جانباز

ابوشجاع ابووقار

نام کتاب	:	جانباز
مصنف	:	ابوشجاع ابووقار
اشاعت	:	2009ء
طابع	:	اے بی سی پرنٹرز
ترتیب وتزئین	:	ڈاکٹر تسنیم شیریں سلیم
زیرِاہتمام	:	قمرزیدی (چیئرمین)
ناشر	:	ویلکم بک پورٹ
قیمت	:	=/550 روپے

ویلکم بک پورٹ

مین اردو بازار کراچی

فون:2633151-2639581 فیکس:021-2638086

E-Mail: Welbooks@hotmail.com

Web: www.welbooks.com

انتساب

محبت کی جاتی ہے جب کہ عشق ہوجاتا ہے، میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ۲۵/ مارچ ۱۹۹۸ء کا سورج میری زندگی میں سب سے بڑا انقلاب لایا۔ میری بھٹکتی اور بے قرار روح صدیوں سے جس کی تلاش میں تھی وہ بالکل اچانک ایک زندہ ہستی کے روپ میں میرے سامنے آگئی۔ میرا گوہرِ مقصود میرے سامنے تھا۔ میں زندگی بھر کے دشوار، کٹھن اور تھکا دینے والے سفر کے بعد بالآخر اپنی منزل تک پہنچ گیا اور اس منزل کو پانے کے لیے میں نے سردھڑ کی بازی لگا دی۔ قدرت نے اس بار بھی میری جھولی میں تین اِکے ڈال دیئے اور تسنیم نے میری رفیقۂ حیات بن کر مجھ جیسے شکستہ انسان کو حیاتِ نو دی اور مجھے زندگی کی رنگینیوں، خوشبوؤں اور مسرتوں سے پھر پیار کرنا سکھایا جنھیں میں مدتوں پہلے فراموش کر چکا تھا۔

اپنی کتاب جانباز کا انتساب میں اپنی محبوبہ بیوی کے نام کرتا ہوں جس کی بے لوث محبت اور چاہت کے بغیر اسے کتابی صورت میں لانا میرے لیے ممکن نہ ہوتا۔

ابوشجاع ابووقار

جانباز۔ اوّل

پیش لفظ

روزنامہ امت میں مسلسل روزانہ شائع ہونے والی میری آپ بیتی "غازی" کو قارئین نے بے حد سراہا۔ بلا مبالغہ ہزاروں قارئین نے خطوط، فیکس اور ٹیلی فون کے ذریعے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ مخلص دوستوں سے میری ملاقاتوں کے دوران میری زندگی کے چند وہ پہلو بھی زیرِ گفتگو آئے تھے جن کا بھارت اور کھٹمنڈو میں میرے قیام، میرے مشنز اور میرے محکمے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے تو اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ "غازی" کی ہر قسط کے ساتھ باکس میں میرے تعارف کے ساتھ "اُمت" کی فرمائش پر اس مجاہد نے اپنی خفیہ خدمات کے ایک گوشے سے پردہ سرکایا ہے۔" لکھنے کے پس پردہ کیا بات تھی؟ "غازی" کی بے پناہ مقبولیت کے بعد جب مجھ سے "باقی گوشوں" سے بھی پردہ سرکانے بلکہ اُٹھانے پر اصرار کیا گیا اور جواز میں قارئین کے خطوط، فیکس اور ٹیلی فونز کا حوالہ دیا گیا تو میں قارئین کی محبت، خلوص اور شوق کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگیا۔ (غازی کتابی صورت میں بھی شائع ہوچکی ہے)

"جانباز" بھی میری آپ بیتی کا ہی ایک حصہ ہے جس میں میرے ایک مخلص دوست نے میری پیشہ ورانہ کامیابیوں کے پیشِ نظر مجھے اپنے ایک ذاتی جان جوکھم کام کو سرانجام دینے کے لیے نہ صرف مجبور کیا بلکہ وعدہ بھی لے لیا۔ یہ مہماتی داستان اب کتابی صورت میں پیشِ خدمت ہے۔

پہلا باب

۱۹۷۶ء کے آغاز میں اُن دنوں میں اپنے محکمے سے Release (فارغ ہوکر) لے کر پشاور کے ایک دوست بابر خان کے پارک ہوٹل کے علاوہ اُن کے راولپنڈی،ایبٹ آباد اور نتھیا گلی میں دیگر ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کا جنرل منیجر تھا۔ میں نے یہ ملازمت بادل ناخواستہ صرف اپنی فیملی اور اپنی مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے کی تھی۔ بھارت اور کھٹمنڈو میں پاکستان کے دشمنوں کو آگ میں بھسم کرنے اور واصل جہنم کرنے والا اب ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس کے باورچی خانوں میں خانساموں سے یہ پوچھتا پھرتا تھا کہ ۵۰ مرغیوں کے تین سو ٹکڑے ۲۸۰ آرڈرز میں کیسے ختم ہوگئے؟ ۲۰ کلو گوشت سکڑ (Shrink) کر بارہ کلو کیسے رہ گیا؟ اسٹور میں چائے کے ۲۰ ڈبوں میں سے تین ڈبے چوہے کیسے کھا گئے کہ نہ تو چائے کا ایک ذرہ چھوڑا اور نہ ہی ڈبے کا کوئی ٹکڑا۔

اُن دنوں جب بھی میرا راولپنڈی جانا ہوتا جہاں بابر خان کا مال روڈ پر راجہ جی ریسٹورنٹ تھا تو میں اپنے دیرینہ اور کالج کے دوست راجہ سرفراز خان سے ضرور ملتا جو پولیس میں DSP اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے اسپیشل باڈی گارڈ تھے۔ (راجہ سرفراز DIG کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں کنٹریکٹ پر دوبارہ اسپیشل پولیس میں خدمات انجام دیں۔) راجہ سرفراز خان سے ملنے میں ایوب پارک راولپنڈی میں وزیراعظم کی رہائش گاہ پر جاتا تھا۔ جہاں مجھے اونچی دیواروں اور کڑے پہرے میں گھرے وزیراعظم ہاؤس میں ہونے والی بہت سی محلاتی سازشوں کا پتہ چلا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد پہلی سمٹ (Summit) کانفرنس میں اندرونی طور پر کیا ہوا؟ بنگلہ دیش کو کیوں تسلیم کیا گیا؟ یوگنڈا کے صدر عیدی امین اور لیبیا کے صدر کرنل معمر قذافی کو کس طرح پاکستان کے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر اپنی ناراضگی دور کرنے پر مجبور کیا گیا؟ فلسطینی صدر یاسر عرفات کو

کیوں کر مجیب الرحمٰن سے ہاتھ ملانے پر رضامند کیا گیا؟ غرضیکہ بہت سی ایسی اندرونی باتوں کا مجھے پتہ چلا جنھیں جان کر پاکستان کو دولخت کرنے کے ذمہ دار مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کے اصل عزائم کھل کر سامنے آگئے۔ مختصر ترین الفاظ میں یہ دونوں "ہر دل عزیز" لیڈر بھارت کے اکھنڈ بھارت پروگرام کے بہت ہی نمایاں کردار تھے اور پاکستان کو دولخت کرکے یہ دونوں اپنی ناپاک منزل کی طرف کامیابی کا پہلا قدم بڑھا چکے تھے۔ ان کا دوسرا قدم پاکستان اور بنگلہ دیش کی افواج کو رسوا کرنا اور اُن کے جذبۂ حب الوطنی کو کچلنا تھا۔ دونوں ممالک کی افواج کو جب ان ہر دل عزیز لیڈروں کی جذباتی تقاریر سے قوم کو بے وقوف بنانے اور نعرے لگوانے کے پیچھے چھپے گھناؤنے عزائم کا پتہ چلا تو یہ دونوں اپنی ہی افواج کے ہاتھوں اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچے۔ فوج چاہے کسی بھی ملک کی ہو، اپنے اندرونی دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ میں وزیراعظم ہاؤس میں داخل ہوتا تو آنکھوں پر سے پردے ہٹ جاتے۔

پاکستان میں دنیا کی تاریخ میں پہلی بار کسی خاتون اوّل کے لیے افواج پاکستان کے سمارٹ اور خوب رو جوان افسر بطور ADC رکھے جانے کا پس منظر، "مولانا وسکی" کی خرمستیاں اور فوج کے ایک اعلیٰ افسر کے ہاتھوں اُن کی سڑک پر پٹائی، "سوہنے منڈے" کے لاہور کی ہیرامنڈی میں کئی ہاٹ لائنوں پر رابطے، لبرٹی مارکیٹ لاہور میں گوگو ریسٹورنٹ پر گورنر ہاؤس سے نکلنے والی پرائیویٹ کاروں کے حملے اور لڑکیوں کے اُٹھائے جانے کے واقعات، کراچی میں PNSC بلڈنگ کے بارھویں فلور پر رنگ رلیوں کی محفلیں اور پری چہرہ خواتین کے جلو میں ایک ممتاز شخصیت کے راجہ اندر کی سبھا رچانے کے واقعات، کراچی کے وزیراعلیٰ کو جس کا جام ہمیشہ بھرا رہتا تھا، وزیراعظم بھٹو کا مخلصانہ مشورہ کہ صرف مزار قائداعظم چھوڑ دینا، باقی جو چاہے بیچ ڈالو، غرضیکہ سینکڑوں ایسے واقعات سے آگہی ہوئی جو اُن دنوں ٹاپ سیکرٹ سمجھے جاتے تھے۔ بچے کھچے پاکستان کی بنیادوں کو سینکڑوں چوہے دن رات کھوکھلا کرنے میں مصروف تھے اور محب وطن پاکستانی اس سیلاب وطن فروشی، خودغرضی، بے حیائی اور بدقماشی کو دونوں ہاتھوں سے اپنی عزت سنبھالے خاموشی سے گزرتے دیکھ رہے تھے۔ کسی میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ ایک قدم بھی آگے بڑھاتا۔ وزیراعظم نے اپنے تحفظ اور مخالفین کو کچلنے کے لیے فیڈرل سیکیورٹی فورس (FSF) کے روپ میں Organised Gang of Gangsters (غنڈوں کا منظم گروہ) تشکیل دی تھی، جو احتجاج کی ہلکی سی آواز بھی نکالنے والوں کو راتوں رات اُٹھا کر غائب کر دیتی اور پھر اُن کا مقدر گم نام قبریں ہوتیں یا مظفرآباد آزاد کشمیر کے دلائی کیمپ کی صعوبتیں اور شاہی قلعہ لاہور کی زیر زمین کال کوٹھریوں میں تحقیر اور ظلم و تشدد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ انتہا یہ کہ استاد دامن جیسے درویش صفت اور بے ضرر شاعر سے ہینڈ گرنیڈ اور پستول برآمد کرکے اور حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا جھوٹا مقدمہ بنا کر اُنھیں پابجولاں کر دیا گیا۔

ایسے ہی دنوں میں ایک روز مجھے راجہ سرفراز کا فون آیا کہ فوری طور پر راولپنڈی آکر اس سے ملوں، بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ سرفراز سے میری بڑی بے تکلفی کی دوستی تھی۔ پہلے تو میں نے اسے ایک مذاق یا ہماری شکار پارٹی کے ہڑیال (ہرن کی ایک قسم) شکار کرنے کی ضیافت میں شمولیت کے لیے دعوت نامہ سمجھا۔ لیکن جب سرفراز نے کہا کہ یہ مذاق نہیں اور اگر فوری روانہ نہ ہوئے تو اٹھوا کر راولپنڈی پہنچا دیے جاؤ گے، تو میں بھی سنجیدہ ہوگیا۔ سرفراز نے کہا کہ ٹیلی فون Under Observation ہونے کی وجہ سے اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہ بات بھی وہ کھلے طور پر نہ کہہ سکا۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ اسی شام سات بجے میں راولپنڈی میں مال روڈ پر راجہ جی ریسٹورنٹ میں اسے ملوں۔

راجہ جی ریسٹورنٹ بھی ان ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس کی زنجیر کی ایک کڑی تھی، جن کا میں جنرل منیجر تھا۔ شام کے ٹھیک سات بجے راجہ سرفراز ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ بغیر کسی رسمی گفتگو کے اس نے کہا۔ "میں بڑی مشکل سے تمہیں فون کرنے اور یہاں بلانے میں کامیاب ہوا ہوں۔ وزیراعظم ہاؤس کا ہر ٹیلی فون ٹیپ ہو رہا ہے اور میں کسی صورت بھی شام 6 بجے سے پہلے وہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ ایک وفاقی وزیر اور بھٹو صاحب کے قریبی دوست کے ایک ذاتی کام کے لیے جب FSF کو کہا گیا تو FSF کے سربراہ مسعود محمود نے تمہارے سابقہ محکمے سے Guidence مانگی اور اسے تمہارا نام دیا گیا۔ چونکہ ملک کی اندرونی جاسوسی زوروں پر ہے اور تم ابھی بھی اپنے محکمے کے زیرنگرانی ہو، اس لیے پشاور میں تمہارا پتہ اور کام کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مسعود محمود نے اپنے نائبین کو تمہیں یہاں فوری لانے کا کہا ہے۔ چونکہ یہ ساری بات میری موجودگی میں ہوئی تھی اور میں تمہاری طبیعت سے بھی اچھی طرح واقف ہوں کہ اگر کسی بات پر اڑ جاؤ تو پھر دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے تم اڑے ہی رہتے ہو اور اس کا مطلب ظاہر ہے کہ اگر تم FSF والوں کے ہمراہ خوشی سے یہاں نہ آتے تو پھر زبردستی لائے جاتے۔ اس لیے میں نے تمہیں کسی ایسے ناخوشگوار واقعے سے بچانے کے لیے فون کیا تھا۔ اب میں عباس (مسعود محمود کا نمبر2) کو فون پر بتاتا ہوں کہ تم میرے پاس ہو اور کل صبح تمہیں وفاقی وزیر راجہ تری دیو رائے کے دفتر میں مسعود محمود کے ہمراہ جانا ہوگا۔ یہاں پر میری پوزیشن بھی بڑی مضبوط ہے۔ وزیراعظم کا سپیشل باڈی گارڈ ہونے کے باعث وزیراعظم تک میری ڈائریکٹ رسائی ہے۔ میری اور تمہاری دوستی کو مسعود محمود بھی بخوبی جانتا ہے اس لیے وہ تم سے اچھی طرح پیش آئے گا۔"

کھانے کے بعد میں راجہ سرفراز کے ہمراہ اس کے گھر رات گزارنے چلا گیا۔ چونکہ آئندہ کے واقعات ایک تسلسل کے ساتھ پیش آئے اس لیے میں یہاں راجہ تری دیو رائے کے متعلق کچھ وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ بنگلہ دیش (سابقہ مشرقی پاکستان) میں چٹاگانگ کے پہاڑی سلسلے میں کٹھن گزرگاہوں سے آگے کپتائی کا قصبہ آتا ہے۔ یہ وہاں کے Civilised World کی آخری حد ہے۔

اس کے بعد پہاڑی سلسلے کی بلندیوں پر جاتے ہوئے پہلے چکمہ پھر مگھ اور پھر مورنگ قبائل آتے ہیں۔ مورنگ قبیلے والے ابھی تک ہزاروں برس کی قدیم دنیا میں رہتے ہیں۔ عجیب و غریب رسوم کے علاوہ اس قبیلے کے زن و مرد صرف پتوں سے اپنا جسم ڈھانپتے ہیں۔ مگھ قبیلہ ان سے نسبتاً ذرا ایڈوانس ہے اور چکمہ ان تینوں میں سب سے زیادہ Civilised ہے۔ اس قبیلے کا صدر مقام رانگا ماٹی ہے۔ اس قبیلے کے مرد و زن زیادہ تر بدھ مت سے ملتے جلتے کسی مذہب کے پیروکار ہیں۔ اس قبیلے کا سردار راجہ تری دیو رائے تھا جسے حکومت پاکستان نے کیپٹن کا اعزازی عہدہ بھی دے رکھا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت برطانیہ میں ہوئی تھی اور چٹاگانگ میں میری سروس کے دوران چٹاگانگ ریسٹ ہاؤس میں ہماری علیک سلیک ہوئی جو بعد میں گہری دوستی میں بدل گئی۔ راجہ تری دیو کے ہمراہ میں کئی مرتبہ رانگا ماٹی جا چکا تھا۔ جہاں ہر بار میرے لیے خصوصی طور پر قبائلی ناچ گانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس قبیلے کے سبھی افراد اپنے راجہ کو سجدہ کرتے اور اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ راجہ نے اپنے حویلی نما محل میں مجھے مغل شہنشاہوں جہانگیر اور اورنگ زیب کی افواج سے چھینی ہوئی توپیں، دیگر اسلحہ اور زرہ بکتریں دکھائیں۔ اس قبیلے نے آج تک کسی کی بھی غلامی قبول نہیں کی۔ قیام پاکستان کے بعد یہ قبیلہ اپنے راجہ کی وجہ سے دل و جان سے پاکستان کا حامی ہوگیا اور پاکستان کی حاکمیت کو تسلیم کرلیا۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت راجہ تری دیو رائے مغربی پاکستان میں تھا۔ بھٹو صاحب کے دور میں اسے پروڈکشن کا وفاقی وزیر بنایا گیا۔ چکمہ قبیلے نے آج تک بنگلہ دیش کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ سنا ہے کہ گذشتہ دو تین سالوں کے دوران راجہ تری دیو کے بڑے بیٹے (جو قبیلے کا موجودہ سردار ہے) اور بنگلہ دیشی حکومت کے درمیان کچھ مفاہمت کی بات چیت ہوئی ہے اور اس قبیلے کے افراد کو چٹاگانگ تک آنے کی اجازت مل گئی ہے۔ جس دور کا میں ذکر کررہا ہوں، اس وقت بنگلہ دیشی فوج نے اس قبیلے کی نچلی سرحدوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور دونوں حالت جنگ میں تھے۔ اس قبیلے کے لوگ روائتی ہتھیاروں کے بجائے قدیم ہتھیاروں مثلاً تلوار، نیزے اور تیر کمان کے علاوہ انتہائی زہریلے سانپوں کے زہر میں بجھے ہوئے تیر اور کھوکھلے بانس کے ٹکڑوں میں زہریلی سوئیاں رکھ کر انھیں غلیل کے کھنچے ہوئے ربڑ کی طرز کے بنے ہتھیار سے دشمن پر پھینکتے تھے۔ باقاعدہ اور تربیت یافتہ فوج بھی ان کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتی تھی کیونکہ اس قبیلہ کے جنگجو سبز رنگوں سے خود کو کیموفلاج کرکے گھنے درختوں پر چھپ کر جب دشمن پر حملہ کرتے تو بغیر آواز پیدا کیے سینکڑوں دشمنوں کو ڈھیر کر دیتے تھے۔ پہاڑوں میں ہونے کے باعث ہوائی جہازوں کے بم بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

دوسرے روز صبح آٹھ بجے سرفراز خان مجھے اپنی گاڑی میں راجہ تری دیو رائے کے دفتر جو اسلام آباد میں سیکریٹریٹ C بلاک میں واقع تھا، چھوڑ آیا۔ میں ان کے PA کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی مسعود محمود بھی آگیا۔ مسعود محمود کسی زمانے میں مشرقی پاکستان میں ایس پی بھی رہ چکا

تھا اور اپنے ظلم و جور کی کئی داستانیں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ ہم دونوں کی آپس میں کوئی بات نہیں ہوئی لیکن انتظار کا سارا وقت ہم عمیق نظروں سے ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے۔ منسٹر صاحب تشریف لائے تو پہلے مسعود محمود کو اور پھر مجھے اندر بلایا گیا۔ راجہ تری دیو پہلے تو ہکا بکا مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا، خیر و عافیت پوچھی اور پھر ماضی کی ملاقاتوں کی باتیں شروع کر دیں۔ کافی پینے کے چند منٹ بعد اس نے پوچھا کہ مجھے اس سے کیا کام ہے؟ جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے تو کوئی کام نہیں بلکہ مجھے کسی کام کے سلسلے میں یہاں بلایا گیا ہے تو وہ حیران و پریشان ہو کر مسعود محمود کی طرف دیکھنے لگا۔ مسعود محمود نے اسے بتایا کہ مشن کے لیے میرے سابقہ محکمے نے میرا نام Recommend کیا ہے تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنے اہم مشن کے لیے جس شخص کو چنا گیا ہے وہ اس کا دیرینہ اور قریبی دوست ہوگا۔ مسعود محمود نے منسٹر صاحب کو کہا کہ وہ مجھے اپنے ہمراہ لے جائے گا اور FSF سے اس مشن کے لے چنے گئے چھ افراد سے میرا تعارف کروائے گا۔ یہ دور ''عوامی حکومت'' کا تھا۔ ہماری بیس پچیس منٹ کی اس میٹنگ کے دوران ہی ''عوامی نمائندے'' اپنی اغراض لیے PA کے دفتر میں جمع ہوگئے اور جو ذرا نڈر تھے وہ سیدھے منسٹر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اب یہاں ہماری خفیہ میٹنگ کا کوئی موقع نہ تھا۔ ہم اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ PA کے کمرے کے باہر سے میں لوٹ کر راجہ تری دیو کے پاس آیا اور اس کے کان میں کہا کہ میں آج رات تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ راجہ نے ایک چٹ پر اپنا بنگلہ نمبر، سڑک اور ٹیلی فون نمبر لکھ کر مجھے دیا اور کہا کہ نو بجے آجانا اور کھانا میرے ساتھ ہی کھانا۔

مسعود محمود نے جو کاریڈور میں کھڑا تھا، بڑی ناگواری سے مجھ سے پوچھا کہ میں دوبارہ اندر کیوں گیا تھا؟ ''ایک ذاتی کام تھا اور None of your Business''۔ میں نے جواب دیا۔ مسعود محمود کو مجھ سے ایسے درشت جواب کی توقع نہ تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بکواس کرتا میں نے اسے کہا، ''مسٹر محمود! نہ تو میں گورنمنٹ کا ملازم ہوں اور نہ ہی تمہارا ماتحت۔ مجھ سے صرف مشن کے متعلق بات کرو اور میرے ذاتی کاموں میں دخل نہ دو۔ راجہ صاحب میرے دیرینہ دوست ہیں اور سرفراز خان بھی۔ اگر مجھ سے حدود سے ذرا بھی باہر ہوکر بات کی تو اس کی اطلاع پرائم منسٹر اور راجہ تری دیو رائے تک پہنچانا میرے لیے بہت آسان ہے۔'' مسعود محمود خون کے گھونٹ پی کر چپ ہوگیا اور اس کی گاڑی میں ہم سیدھے FSF ہیڈکوارٹرز میں پہنچے۔ اپنے دفتر میں پہنچ کر مسعود محمود نے جو FSF کا سربراہ تھا، اپنی اوقات دکھانی شروع کی۔ مجھے ویٹنگ روم میں بٹھادیا گیا اور تین گھنٹے کے انتظار کے بعد مجھے ایک ہال میں لے جایا گیا جہاں SP عباس خان نے مجھ سے اپنا تعارف کروایا۔ وہاں وردی میں ملبوس چھ افراد کھڑے تھے جن میں دو انسپکٹر دو سب انسپکٹر اور دو حوالدار تھے۔ عباس خان نے مجھے بتایا کہ جس مشن پر تمہیں بھیجا جارہا ہے، اس میں تمہارا کام صرف یہ ہوگا کہ تم صرف راستوں کی رہبری کرو گے۔

باقی سب کچھ یہ سنبھال لیں گے۔ ان چھ موٹے افراد اور ان کی بڑھی ہوئی توندیں دیکھ کر ہی مجھے ان کی ''صلاحیت'' کا اندازہ ہوگیا تھا۔ مجھے مشن کے متعلق حالانکہ اب تک کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ لیکن راجہ تری دیو رائے اور ''راستے کی رہبری'' کے الفاظ سے مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوگیا تھا کہ کیا مہم درپیش ہے۔ مجھے فخریہ بتایا گیا کہ یہ چھ افراد FSF کی ''کریک کمپنی'' سے چنے گئے ہیں۔ بر سبیل تذکرہ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ کریک کمپنی FSF کے ''نڈر، بہادر اور پیشہ ورانہ مہارت کے حامل افراد'' پر مشتمل تھی جس پر FSF فخر کرتی تھی۔ اس کمپنی کی ''صلاحیت'' کا اندازہ آپ صرف ایک واقعہ سے ہی لگا سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب اقتدار حاصل کرکے فرعونیت کے اس دور میں تھے جہاں ذرا سی مخالفت برداشت کرنے کا بھی ان میں یارا نہ تھا۔ ہر مخالفت کو وہ Fix up کرنے کی کھلے بندوں صرف دھمکیاں ہی نہیں دیتے تھے بلکہ ان پر عمل بھی کیا جاتا تھا۔ احمد رضا قصوری کو بھی پارلیمنٹ میں بھٹو صاحب نے کہا، "You have become impossible. I will fix you up." (تم میرے لیے ناقابل برداشت ہوچکے ہو۔ میں تمہیں ٹھیک کردوں گا۔) اور اسے ٹھیک کرنے کا کام FSF کی اسی کریک کمپنی کو سونپا گیا۔ کوئٹہ اور لاہور میں مسلسل ڈھائی ماہ اس کریک کمپنی کے ماہر نشانچیوں نے احمد رضا قصوری کی نگرانی کی اور اس کے اپنے گھر آمد و رفت کے اوقات کو نوٹ کرتے رہے۔ ایکشن کے روز انہی میں سے دو افراد نے قصوری کی گاڑی پر Automatic Weapons (خودکار ہتھیاروں) سے حملہ کیا، 87 راؤنڈ فائر کیے اور غلط آدمی یعنی نواب محمد احمد (احمد رضا قصوری کے والد) کو مار بیٹھے۔ یہ تھی اس کریک کمپنی کے چیدہ آدمیوں کی کارکردگی اور صلاحیت۔

آئندہ روز صبح دس بجے ہیڈکوارٹرز میں آنے کا کہہ کر میں رخصت ہوا اور رات نو بجے راجہ تری دیو رائے کے گھر پہنچ گیا۔ راجہ میرا منتظر ہی تھا۔ خاصی دیر خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ کھانے کے بعد ہم پھر اصل موضوع پر آئے۔ راجہ نے بتایا کہ اس کی بچی تو امریکہ میں تعلیم حاصل کررہی ہے، لیکن اس کی بیوی اور دو لڑکے ابھی رانگا مائی میں ہی ہیں۔ بنگلہ دیشی گورنمنٹ انہیں گرفتار کرنے کی پوری کوشش کررہی ہے تاکہ مجھے دباؤ میں لاکر اور بلیک میل کرکے بنگلہ دیش آنے پر مجبور کیا جائے۔ پاکستان سے وفاداری کے جرم میں مجھے پھانسی پر لٹکانے کے آرڈر پہلے ہی جاری ہوچکے ہیں۔ میرا ابھی تک اپنی فیملی اور اپنے قبیلے سے کوئی رابطہ نہیں ہوسکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی اور چھوٹا لڑکا یہاں آجائیں اور بڑا لڑکا وہیں رہے جس کے لیے قبیلے کی سرداری کا فرمان میں یہاں سے لکھ کر بھیج دوں تاکہ اسے قبیلے کا باقاعدہ سردار تسلیم کرلیا جائے اور وہ بنگلہ دیشی حکومت سے مذاکرات کرنے کی پوزیشن میں ہوجائے۔ میں نے وزیراعظم سے اس خواہش کا تذکرہ کیا تھا اور انہوں نے مسعود محمود کے ذمے یہ ڈیوٹی لگادی۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ تم بھی اس مہم کے لیے چنے جاؤ گے۔ اسی لیے میں اپنے دفتر میں مسعود محمود کے ہمراہ تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ یقین جانو مجھے تمہارا نام بھی ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ وہ تو

مسعود محمود نے بتایا تو مجھے یاد آیا۔ راجہ تری دیو یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر اب ایک سوالیہ نشان تھا اور میں ماضی کے ان دنوں میں پہنچ گیا جب انگا مائی میں اس نے میرے اور میرے دوستوں کی کئی بار بھرپور میزبانی کی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ چٹاگانگ میں میری اصفہانی میں ملازمت کے شروع دنوں میں ہی دفتر میں ملازم ایک متعصب ہندو بنگالی انسپکٹر سے کھٹ پٹ ہوگئی تھی جو بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئی کہ اس نے کھلے بندوں یہ کہہ دیا تھا کہ چٹاگانگ میں اب تم رہو گے یا میں۔ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ اس نے اپنی دھمکی کو پورا کرنے کے لیے میری رہائش گاہ یعنی ریسٹ ہاؤس کے سامنے چند بنگالی غنڈے بھی چھوڑ دیئے تھے۔ یہ ریسٹ ہاؤس ریلوے روڈ پر مسکا (Miska) ہوٹل کے سامنے واقع تھا۔ بنگالی غنڈے آتے جاتے مجھ پر آوازے کستے اور مجھے اکساتے کہ میں زچ ہوکر ان سے بھڑ جاؤں اور انہیں مجھے مزہ چکھانے کا موقع مل جائے۔ میں نے یہ بات راجہ تری دیو کو بتائی جو اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا اور ان دنوں ہماری گاڑھی چھنتی تھی۔ تری دیو اگلے روز ہی دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی میرے دفتر کے باہر اپنی جیپ میں اپنے دو تین ملازموں کے ہمراہ آگیا۔ میں نے اشارے سے اسے وہ انسپکٹر دکھایا۔ راجہ کے دو آدمی رکشہ لے کر اس کے پیچھے لگ گئے۔ اگلے روز وہ انسپکٹر دفتر نہیں آیا۔ چند روز بعد پتہ چلا کہ کسی زہریلے کیڑے کے کاٹنے سے اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔ ''کیڑے کے کاٹنے'' کا نشان اس کی گردن پر تھا۔ میں نے تری دیو کو اس بارے میں بتایا تو اس نے صرف He Deserved it (وہ اسی کا مستحق تھا) کہہ کر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ آج وہی دوست مجھ سے مدد کا طلب گار تھا۔

میں نے راجہ کو کہا کہ میں اس کے کام کے لیے آخری حد تک جانے کو تیار ہوں لیکن اس کے لیے میری کچھ شرائط ہیں۔ اول یہ کہ میں FSF یا کسی بھی سرکاری ادارے کی اعانت اور مدد کے بغیر اپنے وسائل سے یہ کام انجام دوں گا۔ نمبر دو، مجھے مختلف نام سے ایک پاسپورٹ چاہیے جس کا علم کسی کو نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میرے محکمے کی طرف سے مجھ پر ملک سے باہر جانے کی ایک سال کے لیے پابندی ہے۔ نمبر تین، مجھے اس کام کو انجام دینے کے لیے خاصی معقول رقم چاہیے کیونکہ اس مشن کے لیے میں اپنے آزمودہ ساتھیوں کو شامل کروں گا اور آخری اور چوتھی شرط یہ ہے کہ تم مسعود محمود کو یہ کہہ دو کہ فی الحال تم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ راجہ تری دیو نے میری ساری شرائط مان لیں۔ دراصل اسے خود بھی FSF پر بھروسہ نہیں تھا کیونکہ معاملہ صرف رانگا مائی تک پہنچنے تک کا ہی نہیں بلکہ اس کی فیملی کو بحفاظت اور خفیہ طور پر پاکستان لانے کا بھی تھا۔ راجہ نے مجھے پانچ ہزار روپے سفر کی تیاری کے لیے دیے اور کہا آج سے دسویں دن میں اسے کراچی میں جم خانہ کلب کے سامنے قصر ناز میں ملوں۔ وہاں ایک دن میں وہ میری مرضی کے مطابق پاسپورٹ، اپنے خطوط اور ضروری رقم فراہم کردے گا۔ یہ رات میں نے پھر راجہ سرفراز کے ساتھ بسر کی۔ دوسرے روز دس بجے میں FSF کے ہیڈکوارٹرز گیا جہاں مجھے

بتایا گیا کہ یہ مشن فی الحال منسوخ کر دیا گیا ہے لہٰذا میری ضرورت نہیں۔ راولپنڈی صدر سے میں نے بینک روڈ اور کشمیر روڈ کے کراسنگ کے بالکل قریب فاروق سپورٹس سے Long Boots (گھٹنوں تک آنے والے جوتے) اور سفری ضرورت کی چند اشیا خریدیں اور شام تک پشاور پہنچ گیا۔ اس مہم پر جانے کے لیے میں نے ذہن میں ایک خاکہ تیار کیا تھا۔ اس کی تفصیلات اور مختلف ممالک سے گزرتے ہوئے پیش آنے والی ہر ممکن رکاوٹ کو عبور کرنے میں دشواریاں کو پیش نظر رکھ کر میں نے اپنی طرف سے ایک مکمل فول پروف پلان ترتیب دے دیا۔ پاسپورٹ ملنے پر میں سیدھا ڈھاکے بھی جا سکتا تھا لیکن 76ء کے آغاز میں بنگلہ دیش جانے والے پاکستانیوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس کی گواہی وہاں جانے والے پاکستانی اور پاکستانی سفارتی عملے کے ارکان دے سکتے ہیں۔ بنگلہ دیشیوں کی پاکستانیوں سے نفرت عروج پر تھی۔ پورے بنگلہ دیش پر عملاً بھارت کا راج تھا۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر مشرقی پاکستانی بھارت کی غلامی میں آ چکے تھے۔ مجیب الرحمٰن کی غداری جسے بنگالیوں نے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر آنکھوں پر بٹھا لیا تھا، جب کھل کر سامنے آئی تو سوائے مجیب کی بیٹی حسینہ واجد کے جو لندن میں تھی، مجیب کے سارے خاندان کو گولیاں مار کر ختم کر دیا گیا اور اس ہر دل عزیز لیڈر اور اس کے خاندان کی لاشیں کئی روز بے گور و کفن اسی گھر میں پڑی رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان لاشوں میں کیڑے پڑ گئے تھے اور تعفن کی وجہ سے گرد و نواح میں رہنے والے اپنے گھر چھوڑ گئے۔

میں نے اپنے پلان میں اپنے آزمودہ ساتھیوں یعنی دہلی میں بشیر کی گیرج کے لڑکوں اور قیصر کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ وہ جری بہادر تھے جو جان پر کھیل جانے کو معمولی بات سمجھتے تھے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی دشواری بھارتی پاسپورٹ کا حصول تھا۔ اس سیکولر ملک میں جہاں سب شہریوں سے بلاتفریق یکساں برتاؤ کا پرچار کیا جاتا ہے، مسلمانوں کو آزادی سے سانس بھی لینے کی اجازت نہیں۔ حتیٰ کہ عدالتوں میں چاہے وہ مجسٹریٹ کی ہوں یا جج کی صرف نمائشی طور پر گواہوں کو ان کے مذہب کے مطابق قرآن حکیم، انجیل، گیتا اور گرنتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کی اجازت ہے۔ باقی سب کام یعنی تفتیش سے جیل تک مسلمانوں سے صرف مسلمان ہونے کی پاداش میں ایسا ناروا سلوک کیا جاتا ہے کہ الاماں الحفیظ۔

میں پاکستان سے دہلی خط بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس کی ایک وجہ میرے سابقہ محکمے کی مجھ پر نگرانی کی نظر عنایت اور دوسری وجہ بھارتی محکمہ ڈاک میں پاکستان سے آنے والی ڈاک سنسر ہونے کا باعث تھی۔ میں نے جو پروگرام ترتیب دیا تھا وہ بڑا کٹھن اور بڑے لمبے روٹ سے ہوتا ہوا رانگا ماٹی پہنچنے کا تھا۔ میں نے اپنے دوست اور ہوٹل کے مالک بابر خان سے چند روز کی رخصت لی اور بارہ روز بعد کی تاریخ کا لکھا ہوا استعفیٰ بھی دے دیا اور کہا کہ اگر دس روز میں واپس نہ پہنچ سکا تو پھر میرا استعفیٰ منظور کر لینا۔ دراصل ان دنوں حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ہر لمحے بے یقینی کا عالم طاری رہتا تھا۔ کسی کو

بھی کچھ علم نہ تھا کہ سیاسی طور پر اگلے روز ملک میں کیا ہونے والا ہے۔ راجہ تری دیو رائے نے بھی پہلے FSF کی خدمات حاصل کیں اور پھر میرے ایک اشارے پر انہیں فارغ کر دیا۔ میرے ساتھ بھی آخری لمحے پر یہی کچھ ہو سکتا تھا لہٰذا میں نے اپنی ملازمت کو محفوظ کر لیا۔ میرے گھریلو حالات پہلے سے بہت زیادہ ناگفتہ بہ ہو چکے تھے۔ زندگی کی ہر دوڑ میں کامیابیوں نے میرے قدم چومے تھے لیکن اس دوڑ میں میں شکست پر شکست کھا رہا تھا۔

میں نے اپنے گھر والوں کو بھی اپنی اس مہم سے آگاہ نہ کیا اور تری دیو رائے سے طے شدہ ملاقات کی صبح PIA سے کراچی چلا آیا۔ ہوٹل میٹروپول کے مالک سائمپرس مینوالا (پپی مینوالا کے والد) میری کراچی میں ٹیکسیشن میں ملازمت کے دور سے مجھ سے انتہائی شفقت برتتے اور اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ میں نے ان کے ہوٹل میں قیام کیا اور بعد دوپہر تری دیو سے ملنے قصر ناز چلا گیا۔

راجہ صاحب اس وقت اپنے بیڈ روم میں شغل مئے نوشی میں مصروف تھے۔ مجھے بھی وہیں بلا لیا۔ اس محفل میں تین اور آدمی ان کے شریک کار تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد راجہ صاحب نے ان تینوں کو ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا کہا۔ وہ چلے گئے تو میں نے راجہ صاحب کو اپنا پلان بتایا۔ راجہ صاحب نے یہ پلان سننے میں دلچسپی نہ لی اور کہا کہ پلان بھی تمہارا ہے اور ذمہ داری بھی تمہاری، مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ اپنی ضروریات بتاؤ۔ میں نے کہا کہ عیسائی نام رابرٹ مائیکل کے نام سے پاسپورٹ اور اخراجات کے لیے پانچ لاکھ روپے کے مساوی امریکی ڈالر۔ راجہ صاحب نے کہا، ''بس صرف یہی کچھ؟'' میں نے کہا ''جی ہاں، صرف اتنے میں ہی سارا کام انشاء اللہ مکمل ہو جائے گا۔'' راجہ صاحب نے اپنے PA کو انٹرکام پر کہا کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے لوگوں کو کمرے میں بھیج دے۔ جب وہ تینوں آ گئے تو راجہ صاحب نے انہیں کہا ''مجھے کل شام تک پانچ لاکھ روپوں کے سرکاری ریٹ پر امریکی ڈالر چاہئیں اور ایک ارجنٹ پاسپورٹ بھی بنوانا ہے جو مجھے کل چار بجے تک ہر حالت میں مل جائے۔'' تینوں نے یکبارگی سر ہلا کر کہا، "Sure Sir. It will be done." (جناب یقینی طور پر ایسا ہوگا) راجہ نے کہا کہ پاسپورٹ کا فارم اور تصاویر لینے کل صبح 9 بجے آ جانا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اجازت لے کر چلے گئے تو راجہ نے بتایا کہ یہ تینوں سندھ انجینئرنگ ورکس میں اوپر کے عہدے دار تھے۔ یہ پانچ لاکھ مجھے دیں گے تو دس لاکھ خود کمائیں گے اور اگر میں ایسا نہ کروں تو پھر بھی ان کے پاس ایسے حربے ہیں کہ میری لاعلمی میں ہی یہ بیسیوں لاکھ ہر مہینے Earn (کماتے) کرتے ہیں۔ میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے اجازت لی اور PA کے پاس جا کر راجہ صاحب کی حسب ہدایت اپنے پاسپورٹ سائز فوٹو گراف اور ''رابرٹ مائیکل'' کے کوائف لکھوائے اور سادہ کاغذ پر رابرٹ مائیکل کے پانچ چھ دستخط بھی کر دیے۔

اگلے روز شام پانچ بجے جب میں قصر ناز پہنچا تو راجہ صاحب پاسپورٹ اور ڈالر لیے

میرے منتظر تھے۔ انہوں نے مجھے یہ دیتے ہوئے کہا کہ BOAC بنکاک تک تمہارا ریٹرن ٹکٹ میں نے اپنی تنخواہ سے لیا ہے تاکہ تمہارا سفر ”محفوظ“ رہے۔ میں اس عجیب منطق پر ہنس پڑا۔ راجہ صاحب نے مجھے ٹکٹ کے ساتھ بڑے لفافوں میں بند خطوط دیے، جن پر قبائلی زبان کے علاوہ انگلش میں بھی نام درج تھے۔ راجہ نے کہا، ”ان خطوط کو ذاتی طور پر تسلی کر کے ہر ایک کو الگ الگ دینا۔ واپسی پر تمہارے ہمراہ میری بیوی اور ایک بیٹا بھی ہوگا، بے شک زیادہ دن لگ جائیں لیکن انہیں آرام اور حفاظت سے لانا۔ ایک اور انتہائی رازداری کا کام میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔ میری بیوی کے پاس ہمارے پرکھوں (Ancestors) کا خزانہ ہے۔ میں نے بیوی کو لکھا ہے کہ جڑاؤ زیورات تو میرے بڑے لڑکے کو دے دے جو اب چکمہ قبائل کا سردار ہے لیکن تمام جواہرات جو چار کلو سے بھی زیادہ وزنی ہیں انہیں پہلے تمہیں دے اور بعد میں وہ زیورات میرے لڑکے کو۔ ان جواہرات کو میرے بڑے لڑکے اور چکمہ قبائل سے نہایت ہشیاری اور رازداری سے نکالنا ہے۔ میرے لڑکوں کو ان کی ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو پھر نہ تو جواہرات ہی بچیں گے اور نہ ہی تم اور تمہارے ساتھی۔ تم میرے دوست ہو۔ میں تم پر تو بھروسہ کرسکتا ہوں لیکن اپنے لڑکوں پر نہیں۔ قبیلے کی رسومات اور سردار کی بیوی کی روانگی سے پہلے قبیلے کی عورتیں اسے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑتیں اس لیے میں نے اپنی بیوی کو لکھ دیا ہے کہ خط ملتے ساتھ ہی جواہرات تمہارے حوالے کر دے۔ پھر یہ تمہاری ذمہ داری ہوگی کہ انہیں بحفاظت مجھ تک پہنچاؤ۔“ راجہ تری دیو رائے کی باتوں سے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اپنی بیوی اور بیٹے سے زیادہ ان جواہرات کو حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ بیوی اور بیٹے کو پاکستان لانے کا مقصد بھی ان کی آڑ میں جواہرات کا حصول تھا۔ بہرحال یہ اس کا ذاتی مسئلہ تھا۔ ابھی تک وہ چکمہ قبیلے کا سردار تھا اور محض پاکستان سے وفاداری کی وجہ سے اپنے قبیلے میں واپس نہیں جاسکتا تھا۔ مجھ پر اس کا اتنا بڑا احسان تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ خزانے کا مالک وہ تھا۔ جسے اس تک اصولاً پہنچنا چاہیے تھا۔ چنانچہ میں نے یہ ذمہ داری بھی قبول کرلی۔ میری سیٹ پرسوں کی فلائٹ کے لیے اوکے تھی اور مجھے اس سفر کے لیے مزید تیاری بھی کرنی تھی۔ میں نے اجازت چاہی تو راجہ نے کہا کہ فلائٹ سے دو گھنٹے قبل میں اس کے پاس آجاؤں۔ کسی بھی قسم کا رسک نہ لینے کی وجہ سے وہ ایئرپورٹ پر میرے ہمراہ چلے گا۔ میں نے راجہ کو بتا دیا کہ اس ساری مہم میں درپیش حالات کے پیش نظر دو ماہ سے پانچ ماہ تک کا عرصہ لگ سکتا ہے اس لیے میں اسے کوئی فکسڈ تاریخ نہیں بتاسکتا۔ میں اپنی طرف سے حتی الامکان کوشش کروں گا کہ جلد از جلد کامیابی سے لوٹ آؤں اور جہاں جہاں بھی موقع ملا میں اسے بذریعہ تار حالات سے مطلع کرتا رہوں گا۔

راجہ تری دیو سے رخصت ہوکر میں میٹروپول ہوٹل آگیا۔ اس ملاقات میں راجہ نے جو نئے انکشاف کیے تھے، ان کے متعلق اس نے اسلام آباد میں ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہاں اس نے

جانباز۔۱

صرف یہ کہا تھا کہ اس کی رانی اور چھوٹے بیٹے کو پاکستان لانا ہے لیکن کراچی میں اس نے اپنے خاندانی جواہرات بھی ہمراہ لانے کا کہہ کر مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا۔ اس کے یہ کہنے سے کہ جواہرات کا اس کے بڑے بیٹے کو جو اب قبیلے کا سردار تھا، ہرگز پتہ نہ چلے اور نہ ہی قبیلے کے کسی فرد کو اس بات کا علم ہو، مجھے پیش آنے والی مشکلات اور حالات کی نزاکت کا پورا احساس ہوگیا تھا۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ چکمہ قبیلے میں پہنچ کر ہم محفوظ ہوں گے اور راجہ کا بیٹا رانگا ماٹی میں ہمارے قیام اور واپسی کے سفر کے دوران کم از کم اپنے قبیلے کی حدود تک اپنے وسائل کے ساتھ ہمارا مدد و مددگار ثابت ہوگا۔ لیکن اب صورت حال مختلف دکھائی دیتی تھی۔ سفر کے دوران اور واپسی پر ”رابرٹ مائیکل“ اور اس کے ساتھیوں کو اتنا خطرہ نہ تھا: جتنا چکمہ قبائل کی حدود میں پیش آسکتا تھا۔ سردار بدلنے کے ساتھ ساتھ یقیناً وفاداریاں بھی بدل چکی ہوں گی۔ نئے سردار کی تقرری کا فرمان میں ہمراہ لے جارہا تھا۔ اس فرمان کا مطلب یہ تھا کہ راجہ تری دیو رائے کے جو مخصوص وفادار تھے، انہیں بھی اب خود راجہ کے فرمان کے مطابق نئے راجہ کی اطاعت اور اس کے احکامات بجا لانے پڑیں گے۔ رانگا ماٹی میدانی علاقے میں نہیں بلکہ گھنے جنگلات اور دشوار گزار پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے سب سے آسان اور سہل راستہ چٹاگانگ سے جاتا ہے۔ اس راستے پر بھی کوئی باقاعدہ سڑک نہیں۔ اونچے نیچے راستے پر فور وہیل جیپ (Four wheel Jeep) بھی بڑی دشواری سے جاتی ہے۔ راستے میں ایک بڑا دریا عبور کرنے کے لیے کوئی پل نہیں اور بڑی کشتی میں جیپ سمیت سوار ہوکر دریا عبور کیا جاتا ہے۔ پہاڑوں میں دو جگہوں پر ایسے گہرے کھڈ آتے ہیں، جن پر سے گذرنے کے لیے صرف ایک ایک فٹ چوڑے لکڑی کے دو بڑے شہتیر رکھے ہوئے ہیں، جن پر سے جیپ گزارنی پڑتی ہے۔ مجھے اپنی ڈرائیونگ پر بڑا ناز ہے۔ لیکن ماضی میں ان شہتیروں پر سے میں جتنی بار بھی گزرا، میں نے اپنے دوستوں کی رہنمائی میں جو جیپ سے اُتر جاتے تھے، جیپ کے اگلے پہیے شہتیروں پر چڑھاتا اور پھر اللہ کا نام لے کر اور آنکھیں بند کر کے ایکسیلیٹر پورا دبا دیتا اور آنکھیں تب کھولتا جب دوست چلا کر بتاتے کہ ”پل“ عبور کرچکے ہو۔ دوستوں نے ہمیشہ ان پلوں کو پیدل چل کر ہی عبور کیا۔ یہ ”سہل ترین راستہ“ بھی اب ہمارے لیے ممنوع تھا کیونکہ ہم کسی حالت میں بھی چٹاگانگ جانے کا خطرہ مول نہ لے سکتے تھے۔ میرے پلان کے مطابق ہمیں سب سے زیادہ بلندی پر پہلے مورنگ اور پھر مگھ قبائل سے گذرتے ہوئے آخر میں چکمہ قبیلے تک پہنچنا اور پھر اسی راستے سے واپس لوٹنا تھا۔ واپسی پر ہمارے ہمراہ رانی اور ان کے بیٹے کے علاوہ بیش قیمت جواہرات بھی ہونے تھے۔ تصور میں تو یہ بڑی Adventurous اور دلچسپ مہم دکھائی دیتی تھی لیکن عملی طور پر تقریباً ناممکن العمل تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد اگلے روز میں پھر راجہ تری دیو کے پاس گیا اور اسے کہا کہ وہ اپنے بڑے بیٹے کے لیے ایک اور فرمان لکھے جس میں تمہاری عنقریب واپسی اور دوبارہ سرداری سنبھالنے اور

بنگلہ دیشی حکومت سے برسرپیکار رہنے کے علاوہ تمہارے یورپین Mercenaries (کرائے کے سپاہیوں) کے حصول کی کوشش کا احوال درج ہو۔ رانی اور چھوٹے بیٹے کو پاکستان بلانے کی وجہ اور آئندہ جنگ میں ان کی حفاظت اور قبیلے کے لوگوں کو بھی اس جنگ کے لیے پوری طرح تیار کرنے کا لکھے۔ میں نے راجہ کو کہا کہ میں یہ نیا فرمان تمہارے بڑے بیٹے کو پہلے دوں گا اور واپسی کے وقت اسے کہوں گا کہ رانی صاحبہ اور چھوٹے بھائی کی حفاظت کے لیے اپنے چند چاک و چوبند جوان اور ایک معتبر شخص ہمارے ہمراہ بھیجے جو برما کی سرحد تک ہمارے ساتھ رہیں۔ ان کے واپس جاتے وقت میں معتبر آدمی کو تمہارا اصلی فرمان دوں گا۔ جب تک وہ فرمان تمہارے بڑے بیٹے کو ملے گا، ہم ان کی پہنچ سے بہت دور نکل چکے ہوں گے۔

راجہ کو میری بات سمجھ آگئی اور اس نے ایک نیا فرمان لکھ کر مجھے دیا۔ میں نے دونوں فرمانوں کے لفافوں پر اپنے نشان لگائے تاکہ انہیں دیتے وقت غلطی کا امکان نہ رہے۔ راجہ سے میری بے تکلفی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جب تم یہاں ایک فرانسیسی عورت سے محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہو تو پھر رانی کو یہاں بلانے کی وجہ یقیناً صرف یہ ہوگی کہ رانی کے بغیر جواہرات تم تک پہنچ نہیں سکتے۔ بجائے جھینپنے کے راجہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا، "میں تمہاری ذہنی رسائی کی داد دیتا ہوں۔ مجھے واقعی صرف جواہرات کی ضرورت ہے۔ رانی اور بیٹے کو میں انگلینڈ بھجوا دوں گا تاکہ میرا بیٹا مغربی تعلیم حاصل کرسکے۔ جہاں تک فرانسیسی عورت کا تعلق ہے تو تم نے اسے آج شاید پہلی بار ہی دیکھا ہوگا۔ تمہارے یہاں آنے سے چند لمحے پہلے ہی وہ میرے کمرے سے نکلی تھی۔ نجانے ایسی کتنی عورتیں یہاں اور اسلام آباد میں میرے پاس آتی ہیں۔ تمہیں یہ بھی بتادوں کہ ان عورتوں میں بیشتر پاکستانی اور مسلمان ہوتی ہیں۔" راجہ کی یہ بات سن کر مجھے طیش تو بہت آیا لیکن میں خاموش رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راجہ کسی عورت کو بلانے اس کے گھر نہیں جاتا تھا۔ اپنی اغراض اور معاشرے کے ناسور کا شکار یہ عورتیں خود راجہ کے پاس آتی تھیں۔ اس میں راجہ کا کوئی قصور نہ تھا۔ جب اپنی مرغی ہی اچھی نہ ہو تو اس کے ہمسایوں کے گھر انڈے دینے پر ہمسائیوں سے جھگڑا کیوں اور یہاں تو بات چند کی نہیں بلکہ آدے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔

اگلا دن میں نے سفر کی تیاری اور اپنے پلان کو مزید ٹھیک ٹھاک کرنے میں گزارا۔ مجھے بار بار ایک ہی خیال ستارہا تھا کہ اگر دہلی سے لڑکے کسی بھی وجہ سے مجھ تک نہ پہنچ سکے تو پھر میں کیا کروں گا؟ پاکستان سے تو میں بالکل اکیلا جارہا تھا۔ اس مشن میں جن کی شمولیت ناگزیر تھی، ان کی آمد کی ابھی تک صرف امید یا زیادہ سے زیادہ میری خوش فہمی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر دہلی کے لڑکے مجھ تک پہنچ نہ سکے تو مجھے ان کے متبادل کہاں سے ملیں گے؟ بنکاک تک میرا سفر پاسپورٹ پر اور قانون کے دائرے میں تھا۔ اس سے آگے رانگا ماٹی تک اور پھر بنکاک تک واپسی غیر قانونی تھی اور واپسی پر

رانی اور لڑکے نے بھی ہمراہ ہونا تھا۔ مجھے بنکاک یا یوں کہہ لیجیے کہ تھائی لینڈ سے گائیڈ بھی لینے تھے، اسلحہ بھی خریدنا تھا اور اگر دہلی سے لڑکے نہ آسکے تو تھائی لینڈ سے ہی ان کے متبادل تلاش کرنے تھے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ تھائی لینڈ میرا بیس کیمپ تھا جہاں سے پوری تیاری کے بعد ہی مجھے آگے بڑھنا تھا۔ راستے میں مجھے کسی مدد یا کمک کی توقع نہیں رکھنی چاہیے تھی۔

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ اچانک مجھے اپنے سابقہ محکمے کی نگرانی کا خیال آیا۔ میرے اچانک "گم" ہوجانے سے وہ میرے متعلق خطرناک حد تک شک و شبے میں مبتلا ہوسکتے تھے۔ کھٹمنڈو سے میری پاکستان آمد کے بعد ایک سال تک تو مجھ پر پاسپورٹ بنوانے اور ملک سے باہر جانے کی پابندی تھی اور میں غلط نام سے پاسپورٹ بنوا کر ملک سے باہر جارہا تھا۔ بھارت میں میرے خطرناک مشنز کو کامیابی سے پورا کرنے اور خصوصاً DMI ہیڈکوارٹر کی حراست سے فرار ہونے میں کامیابی کو اگر ایک طرف سراہا گیا تھا تو دوسری طرف اس امکان کو بھی یکسر مسترد نہیں کیا گیا تھا کہ میں خدانخواستہ DMI کے ہاتھوں بک کر اور ڈبل ایجنٹ بن کر واپس نہ لوٹا ہوں۔ میری ہر حرکت کی نگرانی کی جاتی تھی۔ میرے بغیر اطلاع اور بغیر کسی معقول وجہ کے یکایک غائب ہونے کو کئی مفہوم پہنائے جاسکتے تھے اور میری واپسی پر مجھے بھیانک انجام سے دوچار بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس سوچ سے میرے جسم پر کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔ میں سیدھا راجہ کے پاس گیا اور اسے اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ میری باتیں سن کر وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ ہم دونوں نے واقعی اس بہت اہم بات کو بالکل نظرانداز کردیا تھا۔ ہم یہ سارا مشن ہی ختم (Wind up) کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ آخری کوشش کے طور پر اس نے اپنے PA کو وزیراعظم صاحب سے Top Priority مسئلہ کہہ کر فون ملانے کو کہا۔ خوش قسمتی سے آدھ گھنٹے میں ہی بھٹو صاحب سے اس کا رابطہ ہوگیا۔ راجہ نے چونکہ پہلے بھی اس مسئلے پر ان سے بات کی ہوئی تھی اس لیے اسے ساری بات شروع سے سمجھانے کی ضرورت نہ پڑی۔ دونوں بے تکلف دوست بھی تھے اور ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے بھی۔ میں تو ٹیلی فونک گفتگو میں صرف راجہ کی بات سن سکتا تھا، دوسری طرف سے کیا کہا گیا مجھے اس کا کچھ علم نہ تھا۔ جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو راجہ کے چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔ اس نے کہا، "فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہوجاتا ہے" اور یقین جانیے ایک گھنٹے کے اندر ہی راجہ کے PA نے بتایا کہ میرے محکمے کے دو اعلیٰ افسران اسلام آباد کی ہدایت پر اس سے ملنے آئے ہیں۔ انہیں فوراً بلوا لیا گیا۔ ان دو افسران نے مختصراً میرے اور راجہ کے بیان لیے اور ایک پہلے سے ٹائپ شدہ کلیرنس سرٹیفکیٹ جس پر خالی جگہوں میں میرا اصل نام، نقلی نام اور پاسپورٹ نمبر اور میرا محکمانہ کوڈ نمبر انھوں نے خود لکھ کر مجھے دے دیا۔

سرٹیفکیٹ میں لکھا ہوا تھا کہ اہم سرکاری فرائض کی انجام دہی کے لیے، محکمے کے سربراہ کی ہدایت پر مجھے بیرون ملک جانے کی اجازت دی گئی ہے۔ واپسی پر میں اپنے سابقہ محکمے میں رپورٹ

کروں۔ یہ سرٹیفکیٹ دے کر وہ چلے گئے۔ میری بہت بڑی مشکل حل ہوچکی تھی۔ ہوٹل میٹروپول آ کر میں نے اس سرٹیفکیٹ کی چار کاپیاں بنوائیں۔ ایک اپنے گھر، ایک پشاور میں ہوٹل کے مالک بابر خان کو، ایک کاپی امانتاً مسٹر مینووالا کو دی اور ایک اپنے پاس رکھی جسے جہاز میں پرواز کے دوران میں نے تلف کر دینا تھا۔

اگلے روز بعد دوپہر تین بجے میں میٹروپول سے چیک آؤٹ ہو کر اپنا سوٹ کیس لیے، راجہ کے پاس قصر ناز چلا آیا۔ راجہ بھی بالکل تیار تھا۔ اس کے سیکریٹری کے ہمراہ ہم ایئرپورٹ کو روانہ ہوئے۔ راجہ صاحب کے ہمراہ ہونے کی وجہ سے ہم VIP لاؤنج میں گئے وہیں سے میرا سوٹ کیس لے لیا گیا اور مجھے بورڈنگ کارڈ دیا گیا۔ (British Overseas Airways Corporation) BOAC ان دنوں دنیا بھر کی ایئرلائنز میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی تھی۔ بعد میں دنیا بھر کی یہ سب سے بڑی ہوائی کمپنی ختم کر دی گئی۔ جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا تو راجہ نے گرم جوشی سے مجھے الوداع کہا اور ہاتھ ملاتے ہوئے ایک موٹا لفافہ مجھے تھما دیا اور کہا، ”یہ ہماری عادت ہے کہ دوست کو رخصت کرتے وقت کوئی تحفہ ضرور دیتے ہیں۔ رانگاماٹی میں بھی تم نے دیکھا تھا کہ ہم دوستوں اور مہمانوں کو کبھی خالی ہاتھ وداع نہیں کرتے تھے۔ اس لفافے میں تیس ہزار ڈالر ہیں اور یہ ہماری طرف سے تحفہ ہے۔“ میں نے لفافہ لے کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ ایئرپورٹ کی گاڑی مجھ اکیلے کو جہاز تک لے گئی۔ میرا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا۔ VIPs اور فرسٹ کلاس کے مسافروں کو جہاز تک چند قدم پیدل چلنا بھی دوبھر ہوتا ہے اور یہ مصنوعی اور پیسے سے خریدی گئی عزت پا کر وہ پھولے نہیں سماتے۔

جہاز رن وے پر دوڑتے ہوئے اپنی منزل کی طرف محو پرواز ہوا۔ اس کی منزل تو بنکاک تھی۔ لیکن میرا اصل منزل کی طرف سفر بنکاک سے شروع ہوتا تھا۔ میں نے آئندہ پیش آنے والی دشواریوں کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ میری گزشتہ زندگی میں خدائے ذوالجلال والاکرام میری نہ حل ہونے والی الجھنوں کو عین وقت اور غیر متوقع طور پر حل کرتا رہا اور اسی وجہ سے مجھے اس کی ذات، اس کے قادر مطلق اور مسبب الاسباب ہونے پر یقین کامل تھا اور ہے۔ یاد رہے اب بھی میں نے اسی سے مدد مانگی کیونکہ صرف وہی مدد کرنے والا ہے۔ اس سوچ نے مجھے بڑا سکون دیا اور میں گہری نیند سے اس وقت چونکا جب ایئر ہوسٹس نے اناؤنسمنٹ کی کہ جہاز بنکاک ایئرپورٹ پر اترنے والا ہے۔ سگریٹ بجھا دیجیے اور سیفٹی بیلٹ باندھ لیں۔ جہاز میں مغرب سے مشرق کی طرف سفر کرتے ہوئے جسمانی تھکن اور دماغی تناؤ بہت بڑھ جاتا ہے۔ ساڑھے سات گھنٹے کے مسلسل سفر نے مجھے بھی ایسی ہی حالت سے دوچار کر دیا تھا۔ ایئرپورٹ پر ہی تین ماہ کا وزٹ ویزا میرے پاسپورٹ پر لگا دیا گیا۔ ایئرپورٹ سے ہی میں نے پانچ سو ڈالر کے بھات (تھائی کرنسی) لیے اور ٹیکسی لے کر رائل پلازا ہوٹل چلا گیا۔ تھائی وقت کے مطابق رات کے تین بج رہے تھے جب ہم ایئرپورٹ پہنچے۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے غسل کیا اور سفر کی

تھکان دور کرنے کے لیے اسپرو کی گولیاں کھائیں۔ صبح تو ہو ہی چکی تھی اور آج سے ہی میں نے اپنے مشن کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز کرنا تھا۔

میں صبح نو بجے ہی بنکاک کے مرکزی ٹیلی فون اور ٹیلیگراف آفس پہنچ گیا اور دہلی میں عارف کے گھر کے نمبر پر ارجنٹ کال بک کی۔ چند منٹوں میں ہی کال مل گئی۔ لائن پر عارف تھا۔ خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد جب میں نے اسے بتایا کہ میں بنکاک سے بول رہا ہوں تو وہ بہت حیران ہوا اور جب میں نے اسے یہ بتایا کہ مجھے ایک اور مہم درپیش ہے جس کے لیے مجھے بشیر کے گیرج کے لڑکوں اور لازمی طور پر قیصر کی ضرورت ہے تو وہ کہنے لگا کہ خدا کے لیے اب بس بھی کرو۔ کیوں اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہو؟ کیا بھارت اور کھٹمنڈو میں پیش آنے والے حالات سے تمہارا جی نہیں بھرا؟ میں نے جواب دیا کہ میں تو اپنی باقی زندگی آرام اور سکون سے گزارنا چاہتا تھا لیکن ایک دیرینہ غیر مسلم دوست نے جس نے ماضی میں مجھ پر ایک ایسا احسان کیا تھا جسے میں کبھی فراموش نہ کر سکا، اپنے اسی سلوک اور دوستی کے زعم میں مجھ سے مدد مانگی تو میں انکار نہ کر سکا۔ عارف نے بتایا کہ نذیر، قیصر اور گیرج کے سب لڑکے بخیریت ہیں۔ میرے محکمے کے ساتھیوں سے بھی کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی ہے۔ قیصر نے گیرج اور گھر میں ٹیلی فون لگوا لیا ہے۔ عارف نے مجھے اس کا نمبر دیا۔ رسمی کلمات اور ایک دوسرے کے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے کے بعد میں نے فون بند کر دیا اور قیصر کو فون کیا۔ قیصر نے خود ٹیلی فون اٹھایا۔ اس سے بھی رسمی کلمات کے بعد جب میں نے اپنے مطلب کی بات تو وہ بھی حیران رہ گیا۔ کہنے لگا، ”کیا آپ گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں یا لوہے کے؟“ میں نے اسے اپنی مجبوری بتائی اور پوچھا کہ کیا اس مہم میں وہ اور کم از کم چھ ساتھی لڑکے میرا ساتھ دینے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ تو قیصر نے جواب دیا، ”بھائی جان! آپ کے لیے تو ہم تحت الثریٰ تک جانے کو بھی تیار ہیں۔ آپ حکم کریں۔“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا، ”ابھی میں خود بھی اس مہم کے واضح خدوخال ترتیب نہیں دے سکا ہوں۔ تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ ’’پوری تیاری‘‘ کر لو۔ آج سے ٹھیک دسویں روز میں اسی وقت تمہیں فون کروں گا۔ میرا فون ملنے پر تم دہلی سے چل پڑنا اور بنکاک سے میں روانہ ہو جاؤں گا اور ہماری ملاقات انشاء اللہ بھارت اور برما کے بھارتی سرحدی قصبے کالادان (Kaladan) میں ہوگی۔ اپنے ہمراہ لانگ بوٹ ضرور لانا۔ اس مہم میں ہمیں زہریلے سانپوں، دلدلی جونکوں، زہریلے مچھروں اور مکھیوں کے علاوہ وحشی قبائل سے بھی واسطہ پڑے گا۔ اس لیے ’’پوری اور مکمل‘‘ تیاری سے آنا۔ کالادان پہنچنے کے لیے نقشوں سے مدد لینا۔ میں کل اسی وقت دوبارہ فون کروں گا۔ اگر کسی بھی وجہ سے آپ لوگ نہ آ سکتے ہوں تو مجھے کل ہی بتا دینا۔“ قیصر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا، ”بھائی جان! اگر آپ نے صرف ہمارے اس مہم میں شریک ہونے یا نہ ہونے کے متعلق پوچھنے کے لیے فون کرنا ہے تو پھر فون نہ کیجیے گا، قیصر نے آپ سے جو وعدہ کیا ہے، اسے بشرط زندگی ضرور نبھائے گا اور آپ کی

ہدایت کے مطابق ہم ساتوں آپ کی طرف سے گرین سگنل ملنے پر فوراً روانہ ہوجائیں گے۔" میں نے قیصر کو مزید کچھ ہدایات دینے کے لیے اگلے روز فون کرنے کا کہا اور ہوٹل واپس چلا آیا۔

عارف اور قیصر نے مجھ سے دوبارہ خطروں میں کودنے کا جو شکوہ کیا تھا، وہ بالکل بجا تھا۔ لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں اصولوں کا قیدی تھا اور ہوں۔ کسی کے احسان، خلوص اور محبت بھرے احساس کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا چاہے وہ راجہ تری دیو کے چٹا گانگ میں میرے دشمن بنگالی ہندو انسپکٹر کو واصل جہنم کرنے کی صورت میں ہو یا میرے پسندیدہ خشک فروٹ کاجو سے بھرا ٹن مجھے دینے کی صورت میں...... راجہ نے اپنی امید اور مجھ پر بھروسے کی وجہ سے ہی مجھ سے مدد مانگی تھی، جس سے میں انکار نہ کرسکا۔ دوستی میں نہ تو مذہب حائل ہوتا ہے، نہ فاصلے اور وقت اور نہ ہی دوستی میں دوست کی ظاہری برائی اور کمزوری دیکھی جاتی ہے۔ راجہ کی ساری خامیوں اور برائیوں کو جانتے ہوئے بھی وہ میرا بہترین دوست تھا۔ دوستی کی آزمائش میں بھی پہلا قدم اسی نے رکھا تھا۔ اب میری آزمائش کا وقت تھا اور میں اس آزمائش سے قدم پیچھے کیسے ہٹا سکتا تھا؟ ممکن ہے بعض قارئین کو میری اس رائے سے اختلاف ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مذہب اور وطن کو گزند نہ پہنچانے والے سے دوستی کی کوئی حد نہیں اور ایسی دوستی عزیز و اقارب کی سچی جھوٹی محبتوں سے بہت بلند اور ارفع ہوتی ہے۔

ہوٹل رائل پلازہ سری وانگ روڈ پر پولیس اسٹیشن کے بالکل قریب واقع تھا۔ اب اس کا نام شاید بدل گیا ہوں۔ اس ہوٹل کی مالک ایک جوان اور حسین سکھ خاتون تھی۔ اس ہوٹل میں زیادہ تر پاکستانی اور بھارتی قیام کرتے تھے جو اکثر شراب کے نشے میں آپس میں یا ایک دوسرے سے لڑتے اور مارپیٹ کرتے رہتے۔ ایسے ہنگاموں پر قابو پانے کے لیے سردارنی نے جس کا نام رانی تھا، آٹھ دس تھائی غنڈے پال رکھے تھے۔ میں نے ان غنڈوں سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ میرا گزشتہ تجربہ مجھے بتاتا تھا کہ میری ضرورت کے افراد شرفا میں نہیں بلکہ Under Ground World (زیرزمین دنیا) سے ہی مل سکتے تھے اور ان تک رسائی بھی غنڈوں کے ذریعے ہی ہوسکتی تھی۔ میں نے ان غنڈوں میں سے ایک کو ایک سو بھات دیئے اور کہا کہ مجھے کسی ایسی جگہ لے چلے جہاں سب کچھ ملتا ہو۔ بنکاک میں "سب کچھ" تو سرعام ملتا تھا۔ ویت نام جنگ کے دوران امریکی فوجیوں کے لیے تھائی لینڈ اور خصوصی طور پر بنکاک ان کی مختصر تعطیلات کا مرکز بن چکا تھا۔ سرکاری طور پر بدھ مت کا پیروکاروں کا یہ ملک جس کے باسی جو کبھی اپنی قناعت پسندی کے لیے مشہور تھے، امریکی ڈالروں کی چمک اور فراوانی سے ایک بہت بڑے قحبہ خانے میں بدل چکا تھا۔ دنیا کی کوئی ایسی برائی نہ تھی جو یہاں موجود نہ ہو۔ یہاں کے مختلف ہوٹل دنیا کے ہر ملک کے عیاش سیاحوں کے لیے ان کے اپنے ملک اور رسم و رواج اور تمدن کے مطابق سجے سجائے اور ان کی مخصوص ضروریات پوری کرنے میں شہرت رکھتے تھے۔ مثلاً پاکستانی سفارت خانے کے بالمقابل Grace Hotel (گریس ہوٹل) اپنے عرب گاہکوں کی ضروریات اور

خواہشات پوری کرنے میں مشہور تھا۔ اس ہوٹل کے کمرے، لابیز (Lobbies) اور ریسٹورنٹ فرشی محفلوں کے لیے سجائے گئے تھے۔ عربوں کا پسندیدہ شیشہ (حقہ) اس ہوٹل میں ہر جگہ مہیا تھا اور عرب مہمان زبان نافہمی کے باعث فاحشہ عورتوں سے اپنی تسبیح کے دانوں کی گنتی سے بھاؤ تاؤ کرتے تھے۔ اسی طرح ایمبیسیڈر ہوٹل پاکستانی اور بھارتی افراد کی خدمت کے لیے مشہور تھا۔ اورینٹل (Oriental) اور رائل آرچڈ شیرٹن (Royal Orchid Sheraton) اپنے مغربی گاہکوں کی خواہشات کی تکمیل کے لیے چشم براہ رہتا تھا۔ اسی طرح بیسیوں ریسٹورنٹس بھی یہی دھندہ کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں جب میں نے غنڈے سے ایسی جگہ لے جانے کا مطالبہ کیا جہاں "سب کچھ" ملتا ہو تو وہ سمجھ گیا کہ مجھے حشیش یا LSD کی ضرورت تھی جن کی خرید و فروخت قانونی طور پر ممنوع تھی اور صرف انڈرگراؤنڈ ورلڈ میں یہ دونوں تھوک میں مہیا تھیں۔ ورنہ سڑکوں اور ہوٹلوں میں صرف چرس بھرے سگریٹ اور LSD کی بہت کم مقدار ملتی تھی۔

غنڈہ مجھے رات نو بجے ٹیکسی میں تقریباً دو میل دور After 7 Club کے پچھواڑے گلیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک مکان میں لے گیا جس کے دروازے بند تھے۔ گھنٹی بجنے کے ساتھ ہی کسی نے دروازے میں بنی چوکور کھڑکی کھولی۔ غنڈے نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ اندر والے نے دروازہ کھولا۔ ہم اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ دو تھائیوں نے میری جامہ تلاشی لی اور مطمئن ہوکر مجھے اپنے پیچھے آنے کا کہا اور غنڈے کو واپس بھیج دیا۔ ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے تو میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑے وہ آگے بڑھے غالباً دو مزید کمرے گزرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ہم کھلی فضا میں آگئے ہیں۔ وہاں ایک کار میں مجھے بٹھا کر وہ دونوں میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ گاڑی اندازاً آدھ گھنٹے چلنے کے بعد رکی۔ گاڑی سے اتار کر دونوں تھائی مجھے لے کر ایک گھر میں داخل ہوئے اور کمرے کا دروازہ بند کرکے میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ یہ کمرہ ڈرائنگ روم تھا اور تین آدمی صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے جو غالباً ان کا چیف تھا، دونوں تھائیوں کو باہر انتظار کرنے کا اشارہ کیا اور مجھ سے نہایت نرم لہجے میں اس طرح لائے جانے کی معذرت چاہی۔ وہ خاصی اچھی انگریزی بول رہا تھا۔ اس نے کہا کہ سکیورٹی کی وجہ سے مجھے یہ تکلیف سہنی پڑی جس کے لیے وہ نادم ہے۔ اس نے پوچھا کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ دو درجن ہینڈ گرنیڈ، ایک امریکن پسٹل کم از کم 32 بور کا تین فالتو میگزین اور دو سو گولیاں چاہییں۔ اس تھائی نے مسکرا کر اپنے ایک ساتھی کو کہا "Your Department" (تمہارا شعبہ)۔ دوسرا تھائی مجھے لے کر ایک اور کمرے میں چلا آیا۔ یہاں دیواروں پر مختلف اقسام کے ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ اس نے 32 بور کے دو پسٹل اتار کر مجھے دکھائے۔ دونوں امریکی ساختہ تھے۔ ایک کی میگزین 7 گولیوں والی اور دوسرے کی 11 گولیوں والی تھی۔ مختلف ٹائمنگ کے تین ہینڈ گرنیڈ بھی مجھے دکھائے اور ساتھ ہی کہا، "ہم سودے بازی

نہیں کرتے۔ جو دام بتائیں گے، وہ منظور ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ آپ واپس جاسکتے ہیں۔" میں نے دام پوچھے تو اس نے نہایت مناسب قیمت بتائی۔ میں نے 6 سیکنڈ میں پھٹنے والے گرنیڈ اور گیارہ گولیوں والا پسٹل پسند کیا۔ اس کے کہنے کے مطابق میں نے آدھی رقم اسے وہیں ادا کر دی اور بقیہ آدھی اگلے روز سامان کی ڈیلیوری پر ہوٹل میں دینی تھی۔ مجھے ایک صحیح گاہک سمجھتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ مجھے LMG (لائیٹ مشین گن) SMG (سمال مشین گن) بزرکا، RR (Recoilless Rifle) اور امریکی ساختہ تمام اقسام کے آٹومیٹک ہتھیار حتیٰ کہ اسٹنگر میزائل اور ان سب ہتھیاروں کا ایمونیشن بھی مہیا کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی مقدار میں چاہوں وہ مجھے حشیش، LSD اور گولڈن ٹرائی اینگل کی بنی ہوئی ہیروئن بھی سپلائی کرسکتے ہیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ واپسی پر پہلے کی طرح مجھے Blind Fold کرکے پہلے گھر کے قریب ہی گاڑی سے اتار دیا گیا۔ دوسرے روز رات کے 8 بجے مقررہ وقت پر سارا سامان ہوٹل میں میرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے بقیہ آدھی رقم ادا کی تو سامان لانے والوں نے ایک کاغذ پر ہاتھ سے لکھا ہوا ٹیلی فون نمبر مجھے دیا کہ جب بھی ضرورت ہو تو اس فون پر مسٹر تھان سے ڈائریکٹ رابطہ کرسکتا ہوں۔ میں قبل ازیں غازی میں عرض کرچکا ہوں کہ سمگلر اور زیر زمین کام کرنے والے لکھنے لکھانے کا تردد نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک زبانی کیا ہوا وعدہ ہی حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے بمبئی میں اور اب بنکاک میں بھی مجھے اس کا تجربہ ہوا۔ کاش ہمارے کاروباری حضرات ان زیر زمین کام کرنے والوں سے ہی سبق سیکھیں اور اپنے قول اور وعدے کا خیال رکھیں۔ اگلے روز میں نے بازار سے ایسی ڈبل جیکٹ خریدی جس میں یہ سب اسلحہ اچھی طرح سما سکتا تھا۔ جیکٹ خریدتے وقت دکاندار نے یکایک مجھے نظر انداز کیا اور دکان کے باہر آکر ہاتھ جوڑ اور سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ سڑک پر سات آٹھ گاڑیوں کا ایک قافلہ جا رہا تھا۔ سبھی دکاندار اور سڑک پر چلنے والے تھائی مرد و زن اسی طرح ہاتھ جوڑے اور سر جھکائے کھڑے تھے۔ گاڑیوں کا قافلہ گزرنے کے بعد جب دکاندار اندر آیا تو میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ قافلہ بھائی خان کا تھا جو تھائی لینڈ کا بے تاج بادشاہ ہے اور اپنی نوجوانی میں پاکستان (تقسیم ہند سے پہلے پاکستانی علاقے) سے یہاں آیا تھا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ دکاندار نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے اس کی داستان سنائی تو میں حیران رہ گیا اور فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں بھائی خان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ ایسی عجوبہ روزگار شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔

دوسرا باب

میری ضرورت کا اسلحہ مجھے مل چکا تھا۔ راستے میں حائل ہونے والی جھاڑیوں اور گھنے جنگلات میں رستہ بنانے اور شاخوں کو کاٹنے کے لیے بڑے چاقو اور خنجر بھی مجھے بآسانی مل گئے۔ ملیریا سے بچنے کے لیے کونین، سانپوں کے زہر سے بچنے کے لیے ادویات اور دو فرسٹ ایڈ بکس بھی میں نے خرید لیے۔ دوران سفر پہننے کے لیے سفاری سوٹ اور زین کی برجیس بھی میں نے ارجنٹ آرڈر پر سلوالیں۔ سولا ہیٹ بھی خرید لیا۔ غرضیکہ سفر کے لیے میری تیاری مکمل تھی۔ لیکن ہمراہ جانے والے گائیڈ اور سامان اٹھانے والے کم از کم دو مزدوروں کی مجھے لازماً ضرورت تھی۔ میں نے جس سے بھی پتہ کیا، جن گائیڈز سے بھی بات کی وہ صرف تھائی لینڈ کی آخری حد تک تو جانے کو راضی تھے لیکن برما کی سرحد میں وہ ایک قدم بھی رکھنے کو تیار نہ تھے اور مجھے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو سارا برما عبور کرکے نہ صرف بھارت کے سرحدی قصبے کالادان (Kaladan) تک میرے ہمراہ جائیں بلکہ وہاں سے پھر برما میں داخل ہو کر کشتی میں بنگلہ دیش ساحلی قصبے کاکس بازار یا برما سے خشکی کے راستے بنگلہ دیش میں داخل ہو کر رانگا ماٹی تک ساتھ دیں اور پھر انہی راستوں سے واپس لوٹتے ہوئے تھائی لینڈ میں داخل ہوں۔ اس بارے میں ہوٹل کی مالک رانی سے بات کی تو اس نے بھی کہا کہ کوئی تھائی اس سفر میں تمہارا ساتھ نہیں دے گا اور اگر کوئی تیار ہو بھی گیا تو راستے میں ہی تمہیں لوٹ کر قتل کرکے بھاگ آئے گا۔ میں ہر طرف سے ناامید ہوچکا تھا کہ اچانک مجھے بھائی خان کا خیال آیا۔ میں نے بھائی خان کے متعلق جب معلومات اکٹھی کیں وہ ایسی حیرت انگیز تھیں کہ میں اس کی شخصیت کے قد کاٹھ کے مقابلے میں خود کو محض ایک بونا تصور کرنے لگا۔ بھائی خان اٹک کے قریب مانسر کیمپ کی پہاڑیوں میں واقع ایک گاؤں کا ان پڑھ شخص تھا۔ قیام پاکستان سے چند برس قبل وہ غربت سے تنگ آکر کراچی سے کسی مال بردار جہاز

میں ملازم ہوا اور جب یہ جہاز بنکاک پورٹ پر لنگر انداز ہوا تو بھائی خان جہاز سے چھلانگ لگا کر تیرتا ہوا ساحل تک پہنچا اور غائب ہوگیا۔ جلد ہی اسے سمگلروں کے ایک گروہ میں اس کی بے خوفی اور نڈر پن کی وجہ سے شامل کرلیا گیا۔ سمگلنگ کے اسرار و رموز جاننے کے بعد اس نے خود اپنا ایک گروہ تشکیل دیا اور بیس سال کے عرصے میں اپنے علاقے کے تقریباً پانچ ہزار بے روزگار جوانوں کو غیر قانونی طور پر تھائی لینڈ بلوا لیا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر سارا بری (Sara Buri) میں تھا۔ ہر نئے آنے والے کو وہ گوریلا جنگ اور اسلحے چلانے کی تربیت دیتا۔ غرضیکہ اسمگلنگ کے ساتھ ساتھ اس کے پاس گوریلا جنگ کے لیے پانچ ہزار تربیت یافتہ جوان بھی تیار ہوگئے۔ بھائی خان کی ان سرگرمیوں کی اطلاع ملنے پر تھائی حکومت نے پہلے پولیس بھیجی جو درجنوں لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئی۔ پھر فوجی دستے بھیجے گئے لیکن اس پہاڑی علاقے میں وہ بھی کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکے۔ ہوائی جہازوں کے پھینکے ہوئے بم بھی بیکار گئے۔ بالآخر حکومت نے مجبور ہوکر بھائی خان سے مذاکرات کی ٹھانی۔ یہ واقعہ پچاس کی دہائی کا ہے۔ تھائی لینڈ میں بادشاہت ہے۔ شاہی محل میں بادشاہ، وزیراعظم اور افواج کے سربراہوں کے ساتھ بھائی خان کے مذاکرات ہوئے۔ حکومت اپنی فوجی ناکامی سے مایوس ہوچکی تھی، لہٰذا بھائی خان سے اس کے مطالبات پوچھے گئے۔ حکومت کے خیال میں تھا کہ ایک غیر ملکی مسلمان زر و جواہر اور اسی قسم کی مراعات چاہے گا لیکن جب بھائی خان نے اپنے مطالبات پیش کیے تو سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ بھائی خان کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ پورے تھائی لینڈ میں کسی چوپائے مثلاً بھیڑ بکری گائے بھینس وغیرہ کا کوئی غیر مسلم جھٹکا نہیں کرے گا اور صرف مسلمان ہی انہیں ذبح کریں گے۔ اس کا دوسرا مطالبہ تھا کہ مسلمان بچیوں کو اسکول اور کالج میں اسکرٹ پہننے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور وہ پاجامہ یا پتلون پہنیں گی اور سر کو دوپٹے یا کم از کم اسکارف سے ڈھانپیں گی۔ اس کا تیسرا مطالبہ تھا کہ کوئی بھی مسلمان عورت بدکاری نہیں کرے گی اور جو مسلمان عورت فحاشی کرتے پکڑی گئی تو نہ صرف اسے بلکہ اس کے والدین یا سرپرستوں کو لمبی قید کی سزا دی جائے گی۔

بھائی خان کے یہ تینوں مطالبے فوری منظور کرلیے گئے۔ سارے تھائی لینڈ میں اب تک حالت یہ ہے کہ آپ بلاجھجک اور شبے کے کسی بھی ہوٹل، ریسٹورنٹ یا قصاب سے چوپائے کا گوشت اس یقین کے ساتھ لے سکتے ہیں کہ یہ مسلمان کے ہاتھ سے ذبح ہوا ہے۔ سارے تھائی لینڈ کے سکولوں اور کالجوں میں مسلمان بچیاں اپنی جینز، پتلون اور اسکارف سے مسلمان ہونے کی شناخت بن چکی ہیں۔ تمام بدقماش اور بدکار عورتیں چاہے سڑکوں پر ہوں یا قحبہ خانوں میں، اپنے غیر مسلم ہونے کے ثبوت کے لیے مہاتما بدھ کی مورتی کا پینڈل لازماً پہنتی ہیں اور اگر کوئی مسلمان عورت اس قبیح پیشے میں پکڑی جائے تو اسے اور اس کے شوہر یا سرپرست کو بھی برسوں جیل کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اپنے انہی مطالبات کے عوض بھائی خان نے سمگلنگ چھوڑ دی اور حکومت نے اسے اور اس کے ساتھیوں کے

لیے بنکاک کے گرد و نواح سے لے کر چیانگ رائی، چنگ ماہی تک اور دوسری طرف ملائیشیا کی سرحد کے ساتھ صوبہ ریحان (ہرجائی) تک بھینسوں کے فارم بنانے اور حلال گوشت سپلائی کرنے کے لیے وسیع زمینیں الاٹ کیں۔ بھائی خان کی عزت و توقیر کی یہ حالت تھی کہ وہ بادشاہ اور وزیراعظم سے ملاقات کا وقت لیے بغیر ملتا تھا۔ اسی کے باعث سرکاری مذہب بدھ مت کے اس ملک میں مسلمانوں کی ایک الگ پہچان بن گئی اور لاکھوں غیر مسلم مسلمان ہوگئے۔ صوبہ ہرجائی میں تو 90 فیصد تک مسلمان ہیں۔ اسی عظیم اور بلند مرتبت شخصیت سے ملنے میں اگلے روز روانہ ہوگیا۔ اس کا گھر اور فارم بنکاک سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔

اس پچاس میل کے سفر کے دوران میرے ذہن میں بھائی خان سے ملاقات ہونے پر اس سے اپنی ضرورت بیان کرنے کے متعلق گفتگو شروع کرنے کے مختلف عنوانات آتے رہے لیکن میں کسی سے بھی مطمئن نہ ہوسکا۔ اس کی شخصیت کا مجھ پر ایسا رعب پڑچکا تھا کہ ملاقات سے پہلے ہی میں خاصا گھبرا چکا تھا۔ ڈرائیور نے اس کے گھر کے سامنے ٹیکسی روکی۔ میں نے مین گیٹ کی گھنٹی بجائی تو دو پٹھان پہریداروں نے دروازہ کھولا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور بھائی خان سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے آپس میں کچھ سرگوشی کی اور ایک پہریدار مجھے لے کر گھر کی طرف چل پڑا اور مجھے بیرونی ڈرائنگ روم میں لے جاکر بٹھادیا۔ چند منٹوں بعد قہوہ آ گیا۔ پہریدار نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں پہلے بھی بڑے خان سے مل چکا ہوں یا یہ پہلی ملاقات ہے (بھائی خان کے ملازمین اور اولاد اسے بڑا خان کہتے ہیں) میرے یہ بتانے پر کہ میں پہلی بار ملنے آیا ہوں، پہریدار نے پھر پوچھا کہ کیا اوور سٹے (Over Stay) کا مسئلہ ہے یا پیسے وغیرہ ختم ہوگئے ہیں۔ اس کے سوالوں سے میں کچھ چڑ سا گیا اور اس سے پوچھا کہ کیا بھائی خان سے ملنے کے لیے مجھے تمہارے تمام سوالوں کا جواب دینا ضروری ہے؟ پہریدار ہنسنے لگا بولا، ”ضروری ہرگز نہیں ہے لیکن بڑے خان کا حکم ہے کہ جو بھی نیا ملاقاتی آئے۔ اس کی ضرورت پوچھ کر مجھے بتادو تاکہ میں اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے تیار ہوکر آؤں۔“ میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بھائی خان سے ملنے اور ان کی رہبری سے اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں۔ پہریدار اندر چلا گیا۔ غالباً وہ اندرونی ڈرائنگ روم تھا جہاں بھائی خان اپنے خاص ملاقاتیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پہریدار واپس لوٹ آیا اور مجھے اندرونی ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں بہت سے صوفے اور قالین بچھے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں آٹھ نو ملنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی میں اس کمرے کے دروازے میں کھڑا اندر کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ ایک لمبا تڑنگا اور جسیم شخص صوفے سے اٹھا اور ”پخیر راغلے“ کہہ کر میری طرف بڑھا۔ شاید اس نے مجھے پٹھان سمجھ کر پشتو میں خوش آمدید کہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں پاکستانی ہوں اور آپ کی اتنی تعریفیں سنی ہیں کہ بغیر دیکھے آپ کے کردار کی عظمت کا قائل ہوچکا ہوں۔ آپ کے پاس میرے آنے کی ایک اور وجہ میرا ایک

مشکل اور پیچیدہ کام ہے جس کے لیے آپ کی راہبری اور اگر ممکن ہو تو آپ کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ بھائی خان نے پوچھا، ''کیا علیحدگی میں بات کرنی ہے؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا تو بھائی خان نے کہا، ''ابھی بیٹھو میں مہمانوں سے فارغ ہو جاؤں تو پھر آرام سے بات کریں گے۔'' اس کے مہمانوں کے لیے اس کا یہ اشارہ ہی کافی تھا۔ پانچ منٹ میں وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔

مزید گرم قہوہ اور خشک پھل آ گئے۔ میں نے بھائی خان سے پوچھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تھائی گورنمنٹ نے آپ کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے اور آپ کو ہر قسم کی مراعات دینے کو تیار تھی پھر آپ نے اپنے لیے کچھ نہیں لیا۔ بھائی خان جس سے ہاتھ ملاتے وقت مجھے ایسے محسوس ہوا تھا جیسے لوہے کے بنے ہوئے کسی ہاتھ نے میرا ہاتھ جکڑ لیا ہو، نے اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھا، مسکرایا اور پھر قہقہے لگانے لگا۔ جب اس کے قہقہے تھمے تو اس نے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا، ''یہ تم سے کس نے کہا کہ میں نے اپنے لیے مراعات نہیں لیں۔ آج پورے تھائی لینڈ میں صرف اسلامی طرز پر ذبح گوشت ملتا ہے۔ کسی مسلمان لڑکی کو سکول کالج میں سکرٹ پہننے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ آج اس ملک میں کوئی مسلمان لڑکی کھلے بندوں عصمت فروشی نہیں کر سکتی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ مراعات میرے لیے نہیں ہیں؟ یاد رکھو کہ جب تک تمہاری سوچ، تمہارا مفاد اور تمہارا مذہب الگ الگ رہیں گے تم ایسی ہی سطحی باتیں سوچتے رہو گے۔'' آپ یقین جانیے مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ واقعی یہ میری بہت بڑی بھول تھی جو میں نے عظمت کے اس مینار کو اتنی پستی سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ چند لمحے میں اپنی خفت مٹاتا رہا۔ پھر آہستگی سے پوچھا کہ ملک کی باقاعدہ فوج کا مقابلہ کرنے اور مقابلے میں کامیابی حاصل کرنے کا سبب کیا تھا؟ بھائی خان پر پہلے والی کیفیت ہی طاری تھی۔ وہ اسی لہجے میں بولا، ''یقین کامل۔ رب العزت کی ذات پر یقین کامل اور اپنے مقصد کی سچائی پر یقین۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سامنے کر دیے اور بولا، ''یہ ہاتھ بھی بڑی عجیب شے ہیں۔ انہیں کسی کے سامنے پھیلا دو تو یہ بھکاری کے ہاتھ بن جاتے ہیں۔ انہی ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاؤ تو یہ ذات ذوالجلال والاکرام کے حضور اپنی بے بسی بیان کرنے اور اس سے مدد مانگنے والے دعائیہ ہاتھ ہوتے ہیں اور انہی ہاتھوں کو جب بند کر لو تو یہ گھونسہ بن جاتے ہیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ہمیشہ دوسری اور تیسری طرز کا کام لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک نے ناممکن کاموں کو بھی میرے لیے سہل کر دیا۔''

اس پرعزم شخصیت سے اس کی ذات کے متعلق مزید کچھ پوچھنے کی اب مجھ میں سکت نہ تھی۔ اسلام کا سارا فلسفہ اس نے صرف چند لفظوں میں بیان کر دیا تھا اور ایسی سادگی اور فصاحت کے ساتھ کہ مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں اس قد آور شخصیت کی عظمت کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا جس نے ایک غیر اسلامی ملک میں اسلامی اقدار اپنے آہنی ہاتھوں سے رائج کی تھیں۔ یہ جذباتی فضا کچھ نارمل ہوئی تو میں نے بھائی خان کو اپنی مشکل بتائی اور کہا مجھے بنگلہ دیش کے پہاڑی سلسلے تک جانے اور

واپس آنے کے لیے گائیڈ اور مزدور چاہییں۔ بھائی خان نے کچھ دیر سوچا اور کہا ''میرے آدمی تو ان پڑھ اور صرف تھائی لینڈ سے ہی واقف ہیں۔ ان میں کوئی بھی تمہارے مطلب کا نہیں۔ لیکن میں تمہیں خط لکھ کر دیتا ہوں۔ اسے تھائی لینڈ اور ملائیشیا کے بارڈر پر واقع قصبے سنائی گولک میں عمر خان کے پاس لے جاؤ۔ وہ جوان پڑھا لکھا اور نڈر مسلمان ہے اور پاکستان میں ہمارے ہی علاقے کا رہنے والا ہے۔ اس کے والد شیر خان کو میں نے یہاں آنے کی ترغیب دی تھی۔ عمر خان پکا مسلمان ہے، ہیروئن اور چرس کا بہت بڑا اسمگلر ہے لیکن اسمگلنگ کا ایک پیسہ بھی اپنے اور اپنے گھر والوں پر خرچ نہیں کرتا۔ گولڈن ٹرائی اینگل سے اس کا ڈائریکٹ رابطہ ہے۔ سمگلنگ سے ملنے والا سب روپیہ وہ تھائی لینڈ کے مسلم چھاپہ ماروں اور فلپائن کے مسلم گروہوں میں اسلحہ اور نقد کی صورت میں بانٹ دیتا ہے۔ وہ یقیناً تمہاری مشکل حل کر دے گا۔'' بھائی خان نے اپنے لڑکے کو بلایا اور عمر خان کے لیے خط لکھوا کر اس پر اپنی انگوٹھی کی مہر لگا دی۔ مہر پر واضح طور پر قرآن حکیم اور اسلامی طرز کی تلوار نمایاں تھی۔ لفافہ بند کر کے بھائی خان نے مجھے دیا، گلے ملا اور کہا کہ سنائی گولک سے واپسی پر اس سے ضرور ملوں۔

بھائی خان سے رخصت ہو کر میں بنکاک واپس آ گیا۔ اب میری منزل سنائی گولک تھی۔ جہاں تک جانے کے لیے ریلوے اور سڑک کے رستے موجود تھے۔ میں نے ہوٹل والوں کے ذریعے ریلوے کی اپر کلاس کی سیٹ پرسوں کے لیے بک کروائی اور خود روانگی کی تیاری کرنے لگا کیونکہ میں ہوٹل سے چیک آؤٹ ہو کر سنائی گولک جانا چاہتا تھا۔

ٹرین نے ٹھیک تین بجے بعد دوپہر روانگی کا وسل دیا۔ نہایت اعلیٰ و ارفع سفری سہولیات سے مزین ٹرین تھی۔ آرام دہ اور Relax ہونے والی سیٹیں، صاف و شفاف واش روم، مسافروں کی دلچسپی کے لیے ہر بین الاقوامی زبان کے رسائل اور اخبارات، ویٹرز کو طلب کرنے کے لیے ہر سیٹ کے اوپر کال بیل (Call Bell)، سیٹوں کی گنجائش سے زیادہ ایک بھی مسافر نہیں۔ بالکل یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی اعلیٰ کمپنی کا ہوائی جہاز ریل کی پٹریوں پر دوڑ رہا ہے اور یہ ٹرین کسی یورپین یا امریکی ملک کی نہ تھی بلکہ جنوبی ایشیا کے ایک غریب ملک کی تھی (آج بھی تھائی مرد و زن تیل کی دولت رکھنے والے عرب ممالک میں سب سے کم معاوضوں پر کام کرتے ہیں) میں اس ٹرین کا اپنے ملک کی ٹرینوں سے موازنہ کرنے لگا۔ کوئی ایک چیز بھی اپنی ملکی ٹرینوں میں ایسی نہ مل سکی جسے میں تھائی ٹرین کے پاسنگ بھی کہہ سکتا۔ ڈائننگ کار میں گیا تو مشرقی اور مغربی اقسام کے انواع و اقسام کے لذیذ کھانے موجود تھے۔ گوشت کھاتے وقت یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ یہ حلال گوشت ہے یا نہیں۔ یہ سب صرف ایک نڈر اور مخلص شخص کی وجہ سے ممکن ہوا تھا جس نے اپنے ذاتی مفادات پر اپنے ہم مذہبوں کے مفاد کو ترجیح دی تھی۔ یہ اسی کے رعب اور دبدبے کا نتیجہ تھا کہ تھائی لینڈ کے غیر مسلم اسے دیکھتے ساتھ ہی ہاتھ جوڑ کر اس کے احترام میں سر جھکا لیتے اور مسلمانوں کے چہرے پر فخر و اطمینان کے تاثرات ابھر

آتے۔ تھائی لینڈ کا یہ بے تاج بادشاہ، یہ ان پڑھ غیرت مند پٹھان بھی سمگلر تھا۔ عمر خان جسے ملنے میں سنائی گولک جارہا تھا، وہ بھی پٹھان اور سمگلر تھا۔ بمبئی میں حاجی مستان اور یوسف پٹیل بھی سمگلر تھے لیکن غیر قانونی کام میں ملوث ان لوگوں کے دل جذبۂ ایمانی سے بھرے ہوئے تھے۔ جو کام یہ لوگ اپنی ذاتی حیثیت میں سرانجام دے رہے تھے۔ ویسا کام کرنے کا تو ہمارے ملک میں اس دور کی بھٹو صاحب کے کھوکھلے نعروں سے بنی حکومت سے لے کر نواز شریف کی بھرپور مینڈیٹ رکھنے والی حکومت سوچ بھی نہیں سکتی۔ (جانباز کا یہ حصہ نواز شریف کے دورِ اقتدار میں لکھا گیا) یہ بات نہیں کہ ان حکومتوں کے پاس وسائل نہیں، ذرائع نہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے سب کچھ ہے۔ کمی ہے تو صرف ایک بات کی ہے کہ صرف ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے ہر کوشش بروئے کار لائی جاتی ہے۔ ذاتی تعیش کے لیے ملکی خزانہ بے دریغ لٹایا جاتا ہے۔ ملک کا بال بال غیر ملکی قرضوں میں باندھنے کے بعد ''قرض اتارو، ملک سنوارو'' کے نعرے لگا کر غریب قوم کی بچی کھچی کھال بھی کھینچ لی گئی ہے اور جب اس سے بھی ان کی توندیں نہ بھریں تو سرکاری اثاثے بیچ کر اب ملک کو بھی بیچا جارہا ہے۔ گوادر کی بندرگاہ ننانوے سالہ پٹے پر امریکہ کو دے دی گئی ہے۔ کراچی پورٹ کی برتھیں بھی امریکہ بہادر نے خرید لی ہیں۔ ڈیفنس اور کلفٹن پر چار گنا زائد قیمت پر یہ غیر ملکی جائیدادیں خرید رہے ہیں۔ بجلی، ریلوے، بینک، ٹیلی مواصلات، سڑکیں غرضیکہ سب کچھ غیر ملکی ہاتھوں میں چلا گیا ہے اور جارہا ہے۔ ہمارے پاس کیا بچا ہے؟ صرف ''اتفاق کی نعمت'' اور مہنگائی کا جن۔ کفایت شعاری کی ہر پاکستانی کو ترغیب دی جارہی ہے لیکن وزیراعظم ہاؤس اور وزیراعظم سیکریٹریٹ کے اخراجات بڑھتے جارہے ہیں۔ حکمرانوں کے مزاج شاہانہ ہیں۔ خود بھاری شرح سود پر قرض لے کر سری لنکا کو پچاس کروڑ ڈالر کا قرضہ دینا منظور کیا گیا ہے۔ کراچی میں ماس ٹرانزٹ ریلوے کا اربوں روپوں کا نظام قائم ہونے والا ہے جس پر مزار قائداعظم سے ٹاور تک سفر کے لیے ''صرف'' پچاس روپے کرائے کے ادا کرنے ہوں گے۔ یہ باتیں پہلے بھی اخباروں میں لکھی جاچکی ہیں۔ میں محض اس لیے دہرا رہا ہوں کہ جب بھی ملکی زخموں پر سے پٹی ہٹائی جاتی ہے تو بجائے پرانے زخم مندمل ہونے کے نئے زخم دکھائی دیتے ہیں۔ قوم ہے کہ چکمے پہ چکمہ کھائے جارہی ہے۔ صدر ایوب کی اسمبلی میں حزب اختلاف کے لیڈر ان کے بڑے بھائی سردار بہادر خان تھے یعنی حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں ایک ہی گھر کی تھیں۔ ان دنوں اسمبلی میں ایک شعر بہت مقبول تھا لیکن صرف ایم۔ این۔ ایز کے لیے۔ لیکن آج یہ شعر نہ صرف سیاسی لوگوں پر بلکہ عوام پر بھی برابر صادق آتا ہے ۔

یہ راز اب کوئی راز نہیں، سب اہل گلستاں نے جان لیا
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے، انجام گلستاں کیا ہوگا

تاریخ کا پہیہ گھومتا رہتا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی بے شمار داستانیں ہمارے سامنے

ہیں۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہر دور پر صادق آتا ہے Survival for the fittest (صرف بہترین ہی بچ سکتا ہے)۔ میں تو اس خیال سے ہی تھرا اٹھتا ہوں کہ جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کرنے کے بہانے برصغیر میں داخل ہوئی اور مغلیہ سلطنت کو جس کی سرحدیں کابل سے برما تک تھیں، سکیڑتے سکیڑتے دہلی کے لال قلعے تک محدود کر دیا۔ خدانخواستہ ویسے ہی ہمارے نااہل حکمرانوں کے ہاتھوں اس بچے کھچے پاکستان کی سرحدیں بھی کہیں صرف رائے ونڈ کے ایک فارم ہاؤس تک ہی محدود نہ ہوجائیں۔ قارئین سے معافی چاہتا ہوں کہ ملکی حالات کی سنگینی دیکھ کر اصل موضوع سے اکثر بہک جاتا ہوں، لیکن کیا کروں؟ وطن سے میری محبت دماغ سے نہیں بلکہ دل سے ہے اور دل کسی قاعدے قانون کو نہیں جانتا۔

ٹرین سانپ کی طرح لہراتی، بل کھاتی سرسبز پہاڑوں اور سرنگوں میں سے گزرتی اور ندی نالوں کو عبور کرتے اپنی منزل کی جانب بڑھتی جارہی تھی۔ یہ ٹرین بنکاک سے چل کر ملائیشیا کے دارالحکومت کوالالمپور سے ہوتی سنگاپور جاکر ختم ہوتی ہے۔ میں نے ایشیا اور یورپ کے کئی ممالک میں ٹرین سے سفر کیا۔ لیکن قدرت کی صناعی کے جو مظاہر اس سفر کے دوران دیکھے، کہیں اور دیکھنے کو نہ ملے۔ سنائی گولک سے چالیس میل پہلے ہی میں نے ایک سٹیشن پر ٹرین کو چھوڑ دیا اور ٹیکسی لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ عمر خان کے کئی ٹھکانے تھے اور بھائی خان کے بقول اسے ڈھونڈنا خاصا مشکل تھا۔ میں نے سنائی گولک پہنچتے پہنچتے اس کے کئی ٹھکانے کھنگال ڈالے لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ اس کا آخری ٹھکانہ سنائی گولک میں اس کا دفتر تھا۔ جب وہاں بھی وہ نہ ملا تو میں نے عمر خان کے فیملی ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا۔ اس ہوٹل کو اس کا بھائی عباس خان Manage کرتا تھا۔ عباس خان کو میں نے بتادیا کہ میں بھائی خان کے ریفرنس سے اسے ملنا چاہتا ہوں۔ بنکاک سے میرا سفر گزشتہ روز شروع ہوا تھا اور اب رات کے نو بج رہے تھے جب میں عباس خان سے ملا۔ سفر چاہے کتنا ہی خوشگوار کیوں نہ ہو، تھکان تو ہوتی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد میں جلد ہی سوگیا۔ ابھی صبح کے چھ بھی نہیں بجے تھے کہ ریسیپشن سے فون آیا کہ عمر خان ٹیلی فون پر موجود ہیں۔ بات شروع ہوئی تو عمر خان نے کہا کہ آپ نے اچھا کیا جو بھائی خان کا حوالہ دے دیا ورنہ شاید میں آپ سے کبھی مل نہ پاتا۔ میں اجنبی لوگوں کو ملنے سے احتراز کرتا ہوں۔ میں گیارہ بجے دن آپ کے کمرے میں آجاؤں گا اور وہیں پر باتیں ہوں گی۔ عمر خان سے میری یہ گفتگو انگلش میں ہوئی کیونکہ وہ اردو نہیں جانتا تھا۔

ٹھیک گیارہ بجے عمر خان نے مجھے ہوٹل ریسپشن سے فون کیا اور چند منٹوں میں ہی وہ میرے کمرے میں آگیا۔ اس کی عمر لگ بھگ چالیس برس تھی۔ سرخ و سفید رنگ، آدھے سر کے بال اڑے ہوئے اور وہ دیکھنے کا چشمہ لگاتا تھا۔ بہت ہی مدہم لیکن Determined (فیصلہ کن) لہجے میں گفتگو کرنے والا یہ شخص میرے پاس تین گھنٹے سے بھی زیادہ بیٹھا رہا۔ اس دوران ہم اچھے خاصے بے تکلف دوست بن چکے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک مخلص دوست کے احسان نے مجھے یہ کام کرنے

پر مجبور کردیا ہے اور مجھے رانگا ماٹی تک لے جانے اور میرے ساتھ ہی واپس لوٹنے والے مزدور اور گائیڈ کی ضرورت ہے۔ عمر خان نے کہا کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو حل نہ ہو۔ لیکن اس کے لیے مجھے چند روز انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ برما اور بنگلہ دیش کے راستوں سے واقف اس کے آدمی آج کل ڈیلیوری دینے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے اسے اپنے بھارت اور کھٹمنڈو کے مشنز کے متعلق مختصراً بتایا تو وہ بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا، ''میں اور تم ایک جیسی کشتیوں کے سوار ہیں۔ تم نے بھارت میں جو کچھ کیا اور کھٹمنڈو میں تمہارا دشمنوں سے نپٹنے کا جو انداز رہا میرا بھی کم و بیش ویسا ہی مسئلہ ہے لیکن اسے انجام دینے کے ہمارے طریقے مختلف ہیں۔ تم نے اپنے وطن کے لیے اپنی جان داؤ پر لگادی۔ میں تھائی لینڈ اور فلپائن کے مسلم گوریلوں کے لیے "Base Camp" کا کام انجام دے رہا ہوں۔ ہمارا یہ سرحدی صوبہ کبھی ملائیشیا کا حصہ تھا جسے نااہل حکمرانوں نے تھائی لینڈ کو بیچ دیا۔ اس صوبے میں مسلمان ستر فیصد سے زیادہ ہیں اور اپنے مفاد پرست لیڈروں کے غلط فیصلوں کی سزا بھگتنے کو تیار نہیں۔ پہلے چند جوانوں نے احتجاج کیا جو بڑھتے بڑھتے اب ہزاروں کی تعداد میں مسلح گوریلوں کی صورت میں اس ناانصافی کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ اس مسلح جدوجہد میں ملائیشیا کے گوریلے بھی شامل ہیں۔ ملائیشیا کے ایک سابق وزیراعظم نے سنگاپور کو جو پہلے ملائیشیا کا ایک حصہ تھا، ملائیشیا کے ہی چینی نسل کے باشندوں کو فروخت کر دیا اور اب سنگاپور کی معاشی اور دفاعی طاقت اتنی زیادہ ہے کہ وہ ملائیشیا کو ہی آنکھیں دکھا رہا ہے۔ حالانکہ اگر ملائیشیا سنگاپور کو پانی کی سپلائی ہی بند کر دے تو اس کا پورا ڈھانچہ ہی بیٹھ جائے۔ فلپائن کے مسلمان حریت پسند بھی میرے ساتھ مسلسل رابطے میں ہیں اور میں ان کی ہر ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ان سارے حریت پسندوں کو روپیہ اور اسلحہ دینے کے لیے میں نے اسمگلنگ کا دھندہ اختیار کیا ہے۔ یورپ اور امریکہ ظاہری طور پر چاہے کتنے ہی مضبوط دکھائی دیں لیکن قومی سطح پر بالکل ختم ہو رہے ہیں۔ منشیات کی لت ان کے رگ و پے میں سرایت کرچکی ہے۔ حشیش، ماریجونا، کوکین اور اب ہیروئن کے بغیر وہ رہ نہیں سکتے۔ ان ممالک میں Drug Barons اس قدر طاقت ور ہیں اور ان کا نیٹ ورک اس قدر مضبوط ہے کہ ان ممالک کی حکومتیں اپنی پوری کوشش کے باوجود منشیات کی سپلائی کے رستے بند نہیں کرسکتیں۔ میرا گولڈن ٹرائی اینگل کے خن سا سے ڈائریکٹ رابطہ ہے۔ منشیات کے سمگلروں کے اس بادشاہ کی برما کے ہیڈکوارٹرز ہومونگ کے علاوہ لاؤس اور تھائی لینڈ کے سرحدی علاقے میں بھی بادشاہت قائم ہے۔ برمی حکومت ایک معاہدے کے تحت اسے گرفتار نہیں کرتی اور نہ ہی اسے امریکہ کے حوالے کرنے کو تیار ہے۔ تھائی لینڈ کی فوج نے کئی بار اس کے علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن خن سا کے ہزاروں مسلح گارڈز نے انہیں بھاری جانی نقصان پہنچا کر پیچھے دھکیل دیا۔ خن سا کے زیر اقتدار علاقے کو گولڈن ٹرائی اینگل کہتے ہیں جن میں تھائی لینڈ، برما اور لاؤس کے سرحدی علاقے شامل ہیں۔ خن سا اپنی گوریلا فوج، افیون پیدا کرنے والے کارکنوں سے لے کر ہیروئن تیار کرنے والی

فیکٹریوں کے ملازمین اور ان کی فیملیز کا از حد خیال رکھتا ہے۔ ان کے لیے رہائش گاہیں، سکول، ہسپتال حتیٰ کہ ان کی تفریح کے لیے سنیما گھر تک بنا رکھے ہیں (ان دنوں ڈش اور ٹیلی وژن نہیں تھے) میری خواہش ہے کہ تمہیں اس سے ملواؤں۔ وہ بہادروں کا قدردان ہے اور اس کے ذریعے تمہاری مہم بہت آسان ہوجائے گی۔ ورنہ میرے آدمی تمہارا ساتھ دیں گے۔''

عمر خان سے پہلی ملاقات میں ہی ہماری دوستی کی نہ صرف ابتدا ہوئی بلکہ یہ دوستی کئی منزلیں بیک وقت طے کرگئی۔ اس نے اپنے بھائی عباس کو بھی میرے کمرے میں بلوالیا اور اسے میرے بارے میں تھوڑا بہت بتا کر یہ کہا کہ آج رات یہ میرے گھر پر میرے مہمان ہوں گے اور ہم کل رات کو واپس لوٹیں گے۔ میں جلد جلد تیار ہوا اور عمر مجھے اپنی گاڑی میں لے کر چل دیا۔ سنائی گولک میں ایک ندی تھائی لینڈ اور ملائیشیا کا بارڈر ہے اور سنائی گولک تھائی لینڈ کا سرحدی قصبہ ہے۔ گاڑی ندی کے پل پر پہنچی تو دونوں ممالک کے امیگریشن آفس دکھائی دیے۔ میں نے عمر کو کہا کہ میرا پاسپورٹ تو ہوٹل میں ہے۔ تو وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا، ''جو کام میں کرتا ہوں اس میں ممالک کی سرحدیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں'' اور اس نے جو کہا تھا وہ واقعی سچ ثابت ہوا۔ دونوں چیک پوسٹوں پر امیگریشن والوں نے اس کی صورت دیکھتے ہی Barriers اٹھادیے اور ہم بغیر روک ٹوک ملائیشیا میں داخل ہوگئے۔ عمر گاڑی بڑی تیز رفتاری سے چلا رہا تھا۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ بالآخر میں نے عمر سے پوچھا کہ تمہارا گھر اور کتنی دور ہے۔ وہ کہنے لگا کہ وہ بہت پیچھے کوٹا بارو میں ہے۔ ''تو ہم کہاں جارہے ہیں؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ ''کوالالمپور۔ تھوڑا سا کام تھا۔ میں نے سوچا وہ نمٹالوں تو پھر گھر چلیں گے۔'' تھوڑی دیر بعد ہی کوالالمپور آگیا۔ میں تو اس شہر سے بالکل ناواقف تھا۔ میں صرف یہ جان سکا کہ جہاں ہماری گاڑی رکی اس سے آدھ کلومیٹر پہلے ہائی کورٹ کی بلڈنگ تھی۔ عمر مجھے ایک بڑے فلیٹ میں لے گیا۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ میزبان نے کئی طرح کے کھانے تیار کروا رکھے تھے۔ عمر نے غالباً سنائی گولک سے فون پر ہی اسے اپنی آمد کا بتادیا تھا۔ ہم کھانا کھانے لگے تو عمر نے اسے گاڑی کی چابی دی اور ملائشین زبان میں کچھ کہا۔ کھانے کے بعد ایک گھنٹہ ہم نے ریسٹ کیا۔ اس دوران میزبان نے گاڑی کی چابی واپس کی۔ قہوہ پینے کے بعد ہم میزبان کے ہمراہ باہر آئے۔ گاڑی کو خوب اچھی طرح سے صاف کیا گیا تھا۔ میزبان سے رخصت لے کر ہم گاڑی میں بیٹھے۔ میں نے ڈیش بورڈ پر دیکھا تو پیٹرول گیج بتارہی تھی کہ پٹرول لبالب بھرا ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ گاڑی وہاں سے لے جائی گئی تھی۔ ہم کوالالمپور سے نکلے ہی تھے کہ عمر نے مجھے کہا کہ پسٹل نکال لو اور اگر ٹریفک پولیس والوں نے روکنا چاہا تو پہلے ہوائی فائر اور پھر نشانہ لے کر روکنے والے پر فائر کرنا۔ میرے پاس اس کی بات ماننے کے اور چارہ بھی کیا تھا۔ راستے میں تین چار جگہوں پر ٹریفک سارجنٹ اپنے موٹر سائیکلوں کے ساتھ گشت کرتے دکھائی دیے۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے عمر ہاتھ کے اشارے سے انہیں ہیلو کہتا۔ جواب میں وہ بھی ہاتھ ہلا دیتے۔

اسی طرح ہم بخیر و عافیت کوتا بارو پہنچ گئے۔ اس شہر کی ایک بڑی سڑک پر عمر کا گھر یا یوں کہہ لیجیے کہ بہت بڑا اور وسیع بنگلہ تھا۔ پورچ میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم گاڑی سے اترے تو عمر کے ملازم بھاگتے ہوئے آئے۔ عمر نے انہیں کچھ کہا۔ انہوں نے کار کی ڈگی سے دو بھری ہوئی بوریاں نکالیں اور ہمارے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ عمر نے انہیں بوریاں کھولنے اور فرش پر الٹ دینے کا کہا۔ دونوں بوریاں سو سو ڈالر کے نوٹوں کی گڈیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یقین جانیے میں نے ایک ساتھ اتنا روپیہ زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ملازموں نے گڈیاں گننی شروع کیں۔ کل چھ ہزار گڈیاں یعنی چھ کروڑ ڈالر تھے۔ عمر نے مجھے کہا کہ یہ ڈالر ہیروئن کی ایک بڑی کھیپ کے عوض ملے ہیں اور یہ ساری رقم صرف مسلم چھاپہ ماروں کے لیے اسلحہ خریدنے اور ان کی دیگر ضروریات پر خرچ کی جائے گی۔ ہوٹل اور یہ بنگلہ اس نے بینک سے قرض لے کر بنایا ہے اور صرف ہوٹل کی آمدنی سے اس کا اور اس کے والدین اور بھائیوں کا خرچ چلتا ہے۔ رات کا کھانا بالکل سادہ تھا۔ سارے دن کے تھکے ہارے ہم کھانے کے بعد جلد ہی جمائیاں لینے لگے۔ عمر خود مجھے مہمان خانے میں لے گیا اور پہننے کے لیے لنگی اور قمیض دی۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد ہم سنائی گولک کے لیے روانہ ہوئے۔ عمر مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ تین چار روز کے بعد وہ مجھے ملنے آئے گا اور اس دوران اگر موقع ملا تو وہ مجھے اپنے انڈر گراؤنڈ دفتر پر چھاپہ ماروں سے بھی ملوائے گا۔ ”لیکن جب تک میں تمہیں فون پر (ایک کوڈ بتاتے ہوئے) آنے کا نہ کہوں، کسی کے بلانے حتیٰ کہ میرے بھائیوں کے کہنے پر بھی سنائی گولک سے باہر نہ جانا۔ میرے دو جاں نثار گارڈ ہوٹل کی لابی میں تمہارے ہمراہ جانے کے لیے ہمہ وقت تیار ہوں گے۔ تم شہر میں خوب گھومو پھرو لیکن گارڈز کے بغیر ہرگز باہر نہ جانا۔“ یہ کہہ کر عمر مجھ سے گلے ملا۔ عمر نے اپنے آدمیوں کو ہدایات دے کر مجھے ہاتھ ہلا کر ہیلو کہا اور چلا گیا۔

مجھے یہ خیال بار بار پریشان کرتا تھا کہ تھائی لینڈ میں سوائے اسلحہ خریدنے کے میں نے اپنے مشن کی طرف اب تک ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا ہے۔ دن پر دن گزرتے جا رہے ہیں۔ اصل مہم کی طرف ذرا سی بھی پیش رفت نہیں ہوئی اور ابھی تک صرف وعدے وعید ہی کیے جا رہے ہیں۔ عمر نے اپنی رقم وصول کرنے میں مجھے استعمال کیا تھا۔ شاید اسے اپنے بھائیوں پر بھی اعتماد نہیں تھا اور مجھے بھی علم نہیں تھا کہ کوالالمپور سے ہماری گاڑی میں کتنی دولت ہمارے ساتھ جا رہی تھی۔

آئندہ دو روز میں فیملی ہوٹل میں عمر خان کا انتظار کرتا رہا۔ ان دو دنوں میں میں نے سنائی گولک کے قصبے کی خوب سیر کی۔ تھائی لینڈ کا یہ سرحدی قصبہ خاصا خوبصورت تھا۔ عمر خان کے گارڈز جب بھی میں باہر نکلتا، میرے پیچھے پیچھے چلتے۔ اس احتیاطی تدبیر سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ عمر خان کے دشمن نہ صرف بیرونی تھے بلکہ اس کے گھر کے افراد خصوصاً اس کے بھائی بھی اس دشمنی میں پیش پیش تھے۔ یہ کوئی خلاف توقع بات نہ تھی۔ اگر ایک شخص اچانک دولت، شہرت اور عزت حاصل کر لے تو اس

کے اولین دشمنوں اور حاسدوں میں اس کے انتہائی قریبی رشتہ دار ہی ہوتے ہیں۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ سیزر کو خنجروں سے ہلاک کرنے والوں میں اس کا بھائی بروٹس تھا اور مغل شہنشاہ اورنگ زیب جیسے دیندار اور خوف خدا رکھنے والے نے اپنے بھائی اور تخت کے دعویدار کی آنکھوں میں نشتر لگا دیے تھے۔ عمر خان کی بھی یہی حالت تھی۔ اس کا بھائی عباس اور دوسرے قریبی رشتہ دار اس کی عزت اور شہرت سے حسد کرتے تھے۔ انہیں یہ بھی گمان تھا کہ اگر عمر نہ ہو تو وہ سمگلنگ کی ساری دولت خود حاصل کر سکتے تھے۔ حالانکہ عمر کے سامنے ایک مشن تھا اور وہ صرف اپنے مشن کی تکمیل کے لیے تمام خطرات سے کھیل رہا تھا۔

تیسرے دن صبح ہی عمر نے مجھے فون کیا۔ کوڈ ورڈ (Code Word) سے اپنی شناخت کروائی اور کہا کہ میں ایک گھنٹے میں تیار ہوجاؤں اور اپنے تمام سامان کے ساتھ ہوٹل سے Check out ہوکر اس کے گارڈز کے ہمراہ اس کی گاڑی میں روانہ ہوجاؤں۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں ہوٹل کی لابی میں آ گیا۔ اس کے گارڈز نے میرا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھا اور ہم تیزی سے تھائی لینڈ کے صوبائی دارالحکومت ہرجائی (ریحان) کی طرف روانہ ہوئے۔ سنائی گولک سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر گاڑی نے مین روڈ کو چھوڑا اور ایک تنگ اور ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ہولی۔ ہم نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک جیپ ہمارے پاس رُکی۔ گارڈز نے میرا سامان جیپ میں رکھا۔ عمر کی گاڑی واپس چلی گئی اور بغیر نمبر پلیٹ کے یہ جیپ اونچی نیچی پگڈنڈیوں اور پتھریلی سڑک نما راستے پر چلتی ہوئی گھنے جنگل میں داخل ہوگئی۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ گارڈز نے اپنے پسٹل ہولسٹرز میں ڈال کر آٹومیٹک رائفلیں اُٹھا لی تھیں۔ دو گارڈ میرے ہمراہ آئے تھے اور دو جیپ میں پہلے سے موجود تھے۔ ایک رائفل مجھے بھی دے دی گئی۔ سامنے کی سمت میں نے سنبھال لی اور چاروں گارڈز نے پیچھے اور دونوں اطراف میں اپنی رائفلیں تان لیں۔ ڈرائیور نے جو عمر کا قابل اعتماد ساتھی تھا اور تھوڑی بہت انگریزی بھی بول لیتا تھا، مجھے بتایا کہ تھائی پولیس اور پیرا ملٹری فورس کے آدمی اطراف کے جنگلوں میں چھپ کر وار کرتے ہیں۔ ان کے فائر سے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر چار پانچ منٹ بعد چاروں طرف تیس چالیس بلٹ فائر کر دیے جائیں۔ گولیوں کی آواز سنتے ہی وہ یا تو پیچھے بھاگ جاتے ہیں اور یا پھر خاموشی سے گزرنے والوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ہم نے وقفے وقفے سے فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہم پر کسی جانب سے بھی کوئی فائر نہ ہوا۔ ہماری فائرنگ صرف حفاظتی نقطۂ نگاہ سے تھی۔ جنگل میں داخل ہوئے ہمیں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ہوئے ہوں گے اور ہم نے بمشکل پندرہ میل کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ خاردار تاروں کی ایک باڑھ دکھائی دی۔ باڑھ کے ساتھ ساتھ ہم دائیں جانب بڑھتے رہے۔ اس خاردار باڑھ کے اندر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واچ ٹاور (Watch Tower) بنے ہوئے تھے جن پر ہیوی مشین گنوں سے لیس گارڈ کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اندر جانے

کا راستہ دکھائی دیا جہاں پر تین بیریئرز (Barriers) تھے۔ ڈرائیور نے اپنا پاس دکھا کر تینوں بیریئرز کو عبور کیا تو تقریباً چالیس فٹ لمبی لوہے کی جالی دار سڑک پر سے ہم گزرے۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ اگر کوئی بھی گاڑی بیریئرز کو زبردستی کراس کرلے تو اس لوہے کی سڑک پر پہنچتے ہی ان جالیوں میں سے لوہے کے ہزارہا تیز نوکیلے راڈ نکل کر گاڑی کے ٹائروں کو پھاڑ ڈالتے ہیں۔ گاڑی میں پہیوں کی جگہ اگر ٹینکوں جیسے پٹے لگے ہوں تو اس سڑک کے آخری حصے میں اتنا بارود بھرا ہوا ہے کہ ایک گاڑی تو کیا، کئی ٹینک بھی ہوں تو کئی میٹر تک ہوا میں اچھل جائیں۔ ’’لیکن اگر کوئی گاڑی لوہے کی سڑک کو چھوڑ کر اطراف میں اگی گھاس پر سے گزر جائے تب!؟‘‘ میرے اس سوال پر ڈرائیور ہنسا اور کہنے لگا، ’’اطراف کی گھاس مصنوعی ہے اور لکڑی کے تختے جن پر گھاس لگائی گئی ہے، نیچے سے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں اور انہیں اونچا رکھنے کے لیے دونوں طرف لوہے کے سنگل خاصی دور چٹانوں میں گڑے لوہے کے بڑے کیلوں سے بندھے ہوئے ہیں اور ان تختوں کے نیچے زمین نہیں بلکہ ایسی خطرناک دلدل ہے کہ ایک بھات کا نوٹ بھی فوراً نگل جائے۔ اس کے علاوہ بہت سے خفیہ دفاعی حصار بنے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے تو تھائی پولیس اور فوج بھی زخموں سے چور یہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔ خن سا تک پہنچنا بچوں کا کھیل نہیں۔‘‘ خن سا کا نام سن کر میں چونکا۔ عمر نے ٹیلی فون پر مجھے اس ملاقات کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں دیا تھا۔ اتنے بڑے سمگلر اور تین ملکوں کی سرحدوں میں گولڈن ٹرائی اینگل قائم کرنے والے شخص سے اچانک ملنے کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بہرحال بقول عمر خن سا اگر چاہتا تو میری مہم بہت آسان ہوسکتی تھی۔ اس خیال نے ہی میری ٹینشن دور کردی۔ تھوڑے سے سفر کے بعد جیپ سیمنٹ کے بنے گھر کے سامنے رکی۔ میرا سامان جیپ میں ہی پڑا رہا اور ڈرائیور مجھے اپنے ہمراہ لے کر مکان میں داخل ہوا۔ مکان بالکل خالی اور بغیر کسی ساز و سامان کے تھا۔ ایک کمرے میں نیچے اترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہم سیڑھیوں سے نیچے اترے تو زیر زمین ایک شہر آباد تھا۔ رہائشی مکان، دکانیں ہیر ڈریسر شاپس اور وہ سب کچھ موجود تھا جن کی زمین پر رہنے والوں کو ضرورر پڑسکتی ہے۔

ڈرائیور کے ہمراہ ہم ایک ایسے گھر میں داخل ہوئے جو باہر سے تو گھروں جیسا تھا لیکن اندر سے شاہانہ انداز میں سجا ہوا تھا۔ اس گھر میں داخل ہوتے وقت وہاں کے پہریداروں نے مجھ سے میرا پسٹل لے لیا بلکہ یوں کہیے کہ ان کے پوچھنے پر میں نے خود ہی ان کے حوالے کردیا۔ کئی گیلریوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک دروازے پر رک گئے۔ ڈرائیور کی حد صرف یہاں تک تھی۔ پہریداروں نے انٹرکام پر کسی سے بات کی۔ تھوڑی دیر میں ہی ایک تھائی لڑکی نے دروازہ کھولا اور مجھے ہمراہ لے کر اندر چلی گئی۔ یہاں بھی ایک گیلری گزرنے کے بعد لڑکی نے ایک دروازے پر لگے انٹرکام پر اندر آنے کی اجازت مانگی۔ دروازہ کھلا اور ایک دوسری لڑکی مختصر لباس پر ہتھیار سجائے مجھے لے کر اندر چلی گئی۔ انتہائی

خوبصورتی سے سجے ڈرائنگ روم میں عمر اور تین دوسرے افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ عمر نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک شخص سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ یہ مسٹر خن سا ہے۔ خن سا نے بیٹھے بیٹھے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اشارے سے مجھے اپنے قریبی صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ خن سا اپنے صوفے پر ٹانگیں پسارے نیم دراز تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے مجھ سے دوبارہ میرا نام پوچھا۔ میں نے پھر اپنا اصلی نام بتایا۔ "I could'nt get you. Please write your name." خن سا نے یہ کہتے ہوئے سامنے میز پر پڑے لیٹر پیڈ اور پن کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اپنا نام لکھ دیا۔ خن سا نے نام پڑھا اور وہ کاغذ ہاتھ میں لیے ہوئے پھر پوچھا "Are you Muslim"۔ میں نے ہاں میں جواب دیا تو خن سا سنبھل کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا، ’’تم جھوٹ بولتے ہو۔ تمہارا نام رابرٹ مائیکل ہے۔ تم کرسچین ہو۔ یہ رہا تمہارا پاسپورٹ نمبر اور بنکاک میں تمہارے لینڈ کرنے کی تاریخ اور وقت۔ تم نے بنکاک سے اسلحہ بھی خریدا ہے جس کی تفصیل اس کاغذ میں درج ہے۔ تمہارے سامان سے تمہارا پاسپورٹ نہیں ملا۔ وہ یقیناً تمہاری جیب میں ہے۔ کیا تم ہمیں پاسپورٹ دکھا کر ہماری غلط فہمی دُور کرسکتے ہو؟‘‘ ہماری ساری گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ خن سا نے عمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ’’مسٹر عمر! نہایت دلچسپ واقعہ ہے کہ تمہارے دوست کے دو نام اور دو مذہب ہیں۔ کیا تمہارا دوست اپنا پاسپورٹ خود دکھائے گا یا میرے محافظ یہ کام سرانجام دیں گے؟‘‘ عمر حیران و ششدر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور میرا حال تھا کہ تھوک بھی نہ نگل سکتا تھا۔ مجھ سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں نے بھائی خان اور عمر کو رابرٹ مائیکل کے نام پر پاسپورٹ بنوانے کی وجہ نہیں بتائی تھی۔

کمرے میں موجود تمام افراد حیرانی اور سراسیمگی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ایسی خاموشی طاری تھی جسے Pin Drop Silence (گھمبیر خاموشی) کہا جاتا ہے۔ عمر کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ خن سا سے اس کے برسوں کے تعلقات اور اعتماد داؤ پر لگ چکے تھے۔ عمر نے میرے متعلق خن سا کو خدا جانے کتنی یقین دہانیوں اور ذاتی ضمانتوں کے بعد اس بات پر راضی کیا ہوگا کہ وہ مجھ سے اپنے ذاتی خفیہ ٹھکانے پر ملنے کے لیے راضی ہوا تھا۔ خن سا کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والے کا انجام صرف موت تھی۔ چاہے وہ اس کا برسوں سے جاننے والا ہو یا پہلی بار ملا ہو۔ میری خاموشی سب کے شکوک و شبہات میں اضافہ کررہی تھی۔ میرے لیے صرف چند لمحات تھے جن میں میں اپنی صفائی دینے کی کوشش کرسکتا تھا۔ یہ چند لمحات گزرنے کے بعد میری بڑی سے بڑی صفائی بعد از وقت ثابت ہوتی۔ میں نے کسی کو بھی خصوصی طور پر مخاطب نہ کرتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ’’یہ درست ہے کہ پاسپورٹ پر میرا نام رابرٹ مائیکل اور مذہب عیسائیت درج ہے۔ جبکہ میں دراصل مسلمان ہوں۔ پاسپورٹ پر اس غلط اندراج کی وجہ صرف یہ ہے کہ میرے مشن کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے۔ بنگلہ دیش چند سال قبل میرے ملک کا حصہ تھا لیکن چند غداروں کی غداری اور وطن فروشی کے باعث 71ء کے آخری مہینے میں میرے

وطن کے اس حصے کو بھارت نے علیحدہ کردیا اور وہاں تعصب کی ایسی فضا پیدا کردی کہ دنیا بھر کی تمام قوموں اور مذاہب کے لوگ تو بنگلہ دیش کو قابل قبول ہیں لیکن پاکستانی مسلمان کو وہ ہرگز برداشت نہیں کرتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مجھے برما اور آسام سے گزرنا اور واپس لوٹنا ہے وہاں بھی مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا ہے۔ انہی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے مائیکل رابرٹ کے نام سے پاسپورٹ بنوایا۔ چونکہ تھائی لینڈ کے بعد میرا سفر غیر قانونی اور پاسپورٹ کے بغیر ہونا ہے۔ اس لیے میں نے اس بات کو اہمیت نہ دی کہ بھائی خان اور عمر خان کو اس بارے میں بتاؤں۔ مجھے بخوبی احساس ہے کہ میرے اس اعتراف کو آپ من گھڑت سمجھ رہے ہوں گے لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ ہی حقیقت ہے۔ عمر خان کو بھی میرے پاسپورٹ کے متعلق کچھ علم نہیں۔ اس کے ہوٹل میں میں بغیر اندراج کے ٹھہرا ہوں۔ ورنہ وہاں پر ہی پاسپورٹ کی حقیقت ظاہر ہوجاتی۔ آپ کی دی ہوئی ہر سزا کو میں بخوشی قبول کروں گا۔ لیکن میرا دل اس بات پر مطمئن ہے کہ آپ نے مجھے اپنی صفائی دینے کا پورا موقع دیا اور میں نے تمام تر حقیقت آپ کے گوش گزار کردی۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے پاسپورٹ نکالا اور سامنے میز پر رکھ دیا۔

خن سا اپنے صوفے پر نیم دراز مجھے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکرا رہا تھا۔ چند لمحے خاموشی کے عالم میں گزر گئے تو عمر نے میرا پاسپورٹ اٹھایا اور میرا نام وغیرہ پڑھنے کے بعد خن سا کے سامنے رکھ دیا۔ اب میرے متعلق فیصلہ خن سا نے کرنا تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ کسی طرح کا فیصلہ کرنے میں وہ دیر نہیں کرتا۔ وہاں موجود سب لوگ اب اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور اس کے لب کھلنے کے منتظر تھے۔ میری حالت یہ تھی کہ اس اچانک افتاد سے میں گھبرا تو ضرور گیا تھا لیکن موت کا مجھے ذرّہ بھر بھی خوف نہ تھا کیونکہ مجھے یقین کامل تھا اور ہے کہ میری موت کسی انسان کے فیصلے سے نہیں بلکہ قادر مطلق کے مقرر کردہ وقت پر ہوگی جس سے مفر نہیں اور اس وقت سے پہلے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہ لکھتے ہوئے مجھے اپنی بہادری اور بے خوفی کا اظہار کرنا مقصود نہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ کی بے حد و حساب قوتوں کا اعتراف اور انسان کی بے مائیگی کا احساس بیان کرنا ہے۔ بھارت اور کھٹمنڈو میں اسی یقین کامل کے باعث میں درجنوں بار موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ چکا تھا بلکہ یوں کہیے کہ موت سے میری خاصی آشنائی ہوچکی تھی۔

اس سکوت کو خن سا نے توڑا۔ ''اکثر لوگ اور حکومتیں یہ سمجھتی ہیں کہ ہم لوگ اپنے اپنے دائروں میں ہی رہ کر کام کرتے ہیں اور ہمیں دوسروں کے متعلق کچھ علم نہیں ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ میری بنائی ہوئی ہیروئن اور حشیش اگر جرمنی اور امریکہ میں بکتی ہے تو میرے لیے یہ ضروری ہے کہ مجھے راستے کے سارے نیٹ ورکس اور انڈر گراؤنڈ کام کرنے والوں کے متعلق پوری معلومات حاصل ہوں۔ اسی طرح جن ممالک میں ہماری پیداوار فروخت ہوتی ہے، ان ممالک کی حکومتوں، ان کے اداروں اور

ایجنسیوں کے متعلق بھی پورا علم ہو جن کی بظاہر ذمہ داریوں میں ہمیں ختم کرنا بھی شامل ہے، لیکن وہ اپنے دیگر فرائض کی انجام دہی کے لیے ہمارے ساتھ درپردہ تعاون کرتی ہیں۔ میری تیار کردہ حشیش اور براؤن پاؤڈر بھارت اور کھٹمنڈو بھی جاتا ہے۔ مجھے تمہارے بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہیڈکوارٹر سے فرار کا علم اخباروں میں تمہاری فوٹو چھپنے سے پہلے ہی ہوچکا تھا۔ کھٹمنڈو میں تمہاری تمام کارروائیوں کی رپورٹس مجھے موساد کی اس اسرائیل ایجنٹ لڑکی کے ذریعے ملتی رہیں جس کی تم نے جان بچائی تھی اور اس نے تمہارے احسان کا بدلہ بھی چکا دیا تھا۔ میرے گاہکوں میں حاجی مستان اور یوسف پٹیل بھی شامل ہیں۔ کیا تم نے ہی ان کی صلح نہیں کروائی تھی؟'' خن سا نے میرا نام لے کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''عمر نے مجھے تمہارے مشن کے متعلق سب کچھ بتادیا تھا۔ جب میں اور میرے تمام کارندے مختلف ناموں مذاہب اور ممالک کے پاسپورٹ استعمال کرتے ہیں تو تمہارا مختلف نام سے سفر کرنا ہمارے لیے بالکل نارمل ہے۔ بنکاک ایئرپورٹ پر تم نے دو بار لینڈ کیا ہے۔ پہلے One way (یک طرفہ) پاسپورٹ پر اور اب انٹرنیشنل پاسپورٹ پر۔ اسلحہ بھی تم نے میرے آدمیوں سے ہی خریدا تھا۔ تمہارے متعلق میں نے جو کچھ سنا تھا، اس سے مجھے تم سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور میں عادتاً خود بھی تمہارا ٹیسٹ لینا چاہتا تھا کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ جس مشن پر جانے کے لیے تم یہاں آئے ہو، میں اس میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔ میں عمر کا بھی مشکور ہوں کہ اس نے تمہیں بغیر اطلاع دیے یہاں بلا لیا۔'' یہ کہتے ہوئے خن سا صوفے سے اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی باقی تینوں بھی کھڑے ہوگئے۔ خن سا نے گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا، ''اپنے مشن کی تکمیل کے بعد اگر تمہارا جی چاہے تو عمر کے پاس چلے آنا۔ میں تمہیں اپنے نیٹ میں ایک اونچا عہدہ دے کر خوشی محسوس کروں گا۔''

میں نے خن سا کے متعلق تفصیلاً اس لیے تحریر کیا ہے تاکہ قارئین کو بتا سکوں کہ انڈر گراؤنڈ کام کرنے والوں اور منشیات فروشوں کے ہاتھ کتنے لمبے ہوتے ہیں۔ امریکی صدر جان ایف کینیڈی کو سخت حفاظتی حصار میں ہونے کے باوجود گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کا قاتل اوسوالڈ پکڑا گیا تو اسے عدالت لے جاتے وقت پولیس کمانڈوز کے گھیرے میں ایک اجنبی شخص رابرٹ نے انتہائی قریب سے پسٹل کی گولی سے ہلاک کردیا اور پولیس نے اسے پکڑنے کے بجائے اسے وہیں پر گولیاں مار کر ختم کر دیا اس طرح کینیڈی کا قتل بھی ایک Blind Case (اندھا مقدمہ) بن کر رہ گیا۔ پاکستان جو آج کل منشیات فروشوں کی جنت کہلاتا ہے۔ دنیا بھر کے Drug Barons اور Under Ground Mafia (منشیات فروشوں کے بادشاہوں اور زمین مافیا) پاکستان کو اپنا Centre Point (مرکزی جگہ) بنائے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے منشیات بنانے والوں اور منشیات فروشوں نے بھی دنیا بھر میں اپنا منفرد مقام بنایا ہے۔ ایوب آفریدی، ملک سلیم، رانا اشرف، انور خٹک، مرزا اقبال بیگ، اقبال میمن، آغا قیصر اور کئی دوسرے بین الاقوامی شہرت کے حامل منشیات فروش ہیں۔ اگر موقع ملا تو ان سب کے حیران کن اور بے

حد دلچسپ حقائق قارئین کی نذر کروں گا۔

خن سا سے نہایت خوشگوار ماحول میں ملاقات کا اختتام ہوا۔ عمر اور میں نے رات وہیں گزاری۔ عمر کو اپنی Consignment (کھیپ) لینی تھی۔ دوسرے روز ہم صبح آٹھ بجے دو گاڑیوں اور چھ گارڈز کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ اب ہماری منزل سنائی گولک نہیں بلکہ عمر کا ایک خفیہ اڈہ تھا جہاں سے اس نے اپنے مال کی ڈیلیوری دینی تھی۔

عمر نے نہ تو مجھے بتایا اور نہ ہی میں نے اس سے پوچھنا مناسب سمجھا کہ اس کا یہ خفیہ اڈہ کہاں واقع تھا؟ اپنے ساتھ جانے والی ہیروئن کی کھیپ سے ہی میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ ہماری منزل سنائی گولک نہیں۔ تقریباً چار گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک بڑے شہر کے مضافات میں داخل ہوئے۔ عمر نے مجھے بتایا کہ یہ ریحان (ہرجائی) شہر ہے۔ سنائی گولک آتے ہوئے میں اس صوبائی دارالحکومت سے گزرا تھا۔ مضافات میں ہی ہم ایک اونچی چار دیواری والے گھر میں داخل ہوئے۔ مضبوط لوہے کا بنا ہوا داخلے کا دروازہ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی بند کردیا گیا۔ اس گھر کے پارکنگ ایریا میں تین گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔ ہمارے رکتے ہی چند آدمی آگے بڑھے اور ہیروئن کی کھیپ جس کے پیکٹ بوریوں میں بند تھے، ہماری گاڑیوں سے اُتار کر پہلے سے کھڑی تین گاڑیوں میں سے دو میں منتقل کرنے لگے۔ یہ کام بڑی تیزی سے اور بالکل میکانکی انداز میں ہورہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ بیس منٹوں میں ہیروئن کی منتقلی کا سارا کام مکمل ہوگیا۔ اس دوران ہم سب کے لیے چائے اور بسکٹ آچکے تھے۔ پورچ کے ساتھ بنے برآمدے میں ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ داخلے کے دروازے کھلے اور پولیس کی سائرن اور سرخ اور نیلی جلتی بجھتی بتیوں والی دو گاڑیاں اندر داخل ہوئیں۔ جتنی دیر میں پولیس کی گاڑیوں نے اپنے رخ داخلی دروازے کی طرف کیے، عمر اور میں تیسری گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ عمر کے مسلح گارڈز بھی ہیروئن بھری دو گاڑیوں میں سوار ہوگئے۔ پولیس کی گاڑیاں پہلے باہر نکلیں اور ہماری تینوں گاڑیوں کے نکلتے ہی ایک ہمارے آگے پائلٹ کے طور پر اور دوسری سب سے پیچھے ہولی۔ پانچ گاڑیوں کا یہ قافلہ شہر کے بیچ میں سے گزرتا ہوا بڑی شاہراہ پر پہنچا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

میں نے دل میں تہیہ کیا ہوا تھا کہ عمر سے خود کچھ نہیں پوچھوں گا کہ اب ہماری منزل کونسی ہے؟ اگر اس نے بتانا مناسب سمجھا تو بتا دے گا کیونکہ جاسوسی، سمگلنگ اور زیر زمین کاموں میں Compartmentation (صرف ضرورت کی حد تک جاننا) ان سب کا بنیادی عنصر ہے اور بے جا چھان بین کرنے والا مشکوک ہوجاتا ہے۔ ہم بڑی شاہراہ پر پہنچے تو عمر نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ دیر بعد اس نے بتایا کہ ہم پھوکٹ (Phuket) جا رہے ہیں۔ پھوکٹ تھائی لینڈ کا ایک انتہائی خوبصورت جزیرہ ہے جسے پل کے ذریعے مین لینڈ سے ملایا گیا ہے۔ یہ جزیرہ نہ صرف تھائی لینڈ بلکہ پورے جنوب مشرقی ایشیا میں اپنی خوبصورتی میں منفرد مقام رکھتا ہے اور غیر ملکی سیاح بے اختیار اس جزیرے پر

کھنچے چلے آتے ہیں۔ پرتعیش بحری بجروں میں سوار دنیا بھر کے بڑے سمگلر بھی یہاں آکر تفریح کے ساتھ ساتھ ہیروئن کی بڑی بڑی کھیپیں بھی ہمراہ لے جاتے ہیں۔ عمر نے کہا کہ سیاحت کا مرکز ہونے کی وجہ سے پھوکٹ میں Cosmopolitan (بین الاقوامی معیار کی) پولیس بھی ہوتی ہے۔ ہرجائی سے اس کے خریدے ہوئے پولیس والے اسی لیے ہمارے ہمراہ جارہے ہیں کہ کاسمو پولیٹن پولیس کے علاوہ سمگلنگ کے دوسرے گروہوں سے بھی مڈبھیڑ ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ پھوکٹ سے بالکل قریب مین لینڈ پر اس کا ایک اڈہ ہے جہاں ہیروئن رکھی جائے گی۔ سیاحوں کے روپ میں اس کی ہیروئن کے خریدار غیر ملکی سمگلر بھی پھوکٹ میں موجود ہیں۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق کل رات انہیں ڈیلیوری دینی ہے، لہٰذا آج اڈے پر ہیروئن اُتارنے کے بعد وہ مجھے پھوکٹ لے جائے گا اور کل دن کو اپنے گاہکوں سے ہیروئن کی قیمت وصول کرکے رات کو تیز رفتار موٹر بوٹ کے ذریعے ہیروئن خریدار کے بجرے تک پہنچائی جائے گی۔

ہماری گاڑیاں ساحل کے قریب ہی ایک نسبتاً چھوٹے گھر کے قریب رکیں۔ گھر کے باہر تین چار تھائی غالباً ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ انہوں نے ہیروئن بھری بوریاں اتاریں اور گھر کے اندر لے گئے۔ اس دوران پولیس کی دونوں گاڑیاں ہمارے آگے پیچھے کچھ فاصلہ دے کر کھڑی رہیں اور عمر کے مسلح گارڈز نے بھی سڑک کے دونوں جانب پوزیشن لے لی تھی۔

زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں ساری ہیروئن گھر میں منتقل ہوگئی۔ عمر کی گاڑی نے سب اچھا کا لائٹ سگنل دیا۔ سگنل موصول ہوتے ہی پولیس کی دونوں گاڑیاں واپس چلی گئیں۔ ہیروئن والی ایک گاڑی میں دو مسلح محافظ بیٹھ گئے اور باقی گھر کے اندر چلے گئے۔ ایک گاڑی وہیں کھڑی رہی اور مسلح محافظوں والی گاڑی ہماری گاڑی کے پیچھے چل پڑی۔ اب ہم مین لینڈ سے پھوکٹ کے جزیرے پر جارہے تھے جہاں ہمیں ایک ہوٹل میں قیام کرنا تھا اور عمر کے گاہکوں سے رقم وصول کرنی تھی۔

میں پہلے بھی پھوکٹ کے علاقے سے گزر چکا تھا لیکن نہ تو کبھی یہاں ٹھہرا تھا اور نہ ہی اس علاقے سے واقف تھا۔ عمر نے مجھے بتایا کہ جس گھر میں سامان رکھا تھا وہ پھوکٹ کی ساحلی پٹی پر کرابی کا قصبہ ہے۔ پھوکٹ صوبہ بھی ہے لیکن اصل پھوکٹ ایک جزیرہ ہے اور وہی ہماری منزل ہے۔ تھوڑے سے سفر کے بعد ہم ساحل کے ایک مخصوص حصے پر پہنچ گئے۔ یہاں درجنوں موٹر بوٹس کھڑی تھیں۔ عمر کے کارندے وہاں موجود تھے۔ ہم نے دونوں گاڑیاں وہاں چھوڑیں اور ایک نہایت آرام دہ موٹر بوٹ میں روانہ ہوگئے۔ عمر نے بتایا کہ پل کے راستے سے جانا محفوظ نہیں کیونکہ یہاں کی پولیس پل پر سے گزرنے والی گاڑیوں کے نمبر نوٹ کرتی ہے اور سمگلنگ یا کسی بھی غیر قانونی کام میں ملوث لوگ منزل تک پہنچنے کے لیے اپنی سواریاں کئی کئی بار تبدیل کرتے ہیں۔ مجھے بھی اپنے محکمے میں ٹریننگ کے دوران سکھایا گیا تھا کہ کسی کا پیچھا کرتے وقت یا کسی پیچھا کرنے والے کو جھٹکنے کے لیے سواریاں تبدیل کرو،

مختلف راستے اختیار کرو یا اچانک یوٹرن (U-Turn) لو۔ ہماری موٹر بوٹ خاصی تیز رفتار تھی۔ سامنے روشنیوں سے جگمگاتا ہوا پھوکٹ تھا۔ آدھ گھنٹے میں ہی ہماری بوٹ پھوکٹ کے ساحل پر جالگی۔ وہاں بھی عمر کے آدمی دو گاڑیاں لیے ہمارے منتظر تھے۔ چند منٹوں میں ہی ہم شنگریلا ہوٹل پہنچ گئے۔ جہاں ہمارے لیے تین کمرے پہلے سے بک کیے جاچکے تھے۔ بمبئی میں بھی مجھے حاجی مستان اور یوسف پٹیل جیسے نامی گرامی سمگلروں کا کام کرنے کا انداز دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن جتنا ڈسپلن، خاموشی اور وقت کی پابندی عمر کے کارندوں میں دیکھی، بمبئی والے اس کے عشر عشیر بھی نہ تھے۔ یہاں سب کام میکانکی انداز میں ہورہا تھا۔ ہم نے قریب ایک گھنٹہ آرام کیا۔ اب شام گہری رات میں بدل چکی تھی لیکن پھوکٹ میں گہما گہمی بڑھتی جارہی تھی۔ جزیرہ تو ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کی روشنی اور نیون لائٹس کے اشتہاروں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ سمندر پر کھڑے بجرے اور چھوٹے جہاز روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ پانی کی لہروں سے جھلملاتی یہ روشنیاں ایک انتہائی مسحور کن سماں باندھ رہی تھیں۔ میں خاصی دیر اس منظر کی دلفریبی میں کھویا رہا۔ پروگرام کے مطابق مجھے عمر کے ساتھ رات دس بجے ایک تیز رفتار بوٹ میں ایک بجرے پر جانا تھا جہاں ایک یورپی گاہک کو اس نے "مال" فروخت کرنا تھا اور سودا طے ہونے کے فوری بعد مال کی ڈیلیوری دینی تھی۔ ڈیلیوری مکمل ہونے تک ہمیں بجرے میں ہی ٹھہرنا تھا اور مال کی قیمت لے کر واپس لوٹنا تھا۔ عمر اس مشن میں بھی مجھے ہمراہ لے جارہا تھا۔ مجھے اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ آئی کہ وہ میری موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس کے تمام کارندے تھائی اور پٹھان تھے۔ جو اس کے لیے جان تو دے سکتے تھے لیکن انگریزی سے نابلد اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باعث گاہکوں کے سامنے اس کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خن سا نے بھی مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی نہایت پر کشش دعوت دی تھی۔

ہم نے کھانا کھایا اور پونے دس بجے ساحل پر پہنچ گئے۔ اس بار پانچ موٹر بوٹس ہماری منتظر تھیں۔ ایک میں ہم نے بجرے تک جانا تھا۔ دو بوٹس میں کرابی سے مال بجرے تک لانا تھا۔ ایک بوٹ نے بجرے اور کرابی کے درمیان سمندر میں ہماری بوٹ سے سب اچھا کا سگنل وصول کرنا اور کرابی والی بوٹس کو پاس کرنا تھا اور پانچویں بوٹ نے جس پر جدید اسلحہ سے لیس محافظ تھے مال لانے والی بوٹس کو تحفظ دینا اور بجرے سے ہماری واپسی پر ہمیں کور (Cover) دینا تھا۔ زیر زمین دنیا کے اصولوں کے مطابق انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ تمام تدابیر مال اور رقم کو تحفظ دینے کے لیے کی جاتی ہیں۔ اپنی زندگی کی حفاظت خود کرنی پڑتی ہے۔ ہم پندرہ منٹ میں بجرے تک پہنچ گئے۔ ہماری بوٹ میں بوٹ ماسٹر کے علاوہ عمر کے دو ذاتی محافظ بھی تھے۔ عمر اور میں نے اپنے اپنے پسٹل بوٹ میں بیٹھنے سے پہلے ہی چیک کرلیے تھے اور محافظ بھی پوری طرح چوکنا تھے۔ ہماری بوٹ بجرے کے ساتھ جا کر لگ گئی۔ ملنے کا وقت چونکہ پہلے سے طے ہوچکا تھا، اس لیے بجرے پر گاہک کے محافظ ہمارے منتظر تھے۔ کوڈ

ورڈز کا تبادلہ ہوا۔ ٹارچوں سے ہماری شناخت کی گئی اور پھر ہمیں دوسری جانب آنے کا کہا گیا جہاں بجرے کے ایک کٹ میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ جن کے ذریعہ عمر اور میں بجرے کے عرشے پر پہنچ گئے۔ عرشے سے ہمیں نچلی طرف ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ کمرہ کیا تھا ایک انتہائی دیدہ زیب اور قیمتی فرنیچر سے سجا ہوا ہال تھا جس میں ایک طرف بار بنی ہوئی تھی جس میں دنیا کی مہنگی ترین انواع و اقسام کی شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ کمرے میں سفید سوٹ میں ملبوس ایک موٹا اور ادھیڑ عمر یورپی صوفے پر بیٹھا تھا جسے برہنگی کی حد تک مختصر لباس پہنے چھ سات یورپی حسینائیں گھیرے ہوئے تھیں۔ اس آدمی نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہم سے ہاتھ ملایا۔ رسمی طور پر ہمیں مشروبات کی دعوت دی۔ ہمارے انکار پر اس نے اشاروں میں ہی ان لڑکیوں کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سب فوراً ہی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ہم اس آدمی کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے تھے اور ہم تینوں کے سوا کمرے میں کوئی اور موجود نہ تھا۔ عمر نے اپنی جیب سے ہیروئن کا ایک چھوٹا پیکٹ نکال کر اسے دیا۔ اس نے صوفے کے بالکل ساتھ پڑے انٹرکام پر کسی کو بلایا۔ ایک گٹھے ہوئے جسم والا شخص کمرے میں داخل ہوا اور ہیروئن کے سیمپل کا پیکٹ کھول کر سونگھا اور چٹکی بھر ہیروئن منہ میں ڈال لی۔ یہ ہیروئن کی کوالٹی کا ٹیسٹ تھا۔ قارئین یہاں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ 70ء کے عشرے کے آخر تک ہیروئن کی بیرونی ممالک میں سپلائی کا واحد مرکز گولڈن ٹرائی اینگل تھا۔ پاکستان ابھی اس لعنت سے محفوظ تھا۔ گولڈ ٹرائی اینگل کی ہیروئن کو براؤن پاؤڈر کا نام دیا گیا تھا اور یہ کوالٹی میں ساٹھ فیصد تک خالص تھی۔ منشیات میں یہ ایک نیا اضافہ تھا۔ منشیات کے عادی کوکین اور چرس زیادہ استعمال کرتے تھے۔ 80ء کے عشرے میں پاکستان کوالٹی میں نمبر ایک ہیروئن بنانے والا ملک بن گیا اور 96 فیصد تک خالص ہیروئن بنانے لگا گیا۔ یہ بالکل سفید تھی اور اسے وائٹ پاؤڈر (White Powder) کا نام دیا گیا۔ چکھنے والے نے اثبات میں سر ہلایا۔ موٹا آدمی صرف یونانی زبان بولتا تھا لہٰذا دوسرے آدمی نے مترجم کے فرائض ادا کیے۔ دو ٹن ہیروئن کا سودا طے پایا اور پہلی کھیپ ایک ٹن مقرر ہوئی۔ عمر اور میں ان سے اجازت لے کر عرشے پر آگئے۔ عمر نے جیبی ٹارچ سے بوٹ میں بیٹھے محافظوں کو سگنل دیا۔ انہوں نے اپنی سرچ لائٹ سے درمیان میں ٹھہری بوٹ کو سگنل پاس کیا اور اس بوٹ سے کرابی والی بوٹوں کو سگنل دیا گیا۔ قصہ مختصر ایک گھنٹے کے اندر تینوں بوٹس بجرے سے آلگیں اور ہیروئن کے کارٹن بجرے میں منتقل ہونے شروع ہوئے۔ سگنل دینے کے بعد ہم پھر کمرے میں آگئے تھے۔ وہاں بڑے سوٹ کیسوں میں ڈالروں کی گٹھیاں لائی گئیں۔ ہیروئن کی قیمت ڈھائی لاکھ ڈالر فی کلوگرام کے حساب سے 25 کروڑ ڈالر بنتی ہے یعنی سوٹ کیسوں میں ہوا سو سو ڈالر کی 2500 گٹھیاں تھیں۔ ڈالروں بھرے سوٹ کیس بوٹس میں منتقل کیے گئے اور ہم گرم جوشی سے دونوں غیر ملکیوں سے ہاتھ ملا کر اپنی بوٹ میں اتر آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ عمر کچھ گھبرایا ہوا سا ہے۔ اس نے محافظوں کو کہا کہ رڈ الرٹ (Red Alert) پوزیشن ہے۔ ہم دونوں نے

بھی اپنے پسٹل کلک کر لیے۔ عمر نے مجھے بتایا کہ ہیروئن لانے والی بوٹس کا پیچھا کیا گیا ہے اور عین ممکن ہے واپسی کے سفر میں اٹیک ہوجائے۔ ہم سب انتہائی چوکنا ہوئے اندھیرے میں چاروں طرف دشمن کو دیکھ رہے تھے۔ میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے عمر نے بوٹس کو ایک دوسرے کے پیچھے یا ساتھ چلنے کے بجائے پھیل کر چلنے کا کہا۔ اس طرح دشمن کے لیے ٹارگٹ میں تعین مشکل ہوجاتا ہے۔

ابھی اندازاً آدھا سفر ہی طے ہوا تھا کہ اندھیرے سے اچانک نمودار ہوکر دو بوٹس نے ہم پر فائر کھول دیا۔ ڈالروں والے سوٹ کیس ہماری بوٹ میں نہیں تھے۔ حملہ کرنے والوں کے خیال میں اسی بوٹ میں تھے جس پر ہم سوار تھے۔ ہماری دو بوٹس سے روشنی کے راؤنڈ فائر ہوئے اور جونہی دونوں حملہ آور بوٹس پوری طرح دکھائی دیں ہماری روشنی کے راؤنڈ فائر کرنے والی دونوں بوٹس تیزی سے حملہ آور بوٹس کی طرف بڑھیں اور ان پر خودکار ہتھیاروں سے مسلسل فائر کرنے لگیں۔ حملہ آوروں کے لیے یہ کاؤنٹر اٹیک (Counter Attack) خلاف توقع تھا۔ راؤنڈز کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ ہماری بوٹس کے آدمی کھڑے ہوکر ان پر فائر کر رہے تھے اور حملہ آور بوٹ میں چھپ کر۔ ہمارے محافظ ماہر نشانچی تھے اور بے خوف بھی۔ حملہ آور دونوں بوٹس میں سے تین آدمیوں کو میں نے چیخ کر کھڑے ہوتے اور سمندر میں گرتے دیکھا۔ حملہ آوروں کے لیے یہی نقصان بہت کافی تھا۔ دونوں بوٹس تیزی سے گھومیں اور اندھیرے میں گم ہوگئیں۔ ہماری بوٹس سے بھی فائر رک گیا۔ اور ہم نے بھی اسی میں عافیت دیکھی کہ خاموشی سے بقیہ سفر طے کریں کیونکہ فائر کی آواز سے کوسٹ گارڈ والے بھی چونک سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہم بخیر و عافیت کرابی کے ساحل پر پہنچ گئے۔ گاڑیاں ہماری منتظر تھیں۔ سوٹ کیس گاڑیوں میں منتقل کیے گئے۔ کرابی والے گھر پہنچ کر سوٹ کیس محفوظ کر لیے گئے اور عمر نے چین کا سانس لیا۔ اس نے اب بذریعہ سڑک پھوکٹ جانے کا پروگرام بنایا جہاں ہم نے رات بسر کرنی تھی اور اگلے روز واپس جانا تھا۔ چلنے سے پہلے میں نے عمر کو کہا کہ میرے خیال میں ہم پر حملہ محض اتفاقیہ نہیں تھا بلکہ یہ Planned حملہ تھا اور اسی کا کوئی آدمی مخبر تھا جس نے حملہ آوروں کو اطلاع بھیجی ہے۔ میں نے کہا کہ کسی کو علم نہیں تھا کہ سودا طے ہوتا ہے یا نہیں اور مال کس وقت بوٹس پر لوڈ کرنا ہے۔ مال لے جاتے ہوئے بوٹس پر اس لیے حملہ نہیں کیا گیا کیونکہ اتنی بھاری مقدار کا مال غائب کرنا آسان نہیں جبکہ ڈالروں کے سوٹ کیس نسبتاً زیادہ آسانی سے چھپائے جاسکتے ہیں۔ ہماری واپسی کا بھی کسی کو علم نہ تھا کہ کب ہوگی؟ مخبری یقیناً بوٹس میں مال لوڈ کرنے کے بعد ہوئی ہے۔ عمر نے میری بات توجہ سے سنی اور ایک ایک کرکے گھر کے تمام مکینوں کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ مال لوڈ کرنے کے بعد کون ساحل سے گھر کے بجائے کہیں اور گیا ہے۔ سب نے کہا کہ صرف سمپورن پیٹ میں درد کی دوا لینے آدھ گھنٹے کے لیے باہر گیا تھا ورنہ سب اکٹھے گھر واپس آئے تھے اور کوئی بھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ گاڑیوں کے ڈرائیور بھی تمام وقت اپنی گاڑیوں میں گھر کے سامنے یا ساحل پر موجود رہے۔ سمپورن سے پوچھا گیا تو

اس نے دوا لانے والی کہانی سنائی۔ میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا کہ تم کیمسٹ سے دوا لینے سے پہلے جس سے ملے تھے وہ کون تھا؟ میں نے تو یہ سوال یونہی داغ دیا تھا لیکن سمپورن گھبرا گیا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں لڑکھڑاتی زبان میں بولا، ''وہ تو ایک دوست تھا جو سرِراہ مل گیا تھا۔'' ''اور تم اس کے ساتھ کہاں گئے تھے، ہمیں سب علم ہے۔'' یہ سن کر تو سمپورن کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ وہ مسلسل تھوک نگل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہوچکے تھے اور زبان ساتھ دینے سے قاصر تھی۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا ''بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں'' اور یکبارگی جیب سے پستول نکال لیا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس کے پسٹل نکالنے سے پہلے ہی میرا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں جاچکا تھا جس میں کلک ہوا پسٹل تھا۔ میں نے جیب کے اندر ہی سے اس کا اندازاً نشانہ لیتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ گولی عین اس کے سینے میں لگی۔ وہ اچھل کر پیچھے گرا اور ڈھیر ہوگیا۔ عمر کو چند لمحے سمجھ ہی نہیں آئی کہ فائر کہاں سے ہوا ہے؟ جب میں نے کھڑے ہوئے پسٹل باہر نکالا اور اس کی نال پھونک مار کر صاف کی تو عمر کے پلے پڑا۔ "Wonderful" کہتے ہوئے عمر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا۔ اس کے ساتھی بھی حیران و سراسیمہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ سمپورن کے پسٹل نکالنے کی وجہ سے اب کسی شک و شبے کی گنجائش نہ تھی کہ وہ غداری کا مرتکب ہوا ہے اور اگر میں اسے گولی نہ مارتا تو اس کا نشانہ میں یا عمر ہوتا۔ عمر نے تھائی زبان میں محافظوں کو کچھ کہا جو اس کی لاش اٹھا کر باہر لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی نہ جانتے ہوئے بھی مجھے یقین تھا کہ محافظ سمپورن کی لاش کو سمندر میں پھینکنے لے گئے ہیں۔ خونی شارک انسانی جسم کو مکمل طور پر ختم کر دیتی ہے اور پھوکٹ کا سمندر ان سے بھرا ہوا ہے۔

اگلے روز دس بجے ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا اور شام ڈھلتے ہم ملائیشیا میں عمر کے کوٹا بارو والے گھر پہنچ گئے۔ گھر کے ملازموں نے ڈالروں والے اور ہمارے ذاتی سوٹ کیس اٹھائے۔ رات کو سوتے وقت میں سوچ رہا تھا کہ نجانے میرے ہاتھوں سے ابھی اور کتنے خون ہونے ہیں؟ بمبئی سے انسانی زندگیوں سے کھیلنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ کھٹمنڈو میں شدت پکڑ گیا اور آج پھر سمپورن میری گولی سے مرا۔ بمبئی اور کھٹمنڈو میں میرے ہاتھوں سی بی آئی کے چار افسر گھر کی ملازمہ اور اس کا شوہر ہلاک ہوئے۔ کھٹمنڈو میں مکتی ہنی کے چودہ ایجنٹ میرے ہاتھوں مارے گئے اور آج پھر ایک انسانی زندگی کا میرے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔ اگرچہ مجھے ان سب کو ہلاک کرنے پر کبھی ندامت یا ضمیر پر بوجھ محسوس نہیں ہوا لیکن ایک خلش آج بھی بے چین کر دیتی ہے۔ میرے ہاتھوں آج تک کل اکیس افراد ہلاک ہوئے تھے جن میں سے سوائے سمپورن کے کسی نے مجھ پر اسلحہ نہیں تانا تھا۔ سمپورن کے سوا ہلاک ہونے والے بیس افراد میرے وطن کے اور میرے دشمن تھے۔ اگر میں انہیں ہلاک نہ کرتا تو یقیناً وہ یا مجھے ہلاک کر دیتے یا میرے وطن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے۔ لیکن یہ ''اگر'' کا لفظ مجھے پریشان کر دیتا تھا۔ آخر کس قانون کے تحت میں نے ان لوگوں کی زندگی ختم کی؟ کیا ''اگر'' یا دوسرے معنوں میں مکمل شک

مجھے کسی کی زندگی لینے کا حق دیتا ہے؟ آخر ان لوگوں کے بھی تو والدین، بیوی بچے اور بہن بھائی ہوں گے۔ ایک انسان کو مارنے کا مطلب ہے والدین کے بڑھاپے کا سہارا چھیننا، بچوں کو یتیم اور بیوی کو بیوہ کرنا۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے، جس نے ایک انسان کو قتل کیا اس نے پوری انسانیت کو قتل کیا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے والا امریکی پائلٹ لاکھوں انسانی زندگیوں کو ختم کرنے کا بوجھ آخرکار سہہ نہ سکا اور پاگل ہو کر مر گیا۔ پاگل پن کے دوران اور مرتے وقت بھی اس کی زبان پر یہی فقرہ تھا۔ One Who kills a man, hc kills a whole world. Don't know how many worlds I have killed. (جو ایک انسان کو ہلاک کرتا ہے وہ ایک دنیا کو ہلاک کر دیتا ہے۔ نجانے میں نے کتنی دنیائیں ہلاک کی ہیں) میں سوچتا ہوں کہ میرے ہاتھوں نہ چاہتے ہوئے بھی کتنی دنیائیں ہلاک ہو چکی ہیں۔ میں اس خونی ہولی سے تنگ آچکا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں حتی الامکان کسی کو قتل کرنے سے گریز کروں گا۔ لیکن میرے اس فیصلے پر تقدیر مسکرا رہی تھی۔ ابھی میرے ہاتھوں اتنی ہلاکتیں ہونی تھیں، اتنا خون بہنا تھا کہ جس کے سامنے ماضی کا خون محض چند قطرے دکھائی دیتا۔ بہرحال سونے سے پہلے میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ صبح میں عمر سے اپنے اصلی مقصد یعنی بنگلہ دیش میں چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے رانگا مائی جانے کے لیے گائیڈ اور سامان اٹھانے والے مزدوروں کا فوری انتظام کرنے کا آخری بار کہوں گا اور اگر اس نے لیت و لال کیا تو مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے کوئی دوسرا ذریعہ تلاش کروں گا۔

اگلی صبح ناشتے پر میں نے عمر سے اپنے آئندہ سفر، گائیڈ اور مزدوروں کی بات کی۔ عمر نے ساری بات سن کر کہا، ”میں تو چاہتا تھا کہ مزید چند روز آپ میرے ساتھ رہیں لیکن اب میں آپ کو مزید نہیں روکوں گا۔ میں آج خن سا کو مال کی قیمت ادا کرنے جا رہا ہوں۔ کل واپسی پر اس کے آدمی بھی ہمراہ لے آؤں گا جو برما، آسام اور بنگلہ دیش کے پہاڑی علاقے اور سفر سے بخوبی واقف ہوں گے۔ خن سا کے آدمیوں کے علاوہ محافظ اور تین مزدور میں آپ کو دوں گا۔ یہ سب آپ کے ہمراہ رانگا مائی جائیں گے اور آپ کے ہمراہ ہی واپس آئیں گے۔ اس قافلے کے تمام لوگ جدید ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح ہوں گے اور اپنے خون کے آخری قطرے تک آپ کی حفاظت کریں گے۔ میری واپسی کل شام کو ہوگی اور پرسوں صبح آپ اپنے مشن پر روانہ ہو سکتے ہیں۔ اس دوران آپ یہاں میرے گھر پر قیام کریں۔“ میں عمر سے جس روز پہلی بار ملا تھا اس نے میری عزت اور میزبانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی لیکن اس کی آج کی گفتگو میں جو خلوص دکھائی دیا وہ یقیناً سمپورن کے ہاتھوں اس کی زندگی بچانے کی وجہ سے تھا۔ جس کا ثبوت اگلی شام ہی مل گیا جب اس کے نو آدمیوں کے علاوہ خن سا کے بھیجے ہوئے پانچ مسلح گائیڈ عمر کے واپس آنے سے پہلے ہی اس کے گھر پہنچ گئے۔ ایک اور اچھی بات یہ ہوئی کہ ان چودہ افراد میں سے چار خاصی انگریزی بول سکتے تھے۔ عمر نے اگلی صبح آٹھ بجے انہیں تیار

رہنے کا حکم دیا۔ میری موجودگی میں عمر نے انہیں کہا کہ وہ اب سے مکمل طور پر میرے احکام پر عمل کریں گے اور میری اور میرے ساتھ رانگا مائی سے آنے والے مہمانوں کی پوری طرح حفاظت کریں گے۔ عمر کے الفاظ تھے، ”اگر تمہارے کمانڈر (یعنی مجھے) یا مہمانوں کو کوئی بھی گزند پہنچا تو وہ واپس ہرگز نہ آئیں کیونکہ میرے اور خن سا کے فیصلے کے مطابق نہ صرف ان کے گھروں کو جلا دیا جائے گا بلکہ ان کے افراد خانہ کو بھی ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس لیے ایسی صورت میں وہ خود مزید چند روز زندہ رہ سکیں گے جب تک کہ ہمارے شکاری انہیں تلاش کر کے ٹھکانے نہ لگا دیں۔“ سب نے عمر کی یہ وارننگ خاموشی سے سنی۔ اس کے بعد عمر نے انہیں میرے حوالے کیا یعنی میری کمانڈ میں دے دیا۔ میں نے سب کا اسلحہ چیک کیا۔ پانچ مشین گنیں، چودہ پسٹل اور ریوالورز کے علاوہ ان کے پاس ہزاروں راؤنڈ اور بڑے شکاری چاقو تھے۔ خن سا نے تین جیپیں بھی بھیجی تھیں جن پر سب کے لیے سلیپنگ بیگ، فوری ضرورت کی ادویات، وافر مقدار میں ٹن فوڈ (ڈبوں میں بند کھانا) اور پانی تھا۔ خن سا کے احکام کے مطابق جہاں تک ممکن ہوا ہمارا سفر جیپوں میں ہونا تھا اور ہماری واپسی تک جیپوں نے وہیں پر ہمارا انتظار کرنا تھا۔ جیپوں پر پٹرول بھرے درجنوں جیری کین بھی موجود تھے کیونکہ برما میں ہمارے روٹ پر پٹرول ملنا تقریباً ناممکن تھا۔ عمر نے مجھے علیحدہ لے جا کر ایک بڑی چوڑی بیلٹ دی، جس میں چار بیگ لگے ہوئے تھے۔ ”ان میں کچھ ڈالر ہیں۔ یہ میری طرف سے زاد راہ کے طور پر قبول کریں۔ راستے میں اگر ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو بلا دریغ انہیں ہلاک کر دیں۔ اور یہ دو خط خن سا نے دیے ہیں۔ برما میں اگر فوجیوں نے آپ کا راستہ روکا تو یہ خط انہیں دکھا دیں۔ خن سا کے برما کے فوجی کمانڈروں سے ذاتی تعلقات ہیں۔ یہ خطوط آپ کے لیے نہ صرف راہداری کا کام دیں گے بلکہ فوجی اپنی حفاظت میں آپ کو بارڈر تک پہنچائیں گے۔ اگر ہمارے آدمیوں میں سے کسی نے حکم عدولی یا نافرمانی کی تو اسے بھی ہلاک کر دیں۔ یہ دوسروں کے لیے سبق ہوگا۔ میرے اور خن سا کے چار آدمی کچھ دور رہ کر آپ کے قافلے پر نظر رکھیں گے تاکہ کسی ایمرجنسی یا ضرورت کے وقت آپ کو کمک مل سکے۔ آپ اب اندر چلیں تاکہ وہ چاروں اور آپ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ میں عمر کے ساتھ ایک اندرونی کمرے میں گیا۔ وہاں مضبوط جسم کے چار افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے انگریزی میں مجھے مخاطب کیا، ”جناب، ہم عقابوں کی طرح آپ کے قافلے پر مسلسل نظر رکھیں گے۔ جب آپ ضرورت محسوس کریں تو سرخ روشنی کا راؤنڈ فائر کر دیں۔ ہم فوراً آپ تک پہنچ جائیں گے۔“ عمر نے مجھے بتایا کہ ہمارا قافلہ تھائی لینڈ کے سرحدی قصبے چنگ مائی میں دو روز قیام کرے گا۔ اس دوران چاروں محافظ برما میں داخل ہو کر اور ہمارے روٹ پر خاصے آگے جا کر راستے کے محفوظ ہونے کا تعین کریں گے اور اگر سب اچھا ہوا تو دو روز بعد صبح آپ اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں۔ عمر نے مجھے راستے میں پیش آنے والی دشواریوں اور ان پر قابو پانے کے طریقوں سے بھی بخوبی آگاہ کیا۔ یہاں پر میں قارئین کو بھی مختصراً بتاتا چلوں، تھائی لینڈ اور برما

کا بارڈر ہم نے چنگ مائی کے قریب کھن یوان (Khun Yuan) کے گاؤں سے کراس کر کے برما کے سرحدی گاؤں کموپیو (Kemopyu) میں داخل ہونا تھا۔ رانگاماٹی تک کے سفر کو ہم نے برما سے چار حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلا حصہ یا پڑاؤ ہمیں برما میں تان گپ (Taungup) کے قصبے میں کرنا تھا۔ بارڈر سے اس قصبے کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ تین سو میل تھا اور یہ قصبہ برما کے صوبہ اراکان(Arakan) میں واقع تھا جہاں مسلمان نسبتاً زیادہ تعداد میں آباد تھے۔ تین سو میل کے اس سفر کو طے کرنے کے لیے ہم نے سات دن رکھے تھے جو ذرائع مواصلات کی موجودگی میں بمشکل سات گھنٹے کا سفر ہوتا۔ یہ حصہ سب سے دشوار گزار اور خطرناک تھا۔ اس سارے سفر میں سڑک نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ قسم قسم کے انتہائی زہریلے حشرات الارض سے یہ علاقہ پٹا پڑا تھا۔ چیتے، جنگلی بلیاں اور شیر بھی اس علاقے میں بکثرت تھے۔ سانپ اور بچھو اتنے زیادہ تھے کہ نگاہ ہر وقت آئندہ اٹھنے والے قدم پر جمی رہتی تھی۔ پھر یہاں کے مچھر خدا کی پناہ۔ اتنے زیادہ اور زہریلے تھے کہ ایک مچھر بھی کاٹ لے تو ملیریا یقینی تھا۔ برما میں مستقل فوجی حکومت تھی جس کا دائرۂ اقتدار و اختیار صرف دارالحکومت رنگون اور گرد و نواح کے قریبی قصبات تک محدود تھا۔ باقی تمام ملک کے لوگ اپنی حفاظت کے خود ذمہ دار تھے۔ ڈاکوؤں کے بے شمار گروہ وجود میں آ چکے تھے۔ جنہوں نے ملک بھر میں اپنے اپنے علاقے بانٹ رکھے تھے۔ جو گاؤں اور قصبہ انہیں معقول رقم بطور خراج دیتا، وہ نہ صرف ڈاکوؤں سے محفوظ رہتا بلکہ خراج لینے والے ڈاکو ان کی دوسرے ڈاکوؤں سے حفاظت بھی کرتے۔ حکومتی اخراجات کا بڑا حصہ خن سا ادا کرتا اور باقی ضرورت چین اور روس کی حکومتیں پوری کرتیں۔ میں نے برما کے ان دنوں کے حالات کا مختصراً احاطہ کیا ہے۔ قانون نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ فوجی حکومت اور اس کے سپاہی تک جسے چاہتے گولیوں سے بھون ڈالتے۔ نہ کوئی عدالت تھی، نہ منصف اور نہ قانون۔ انہی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے قافلے کے افراد پوری طرح سے مسلح تھے کیونکہ دوران سفر ہم اچانک کسی بھی ناگہانی آفت میں گھر سکتے تھے۔

عمر نے مجھے بھینچ بھینچ کر گلے لگایا اور میری کامیابی کے ساتھ واپسی کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ تینوں جیپیں ایک دوسرے کے پیچھے روانہ ہوئیں۔ چاروں خفیہ محافظ ہمارے بعد گھر سے نکلے تھے اور انہوں نے سیدھے برما کے خاصا اندر جا کر اور حالات دیکھ کر دو دن کے اندر مجھے چنگ مائی میں رپورٹ دینی تھی اور پھر ہمارے قافلے نے برما کی جانب کوچ کرنا تھا۔ یہ چاروں محافظ بھی جیسے کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، ایک جیپ اپنے ہمراہ لائے تھے۔ دوران سفر ایک بار ان کی جیپ ہمارے بہت کام آئی۔

ہم کوٹا بارو سے تھائی لینڈ میں داخل ہوئے، یہ تھائی لینڈ کا انتہائی جنوبی علاقہ تھا اور ہمیں پورا تھائی لینڈ گزر کر انتہائی شمال میں چنگ ماہی پہنچنا تھا۔ چنگ ماہی پہنچنے میں ہمیں چھتیس گھنٹے لگے۔ سفر تھا کہ الامان۔ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ جوں جوں ہم شمال کی جانب بڑھتے گئے، سردی بڑھتی گئی۔

پہاڑی سلسلہ شروع ہوا تو ایسے دلفریب قدرتی مناظر دیکھنے کو ملے کہ اللہ پاک کی صناعی پر جتنی بھی داد دی جائے کم تھی۔ بھرپور اور گھنے جنگلات، دریا، آبشاریں، ہاتھیوں کے غول یہ ایسے دلربا مناظر فطرت تھے جن کے طلسم میں انسان کھو کر رہ جاتا ہے۔ ٹوکیو سے لے کر امریکہ تک آپ کسی بھی ملک کے بڑے شہروں میں جائیں آپ کو سب میں ایک یکسانیت ملے گی۔ ہر جگہ وہی سر بہ فلک عمارتیں، کشادہ سڑکیں اور گاڑیوں کی ریل پیل۔ ان شہروں کا ہر شخص ہر وقت جلدی میں الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے اگر آج کام ختم نہ ہوا تو قیامت آ جائے گی۔ ہر بڑا شہر سیمنٹ اور سٹیل کا جنگل بنا ہوا ہے اور قدرتی حسن سے یکسر محروم ہے۔ ہمارا چھتیس گھنٹے کا سفر ختم ہوا تو ان قدرتی نظاروں کی وجہ سے جتنی تھکن تھی، سب ختم ہو چکی تھی۔ شہروں کی مسموم فضا سے نکل کر آلودگی سے پاک قدرتی ہوا میں ہم خود کو تر و تازہ اور چاک و چوبند محسوس کر رہے تھے۔ عمر کے آدمیوں نے ایک موٹل (Motel) میں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔ سارے چنگ مائی میں صرف ایک پاکستانی ریسٹورنٹ تھا۔ میں نے وہاں کھانا کھایا۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک پختہ کناروں والی بڑی نہر یا دریا بہتا ہے وہاں صرف رات کو بازار لگتا ہے جہاں مقامی لوگ اپنی بنائی ہوئی ہینڈی کرافٹ کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ یہاں کے شہری لوازمات اور رنگ و بو کی دنیا سے قطعی ناآشنا ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی ستر فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ مجھے یہ شہر اور لوگوں کی سادگی اتنی پسند آئی کہ میں نے سوچا کہ اگر زندگی نے وفا کی اور حالات سازگار ہوئے تو مستقل طور پر یہیں بقیہ زندگی بسر کروں گا۔

اسی پاکستانی ریسٹورنٹ میں خفیہ محافظوں نے ہمیں آل کلیر کا سگنل دیا اور تیسرے دن صبح سات بجے ہمارا چھوٹا سا کارواں برما کے بارڈر کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں میں قارئین کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ برما اور تھائی لینڈ کے بارڈر پر کم از کم اس علاقے میں کوئی حد بندی نہ تھی۔ دونوں اطراف کے لوگ سرحدی قصبوں میں بلا روک ٹوک آتے جاتے تھے۔ برما کی فوج جسے عوام Organised Gang of Gangsters (لٹیروں کا منظّم گروہ) کہتے تھے، اپنے ملک کے اندر بڑے قصبات اور شہروں میں عوام اور کاروباری طبقے سے بھتہ لیتے تھے اور یہی ان کی تنخواہ تھی۔ ساری دنیا سے سفارتی تعلقات منقطع کر کے برما دنیا بھر کے باقی ملکوں سے تقریباً کٹ چکا تھا۔ امپورٹ اور ایکسپورٹ نہ ہونے کے برابر تھی۔ انسانی حقوق نام کی کوئی شے نہ تھی۔ ہر بات کا حل صرف گولی تھا۔ برمی مسلمانوں کی حالت تو اور بھی ناگفتہ بہ تھی۔ وہاں تو مسجد بنانے، اذان دینے اور نماز پڑھنے پر بھی ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ میں یہ باتیں یہاں محض اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ برما کو کراس کرتے وقت ہمیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس کی وجہ اور پس منظر قارئین کے ذہن نشین رہے۔

ہم سہ پہر چار بجے تھائی لینڈ کے سرحدی قصبے کھن یوان (Khun Yuan) کو بائی پاس کرتے ہوئے برما میں داخل ہوئے اور برما کے سرحدی قصبے کیموپیو (Kemopyu) کے قریب سے

گزرتے ہوئے اس سڑک پر روانہ ہوئے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی فوج نے ہنگامی ضرورت کے لیے بنائی تھی۔ اب اس سڑک کا صرف نام ہی تھا۔ پتھروں اور کنکروں کے ایک مسلسل لمبے ڈھیر پر سے ہماری جیپیں جارہی تھیں۔ راستے میں جگہ جگہ گرے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کو ہٹاتے، کھائیوں سے بچتے ہماری فور وہیل ڈرائیو جیپیں بمشکل آٹھ دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ گائیڈ کے مطابق ہمارا پہلا پڑاؤ ٹونگو (Toungoo) میں ہونا تھا۔ لیکن سڑک کی ناگفتہ بہ حالت اور سورج غروب ہونے تک ہم بمشکل چالیس میل کا سفر طے کرسکے۔ جیپوں کے انجن بے حد گرم ہوچکے تھے۔ اندھیرا چھانے کے باعث جنگلی درندوں کا بھی خطرہ تھا۔ بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ جہاں بھی ذرا سی کھلی جگہ مل جائے وہیں رات بھر کے لیے کیمپ لگا دیا جائے۔ جلد ہی ایک مناسب جگہ پر ہم نے گاڑیاں روک دیں۔ چھ آدمی فوراً ہی ٹہنیاں اکٹھی کرنے چل دیے۔ جنگلی جانوروں اور سانپوں وغیرہ سے بچنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ چاروں طرف آگ کا دائرہ بنا کر رات بھر آگ جلتی رکھی جائے۔ جب خاصی مقدار میں ٹہنیاں اکٹھی ہوگئیں تو ہم نے درمیان میں جگہ صاف کرکے چھوٹے ٹینٹ لگائے۔ کھانا کھانے کے بعد ٹہنیوں کو آگ دکھادی اور میں نے تین تین آدمیوں کی آگ کے دائرے کے باہر تین تین گھنٹے کی نگرانی کی ڈیوٹی لگادی۔ ابھی ہم ان انتظامات میں مصروف تھے کہ سامنے سے گاڑی کے انجن کی آواز اور ہیڈ لائٹس کی جھلملاتی روشنی دکھائی دی۔ ہم سب نے اپنا اسلحہ نکال کر ہاتھوں میں لے لیا۔ آنے والی صرف ایک ہی گاڑی تھی اور ایک آدمی اس کے آگے پیدل چل رہا تھا۔ جب وہ ذرا اور قریب آئے تو میرے ساتھیوں نے پیدل اور گاڑی میں بیٹھے تین آدمیوں کو اپنی شست میں لے لیا۔ ابھی وہ گولیوں کی باڑھ مارنے ہی والے تھے کہ میں نے پیدل آنے والے کو پہچان لیا۔ وہ ہمارے خفیہ محافظوں میں سے انگریزی بولنے والا تھا۔ میں نے چلا کر ساتھیوں سے کہا کہ فائر نہ کریں۔ میرے ساتھی حیران تھے کہ میں نے انہیں فائر کرنے سے کیوں روکا اور آنے والے اجنبی کون تھے؟ ہمارے بالکل نزدیک آکر انہوں نے گاڑی روکی۔ میں نے انگریزی بولنے والے کو الگ لے جاکر یہاں آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ تقریباً آٹھ میل آگے فوجیوں کا ایک دستہ رات بھر کے لیے پڑاؤ کررہا ہے۔ اس لیے وہ بھی راستے میں ہی رک گئے اور پھر ہمیں بتانے کے لیے واپس آگئے ہیں۔ میرے پاس اب اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ ان کا اپنے ساتھیوں سے ہمارے کارواں کے ہراول دستے کے طور پر تعارف کراؤں۔ ہم فوجیوں سے جان بوجھ کر مڈبھیڑ نہیں چاہتے تھے۔ خفیہ محافظوں نے بتایا کہ فوجیوں نے جہاں پڑاؤ کیا ہے وہاں سے ایک سڑک سکان چھاؤنی (Sakan Cantt) کو جاتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ رات بھر یہاں قیام کرکے صبح واپس جاکر فوجی دستے کی روانگی کا انتظار کریں گے۔ اگر وہ سکان کی جانب گئے تو ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے اور اگرانہوں نے ٹونگو (Toungoo) کا رخ کیا تو پھر ہم ان کی روانگی کے چوبیس گھنٹے بعد یہاں سے چلیں گے۔ ان کا

ہماری جانب آنا بعید از قیاس تھا کیونکہ بارڈر کی طرف آنے کی انہیں کوئی ضرورت نہ تھی۔ محافظ ساتھیوں کے بقول اس فوجی دستے کے تین ٹرک کھانے پینے کے سامان اور اسلحہ سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ سامان وہ یقیناً چھاؤنی میں ہی لے جارہے تھے۔

ہمارے چاروں نئے ساتھیوں نے اپنی جیپ بھی آگ کے دائرے کے اندر کھڑی کردی۔ مچھروں نے اب بھرپور یلغار کردی تھی۔ ہر سو خاموشی میں گیدڑوں اور دوسرے چھوٹے جانوروں کی آوازیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ اگلی صبح ہم سب جلد ہی اپنے اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس گئے جب کہ پہریداروں نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔ فوجی ہم ڈبل روٹی اور چائے کے ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ہمارے خفیہ محافظ جو منہ اندھیرے ہی دستے کی روانگی دیکھنے گئے تھے، واپس آگئے اور ہمیں بتایا کہ ہماری سوچ کے عین مطابق فوجی دستہ سکان (Sakkan) چھاؤنی کی طرف روانہ ہوگیا ہے۔ ہمارے لیے اب راستہ کھلا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی پڑاؤ کا سامان سمیٹا اور رات بھر جلنے والی آگ کے نشان مٹائے۔ میں نے خفیہ محافظوں کو کہا کہ اب انہیں ہم سے زیادہ دور رہنے کی ضرورت نہیں وہ صرف ایک میل کے لگ بھگ ہم سے آگے رہیں۔ ہم نے صبح ساڑھے آٹھ بجے اپنی جیپیں سٹارٹ کیں اور ٹونگو کی راہ لی۔ ہمارے گائیڈ کے مطابق اگر سب اچھا رہا تو شام پانچ بجے تک ہم کو ٹونگو پہنچ جانا تھا۔

ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، درختوں کا گھنا پن کم ہورہا تھا اور چھوٹی چٹانیں اور پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے نمایاں ہورہے تھے۔ میری جیپ میں بیٹھے گائیڈ نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ اس علاقے میں دنیا کا بہترین یاقوت ملتا ہے جسے Pigeon Blood کا نام دیا گیا ہے۔ اور تھوڑا سا شمال کی جانب جائیں تو ہیروں کی کانیں ہیں۔ انگریزوں کے دور میں یہاں سے ہیرے اور یاقوت کی باقاعدہ کان کنی ہوتی تھی۔ لیکن ڈاکوؤں اور فوجی جنتا کے یہ قیمتی پتھر کانوں کے مالکوں اور ٹھیکیداروں سے مسلسل چھیننے کی وجہ سے کان کنی بند ہوچکی ہے۔ اب کچھ مہم جو اپنی زندگی داؤ پر لگا کر صرف دو تین دن یہاں بلاسٹ (Blast) کرکے یہ پتھر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ پہلے بلاسٹ میں ہی کروڑوں روپے کے یاقوت اور ہیرے ان کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ کچھ بڑی امیدوں کے ساتھ خالی ہاتھ آتے اور خالی ہاتھ ہی جاتے ہیں اور بعض ایسے بدقسمت ہوتے ہیں جو بہت کچھ پالینے کے بعد ڈاکوؤں کے ہاتھوں نہ صرف مالی طور پر لٹ جاتے ہیں بلکہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ گائیڈ نے مزید بتایا کہ اسی علاقے میں جاپانی اور برطانوی فوج میں دوسری جنگ عظیم کے بعد شدید لڑائی ہوئی تھی۔ ہر قسم کے گولا بارود کے استعمال کے ساتھ ساتھ دونوں فوجوں میں دست بدست بائیونٹ فائٹنگ کے بھی سینکڑوں واقعات ہوئے تھے۔ انگریز فوجی تو جاپانیوں کو دیکھتے ہی بھاگ جاتے تھے لیکن پنجابی مسلمان اور سکھ فوجی آخری گولی ختم ہونے کے بعد بھی جاپانیوں سے دست بدست لڑتے تھے۔ اسی بہادری کے صلے میں مسلمان اور سکھ فوجیوں کو اس

جنگ میں سب سے زیادہ تعداد میں وکٹوریہ اور جارج کراس جیسے بہادری کے اعلیٰ ترین تمغے ملے۔ اگرچہ برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا تھا لیکن پسپائی کے باوجود یہ فوجی بہادری اور جرأت کی انمول داستانیں رقم کر گئے۔

سڑک کے نہ ہونے کے باعث ہم رات نو بجے کے بعد ٹونگو پہنچے۔ یہ قصبہ نما گاؤں بالکل خاموش اور سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یہاں بجلی بھی نہ تھی حالانکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے برصغیر میں انگریزی حکومت کے آخری دور میں تیل کی پہلی کمپنی کا نام برما آئل کمپنی تھا۔ ہم نے گاؤں کے شروع میں ہی اپنا کیمپ لگایا اور چار ساتھیوں کو گاؤں سے کھانا اور پانی لانے کو بھیج دیا۔ گائیڈ کے مطابق آئندہ سفر میں کئی بار ایسے مواقع پیش آنے تھے جن میں کئی کئی روز تک ہمیں اپنے ہمراہ لائے ہوئے Tin Food اور پانی پر گزارہ کرنا تھا اس لیے حتیٰ الوسع ہمیں مقامی خوراک حاصل کرنی چاہیے تھی۔ ہمارے ساتھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد گاؤں کے ایک جھونپڑا نما ہوٹل سے انڈوں کا سالن، اُبلے چاول اور پانی لے آئے۔ یہ رات بھی ہم نے پہریداروں کی نگرانی میں گزاری اور اگلی صبح سات بجے ہی اپنے سفر روانہ ہوگئے۔ گائیڈ نے بتایا تھا کہ اب وہ علاقہ شروع ہو رہا ہے جہاں انتہائی زہریلے سانپ، بچھو اور مچھروں کے علاوہ جنگلی درندے بھی دندناتے پھرتے ہیں۔

ہماری آئندہ منزل پوکوانگ (Poukkaung) اور اس کے بعد پائی (Pye) تھی۔ اندازے کے مطابق ہمیں Pye تین دنوں میں پہنچنا تھا۔ راستے میں چھوٹے دریا بھی آتے تھے۔ جن پر کوئی پل نہ تھا۔ دراصل ہم نے برما کو کراس کرنے کے لیے جو روٹ چنا تھا، وہ برما کے انتہائی جنوبی حصہ میں تھا۔ دارالحکومت رنگون ہمارے روٹ کے آخری جنوبی حصے میں تھا۔ ہمارا اس روٹ کو اختیار کرنے کا واحد مقصد شہروں اور فوجی علاقوں سے ہٹ کر جانا تھا کیونکہ ہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر برما سے گزرنا چاہتے تھے۔

تیسرا باب

اب تک ہمارا سفر چھوٹی چھوٹی سفری دشواریوں کے سوا بخیر وخوبی طے ہوا تھا اور یہی خیال تھا کہ آئندہ بھی کسی بڑی رکاوٹ کے بغیر ہم برما کراس کر جائیں گے۔ عمر اور خن سا نے اپنے قابل اعتماد آدمی میرے ہمراہ بھیجے تھے اور چلتے وقت عمر نے انھیں تنبیہ بھی کی تھی کہ اگر انھوں نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی دکھائی تو انھیں انتہائی بھیانک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ گائیڈ، مزدور اور محافظ بظاہر میرے ہر حکم کی تعمیل کر رہے تھے لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم جتنا برما کے اندر بڑھ رہے ہیں، ان کی آپس میں کھسر پھسر بھی بڑھ رہی ہے۔ خصوصاً جب سے خن سا کے بھیجے ہوئے چاروں محافظوں کو جنھیں ہمارے ہراول کے طور پر ہم سے چند میل آگے رہنا تھا، میں نے رات کو پڑاؤ میں اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا اور دوسروں کو ان کے متعلق بتا بھی دیا تھا، اس وقت سے میرے باقی ہمراہیوں میں کچھ بے چینی سی پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں نے اسے محض اپنا وہم سمجھا لیکن جب ایک گائیڈ نے مجھ سے پوچھا کہ ان چاروں کے متعلق میں نے انھیں پہلے کیوں نہیں بتایا تو میں چونک گیا کیونکہ مجھ سے اس طرح کے سوال کرنے کی انھیں اجازت نہ تھی۔ میں نے گائیڈ کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ خود بھی سمجھ لے اور دوسروں کو بھی بتا دے کہ وہ عمر اور خن سا کے احکام کے مطابق صرف اپنے کام سے کام رکھیں۔ میرے ہمراہ اور کتنے لوگ ہیں اور ان کے کیا فرائض ہیں، یہ جاننا ان کے لیے قطعاً ضروری نہیں۔ اگر وہ اس سفر میں میرے ہمراہ جانا نہیں چاہتے تو بے شک واپس چلے جائیں۔ میں عمر اور خن سا کو یہیں سے ان کے واپس جانے کی اطلاع بھجوا دوں گا اور ان کا جو بھیانک حشر ہوگا اس کے تمام تر ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔

گائیڈ اپنے ہمراہیوں کے پاس چلا گیا تو میں نے اپنے ذاتی اسلحہ اور دیگر سامان کا جائزہ

لیا۔ میرے پاس پسٹل اور دو سو راؤنڈ، ہینڈ گرنیڈز اور راستہ صاف کرنے کے بڑے خنجروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں اکیلا صرف ایک جیپ اور اس پر لدا سامان اپنے ہمراہ سے جاسکتا تھا۔ راستہ میرے لیے بالکل انجان تھا۔ اگر ڈاکوؤں یا فوجیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی تو اس اسلحہ کے ساتھ میں کتنی دیر تک اپنا دفاع کرسکتا تھا۔ میرے سامنے صرف دو ہی راستے تھے اول یہ کہ میں ہمراہیوں کے دل میں خن سا اور عمر کے انتقام کا ڈر پیدا کروں اور انھیں اپنے ہمراہ چلنے پر مجبور کروں اور یہ میں نے کردیا تھا۔ دوسرا رستہ یہ تھا کہ میں ان کے دل میں چھپے اس خوف کی وجہ جان سکوں جو خن سا کے بھیجے چار محافظوں کی وجہ سے ان کے دلوں میں پیدا ہوا تھا۔ چند منٹ سوچنے کے بعد میں نے گائیڈ کو بلایا اور پوچھا کہ بجائے خوش ہونے کے کہ ہمارے قافلے میں چار اور محافظ بھی ہمارے ساتھ ہیں یہ لوگ پریشان کیوں ہیں؟ گائیڈ نے پہلے تو مجھے ٹالتے ہوئے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں لیکن جب میں نے اسے مزید کریدا اور کہا کہ اس قافلے کے سالار کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ اپنے ہمراہیوں کی پریشانی کا سبب جانوں اور جہاں تک ممکن ہو ان کی پریشانی کا سدباب کروں تو گائیڈ پھٹ پڑا۔ ”جناب! یہ چاروں لاؤس کے چھاپہ مار ہیں اور خن سا کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان چاروں نے دو ماہ قبل ہمارے تین ساتھیوں کو صرف اس جرم میں گولیوں سے بھون ڈالا کہ انھوں نے ہیروئن کی کھیپ کا ان کے حصے کا وزن اٹھانے سے انکار کردیا تھا۔ وہ تینوں پہلے ہی اپنے حصے کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ انکار تو ایک نے کیا تھا لیکن اپنے خلاف گواہ ختم کرنے کے لیے انھوں نے تینوں کو مار ڈالا اور خن سا کو جاکر بتایا کہ وہ مال لے کر بھاگ رہے تھے۔ اس لیے ان تینوں کو انھوں نے ختم کرکے مال بچا لیا۔ یہاں ہمارے ساتھیوں میں مرنے والوں میں سے ایک کا بھائی بھی شامل ہے۔ اس نے گزشتہ رات ان کے آنے کے بعد ان سے اپنے بھائی کو ہلاک کرنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ پڑاؤ کے باہر آؤ، ذرا گھوم پھر آئیں۔ وہیں تمھیں وجہ بھی بتا دیں گے۔ ہمارا ساتھی ان کے ساتھ تو نہیں گیا لیکن اس نے دوسرے تمام ساتھیوں کو یہ بات بتادی۔ اسی وقت سے قافلے میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کا پیغام سب تک پہنچا دیا ہے اور سب کا ایک ہی جواب ہے کہ آپ کی حکم عدولی کی سزا یا معافی خن سا اور عمر ہماری بات سن کر ہی دیں گے لیکن یہ چاروں تو اپنا بھید نہ کھلنے کے لیے آپ سمیت ہم سب کو ختم کرسکتے ہیں۔ اسی خوف سے ہمارے آدھے سے زیادہ ساتھی یہیں سے واپس جانے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ جو باقی ہیں وہ بھی بھاگنے والوں کی دیکھا دیکھی واپس چلے جائیں گے۔ ان چاروں کا کیا ہے، یہ سب کچھ لوٹ کر کبھی واپس نہ آنے کے لیے لاؤس چلے جائیں گے اور یا خن سا کے پاس جاکر ایسی گھڑی گھڑائی خبر سنائیں گے جس کی تردید کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ میں نے آپ کو تمام حالات اور خدشات بتا دیے ہیں۔ اب فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔“ اپنی بات پوری کرکے گائیڈ نے جو تھائی مسلمان تھا ہاتھ جوڑ کر مجھے سلام کیا اور ذرا فاصلے پہ کھڑا ہوگیا۔

واقعی بڑی پریشان کن صورت حال تھی۔ قافلے کے ساتھیوں کو اپنی جانوں کا اتنا زیادہ خوف تھا کہ وہ واپس لوٹنے اور عمر اور خن سا کا عتاب سہنے کو بھی تیار تھے۔ ادھر مجھے اپنے مشن کو بہرطور مکمل کرنا تھا۔ اگر صرف گائیڈ ہی واپس چلا جاتا تو میرے لیے باقی سب لوگ بیکار تھے۔ یہ چاروں لاؤسی صرف ہراول دستے کا کام دے رہے تھے اور انھیں خن سا اور عمر نے اجازت دے رکھی تھی کہ قافلے کے لوگوں میں سے اگر کوئی میری حکم عدولی کرے تو اسے بلاجھجک ہلاک کردیں۔ مشن سے واپسی پر راجہ ترِی دیو کی بیوی اور لڑکے کے علاوہ انمول جواہرات کا خزانہ بھی ہمارے ہمراہ ہونا تھا۔ اگر قافلے کے لوگوں میں سے چند یا صرف ایک ہی جواہرات کے لالچ میں غداری پر آمادہ ہوجاتا تو ہم سب کو بے خبری میں ہلاک کرسکتا تھا۔ تھائی فطرتاً دوسروں کے مقابلے میں صلح جو اور پرامن ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے گھر بار اور خاندان کے لوگوں تک خن سا اور عمر کی بھی رسائی تھی لیکن لاؤسی ایک بار غائب ہوجاتے تو ان تک کسی کا بھی پہنچنا محال تھا۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹہ تمام صورت حال کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور بالآخر ایک فیصلہ کرکے سرخ روشنی کا ایک راؤنڈ فائر کیا۔ یہ ان لاؤسیوں کے لیے فوراً واپس آنے کا سگنل تھا۔ ابھی بیس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ چاروں لاؤسی اپنی جیپ میں میرے پاس آگئے۔ میں نے خوش دلی سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اسی دوران میرے قافلے کے لوگ بھی ہمارے گرد جمع ہوچکے تھے۔ میں نے انھیں کہا کہ آئندہ سفر جاری رکھنے سے پہلے میں سب کا اسلحہ چیک کرنا چاہتا ہوں تاکہ مجھے تسلی ہوجائے کہ کسی ہنگامی صورت حال سے نپٹنے کے لیے ہماری فائر پاور کتنی ہے؟ میں نے قریب کھڑے پانچ چھ تھائیوں کا اسلحہ لیا اور چیک کرکے انھیں لوٹا دیا۔ تھائیوں کے لیے گائیڈ میرا مترجم تھا جبکہ ایک لاؤسی ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتا تھا۔ ان چاروں کے پاس چینی ساختہ سب مشین گنیں اور ریوالور تھے۔ میرے اسلحہ طلب کرنے پر پہلے تو وہ کچھ جھجکے لیکن اپنے مترجم کے کہنے پر انھوں نے اپنا تمام اسلحہ میرے سامنے ڈھیر کردیا۔ لاؤسیوں کے متعلق میں پہلے سے جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ دو بڑے خنجر اپنی پنڈلیوں سے باندھ کر رکھتے ہیں اور اکثر لاؤسی کراٹے کے ماہر ہوتے ہیں۔ میں نے ایک ایک کرکے ان کی گنیں اور ریوالور اٹھا کر دیکھے اور چیک کرنے کے بعد اپنے سامنے رکھ دیں اور ان سے خنجر طلب کیے۔ کچھ پس و پیش کے بعد انھوں نے اپنے خنجر بھی میرے سامنے رکھ دیے۔ انھیں میرے اس طرح اسلحہ چیک کرنے پر کچھ شک سا پڑ گیا تھا۔ وہ بغیر میری اجازت کے اپنا اسلحہ اٹھانے کے لیے آگے بڑھے اور یہی لمحہ تھا جس کا مجھے انتظار تھا میں نے فوری اپنا ریوالور نکالا اور ان پر تان کر کہا کہ اگر ایک انچ بھی آگے بڑھے تو گولیاں ان کی کھوپڑیوں میں اتار دوں گا۔ میں نے گائیڈ کو اشارہ کیا تو ان کے پیچھے کھڑے تھائیوں نے انھیں پکڑ کر نیچے گرادیا اور اس سے پہلے کہ وہ کراٹے کے داؤ آزمائیں، دو دو تھائی ان کی پشت پر بیٹھ گئے اور انھیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔

میں نے انگلش بولنے والے لاؤسی کو سیدھا لٹانے کو کہا اور اس سے پوچھا کہ تم لوگوں نے

تین تھائیوں کو شوٹ کیوں کیا تھا؟ ''چونکہ وہ بمعہ سامان کے بھاگ رہے تھے۔'' ''کیا تمھارے ان ساتھیوں کے علاوہ تمھارا کوئی اور گواہ بھی ہے۔ اور تم ان کو ٹانگوں میں گولیاں مار کر زخمی کر سکتے تھے، ان کو ہلاک کیوں کیا؟ اب یہ لوگ تم سے بدلہ لیں گے۔'' میں نے اسے ڈرانا چاہا۔ ''یہ تھائی کتے ہم سے کیا بدلہ لے سکتے ہیں۔ ان میں چانگ ست کے خاص آدمی بھی ہیں اور اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ہمیں گزند پہنچانے والے کا کیا انجام ہوگا؟'' لاؤسی نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔ ''چانگ ست کون ہے؟'' میرے استفسار پر لاؤسی بولا، ''خن سا کا ابھی تک نمبر ٹو ہے اور بہت جلد خن سا کی جگہ لے گا۔'' میرے لیے یہ بالکل نئی بات تھی۔ عمر کے مطابق خن سا کا کوئی نمبر ٹو نہیں تھا جو اس کے بہت ہی قریبی اور وفادار تھے ان میں چانگ ست نام کا کوئی بندہ نہ تھا۔ دوسری طرف میں نے دیکھا کہ عمر اور خن سا کے آدمی اپنی قومیت کی وجہ سے ایک ہو چکے تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور بدھ اور عیسائی بھی لیکن قومیت سب مذہبی اختلافات پر حاوی تھی۔ انہی میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر مترجم کے کان میں سرگوشی کی۔ مترجم بولا ''سر! یہ آپ سے علیحدگی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔'' میں اسے اور مترجم کو لے کر ایک طرف ہو گیا۔ مترجم اس کی زبانی بولا، ''سر! وہ لاؤسی سور ٹھیک کہتا ہے۔ چانگ ست، خن سا کی لٹاری کا ایک عہدے دار ہے اور ہمیشہ اسی تاک میں رہتا ہے کہ خن سا کو ختم کر کے خود گولڈن ٹرائی اینگل کا ہیڈ بن جائے۔ ان چاروں لاؤسیوں اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی چانگ ست نے ہی بھجوایا ہے۔ چانگ ست آپ کی خن سا سے ملاقات کے وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ لیکن جو لڑکی آپ کو خن سا کے کمرے میں لے گئی تھی اس نے چھپ کر آپ کی ساری باتیں سن لیں اور چانگ ست کو بتا دیں۔ چانگ ست نے ان چاروں کو حکم دیا تھا کہ جب آپ رانگا ماٹی سے خزانہ لے کر واپس لوٹیں تو یہ چاروں برما کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے ہی آپ سب کو ٹھکانے لگا کر اور خزانہ لے کر چیانگ وائی میں رک جائیں اور ایک آدمی خفیہ طور پر چانگ ست کو اطلاع دے۔ میرے اور میرے ساتھی کی ڈیوٹی یہ تھی کہ کھوج لگا کر ان کو یہ بتائیں کہ خزانہ مل گیا ہے اور کس کے پاس ہے۔ جب چانگ ست کو خزانہ مل جائے تو پھر ہم سب (چار لاؤسی اور دونوں تھائی) عمر اور خن سا کو جا کر یہ بتائیں کہ واپسی پر ڈاکوؤں نے اچانک حملہ کر کے خزانہ لوٹ لیا اور سب کو قتل کر دیا۔ ہم بڑی مشکل سے جانیں بچا کر واپس لوٹے ہیں۔ مجھے اور میرے ساتھی کو یہ خیال بھی بار بار آتا تھا کہ آخر میں یہ لاؤسی ہم دونوں کو بھی قتل کر کے اصل واقعات کے چشم دید گواہوں کو بھی ختم کر دیں گے۔ ہم نے چانگ ست سے وفاداری کا عہد کیا تھا لیکن ان لاؤسیوں نے سارے تھائیوں کو گالی نکال کر ہماری قوم کی بے عزتی کی ہے۔ میں نے چانگ ست کا راز آپ کو بتا دیا ہے۔ آپ ہم سے چاہے جو سلوک کریں، ہمیں دکھ نہیں ہوگا۔ ہم اپنی بے عزتی اور موت تو برداشت کر سکتے ہیں لیکن ساری قوم کو ذلیل کہنے والوں کو کبھی معاف نہیں کر سکتے۔''

وہ تو ساری بات کہہ کر چپ ہو گیا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ ایک یہ تھائی ہیں جن کا سارا ملک اور معاشرہ ایک قحبہ خانہ بن چکا ہے لیکن ان میں بھی ابھی قومی غیرت باقی ہے اور ایک ہم پاکستانی ہیں جو اپنی غیرت، جرات اور مردانگی کے نعرے لگاتے تھکتے نہیں لیکن ہماری قومی حمیت نجانے کس تحت الثریٰ میں پڑی سو رہی ہے کہ دنیا بھر میں ہماری رسوائی کا باعث بننے والوں کو، ملک کو دولخت کرنے والوں اور ساری دنیا سے قرض کی بھیک مانگ کر رسوا کرنے والوں کو ہماری قوم اقتدار طشتری میں سجا کر پیش کرتی ہے۔ جنرل یحییٰ خان جیسے شرابی، کبابی اور زانی حکمران کو کنپٹی پر پستول رکھ کر صدارت سے ہٹانے اور ذوالفقار علی بھٹو کو سول مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر بنانے والے نجات دہندہ جنرل گل حسن کو بھٹو نے وفاداری کا یہ صلہ دیا کہ انھیں کمانڈر انچیف بنا کر محض چھ ہفتے بعد ذلت و رسوائی کے ساتھ سبکدوش کر دیا۔ انھیں زیر حراست پنڈی سے لاہور گورنمنٹ ہاؤس لایا گیا اور وہاں بھی انھیں اذیتیں دی گئیں۔

مشورہ کرنے کے لیے میرے پاس صرف مترجم اور وہ تھائی تھا۔ میرے پوچھنے پر کہ ان لاؤسیوں سے کیسے پیچھا چھڑوایا جائے؟ انھوں نے کہا کہ برمی ڈاکو اپنے شکار کو درخت سے باندھ کر اس کا سر قلم کر دیتے ہیں اور لاش کو آگ لگا کر جلا دیتے ہیں اگر ہم بھی یونہی کریں تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ چونکہ وہ حسب ہدایت ہم سے چار پانچ میل آگے رہتے تھے اس لیے ڈاکوؤں سے ان کی مڈبھیڑ کا ہمیں کچھ پتہ نہ چلا۔ آگے پہنچنے پر ان کی سوختہ لاشیں ہی ملیں۔ میں نے اس کارروائی کے لیے اثبات میں سر ہلایا تو سارے تھائیوں نے انھیں پکڑ کر درختوں سے باندھ دیا۔ دو تھائی جو ذرا زیادہ دلیر تھے، آگے بڑھے اور اپنے خنجروں سے ان کے سر قلم کر دیے اور نعشوں پر پٹرول چھڑک دیا۔ میں نے ان دونوں تھائیوں کو جو چانگ ست کو حلف وفاداری دے چکے تھے کہا کہ نعشوں کو وہ جلائیں۔ وہ دونوں ماچس لے کر نعشوں کی طرف گئے تو میں نے ایک لاؤسی کی سب مشین گن اٹھائی اور ان دونوں پر گولیوں کی باڑھ ماری۔ دنوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ مجھ پر غداری کی سازش عیاں ہونے کے باعث جنون چڑھا ہوا تھا۔ سارے تھائی سراسیمہ اور خاموش کھڑے تھے۔ میں نے چلا کر مترجم کو کہا کہ سب کو بتا دے کہ یہ دونوں بھی غدار اور اسی سزا کے مستحق تھے۔ میں حکم عدولی اور غداری ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا فیصلہ اور عمل سب نے دیکھ لیا ہے۔ جس کو اس سے اختلاف ہو وہ یہیں سے واپس چلا جائے۔ میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن آئندہ اگر کسی نے غداری اور حکم عدولی کے متعلق سوچا بھی تو اس کا بالکل ایسا ہی حشر ہوگا۔

مترجم خاموش ہوا تو میں نے دیکھا کہ سارے تھائی ہاتھ جوڑے اور سر جھکائے اونچی آواز میں اپنی زبان میں مسلسل کہے جا رہے تھے۔ ''ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہوگا۔''

حالات نے یک لخت کچھ ایسا پلٹا کھایا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ خن سا اور عمر کے بھیجے ہوئے یہ اعتباری آدمی درپردہ کتنی بڑی سازش کے کردار تھے۔ اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجاتے تو خن سا اور عمر کیا کرتے۔ بس چند لمحے کڑھنے کے بعد خاموش ہوجاتے، ان کے لیے انسانی زندگیوں کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ انھوں نے نہ تو کوئی تحقیقاتی کمیشن تشکیل دینے تھے اور نہ ہی خود اصلیت جاننے کی کوئی کوشش کرنی تھی۔ ہم سب کی موت ان کی روزمرہ زندگی کا ایک حصہ تھی۔ میں نے تھائی مترجم کو کہا کہ دونوں تھائیوں کی لاشوں پر بھی پیٹرول چھڑک کر سب کو آگ لگا دی جائے۔ اس کام سے فارغ ہوکر میں نے ایک خط عمر کے نام لکھا جس میں درپیش آنے والے تمام واقعات کی تفصیل تھی۔ چانگ ست کی سازش اور خن سا کے متعلق اس کے ارادے لکھ کر عمر کو مشورہ دیا کہ وہ فوری خن سا سے ملے اور کہے کہ اس لڑکی پر جو مجھے خن سا کے پاس لے گئی تھی، ذرا سختی کرے تو وہ چانگ ست کے متعلق سب کچھ بک دے گی۔ یہاں میں عرض کرتا چلوں کہ یہ خط میں نے قافلے کے سامان رسد میں سے پیاز لے کر اس کے پانی سے لکھا تھا جس کے خشک ہونے پر لکھائی بالکل غائب ہوگئی تھی۔ ایک دوسرے کاغذ پر عام روشنائی سے میں نے لکھا کہ آگ کی تپش بہت سے پنہاں رازوں پر سے پردہ اٹھادیتی ہے۔ یہ دونوں خط دو علیحدہ لفافوں میں بند کرکے میں نے ترجم کو کہا کہ عمر کے بھیجے ہوئے محافظوں میں سے کسی قابل اعتبار اور تیز چلنے والے آدمی کو لے آئے جو عمر تک میرے یہ دو خط پہنچادے۔ مترجم ایک تگڑے جوان تھائی کو میرے پاس لایا۔ دیگر ہدایات دینے کے علاوہ میں نے اس کو کہا کہ یہ دونوں خط عمر کے بھائیوں یا کسی دوسرے کو ہرگز نہ دے بلکہ عمر کے گھر کو ٹاہارو میں اس کا انتظار کرے اور عمر کے ملنے پر صرف اسے دے۔ میں نے اس تھائی کو سفر کے اخراجات کے لیے دو سو ڈالر دیئے۔ چند لمحوں میں وہ پیدل ہی واپسی کے لیے چل پڑا۔ میں نے اسے کہا کہ خط دینے کے بعد اسے واپس آنے کی ضرورت نہیں۔

اب ہمارے قافلے میں سے سات افراد کم ہوچکے تھے۔ لاؤسیوں کی جیپ میں نے سنبھال لی اور اپنے ساتھ مترجم اور گائیڈ کو بٹھالیا۔ لاؤسیوں کا سارا اسلحہ بھی میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ جب سفر شروع ہوا تو ہماری جیپ سب سے آگے تھی۔ پائی (Pye) ہم سے ابھی خاصا دور تھا اور برما میں سفر کے آغاز میں ہی ہم چھ غداروں سے نجات پاچکے تھے۔ میرے خیال میں غداروں کے عبرت ناک انجام سے قافلے کے باقی لوگوں نے خاصا سبق حاصل کرلیا ہوگا وار آئندہ سفر بغیر کسی قسم کے حادثات کے طے ہوگا لیکن بقول کسے اے بسا آرزو کہ خاک شد...!

میں اس مہماتی داستان میں حتی المقدور یہ کوشش کررہا ہوں کہ صرف وہ واقعات ہی لکھوں جو ہمیں اس مہم کے دوران پیش آئے لیکن بعض اوقات کچھ واقعات کی وضاحت کے لیے گرد و پیش کے حالات اور اس علاقے کے رسم و رواج بھی لکھنے پڑتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران برما پر پہلے

برطنیہ پھر جاپان اور برطانیہ و امریکہ نے قبضہ کیا۔ اس ملک میں بڑی سخت جنگیں لڑی گئیں۔ اس وقت کا ہندوستان (برصغیر) ان ممالک کے لیے سونے کی چڑیا کی حیثیت رکھتا تھا۔ برصغیر کے قدرتی وسائل، غربت اور Man Power کی وجہ سے ہی برطانیہ سو برس سے اپنا غلام بنائے ہوئے تھا۔ جاپان، جرمنی اور امریکہ اس پر اپنے پنجے گاڑنے کے لیے کوشاں تھے۔ اسی لیے جاپان اور جرمنی نے آزاد ہند فوج بنانے کے لیے سرمایہ دیا تھا۔ اس آزاد ہند فوج کے بانیوں میں سبھاش چندر بوس (جو دوران جنگ ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہوگئے) پاکستان کے جنرل محمد اکبر خان (رنگروٹ) بھی شامل تھے۔ برصغیر کے مغرب یعنی افغانستان کے راستے تو جرمنی اور جاپان کا ہند میں داخلہ ناممکن تھا۔ مشرقی جانب سے جاپان پیش قدمی رکتے ہوئے انڈونیشیا، سنگاپور اور ملائیشیا کو روندتا ہوا برما میں داخل ہوچکا تھا۔ برطنیہ جس کا کل رقبہ ضلع ڈیرہ غازی خان سے بھی کم ہے۔ یہ جنگ صرف برصغیر کے وسائل، اناج، دولت اور Man Power کے برتے پر لڑ رہا تھا۔ جاپانیوں کی برما میں پیش قدمی کو روکنے کے لیے برطانیہ نے اپنے تمام وسائل جنگ میں جھونک دیئے تھے، کیونکہ برصغیر پر جاپان اور جرمنی کے قبضہ کرلینے کا مطلب تھا، برطانیہ کی موت۔ جاپان کے لڑاکا جہازوں نے جنگ کے دوران کلکتہ پر بمباری بھی کی تھی اور وہ سیلاب کی طرح آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ ہر روز یہی خیال گزرتا تھا کہ جاپانی برصغیر میں اب داخل ہوئے کہ تب۔ جنگ کے لیے پناہ اخراجات نے جنگ میں شامل ممالک کے مالی وسائل کی کمر توڑ رکھی تھی۔ اپنی فوجوں کو تنخواہیں دینے، سامانِ رسد اور غیرملکی غداروں کو خریدنے کے لیے اربوں کی مالیت کے جعلی ڈالر، برطانوی پاؤنڈ، جرمن مارک، ہندوستانی روپے اور جاپانی ین ان ممالک کی حکومتوں نے جنگ زدہ ملکوں میں پھیلادیئے تھے۔ اس وقت میری عمر پانچ چھ سال تھی لیکن مجھے یہ خوبی یاد ہے کہ میرے گاؤں کے فوجی جو جاپان کے خلاف لڑتے رہے تھے اور برما سے جاپان کی پسپائی کے بعد واپس لوٹے تھے۔ یہ فوجی انھیں اصل نوٹ سمجھ بیٹھے تھے لیکن اصلیت جاننے کے بعد انھوں نے یہ نوٹ گاؤں کے بچوں میں کھیلنے کے لیے تقسیم کردیئے۔ برما میں جب ہم داخل ہوئے، اس وقت برما کی فوجی جنتا بھی جعلی امریکی ڈالر چھاپ کر اپنی ضروریات پوری کرتی تھی۔ میرے پاس اصل ڈالر تھے لیکن پائی (pye) کے شہر میں انھیں تبدیل کرانے میں مجھے بہت دشواری پیش آئی۔

روانگی کے وقت میں نے محسوس کیا کہ آدھے گھنٹے میں قافلے میں شامل چھ افراد کے قتل کے باعث قافلے میں شامل چھ افراد کے قتل کے باعث قافلے کے باقی لوگوں پر میری خاصی دہشت بیٹھ چکی تھی۔ میں نے چانگ ست جوکہ بزعم خود خن سا کا نمبر ٹو تھا، کے چھ آدمیوں کو نہ صرف ٹھکانے لگا دیا تھا بلکہ اس کی اطلاع عمر کو بھی بھجوا دی تھی۔ میرے اس عمل سے ان لوگوں نے غالبًا یہ سمجھ لیا تھا کہ میں خن سا اور عمر کے لیول کا ہوں۔ یہ سب پہلے مجھے سر کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور اب انھوں نے مجھے باس کہنا شروع کردیا۔ ہمارا قافلہ ابھی صرف نو دس میل ہی آگے بڑھا تھا کہ ہم گاڑیاں روکنے پر

مجبور ہوگئے۔ جیسا کہ میں گزشتہ اقساط میں عرض کرچکا ہوں ہم کسی باقاعدہ سڑک پر سفر نہیں کر رہے تھے بلکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران فوجی استعمال کے لیے بنائی گئی گزرگاہ جواب محض پتھروں کا ڈھیر تھی، پر جا رہے تھے اور اب بڑے پتھر اور درختوں کے ٹہنے ہمارے راستے میں حائل تھے۔ میں نے اپنے پیچھے آنے والوں کو مترجم کے ذریعے کہا کہ پتھر اور ٹہنے ہٹائیں۔ پانچ تھائی اپنی جیپ سے اترے اور راستہ صاف کرنے لگے۔ اچانک ایک تھائی نے چیخ ماری، دونوں بازو اوپر اٹھائے، چند قدم پیچھے کی جانب ہٹا، گر کر چند لمحے تڑپا اور ٹھنڈا ہوگیا۔ ہم سب اس کی طرف دوڑے۔ اس کے دائیں ہاتھ پر ابھی تک ایک مٹیالے رنگ کے تقریباً سات انچ لمبے سانپ نے اپنے دانت گاڑے ہوئے تھے۔ سب تھائی اس سے قدرے فاصلے پر کھڑے ہوگئے۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا تو مترجم نے مجھے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ خوف کے باعث اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے مجھے بتایا کہ ایک بہت ہی زہریلے سانپ نے اسے کاٹ لیا ہے۔ یہ چھوٹا سا سانپ اتنا زہریلا بھی ہوسکتا ہے؟ اس کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے میں نے اسے جیپ میں سے فرسٹ ایڈ کا بکس جس میں سانپ کے زہر کی دوا بھی تھی۔ لانے کو کہا تو اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا No Use. No Use (کوئی فائدہ نہیں) اور گرے ہوئے تھائی کی طرف اشارہ کیا۔ اب اس کے منہ سے جھاگ اور آنکھوں اور کانوں سے خون بہنا شروع ہوچکا تھا اور چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ مترجم نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ اس سانپ، کا نام سنگ چور ہے اور کہتے ہیں کہ اس کا زہر اتنا تیز ہوتا ہے کہ کسی شخص کو ڈسنے کے بعد یہ فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے کہ کہیں ڈسا ہوا شخص اس کے اوپر ہی نہ گرجائے۔ مترجم نے کہا کہ یہ سانپ بہت غصے میں تھا، اسی لیے ڈسنے کے بعد بھی اپنے دانت اس کے ہاتھ میں گاڑے رکھے۔ یقیناً اس کی مادہ بھی وہیں ہوگی اور یہ خرمستیوں میں مشغول ہوں گے، جب مرنے والے کا ہاتھ ان پر جا پڑا۔ اب کوئی بھی تھائی راستہ صاف کرنے کو تیار نہ تھا اور راستہ صاف کیے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ سالارِ قافلہ کے طور پر اب مجھے آگے بڑھنا تھا۔ میں نے جیپ سے پیٹرول بھرا گیلن اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں سب مشین گن سے پتھروں اور ٹہنوں پر فائر کرتے ہوئے پہلے اس سانپ کو گولی ماری اور پھر ٹہنوں پر پیٹرول ڈال کر انھیں آگ دکھا دی۔ آگ کی تپش سے یقین جانیے، اسی نسل کے پانچ سانپ اپنی جگہوں سے باہر نکلے جنھیں میں نے گولیوں سے اڑا دیا۔ یہ سانپ سیدھے یا لہراتے ہوئے نہیں چلتے تھے بلکہ جلیبی کی صورت میں آگے بڑھتے اور پیچھے ہٹتے تھے۔ میں نے قریباً تیس راؤنڈ فائر کیے تھے۔ ٹہنوں میں ابھی آگ بھڑک رہی تھی۔ میرے لیے یہی راستہ تھا کہ خود پتھروں کو ہٹانا شروع کروں تا کہ تھائیوں کا خوف دور ہو۔ میں نے چار پانچ پتھر ہی اٹھائے تھے کہ باقی تھائی بھی میرے ساتھ شامل ہوگئے اور چوتھائی گھنٹے میں ساری رکاوٹیں دور کرکے ہم آگے روانہ ہوگئے۔ موت کا ڈر ہو نہ ہو، سانپ کا نام سنتے ہی بڑے بڑوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور یہی

حالت ان تھائیوں کی تھی۔

ہم قریباً آٹھ میل آگے بڑھے ہوں گے کہ ایک دریا آگیا جس کا نہ تو پاٹ بڑا تھا اور نہ ہی گہرا دکھائی دیتا تھا۔ بڑے پتھر پانی میں سے جھانک رہے تھے۔ دو تھائی دریا میں اتر گئے اور دوسرے کنارے تک ہوکر واپس لوٹ آئے۔ دریا کا پانی زیادہ سے زیادہ چار فٹ گہرا تھا لیکن سارا پاٹ چھوٹے بڑے پتھروں سے بھرا پڑا تھا۔ میں نے سوائے ڈرائیوروں کے سب تھائیوں کو دریا چل کر عبور کرنے کو کہا۔ لاؤسیوں کی جیپ جسے اب میں خود ڈرائیو کر رہا تھا، میں نے سب سے پہلے خود دریا میں ڈالی اور سب ڈرائیوروں کو کہا کہ فور وہیل گیئر لگا کر تیز رفتار سے دریا میں سے گزریں۔ میری جیپ اور باقی ساری ماسوا ایک جیپ کے باآسانی دریا میں سے گزر گئیں۔ ایک جیپ دریا کے بیچ میں پتھروں میں کچھ ایسی پھنسی کہ اس کے چاروں پہیے گھومتے رہے لیکن وہ ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ مضبوط رسے تو ہمارے پاس تھے ہی لیکن لاؤسیوں کی جیپ میں ٹوچین کرنے کے لیے چرخی اور لوہے کا سنگل بھی تھا۔ تھائیوں نے سنگل کو پھنسی ہوئی جیپ کے آگے لگایا۔ پھنسی ہوئی جیپ کو تھوڑا سا ہی کھینچنا پڑا اور جونہی وہ پتھروں کی جکڑ سے آزاد ہوئی، اپنے انجن کے زور پر چل کر دریا کے باہر آگئی۔ ہم نے تھوڑی دیر کے لیے پڑاؤ کرکے چائے پی اور پھر آگے روانہ ہوگئے۔ گائیڈ کے مطابق چند میل آگے ایک اور دریا تھا جو اس سے بڑا تھا لیکن گہرائی میں زیادہ نہ تھا۔ وہ دریا بھی ہم نے عبور کرلیا لیکن دریا میں ایک گاڑی کو دھکا لگاتے ہوئے ایک تھائی کا پاؤں پہیے کے نیچے آگیا اور اس بری طرح سے کچلا گیا کہ ہم اسے پائی (Pye) کے قصبے میں ایک نیم ڈاکٹر کے پاس علاج کے لیے چھوڑ کر آگے روانہ ہوگئے۔ ہماری واپسی تک وہ تھائی اس ڈاکٹر کا Paying Guest رہا اور ڈاکٹر نے اس کا پاؤں ناقابل علاج سمجھ کر کاٹ دیا تھا۔ دریا عبور کرکے، رات کو راستے میں پڑاؤ کرکے ہم دوسرے دن بعد دوپہر پائی (Pye) پہنچے۔ یہ خاصا بڑا قصبہ تھا۔ خرید وفروخت کی دو بڑی مارکیٹوں کے علاوہ یہاں ایک سینما بھی تھا۔ ہم نے قصبے کے واحد ہوٹل میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ہوٹل کیا تھا بغیر کسی قسم کے فرنیچر کے چار بڑے بڑے کمرے تھے اور سارے خالی تھے۔ میں نے چاروں کمرے لے لیے۔ ایک اپنے لیے اور باقی تینوں تھائیوں کے لیے۔ ہمیں کمرے لیے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پولیس کے چند اہلکار آگئے۔ ہمارے پاس صرف ایک پاسپورٹ تھا۔ صرف میرا اور وہ بھی رابرٹ مائیکل کے نام سے۔ لیکن پولیس والوں نے نہ تو باقی لوگوں کے پاسپورٹ دیکھنے چاہے اور نہ ہی ہمارا اسلحہ اور بغیر نمبر کی جیپوں کی طرف کچھ دھیان دیا۔ وہ تو ہم سے کچھ اینٹھنا چاہتے تھے۔ مترجم کے کہنے پر میں نے انھیں سو امریکی ڈالر کا ایک نوٹ دیا۔ انھوں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور ہنستے ہوئے نوٹ ہمیں لوٹا کر مترجم کو کہا کہ ایسے ڈالر تو ہزاروں کی تعداد میں ہمارے پاس ہیں، جن سے ہمارے بچے کھیلتے ہیں۔ میرے اور مترجم کے لاکھ یقین دلانے کے باوجود مطمئن نہیں ہوئے اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ ایک برٹش پادری جو قریب ہی ایک چرچ

میں رہتا ہے اگر وہ کہہ دے کہ یہ نوٹ اصلی ہے تو وہ یہ نوٹ لے لیں گے اور ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔ چار و ناچار میں اور مترجم ان پولیس والوں کے ہمراہ پادری کے پاس گئے۔ چرچ سے ملحقہ پادری کی چھوٹی سی رہائش گاہ تھی۔ ہمارے تین چار بار دستک دینے پر وہ باہر آیا۔ لگ بھگ چالیس برس کی عمر کا یہ پادری ہم دو اجنبیوں کو رات کے وقت پولیس کے ہمراہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کے استفسار پر میں نے نپی تلی انگریزی میں کہا، ''ہم مسافر ہیں وار ایک دو روز پائی میں ٹھہرنے کے بعد آگے کی راہ لیں گے۔ میں ان پولیس والوں کو ہمیں بلاوجہ تنگ نہ کرنے کے عوض ایک سو امریکی ڈالر دے رہا ہوں لیکن یہ نوٹ کو جعلی سمجھ رہے ہیں اور ہم آپ کے پاس نوٹ کے اصلی ہونے کی تصدیق کے لیے آئے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے نوٹ اس کے آگے کر دیا۔ ہماری یہ گفتگو دروازے میں کھڑے کھڑے ہوئی تھی۔ نوٹ لے کر پادری نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور ہمیں اندر آنے کی دعوت دی اور اپنے مختصر سے ڈرائنگ روم میں ہمیں بٹھا کر مجھ سے کہنے لگا، ''یہ نوٹ اصلی ہے لیکن میری تصدیق کے بغیر پولیس والے اسے نہیں لیں گے اور میں بھی اپنی مالی ضروریات کی وجہ سے یونہی تصدیق نہیں کروں گا اور میرے تصدیق کرنے کا معاوضہ بھی ایک سو ڈالر ہوگا۔'' میرا جی تو چاہا اس پادری کی ایسی پٹائی کروں جسے اس کی آئندہ نسلیں بھی نہ بھول سکیں لیکن ہم برما میں بغیر کسی بڑی وجہ کے کسی قسم کا تصادم مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ اس لیے مجبوراً اس کی بلیک میلنگ کو ماننا پڑا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو پادری نے پولیس والوں کو برمی زبان میں کچھ کہا۔ انھوں نے سر ہلایا کہ ہاں کہا تو پادری نوٹ لے کر اندرونی کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر میں ہی برمی کرنسی (کیات) کا ایک بنڈل لا کر پولیس والوں کو دے دیا۔ یہ چالیس ہزار کیات تھے، پولیس والوں نے جھک کر پادری سے اور ہم سے مصافحہ کیا اور چلے گئے۔ میں نے جیب سے سو ڈالر کا ایک اور نوٹ نکال کر اسے دیا۔ نوٹ لے کر وہ کہنے لگا ''اس ناگوار کام کے لیے میں شرمندہ ہوں لیکن مجھے چرچ کا اور اپنا خرچ بہرطور پورا کرنا ہوتا ہے۔ میں آپ کو یہ بتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ سوائے رنگون کے آپ امریکی ڈالر اور پاؤنڈ وغیرہ کہیں بھی تبدیل نہیں کر سکیں گے۔ میں آپ کو چار سو کیات فی ڈالر دے سکتا ہوں، اگر ضرورت ہو تو کل دوپہر ایک بجے میرے پاس آ جائیں لیکن ابھی مجھے یہ ضرور بتا دیں کہ آپ نے کتنے ڈالر تبدیل کروانے ہیں۔'' میں نے یہ سوچ کر کہ ہمیں برما کراس کرتے ہوئے اور پھر واپسی کے سفر میں بھی برمی کرنسی کی ضرورت پڑے گی، اسے کہا کہ دو ہزار ڈالر کی برمی کرنسی چاہیے۔ ''No Problem!'' اس نے مجھے اگلے روز آنے کا کہا اور ہمیں رخصت کر دیا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ قافلے کے چھ بندوں کو ہلاک کرنے سے اگر ایک طرف میرے باقی ہمراہی مجھ سے خوفزدہ ہو گئے تھے اور میرے احکام کو بلا چون و چراں بجا لاتے تھے تو دوسری طرف ان کے اور میرے درمیان ایک غیر محسوس سی خلیج بھی حائل تھی۔ حالات ایسے تھے کہ صرف رعب اور دبدبے

سے ہی کام نہیں چل سکتا تھا۔ مجھے اب شیر کی دلیری کے ساتھ ساتھ لومڑی کی چالاکی سے بھی کام لینا تھا۔ میں نے اس کا آغاز مترجم سے کیا اور اسے کہا کہ ''تمھاری خوبیوں اور وفاداری کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں تمھیں ابھی سے اپنا نمبر ٹو مقرر کرتا ہوں۔ تم اس بات کا اعلان باقی ہمراہیوں میں بھی کر دو اور انھیں یہ بھی بتا دو کہ اپنی مہم کو کامیابی سے سر کر لینے کے عوض میں ہر ایک کو 1500 امریکی ڈالر دوں گا۔'' میرا ماضی کا تجربہ مجھے بتاتا تھا کہ جب اپنے کسی جونیئر کو اس کی تعریف کر کے اپنا نائب بنایا جائے تو وہ دل و جان سے اپنے سینیئر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مترجم ہونے کے باعث وہ پہلے ہی باقی قافلے والوں کے ساتھ میرے رابطے اور احکام دینے کا ذریعہ تھا اور اب نمبر ٹو کی حیثیت سے اسے اپنی مرضی سے چھوٹے موٹے کام کرنے کی میں نے اجازت دے دی تھی۔

اگلی صبح وہ مجھے بتائے بغیر چاروں جیپوں کو صفائی اور ضروری مرمت کے لیے ورکشاپ لے گیا۔ دوپہر ایک بجے میں پادری کے پاس گیا اور دو ہزار ڈالر دے کر آٹھ لاکھ کیات لے آیا۔ میں نے نمبر ٹو کو سب تھائیوں کے سامنے تین لاکھ کیات دیئے اور کہا کہ جیپوں کی مرمت کا خرچ دینے کے علاوہ سب جیپوں اور خالی ڈرموں میں پیٹرول بھرنے والے اور ایک لاکھ کیات ہمراہیوں میں برابر تقسیم کر کے باقی اپنے پاس رکھے اور اگر آئندہ سفر کے دوران کوئی چیز لینا مناسب سمجھے تو خرید لے۔ میں نے اسے مزید ایک لاکھ کیات ڈاکٹر کے پاس اپنے زخمی ساتھی کے قیام و طعام اور علاج کے لیے دیئے۔ یہاں میں قارئین کو بتاتا چلوں کہ اگرچہ برمی کرنسی کی بین الاقوامی مارکیٹ میں کوئی ویلیو نہیں تھی لیکن برما کے اندر اشیا ضرورت اس قدر سستی تھیں کہ ایک لاکھ کیات رکھنے والا خاصا امیر سمجھا جاتا تھا۔ میں نے مترجم کو یہ بھی کہا کہ وہ زخمی ساتھی کے علاج کے لیے ایک لاکھ کیات دینے کی بات بھی سب کو بتا دے تاکہ ان کو یہ احساس ہو جائے کہ میں صرف حکم دینے اور اس کی بجا آوری ہی نہیں چاہتا بلکہ اپنے ہمراہیوں کا ہر طرح سے خیال بھی رکھتا ہوں۔

وہ شام سارے تھائی گھومنے پھرنے اور پینے پلانے کے لیے نمبر 2 کی اجازت سے شہر میں چلے گئے۔ نمبر ٹو بھی مجھ سے اجازت لے کر ان کے ساتھ ہی چلا گیا اور میں ہوٹل کے کمرے میں لیٹا اس مہم کے دوران ماضی میں پیش آنے والے واقعات اور آئندہ سفر کے دوران درپیش آنے والی مشکلات کا احاطہ کرنے لگا۔ میں نے چیانگ رائی سے چلتے وقت دہلی میں قیصر سے ٹیلی فون پر بات کی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ دس دن کے اندر اپنے ساتھیوں سمیت کالا دان پہنچ جائے اور کسی ہوٹل میں ٹھہرے۔ میں بھی اس وقت تک کالا دان پہنچ جاؤں گا۔ ہم میں سے جو بھی پہلے پہنچیں گے وہ دوسری کا انتظار کریں گے۔ میں بامر مجبوری تھائیوں کے ہمراہ جا رہا تھا لیکن اصل مہم کے دوران میں صرف اپنے آزمودہ ساتھیوں پر ہی اعتبار کر سکتا تھا۔ واپسی پر میرے ہمراہ راجا تری دیو کی بیوی اور لڑکے کے علاوہ جواہرات کا بیش بہا خزانہ بھی ہونا تھا اور اسی وجہ سے میری ذمہ داری بہت بڑھ جاتی تھی۔ انھی خیالات

میں کھویا ہوا میں نجانے کب سوگیا اور صبح اس وقت جاگا جب دروازے پر زوردار دستک دی جا رہی تھی۔ دروازہ کھولا تو نمبرٹو کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ رات نشے کی حالت میں تھائیوں کی ایک شراب خانے میں چند برمیوں سے تو تکار ہوگئی تھی۔ وہی پولیس والے ہواں بھی موجود تھے۔ جھگڑا ہاتھا پائی تک بھی نہیں بڑھا تھا لیکن پولیس والں نے دو تھائیوں کو پکڑ لیا اور اب انھیں لے کر مجھے ملنے آئے ہیں۔ میں جلدی جلدی تیار ہوکر نیچے آیا تو پولیس والوں نے ہوٹل کے مالک کے ذریعے جو تھوڑی بہت انگریزی جانتا تھا، مجھے بتایا کہ جھگڑا کرنے کی وجہ سے ان کو پکڑا گیا ہے لیکن ابھی تک کوئی کاغذی کارروائی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے پولیس والوں سے پوچھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ''ان کو چھوڑنے کے لیے 'Some Money' یعنی سو ڈالر۔ میں خواہ مخواہ کا جھگڑا کرنا اور بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے خاموشی سے اوپر اپنے کمرے میں آیا اور چالیس ہزار کیات لے کر پولیس والوں کو دے دیئے۔ اب یہاں مزید ٹھہرنے کا مطلب تھا کہ ہر روز پولیس والوں کو رشوت دی جائے اور نجانے کب وہ زیادہ رقم کا مطالبہ کر بیٹھیں۔ میں نے نمبرٹو سے کہا کہ اب سے ٹھیک دو گھنٹے بعد ہم یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔ سب نے جلدی جلدی رخت سفر باندھا اور ہم نو بجے اپنی آئندہ منزل یعنی ٹوانگپ پاس ''Tuangap Pass'' کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

اگر آپ برما کے نقشے کو دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ برما کو کراس کرنے کے لیے میں نے جو رستہ چنا تھا وہ سیدھا نہیں بلکہ بل کھاتا ہوا (Zig Zag) اور بڑے شہروں سے دور نسبتاً کم آباد علاقوں سے گزرتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں خود اپنے ساتھیوں کو فوجیوں اور حکومت کے کارندوں سے حتیٰ الامکان کسی تصادم سے بچانا چاہتا تھا کیونکہ ہمارا مشن برما میں نہیں بلکہ چٹا گانگ (بنگلہ دیش) کے پہاڑی علاقوں میں رانگاماٹی تک جانا اور بخیر و عافیت واپس لوٹنا تھا۔ واپسی پر بھی ہمیں برما سے گزرنا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں برما میں تلخیاں چھوڑ جاؤں تاکہ ہماری واپسی پر وہ ہم سے بدلہ لینے کے لیے تیار بیٹھے ہوں۔ اسی مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے Pye میں نہ صرف پولیس کو رشوت دی بلکہ پادری کی بلیک میلنگ کو بھی جانتے بوجھتے ہوئے خاموشی سے قبول کیا۔ اب توان گپ پاس (Tuangup Pass) نامی پہاڑی درے سے گزر کر ہمیں ٹوانگ گپ کے قصبے میں جانا تھا۔ میری معلومات کے مطابق یہ پہاڑی درہ صوبہ اراکان میں جانے کا کم از کم اس علاقے میں جہاں سے ہم گزر رہے تھے، واحد ذریعہ تھا۔ صوبہ اراکان میں مسلم آبادی نسبتاً باقی برما کے خاصی زیادہ ہے۔ فوجی جنتا کا بھی اس صوبے پر Hold بہت کم تھا۔ اسی لیے حکومت نے اس صوبے کو باقی ملک کی نسبت بہت کم سہولتیں دی تھیں۔ ٹوانگ گپ پاس کے داخلی سرے پر خاصی تعداد میں فوجی تعینات تھے اور ان کی چیکنگ کے بغیر اس درے کو کراس کرنا محال تھا۔ مترجم اور ایک گائیڈ سے مشورے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ درے اور پائی کے درمیان ایک چھوٹے سے قصبے پوڈوانگ (Poduong) میں رکا جائے

اور میں گائیڈ کے ہمراہ آگے جاکر درے کی صورت حال اور چیکنگ کا معیار دیکھوں اور کوشش کرکے کچھ فوجیوں کو اپنے ساتھ ملالوں تاکہ ہمارا قافلہ چیکنگ اور پوچھ تاچھ کے بغیر درہ کراس کر جائے۔ ہم قریب بارہ بجے تین گھنٹے کے سفر کے بعد پوڈوانگ پہنچ گئے۔

پوڈوانگ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور اس میں بھی ایک چرچ تھا۔ ہم نے چرچ کے باہر جیپوں کو ٹھہرایا اور میں پادری سے ملنے چرچ کے اندر چلا گیا۔ پادری کو میں نے اپنا پاسپورٹ دکھا کہ کہا کہ میں پاکستان سے 7th Day Church (عیسائی مذہب کے ایک فرقے سے وابستہ ہوں اور آسام میں ایک عیسائی بستی کے مکینوں کے لیے کارڈینل کو بھیجی گئی مدد کی اپیل کے جواب میں ان کے پاس جا رہا ہوں اور مجھے درے سے گزرنے کے لیے اس کی مدد درکار ہے۔ یہ پادری رومن کیتھولک تھا اور 7th Day والوں سے ان کا مذہبی اختلاف بالکل ایسا ہی تھا جیسے پاکستان میں شیعہ اور سنیوں میں ہے۔ حالانکہ ایک اللہ، ایک قرآن اور ایک نبی ختم الرسل رحمت العالمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ماننے والوں کو ان پیشہ ور مولویوں نے محض اپنے حلوے مانڈے کے لیے سو کے قریب مختلف فرقوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اور انہی نیم ملاؤں کی وجہ سے امت مسلمہ کی طاقت یکجا ہوکر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے آپس میں ہی دست و گریباں ہو رہی ہے جس کا فائدہ غیرمسلم اور ہنود و یہود اٹھا رہے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد دہلی میں میرے قیام کے دوران بھارتی فوجی جاسوسی ایجنسی DMI کے بریگیڈیئر رنجیت کی خفیہ ڈائری میرے ہاتھ آگئی تھی جسے پڑھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس وقت کے بعض چوٹی کے سیاست دانوں، بزنس میگنٹس کے علاوہ چند پاکستانی ایسے علما کے نام بھی اس میں لکھے ہوئے تھے جو DMI کے پے رول پر تھے اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے بڑے اور نامور مذہبی عالم بھارتی ایجنٹ ہوں گے اور آج تو یہ حال ہے کہ امریکی CIA کے پے رول پر ان سے دو چند زیادہ علما ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں راہ راست پر لائے اور یہ پاکستانی مسلمانوں کو بجائے بھٹکانے کے ایک پلیٹ فارم پر لاکر متحد ہونے کا درس دیں۔ بات ہو رہی تھی پوڈوانگ کے پادری کی۔ اس نے میری ساری بات سن کر اور میرے اصرار کے باوجود میری مدد کرنے سے صاف جواب دے دیا۔ میں پریشانی کے عالم میں چرچ سے باہر آیا تو گائیڈ نے میری کیفیت سے حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا کہ وہ اس درے سے کئی بار گزر چکا ہے کہ جب بھی کسی نے روکنے کی کوشش کی تو اس نے خن سا کی تصویر جس کی پشت پر خن سا نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے، فوجیوں کے افسر کو دکھائی۔ تصویر دیکھ کر اور عبارت پڑھ کر افسر نے اسے فوراً جانے کی اجازت دے دی۔ مجھے یک لخت خیال آیا کہ خن سا نے مجھے بھی فوجیوں سے بچنے کے لیے خطوط دیے تھے۔ میں نے پہلے گائیڈ کی تصویر اور اگر اس سے کام نہ بنے تو خن سا کے خطوط کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے گائیڈ کو کہا ہم دونوں فوجیوں کے افسر کے پاس جائیں گے جب کہ باقی قافلہ ہم سے ایک میل پہلے رک جائے گا۔ پہلے تم اپنی ترکیب سے کام

نکالنے کی کوشش کرنا۔ اگر اس طرح کامیابی ہوگئی تو بہت ہی بہتر ورنہ پھر میں اپنی کوشش کروں گا۔

تھوڑی دیر میں ہی ہمارا قافلہ درے کی طرف روانہ ہوگیا۔ درے کے بالکل قریب گائیڈ نے باقی قافلہ رکوا دیا اور میں گائیڈ کے ہمراہ درے کے آغاز پر فوجی چوکی پر چلا گیا جہاں بقول گائیڈ ان کا افسر بیٹھتا تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ پہلے والا افسر تو کب کا ٹرانسفر ہوچکا ہے اور اس کی جگہ نیا افسر (میجر) آیا ہے اور آج ایک جنرل بھی معائنے کے لیے آیا ہوا ہے۔ اپنی پہچان والے افسر کے نہ ہونے کا سن کر گائیڈ تو مایوس ہوگیا اور مجھے واپس چلنے کو کہا لیکن میں نے جنرل کو ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ خن سا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ برما کے فوجی حکمرانوں سے اس کے نہ صرف ذاتی تعلقات تھے بلکہ وہ فراخ دلی سے ان کی مالی اعانت بھی کرتا تھا۔ یقیناً اس کے لکھے ہوئے خطوط معمولی افسروں کے لیے نہیں بلکہ Top Brass کے لیے تھے۔ میں نے اس کے دونوں خطوط کے لفافوں پر ایڈریس دیکھے تو واقعی دو جرنیلوں کے نام تھے۔ گائیڈ کو باہر چھوڑ کر میں چوکی کے ساتھ بنے ہوئے میس (Mess) میں گیا بلکہ نئے میجر نے اپنے سپاہیوں کے ہمراہ مجھے وہاں بھیجا۔ میں نے ADC کو ایک سادہ کاغذ پر ''خن سا کے خط کے ساتھ اس کا ایک دوست'' لکھ کر جنرل کے لیے دیا۔ میجر جنرل شال گپ نے مجھے دس منٹ میں ہی طلب کرلیا۔ وہ ایک چالیس پینتالیس سالہ خاصا پڑھا لکھا اور اکثر مسکراتے رہنے والا شخص تھا۔ مجھ سے رسمی تعارفی کلمات کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا ''وہسکی یا چائے؟'' جواباً میں نے کہا ''صرف تمھاری مسکراہٹ۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تو میں نے اسے خن سا کا خط دیا۔ ایڈریس پڑھ کر اس نے کہا، ''یہ خط میرے لیے نہیں ہے لیکن میں خن سا کا دوست ہوں اور اس کی تحریر پہچانتا ہوں۔ کیا کام ہے؟'' میرے ہمراہ خن سا کے مال کی ایک کھیپ ہے جسے آسام کے رستے بھارت پہنچانا ہے۔ اگر بغیر چیکنگ اور باز پرس کے ہمیں درے سے گزرنے دیا جائے تو آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔ ہمارے پاس پاسپورٹ بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ ایسے کاموں میں پاسپورٹ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔'' میں نے پورے تحمل اور یقین سے کہا۔ ''خن سا کا دوست، میرا دوست۔ تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو نہ صرف درے سے گزرنے کی اجازت ہے بلکہ برما کی سرحد تک میرا ایک سپاہی اور ایک افسر تمھارے ساتھ جائیں گے۔'' بادی النظر میں تو جنرل کی یہ بڑی فراخ دلانہ پیش کش تھی لیکن میں نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے کہا کہ اپنے فوجی میرے ہمراہ بھیجنے کے بجائے اگر وہ راہداری کے طور پر ایک حکم نما خط مجھے دے تو بہت بہتر رہے گا۔

''ہم نے صوبہ اراکان میں سے چند مزدور اور گائیڈ لیے ہیں۔ آپ کے فوجیوں کو ہمراہ دیکھ کر وہ کام کرنے سے کترائیں گے۔'' میں نے اسے وجہ بتائی تو وہ مان گیا اور ایک خط لکھ کر مجھے دیا کہ یہ لوگ ہمارے اور خن سا کے خاص آدمی ہیں۔ انھیں بغیر چیکنگ اور پوچھ گچھ کے آگے بڑھنے دیا جائے اور ضرورت پڑنے پر ان کی ہر ممکن مدد کریں۔'' مجھے یقین ہے اس خط کی وجہ سے آپ لوگوں کو فوج اور

ہول کی طرف سے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔'' اس نے خط مجھے دیتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کا دوبارہ شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوکر میس سے باہر آگیا۔ میں نے گائیڈ کو کہا کہ وہ جیپ میں جا کر ہمارے قافلے کو لے آئے۔ تب تک میں میجر کے پاس اس کا انتظار کروں گا۔

آدھے گھنٹے میں ہی قافلہ میرے پاس پہنچ گیا۔ میرے جنرل سے ملنے کے باعث میجر پر میرا خاصا رعب پڑ چکا تھا۔ میں اس سے ہاتھ ملا کر اپنی جیپ کی طرف آیا اور ہمارا قافلہ بلا روک ٹوک درّے سے گزر کر دو گھنٹے کے اندر ٹوان گپ کے قصبے میں داخل ہوگیا۔ اب ہم صوبہ اراکان میں تھے اور یہاں ہم نے ایک رات قیام کرنا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں صوبہ اراکان برما کے انتہائی مشرق میں سمندر کے ساتھ ساتھ شمالاً جنوباً ایک پٹی کی صورت میں واقع ہے۔ اس کی حدود بنگلہ دیش اور بھارت میں آسام سے ملتی ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت کا یہ صوبہ برما کی حکومت کی مسلمانوں سے بغیر کسی معقول وجہ کے عداوت کی بنا پر بے توجہی کے باعث باقی ملک سے خاصا پسماندہ اور غربت کا شکار ہے۔ یہاں کی بیشتر آبادی کا ذریعۂ معاش مچھلی پکڑنا ہے اور حکومت اس میں بھی ان کی کوئی مدد نہیں کرتی۔ یہاں نہ تو سڑکیں ہیں اور نہ ہی دریاؤں کے ڈیلٹوں کی درجنوں شاخوں پر سے گزرنے کے لیے کوئی پل۔ تین چار بڑے قصبوں مثلاً ٹیان دن (Tiandin) دالت (Dalit) اور پالت وا (Paletwa) وغیرہ میں پرانے اور اکثر خراب رہنے والے مقامی بجلی گھر ہیں جبکہ چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں بجلی کی سہولت بھی میسر نہیں۔ مغربی عیسائی ممالک نے کئی بار اپنے مشنری یہاں بھیجے تاکہ غریبی کے مارے مسلمانوں کو پیسے وغیرہ دے کر عیسائی بنایا جائے لیکن یہاں کے مسلمانوں نے ان کی ہر پیش کش کو مسترد کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ تو اپنی حکومت نے ان کی مشکلات کی طرف کوئی توجہ دی اور نہ ہی غیر ملکی مشروط مدد ہی انھیں مل سکی۔ دنیا کی یہ بہت بڑی سچائی ہے کہ جہاں غربت ہوتی ہے وہاں توہمات اور بعید از عقل اعتقاد جنم لیتے ہیں۔ اراکان میں یہی صورت حال تھی۔ نہ پیسہ، نہ ہسپتال اور علاج معالجے کی سہولتیں اور نہ ہی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی معقول ذریعہ۔ بے یقینی کی اس مسلسل کیفیت کے باعث وہاں جادو ٹونے، جعلی عاملوں اور فوری کایا پلٹ کرنے والے دعویداروں نے جنم لیا۔ کراچی کی طرح وہاں بھی عاملوں اور جادوگروں کی بھرمار تھی۔

ٹوان گپ کے قصبے میں پہنچ کر جب میں نے دیکھا کہ ہوٹل نام کی یہاں کوئی جگہ نہیں تو میں نے اپنے نمبر ٹو کو کہا کہ قصبے میں کسی کھلی جگہ پر پڑاؤ کرتے ہیں۔ ہم کسی معقول جگہ کی تلاش میں ہی تھے کہ گائیڈ نے نمبر ٹو کے ذریعے مجھے کہا کہ یہاں ایک نسبتاً خوشحال گھرانہ ہے۔ اگر ان کے پاس چلیں تو ممکن ہے وہ کوئی انتظام کردیں۔ زمین پر سونا خطرناک ہے کیونکہ یہ علاقہ انتہائی زہریلے بچھوؤں اور سانپوں سے بھرا پڑا ہے۔ علاوہ ازیں مجھے آئندہ سفر کے راستے کا اچھی طرح سے علم بھی نہیں ہے اور

کی رات آنے دیجیے آپ خود اس کے قائل ہو جائیں گے۔" میں عبداللہ کی باتوں سے تذبذب کا شکار انہی خیالوں میں مزید دو روز کھویا رہا حتیٰ کہ اماوس کی رات والا دن آ گیا۔ سرِ شام ہی میں اپنے سارے ہمرائیوں سمیت عبداللہ کے گھر جا پہنچا۔ وہ پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے پیر صاحب نے اس کے لڑکے کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دی ہے۔ عبداللہ نے بتایا کہ قصبے کے باہر اس جادوگرنی کی کٹیا ہے اور ہمیں رات گیارہ بجے وہاں پہنچنا ہے۔ میرے سارے ہمراہی جادو کا تماشا دیکھنے کو بے تاب تھے۔ میں نے انھیں کہا کہ قصبے سے کھانا کھا کر رات دس بجے یہاں پہنچ جائیں۔ میں نے عبداللہ کے ساتھ کھانا کھایا اور رات ساڑھے دس بجے ہمارا قافلہ جادوگرنی کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

قصبے سے تقریباً چھ میل دور درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی کٹیا کے قریب آگ کا الاؤ روشن تھا جس کے سوا ہر سو گھپ اندھیرا تھا۔ چاند تو تھا ہی نہیں، ستاروں کو بھی ہلکے بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ ایسا سناٹا تھا کہ دل خواہ مخواہ گھبرانے لگا۔ ہم نے الاؤ سے کچھ فاصلے پر اپنی جیپیں کھڑی کر دیں۔ الاؤ کے گرد دس پندرہ آدمی بالکل خاموش کھڑے تھے۔ سامنے ہی ایک کٹیا تھی جس کے باہر سیاہ چادر میں لپٹی ایک پچیس تیس سالہ عورت بیٹھی تھی۔ اس عورت کے بال خشک اور کھلے ہوئے تھے اور گلے میں اس نے بہت ساری مالائیں پہن رکھی تھیں۔ یہ عورت کسی نامعلوم زبان میں منتر پڑھ رہی تھی۔ عبداللہ نے مجھے بتایا کہ یہ عورت جادوگرنی کی بیٹی اور چیلی ہے۔ ماں کی زندگی میں یہ جادوگرنی اس کی شاگرد تھی اور ماں کے مرنے کے بعد اب یہ جادوگرنی ہے اور اس کی بیٹی اس کی شاگرد ہے۔ ان کے پاس کوئی مرد نہیں۔ لوگوں کے کہنے کے مطابق ہر جادوگرنی کے صرف ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا باپ بالکل اجنبی ہوتا ہے اور چند ماہ کے اندر ہی مر جاتا ہے۔

جادوگرنی ابھی تک کٹیا میں ہی تھی۔ میں نے غور سے سنا تو کٹیا کے اندر سے بھی منتروں کے جاپ کی آواز آ رہی تھی۔ عبداللہ نے اس عورت کے قریب جا کر کچھ کہا۔ اس نے سر ہلا کر اچھا کہا اور منتروں کا جاپ جاری رکھا۔ میں نے سوالات کا پرچہ عبداللہ کو دیا۔ عبداللہ نے سوال پڑھے اور پرچہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ آگ کے گرد کھڑے لوگ خشک ٹہنیاں اور لکڑیاں اپنے ساتھ لائے تھے جنھیں وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آگ میں ڈال دیتے تا کہ الاؤ کی آگ کم نہ ہو۔ موسم خاصا خنک تھا۔ اس عجیب اور خوفناک ماحول میں سب کی نظریں کٹیا کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ساڑھے بارہ کے قریب وہ عورت کٹیا میں گئی اور ایک خاصا بڑا لگن لا کر الاؤ کے قریب رکھ دیا۔ کٹیا کے اندر سے ہی وہ پانی سے بھری دو بالٹیاں لائی اور ان کا پانی لگن میں ڈال کر اسے لبالب بھر دیا۔ لگن میں الاؤ کی آگ کے رقصاں شعلے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ عبداللہ نے مجھے کہا کہ لگن کے قریب جا کر کھڑا ہو جاؤں تا کہ لگن میں ہونے والے طلسم کو بخوبی دیکھ سکوں۔ ادھر میں دل میں سوچ رہا تھا کہ جب جادوگرنی باہر آ کر اپنا کمال

دکھانا شروع کرے گی تو میں اس کی ایک ایک حرکت کو بخوبی نوٹ کر کے اس کی چالاکی اور شعبدہ بازی کو بھانپ لوں گا اور سب کے سامنے اس کی جادوگری کا پول کھول دوں گا۔

تھوڑی دیر بعد جادوگرنی کٹیا سے برآمد ہوئی۔ اس نے صرف ایک سیاہ چادر سے اپنے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے بھی گلے میں منکوں کی بیسیوں مالاؤں کے علاوہ رسی میں پروئی تین چھوٹی انسانی کھوپڑیاں پہن رکھی تھیں۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور کانٹوں کی طرح سخت کھلے بال سر کے اطراف پھیلے ہوئے تھے جن پر کئی رنگ چھڑکے ہوئے تھے۔ سب سے نمایاں اور خوفناک اس کی آنکھیں تھیں۔ حلقوں سے باہر نکلی ہوئی اس کی بالکل سرخ آنکھوں میں اتنی چمک تھی کہ ان پر نظر جمانا مشکل تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ضعیف الاعتقاد لوگوں پر مکمل تاثر جمانے اور جادوئی رنگ دینے کے لیے یہ ماحول پیدا کیا گیا ہے۔ میں اب اس انتظار میں تھا کہ کب وہ اپنا جادوئی کھیل شروع کرے اور میں اس کے اس سارے ڈھونگ کا پول کھول دوں۔ اس کے جاپ میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ آگ میں مٹھی بھر کوئی چیز پھینکتی جس سے آگ اور زیادہ بھڑک اٹھتی۔ جاپ کے دوران اس نے دو تین بار میری طرف نظر بھر کر دیکھا اور دھیمے سے مسکرائی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں اتنی چمک اور ہیبت تھی کہ ان کی تاب نہ لاتے ہوئے میں نے اپنی آنکھیں فوراً نیچی کر لیں۔

اس نے جاپ ختم کیا تو اردگرد کھڑے لوگوں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے برمی زبان میں سوال کیے جن کے اس نے مختصر جواب دیے۔ جواب ملتے ہی وہ لوگ وہاں سے جانا شروع ہو گئے۔ اب عبداللہ آگے بڑھا۔ میرے لکھے ہوئے سوالوں کا برمی زبان میں ترجمہ کر کے وہ اسے سنانے ہی لگا تھا کہ جادوگرنی نے ہاتھ بڑھا کر عبداللہ سے پرچہ لیا اور اسے آگ میں ڈال دیا۔ میں لگن کے بالکل قریب کھڑا تھا اور جادوگرنی مجھ سے چار پانچ فٹ دور بیٹھی تھی۔ اچانک ہی وہ نہایت صاف اور سلیس اردو میں مجھ سے مخاطب ہوئی، "مسٹر سلیم عرف رابرٹ مائیکل، اپنے سوالوں کا جواب کس زبان میں سننا چاہو گے انگلش، اردو، بنگلہ یا کسی اور زبان میں؟ میں تمھارے تمام سوالوں کا نہ صرف جواب دوں گی بلکہ تمھارا ماضی، حال اور مستقبل بھی تمھیں پانی میں دکھاؤں گی۔" اس جادوگرنی کو اتنی روانی سے اردو بولتے سن کر میرے تو چھکے چھوٹ گئے۔ بڑی مشکل سے اپنی طاقت مجتمع کر کے میں صرف یہ کہہ سکا "اردو میں۔"

جادوگرنی نے ماش کے چند دانے مجھ پر اور کچھ آگ پر پھینکتے ہوئے کہا، "تم پاکستان سے راجہ کی بیوی اس کے لڑکے اور جواہرات لینے کے لیے رانگا مائی جا رہے ہو۔ تم اپنی مہم میں کامیاب ہو گے لیکن تمھارے بہت سارے ساتھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ تم انتہائی خود سر آدمی ہو اور اپنی بات منوانے پر ہمیشہ مصر رہتے ہو۔ بچپن سے ہی اپنے والدین سے باغی ہو گئے تھے۔ تمھاری مرضی کے خلاف تمھاری شادی ایک ایسی عورت سے ہوئی جو تمھارے تصورات اور خیالات کے بالکل برعکس

ہے۔ اسی وجہ سے تم اپنے گھر سے بھاگے رہتے ہو اور خطرناک کاموں میں جان بوجھ کر حصہ لیتے ہو۔ دہلی میں موت تم کو چھو کر گزر گئی لیکن تم باز نہ آئے اور اب پھر اس خطرناک مہم پر چل پڑے ہو۔'' وہ ذرا خاموش ہوئی تو میں نے کہا، ''تمھاری اردو دانی پر میں حیران ہوں۔ میرا اصلی نام اور اختیار کیا ہوا نام کئی لوگ جانتے ہیں۔ بیوی سے ناچاقی کے باعث اکثر مرد گھر سے فرار ہوجاتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مہم میں اگر مجھے کامیابی ہوئی تو تم سچی کہلاؤ گی اور اگر ناکامی ہوئی تو میری لاش تم سے بازپرس کرنے نہیں آئے گی۔ رانگاماٹی تک جانے کا میرے ساتھیوں کے علاوہ عبداللہ کو بھی علم ہے۔ ابھی تک تم نے کوئی ایسی بات نہیں بتائی جس سے مجھے یقین آجائے کہ تم واقعی جادو جانتی ہو اور اس کے ذریعے ماضی، حال اور مستقبل کی باتیں بتاسکتی ہو۔ میرے خیال میں یا تو تمھارے ایجنٹ سوال کرنے والے کی باتیں اشاروں یا خفیہ کوڈ میں بتادیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تم ذہن پڑھ سکتی ہو۔''

جادوگرنی خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا لیکن میری باتوں سے اس کی آنکھوں کی سرخی مزید بڑھ گئی۔ ماش کے دانے آگ میں ڈالتے ہوئے وہ بولی، ''بہت سے لوگ اس وقت تک جادو کے قائل نہیں ہوتے جب تک خود ان پر جادو نہ کیا جائے۔ اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالو اور جو کچھ بھی ہاتھ میں آئے، بلاخوف اسے باہر نکال لو۔ تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔'' میں جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو کوئی لجلجی سی چیز میرے ہاتھ میں آئی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ باہر نکالا تو یقین جانیے کوئی نو انچ لمبا ایک بہت موٹا تازہ بچھو تھا۔ میرے تو خوف کے مارے پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے زور سے ہاتھ کو جھٹکا تو بچھو زمین پر جا پڑا اور رینگتا ہوا جادوگرنی کی کٹیا کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنا ڈنک اونچا کیے ہوئے تھا۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ اس قسم کے بچھو کے زہر کا کوئی علاج نہیں اور کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی اور اس کا ڈسا ہوا تڑپ تڑپ کر چند منٹوں میں ہلاک ہوجاتا ہے۔ وہ بچھو خواہ چند سیکنڈ کے لیے ہی میرے ہاتھ میں رہا تھا مگر وہ مجھے بڑی آسانی سے ڈنگ مارسکتا تھا۔ ابھی میرے حواس بحال بھی نہیں ہوئے تھے کہ جادوگرنی بولی، ''تمھارے مذہب میں بچھو کو عقرب کہتے ہیں اور تمھاری پیدائش عقربی مہینے کے اس خاص لمحے میں ہوئی تھی جو عقرب کے آغاز کا وقت تھا۔ تمھیں بچھو کبھی نہیں کاٹے گا۔'' مجھے فوری یاد آگیا کہ دہلی میں DMI کی قید کے دوران میری کوٹھڑی (Cell) میں بھی چار بچھو چھوڑے گئے تھے۔ تین بچھو اس اینٹ پر بنے خول میں تھے جسے میں تکیے کے طور پر استعمال کرتا تھا اور ایک میری ٹانگ پر رینگ رہا تھا لیکن مجھے کسی نے نہ کاٹا اور میں نے چاروں کو مار دیا۔ جادوگرنی بولی، ''تمھیں یقین دلانے کے لیے اب میں تمھارے ماضی، حال اور مستقبل کے مناظر تمھیں پانی میں دکھاؤں گی۔ پھر تمھیں یقین آجائے گا کہ اپنے خدا کی مدد پر یقین کامل کرتے ہوئے تم جو خطرناک کاموں میں کود پڑتے ہو تو خدا کے علاوہ کچھ اور طاقتیں بھی ہیں جو تمھاری حفاظت کرتیں اور تمھیں مشکلات سے نکالتی ہیں۔'' یہ کہہ کر جادوگرنی نے منتروں کا اونچی

آواز میں جاپ شروع کردیا۔ میں، عبداللہ اور میرے ساتھی بالکل خاموش، سراسیمہ اور خوفزدہ بالکل ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی عملی تفسیر بنے کھڑے تھے۔

ابھی تک جادوگرنی نے جو کچھ بتایا تھا وہ بالکل درست تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ میرا اصلی نام خن سا اور عمر کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ عبداللہ کو بھی میں نے صرف رانگاماٹی تک جانے اور واپس لوٹنے کے سوا اپنے مشن کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں واقعی خودسر ہوں اور ہر چھوٹا بڑا فیصلہ خود کرتا اور اس پر قائم رہتا ہوں چاہے وہ غلط ہی ہو۔ خوشحال والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث ان کے لاڈ پیار نے مجھے بگاڑا تو نہیں تھا لیکن جب والد صاحب نے اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ مجھے CSS کا امتحان پاس کرنا ہوگا چاہے تین سال لگ جائیں تو میں گھر سے بھاگ کر چٹاگانگ اور پھر سری منگل کے چائے کے باغات میں ایک غیرملکی کمپنی میں بطور آفیسر ملازم ہوگیا۔ گھر سے پہلی مرتبہ بھاگنے کے بعد میں اپنے والد مرحوم کی زندگی میں صرف دو بار گھر آیا اور وہ بھی محض چند دنوں کے لیے۔ والد مرحوم کے انتقال کے دس برس بعد میں شادی کرنے پر صرف اس وقت بہ امر مجبوری راضی ہوا جب میری والدہ نے اپنا دوپٹہ میرے قدموں میں ڈال کر یہ کہا کہ جیسے تمھارے والد تمھارا سہرا دیکھنے کی حسرت دل میں لیے اس دنیا سے چلے گئے، ویسے ہی میں بھی اپنی ساری حسرتوں اور آرزوؤں کو دل میں سمیٹے محض تمھاری بے جا ضد کی وجہ سے قبر میں چلی جاؤں گی۔ میرے ہاں کہنے پر فوری طور پر میری شادی کردی گئی۔ بیوی ایسی ملی جس کا شروع سے ہی مجھ سے نہ تو ذہنی رابطہ ہوسکا اور نہ ہی اس نے مجھے سمجھنے کی کوشش کی۔ جن باتوں سے میں الرجک تھا وہ اس کی نہ چھوٹنے والی عادتیں تھیں اور جو میرے شوق تھے ان پر اس نے کبھی توجہ نہ دی۔ اپنے خاندان کی عظمت اور وقار کے باعث میں نے ازدواجی زندگی کے آغاز میں ہی اسے طلاق نہ دی اور گھریلو جھگڑوں کو برداشت نہ کرتے ہوئے خود اپنے گھر سے دور ہوتا گیا۔ نڈر میں شروع سے ہی تھا اس لیے خطرناک اور جان جوکھم کاموں میں بلاوجہ کود پڑتا۔ میں عقربی (Scarpion) ہوں اس کا علم چند ایک قریبی دوستوں کے سوا کسی کو نہ تھا۔ جوانی کے آغاز سے ایک نسوانی ہیولا میرے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ اگرچہ خدوخال واضح نہ تھے لیکن مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر میری زندگی میں کوئی خوشیاں لاسکتی ہے اور میرے جذبات کے متلاطم سمندر کو پرسکون بناسکتی ہے تو صرف وہی شخصیت ہے جس کے غیرواضح خدوخال میرے دل و دماغ میں ہمیشہ سے ہلچل پیدا کیے ہوئے ہیں۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ اسے کھوجنے میں ضائع ہوگیا تھا جس کے باعث میں خاصا چڑچڑا ہوگیا۔

جادوگرنی نے یکایک اپنا جاپ بند کیا اور بولی، ''دیکھ پانی میں اپنا ماضی، حال اور مستقبل تاکہ تجھے میری طاقت پر یقین آجائے۔'' میں نے لگن کے پانی پر اپنی نظریں جمادیں۔ رقصاں شعلوں کے عکس سے ایک تصویر بنی۔ پہاڑیوں کے درمیان میں کھڑا تھا اور میرے چاروں طرف لاشیں پڑی

تھیں۔ میں نے قیصر اور اپنے نمبر ٹو کو پہچانا۔ قیصر کے ساتھ چند لڑکے بھی تھے اور ہم چاروں طرف سامنے اور درختوں پر فائر کر رہے تھے کئی لوگ جو صرف لنگوٹ پہنے تھے اور جن کے چہروں اور جسم پر مختلف رنگوں سے لکیریں کھنچی ہوئی تھیں ہمارے فائر سے درختوں پر سے چیختے ہوئے نیچے گرے اور ڈھیر ہوگئے۔ ''یہ سب رانگاماٹی میں تیرے ساتھ پیش آئے گا اور یہاں سے تیرے ساتھ جانے والوں میں سے صرف تو اور تیرے چند ساتھی زندہ بچیں گے۔ تیرے ہمراہیوں میں سے چند راستے میں ہی تیرا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔'' سکوت کو توڑتے ہوئے جادوگرنی کی آواز آئی۔ پانی میں ایک اور منظر ابھرا۔ میرے ہمراہ ایک درمیانی عمر کی عورت اور ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا تھا اور قیصر اور اس کے ساتھی اور میرا نمبر ٹو تیز تیز چلتے ہوئے ایک کشتی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ''یہ تیری واپسی کا سفر ہے۔'' جادوگرنی بولی۔ ایک اور منظر ابھرا۔ میری ضعیف والدہ ہمارے گھر میں برآمدے کے ایک کونے میں سہمی ہوئی کھڑی تھیں اور میری بدبخت بیوی انھیں جھاڑو سے مار رہی تھی۔ ''گھبرا مت اور دیکھتا جا۔'' جادوگرنی نے یہ کہا اور منظر تبدیل ہوا۔ میری والدہ کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور میں اپنی بیوی کو ایک کاغذ دے رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ طلاق نامہ تھا۔ میں نے حوصلہ کرتے ہوئے جادوگرنی سے کچھ پوچھنا چاہا تو وہ بولی۔ ''بول نہیں۔ چپ چاپ اپنی زندگی کے مختلف ادوار دیکھتا جا اور میری باتیں سن۔'' ایک نیا منظر ابھرا۔ رقصاں شعلوں کے عکس سے ایک تصویر بنی جسے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ ''یہی ہے نا وہ جسے تو نہ جاننے کے باوجود اپنے دل و دماغ میں بسائے ہوئے ہے۔ تجھے یہ ضرور ملے گی کیونکہ تم دونوں کئی جنموں سے ایک دوسرے کی تلاش میں بھٹک رہے ہو، لیکن اس جنم میں تم دونوں ضرور ملوگے۔ یہ تمھاری دلہن بنے گی۔ تم دونوں دیوانگی کی حد تک ایک دوسرے کو چاہو گے اور تمھاری زندگیاں خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بن جائیں گی۔'' یہ نہایت واضح عکس ہو بہو اس ہیولے کا تھا جو شروع جوانی سے ہی میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ میں نے اس عکس کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔

اس رات سے قبل میں جادو کو محض شعبدہ بازی سمجھتا تھا لیکن میرے ماضی، حال اور مستقبل کے مناظر دکھا دینا، اس آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی حقیقت کو میں کیونکر جھٹلا سکتا تھا۔ میری زبان گنگ ہوچکی تھی اور مجھ پر سکتہ سا طاری تھا۔ جادوگرنی پھر بولی، ''تو مجھے دینے کے لیے دو ہزار ڈالر لایا ہے۔ میں ڈالر نہیں لوں گی البتہ تیرا ایک ساتھی میری بچی کو پسند آگیا ہے۔ میں اسے لوں گی۔ تجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اب وہ تیرے لیے بیکار ہوچکا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے جادوگرنی نے کچھ پڑھتے ہوئے ماش کے کچھ دانے میرے گائیڈ کے اوپر پھینکے۔ دانوں کے لگتے ہی گائیڈ کچھ دیر کانپتا رہا اور پھر یکایک اپنی جیکٹ اور قمیض اُتار کر جادوگرنی کی طرف بھاگا اور اس کے پاؤں میں سر رکھ دیا۔ جادوگرنی نے اس کی پیٹھ سہلائی اور گلے میں پہنی تینوں کھوپڑیاں اس کے جسم سے مس کیں۔ گائیڈ اٹھ بیٹھا اور ہماری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے ہمیں پہچانتا ہی نہ ہو۔ میں نے اسے کئی بار پکارا لیکن اس نے کوئی

جواب نہ دیا۔ اتنی دیر میں جادوگرنی کی بیٹی اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور اپنے گلے سے چند مالائیں اتار کر اسے پہنا دیں۔ جادوگرنی مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی، ''اب تجھے یقین آگیا ہوگا کہ جادو ہوتا ہے اور اس میں بڑی طاقت بھی ہوتی ہے۔ جادو کے منتروں پر عبور حاصل کرکے انسان کی خفیہ طاقتیں بیدار ہوجاتی ہیں۔ ہر انسان اپنے ماضی کو جانتا، حال کو سمجھتا اور مستقبل کے متعلق سوچتا ہے۔ یہ خفیہ طاقتیں بیدار ہوجائیں تو انسان نہ صرف اپنے مستقبل میں اچھی طرح جھانک سکتا ہے بلکہ اپنے سامنے موجود لوگوں کی کوئی بات بھی اس سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ تجھے دیکھتے ساتھ ہی مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ تو جادو پر یقین نہیں کرتا۔ میں جو زبان بول رہی ہوں وہ بھی اپنے منتروں کے زور پر بول رہی ہوں ورنہ حقیقتاً میں اس زبان سے قطعی نابلد ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے لگن میں سے چلو بھر پانی لے کر آگ پر پھینکا۔ آگ فوراً بجھ گئی جیسے اس پر ڈرموں پانی ڈالا گیا ہو۔ جادوگرنی اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ ہمیں رخصت کرنے کے لیے اس کا سگنل تھا۔

اسی وقت نجانے مجھے کیا ہوا اور میں آج تک، اس کی صحیح وجہ نہیں جان سکا۔ بالکل غیرارادی طور پر میں نے اپنا ریوالور نکالا اور اس سے پہلے کہ جادوگرنی میری طرف گھومے، میں نے اپنے ریوالور کی چھ کی چھ گولیاں جادوگرنی، اس کی بیٹی اور گائیڈ کو مار دیں۔ یہ اتنا اچانک ہوا کہ جادوگرنی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ گولیاں چونکہ بہت قریب سے چلائی گئی تھیں اور میرا نشانہ پختہ تھا اس لیے تینوں کے سینوں پر گولیاں لگیں اور وہ وہیں ڈھیر ہوگئے۔ مجھ پر ایک جنون سا طاری تھا۔ میں نے ریوالور کو دوبارہ لوڈ کرتے ہوئے نمبر ٹو کو جیپوں سے پٹرول کے گیلن لانے کا حکم دیا۔ پٹرول میں نے خود ان کے بے جان جسموں پر ڈالا اور آگ لگا دی۔ جلتی ہوئی لاشوں پر میں نے دوبارہ اپنا پستول خالی کیا اور تب تک وہیں کھڑا رہا جب تک لاشیں بالکل راکھ نہ بن گئیں۔ گولیاں چلتے ہی میرے ہمراہیوں اور نمبر ٹو کے علاوہ باقی سب لوگ بھاگ گئے تھے۔ لاشوں کے جلنے کے بعد ہم خاموشی سے اپنی جیپوں کی طرف بڑھے اور عبداللہ کو اس کے گھر اتار کر اپنے ٹھکانے پر چلے گئے۔ تمام راستے ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ رات بستر پر لیٹے ہوئے میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق سوچتا رہا۔

سب سے پہلے تو میں جادوگرنی اس کی بیٹی اور گائیڈ کو ہلاک کرنے کی وجہ اپنی سوچ کے مطابق عرض کرتا ہوں۔ میرا اللہ پاک کی ذات اس کی بے شمار صفات اور بے حد و حساب قدرتوں پر یقین کامل ہے۔ میری زندگی میں درجنوں ایسے لمحات آئے جب میں نے دشمنوں کے ہاتھوں خود کو بے دست و پا دیکھ کر اللہ پاک کے حضور اپنی بے چارگی اور بے بسی بیان کرکے مدد کی التجا کی اور اللہ پاک نے اپنے حبیب ﷺ اور پنج تن کے صدقے میری فریادسنی اور مجھے اس مصیبت سے نکالا۔ میرے ایمان کے مطابق اللہ پاک کی رضا کے بغیر ایک پتا بھی ہل نہیں سکتا۔ میری سوچ کے مطابق کائناتوں میں دوسری سب سے بڑی طاقت شیطان لعین کی ہے جس نے قیامت تک اللہ کے بندوں کو بہکانے کی اللہ

سے اجازت لی ہوئی ہے اور شب و روز کے ہر ہر لمحے میں وہ اور اس کے چیلے اسی کام میں مشغول ہیں۔ شیطان کے بہکاوے میں تو پیغمبر بھی آئے اور وہ بھی جنہیں اپنی عبادت پر بڑا ناز تھا اگر ایک مسلمان کسی بت خانے کے سامنے سے گزرتا ہوا سر کو ذرا خم بھی کردے تو وہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔ یہ میرا ذاتی خیال اور یقین ہے۔ ممکن ہے بعض قارئین کو میرے اس عقیدے پر اعتراض ہو۔ جادوگرنی نے مجھے میرے ماضی، حال اور مستقبل کے جو مناظر دکھائے اور جو کچھ بتایا تھا۔ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اس جادوگرنی میں یقیناً شیطان حلول کرچکا تھا اور وہ شیطانی قوتوں کے سہارے مسلمانوں کو گمراہ کر رہی تھی۔ میرے خیال میں اس جادوگرنی کا مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے میں جادوئی کام دکھانا اور انھیں غیر اللہ طاقتوں سے مرعوب اور متاثر کرکے ان کے دلوں میں اللہ پاک کی وحدانیت پر شک پیدا کرنا تھا۔ اپنی اس توجیہہ کے علاوہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ ان تینوں کو ہلاک کرنے اور ان کی لاشوں کو جلا کر راکھ کردینے تک جو کچھ بھی میں نے کیا اس میں میرے ارادے اور دماغی سوچ کا قطعی دخل نہ تھا۔ میرا دماغ اور عقل بالکل بے بس اور معطل ہوچکے تھے۔ میری حالت بالکل ایک روبوٹ جیسی تھی۔ کسی ان دیکھی طاقت نے مجھ سے یہ سب کام کرایا۔ جادوگرنی جو دوسروں کے ماضی، حال اور مستقبل کے حالات نہ صرف بتاتی بلکہ دکھاتی بھی تھی، اس کے لیے اپنے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے جاننا کچھ مشکل نہ تھا اور وہ اس کا سدباب بھی کرسکتی تھی لیکن اسی طاقت نے اس کی عقل اور جادوئی قوتوں پر بھی پردہ ڈال دیا تھا۔

جادوگرنی نے مجھے جو کچھ بتایا اور دکھایا وہ بعین ہی ویسے ہی ہوا۔ مہم کی کامیابی کے بعد جب میں واپس گھر لوٹا تو مجھے رشتہ داروں نے بتایا کہ میری ضعیف والدہ کو میری بیوی نے جھاڑو سے مارا ہے۔ 89ء میں میری والدہ کی آنکھوں کا آپریشن ہوا اور آپریشن کے دو روز بعد ہسپتال میں ابھی میری والدہ کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی تو ایک ایسی بات ہوئی جس پر میں نے اپنی خودسر بیوی کو طلاق دے دی اور دیکھے گئے منظر کے عین مطابق وہ وہاں سے رخصت ہوئی اور ایک مستقل عذاب سے جو مجھ پر اور میری والدہ پر نازل تھا ہمیشہ کے لیے ہمیں نجات مل گئی۔

اس مہم کی تکمیل کے دو سال بعد میں سعودی عرب چلا گیا اور ساڑھے سات سال وہاں بطور ایئرپورٹ ایڈمنسٹریٹر ملازمت کی اور اس کے بعد سات سال سنگاپور میں سیلز ڈائریکٹر کے طور پر گزارے۔ اس تمام عرصے میں مجھے آسٹریلیا، کوریا، فلپائن، ملائیشیا، تھائی لینڈ، سری لنکا، ایران، شام اور عراق جانے کا موقع ملا اور ہر ملک اور ہر جگہ میں نے اس نسوانی عکس کو ڈھونڈا جسے دکھاتے ہوئے جادوگرنی نے کہا تھا کہ تم دونوں کئی جنموں سے ایک دوسرے کی تلاش میں ہو لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی اور میں اس کی تلاش میں ناکامی سے بالکل مایوس ہوچکا تھا۔ میں 98ء کے مارچ میں کراچی میں تھا کہ بالکل اچانک ہی وہ صورت مجھے نظر آئی۔ اپنے خوابوں کی تعبیر کو سامنے دیکھ کر میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ مجھے

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے بتاؤں کہ میں اس کی تلاش میں کب سے بھٹک رہا ہوں اور کہاں کہاں اسے نہیں ڈھونڈا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور چوتھے روز ہی اسے حالِ دل کہہ سنایا۔ چونکہ قدرت کو ہمارا ملاپ منظور تھا اس لیے چودہ روز کے اندر ہی ہماری شادی ہوگئی۔ میری بیوی کسی معمولی خاندان سے یا کم پڑھی لکھی نہیں جسے میں سڑک سے اٹھا لایا ہوں۔ چونکہ قدرت کو منظور تھا اس لیے کوئی بھی رکاوٹ ہمارے راستے میں حائل نہ ہوسکی۔ اور 25/مارچ 98ء کو ہم رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ میری بیوی میرے خیالوں اور امیدوں سے بہت بڑھ کر میری صحیح معنوں میں رفیقۂ حیات ثابت ہوئی ہے اور میری حالت تو یہ ہے جیسے مجھے دونوں جہاں کی خوشیاں اور مسرتیں مل گئیں۔ میرے لیے اس کے بغیر ایک پل گزارنا بھی دوبھر ہوجاتا ہے اور ہم دونوں زندگی کی خوشیاں اور مسرتیں دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے جہانِ رنگ و بو کی لذتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

جانباز کی داستان چونکہ اس مرحلے میں داخل ہوچکی ہے جہاں غیر مرئی طاقتوں کا ذکر ہے اس لیے میں قارئین کی خدمت میں اپنی زندگی کے دو واقعات پیش کرنا چاہتا ہوں جو آج تک میرے لیے ایک معمہ بنے ہوئے ہیں۔ پندرہ برس کی عمر میرے میٹرک پاس کرنے کے بعد میرے والد مرحوم مجھے پہلی مرتبہ لاہور لے گئے اور ان کے ہمراہ میں شاہی قلعہ دیکھنے گیا۔ شیش محل سے باہر آئیں تو سامنے گھاس اور پھولوں کا ایک قطعہ ہے۔ اس پر سے گزرتے ہوئے میں نے اپنے والد کو کہا کہ یہاں نیچے کسی بزرگ کی قبر ہے جس تک پہنچنے کے لیے پندرہ سیڑھیاں اترنی پڑتی ہیں۔ یقین جانیے میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا اور قبر کے متعلق مجھے کسی نے کبھی بھی نہیں بتایا تھا۔ والد مرحوم ہنسنے لگے اور بولے کہ تم پہلی مرتبہ یہاں آئے ہو جبکہ میں نے لاہور میں ایف سی کالج میں تعلیم حاصل کی ہے اور ملازمت کا خاصا وقت بھی یہاں گزارا ہے۔ یہاں کوئی قبر نہیں اور یہ محض تمھارا خیال ہے۔ جب میں نے اپنی بات پر زور دیا تو وہ قلعے میں واقع سپیشل پولیس کے دفتر میں مجھے لے گئے جہاں ہم نے چائے پینی تھی (میرے والد مرحوم پولیس کے محکمے میں ایک اعلیٰ افسر تھے) سپیشل پولیس والوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ قلعے کے چپے چپے سے واقف ہیں اور یہاں کوئی قبر نہیں۔ جب میں نے اصرار کیا تو انھوں نے قلعے کے ایک پرانے اور بوڑھے چوکیدار کو بلوایا اور اس سے قبر کی بابت دریافت کیا۔ چوکیدار پہلے کچھ ٹھٹکا اور پھر بولا، ''اس جگہ زیرِ زمین ایک قبر ہے لیکن ہم نے سیڑھیوں کے داخلے پر تختے لگا کے اسے بند کیا ہوا ہے اور تختوں پر مٹی ڈال کر گھاس اگائی ہوئی ہے۔'' چوکیدار کی بات سن کر سب حیران ہوئے اور چوکیدار سے کہا کہ تختے ہٹائے۔ پولیس اور وہ بھی سپیشل پولیس والوں کے سامنے بچارے چوکیدار کی کیا چلتی۔ آدھے گھنٹے میں ہمارے سامنے چوکیدار اور مالیوں نے تختے ہٹائے اور چند منٹ بعد تازہ ہوا کے داخل ہونے کا انتظار کرکے ہم ٹارچوں کی روشنی میں اندر داخل ہوئے۔ پتھروں کی بنی پوری پندرہ سیڑھیاں اُترنے کے بعد سرنگ دائیں جانب گھومی اور سامنے ہی ایک قبر تھی جس پر ایک

بوسیدہ چادر پڑی تھی۔ بمعہ میرے والد کے سب پولیس والے حیران تھے لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں یہاں پہلے بھی آچکا ہوں۔ ہم سب نے فاتحہ پڑھی اور واپس آگئے۔ دوسرا واقعہ 93ء میں پیش آیا۔ میں راولپنڈی میں تھا اور دن کے گیارہ بجے کے قریب محسوس ہوا تھا کہ میری والدہ کسی مشکل میں گرفتار ہیں یا ہونے والی ہیں۔ گاڑی میں میرا ایک جوان عزیز میرے ہمراہ تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ فوری طور پر سرگودھا میں ہمارے گاؤں جائے اور میری والدہ کی خیریت سے مجھے بذریعہ فون آگاہ کرے۔ میں نے اسے گاؤں جانے پر اتنا مجبور کیا کہ سیدھے موتی محل سینما کے ساتھ ویگنوں کے اڈے پر جاکر بھیرہ جانے والی ویگن پر بٹھا کر جب تک ویگن چل نہ پڑی، میں وہیں رکا رہا۔ پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ سرِ شام ہی گاؤں پہنچ گیا۔ اسی رات بالکل اچانک اور بغیر کسی سرکاری وارننگ کے دریائے جہلم میں اتنی سخت طغیانی آئی جس سے میرے گھر میں چار فٹ سے زیادہ پانی چڑھ آیا۔ میری والدہ گھر میں اکیلی تھیں اور کام کاج کرنے والی عورتیں جا چکی تھیں۔ میری والدہ کو جو بغیر سہارے کے چل نہیں سکتی تھیں، میرا وہی عزیز اپنے کاندھوں پر اٹھا کر میرے چچا کے گھر لے گیا جو بلندی پر واقع تھا اور یوں ان کی جان بچی۔ اب بھی یہ حال ہے کہ بعض بڑے اور اہم واقعات پیش آنے کا مجھے ایک دو روز پہلے ہی مبہم سا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ میں اسے اپنی طاقت نہیں بلکہ صرف اللہ پاک کا کرم سمجھتا ہوں یا اس چند منٹ کے وظیفے کی تاثیر جسے میں ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک بلاناغہ پڑھتا ہوں۔

اگلی صبح میں دیر تک بستر میں پڑا رہا۔ کسل مندی کے باعث کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ نمبرٹو نے آکر مجھ سے پوچھا کہ کب روانہ ہونا ہے؟ میں نے کہا کہ ایک دو دن بعد۔ باقی ہمرائیوں کے متعلق اس نے بتایا کہ رات کے واقعے سے وہ بھی بہت پریشان ہیں۔ عبداللہ کے متعلق بھی علم نہیں تھا کہ گزشتہ رات جو کچھ ہوا اس کے بعد وہ اپنے لڑکے کو ہمیں آسام کی سرحد تک چھوڑنے کے لیے بھیجے گا یا نہیں۔ جادوگرنی نے مجھے لگن کے پانی جو کچھ دکھایا تھا اسے میرے سوا صرف عبداللہ نے دیکھا تھا۔ ان مختلف عکسوں کا مطلب اور حقیقت وہ نہیں سمجھا ہوگا کیونکہ جادوگرنی اردو بول رہی تھی اور عبداللہ کو اردو بالکل نہیں آتی تھی۔ میرے باقی ہمراہی تو عکس بھی نہ دیکھ سکے تھے۔ ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ عبداللہ آن پہنچا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے جادوگرنی اور اس کی بیٹی کو کیوں مارا؟ ''محض اس لیے کہ اس نے ہمارے گائیڈ کو اپنے جادو میں جکڑ لیا تھا۔ اگر میں انھیں نہ مارتا تو وہ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر بھی جادو کر سکتی تھی۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔ ''لگن کے پانی سے جو تصویریں ابھری تھیں وہ کیا تھیں؟'' عبداللہ نے مجھے کرید کر حقیقت جاننا چاہی۔ ''وہ سب محض جادو اور نظربندی تھی اور تصویروں کا مجھ سے یا ہماری مہم سے کوئی تعلق نہ تھا۔'' میں نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے عبداللہ کو جواباً کہا۔ عبداللہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا، ''زبان بھی تو وہ آپ کی ہی بول رہی تھی۔'' ''اردو کے چند لفظ جاننے سے اردو نہیں آتی۔ اس کا جادو وادو کچھ نہیں تھا۔ اگر اسے اس علم پر عبور ہوتا

تو اسے یہ بھی پتہ چل جانا چاہیے تھا کہ میں اسے اور اس کی بیٹی اور اپنے گائیڈ کو ہلاک کرنے والا ہوں۔ آپ لوگوں کی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے باعث ایسے شعبدہ باز اپنے تماشے دکھا کر آپ کو بے وقوف بناتے ہیں۔'' میرا یہ جواب سن کر عبداللہ بولا۔ ''صبح سے میرے گھر تو بیسیوں لوگ آچکے ہیں اور وہ جادوگرنی اور اس کی بیٹی کو ہلاک کرنے کے باعث آپ سے بہت ناراض ہیں۔'' ''مجھے ان کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں اگر کسی کو بہت ہی تکلیف پہنچی ہے تو وہ پولیس میں جاکر میرے خلاف رپورٹ درج کرواسکتا ہے لیکن اسے یہ ضرور بتادیں کہ میرے ہمراہی خن سا اور عمر کے آدمی ہیں اور جنرل شال گپ میرا دوست ہے۔ ہم اپنے مخالفوں کو ایسے ہلاک کرتے ہیں جیسے بلی چوہے کو اور اگر میں نے جنرل شال گپ سے شکایت کردی تو فوجی آپ کے قصبے میں وہ شامت لائیں گے کہ آپ کو جان چھڑانا مشکل ہوجائے گی۔ جادوگرنی اور اس کی بیٹی تو لامذہب تھیں۔ آپ لوگ تو مسلمان ہیں اور میری آپ لوگوں سے کوئی عداوت نہیں۔ اگر پھر بھی کسی کو مصیبت میں گھرنے کی آرزو ہے تو بڑے شوق سے اپنے ارمان پورے کرلے۔'' میں نے برما کی فوجی حکومت کے ستائے اراکانی مسلمانوں کو رات کے واقعے پر خاموشی اختیار کرنے کے لیے دھمکی دی۔ عبداللہ اچھی طرح سے میری بات سمجھ گیا اور بولا، ''میں ابھی جا کر لوگوں کو بتاتا ہوں۔ ہمارے اوپر پہلے ہی کیا کم مصائب ہیں جو بلاوجہ آپ سے مخالفت کی مصیبت مول لیں۔'' میرے استفسار پر عبداللہ نے کہا کہ اس کا لڑکا آسام تک ہمارے ہمراہ جانے کو تیار ہے۔ بشرطیکہ اسے اس خدمت کا معاوضہ دو ہزار ڈالر دیے جائیں جن میں سے ایک ہزار ڈالر پیشگی دے دیے جائیں۔ میں نے ایک ہزار ڈالر عبداللہ کو دیتے ہوئے کہا کہ اپنے لڑکے کو یہ بھی کہہ دیں کہ اگر اس نے مجھے چکمہ دینے اور راستے سے ہی واپس لوٹنے کی کوشش کی تو اس کی لاش کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔ عبداللہ نے ڈالر جیب میں ڈالتے ہوئے کہا کہ ''ہم مسلمان ہیں اور جو وعدہ کرتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں۔'' عبداللہ کے جانے کے بعد میں نے نمبرٹو سے کہا کہ کل صبح نو بجے ہم آئندہ سفر پر روانہ ہوجائیں گے۔ نمبرٹو کے جانے کے بعد میں پھر گزشتہ رات پانی پر ابھرنے والے عکسوں میں کھو گیا۔ جادوگرنی نے سفر کی واپسی پر ہمیں ایک کشتی کی طرف جاتے دکھایا تھا جبکہ میرے پلان کے مطابق ہم نے اسی راستے سے واپس آنا تھا جس پر ہم جارہے تھے اور اس راستے میں کشتی کا سفر کہیں نہیں تھا۔

اگلی صبح ہمارا قافلہ عبداللہ کے لڑکے حمید کی رہنمائی میں روانہ ہوا۔ اب ہماری منزل پالت وا (Paletwa) تھی اور راستے میں ہمیں دالت (Dalet) میں پڑاؤ کرنا تھا۔ حمید نے جو اپنے باپ کی طرح ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتا تھا، مجھے بتایا کہ ماسوائے چند چھوٹی ندیوں کے یہ سارا راستہ ریتلا ہے اور ہمیں پتھروں سے گزرنا ہوگا، اس لیے جیپوں کی رفتار زیادہ سے زیادہ 20 میل فی گھنٹہ ہوگی۔

یہ محض اتفاق ہی تھا کہ قصبے سے نکل کر ہمیں اسی راستے سے گزرنا پڑا جہاں جادوگرنی کی کٹیا تھی۔ میں نے حتی الامکان کٹیا سے فاصلہ رکھ کر جیپ گزاری۔ کٹیا کے باہر نعشوں کی جگہ پر چند

گدھ بیٹھے سوختہ نعشوں کو کرید رہے تھے۔ میں نے لاؤسیوں کی سب مشین گن سے ان پر چند راؤنڈ فائر کیے۔ گدھ گولیوں کی آواز سے چند لمحے ادھر ادھر ہوکر پھر وہیں جمع ہوگئے۔ میں نے یہ فائر اپنے ہمراہیوں کو حوصلہ دینے اور اس رات کے واقعے کو محض ایک حادثہ سمجھنے کے لیے کیے تھے۔ ان پر کچھ اثر ہوا یا نہیں لیکن میری یہ حالت تھی کہ آئندہ چند روز تک ایک لمحے کے لیے بھی میں اس واقعے کو اپنے ذہن سے نہ نکال سکا۔

۞

چوتھا باب

والت تک ناہموار اور پھسپھسی ریت، چھوٹے پتھروں اور ڈیلٹا سے گزرنے والی کم گہری ندیوں، نالوں کو عبور کرتے ہوئے دو دنوں میں ہمارا سفر بغیر کسی بڑی دشواری کے طے ہوا۔ والت میں پڑاؤ کے دوران میرے ہمراہی دو تھائی مقامی بنی ہوئی شراب پی کر نشے میں ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ بات یہاں تک بڑھ گئی کہ ایک نے خنجر کے واروں سے دوسرے کو ہلاک کردیا۔ قاتل کو میرے پاس لایا گیا۔ اصولاً تو مجھے اسی وقت اسے سزا دینا چاہیے تھی لیکن میں پہلے ہی اپنے کئی ہمراہیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور ان میں اب مزید کمی کی گنجائش نہ تھی۔ مرنے اور مارنے والے دونوں خن سا کے آدمی تھے، لہٰذا میں نے سزا کا فیصلہ بھی خن سا پر چھوڑ دیا۔ علاوہ ازیں مارنے والا جیپ کا ڈرائیور تھا لہٰذا اسے سزا دینے کا مطلب تھا کہ ہمیں ایک جیپ بھی یہیں چھوڑنی پڑے گی۔ میں نے اس سے اسلحہ لے لیا اور کہا کہ اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے گولی ماردی جائے گی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شراب کے نشے میں مرنے والے تھائی نے اس سے بلاوجہ ایسی اشتعال انگیز باتیں کی تھیں جنھیں کوئی ہوش و حواس میں رہتے ہوئے بھی برداشت نہ کرسکتا تھا، وہ تو پھر بھی نشے کے باعث ہوش میں نہ تھا۔

ہر روز مسلسل چودہ پندرہ گھنٹے سفر کرتے ہوئے پانچویں دن سہ پہر کو ہم پالت وا پہنچے۔ یہ خاصا بڑا قصبہ تھا اور یہاں سے ہمیں ساحل سے ہٹ کر اراکان کے اندرونی حصے سے گزر کر آگے بڑھنا تھا۔ پالت وا میں ہم نے دو روز قیام کیا اور جیپوں کی ضروری مرمت کروائی۔ عبداللہ کے کچھ عزیز یہاں رہتے تھے۔ حمید انھیں ملنے چلا گیا۔ واپسی پر اس کے ہمراہ دو ادھیڑ عمر کے آدمی آئے۔ انھوں نے مجھے اور میرے ہمراہیوں کو رات کے کھانے کی دعوت دی اور دوران گفتگو جب انھیں ہماری منزل کا پتہ چلا تو ان میں سے ایک ہمارے ہمراہ رانگا ماٹی تک جانے کو تیار ہوگیا بشرطیکہ میں اسے بھی ایک ہزار ڈالر دوں۔

اس نے بتایا کہ کالادان (جہاں قیصر اور اس کے ساتھیوں نے مجھ سے ملنا تھا) سے آگے میزولینڈ اور بنگلہ دیش کے پہاڑی سلسلہ سے گزرنے کا اسے کئی بار موقع ملا ہے۔ وہ نہ صرف راستے سے بخوبی واقف ہے بلکہ مورنگ اور مگھ قبیلے کے سرداروں سے بھی مل چکا ہے۔ پہاڑی سلسلے کے اوپر سے رانگا ماٹی جاتے ہوئے ہم کو لازماً ان دو قبائل کے بیچ سے گزرنا تھا۔ مجھے ایک ایسے ہی گائیڈ کی ضرورت تھی اس لیے میں نے اس کی آفر قبول کرتے ہوئے اسے پانچ سو ڈالر پیشگی دے دیئے۔

ہمارا اگلا دن تیاری میں صرف ہوا اور تیسرے روز صبح ہم اپنے آئندہ سفر پر روانہ ہوگئے۔

حمید کا عزیز شمس اب ہمارا گائیڈ تھا اس لیے میں نے اسے اپنی جیپ میں بٹھالیا جو ہمارے کاروان میں سب سے آگے تھی اور اپنے نمبر ٹو کو سب سے پچھلی جیپ پر بھیج دیا اور اسے ہدایت کی کہ قاتل تھائی پر نگاہ رکھے اور اگر وہ بھاگنے یا ادھر اُدھر ہونے کی حماقت کرے تو وارننگ دے کر گولی مار دے۔ میں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ مجھ اکیلے کی تو خیر کوئی بات نہ تھی لیکن رانگا ماٹی سے کامیابی سے لوٹنے پر میرے ہمراہ راجہ کی بیوی، بیٹا اور جواہرات ہونے تھے۔ دولت کا لالچ بڑے بڑے متقیوں کو بہکا دیتا ہے اور میرے ہمراہی تو سمگلروں کے گروہ کے آدمی تھے جن کا کام ہی اچھے بھلے آدمیوں کو منشیات کی لعنت لگا کر زندہ درگور کرنا تھا۔ ایسے لوگوں سے خیر کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ صرف گولیوں کا خوف ہی انھیں سیدھا رکھ سکتا تھا۔ سفر کے آغاز سے ہی میں نے یہ خوف ان پر طاری کردیا تھا۔ ان کے چند آدمیوں کو ہلاک کرنے کے باعث وہ اب میرے تمام احکام بلاچوں چرا بجا لاتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خوف بتدریج کم ہوسکتا تھا۔ آپ اسے میری خودغرضی کہیں یا کچھ اور لیکن میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ کالادان میں قیصر اور اس کے ساتھیوں کو ملنے کے بعد میں ان تھائیوں میں سے ایک آدھ کو ضرور ٹھکانے لگادوں گا تاکہ ان پر موت کی دہشت طاری رہے۔

تین دن کے جاں لیوا سفر کے بعد ہم راستے میں بادوپی (Badupi) میں رات بسر کر کے لنگ نگو (Lungngo) غروب آفتاب کے وقت پہنچے۔ راستہ اب بہت دشوار گزار ہوچکا تھا۔ برما اور آسام کے پہاڑی سلسلے شروع ہوچکے تھے۔ بنگلہ دیش کا ساحلی قصبہ کاکس بازار (Coxs Bazar) ہم اپنے مغربی جانب پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب چٹاگانگ ہمارے مغرب میں تقریباً دو سو میل اور کالادان ہمارے شمال مغرب میں تقریباً ایک سو بیس میل کے فاصلے پر تھے۔ شمس نے مجھے بتایا کہ اگر ہم کسی طرح انتہائی دشوار راستے کو عبور کر کے کالادان پہنچ بھی گئے تو بھی ہمیں اپنی جیپیں دیموگری (Demogiri) میں چھوڑنی پڑیں گی اور آئندہ سفر خچروں پر اور پیدل طے کرنا پڑے گا۔ کراچی میں اس مہم پر روانگی سے پہلے ہی مجھے دوران سفر پیش آنے والی مشکلات اور دشواریوں کا بخوبی علم ہوچکا تھا۔ راجہ تری دیو نے مجھے اس ناممکن العمل مہم (Mission Impossible) پر بھیج کر اپنے تیئں بہت ہی کم رسک لیا تھا اور رشوت کے پیسوں سے مہم کے اخراجات پورے کر کے اپنی بیوی اور چھوٹے لڑکے کو محض اس لیے بلوایا تھا کہ اس

کی بیوی کے ذریعے جواہرات بھی آجائیں۔ بنگلہ دیش یا اپنے قبیلے میں وہ زندگی بھر جانہیں سکتا تھا۔ اس کا مقصد صرف جواہرات کا حصول تھا ورنہ اپنی رانی اور بیٹے سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ تو پاکستان میں ایک فرانسیسی عورت کے چنگل میں اس بے طرح گرفتار تھا کہ اس کی رانی پاکستان پہنچنے کے چند ماہ بعد ہی انتقال کرگئی۔ چھوٹے بیٹے کو اس نے انگلینڈ بھیج دیا جہاں اس کی اکلوتی بیٹی کیمبرج میں پڑھ رہی تھی۔ ماں کے مرنے اور باپ کے رویے سے مایوس ہوکر اس نے وہیں کسی گورے سے شادی کرلی۔ راجہ تری دیو کو بعد میں بھٹو صاحب نے میکسیکو کا پاکستانی مقرر کیا تھا۔ راجہ تری دیو کی عادات اور اس کے اصل مقصد کو جاننے کے باوجود میں نے محض اس لیے اس جان جوکھم مہم کو سر کرنے کی ہامی بھری تھی کیونکہ راجہ نے چٹاگانگ میں میری ملازمت کے دوران مجھ پر جو احسان کیا تھا اس کی بنا پر میں انکار نہ کرسکا اور میرے مالی حالات بھی اتنے خراب ہوچکے تھے کہ میں ہر قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ سفر کے دوران آئندہ پیش آنے والی دشواریوں کا بتاتے ہوئے شمس نے کہا کہ ایک نسبتاً کم دشوار راستہ ہے۔ ہم واپس پالٹ وا چلتے ہیں اور وہاں سے کاکس بازار کی طرف ساحلی پٹی پر جاتے ہیں۔ بنگلہ دیش اور برما کے درمیان ایک چھوٹی سی ندی راموں نام کی ہے، اسے عبور کر کے ہم بنگلہ دیش میں ہوں گے۔ کاکس بازار سے کسی بڑی بادبانی کشتی کے ذریعے ہم بآسانی چٹاگانگ اور پھر رانگا ماٹی جاسکتے ہیں۔ میں نے شمس کی تجویز کو شکریے کے ساتھ رد کردیا۔ جس کی وجوہات میں ہی جانتا تھا۔ بنگلہ دیش پر اس دور میں بھارت کا اتنا اثر و رسوخ تھا کہ بنگلہ دیش میں داخل ہوکر میرا خود کو ظاہر کرنا بالکل ایسے ہی تھا جیسے بھارت میں جاکر میں DMI کے سامنے خود کو ظاہر کردوں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بنگلہ دیشی فوج نے رانگا ماٹی کو سوائے اوپر کے ناقابل دشوار راستے کے چاروں طرف سے اس طرح گھیر رکھا تھا کہ چٹاگانگ کے راستے سے ان کی نظروں میں آئے بغیر رانگا ماٹی پہنچنا ناممکن تھا اور تیسری وجہ تھی کہ میں نے کالادان میں قیصر اور اس کے ساتھیوں کو بلایا ہوا تھا جن کے بغیر اور محض تھائیوں کے برتے پر میں اس مہم کو سرانجام دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

قارئین کے لیے میں راموندی کے بارے میں جو برما اور بنگلہ دیش کے درمیان حد بندی کرتی ہے، ایک دلچسپ حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ سابق مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں ملازمت کے دوران میں خصوصی طور پر اس ندی کو دیکھنے گیا جس کا شہنشاہ جہانگیر نے بھی اپنی خودنوشت میں ذکر کیا ہے۔

بقول جہانگیر اس نے اپنے ایک دوست اور شاہی دربار میں ہفت ہزاری درجہ رکھنے والے کو بنگال کی صوبے داری کے لیے منتخب کیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ بنگال کی صوبے داری کا مطلب تھا برما، آسام اور متحدہ بنگال جس میں بہار بھی شامل تھا، کے علاقوں پر مطلق العنان حکمرانی۔ جہانگیر کا دوست اپنے لاؤلشکر سمیت قریب دو ماہ میں بنگال پہنچا اور صرف آٹھ دس روز وہاں قیام کے بعد لاہور واپسی کی راہ لی۔ واپسی کے سفر میں بھی کم و بیش دو ماہ ہی صرف ہوئے۔ شہنشاہ جہانگیر نے جب اس سے واپسی کی

وجہ دریافت کی تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولا، ''شہنشاہ معظم! جس علاقے میں دریا کا پانی دن کو شمال سے جنوب کو رات کو جنوب سے شمال کی طرف بہتا ہو۔ وہاں کے لوگوں کی متلون مزاجی کا کیا حال ہوگا؟ ایسے لوگوں پر حکمرانی کرنے کا میں اہل نہیں اس لیے بصد حسرت و یاس میرا استعفیٰ قبول فرمائیں۔'' اس دریا یا ندی کو دیکھنے میں خود گیا۔ کاکس بازار کے مشرقی جانب قریباً پچیس میل کے فاصلے پر یہ ندی بہتی ہے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ ہم نے رات وہیں بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ دن کے وقت ندی کا پانی شمال سے جنوب کی طرف بہتا ہوا سمندر میں جا گرتا تھا۔ رات ہوئی تو ندی الٹی جانب یعنی جنوب سے شمال کو بہنے لگی۔ بادی النظر میں یہ بڑی عجیب اور حیران کن بات تھی۔ میرے خیال میں دن کو ندی کا پانی سیدھے سبھاؤ شمال سے جنوب کو بہتا تھا۔ رات کو سمندر کی لہریں زیادہ بلند ہوجاتی ہوں گی۔ جوار بھاٹے کے باعث سمندر چڑھ آتا ہوگا اور اس کا پانی ندی کے پانی کو دھکیلتا ہوا ندی میں داخل ہوکر Up Stream بہنے لگتا ہوگا۔ میں نے دوستوں سے اپنے اس نظریے کا ذکر کیا تو انھوں نے اسے رد کرتے ہوئے کہا کہ سمندر میں صرف راموندی ہی نہیں بلکہ درجنوں چھوٹے بڑے دریا گرتے ہیں۔ ان کا پانی تو کبھی الٹا نہیں بہتا۔ پانی الٹا بہنے کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ ایک بات ماننی ہی پڑتی ہے۔ بنگالی قوم جتنی متلون مزاج دنیا کی شاید کوئی دوسری قوم نہیں۔ مچھلی اور چاول کھانے سے ان کے دماغ ہمیشہ گرم رہتے ہیں اور جیسے مچھلی اکثر ہاتھ سے پھسل جاتی ہے ویسے ہی ایک کے بعد ایک نظریہ ان کے دماغ میں آتا اور پھسلتا جاتا ہے۔ مغلیہ خاندان کے دور حکومت میں سب سے زیادہ بغاوتیں اسی علاقے میں ہوئیں۔ یہاں کی بیشتر آبادی بیک وقت پکے مسلمان اور باغیانہ اور لادینی خیالات والوں پر مشتمل ہے۔ شیخ مجیب کے اپنے بیان کے مطابق وہ قائداعظمؒ کا اتنا مداح تھا کہ ان کی تقریر سننے سائیکل پر کلکتے گیا تھا وہی مجیب پاکستان کو دولخت کرنے کا سبب بنا۔ میرے خیال میں شخصیات اور حکمرانوں سے اختلاف کی بنا پر اپنے وطن اور ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانے والے عقل و دانش سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ اب نہ تو مجیب زندہ ہے اور نہ ہی ذوالفقار علی بھٹو، جنرل یحییٰ اور جنرل ٹکا خان لیکن مجیب اور بھٹو نے پاکستان کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے ہوئے اور اقتدار کی ہوس میں جو گھناؤنا کھیل کھیلا اس کے داغ تاحشر سچے پاکستانیوں کے دلوں پر موجود رہیں گے۔

لنگ نگو اس پہاڑی سلسلے میں واقع ایک قصبہ تھا جو برما اور آسام کے درمیان قدرتی حد فاصل ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ ناقابل عبور اور جنگلی درندوں، سانپوں اور ہر قسم کے زہریلے حشرات الارض سے بھرا پڑا ہے۔ شمس کے بقول بارڈر کو جیپوں سمیت کراس کرنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ ہم برما میں مزید شمال کی طرف کلنگ کالانگ (Kalang Klang) اور فالام (Falam) سے گزرتے ہوئے ٹورزنگ (Torzang) جائیں۔ اس روٹ پر پہاڑی سلسلے کے مغربی دامن سے گزرتے ہوئے ہم بلند پہاڑوں سے گھنے جنگلات کو پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ ٹورزنگ میں ایک درے سے گزرتا ہوا راستہ ہمیں

آسام پہنچا سکتا ہے اور اس راستے سے جیپیں بھی جاسکتی ہیں۔ آسام میں ہم میزو رام میں ازاول (Aizawl) سے پھر جنوب کی جانب جاکر کالادان پہنچ جائیں گے۔ کالادان سے آگے ڈیموگری (Demugiri) کے قصبے میں ہم جیپیں چھوڑ کر پیدل اور خچروں پر بنگلہ دیش میں داخل ہوں گے۔ یہ پہاڑی سلسلہ بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان واقع ہے۔ بھارتی جانب میزورام کے قبائل ہیں جو مغلیہ دور حکومت سے لے کر آج تک ہر حکومت سے لڑتے رہے ہیں اور بنگلہ دیش کی جانب مورنگ، مگھ اور چکمہ قبائل ہیں۔ چکمہ قبیلہ جو ان سب قبائل سے زیادہ Civilized ہے وہ بھی مغلیہ دور سے لے کر آج تک 1947ء سے 1971ء کے وقفے کے سوا ہر حکومت سے برسرِ پیکار رہا جبکہ مگھ اور مورنگ قبائل تو آج سے ہزاروں برس پہلے کے ماحول میں رہ رہے ہیں۔

پہاڑی تنگ پگڈنڈیوں پر پیدل چلنے اور خچروں پر سفر کے خیال سے ہی مجھے وحشت ہوتی تھی اور یہی حال میرے ہمراہیوں کا تھا۔ بہرحال! جب اوکھلی میں سر دیا تھا تو موصلی کی ضربات تو سہنی ہی تھیں۔ چار و ناچار اپنی مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی مجھے ہر ممکن کوشش کرنی تھی۔ لنگ نگو میں دو روز قیام کے بعد ہم نے شمس کی رہنمائی میں شمال کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ برما کے اس علاقے میں خاصی سردی تھی۔ راستہ بھی بہت کٹھن اور دشوار گزار تھا۔ قصہ کوتاہ اس چار روزہ سفر میں ہم سارا دن ٹوٹے پھوٹے راستوں پر جیپیں چلاتے اور رات کو جنگل کے کنارے پہاڑوں کے درمیان کسی کھلی جگہ پڑاؤ کرتے رہے۔ جنگلی درندوں اور حشرات الارض سے بچنے کے لیے ساری رات آگ جلائے رکھنے کے باوجود ہم ذرا بھی سو نہ سکے۔ اس علاقے کے چیتے اور جنگلی بلیاں ہمارے پڑاؤ کے اردگرد ہی گھومتی رہتیں۔ ان کے غرانے سے درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے ڈر کر اڑتے۔ ان کی چیخوں اور جنگلی بندروں کی آوازوں سے اس قدر شور مچتا کہ ہماری ساری راتیں جاگتے ہی بیت گئیں۔ چوتھے روز شام کے وقت ہم ٹورزنگ پہنچے۔ یہاں آسام میں داخل ہونے کے لیے جس درے سے ہمیں گزرنا تھا۔ اس کے دونوں جانب برمی اور بھارتی پولیس اور بارڈر سیکیورٹی فورس تعینات تھی۔ برمی جانب سے تو ہم جنرل شال کپ کا خط دکھلا کر بغیر کسی دشواری کے درے میں داخل ہوگئے۔ بھارتی جانب ہمیں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم نے بھارتی حصے میں داخلے سے آدھ میل پہلے ہی اپنا قافلہ روک لیا تھا اور شمس اور حمید کے ساتھ میں بھارتی سائیڈ کا جائزہ لینے آگے گیا۔ جب کوئی بھی تدبیر کام نہ آئی تو ہم نے بین الاقوامی سفارش یعنی امریکی ڈالروں کی پیش کش کی۔ یہ اتنی بڑی سفارش تھی جسے میرے خیال میں شاید ہی کسی نے کبھی ٹھکرایا ہو۔ ایک ہزار ڈالر میں معاملہ طے ہوا اور بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس کے میجر نے ڈالر جیب میں رکھتے ہوئے ہمیں گزرنے کی اجازت دے دی۔ میجر نے کمال مہربانی کرتے ہوئے ہمارے سامان کی تلاشی لینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی ورنہ ہمارے پاس اچھا خاصا اسلحہ تھا۔ درے سے گزر کر ہم جلد از جلد ازاول کے قصبے میں پہنچنا چاہتے تھے کیونکہ بین الاقوامی بارڈر سے جتنا دور رہا جائے اتنا ہی محفوظ سمجھا جاتا

ہے۔ ازاول میں ہم نے کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کے بجائے قصبے سے باہر پڑاؤ کرنا بہتر سمجھا کیونکہ ہوٹل والے ہم سے ہماری شناخت اور پاسپورٹ وغیرہ بھی طلب کرسکتے تھے۔ ہم ابھی پڑاؤ کے لیے کوئی مناسب جگہ ہی ڈھونڈ رہے تھے کہ بھارتی سائیڈ کا وہی میجر وہاں آدھمکا۔ اس کا رویہ اب خاصا دوستانہ تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ ہم کسی ہوٹل میں کیوں نہیں ٹھہرتے۔ رات کو تو یہاں سردی اتنی بڑھ جائے گی جسے ہم برداشت نہ کرسکیں گے۔ میجر کو میں نے جب یہ بتایا کہ میرے ساتھیوں کے پاس اتنی رقم نہیں کہ ہوٹل کا خرچ برداشت کرسکیں تو وہ ہنس پڑا اور بولا، ”تعجب ہے کہ سرحد کراس کرنے کے عوض ہزار ڈالر دینے والے معمولی درجے کے ہوٹل کا خرچہ بھی برداشت نہیں کرسکتے؟ اصل بات کیوں نہیں بتاتے کہ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں کے پاس سفری کاغذات نہیں ہیں اور اسی لیے تم ہوٹل میں جانے سے کتراتے ہو۔ مجھے مزید ڈالر دو تو بغیر کاغذات کے تم سب کے لیے ہوٹل میں قیام کا بندوبست کردوں گا۔“ ”اور اگر میں کہوں کہ ہمارے پاس واقعی مزید ڈالر نہیں ہیں تو؟“ میں نے سوال کیا تو میجر بولا، ”پھر میں تمھارے سارے سامان کی تلاشی لوں گا۔ تم سب یقیناً کسی غیرقانونی کام یا بھارت میں دہشت گردی کرنے کے ارادے لے کر یہاں آئے ہو۔“ میں میجر کی نیت بھانپ چکا تھا اور اب گفتگو سے اسے رام کرنے کی کوشش کرنا بیکار تھا۔ میجر اپنی جیپ میں اکیلا آیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ہم نہ تو دہشت گردی کے لیے بھارت آئے ہیں اور نہ ہی کسی غیرقانونی کام کے لیے۔ ہمارے پاس جتنا روپیہ بھی ہے ہم اسے دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ صرف پانچ منٹ انتظار کرے میں اپنے ایک ساتھی سے روپیہ لے کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں اپنے نمبر ٹو کے پاس گیا جو سامنے ہی کھڑا تھا اور سرگوشی میں اسے اپنا پلان سمجھایا اور نوٹوں کی ایک گڈی چپکے سے اُسے دی۔ میں میجر کے پاس واپس لوٹ آیا اور اسے بتایا کہ میرا ساتھی ڈالر لے کر ابھی آتا ہے۔ نمبر ٹو وہی گڈی ہاتھ میں لیے ہماری طرف آیا۔ شام کا اندھیرا خاصا پھیل چکا تھا۔ نمبر ٹو نے گڈی جس میں کم وبیش دس ہزار ڈالر کے نوٹ تھے، مجھے تھمائی اور پیچھے ہٹ گیا۔ میجر کی نگاہوں میں دولت کی حرص تھی اور وہ گڈی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ میں نے اسے کہا، ”ہماری کل پونجی یہی ہے اور ہمیں خاصا دُور جانا ہے۔ تمھاری بہت مہربانی ہوگی اگر کچھ ڈالر ہمارے پاس رہنے دو۔“ میجر ہنسا اور گڈی لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا، ”میری ضرورت تم سے زیادہ ہے۔ تمھاری جیپوں پر تو خاصا سامان لدا ہوا ہے۔ تم سامان یا ایک جیپ بیچ دو۔ تمھاری ضرورت پوری ہوجائے گی۔ میں یہ تمام ڈالر لوں گا۔“ میں نے گڈی اسے تھماتے ہوئے کہا، ”صرف ایک سو ڈالر ہی دے دو۔“ "Not at all" (بالکل نہیں)“ میجر نے یہ کہا اور ساتھ ہی اس نے چیخ ماری جسے میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔ نمبر ٹو کا وار اتنا کاری تھا کہ خنجر اس کے دل کو چیرتا ہوا جسم کے آرپار ہوگیا۔ میجر کی بے جان لاش کو میں نے گرنے سے روکا۔ نمبر ٹو نے میجر کے جسم میں خنجر اتار کر اسے گھما دیا تھا تاکہ اس کے مرنے میں کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میجر کا قد اور جسم مجھ جیسا ہی تھا۔ میں نے نوٹوں

کی گڈی جیب میں ڈال کر نمبر ٹو کو کہا کہ اپنے آدمیوں سے کہے کہ میجر کی وردی اتار کر اس کے جسم کو ایک سلیپنگ بیگ میں ڈال دیں اور وردی پر سے خون کے داغ فوری صاف کردیں۔ نمبر ٹو گیا تو میں نے نوٹوں کی گڈی کے علاوہ اس کی جیبوں میں سے تمام کاغذات، اپنے دیے ہوئے ہزار ڈالر اور بھارتی کرنسی نکال لی۔ آدھے گھنٹے میں میرے ہمراہیوں نے سارا کام کردیا۔ میں نے میجر کی وردی پہنی اور اسی کی جیپ میں اپنا اسلحہ ڈال کر شمس کو بٹھایا۔ ادھر حمید نے میری جیپ چلانے کی ذمہ داری سنبھالی۔ ہم نے یہاں پڑاؤ کرنے کو کینسل کیا اور تھوڑی دیر میں ہی ہمارا قافلہ کالادان کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے سوچا تھا کہ بنگلہ دیش میں داخل ہونے تک میں میجر کی وردی اور جیپ اپنے استعمال میں رکھوں گا۔ راستے میں ایک گہری کھائی کے قریب ہم نے قافلہ روکا۔ میرے ساتھیوں نے میجر کو اس طرح کاٹا کہ وہ ناقابل شناخت ہوگیا اور سلیپنگ بیگ سمیت اس کی لاش کو آگ لگا کر ہم آگے بڑھ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ میجر کی گمشدگی کا رات گئے تک بھارتی فوج کو پتہ نہ چل سکے گا کیونکہ وہ اپنی پوسٹ سے ڈیوٹی ختم ہونے پر ہی ہمارے پاس آیا تھا۔ اسے تلاش کرتے ہوئے بھی ہم پر شک نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس نے یقیناً اپنی پوسٹ سے جاتے ہوئے ہمارا کوئی ذکر نہ کیا ہوگا۔

کالادان جانے کا راستہ پتھریلا، جنگلات سے ہوتا ہوا ڈھلوان کی جانب تھا اور ہماری جیپیں آہستہ رفتار سے آگے بڑھ رہی تھیں صبح ہمیں ایک فوجی چیک پوسٹ سے گزرنا پڑا۔ مجھے میجر کی وردی میں اور فوجی جیپ کو دیکھ کر فوجی پہریداروں نے بغیر کوئی سوال کیے چیک پوسٹ کا بیریئر (Barrier) اُٹھا دیا۔ لیکن وہ بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ شمس نے مجھے بتایا کہ انڈین بارڈ سیکیورٹی فورس میں زیادہ تر وہی آفیسر اور جوان اس علاقے میں تعینات کیے جاتے ہیں جو اس علاقے سے تعلق رکھتے اور آسامی اور بنگلہ زبان جانتے ہوں۔ تم اپنی شکل وصورت سے کسی طرح بھی اس علاقے کے رہنے والے نہیں لگتے ہو۔ علاوہ ازیں تمھارے علاوہ سارے قافلے میں سے کسی نے بھی فوجی وردی نہیں پہنی ہوئی اور اسی کے باعث پہریدار فوجی صرف تمھیں ہی نہیں بلکہ سارے قافلے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ آگے ایک بڑی چیک پوسٹ بھی آئے گی اور عین ممکن ہے کہ وہاں بھارتی سیکیورٹی فورس کے آفیسر بھی ہوں۔ اس وردی اور فوجی جیپ کے باعث تم کسی مشکل میں گرفتار ہوسکتے ہو۔ اس کے علاوہ آگے کا سارا علاقہ میزورام کا ہے جہاں کے باغی قبائل بھارتی حکومت اور فوج کے مظالم سے تنگ آکر انتقامی کارروائیاں کرتے ہیں۔ بھارتی فوجی کبھی کبھار جب اس علاقے میں جاتے ہیں تو کم از کم ایک دو کمپنی (لگ بھگ تین سو) کی نفری میں جاتے ہیں۔ اکا دکا فوجی تو وہاں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا ورنہ میزو قبائل اسے فوراً ہلاک کردیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اگلی چیک پوسٹ آنے سے پہلے تم وردی اور فوجی جیپ سے چھٹکارا پالو۔ شمس کی بات معقول اور دلائل سے پر تھی۔ میں نے راستے میں ایک گہرے کھڈ کے قریب قافلہ رکوا دیا اور فوجی جیپ پر پٹرول ڈال کر آگ لگائی اور اسے کھڈ میں دھکیل دیا۔ آگ کی حدت سے

جیپ کے پٹرول ٹینک نے بھی آگ پکڑ لی اور ایک دھماکے سے جیپ کے پرخچے اڑ گئے۔ وردی کو بھی اتار کر میں نے آگ دکھا دی لیکن میجر کی سمور والی جیکٹ پہنے رکھی جس پر کوئی فوجی نشان نہ تھا۔ دراصل سردی اس قدر زیادہ تھی کہ سمور کی جیکٹ نے مجھے بہت آرام دیا تھا۔ راستے میں آنے والی بڑی چیک پوسٹ پر ہم سارے دن کے سفر کے بعد رات گئے پہنچے۔ بنکاک سے چلتے وقت میں نے احتیاطاً ایک لمبا سیاہ کوٹ اور صلیب والی پینڈل بھی خرید لی تھی۔ ''رابرٹ مائیکل'' یعنی میں اب ایک پادری تھا جو اس علاقے میں باغی قبائل میں مذہبی پرچار کے علاوہ ان کے لیے دوائیاں اور کھانے پینے کا سامان لے کر جارہا تھا۔ یہ میری کورسٹوری (Cover Story) تھی جسے میں نے چیک پوسٹ پر بیان کیا۔ لباس بھی میں نے پادریوں جیسا پہنا ہوا تھا جس پر لٹکی ہوئی صلیب نمایاں تھی۔ بھارتی حکومت اور فوج آج تک یہ چاہتی ہے کہ اس علاقے کے لوگ بھلے عیسائی ہوجائیں لیکن باغیانہ کارروائیاں چھوڑ دیں۔ اسی لیے مغربی عیسائی ممالک نے اپنے کئی مشن یہاں بھیج رکھے ہیں۔ ہمیں بھی اس چیک پوسٹ سے بغیر کسی چیکنگ کے بلکہ سب کو گرم چائے پلوا کر احترام سے روانہ کیا گیا ''آخر ہم ان کے باغیوں کو رام کرنے اور سدھانے کے لیے ہی تو جارہے تھے۔''

ایک رات اور دن کے مزید سفر کے بعد شام کو ہم کالادان پہنچ گئے۔ یہ خاصا بڑا قصبہ تھا اور یہیں پر مجھے قیصر اور اس کے ساتھیوں سے ملنا تھا۔ قصبے کے شروع میں ہی ایک جھونپڑ ہوٹل سے ہم نے شہر کے تمام رہائشی ہوٹلوں کا پتہ لیا۔ میں نے باقی قافلے کو تو یہیں رکنے کا کہا اور شمس اور اپنے نمبرٹو کے ہمراہ اپنی جیپ میں قیصر اور اس کے ساتھیوں کی تلاش میں چل پڑا۔ شمس کالادان سے بخوبی واقف تھا اور میں قیصر کی طبیعت اور اپنی تربیت سے جو میں نے اسے دی تھی۔ شمس نے سارے ہوٹل کھنگال ڈالے لیکن قیصر اور اس کے ساتھیوں کا کہیں پتہ نہ چلا۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ قیصر نہ تو کسی ایک ہوٹل میں اپنے ساتھیوں سمیت اکٹھا ٹھہرا ہوگا اور نہ ہی انھوں نے ہوٹلوں میں اصل نام لکھوائے ہوں گے۔ (بھارت میں چونکہ شناختی کارڈ رائج نہیں اس لیے کسی ہوٹل میں قیام کے لیے جو بھی نام اور پتہ لکھوایا جائے، ہوٹل والوں کو قبول کرنا پڑتا ہے) انھیں تلاش کرنے کے لیے ہوٹلوں کے ویٹروں سے ہی صحیح معلومات مل سکتی تھیں۔ میں نے شمس کو قیصر کا حلیہ بتا کر اسے کہا کہ ہم دوبارہ ہوٹلوں میں جاتے ہیں اور تم آسامی زبان میں اس حلیے والے شخص کا دریافت کرو۔ دوسرے ہوٹل میں ہی میری یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور ہوٹل کے بیرے نے بتایا کہ ایک کمرے میں اردو بولنے والے تین مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں جن میں سے ایک کا حلیہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا آپ نے بتایا ہے اور یہ تینوں مہمان اس وقت اپنے کمرے میں موجود ہیں۔ میں اور شمس پہلی منزل کے اس کمرے کی طرف گئے اور میں نے آہستہ سے دو بار اسی انداز سے دستک دی جیسے گورکھپور میں دیا کرتا تھا۔ دروازہ قیصر نے کھولا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں اور کافی دیر تک ہم ایک دوسرے سے بغل گیر رہے۔ قیصر مجھے اور شمس کو کمرے میں لے گیا۔ اس کے ہمراہ

جو دو ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے انھوں نے دہلی میں 26 جنوری اور گورکھپور کے مشنوں میں حصہ لیا تھا۔ وہ دونوں بھی مجھے لالہ جان کہتے ہوئے لپٹ گئے۔ یقین جانیے ان کے گلے ملنے اور خیریت پوچھنے میں اتنا خلوص تھا کہ میری آنکھیں بھر آئیں۔ اپنوں نے تو مجھے ہمیشہ دکھ ہی دیے تھے۔ خلوص ملا تو ان بھارتی مسلمانوں میں جن کا میرے ساتھ صرف ایک ہی ذہنی تعلق تھا اور وہ تھا بھارتی ہندوؤں سے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینا۔ قیصر کی تو مارے خوشی کے بری حالت تھی۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کہا کہ باقی سب ساتھیوں کو جو دوسرے ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے تھے، یہاں لے آئے۔ ادھر شمس سے میں نے کہا کہ قافلے کے باقی ہمراہیوں کو لے کر ان ہوٹلوں میں ٹھہرائے جہاں دہلی کے لڑکے ٹھہرے ہوئے تھے۔ نمبرٹو ان کا ایڈوانس کرایہ جمع کروا دے اور وہ نمبرٹو کو اسی ہوٹل میں لے آئے۔ دونوں لڑکے اور شمس باقی ساتھیوں اور ہمراہیوں کو لینے چلے گئے اور قیصر اور میں نے ان دنوں سے باتوں کا آغاز کیا جب ہم دہلی میں پہلی بار ملے تھے۔ جب باتیں شروع ہوئیں تو ہمیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا تاآنکہ میرے ہمراہیوں کو ہوٹلوں میں ٹھہرا کر اور قیصر کے سارے ساتھیوں کو لے کر شمس اور نمبرٹو واپس آگئے۔ حمید کو میں نے تھائیوں کے ہمراہ ٹھہرایا تھا اور نمبرٹو اور شمس کے لیے ایک کمرہ اور ایک کمرہ اپنے لیے بک کیا۔ قارئین کو میری اور قیصر کی ماضی کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی اس لیے قصہ مختصر کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ ہم پو پھٹنے تک باتیں کرتے رہے۔ آئندہ سفر کے لیے یہ فیصلہ ہوا کہ شمس اور حمید یہاں کالادان سے ہی خچروں اور مزدوروں کا انتظام کرنے کی کوشش کریں گے اور تین روز یہاں قیام کرنے اور ضروری تیاری کے بعد ہم اپنے آئندہ سفر کا آغاز کریں گے۔

کالادان میں قیصر کو جب میں نے یہ بتایا کہ بھارت اور نیپال میں اپنے ساڑھے تین سالہ قیام اور بھارتی انٹیلی جنس اور افواج کا غرور توڑنے کے بعد میں پاکستان پہنچا تو مجھے اتنی مالی دشواریوں میں مبتلا کر دیا گیا کہ میں نے مجبور ہوکر ایک دوست کے ہوٹل میں ملازمت کرلی اور مالی دشواریوں کے باعث ہی میں نے اس مہم کو سر کرنے کی ہامی بھری ہے تو وہ سر پیٹ کر رہ گیا۔ ''بھائی جان! آپ نے تو اپنی حب الوطنی کے باعث بغیر کسی لالچ کے سر پر کفن باندھ کر اپنے وطن اور اسلام کی خدمت کی اور جتنا روپیہ بھی حاجی مستان اور یوسف پٹیل نے آپ کو دیا وہ سب آپ نے کھٹمنڈو میں ضرورت مند مہاجروں میں بانٹ دیا لیکن اپنی جو حالت آپ نے بتائی ہے اس کا تو ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ حاجی مستان اور یوسف پٹیل ابھی زندہ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جس قدر وہ آپ کی عزت اور توقیر کرتے ہیں، اگر آپ انھیں ذرا سا اشارہ بھی کردیں تو وہ آپ کے قدموں میں روپوں کا ڈھیر لگادیں گے۔'' قیصر نے میری دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔ ''قیصر! میں نے جو کچھ بھی کیا وہ میرا فرض تھا۔ ہم سب اپنے وطن اور ملک سے اپنے مفاد کے لیے مانگتے ہیں لیکن ہم اپنے وطن کو دیتے کیا ہیں؟ محض نفرتیں اور شکوے شکایت۔ میں نے پاکستان کی جو بھی خدمت کی ہے وہ کسی عوضانے یا بدلے میں کچھ پانے کے لیے نہیں بلکہ صرف

اس ذلت اور خفت کو مٹانے کے لیے تھی جو سقوط ڈھاکہ کے باعث ہمیں ملی اور میری خدمت اس سمندر میں ایک قطرے کے برابر ہے جو ہزارہا بلکہ لاکھوں پاکستانیوں نے اپنے وطن کی عزت اور حرمت کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے دے کر کی ہے۔ میں تو آج بھی زندہ سلامت تمھارے سامنے موجود ہوں۔ ذرا ان لاکھوں جانوں کے نذرانے دینے والوں کے متعلق سوچو جو خود مٹ کر اپنے وطن کو دائمی بقا دے گئے۔ جہاں تک میری مالی دشواریوں کا تعلق ہے تو میں نے آج تک کسی انسان کو نہیں بلکہ صرف اللہ کو رزاق مانا ہے۔ جو روزی میرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے وہ مجھے ہر حالت میں ملے گی۔ یہی میرا یقین، اعتماد اور زندگی گزارنے کا اصول ہے۔ تم جیسے جاں نثار دوستوں کی بے لوث محبت کیا کوئی کم دولت ہے؟ میں تم سب دوستوں اور ساتھیوں کی محبت کو دنیاوی مال و دولت سے بدرجہا قیمتی سمجھتا ہوں۔ میرے ایک ٹیلی فون کرنے پر تم سب بھارت کے اس کونے تک آگئے ہو اور میرے ساتھ اس جان جوکھم مہم میں جانے کو تیار ہو۔ کیا تمھارا خلوص اور محبت کسی دنیاوی دولت سے کم ہے؟" میں نے قیصر کو لاجواب کر دیا تو وہ بولا، "بھائی جان! ہم اپنے ساتھ صرف ایک ایک ریوالور، دو درجن مقامی دستی بم اور خنجر ہی لا سکے ہیں۔ انھیں تو ہم نے چھپا لیا تھا اگرچہ بڑا اسلحہ بھی مہیا تھا لیکن راستے کی چیکنگ کے باعث نہ لا سکے کیا یہ اسلحہ کافی ہوگا یا ہم کسی فوجی چوکی پر اچانک حملہ کرکے ان کا اسلحہ چھین لیں؟" میں نے جواب دیا، "فی الحال تو ہمارے پاس کافی اسلحہ ہے اگر مزید کی ضرورت پڑی تو یہ بھی کرلیں گے۔ میرے پاس سائیڈ آرمز (Side Arms) کے علاوہ دستی بم بھی ہیں اور دو سب مشین گنز بھی۔ میرے ہمراہی تھائیوں میں سے چند کے پاس آٹومیٹک رائفلیں ہیں۔ میں موقع ملتے ہی ان سے یہ رائفلیں لے کر تمھیں دے دوں گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمھارے کتنے ساتھی یہ رائفلیں بخوبی استعمال کرسکیں گے؟" "میں نے بھارت میں مسلمانوں کی مخدوش حالت دیکھتے ہوئے دو تین فوجی چوکیوں سے اسلحہ چھینا تھا اور اپنے ساتھیوں کو یہ اسلحہ چلانے کی کافی مشق بھی کروائی ہے۔ آپ یقین رکھیے کہ موقع آنے پر میرے ساتھی آپ کو مایوس نہ کریں گے۔" قیصر نے اپنے ساتھیوں کی کارکردگی کا یقین دلایا۔

کالادان میں تین روز کے قیام کے دوران ہمیں کوئی مزدور یا خچر نہ ملے۔ سب نے یہی کہا کہ دیموگری (Demogiri) میں ہی ہمیں یہ سب مل سکیں گے۔ کالادان میں تین روز قیام کرنے اور شمس سے آئندہ سفر کی مفصل معلومات لینے کے بعد چوتھے روز صبح ہم دیموگری کے لیے روانہ ہوئے۔ قیصر اور اس کے ساتھیوں کے باعث ہماری نفری کی کمی تو پوری ہوگئی لیکن جیپوں پر بیٹھنے کی گنجائش کم ہوگئی۔ میں نے چاروں جیپوں پر قیصر کے ساتھیوں کو اس طرح بانٹ کر بٹھا دیا کہ تھائیوں کی تعداد ان سے بڑھنے نہ پائے۔ ادھر قیصر نے میری جیپ چلانے کی ذمہ داری بانٹ لی۔ کالادان سے ہی سب نے گرم مفلر، دستانے اور جیکٹیں خریدیں کیونکہ ہمیں اب بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیانی پہاڑی سلسلے کو عبور کرنا تھا۔

راتوں کو راستے میں پڑاؤ کرتے ہوئے تیسرے روز بعد دوپہر ہم دیموگری پہنچے۔ یہاں شمس

نے اپنا کمال دکھایا اور ایک ہندو مہاجن سے ہماری چاروں جیپیں رہن رکھ کر معمولی رقم قرض لینے کی بات کی۔ مہاجن جیپیں دیکھ کر مطلوبہ رقم دینے پر فوری راضی ہوگیا۔ شرط یہ تھی کہ مہاجن تین ماہ کے لیے روپیہ قرض دے گا اور جیپوں کو ہرگز استعمال نہیں کرے گا۔ تین ماہ تک اگر اسے اصل اور سود واپس نہ ملا تو چاروں جیپیں اس کی ملکیت ہوجائیں گی۔ ہمارا اصل مقصد جیپوں کو محفوظ رکھنا تھا ورنہ قرض کی ہمیں قطعاً ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ خچروں اور مزدوروں کا انتظام کرکے ہم نے چاروں جیپیں مہاجن کے گودام کے کمپاؤنڈ میں کھڑی کردیں اور ان کے ڈسٹری بیوٹر اور گورنر نکال کر اپنے پاس رکھ دیے تاکہ ہماری غیر موجودگی میں جیپیں چلانے کا امکان نہ رہے۔ فالتو پٹرول کے ڈبے مہاجن نے گودام میں رکھوا دیے۔

کالادان سے دیموگری تک کا سفر تو ہم نے بغیر کسی بڑی دشواری کے طے کیا تھا۔ ہمارے اصل مصائب اور سفری صعوبتیں دیموگری سے شروع ہوئیں۔ خچروں، پیدل اور مزدوروں کے ساتھ پہاڑی سلسلے پر پیچ وخم کھاتی تنگ پگڈنڈیوں، گہری کھائیوں جن کے آخری سرے شاید پاتال کی گہرائیوں سے ملے ہوئے تھے، یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے نہ صرف اپنی تندہی سے ہمیں ہلا دیتے تھے بلکہ ہڈیوں تک میں سرایت کر جاتے تھے۔ جنگلی بلیاں اور چیتے درختوں کے تنوں سے چمٹے ہوئے ہماری ذرا سی بے دھیانی میں ہم پر جھپٹنے کو تیار دکھائی دیتے تھے اور کوبرا سانپ اور اژدھے جو گرے ہوئے پتوں اور ٹہنیوں میں خود کو کیموفلاج کیے ہوئے ہمارا اگلا قدم اٹھنے پر ہم پر حملہ آور ہونے پر آمادہ اور سب سے بڑھ کر باغی میزو قبائل جو ہمارا روپیہ، اسلحہ اور سامان رسد لوٹنے کی تاک میں چھپ کر ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ غرضیکہ کون سی ایسی مشکل اور دشواری تھی جو ہمیں اس پہاڑی سلسلے کو عبور کرتے ہوئے پیش نہ آئی۔ شمس کی ہدایت کے مطابق ہم نے پیدل چلنے والوں کو اور خچروں کو دو مضبوط رسوں سے اس طرح باندھا تھا کہ اگر کوئی خچر یا پیدل چلنے والا پگڈنڈی سے پھسل کر کھائی میں گرے تو رسوں سے بندھے باقی ہمراہی اسے سنبھال سکیں۔ ہمارا سفر شروع ہوئے ابھی صرف دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ میں نے ان پگڈنڈیوں پر چلنے کے عادی خچر سے اتر کر پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ شمس کے سوا قیصر اور اس کے ساتھی بھی پیدل چل رہے تھے۔ مجھے اپنے پاؤں اور ٹانگوں پر تو بھروسہ تھا لیکن خچر کی نپی تلی چال کے باوجود میں بہت Unsafe اور Uncomfortable محسوس کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں قیصر اور اس کے ساتھیوں کے لیے بھی سفر کا یہ انداز بالکل انوکھا اور نیا تھا۔ صرف میرے ساتھ اپنے خلوص اور وعدے کو نبھاتے وہ میرا ساتھ دے رہے تھے، لہٰذا میں نے بھی رسے کو اپنی کمر کے گرد باندھا اور ان کے ساتھ پیدل چل پڑا۔ خچر اور مزدور ہمارے آگے جا رہے تھے اور تھائی ہمارے پیچھے۔ میں نے سفر شروع کرنے سے پہلے ہی تھائیوں سے تین آٹومیٹک رائفلیں لے کر قیصر اور اس کے دو ساتھیوں کو دے دی تھیں۔ قافلے کے تمام افراد کو میری جنرل ہدایات یہ تھیں کہ ہم حتی الامکان کوشش کریں گے کہ بغیر کسی سے مقابلہ کیے اپنا سفر جاری رکھیں اس لیے کوئی بھی فائر آرم استعمال نہیں کرے گا۔ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہوجائے تو میں معاملہ سلجھانے کی کوشش کروں

گا اور اگر کوئی بھی تدبیر کام نہ آئی تو پہلا فائر میں کروں گا۔ پھر ان سب کو اجازت ہوگی کہ چن چن کر اپنے مد مقابل کو ختم کریں۔

مجھے سفر کے آغاز سے ہی محسوس ہو رہا تھا یا یہ میری چھٹی حس تھی جو مجھے خبردار کر رہی تھی کہ غیر محسوس طریقے سے ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ پگڈنڈی کے ایک جانب تو گہری کھائی تھی اور دوسری طرف بلند پہاڑ جن پر گھنے درخت اگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک دو بار قیصر کو کہا بھی کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ پہاڑ کے درختوں کی اوٹ میں چھپ کر ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ ہمیں کئی بار سوکھے پتوں پر چلنے کی نمایاں آوازیں آئیں اور دو تین بار تو چھوٹے پتھر لڑھکتے ہوئے پگڈنڈی پر آن گرے۔ ہم پیدل چلنے والوں کی نگاہیں بیک وقت درختوں پر جنگلی بلیوں اور چیتوں کے علاوہ سانپوں اور اژدھوں کو بھی تلاش کر رہی تھیں جو پگڈنڈیوں کے پتھروں کے نیچے اور قریبی درختوں سے چمٹے رہتے تھے۔ شمس نے مجھے بتایا تھا کہ خچروں کی حس انسانوں سے بہت بڑھ کر ہوتی ہے اور وہ خطرے کی بو پاتے ہی ہنہنانے لگتے اور آگے بڑھنے سے رک جاتے ہیں۔ شمس نے ہی دیموگری میں کہا تھا کہ اگر ہمارا سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہا تو ہم شام ڈھلنے تک اس پہاڑ کی بلندی طے کر کے ڈھلوان میں ایسی جگہ پر پہنچ جائیں گے جہاں رات کے لیے کیمپ کیا جا سکتا تھا۔ ڈھلوان کے ساتھ ہی پہاڑ کا وہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان سرحد ہے۔ نقشے کے مطابق دیموگری سے رانگاماٹی کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر تھا لیکن پہاڑی راستوں اور پرپیچ پگڈنڈیوں کے باعث یہ راستہ دگنا بڑھ جاتا ہے۔ میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ جیسے تیسے ہم رانگاماٹی پہنچ تو جائیں گے لیکن واپسی کے سفر میں رانی، اُس کے لڑکے اور جواہرات کے ہمراہ یہ راستہ ہم سب کے لیے قطعی غیر محفوظ ہوگا۔ اچانک ہی ایک تھائی کی چیخ اور خچروں کے ہنہنانے کی آوازیں آئیں۔ تھائی ہمارے پیچھے اور خچر آگے تھے۔ بیک وقت رسوں سے خود کو آزاد کر کے قیصر آگے اور میں پیچھے کی طرف بھاگا۔ ایک تھائی پر جو قافلے کے بالکل آخر میں تھا۔ ایک چیتے نے درخت پر سے جست لگا کر حملہ کر دیا تھا۔ چیتا ابھی پوری طرح سے جوان بھی نہیں تھا۔ اُس کے جست لگانے کے زور سے تھائی گر پڑا تھا اور دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے اور دوسرے تھائی اپنے خنجروں سے چیتے کو مسلسل ضربات لگا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہی چیتا زخموں سے نڈھال ہو کر نیم مردہ حالت میں تھائی سے الگ ہو گیا۔ اب تھائیوں نے پوری طاقت سے کئی خنجر اُسے مارے اور وہ سسکتا ہوا دم توڑ گیا۔ حملے کا شکار تھائی تھوڑی دیر میں ہی اُٹھ بیٹھا۔ چیتے کے پنجوں کی چند گہری خراشوں کے سوا اُسے کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ نمبر ٹو اُس کی مرہم پٹی کے لیے فسٹ ایڈ بکس لے آیا۔ اب میں آگے کی طرف بھاگا جہاں خچر ہنہنا رہے تھے۔ ایک خچر پگڈنڈیوں پر گرا گہری سانسیں لے رہا تھا۔ قیصر نے بتایا کہ ایک تیر اُس کی گردن میں پیوست تھا جسے اُس نے نکال دیا۔ تیر کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ہم خچر کو کھڑا کرنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ وہ مر گیا۔ تیر یقیناً زہر میں بجھا ہوا تھا۔ میرا خدشہ صحیح نکلا کہ چھپ کر

ہمارا پیچھا کیا جا رہا تھا۔ زہریلے تیر میزو قبائل کے وہ لوگ استعمال کرتے تھے جو اس قبیلے کی نگرانی اور سامان خورد و نوش کا انتظام کرتے تھے ورنہ حکومت اور فوج سے لڑنے والوں کے پاس جدید اسلحہ ہوتا تھا۔ میں نے حمید کو کہا کہ چند تھائیوں کو لے آئے تاکہ وہ مردہ خچر کا سامان دوسرے خچروں پر لاد دیں۔ سامان ابھی دوسرے خچروں پر لادا ہی جا رہا تھا کہ مجھے پھر سوکھے پتوں پر چلنے کی آواز آئی۔ میں نے قیصر کو اشارہ کرتے ہوئے اپنی سب مشین گن سے بغیر شست لئے آواز کی طرف فائر کیا۔ میرے فائر کرنے کے ساتھ ہی سارے تھائیوں اور قیصر کے ساتھیوں نے اُسی جانب مسلسل فائر کرنے شروع کر دیئے۔ ہمارا قافلہ کم از کم چالیس فٹ کی لمبائی میں پھیلا ہوا تھا کیوں کہ ہم سبھی پگڈنڈیوں کے تنگ ہونے کے باعث سنگل فائل میں چل رہے تھے۔ فائروں کے ساتھ ہی کئی چیخیں سنائی دیں اور پانچ کالے رنگ کے آدھے ننگے میزو لڑھکتے ہوئے پگڈنڈیوں پر آن گرے۔ ان پانچ زخمیوں میں ایک جوان عورت بھی تھی۔ ہمارا فائر ابھی جاری تھا کہ اُسی حلیے کے دو آدمی اپنی کمانیں اور ترکش اپنے اوپر اُٹھے ہاتھوں میں لیے ہمارے سامنے آئے اور ترکش اور کمانیں ہمارے قدموں میں پھینک کر سجدہ ریز ہو گئے۔ زخمی میزوؤں کے ترکش اور کمان ابھی تک اُن کے ہاتھوں میں ہی تھے۔ یہ دونوں اونچی آوازوں میں مسلسل کچھ کہے جا رہے تھے جو خاک بھی ہمارے پلے نہ پڑا۔ دیموگری کا ایک مزدور ان کی زبان سمجھتا تھا۔ میں نے اسے بلوایا۔ یہ دنوں میزو چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ ان کا مقصد ہمیں ہلاک کرنا نہ تھا بلکہ وہ صرف ہمارا سامان ہم سے چھیننا چاہتے تھے۔ زخمی میزو کراہ رہے تھے اور ان کی کمانیں، ترکش اور بھالے ان کے ساتھ ہی پڑے تھے۔ دونوں میزو بار بار پہاڑی کی طرف دیکھتے۔ شک پڑنے پر میں نے یونہی کہا کہ تمھارے جو ساتھی ابھی تک سامنے نہیں آئے انھیں بھی بلوا لو تاکہ تمھارے زخمی ساتھیوں کو لے جا سکیں۔ دونوں میزو نے آپس میں کھسر پھسر کی اور زوردار آواز میں کچھ کہا۔ چند لمحوں میں ہی دو مرد اور ایک عورت گھنے درختوں سے نکل کر پتھروں کو پھلانگتے نیچے آ گئے۔ ان کی آنکھوں سے ہمارے خلاف نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ عورت تو ایک زخمی مرد کے پاس چلی گئی اور زور زور سے کچھ بولنے لگی۔ وہ مرد شاید اس کا شوہر یا بھائی تھا اور وہ یقیناً ہمیں کوس رہی تھی۔ میں ابھی ان کے متعلق کچھ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ قیصر بولا، ”اگر ان میں سے ایک بھی زندہ اپنے قبیلے میں چلا گیا تو پھر ہماری خیر نہیں۔ زہر میں بجھے تیروں سے ہم سب کو ہلاک کر دیا جائے گا۔“ میرے ذہن میں بھی یہ تھا کہ ان کو چھوڑ دینے کا مطلب ہوگا کہ یہ اپنے قبیلے سے کمک لے کر ہم سے راستے میں پھر بھڑ جائیں۔ قیصر کی بات نے مجھے فیصلہ کرنے میں مدد دی۔ میں نے قیصر کو کہا کہ سب کو ختم کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے قبیلے والوں کو بتانے کے لیے کوئی نہیں ہوگا کہ ان کو کس نے ہلاک کیا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا ریوالور نکالا۔ ادھر قیصر اور اس کے ساتھیوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کیں۔ اس سے پہلے کہ کسی کی سمجھ میں کچھ آئے ہم نے پندرہ بیس گولیاں چلائیں اور پانچوں زخمی اور ان کے پانچوں ساتھی گولیوں کو اس بوچھاڑ سے ختم ہو گئے۔ میں نے تھائی ہمراہیوں کو کہا

کہ ان کے تیر، کمان اور بھالے اٹھالیں۔ ہمارے پاس پٹرول تو تھا نہیں کہ نعشوں کو جلا دیتے اس لیے پگڈنڈی کی دوسری طرف گہرے کھڈ میں ان کی نعشیں لڑھکا دیں۔ ان دس افراد کی ہلاکت ہم سب کے دل پر بوجھ بن گئی تھی۔ دوسروں کے متعلق تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اپنے دل کو میں نے یہ سوچ کر سمجھایا کہ ہم پر حملے میں پہل انھوں نے کی تھی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ ہم نہ تو انھیں قیدی بنا سکتے تھے اور نہ ہی زخمیوں کی دیکھ بھال کر سکتے تھے اور انھیں زندہ چھوڑنے کا مطلب تھا ہماری اپنی موت۔ یہ چاہے طفل تسلی ہی تھی لیکن پھر بھی دل کو کچھ سنبھالا مل گیا۔

راستے میں چیتے اور میزوؤں سے جھڑپ کے باعث ہمارے دو گھنٹے ضائع ہو گئے تھے لہٰذا جب ہم شمس کی بتائی ہوئی ڈھلوان پر پڑاؤ کی جگہ پر پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے تھائیوں کو تو لکڑیاں اکٹھی کرنے کا کہہ کر اطراف میں بھیج دیا اور قیصر اور اس کے ساتھی اور حمید خچروں پر سے سامان اتارنے لگے۔ سردی بھی بہت تھی اور سب کو بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ آگ جلا کر ہم نے اپنے جسم تاپے اور ٹن فوڈ کھا کر سب نے چائے پی۔ شب بسری کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ ہماری آدھی نفری سوئے گی اور آدھی پہرہ دے گی۔ چار چار گھنٹے کی شفٹ مقرر کر کے میں اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔

میزو قبائل سے تصادم اور کٹھن راستے کی وجہ سے میں نے کسی متبادل راستے کے متعلق سوچنا شروع کیا جس سے ہم واپس جا سکیں۔ صبح میں نے قیصر، شمس اور حمید کے ساتھ اس بارے میں گفتگو بھی کی۔ شمس چونکہ میرے ماضی کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا لہٰذا اس نے چٹا گانگ سے کاکس بازار اور پھر راموندی کو عبور کر کے برما میں داخل ہونے یا چٹا گانگ سے ہی ایک بڑی کشتی میں اکیاب (برما) تک جانے کا مشورہ دیا۔ قیصر اس بارے میں بالکل کورا تھا اور اسے اس علاقے کے متعلق ذرا بھی علم نہیں تھا۔ بقول اس کے کالادان بھی وہ بڑی مشکل سے پہنچے تھے۔ میرا نمبر ٹو بھی بالکل خاموش تھا، اس نے صرف یہ کہا کہ میزو قبیلے سے تصادم کے بعد سارے تھائی ڈرے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ واپسی کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کیا جائے۔ اس نے بالکل صحیح کہا تھا۔ اسمگلنگ سے وابستہ لوگوں کا یہ ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے کہ جہاں پولیس یا اینٹی نارکوٹکس والوں نے روکا اور تلاشی لینی چاہی تو یہ سب مال وہیں چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ اب بھی پاکستانی اخبارات میں آپ نے اکثر پڑھا ہوگا کہ سمگلر سامان سے بھرے ٹرک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ چونکہ راتوں رات امیر بننے کی خواہش میں وہ سمگلنگ کا دھندہ اختیار کرتے ہیں اس لیے انہیں روپیہ پیارا ہوتا ہے اور روپے سے پیار کرنے والوں کو اپنی زندگی بے حد عزیز ہوتی ہے۔ زندگی کو داؤ پر لگانے والے صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں زندگی سے زیادہ اپنی عزت، غیرت اور وطن سے محبت ہوتی ہے۔ افواج پاکستان کے نڈر جوانوں کی ہمت و شجاعت اور وطن پرستی کے باعث ہم سے آٹھ گنا زیادہ فوج رکھنے والا بھارت اسی لیے ہماری افواج سے خوفزدہ رہتا ہے کہ جب بھی اس نے ان اللہ کے شیروں سے ٹکرانے کی حماقت کی، اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اللہ پاک نے قرآن حکیم میں شہید کو اتنا بلند

مقام دینے کا وعدہ کیا ہے جس کے مقابلے میں یہ چند روزہ دنیاوی زندگی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ ہماری تمام فوج اسی جذبۂ شہادت سے سرشار ہے اور انشاء اللہ تاقیامت ہمارے دشمنوں پر ''ضرب مومن'' کی دھاک بیٹھی رہے گی۔

مجھے واپسی کے لیے جب کوئی متبادل راستہ دکھائی نہ دیا تو میں نے اس کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا، ''کار ما فکر کارساز ما'' (میرے کام کی فکر میرے خالق کی فکر ہے) میں کیوں خوامخواہ اپنے ذہن کو پریشان کروں۔ اللہ پاک کی مدد کے یقین پر ہی جو بے حد و حساب رحم کرنے والا ہے میں نے اس مہم کو سر کرنا کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اب تک اس سفر کے دوران جتنی بھی مشکلات سامنے آئیں، اسی ذات کریم نے انہیں دور کیا۔ آئندہ بھی اگر اس کی مدد میرے شامل حال رہی تو اس ذات پاک کے سہارے تمام مشکلات اور رکاوٹیں دُور ہو جائیں گی ورنہ انسان تو اتنا مجبور اور بے بس ہے کہ وہ یہ تک نہیں دیکھ سکتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا ہے۔

ہم صبح دس بجے تک اپنے پڑاؤ کا تمام سامان خچروں پر لاد کر روانگی کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ میں نے نمبر ٹو کو کہا کہ وہ تھائی ہمراہیوں کو بتا دے کہ واپسی پر ہم متبادل راستہ اختیار کریں گے جس میں میزو قبائل سے تصادم کا کوئی خدشہ نہ ہوگا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم پہاڑ کی ترائی میں پہنچ گئے۔ ہمارے سامنے اب وہ پہاڑ تھا جس کی دوسری جانب کا حصہ بنگلہ دیش کی حدود میں تھا۔ میں نے میزو قبائل کے اچانک حملے سے بچنے کے لیے قیصر کے ساتھیوں اور تھائیوں کی دو دو کی ٹولیاں بنا کر انہیں قافلے کے چاروں جانب پھیل کر چلنے، چوکنا رہنے والا اور خاص طور پر درختوں پر نگاہ رکھنے کا کہا۔ یہاں پر درخت بہت کم تھے لیکن پہاڑ کی بلندی گھنے درختوں سے اٹی پڑی تھی۔

ہم نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ یہاں بھی ایک تنگ سی پگڈنڈی تھی۔ شمس نے بتایا کہ یہ علاقہ میزو قبائل کے چھوٹے چھوٹے رہائشی جھونپڑوں کے سوا بالکل غیر آباد ہے اور یہ پگڈنڈی بھی انہوں نے اپنی آمدورفت اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانے کے لیے بنائی ہے۔ یہ بڑی پگڈنڈی ہے اور آئندہ راستے میں اس سے کئی پگڈنڈیاں نکلتی ہیں جو ان کے جھونپڑوں تک جاتی ہیں لہٰذا ہمیں بہت محتاط ہو کر آگے بڑھنا ہوگا۔ شمس نے مجھے دو ایسی باتیں بتائیں جن کے متعلق میں نے پہلے سنا تو تھا لیکن اسے محض گپ سمجھتے ہوئے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اس پگڈنڈی کے آس پاس اتنے زہریلے بچھو ہوتے ہیں جو ایک خاص پتھر پر ڈنگ مار کر اسے چور چور کر دیتے ہیں۔ اسی پتھر کے چورے کو مقامی شراب میں حل کر کے میزو اپنے تیروں پر لگاتے ہیں جس سے یہ تیر اس قدر زہریلے ہو جاتے ہیں کہ انسان ہو یا جانور، یہ تیر لگنے سے چند منٹوں میں ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔ وہ پتھر سانپ کی شکل کے ایک پودے کے بالکل قریب ہوتا ہے۔ اسی پتھر کی وجہ سے وہ پودا بھی اس قدر زہریلا ہو جاتا ہے کہ اگر ہاتھ سے اسے چھو بھی لیں تو بچھو کے ڈنگ جتنا درد ہوتا ہے۔ اس پودے کے ساتھ ہی

پالک کے پتوں سے مشابہہ ایک دوسرا پودا بھی ہوتا ہے جس کے پتے کو ہاتھ پر ملنے سے درد فوراً جاتا رہتا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس پہاڑ پر بلکہ اس پگڈنڈی پر بھی کہیں نہ کہیں پارس پتھر موجود ہے۔ پارس کی خوبی یہ ہے کہ اگر کوئی دھات اس سے چھو جائے تو فوراً خالص سونا بن جاتی ہے۔ اس پتھر کو بہت تلاش کیا گیا لیکن وہ نہ ملا۔ البتہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ خچروں کے نعل اس پتھر کے چھونے سے سونے کے بن گئے۔ اسی لیے خچروں کے مالک اس طرف آتے ہوئے اپنے خچروں کو موٹے اور وزنی لوہے کے نئے نعل لگواتے ہیں۔ ''میں بھی اسی پتھر کی تلاش میں اس پگڈنڈی پر کم و بیش آٹھ نو مرتبہ آچکا ہوں۔'' شمس نے شرماتے ہوئے بتایا اور اپنی دستی چھڑی دکھائی جس کا نچلا حصہ ٹھوس لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے یاد آیا کہ خچروں کے مالک ہر پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد اپنے خچروں کے نعل کیوں دیکھتے تھے۔ بہرحال اس سفر کے دوران پارس پتھر کسی کو نہ ملا اور نہ ہی لوہے کی کوئی چیز سونا بنی۔

اس پہاڑ کی چڑھائی پر ہمارا دو مرتبہ میزو مرد عورتوں اور بچوں سے سامنا ہوا۔ ہمیں کوئی مہم جو سمجھتے ہوئے اور ان کی زبان بولنے والے مزدور کی زبانی ہمارے ''پرامن'' ہونے کا سن کر انہوں نے ہمیں خاموشی سے آگے بڑھنے کا راستہ دے دیا۔ میں نے ان کے بچوں کو خوراک کے دو چار ٹن دیے تو شمس بولا۔ ''یہ خوراک ان پر ضائع نہ کریں۔ پہاڑ کی دوسری جانب مورنگ اور مگھ قبائل کے سردار ٹن فوڈ بہت پسند کرتے ہیں اور ہمیں رانگا ماٹی جانے کے لیے ان کی مدد درکار ہوگی۔'' ان سرداروں کے لیے میں نے پہلے ہی ڈھیر سارے سگار اور نقلی موتیوں کے ہار اور زیور خرید لیے تھے۔ اب ٹن فوڈ بھی ان کے لیے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

چڑھائی پر جاتے ہوئے ہمارے راستے میں درجنوں چشمے آئے جن کا میٹھا اور یخ پانی پی کر لطف آگیا۔ اس پہاڑ پر چڑھتے ہوئے دوسری شام کو ہم سے کچھ فاصلے پر ایک چٹان پر ایک ہرن کھڑا دکھائی دیا۔ ابھی میں اسے اچھی طرح دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ ہم سے آگے چلنے والے قیصر کے ایک ساتھی نے اس پر فائر کیا۔ ہرن اچھلا اور دھڑام سے گر کر لڑھکتا ہوا ہمارے سامنے آن پڑا۔ میں نے جلدی سے اپنے خنجر سے اسے ذبح کیا۔ نزدیک ہی ایک نسبتاً صاف جگہ پر ہم نے پڑاؤ کیا۔ قیصر کے ساتھیوں نے پورا ہرن آگ پر بھونا۔ اس سفر کے دوران یہ ہمارا پہلا حلال شکار تھا۔ تیسرے روز شام کے وقت ہم پہاڑ کی بلندی کے اس حصے پر پہنچ گئے جہاں سے ڈھلوانی رستہ شروع ہوتا تھا۔ اب ہم بنگلہ دیش میں داخل ہونے والے تھے۔

کسی بھی پہاڑ کی چوٹی پر درخت نہیں ہوتے۔ میں نے پہاڑ کے بنگلہ دیشی جانب ایک ذرا ہموار چٹان پر رات کو پڑاؤ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جلد ہی وہاں پر ہمارا کیمپ لگا دیا گیا۔ ہم سب بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے اور یہی حال خچروں کا تھا۔ خچروں کے مالکان دیموگری سے متوقع سفر کے دورانیے کا اندازہ کرتے ہوئے ان کے لیے خاصی مقدار میں بھوسہ اور چنے ہمراہ لائے تھے۔ راستے میں پڑنے

والے چشموں سے ہم نے پانی کا بھی خاصا ذخیرہ اکٹھا کر لیا تھا۔ خاصی سردی اور تیز ہوا کے باوجود لکڑیاں چن کر آگ جلائی گئی اور تھائیوں اور قیصر کے ساتھیوں نے الگ الگ اپنا کھانا تیار کیا۔ جہاں پر ہم نے پڑاؤ کیا تھا وہاں سے نیچے جانے کے لیے کوئی پگڈنڈی وغیرہ مجھے دکھائی نہ دی تو میں نے شمس سے دریافت کیا۔ شمس نے کہا کہ تھوڑا سا نیچے جانے کے بعد ایک بڑا چشمہ آئے گا اور اس کے پانی کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ ہم نیچے جائیں گے۔ اس چشمے میں کئی اور چشمے اور برساتی نالوں کا پانی شامل ہوتا جاتا ہے اور مورنگ قبیلے تک پہنچتے پہنچتے یہ ایک پہاڑی ندی کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ یہی ندی مگھ قبیلے کے پاس سے گزرتی ہوئی رانگا ماٹی جاتی ہے اور تھوڑا اور نیچے جا کر کپتائی کے قریب دریائے کرنافلی میں جا گرتی ہے۔ کرنافلی دریا اتنا بڑا اور گہرا ہے کہ چٹاگانگ کی بندرگاہ اسی دریا پر واقع ہے اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے جہاز اس بندرگاہ تک آتے ہیں۔ یہ دریا تقریباً سات میل آگے پتنگا کے مقام پر سمندر میں شامل ہوتا ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے بندرگاہ بہت محفوظ لیکن دفاع اور جنگ کے لیے انتہائی غیر محفوظ ہے۔ 71ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران بھارت کے صرف ایک فریگیٹ اور ایک کروزر کے علاوہ دو میزائل بوٹس نے اس بندرگاہ کو مفلوج کر کے ناقابل استعمال بنا دیا تھا۔ کیونکہ وہ کرنافلی دریا کے سمندر میں گرنے کی جگہ پر کھڑے تھے۔ علاوہ ازیں بھارتی بمبار جہازوں نے بندرگاہ پر بمباری کر کے ایک کارگو جہاز ڈبو دیا تھا اور دریا کا پاٹ چوڑا نہ ہونے کے سبب ڈوبے ہوئے جہاز کی وجہ سے دوسرے جہازوں کا رستہ بلاک ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ پاکستان نیوی کی گن بوٹس بھی اسی کے باعث دوران جنگ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکیں۔ ادھر بندرگاہ پر اسلحہ سے لدے ہوئے جہازوں پر غدار بنگالیوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا اور جو بنگالی پاکستان کے وفادار تھے انہیں نہایت بے دردی سے ہلاک کر دیا۔ اب 71ء کی جنگ اور غداروں کا ذکر شروع ہو ہی گیا ہے تو غداری کے چند واقعات بھی گوش گزار کرتا چلوں۔ خیال رہے 16 دسمبر 71ء کو سقوط ڈھاکہ ہوا اور بنگلہ دیشی اس تاریخ کو اپنا ''یوم آزادی'' مناتے ہیں اور میں اب دسمبر 99ء میں آپ کو سابق مشرقی پاکستان میں غداروں کی غداری اور ظلم و بربریت کے چند واقعات سنا رہا ہوں۔

چٹاگانگ میں بندرگاہ کے سامنے والی سڑک کا نام ریلوے روڈ ہے جس پر تقریباً آمنے سامنے چٹاگانگ ریسٹ ہاؤس اور مسکا ہوٹل واقع ہیں۔ ''جانباز'' کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ اپنی پہلی ملازمت میں نے چٹاگانگ میں اصفہانی ٹی کمپنی آگرہ آباد روڈ میں کی تھی اور اس ملازمت کے دوران میرا قیام چٹاگانگ ریسٹ ہاؤس میں تھا جہاں راجہ تری دیو رائے سے ملاقات ہوئی جس نے جلد ہی گہری دوستی کی صورت اختیار کر لی۔ اور مارچ 71ء کی جنگ کے دوران اور 16 دسمبر کے بعد چٹاگانگ کے غداروں نے اس دور کے مشہور دہشت گرد میجر صدیقی کی قیادت میں اسی ریسٹ ہاؤس کو مغربی پاکستانیوں کا مقتل بنا دیا تھا۔ گھروں سے مغربی پاکستانی مرد، عورتوں اور بچوں کو یہاں لایا جاتا اور اس دو منزلہ ریسٹ ہاؤس کی دوسری منزل کی بالکونی کی ریلنگ پر ان کے سر رکھ کر گردن اڑا دی جاتی۔ سر نیچے

جا گرتے اور پھڑ پھڑاتے جسموں کو کمروں میں ڈال دیا جاتا۔ اسی میجر صدیقی نے چٹاگانگ کلب کے قریب ٹائیگر پاس کے ایک بڑے اور ہموار قطعۂ زمین پر چھ ماہ سے دو سال تک کی عمر کے مغربی پاکستانی زندہ بچوں کو پیٹوں میں سے لوہے کے بڑے سوؤں کے ساتھ رسیوں میں پرو کر ایک بہت بڑا چاند تارہ (پاکستان کے قومی پرچم کا نشان) بنایا تھا جسے مغربی دنیا کے پریس والوں نے ہیلی کاپٹروں میں اڑتے ہوئے فلمایا تھا۔ اسی چٹاگانگ کی بندرگاہ پر بنگالی مزدوروں کے جہاز پر سے اسلحہ اتارنے سے انکار کرنے پر جب پاک فوج کے جوانوں نے یہ کام شروع کیا تو اسلحہ بھرے جہاز کو دھماکے سے اڑا دیا گیا۔

مارچ 71ء میں جب پاک فوج نے مشرقی پاکستان کا شہری نظم ونسق سنبھالا تو انہیں اسی چٹاگانگ کے ایک شہری علاقے چوہدری عزیز بلڈنگ کے نزدیک ایک مسجد کے ہال کمرے سے جوان عورتوں کے بالکل ننگے بے جان جسم، شیر خوار بچوں کی لاشیں اور مسجد کی دیواروں پر ان بچوں کے چپکے ہوئے مغز اور کھوپڑیوں کے ٹکڑے ملے۔ ان ہی غداروں نے کھلنا چھاؤنی میں مغربی پاکستانی کمانڈنگ آفیسر کو اس کے دفتر میں ہلاک کیا اور پھر اس کے گھر جا کر اس کے گیارہ سالہ بچے کا سر قلم کر کے اس کی حاملہ بیوی کے پیٹ کو چیر کر بچہ نکال کر اس کا سر علیحدہ کیا اور دونوں بچوں کے سر بچوں کی مردہ ماں کے شکم پر رکھ کر تصویریں اتاری گئیں۔ مارچ 71ء میں بنگالی پولیس اور فوج بھی غداروں میں شامل ہو چکی تھی۔ ان فوجی کمپنیوں میں مغربی پاکستانی بھی تھے۔ ان کے ہاتھ زمین میں گڑے کھونٹوں سے باندھ کر ان کی خون کی نسیں کاٹ دی گئیں۔ ان غداروں کا بے تاج بادشاہ مجیب الرحمٰن تھا۔ اس نے مشرقی پاکستانیوں کو "ہمار دیش، تمہار دیش، سنار دیش" جیسے فریبی نعروں سے ورغلا کر ظلم وستم کی ایسی داستانیں رقم کیں جن پر انسانیت رہتی دنیا تک سسکتی رہے گی۔ اسی غنڈے اور غداروں کے لیڈر کی حقیقت کا جب پول کھلا تو اسی کے قائم کردہ بنگلہ دیش کے باسیوں نے اس کا وہ عبرتناک انجام کیا کہ سوائے اس کی لڑکی حسینہ واجد کے جو بیرون ملک تھی، اس کے سارے کنبے کو بے دردی سے ہلاک کر دیا اور ان کی بے گور و کفن لاشیں کئی روز تک اسی گھر میں پڑی سڑاند پھیلاتی رہیں اور اس قدر بدبو پھیلی کہ ہمسائے گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ تھا ایک غدار اور اس کے گھر والوں کا انجام۔ ادھر ذوالفقار علی بھٹو جو مجیب کی طرح غداری میں برابر کا شریک تھا اور وہ بھی اپنے عبرتناک انجام کو پہنچے۔ 71ء کے دسمبر میں سقوط ڈھاکہ کے بعد غداری کی ایک نئی قسم میاں نواز شریف نے ایجاد کی جب آج سے دو تین سال قبل بنگلہ دیش کے سرکاری دورے پر جا کر آنجناب نے مکتی باہنی والوں کی یادگار پر تو پھول چڑھائے مگر پاکستانی بہاریوں سے ملنے سے انکار کر دیا اور اپنے تلوے چاٹنے والے مشاہد حسین کو ان کے پاس بھیج دیا۔ یہ پاکستانی بہاری آج بھی بنگلہ دیش میں خار دار تاروں سے گھرے کیمپوں میں تیس سال بعد بھی پاکستان کا جھنڈا بلند کیے ہوئے ہیں۔ دنیا بھر میں شاید یہ واحد مثال ہے کہ دو ڈھائی لاکھ ایسے افراد بھی ہیں جن کے پاس کسی بھی ملک کی شہریت نہیں۔ پاکستان انہیں قبول نہیں کرتا اور بنگلہ دیشی حکومت انہیں اپنا شہری نہیں مانتی۔ جیل

میں اے کلاس کے علاوہ اضافی سہولتیں ملنے کے باوجود مچھروں کی شکایتیں کرتے اور آسمان کی طرف دیکھ کر آہیں بھرتے اور بڑبڑاتے نواز شریف صاحب کو شاید ان بہاری پاکستانیوں کی روحیں دکھائی دیتی ہوں گی جو پاکستان آنے کی آرزو دل میں لیے ہی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ میاں صاحب تو انشاء اللہ اپنے عبرتناک انجام کو ضرور پہنچیں گے۔ میں نہایت عاجزانہ طور پر چیف ایگزیکٹیو جنرل پرویز مشرف صاحب سے التجا کرتا ہوں کہ اپنے سامنے درپیش ان گنت مسائل میں ان بے بس و بے کس بہاری پاکستانیوں کا مسئلہ بھی شامل کر لیں۔ میں نے گزشتہ دنوں کے اخبارات میں پڑھا ہے کہ پاکستان اور خصوصاً صرف کراچی میں دو لاکھ کے قریب غیر قانونی مقیم بنگلہ دیشیوں، برمیوں اور سری لنکن کو حکومت ورک پرمٹ دے کر ان کے غیر قانونی قیام کو قانونی بنانے والی ہے۔ ان غیر ملکیوں کی تعداد یقیناً ان بہاری پاکستانیوں سے زیادہ ہے جو بنگلہ دیش میں آج بھی پاکستان کا جھنڈا بلند کیے ہوئے ہیں۔ اور ہم اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کو گلے لگا رہے ہیں۔ جنرل صاحب! دنیا بھر میں غیر قانونی قیام کرنے والوں کو ان ممالک سے نکالا جاتا ہے اور اپنے ہم وطنوں کی چاہے وہ دنیا کے کسی خطے میں بھی ہوں، خبر رکھی جاتی ہے۔ آخر ہمارے ملک میں ہی ہر کام دنیا بھر سے الٹا کیوں ہوتا ہے۔ اللہ پاک نے آپ کو موقع دیا ہے، طاقت دی ہے، جرأت دی ہے۔ آیئے! اور یہ نیک کام کو سرانجام دیں۔ ہمیشہ کا اقتدار صرف اللہ پاک ذوالجلال والاکرام کا ہے۔ دنیا میں کامیاب وہی رہے جو ایسے نیک کام کر کے شہرت دوام پا گئے۔

پہاڑ سے نیچے اترنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ عمودی چٹانیں نوکیلے پتھر اور چھوٹی موٹی جھاڑیاں ہمارے راستے میں حائل تھیں اور بارش اور نم آلود ہواؤں کے باعث ہمیں اترنے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔ دس پندرہ فٹ اترنے کے لیے ہمیں سیکڑوں گز دور جا کر ایسی جگہ ملتی تھی جہاں سے ہم خچروں سمیت نیچے جا سکیں۔ ہم اور خچر بار بار پھسل رہے تھے۔ بعض جگہوں پر تو خچروں نے اتنا تنگ کیا کہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے تھے اور انہیں دھکیلتے دھکیلتے ہم ہلکان ہو گئے۔ شام ڈھلنے تک ہم بمشکل ایک سو فٹ نیچے جا سکے۔ بڑے چشمے کا ابھی دُور دُور تک کوئی نشان نہ تھا۔ ہمارا گائیڈ شمس ایسی ہی ایک چٹان سے اترتے ہوئے اپنے قدم جما نہ سکا اور لڑھکتا ہوا چٹان سے نیچے جا پڑا۔ اس کی ٹانگ تو ٹوٹنے سے بچ گئی لیکن پیدل چلنے سے وہ قاصر ہو گیا۔ ہم نے اسے خچر پر بٹھایا اور اب وہ خچر پر بیٹھے ہوئے ہمیں گائیڈ کرتے ہوئے نیچے اترنے کی ہدایت دینے لگا۔ گھنے جنگلات ابھی ہم سے خاصے دور تھے۔ ڈھلتی شام میں اگر ہم جنگلات تک پہنچ بھی جاتے تو جنگلی جانوروں سے بچاؤ کا مسئلہ پیدا ہو جاتا، لہٰذا میں نے انہی چٹانوں میں سے ایک چٹان کو رات کے پڑاؤ کے لیے منتخب کیا اور کھانے پینے کی ضرورت سے فارغ ہو کر ہم لوگ سونے کی تیاری کرنے لگے۔ شمس کی ٹانگ پر Iodex مرہم کی مالش کر کے Crepe بینڈیج پٹی سے اسے باندھ دیا گیا۔ قطب نما (Compus) کے مطابق ہم جنوب کو جا رہے تھے لیکن کیا ہم صحیح جگہ سے ہی نیچے اُتر رہے تھے، اس کا علم صرف شمس کو تھا۔ میں نے شمس سے جب کرید کر پوچھا تو وہ

آئیں بائیں شائیں بکنے لگا۔ مجھے اس کی باتوں سے کچھ شک ہوا تو میں نے اسے کہا کہ ہمیں اب بھی صحیح بتادے کہ وہ کبھی مورنگ اور مگھ قبائل تک خود گیا ہے۔ اگر جھوٹ بولا تو اس کی اور حمید کی ٹانگیں توڑ کر یہیں پھینک جائیں گے۔ میری وارننگ سن کر اور گزشتہ سفر کے دوران میزو قبائل سے میرا سخت رویہ دیکھ کر وہ بولا، ”جناب پہاڑ کی چوٹی تک تو میں کئی بار آچکا ہوں اور میرے ساتھیوں نے مجھے مورنگ اور مگھ قبائل تک جانے کے لیے اسی علاقے میں ایک بڑے چشمے کا بتایا تھا۔ میں خود اس طرف پہلے کبھی نہیں گیا۔ اس غلط بیانی کی میں معافی چاہتا ہوں۔“ شمس تو یہ بات کہہ کر خاموش ہوگیا لیکن ہمارے لیے مشکلات کا پہاڑ کھڑا ہوگیا۔ ہم پہاڑ کی ڈھلوان پر جہاں آگے کوئی آبادی نہ تھی اور پیچھے میزو قبائل کا خطرہ، آئندہ راستے سے ناواقف بے آسرا پڑے تھے۔ میں نے قیصر کو جب یہ صورت حال بتائی تو وہ غصے پر قابو نہ رکھ سکا اور شمس کی اچھی خاصی ٹھکائی کردی۔ قیصر کا غصہ بھی حق بجانب تھا۔ صرف میرے کہنے پر وہ اپنے ساتھی لڑکوں کو اپنی ضمانت پر ہمراہ لایا تھا اور ان کی بخیر و عافیت واپسی اس کی ذمہ داری تھی۔ دشمنوں سے لڑتے ہوئے مارے جانا اور بات تھی لیکن گائیڈ کی غلط بیانی کے سبب راستہ کھو کر سسک سسک کر مرنا کسی طور ہمیں قبول نہ تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ صبح قیصر کے تین مسلح ساتھی میزو زبان جاننے والے مزدور کے ہمراہ ان کی کسی قریبی بستی میں جائیں اور خوراک اور پیسوں کا لالچ دے کر کسی میزو کو ہمراہ لائیں جو ہمیں صحیح راستے پر ڈال سکے۔ اگلے روز صبح ہی مزدور کے ہمراہ قیصر کے تین ساتھی لڑکے چلے گئے۔ ان کے پیچھے ہی میں نے دو اور مسلح لڑکوں کو انہیں کور (Cover) دینے کو بھیجا۔ دوپہر ڈھلنے تک پانچوں لڑکے اور مزدور ایک جوان اور ایک ادھیڑ عمر میزو کے ہمراہ واپس لوٹے۔ میزو تو چونکہ پہاڑی راستوں سے گزرنے کے عادی تھے انہیں تو یہ سفر بالکل محسوس نہ ہوا تھا جبکہ سب لڑکوں کے دم پھولے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ پچاس ڈالر کے عوض یہ دونوں میزو ہمیں مورنگ قبیلے تک چھوڑ آئیں گے۔ ان میزوؤں کے چہروں سے ہی غربت، افلاس اور بھوک دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے انہیں کھانے کے لیے ٹن فوڈ کے دو ڈبے دیئے۔ انہوں نے مزدور کی زبانی بتایا کہ اگر ہم ان کے قدم بقدم تیز چل سکیں تو گہری رات ہونے تک مورنگ قبیلے تک پہنچ سکتے ہیں ورنہ ایک رات راستے میں پڑاؤ کرنا پڑے گا۔ ہم نے راستے میں پڑاؤ کرنے والی بات مان کر اسی وقت اپنا کیمپ اکھیڑا اور خچروں پر سامان لاد کر میزوؤں کی راہنمائی میں پھر پہاڑ پر چڑھ کر مشرق کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ مزدور سے بار بار کچھ پوچھ رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں جب کئی بار ڈالر لفظ سنائی دیا تو میں نے مزدور کی زبانی انہیں کہا کہ میں انہیں پچاس نہیں بلکہ ساٹھ ڈالر دوں گا۔ بشرطیکہ وہ ہمیں سہل اور صحیح راستے سے لے جائیں۔ انعامی دس ڈالر کا سن کر وہ اتنے خوش ہوئے کہ بار بار قدم بوسی کے انداز میں میرے سامنے جھک جاتے۔ مجھے رہ رہ کر ان میزوؤں کا خیال آرہا تھا جو ہمارے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے انہوں نے

ہم پر اس لیے حملہ کیا تھا کہ ہمارا سامان لے سکیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ بھوک انسان سے کیا کچھ نہیں کرواتی؟ زمانہ قدیم میں جتنی بڑی جنگیں لڑی گئیں وہ خوراک اور پانی کے حصول کے لیے تھیں۔ آرین یورپ سے نکلے تو برصغیر میں آگئے۔ اس نقل مکانی کی وجہ کیا تھی؟ صرف سامان خورد و نوش کا حصول۔ سفید ہن، چنگیز خان، ہلاکو اور بہت سارے دوسرے حملہ آور صرف اسی مقصد کے پیش نظر لڑتے بھڑتے تباہی و بربادی کا سبب بنے۔ خود میری اپنی مثال بھی تھی۔ اس مہم کو سر کرنے کے پس منظر میں راجہ سے کیے ہوئے وعدے کے ساتھ ساتھ میری اپنی ابتر مالی حالت بھی تھی۔ ظلم تو وہ کرتے ہیں جو بے اندازہ دولت اور وافر وسائل رکھنے کے باوجود مزید اور مزید کے چکر میں ایسے پھنستے ہیں جس کی کوئی انتہاء نہیں ہوتی اور ان کا انجام جاتی امرا کے ان لوہاروں جیسا ہوتا ہے جو اپنے جامے سے اتنے باہر نکل آئے تھے کہ پاکستان کی حکومت پر قابض ہوکر ساری ملکی دولت کو چٹ کرنے کے بعد بھی ان کا پیٹ نہ بھرا اور وہ ملک کے امیر المومنین اور بادشاہ بننے کے خواب دیکھنے لگے۔ افغانستان میں بھی بچہ سقہ اسی طرح اچانک ہی ملک کا بادشاہ بن بیٹھا تھا لیکن جلد ہی اپنے انجام سے دوچار ہوا۔ میں تو حیران ہوں کہ ان جیسے نودولتیوں کی موت چاہے طبعی ہی ہو کیسی عبرتناک اور تکلیف دہ ہوگی۔ بڑے بڑے محلات کارخانے اور فیکٹریاں بنانے والے جب مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو انہیں بخوبی علم ہوتا ہے کہ چھ فٹ لمبی تنگ و تاریک قبر ہی ان کا مستقل ٹھکانہ ہوگی اور یہ محلات، فیکٹریاں، کارخانے اور ملکی اور غیر ملکی بنکوں میں جمع اربوں کھربوں روپے یہیں دھرے کے دھرے رہ جائیں گے تو ان کی جان کیسے نکلتی ہوگی؟ جائیدادوں پر تو ان کی نالائق اولاد قابض ہوکر عیش و عشرت میں پڑ جائے گی۔ غیر ملکوں میں جعلی ناموں سے جمع کی ہوئی دولت بینک والوں کی ملکیت بن جائے گی اور صحیح نام سے بھی اس دولت کو جمع کرنے والوں کے ورثا بھی شاید ہی اسے حاصل کرسکیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے سوئس بینکوں میں رکھا اٹھاون من سونا اور کروڑوں ڈالر ابھی تک اس کے ورثا کو نہیں ملے۔ (یہ ڈالر بھٹو کی حکومت کے دوران لیبیا کے سربراہ معمر قذافی نے پاکستان کو ایٹمی طاقت بننے کے لیے بطور امداد دیے تھے جسے بھٹو نے سوئٹزرلینڈ میں اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا۔ اٹھاون من سونا پاکستان میں قاسم بھٹی اور دوسرے سمگلروں سے پکڑا گیا تھا۔ ایوب خان اور یحییٰ خان کے دور حکومت میں یہ سٹیٹ بینک میں رہا لیکن بھٹو کے دور میں اچانک غائب ہوگیا) بھٹو کے دونوں بیٹے قتل ہوگئے۔ بیوی ہوش و حواس سے عاری نیم پاگل اور بیٹی سرے محل اور بہت ساری جائیدادوں اور دولت کی مالک دبئی، یورپ اور امریکہ میں دربدر خاک بسر، شوہر جیل میں اور بچے ماں اور باپ کی محبت اور شفقت سے محروم ہیں۔ یہ انجام ہوتا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا ان کا جو دولت کے حصول میں جائز و ناجائز اور حرام و حلال کی تمیز چھوڑ دیتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے ”اگر آسان موت چاہتے ہو تو اپنے گھر کو ایسا خالی رکھو جیسے کہ قبر۔“ صرف صاف اور سیدھی سادی زندگی ہی موت کو آسان بنا سکتی ہے۔ ترکی کا صدر تین سو سے زیادہ دن کومے میں ایسی حالت میں رہا کہ ذرا ہوش میں آتا

تو درد اور تکلیف سے چلا اٹھتا اور پھر کومے میں چلا جاتا (کوما موت اور زندگی کی درمیانی صورت ہے جس میں انسان زندہ تو ہوتا ہے لیکن جسم اور دماغ بے جان) شہادت اسی لیے افضل ترین اور انتقال کی بہترین صورت ہے اور اللہ پاک نے شہید کے متعلق قرآن حکیم میں فرمایا کہ ''انہیں (شہیدوں کو) مردہ مت کہو، یہ زندہ ہیں اور ہم انہیں رزق دیتے ہیں۔''

بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں آن پہنچی۔ جانباز تحریر کرتے وقت میرا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ داستان کی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی باتیں بھی لکھ دوں جنہیں پڑھ کر اگر ایک بھٹکا ہوا انسان بھی راہ راست پر آجائے تو میری محنت وصول ہوجائے گی۔ دونوں میزو ہمیں پہاڑ کی بلندی پر واپس لے جاکر مشرق کی جانب چل پڑے۔ تقریباً ایک میل فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم پھر ڈھلوان میں اترے۔ یہ خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑی حصہ تھا۔ ہمارے آگے اب ایک جنگل تھا جس میں بنی ایک پگڈنڈی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میزوؤں نے بتایا کہ اس جنگل میں درندے اور سانپ اژدھا وغیرہ کثرت سے ہیں اس لیے محتاط رہیں۔ پگڈنڈی پر آگے آگے میزو اپنے بھالے تھامے اور پیچھے ہم اپنا لوڈڈ اسلحہ ہاتھوں میں لیے چل رہے تھے۔ ہمارے قافلے میں خچر اب درمیان میں تھے اور ان کے پیچھے تھائی اور آگے ہم۔ یونہی چلتے ہوئے ہمیں بڑا چشمہ دکھائی دیا۔ میزوؤں نے کہا کہ ہم چشمے کے شروع میں ہی اگر شب بسری کے لیے اپنا کیمپ لگا لیں تو بہتر رہے گا کیونکہ جنگلی درندے اسی چشمے کے پانی کی گزرگاہ سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ اس لیے یہ جگہ نسبتاً بہتر اور محفوظ ہے۔

ہم نے وہیں پر ایک مناسب جگہ دیکھ کر اپنا کیمپ لگایا۔ ہمارے پاس کھانے کے لیے ٹن فوڈ تھا اور اب ہمارے قافلے میں دو میزو بھی شامل تھے۔ ٹن فوڈ کو میں مورنگ اور مگھ قبائل کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے مزدور سے کہا کہ ان میزوؤں سے پوچھے کہ یہاں ہمیں کچھ شکار وغیرہ بھی مل سکتا ہے۔ میزوؤں نے کہا کہ دو رائفل بردار ہمارے ساتھ جنگل میں چلیں۔ اس بار قیصر کے تین ساتھی ان کے ساتھ جنگل میں گئے۔ آدھ گھنٹے کے اندر ہی ہمیں دو فائروں کی آواز سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد ہی دونوں میزو ایک نیل گائے کو گھسیٹتے ہوئے لے آئے۔ قیصر کے دو ساتھیوں نے نیل گائے دیکھ کر فائر کیے تھے اور تیسرے نے اسے ذبح کیا۔ اتنی جلد شکار ملنے پر تینوں خوشی سے اچھل رہے تھے۔ تھائیوں نے حسب معمول اتنے عرصے میں لکڑیاں جمع کرلی تھیں۔ خوب سیر ہوکر ہم نے بھنا گوشت کھایا۔ میں نے پہلے کی طرح تھائی اور قیصر کے ساتھیوں کی تین ٹولیاں بنائیں جنہیں رات کو باری باری پہرہ دینا تھا۔ ہم جلد ہی سوگئے۔ میں نے نگران پہرہ داروں کو میزوؤں پر خاص طور پر نگاہ رکھنے کو کہا۔ اس سب علاقے میں جنگل کا قانون چلتا تھا اور میری حالات ایسی تھی کہ سفر کے دوران ماضی کے واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں کسی پر بھروسہ نہیں کرسکتا تھا۔

صبح آٹھ بجے ہم نے اپنے پڑاؤ کا سامان خچروں پر لادا۔ شمس بھی ایک خچر پر بیٹھ گیا اور ہمارا

قافلہ چشمے کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ مورنگ قبیلے کی طرف روانہ ہوا۔ ہمارے دونوں میزو گائیڈز کے مطابق ہمیں شام ڈھلنے سے پہلے قبیلے کے مرکز میں پہنچ جانا تھا جہاں سردار کی رہائش تھی ورنہ سارا قبیلہ تو اطراف میں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ مجھ سمیت میرے تمام ہمراہیوں کا اس انوکھے اور عجیب وغریب روایات کے حامل قبیلے میں جانے کے شوق کے باعث Excitement سے برا حال تھا۔ مغربی فلموں میں افریقہ اور جنوبی امریکہ کے قدیم قبائل کے بارے میں خاصا کچھ دیکھ رکھا تھا۔ لیکن ایک قدیم قبیلے میں جانے اور بچشم خود ان کے رسم و رواج دیکھنے کا ہم سب کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ میزو گائیڈوں نے مزید انعام کے لالچ میں سفر کے دوران ہمیں اس قبیلے کے ادب و آداب کے متعلق مزید کئی باتیں بتائی تھیں۔ اب ہم گھنے جنگل میں داخل ہوچکے تھے۔ میں نے اپنے تمام ہمراہیوں کو جنگلی درندوں اور سانپوں سے بچنے کے لیے چوکنا رہنے کی سختی سے تلقین کی۔ ڈھلوان میں جانے کے باعث چشمے کے پانی کی روانی میں خاصی تیزی آچکی تھی اور پتھروں بھرے پاٹ میں پانی پتھروں سے ٹکراتا اور جھاگ بناتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میزوؤں نے ہمیں بتایا کہ جب تک کہ فی الحقیقت کسی کی جان کو خطرہ نہ ہو ہم فائر نہ کریں۔ مورنگ قبیلے کے عقیدے کے مطابق تمام جنگلی جانور قابل احترام ہیں اور شکار کے لیے تو ہرگز ہرگز کسی جانور یا پرندے کو نہ ماریں۔ شمس جو اب تک راستہ جاننے کی غلط بیانی اور قیصر کے ٹھکائی کرنے کے باعث چپ تھا، بولا ''اس قبیلے میں صدیوں پہلے ایک بدھ بھکشو آیا تھا جس نے بیمار سردار کا کامیاب علاج کرکے اپنی عزت و توقیر بنالی تھی۔ اسی کے پرچار کے باعث یہ قبیلہ بدھ مذہب کا پیروکار ہوگیا۔ سردار کے مرنے کے بعد جو دوسرے سردار آئے، وہ رفتہ رفتہ بدھ مت سے دور ہوتے گئے۔ بدھ مذہب کے مطابق کسی قسم کا گوشت کھانا یا جانوروں کو ہلاک کرنا منع ہے۔ جنگلوں میں رہنا اور گوشت سے پرہیز، درندوں اور زہریلے حشرات الارض کا شکار ہونا اور انہیں زندہ رہنے دینا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اب اس قبیلے کی حدود میں جانوروں اور پرندوں کا شکار محض اس لیے پسند نہیں کیا جاتا کیونکہ مورنگ اسے غیر لوگوں کی مداخلت اور اپنی ضرورت کی خوراک میں کمی سمجھتے ہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ سردار نے آپ کو خوش آمدید کہا تو ضیافت میں آپ کے لیے بھی شکار ہی پیش کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں آپ صرف یہ کیجیے گا کہ سردار کو کہیں کہ زندہ جانوروں اور پرندوں کو ہم خود حلال کریں گے۔''

ابھی شمس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہمیں دور سے نقارہ بجنے کی آواز سنائی دی۔ میزوؤں نے بتایا کہ ہمیں دیکھ لیا گیا ہے اور قبیلے کے اطراف میں بسے مورنگ سردار کو ہماری آمد کی اطلاع دے رہے ہیں۔ ''آپ اپنا بڑا اسلحہ سامان میں چھپائیں اور صرف چھوٹا اسلحہ مثلاً پسٹل ریوالور وغیرہ تیار حالت میں اپنے پاس رکھیں۔ مورنگ اب جنگل میں چھپ کر آپ کا پیچھا کریں گے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم منہ سے ایسی آوازیں نکال کر پیچھا کرنے والے مورنگوں کو بتا دیں کہ آپ لوگ پرامن ہیں اور سردار سے ملنا اور اسے تحائف پیش کرنا چاہتے ہیں۔'' میزوؤں کی بات سن کر میں نے انہیں

اجازت دے دی کہ مورنگوں کو ہماری آمد اور سردار سے ملنے کا مقصد بتادیں۔ ہم یونہی آگے بڑھتے جارہے تھے کہ اچانک میزوؤں نے اپنے ہاتھ منہ کے گرد رکھ کر عجیب قسم کی اونچی آوازیں نکالیں۔ تھوڑی دیر میں ہی جنگل سے بھی ایسی ہی آوازیں آئیں۔ چند مرتبہ آوازوں کے تبادلے کے بعد جنگل سے ایک ایک کرکے چار آدمی ہمارے سامنے آگئے۔ ان کے رنگ گندمی اور ناکیں چپٹی تھیں۔ جسم اور چہروں پر انہوں نے مختلف رنگ لگائے ہوئے تھے اور ان کے پاس تیر کمان اور بھالے تھے۔ ان کے جسم ننگے تھے اور کمر کے گرد بندھی چھال اور درختوں کے پتے ستر پوشی کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میں شمس کے خچر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ شمس سرگوشی میں بولا ''کمر کے گرد بندھی چھال کے پتے ستر پوشی کے لیے نہیں بلکہ ''حسین'' دکھائی دینے کے لیے باندھے گئے ہیں۔'' میری حیرانگی کی وجہ کچھ اور تھی، میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ ننگے جسم اتنی سردی کیسے برداشت کرتے ہیں؟ میرے سوال کے جواب میں شمس بولا، ''بچے کی پیدائش کے وقت سے ہی اسے ننگا رکھا جاتا ہے۔ انسانی جسم کو قدرت نے یہ خوبی عطا کی ہے کہ چاہے قطب شمالی کا برفانی حصہ ہو یا مڈل ایسٹ کے صحراؤں کی گرمی، انسانی جسم سب کا عادی ہو جاتا ہے۔'' مورنگ اب میزوؤں کے ساتھ چل رہے تھے۔ ان میں کچھ بات ہوئی تو مورنگوں نے منہ سے کچھ آوازیں نکالیں۔ ان آوازوں کے بعد میں نے نوٹ کیا کہ نقاروں کی تال (ردھم) میں فرق آگیا۔ یہ فرق یقیناً ہمارے پرامن ہونے اور سردار سے ملنے کی خواہش کا پیغام تھا۔ چشمے کے پانی کی گزرگاہ کے دوسری طرف جہاں بھی درخت کم تھے یا کاٹ دیے گئے تھے، میں نے خاص انداز کے بنے جھونپڑے دیکھے جن کے باہر ننگ دھڑنگ عورتیں اور بچے کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ شمس نے کہا، ''یہ سب مورنگ قبیلے کے لوگ ہیں اور صرف اسی وقت یہ چھال اور پتے پہنتے ہیں جب کہیں جانا ہو۔'' شمس مجھے قبیلے کے رسم و رواج کے متعلق بتانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی یا وہ گوئی اچھی نہ لگی۔ ''تم تو ایسے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہے ہو جیسے ان قبائل میں خاصا عرصہ رہ چکے ہو حالانکہ تم مجھے بتا چکے ہو کہ اس طرف پہلے کبھی نہیں آئے۔ خاموش رہو ورنہ خچر کی سواری چھوڑ کر پیدل چلنا پڑے گا۔'' میری اس وارننگ پر شمس بالکل خاموش ہوگیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس نے مجھ سے پھر کبھی ڈائریکٹ بات کرنے کی ہمت نہیں کی۔

ادھر میزوؤں نے غالباً مورنگوں کو بتادیا تھا کہ میں سالار قافلہ ہوں۔ مورنگ میرے پاس آئے فوراً اپنے بھالے اور تیر کمان میرے سامنے رکھ کر اور گردنیں جھکا کر کھڑے ہوگئے۔ میزوؤں نے مزدور کی زبانی مجھے کہا کہ میں ان کے بھالے اور تیر کمان اٹھا کر ان کے حوالے کردوں۔ قافلے کے سردار یعنی میرے سامنے انہوں نے ہتھیار ڈال کر اطاعت گزاری اور دوستی کا مظاہرہ کیا ہے اور ان کے ہتھیار واپس لوٹا کر میں ان کی اطاعت گزاری کو قبول کروں گا۔ میں نے ان کے ہتھیار اٹھا کر انہیں دیئے تو وہ خوش ہوکر کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر تالیاں بجانے لگے۔

قریب دو گھنٹے کے مزید سفر کے بعد چشمے کی گزرگاہ کے دوسری طرف ایک خاص بڑے رقبے

کو درختوں سے صاف کرکے تقریباً دو سو جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ ایک جھونپڑا بہت بڑا اور دو جھونپڑے باقیوں کی نسبت بڑے تھے۔ دوران سفر چشمے کے پانی میں کئی اور چشمے شامل ہوچکے تھے لیکن پانی کی گہرائی دو فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ ایک جگہ جہاں نسبتاً زیادہ پتھر تھے، ہم نے پانی کو عبور کیا۔ مورنگوں نے جھونپڑوں کے سامنے ایک کھلی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں کہا کہ یہاں پڑاؤ کریں اور میزوؤں کے ذریعے مجھے بتایا کہ سردار شام کو سورج ڈھلنے کے بعد ہمیں ''شرف باریابی'' بخشے گا۔ ہم نے خچروں سے سامان اتارا اور میں نے اپنے بقایا ٹن فوڈ کے تین حصے اور نقلی موتیوں کی مالاؤں اور سگار کے دو حصے کیے۔ ٹن فوڈ کا ایک حصہ میں نے اپنی آئندہ ضروریات کے لیے محفوظ کرلیا جبکہ موتیوں کی مالاؤں، سگار اور ٹن فوڈ آدھا مورنگ سردار اور بقیہ آدھا مکھ سردار کے لیے رکھ لیا۔ ہم نے اپنی سب مشین گنیں اور رائفلیں سامان میں چھپا کر رکھ دی تھیں جبکہ سائڈ آرمز کو لوڈ کرکے اپنے لباس میں اس طرح چھپالیا تھا کہ اگر ضرورت پڑے، تو بغیر وقت ضائع کیے اسے استعمال کرسکیں۔

ہمارے وہاں کیمپ لگاتے ہی مورنگ عورتیں اور اکا دکا مرد وہاں آگئے۔ اور کچھ دور کھڑے ہمیں دیکھ کر ہمارے متعلق باتیں کرنے لگے۔ شمس نے بالکل صحیح کہا تھا۔ پتوں اور درختوں کی چھال سے ستر پوشی محض سفر کے لیے اور نمائشی تھی۔ یہ چونکہ ان کا گاؤں اور گھر تھا، لہٰذا یہاں سب الف ننگے تھے۔ چونکہ یہ ان کا معاشرہ تھا لہٰذا اس طرح ننگ دھڑنگ عورتوں اور مردوں کا پھرنا ان کے لیے معیوب نہ تھا البتہ تھائیوں، قیصر اور اس کے ساتھیوں کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ یہ سب ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے اونچی نیچی زمین پر بیٹھے یا نیم دراز آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ نجانے اس طرح گھورنے سے یہ مورنگ ہمارے متعلق کیا سوچیں؟ میں نے قیصر اور اپنے نمبر ٹو کو کہا کہ دونوں کے آدھے آدھے ساتھی نشیب میں جاکر چشمے کے پانی میں نہائیں اور ان کی واپسی پر دوسری ٹولی جائے تاکہ سرد پانی سے ان کی گرمی دور ہو۔ قیصر نے جو خود بھی اس منظر کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا، میری بات سن کر خفت میں آنکھیں جھکالیں اور وہ اور نمبر ٹو اپنے آدھے ساتھیوں سمیت صابن اور تولیے لے کر پانی کی ڈھلوان کی طرف چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی مورنگ عورتوں کا مجمع بھی خاصا چھٹ گیا۔ میں آنکھیں بند کیے اپنے سلیپنگ بیگ سے ٹیک لگائے نیم دراز ہوگیا۔ میں اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتا کہ اس منظر نے میرے دماغ میں بھی ہلچل پیدا کردی تھی۔ ابھی بیس پچیس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ قیصر بھاگتا ہوا آیا اور مجھے کہنے لگا، ''بھائی جان! ذرا میرے ساتھ آیئے۔'' یہ سوچ کر کہ کچھ گڑ بڑ ہوگئی ہے میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ قیصر سے پوچھنے پر وہ بولا، ''آپ خود آکر دیکھ لیجیے۔'' مجھے ہمراہ لیے اس ڈھلوان کی طرف جہاں تھائی اور قیصر کے ساتھی انڈر ویئر پہنے نہا رہے تھے، ان سے دگنی تعداد میں مورنگ عورتیں اسی بے لباسی کی حالت میں تھائیوں اور قیصر کے ساتھیوں کے ہمراہ پانی میں تھیں اور ان کے اور اپنے جسموں پر صابن لگا کر انہیں نہلا رہی تھیں اور پانی کے دونوں کناروں پر چند مورنگ مرد کھڑے قہقہے لگا

رہے تھے۔ قیصر نے مجھے بتایا کہ اس کا ایک ساتھی جب ان عورتوں کے پانی میں آنے کی وجہ سے بھاگنے لگا تو کناروں پر کھڑے مورنگ مردوں نے تین چار تیر اس کے قدموں کے قریب چلا کر اسے بھاگنے نہیں دیا۔ اب اس کے ساتھیوں اور تھائیوں میں کچھ تو خوشی سے اور کچھ جبراً اس طرح نہانے پر مجبور ہیں۔ اس صورت حال میں سوائے خاموش رہنے کے میں کیا کرسکتا تھا؟ ان کے حال پر انہیں چھوڑ کر میں واپس چلا آیا۔ مزید آدھ گھنٹے تک اچھی طرح ''نہانے'' کے بعد پہلی ٹولی واپس آئی تو ان میں ہر ایک کے ہمراہ دو عورتیں تھیں۔ جو ان کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئیں اور ان کے جسم دبانے لگیں۔ میں نے قیصر کو کہا کہ دوسری ٹولی کو بھی نہانے کے لیے بھیج دے تاکہ وہ بھی اس غسل سے لطف اندوز ہوسکیں۔ اب صرف قیصر اور میں ہی باقی بچے تھے۔ قیصر میرے بیٹھ گیا اور بولا، ''بھائی جان وہ سامنے دیکھئے پانچ چھ عورتیں ہم دونوں کی تاک میں کھڑی ہیں۔'' ''تمہارا جی چاہتا ہے تو تم بھی شوق پورا کرلو۔ میں تو نہانے سے باز آیا۔'' یہ کہہ کر میں نے پھر آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں نے آنکھیں کھولیں تو قیصر غائب تھا اور تین مورنگ عورتیں میرے بالکل قریب کھڑی تھیں۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرنے میں ہی عافیت سمجھی کیونکہ ان کے رویے سے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ان عورتوں کو سوتے ہوئے مہمانوں کو جگانے یا کوئی اور حرکت کرنے کی اجازت نہیں۔ میں گھنٹہ بھر یونہی آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ میرے پاس کھڑی مورنگ عورتیں مایوس ہوکر جا چکی تھیں اور قیصر اپنے ساتھیوں کے قریب لیٹا ہوا تھا اور دو مورنگ عورتیں اس کے جسم کا مساج کر رہی تھیں۔ یقیناً وہ بھی اس انوکھے غسل سے فیض یاب ہوچکا تھا۔

سورج غروب ہوتے ہی ایک کرسی نما اونچی چوکی سردار کے جھونپڑے کے سامنے رکھ دی گئی اور شہد کے چھتوں کی موم سے درجنوں مشعلیں جلائے کچھ مرد اور سو سے زیادہ عورتیں دو قطاروں میں چوکی کے سامنے بیٹھ گئیں۔ ہمیں راستے میں ملنے والے مورنگ میزو گائیڈوں کو لے کر میرے پاس آئے اور بولے کہ سردار تھوڑی دیر میں باہر آنے والا ہے۔ آپ سب سردار کے مہمان ہیں۔

پانچواں باب

جب سے ہم اس قبیلے میں داخل ہوئے تھے، بڑی انوکھی باتیں ہو رہی تھیں۔ ننگ دھڑنگ سینکڑوں عورتیں اور گنتی کے صرف چند مرد ہمیں اب تک دکھائی دیے تھے۔ قبیلے کی عورتیں کسی بھی قسم کی شرم و حیا کے بغیر میرے سارے ہمراہیوں کو بلاجھجک اپنے جھونپڑوں میں لے گئی تھیں۔ اب اتنی رات گئے سردار نے مجھے اپنے جھونپڑے میں بلوایا تو اس کے پلنگ پر نیم دراز، جواہرات سے لدی ایک جوان عورت جو یقیناً کسی مغربی ملک کی تھی، انگریزی میں مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ میں گھبرایا ہوا جھونپڑے کا ہر طرف سے جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ چند قبائلی اپنے سردار کے ہمراہ یہیں کہیں چھپے ہوئے ہیں اور ناگہانی مجھ پر تیروں اور نیزوں کی بارش شروع ہوجائے گی اور میرے قافلے کے باقی لوگوں کا بھی یہی حشر یا تو ہوچکا ہوگا یا ہونے والا ہوگا۔ میری بے چینی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ بے اختیاری کی حالت میں میرے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں چلے گئے اور ہتھیاروں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کرلیا کہ موت تو یقیناً آنی ہے لیکن ان قبائلیوں کے ہاتھوں مرنے سے پہلے ایک ایک گولی سے ایک ایک قبائلی کو نشانہ بناؤں گا۔ میری اضطراری کیفیت کو بھانپتے ہوئے وہ عورت مسکراتے ہوئے کھڑی ہوگئی اور میری جانب بڑھتے ہوئے بولی، ''ڈرو نہیں۔ یہاں میرے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ مرد اور نہ ہی کوئی عورت۔ تم سردار سے ملنا چاہتے تھے نا تو اب سردار تمہارے سامنے ہے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس عورت کی خوبصورت انگریزی اور عمدہ تلفظ سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ آسٹریلین ہے۔ ''میری پریشانی اور حیرت زدہ ہونے کی وجہ کا تمہیں یقیناً اندازہ ہوگا۔ جو کچھ میرے قافلے کے باقی لوگوں کے ساتھ اب تک پیش آیا ہے وہ یقیناً اس قبیلے کے رسم و رواج کا حصہ ہے۔ میرے لیے یہ سب باتیں اتنی اہم نہیں لیکن

سردار کے جھونپڑے (Hut) میں تم جیسی حسین، جوان اور لباس کے تکلف سے آزاد روانی سے انگریزی بولنے والی عورت کو اکیلا دیکھ کر کون ذی ہوش ہوگا جو حیران نہ ہو جائے؟'' میں نے اپنے پستول اور ریوالور کے دستوں پر ہاتھ جماتے ہوئے جواب دیا۔ میری انگریزی بھی ناقص نہیں اور شکل وصورت میں بھی میں ایسا گیا گزرا نہیں ہوں۔ میری بات سنتے ہوئے وہ عورت میرے اتنے قریب آگئی کہ سردی کے موسم میں بھی مجھے اس کے جسم کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔ میرا بازو تھام کر وہ مجھے پلنگ کی جانب لے جاتے ہوئے بولی، ''میں قبیلے کی سردار ہوں اور تم اپنے قافلے کے... کیوں نہ ہم دوستانہ انداز میں اکٹھے بیٹھ کر باتیں کریں اور اس زندگی کے مزے لوٹیں جو صرف ایک بار ہی ملتی ہے۔'' ''تم خاصی پڑھی لکھی دکھائی دیتی ہو۔ زندگی اور جوانی کے مزے لوٹنے کے لیے ذہنی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کو اچھی طرح جاننا بہت ضروری ہے ورنہ انسان اور جانور میں کیا فرق باقی رہ جائے؟ کون کافر تمہاری جوانی اور حسن کی شراب سے سیراب ہونا نہیں چاہے گا لیکن اس کو دوآتشہ کرنے کے لیے ایک دوسرے سے اچھی طرح جان پہچان ضروری ہے۔ ہمیں پہلے اجنبیت کو دُور کرنا چاہیے اور مجھے تو تمہارے نام کا بھی علم نہیں ہے اور یقیناً یہی حالت تمہاری بھی ہوگی۔'' میں نے پلنگ پر اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''صرف ایک جام اس شراب کا پی لو۔ تمہاری ساری منطق دھری کی دھری رہ جائے گی۔'' اس عورت نے شراب سے بھرا گلاس مجھے پیش کرتے ہوئے چیلنج کیا۔ ''تمہاری جوانی، حسن اور انداز سپردگی میں جو نشہ مجھے دکھائی دے رہا ہے وہ اس شراب میں کہاں؟'' میں نے اس کا جام والا ہاتھ پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس عورت نے سنجیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے جام کو ایک میز نما شے پر رکھا اور بولی، ''بہت ضدی ہو اور میں بھی اپنی دھن کی پکی ہوں ورنہ کب کی ملبورن جاچکی ہوتی۔ اب میں تمہیں اپنے متعلق بہت کچھ بتاؤں گی اور تمہاری بھی سب باتیں سنوں گی۔ لیکن اپنے ذہن سے اس خیال کو نکال دینا کہ تمہارے ساتھی کبھی بھی تمہاری مدد کو پہنچ سکیں گے۔ ہمارا وار یک طرفہ نہیں ہوتا۔ جو مرد ہماری محبت، خدمت اور انداز سپردگی کے دام میں گرفتار نہ ہوسکے اسے ہم لوہے کی زنجیروں سے اس وقت تک جکڑ کر رکھتی ہیں جب تک یا تو وہ ہماری خواہشات کا غلام بے دام نہ بن جائے اور یا... مر نہ جائے۔'' یہ کہتے ہوئے اس عورت نے شراب بھرا گلاس اٹھایا اور ایک لمبی سانس میں خالی کردیا۔

پہلے تو مجھے اس کی بات سمجھ میں نہ آئی لیکن اس کے کہے ہوئے الفاظ اور فقروں کو جب میں نے مربوط کیا تو خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ ''تمہارے ساتھی اب کبھی بھی تمہاری مدد کو پہنچ نہ سکیں گے اور... اسے ہم لوہے کی زنجیروں سے جکڑ کر رکھتی ہیں۔'' اس عورت نے یہ باتیں بلاوجہ اور بغیر کسی حقیقت کے نہیں کہی تھیں اور یہ عین ممکن تھا کہ میرے مدہوش ساتھیوں کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہو۔ جس وقت سے ہم اس قبیلے میں داخل ہوئے تھے، باقی دنیا کے الٹ اور خلاف

معمول باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے چہرے پر عیاں خوف اور بدلتے رنگ دیکھ کر وہ بولی، ''تمہارے سامان میں چھپا ہوا سب اسلحہ ہم نے نکال لیا ہے اور تمہارے ساتھیوں کی میزبان لڑکیوں نے ان کی مدہوشی کے دوران ان کے لباس میں موجود اسلحہ بھی اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔ تمہارے ساتھی صبح جب ہوش میں آئیں گے تو ان کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوں گے۔ تم اپنے قافلے کے سردار ہو اور سمجھ دار بھی لگتے ہو۔ کیا تم خود اپنا جیبی اسلحہ میرے حوالے کرو گے یا یہ ناخوشگوار کام میری گارڈز کو انجام دینا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دو مرتبہ تالی بجائی اور فوراً ہی چار مورنگ عورتیں بھالے تھامے جھونپڑے میں داخل ہوئیں اور میرے بالکل قریب ایسی پوزیشن میں کھڑی ہوگئیں کہ میری ذرا سی بھی غلط حرکت پر وہ مجھے بھالوں میں پرو دیں۔ میں نے سردار کی اجازت سے اپنی جیکٹ کی دائیں جیب سے بھرا ہوا ریوالور اور اس کے فالتو راؤنڈ نکالے اور اس کے سامنے رکھ دیے۔ سردار کے اشارہ کرنے پر اس کی ایک گارڈ نے ریوالور اور گولیاں اُٹھا لیں اور چاروں جھونپڑے سے باہر چلی گئیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں سائیلنسر والا پسٹل اور دو فالتو میگزین تھے۔

''اب ہم بے تکلفی سے باتیں کرسکیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بستر پر نیم دراز ہوگئی اور مجھے بھی بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس نے مشکیزے سے اپنے لیے ایک جام اور نکالا اور پیتے ہوئے بولی، ''میں آسٹریلیا سے یہاں آئی تھی۔ میرے والدین کی میرے بچپن میں ہی علیحدگی ہوگئی اور میں اپنے ماں باپ کی گرم محبت اور شفقت کے بجائے ہوسٹل کی کھردری اور بے جان دیواروں کے درمیان پل کر جوان ہوئی۔ مجھ جیسی بے آسرا لڑکیاں نشے کے دُھویں میں ان لوگوں میں پناہ ڈھونڈتی ہیں جن کے لیے دن اور رات کی تمیز ختم ہوچکی ہوتی ہے اور چرس بھرے سگریٹ اور ہیروئن ان کے لیے دن اور ان کا نہ ملنا رات کا اندھیرا ہوتا ہے۔ ایسے ہی تین مرد ساتھیوں کے ساتھ میں تھائی لینڈ اور برما سے بھارت ہوتے ہوئے نیپال گئی اور چند ماہ وہاں گزارنے کے بعد ہم نے واپسی کی ٹھانی۔ ہمارے ملکی معاشرے اور خصوصی طور پر ہپیوں کے معاشرے میں اجنبی مرد اور عورت کے اختلاط کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ تینوں بیک وقت میرے ساتھی بھی تھے اور شوہر بھی۔ بھارت میں بمبئی میں ہم ایک یوگی راجنیش کے آشرم میں گئے۔ وہاں بڑے بڑے کاروباری لوگ، فلم سٹارز، سمگلر اور گھروں سے بھاگی ہوئی لڑکیاں آتی تھیں۔ راجنیش ہمیں مفت میں چرس فراہم کرتا اور اپنے لیکچرز میں کہتا کہ جنسی آزادی ہر مرد اور عورت کا حق ہے۔ اس کے آشرم میں آنے والے بھارتی مجھے چند گھنٹوں کے عوض سینکڑوں روپے دے جاتے۔ جنہیں ہم آشرم کا خرچ اور چرس وغیرہ خریدنے میں صرف کرتے۔ نیپال میں میرے ساتھیوں نے کھلے بندوں مجھے کہا کہ تم جسم فروشی کرو تاکہ ہم اپنے اخراجات پورا کرسکیں۔ چند ماہ بعد جب میرا جسم اور اعصاب جواب دینے لگے تو میں نے ساتھیوں کو کہا کہ میں واپس ملبورن جا

رہی ہوں۔ اگر وہ چلنا چاہیں تو بہتر ورنہ میں اکیلی چلی جاؤں گی۔ میرے ساتھی یہ دیکھتے ہوئے کہ میرے بغیر تو وہ بھوکے مرجائیں گے، میرے ساتھ واپس چلنے پر آمادہ ہوگئے۔ ہمارا پروگرام تھا کہ آسام کے پہاڑی سلسلے کو عبور کرکے بنگلہ دیش میں داخل ہوں گے اور ڈھاکہ سے کسی مال بردار جہاز پر سفر کرکے آسٹریلیا پہنچ جائیں گے۔ میرے ساتھیوں نے واپسی کے سفر کے دوران بھارت میں مجھے زبردستی جسم فروشی پر مجبور کیا۔ میرے دل میں ان کے خلاف نفرت بھر چکی تھی۔ بالکل آپ کی طرح جب ہم مورنگ قبیلے میں شب بسری کے لیے رکے تو میرے ساتھیوں نے قبیلے کے سردار کے ہاتھوں مجھے فروخت کردیا۔ ابھی میرے ساتھی یہیں تھے کہ قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق سردار نے مجھے اپنی دلہن بنایا اور یہاں کے رواج کے مطابق مجھ سے میری ایک ایسی خواہش پوچھی جس کو پورا کرنا اس کے بس میں ہو۔ میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کے سر مانگے جو چند لمحوں میں ہی بھالوں پر چڑھے میرے سامنے لائے گئے۔ قبیلے کا سردار مجھ سے سچی محبت کرنے لگا تھا اور میں نے بھی کوئی چارہ نہ دیکھتے ہوئے اس زندگی کو قبول کرلیا تھا۔ سردار کی محبت میں بہت گرمجوشی تھی اور میں اس کی محبوبہ بیوی۔ ایک دشواری تھی کہ ہم ایک دوسرے کی زبان سے بالکل ناآشنا تھے۔ سردار نے مجھے یہ تاج اور جواہرات کی مالائیں تحفے میں دی تھیں۔ وہ اشاروں سے مجھے کچھ بتانا چاہتا تھا۔ میں صرف اتنا ہی سمجھ سکی کہ اس جیسے بہت زیادہ جواہرات کا خزانہ سردار کے پاس ہے۔ سردار نے چرس کے بجائے مجھے اس شراب کا عادی بنا دیا۔ سینکڑوں مورنگ عورتیں میری خدمت کرنا اپنا اعزاز سمجھتی تھیں اور ہماری زندگی ٹھیک ٹھاک ہی گزر رہی تھی کہ ایک روز بھارتی ناگالینڈ کے باغیوں نے ہم پر حملہ کردیا۔ یہ حملہ اچانک اور بغیر کسی وجہ کے تھا۔ بارودی اسلحہ کا ہمارے آدمی صرف بھالوں اور تیروں سے کہاں تک مقابلہ کرتے؟ ہمارے قبیلے کے نوے فیصد مرد اس لڑائی کے پہلے روز ہی ناگاؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔ سردار بھی شدید زخمی ہوا تھا اور زخم خراب ہونے کے باعث چند روز بعد مرگیا۔ سردار کی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے قبیلے کے چند بچے کھچے مردوں اور سینکڑوں عورتوں نے مجھے اپنا سردار بنالیا۔ یہ واقعہ تقریباً دو برس قبل کا ہے۔ ہماری خوراک کے لیے جنگل میں ضرورت سے زیادہ شکار اور پینے کے لیے پانی کا چشمہ ہے۔ ہم نے سردار کے ہلاک ہونے کی خبر کو اب تک سب سے پوشیدہ رکھا ہے۔ کھانے اور پینے کی ضروریات کے علاوہ جنس آسودگی بھی چونکہ ایک فطری ضرورت ہے۔ اس لیے میں نے راجنیش کے آشرم کی طرح قبیلے کی عورتوں کو جنسی ضرورت پورا کرنے کی کھلی اجازت دے رکھی ہے اور خود پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ یہ سارا واقعہ میں نے تمہیں صرف اس لیے بتایا ہے کہ اگر تم بڑا خزانہ ڈھونڈنے میں میرے شریک کار بن جاؤ تو ہم یہاں اکٹھے رہیں گے لیکن اپنی سچائی کے ثبوت کے طور پر تمہیں اپنے چار ساتھیوں کو سب کے سامنے ہلاک کرنا ہوگا۔ دوسری صورت میں تمہیں صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ تمہارے تمام ساتھی جھونپڑوں میں زنجیروں

سے بندھے نشے میں مدہوش بے سدھ سو رہے ہیں۔ میری شرط ماننے سے انکار کی صورت میں تمہیں ہلاک کرکے کل صبح میں تمہارے کسی ساتھی کو جو مجھے اچھا لگا، یہی شرط بتاؤں گی۔ انکار کی صورت میں ایک کے بعد ایک کرکے تمہارے تمام ساتھی ہلاک کردیے جائیں گے۔ تمہیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ سب سے پہلے تو تم ہی اپنی حماقت کے باعث اس دنیا سے رخصت ہوچکے ہو گے۔"

شراب کے نشے، قبیلے کی سرداری کی رعونت اور میرے اور میرے ساتھیوں کے بے دست و پا ہونے کے باعث یہ عورت زیادہ ہی Over Confident اور اپنی برتری کے احساس کا شکار ہوچکی تھی۔ اس نے مجھے شریک کار بننے کی جو آفر کی تھی وہ اس کا حکم نامہ تھا جس سے انکار میری موت کا پروانہ تھا۔ ابھی تو میرے پاس سائیلنسر والا پسٹل اور اکیس گولیاں موجود تھیں، جنہیں میں ضرورت کے وقت کام میں لاسکتا تھا۔ مجھے اپنے سابقہ محکمے کی سخت ٹریننگ کی وجہ اور اہمیت کا اس وقت احساس ہوا۔ بغیر اسلحہ کے دشمن کی چند مخصوص نسیں دبا کر اس کا کام تمام کیا جاسکتا تھا۔ میرے لیے اس عورت سے نبٹنا مشکل نہ تھا۔ مجھے فکر تھی تو اپنے ساتھیوں کی جو شراب کے نشے میں چور ہوکر ان عورتوں کے قیدی بن چکے تھے اور ہوش میں آنے کے بعد بھی زنجیروں میں جکڑے اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی کرنے سے معذور تھے۔ مجھے ہر حالت میں اس عورت کو اس وقت تک کسی شک کے احساس کے بغیر زندہ رکھنا تھا۔ جب تک کہ میرے ساتھی ہوش میں نہ آجائیں اور اپنی جان بچانے کے لیے میری تدبیر میں جسمانی طور پر شامل نہ ہوسکیں۔ مجھے اس وقت شیر کی دلیری سے زیادہ لومڑی کی چالاکی کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، "پارٹنر! اگرچہ تم نے میرے لیے Choice (ہاں اور نہ) کی کوئی صورت نہیں چھوڑی اور انکار کی صورت میں مجھے موت کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن ایک بات میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ میں مرنے سے ہرگز نہیں ڈرتا اور زندگی میں کئی بار موت کے منہ میں آنکھیں ڈال کر دیکھ چکا ہوں۔ میں نے تمہیں پارٹنر تمہارے خوف کی وجہ سے نہیں کہا بلکہ میں تمہارے ماضی کی داستان سن کر تمہاری محرومیوں اور مردوں کی تم سے چال بازیوں کے باعث تمہارے انتقامی جذبے کے ابھرنے اور بدلہ لینے کے عزم کی وجہ سے تم سے بہت متاثر ہوچکا ہوں۔ اپنے متعلق مختصراً یہی کہہ سکتا ہوں کہ اپنی گھریلو زندگی کو انتہائی ناخوشگوار پاکر میں نے زندگی سے فرار کی راہ اپنائی ہے۔ میرے قافلے میں شامل لوگوں کو ہی دیکھ کر تمہیں اندازہ ہوجانا چاہیے کہ تھائی، برمی، بھارتی اور میزو میرے ہمراہ ہیں۔ ان میں سے بہت کم پیسے کے لیے اور باقی سب میری طرح زندگی سے فرار ہوکر کہیں دور نئی دنیا آباد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے اسی لیے اپنے سفر کے لیے اس نسبتاً بے آباد علاقے کو چنا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے ایک باہمت دلیر اور نڈر عورت کے ساتھ کی خواہش رہی ہے۔ تم میں ہر وہ خوبی ہے جس کی تلاش میں میں مدتوں سے بھٹک رہا ہوں۔ تمہارے ساتھ پارٹنر کی حیثیت سے رہنے کے لیے میں اپنی شرائط نہیں بلکہ چند خواہشات بیان کرنا

چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ تم اپنے حسین جسم کو لباس سے ڈھانپ لو۔ میں بہت Possessive ہوں اور یہ برداشت کرنا میرے لیے ناممکن ہوگا کہ میری محبوبہ کے جسم پر کوئی بھی حریصانہ نظر ڈالے۔ میری دوسری شرط یا خواہش یہ ہے کہ میرے جتنے ساتھی بھی بخوشی یہاں مستقل رہنا چاہیں انہیں بغیر کسی پابندی کے رہنے کی اور مورنگ عورتوں میں سے اپنی پسند کی عورت یا عورتیں چننے کی اجازت دی جائے۔ میری تیسری اور آخری خواہش یہ ہے کہ قتل و غارت کا یہ کھیل بند کیا جائے اور مجھے اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے اپنے چار ساتھیوں کو ہلاک کرنے کی شرط سے آزاد کیا جائے۔ ہمیں Man Power کی اشد ضرورت ہے۔ اصل خزانے تک پہنچنے کے لیے ہمیں یقیناً خاصی جگہوں پر کھدائی کرنی پڑے گی۔ میں تمہیں یہ اجازت دیتا ہوں کہ اگر کبھی بھی تم نے محسوس کیا کہ میں فی الواقعہ بھاگنے کی کوشش میں ہوں تو بلا دریغ مجھے ہلاک کردینا۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کے کندھوں کو اپنے ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا، ”ہم اتنی باتیں کرچکے ہیں لیکن نہ تو تم نے مجھے اپنا نام بتایا اور نہ ہی میرا نام پوچھا۔“ ”میرا نام الزبتھ ہے اور پاسپورٹ کے مطابق تمہارا نام رابرٹ مائیکل ہے اور تم پاکستانی ہو حالانکہ اپنی شکل وصورت اور بول چال سے لگتے نہیں۔ تم نے بتایا تھا کہ تم تھائی لینڈ سے برما اور بھارت سے گزرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو حالانکہ تمہارے پاسپورٹ پر نہ تو برما اور بھارت کے ویزے ہیں اور نہ ہی داخلے کی مہریں۔“ پاسپورٹ تک اس کی رسائی کا مطلب تھا کہ میرے تمام ڈالر بری کیات اور راجہ تری دیو کے اپنی بیوی اور بیٹے کے نام خطوط بھی اس کے قبضے میں تھے۔ مجھے اپنی مہم یہیں ختم ہوتے دکھائی دے رہی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے یہ کہانی گھڑی۔ ”میں پاکستانی نہیں بلکہ اسرائیلی یہودی ہوں۔ میں نے ایک انعام کے لالچ میں چکمہ قبیلے تک جانے کی مہم کی ذمہ داری سنبھالی تھی اور میرے تمام ساتھی بھی اس انعام میں میرے حصہ دار ہیں لیکن تمہیں ملنے اور پانے سے ساری مہم اور انعام کا لالچ گیا جہنم میں۔ آؤ اب ہم زندگی کی رنگینیوں کی باتیں کریں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے ہٹا کر اس کی گردن کے گرد حمائل کردیے۔ میں نے ٹریننگ کے دوران گردن کی نسیں دبا کر دشمن کو ہلاک کرنے کا فن سیکھا تھا۔ یہ نسیں اس قدر چھوٹی اور دکھائی نہ دینے والی ہوتی ہیں کہ اکثر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ آپ دشمن کو یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ مجھے آرام سے اپنی گردن کی یہ نسیں تلاش کرنے دو تاکہ میں تمہیں ہلاک کرسکوں۔ الزبتھ کے حسن اور جوانی کی تعریف کرکے میں پہلے ہی عورت کی ازلی کمزوری کی تاروں کو چھیڑ چکا تھا۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ بیک وقت دو باتیں بلکہ تین باتیں ہوئیں۔ اس کی گردن کی مخصوص رگوں پر میرا ہاتھ پہنچا اور مجھ سے لپٹنے کے باعث اسے میرے جیکٹ کی جیب میں موجود پسٹل کا احساس ہوا۔ مجھے پرے دھکیلنے کی کوشش میں ناکام ہوکر اس نے میرے گھٹنوں پر زور سے کک جمائی۔ کک لگنے سے مجھے درد تو اتنا زیادہ ہوا کہ عام حالت میں درد کی شدت سے دہرا

ہوجاتا لیکن وقت اتنا نازک تھا کہ میں نے اپنے جسم کی ساری طاقت درد پر قابو پانے اور الزبتھ کی گردن دبانے میں لگائے رکھی۔ الزبتھ کراٹے کے فن سے بھی خاصی واقف تھی۔ اس نے خود کو میری گرفت سے چھڑانے کے لیے کئی داؤ پیچ آزمائے۔ میں نے اسے پلنگ پر گرا رکھا تھا اور اپنے جسم کا سارا بوجھ اس پر ڈال کر اس کی گردن کی نسیں دبا رہا تھا۔ اپنے بچاؤ کے آخری حربے کے طور پر اس نے اپنی انگلیاں میری آنکھوں میں گھسیڑنی چاہیں تو میں نے اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل قریب بستر میں ایسے چھپایا جہاں اس کی انگلیوں سے میری آنکھیں محفوظ رہیں۔ پھر بھی اس نے کئی جگہ سے میرا چہرہ نوچ ڈالا۔ اس کی قوت مدافعت بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے ہاتھ پاؤں بالکل ڈھیلے پڑ گئے اور اب پلنگ پر اس کا بے جان جسم پڑا تھا۔ اس کی موت کو یقینی بنانے کے لیے میں نے اپنے پسٹل کے دستے سے اس کی کنپٹی پر چند زور دار چوٹیں لگائیں۔ الزبتھ کے مرنے سے میرا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا البتہ مجھے اپنا آئندہ لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے چند گھنٹوں کی مہلت ضرور مل گئی تھی۔

میں نے سارے معاملے کا عمیق نظروں سے جائزہ لیا۔ (1) میرے تمام ساتھی مختلف جھونپڑوں میں شراب کے نشے میں بے سدھ اور زنجیروں سے جکڑے پڑے ہیں اور ہر ایک کے ہمراہ دو مورنگ عورتیں ہیں۔ زنجیروں میں اگر قفل لگے ہیں تو ان کی چابیاں بھی انہی عورتوں کے پاس ہوں گی۔ یہ عورتیں غیر مسلح ہیں لیکن ان کے قبضے میں میرے ساتھیوں کے ہتھیار بھی ہوں گے جنہیں شاید یہ استعمال کرنا نہ جانتی ہوں۔ (2) ہمارے بڑے ہتھیار اور میری اور میرے ساتھیوں کی کل رقم ان کے پاس ہے۔ یہاں مجھے اچانک خیال آیا کہ پاسپورٹ پر میرا نام صرف الزبتھ ہی پڑھ سکتی تھی اس لیے پاسپورٹ، روپیہ اور بڑے ہتھیار یقیناً سردار کے جھونپڑے میں ہی کہیں پوشیدہ رکھے گئے ہوں گے۔ میں نے جھونپڑے کے اندر کا سرسری جائزہ لیا تو اندر داخلے کے مرکزی دروازے کے علاوہ عقب میں دو دروازے اور دکھائی دیے۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر جھونپڑے کی تلاشی لینی شروع کردی تو جلد ہی لکڑی کے ایک بڑے صندوق میں سے جس پر گھاس پھوس بچھا کر ایک چھوٹے بیڈ کی صورت دی گئی تھی، ہمارے سارے ہتھیار خطوط اور روپے پیسے مل گئے۔ میرے ساتھیوں کے سائیڈ آرمز بھی اس صندوق میں تھے۔ (3) مجھے کوئی ایسی تدبیر اختیار کرنی چاہیے تھی کہ جب تک میرے سارے ساتھیوں کے ہوش و حواس بحال نہ ہوجائیں قبیلے میں کسی کو بھی علم نہ ہونے پائے کہ اُن کی سردار ہلاک ہوچکی ہے۔ مجھے سردار کے معمول کا تو علم نہیں تھا لیکن یہ یقین ضرور تھا کہ رات گئے تک اتنی شراب پینے والی صبح خیز نہیں ہوگی۔ اپنے ساتھیوں کے متعلق بھی میرا یہی خیال تھا کہ صبح نو دس بجے سے قبل وہ نارمل حالت میں نہ آسکیں گے۔ (4) سردار کے جھونپڑے سے میرے باہر جاتے ہی اس کی خادمائیں اندر جائیں گی اور اپنی سردار کو مرا ہوا پاکر اس سے پہلے کہ میں چند قدم

بھی چل سکوں، مجھے حراست میں لے کر ہلاک کردیا جائے گا۔ اگر میں نے خادماؤں کو اسلحہ سے ہلاک کردیا تو فائروں کی آواز سن کر سارے مورنگ اکٹھے ہوجائیں گے اور اگر میں انہیں ہلاک بھی کردوں تو عین ممکن ہے کہ جھونپڑوں میں میرے ساتھیوں کو ان کی ہمراہ عورتیں ہلاک کر دیں۔ میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور ان حقائق کی روشنی میں کوئی راستہ ڈھونڈنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں الزبتھ کی بات مان لیتا تو سردار کے شوہر کی حیثیت سے میری بھی ایسی شناخت ضرور ہوتی جو مجھے قبیلے کے دوسرے لوگوں سے ممتاز کرتی۔ اسی سوچ کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ سردار کی بھی ضرور کوئی نمایاں شناخت ہوگی۔ یہی شناخت ڈھونڈنے کے لیے میں الزبتھ کی لاش کے پاس گیا۔ اس کے گلے میں جواہرات کی نو دس مالائیں اور سر پر تاج تھا۔ ان مالاؤں میں صرف ایک مالا ایسی تھی جس میں تکونی شکل کا صرف ایک بڑا اور بے عیب یاقوت تھا۔ میرے خیال کے مطابق صرف یہ یاقوت ہی سردار کی پہچان تھی۔ میں نے الزبتھ کی گردن سے وہ مالا اور سر سے تاج اتار لیا۔ صندوق میں سے تمام ڈالر اور دوسری نقدی کے علاوہ ایک سب مشین گن کے علاوہ اپنے ساتھیوں کے تین پسٹل اور ایک رائفل بھی نکال لی۔ یہ کام کرنے کے بعد میں نے الزبتھ کے بے جان جسم کو سہارا دے کر بٹھایا اور اپنا سائیلنسر والا پسٹل نکال کر Cock کیا اور داخلے کے دروازے کے پردوں کی اوٹ میں کھڑے ہوکر دو مرتبہ تالی بجائی۔ بھالے بردار دو مورنگ عورتیں جھونپڑے میں داخل ہوکر الزبتھ کی طرف گئیں۔ اسی وقت میں نے دونوں عورتوں کے سروں کا نشانہ لے کر دو فائر کیے اور وہ بغیر آواز نکالے دھڑام سے گر گئیں۔ چند لمحوں بعد میں نے دوبارہ تالی بجائی۔ دو اور مورنگ عورتیں بھالے تھامے اندر داخل ہوئیں اور میں نے ان کا بھی وہی حشر کیا۔ ان چاروں سے فارغ ہوکر میں نے پردے کی اوٹ سے باہر دیکھا۔ ہر سو ایک خاموشی طاری تھی یعنی ابھی صبح ہونے میں دیر تھی۔ میں نے الزبتھ کے جسم کو فرش پر لڑھکایا اور خود اس کی جگہ لیٹ گیا۔ اب مجھے فوری فیصلہ کرنا تھا کہ صبح کا انتظار کروں اور پھر ساتھیوں کے جھونپڑوں کو تلاش کروں یا ابھی سے انہیں تلاش کرنا شروع کر دوں۔

ساتھیوں کی تلاش میں صبح جانے کا اگر ایک فائدہ تھا کہ وہ ہوش میں آ چکے ہوں تو ایک قباحت بھی تھی کہ یہاں موجود تمام مورنگوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ گولیاں تو دشمنوں کو دیکھ کر چلائی جاسکتی تھیں لیکن چھپے ہوئے مورنگوں کے تیر اور اچھال کر میری طرف پھینکے گئے بھالے مجھے بڑی آسانی سے ہلاک کرسکتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ساتھیوں کی تلاش میں جانے کا فائدہ یہ تھا کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر میں جھونپڑوں تک جاکر اور اگر وہاں ساتھی نہ بھی ہو تو مورنگوں کو یرغمال بنا کر ساتھیوں تک پہنچ سکتا تھا۔ اس میں دشواری یہ تھی کہ شراب کے نشے میں بے سدھ ساتھی میرا ساتھ دینا تو ایک طرف رہا، اپنا تحفظ کرنے کے بھی قابل نہ تھے۔ مجھے فوری طور پر فیصلہ کرنا تھا۔ Now or Never (ابھی یا کبھی نہیں) کی مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے ابھی جانے کا فیصلہ کیا۔

مورنگوں کو اپنے متعلق کچھ دیر کے لیے غلط فہمی کا شکار رکھنے اور Time Gain کرنے کے لیے میں نے اپنا تمام لباس اتار کر الزبتھ کی ساری مالائیں اور تاج پہن لیا اور سردار کے سفر کے دوران پہننے والے گھاس اور پتوں کا کمربند بھی باندھ لیا۔ چاروں پسٹل بھی میں نے ہولسٹروں کے ساتھ اپنی کمر کے گرد اور ساری نقدی بھی اپنی بنیان میں رکھ کر بنیان کو کمر کے گرد باندھ لیا۔ اس سے زیادہ اسلحہ اٹھانا میری Mobility (حرکت کرنے کی صلاحیت) کو کم کردیتا۔

میں نے اللہ کا نام لیااور جھونپڑے سے باہر آ گیا۔ موسم کی سردی میری ہڈیوں میں سرائیت کررہی تھی۔ میں تیز تیز قدموں چلتا ہوا ایک ایسے جھونپڑے کی طرف گیا جس میں مشعل کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں جھونپڑے میں داخل ہوا تو ہمارا ہم سفر ایک تھائی ساتھی جس کے ہاتھ اور پاؤں میں زنجیریں بندھی تھیں، بے سدھ پڑا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو مورنگ عورتیں اس سے جڑ کر لیٹی سو رہی تھیں۔ میں نے پاؤں سے ٹھوکا دیتے ہوئے ایک عورت کو جگایا۔ نشے میں ڈوبی اور کھلی آنکھوں سے مجھے اپنے قبائلی ''لباس'' میں دیکھ کر اس نے دوسری عورت کو جگایا۔ دونوں مجھے اس حلیے میں دیکھ کر ابھی کچھ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھیں کہ میں نے تکونا یاقوت ان کے سامنے کردیا اور سر پر پہنے تاج کی طرف اشارہ کیا۔ یاقوت اور تاج کو دیکھتے ہی وہ سجدہ ریز ہوگئیں۔ میں نے انہیں اشارے سے کہا کہ تھائی کو کھول دیں۔ قفل وغیرہ تو تھے نہیں البتہ زنجیروں کو اس طرح لپیٹ کر باندھا گیا تھا کہ وہ خاصی دقت سے جسم سے علیحدہ ہوئیں۔ تھائی ابھی تک مدہوشی کے عالم میں بے سدھ تھا۔ ایک مورنگ عورت نے قریب ہی پڑے مشکیزے کا یخ بستہ پانی تھائی کے جسم پر انڈیلا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے حواس ابھی تک بحال نہ ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے اور پہچانتے ہوئے بھی جب اس نے مورنگ عورتوں کو سجدہ ریز دیکھا تو خود بھی ان ہی کی طرح زمین بوس ہوگیا۔

یہ حالت اب میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ انہی ساتھیوں کی ''رنگینیوں'' کے باعث مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ چکے تھے۔ میں نے اسے تین چار ایسے سخت ٹھڈے مارے کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ اور وہ دونوں ہاتھ جوڑے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ میں نے عورتوں کو اشارے سے کہا کہ اس کے کپڑے لائیں۔ جھونپڑے کے ایک کونے میں ہی اس کے کپڑے پڑے تھے۔ انہیں پہن کر وہ تیار ہوا تو میں نے مورنگ عورتوں کو پھر اشاروں سے سمجھایا کہ ہمیں ان تمام جھونپڑوں میں لے چلیں جہاں دوسرے ساتھی قید ہیں۔ قصہ مختصر ایک سوا گھنٹے کے اندر ہی میں اپنے تمام ساتھیوں کو آزاد کروا چکا تھا۔ میں نے اپنے پسٹل اور سب مشین گن کے سوا تینوں پسٹل قیصر اور اس کے ساتھیوں کو دے دیے۔ صبح کی روشنی پھیل رہی تھی اور بڑا ہی عجیب اور مضحکہ خیز منظر تھا۔ قافلے کا سالار یعنی میں قبیلے کے سردار کا روپ دھارے سر پر تاج اور گلے میں مالائیں پہنے ننگ دھڑنگ سب سے آگے اور پیچھے قیصر اور اس کا ایک ساتھی، ان کے پیچھے مورنگ عورتوں کی بے لباس فوج اور ان

کے پیچھے قیصر کے باقی ساتھی سردار کے جھونپڑے کی طرف رواں دواں تھے۔ جھونپڑے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے سب کو باہر روکا اور اکیلے اندر جا کر پہلے اپنا لباس پہنا اور پھر قیصر اور اپنے نمبر ٹو تھائی کو اندر بلا کر کہا کہ ایک ایک کر کے اپنے آدمی اندر بلواؤ اور صندوق میں پڑا ان کا اسلحہ ان میں بانٹ دو۔ جتنے مورنگ مرد اور بھالے بردار عورتیں ہیں انہیں حراست میں لے کر انہی زنجیروں سے باندھ دو جن سے تمہیں باندھا گیا تھا۔ خچروں پر سارا سامان لادو اور یہاں سے نکلنے کی جلد از جلد کوشش کرو۔

اپنے ساتھیوں کو روانگی کے تمام احکام دے کر میں نے انہیں کم از کم دو دو کی ٹولیوں میں چلنے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان کے تمام تیر، ترکش اور کمانیں اپنے قبضے میں لے لو۔ ان کا یہ اسلحہ ہم ساتھ لے جائیں گے۔ اب میں نے کالادان کے مزدور اور میزو گائیڈوں کو بلایا اور کہا کہ جو کچھ میں کہوں وہ لفظ بلفظ ان مورنگوں کو بتائیں۔

مورنگوں تک میری بات تین واسطوں سے پہنچنی تھی۔ شس کو میری بات جتنی کچھ سمجھ میں آنی تھی اس کا آسامی میں ترجمہ کر کے مزدور کو سنانا تھا۔ مزدور نے میزوؤں کو اور میزوؤں نے مورنگوں کو۔ مجھے یقین تھا کہ مورنگوں تک میرے بات پہنچتے پہنچتے اپنا مفہوم بالکل بدل جائے گی، لہٰذا میں نے نہایت مختصر بات کے ساتھ مورنگوں کو عملی مشاہدہ کروانے کا بھی فیصلہ کیا تاکہ میرا مطلب سمجھنے میں انہیں آسانی ہو۔ میں سردار کے جھونپڑے کے باہر بچھی تخت نما کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے ہمراہیوں کو کہا کہ الزبتھ اور اس کی چاروں پہریدارنیوں کے بے جان جسم جھونپڑے سے باہر لا کر زمین پر زور سے پٹخ دیں۔ لاشوں کو زمین پر پٹخنے سے میں چاہتا تھا کہ مورنگوں پر سے سردار (الزبتھ) کی ہیبت کم ہو اور ہمارا دبدبہ ان کے دلوں پر بیٹھ جائے۔ الزبتھ نے اپنے تین ساتھیوں کے سر نیزوں پر ٹنگوا کر مورنگوں پر اپنی ہیبت طاری کر دی تھی۔ سردار کی موت کے بعد مورنگوں کی سردار بننے کے لیے بھی الزبتھ نے یقیناً کچھ ایسے قدم اٹھائے ہوں گے جن کے باعث اس غیر ملکی اور قبیلے سے باہر کی عورت کو مورنگ بلا چوں چرا اپنا سردار تسلیم کر بیٹھے۔ پانچوں لاشیں باہر آئیں تو سارے مورنگ یکبارگی کھڑے ہو کر اونچا اونچا بولنے لگے۔ میں ایسے ہی موقعے کی تلاش میں تھا۔ میرے اشارے پر قیصر اور اس کے دو ساتھیوں نے ہوائی فائر کیے اور میں نے اپنی سب مشین گن سے الزبتھ کی لاش پر چار پانچ گولیاں داغ دیں۔ سارے مورنگ ایک دم خاموش ہو گئے تو میں نے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ سب ہی نے میرے حکم کی فوری تعمیل کی تو میں نے رک رک کر بولنا شروع کیا تاکہ مترجم اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔ ”یہ غیر ملکی عورت جو تمہاری سردار بنی بیٹھی تھی اور اس کی چار محافظوں کے بے جان لاشے تمہارے سامنے پڑے ہیں۔ ہم مسافر ہیں اور اس راستے سے گزر رہے تھے کہ تمہاری اس سردار اور اس کی چیلیوں نے ہمیں اپنا قیدی بنا لیا۔ اپنی جان بچانے کے لیے ہمارے پاس اس

کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ انہیں ہلاک کریں۔ ہمیں تمہارے قبیلے کے متعلق اور تو کچھ علم نہیں لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ تم خوشی سے کسی غیر ملکی کو اپنا سردار نہیں بنا سکتے۔ ہم اب یہاں سے آگے روانہ ہونے والے ہیں اور تمہیں صرف یہی بتانے کے لیے یہاں اکٹھا کیا ہے کہ ہمیں خاموشی اور امن سے یہاں سے جانے دو۔ اگر ہمارا رستہ روکا گیا یا کوئی اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو یہ یاد رکھنا کہ اگر ہمارے کسی خچر کو بھی جسمانی نقصان پہنچا تو تم سب کی لاشیں یہاں پڑی ہوں گی جنہیں جلانے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ ہم حفاظتی نقطۂ نظر سے چھ مورنگ مردوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اور مگھ قبیلے میں پہنچ کر انہیں واپس بھیج دیں گے۔“ میری بات ختم ہوئی تو دو ادھیڑ عمر مورنگ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھوں میں بھالے پکڑے ہوئے تھے۔ میرے ساتھیوں نے انہیں فوری اپنے اسلحہ کی زد میں لے لیا۔ وہ مورنگ آگے بڑھے اور الزبتھ کے بے جان جسم پر اپنے بھالوں سے اتنے وار کیے کہ اس کا جسم چھلنی ہو گیا۔ یہ الزبتھ سے ان کی شدید نفرت کا اظہار تھا۔ ان مورنگوں کی تقلید میں دوسرے تمام مورنگ مردوں نے الزبتھ اور اس کی چاروں محافظوں کی لاشوں پر اپنے بھالوں کی بارش کر دی۔ ان سے فارغ ہوتے ہی ان مورنگوں نے اپنے ان تین ہم قبیلوں کو پکڑا جو چشمے کے پانی سے قیصر کے ایک ساتھی کو مورنگ عورتوں کی خرمستیوں سے بچ کر بھاگ نکلنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ ان تینوں کو بھی انہوں نے بھالے مار مار کر ختم کر دیا۔ اب ایک ادھیڑ مورنگ نے کھڑے ہو کر بولنا شروع کیا۔ مترجموں کے ذریعے جو کچھ مجھ تک پہنچا وہ یہ تھا۔ ”اس غیر ملکی عورت اور اس کی محافظوں کو ہلاک کر کے آپ نے ہم پر ایسا احسان کیا ہے جسے ہم کبھی بھی بھول نہ پائیں گے۔ سردار کی بیوی بننے کے بعد اس نے چالاکی سے ہمارے چند مرد اور عورتوں کو اپنے جال میں پھنسا لیا۔ ناگاؤں سے لڑائی میں ہمارے بہت سارے مرد مارے گئے اور سردار معمولی زخمی ہوا۔ اس عورت نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ہمارے سردار کو جس کی صرف ایک ٹانگ پر زخم آیا تھا، سر پر کوئی وزنی چیز مار کر ہلاک کر دیا۔ اگر سردار کی کوئی اولاد نہ ہو تو پھر نئے سردار کے لیے چناؤ ہوتا ہے۔ چناؤ والے روز جب قبیلے کے تمام افراد یہاں جمع تھے، اس عورت نے کہا کہ قبیلے کو طاقت کی ضرورت ہے اور میں طاقت ہوں۔ تم میں سے جو چاہے مجھ سے مقابلہ کرے اور مجھے زیر کرنے کی کوشش کرے۔ یکے بعد دیگر ہمارے کئی جوان اس کے مقابلے پر اُترے لیکن چند لمحوں میں ہی اس عورت نے انہیں ڈھیر کر دیا۔ (الزبتھ کے کراٹے کے ایک وار کا مزہ میں بھی لے چکا تھا) ہم آج تک اس عورت کو طاقت کی دیوی سمجھتے ہوئے اس کو سردار بنا کر اس کی اطاعت کرتے رہے۔ آپ کی وجہ سے آج ہمارا اس سے پیچھا چھوٹا ہے۔ آپ ہمارے سردار ہو جائیں تو ہمارے لیے یہ بڑے فخر کا مقام ہوگا۔ آپ ناگا قبیلے سے ہمارا انتقام بھی لے سکتے ہیں۔“ مورنگ خاموش ہوا تو میں نے جواباً کہا، ”قبیلے کا سردار قبیلے میں سے ہی ہونا چاہیے۔ جیسے الزبتھ غیر ملکی تھی ویسے ہی میں بھی تمہارے قبیلے سے نہیں ہوں۔ علاوہ ازیں ہم

لوگوں کو ایک مہم درپیش ہے اس لیے میں تمہاری اس پیش کش کو قبول نہیں کرسکتا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے تاج اور تکونی یاقوت والی مالا کے ساتھ ساری مالائیں اس مورنگ کے حوالے کرنی چاہیں تو وہ بولا۔''اس صورت میں انہیں آپ فی الحال اپنے پاس رکھیں۔ جب تک سردار کی یہ نشانیاں آپ کے پاس ہوں گی، ہم سب پر آپ کی اطاعت فرض ہوگی۔ ہمارے جن چھ آدمیوں کو آپ اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں ان میں مجھے بھی شامل کرلیں اور مگھ قبیلے میں پہنچ کر یہ ہمیں مگھ سردار کے سامنے لوٹا دیں۔ مگھ قبیلہ ہمارا دوست ہے اور اس کا سردار یقینی طور پر ہمارے لیے صحیح سردار کا فیصلہ کرے گا۔''

مزید ایک گھنٹے کے اندر ہمارا قافلہ مگھ قبیلے کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے دونوں میزوؤں کو ساٹھ ڈالر دے کر واپس رخصت کر دیا کیونکہ یہ چھ مورنگ اب ہمارے گائیڈ تھے۔ سارے تھائی اور قیصر کے ساتھی خصوصاً قیصر اور میرا نمبر ٹو مجھ سے آنکھیں ملانے سے کترا رہے تھے۔ ابھی ہم سو قدم بھی نہ چلے ہوں گے کہ قیصر اور اس کے ساتھیوں نے یکباری مجھے گھیر لیا اور لگے مجھ سے معافیاں مانگنے۔ قیصر بولا، ''بھائی جان! کوئی جواز نہیں، کوئی وجہ نہیں جسے ہم اپنی اتنی بڑی غلطی کے متعلق بیان کرسکیں۔ آپ ہمارے لیے جو سزا بھی تجویز کریں ہم اسے بخوشی تسلیم کریں گے۔ آپ صرف اشارہ کردیں ہم اپنے اسلحہ سے خود کو ہلاک کرنے کو بھی تیار ہے۔ ہم اپنے گناہ کا کفارہ اپنی جان دے کر بھی ادا کرنے کو تیار ہیں۔ اللہ پاک ہمیں معاف کرے۔ واقعی ان سب کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور وہ فی الحقیقت نہ صرف بے حد شرمندہ تھے بلکہ ان کی حالت ایسی ہورہی تھی کہ ان کا خود کو مار دینا قطعاً بعید نہ تھا۔ میں نے ان سب کو گلے لگایا اور کہا، ''میں نے تمہیں معاف کیا۔ اللہ تمہیں معاف کرے۔ شیطان آدم کے آغاز سے انسان کو بہکانے پر لگا ہوا ہے اور اپنے مقاصد میں اکثر و بیشتر کامیاب بھی ہوتا ہے۔ اللہ پاک غفور و رحیم ہے، معاف کرنے والا ہے اور اپنے گنہ گار بندوں پر بھی اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے۔ تمہاری جگہ بڑے سے بڑا پارسا بھی ہوتا تو بہک جاتا۔ میرے دل میں تمہارے خلاف کوئی غصہ یا کدورت نہیں ہے۔ تم پہلے بھی میرے مخلص ساتھی اور دوست تھے اور اب بھی ہو۔'' تھائیوں نے بھی نمبر ٹو کے ذریعے اپنی ندامت کا اظہار کیا۔ مزدور اور خچروں والے بھی آنکھیں جھکائے کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی شرمندگی نمایاں تھی۔ صرف شمس اور حمید تھے جو اپنی عمروں کے فرق کے باوجود کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ شمس لنگڑاتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا، ''آپ مجھے اس قبیلے کا سردار بنوا دیجیے۔ میں ساری مالائیں آپ کی نذر کر دوں گا۔ جتنی بڑی مصیبت اور مشکل میں، میں بلکہ ہم سب گرفتار ہوچکے تھے اس پر ندامت کا اظہار تو مجھے ٹھنڈا کرسکتا تھا لیکن شمس کی یہ بات سن کر میں اپنے غصے پر قابو نہ پاسکا۔ میں نے مکوں اور ٹھڈوں سے اسے پیٹنا شروع کیا تو اور اس وقت رکا جب قیصر اور اس کے دو ساتھیوں نے مجھے پکڑا اور کہا کہ اب بس کریں۔ اگر اسے اور مارا تو یہ مر جائے گا۔ پہلے ہی یہ ہمارے لیے بیکار ہوچکا ہے۔

بہتر ہے اسے یہیں سے رخصت کردیں۔ شمس نے قیصر کی تجویز سنتے ہی میرے پاؤں پکڑے اور گڑ گڑا کر کہنے لگا۔ ''خدا کے لیے مجھے اس حال میں یہاں نہ چھوڑ جائیں۔ میں تو سسک سسک کر مر جاؤں گا۔ یہ میزو جو آپ کے اسلحے کے خوف سے آپ کے تابعدار بنے ہوئے ہیں، مجھے اکیلا پا کر ہماری تکا بوٹی کردیں گے۔ یہ سب جھوٹ بک رہے ہیں کہ غیر ملکی عورت ان کی خواہش کے خلاف زبردستی سردار بنی ہوئی تھی۔ ان سے پوچھیں کہ دو سال کے عرصۂ سرداری میں ان کو کبھی بھی موقع نہیں ملا کہ سردار عورت اور اس کی چار چھ بھالا بردار محافظوں پر قابو پاسکیں۔ دراصل اتنی بلندی پر جنگلات میں رہنے والے ان میزوؤں کو سردار عورت نے آرام طلب اور بے غیرت بنا دیا ہے۔ سخت محنت و مشقت سے بمشکل دو وقت پیٹ کی آگ بجھانے والے یہ سخت جان لوگ اب صرف لوٹ مار اور اپنی عورتوں کو بالکل جنسی آزادی دے کر ان کی کمائی اور جنسی بے راہ روی پر چل رہے ہیں۔'' ''اور تم نے ان کا سردار بننے کی خواہش اس لیے ظاہر کی تھی کہ بے غیرتی اور عورت کی کمائی پر پلنے والوں کے چیف بن جاؤ۔'' میں نے شمس کی بات کا جواب دیا۔ ''جناب میں نے تو صرف مذاقاً یہ بات کی تھی۔'' شمس بوکھلایا ہوا بولا، ''حرام زادے! ہمارے درمیان مذاق کب سے شروع ہوا ہے اور گزشتہ رات جو شرمناک حرکت تم نے اور حمید نے کی تھی، کیا وہ بھی ایک مذاق تھا؟ صرف تم دونوں ہی نے نہیں بلکہ قافلے کے سارے لوگوں نے اس قدر بیہودہ اور گندی ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو دیکھ کر ہی مجھے گھن آنے لگی ہے۔ ہم سب کی جانیں انتہائی خطرے میں گھر چکی تھیں۔ صبح خود کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھ کر کیا تم لوگوں کو اپنے انتہائی پست کردار اور اس کے بھیانک انجام سے دوچار ہونے میں چند لمحوں کی کسر کا احساس ہوا ہے؟ کیا تم نے خود پر اور اپنے کردار پر لعنت بھیجی ہے؟ مجھ سے آنکھیں چرانے اور ندامت کا اظہار کرنے کے بجائے تم نے اب بے شک مذاقاً ہی سہی، مجھ سے ایسی بات کرنے کی جرأت کیسے کی؟'' میں مخاطب تو شمس سے تھا لیکن دل کا غبار سب پر نکال رہا تھا۔ قیصر اور اس کے ساتھیوں کے سر شرم کے احساس سے جھک کر ان کے سینوں سے آن لگے تھے۔ شمس پتھروں پر بار بار اپنا ماتھا پٹخ رہا تھا۔ میں نے سب ساتھیوں کو بہت زیادہ برا بھلا کہہ دیا تھا اور اب انہیں دلاسہ دینے کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنی آواز کو ذرا مدہم کرتے ہوئے کہا، ''جو کچھ ہوچکا ہے اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر میں بھول جانا چاہتا ہوں اور آپ سب بھی اس تمام واقعے کو قطعاً فراموش کردیں اور اس بات کو اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھالیں کہ ہم یہاں سیر و تفریح اور غلیظ قسم کی عیاشی کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ ایک دشوار گزار مہم ہے جسے ہم نے سر کرنا ہے۔ ابھی اس مہم کی منزل تک بھی ہم نہیں پہنچے ہیں اور دس بارہ لاشیں گر چکی ہیں اور گزشتہ رات تو ہم سب کی زندگی کی آخری رات بننے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی؟ آئندہ قیصر اور اس کے ساتھی مسلح حالت میں مجھے اپنے گھیرے میں رکھیں گے۔ شمس پہلے کی طرح تھائیوں اور سامان والے خچروں کے ساتھ

ہمارے آگے آگے ایک خچر پر سوار ہوگا اور مورنگ تھائیوں کے پیچھے اور ہمارے آگے چلیں گے۔

ان نئے انتظامات کے ساتھ ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ اب ہم نشیب میں جا رہے تھے۔ راستے میں اس چشمے میں دوسرے چشموں اور برساتی پانی نے شامل ہوکر ایک پہاڑی ندی کی صورت اختیار کرلی تھی۔ جنگل اب بہت زیادہ گھنا ہوچکا تھا۔ شام ڈھلنے سے پہلے ہی ہم نے ایک نسبتاً ہموار جگہ دیکھ کر کیمپ لگایا۔ دو مورنگوں کے ساتھ میں نے قیصر کے تین مسلح ساتھیوں کو جنگل میں بھیجا جو تھوڑی دیر میں ہی ایک ہرن مار لائے۔ کھانا کھا کر ہم نے سونے کی ٹھانی۔ اب تک کے سفر میں ہم بارش سے بچے رہے تھے لیکن اب آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ موسلا دھار بارش ہوگی۔ پہرے پر قیصر کے ساتھیوں اور تھائیوں کی ڈیوٹی لگا کر میں اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔ میں گزشتہ چالیس گھنٹوں میں ایک پل بھی نہیں سو سکا تھا۔ مجھے سوئے ہوئے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت گزرا ہوگا کہ ایک انتہائی خوفزدہ چیخ نے مجھے جگا دیا۔ سلیپنگ بیگ سے باہر آکر میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ قافلے کے باقی لوگ بھی جاگ اٹھے تھے۔ سونے کے باعث چیخ کی سمت کا کوئی بھی تعین نہ کرسکا۔ میں نے نمبر ٹو اور قیصر سے کہا کہ قافلے کے افراد کی گنتی کرو تاکہ معلوم ہوسکے کہ کون موجود نہیں ہے۔ ابھی گنتی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ ویسی ہی چیخ دوبارہ سنائی دی۔ یہ جنگل میں ہمارے قریب ہی سے آئی تھی۔ ٹارچوں کی روشنی میں ہم اس طرف بھاگے۔ ہم سے زیادہ سے زیادہ پچاس فٹ کے فاصلے پر شمس دکھائی دیا۔ ایک بڑے اژدھے کا کچھ حصہ اس کے جسم کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ شمس کے صرف دونوں بازو آزاد تھے جن سے وہ اژدھے کی گرفت سے نکلنے کی بیکار سعی کررہا تھا۔ اب حکم دینے یا لینے کا وقت نہیں تھا۔ مجھ سمیت میرے نمبر ٹو، قیصر اور اس کے دو تین ساتھیوں نے اژدھے کے سر اور اس حصے پر جس نے شمس کو گرفت میں نہیں لیا تھا، بیک وقت گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ شمس کی آنکھیں مسلسل کھلی ہوئی تھی اور اب اس کے بازوؤں کی حرکت بھی ختم ہوچکی تھی۔ اتنی گولیاں لگنے کے بعد بھی جب اژدھے نے کوئی حرکت نہ کی تو مورنگوں نے ہمیں فائر کرنے سے روکا اور اپنے بھالے تانے ہوئے اژدھے کے قریب گئے اور شمس کے جسم کو کھینچ کر اژدھے کی گرفت سے نکالا۔ اژدھا ہماری گولیاں لگنے اور ہلاک ہونے سے پہلے ہی شمس کے جسم کو اس بری طرح سے بھینچ چکا تھا کہ اس کی پسلیاں اور جسم کی دوسری ہڈیاں ٹوٹ کر چکنا چور ہوچکی تھیں اور اس کے مردہ جسم کے بازو اژدھے کی حرکت کے باعث ہل رہے تھے۔ ہم نے حمید کی اجازت سے شمس کو غسل دیا اور وہیں پر اس کی نماز جنازہ پڑھ کر اور بڑی مشکل سے ایک گڑھا کھود کر اس میں دفن کردیا۔ مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ اگر اتنی جلدی شمس نے ہم سے جدا ہوجانا تھا تو میں نے اسے کیوں مارا اور ذلیل و خوار کیا۔ شمس کی اس طرح سے موت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ حمید نے ہمیں بتایا کہ شمس حوائج ضروری سے فراغت کے لیے جنگل میں گیا تھا اور درخت کے

تنے جتنا موٹا اژدھا یقیناً اس جگہ پر ہی تھا جہاں شمس گیا۔ میں نے شمس کا ذاتی سامان اور گائیڈ بننے کا عوضانہ پانچ سو ڈالر حمید کو دیے۔ تھکے ہارے جب ہم اپنے سلیپنگ بیگز میں دوبارہ گئے تو پرندوں کے چہچہانے سے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ صبح ہورہی ہے۔ اب خاک نیند آنی تھی۔ بادل بھی بہت گہرے ہوچکے تھے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کے بعد یوں موسلا دھار بارش ہوئی کہ اللہ کی پناہ۔

یہ پورا دن اور رات ہم نے پڑاؤ پر ہی گزارا۔ شدید بارش کی وجہ سے ایک تو جنگل میں چلنا بہت دشوار تھا دوسری وجہ چشمے کی گزرگاہ تھی جس میں برساتی پانی اس قدر چڑھ آیا تھا کہ شور مچاتا اور پتھروں کو اکھیڑتا یہ پانی اب کناروں سے باہر بہہ رہا تھا۔ قارئین نے اگر پہاڑوں میں برساتی پانی یک لخت چڑھ آنے اور اس کی شدت دیکھی ہوگی تو انہیں بخوبی اندازہ ہوگا کہ ہمارے چشمے کی گزرگاہ کی کیا حالت ہوگی؟ بارش کے ساتھ ساتھ انتہائی کڑک دار بجلی چمکتی اور وقفے وقفے سے جنگل کے درختوں پر گرتی۔ اسی بارش اور آسمانی بجلی گرنے کے دوران زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے ایک قدرتی عمل دیکھنے کا بچشم خود موقع ملا۔ جنگل میں قسم قسم کے درخت اگے ہوئے تھے۔ ایک بار بجلی ہمارے قریب ہی ایک درخت پر گری۔ درخت کے کئی ٹہنے ٹوٹ کر گر گئے اور ان میں آگ بھڑک اٹھی جسے بارش نے جلد ہی بجھا دیا۔ چند ہی لمحوں میں ہوا میں ایک انتہائی خوشگوار خوشبو پھیل گئی۔ مورنگ خوشبو پھیلتے ہی اس درخت کی جانب بھاگے۔ میں یہ سمجھا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ ہم سب خیموں میں بیٹھے تھے جنہیں ہم ایسی ہی ناگہانی صورت میں بارش سے بچاؤ کے لیے ہمراہ لائے تھے۔ میں نے قیصر اور اس کے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور ہم سب مورنگوں کے پیچھے گئے۔ مورنگ اس درخت کے گرے ہوئے ادھ جلے ٹہنوں کی بڑی شاخوں کو کاٹ رہے تھے۔ ساری خوشبو انہی ٹہنوں سے آرہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی مورنگوں نے تمام چھوٹی بڑی شاخیں کاٹ کر اور ان کے جلے ہوئے پتے علیحدہ کرکے ان کے دو بڑے ڈھیر بنائے۔ وہیں سے دوسرے درختوں کی لمبی اور باریک شاخیں لے کر انہیں باندھا اور اٹھا کر میرے خیمے میں لے آئے۔ ان تمام شاخوں پر لاتعداد پھنسیاں سی نکلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے شاخوں کے یہ دو بڑے گٹھے مجھے یعنی اپنے وقتی سردار کو پیش کیے۔ مجھے ابھی تک ان کا مصرف سمجھ میں نہ آیا تھا۔ ان شاخوں سے ابھی تک خوشبو آرہی تھی اور یہ خوشبو مجھے خاصی مانوس محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک ہی مجھے یاد آیا کہ خن سا کا ڈرائنگ روم بھی ایسی ہی خوشبو سے مہکا ہوا تھا اور پھر دماغ کے آگے سے پردے ہٹتے گئے۔ عمر نے ایک روز مجھے بتایا تھا کہ کمپوچیا، تھائی لینڈ اور لاؤس کے جنگلات میں اکثر اور برما، آسام اور بنگلہ دیش کے جنگلات میں کہیں کہیں یہ مخصوص قسم کا عود رو درخت پایا جاتا ہے۔ اگر کبھی آسمانی بجلی اس درخت پر گر پڑے تو بڑے ٹہنے ٹوٹ کر گر جاتے اور آگ پکڑ لیتے ہیں۔ اگر بجلی گرتے وقت بارش بھی ہو رہی ہو تو بارش آگ تو بجھا دیتی ہے لیکن بجلی کی حدت سے شاخوں کا اندرونی رس ان کی جلد پر آکر پھنسیوں کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ یہ شاخیں

دنیا میں سب سے قیمتی لکڑی سمجھی جاتی ہیں اور اسے عود کہتے ہیں۔ مڈل ایسٹ کے حکمران اور امرا اس خوشبو کے دیوانے ہیں۔ سوکھنے پر یہ شاخیں 1976ء میں دس ہزار ڈالر میں ایک کلو کے حساب سے یہ حکمران اور امرا بخوشی خریدتے تھے۔ انہیں جب سلگایا جاتا ہے تو اس کی مسحور کن خوشبو ان کے محلوں میں پھیل جاتی ہے۔ جو شاخیں مورنگوں نے مجھے دی تھیں، سوکھنے کے بعد بھی ان کا وزن چالیس کلو سے زیادہ ہی ہونا تھا۔

دوسری رات کو بادل چھٹ گئے۔ صبح کی نکھری نکھری دھوپ میں یوں محسوس ہوتا تھا گویا جنگل نے غسل کیا ہے۔ ہمارا قافلہ صبح نو بجے ہی مگھ قبیلے کی جانب روانہ ہوگیا۔ چشمے کا پانی اب اچھی خاصی بڑی ندی کی صورت اختیار کر چکا تھا اور پہاڑ کی ڈھلوان کی جانب لہراتا، بل کھاتا کبھی نظروں سے بالکل غائب ہو کر یکایک سامنے آجاتا۔ یونہی ایک بار جب غائب ہوا چشمہ سامنے نظر آیا تو مورنگوں نے اشارے سے ہمیں بالکل خاموش رہنے اور بیٹھ جانے کو کہا۔ ہمارے سامنے ہی دس بارہ ہاتھی ایک قطار میں اگلے ہاتھی کی دم کو اپنی سونڈ سے پکڑے چشمے کو کراس کر رہے تھے۔ دو نر ہاتھی قطار سے علیحدہ چلتے ہوئے دو بچے ہاتھیوں کی نگرانی کر رہے تھے جو شرارتیں کرتے اور اپنی سونڈوں میں پانی بھر کر ایک دوسرے پر اچھالتے قطار سے دُور ہو جاتے۔ مجھے بعد میں سندربن میں ''کھیدا'' (جنگلی ہاتھیوں کے غول کو پکڑنے کا دلچسپ طریقہ جس کا ذکر آگے آئے گا) کے دوران بتایا کہ جنگلی ہاتھی اگر کسی انسان کو اچانک دیکھ لیں تو اس پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ہاتھیوں کے گزرنے کے کافی دیر بعد تک ہم اپنی جگہوں پر دبکے رہے۔ اب ہمارا قافلہ مگھ قبیلے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا کیونکہ نقارے ایک خاص انداز سے بجا کر ہماری آمد کی اطلاع دی جا رہی تھی۔ مگھوں کے ایک قریبی گاؤں کے لوگ چشمے کے دوسرے کنارے پر آکر ہمیں دیکھنے لگے۔

مورنگوں نے انہیں اپنی زبان میں کچھ بتایا۔ اب مگھ چشمے کے دوسری طرف ہمارے متوازی چل رہے تھے۔ کچھ آگے جا کر ایک جگہ وہ رک گئے۔ وہاں پر چشمے کا پاٹ خاصا چوڑا اور پانی نسبتاً کم گہرا تھا۔ وہیں سے ہم نے چشمے کو عبور کیا اور اب مگھ اور مورنگ ہمارے آگے آگے ہمیں اس گاؤں میں لے جا رہے تھے جہاں ان کے سردار کی رہائش تھی۔

شام کے چھ بجے ہوں گے جب ہم سردار کے گاؤں میں داخل ہوئے۔ اس قبیلے کے مرد اور عورتیں ستر پوشی کے لیے جانوروں کی کھالوں کے ٹکڑے باندھے ہوئے تھے۔ ان کے جھونپڑے بھی کھالوں سے ڈھنپے ہوئے تھے۔ سردار کا خیمہ گاؤں کے بیچ میں سب سے بڑا اور نمایاں تھا۔ اس کے خیمے کے سامنے کھلی جگہ پر ہمیں پڑاؤ کرنے کا کہا گیا۔ خچروں پر سے اسباب اُتارا گیا تو میں نے سردار اور اس کی رانیوں کے لیے خریدے نقلی موتیوں کے ہار، سگار اور سگرٹ وغیرہ نکال کر علیحدہ کر دیے۔ ٹن فوڈ بھی ہمارے پاس خاصی مقدار میں تھا کیونکہ مورنگوں کو تو یہ تحائف دینے کی نوبت ہی نہ

آئی تھی۔ اس قبیلے کی عورتیں بھی مورنگ عورتوں سے اخلاقی طور پر بہت بہتر تھیں انہوں نے جسموں کا اوپری حصہ پتوں کی بیلوں سے ڈھانپا ہوا تھا۔ صرف بچوں کو دودھ پلاتے وقت وہ کوئی جھجک وغیرہ محسوس نہیں کرتی تھیں۔

سورج غروب ہوتے ہی گاؤں کے باسی مشعلیں روشن کیے سردار کے خیمے اور ہمارے پڑاؤ کی جگہ کے درمیان قطاروں میں بیٹھ گئے۔ مورنگ گائیڈوں کے ذریعے سردار کو ہمارے متعلق مفصل اطلاعات یقیناً مل چکی ہوں گی۔ اسی لیے ہمارے لیے تین زندہ مرغ لائے گئے۔ قیصر کے ساتھیوں نے انہیں ذبح کر کے آگ پر بھونا اور کھانے کے بعد انہوں نے ہم سب کے لیے چائے بنائی۔ ابھی ہم کھانے پینے سے بمشکل فارغ ہوئے تھے کہ مگھ سردار اپنے خیمے سے برآمد ہوا۔ اس کے دائیں بائیں اس کی دو رانیاں اور پیچھے بھالے بردار محافظ تھے۔ سردار نے اپنے تخت پر بیٹھ کر اپنے قریب کھڑے ایک ادھیڑ عمر مگھ کو جو اپنے پہناوے سے اس کا مشیر لگ رہا تھا، کچھ کہا۔ مشیر سیدھا میرے پاس آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سردار کے پاس لے جانا چاہا۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ میں نے آہستگی سے قیصر کو جو میرے قریب ہی کھڑا تھا کہا کہ اپنے ساتھیوں کو کہے کہ اپنے ہتھیاروں پر ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر لیں اور خود وہ اور میرا نمبر ٹو سردار کے لیے لائے گئے تحائف اٹھا کر میرے پیچھے آئیں۔ ہم سردار کے پاس پہنچے تو سردار نے کھڑے ہو کر اپنا بازو میرے دائیں کندھے کے جوڑ پر رکھ دیا۔ میں نے بھی بالکل اسی طرح کیا۔ یہ غالباً اس قبیلے کا گرمجوشی سے ہاتھ ملانے کا طریقہ تھا۔ میں نے سردار کو تحائف پیش کیے جنہیں اس نے خوش دلی سے قبول کیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ سردار نے گفتگو کرنے کے لیے ایک یا کئی مترجموں کی ضرورت پڑے گی کہ سردار نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''خوش آمدید اور تحائف کے لیے بے حد شکریہ۔ میں اپنے والد سردار کی زندگی میں کچھ عرصے تک چٹاگانگ کے ایک سکول میں پڑھتا رہا ہوں اور انگریزی زبان سے بالکل ہی نابلد نہیں بلکہ آسان الفاظ میں سمجھ سکتا اور اپنا مافی الضمیر بھی بیان کر سکتا ہوں۔'' اس نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس کے لیے تخت پر اس کی دونوں رانیاں ذرا کھسک گئیں اور میں سردار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ قیصر اور میرے نمبر ٹو تھائی جو ابھی تک ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ مشیر نے دو مونڈھے پیش کیے جن پر وہ مشیر کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

سردار نے چند رسمی باتوں کے بعد مورنگ قبیلے کی بات چھیڑتے ہوئے کہا، ''اس جلاد اور وحشی عورت سے قبیلے والوں کی جان چھڑوا کر تم نے نہ صرف اس قبیلے پر بلکہ ہم پر بھی احسان کیا ہے۔ مورنگ ہمارے قبیلے سے بہت چھوٹا لیکن ہمارا دوست قبیلہ ہے۔ اس عورت نے اپنے سردار شوہر کو قتل کر کے ہمارے ساتھ بھی اپنے قبیلے کے تعلقات ختم کر دیے تھے۔ تمہارے ہمراہ آنے والے مورنگوں نے بتایا مگر انہوں نے اپنا سردار چننے کے لیے میرا نام تجویز کیا ہے اگر تم ساری مالائیں، تکونا یاقوت اور تاج

مجھے دے دو تو میں کسی مناسب مورنگ کو ان کا سردار چن لوں گا۔" سردار نے مجھ سے ملنے کے چند منٹ بعد ہی مجھ سے مورنگ قبیلے کے سردار کی پہچان کی نشانیاں مانگ لی تھیں۔ اس کی اس قدر عجلت نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ اپنے محکمے میں ٹریننگ کے دوران مجھے سکھایا گیا تھا کہ مفروضوں میں ہی حقائق چھپے ہوتے ہیں اس لیے انھیں یکسر نظر انداز نہ کرو۔ میں نے سردار کو کہا، "سردار عورت کو ہلاک کرنے کے باعث مجھ پر بھی مورنگ قبیلہ کی کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس رسم کو ہم کل کے لیے ملتوی کر دیں۔ ویسے بھی آج رات ہم آپ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوں گے۔"

شاید میری بات سردار کی توقع کے خلاف تھی۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور ماتھے پر تیوریاں پڑیں لیکن فوراً ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا "بے شک! آپ ہمارے مہمان ہیں اور آپ کی خاطر تواضع اور تفریح طبع کے لیے ہم کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ مورنگ سردار کا چناؤ تو بعد میں ہوتا رہے گا۔ میں تو چاہتا ہوں آپ چند روز یہیں رہیں اور اپنے سفر کی تھکاوٹ اتاریں۔" سردار نے یہ کہہ کر اپنے مشیر کو اپنے قریب بلایا اور اسے کچھ ہدایات دیں۔ مشیر قبیلے کی دس بارہ عورتیں اور اتنی ہی تعداد میں مرد اپنے ہمراہ لے کر خیموں کی طرف چلا گیا۔ ادھر سردار سے چند منٹوں کے لیے اجازت لے کر میں نے قیصر اور نمبر ٹو کو اشارہ کیا اور وہ میرے ساتھ ہی خچروں کی طرف آ گئے۔ میں نے ان دونوں کو کہا مجھے سردار کی نیت ٹھیک دکھائی نہیں دیتی۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہی ہو لیکن احتیاطاً اپنے تمام ساتھیوں کو کہہ دیں کہ اپنا تمام اسلحہ اور گولیاں اپنے پاس تیار حالت میں رکھیں اور ان کی دی ہوئی کھانے پینے کی کوئی شے بھی ہرگز استعمال نہ کریں۔ نمبر ٹو کو میں نے خصوصی ہدایت دی کہ اگر قبیلے والے تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو شراب پیش کریں تو اوّل تو شراب نہ پیو اور اگر بہت جی چاہے تو جام پہلے پیش کرنے والوں کو پلاؤ اور پھر خود بعد میں پیو۔ نمبر ٹو نے میری بات سن کر کہا، "جناب! ہم پہلے ہی بہت شرمندہ ہیں اور اگر آپ نہ بھی کہتے تو ہم ان کی دی ہوئی کوئی چیز بھی استعمال نہ کرتے۔ آپ بے فکر رہیں، ہم ہر ممکن احتیاط کریں گے اور ہر دم چوکنا رہیں گے۔" میں ان دونوں کو ہدایات دے کر سردار کے پاس واپس لوٹ آیا اور چند منٹوں میں قیصر اور نمبر ٹو بھی اپنے ساتھیوں تک میرا پیغام پہنچا کر اپنے مونڈھوں پر آن بیٹھے۔ میری غیر موجودگی میں سردار کی دو رانیاں بھی اپنے خیموں میں جا چکی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ہی بہت ساری لکڑیاں میدان میں ہمارے سامنے ڈھیر کر کے الاؤ روشن کیا گیا اور تین نقارے الاؤ کی دوسری طرف بجنے لگے۔ تین مگھ مرد ایک بڑا مٹکا اٹھا کر لائے اور سردار سے قدرے فاصلے پر رکھ دیا۔ مٹکا کسی سیال شے سے بھرا ہوا تھا۔ چند لمحوں میں ہی پندرہ مگھ عورتیں اپنے چہروں اور بازوؤں پر مختلف رنگوں سے سجاوٹ کر کے آ گئیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک خالی جام تھا، وہ سب سردار کے سامنے اکڑوں بیٹھ گئیں۔ ان کے

پیچھے ہی پندرہ مگھ مرد بھی آ گئے۔ ان کے جسموں اور چہروں پر بھی مختلف رنگوں سے لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں ٹولیاں سردار کے سامنے ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ دونوں رانیاں بھی رنگوں سے چہرے سجائے اور جام تھامے خیمے سے باہر آئیں اور تخت پر ہمارے ساتھ بیٹھ گئیں۔ سرادر نے کھڑے ہو کر اپنی زبان میں کچھ کہا۔ دونوں رانیوں نے مٹکے سے ایک ایک جام بھر کر زمین پر پھینکا۔ یہ ایک طرح سے اجازت نامہ تھا کہ شروع ہو جاؤ۔ مگھ عورتوں نے مٹکے سے جام بھر کر میرے ساتھیوں کو پیش کیے۔ ان کے انکار کرنے پر خود جام میں سے تھوڑا سا پیا اور پھر جام میرے ساتھیوں کو پیش کیا۔ اب بھی انھوں نے انکار کیا تو انھوں نے یہی جام اپنے مردوں کی ٹولی کو دیئے جو غٹا غٹ پی گئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے رویے کے بارے میں سردار کو کہا کہ مورنگ قبیلے میں پیش آنے والے حالات کے باعث میرے ساتھیوں نے عہد کیا ہے کہ شراب ہرگز نہیں پئیں گے اور میں بھی اس عہد میں شامل ہوں۔ سردار جو میرے ساتھیوں کے شراب نہ لینے کے باعث حیران ہو رہا تھا، بولا، "تم نے اچھا کیا کہ مجھے اس بات سے پہلے ہی آگاہ کر دیا، ورنہ میری رانیوں کی پیش کردہ شراب پینے سے اگر تم انکار کر دیتے تو یہ میری اور میری رانیوں اور قبیلے کی سخت توہین سمجھی جاتی۔" رانیاں اس دوران اپنے خاص مشکیزے سے دو جام بھر چکی تھیں۔ سردار نے انھیں میرے نہ پینے سے متعلق بتایا اور رانیوں نے دونوں جام سردار کو پیش کیے، جنھیں وہ یکے بعد دیگرے چڑھا گیا۔

نقاروں کے تال میں اب تیزی آ چکی تھی۔ سردار کے اشارے پر دونوں ٹولیاں کھڑی ہو گئیں اور اپنی زبان میں ہاؤ ہو اور نہ معلوم کیا گاتے ہوئے ناچنا شروع کر دیا۔ ان کی زبان میرے قطعاً پلے نہیں پڑی لیکن نقاروں کی ردھم پر ان کی ہم آہنگی اور ایک جیسی جسمانی حرکات یقیناً قابل داد تھیں۔ الاؤ کی دہکتی آگ کے لرزتے شعلوں کے عکس میں ان کے تھرکتے ہوئے جسم بڑا پر کیف سماں پیدا کر رہے تھے۔ سردار نے دو جام اور چڑھائے اور اپنی رانیوں کے ساتھ خود بھی رقص میں شامل ہو گیا۔ میرے تھائی ساتھی للچائی ہوئی نظروں سے شراب کے مٹکے کو دیکھ رہے تھے جس میں سے رقص کرنے والی ٹولیاں وقفے وقفے سے جام بھر کر پی رہی تھیں۔ یہ ہنگامہ رات کے پچھلے پہر تک جاری رہا۔ رقص ختم ہوا تو میں نے اور میرے ساتھیوں نے دل کھول کر داد دی اور میں نے سردار کا شکریہ ادا کیا۔ جس نے ہمارے اعزاز میں اس جشن کا اہتمام کیا تھا۔ شب بسری کے لیے سردار نے مجھے اپنے خیمے کے قریب ہی ایک خیمہ دیا جو یقیناً اس کی دو رانیوں میں سے کسی ایک کا تھا۔ خیمے میں گھاس پھوس سے بنے بستر پر چادروں کے بجائے جانوروں کی کھالیں بچھی تھیں اور ایک مشعل روشن تھی۔ مجھے خیمے تک پہنچانے کے لیے ایک رانی آئی تھی۔ ایک تھائی، میر ذاتی سامان جس میں مالائیں اور تاج کے علاوہ دو سب مشین گنیں تھیں، خیمے میں چھوڑ گیا۔ میں نے اپنے بیگ میں سے سلیپر اور رات کو پہننے والے کپڑے نکالے اور سر جھکا کر رانی کا شکریہ ادا کیا کہ وہ جائے تو میں کپڑے وغیرہ

تبدیل کرسکوں لیکن رانی جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں نے اشاروں سے اسے بتایا کہ مجھے کپڑے تبدیل کرنے ہیں تو وہ میری جیکٹ کے بٹن کھولنے لگی۔ میں نے یہ گمان کرتے ہوئے کہ اس نے میرے اشاروں کا صحیح مطلب نہیں سمجھا، اسے بازو سے پکڑ کر خیمے سے باہر لے جانا چاہا تو وہ ایک دم میرے پاؤں پر گر گئی اور اشاروں سے مجھے بتایا کہ اگر وہ صبح ہونے سے پہلے خیمے سے باہر گئی تو سردار اسے قتل کردے گا۔ یہاں بھی کم و بیش مورنگوں والے رسم و رواج تھے۔ مہمان کی عزت افزائی کے لیے قبیلے کی کسی عورت اور اگر کوئی وی وی آئی پی ہو تو رانی کو پیش کیا جاتا تھا۔ میری جان عجیب مصیبت میں تھی۔ گزشتہ دنوں سے پے در پے ایسے واقعات پیش آ رہے تھے جو بظاہر جذبات کو بھڑکانے والے اور تسکین آمیز محسوس ہوتے تھے لیکن جن کا انجام انتہائی بھیانک اور ناخوشگوار ہوتا تھا۔ تھکاوٹ سے میرا جسم چور ہو رہا تھا اور آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں بستر پر بچھی وہ کھالیں اٹھا کر خیمے کے ایک کونے میں چلا گیا اور رانی کو کہا کہ وہ بستر پر سوجائے۔ میں نے دونوں سب مشین گنیں اپنے سرہانے رکھیں اور پسٹل ہاتھ میں پکڑ کر لیٹ گیا۔ رانی نے میرا یہ انداز دیکھا تو میرے قریب آکر بیٹھ گئی اور صاف انگریزی میں بولی، ”مسٹر! مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم میرے ساتھ سوتے ہو یا علیحدہ۔ البتہ سردار نے مجھے جو کام سونپا ہے اگر میں اسے سر انجام نہ دے سکی تو وہ میرا حشر برا کردے گا۔“ رانی کو انگریزی بولتے سن کر میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا اور میری نیند یک لخت کوسوں دور بھاگ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں چاروں طرف سے خطرات میں گھر چکا ہوں۔ بڑا ہی منحوس دن تھا جب ہم برما میں داخل ہوئے۔ ہر روز ایک سے ایک انوکھا واقعہ ہمیں پیش آرہا تھا۔ لاشوں پر لاشیں گرتی جارہی تھیں۔ دشمنوں کی بھی اور اپنے ساتھیوں کی بھی۔ کبھی انسان درندوں کے روپ میں سامنے آتے، کبھی شیطان جادوگرنی کے ذریعے بہکاتا، کبھی بھارتی فوجی، ناگا، میزو اور مورنگ قبائل ہماری راہ میں حائل ہوتے، کبھی جنگلی درندے اور اژدھے، سانپ اور بچھو ہم پر وار کرتے اور کبھی سازشوں کے جال ہمارے چاروں طرف بنے جاتے۔ مجھے اگر راولپنڈی سے روانگی کے وقت ایسے حالات سے دوچار ہونے کا ذرا سا شائبہ بھی ہوتا تو میں کانوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے راجا تری دیو رائے سے معذرت کرلیتا۔

میں نے پسٹل رانی کی طرف کرتے ہوئے کہا، ”تم انگریزی جانتی ہو تو یقیناً یہ بھی جانتی ہوگی کہ میں نے ہاتھ میں لوہے کا جو ٹکڑا پکڑا ہوا ہے، اسے پسٹل کہتے ہیں اور اس کی نال پر جو شے لگی ہوئی ہے اسے سائلنسر کہتے ہیں جس سے پسٹل چلنے کی آواز نہیں آتی۔ ایک بات شاید تم نہیں جانتیں کہ اس پسٹل کی گولیاں دو بار چلتی ہیں۔ ایک بار پسٹل سے چلتے وقت اور دوسری بار اپنے ٹارگٹ کو لگنے کے بعد پھٹتی ہیں۔ یہ مشین گنیں ایک منٹ میں 270 گولیاں فائر کرسکتی ہیں اور آخری بات یہ کہ میں آج تک بھارت، تھائی لینڈ، برما، آسام اور ناگا، میزو اور مورنگ قبائل میں اتنے لوگوں

کو ہلاک کرچکا ہوں جن کی تعداد بھی مجھے یاد نہیں، میرا اصول ہے کہ میں گولی پہلے چلاتا ہوں اور سوچتا بعد میں ہوں۔ تم نے مجھے چونکہ خود ہی کسی خاص مقصد سے اس خیمے میں میرے پاس آنا بتایا ہے، اس لیے میں چاہوں گا کہ تم مجھے تفصیلاً اپنے متعلق اور یہاں آنے کے مقصد کے متعلق بتاؤ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ تمھاری ناکامی پر سردار تو تمھیں شاید چھوڑ دے لیکن اگر میں تمھاری باتوں سے مطمئن نہیں ہوا تو اس پسٹل کی ساری گولیاں تمھارے جسم میں ضرور داخل کردوں گا۔“

میری باتیں سن کر رانی خوف سے کانپنے لگی۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس تیئس برس ہوگی اور شکل و صورت سے بھی اس کا چہرہ اس قبیلے کے خد و خال سے مختلف تھا۔ اس نے خوف سے اٹکتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ”میں آپ کو اپنے متعلق اور آج رات سونپے گئے مشن کے متعلق بالکل صحیح بتاؤں گی۔ اگر سچ میں کوئی طاقت ہے تو آپ کو میری باتوں پر یقین آجائے گا۔ دوسری صورت میں مجھے موت کا غم اس لیے نہیں ہوگا کہ میں پہلے ہی اس زندگی کو موت سے بدتر سمجھتی ہوں۔ میرا نام کلپنا ہے اور میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ میرے پتا بڑے مشہور Archaeologist (قدیم تعمیرات کی تحقیق اور کھدائی کرنے والا) تھے۔ ہم دارجلنگ کے رہنے والے ہیں۔ میرے پتا آج سے تقریباً پانچ سال پہلے بمبئی کے قریب ایلیفنٹ کے جزیرے میں کوروؤں کے زمانے کی تعمیرات پر تحقیق کررہے تھے کہ سردار بھوشن سے ان کی ملاقات ہوئی۔ سردار بھوشن نے انھیں بتایا کہ اس کے قبیلے مکھ اور ہمسائے قبیلے مورنگ پر آج سے پانچ سات پشت پہلے دو جڑواں بھائیوں کی حکومت تھی۔ ان کے والد نے جواہرات کا ایک بہت بڑا خزانہ کہیں دفن کرکے یاقوت کے دو تکونے ٹکڑوں پر نقشہ کندہ کرکے ایک ایک ٹکڑا دونوں بھائیوں کو دے دیا تھا، بعد میں ان جڑواں بھائیوں کی اولاد میں اختلافات پیدا ہوگئے اور نفرتیں یہاں تک پہنچ گئیں کہ دونوں سرداروں کی اولاد ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہوگئی۔ خزانے تک پہنچنے کے لیے دونوں یاقوتی تکونوں کی ایک ساتھ موجودگی ضروری تھی تاکہ اِن پر کندہ پورا نقشہ سامنے آجائے۔ میرے پتا ایک مہم جو اور نڈر شخص تھے، انھوں نے سردار بھوشن کا تکونی یاقوت دیکھا اور اس پر کندہ آدھا نقشہ دیکھ کر کہا ”میں کوشش کروں گا اور اس آدھے نقشے اور علاقے کی صورتِ حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے خزانے تک پہنچ جاؤں۔ سردار بھوشن نے میرے پتا کو خزانے کا چوتھائی حصہ دینے کا لالچ دیا اور میرے پتا میرے اور میری ماتا کے ہمراہ یہاں چلے آئے۔ پتا جی نے دو ماہ سے زیادہ عرصہ خزانے کی تلاش میں صرف کیا لیکن ناکام رہے۔ سردار بھوشن کی ہر صبح امید کے ساتھ شروع ہوتی اور ہر شام مایوسی میں ڈھل جاتی۔ خزانے کی تلاش کا چرچا سارے قبیلے میں پھیل چکا تھا۔ ایک روز جب تھک ہار کر پتا جی نے اپنی ناکامی کی خبر سنائی تو سردار بھوشن نے غصے میں میرے پتا اور ماتا کو قتل کردیا اور مجھے زبردستی اپنی بیوی بنالیا۔ میں نے یہاں سے کئی بار بھاگنے کی کوشش کی لیکن ہر بار پکڑی گئی اور اس جرم میں بے انتہا جسمانی اذیت سہنا پڑی۔

سردار بھوشن نے مورنگ غیر ملکی سردار عورت کو بھی خزانے کا حصہ دینے کا لالچ دیا تھا اور چند روز وہ اور زندہ رہتی تو سودا طے ہوجاتا۔ اس کے مرنے کے بعد جو مورنگ آپ کو یہاں لائے ہیں، وہ سردار بھوشن کے جاسوس اور حامی ہیں۔ سردار بھوشن انہی میں سے کسی کو سردار چن کر مورنگوں کا یاقوت لے لیتا، اب وہ یاقوت آپ کے پاس ہے اور سردار نے مجھے رات آپ کے ساتھ گزارنے کے لیے اس لیے بھیجا ہے کہ آپ کو خوش کر کے یا تو وہ یاقوت خود حاصل کرلوں یا آپ کو قائل کروں کہ آپ صبح وہ یاقوت سردار کو دے دیں۔ یاقوت کے حصول کے لیے سردار آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہلاک کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا، اگر مورنگ اسے یہ نہ بتاتے کہ آپ کے پاس فائر آرمز ہیں۔ مجھے بھی سردار نے کہا ہے کہ اگر میں یاقوت آپ سے لینے میں کامیاب ہوگئی تو وہ مجھے آزاد کردے گا۔ یہ ہے میری داستان۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ اس پر یقین کرتے ہیں یا نہیں۔" یہ کہہ کر کلپنا خاموش ہوگئی اور میں آنے والے خطرات سے نمٹنے کے طریقوں کی سوچ میں غرق ہوگیا۔

حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں اب یا صبح تکونا یاقوت سردار بھوشن کے حوالے کردیتا۔ وہ جسے چاہتا مورنگ قبیلے کا سردار بناتا اور خزانہ اسے ملتا نہ ملتا، اس سے ہمارا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ہم پہلے ہی اچھی خاصی مشکلات کا سامنا کرچکے تھے اور ہماری اصل مہم کی منزل یعنی چکمہ قبیلے کا صدر مقام رانگا ماٹی یہاں سے صرف دو دنوں کی مسافت پر تھی۔ ہمیں وہاں جلد از جلد پہنچنا اور سردار کی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ جواہرات لے کر واپس لوٹنا چاہیے تھا۔ میری ذہنی حالت یہ تھی کہ میں مہم کے سر کرنے کی حد تک تو واقعی جلدی میں تھا اور چاہتا تھا کہ راجا تری دیو سے کیا ہوا وعدہ پورا کروں اور اس کی امانتیں اس تک بخیر و خوبی پہنچادوں۔ جہاں تک خود اپنے واپس گھر جانے کی خواہش تھی تو یقین جانیے میں واپس جانے کے خیال سے ہی لرز اٹھتا تھا اگر مجھے اپنے گھر اور گھر والوں سے خوشی اور سکون حاصل ہوتا تو میں اس مہم پر آتا ہی کیوں؟ گھر میں اگر سکون اور خوشی میسر ہو تو وہ مانند جنت ہوتا ہے اور اگر حالات اس کے برعکس ہوں تو جہنم سے بھی بدتر۔ گھریلو زندگی بلکہ صاف الفاظ میں ازدواجی زندگی سے متعلق میرے تمام خواب، خواہشات اور امنگیں چکنا چور اور ملیا میٹ ہوچکی تھیں۔ بھارت میں ساڑھے تین سالہ قیام اور واپسی پر چند ماہ کے بعد ہی اس مہم پر نکل پڑنا میرا گھریلو حالات کی سنگینی سے مقابلہ نہ کرسکنے اور ان سے فرار ہونے کی کیفیت تھی۔ میرے تحت الشعور میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ میں اپنے گھر کے ظلمت کدہ سے جب تک اور جتنا بھی دور رہوں، میرے لیے بہتر ہوگا، کلپنا کی داستان انوکھی یا نئی نہ تھی بلکہ ہزاروں لاکھوں بار دہرائی ہوئی تھی۔ Might is Right ازل سے طاقتور کا اصول رہا ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کے یہ عالیشان مقبرے، ان کی نمائشی محبت کے شاہکار تاج محل، یہ اہرامِ مصر اور دیوار چین جیسی حیران کن تعمیرات میں چھپے ان حکمرانوں کے جاہ و جلال، ملکی دولت سے بھرے خزانوں پر ان کی دسترس اور غریبوں کی زندگی اور

خون پر ان کا مکمل اختیار ہونے کے حقائق چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ صرف طاقت ہی سچائی ہے۔ آج کے دور میں اگر ان جیسے حکمرانوں کا عوام یا کوئی صحیح متبادل طاقت محاسبہ کرتی ہے تو یہ حکمران حیران ہوکر پوچھتے ہیں کہ جب تاج محل اور جہانگیر کا مقبرہ بنانے والے شاہجہاں کا محاسبہ نہیں کیا گیا تو ہمارے سرے محل اور رائے ونڈ کے محلات کیوں ان کی نظروں میں کھٹکتے ہیں، ملکی بینکوں کا سارا روپیہ کھانا تو ہمارا پیدائشی حق تھا۔ شاہجہاں کو بادشاہت تو باپ سے ورثے میں ملی تھی لیکن ہم تو پوری قوم کے ڈالے گئے 18 فیصد سے بھی کم ووٹوں سے انجینئرڈ الیکشن میں دو تہائی ووٹوں کا "بھارتی مینڈیٹ" حاصل کر کے ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن چکے ہیں۔ ان خاکی وردی والوں کی اتنی مجال کہ ہمیں وزیراعظم ہاؤس سے نکال کر جیل میں ڈالا اور ہماری بدعنوانیوں کے متعلق پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ ہمارا "بھاری مینڈیٹ" ہمیں پوری اجازت دیتا ہے کہ ہم جو چاہیں کریں۔ فوج کے سربراہ کے جہاز کو اترنے دیں یا دوسرے 200 مسافروں سمیت فضا میں ہی بھسم کردیں، ہم طاقت ہیں۔ ہمارا بھاری مینڈیٹ سب سے افضل ہے۔ ہم آج بھی وزیراعظم ہیں اور زندگی کے آخری سانس تک وزیراعظم ہی رہیں گے۔ سردار بھوشن نے تو کلپنا کو زبردستی اپنی رانی بنایا تھا۔ اپنے گرد و پیش میں دیکھیں، آپ کو ہزاروں لاکھوں کلپنائیں ملیں گی جنھیں آہ بھرنے کی بھی اجازت نہیں اور جو سسک سسک کر زندگی کے سانس پورے کررہی ہیں۔ یہ جاگیردار، یہ وڈیرے، یہ سردار یہ سب طاقت ہیں اور ان کا ہر کام جائز۔ ان کی حویلیوں؟ اور اونچی دیواریوں کے اندر سینکڑوں ہزاروں کلپنائیں موجود ہیں۔ تہمینہ درانی اور ناہید اختر جیسی ہزاروں ہیں جن کی آہیں اور سسکیاں ان اونچی دیواروں کے اندر ہی دب کر رہ گئیں۔

میں نے کلپنا سے کہا کہ وہ بستر پر سوجائے اور صبح سردار بھوشن سے کہے کہ اس نے مجھے اس بات پر رضامند کرلیا ہے کہ تکونا یاقوت سردار کے حوالے کردوں۔ صبح میں اپنے ساتھیوں کے مشورے سے آئندہ کے لائحۂ عمل کا فیصلہ کروں گا۔ میں نے کلپنا سے پوچھا کہ کیا دارجلنگ میں اس کے عزیز و اقارب اسے ان حالات سے گزرنے کے بعد قبول کرلیں گے۔ کلپنا نے کہا کہ اس کے پتا کی ملکیت ایک کوٹھی، چائے کا ایک کارخانہ اور چائے کے چھ کھیت ہیں اور اب وہی ان سب کی مالک ہے۔ علی الصبح ہی کلپنا سردار کے خیمے میں چلی گئی۔ دن چڑھے میں خیمے سے باہر نکلا اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوکر قیصر اس کے ساتھیوں کو الگ لے جاکر رات کا سارا واقعہ سنایا۔ سب نے یہی کہا کہ اگر ہماری اصل مہم میں مکھ سردار سے دو، دو ہاتھ کرنا حارج نہ ہو تو ہمیں نہ صرف کلپنا کی مدد کرنا چاہیے بلکہ سردار بھوشن کا تکونا یوسف بھی کسی نہ کسی صورت حاصل کر کے خزانے کو تلاش کرنا چاہیے۔ میں نے محسوس کیا کہ قیصر کلپنا کی طرف داری میں دوسروں سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے کریدنے کی غرض سے علیحدہ لے جاکر پوچھا کہ کیا کلپنا میں اس کی خاص دلچسپی کی کوئی

وجہ ہے۔"جی ہاں، بہت خاص! میری ایک بہن جو آغازِ جوانی میں ہی مرگئی تھی، کلپنا کی ہم شکل تھی، کل رات اسے دیکھتے ہی مجھے اپنی بہن یاد آگئی اور آپ سے اس کی داستان سن کر ہمدری کے جذبات امڈ آئے۔ علاوہ ازیں آپ جانتے ہیں کہ بھارت میں ہماری مالی حالت باوجود سخت محنت اور کوشش کے بہتر نہیں ہو پاتی ہندوؤں کی تنگ نظری کے باعث مسلمان وہاں دوسرے درجے کے شہری سمجھے جاتے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ہم پر بند ہیں، ہمیں فوج میں بھی بھرتی کرنے سے بھارتی حکومت کتراتی ہے اور شاذ و نادر ہی کسی مسلمان کو فوج میں کمیشن دیا جاتا ہے۔ گیرج کی حالت اگرچہ پہلے سے بہتر ہے لیکن ان تمام لڑکوں کے ضروری اخراجات بھی بہ مشکل پورے ہوتے ہیں۔ میں نے ان تمام لڑکوں کو بتادیا تھا کہ جس مہم کے لیے آپ نے ہمیں بلایا ہے اس میں ہماری جانیں بھی جاسکتی ہیں اور آپ ہمیں اس پرائیویٹ مہم کا خرچہ بھی دیں گے۔ پیسوں کے لالچ میں ہی یہ سب آئے ہیں۔ اب اگر یہ خزانہ بھی مل جائے تو یقیناً ان سب کو آپ کچھ حصہ بھی دیں گے۔ اس لیے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہمیں خزانے کے حصول کی کوشش ضرور کرا چاہیے۔" میں خود بھی چاہتا تھا کہ اگر بالکل ہی ناممکن نہ ہو تو جہاں ہم سب اصل مہم کے لیے اتنا رسک لے رہے ہیں، وہاں خزانے کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔

دوپہر کے تقریباً بارہ بجے سردار نے مجھے اپنے خیمے میں طلب کیا اور مالاؤں، تاج اور یاقوت کا ذکر چھیڑ کر کہا کہ اب مورنگ سردار کا چناؤ ہوجانا چاہیے۔ کلپنا نے اسے میرے متعلق اتنا کچھ یقین دلا دیا تھا کہ وہ اب مجھ سے یاقوت کا حصول بہت آسان اور طے شدہ بات سمجھ رہا تھا۔ سردار نے مجھ سے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا کہ"کیا گزشتہ رات میرا بھیجا ہوا تحفہ تمھیں پسند آیا؟" میں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا،"بہت ہی اعلیٰ اور Co-Operative تحفہ تھا اور میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آج رات پھر اسی تحفے سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیں۔" سردار کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا،"ضرور ہم اپنے مہمانوں کی کسی خواہش کو رڈ نہیں کرتے۔" میں نے سردار سے کہا کہ"میرے ساتھیوں نے کہا ہے کہ ہمارے ساتھ صرف چھ مورنگ یہاں آئے ہیں اور میں یہ علم نہیں کہ قبیلے میں ان کی کیا حیثیت ہے، اس لیے سردار کے چناؤ کے لیے آپ مورنگ قبیلے کے زیادہ سے زیادہ افراد کو یہاں بلائیں تاکہ سب کے سامنے سردار کا چناؤ ہو اور کسی کو بھی اعتراض کا موقع نہ ملے۔" سردار کی مسکراہٹ اور خوش دلی یکدم غائب ہوگئی اور وہ ترش لہجے میں بولا،"سردار کے چناؤ کا حق تو مجھے ان مورنگوں نے دیا ہے اور سردار بھی مورنگ قبیلے سے ہوگا۔" کل تک ایک غیرملکی عورت ان کی سردار تھی، مورنگ قبیلے کے رواج کے مطابق جس کے پاس تکونا یاقوت اور تاجر ہوگا وہی قبیلے کا سردار ہوگا وار چونکہ یہ دونوں چیزیں اب میرے پاس ہیں، اس لیے اصولاً اس وقت میں قبیلے کا سردار ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ نئے سردار کے چناؤ کو فی الوقت ملتوی کردیا جائے۔ ویسے

میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے سردار بننے کا قطعاً شوق نہیں اور کلپنا نے تو مجھے اس حد تک مطمئن کیا ہے کہ میں جلد از جلد سرداری کی ذمہ داری سے دستبردار ہونا چاہتا ہوں لیکن اپنے ساتھیوں کی بات ماننا بھی میرے لیے ضروری ہے۔" میرا یہ جواب سن کر سردار بھوشن کچھ دیر تو خاموش رہا اور پھر کچھ تحکمانہ لہجے میں بولا،"وہ یاقوت اور تاج اس وقت کہاں ہیں؟" بہت ہی محفوظ جگہ پر ہیں اور انھیں جبراً حاصل کرنے کے لیے پانچ چھ ہزار افراد کی قربانی دینا پڑے گی۔ ہاں ایک بات مجھے یاد آئی۔ الزبتھ نے مجھے بتایا تھا کہ بالکل ویسا ہی ایک یاقوت تمھارے پاس بھی ہے اور اس یاقوت کی طرح تمھارے یاقوت پر بھی چند لکیریں کھدی ہوئی ہیں جو دراصل ایک خزانے کا نقشہ ہے اور جب تک دونوں یاقوتوں کو ایک ساتھ نہ رکھا جائے، خزانے کا نقشہ مکمل نہیں ہوتا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے؟" میری اس بات سے سردار بالکل ہی بوکھلا گیا اور جھلاہٹ میں بولا،"یہ ہمارے پرکھوں کا خزانہ ہے اور کسی غیر کو ہم اس تک جانے اور اسے حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔" اسی لیے تم الزبتھ سے خزانے کے متعلق سودے بازی کررہے تھے۔" میری یہ بات سن کر سردار بھوشن بولا۔"میں اس سے یاقوت لے کر اسے قتل کر دیتا۔" اور مجھ سے بھی یاقوت لے کر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ یہ کہتے ہوئے میں نے یکلخت اپنا پستول نکالا اور اس سے پہلے کہ سردار بھوشن سنبھلے یا اپنے گارڈز کو طلب کرسکے، اسے پستول کی زد میں لے کر کہا کہ،"بالکل خاموش رہو اور کوئی حرکت نہ کرنا، ورنہ سائلنسر والے پستول کی گولیاں تمھارے آرپار ہوجائیں گی اور تمھارے مرنے کی کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔" سردار بھوشن میرے اس اچانک رویے پر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو میں نے پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ خیمے میں کلپنا موجود تھی، میں نے اسے کہا کہ "خیمے سے باہر جاکر میرے ساتھی قیصر کو پکارے اور اسے کہے کہ اپنے تین مسلح ساتھیوں سمیت فوراً اس خیمے میں آجائے۔ مجھ کلپنا سے انگریزی بولتے دیکھ سردار بھوشن کبھی اسے دیکھتا اور کبھی مجھے، اور بالآخر بول اٹھا،"آخر میرے خلاف سازش ہوگئی۔ لیکن یاد رکھنا میرا قبیلہ بہت بڑا ہے۔ وہ تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" تمھارے قبیلے سے دگنی گولیاں ہمارے پاس ہیں اور تم جیسے سازشی مکاروں کو انھی کے انداز میں زیر کرنے اور مارنے میں ہمیں خاصا لطف آتا ہے۔ اپنا یاقوت تم آرام سے ہمیں دے دوگے یا ہمیں تمھاری کچھ خاطر کرنی پڑے گی۔" سردار نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور زمین پر نظریں گاڑ دیں۔ اتنی دیر میں کلپنا قیصر اس کے تین ساتھیوں کے ساتھ خیمے میں داخل ہوئی۔ میں نے قیصر کو کہا کہ سردار کو اسلحہ کی زد پر لے لو اور اس پر ہر طریقہ آماؤ تاکہ وہ اپنا یاقوت ہمارے حوالے کردے۔"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کلپنا بولی۔"مجھے معلوم ہے کہ یاقوت کہاں... رکھا ہے۔"

یہ فطری عمل تھا کہ ہم سب کلپنا کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اسی موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سردار بھوشن نے اپنی پہنی ہوئی کھال کے اندر سے بجلی کی تیزی سے ایک خنجر نکالا اور مجھے جو

اس کے بالکل قریب کھڑا تھا نشانہ بنانے کے لیے بازو اوپر اٹھایا۔ اسی لمحے قیصر کے ایک ساتھی کی نگاہ اس پر پڑی اور وہ زور سے چیخا "بھائی جان بچیے۔" مجھے خنجر مارنے کے لیے سردار کا ہاتھ خاصا بلند ہوچکا تھا۔ اب پسٹل چلانے کا بھی موقع نہیں تھا۔ میں پسٹل پھینک کر سردار پر جھپٹا اور اس کے خنجر والے بازو کو پکڑ کر پیچھے کی جانب موڑا اور ہم دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ میرے تینوں ساتھی مسلح تھے لیکن گولی چلانے سے اس لیے احتراز کر رہے تھے کہ گولی کہیں مجھے نہ لگ جائے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں لڑکھڑیاں کھاتے کبھی ایک طرف جاتے اور کبھی دوسری طرف۔ ہم اپنی جانیں بچانے کی کوشش میں اپنی پوری طاقت صرف کر رہے تھے لہٰذا چند منٹوں میں ہی ہماری جسمانی قوت اور مدافعت کم ہونے لگی۔ اسی دوران ایک بار جب سردار میرے نیچے اور میں اوپر سے اس کا خنجر والا بازو پکڑے ہوئے تھا، مجھے موقع مل گیا اور میں نے اپنی ساری طاقت اپنے بائیں ہاتھ میں مرتکز کرکے اس کی کنپٹی پر پورے زور سے مکا مارا۔ میرا مکا بالکل صحیح جگہ پر پڑا تھا۔ سردار کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑگئے اور خنجر اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ قیصر نے فوراً ہی خنجر اُٹھا لیا اور اس کے ساتھیوں نے سہارا دے کر مجھے کھڑا کیا۔ اس دھینگا مشتی میں مجھے بھی کہنیوں اور دائیں گھٹنے پر چوٹیں آئی تھیں۔ سردار نیم بے ہوشی کی حالت میں فرش پر پڑا آہستہ آہستہ اپنے پاؤں ہاتھ ہلا رہا تھا۔ قیصر کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ قریب تھا کہ وہ اسے گولی مار دے کہ میں نے اسے روکا۔ میں نے اپنی جان بچانے کی کوشش میں اپنی ساری توانائی صرف کر ڈالی تھی۔ میرا سانس ذرا بحال ہوا تو میں نے قیصر کو کہا کہ ہم سردار کو فی الحال زندہ رکھیں گے کیونکہ سردار کی لاش سے زیادہ زندہ سردار ہمارے لیے فائدہ مند ہے اور اس کی زندگی کے عوض ہم اس سے اور اس کے قبیلے میں اس کے حامی لوگوں سے سودابازی کرسکتے ہیں لہٰذا فی الحال اسے رسیوں سے جکڑ کر اس طرح باندھو کہ یہ حرکت نہ کرسکے اور اس کے منہ میں رومال ٹھونس دو تاکہ اس کی آواز بھی نہ نکلے۔ کلپا نے خیمے میں سے ہی ہمیں رسیاں نکال کر دیں جن میں سردار کو اچھی طرح جکڑ کر اس کا منہ بھی بند کردیا گیا۔ کلپا نے ہمیں بتایا کہ سردار کی پہنی ہوئی کھال کے اندر ایک دوسرا خنجر بھی ہے اور یہ دونوں خنجر اور خیمے میں رکھے سردار کے بھالے اور تیر سبھی انتہائی مہلک زہر میں بجھے ہوئے ہیں اور ان سے لگی ایک معمولی سی خراش بھی لمحوں میں انسان کو ہلاک کردیتی ہے۔ سردار سے دھینگا مشتی کے دوران اس کا خنجر کئی بار میرے چہرے اور جسم سے محض ایک انچ کی دوری تک گیا تھا اور میں خنجر کی خراش لگنے سے بال بال بچا تھا۔ اس میں میرا کوئی کمال نہ تھا بلکہ سب اللہ پاک کا کرم تھا اور اس بات پر یقین کامل کہ زندگی اور موت صرف رب ذوالجلال کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ موت تمہاری زندگی کی محافظ ہے۔ اس قول کی صداقت کا میں نے کئی بار خود مشاہدہ کیا ہے اور میرا یقین کامل اور زیادہ مستحکم ہوچکا ہے کہ لکھے ہوئے مقررہ وقت سے پہلے موت چھو کر گزر تو جاتی ہے لیکن

آتی نہیں۔

خیمے میں پڑے ایک صندوق سے کلپنا نے لکڑی کا ایک ڈبہ نکال کر مجھے دیا جس میں چند جواہر کے علاوہ تکونا یاقوت، سونے کی انگوٹھیاں، کانٹے بالیاں اور ایک ہار کے علاوہ کاغذات کا ایک پلندہ بھی تھا۔ کلپنا نے بتایا کہ بالیاں اس کی اور کانٹے انگوٹھیاں اور ہار اس کی ماتا کے ہیں۔ کاغذات اور دو قلم اس کے پتا کے ہیں اور ان کاغذات پر وہ سب کچھ لکھا ہوا ہے جو اس کے پتا نے خزانے کی تلاش میں معلوم کیا تھا۔ میں نے یہ سب چیزیں بھی اپنے قبضے میں لے لیں۔ ادھر قیصر اور اس کے ساتھیوں نے زہریلے بھالے اور تیر بھی اکٹھے کرکے میرے سامنے ڈھیر کردیے۔ سردار پوری طرح ہوش میں آچکا تھا اور خود کو رسیوں سے چھڑوانے کی لاحاصل سعی کے بعد ہماری ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ جب قیصر نے اس کے جسم پر بندھا دوسرا خنجر نکالنا چاہا تو سردار نے رومال جو اس کے منہ میں ویسے ہی ٹھوس دیا گیا تھا، نکال کر قیصر پر تھوکا۔ قیصر کا پہلے ہی غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے سردار کو اتنے ٹھڈے اور مکے مارے کہ وہ ادھ مرا ہوگیا۔ بڑی مشکل سے اس کے ساتھیوں نے اسے روکا۔ ادھر کلپنا مجھے بتا رہی تھی کہ اصل رانی تو اپنے خیمے میں ہے۔ یہاں کے رواج کے مطابق جب تک سردار نہ بلائے، وہ یا اصل رانی اس خیمے میں داخل نہیں ہوسکتی "میری پوزیشن تو محض ایک رکھیل کی ہے۔ اصل رانی سردار کے مشیر کی بیٹی ہے۔ جب تک اِن دونوں کو قابو میں نہیں کیا جاتا، اپنی جان بچاتا اور قبیلے سے نکلنا بہت مشکل ہے۔" کلپنا کے اس انکشاف سے ہمیں آئندہ پیش آنے والی مشکلات کا بخوبی اندازہ ہوگیا۔ جلدبازی میں بغیر کسی پلاننگ کے ہم نے سردار کو تو گرفتار کر لیا تھا، اب آگے ہمیں کیا کرنا تھا اور کس طرح اس قبیلے کے علاقے سے نکلنا ممکن تھا، اس بارے میں ہمارے ذہن ماؤف تھے۔ سردار کو بھی شاید ہماری کیفیت کا اندازہ ہوچکا تھا۔ قیصر سے مار کھانے کے بعد اس کی خونیں آنکھوں میں اب ہمارے لیے تمسخر اور ہماری بے مائیگی دیکھ کر اپنی کامیابی اور ہم سے بدلہ لینے کی چمک تھی۔ اس کے منہ میں رومال دوبارہ ٹھونس کر اسے اچھی طرح باندھ دیا گیا تھا۔ ہم اس حالت میں خیمے میں زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے تھے اور ذرا سا بھی شک گزرنے پر سردار کے گارڈ آجاتے۔ میں نے قیصر اور اس کے ساتھیوں سے مشورہ کرکے جو فیصلہ کیا کہ قیصر کے باقی تمام ساتھیوں اور نمبر ٹو کے ذریعے سارے تھائیوں کو خیمے میں بلا کر یہ صورت حال انہیں بتائی جائے۔ خچروں پر سامان لاد کر انہیں بھی خیمے میں لایا جائے اور یہ خیمہ ہمارے لیے ایک قلعے کی مانند ہو جائے جہاں سے اگر ضرورت پڑے تو ہم اکٹھے مل کر دشمن کا مقابلہ کرسکیں۔ رانی کے خیمے میں قیصر کے تین ساتھی جائیں اور اسے اٹھا کر یہاں لے آئیں۔ رانی کے ذریعے اس کے باپ یعنی سردار کے مشیر کو یہاں بلایا جائے اور اسے ہلاک کرنے کی دھمکی دے کر اسے اور رانی کو مجبور کیا جائے کہ ہمیں قبیلے کے علاقے سے نکلنے کا موقع فراہم کریں۔ سردار، رانی مشیر اور کلپنا کو ہم یرغمال بنا کر اپنے

ہمراہ لے جائیں۔ کلپنا ہمارے ساتھ جکمہ قبیلے میں جائے گی جبکہ سردار، رانی اور اس کے باپ کو ہم ایسی جگہ پر چھوڑ دیں جہاں وہ ہمارے لیے خطرے کا باعث نہ بن سکیں۔ یہ سب باتیں صرف اسی صورت میں ہوں گی اگر قبیلے کی طرف سے مزاحمت نہ ہوئی۔ دوسری صورت میں ہر بات کا جواب گولی سے دیا جائے گا۔

اس فیصلے کے بعد قیصر اپنے باقی ساتھیوں اور نمبر ٹو کو بلانے چلا گیا اور کلپنا قیصر کے ساتھیوں کو رانی کے خیمے میں لے گئی جو اسے اٹھا کر سردار کے خیمے میں لے آئے۔ رانی کے خیمے میں چار مگھ خادمائیں بھی تھیں وہ بھی خاموشی سے رانی کے ساتھ ہی چلی آئیں۔ رانی نے سردار یعنی اپنے شوہر کو رسیوں سے بندھا ہوا دیکھا تو بجائے واویلا کرنے کے زور زور سے ہنسنے لگی اور سردار کے گالوں پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ ہم سب رانی کے اس رویے پر حیران تھے کہ کلپنا بولی، ''یہ بیاہتا عورت کا فطری حسد اور جلاپا ہے۔ جب سے سردار نے مجھے اپنی غیر رسمی بیوی بنایا ہے، رانی کو اس نے ایک بار بھی خیمے میں شب بسری کے لیے نہیں بلایا۔ آج سردار کو اس حالت میں دیکھ کر وہ خود پر قابو نہ پا سکی اور اس سبکی کے لیے اپنے چھپے ہوئے جذبات کی بھڑاس نکال رہی ہے لیکن اس کا یہ رویہ محض وقتی ہے اور سردار کی جان بچانے کے لیے یہ اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دے گی، لہٰذا اس سے محتاط رہیں۔'' میں نے کلپنا کے ذریعے جو ان کی زبان بول سکتی تھی، کہا کہ رانی کو کہہ کر اپنے باپ کو یہاں بلائے۔ کلپنا کے کہنے پر رانی نے اپنی تین خادمائیں اپنے باپ کو بلانے بھیجیں۔ اسی دوران قیصر کے باقی ساتھی اور سارے تھائی خچروں اور سامان کے ساتھ خیمے کے اندر آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ تیس چالیس مگھ جوانوں نے ہماری غیر معمولی حرکات دیکھ کر خیمے کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ ادھر میں حیران تھا کہ رانی نے اپنے باپ کو بلانے کے لیے ایک کے بجائے تین خادمائیں کیوں بھیجی ہیں؟ فوری طور پر میرے دماغ میں خطرے کا کوندا لپکا۔ میں نے قیصر کے ساتھیوں اور تھائیوں کو کہا کہ خیمے کے اندر سے خیمے کے چاروں اطراف اپنے خنجروں سے شگاف کریں اور کسی خطرے کی صورت میں یا ہم پر حملہ کرنے والوں پر ان شگافوں سے فائر کریں۔ میرا دوسرا فوری حکم یہ تھا کہ جن مگھوں نے خیمے کو گھیر رکھا ہے، ان پر فائر کر کے کم از کم دس مگھوں کو گولیاں مار دیں تاکہ دوسرے لوگ خیمے سے اتنی دور چلے جائیں جہاں سے ان کے تیر اور بھالے ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ میرا تیسرا حکم تھا کہ بھالے بردار گارڈوں کو دیکھتے ہی بغیر وارننگ دیے گولیاں مار کر ڈھیر کر دیں۔

میرے ساتھیوں نے خیمے میں چاروں طرف سوراخ کر کے تاک تاک کر گولیاں چلانی شروع کیں۔ آٹھ دس مگھ ڈھیر ہوئے تو باقی سارے بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ مرنے والوں میں بھالے بردار اور تیر انداز بھی شامل تھے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ وقفے وقفے سے دو چار گولیاں چلاتے رہیں۔ اب ہمیں رانی کے باپ یعنی مشیر کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی ایک ساتھی

نے بتایا کہ مشیر ہاتھ اوپر اٹھائے خیمے سے کافی فاصلے پر کھڑا ہے۔ میں رانی کی پشت سے پسٹل لگا کر اس کے ساتھ خیمے کے دروازے پر آیا اور اسے کہا کہ اپنے باپ کو بلا لے۔ ہم اسے کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے۔ میں نے کلپنا کے ذریعے رانی کو مخاطب کیا تھا۔ رانی نے میری طرف دیکھا تو میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ رانی نے باپ کو بلایا اور چند ہی لمحوں میں وہ خیمے میں آ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ بدستور اٹھائے ہوئے تھے۔ اب کلپنا ہماری مترجم تھی۔ میں نے مشیر کو کہا، ''تمہارا سردار ہم سے زبردستی مورنگوں کا یاقوت اور تاج لے کر ہمیں ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ خیمے کے باہر جن مگھوں کی لاشیں پڑی ہیں انہوں نے دوسرے مگھوں کے ساتھ خیمے کو گھیر لیا تھا اور ہمیں ان کے حملے سے بچنے کے لیے فائر کرنے پڑے۔ تمہارا سردار کلپنا کے ماتا پتا کا قاتل ہے، اسے یقیناً اس جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ ہمارا انداز تم نے دیکھ لیا ہے کہ ہم بلاوجہ قتل نہیں کرتے لیکن جہاں جواز ہو وہاں مخالف چاہے کتنے ہی ہوں ہم انہیں ہلاک کر دیتے ہیں۔ تم اگر اپنی بیٹی کی اور سردار کی زندگی چاہتے ہو تو اپنے قبیلے والوں سے کہو کہ ہمیں بغیر کسی روک ٹوک کے یہاں سے جانے دیں۔ تم تینوں کو ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے اور کسی محفوظ مقام تک پہنچ کر پہلے تمہیں اور آگے جا کر تمہاری بیٹی اور سب سے آخر میں سردار کو رہا کر دیں گے۔ میری بات میں کسی بحث مباحثے کی گنجائش نہیں۔ اگر تمہیں میری تجویز سے اتفاق ہو تو بہتر ہے ورنہ تم تینوں کو یہیں ہلاک کر کے ہم اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ اس طرح جتنے بھی مگھ ہمارے راستے میں حائل ہوئے وہ ہماری گولیوں کا نشانہ بنیں گے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ تمہارے سردار کی قسمت کا فیصلہ کلپنا کرے گی یا پھر بھارتی قانون۔ اس لیے بہتر ہے کہ کلپنا کی منت سماجت کرو اور اسے اس بات پر راضی کرو کہ تمہارے سردار کو معاف کر دے۔ وہ کلپنا کا مجرم ہے اور اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ سردار کو معاف کرے یا سزا دے۔''

مگھ سردار ابھی جواب کے لیے موزوں الفاظ تلاش کر ہی رہا تھا کہ رانی بولی، ''اگر کلپنا سردار کو معاف کر دے تو میں اسے خزانے کا مکمل نقشہ اور وہ جگہ بھی بتا دوں گی جہاں خزانہ دفن ہے۔'' یہ کہہ کر رانی اپنے باپ سے مخاطب ہوئی۔ ''اب اپنی ہٹ دھرمی اور ضد چھوڑو اور خزانے کا پتہ انہیں بتا کر سردار کی زندگی بچا لو۔'' کلپنا نے باپ بیٹی کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ترجمہ کر کے مجھے بتایا اور کہا کہ قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق سردار کے مرنے پر رانی کو بھی جلتی چتا میں کود کر ستی ہونا پڑتا ہے۔ اپنی خوشی سے ستی نہ ہونے والی رانی کو قبیلے کے لوگ زبردستی اٹھا کر چتا میں ڈال دیتے ہیں۔ رانی سردار کی زندگی کی بھیک صرف اس کی محبت اور چاہت کے لیے ہی نہیں بلکہ خود ستی ہونے سے بچنے کے لیے بھی مانگ رہی ہے۔

بیٹی کی بات سن کر مشیر سوچ میں پڑ گیا۔ ادھر سردار نے بھی یہ سن کر کہ خزانے کا مکمل نقشہ مشیر کے پاس ہے رسیوں میں جکڑے ہونے کے باوجود ہاتھ پیر چلائے اور منہ سے غوں غوں کی

آوازیں نکالنا شروع کیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک التجا تھی کہ اسے بولنے کا موقع دیا جائے۔ قیصر نے بھی سردار کی یہ حالت نوٹ کی اور مجھ سے پوچھا کہ اگر میں اجازت دوں تو وہ سردار کا منہ کھول دے تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ میں نے قیصر کو نفی میں جواب دیا۔ مشیر اپنی بیٹی کی التجا سن کر نقشہ دینے کے متعلق ابھی سوچ رہا تھا یعنی نیم رضامند تھا اور میں چاہتا تھا کہ رانی پر ذرا سی سختی کر کے اور دباؤ ڈال کر مشیر کو مجبور کردوں کہ وہ نقشہ ہمارے حوالے کردے۔ اگر سردار کو اس دوران بولنے کا موقع مل جاتا تو وہ مشیر کو کچھ بھی کہہ کر نقشہ ہمیں دینے سے روک سکتا تھا۔ میری اولین ترجیح اپنے ساتھیوں سمیت اس علاقے سے بخیروعافیت گزر جانا تھا۔ خزانہ تو ایک جیک پاٹ (Jack Pot) تھا جو اگر مل جاتا تو قسمت کھل جاتی اور اگر نہ ملتا تو کم از کم مجھے اس کا زیادہ قلق نہ ہوتا کیونکہ یہ خزانہ نہ تو ہمارے اصل منصوبے میں شامل تھا اور نہ ہی ہم نے اس کے حصول کے لیے یہ خطرناک سفر اختیار کیا تھا۔ یہ تو سفر کے دوران پیش آنے والے حالات کے نتیجے میں ہمارے سامنے آیا تھا لیکن اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ اسے دل و دماغ سے فراموش کرنا بھی ہمارے لیے ناممکن تھا۔ میں نے کلپنا کے ذریعے مشیر کو کہا کہ فوری طور پر فیصلہ کرے کہ نقشہ ہمیں دے گا یا نہیں۔ بصورت دیگر میں سردار کے ساتھ اسے اور اس کی بیٹی کو یہیں ختم کردوں گا۔ میں نے یہ کہتے ہوئے قیصر کو اشارہ کیا اور اس نے اپنی رائفل مشیر کے اوپر تان لی۔ ادھر میں نے پسٹل دوبارہ رانی کی کنپٹی سے لگا دیا۔ مشیر کی قوت مدافعت بالکل ختم ہوچکی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ نقشہ دینے کو تیار ہے لیکن اسے اپنے خیمے کے قریب ایک جگہ کچھ کھدائی کرنا پڑے گی جہاں نقشہ دفن ہے۔ میں نے اس کی بات مانتے ہوئے دو تھائی اور قیصر کے دو ساتھی اس کے ہمراہ بھیجے اور مشیر کو یہ کہا کہ اپنے قبیلے والوں کو اپنے اور میرے ساتھیوں کے قریب آنے سے روکے۔ بصورت دیگر میرے ساتھی اسے اور قریب آنے والے مگھوں کو گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔ مشیر نے بتایا کہ نقشہ زیادہ گہرائی میں نہیں ہے بلکہ ایک بڑے خنجر سے ہی پتھروں کو ہٹایا جائے گا اور تھوڑی سی زمین کھودی جائے گی۔ میں نے ایک اور تھائی کو ان کے ہمراہ بھیجا تاکہ وہ زمین کھودے۔ میرے باقی ساتھی وقفے وقفے سے خیمے کے سوراخوں سے فائر کر کے مگھوں کو قریب آنے سے روک رہے تھے۔ امید و بیم کی اس صورت میں میری حالت بھی ناگفتہ بہ ہوچکی تھی۔ پے در پے ایسے واقعات پیش آچکے تھے جن میں کوئی بھی انسان نارمل حالت میں نہیں رہ سکتا۔ آدھ گھنٹہ ہمارے لیے آدھی صدی کے برابر ہوچکا تھا۔ جب قیصر نے جو خیمے سے باہر جھانک رہا تھا، مجھے بتایا کہ مشیر اور پانچوں ساتھی واپس آرہے ہیں۔ مشیر نے ہرن کی کھال کا ایک رول کیا ہوا ٹکڑا میرے سامنے رکھ دیا۔ کھال پر مختلف رنگوں سے چشمے اور جنگلی درختوں کے چند جھنڈوں کا ایک حصہ بنا ہوا تھا اور کوئی ایسا نشان نہ تھا جس سے خزانے کی نشان دہی ہو۔ میں نے سوالیہ نظروں سے مشیر کو دیکھتے ہوئے کلپنا کے ذریعے پوچھا کہ یہ کیا ہے اور خزانہ کہاں دفن

ہے؟ مشیر نے کہا کہ یاقوت کے دونوں ٹکڑے لائے جائیں۔ یاقوت کے دونوں تکونے ٹکڑے اس کے سامنے رکھ دیے گئے۔ اس نے دونوں ٹکڑوں کو نقشے کی کھال پر ایک مربع کی صورت میں رکھا اور دونوں ٹکڑوں پر کندہ لکیریں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ کھال پر بنے نقشے اور یاقوتوں کی لکیریں واضح طور پر اس جگہ کی نشان دہی کررہی تھیں جہاں خزانہ دفن تھا۔ یہ جگہ چشمے کے آغاز کے قریب درختوں کے ایک جھنڈ سے متصل تھی جہاں ہم نے مورنگ قبیلے میں داخلے سے پہلے رات کا پڑاؤ کیا تھا۔ نقشے کو میرے سبھی ساتھی اور رانی بھی دیکھنے کے لیے قریب آنے لگی۔ لیکن میں نے سب کو روک دیا۔ مشیر کے چہرے پر بھی خزانے کا سراغ ملنے سے ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ اب تک خزانے کی صحیح نشان دہی کو صرف میں، قیصر اور مشیر ہی جان پائے تھے۔ میں نے کھال کو رول کر کے دونوں یاقوتوں کے ساتھ اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ اب یہ کسی صورت بھی مناسب نہیں کہ ہم پہلے چکمہ قبیلے میں جائیں اور بعد میں خزانے کی طرف۔ اس وقت حالات ہمارے قابو میں تھے۔ سردار، اس کی رانی اور مشیر اسی خیمے میں موجود تھے۔ مورنگوں کا ابھی تک نیا سردار چنا نہیں گیا تھا اور جب تک یاقوت اور تاج میرے پاس تھے میں ان کا سردار تھا اور مجھے ان کا تعاون حاصل ہوسکتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی آدھی نفری یہاں چھوڑنے اور بقیہ آدھی کے ساتھ خزانے تک جانے کا فیصلہ کیا۔ قیصر میرا انتہائی معتمد ساتھی تھا لیکن یہاں کے حالات سنبھالنے کے لیے میں نے اسے یہیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور آدھے تھائی اور آدھے قیصر کے ساتھیوں کے ساتھ واپس کوچ کی تیار شروع کی۔ پیدل چلنے کے بجائے ہم نے اب سفر خچروں پر طے کرنا تھا۔ خوراک کا ضروری سامان ہم اپنے ساتھ لے جارہے تھے۔ ہم ابھی بمشکل تیار ہوئے ہی تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

ہم روانگی کی تیاری میں مشغول تھے۔ میرے ساتھیوں نے سردار کے زہریلے تیر اور بھالے میرے سامنے ڈھیر کر رکھے تھے۔ سردار غیر محسوس طور پر کھسکتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ وہ جوان تھا اور طاقتور بھی۔ اپنے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں تو نہ کھول سکا لیکن جب ہماری باتوں سے اسے مشیر کی غداری اور ہمیں خزانے کا مکمل سراغ ملنے کا علم ہوا تو وہ اس شکست اور ناکامی کو برداشت نہ کرسکا۔ بھالوں اور تیروں پر اس نے اپنے بندھے ہاتھوں اور پاؤں سے اس طرح لڑھکنی کھائی کہ کئی تیر اور بھالے اس کی پیٹھ میں چبھ گئے اور ان سے خون رسنے لگا۔ ہم نے فوراً اسے بھالوں اور تیروں پر سے اٹھایا لیکن زہر بجھے تیر اور بھالے اپنا کام دکھا چکے تھے۔ وہ صرف چند لمحے تڑپا زور زور سے سانسیں لیں اور دم توڑ گیا۔ یقین جانیے اس کے اس طرح مرنے سے ہم سب کو بہت افسوس ہوا لیکن ہم کر بھی کیا سکتے تھے؟ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیں اور اسے چوکی نما پلنگ پر لٹادیں۔ سردار کی موت بھی ازل سے دنیا میں فساد کی جڑ زر، زمین اور زن کے باعث

ہوئی تھی۔ میں ظاہری طور پر کتنا ہی سنگدل دکھائی دوں لیکن میرا دل موم سے بھی زیادہ نرم ہے۔ بلاوجہ کسی کو گزند پہنچانا یا ہلاک کرنا میری سرشت میں نہیں۔ یہ درست ہے کہ اپنے وطن کے دشمنوں اور غداروں کو ان کے آخری انجام تک پہنچاتے ہوئے میرے ہاتھ میں کبھی لرزش پیدا نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ اطمینان اور سکون ملا ہے اور نہ ہی کبھی میں نے اپنے جانی دشمنوں کو زندہ چھوڑا ہے لیکن کسی دنیاوی لالچ کے لیے میرے ہاتھوں کسی کو ایک خراش تک نہیں آئی۔ سردار کے اس طرح مرنے سے مجھے اتنا رنج ہوا کہ میں وہیں پر سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا پسٹل بھی فرش پر رکھ دیا تھا۔ میں اسی حالت میں مغموم بیٹھا تھا کہ مجھے اپنے سائیلنسر والے پسٹل سے دو فائر کرنے کی آواز آئی۔ میں چونک کر کھڑا ہوگیا۔ پسٹل قیصر کے ہاتھ میں تھا اور رانی میرے بالکل قریب ہاتھ میں زہریلا بھالا تھامے زمین پر گری تڑپ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی مشیر بھی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ میں بالکل خالی الذہن تھا۔ میں نے قیصر کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھا تو اس نے کہا، ”بھائی جان! آپ تو سر جھکائے بیٹھے تھے۔ رانی نے اچانک بھالا اٹھایا اور آپ پر جھپٹی۔ میرا ریوالور جیب میں تھا۔ اسے نکالتا تو دیر ہوجاتی۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو آپ کا پسٹل اٹھا کر اس پر داغ دیا۔“ میں نے مشیر کی طرف دیکھا تو قیصر بولا، ”یہ ہماری راہ کا آخری کانٹا تھا۔ اگر یہ زندہ رہتا تو ہمیں یقیناً نقصان پہنچاتا لہٰذا میں نے اسے بھی ختم کر دیا۔“ مشیر گولی لگنے کے باوجود کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے کلپنا کو کہا کہ اس کے منہ کے قریب جاکر سنے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ کلپنا اس کے قریب گئی اور مشیر اٹک اٹک کر جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سن کر مجھے بتایا۔ اسے جو کچھ سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ یہ خزانہ آج سے پانچ سو برس پہلے مورنگ اور مکھ قبیلے کے مشترکہ سردار نے مغل حکمرانوں کے ایک سپہ سالار سے چھینا تھا۔ وہ سردار اس وقت شیر کے بزرگ کا سگا بھائی تھا۔ مرتے وقت اس نے خزانہ دفن کرکے جگہ کا نقشہ اس کے بزرگ اور اپنے بھائی کو دیا اور ایک چوکور یاقوت پر خزانے کے رستے کو کندہ کرکے اور یاقوت کو دو ٹکونے حصوں میں کاٹ کر دونوں بیٹوں کو دے دیے۔ خزانے کے حصول کے لیے دونوں بیٹوں میں جھگڑا ہوا جو اس حد تک بڑھا کہ آج تک کوئی بھی خزانے تک نہ پہنچ سکا۔ خزانے کا نقشہ مجھے اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملا۔ چونکہ طاقت دونوں سرداروں کے پاس تھی اس لیے اس نقشہ کی میرے بزرگوں نے اور میں نے کسی کو ہوا تک نہ لگنے دی۔ میری اکلوتی بیٹی ہی میری وارث تھی۔ چنانچہ میں نے اسے نقشے کے متعلق بتادیا تھا۔ آج جب دونوں یاقوت اور نقشہ یکجا ہوئے تو حقداروں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں۔“ کلپنا تو یہ بات کہہ کر خاموش ہوگئی ادھر مشیر بھی چند مزید سانسیں لے کر ختم ہوگیا۔ مشیر کی ان آخری باتوں نے میری سوچ کا رخ یک لخت بدلا اور میرا سارا رنج و غم ختم ہوگیا۔ مغلوں سے زبردستی چھینے گئے خزانے کے یہ مکھ اور مورنگ سردار کب سے جائز وارث بن گئے؟ اپنے صد سالہ ظلم و جبر سے برصغیر پر حکمرانی کرنے والے انگریز تاجروں کے روپ میں اس ملک میں داخل

ہوئے اور زبردستی حکمران بن بیٹھے۔ مال و دولت کی فراوانی سے بھرپور اس ملک کو لوٹ لوٹ کر کنگال کرکے جب واپس گئے تو اپنی سابقہ حکمرانی کی نشانی کے طور پر دولت مشترکہ قائم کی۔ جس میں پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش سری لنکا اور تمام ممالک شامل کیے جن کے یہ کبھی زبردستی حکمران بن بیٹھے تھے۔ کوہ نور ہیرا برصغیر سے یہ انگریز رنجیت سنگھ کے لڑکے دلیپ سنگھ سے زبردستی لے گئے۔ یہ بے مثال ہیرا آج بھی ملکہ برطانیہ کے تاج کی زینت بنا ہوا ہے اور نہایت ڈھٹائی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ برٹش اسے واپس کرنے سے انکاری ہیں۔ اگر برطانوی شاہی خاندان کوہ نور ہیرے کا جائز وارث نہیں تو یہ مکھ اور مورنگ سردار اس خزانے کے کیسے جائز وارث ہوگئے؟ انسانی دماغ بھی عجیب شے ہے۔ پل میں تولہ، پل ماشہ۔ ایک لمحے میں دل میں رنج و غم کا احساس خوشی میں ڈھل جاتا ہے۔ میری بھی یہی کیفیت تھی۔ سردار، رانی اور مشیر کی موت کا غم اب اس احساس میں بدل چکا تھا کہ اس خزانے کے اصل حقدار برصغیر کے مسلمان تھے اور ملنے پر یہ خزانہ ان مسلمانوں میں ہی تقسیم کیا جائے گا جو اس مہم میں ہمارے ساتھ ہیں۔

قیصر نے بالکل درست کہا تھا کہ مشیر کو ہلاک کرکے اس نے ہماری راہ کا آخری کانٹا بھی دور کردیا تھا۔ میں نے خیمے میں رکنے والے ساتھیوں کا چیف قیصر کو بنایا اور تاکید کی کہ سردار، رانی اور مشیر کے مرنے کی خبر ہرگز ہرگز باہر نہ جانے پائے اور نہ ہی قبیلے کے لوگوں کو خیمے کے قریب آنے دیا جائے۔ ہم انشاء اللہ تین روز میں واپس لوٹ آئیں گے۔ ہم خیمے کے اندر سے خچروں پر بیٹھ گئے اور انہیں ایڑھ لگا کر بھگاتے ہوئے چشمے کی طرف بڑھے۔ خیمے میں سے ہمارے ساتھی فائر کررہے تھے ادھر ہم بھی فائر کرتے ہوئے قبیلے کے لوگوں کے سامنے سے گزر گئے۔ واپسی کے اس سفر کے دوران ہم نے کم سے کم وقت پڑاؤ کیا اور دوسرے روز شام کو ہم چشمے کے دہانے پر پہنچ گئے۔ میں نے مورنگوں والا یاقوت گلے میں پہن رکھا تھا۔ راستے میں جب بھی مورنگوں سے آمنا سامنا ہوا میں نے یاقوت ان کو دکھایا اور وہ تعظیماً جھک گئے۔ ہم نے اس مخصوص مقام پر پہنچتے ساتھ ہی خزانے کی تلاش کا کام شروع کر دیا۔ یہاں پر ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میرے تھائی ساتھیوں میں سے کسی کو بھی علم نہ تھا کہ ہم واپس کیوں آئے ہیں؟ قیصر کے ساتھیوں کو چونکہ اصل حقیقت معلوم تھی لہٰذا میں نے انہیں چوکنا رہنے اور ایک دوسرے کی حفاظت کرنے اور کور (Cover) دینے کی ہدایت کی۔ نقشے کے مطابق چشمے کے آغاز کے قریب ہی درختوں کا جھنڈ تھا۔ وہاں اس جگہ کے قریب ہی ہم نے پڑاؤ کیا۔ میں نے نقشے پر یاقوت جما کر رکھے اور اس جگہ کو تلاش کرلیا جہاں خزانہ دفن تھا۔ یہ تقریباً بارہ مربع فٹ جگہ تھی جہاں خزانہ ہونا چاہیے تھا۔

چھٹا باب

جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں، میرے علم کے مطابق تھائیوں کو تو نہ تو خزانے کے متعلق کوئی بات معلوم تھی اور نہ ہی انھیں مورنگ قبیلے تک واپس لوٹنے کی وجہ کا علم تھا۔ صرف قیصر کے ساتھی اس بارے میں جانتے تھے۔ دولت ہے ہی ایسی شے جس سے بڑے بڑے ایماندار اور متقی بھی اپنے اصولوں سے پھسل جاتے ہیں۔ میرے سارے ساتھی مسلح تھے اور خزانہ ملنے کے بعد کسی کی بھی نیت میں فتور آسکتا تھا اور رات کو مجھ پر سونے کے دوران بآسانی قابو پایا جاسکتا تھا، لہٰذا میں نے خزانہ نکالنے کا کام صبح تک ملتوی کردیا۔ ہم سب نے ٹن فوڈ کھایا اور چشمے کے پانی سے پیاس بجھائی۔ رات کو پہرہ دینے کے لیے میں نے تھائیوں اور قیصر کے ساتھیوں کی تین مشترکہ ٹولیاں بنائیں اور تمام ممکن انتظامات کرکے ہم اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس گئے۔ باوجود خاصی تھکاوٹ کے نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ اپنے سابقہ محکمے میں ٹریننگ کے دوران میرے ساتھیوں کو اور خصوصاً مجھے بحیثیت گروپ لیڈر کے سختی سے سکھایا گیا تھا کہ مشن کے دوران اپنے حتمی ارادے، آنے جانے کی صحیح جگہ اور اٹیک کے صحیح وقت کا کسی کو حتیٰ کہ اپنے انتہائی قریبی ساتھیوں کو بھی علم نہ ہونے دو۔ اسی ٹریننگ کے باعث آج تک کسی کو بھی میرے آئندہ پروگرام کا کبھی بھی مکمل علم نہیں ہوتا۔ سلیپنگ بیگ میں لیٹ کر اسے بند کرنے والی زپ پاؤں سے سر کی جانب بند ہوتی ہے۔ میں بیگ میں ہمیشہ الٹی طرف لیٹتا ہوں یعنی زپ سر سے پاؤں کی طرف بند کرتا ہوں۔ مجھے وقت کا صحیح اندازہ تو نہ ہوسکا۔ غالباً بیگ میں گھسے مجھے دو گھنٹے گزرے ہوں گے اور ابھی میں پوری طرح سو بھی نہ پایا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ میرے بیگ کو آہستگی سے پاؤں کی جانب سے کسی تیز دھار آلے یعنی چاقو یا خنجر سے پھاڑا جا رہا ہے۔ خطرے کو بھانپنے کی میری چھٹی حس بیدار ہوچکی تھی۔ بڑی آہستگی اور خاموشی سے میں نے اپنی

جیکٹ کی جیبوں سے پسٹل اور ریوالور نکالے۔ باہر بھی اندھیرا تھا اور بیگ میں تو اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بیگ تقریباً آدھا چیرا جا چکا تھا جب میں نے محض اندازے سے پسٹل اور ریوالور سے بیک وقت فائر کیے۔ دو چیخوں نے رات کے خاموش سکوت کو توڑا اور میں چیرے ہوئے بیگ میں سے باہر نکل آیا۔ فائروں کی آواز سے درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے شور مچاتے ہوئے اڑنے لگے۔ پہریدار اپنی جگہوں سے اور دوسرے سوئے ہوئے ساتھی بھی اپنے بیگز سے نکل آئے۔ ٹارچوں کی روشنی میں قیصر کے دو ساتھی اوندھے پڑے تھے۔ ایک کے پاس ہی ریوالور پڑا تھا اور دوسرے نے ہاتھ میں ابھی تک رام پوری چاقو پکڑا ہوا تھا۔ دونوں میں ابھی کچھ سانسیں باقی تھیں۔ ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا، ''لالچ نے ہمیں اندھا کر دیا تھا۔ سارا خزانہ پانے کی کوشش میں ہم اپنی جانوں سے بھی گئے۔'' ابھی وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی جسے کندھے میں گولی لگی تھی، بڑی مشکل سے سیدھا ہوا۔ ریوالور اس کے قریب ہی پڑا تھا۔ اسے اٹھاتے ہوئے وہ کراہتی آواز میں بولا، ''اپنی اس حرکت کے باعث ہم کسی کو بھی منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ اگر ہم زندہ بچ بھی گئے تو قیصر بھائی ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔ ہم نے بے وفائی اور غداری کی جس کی سزا ہمیں ضرور ملنی چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے پہلے اس نے اپنے ساتھی پر دو فائر کیے اور پھر اپنی کنپٹی پر ریوالور رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ اسے اس حرکت سے باز رکھنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور نہ ہی ہمیں اس بات کا ذرا سا بھی امکان تھا کہ وہ اپنی پشیمانی کا ازالہ اپنی اور اپنے ساتھی کی جان لے کر کرے گا۔ مدفون خزانوں کے منحوس ہونے والی روایت یقیناً صحیح ہے۔ ابھی تک خزانہ ہمیں ملا نہیں تھا لیکن بیس بائیس انسانوں کی جانیں اس خزانے کے باعث جاچکی تھیں۔ قیصر کے ایک ساتھی نے جو پہرے پر تھا، مجھے بتایا کہ یہ دونوں زیادہ سے زیادہ چھ ماہ قبل قیصر سے متعارف ہوئے اور گیرج میں کام کرنے لگے تھے۔ بقول اس کے ان کے متعلق قیصر کو بھی بہت کم علم تھا اور ان کی بڑی منت سماجت کے بعد قیصر انھیں اپنے ساتھ لانے پر رضامند ہوا تھا۔ میں نے تھائیوں کو دو قبر نما گڑھے کھودنے کا کہا۔ ادھر قیصر کے ساتھیوں نے ان کا ذاتی سامان اکٹھا کیا۔ چشمے کے پانی سے دونوں کو غسل دیا اور نماز جنازہ کے بعد ان کو قبروں میں دفن کردیا گیا۔ جیسا کہ میں گزشتہ قسط میں عرض کرچکا ہوں کہ خزانہ ملنے پر میں نے تمام جواہر فروخت کرکے قیصر کے ساتھیوں میں بانٹ دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ قیصر پر بھی اپنے ہمراہ آنے والے ساتھیوں کی ذمہ داری تھی، لہٰذا میں نے اس خزانے سے ان دونوں مرنے والوں کا حصہ ان کے ورثا کو دینے کا فیصلہ کیا۔

رات تو کبھی کی بیت چکی تھی۔ چائے کے ساتھ ہلکا سا ناشتہ کرکے بوجھل قدموں اور بے دلی کے ساتھ میں نے قیصر کے باقی ساتھیوں کو مسلح ہوکر نگرانی کرنے کا کہا اور تھائیوں کو خزانے کی جگہ کھودنے پر لگادیا۔ پھاوڑے اور کدالیں تو ہمارے پاس تھیں نہیں، لہٰذا بڑے چاقوؤں اور خنجروں سے

ہی کھدائی شروع کی گئی۔ دس مربع فٹ جگہ سے چھوٹے بڑے پتھر اور مٹی چار فٹ سے زیادہ ہٹانے پر ایک بہت بڑا پتھر دکھائی دیا۔ اس کے چاروں اطراف سے مٹی اور پتھر ہٹا کر اسے ننگا کردیا گیا۔ کئی تھائیوں نے مل کر اس پتھر کو ہٹایا تو معلوم ہوا کہ اس پتھر سے ایک دوسرے پتھر میں بنے ہوئے بڑے سوراخ کو ڈھانپ دیا گیا تھا۔ سوراخ تقریباً ایک میٹر گہرا تھا جس کی تہہ میں کھالوں سے بنی ایک بڑی تھیلی تھی۔ ایک تھائی نے سوراخ پر لیٹ کر تھیلی اٹھانی چاہی تو میں نے اسے فوراً روک دیا۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ خزانے کی حفاظت اور کسی غیر کے اس تک پہنچنے کی صورت میں اسے حاصل نہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ بنکاک سے چلتے وقت میں نے چمڑے کے دستانوں کے دو جوڑے سردی سے بچاؤ کے لیے خریدے تھے جن کی اب تک ضرورت نہ پڑی تھی اور وہ جوڑے ابھی تک میرے سامان میں تھے۔ میں نے ایک جوڑا اس تھائی کو دیا کہ اسے پہن کر تھیلی کو اٹھائے۔ تھائی نے تھیلی باہر نکالی تو میں نے ایک صاف جگہ اسے کھولنے اور الٹنے کا کہا۔ تھیلی میں غیر تراشے ہیرے اور یاقوت تھے جن کا وزن تقریباً ایک کلو ہوگا۔ ان میں چند خاصے بڑے ٹکڑے بھی تھے۔ ان کی قیمت کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ واپسی پر بنکاک میں انھیں فروخت کرکے ہمیں ستر کی دہائی میں چھیاسٹھ لاکھ ڈالر ملے جس میں سے 14 لاکھ تھائیوں کو دے کر باقی سب رقم قیصر اور اس کے زندہ اور مرے ہوئے ساتھیوں، کلپنا اور مجھے برابر کے حصوں میں سوا چار لاکھ ڈالر فی حصہ آئی۔

تھیلی اٹھانے والے تھائی کے دستانوں کو ہم نے ایک خنجر سے کاٹ کر اس کے ہاتھوں سے علیحدہ کیا۔ محض اپنے شک اور تجربے کی خاطر وہ تھیلی اور دستانے میں نے چاقو سے اٹھا کر ایک جنگلی گلہری پر پھینکے۔ تھیلی لگتے ساتھ ہی گلہری وہیں مرگئی۔ تھیلی پر یقیناً کوئی زہر لگایا گیا تھا۔ ہم نے دستانے، تھیلی اور چاقو اسی سوراخ میں ڈال کر اسی پتھر سے اسے ڈھانپ دیا اور جواہر کو بھی چشمے کے پانی سے خوب اچھی طرح دھویا۔

اب یہاں ہمارا قیام بے سود تھا اور ہمیں جلد از جلد مگھ قبائل میں اپنے ساتھیوں تک پہنچنا تھا۔ ڈھلوان کا سفر نسبتاً آسان تھا۔ دوسرے دن گیارہ بجے ہم اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔ مگھ خاص بڑی تعداد میں سردار کے خیمے کو خاصی دُور سے گھیرے ہوئے تھے۔ ہم ہوائی فائر کرتے اور مگھوں کو بھگاتے خیمے میں گئے تو سب ساتھی بخیریت تھے۔ ہم نے انھیں اپنی کامیابی سے واپسی کا مژدہ سنایا۔ مگھوں کو ابھی تک علم نہ ہوسکا تھا کہ سردار، رانی اور مشیر مرچکے ہیں۔ قیصر نے بتایا کہ حوائج ضروری سے فراغت پانے کے لیے وہ شام گہری ہونے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے تین تین کی ٹولی میں خیمے سے باہر جاتے رہے ہیں اور مگھ یقیناً انھیں دیکھتے ہوں گے۔ لیکن سردار، رانی اور مشیر کے باہر نہ جانے کے باعث بہت ممکن ہے کہ انھیں کچھ شک پڑ گیا ہو اور اسی لیے وہ کئی کئی بار اپنی زبان میں نعرے لگاتے ہیں۔ قیصر نے ایک بات اور بتائی کہ گولیاں تقریباً ختم ہوچکی ہیں اور اب دستی بم ہی

باقی رہ گئے ہیں۔ میرے پاس اور میرے ہمراہ جانے والے ساتھیوں کے پاس بھی محض بیس بائیس گولیاں باقی رہ گئی تھیں۔ دستی بم مگھوں کی طرف پھینکتے ہوئے ہم ان کے علاقے سے تو نکل سکتے اور رانگا ماٹی بھی پہنچ سکتے تھے۔ لیکن وہاں پر اسلحہ کی ضرورت... اور مجھے فوراً ہی جادوگرنی کا دکھایا ہوا منظر یاد آ گیا جس میں میرے چاروں طرف لاشیں پڑی تھیں اور میں، قیصر اور اس کے ساتھی درختوں پر فائر کررہے تھے اور درختوں پر پتوں میں چھپے ہوئے اور ٹہنوں پر بیٹھے چکمہ لڑاکے گولیاں لگنے سے گر رہے تھے۔ قیصر کو میں نے اور میرے ہمراہ جانے والے ساتھیوں نے اپنے ان دو ساتھیوں کے متعلق بتایا جو خزانے کو ہتھیانے کی کوشش میں مارے گئے تھے۔ قیصر نے ان کی ہلاکت کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا بلکہ مجھ سے اپنے ساتھیوں کی غداری کے بارے میں معذرت کرنے لگا کہ وہ شرمندہ ہے کہ ساتھیوں کے چناؤ میں اس سے غلطی ہوگئی۔ اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو میرے سامنے کہا کہ اگر کسی نے بھی حکم عدولی یا غداری کا سوچا بھی تو وہ خود اسے ہلاک کردے گا۔

ہم نے رانگا ماٹی جانے کی مکمل تیاری کرلی اور اب ہمیں خیمے سے نکلنا اور مگھوں کے بیچ میں سے رستہ بناتے ہوئے چشمے کے ساتھ ساتھ پہاڑ کی ڈھلوان میں اترنا تھا۔ لیکن ہمارا سب سے بڑا مسئلہ اپنے مطلوبہ بور کی گولیوں کا حصول تھا اور ویسی گولیاں نہ ملنے کی صورت میں ہمیں گولیوں کے ساتھ ایسا اسلحہ بھی حاصل کرنا تھا جن کے لیے وہ اسلحہ کارآمد ہو۔ میں نے خیمے میں ہی قیصر سے علیحدگی میں مشورہ کیا۔ صرف ایک ہی ذریعہ تھا کہ ہم کسی فوجی چوکی پر اچانک حملہ کرکے وہاں سے اسلحہ اور ایمونیشن چھین لیں۔ چٹاگانگ جاکر یہ کام کرنا اور بخیریت لوٹنا ناممکن تھا کیونکہ چٹاگانگ فوجی چھاؤنی تھی اور وہاں بنگلہ دیشی فوج کا ایک ڈویژن متعین تھا پھر وہاں سے رانگاماٹی پہنچنے کے لیے جیپوں کی ضرورت تھی۔ تیسری رکاوٹ یہ تھی کہ چکمہ قبیلے کو بنگلہ دیشی فوج نے ڈھلوانی جانب سے گھیرے میں لے کر آمدورفت کے تمام راستے بند کیے ہوئے تھے۔ لہٰذا ہمیں اسلحہ اونچائی پر کسی فوجی چوکی سے چھین کر اوپری راستے سے رانگا ماٹی تک جانا تھا۔ ایک اور سوچ نے مجھے پریشان کررکھا تھا۔ مورنگ، مگھ اور میزو قبائل میں ہمیں جن کٹھن حالات سے گزرنا پڑا تھا ان کے پیش نظر اگر ہم اس راستے کی دشواری کو پس پشت بھی ڈال دیتے تو ہمارا اس راستے سے گزرنا ناممکن تھا۔ ایمونیشن کی کمیابی کی وجہ سے ہم بری طرح پھنس چکے تھے۔ جب کوئی صورت بھی دکھائی نہ دی تو میں نے بنگلہ دیش کے نقشے نکالے اور چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کا تفصیلاً جائزہ لیتے ہوئے مگھ قبیلے کے محل وقوع کا تعین کیا۔ یہ چشمہ جو اب ندی کی صورت اختیار کرچکا تھا، دریائے کرنافلی میں جس جگہ شامل ہوتا تھا وہیں پر کرنافلی پیپر ملز تھی اور یہاں کا بنا ہوا کاغذ برآمد بھی ہوتا تھا۔ اس پیپر ملز کی بنیاد ایک اردو سپیکنگ انجینئر نے رکھی تھی اور اپنی نگرانی میں تمام مشینری لگ[illegible] کر اسے چالو کیا تھا۔ اس انجینئر کو اپنے ہاتھوں تعمیر کردہ اس کارخانے سے اتنی محبت تھی کہ متعصب [illegible]لی کارندوں کی ہر قسم کی بداخلاقی اور

ہی کھدائی شروع کی گئی۔ دس مربع فٹ جگہ سے چھوٹے بڑے پتھر اور مٹی چار فٹ سے زیادہ ہٹانے پر ایک بہت بڑا پتھر دکھائی دیا۔ اس کے چاروں اطراف سے مٹی اور پتھر ہٹا کر اسے ننگا کر دیا گیا۔ کئی تھائیوں نے مل کر اس پتھر کو ہٹایا تو معلوم ہوا کہ اس پتھر سے ایک دوسرے پتھر میں بنے ہوئے بڑے سوراخ کو ڈھانپ دیا گیا تھا۔ سوراخ تقریباً ایک میٹر گہرا تھا جس کی تہہ میں کھالوں سے بنی ایک بڑی تھیلی تھی۔ ایک تھائی نے سوراخ پر لیٹ کر تھیلی اٹھانی چاہی تو میں نے اسے فوراً روک دیا۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ خزانے کی حفاظت اور کسی غیر کے اس تک پہنچنے کی صورت میں اسے حاصل نہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ بنکاک سے چلتے وقت میں نے چمڑے کے دستانوں کے دو جوڑے سردی سے بچاؤ کے لیے خریدے تھے جن کی اب تک ضرورت نہ پڑی تھی اور وہ جوڑے ابھی تک میرے سامان میں تھے۔ میں نے ایک جوڑا اس تھائی کو دیا کہ اسے پہن کر تھیلی کو اٹھائے۔ تھائی نے تھیلی باہر نکالی تو میں نے ایک صاف جگہ اسے کھولنے اور الٹنے کا کہا۔ تھیلی میں غیر ترشے ہیرے اور یاقوت تھے جن کا وزن تقریباً ایک کلو ہوگا۔ ان میں چند خاصے بڑے ٹکڑے بھی تھے۔ ان کی قیمت کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ واپسی پر بنکاک میں انھیں فروخت کرکے ہمیں ستر کی دہائی میں چھیاسٹھ لاکھ ڈالر ملے جس میں سے 14 لاکھ تھائیوں کو دے کر باقی سب رقم قیصر اور اس کے زندہ اور مرے ہوئے ساتھیوں، کلپنا اور مجھے برابر کے حصوں میں سوا چار لاکھ ڈالر فی حصہ آئی۔

تھیلی اٹھانے والے تھائی کے دستانوں کو ہم نے ایک خنجر سے کاٹ کر اس کے ہاتھوں سے علیحدہ کیا۔ محض اپنے شک اور تجربے کی خاطر وہ تھیلی اور دستانے میں نے چاقو سے اٹھا کر ایک جنگلی گلہری پر پھینکے۔ تھیلی لگتے ساتھ ہی گلہری وہیں مرگئی۔ تھیلی پر یقیناً کوئی زہر لگایا گیا تھا۔ ہم نے دستانے، تھیلی اور چاقو اسی سوراخ میں ڈال کر اسی پتھر سے اسے ڈھانپ دیا اور جواہر کو بھی چشمے کے پانی سے خوب اچھی طرح دھویا۔

اب یہاں ہمارا قیام بے سود تھا اور ہمیں جلد از جلد مگھ قبائل میں اپنے ساتھیوں تک پہنچنا تھا۔ ڈھلوان کا سفر نسبتاً آسان تھا۔ دوسرے دن گیارہ بجے ہم اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔ مگھ خاص بڑی تعداد میں سردار کے خیمے کو خاصی دُور سے گھیرے ہوئے تھے۔ ہم ہوائی فائر کرتے اور مگھوں کو بھگاتے خیمے میں گئے تو سب ساتھی بخیریت تھے۔ ہم نے انھیں اپنی کامیابی سے واپسی کا مژدہ سنایا۔ مگھوں کو ابھی تک علم نہ ہوسکا تھا کہ سردار، رانی اور مشیر مرچکے ہیں۔ قیصر نے بتایا کہ حوائج ضروری سے فراغت پانے کے لیے وہ شام گہری ہونے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے تین تین کی ٹولی میں خیمے سے باہر جاتے رہے ہیں اور مگھ یقیناً انھیں دیکھتے ہوں گے۔ لیکن سردار، رانی اور مشیر کے باہر نہ جانے کے باعث بہت ممکن ہے کہ انھیں کچھ شک پڑگیا ہو اور اسی لیے وہ کئی کئی بار اپنی زبان میں نعرے لگاتے ہیں۔ قیصر نے ایک بات اور بتائی کہ گولیاں تقریباً ختم ہوچکی ہیں اور اب دستی بم ہی

باقی رہ گئے ہیں۔ میرے پاس اور میرے ہمراہ جانے والے ساتھیوں کے پاس بھی محض بیس بائیس گولیاں باقی رہ گئی تھیں۔ دستی بم مگھوں کی طرف پھینکتے ہوئے ہم ان کے علاقے سے تو نکل سکتے اور رانگا ماٹی بھی پہنچ سکتے تھے۔ لیکن وہاں پر اسلحہ کی ضرورت... اور مجھے فوراً ہی جادوگرنی کا دکھایا ہوا منظر یاد آگیا جس میں میرے چاروں طرف لاشیں پڑی تھیں اور میں، قیصر اور اس کے ساتھی درختوں پر فائر کررہے تھے اور درختوں پر پتوں میں چھپے ہوئے اور ٹہنوں پر بیٹھے چکمہ لڑاکے گولیاں لگنے سے گر رہے تھے۔ قیصر کو میں نے اور میرے ہمراہ جانے والے ساتھیوں نے اپنے ان دو ساتھیوں کے متعلق بتایا جو خزانے کو ہتھیانے کی کوشش میں مارے گئے تھے۔ قیصر نے ان کی ہلاکت کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا بلکہ مجھ سے اپنے ساتھیوں کی غداری کے بارے میں معذرت کرنے لگا کہ وہ شرمندہ ہے کہ ساتھیوں کے چناؤ میں اس سے غلطی ہوگئی۔ اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو میرے سامنے کہا کہ اگر کسی نے بھی حکم عدولی یا غداری کا سوچا بھی تو وہ خود اسے ہلاک کردے گا۔

ہم نے رانگا ماٹی جانے کی مکمل تیاری کرلی اور اب ہمیں خیمے سے نکلنا اور مگھوں کے بیچ میں سے رستہ بناتے ہوئے چشمے کے ساتھ ساتھ پہاڑ کی ڈھلوان میں اترنا تھا۔ لیکن ہمارا سب سے بڑا مسئلہ اپنے مطلوبہ بور کی گولیوں کا حصول تھا اور ویسی گولیاں نہ ملنے کی صورت میں ہمیں گولیوں کے ساتھ ایسا اسلحہ بھی حاصل کرنا تھا جن کے لیے وہ اسلحہ کارآمد ہو۔ میں نے خیمے میں ہی قیصر سے علیحدگی میں مشورہ کیا۔ صرف ایک ہی ذریعہ تھا کہ ہم کسی فوجی چوکی پر اچانک حملہ کرکے وہاں سے اسلحہ اور ایمونیشن چھین لیں۔ چٹاگانگ جاکر یہ کام کرنا اور بخیریت لوٹنا ناممکن تھا کیونکہ چٹاگانگ فوجی چھاؤنی تھی اور وہاں بنگلہ دیشی فوج کا ایک ڈویژن متعین تھا پھر وہاں سے رانگاماٹی پہنچنے کے لیے جیپوں کی ضرورت تھی۔ تیسری رکاوٹ یہ تھی کہ چکمہ قبیلے کو بنگلہ دیشی فوج نے ڈھلوانی جانب سے گھیرے میں لے کر آمدورفت کے تمام راستے بند کیے ہوئے تھے۔ لہٰذا ہمیں اسلحہ اونچائی پر کسی فوجی چوکی سے چھین کر اوپری راستے سے رانگا ماٹی تک جانا تھا۔ ایک اور سوچ نے مجھے پریشان کررکھا تھا۔ مورنگ، مگھ اور میزو قبائل میں ہمیں جن کٹھن حالات سے گزرنا پڑا تھا ان کے پیش نظر اگر ہم اس راستے کی دشواری کو پس پشت بھی ڈال دیتے تو ہمارا اس راستے سے گزرنا ناممکن تھا۔ ایمونیشن کی کمیابی کی وجہ سے ہم بری طرح پھنس چکے تھے۔ جب کوئی صورت بھی دکھائی نہ دی تو میں نے بنگلہ دیش کے نقشے نکالے اور چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کا تفصیلاً جائزہ لیتے ہوئے مگھ قبیلے کے محل وقوع کا تعین کیا۔ یہ چشمہ جو اب ندی کی صورت اختیار کرچکا تھا، دریائے کرنافلی میں جس جگہ شامل ہوتا تھا وہیں پر کرنافلی پیپر ملز تھی اور یہاں کا بنا ہوا کاغذ برآمد بھی ہوتا تھا۔ اس پیپر ملز کی بنیاد ایک اردو سپیکنگ انجینئر نے رکھی تھی اور اپنی نگرانی میں تمام مشینری لگ[illegible] کر اسے چالو کیا تھا۔ اس انجینئر کو اپنے ہاتھوں تعمیر کردہ اس کارخانے سے اتنی محبت تھی کہ متعصب [illegible]لی کارندوں کی ہر قسم کی بداخلاقی اور

بدتمیزی کو برداشت کرتے ہوئے اور اپنے ہی خواہوں کی بار بار تنبیہہ کے باوجود اس نے یہاں سے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا ڈرائیور بھی بنگالی تھا۔ ایک روز جب بنگالی ملز میں ہنگامہ بپا کیے ہوئے ملز کو آگ لگانے لگے تو اس انجینئر نے ملز کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے بنگالی ڈرائیور کو کہا کہ اسے مزدوروں کے پاس لے چلے تاکہ وہ انھیں اپنے یہاں سے ہمیشہ کے لیے جانے کا بتا کر انھیں ملز کو آگ لگانے سے روکے۔ بنگالی ڈرائیور اسے مزدوروں کے درمیان لے جاکر جیپ سے اترا اور مزدوروں کو کہا کہ یہ انجینئر اب بھاگ رہا ہے، اسے جانے نہ دینا۔ مشتعل مزدوروں نے انجینئر کو جیپ کے پیچھے رسیوں سے باندھ کر پتھریلی زمین پر اس بری طرح سے گھسیٹا کہ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس واقعے کے بعد اس ملز میں ایک فوجی چوکی قائم کردی گئی تھی۔ بہت ہی کم امکان تھا کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بھی وہ چوکی وہاں قائم ہو لیکن بظاہر کوئی دوسری صورت سامنے نہ ہونے کے باعث میں نے اسی چوکی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

مگھ سردار، رانی اور مشیر کے علاوہ بھالا بردار عورتوں کی لاشوں کو خیمے میں چھوڑ کر ہم سب یکباری خیمے سے باہر نکلے۔ زہریلے تیر اور بھالے بھی ہمارے پاس تھے۔ آگے آگے ہمارے پیدل ساتھی تھے اور پیچھے ہم خچروں پر سوار۔ ہم نے چار پانچ فائر کیے اور چھ دستی بم مگھوں کی طرف پھینکے۔ کلپنا بھی ایک خچر پر سوار تھی۔ آدھے گھنٹے میں ہی ہم مگھوں کے علاقے سے باہر نکل آئے۔ دستی بموں نے گولیوں سے زیادہ اثر دکھایا۔ پہاڑی علاقے اور پتھروں کے باعث صرف چند مگھ زخمی ہوئے ہوں گے۔ وہ ہمیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ابھی ہم مگھوں کے بیچ میں سے گزر ہی رہے تھے کہ سردار کے خیمے میں ایک دھماکہ ہوا اور خیمہ ٹکڑے ہوکر نیچے آن پڑا۔ میری لاعلمی میں ہی قیصر نے خیمے میں ایک اپنا بنایا ہوا دستی بم فٹ کر دیا تھا اور اس کی پن کو ایک لمبے دھاگے سے باندھ کر دھاگے کا دوسرا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ ابھی ہم مگھوں کے قریب ہی تھے کہ دھاگہ ختم ہوگیا اور کھینچنے پر بم سے پن نکل گئی اور وہ پھٹ گیا۔ اگرچہ قیصر نے میری اجازت کے بغیر یہ کام کیا تھا لیکن میں نے اس سے اس کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ آخر میں کوئی عقل کل تو تھا نہیں۔ خیمے میں بم پھٹنے سے ایک تو مگھ فوراً ہی خیمے تک جانے سے کترائے ہوں گے اور اپنے سردار، رانی اور مشیر کے متعلق ہمیشہ اس شک و شبے میں مبتلا رہیں گے کہ آیا ہم نے انھیں ہلاک کیا یا وہ بم کے دھماکے سے ہلاک ہوئے۔ اس طرح ہمیں ان کی پہنچ سے نکلنے کے لیے وقت مل گیا۔ اگر مجھے یہ بات سوجھتی تو میں اس پر یقیناً عمل کرتا۔

شام ڈھلنے تک ہم پہاڑ کی ڈھلوان پر خاصا سفر طے کرچکے تھے۔ نقشے کے مطابق رانگا ماٹی ہم سے پچیس تیس میل دور تھا۔ ہم نے ندی کے کنارے پڑاؤ کیا۔ یہیں سے ہمیں کرنافلی پیپر ملز کو جانا تھا۔ میں نے قیصر اور اپنے نمبر ٹو کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ ہم اپنے قافلے کو دو حصوں میں

تقسیم کرلیں۔ میں، قیصر اور میرا نمبر ٹو اپنے ایک ایک ساتھی کے ہمراہ پیپر ملز کی طرف جائیں جبکہ باقی قافلہ رانگاماٹی جائے اور گاؤں کے باہر پڑاؤ کرے تاآنکہ ہم اپنے مشن سے لوٹ کر ان سے واپس آن ملیں۔ اگر رانگاماٹی والے قافلے سے پڑاؤ کے دوران کوئی ان کی آمد کی وجہ پوچھے تو یہ بتائیں کہ راجہ تری دیو رائے کے خطوط اور پیغام لے کر قافلے کا دوسرا حصہ ایک آدھ دن میں ان سے آن ملے گا۔ قیصر نے اپنے ایک معتمد ساتھی کو اس قافلے کی سرداری سونپی اور اسے کہا کہ وہ اور اس کے ساتھی تھائیوں پر نگاہ رکھیں، ان کی حرکات نوٹ کریں اور اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو بلاجھجک اسے گولی مار دیں۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ ایسی نوبت نہیں آئے گی کیونکہ اپنی طے شدہ منزل پر پہنچنے کے انتہائی قریب ہوکر کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرسکتا۔ مجھے خطرہ صرف حمید سے تھا۔ جب سے شمس کی پٹائی اور موت واقع ہوئی تھی، حمید ہم سے کچھ کھنچا کھنچا سا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد حمید کو بلایا اور اسے کہا کہ میرے دیے ہوئے ڈالر مجھے عارضی طور پر واپس کردے۔ میں بخوبی جانتا تھا کہ زادِ راہ ہی کسی کو بھاگنے میں مدد دے سکتا ہے۔ مگھ اور مورنگ قبائل کے خوف سے وہ نہ تو پیچھے پلٹ سکتا تھا اور پیسے کے بغیر بنگلہ دیش سے بنا پاسپورٹ کے گزرنا کم از کم اس کے لیے ناممکن تھا۔ میں نے اس سے ڈالر لیے اور قیصر نے اس کی جامہ تلاشی لی کہ شاید اس نے کوئی اسلحہ وغیرہ چھپا کر رکھا ہو۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے خچر اُن کے مالکان سے منہ مانگے داموں خرید کر اُنھیں واپس بھیج دیا۔ بقیہ قافلے سے وداع ہوکر ہم پانچوں پیپر ملز کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہاں سردی بھی کم تھی اور کہیں کہیں آبادی کے آثار بھی دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے دو روز کی ضرورت کا ٹن فوڈ ہمراہ لیا تھا اور ریوالور اور پسٹل کی جتنی گولیاں بھی قافلے میں موجود تھیں، وہ بھی لے لی تھیں۔ قیصر اور میرا نمبر ٹو حیران تھے کہ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر بھی مجھے اسلحے کی ضرورت کیوں محسوس ہورہی ہے۔ ایک دو بار انھوں نے پوچھا بھی لیکن میں نے یہ کہہ کر انھیں ٹال دیا کہ چکمہ قبیلے کے پاس تو فائر آرمز ہیں نہیں اور واپسی کے سفر کے دوران چکمہ کی رانی اور بیٹے کے ہمراہ ہونے کے باعث اگر ہمیں ضرورت پڑی تو ہم اسلحہ اور گولیاں کہاں سے حاصل کریں گے؟ اس لیے رانگا ماٹی جانے سے پہلے ہی ہمارا پوری طرح سے مسلح ہونا ضروری ہے جبکہ اصل وجہ جادوگرنی کا دکھایا ہوا وہ منظر تھا جسے میں ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہ کرسکا تھا۔

اپنی Mobility بڑھانے اور فوجیوں سے مقابلہ ہونے کی صورت میں چھپنے کے لیے ہم نے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ Compass (قطب نما) کی مدد سے راستے کا تعین کرتے ہوئے ہم نے رات نو بجے اپنا سفر شروع کیا اور دو بجے تک چلتے رہے۔ بقیہ رات ہم نے پتھروں پر لیٹ کر گزاری۔ فوجی چوکی پر حملے یا اس میں اچانک داخل ہوکر فوجیوں پر قابو پانے کا مکمل پلان میں نے ترتیب دیا تھا۔ پروگرام کے مطابق شام ساڑھے سات بجے پہلے مجھے اکیلے چوکی میں داخل ہونا تھا اور پیپر ملز

کے منیجر کے بنگلے کا پوچھنے کا بہانہ کرکے فوجیوں کی تعداد اور اسلحے کا جائزہ لینا تھا، اس وقت فوجی رات کا کھانا کھاتے ہیں۔ اگر حالات موافق اور فوجیوں کی تعداد اتنی ہوئی جن کو ہم زیر کرسکیں تو چوکی سے باہر آکر مجھے ایک مخصوص وسل بجا کر اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینی تھی جو قریب ہی چھپے بیٹھے ہوں گے۔ پھر ہمیں فوراً ہی اکٹھے چوکی میں داخل ہوکر فوجیوں کو ہینڈز اپ کرانا اور ان کا اسلحہ اور اسلحہ خانے سے ایمونیشن وغیرہ اٹھانا ہوگا۔ اگر انھوں نے مدافعت کی کوشش کی تو پہلے صرف سائیلنسر والے پسٹل کی ساری گولیاں چلا کر اور اگر پھر بھی ضرورت پڑی تو دوسرا اسلحہ استعمال کیا جائے گا۔

اگلا سارا دن چلتے رہنے کے بعد سہ پہر کو ہمیں پیپر ملز دکھائی دی اور ہم ایک چٹان کی آڑ میں تازہ دم ہونے کو بیٹھ گئے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ میں بخوبی جانتا ہوں اور قیصر بھی اسے آزما چکا ہے کہ فوجی بھی ہم جیسے ہی انسان ہوتے ہیں اور ان سے بھی فاش غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ گورکھپور کا ہوائی اڈہ مکمل اور فول پروف پلاننگ اور قیصر اور حبیب کی بے مثال بہادری کی وجہ سے تباہ ہوا۔ میرے اندازے کے مطابق اس چوکی میں صرف ایک گروپ یعنی بارہ فوجی ہوں گے جن کی کمان کسی صوبیدار یا کیپٹن کے پاس ہوگی اور دس بارہ فوجیوں پر بے خبری میں اسلحہ تان کر قابو پانا ہم پانچوں کے لیے کوئی مشکل نہیں، صرف دلیری اور تیزی سے عمل کی ضرورت ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا کیونکہ میرے اور قیصر کے سوا فوجیوں سے ابھی تک کسی نے ٹکر نہیں لی تھی۔ شام کو ساڑھے چھ بجے ہم ملز کی طرف روانہ ہوئے۔ فوجی چوکی ڈوبتے سورج کی شعاعوں میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔ یہ چوکی ملز کے احاطے کے باہر دریائے کرنافلی کے عین کنارے پر بنی ہوئی تھی۔ ملز کے ملازمین کے کوارٹر اور افسران کے بنگلے ملز کے احاطے کے اندر ہی تھے۔ ہم جن پتھروں کی اوٹ میں بیٹھے تھے اس کے آگے چوکی تک کوئی ایسا پتھر یا چٹان نہ تھی جس کے پیچھے چھپا جاسکے۔ ہمیں لامحالہ رات ڈھلنے کا انتظار کرنا تھا تاکہ کسی کی نظر میں آئے بغیر چوکی تک جاسکیں۔

اللہ کا نام لے کر ٹھیک سات بجے میں نے ساتھیوں کو چوکی کی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک دوسرے سے تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر چوکی کی طرف روانہ ہوئے۔ پندرہ منٹ میں چوکی کے احاطے میں پہنچ کر میں نے ایک بند دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک حوالدار نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ مشرقی پاکستان میں ملازمت کے دوران میں نے تھوڑی بہت بنگلہ بھاشا (بنگالی زبان) سیکھ لی تھی لیکن اپنے حلیے، قدو قامت اور رنگ سے میں قطعاً بنگالی نہیں لگتا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد کئی مغربی پاکستانی ڈھاکہ میں بنگلہ دیشی فوجیوں سے اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر وہیں رہ گئے تھے۔ چند ماہ تو انھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں انھیں تعلقات کی بنا پر بنگلہ دیشی شہریت مل گئی اور ان کے ضبط شدہ اثاثے اور کاروباری سہولتیں بھی بحال ہوگئیں۔ انھی میں میرے دو دوست بھی شامل تھے۔ ایک تو فرید خان تھا جس کی بے بی آئس کریم ڈھاکہ اور اس کے مضافات میں انتہائی مقبول تھی

اور گلستان سینما کے سامنے ہی اس کی مرکزی دکان تھی۔ دوسرا فلم اسٹار ہارون تھا جس کے دو تین کارخانے تھے وہاں کی مقبول ترین ''فیروز ڈائری'' بھی اس کی ملکیت تھی۔ چوکی پر میں نے فرید خان بن کر حوالدار سے اپنا تعارف کروایا اور کہا کہ مجھے فیکٹری کے جنرل منیجر کے گھر جانا ہے اور میرے ساتھ چار اور افراد بھی ہیں۔ حوالدار نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ پہلے یہاں چائے پئیں پھر ہمارا کوئی جوان آپ کو مطلوبہ بنگلے تک پہنچا دے گا۔ آپ اپنے ساتھیوں کو بھی بلالیں میں کیپٹن صاحب کو آپ کی آمد کی اطلاع دیتا ہوں۔ اچانک ہی اس نے سوال کیا کہ آپ کی گاڑی کہاں ہے؟ ''ہم تفریحی موڈ میں تھے لہٰذا چٹاگانگ تک ہوائی جہاز سے اور یہاں تک اسٹیمر سے آئے ہیں اور گھاٹ سے یہاں تک پیدل۔'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ حوالدار کیپٹن کو ہمارے متعلق بتانے چلا گیا۔ اس دوران میں نے دروازے سے باہر آکر ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ فوراً اندر آجائیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دوسرا دروازہ کھول کر جھانکا تو وہاں جوانوں کے بستر اور چار پائیاں وغیرہ تھیں۔ میرے پہلے اندازے کے خلاف یہاں پانچ کمرے تھے۔ کیپٹن کے دفتر کے علاوہ ایک کچن اور ایک کمرہ اسلحہ خانہ اور کوارٹر گارڈ ہوگا جہاں یقیناً مسلح پہریدار ہونا چاہیے تھا۔ جس کمرے میں حوالدار مجھے ٹھہرا کر کیپٹن کے پاس گیا تھا وہاں بھی تین بیڈ تھے۔ کیپٹن یقیناً ملز کے اندر مہمان خانے میں رہتا ہوگا۔ میں نے ازسرنو پلاننگ کرتے ہوئے بیک وقت گارڈ روم میں مسلح سپاہی پر قابو پاکر اسلحہ خانے پر قبضہ کرنا اور کیپٹن سے اس کا سائیڈ آرم چھیننا تھا۔

فوجی قانون کے مطابق ڈیوٹی دینے والوں کے سوا چوکی یا کمپنی، رجمنٹل سینٹر، بریگیڈ اور ڈویژن ہیڈکوارٹرز میں ڈیوٹی سے واپس آنے والے فوجی سب سے پہلے اپنا اسلحہ گارڈ روم میں جمع کرواتے اور روانگی اور آمد کی رپورٹ لکھواتے ہیں۔ میرے خیال میں ڈیوٹی دینے والے فوجی چوکی پر نہیں بلکہ ملز کے مختلف حصوں میں ڈیوٹی دینے پر مامور تھے۔ میرے ساتھی چوکی کے احاطے میں آگئے۔ میں نے فوری طور پر انھیں دو ٹولیوں میں تقسیم کرکے ایک ٹولی کو گارڈ روم میں مسلح گارڈ پر قابو پانے اور دوسری ٹولی کو جوانوں کو ہینڈز اپ کرانے کا کہا۔ جلدی جلدی دی ہوئی ہدایات میں نے بمشکل ختم ہی کی تھیں کہ حوالدار واپس آیا اور مجھے کیپٹن کے کمرے میں لے گیا۔ کیپٹن جوان اور خاصا اسمارٹ تھا۔ اس نے کھڑے ہوکر مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے بنگلہ زبان میں ''کیمون آچھن اور اپنور کے حال چھے'' کہہ کر انگریزی میں گفتگو شروع کی اور حوالدار میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے چائے کے انتظام کے لیے چلا گیا۔

ہمارے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ ڈیوٹی پر گئے ہوئے فوجی کسی بھی وقت واپس آسکتے تھے اور ان کے اسلحہ کے مقابلے میں ہمارے سائیڈ آرمز بالکل بیکار ثابت ہوتے۔ ان کی واپسی سے پہلے ہی ہمیں یہاں پر موجود تمام فوجیوں پر قابو پاکر انھیں بے ہوش کرنا اور تمام اسلحہ اور ایمونیشن لے کر

بغیر مقابلے کے غائب ہونا تھا۔ حوالدار کے جاتے ہی میں نے سائیلنسر لگا پسٹل نکالا اور اس سے پہلے کہ ہکا بکا کیپٹن کچھ سمجھ سکے، اس کے پاس جا کر اس کی کنپٹی سے لگا دیا اور کہا، ''یہ مذاق یا ایکٹنگ نہیں۔ میرے ساتھی تمہارے سب جوانوں پر قابو پا چکے ہیں۔ اگر اپنی اور اپنے جوانوں کی زندگی بچانا چاہتے ہو تو ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور میرے ساتھ چل کر اپنے جوانوں کو کہو کہ بلاچوں چرا اور کوئی حماقت کیے بغیر میرے احکام پر عمل کریں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے کیپٹن کی بیلٹ میں بندھے ہولسٹر سے اس کا ریوالور نکال لیا۔ اس کے ریوالور کے دستے پر بنے رنگ میں کلپ لگا تھا جو اس کے کندھے پر لگے اسٹارز کے فلیپ میں سے گزرتی ہوئی وسل پٹی میں لگا تھا۔ میں نے اس کے ریوالور کو کلپ سے آزاد کیا۔ کیپٹن نے ہاتھ اوپر اُٹھائے ہوئے تھے۔ اس کی کنپٹی سے اپنا پسٹل لگائے اور دوسرے ہاتھ میں اس کا ریوالور پکڑے میں اسے لے کر دوسرے کمرے میں آیا۔ قیصر اور میرے نمبر ٹو نے میری واپسی تک بڑی پھرتی دکھائی تھی۔ حوالدار سمیت سات جوانوں کو انھوں نے ہینڈز اپ کرا کے فرش پر لٹا رکھا تھا۔ میں نے کیپٹن کو کہا کہ اپنے جوانوں کو کہے کہ کوئی حرکت نہ کریں ورنہ سب کو گولی مار دی جائے گی۔ کیپٹن نے لفظ بلفظ میرے الفاظ بنگلہ زبان میں اپنے جوانوں کو کہے۔ ہم انھیں باندھنے کے لیے رسیاں لانی بھول گئے تھے۔ میں نے نمبر ٹو کو کہا تو اس نے فوری طور پر جوانوں کی چارپائیاں کی ادوانیں کاٹ کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ ادھر قیصر نے ان کے بستروں کو چادروں کے ٹکڑے کر کے اور ان کے منہ میں ٹھونس کر اچھی طرح سے بند کر دیا اور تھائیوں نے ان کے ہاتھ پیچھے باندھ دیے۔
ابھی ہمارا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ ہمیں گارڈ روم کے مسلح جوان کو قابو کر کے اسلحہ خانے کی چابی لینی، سارا اسلحہ اور ایمونیشن نکالنا، ان سب کو گارڈ روم میں لے جا کر بے ہوش کرنا اور کچن میں کام کرنے والے لانگری کو بھی بے ہوش کرنا تھا۔ ان کی نگرانی پر اپنے تین ساتھیوں کو چھوڑ کر میں اور قیصر گارڈ روم میں گئے۔ وہاں مسلح گارڈ اپنی رائفل قریبی میز پر رکھے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی رائفل اٹھا کر ہم نے اسے فوری قابو کر لیا اور اسلحہ خانے اور کوارٹر گارڈ کی چابی مانگی۔ دونوں چابیاں اس نے بلا حیل و حجت ہمارے حوالے کر دیں۔ قیصر نے پستول کا دستہ اس کے سر کی پچھلی جانب مار کر اسے بے ہوش کیا اور کوارٹر گارڈ کھول کر اسے گھسیٹ کر اس میں ڈال دیا۔ کوارٹر گارڈ کے ساتھ ہی اسلحہ خانہ تھا جہاں دس آٹومیٹک رائفلیں، دو ریوالور اور گولیوں کے بکس پڑے تھے۔ اب ہم کچن میں گئے۔ لانگری چائے بنانے میں مصروف تھا۔ ابھی وہ ہماری طرف پلٹا بھی نہ تھا کہ میں نے ریوالور کے دستے مار کر اسے بھی بے ہوش کر دیا اور قیصر نے اسے گھسیٹ کر کوارٹر گارڈ میں ڈال دیا۔ کیپٹن کی جیپ احاطے میں کھڑی تھی اور اس کی چابی بھی دوسری چابیوں کے ساتھ گارڈ روم میں دیوار سے ٹنگی ہوئی تھی۔ میں نے وہ چابی بھی اٹھا لی۔ قیصر اور میں اب پھر اس کمرے میں آئے جہاں کیپٹن سمیت دوسرے جوان بندھے ہاتھوں فرش پر پڑے تھے۔ ایک تھائی نے رسیاں اور چادروں کے ٹکڑے اٹھائے۔ ہم نے اسلحہ

کے نوک پر انھیں سنگل فائل میں کوارٹر گارڈ چلنے کو کہا۔ وہ اتنے ڈرے ہوئے اور اتنے دہشت زدہ تھے کہ فوراً ہی چلے پڑے۔ کوارٹر گارڈ میں وہ سنگل فائل میں ایک ایک کر کے داخل ہو رہے تھے اور قیصر اور میں دونوں طرف کھڑے ریوالوروں کے دستے مار مار کر انھیں بے ہوش کرتے رہے۔ جب وہ سب بے ہوش ہو گئے تو ہم پانچوں نے ان کی ٹانگیں اور پاؤں باندھے اور کوارٹر گارڈ کو بند کر کے تالا لگا دیا۔ اب ہم اسلحہ خانے کی طرف بھاگے اور سارا اسلحہ اور ایمونیشن کیپٹن کی جیپ میں منتقل کر دیا۔
مجھے اچانک ایک بات یاد آئی، میں کیپٹن کے کمرے میں گیا اور ٹیلیفون کی تاریں کاٹ دیں اور وائرلیس سیٹ پر سائیلنسر والے پسٹل سے دو فائر کر کے اسے بھی ناکارہ کر دیا۔ چوکی میں داخلے کے وقت سے لے کر جیپ اسٹارٹ کرنے تک ہمارے بائیس منٹ صرف ہوئے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے تیز رفتاری سے جیپ چلاتے ہوئے ملز کی سڑک عبور کی اور بڑی سڑک پر آ گیا۔ ہمیں ضرورت سے زیادہ اسلحہ اور ایمونیشن مل چکا تھا۔ ہم نے احتیاطاً چار رائفلیں اور ان کے آٹھ سو راؤنڈز، تین ریوالور اور ان کی تمام گولیاں جو تین سو سے زائد تھیں، اپنے لیے الگ کر لیں۔ ہمیں اب مغرب کی طرف جانا تھا جبکہ سڑک جنوب کو گھوم رہی تھی۔ یہیں پر ایک جگہ سڑک پہاڑ کے اس حصے سے گزر رہی تھی جس سے چند فٹ کے فاصلے پر کم از کم دو سو فٹ گہرائی میں دریائے کرنافلی بہہ رہا تھا۔ ہم نے یہیں پر جیپ اور فالتو اسلحہ کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا۔ جیپ کو نیوٹرل کر کے ذرا سا دھکیلا اور وہ لڑھکنیاں کھاتی سینکڑوں فٹ گہرائی میں بہتے دریا میں گری اور ڈوب گئی۔ اس پہاڑی علاقے میں دریا کی تیز رفتاری سے بہنے کا اس قدر شور اٹھتا ہے کہ اس میں جیپ کے گرنے کی آواز تک سنائی نہ دی۔ ہم نے تیز قدموں سے سڑک کا کچھ حصہ طے کیا اور پھر سڑک چھوڑ کر جنوب کو گھوم گئے اور پتھر پھلانگتے سڑک سے دور ہوتے گئے۔ Compass نے اس سفر میں ہماری بہت مدد کی۔ میں نے تو یہاں آتے وقت کوئی ایسی نشانی ذہن میں نہیں رکھی تھی لیکن میرے نمبر ٹو نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آتے وقت ہم نے یہاں تھوڑی دیر آرام کیا تھا اور چائے بھی پی تھی۔ رائفلوں اور ایمونیشن کے وزن اور تھکاوٹ کے باعث ہم میں اب یہاں آنے والی تیزی نہیں رہی تھی۔ رات کو اندھیرے میں پتھروں سے ٹکراتے سفر کرنا بھی مشکل تھا۔ ہم نے ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں پڑاؤ کیا اور ٹن فوڈ کھا کر چائے پی۔ میں نے چاروں ساتھیوں کی رات کو پہرہ دینے کی دو، دو گھنٹے کی ڈیوٹی لگائی۔ اگرچہ اس علاقے میں بھی سانپ اور بچھو کثرت سے تھے لیکن ہم نے احتیاطاً الاؤ نہیں جلایا۔ دوسرے دن صبح نو بجے ہم اپنے بقیہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ فوجی آٹومیٹک رائفلیں ہم نے اپنے کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں۔ یہ کوئی ایسا راستہ نہ تھا جس پر آمد و رفت ہو۔ جہاں کہیں دور سے بھی آبادی کے آثار دکھائی دیتے، ہم چکر کاٹ کر آبادی سے دُور ہو کر گزرتے۔ مجھے یقین تھا کہ گزشتہ شام چوکی پر پیش آئے واقعات کی اطلاع اب تک ڈویژن ہیڈکوارٹرز تک پہنچ چکی ہوگی اور ہماری ہر جگہ

تلاش بھی ہو رہی ہوگی لیکن ہمارے حلیے کے مطابق کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم بھارت سے سرحدی پہاڑ عبور کر کے مورنگ اور مگھ قبائل سے گزرتے ہوئے چوکی پر حملہ کر کے رانگا ماٹی کی طرف جا رہے ہوں گے۔

سارا دن چلتے رکتے اتنے وزن کے ساتھ ہم نڈھال ہو چکے تھے۔ سرِشام ہی ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور رات بھر گہری نیند کے مزے لوٹے۔ رانگا ماٹی ابھی ہم سے خاصی دوری پر تھا۔ ہم اگر چاہتے تو رات کا کچھ حصہ بھی سفر میں گزار سکتے تھے لیکن میری اور میرے ساتھیوں کی حالت ایسی دگرگوں ہو رہی تھی کہ اگر ہم بھرپور آرام نہ کرتے تو ہم میں سے کوئی یقیناً بیمار ہو کر چلنے سے معذور ہو جاتا۔

اگلی صبح آٹھ بجے ہم تازہ دم ہو کر روانہ ہوئے۔ بقول میرے نمبر ٹو کے ہم اسی راستے سے کرنافلی گئے تھے۔ میری پہلی اور اکلوتی نشانی وہ ندی تھی جس کے کنارے کنارے ہم مورنگ اور مگھ قبائل سے گزر کر آئے تھے۔ بعد دوپہر اچانک ہی وہ ندی ہمارے سامنے آ گئی۔ اسے دیکھتے ہی میری سفر کی ساری کوفت دور ہو گئی۔ یہی حال میرے ساتھیوں کا تھا۔ رانگا ماٹی اب ہم سے پچیس میل کے فاصلے پر تھا۔ ندی میں ہم نے غسل کیا اور شیو وغیرہ بھی بنائی۔ یخ بستہ پانی سے غسل ہمیں اس وقت بہت بھلا محسوس ہوا۔ میرے تمام ساتھیوں کی رائے تھی کہ ہم اپنا سفر جاری رکھیں اور چاہے ہمیں آدھی رات تک ہی کیوں نہ چلنا پڑے ہم کو رانگا ماٹی میں اپنے ساتھیوں کے پڑاؤ تک بغیر رکے پہنچنا چاہیے۔ میں نے ان کی اس تجویز سے اختلاف کیا اور کہا کہ ہم ساتھیوں کے پڑاؤ سے دو چار میل پہلے پڑاؤ کریں گے اور اگلی صبح اپنے ساتھیوں سے جا ملیں گے۔ میرے اس اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ ہم کسی کاسموپولیٹن شہر میں نہیں بلکہ ایک کم وحشی قبیلے میں جا رہے تھے جہاں ہمیں خلاف توقع ناموافق حالات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا تھا۔ ایسی صورت حال میں کم از کم دن کی روشنی تو ہوتی جس میں ہم حالات کا مقابلہ کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہوتے۔

رانگاماٹی میں اس وقت بجلی نہیں تھی اور میرے خیال میں اب بھی نہیں ہوگی۔ ہم نے اپنا پڑاؤ اپنے قافلے سے اندازاً پانچ میل پہلے کیا۔ دوسری صبح ہم رانگاماٹی کی طرف روانہ ہوئے۔ اس چھوٹے سے قصبے کے قریب ہی ہمیں اپنے قافلے کے پڑاؤ کے نشان دکھائی دیے۔ ٹن فوڈ کے ڈبے بھی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے لیکن قافلے کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ ہم حیران تھے کہ آخر قافلہ کہاں غائب ہو گیا؟ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ ہم قصبے میں جاتے ہیں ممکن ہے وہاں ان کا سراغ مل جائے۔ پریشان ہم سب ہی تھے۔ میں سارے قافلے کے گم ہونے سے پریشان تھا تو قیصر اور نمبر ٹو اپنے اپنے ساتھیوں کے لیے۔ قصبے میں داخل ہو کر ہم نے راجہ کی حویلی کا رخ کیا۔ یہاں میں کئی بار آ چکا تھا۔ ابھی ہم حویلی کے قریب ہی پہنچے تھے کہ قیصر کا ایک ساتھی چار پانچ چکمہ مردوں کے ہمراہ ہماری طرف

آتا دکھائی دیا۔ ہمارے پاس آ کر وہ پہلے قیصر اور اپنے بھارتی ساتھی سے لپٹا اور پھر مجھ سے اور نمبر ٹو اور اس کے ساتھی سے بغل گیر ہوا۔ اس نے بتایا کہ پڑاؤ کے اگلے روز ہی صبح چکمہ بھالے برداروں نے انھیں گھیر لیا۔ آپ کی ہدایت کے مطابق ہم نے انھیں بتایا کہ ہم نے براجہ صاحب سے ملنا ہے اور ہمارے قافلہ سالار ہمیں دو روز میں آن ملیں گے۔ وہ راجہ تری دیو رائے کا پیغام اور خط اپنے ہمراہ لائے ہیں۔ صرف راجہ تری دیو کا نام ان کے پلے پڑا کیونکہ وہ ہماری زبان نہیں جانتے تھے۔ وہ میرے دو ساتھیوں کو اور مجھے لے کر حویلی میں چلے گئے۔ کئی گھنٹے کے انتظار کے بعد راجہ صاحب کے لڑکے نے ہمیں ملاقات کے کمرے میں بلایا۔ وہ بخوبی انگریزی بولتا اور سمجھ سکتا ہے۔ ہمارا ایک ہمراہی انگریزی میں تھوڑی بہت شدبد رکھتا ہے۔ اس نے ساری بات راجہ کو بتائی تو راجہ بہت خوش ہوا اور اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سارے قافلے والوں کو یہاں لے آئیں کیونکہ وہ سب ہمارے مہمان ہیں۔ ہمیں مہمان خانے کے تین کمروں میں ٹھہرایا گیا اور کلپنا کو وہ زنان خانے میں لے گئے۔ اس وقت سے لے کر اب تک ہم نے کلپنا کی صورت تک نہیں دیکھی۔ ہماری خوب اچھی طرح سے خاطر مدارت ہو رہی ہے۔ ہر روز ایک زندہ بکری اور آٹھ زندہ مرغیاں اور پکانے کا تمام سامان ہمیں دیا جاتا ہے۔ رات کو سونے کے لیے آرام دہ بستر ہیں اور آپ کی آمد کا شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ راجہ ہر روز اپنے چار پانچ افراد کے ساتھ ہمیں ہمارے پڑاؤ کے راستے پر بھیجتا ہے اور چار چار گھنٹے کے بعد ہماری باری تبدیل ہوتی ہے۔ راجہ نے اپنے آدمی خاصی دور تک آپ کی تلاش اور اطلاع دینے کے لیے بھیج رکھے ہیں۔ کل رات اس کے بھیجے گئے آدمیوں نے آ کر بتایا کہ پانچ اجنبی مسافر رانگا ماٹی سے چند میل دور پڑاؤ کر رہے ہیں۔ راجہ نے اب مجھے اپنے آدمیوں کے ساتھ اس لیے بھیجا تھا کہ تصدیق کر سکوں کہ آنے والے اجنبی مسافر آپ ہی ہیں یا کوئی اور۔ آپ سے گلے ملتے دیکھ کر اس کے وہ آدمی اسے آپ کی آمد کی اطلاع دینے فوراً واپس چلے گئے۔ اس لڑکے کی ساری باتیں سن کر میں نے اس سے پوچھا کہ تم لوگوں کا اسلحہ کہاں ہے؟'' سب ہمارے پاس ہے اور راجہ نے کوئی تعرض نہیں کیا۔'' تم راجہ تری دیو کے لڑکے کو راجہ کیوں کہہ رہے ہو؟'' میرے اس سوال کے جواب میں لڑکا بولا، ''میں اور تو کچھ نہیں جانتا لیکن سبھی اسے راجہ کہتے ہیں، اس نے تاج پہن رکھا ہے اور راجہ کے تخت پر وہی بیٹھتا ہے۔'' لڑکے کے اس جواب سے میرا ایک اندیشہ صحیح ثابت ہو گیا۔ میں خاموشی سے حویلی کی طرف بڑھتا گیا لیکن سوچ رہا تھا کہ حکمرانی کا نشہ کسی خونی رشتے کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اخلاقی اور سماجی قدریں تو بہت معمولی باتیں ہیں۔

چکمہ قبیلے کے سردار راجہ تری دیو رائے کی صرف عدم موجودگی میں اس کی زندگی میں ہی اس کا بیٹا قبیلے کا سردار بن بیٹھا تھا اور اس کے تاج اور تخت پر نہ صرف قبضہ کر لیا تھا بلکہ قبیلے پر باقاعدہ حکمرانی بھی کر رہا تھا۔ اس خلاف توقع اور بدلی ہوئی صورت حال میں مجھے نہایت پھونک

پھونک کر قدم اٹھانا تھا۔ حویلی تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر قیصر کے ساتھی کی بتائی ہوئی بات درست نکلی تو میں راجہ تری دیو کا وہ خط جس میں اس نے عنقریب اپنی قبیلے میں واپسی کا لکھا تھا، راجہ کے بیٹے کو نہ دوں بلکہ اس کی جگہ وہ خط دوں گا جس میں اس نے اپنے شاہی فرمان میں بڑے بیٹے کو سردار بنانے اور تمام قبیلے کو اس کی سرداری تسلیم کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس طرح میں اس کے بیٹے کی خوشنودی حاصل کر کے رانی اور چھوٹے بیٹے کے ساتھ اس کے خاندانی جواہرات لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ پرامن اور بخیریت واپسی کی امید کرسکتا ہوں۔ مجھے کلپنا کے متعلق بھی یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس نے موجودہ راجے کو دانستہ یاغیردانستہ طور پر ہمارے مورنگ اور مگھ قبائل کے ساتھ تصادم اور ان کے مدفون خزانے کو حاصل کر لینے کے واقعات بھی نہ بتا دیے ہوں۔ راولپنڈی سے اس مہم پر روانگی کے وقت مجھے صرف اتنا علم تھا کہ تھائی لینڈ، برما اور آسام (بھارت) سے گزر کر مجھے چکمہ قبیلے تک پہنچنا اور رانی، چھوٹے بیٹے اور جواہرات کے ساتھ واپس راولپنڈی لوٹنا تھا۔ دوران سفر مجھے جن حالات سے گزرنا پڑا اگر ان کے متعلق مجھے ذرا سا بھی علم ہوتا تو میں قطعاً اس مہم کو سر کرنے کی ہامی نہ بھرتا۔ میری مشکلات میں تازہ ترین اضافہ بنگلہ دیشی فوج سے اسلحہ چھیننا اور راجے کے بیٹے کا از خود ہی سردار بن بیٹھنا تھا۔

جیسا کہ گزشتہ اقساط میں کہیں تحریر کر چکا ہوں، مورنگ اور مگھ قبائل کے مقابلے میں چکمہ قبیلہ زیادہ مہذب اور تہذیب یافتہ تھا۔ راجہ تری دیو کے دور سرداری میں اس قبیلے کے افراد چٹاگانگ اور کاکس بازار میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ کاکس بازار میں سگار بنانے کے کئی درمیانے درجے کے کارخانے ہیں۔ وہاں چکمہ عورتیں ہی اپنے ہاتھوں سے سگار بناتی اور لپیٹتی (Roll) تھیں۔ ان کی عورتیں ایک یا سوا گز کپڑے کو اپنے جسم کے نسوانی حصوں پر اس طرح باندھتی تھیں کہ کپڑا باندھے ہوئے بھی یوں محسوس ہوتا کہ کچھ نہیں پہنا ہوا۔ عورت کی نیم عریانی، مکمل عریانی سے زیادہ ہیجان خیز ہوتی ہے۔ سارے بنگال میں چکمہ عورتوں کے حسن کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ شہری زندگی سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے چکمہ قبیلے کے کچھ لوگوں نے اپنے علاقے کی مخصوص گھریلو صنعتیں مثلاً سگار اور جیوٹ (پٹسن) اور گھاس کو ملا کر بنے ہوئے کپڑے بھی چٹاگانگ کی مارکیٹ میں فروخت کرنے شروع کر دیے تھے۔ راجہ تری دیو رائے انگلینڈ کا پڑھا ہوا ایک شستہ انسان تھا جسے حکومت پاکستان نے کیپٹن کا اعزازی عہدہ دیا تھا اور وہ جم خانہ کلب کا ممبر اور ایوننگ پارٹیوں کا دلدادہ تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستان سے اپنی وفاداری دکھاتے ہوئے اس نے بنگلہ دیشی حکومت کو تسلیم نہیں کیا اور اسی جرم کی پاداش میں بنگلہ دیشی فوج نے اس قبیلے کے نشیبی علاقے کو گھیرے میں لے کر چکمہ قبائل کا چٹاگانگ اور دوسرے شہروں سے رابطہ منقطع کردیا تھا۔ راجہ تری دیو کو ذوالفقار علی بھٹو نے مرکزی حکومت کا پروڈکشن منسٹر بنادیا تھا اور اسی منسٹری کے زمانے میں مجھے اس مہم پر بھیجا گیا۔

حویلی کے دروازے پر چار معزز چکمہ مرد کھڑے تھے جو یقیناً راجہ کے درباری یا مشیر ہوں گے۔ ان کے ہمراہ چھ نیزہ بردار بھی تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان نیزہ برداروں نے بالکل مغلیہ دور کا لباس پہنا ہوا تھا۔ راجہ تری دیو نے مجھے بتایا تھا کہ مغلوں کے ساتھ اس کے بزرگوں کی دو تین جنگیں ہوئی تھیں جن سب میں مغلوں کو شکست ہوئی اور وہ اپنا توپ خانہ تک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جو مغل سپاہی اور عہدے دار چکمہ قبائل کے ہاتھوں گرفتار ہوئے، انھیں ذلیل کرنے کے لیے ان کے پہنے ہوئے لباس میں ہی انھیں نیم عریاں چکمہ سرداروں کی خدمت اور دربانی پر لگا دیا گیا۔ وہ رسم آج تک رائج ہے اور چکمہ قبیلے کے ہی افراد میں سے چن کر ان کے لیے مغلیہ دور کا مخصوص لباس بنوایا جاتا ہے جسے پہن کر یہ حویلی کی دربانی کرتے ہیں۔ راجہ تری دیو نے مجھے مغلوں سے چھینی ہوئی توپیں اور دوسرے ہتھیار بھی دکھائے تھے جنھیں مغل فوج شکست کھانے کے بعد چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ راجہ کے بقول اس کے قبیلے نے سوائے پاکستان کے کبھی بھی کسی ہندو یا مسلمان حکمران اور برطانوی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ برطانوی دور میں حکومت سے ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے مطابق اس قبیلے کی سرداری اور خود مختاری کو تسلیم کرتے ہوئے ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اور چکمہ قبیلے کے لوگوں کو روزگار اور حصول معاش کے لیے چٹاگانگ اور دوسرے شہروں تک جانے کی اجازت ملی تھی۔ اسی معاہدے کی وجہ سے راجہ تری دیو رائے کو انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستانی حکومت نے اس قبیلے سے نہ صرف برطانوی معاہدے کی تمام شرائط کو برقرار رکھا بلکہ جذبۂ خیر سگالی کے طور پر سردار کو اعزازی کیپٹن کا عہدہ بھی دیا۔ اس قبیلے کی پاکستان سے وفاداری کسی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ سقوط ڈھاکہ (دسمبر 1971ء) کے بعد بہت سے پاکستانی فوجی جنھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے، اسی قبیلے کی مدد سے برما پہنچے اور وہاں سے پاکستان آئے۔ اس قبیلے کے سردار راجہ تری دیو رائے نے بنگلہ دیشی حکومت کو تسلیم نہیں کیا اور سقوط ڈھاکہ سے چند روز پیش تر مغربی پاکستان چلا آیا۔ بنگلہ دیشی فوج نے قبیلے کو زیر کرنے کے لیے کئی بار رانگاماٹی پر حملہ کیا۔ جہازوں سے بمباری بھی کی گئی لیکن ناقابل عبور راستوں، دریاؤں پر پلوں کے نہ ہونے اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے بنگلہ دیشی فوج کے سارے میدانی اور ہوائی حملے ناکام ہوئے اور چکمہ قبائل کے تیر اندازوں نے اپنے جسموں پر مختلف رنگ لگا کر گھنے درختوں پر خود کو کیموفلاج کر کے بنگلہ دیشی فوج پر زہریلے تیروں کی بارش کردی۔ ہر حملے میں بنگلہ دیشی فوج کو خاصا جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ ہوائی حملوں میں بھی بمباری پہاڑی علاقہ ہونے کے باعث ناکام ثابت ہوئی۔ آخری حربے کے طور پر رانگاماٹی کے جنوب میں پہاڑوں کے زیریں حصوں پر بنگلہ دیشی فوج نے ایسی ناکہ بندی کی کہ نہ تو کوئی شخص رانگاماٹی جاسکتا تھا اور نہ ہی وہاں سے کوئی بنگلہ دیشی شہروں میں، ان کی نگاہ میں آئے بغیر آ سکتا تھا۔ اسی ناکہ بندی کے باعث ہم نے تھائی لینڈ، برما،

آسام اور میزو، مورنگ اور مگھ قبیلوں سے گزرنے کی صعوبتیں اٹھائیں اور شمالی جانب سے رانگاماٹی میں داخل ہوئے۔

ہم سب راجہ کے مشیروں اور نیزہ برداروں کے ساتھ حویلی کی طرف روانہ ہوئے۔ حویلی میری جانی پہچانی تھی۔ ہمیں اس بڑے ہال میں لے جایا گیا جہاں پر راجہ قبائل کے مسائل سنتا اور فیصلے کرتا تھا۔ اسی کمرے میں ایک آبنوسی لکڑی کا تخت بھی تھا جس پر مختلف جگہوں پر چھوٹے چھوٹے جواہر لگے ہوئے تھے۔ اس ہال میں چالیس سے زیادہ کرسیاں دیواروں کے ساتھ قطاروں میں پڑی تھیں۔ ہال کے بیچ میں قبیلے کے لوگوں کے بیٹھنے کے لیے پرانے قالین بچھے ہوئے تھے۔ (قبیلے کا کوئی فرد یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سردار کے سامنے کرسی پر بیٹھ سکے) میں اس ہال یا دربار میں راجہ تری دیو کے ہمراہ پہلے بھی جا چکا تھا اور راجہ نے دیواروں پر سجی تلواریں، زرہ بکتر، ڈھالیں اور توڑے دار بندوقیں دکھاتے ہوئے بتایا تھا کہ انھیں مغلوں سے مختلف اوقات میں جنگوں کے دوران چھینا گیا تھا۔ مشیروں نے ہمیں کرسیوں پر بٹھا دیا۔ میرے کہنے پر ایک مشیر نے جو انگریزی جانتا تھا ہمارے باقی ساتھیوں کو بھی وہاں بلوالیا۔ سوائے کلپنا کے سبھی ساتھی وہاں آگئے۔ ایک دوسرے سے ملنے اور خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد ہم راجہ کی آمد کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ یہاں پر موجود ہمارے کسی ساتھی کو بھی کلپنا کے متعلق کوئی علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟ حمید ابھی تک اکھڑا اکھڑا نظر آتا تھا۔ میں ان نئے اور غیر متوقع حالات کی روشنی میں راجہ کے لڑکے سے جو سردار بن بیٹھا تھا، گفتگو کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ ایک فیصلہ تو میں نے کرلیا تھا کہ رانی کو راجہ تری دیو کا خط موجودہ سردار سے گفتگو کرنے اور اس کا رویہ دیکھنے کے بعد ہی دینے کا فیصلہ کروں گا۔ موجودہ حالات کی روشنی میں یہ ناممکن دکھائی دیتا تھا کہ رانی صاحبہ کو ان کا خط جس میں خاندانی جواہرات ہمراہ لانے کا لکھا تھا، ڈائریکٹ سردار کے علم میں لائے بغیر اور اس کے پڑھے بغیر پہنچا سکوں۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ راجہ تری دیو کا لڑکا اور موجودہ سردار پتلون اور بند گلے کا کوٹ پہنے اور سر پر تاج رکھے اپنے درباریوں کے ساتھ ہال میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کی تعظیم میں ہم سب کھڑے ہوگئے اور جب تک تخت پر بیٹھ کر اس نے ہمیں اشارے سے بیٹھنے کی اجازت نہ دی ہم سب کھڑے رہے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ صاف ستھری انگریزی میں بولا، ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے والد اور چکمہ کے سابق سردار کا پیغام لے کر کوئی آیا ہے۔ وہ شخص میرے قریب آئے اور مجھے بتائے کہ کیا پیغام ہے؟'' میں اپنی کرسی سے اٹھا۔ راجہ تری دیو کا وہ خط جس میں اس نے قبیلے کی سرداری اپنے بیٹے کو سونپنے کا فرمان لکھا تھا، اپنی جیب سے نکالا اور دونوں ہاتھوں میں لیے سردار کی طرف بڑھا۔ سردار نے میرے ہاتھوں سے خط اٹھایا اور مجھے اپنے تخت کے قریب ترین بچھی کرسی پر جہاں اس کا مشیر اعلیٰ بیٹھا تھا، بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مشیر اعلیٰ نے اس کے حکم کی

تعمیل میں اپنی کرسی میرے لیے فوراً خالی کردی اور خود ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ لفافہ خاصا بڑا اور وزنی تھا۔ اس میں شاہی فرمان قبیلے کی زبان میں بڑے حروف میں ایک نہایت اعلیٰ اور موٹے کاغذ پر لکھا ہوا تھا اور لاکھ کے ساتھ اس پر شاہی مہر بھی ثبت تھی۔ دوسرا خط راجہ کی وزارت کے لیٹر ہیڈ پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا جس میں میرے ہمراہ رانی اور چھوٹے بیٹے کو بھیجنے کا تحریر تھا۔ سردار نے دونوں خط پڑھے اور ہنستے ہوئے انگریزی میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''قبیلے کے موجودہ سردار کو سابق سردار نے سردار بنانے کا حکم نامہ بھیجا ہے۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ سابق سردار کا یہ فرمان میرے لیے بالکل بیکار ہے۔ جہاں تک سابقہ رانی اور میرے چھوٹے بھائی کو تمہارے ساتھ بھیجنے کا سوال ہے تو اس بارے میں ان سے میں مشورہ کروں گا اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گا۔ یہاں تک پہنچنے میں تمہیں جن دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، ان میں سے کچھ کا علم مجھے تمہاری ساتھی عورت کے ذریعے ہو چکا ہے اور میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے یہ صعوبتیں برداشت کیں۔ اس عورت نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ تم نے مگھ اور مورنگ قبیلے کا موروثی خزانہ بھی ڈھونڈ نکالا ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟'' ''جی ہاں! بالکل درست ہے اور اسی خزانے کے جواہر کو بیچنے کے لیے میں چٹا گانگ گیا تھا۔ اس کی جو رقم ملی وہ میں نے تھائی لینڈ ٹرانسفر کردی ہے۔ اسی لیے میں اپنے قافلے سے تین روز بعد یہاں پہنچا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ میرا جواب سن کر سردار کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ وہ کچھ دیر خشمگیں آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا اور پھر بولا، ''ہم تینوں قبائل ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے لیکن اصولاً یہ خزانہ ان قبائل میں ہی رہنا چاہیے تھا۔ کوئی غیر قبائلی کیونکر اس کا مالک بن سکتا ہے؟'' ''بالکل ویسے ہی جیسے مستند روایات کے مطابق یہ خزانہ کسی مغل سپہ سالار سے چھینا گیا تھا جو یقیناً ان قبائل کا فرد نہیں تھا۔'' اس بات کے ساتھ ہی میں نے کہا، ''سردار! میں چاہتا ہوں کہ آپ سے علیحدگی میں اور درباری ماحول کے بجائے دوستانہ ماحول میں باتیں کروں۔ میں آپ کے والد کا بے تکلف اور گہرا دوست ہوں اور اسی لیے اس مہم کی ذمہ داری انھوں نے مجھے سونپی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس ملاقات سے آپ مایوس نہیں ہوں گے۔ ایک بات اور! میں کلپنا سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے حفاظت سے اس کے گھر دارجلنگ تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔'' سردار نے خاموشی سے میری بات سنی اور بولا، ''بہت جلد آپ سے علیحدگی میں ملاقات ہوگی۔ جہاں تک کلپنا کا تعلق ہے تو وہ میری دوسری رانی بننے اور ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے پر بخوشی تیار ہے۔ میں کوئی زبردستی نہیں کر رہا۔ کلپنا سے آج شام آپ کی ملاقات ہو جائے گی اور صرف خادمائیں اس ملاقات کے دوران موجود ہوں گی۔ اسے رانی بنانے کا جشن بھی عنقریب منایا جائے گا۔ کلپنا نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کے پاس ڈھیر سارا اسلحہ ہے۔ آپ میرے والد کے دوست ہیں اور ان کی ایما پر ہی یہاں آئے ہیں۔ میں آپ سے صرف یہ کہوں گا کہ اپنا اسلحہ بے شک

اپنے پاس رکھیں لیکن ہمارے قبیلے کی حدود میں اسے استعمال نہ کریں۔'' یہ کہہ کر سردار اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا، ''کلپنا سے آپ کی ملاقات کے بعد ہماری محفل جمے گی تب آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں دوست نوازی میں اپنے والد سے بھی چار ہاتھ آگے ہوں۔''

راجہ نے میرے لیے آرام دہ فرنیچر سے سجا ایک کمرہ مخصوص کردیا تھا اور میرے ساتھیوں کو بھی اب تین کے بجائے چار کمرے دیے گئے تھے۔ میں بستر پر لیٹا تو ایسا محسوس ہوا کہ راولپنڈی سے یہاں تک جن مشکلات اور تکلیفوں کا سامنا مجھے کرنا پڑا ان کا اصل احساس منزل پر پہنچ کر ہی ہوتا ہے۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ کمزوری کے باعث گالوں کی ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹانگوں کو ہاتھ لگایا تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی پھوڑے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میں نے سوچا کہ تھکاوٹ دور کرنے کا واحد علاج اچھی خوراک اور جسم کی روزانہ مالش ہے۔ میں نے راجہ تری دیو کی بیوی، بیٹے اور جواہرات کے خزانے کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ ہمیں ابھی یہاں خاصا وقت قیام کرکے اول اپنی صحت بحال کرنی تھی اور ساتھ ساتھ کوئی ایسا طریقہ بھی سوچنا تھا جس سے موجودہ سردار اپنی رضامندی سے اپنی ماں اور بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔ کوئی ایسی سبیل بھی تلاش کرنی تھی کہ راجہ کی بیوی سے علیحدگی میں مل کر اس کے شوہر کا خط اسے دے سکوں تاکہ وہ موقع دیکھ کر جواہرات میرے حوالے کردے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر نکلا۔ دو چکمہ بظاہر میری خدمت کے لیے موجود تھے۔ ان کے ہمراہ میں ساتھیوں کے کمروں کی طرف گیا اور تمام ساتھیوں کو ایک کمرے میں اکٹھا کرکے انھیں کہا کہ اپنے اسلحہ کی پوری طرح سے حفاظت کریں۔ سب بڑا اسلحہ ایک کمرے میں رکھیں اور ہمہ وقت کم ازکم دو ساتھی اس کی نگرانی کریں۔ پسٹل اور ریوالور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں اور سردار کے کہنے کے مطابق قطعاً ہرگز فائر نہ کریں۔ دوسری ہدایت یہ دی کہ حویلی سے زیادہ دور نہ جائیں اور ہمیشہ دو دو کی ٹولی میں جائیں۔ قیصر نے اپنے جس ساتھی کو ہماری کرنافلی روانگی کے وقت قافلے کی ذمہ داری سونپی تھی، اس نے مجھے بتایا کہ اس کے ساتھی اور سارے تھائی تو اس کے احکام کو بجا لاتے رہے لیکن حمید کسی کی بات نہیں مانتا اور اب بھی بغیر بتائے باہر گیا ہوا ہے۔ شمس اور حمید شروع ہی سے ہمارے لیے پرابلم بنے ہوئے تھے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود حمید ابھی تک سیدھا نہیں ہوا تھا۔ میں نے قیصر کو کہا جب حمید واپس آئے تو اس پر اچانک چادر ڈال کر سب مل کر اسے مکوں اور ٹھڈوں سے پیٹیں۔ اس طرح سے پٹائی کے بعد بھی اگر اس نے اپنی یہی حرکتیں جاری رکھیں تو پھر میں اس کا کوئی خاطر خواہ انتظام کروں گا۔

شام کو تین خادماؤں کے ساتھ کلپنا میرے کمرے میں آئی۔ میں نے اسے کہا ''محض تمہارے عورت اور تنہا ہونے کے باعث رحم کھا کر میں نے تمہیں اپنے قافلے میں شامل کیا تھا اور یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ تمہیں بحفاظت دارجلنگ پہنچا دیا جائے گا۔ آج سردار نے بتایا ہے کہ تم بخوشی اس

کی دوسری رانی بننے کو تیار ہو۔ دوسری رانی کا مطلب تم بخوبی جانتی ہو۔ اگر اسی میں تمہاری خوشی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہمیں تو قبیلہ کی رانی بننے کے جشن میں شرکت کی دعوت بھی مل چکی ہے۔ دوسری بات یہ کہ تم نے سردار کو خزانے کے متعلق بتا کر اچھا نہیں کیا۔ اگر تمہارے متعلق تمام حقائق میں سردار کو بتادوں تو کیا وہ کبھی بھی تم پر اعتبار کرسکے گا؟ تم نے خود اپنے راستے میں کانٹے بکھیرے ہیں اور ان کی چبھن کا درد تمہیں ہی سہنا ہوگا۔'' میری بات سن کر کلپنا کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ فرش پر نظریں گاڑے وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر بولی، ''میں ایک باعزت اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے ماتا پتا کو بے جرم و خطا قتل کر دیا گیا اور مگھ سردار نے مجھے زبردستی اپنی رکھیل بنا لیا۔ وہاں سے آپ نے میری جان بچائی اور میں قافلے کے ساتھ یہاں آگئی۔ حویلی میں مجھے باقی قافلے سے جدا کرکے زنان خانے میں بھیج دیا گیا وہاں بڑی رانی یعنی سردار کی ماں دو کمروں میں نظر بندی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اپنی رانی کو سردار نے چند ماہ پہلے اتنا پیٹا کہ اس کی ایک ٹانگ زخمی ہوگئی اور ٹھیک علاج نہ ہونے کے باعث کاٹنی پڑی۔ مجھے یہاں پہلی رات ہی سردار نے اپنی ہوس کا زبردستی نشانہ بنایا۔ صرف چہرے ہی مختلف ہوتے ہیں ورنہ سب مردوں کی خصلت ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ میں نے سردار کو خزانے کے متعلق بتا کر اپنے اعتماد میں لے لیا ہے۔ جس عصمت کو بچانے کے لیے عورت اپنی جان پر کھیل جاتی ہے میں اب اسی عصمت کو لٹا کر ہر وحشی مرد سے بدلہ لوں گی۔ سردار آپ کو زنان خانے کی ہوا بھی نہیں لگنے دے گا۔ آپ کے احسان کے بدلے میں اندر کی تمام خبریں آپ تک پہنچاؤں گی اور موقع ملتے ہی سردار کی ماں سے آپ کے مشن کی بات کروں گی۔ میری اب تک کی معلومات کے مطابق سردار کی ماں ہندی اور انگریزی بخوبی بولتی ہے۔ سردار کا چھوٹا بھائی بھی زنان خانے کے ایک حصے میں قید ہے۔ اس نے باپ کی زندگی میں بڑے بھائی کی سرداری کو قبول نہیں کیا جس کی وہ سزا بھگت رہا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ قبیلے کے چند بڑوں کے سوا جنھیں موجودہ سردار نے خرید لیا ہے، باقی سب قبیلہ سردار کے خلاف ہے۔ آپ کو شاید میری باتوں پر یقین نہ آئے لیکن میں بھگوان کی اور اپنے سورگ باشی ماتا پتا کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ میں دل سے آپ کے ساتھ ہوں اور موقع ملتے ہی سردار کو ختم کردوں گی اور آپ کے ساتھ ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔'' یہ کہتے ہوئے کلپنا نے اپنے لباس میں سے ایک تیر کا سرا نکال کر مجھے دکھایا۔ ''یہ زہریلا تیر میں نے اسی لیے چھپا کے رکھا ہوا ہے کہ موقع ملتے ہی میں یہ تیر سردار کو چبھو کر اس کا کام تمام کر دوں گی اور اگر ناکام رہی تو اسی تیر سے خودکشی کرلوں گی۔ آپ مجھ پر اعتبار کریں اور مجھے موقع دیں کہ میں آپ کے کام آکر آپ کے احسان کا بدلہ اتار سکوں۔ آپ سے اب روزانہ ملنا نہیں ہوگا بلکہ رانی بننے کے بعد تو شائد کبھی بھی نہ مل سکوں گی۔ اگر آپ مجھے چند کاغذ اور ایک قلم دیں تو میں روزانہ آپ سے رابطہ کرسکتی ہوں۔'' کلپنا نے بات ختم کرتے ہوئے ایک خادمہ کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا۔ ''یہ سردار کی ماں کی ہمراز اور حامی ہے۔ یہی ہمارے رقعے ایک دوسرے تک پہنچائے گی۔'' کلپنا کی باتیں سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ حالات ایسے تھے کہ خود اپنی ذات پر سے بھی اعتبار اٹھ گیا تھا۔ کس پر اعتبار کروں اور کس پر نہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کلپنا تو بالکل غیر تھی۔ یہاں تو اقتدار کے لالچ میں خون اپنے خونی رشتوں کی جان کا پیاسا ہو چکا تھا۔ میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑتے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ اور ایک قلم کلپنا کو دیا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہ تھا۔

شام کو حمید کی واپسی ہوئی اور میرے کہنے کے مطابق اس پر چادر ڈال کر سب نے ٹھڈوں اور مکوں سے اس کی خوب دھنائی کی۔ اس طرح کسی کو مارنے کو میں اپنی اختراع سمجھتا تھا۔ پاکستان واپس آ کر معلوم ہوا کہ یہاں کی جیلوں میں اکثر بااثر قیدیوں کے مخالف اس پر اچانک کمبل ڈال کر بے طرح پیٹتے ہیں۔ جیل مینوئل میں بھی اس کا ذکر ہے اور اسے کمبل پریڈ کہتے ہیں۔ اس طرح پٹائی سے حمید کی ساری خود سری ختم ہو گئی اور وہ نہ صرف میرے بلکہ قیصر اور میرے نمبر ٹو کے احکام بھی بلا چوں چرا بجا لانے لگا۔

کلپنا کے واپس جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی سردار کے ایک مشیر نے میرے کمرے میں آ کر مجھے بتایا کہ آپ تیار ہو جائیں۔ رات آٹھ بجے سردار نے آپ کو اپنے ڈرائنگ روم میں ملنے کی دعوت دی ہے۔ آٹھ بجے سے چند منٹ قبل وہی مشیر مجھے اپنے ہمراہ حویلی کے دوسرے حصے میں بنے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اس کمرے میں بھی میں راجہ تری دیو کے دور میں کئی بار جا چکا تھا۔ اس وقت ہماری رات کی محفلوں میں مقامی لوگ شامل نہیں ہوتے تھے۔ راجہ تری دیو کا حلقۂ احباب اتنا وسیع تھا کہ اس دور کے پاکستانی بیوروکریسی کے اعلیٰ افسر اور فوج کے افسران شکار کی غرض سے جب بھی اس قبیلے کی حدود میں آتے تو راجہ تری دیو کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاتے۔ لیکن آج شام کی محفل میں سردار کے علاوہ صرف اس کے قبیلے کے افراد جو یقیناً اس کے مشیر تھے، شامل تھے۔ سردار نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور دوسرے شرکائے محفل سے میرا تعارف کرایا۔ راجہ تری دیو کے زمانے کا تقریباً تمام فرنیچر بدل چکا تھا۔ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں سردار نے ایک بار بنا رکھی تھی۔ جس میں انواع و اقسام کی غیر ملکی شراب کی بوتلیں سجی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ہی محفل ناؤ نوش شروع ہو گئی۔ میں سردار کا راجہ تری دیو سے مقابلہ کر رہا تھا۔ راجہ بڑے رکھ رکھاؤ والا تھا اور اپنے قبیلے کے لوگوں کو مناسب فاصلے پر رکھتا تھا۔ اس کے برعکس یہ سردار اپنے مشیروں کے ساتھ بے تکلفی اور ہنسی مذاق میں حدیں پار کر رہا تھا۔ اسی ماحول میں ان کی گفتگو کا رخ راجہ تری دیو یعنی سردار کے باپ کی طرف ہو گیا۔ سردار نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''آخر میرے پتا کو یہ کیا سوجھی جو مجھے قبیلے کے سردار کی تقرری کا پروانہ بھیج دیا۔ میں قبیلے کی سرداری کے لیے ان کی اجازت یا اس پروانے کا

محتاج نہیں۔'' میں نے جواب دیا، ''سردار! میں نے اسی لیے علیحدگی میں آپ سے ملنے کی درخواست کی تھی۔ آپ کے دوست جو اس محفل میں شریک ہیں یقیناً آپ کے بہت قریب اور ہمدرد ہیں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی موجودگی میں ہی وہ سب باتیں کہہ دوں جو بالکل علیحدگی میں کہنا چاہتا تھا۔ آپ کے والد کے تعلقات موجودہ بنگلہ دیشی حکومت کے بعض بڑے سیاست دانوں اور بیوروکریسی کے اعلیٰ افسران سے ہیں جن کے ذریعے انھیں آپ کے سردار بننے اور قبیلے کے حالات سے بخوبی آگاہی ہے۔ بے شک آپ اب قبیلے کے سردار ہیں لیکن بنگلہ دیشی فوج نے آپ کے قبیلے کو گھیرے میں کیوں لے رکھا ہے؟ اگر بنگلہ دیشی حکومت آپ کے والد کی مخالف ہے تو انھیں قیامت تک ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ وہ پاکستان کی وفاقی حکومت کے وزیر ہیں اور ان کے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ بھی ہے جبکہ آپ چٹا گانگ تک بھی نہیں جا سکتے۔ آخر کیوں؟ محض اس لیے کہ اس حکومت نے آپ کے قبیلے کا سردار بننے کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے۔ راجہ تری دیو تو شاید زندگی بھر یہاں لوٹ کر نہ آئیں۔ انھوں نے آپ کو قبیلے کی سرداری منتقل کرنے اور راجہ بننے کا فرمان نہ صرف شفقت پدری بلکہ قبیلے کی بھلائی کے لیے بھی بھیجا ہے۔ اس فرمان کے ذریعے آپ کو قبیلے کا سردار اور راجہ بننے کا قانونی جواز مل گیا ہے اور آپ اب اس پوزیشن میں ہیں کہ بنگلہ دیشی حکومت سے مذاکرات کر کے اپنے لیے اور اپنے قبیلے کے لیے کم از کم سابقہ مراعات تو حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں کی حکومت آخر کب تک اپنی بہت ہی مختصر فوج کے ایک بڑے حصے سے آپ کے قبیلے کو گھیرے رکھے گی؟ اسے بہرحال آپ سے مذاکرات کرنے پڑیں گے۔ اسے صرف آپ کے جائز اور قانونی وارث ہونے کا ثبوت چاہیے جو آپ کے والد نے آپ تک پہنچا دیا ہے۔'' میں نے محسوس کیا کہ سردار بڑے غور سے میری باتیں سن رہا تھا۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے میں نے اپنی طرف سے چند ''انکشافات'' کر کے راجہ کے دل میں شک پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میں جانتا تھا کہ غداری اور سازش کا ذرا سا بھی شک پیدا ہو جائے تو بڑے بڑے حکمرانوں کے مضبوط اور جمے ہوئے قدم بھی لڑکھڑا جاتے ہیں۔ یہ تو محض ایک قبیلے کا ناجائز سردار اور زبردستی کا راجہ بنا بیٹھا تھا جبکہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک تخت پر دو حکمران نہیں بیٹھ سکتے۔ ''سردار ایک اور اہم بات میں آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ آپ کے والد کو اپنے ہمدردوں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے قبیلے کے ہی کچھ لوگ آپ کی سرداری کو ناجائز سمجھتے ہوئے خود قبیلے کا سردار بننا چاہتے ہیں۔ یہ آستین کے وہ سانپ ہیں جو ایک طرف تو آپ سے وفاداری کا دم بھرتے ہیں اور دوسری طرف درپردہ بنگلہ دیشی حکومت سے خود سردار بننے کے لیے خفیہ رابطے کیے ہوئے ہیں۔ راجہ تری دیو رائے نے اسی لیے آپ کو سرداری منتقل کرنے کا پروانہ بھیجا ہے اور رانی صاحبہ اور آپ کے چھوٹے بھائی کو پاکستان بلوایا ہے تا کہ سازشیوں کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے وہ آپ کی سرداری کو چیلنج کر سکیں۔ میں نے آپ کو سب حقائق سے آگاہ کر دیا ہے اور اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ

آپ کیا قدم اُٹھاتے ہیں؟" یہ کہہ کر میں نے غیر ملکی شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "آپ کو یہ سکاچ وہسکی اور ہوانا کے بنے ہوئے سگار مہیا کرنے والے بنگلہ دیشی فوج کے JCO یا کیپٹن تک کے عہدے کے افسران ہوں گے۔ ان کی اس Favour سے آپ ہرگز یہ نہ سمجھئے کہ اس فوج کے اعلیٰ افسران، سیاستدان اور حکمران بھی آپ کے حامی ہیں۔ آپ کو بخوبی علم ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ اس معمولی سی رعایت کے عوض آپ کو ان فوجیوں کو رشوت میں کیا دینا پڑتا ہے۔ مجھے تو یقین تھا کہ آپ اپنے والد کی دور اندیشی اور آپ سے محبت کے احساس کو بے حد سراہیں گے لیکن مجھے بے حد مایوسی ہوئی جب بھرے دربار میں آپ نے اپنے والد کے اس جذبے کو ٹھٹھے مذاق میں اُڑا دیا۔" میری سچی اور تلخ باتیں سن کر سردار کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ وہ خاصی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے کوئی بڑا فیصلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہو۔ لوہا پوری طرح سے گرم تھا اور یہ صحیح وقت تھا کہ اس پر چوٹ لگا کر اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا جاسکے۔ "اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو سب سے پہلے اپنے گرد جمع حواریوں میں ان غداروں کو تلاش کریں جو منافق ہیں اور ڈبل رول ادا کر رہے ہیں۔" سردار کے مشیروں میں سے میرے اندازے کے مطابق کم از کم دو آدمی انگریزی جانتے تھے۔ میری باتیں سن کر ان میں سے ایک بولا، "آپ کی ان باتوں کا کیا یہ مطلب ہے کہ ہم سردار سے غداری کر رہے ہیں اور ان کے خلاف سازشیں کرنے میں بھی ہمارا ہی ہاتھ ہے؟" "جب دو بڑے بات کر رہے ہوں تو چھوٹوں کو دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے بلکہ خاموش رہنا چاہیے۔ میں تو آپ لوگوں کو جانتا تک نہیں اور آج پہلی مرتبہ آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ سردار کی محفل میں بیٹھنے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں۔ راجہ تری دیو کے ساتھ اسی حویلی اور اسی کمرے میں میری کئی شامیں اکٹھی گزری ہیں۔ ان دنوں تو آپ کا دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ کیا راجہ تری دیو کے پاکستان جانے کے ساتھ اس کے سارے مشیر بھی بھاگ گئے جن کی جگہ آپ نے سنبھالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چکمہ قبیلے اور سردار کے بہی خواہ اور ہمدرد صرف وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے راجہ تری دیو کی غیر موجودگی میں سردار کے بڑے بیٹے کو قائم مقام سردار بنانا چاہا ہوگا اور اسے مطلق العنان راجہ بنانے کی مخالفت کی ہوگی۔ اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیے اور دیکھیے کہ آپ کا کیا کردار رہا ہے؟" میرے اس کڑوے جواب سے مشیر خاموش ہوگیا۔ میں سمجھتا تھا کہ محفل کا رنگ بدل جانے سے وہ اٹھ جائیں گے لیکن وہ اپنی جگہوں پر جمے رہے۔ شاید وہ اس ماحول میں مجھے سردار کے ہمراہ اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن ان کی بے چینی اور حرکات و سکنات سے مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا جیسے انھیں علم ہوچکا ہے کہ میں نے غداری اور منافقت کا لیبل انھی پر چسپاں کیا ہے۔ اب تک سردار نے ان کے سامنے عام سکاچ وہسکی کی دو بوتلیں رکھی تھیں اور خود وہ ڈیلکس سکاچ Shivaz Regal پی رہا تھا۔ مشیروں نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے پہلے تو اپنی دونوں بوتلیں خالی کیں جب ان سے بھی طبیعت نہ سنبھلی تو سردار سے

مزید شراب مانگی۔ میری باتوں نے سردار پر کچھ ایسا اثر کیا تھا کہ اس نے نہایت تلخ اور اونچی آواز میں اپنی زبان میں کچھ کہا۔ وہ پہلے تو چند لمحے حیرانی سے سردار کے بدلے ہوئے رویے کو دیکھتے رہے اور پھر ایک ساتھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ ان پر بھی کاری ضرب لگانے کا یہی موقع تھا۔ میں نے انگریزی بولنے والے مشیر کو کہا "کیا شراب کے نشے میں سردار سے رخصت ہونے کے آداب بھی بھلا بیٹھے ہو؟" میری بات سن کر وہ رکے، پلٹے اور قدم بوسی کے انداز میں قالین بچھے فرش پر ماتھا ٹیکا اور ہاتھ باندھے ہوئے الٹے قدموں چلتے ہوئے کمرے سے رخصت ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد سردار نے بھی اپنے ذہنی دباؤ کو ختم کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے شراب کے دو گلاس چڑھائے۔ وہ پہلے ہی کافی زیادہ پی چکا تھا۔ مزید شراب پینے سے اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اسے کہا کہ بہتر ہوگا اگر آپ آرام کے لیے اب اپنی خواب گاہ میں چلے جائیں اور کل جب بھی مناسب سمجھیں مجھے گفتگو کرنے کے لیے علیحدگی میں بلالیں۔ یہ کہہ کر میں نے سردار کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے تالی بجائی۔ دو نیزہ بردار کمرے میں داخل ہوئے اور سردار کو سہارا دیے ہوئے کمرے سے لے گئے۔ میں نے بھی اپنے کمرے کا رخ کیا۔ سردار کے جاتے ہی اس کے دو اور ملازم کمرے میں آگئے تھے۔ وہ گلاس، بوتلیں اور کھانے پینے کا سامان اٹھانے لگے۔ میں نے اپنے کمرے میں جاکر اپنا پسٹل اور ریوالور تکیے کے نیچے رکھے اور آج کے واقعات پر غور کرتے ہوئے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

سردار کی عمر بائیس تیئس سال ہوگی۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش کے نام سے معرض وجود میں آنا اور راجہ تری دیو کے پاکستان سے وفاداری کے باعث پاکستان میں مستقل قیام کرنا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت نئے سردار کی عمر سولہ سترہ برس ہوگی۔ اس عمر میں ذہن کچا اور امنگیں عروج پر ہوتی ہیں۔ ایک غریب آدمی کی لاٹری نکل آئے تو وہ اکثر جامے سے باہر ہوجاتا ہے اور اس سے ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ بعینہ ایسی حالت نئے سردار کی تھی۔ راجہ تری دیو کی غیر موجودگی میں اس کے مخلص مشیروں کی جگہ خوشامدی چمچوں نے راجہ کے لڑکے کو اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ایسی پٹی پڑھائی کہ اس کا دماغ عرش پر جاپہنچا۔ انھی چمچوں نے مل ملا کر اسے قبیلے کی بہت بڑی اکثریت کی خواہش کو نظر انداز کرتے ہوئے مکمل سردار بنادیا۔ چکمہ قبیلہ فطرتاً پرامن ہے۔ نئے سردار کے چند حواریوں اور مطلب پرستوں کے نئے سردار کے چناؤ کو انھوں نے بادل نخواستہ قبول کیا اور خاموشی اپنالی۔ چکمہ قبیلے کے حالات ماضی قریب میں بالکل پاکستان جیسے تھے۔ قوم کے اٹھارہ فیصد سے بھی کم ڈالے گئے ووٹوں سے انجینئرڈ دو تہائی ووٹ لے کر اور اسے بھاری مینڈیٹ کا نام دے کر میاں نواز شریف پاکستان کے مختار کل بن بیٹھے تھے اور اپنے حواریوں اور چمچوں کی خوشامد اور مدح سرائی نے ان سے ایسے کام کروائے

جنھیں کوئی ذی ہوش انسان کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسمبلی میں فلور کراسنگ اور حکومتی پارٹی کے ارکان کی حکومت کے غلط کاموں پر احتجاج کرنے کی پاداش میں اسمبلی کی رکنیت سے برخواستگی کا قانون بنا کر اپنی پارٹی کے اراکین کی زبانیں بھی کاٹ دی گئیں۔ پھر سپریم کورٹ پر حملہ اور غنڈہ گردی کر کے انصاف کو مفلوج کرنے کی بیانگ دہل کوشش کی۔ پاکستان آرمی کے سربراہوں کو اپنا ذاتی ملازم سمجھتے ہوئے ان کی ہمیشہ توہین کی۔ جنرل آصف نواز کا اندھا قتل، جنرل وحید کاکڑ اور جنرل کرامت کی برخواستگی تذلیل سے کی گئی۔ کارگل میں جو کچھ ہوا اس کی تمام تر ذمہ داری افواج پاکستان پر ڈال کر اپنا دامن صاف بچانے کی کوشش کی۔ اگر بغرض محال چند لمحوں کو میاں صاحب کی اس بات کو درست بھی مانا جائے تو کیا یہ ملک کے وزیراعظم کی انتہائی نااہلی کی دلیل نہیں کہ ملک کے سیاہ وسفید کے مالک وزیراعظم کو اتنی بڑی کارروائی کی بھنک تک نہ پڑی۔ دنیا بھر میں معرکہ کارگل نے ہلچل مچادی لیکن میاں صاحب ''لاعلمی اور بے خبری'' کے عالم میں ہریسے کھانے میں مگن رہے اور جب پانی سر سے اونچا ہوگیا تو ISI کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل ضیا بٹ کے ہمراہ اپنے برادر خورد شہباز شریف کو امریکہ بھیج کر اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہی اور اس ''غلطی'' کی تلافی کے لیے بری فوج کے چیف آف اسٹاف کو برخواست کر کے جنرل ضیاء الدین بٹ کی بحیثیت چیف آف سٹاف کے تقرری کی منظوری حاصل کی۔ سری لنکا کی افواج کے پچاس سالہ قیام کی رسومات میں شرکت کے لیے فوج کے سربراہ کو میاں صاحب نے اصرار کر کے بھیجا حالانکہ بھارت نے ان رسومات میں شرکت کے لیے جنرل پرویز مشرف کے ہم پلہ نہیں بلکہ اپنے چیف آف جنرل سٹاف کو بھیجا تھا۔ میاں صاحب کے سیاہ کارناموں کے باعث ان میں اخلاقی جرأت کا فقدان ہوچکا تھا لہٰذا جب سری لنکا میں جنرل پرویز مشرف افواج پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے تو یہاں پاکستان میں ٹی وی پر جنرل صاحب کی برخواستگی اور جنرل ضیا بٹ کی تقرری کا اعلان کیا جارہا تھا۔ خوفزدہ انسان تو سوتے ہوئے بھی بھیانک خواب دیکھ کر چلانے لگتا ہے جیسے میاں شہباز شریف گزشتہ دنوں کراچی جیل میں اپنے ماضی کے کارناموں کے انجام سے خوفزدہ بھیانک خواب دیکھتے ہوئے چارپائی سے چلاتے ہوئے نیچے گر پڑے اور مسلسل چلاتے رہے یہاں تک کہ جیل کے حکام ان کا شور شرابا سن کر بھاگے چلے آئے اور انھیں بتایا کہ آپ محض خواب دیکھ رہے تھے اور اصل انجام تک پہنچنے میں ابھی تھوڑا سا وقت لگے گا۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی لیکن میں اس مہماتی داستان کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ملک کے موجودہ حالات پر تبصرہ بھی کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔ کیا کروں حساس دل رکھتا ہوں اور اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ راجہ تری دیو کے لڑکے کا کردار بالکل ایسا ہی تھا جیسا نواز شریف کے پابند سلاسل ہونے کے بعد اس کے صاحب زادوں کا ہے اور میاں فیملی کے چمچے جنھیں دوسرے کا چھوڑا ہوا جوٹھا کھانے کی عادت ہے اور وہ اب نواز شریف کے لڑکوں اور کبھی ان کی بیگم اور ان کی صاحبزادی کو

سیاست میں گھسیٹنے میں کوشاں ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو صرف اپنے مفاد اور حلوے مانڈے سے غرض ہوتی ہے۔ چاہے وہ ذوالفقار علی بھٹو سے ملے یا بے نظیر سے، مرتضیٰ بھٹو سے ملے یا غنویٰ بھٹو، نواز شریف سے ملے یا ان کی بیگم اور اولاد سے، اندرا گاندھی سے ملے یا راجیو گاندھی سے یا اس کی بیوہ سونیا سے، شیخ مجیب سے ملے یا حسینہ واجد سے، جنرل ضیا سے ملے یا خالدہ ضیا سے، جنرل ضیاء الحق سے ملے یا اعجاز الحق سے۔ یہ سب وہ مردار خور گدھیں ہیں جنھیں اپنی خوراک اور توانائی کے لیے لاشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ گزشتہ دنوں ہی میرے دوستوں کی ایک محفل میں بات سیاست کی طرف چلی گئی۔ مسلم لیگ کے ایک پرجوش حامی فرمانے لگے، ''پیپلز پارٹی کے پاس دو لاشیں ہیں اور اسلام آباد میں گزشتہ سالوں میں جماعت اسلامی کے ایک جلوس پر فائرنگ سے چار لاشیں گریں اور ان کی سیاسی ضرورت پوری ہوگئی۔ ایک ہماری مسلم لیگ ہے جس کے پاس کوئی لاش نہیں اور فی الوقت ہمیں کم از کم دو لاشوں کی بے حد ضرورت ہے، تبھی ہم دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح عوام کو اپنی جانب راغب کر سکتے ہیں۔'' قارئین یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ لاشوں کی ضرورت بیان کرنے والوں کا اشارہ کن کی طرف تھا۔

اگلی صبح سردار نے مجھے اسی ڈرائنگ روم میں طلب کیا۔ وہاں وہ بالکل اکیلا بیٹھا تھا۔ میرے ڈرائنگ روم میں داخلے کے بعد نیزہ برداروں نے بیرونی دروازہ بند کر دیا۔ کسی پرانے مے خوار کی کہاوت کے مطابق کہ زیادہ شراب پینے سے طبیعت کی خرابی (Hang Over) کو شراب ہی ختم کرتی ہے، سردار نے بھی پھر پینی شروع کر دی۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اس نے بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''تمہارا قیافہ غضب کا ہے۔ ہمارے قبیلے کو گھیرنے والی فوج کا ایک JCO ہی چٹاگانگ سے خرید کر مجھے یہ بوتلیں لا کر دیتا ہے اور ان کے عوض میں اسے خاصی رقم دیتا ہوں۔ تم نے بالکل درست کہا ہے۔ میرے والد نے واقعی قبیلے کی سرداری اور راجہ بننے کا فرمان بھیج کر مجھے جائز حکمرانی اور بنگلہ دیشی حکومت سے مذاکرات کرنے کا اختیار دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آئندہ پندرہ یوم میں ایک باقاعدہ دربار منعقد کر کے تمہاری موجودگی میں اور تمہاری تصدیق کے ساتھ شاہی فرمان پڑھا جائے اور میں دوبارہ تخت پر بیٹھوں اور تاج پہنوں۔ اس رسم کے بعد بڑے پیمانے پر ایک جشن منایا جائے گا تم آپ اور آپ کے تمام ساتھی اس جشن میں شریک ہوں گے اور تب تک آپ سب ہمارے مہمان رہیں گے۔'' میں نے کہا، ''رانی صاحبہ اور آپ کے چھوٹے بھائی کو ہمارے ہمراہ پاکستان بھیجنے کے متعلق آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' سردار چند لمحے خاموش رہا اور پھر کہنے لگا، ''رانی صاحبہ میری والدہ ہیں لیکن کچھ ایسی ناخوشگوار باتیں ہوچکی ہیں جن کے باعث وہ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتیں۔ وہ بخوبی انگریزی بول سکتی ہیں۔ یہی حال میرے چھوٹے بھائی کا بھی ہے۔ اگر تم ان دونوں کو قائل کر سکو تو مجھے تمہارے ساتھ انھیں بھیجنے میں کوئی عذر نہیں۔'' میں نے کہا، ''ایک بات اور۔ آپ قبیلے کے

سردار اور راجہ بننے والے ہیں اور اب سب قبیلے کی نظریں آپ پر ہوں گی۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ رسم تاجپوشی تک کلپنا کو دوسری رانی بنانے کا اعلان بلکہ کسی سے ذکر تک نہ کیجیے۔ رسم تاجپوشی میں آپ صرف اپنی اصل رانی کے ہمراہ آئیں۔ اس رسم کے ادا ہونے کے بعد آپ بجائے ایک کے چار رانیاں رکھیں۔ کسی کو آپ سے تعرض نہ ہوگا۔ چونکہ قبیلے کی روایات کے مطابق راجہ کی صرف ایک ہی رانی ہوتی ہے لہٰذا اصلی رانی ہی آپ کے ہمراہ ہونی چاہیے۔'' ''لیکن اس کی تو ایک ٹانگ کٹی ہوئی ہے۔'' راجہ نے کہا تو میں نے جواب دیا۔ ''کوئی بات نہیں۔ تخت پر رانی کو درباریوں اور عوام کے آنے سے پہلے ہی بٹھا دیا جائے اور رسم پوری ہونے کے بعد اور سب کے جانے کے بعد انھیں واپس لے جایا جائے۔'' سردار نے میری تجویز سے اتفاق کیا تو میں نے کہا، ایک اور بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ کھلنا اور پھر کاکس بازار جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے اس JCO سے ملادیں جو آپ کو بوتلیں مہیا کرتا ہے تو اس سے میں معلوم کروں گا کہ وہ ہماری اس معاملے میں کس حد تک مدد کرسکتا ہے اور مدد کا اسے کیا معاوضہ درکار ہوگا؟'' ''وہ JCO پرسوں یہاں آئے گا تو تم سے ضرور ملوا دوں گا۔'' سردار یہ بات کہہ کر مسکراتے ہوئے اور اپنی ایک آنکھ دباتے ہوئے مجھ سے گویا ہوا ''اگر کسی چیز کی ضرورت ہو یا تفریح کرنے کا موڈ ہو تو اس کا بھی انتظام کیا جاسکتا ہے۔'' میں نے سردار کی اس آفر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ فی الحال مجھے ایک مالش (مساج) کرنے اور جسم دبانے والے شخص کی ضرورت ہے تاکہ سفر کی تھکان دُور کرسکوں۔ سردار نے ہر رات اور صبح ایسا آدمی بھیجنے کا وعدہ کیا اور میں اس سے رخصت ہوکر اپنے ساتھیوں کے کمروں کی طرف چلا گیا اور اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ستانے کے لیے میں لیٹا ہی تھا کہ میری خدمت پر معمور پہریداروں نے آکر مجھے بتایا کہ کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے ملاقاتی کو کمرے میں بلایا۔ یہ مشیر تھا جس سے گزشتہ رات میری جھڑپ نما گفتگو ہوئی تھی۔

ساتواں باب

مشیر کا مجھ سے ملنے آنا میرے لیے بالکل غیرمتوقع تھا۔ گزشتہ رات سردار کے سامنے میں نے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا اصل چہرہ دکھادیا تھا۔ ہماری گفتگو کا اختتام بھی ناخوشگوار ماحول میں ہوا تھا اور آج صبح سردار سے میری علیحدگی میں جو باتیں ہوئی تھیں، ان سے متاثر ہوکر سردار نے میرے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے میرے لائحۂ عمل پر چلنے کو منظور کرلیا تھا۔ بظاہر کوئی ایسی وجہ نہ تھی جس کی بنا پر مشیر کو مجھ سے ملنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ میں نے مشیر کو کمرے میں بلالیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے آمد کی وجہ پوچھی۔ مشیر کچھ دیر خاموشی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے Assess کرتا رہا اور پھر بولا، ''آپ لوگ یہاں سے کب واپس جا رہے ہیں؟'' اس کے اس سوال کا میں نے زبان سے تو کوئی جواب نہ دیا بلکہ ایسی سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا جس کا مقصد اس کے سوال کی وضاحت تھا۔ مشیر بھی سمجھ گیا کہ اس نے بہت مختصر سوال اور بغیر کوئی وجہ بیان کیے پوچھا ہے۔ اپنی بات میں زور پیدا کرتے ہوئے وہ بولا، ''آپ نے راجہ صاحب کو ان کے والد کا خط دے دیا ہے۔ راجہ صاحب کے چھوٹے بھائی اور رانی صاحبہ کو یہاں سے آپ کے ہمراہ بھیجنے کے متعلق راجہ صاحب کا جواب بھی آپ نے سن لیا ہے۔ آپ نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب آپ کو یہاں سے فوراً چلا جانا چاہیے ورنہ...'' ''یہ بھی بتا دیجیے کہ اگر ہم یہاں سے فوری نہ گئے تو پھر کیا ہوگا؟ راجہ صاحب نے ہمارے ساتھی کلپنا کو اپنی رانی بنانے کے جشن میں شرکت کرنے کی دعوت گزشتہ رات آپ کی موجودگی میں ہی دی تھی۔ اب آپ بتائیے کہ اگر میں راجہ صاحب کی دعوت کو ٹھکرا کر آپ کے حکم کی تعمیل کروں تو اس کی ٹھوس وجوہات کو جاننا بھی میرے لیے ضروری ہے اس لیے آپ کھل کر اور بغیر تکلف کے بات کریں۔'' میرا یہ جواب سن کہ مشیر کچھ دیر پھر خاموش رہا جیسے بولنے کے لیے الفاظ کو ناپ تول رہا ہو اور پھر فیصلہ

کن لہجے میں بولا، ''ہمارے قبیلے کے اندرونی معاملات میں آپ کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ خوامخواہ سلجھے ہوئے حالات کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ زندگی سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں۔ ہم اپنا سردار اور راجہ منتخب کر چکے ہیں مورنگ اور مگھ قبیلوں سے مڈبھیڑ میں اگر آپ کو کامیابی ہوئی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ہمارے قبیلے کے معاملات میں بھی بلاوجہ ٹانگ اُڑائیں۔ اگر آپ کے پاس اسلحہ ہے تو ہم بھی خالی ہاتھ نہیں۔ میں آپ کو وارننگ دیتا ہوں کہ آپ کل دوپہر تک رانگاماٹی سے چلے جائیں ورنہ اپنے بھیانک انجام کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔'' یہ کہتے ہوئے مشیر نے اپنے ہاتھ میں پکڑے رسیوں کے تھیلے میں سے ایک ریوالور نکالا اور اس کی چرخی گھمانے لگا۔ میں نے خوفزدہ ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا، ''براہ کرم اس خطرناک شے کو تھیلے میں واپس رکھ لیں۔ میں اپنے ایک ساتھی کو ابھی آپ کے سامنے بلا کر کہتا ہوں کہ سفر کی تیاری شروع کر دیں۔ مجھے صرف اتنا اور بتادیں کہ یہ باتیں آپ اپنی طرف سے کہہ رہے ہیں یا سردار کے حکم پر اور اگر سردار نے آپ کو یہ حکم دیا ہے تو کب اور اندازاً کس وقت۔ میں یہ صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ آپ تو یقیناً ہمیں ایک دو گھنٹے کی رعایت دے دیں گے تاکہ ہم یہاں سے جانے کی تیاری آرام سے کر سکیں لیکن سردار تو پانچ منٹ کی تاخیر بھی برداشت نہیں کرے گا۔'' میں نے خوفزدہ ہونے کی اتنی بھرپور ایکٹنگ کی تھی جس سے پھر میں اور میرے ساتھی بعد میں کئی روز تک لطف اٹھاتے رہے۔ میں نے فوراً ہی کاغذ کے ایک ٹکڑے پر قیصر کے لیے پیغام لکھا کہ جلد از جلد تمام ساتھیوں کو چھوٹے بڑے تمام اسلحہ سے مسلح کر کے میرے کمرے کے باہر Stand by پوزیشن میں لے آئے۔ یہ رقعہ میں نے اپنے کمرے کے باہر کھڑے ایک خادم کو دیا۔ میری سراسیمگی اور خوف کی حالت دیکھ کر مشیر کا حوصلہ اور بڑھا اور وہ بولا، ''سردار نے صبح ہی مجھے طلب کر کے یہ پیغام دیا تھا۔ بہرحال اب یہ میرا حکم ہے اور تم اس کو بجالاؤ گے۔ اس کے علاوہ تم نے مورنگ قبیلے کا خزانہ فروخت کرنے کی جو بات کی ہے وہ دل کو لگتی نہیں۔ خزانہ یقیناً اب بھی تمھارے پاس ہے اور دونوں تکونے یاقوت بھی۔ یہ سب بھی ابھی میرے حوالے کر دو اور جتنی کرنسی ہے وہ بھی مجھے دے دو اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمھارا اور تمھارے ساتھیوں کا اسلحہ میں قبیلے کے قانون کے مطابق ضبط کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ مجھے دے دو اور اپنی جانیں بچا کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔'' مشیر نے اپنا ریوالور ابھی تک ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا لیکن ریوالور اور پکڑنے کے انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ زندگی بھر اس نے شاید ایک گولی بھی فائر نہیں کی ہے۔ تقریباً دس منٹ میں میں نے اپنی تمام پونجی اور خزانے کے جواہرات نکالنے میں لگا دیے تاکہ قیصر کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ تیار ہو کر آنے کا مناسب وقت مل جائے۔ ادھر مشیر مجھے بار بار کہہ رہا تھا کہ جلدی کرو۔ اسی اثنا میں خادم نے کمرے میں آکر مجھے کہا کہ آپ کے ساتھی باہر کھڑے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے بڑے ڈرے ہوئے لہجے میں مشیر کو کہا کہ بہتر ہوگا کہ آپ اپنا ریوالور اپنے تھیلے میں ڈال کر میرے ہمراہ کمرے سے باہر چلیں۔ میرے

سارے ساتھی اپنا اسلحہ لے کر باہر آچکے ہیں۔ اگر انھوں نے آپ کو مجھ پر ریوالور تانے دیکھ لیا تو کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھیں۔ میں انھیں بالکل نارمل حالت میں ہوتے ہوئے کہوں گا کہ اپنا سارا اسلحہ آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیں۔ مشیر صاحب جو اتنی آسانی سے مجھ پر قابو پانے اور سارے جواہرات ''حاصل'' کرنے کی خوشی میں سوچ اور سمجھ کا دامن چھوڑ بیٹھے تھے، اپنا ریوالور تھیلے میں ڈالتے ہوئے مجھے ڈانٹنے کے انداز میں بولے، ''مجھ سے کوئی چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ساری گولیاں تم پر چلا دوں گا۔'' ''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ کے کہنے کے مطابق زندگی سے قیمتی کوئی چیز نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکلا۔ کمرے کی بیرونی دیوار کے ساتھ ہی قیصر اور تمام ساتھی اپنا اپنا اسلحہ لیے کھڑے تھے۔ انھیں کچھ علم نہیں تھا کہ میں نے انھیں فوری طور پر مسلح ہو کر کیوں طلب کیا ہے؟ وہ حیرت زدہ اور سوالیہ نگاہوں سے مجھے اور مشیر کو دیکھ رہے تھے۔ مشیر میرے بالکل پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور اس نے تھیلے کو دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ قیصر کے قریب جا کر میں رک گیا اور پلٹ کر قیصر کو کہا، ''مشیر صاحب کے ہاتھ میں پکڑے تھیلے میں ان کا لوڈڈ ریوالور ہے اور انھوں نے ہماری جان بخشی صرف اس شرط پر کی ہے کہ ہم اپنی تمام پونجی، جواہرات اور اسلحہ ان کو دے کر جلد از جلد قبیلے کی حدود سے نکل جائیں۔'' قیصر سے میں نے ساری بات اردو میں کی۔ میرے بائیں ہاتھ میں جواہرات اور ڈالروں سے بھری تھیلی تھی۔ مشیر سے میرا فاصلہ صرف دو ڈھائی فٹ ہوگا۔ میں نے قیصر کو کہا کہ آپ سب اپنا اسلحہ خاموشی سے فرش پر رکھ دیں۔ قیصر بڑی حیرانی سے مجھے ایسا بے تکا حکم دیتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دوبارہ اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر آپ سب فوری عمل کریں۔'' یہ کہہ کر میں غیر محسوس طور پر ذرا سا پیچھے ہٹا۔ قیصر کی تقلید میں باقی سب ساتھی بھی اپنا اپنا اسلحہ اپنے سامنے فرش پر رکھ رہے تھے اور مشیر انھیں دیکھ رہا تھا۔ ادھر سب نے اپنا اسلحہ فرش پر رکھا۔ ادھر میں نے مشیر کے تھیلے والے ہاتھ پر پورے زور سے ایک کک لگائی اور فوراً ہی دوسری کک اس کے جسم کے نازک حصے پر ماری۔ میری پہلی کک سے مشیر کا تھیلا دور فرش پر جا پڑا اور دوسری کک لگنے سے درد سے وہ دوہرا ہو گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی جیتی ہوئی بازی یکایک یوں پلٹ جائے گی۔ قیصر اور اس کے ساتھی اپنا اسلحہ اٹھانے لگے تو میں نے انھیں روک دیا اور کہا، ''اسے ہم خالی ہاتھوں درست کریں گے۔'' یہ کہہ کر میں نے دہرے ہوئے مشیر کو گردن سے پکڑ کر سیدھا کیا اور پھر اس کے پیٹ میں زوردار کک جمائی۔ مشیر درد سے پھر دہرا ہو گیا۔ دو چار مزید ایسی ہی لاتیں اور چہرے پر مکے مارنے کے بعد میں نے قیصر کو کہا کہ اب تمھاری باری ہے۔ قیصر نے اس کی دھنائی شروع کی تو میں نے قیصر کے ساتھیوں اور نمبر ٹو کو کہا کہ اپنا اپنا اسلحہ اٹھا لیں اور چوکس رہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی مدد کے لیے کچھ لوگ آئیں۔ اگر بھالے اور تیر کمان لیے لوگ آئے تو بے شک فائر کر کے انھیں ہلاک کر دیں۔ قیصر کے بعد ہر ایک ساتھی باری باری اس کی اچھی طرح ٹھکائی کرے۔ یہ مرنے نہ پائے لیکن اگر اس کے

ہاتھ پاؤں اور دوسری ہڈیاں ٹوٹ جائیں تو کوئی ہرج نہیں۔ میں اسے عبرت کا نمونہ بنا کر دوسروں کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ مشیر صاحب میری شروع میں لگائی گئی ککوں سے تو خوب چیخے چلائے لیکن ساتھیوں کی مار کے دوران ان کی آواز بند ہوگئی۔ غالباً وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ دونوں خادم یہ منظر دیکھتے ہی رفوچکر ہوگئے اور تھوڑی دیر میں ہی جبکہ ابھی میرے ساتھی مشیر صاحب پر طبع آزمائی کررہے تھے حویلی کے پہریدار اپنے تیر کمان اور بھالے لیے اس جگہ آگئے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ انھیں اپنے اسلحے کی زد میں لے لیں۔ میں ایک نیزہ بردار کے قریب گیا اور اس کا نیزہ لے کر اسے فرش پر رکھ دیا اور پسٹل کے اشارے سے باقی نیزہ برداروں اور تیراندازوں کو کہا کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔ سب نے خاموشی نے اپنے اپنے بھالے اور تیر کمان فرش پر رکھ دیے۔ مشیر سب سے پٹنے کے بعد میرے ساتھیوں اور حویلی کے پہریداروں کے درمیان فرش پر پڑا تھا۔ نامعلوم یہ خبر حویلی سے باہر کیسے پہنچ گئی۔ سردار کے دو مصاحب بھی وہاں آن پہنچے اور ان کی ملی جلی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حویلی کے باہر بھی سینکڑوں چکمہ جمع ہوچکے ہیں۔ میں ابھی تک اسی شش و پنج میں تھا کہ مشیر نے مجھ سے یہ مطالبے سردار کی ایما پر کیے ہیں یا یہ خود اس کے ذہن کے پیدا کردہ تھے۔ حویلی کے تقریباً سبھی مرد ملازم، سردار کے مشیر اور حویلی کے باہر چکمہ قبیلے کے لوگ جمع تھے اور ان میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ میرے دماغ میں یکایک اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا خیال آیا۔ میں نے ایک خادم کو اشارے سے سمجھایا کہ راجہ کو بلا لائے۔ ادھر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میرے اشارے پر اپنے اسلحہ سے یکے بعد دیگرے ایک ایک ہوائی فائر کریں۔ اسی حالت میں مزید پندرہ منٹ گزر گئے تو راجہ کی آمد کا شور مچا۔ حویلی کے سبھی ملازم دو رویہ کھڑے ہوکر راجہ کو دیکھتے ہی جھک گئے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب وہ خود بے بس ہوجائے تو اپنے سے بڑی طاقت کی طرف دیکھتا اور اسی کے فیصلے کا انتظار کرتا ہے جیسے پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں بڑے مسائل کے لیے سپریم کورٹ اور بڑی عدالتوں کے فیصلوں پر انحصار کیا جاتا ہے۔ قبیلے کے سردار کا فیصلہ چونکہ آخری ہوتا ہے اس لیے وہاں پر موجود سب لوگ راجہ کی آمد کے منتظر تھے۔ حویلی کے باہر جمع لوگوں کی بھی یقیناً یہی کیفیت ہوگی۔ سردار نے پہلے اپنی حویلی کے ملازمین اور پہریداروں کو دیکھا جو اپنا اسلحہ فرش پر دھرے کھڑے تھے۔ پھر میرے مسلح ساتھیوں اور کراہتے ہوئے مشیر کو دیکھ کر میرے قریب آیا اور بڑے خشک لہجے میں بولا، ''یہ سب کیا تماشہ ہے؟'' میں نے بھی اسی لہجے میں سوال کیا، ''کیا تم نے اسے ریوالور دے کر بھیجا تھا کہ ہم اپنی ساری پونجی اور اسلحہ اسے دے کر یہاں سے فوراً چلے جائیں۔'' ''ہرگز نہیں۔ گزشتہ رات کے بعد تو میں اب اس کی صورت دیکھ رہا ہوں جبکہ میں آج صبح تمھارے ساتھ ملاقات میں تمام معاملات طے کرچکا ہوں۔'' سردار نے جواب دیا۔ ''میں نے مشیر کا تھیلا اٹھا کر اس میں سے ریوالور نکالا اور اس کی ساری گولیاں نکال کر خالی ریوالور اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا، ''اس ریوالور کے بل بوتے پر اس نے ہم سے سارا اسلحہ اور نقدی کے علاوہ تمام قیمتی اشیا یہ کہہ کر حاصل

کرنے کی کوشش کی کہ وہ یہ سب تمھارے حکم پر کررہا ہے۔'' سردار نے غضب ناک آنکھوں سے اسے دیکھا اور اپنے قریب ہی پڑے ایک پہریدار کا بھالا اٹھایا اور اس سے پہلے کہ میں اس کا ارادہ جان لیتا، اس نے وہ بھالا مشیر کے سینے میں پیوست کردیا۔ مشیر کی ایک چیخ ابھری اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ بھالا مشیر کے سینے میں ہی گڑا رہا۔ سردار کے اشارے پر اس کے چند خدام آگے بڑھے تاکہ مشیر کی لاش اُٹھا سکیں لیکن میں نے پسٹل ان کی طرف کرتے ہوئے انھیں روک دیا۔ سردار میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے قیصر کو اشارہ کیا اور میرے ساتھیوں نے ایک ایک فائر کرنا شروع کیا۔ ریوالور، سب مشین گنوں، آٹومیٹک رائفلوں کے فائروں سے حویلی گونج اٹھی۔ فائر ختم ہوئے تو میں نے سردار کو کہا، ''تم نے اپنے مشیر کو ہلاک کرنے میں اتنی تیزی دکھائی کہ مجھے شک ہوگیا ہے کہ تم نے اسے ہلاک کرکے شاید سچائی چھپانے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ مجھے فوراً اور بادل نخواستہ حویلی کے انتظام میں دخل اندازی کرنی پڑے گی۔ تم نے ہماری فائر پاور دیکھ لی ہے اور مورنگ اور مگھ قبیلوں نے جب ہم سے تصادم کا فیصلہ کیا تو ان کا انجام بھی تم سے چھپا ہوا نہیں۔

اب تم اسے میرا مخلصانہ مشورہ سمجھو یا حکم۔ تم حویلی سے میری اجازت کے بغیر باہر نہیں جاؤ گے اور نہ ہی باہر کا کوئی آدمی یا تمھارا کوئی مشیر تم سے مل سکے گا۔ رانی صاحبہ اور اپنے چھوٹے بھائی سے تم آج شام ہی میری ملاقات کرواؤ گے اور تمھاری تاجپوشی کا جشن منعقد ہونے تک کلپنا ہر روز ایک مرتبہ اپنی خادماؤں کے ساتھ مجھ سے ملنے آئے گی۔ تمھارے رہائشی حصے کے باہر تمھارے پہریداروں کے بجائے میرے دو ساتھی پہرہ دیں گے اور یہ یاد رکھنا کہ میرے ساتھی بڑے وحشی اور صرف میرے حکم کے پابند ہیں۔ اگر تم نے ان کی بات نہ مانی اور الجھنے کی کوشش کی تو وہ بغیر وارننگ کے گولی چلادیں گے۔ اپنے آدمیوں، پہریداروں سپاہیوں اور خادموں کو بھی سمجھادو کہ میرے ساتھیوں کے خلاف کسی قسم کی حماقت کرنے کا سوچیں بھی نہیں۔ بنگلہ دیشی فوج تو پلوں کے نہ ہونے اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر رانگاماٹی کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں لیکن ہم تمھاری حویلی کے اندر موجود ہیں۔ ہمارے ساتھ اگر کسی قسم کی بھی زیادتی کرنے کی کوشش کی گئی تو ہم تمھاری حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے اور یہ بھی نہ بھولنا کہ پرجا ہو یا راجہ گولی کسی کی تمیز نہیں کرتی۔ میں تمھیں پھر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرا مشن راجہ تری دیو رائے کا خط تم تک پہنچانا اور رانی اور چھوٹے بیٹے کہ ہمراہ لے جانا ہے۔ ہم تمھارے ساتھ بالکل پر امن رہنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو اس کی واحد ذمہ داری تم پر اور تمھارے قبیلے والوں پر ہوگی۔''

سردار سے میری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی اور ہم ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے تھے کہ وہاں پر موجود چکمہ لوگوں کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ سردار نے دھیما لہجہ اختیار کرتے ہوئے مجھے کہا، ''مجھے ان لوگوں پر حکمرانی کرنی ہے اور جس طرح تم نے مجھے بے دست و پا کرنے کا فیصلہ کیا ہے، کیا تم

سمجھ سکتے ہو کہ میں راجہ اور سردار بن کر ان سے اپنی اطاعت کروا سکوں گا۔ تمھارے ساتھی اگر میرے پہریداروں کی جگہ لیں گے یا مجھ سے ملنے والوں کو اگر پہلے تمھارے ساتھیوں کی اجازت حاصل کرنا ہوگی تو قبیلے کے سب لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں تمھارے زیر حراست ہوں۔ میں تمھیں دوبارہ یقین دلاتا ہوں کہ میرے مشیر نے جو کچھ کیا اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ میری ایما پر اُس کا یہ قدم اٹھانا تو دور کی بات ہے وہ تو گزشتہ رات کے بعد مجھ سے ملا تک نہیں۔ ذرا سوچو کہ اگر میرے حکم پر اس نے یہ سب کچھ کیا ہوتا تو اس کی حفاظت اور تمھارا اسلحہ اپنے قبضے میں کرنے کے لیے میں کم از کم اپنے پہریدار اور سپاہی تو اس کے ہمراہ ضرور بھیجتا۔ یقین جانو یہ سب کچھ صرف اس کی سوچ اور حماقت کے سبب ہوا۔“

سردار کی بات میں وزن تھا ورنہ اکیلے مشیر کا ہم سے صرف ایک ریوالور کے ساتھ ساری نقدی، جواہرات اور اسلحہ چھیننے کی کوشش انتہائی احمقانہ حرکت تھی۔ سردار کا اپنے مشیر کو ہلاک کرنا اس کی اس شرمندگی اور بے عزتی کا ردعمل بھی ہوسکتا تھا جو اسے قبیلے کے لوگوں کے سامنے ہوئی۔ میں نے سردار کو کہا، ”حالات نے یکایک ایسا رخ اختیار کرلیا تھا کہ میں نے ایسا فیصلہ کیا۔ یہ میری غلطی تھی اور اس پر میں شرمندہ ہوں۔ ہماری گفتگو کو ہم دونوں کے سوا کوئی دوسرا سمجھ نہیں سکا ہے۔ میں فوری طور پر اس کا ازالہ اس خوبی سے کرتا ہوں کہ تمھارے قبیلے کے لوگوں کی نہ صرف چہ میگوئیاں ختم ہوجائیں گی بلکہ تمھاری عزت اور وقار میں مزید اضافہ ہوگا۔ میں نہ صرف اپنا ذاتی اسلحہ بلکہ اپنے ساتھیوں کا اسلحہ بھی تمھارے معائنے کے لیے پیش کروں گا اور معائنہ ختم ہونے کے بعد میں اور میرے ساتھی تمھارے حق میں نعرے لگائیں گے۔ میں نے تم پر جن پابندیوں اور اپنے ساتھیوں کو تمھارے پہریداروں کی جگہ لینے کا جو فیصلہ کیا ہے اسے بھی فوری کینسل کرتا ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ اپنے قبیلے کے تمام لوگوں کو جو حویلی کے اندر اور باہر موجود ہیں یہاں بلا لو اور ہمارے اسلحہ کے معائنے کے بعد اپنے مشیر کی غداری اور ہمارے تعاون کا ذکر کرتے ہوئے اپنے والد کا شاہی فرمان ملنے کا ذکر کرو بلکہ اپنے باقاعدہ سردار اور راجہ بننے کی تاریخ اور جشن منانے کی تاریخ کا اعلان بھی کر دو۔ اس شاہی فرمان کے متعلق سن کر وہ لوگ بھی جو تمھارے خلاف تھے، تمھارے حق میں ہوجائیں گے۔“ سردار نے میری بات سن کر اثبات میں سرہلایا۔ میں سردار کے سامنے سے چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر باقاعدہ فوجی انداز میں آگے بڑھ کر اپنا ریوالور اور پسٹل دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر سردار کے معائنے کے لیے بازو اس کے سامنے کردیے۔ سردار نے دونوں کو اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا اور مجھے لوٹا دیے۔ میں نے اونچی آواز میں ساتھیوں کو کہا کہ سردار کے معائنے کے لیے اپنا اسلحہ اپنے ہاتھوں میں لے لو۔ اس حکم کے بعد میں سردار کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میرے ساتھی ایک قطار میں کھڑے تھے۔ سردار ایک ایک کے پاس گیا اور ہر ایک کے اسلحے کا معائنہ کرتے ہوئے ان سے ہاتھ ملاتا گیا۔ میں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ہم سردار کے حامی ہیں۔ معائنہ ختم ہوا تو میرے کہنے پر میرے ساتھیوں نے ”سردار زندہ باد۔ راجہ زندہ باد“ کے نعرے لگائے۔ معائنے سے قبل ہی سردار نے

حویلی کے باہر کھڑے ہجوم کو اندر بلوا لیا تھا۔ سینکڑوں لوگوں کے سامنے سردار نے ایک مختصر تقریر کی۔ اس کی زبان تو میری سمجھ میں نہ آئی لیکن تقریر کے دوران اس نے کئی بار مشیر کی لاش اور بعد میں میرے اور میرے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ تقریر کے خاتمے کے بعد سردار نے آگے بڑھ کر مورنگ اور مگھ قبائل کی طرح میرے بائیں شانے پر ہاتھ رکھا اور سرگوشی میں مجھے کہا کہ تم بھی یونہی کرو۔ میں نے بھی سردار کے بائیں شانے پر ہاتھ رکھا۔ سب چکمہ لوگوں نے اب تالیاں پیٹنی شروع کیں۔ ان میں جو کسی خاص حیثیت کے حامل تھے وہ آگے بڑھے اور سردار کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔ ان کے ساتھ ہی باقی سارے چکمہ بھی اپنی اپنی جگہ سجدے میں چلے گئے۔ یہ ان کی سردار سے اطاعت گزاری اور وفاداری کا اظہار تھا۔ سردار نے اگلی ملاقات میں مجھے بتایا کہ ان معززین قبیلہ میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے ماضی میں اس کے سردار بننے پر اعلانیہ اور دبے لفظوں میں مخالف کی تھی۔ سردار آج اتنی تیزی سے بدلتے حالات خصوصاً پہلے نظر بندی اور بعد میں ہماری دی ہوئی عزت اور اپنے قبیلے والوں کی مکمل اطاعت کے اظہار سے اتنا حیران اور خوش ہوا کہ مجھے مجبور کر کے اپنے ڈرائنگ روم میں آنے کی دعوت دی۔ ادھر چکمہ قبائلی جو پہلے میرے ساتھیوں سے غیریت برت رہے تھے، اب ان میں گھل مل گئے۔ میں نے بھی جواہرات اور ڈالر وغیرہ اپنے کمرے میں رکھ کر سردار کے ڈرائنگ روم کی راہ لی۔ سردار نے ابھی سے مے نوشی شروع کر دی تھی۔ آج کی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے سردار نے بتایا کہ اس نے بھی اپنے والد کی تقلید میں اپنی جاسوسی کا جال پھیلایا ہوا ہے۔ اب تک اسے جو رپورٹس ملی تھیں ان کے مطابق آج مارے جانے والا مشیر خود سردار بننے کی خفیہ کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے کبھی بھی اطلاع دینے والوں کی بات پر توجہ نہ دی کیونکہ میرے سامنے وہ بے حد تابعداری اور اپنے عجز و انکسار کا اظہار کرتا تھا۔ دراصل وہ رشتے میں میرے دادا کے بھائی کی اولاد ہے۔ میرے دادا کو خلاف توقع ان کے والد نے سردار اور راجہ بنایا تھا حالانکہ مشیر کے دادا ان کے بڑے بھائی تھے۔ اسی وقت سے وہ اور ان کی اولاد میں کوئی نہ کوئی ہمیشہ ہمارا مشیر رہا ہے۔ میرے والد کے مشیر اعلیٰ اس کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے لڑکے نے جسے میرا مشیر اعلیٰ بننا تھا نامعلوم وجوہ کی بنا پر معذرت کرلی لہٰذا والد کے مشیر اعلیٰ کے چھوٹے بھائی کو مجھے اپنا مشیر بنانا پڑا۔ یہ کلکتے کا پڑھا ہوا تھا اور میرے جاسوسوں کے مطابق اکثر کہتا تھا کہ قبیلے کی سرداری اور راجہ بننا ہمارا حق تھا اور ہم اپنا حق کبھی نہ کبھی ضرور حاصل کرلیں گے۔ میں اس کے متعلق ہمیشہ شش و پنج میں مبتلا رہا لیکن آج کی حرکت سے اس کے عزائم کھل کر سامنے آگئے۔ آپ نے اپنے اسلحہ کے زور پر مجھے نظر بند کرنا چاہا تھا اور اگر یہ اسلحہ اس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ مجھے اور میرے بھائی کو ختم کر کے خود راجہ بن بیٹھتا اور آپ کے پیسوں سے اپنے مخالفین کو بھی خرید لیتا۔“ راجہ اپنی باتیں کیے جا رہا تھا ادھر میں سوچ رہا تھا کہ اقتدار اور حکومت کے حصول کے لیے انارکلی کو وجہ بنا کر شہزادہ سلیم (بعد میں شہنشاہ جہانگیر) نے اپنے باپ شہنشاہ اکبر کے خلاف بغاوت کی۔ اورنگ زیب نے بھی اپنے والد

شاہجہاں کو آگرہ کے قلعے میں قید کر کے تاج و تخت پر قبضہ کیا تھا اور انتہائی مذہبی خیالات کے حامل اس شہنشاہ نے اپنے سگے بھائی اور تخت دہلی کے دعویدار کی آنکھوں پر نشتر لگا کر اسے اندھا کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ شہنشاہ اکبر نے اپنے استاد خان خاناں کو قید کر دیا۔ حکومت کرنے کا سودا جن کے دماغ میں سما جائے، ان کے لیے دو ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ تخت یا تختہ۔ بقول فیض احمد فیض ۔

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ہندوستان کی تاریخ کی سب سے بڑی جنگ مہابھارت آج سے ہزاروں برس پہلے کوروں اور پانڈوں کے درمیان لڑی گئی جو آپس میں چچا زاد بھائی تھے۔

سردار نے وعدے کے مطابق بعد دوپہر کلپنا کو دو خادماؤں کے ہمراہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے کلپنا کو بتایا کہ میں نے سردار کو اس بات پر رضامند کر لیا ہے کہ جشن سرداری سے پہلے وہ تمھیں اپنی رانی نہ بنائے۔ اگر وہ اس دوران شب بسری کے لیے تمھیں کہے تو تم کسی بہانے ٹال دینا۔ سردار کو ہلاک کرنا کوئی مشکل نہیں لیکن ابھی ہمیں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے اس کی زندگی کی ضرورت ہے، لہٰذا وہ فی الحال زہریلا تیر استعمال کرنے کا خیال بھول جائے۔ ہمارا تعاون اسے صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب وہ میرے کہے پر عمل کرے۔ کلپنا کو مطمئن کر کے میں نے واپس بھیج دیا۔ فی الحال اسے بڑی رانی تک پہنچنے کا موقع نہیں ملا تھا اور سردار نے اپنے وعدے کے مطابق مجھے آج بڑی رانی اور چھوٹے بھائی سے ملوانا تھا۔

کلپنا کے جانے کے بعد میں آج کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں واقعات کی کڑیاں ملا کر کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی سوچ میں پڑ گیا۔ مشیر اعلیٰ کا اکیلے آ کے مجھ سے ہمارا تمام اسلحہ، جواہرات اور روپیہ جبراً لینے کی کوشش ایک انتہائی احمقانہ فعل تھا۔ اس کی ناکامی کی صورت میں میرے مسلح ساتھیوں اور حویلی کے ملازمین کے سامنے سردار کا اسے کسی تفتیش اور حالات کی تہہ تک پہنچے بغیر فوری ہلاک کر دینا بھی غلط اور بالکل نامناسب تھا۔ یہ بھی تو عین ممکن تھا کہ سردار نے اسے بطور چارہ میرے پاس بھیجا ہو اور اس کے پہریدار اور سپاہی اسی انتظام میں حویلی میں کسی خفیہ جگہ تیار حالت میں موجود ہوں کہ اگر مشیر اعلیٰ پلان کے مطابق ہم سے اسلحہ، روپیہ اور جواہر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو سپاہی اور پہریدار اچانک نمودار ہو کر ہمارا اسلحہ اپنے قبضے میں لے کر ہمیں حراست میں لے لیں۔ ہمارے ساتھ آمنے سامنے مقابلے میں انھیں چونکہ اپنی کامیابی کا ذرہ بھر یقین نہیں تھا اس لیے مشیر کے ذریعے پہلے اور بعد میں مجھے اسلحے کی زد میں لے کر میرے ساتھیوں کو بے ہتھیار کرنے کی سازش بھی ہوسکتی تھی۔ اس طرح اگر سازش کامیاب رہتی تو اس کا سارا مقصد پورا ہو جاتا اور ناکامی کی صورت میں سازش کا سارا بوجھ مشیر اعلیٰ پر ڈال کر اور اسے فوری ہلاک کر کے اس پر پردہ ڈالنا تھا۔ میں نے سردار سے اپنی پہلی ملاقات سے لے کر آج کی ملاقات تک اس کے رویے پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ ان چند ملاقاتوں میں اس نے کئی قلابازیاں کھائی ہیں۔ پہلے رعونت اور اپنے باپ کے بھیجے گئے شاہی فرمان کا مذاق اڑانا، پھر میرے سمجھانے پر اپنا رویہ بدلنا، آج حویلی کے صحن میں مشیر کی حالت دیکھ کر میرے ساتھ خشک لہجے میں بات کرنا اور پھر ہماری فائر پاور سے خوفزدہ ہو کر اور میری وارننگ کے بعد اپنے رویے میں ایک دم تبدیلی لانا اور مشیر کو فوری ہلاک کرنا، سردار کا ذاتی کردار اتنا پست ہونا کہ خود ہی اپنی حویلی میں میرے قافلے کو دعوت دے کر بلانا اور پہلی رات ہی کلپنا سے زبردستی کرنا۔ ان سب کڑیوں کو جب میں نے ملایا تو ایک ایسے خودسر نوجوان کا چہرہ سامنے آیا جو حصول اقتدار کے لیے اپنی ماں اور بھائی کو قید کر کے اور اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر قبیلے کا سردار اور راجہ بن سکتا ہے اور اپنے باپ کے بھیجے ہوئے مہمان کے سامنے اپنے باپ کی توہین اور اپنی مقصد براری کے لیے اپنے مشیر اعلیٰ کو ہلاک کر سکتا ہے اور اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے ایک اجنبی مہمان لڑکی سے زبردستی کر کے تمام اخلاقی اور سماجی اقدار کو پامال کر سکتا ہے۔ اس نئے زاویے سے حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے مشیر کا کردار بالکل ایک کٹھ پتلی جیسا دکھائی دیا جو اپنے سردار اور راجہ کے حکم کی بجا آوری کے دوران ہمارے ہاتھوں زخمی ہوا اور راز کے کھل جانے کے خوف کے باعث راجہ کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ میں اب تک صرف سردار کی باتوں پر یقین کیے بیٹھا تھا حالانکہ کلپنا کے بقول وہ آج بھی رانی تک رسائی حاصل نہ کر سکی تھی۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ سردار کی ماں اور بھائی ابھی تک نظر بندی کی حالت میں تھے۔ میرا دماغ کئی باتوں میں الجھا ہوا تھا لہٰذا میں نے قیصر اور اپنے نمبر ٹو سے ان حالات کے پیش نظر مشورہ کر کے آئندہ لائحۂ عمل کا فیصلہ کرنا مناسب سمجھا۔

میں نے ان دونوں کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس مسئلے پر گفتگو شروع کی۔ دو گھنٹے کے بحث مباحثہ اور دلائل کی روشنی میں ہم نے جو فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ (1) سردار قطعی بے اعتبار اور سازشی ہے لہٰذا اس پر ہرگز ہرگز بھروسہ نہ کیا جائے۔ (2) جس طرح اس نے کئی پینترے بدلے ہیں، ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے اسی مغالطے میں رکھ کر کہ ہم اس کے حامی ہیں ہمیں اپنے اصل مقصد یعنی رانی اور اس کے چھوٹے بیٹے کے ہمراہ جواہرات حاصل کرنے پر پوری توجہ دینی چاہیے۔ (3) ہمیں ہر دم چوکس رہنا اور اپنے ہتھیاروں کی حفاظت کرنا چاہیے تاکہ ہماری بے خبری، لاعلمی اور اندھے بھروسے کی وجہ سے دشمن ہم پر اچانک وار نہ کر سکے۔ ہمیں بھی اپنے طور پر پیسوں کا لالچ دے کر جاسوسی کا ایسا نظام بنانا چاہیے جو ہمیں اندرونی حالات اور سازشوں سے باخبر رکھ سکے۔ (4) سردار کو شراب مہیا کرنے والے فوجی پر بھروسہ کر کے اسے قطعی اپنا ہمراز نہ بنایا جائے اور نہ ہی اس کے ذریعے بنگلہ دیش جانے کی کوشش کی جائے بلکہ اس مقصد کے لیے اپنے ذرائع سے کوشش کی جائے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے قیصر کو کہا کہ اپنے دو مسلح ساتھیوں کے ہمراہ حویلی سے باہر جا کر مرنے والے مشیر کے گھر کا پتہ چلانے کی کوشش کرے اور اگر گھر مل جائے تو یہ پوچھے کہ گھر میں کوئی انگریزی یا اردو بولنے والا شخص ہے۔ اگر ایسا شخص مل جائے تو دو آدمی اسی کے پاس رکیں اور ایک آ کر مجھے اطلاع دے۔ میں سمجھتا تھا کہ سردار

کے ہاتھوں مرنے والے کے قریبی لواحقین یقیناً طیش میں ہوں گے اور بہت ممکن ہے کہ میں ان سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہوجاؤں۔

قیصر اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ فوراً ہی اپنے مشن پر نکل کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی طرف سے حتیٰ الامکان کسی سازش کا شکار ہونے سے بچنے کے لیے تمام انتظام کر لیے تھے اور اب مجھے رانی اور اس کے لڑکے سے ملاقات کا انتظار تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک شک ابھرا۔ میں نے اپنے خادموں میں سے ایک کو اشاروں سے سمجھایا کہ حویلی کے زنانے حصے میں جائے اور کلپنا کو میرا پیغام دے کہ وہ مجھے فوری طور پر ملنے کے لیے آئے۔ آدھے گھنٹے میں ہی کلپنا اپنی دو خادماؤں کے ساتھ آ گئی۔ خادماؤں کو باہر رکنے کا کہہ کر میں نے کلپنا کو اپنے کمرے میں بلایا اور آج کے واقعات کو مختصراً دوبارہ بیان کر کے کہا کہ سردار کے وعدے کے مطابق آج رانی اور اس کے چھوٹے بیٹے نے مجھ سے ملنا ہے۔ تم واپس جا کر پوری کوشش کرو کہ کسی طرح رانی اور نظر بند لڑکے کو دیکھ سکو یا کم از کم اپنی رازدار خادمہ کے ذریعے یہ پتہ چلانے کی کوشش کرو کہ مجھ سے ملنے والے واقعی اصلی رانی اور اس کا بیٹا ہی ہیں یا کوئی دوسرے لوگ رانی اور اس کا بیٹا بن کر مجھ سے ملیں گے۔ اگر دوسری بات درست ہوئی تو کسی کی بھی پرواہ کیے بغیر ملاقات کے کمرے میں چلی آنا۔ تمھارے لیے یہ بات اس لیے دشوار نہ ہوگی کیونکہ سردار بھی اس ملاقات کے دوران موجود ہوگا جو زنانے حصے کے ڈرائنگ روم میں ہوگی۔ کلپنا میری بات سمجھ گئی اور بولی کہ وہ اپنے تئیں پوری کوشش کرے گی کہ مجھے اصلیت کا پتہ چل جائے۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں اپنی بات مکمل کر کے میں نے کلپنا کو واپس بھیج دیا۔ ذہنی طور پر میں واقعی بہت اپ سیٹ تھا۔ میں دشمن سے کھلے مقابلے اور گولیوں کے تبادلے میں کبھی بھی گھبرایا نہ تھا لیکن محلاتی سازشوں سے میرا پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ چھپا ہوا دشمن دکھائی دینے والے دشمن سے بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ مجھے خوب اچھی طرح سے یاد ہے کہ 65ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران جنگ بندی کے بعد لاہور سیکٹر میں دونوں ممالک کی فوجیں زیادہ سے زیادہ ایک سو میٹر کے فاصلے پر ایک دوسرے کے سامنے مورچوں اور خندقوں میں موجود تھیں۔ سیز فائر کے باوجود دونوں افواج میں گولیوں کا اکثر تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ ہندو فوج صبح اپنی چمکتی گڑویاں لیے ہوئے رفع حاجت کے لیے مورچوں سے باہر نکلتے تھے۔ وہ خود تو سبز یا کیمو فلاج وردی پہنے ہوتے تھے لیکن سورج کی ترچھی شعاعوں میں ان کی گڑویاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ پاک فوج کے سپاہی انھیں پریشان کرنے کے لیے گڑوی کا نشانہ لے کر فائر کر دیتے۔ فائر ہوتے ہی بھارتی فوجی سب کچھ بیچ میں چھوڑ چھاڑ اپنی خندقوں کی طرف بھاگتے اور پاکستانی ایک یا دو فائر کے جواب میں ہزاروں گولیاں چلاتے۔ پاکستانی فوجیوں کے ہاتھ تو ایک کھیل آ گیا تھا۔ تقریباً ہر روز ہی ایسا ہوتا لیکن بھارتی فوجیوں کی حالت خوف سے ناگفتہ بہ ہوچکی تھی۔ بالآخر انھوں نے اپنی خندقوں اور مورچوں میں ہی رفع حاجت کا عمل شروع کر دیا۔ تعفن اور بدبو سے ان کے مورچے اور خندقوں کی حالت ایسی ہوگئی

کہ وہاں چند منٹ رکنا بھی محال ہوگیا۔ آٹھ دس روز بعد بالآخر بھارتی بریگیڈیئر سفید جھنڈا لگائے پاکستانی کمانڈر کے پاس آیا اور بڑے ملتجیانہ لہجے میں اپنی بریگیڈ کے لیے چند رعایتیں مانگیں۔ (1) پاکستانی فوجی گڑویوں کو نشانہ بنانا چھوڑ دیں (2) آدھی رات کو جب ہو کا عالم ہوتا ہے، پاکستانی فوجی نعرۂ تکبیر لگا کر ہمارے فوجیوں کی نیند حرام کر دیتے ہیں کیونکہ افواج پاکستان یہ نعرہ دشمن پر حملہ کرتے وقت لگاتی ہے لہٰذا یہ نعرہ نہ لگایا جائے پاکستانی کمانڈر نے بھارتی بریگیڈیئر کی درخواست منظور کی اور یوں بھارتی فوجیوں کو سکھ کا چین لینا نصیب ہوا۔ پھر بھی گاہے بگاہے پاکستانی فوجی بھارتی فوجیوں کی گڑویوں کو نشانہ بناتے ہی رہے اور یہ حالت اس وقت تک برقرار رہی جب تک دونوں فوجیں واپس اپنی اپنی چھاؤنیوں میں چلی نہ گئیں۔ جب بھرپور جنگ ہو رہی ہو تو فوجیوں کو نہ تو اپنی جان کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کی جان لینے کا افسوس۔ لیکن یہی فوجی مورچوں میں بیٹھے اور دشمن کے حملے کے انتظار میں ذہنی تناؤ کا اتنا زیادہ شکار ہوجاتے ہیں کہ بعض اوقات مورچوں اور خندقوں سے باہر آ کر اونچی آواز میں دشمن کو گالیاں دینے اور بغیر کسی ٹارگٹ کے فائر کرنے لگتے ہیں اور اسی حالت میں نہ صرف دشمن کی گولی کا نشانہ بنتے ہیں بلکہ دشمن کو ان کے مورچوں اور خندقوں کی نشان دہی بھی ہوجاتی ہے۔

میری ذہنی حالت بھی دشمن کے انتظار میں مورچے میں بیٹھے ہوئے فوجی جیسی ہو رہی تھی۔ دشمن کو نہ دیکھا ہو تو در و دیوار بھی دشمن دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی تو میرا جی چاہتا کہ ساتھیوں سمیت زنانہ خانے پر حملہ کر کے سوائے رانی اور اس کے چھوٹے بیٹے کے سب کو گولیاں مار دوں۔ کبھی یہ خیال آتا کہ چپ چاپ رانی اور چھوٹے لڑکے کے بغیر ہی یہاں سے واپس لوٹ جاؤں۔ دراصل میں جتنا آمنے سامنے کی لڑائی میں بلا کسی خوف کے کود پڑتا ہوں اتنا ہی چھپے دشمن کے وار سے گھبراتا ہوں۔ میں بڑی بے چینی کی حالت میں تھا کہ قیصر کا ساتھی بھاگتا ہوا آیا اور بولا کہ کام کا آدمی مل گیا ہے اور قیصر نے اسے وہیں روک کر آپ کو بلایا ہے۔ میں پیغام لانے والے کے ساتھ ہی چل پڑا۔ حویلی سے تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر ایک جھونپڑ ہوٹل میں قیصر اپنے ساتھی اور ایک اجنبی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ قیصر نے اس سے اردو میں میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا، ”یہ رضی صاحب بہار کے رہنے والے مہاجر ہیں۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل انھوں نے ایک چکمہ خاتون سے شادی کر لی تھی اور بنگلہ دیش بننے کے بعد رانگا ماٹی میں ہی آن بسے۔ یہ پڑھے لکھے ہیں اور آپ کو خاصی معلومات دے سکتے ہیں۔ میں نے گرمجوشی سے رضی سے ہاتھ ملایا۔ قیصر نے دوسری بار چائے منگوائی۔ میں نے رضی کو کہا، ”میں اپنے ساتھیوں سمیت ایک اہم کام کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں اور مجھے قبیلے کی کچھ اندرونی معلومات درکار ہیں۔ اگر آپ کے ذریعے میری ساری ضرورت پوری ہوگئی تو میں آپ کو ایک سو ڈالر دوں گا۔ ورنہ جتنی اہم باتیں آپ سے معلوم ہوں گی۔ ان کے مطابق آپ کو معاوضہ دیا جائے گا۔

سو ڈالر معاوضے کا سن کر پہلے تو رضی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور ساتھ ہی آنکھیں بُجھ

آئیں۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی دونوں کیفیتوں پر قابو پایا اور گویا ہوا۔ ''صاحب! آپ نے اتنی زیادہ رقم مجھے معاوضے میں دینے کا کہا ہے جس کا میں اپنے موجودہ حالات میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یقین جانیے میں نے آج کئی ہفتوں کے بعد چائے پی ہے۔ میں مشرقی پاکستان میں گیم وارڈن تھا اور انھی جنگلات میں اپنے سرکاری فرائض ادا کرتا تھا۔ سفید پوشی کی زندگی بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ میری تنخواہ اور غیر ملکی شکاری حضرات کے دیے ہوئے انعام سے میں اپنے ضعیف والدین کو بھی خاصی رقم بھیجتا تھا جو چٹاگانگ میں رہتے تھے۔ ایک بار رانگاماٹی کے بالکل قریبی جنگل میں درخت کے تنے سے چپکے ایک چیتے نے مجھ پر حملہ کردیا۔ چیتے کی طاقت اور چھلانگ لگانے کے زور سے میں اوندھے منہ گر گیا اور میری رائفل بھی دور جا پڑی۔ قریب تھا کہ چیتا مجھے پھاڑ کھاتا کہ ایک چکمہ عورت نے بھالے مار مار کر چیتے کو لہولہان کردیا اور میری جان بچائی۔ وہی چکمہ عورت اب میری بیوی ہے۔ سقوط ڈھاکہ تک ہم نہایت خوش وخرم زندگی بسر کررہے تھے۔ 25 مارچ 71ء سے دو ماہ پیشتر جب غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع ہوا تو اس کی زد میں میرے والدین بھی آگئے۔ میں اور میری بیوی اس وقت کھلنا میں تھے۔ بڑی مشکل سے اپنی جانیں بچاتے ہم رانگاماٹی پہنچے۔ عام خیال یہی تھا کہ حالات جلد ہی معمول پر آجائیں گے لیکن ہوا اس کے برخلاف۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت تک ہم اپنی تمام جمع پونجی ختم کر بیٹھے تھے۔ چٹاگانگ میں ہمارا گھر بلوائیوں نے لوٹ لیا تھا۔ میرے پاس صرف چند جوڑے کپڑے اور رائفل تھی۔ میری بیوی کا اس کے قبیلے والوں نے اس لیے بائیکاٹ کردیا کہ اس نے قبیلے سے باہر شادی کی تھی۔ اس کے والدین نے بھی ہم سے آنکھیں پھیر لیں کیونکہ میں اب کماؤ داماد نہیں بلکہ ان کے لیے ایک بوجھ تھا۔ اس کے علاوہ قبیلے والوں نے ہماری شادی کی وجہ سے ان کا بھی بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میری رائفل قبیلے کا ایک سرکردہ آدمی زبردستی چھین کر لے گیا۔ میری بیوی میرے ہمراہ پاکستان جانے کو تیار تھی لیکن ہم دونوں بالکل خالی ہاتھ تھے۔ ہم دونوں نے مل کر قصبے کے باہر ایک جھونپڑا بنایا۔ گیم وارڈن ہونے کی وجہ سے مجھے جنگلی جانوروں اور پرندوں کو پکڑنے اور ان کو Taxiderm (کھال میں بھوسہ اور دوسرے اجزا ڈال کر بالکل زندہ جانوروں کی شکل دینا) کرنے کا فن آتا ہے۔ میں نے یہی کام شروع کردیا۔ لیکن بنگلہ دیشی فوج نے رانگاماٹی کو گھیرے میں لے کر قبیلے تک آمد و رفت کو روک دیا جس سے خریدار یہاں آنے بند ہوگئے۔ اب میں مہینے میں ایک آدھی بار چھپ چھپا کر چٹاگانگ اور کھلنا جاتا ہوں اور انتہائی محنت سے Stuff کیے ہوئے پرندے کوڑیوں کے مول دکانداروں کو بیچ کر گزر اوقات کررہا ہوں۔ بارہا ایسے موقعے آئے کہ بارشوں یا رستہ نہ ملنے کے باعث میں یہ سامان فروخت کرنے نہ جاسکا اور ہمیں ہفتوں صرف جنگلی بیر کھا کر پیٹ کا دوزخ بھرنا پڑا۔ رضی کی باتوں سے سچائی ٹپک رہی تھی۔ اس کے لباس میں درجنوں پیوند لگے ہونے کے باوجود کئی جگہ سے جسم ننگا تھا۔ اس کی کاٹھی مضبوط تھی لیکن کمزوری اور بھوک کے باعث جسم کی ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے رضی

سے پوچھا، ''ہمارے متعلق کیا کچھ جانتے ہو؟'' ''آج کل رانگاماٹی میں ہر طرف آپ ہی کے چرچے ہو رہے ہیں۔ قسم قسم کی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ راجہ تری دیو کا پیغام لے کر آئیں ہیں، کسی کی زبان پر یہ ہے کہ موجودہ سردار کو آپ نے حراست میں لے لیا ہے، کہیں یہ کہا جارہا ہے کہ راجہ عنقریب آپ سب کو ہلاک کردے گا۔ آج مشیر اعلیٰ کی ہلاکت اور آپ کے سردار کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے چرچے ہیں۔'' رضی نے جواب دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، ''مجھے یہ بتاؤ کہ سردار پر کس حد تک بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور کیا مرنے والا مشیر بھی سردار بننے کی خواہش رکھتا تھا؟'' رضی نے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا، ''اقتدار کے حصول کی خواہش کسے نہیں ہوتی۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے پیچھے یہی خواہش کارفرما تھی۔ بھٹو کو مشرقی پاکستان سے ایک سیٹ بھی نہیں ملی تھی اور مجیب الرحمٰن کی حکومت بھٹو کو قبول نہ تھی۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان جغرافیائی فاصلے کو محبت، پیار اور ایثار سے پاٹنے کے بجائے بھٹو اور مجیب نے نفرتوں کے سمندر حائل کردیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت دولخت ہوگی۔ مجیب اور بھٹو کو دونوں حصوں میں اقتدار تو مل گیا لیکن دونوں حصوں کے عوام کے دلوں میں نفرتوں کے جو بیج ان دونوں نے بوئے وہ آکاس بیل کی طرح بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ موجودہ سردار اپنے باپ کی یہاں موجودگی میں زیادہ وقت یورپ میں رہا۔ باپ اس سے زیادہ اپنے چھوٹے بیٹے کو پسند کرتا تھا اور عام خیال یہی تھا کہ راجہ تری دیو چھوٹے بیٹے کو سردار بنائے گا۔ بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے ہی بڑا بیٹا یورپ سے لوٹ آیا اور بنگلہ دیش بننے کے دو ماہ کے اندر ہی اس نے اپنی سرداری کا اعلان کردیا، اس دن سے اس کی ماں اور چھوٹے بھائی کو کسی نے نہیں دیکھا۔ موجودہ سردار انتہائی شاطر اور سازشی دماغ کا ہے۔ جس مشیر کو اس نے آج ہلاک کیا ہے وہ تو اس کا انتہائی وفادار اور معتمد تھا۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ سردار کی بیوی اسی مشیر کی سگی بہن ہے۔ قبیلے کے لوگ سردار کو باپ کا درجہ دیتے ہیں اور قبیلے کی عورتیں سردار کے بلاوے پر بغیر کسی خوف کے اس کے پاس جاتی ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں درجنوں بار ایسا ہوا ہے کہ سردار کے بلانے پر جانے والی لڑکی نے واپس آکر ایک اونچی چٹان سے کود کر خودکشی کرلی۔ اس چٹان کا اب نام ہی موت کی چٹان پڑ گیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان خودکشیوں کی وجہ کیا ہے لیکن خوف کے مارے کوئی بھی آواز اٹھانے کو تیار نہیں۔'' رضی نے اپنی داستان سنا کر اپنے دل میں جذبات کا بند کھول دیا تھا۔ ''جناب میری بیوی بھی اب اردو بولتی اور سمجھتی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس سے پوچھ لیں۔ ممکن ہے اس سے آپ کو کام کی کوئی بات مل جائے۔'' رضی نے ڈرتے ڈرتے اپنے جھونپڑے میں مجھے آنے کی دعوت دی۔ میں نے فی الوقت اس کے ہاں جانے کی معذرت کرتے ہوئے کہا، ''رضی میں تمھاری دکھ بھری داستان اور ہمت اور صبر کا دامن نہ چھوڑنے سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آج تو مجھے کچھ بہت ضروری کام کرنے ہیں۔ انشاء اللہ کل میں تمھارے گھر آؤں گا۔ تم کل گیارہ بجے اسی ہوٹل میں میرا انتظار کرنا۔ تم کو میں سو ڈالر معاوضہ

دے رہا ہوں۔ تم نے اپنی داستان سنانے کے دوران فوج کا گھیرا ہونے کے باوجود اپنے چٹاگانگ اور کھلنا جانے کا بتایا تھا۔ کیا تم ہمارے ساتھ انہی راستوں سے ہمیں چٹاگانگ، کھلنا اور ڈھاکہ لے جاسکتے ہو؟ میری بات کا جواب سوچ سمجھ کر کل دینا۔ تمھیں گائیڈ بننے کا نہ صرف تمھاری توقع سے زائد معاوضہ ملے گا بلکہ اگر تمھاری اور تمھاری بیوی کی خواہش ہوئی تو ہم تمھیں بھارت یا پاکستان جہاں چاہو، اپنے یا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بھجوا دیں گے اور تمھیں رہائش اور کاروبار یا ملازمت دلانے کا بھی وعدہ کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے پانچ پانچ ڈالر کے 20 نوٹ رضی کو دیے۔ اس نے اپنی جو حالت زار بتائی تھی، اس میں کوئی بھی سو ڈالر کا نوٹ اس سے چھین سکتا تھا۔ رضی کو رخصت کرکے میں جھونپڑ ہوٹل سے باہر نکلا ہی تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے قیصر کے ایک ساتھی کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اس کو واپس لے آئے۔ رضی جو سو ڈالر یکمشت ملنے سے اتنا خوش تھا جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو، واپس آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ابھی تمھاری بیوی سے مل کر چند سوال پوچھ سکیں؟ رضی نے فوراً ہامی بھری اور ہمیں لے کر اپنے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔ دس بارہ منٹ میں ہی ہم اس کے جھونپڑے تک پہنچ گئے جو اس کی غربت کا حال بیان کررہا تھا۔ ایک پھٹا پرانا سوٹ کیس، چند ٹوٹے ہوئے برتن اور Stuff کیے ہوئے پرندے جھونپڑے کی کل کائنات تھی۔ رضی نے اردو میں اپنی بیوی کو ہمارے متعلق بتایا جو ایک پھٹی ہوئی ساڑھی پہنے تھی اور اسے سو ڈالر کے نوٹ دیے۔ میں جلدی میں تھا اس لیے میں نے اس کی بیوی سے ڈائریکٹ سوال کیا کہ کیا اس نے کبھی راجہ تری دیو رائے کی بیوی اور چھوٹے بیٹے کو دیکھا ہے اور اگر دیکھا ہے تو ان کی شکل وصورت اور قد وقامت کے ساتھ کوئی ایسی نشانی یا کوئی خاص بات بتا سکتی ہے جس سے ان کی پہچان میں آسانی ہو؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولی، ''رانی صاحبہ کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہے اور وہ قدرے بھاری جسم کی ہیں۔ ان کی ایک خاص نشانی یہ ہے کہ ان کے بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیاں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ وہ روانی سے انگریزی بولتی ہیں۔ سردار کا بھائی بالکل جوان ہے اور اس کی ناک پر ایک مسہ ہے۔ وہ قبیلے کی زبان کے علاوہ انگریزی، اردو اور بنگلہ زبانوں کے علاوہ فرانسیسی زبان بھی جانتا ہے۔ یہ جسمانی نشانیاں تو میں نے خود دیکھی ہیں جبکہ مختلف زبانیں جاننے کے متعلق مجھے ایک سہیلی نے بتایا تھا جو حویلی میں خادمہ ہے۔'' ''اگر تمھیں موقع ملے تو کیا تم رانی صاحب اور لڑکے کو شناخت کرسکتی ہو؟'' میرے اس سوال کے جواب میں اس نے سرہلاتے ہوئے جواب دیا، ''یقیناً اور سو فیصد درستگی کے ساتھ۔'' میرے پاس وقت بہت ہی کم تھا۔ رضی ہمارے ساتھ ہی قصبے میں چلا آیا کیونکہ اسے قصبے کے مہاجن سے ڈالر تبدیل کروا کے سودا سلف خریدنا تھا۔

میں قیصر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ تیز تیز قدموں سے حویلی میں واپس لوٹ آیا۔ مجھے شام کو کسی وقت بھی زنان خانے میں رانی اور اس کے چھوٹے لڑکے سے ملنے کے لیے طلب کیا جاسکتا

تھا۔ میں نے رانی کے لیے راجہ تری دیو کا خط اپنی اندرونی جیب میں رکھا اپنا ریوالور اور پسٹل کی فالتو گولیاں اور میگزین بھی اندرونی جیب میں رکھیں اور لاؤسیوں کی طرح ایک خنجر اپنی دائیں پنڈلی سے باندھا۔ میں نے قیصر اور نمبر ٹو کو اپنے کمرے میں بلوا کر کہا کہ آج رات مجھے رانی اور اس کے لڑکے سے ملنے زنان خانے میں جانا ہے۔ مجھے یہ بھی خدشہ ہے کہ وہاں مجھے کسی ٹریپ (Trap) میں پھنسا دیا جائے اس لیے میرے جانے اور واپسی تک سب ساتھی چوکنے اور ہتھیاروں سمیت بالکل تیار رہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں ایک دو فائر کروں گا۔ فائر کی آواز سنتے ہی آپ سب زنان خانے پر دھاوا بول دینا اور اپنی راہ میں حائل ہونے والے کسی بھی مرد یا عورت کو گولیوں سے بھون دینا چاہے وہ سردار ہی کیوں نہ ہو اور مجھ تک پہنچنے کی جلد از جلد کوشش کرنا۔ یہ ہدایات دے کر میں نے قیصر کو تمام نقدی اور جواہر دیے اور کہا کہ اگر میں زندہ نہ لوٹ سکا تو تم قافلے کے سربراہ ہو گے اور میری ہدایت کے مطابق سب کو جواہر کے حصے دے کر واپس چلے جانا۔ قیصر رونی صورت بنا کر اٹوٹ لہجے میں بولا، ''بھائی جان! یہاں سے زندہ جائیں گے تو اکٹھے اور مریں گے تو بھی اکٹھے۔ ایسی باتیں نہ کریں۔ اگر آپ کو کوئی خدشہ ہے تو زنان خانے پر ابھی دھاوا بول کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیتے ہیں۔ سردار ہو، اس کی ماں ہو یا بھائی، ہمیں ان کی زندگی سے کیا دلچسپی۔ صرف آپ کے لیے ہم نے اپنی زندگیاں داؤ پر لگائی ہیں اور آپ کی حفاظت کے لیے ہم ہر قدم اٹھائیں گے چاہے آپ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔'' کچھ وقت اسی بحث میں گزرنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ نمبر ٹو میرے ہمراہ زنان خانے میں جائے گا جبکہ قیصر باقی ساتھیوں کے ساتھ Stand by پوزیشن میں رہے گا اور نمبر ٹو اور میں اپنے سائیڈ آرمز کے علاوہ چھ چھ دستی بم بھی جیکٹوں کے نیچے چھپا کر لے جائیں گے۔ تیاری کے لیے دس منٹ کی مہلت لے کر نمبر ٹو اور قیصر اپنے کمروں کی طرف گئے۔ اس دوران میں نے بھی دستی بم قمیض کے ساتھ باندھ کر اوپر جیکٹ پہن لی۔ نمبر ٹو کو تیار ہو کر میرے پاس آئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ خادموں نے مجھے بتایا کہ مجھے زنان خانے میں لے جانے کے لیے دو آدمی آئے ہیں۔ ہم دونوں کمرے سے باہر نکلے تو قیصر اپنے کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ آکر شامل ہوگیا۔ اس نے کہا کہ وہ زنان خانے کے داخلی دروازے تک ہمارے ساتھ جائے گا تاکہ راستے سے واقف ہوسکے۔ دونوں پہریدار ہم تینوں کو ان کے ساتھ جاتے دیکھ کر تذبذب میں پڑ گئے لیکن بولے کچھ نہیں۔ داخلی دروازے پر جاکر پہریداروں نے دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ وہاں چار پہریدار موجود تھے۔ میں اور نمبر ٹو دروازے میں جاکر کھڑے ہوگئے تاکہ قیصر اندر کا اچھی طرح جائزہ لے سکے۔ میں نے پہریداروں سے اشارے سے پوچھا کہ کس طرف جانا ہے۔ انھوں نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ یہ بھی قیصر کو سمجھانے کے لیے تھا۔ قیصر وہیں رک گیا۔ میرے ساتھ نمبر ٹو آگے بڑھا تو پہریداروں نے اسے روکنا چاہا۔ میں نے ان کے بھالے ایک طرف ہٹاتے ہوئے انھیں سمجھایا کہ یہ میرے ساتھ جائے گا۔ پہریداروں نے اپنی زبان میں ایک

دوسرے سے کچھ بات کی اور پھر ایک ہمارے آگے اور ایک پیچھے ہوکر چلنے لگے۔ میں نے آگے چلنے والے کو روک کر اشارے سے سمجھایا کہ تم دونوں ہمارے آگے چلو۔ بادلِ نخواستہ انھوں نے میری بات مانی اور ہمارے آگے چلنے لگے۔ خاصا بڑا صحن عبور کرکے ہم غلام گردش میں پہنچے اور پہریداروں نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک خادمہ نے دروازہ کھولا اور پہریداروں کی بات سن کر دروازہ بند کرکے اندر جانے لگی تو میں نے دروازے میں پاؤں رکھ کر اسے بند نہ ہونے دیا۔ کیونکہ اندر کی ایک جھلک سے ہی مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ کمرہ ڈرائنگ روم ہے۔ میں نے زور سے دھکا دے کر دروازہ کھولا اور اپنے نمبر ٹو کے ساتھ اندر جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ چونکہ خادمہ اور پہریداروں میں سے کوئی بھی انگریزی نہیں جانتا تھا اس لیے زبان نہ سمجھنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نمبر ٹو کے ساتھ کمرے میں چلا آیا تا کہ ہماری یہ ''زبردستی'' زبان نہ سمجھنے کے باعث شک و شبے میں ہی رہے۔

ہمیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری ہوگی جب سردار اپنے چار پہریداروں سمیت اندرونی کمرے سے وہاں آیا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار صاف نمایاں تھے۔ اس نے صوفے پر بیٹھتے ساتھ ہی پوچھا، ''میں نے اپنی ماں اور بھائی کو صرف تم سے ملانے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں انھیں بیچ چوراہے میں لے آؤں۔ تمھیں اپنے آدمی کو ہمراہ لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ضرورت تھی کیونکہ رانی صاحبہ اور آپ کے بھائی نے ہمارے ساتھ یہاں سے جانا ہے اس لیے میرے نائب کا ان سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ تمھیں بخوبی علم ہوگا کہ پاکستان یہاں سے کتنے ہزار میل دور ہے اور اس سفر کے دوران تم ہمارے ساتھ نہیں ہوگے لہٰذا مجھے اور میرے ساتھیوں کو ان کی حفاظت اور آرام کا خیال رکھنا ہوگا۔'' میرا یہ جواب سن کر سردار کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر ایک پہریدار کو کچھ کہا۔ پہریدار اسی دروازے سے اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد رانی اور چھوٹے بھائی کو لیے کمرے میں آگیا۔ میں نے اور نمبر ٹو نے کھڑے ہوکر دونوں کو تعظیم دی۔ رانی کی عمر لگ بھگ وہی تھی اور چھوٹا بھائی بھی سولہ سترہ سال کا تھا اور اس کی ناک پر ایک مسہ بھی موجود تھا۔ میں نے رانی صاحبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''راجہ تری دیو میرے محسن اور دوست ہیں اور انھوں نے مجھے یہاں اپنا شاہی فرمان دے کر بھیجا ہے جس کے مطابق آپ کے بڑے صاحبزادے کو قبیلے کا سردار اور راجہ مقرر کیا گیا ہے اور آپ کو اور آپ کے چھوٹے صاحبزادے کو اپنے پاس راولپنڈی بلایا ہے۔'' میں نے یہ گفتگو انگریزی اور اردو میں کی تھی۔ رانی نے سردار کے ساتھ کچھ سرگوشی کی اور سردار نے اس کی بات سن کر مجھے کہا کہ رانی صاحب نے کہا ہے کہ وہ یہاں سے نہیں جانا چاہتیں۔ میں اس دوران رانی کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے کسی بھی ہاتھ کی دو انگلیاں جڑی ہوئی نہ تھیں۔ وسوسے اور اندیشے میرے دل میں سر ابھار رہے تھے۔ میں نے چھوٹے بیٹے کو اپنی ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں مخاطب کرتے ہوئے اس کا احوال پوچھا اور کہا کہ وہ تو میرے ساتھ چلے گا کیونکہ اس کے والد اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔ لڑکا مجھے دیکھتا رہا لیکن

اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ سردار میری بات ختم ہوتے ہی بولا، ''میرا بھائی فرنچ نہیں جانتا۔'' میں نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی بات انگریزی میں دہراتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے میں چھوٹے لڑکے کے قریب جا بیٹھا اور انگریزی میں اپنی بات کی۔ میرے اس کے قریب بیٹھتے ہی اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے قبائلی زبان میں سردار سے کچھ کہا۔ سردار بولا، ''میرا بھائی بھی جانے سے انکاری ہے۔ اب تو تمھاری خواہش کے مطابق یہ ملاقات ہوگئی ہے اس لیے اب تم جاسکتے ہو۔'' سردار کے لہجے سے جھلاہٹ اور کرختگی صاف ظاہر تھی۔ اس نے پہریداروں کو اشارہ کیا اور ساتھ ہی اپنی زبان میں ماں اور بھائی سے کچھ کہا۔ وہ دونوں جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو میں اچانک آگے بڑھا اور گلے ملنے کے انداز میں لڑکے کو دونوں بازوؤں میں لے لیا اور یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنا چاہا کہ مسے کی ''حقیقت'' معلوم ہوسکے۔ عین اسی وقت اندرونی دروازے پر شور اٹھا جس میں کلپنا کی آواز نمایاں تھی۔ پھر دو پہریداروں کی چیخیں ابھریں اور زور سے دروازہ کھولتے ہوئے کلپنا داخل ہوئی۔ زہریلے تیر کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کی پھولی ہوئی سانس اور پھٹے ہوئے گریبان سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ اس کی پہریداروں سے ہاتھا پائی ہوئی ہے۔ سردار اسے دیکھتے ہی گھبرا گیا اور کھڑے ہوکر اس نے اپنا ہاتھ کوٹ کے اندر ڈالا۔ میرے اور نمبر ٹو کے ہاتھ بھی اپنے لباسوں کے اندر جاچکے تھے۔ تقریباً بیک وقت سردار کے ہاتھوں میں اپنا ریوالور اور میرے اور میرے نمبر ٹو کے ہاتھوں میں پسٹل اور ریوالور تھے۔ سردار کو یہ سوچنے میں ایک یا دو سیکنڈ لگے ہوں گے کہ وہ پہلے مجھے یا میرے نمبر ٹو میں سے کسے نشانہ بنائے اور اسی دو سیکنڈ کے وقفے میں میں نے سردار کے ہاتھ پر فائر کیا۔ قارئین اس منظر کو تصور میں لاسکتے ہیں کہ سردار کے ہاتھ پر میری گولی لگی اور اس کا ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کچھ دور جا گرا۔ لیکن اس دوران سردار نے بھی ٹریگر دبا دیا تھا جس سے اس کے ہاتھ سے گرنے والے ریوالور سے نکلنے والی گولی چلی لیکن اس دوران ریوالور کا رخ بدل چکا تھا۔ اس کی گولی اس کے پیچھے کھڑے ایک پہریدار کے پیٹ میں لگی۔ یہ سب واقعہ زیادہ سے زیادہ تین سیکنڈ میں ہوا ہوگا۔ سردار زخمی ہاتھ پکڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ادھر رانی اور چھوٹا لڑکا ڈر سے تھر تھر کانپتے ہوئے میرے آگے سجدے میں گر گئے۔ میں نے کلپنا سے کہا کہ وہ رانی اور لڑکے کو اٹھائے اور انھیں دلاسہ دے کہ انھیں خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ''کہاں کی رانی اور کونسا لڑکا؟ یہ دونوں تو سردار کے کہنے پر ان کا بہروپ بھرے ہوئے ہیں۔ اصلی رانی اور لڑکا تو زنان خانے کے آخری حصے میں قید ہیں۔'' میں نے اور نمبر ٹو نے سردار کے علاوہ پہریداروں کو بھی زد میں لے رکھا تھا۔ کلپنا نے سردار کا ریوالور اٹھالیا اور میرے کہنے پر پہریداروں سے بھالے لے کر الٹا لیٹنے کو کہا اور انھیں ذرا سی بھی حرکت کرنے سے منع کیا۔ کلپنا نے بتایا کہ اسے ساری حقیقت کا علم ہوگیا تھا اور یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ سردار ایک عورت اور لڑکے کو اپنی ماں اور بھائی بنا کر تم سے ملانے کا ڈرامہ کررہا ہے۔ پہریداروں نے

اسے ڈرائنگ روم میں آنے سے روکا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا کیونکہ سردار کا ارادہ تھا کہ اس ڈرائنگ روم میں تمھیں اپنی مصنوعی ماں اور بھائی سے ملاکر اور اپنی طرف سے غافل پاکر تمھیں یہیں پہریداروں سے مروا دے گا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ تم اکیلے نہیں بلکہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ زبردستی اس کمرے میں آگئے ہو تو وہ اتنا جھنجلایا کہ اپنا ریوالور نکال کر اس میں گولیاں بھریں اور یہاں آگیا۔ ایسے نازک وقت میں پہریداروں نے سختی سے مجھے اندر آنے سے روکا اور مجھے ان دونوں کو مجبوراً زہریلے تیر سے ہلاک کرنا پڑا۔ کلپنا کے بولنے کے دوران جب سردار نے دوسری مرتبہ اس کی بات کو کاٹنا چاہا تو میں نے اپنے نمبرٹو کو کہا کہ اس کے منہ پر زور سے بیس تھپڑ مارو۔ حالات نے اچانک ایسا پلٹا کھایا تھا کہ مجھے مجبوراً سردار کے خلاف بھرپور کارروائی کرنی پڑی۔ میں نے نمبرٹو کو کہا کہ بھاگتا ہوا جائے اور اپنے اور تمام ساتھیوں کو اسلحے سمیت یہاں لے آئے۔ چند منٹ میں ہی میرے تمام ساتھی اس کمرے میں پہنچ گئے۔ قیصر کو جب معلوم ہوا کہ سردار نے مجھ پر گولی چلائی ہے تو اس نے صوفے پر بیٹھے سردار کا ٹھڈے اور مکے مار مار کر ایسا حشر کر دیا کہ وہ فرش پر دو زانو بیٹھ کر مجھ سے گڑگڑا کر زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ اسے مورنگ اور مگھ قبائل کے سرداروں کا ہمارے ہاتھوں حشر معلوم ہوچکا تھا۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی اور اسے ہلاک کرنے میں میرے راستے میں واحد رکاوٹ اس کے باپ سے میرے تعلقات تھے۔ میں نے قیصر اور نمبرٹو سے چند منٹ کی مشاورت میں یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے، فوری کیا جائے۔ زیادہ غور وخوض اور وقت ضائع کرنے سے دشمن کو تازہ دم ہونے کی مہلت ملتی ہے اور مقابلہ کرنے کی نئی راہیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ میرے سب ساتھی اس کمرے میں موجود تھے۔ میں نے انھیں اٹیک سے پہلے آخری ہدایت دی کہ سردار کے ہاتھ پیچھے باندھ کر اسے اپنے آگے چلائیں۔ کلپنا ہمیں اصلی رانی اور راجہ کے لڑکے تک لے جائے گی۔ حویلی پر اب ہمارا قبضہ ہے جو ہمارے یہاں رہنے تک جاری رہے گا۔ سردار کو فی الحال کسی محفوظ کمرے میں حالت قید میں رکھا جائے گا اور قبیلے کے کسی بھی شخص، کسی خادم یا پہریدار کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہ ہوگی اور اگر کسی نے بھی ہماری اس کارروائی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو اسے فوراً گولی مار دی جائے۔ اصلی رانی اور لڑکے کو ہمارے ساتھ اور ہمارا انداز دیکھ کر قبیلے میں ہماری مخالفت کرنے والوں کی آواز بھی دب جائے گی اور رانی اور لڑکے کو سردار کے زندہ اور بخیریت ہونے کی یقین دہانی کرائی جائے گی۔

یہ ہدایات دے کر ہم نے سردار کے ہاتھ باندھنے کے لیے پردے پھاڑے اور اسے اپنے اسلحہ کی زد میں لے کر نقلی رانی، بھائی اور پہریداروں کے ہاتھ بھی باندھ دیے اور کلپنا ہمیں لے کر زنان خانے میں داخل ہوئی۔ ایک اندرونی صحن عبور کرکے زنان خانے کا اصل حصہ شروع ہوا۔ یہاں بھی کئی پہریدار تھے جن کے نیزے لے کر ہم نے انھیں بھی آگے لگالیا۔ کلپنا ہمیں ایک کمرے میں لے گئی جس میں سے سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ ان سیڑھیوں کے آخر میں چار پانچ تہہ خانے بنے ہوئے تھے۔ ان

میں سے ایک میں رانی اور دوسرے کمرے میں اس کی دو خادمائیں تھیں پھر دو کمرے چھوڑ کر ایک دروازہ تھا جس پر ایک پہریدار تھا۔ ہم نے اسے بھی نہتا کردیا بلکہ اپنے سردار کے بندھے ہاتھ دیکھ کر اس نے خود ہی اپنا بھالا پھینک دیا اور دروازہ کھول دیا۔ اس دروازے کے سامنے دو کمرے تھے جن میں سے ایک میں سردار کا چھوٹا بیٹا قید تھا۔ راجے کا بیٹا اپنے بڑے بھائی کے بندھے ہاتھ دیکھ کر سمجھ گیا کہ اس کا کھیل ختم ہوچکا ہے۔ میں نے مختصراً اسے یہاں اپنی آمد کا مقصد بتایا اور اسے لے کر ہم واپس رانی کے کمرے کی طرف لوٹے۔ رانی بھی چھوٹے بیٹے کو آزاد اور بڑے بیٹے کو ہمارا قیدی دیکھ کر حالات کی تبدیلی کو سمجھ گئی۔ ہم رانی اور چھوٹے بیٹے کے ہمراہ اوپر آئے لیکن اب سردار ہمارے ساتھ نہیں تھا بلکہ ہم اسے اس کے چھوٹے بھائی کے کمرے میں اسی حالت میں چھوڑ کر اور دروازہ بند کرکے ایک تھائی ساتھی کو پہرے پر چھوڑ آئے تھے۔ رانی بار بار اپنے چھوٹے بیٹے کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتی۔ اس نے مجھے بتایا کہ تقریباً تین سال کے بعد اس نے آسمان، کھلی فضا اور اپنے چھوٹے بیٹے کو دیکھا ہے۔ قیصر اور نمبرٹو نے میری ہدایت کے مطابق اپنے دو دو آدمی زنان خانے کے پہرے پر لگائے اور رانی اور چھوٹے لڑکے کی خدمت کے لیے ان کی مرضی کی خادماؤں کو روک کر باقی سب کو رخصت کردیا۔ میں نے رانی کو کہا کہ راجہ صاحب نے ان کے نام ایک خط دیا ہے۔ میں ابھی حویلی کی نگرانی اور حفاظت کے انتظام میں مصروف ہوں۔ کل سویرے آپ کو خط دوں گا اور ہماری مفصل بات چیت ہوگی۔ اس رات ہم نے اپنا پہرہ انتہائی سخت کردیا کیونکہ ہمیں خدشہ تھا کہ سردار کے حامی رات کو ہم پر حملہ نہ کردیں۔ یہ رات ہم نے مہمان خانے میں تقریباً جاگتے اور انتہائی چوکسی کی حالت میں گزاری لیکن ہم پر کوئی حملہ نہ ہوا۔

میرے ساتھی سردار کے حامیوں کے حملے خطرے کے باعث ساری رات پہرہ دیتے اور حویلی کا گشت کرتے، سورج نکلنے تک تھک کر نڈھال ہوچکے تھے۔ میں نے حویلی کے بڑے داخلی دروازے پر قیصر کے دو ساتھیوں کو ایک سب مشین گن اور بنگلہ دیشی فوجیوں سے چھینی ہوئی رائفل دے کر اس حکم کے ساتھ بٹھا دیا تھا کہ خود کو زہریلے تیروں سے محفوظ رکھ کر دروازے کے دونوں طرف بنے خولوں سے باہر سے کسی کو دروازے کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیں۔ نزدیک آنے والوں کو پہلے تو ہوائی فائر کرکے روکیں اور اگر پھر بھی کوئی آگے آنے کی کوشش کرے تو فائر کرکے اسے ہلاک کردیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر ایسے معرکے کی نوبت آئی تو ہم زیادہ سے زیادہ حملہ آوروں کو ہلاک کریں گے۔ مجھ پر اپنے تمام ساتھیوں کی سلامتی اور صحیح پلاننگ کی ذمہ داری تھی۔ حویلی میں قلعہ بند ہوکر ہم نسبتاً محفوظ حالت میں تھے لیکن ہمیں نہ صرف حویلی بلکہ رانگاماٹی سے بھی بالآخر جانا تھا اور میں چاہتا تھا کہ سردار کے حامی مشتعل ہوکر اگر ہم پر حملہ کریں تو ہم زیادہ سے زیادہ تعداد میں انھیں یہیں ہلاک کردیں تاکہ واپسی کے دوران کھلی جگہوں پر مقابلہ ہونے کی صورت میں ہمارا کم سے کم دشمنوں سے پالا پڑے۔ چکمہ نسبتاً ایک پرامن قبیلہ تھا۔ اگر آپ دنیا بھر کے ممالک کی آبادی پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر ملک کی

ساری آبادی کا بمشکل دو فیصد حصہ اس ملک کے دفاعی اداروں میں کام آتا ہے اور وہ بھی تنخواہ کے عوض۔ چکمہ قبیلے کے لڑاکوں کو تو تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی۔ مجھے آمنے سامنے مزاحمت کا خدشہ کم تھا لیکن زہریلے اور بے آواز تیروں کا زیادہ۔ اگر تیس چالیس تیر انداز بھی اپنے جسموں کو مختلف رنگوں سے کیمو فلاج کر کے ہم پر تیر برساتے تو ہم سب کو ہلاک کر سکتے تھے۔ حویلی کے تمام پہریداروں اور بیشتر خادموں کو گزشتہ رات ہی میں نے حویلی سے باہر نکلوا دیا تھا۔ رات کا کھانا بھی ہم نے نہیں کھایا تھا اور اب بھوک اور تھکن سے ہم سب کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ زنان خانے سے بڑی طشتریوں میں گرما گرم پراٹھے، انڈوں کے آملیٹ اور چائے دانیوں سے بھاپ اڑاتی چائے کی کیتلیاں لیے رانی کی خادمائیں برآمد ہوئیں۔ ان کے ساتھ سردار کا چھوٹا بیٹا بھی تھا۔ وہ سیدھے میرے پاس آئے اور بتایا کہ رانی صاحبہ نے میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے ناشتہ بھجوایا ہے۔ میں نے ان خادماؤں کو حویلی کی مختلف جگہوں پر پہرہ دینے والے اپنے ساتھیوں کے پاس بھجوایا۔ راجہ کے بیٹے نے کہا کہ رانی صاحبہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اور اپنی حالت ٹھیک ٹھاک کر کے میں راجہ کے بیٹے کے ساتھ رانی سے ملنے زنان خانے میں گیا۔ مجھے اندر جانے سے پہلے ہی اپنے ساتھیوں سے اطلاع مل چکی تھی کہ حویلی کے باہر قبیلے کے لوگوں کا جمگھٹا لگ گیا ہے جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور پہرے پر موجود میرے ساتھیوں نے انھیں حویلی سے دور رکھنے کے لیے دو ہوائی فائر بھی کیے ہیں۔ میں نے رانی کو راجہ تری دیو کا خط دیتے ہوئے اسے مختصراً رانگاماٹی تک پہنچنے کے واقعات اور تفصیل سے رانگاماٹی میں پیش آنے والے حالات بتائے اور یہ بھی کہا کہ اگرچہ میرے ساتھی سفر کی صعوبتیں سہتے سہتے نڈھال ہو چکے ہیں لیکن ہم آخری سانس اور آخری گولی تک ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھاتے ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ اس وقت حویلی کے باہر قبیلے کے لوگ خاصی بڑی تعداد میں جمع ہو چکے ہیں۔ ان کے کیا ارادے ہیں یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن میرے ساتھی انھیں اپ Fire Weapon (ہتھیاروں) سے حویلی سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رانی میری بات سن کر دھیمے سے مسکرائی اور بولی، ''مجھے اور میرے چھوٹے بیٹے کو اپنے ساتھیوں کی حفاظت میں حویلی کے دروازے پر لے چلو، پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔'' میں نے قیصر اور نمبر ٹو کو اپنا ایک ایک ساتھی بلانے کا کہا اور ہم پانچوں کے ساتھ رانی اور چھوٹا بیٹا حویلی کے دروازے پر گئے۔ رانی کے چہرے سے ذرا سی بھی پریشانی ظاہر نہیں ہو رہی تھی اور بڑے اعتماد کے ساتھ اس نے حویلی کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ دروازہ کھلا۔ ہمارے دو ساتھی پہلے ہی دیوار میں بنے سوراخوں سے باہر والوں کو اپنے اسلحے کی زد پر لیے چوکس کھڑے تھے اور ہم پانچوں نے رانی اور لڑکے کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی رانی اور اس کا لڑکا ہمارے گھیرے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ قبیلے والوں کے جم غفیر نے جونہی رانی اور لڑکے کو دیکھا، فوراً ہی خاموش ہو گئے۔ رانی نے اشارے سے سب کو اپنے قریب بلایا اور اپنی قبائلی زبان میں ان

سے خطاب کرنے لگی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی یہ تو ہماری سمجھ میں نہ آیا لیکن مجمع پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔ رانی نے کئی بار آسمان، اپنے بیٹے اور میری طرف اشارہ کیا۔ اس کی پندرہ بیس منٹ کی تقریر کے دوران مجمعے سے ایسی آوازیں آئیں جن سے حیرانی، خوشی اور ہمارے لیے داد و تحسین کا اظہار ہوتا تھا۔ رانی نے دوران تقریر ہی مجھے انگریزی میں کہا کہ اب اپنے اسلحے کا رخ نیچے کر لیں۔ قبیلے کے سبھی لوگوں کو میں نے اپنی اور اپنے بیٹے کی برسوں کی اسیری اور تمھارے ذریعے اپنی رہائی کے متعلق بتایا ہے اور یہ سب تمھاری ہمت، دلیری اور راجہ صاحب سے دوستی کی بنا پر کیے پیمان کو پورا کرنے پر تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو داد دے رہے ہیں۔ ہم نے اپنے اسلحے کا رخ نیچے کر لیا۔ ''زندہ باد'' چونکہ پاکستان میں قومی نعرے کی جگہ لے چکا تھا اس لیے قبیلے والے بھی یہ نعرہ جانتے تھے اس لیے کئی بار انھوں نے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے۔ قیدی سردار کو تو حکمران بنے چند سال ہی بیتے تھے جبکہ رانی برسہا برس سے ان کی رانی تھی اس لیے قبیلے کے لوگوں کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس نے مجمعے میں کھڑے دو آدمیوں کو اپنے قریب بلایا اور انھیں کچھ کہا۔ وہ سر جھکائے رانی کی بات سنتے رہے اور پھر واپس پلٹے۔ رانی مجھے ساتھ ہی ساتھ سب باتیں بتا رہی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ دو آدمی راجہ تری دیو کے معتمد مشیر تھے جنھیں اس کے لڑکے نے معزول کر دیا تھا۔ میں نے انھیں کہا ہے کہ راجہ صاحب کے دور کے ہمارے خدام خادماؤں اور پہریداروں کو بلائیں تاکہ وہ اپنے پہلے والے فرائض انجام دے سکیں۔ رانی نے اپنی تقریر ختم کر کے اپنے دونوں ہاتھ مجمعے کی طرف اٹھائے۔ تقریباً ایک ہزار کے لگ بھگ قبیلے کے مرد اور عورتیں جو وہاں موجود تھے، سب رانی کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ یہ ان کی رانی کے ساتھ اطاعت اور وفاداری کا اظہار تھا۔ رانی نے مجھے کہا کہ اپنے آدمیوں کو کہہ دوں کہ یہ دونوں مشیر جن مردوں اور عورتوں کو اپنے ساتھ لائیں انھیں بلا روک ٹوک اندر آنے دیں تاکہ وہ حویلی کے انتظام اور پہرے کی ڈیوٹیاں سنبھال سکیں۔ میں نے یہی ہدایات قیصر کو دیں تاکہ وہ پہرے پر موجود اپنے ساتھیوں کو بتا دے۔ ہمارے اندر آنے کے بعد حویلی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ رانی نے زنان خانے میں جاتے ہوئے مجھے کہا کہ بہت جلد ہی ہمارے پہریدار اور خادم آ جائیں گے۔ ان کے آنے کے بعد آپ سب بھرپور آرام کریں۔ آپ سے آج رات پھر ملاقات ہو گی جس میں ہم تفصیلاً گفتگو کریں گے۔ میں اور میرا بیٹا آپ کے ساتھ پاکستان جانے کو تیار ہیں لیکن یہاں کے نئے انتظامات کرنے میں پندرہ بیس روز لگ جائیں گے۔ اس نے مجھ سے عاجزانہ طور پر کہا کہ میرا بڑا بیٹا اگرچہ اپنے برے کرتوتوں کے باعث قابل گردن زدنی ہے لیکن میں ماں ہوں اس لیے تم سے درخواست کرتی ہوں کہ اسے کوئی گزند نہ پہنچے اور اس کے زخمی ہاتھ کا علاج کیا جائے لیکن اسے ہرگز ہرگز نہ تو قید سے رہا کیا جائے اور نہ ہی کسی کو اس سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ اس کے لیے کھانا وغیرہ میرے خاص اور قابل اعتبار خادم لے کر جائیں گے۔ راجے کا چھوٹا لڑکا جو اردو، بنگالی اور انگریزی کے علاوہ فرنچ بھی جانتا تھا، میری اپنے والد سے دوستی کے باعث مجھے انکل

کہنے لگا۔ رانی اور لڑکے کے زنان خانے میں جانے کے بعد میں نے اپنا فرسٹ ایڈ بکس لیا اور قیصر اور نمبر ٹو کے ساتھ تہہ خانے میں قید سردار کے پاس گیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ میری گولی اس کے ہاتھ کا کچھ گوشت چاٹتے ہوئے گزر گئی تھی لیکن کسی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ہاتھ سے بہتا خون بھی اب رک چکا تھا۔ میں نے اس کے زخم کو پانی میں سپرٹ ڈال کر دھویا اور پٹی باندھ کر ایک اینٹی بائیوٹک انجکشن لگایا اور اسپرو کی گولیاں کھانے کو دیں۔ ہم ابھی تہہ خانے میں ہی تھے کہ اس کے لیے بھی کھانا آ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ ماں کی محبت کی واقعی کوئی حد نہیں ہوتی۔ بیٹے کے ہاتھوں برسوں قید رہنے والی ماں نے مجھ سے اپنی پہلی خواہش یہی بیان کی کہ اس کے ظالم بیٹے کو کوئی گزند نہ پہنچے اور اس کے زخم کا علاج کیا جائے اور اب میں نے اس کے لیے اس کا پسندیدہ کھانا بھیجا ہے۔ ماں کی محبت کو اسی لیے افضل ترین کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی اولاد کی تخلیق کرتی یعنی اس کی خالق ہوتی ہے لیکن شیطانی ہوس کی شکار ایسی بھی لاکھوں مائیں ہیں جو اپنے شیر خوار بچوں کو ہلاک کر دیتی ہیں یا انھیں چھوڑ کر اپنے آشناؤں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔ انسان کو جسے اللہ نے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے، شیطان بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے ورنہ ماں کی محبت انسانوں میں ہی نہیں بلکہ درندوں، چرندوں میں دیکھ کر ہی عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

اگلے دو تین گھنٹوں میں ہی رانی کے وفادار پہریداروں اور خادم خادماؤں نے حویلی کا انتظام سنبھال لیا اور میرے تھکے ماندے ساتھی اپنے کمروں میں جا کر ایسے سوئے کہ رات کے کھانے پر بھی بڑی مشکل سے جاگے۔ آج بنگلہ دیشی فوجی نے بھی سردار سے ملنے آنا تھا۔ میں سہ پہر کو سردار کے پاس تہہ خانے میں گیا تا کہ اس کے ہاتھ کے زخم کو دیکھ سکوں۔ سردار مجھے اکیلا دیکھ کر بولا، ''تم نے اچھا نہیں کیا۔ اب بھی چاہو تو میں تمھیں زر و جواہر سے مالا مال کر سکتا ہوں۔ مجھے رہا کر دو اور میری والدہ اور بھائی کو میرے حوالے کر دو۔'' جواہر کا لالچ دے کر سردار نے جواب طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس کے زخم کی مرہم پٹی کرتے ہوئے نہ تو پہلے میں نے اس سے کوئی بات کی تھی اور نہ اب۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی اور میں نے بھی بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔ اب اس نے بجائے اپنی پشیمانی اور ندامت کا اظہار کرنے کے مجھے جواہر کا لالچ دے کر خریدنا چاہا تو میرے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ سردار کے دونوں ہاتھ اب کھول دیے گئے تھے۔ میں نے اسے پھر ٹھڈوں اور مکوں پر رکھ لیا اور دل کا پورا غبار نکالا۔ مجھے سب سے زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ ان پیسے والوں اور سرداروں کے نزدیک وہ جب چاہیں ایک انسان کے ضمیر کو خرید سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے بہت سارے سیاست دان، وڈیرے، جاگیردار اور نوکر شاہی والے وطن فروش اور ضمیر فروش ہیں اور انھوں نے بہت سوں کو خرید بھی رکھا ہے۔ لیکن سبھی کو ایک جیسا سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے جس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے جیسے آج کل پاکستان کے دو سابق وزیر اعظم بھگت رہے ہیں۔

سردار کی ''مرمت'' کے بعد میں اپنے کمرے میں آیا اور قیصر کو کہا کہ اپنے ساتھی کو بھیج کر رضی اور اس کی بیوی کو بلا لائے۔ میں اور میرے ساتھی غیر متوقع طور پر ایسے حالات میں گھر چکے تھے جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ مورنگ اور مگھ قبائل سے تصادم اور رانی اور اس کے لڑکے کے ہمارے ہمراہ جانے کے باعث اس دشوار گزار راستے سے واپس جانا ناممکن تھا۔ رانگا ماٹی کی محلاتی سازشوں کا ہمیں یہاں پہنچنے تک قطعی علم نہ تھا۔ مجھے یہاں آ کر یقین ہو چکا تھا کہ چکمہ قبیلے میں موجودہ سردار کے حامیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود تھی جو ہماری پر امن واپسی کی راہ میں حائل ہو سکتی تھی۔ اگر ہم بنگلہ دیش کے شہروں میں سے گزرنے کا خطرہ مول لینے کو بھی تیار ہو جاتے تو سڑک کے راستے کو تو بنگلہ دیشی فوج نے بند کر رکھا تھا اور کرنافلی دریا سے اسٹیمر کے ذریعے چٹاگانگ جانے کے واحد راستے پر کرنافلی پیپر ملز کی فوجی چوکی پر ہمارے حملے کے باعث وہ راستہ بھی اب خارج از بحث تھا۔ چکمہ قبیلہ اور سردار کم از کم رانگاماٹی میں تو محفوظ تھے لیکن ہم یہاں پر بھی سردار کے حامیوں کے ہاتھوں کسی وقت بھی نقصان اٹھا سکتے تھے۔ میں نے اسی لیے رضی کو بلوایا تھا کہ شاید اس کے علم میں یہاں سے نکلنے کا کوئی محفوظ اور متبادل راستہ ہو۔ سردار کے دوست فوجی JCO کے متعلق تو میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ نہ تو اس سے ملا جائے اور نہ ہی سردار سے اسے ملنے دیا جائے۔

رات کو رانی صاحبہ سے ملاقات ہونے پر میں نے اسی موضوع پر تفصیلی بات کرنی تھی۔ میں نے راجہ کے چھوٹے بیٹے کو بلایا اور اسے کہا کہ حویلی کے نئے پہریداروں کو کہہ دے کہ فوجی JCO کے آنے پر اسے کہیں کہ سردار کی طبیعت ناساز ہے اس لیے وہ نہیں مل سکتا۔ علاوہ ازیں اس فوجی کو واپس بھیجتے وقت دو آدمی رانگاماٹی سے باہر تک اسے چھوڑنے جائیں اور کوشش کریں کہ اسے قبیلے کے کسی آدمی سے ملنے اور اصل صورت حال جاننے کا موقع نہ ملے۔ رضی اور اس کی بیوی جلد ہی میرے پاس آ گئے۔ میرے استفسار پر اس نے کہا کہ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے اور سڑک اور دریائی راستے کے سوا اور کوئی مروجہ راستہ نہیں ہے جس سے چٹاگانگ تک پہنچا جا سکے۔ میرے نہ کہنے کے باوجود رضی اور اس کی بیوی میری دشواری کو سمجھ چکے تھے۔ اس کی بیوی بولی، ''صرف ایک اور ذریعہ ہے۔ کرنافلی پیپر ملز سے آگے چٹاگانگ تک دریا کے کنارے آباد دیہاتوں کے لیے دریائی بازار لگتے ہیں۔ پندرہ بیس کشتیوں کا بیڑا جس میں دیہاتوں میں رہنے والے لوگوں کی ضروریات کا سب سامان ہوتا ہے، ہفتے کے مختلف دنوں میں مختلف دیہاتوں کے لیے ایک ایک دن کے لیے لنگر انداز ہوتا ہے۔ اگر اس بیڑے کی دو کشتیاں مل جائیں تو با آسانی چٹاگانگ پہنچا جا سکتا ہے۔'' رضی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ بیوی کی بات سن کر وہ بولا، ''واقعی یہ بڑا محفوظ اور قابل عمل ذریعہ ہے۔ ان کشتیوں والوں کو پیسے دے کر ہم ان سے مطلوبہ تعداد میں کشتیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک دن پیدل سفر کرنے پر ایک ایسا دیہات ہے جس کا سربراہ میرا خاصا واقف ہے۔ اس کے ذریعے میں کشتیوں کے انتظام کی ذمہ داری لیتا ہوں۔

چٹاگانگ سے ایک بڑی کشتی کا انتظام بھی میں کرلوں گا جو ہمیں کاکس بازار تک لے جائے گی۔ کاکس بازار سے ہم خشکی یا سمندر کے راستے بآسانی برما میں داخل ہوسکتے ہیں۔'' میں نے رضی سے پوچھا کہ ''ہم'' کہنے سے کیا میں یہ سمجھوں کہ وہ بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ ''جی ہاں۔ میرا یہی مطلب ہے۔ مدتوں بعد مجھے اور میری بیوی کو روشنی کی کرن دکھائی دی ہے اور ہم دونوں کی خواہش ہے کہ آپ کے ساتھ ہی اس سرزمین سے نکلیں اور پاکستان پہنچیں۔ ویسے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم دونوں آپ کے لیے بوجھ نہیں بنیں گے بلکہ فائدہ مند ہی ثابت ہوں گے۔'' میں نے رضی کو کہا کہ مجھے انھیں اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی عار نہیں لیکن پہلے وہ ایسی تین کشتیوں کا انتظام کرے جن میں بیچنے کا سامان بھی لدا ہو تاکہ ہم اس سامان کی آڑ میں بحری پولیس وغیرہ کی نظروں میں آئے بغیر چٹاگانگ پہنچ سکیں۔ روانگی کی حتمی تاریخ میں ابھی نہیں بتاسکتا۔ ہمیں بہرحال پندرہ روز کے اندر یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ رضی کے ذمے یہ کام لگا کر میں نے انھیں رخصت کیا اور کہا کہ وہ جلد از جلد مجھے کشتیوں کے انتظام کی خبر دے۔ علاوہ ازیں اگر رانگاماٹی میں کوئی بھی غیر معمولی بات ہو تو مجھے فوراً اطلاع دے۔ میں حویلی کے پہریداروں کو بھی ہدایت کردوں گا کہ تمھیں بلا روک ٹوک مجھ تک آنے دیں۔

رات کو رانی صاحبہ نے مجھے زنان خانے کے ڈرائنگ روم میں بلوایا۔ میں نے انھیں بتایا کہ آج جب میں اس کے سردار بیٹے کی مرہم پٹی کے لیے گیا تو اس نے مجھے زر و جواہر کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں مجھے اس کی تھوڑی سی پٹائی کرنی پڑی۔ ''یہ بھی اس کی کمینگی اور جھوٹ ہے۔ اس کے پاس سونے کے صرف چند نمائشی زیورات ہیں جنھیں اس کی بیوی اور وہ قبیلے کے تہواروں میں پہنتے ہیں۔ راجہ صاحب نے اپنے خط میں جن جواہرات کا ذکر کیا ہے وہ میرے پاس ہیں اور نہایت محفوظ جگہ پر مدفون ہیں اور یہاں سے روانگی سے پہلے تمھارے ساتھیوں کے ذریعے ہی انھیں نکلوا کر میں تمھارے حوالے کروں گی۔ انہی جواہرات کو حاصل کرنے کے لیے میرے بیٹے نے مجھے برسوں قیدی بنا کر رکھا تھا۔ میں نے رانی کو رضی کے ساتھ بنائے ہوئے واپسی کے پروگرام کے متعلق جب بتایا تو اس نے کہا، ''چٹاگانگ تک تو ٹھیک ہے لیکن میں کاکس بازار کے بجائے کھلنا جانا چاہتی ہوں۔ وہاں راجہ صاحب کے ایک مخلص دوست ہیں جن کا خاصا اثر و رسوخ بھی ہے۔ وہ ہمارے بنگلہ دیش سے نکلنے میں بہت مدد و معاون ثابت ہوں گے۔ اس لیے ایسا انتظام کرو کہ چٹاگانگ سے ہم کھلنا جاسکیں۔ چٹاگانگ سے لی ہوئی کشتی ہمیں کھلنا بھی لے جاسکتی ہے ورنہ وہ ہمیں ہرن گھاٹا تک ہی پہنچا دے۔ وہاں سے ہم دوسری کشتی یا موٹر لانچ لے کر کھلنا چلے جائیں گے۔'' رانی کے پہلے کھلنا جانے پر اصرار کرنے پر میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا، ''تمھارے یہاں آنے کے راستے کی دشواریوں کا سن کر میں سمجھتی ہوں کہ ایسا سفر کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ کھلنا سے ہمیں ایسا سٹیمر بھی مل سکتا ہے جس کے ذریعے ہم سیدھے بنکاک جاسکتے ہیں اور راجہ صاحب کے دوست رفیق الاسلام اس کا

انتظام کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں جانے کی میری ایک ذاتی وجہ بھی ہے۔ جس کے متعلق میں تمھیں وہاں جاکر بتاؤں گی۔'' مجھے تذبذب کا شکار دیکھ کر رانی نے کہا، ''میں اگر چاہوں تو اپنے چھوٹے بیٹے کو سردار بنا کر یہاں رہ سکتی ہوں۔ راجہ صاحب کی طبیعت سے بخوبی واقف ہونے کے باعث مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے اور اپنے بیٹے سے زیادہ اپنے موروثی جواہرات کے خزانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے باوجود میں اس لیے جانا چاہتی ہوں کہ میرا چھوٹا بیٹا اور میں اپنے معزول سردار بیٹے کی درندگی سے محفوظ رہ سکیں۔ یہاں کے حالات اور قبیلے کے لوگوں کی وفاداریاں راتوں رات تبدیل ہوجاتی ہیں۔ اگر میرا معزول بیٹا یہاں ہماری موجودگی میں آزاد ہوگیا تو وہ مجھے اور اپنے چھوٹے بھائی کو ہلاک کرنے میں چنداں دیر نہیں کرے گا۔ میں صاف گو عورت ہوں اور دل میں چھپا کر کوئی بات نہیں رکھتی۔ اگر تم کھلنا نہیں جانا چاہتے تو میں راجہ صاحب کے موروثی جواہرات ان کے حکم کے مطابق تمھارے حوالے کردیتی ہوں لیکن میں اور میرا بیٹا تمھارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ میں تم سے بھی ایسی ہی صاف گوئی کی امید رکھتے ہوئے چاہتی ہوں کہ جو وعدہ کرو اسے ضرور پورا کرنا۔'' ادھر میں سوچ رہا تھا کہ رانی کی بات ماننے کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ برما کے راستے واپسی کے سفر کا سوچ کر ہی مجھے جھرجھری آجاتی تھی۔ اگر میں رانی اور اس کے بیٹے کے بغیر واپس جاتا تو کسی نہ کسی وقت وہ دونوں یقیناً اپنے بڑے بیٹے کی سازش کا شکار ہوکر مارے جاتے۔ راجہ تری دیو اپنی بیوی اور بیٹے کے بغیر میرے واپس لوٹنے پر طوفان کھڑا کرسکتا تھا۔ مجھے قیصر اور اس کے ساتھیوں کی بھی فکر تھی۔ جن میں سے دو تو پہلے ہی لالچ کے باعث مارے جاچکے تھے۔ برما سے ان کی اکیلے بھارت واپسی میں جو مشکلات حائل تھیں ان میں ان کی جانیں بھی جاسکتی تھیں۔ کھلنا سے جیسور قریب ہی تھا اور وہیں سے اکثر مشرقی پاکستانی مہاجر بھارت میں داخل ہوکر نیپال گئے تھے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ رانی کی خواہش کے مطابق چٹاگانگ سے کھلنا چلا جائے۔ اگر رانی کی مدد سے سٹیمر مل جائے تو کیا کہنے ورنہ ہم سب جیسور کے بارڈر سے بھارت میں داخل ہوں گے۔ تھائی ساتھیوں کو میں کھلنا سے ہی واپس بھیج دوں گا اور قیصر اور اس کے ساتھی مجھے، رانی اور اس کے بیٹے کے ساتھ بھارت اور نیپال کے بارڈر رکسول تک چھوڑنے جائیں گے۔ نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں پاکستانی سفارت خانہ ہونے کے باعث ہمیں پاکستان پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی خصوصاً جب پاکستانی وفاقی وزیر کی اہلیہ اور بیٹا میرے ہمراہ ہوں گے۔ چنانچہ میں نے رانی سے کھلنا چلنے کی ہامی بھرلی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر وہ رفیق الاسلام کی مدد حاصل کرنے میں ناکام رہیں تو پھر انھیں ہمارے ساتھ بھارت کراس کرکے نیپال جانا ہوگا جہاں سے ہم پاکستان جائیں گے۔ رانی نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ ہماری گفتگو کے دوران چھوٹا بیٹا بھی آگیا تھا۔ ہم تینوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ واپس آکر میں نے قیصر کو اپنے کمرے میں بلوایا اور اسے رانی سے کی ہوئی گفتگو اور اپنے فیصلے کا بتایا۔ قیصر میرا فیصلہ سن کر بہت خوش ہوا اور بولا، ''بھائی

جان! آپ نے رانی کی بات مان کر بہت اچھا کیا۔ اب میری بھی ایک بات آپ کو ماننی پڑے گی۔ کھلنا سے سندر بن بہت ہی قریب ہے۔ اس جنگل کے سحر اور شکار کے متعلق میں نے بہت کہانیاں سن رکھی ہیں اور اس جنگل میں شکار کرنے کا میرا شوق جنون کی حد تک بڑھ چکا ہے۔ رضی سندر بن سے اچھی طرح واقف ہے اور وہ ہمیں شکار کے صحیح مقامات تک لے جاسکتا ہے۔ آپ کھلنا میں ایک ہفتہ قیام کریں اور اس دوران ہم شکار سے لطف اندوز ہوکر تھکاوٹ دُور کریں گے۔'' میں بھی آغاز جوانی سے شکار کے لیے اپنے شکاری دوستوں کے ہمراہ بارہا جاچکا تھا اور اب موقع مل رہا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی شکار گاہ میں شکار کرسکوں۔ میں نے قیصر کی بات مان لی لیکن اسے کہا کہ جب تک میں اجازت نہ دوں، کسی سے بھی کھلنا جانے کا ذکر نہ کرے۔ میرے تھائی ساتھی بھی اب اکتائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور واپس جانے کو بے چین تھے۔ مقید سردار کی طرف سے بھی خطرہ تھا کہ وہ حراست سے بھاگ کر ہمارے لیے مزید مصائب کھڑے نہ کردے۔ میری حالت یہ تھی کہ زندگی اور موت سے آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے میں اکتا چکا تھا۔ بنگلہ دیش، بھارت اور نیپال میرے لیے یکساں خطرناک تھے کیونکہ میں ان تینوں ملکوں میں wanted تھا اس لیے میری سوچ یہ تھی کہ جو کچھ بھی ہونا ہے، ایک بار ہوجائے اور میں اس شب و روز کی اذیت سے بچ جاؤں۔ اس لیے میں نے رانی کی بات مان لی تھی۔

آئندہ چند روز حویلی کے حفاظتی انتظامات کو مزید مستحکم کرنے اور آئندہ سفر کی پلاننگ کو فول پروف بنانے میں گزر گئے۔ رضی دو روز بعد کشتیوں کے انتظام کے لیے چلا گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی ہر روز سہ پہر کے وقت میرے پاس آتی اور مجھے رانگاماٹی میں سردار کی حراست اور معزولی کے بعد رانی کی رہائی اور قبیلے کے لوگوں سے خطاب کے بعد ان کے ملے جلے رجحانات کے متعلق بتاتی۔ رانی کے مشیر بھی دن کا بیشتر وقت حویلی میں گزارتے اور ہر روز رانی سے ملاقات کرتے۔ اندرونی خبریں مجھے کلپنا کے ذریعے مل رہی تھیں۔ اسی نے مجھے بتایا کہ میری اور رانی کی سختی سے ممانعت کے باوجود باہر سے دو آدمی معزول سردار کے بال کاٹنے اور حجامت بنانے کے لیے آئے تھے اور رانی نے انھیں سردار کے پاس جانے کی اجازت دے دی تھی۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی۔ لیکن کلپنا نے جب یہ بتایا کہ دونوں ''حجام'' بغیر بال کاٹے اور حجامت بنائے ہی واپس چلے گئے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں تھوڑی دیر کے بعد معزول سردار کے پاس تہہ خانے میں گیا۔ میرے ساتھ قیصر کے دو ساتھی لڑکے بھی تھے۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر کمرے کی مکمل تلاشی لی لیکن کوئی قابل اعتراض چیز ہمیں نہ ملی۔ میں نے سردار سے پوچھا کہ اس نے حجاموں کو بغیر بال کٹوائے واپس کیوں بھیج دیا تو وہ بولا، ''میری مرضی۔ بال کٹوانے کو جی نہیں چاہا اور میں تمھارے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔'' سردار کے انداز گفتگو میں ابھی بھی وہی رعونت تھی۔ میں نے لڑکوں کو کہا کہ سردار کی جسمانی تلاشی بھی لو۔ اس کے لباس سے بھی کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔ حجاموں کو طلب کرنا اور ان سے بغیر کوئی کام لیے واپس بھیج دینے کا سردار نے

بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے لڑکوں کو دوبارہ تلاشی لینے کا کہا اور خود سردار کے سامنے بیٹھ کر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ سردار مجھ سے آنکھیں ملانے سے کترا رہا تھا اور میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اس کی نگاہیں کئی بار کمرے کے عقب میں بنی واحد کھڑکی جس کی دیوار ایک عمودی چٹان پر تھی اور کمرے میں پڑے صوفے پر کئی بار رکیں۔ میں نے لڑکوں کو کہا کہ میز کو گھسیٹ کر کھڑکی کے پاس لے جائیں اور اس پر چڑھ کر کھڑکی کی بیرونی حصے کا جائزہ لیں۔ کھڑکی کے بیرونی حصے پر بارش کے پانی کو روکنے کے لیے ایک چھجہ بنا ہوا تھا۔ لڑکوں نے اس چھجے کے اوپر ہاتھوں سے ٹٹولا تو ایک مضبوط اور تقریباً سو فٹ لمبی رسی ملی۔ اس کا مطلب تھا کہ قید ہونے کے بعد سردار کو کھڑکی کے راستے فرار ہونے کے لیے یہ رسی مہیا کی گئی تھی۔ رسی کو دیکھ کر سردار کا رنگ فق ہوگیا۔ اب ہم نے کمرے کی دوبارہ تلاشی لینی شروع کی۔ سردار کے بستر کے گدے کو بھی جگہ جگہ سے ٹٹول کر دیکھا گیا، وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ میں نے لڑکوں کو کہا کہ اب صوفے کو چاروں طرف سے اچھی طرح سے دیکھیں۔ جب صوفے کو الٹا گیا تو اس کے نیچے لگے استر کو کاٹ ایک سوراخ بنا ہوا تھا۔ سوراخ میں ہاتھ ڈال کر لڑکے دیکھنے لگے تو سردار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور اس کا ماتھا پسینے سے بھیگ گیا۔ میں نے اپنا پسٹل نکال کر سردار کی طرف کیا اور لڑکوں کو کہا کہ استر کو پھاڑ کر صوفے کے اندرونی حصے کی اچھی طرح سے تلاشی لیں۔ جب استر کو پھاڑا گیا تو ایک ریوالور اور گولیوں کا ایک ڈبہ، ایک پین اور لکھائی کے لیے کاغذ اور ایک فوجی واکی ٹاکی صوفے کے سپرنگوں میں پھنسے ہوئے برآمد ہوئے۔ گویا فرار کا منصوبہ مکمل تیار تھا جس پر صرف عمل ہونا باقی تھا۔ بتیس بور کا ریوالور صرف فوجی ہی استعمال کرتے ہیں اور واکی ٹاکی کا سیٹ بھی فوجی تھا کیونکہ اس پر بنگالی میں یونٹ نمبر اور سیریل نمبر لکھے ہوئے تھے۔ میں نے سیٹ کو آن کیا تو معلوم ہوا کہ بیٹری پوری طرح چارج ہے۔ میں نے سوائے ریوالور کے دوسرا سارا سامان سردار کے سامنے رکھتے ہوئے کہا، ''تمھارا فرار کا منصوبہ تو پکڑا گیا۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ مجھے خود ہی تمام تفصیلات بتادو اور یہ سامان فراہم کرنے والوں کے نام اور ٹھکانے بھی لکھ کر دے دو۔ اگر تم نے میری اس پیشکش کو قبول نہ کیا تو میں تمھاری زبان کھلوانے کے لیے وہ طریقے استعمال کروں گا جن سے تمھاری صرف چند ہڈیاں ہی ٹوٹیں گی، ہاتھوں اور پاؤں کی تمام انگلیاں کٹ جائیں گی اور تمھارا چہرہ مسخ ہوجائے گا۔ تم معذور ہوجاؤ گے اور کبھی بھی سردار بننے کے قابل نہیں رہوگے۔ تم نے میری قید میں ہونے کے باوجود جو حرکت کی ہے اس کے جواب میں تمھاری زبان کھلوانے کے لیے میں تمھارے ساتھ بدترین سلوک کرنے میں بھی حق بجانب ہوں گا۔ میں نے یہ دھمکی محض اس لیے دی تھی کہ سردار میری باتوں سے ہی Breaking Point پر آجائے ورنہ اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کا میرا ہرگز ارادہ نہ تھا۔ بھارت میں میری حراست کے دوران DMI والوں نے بھی مجھے ایسی ہی دھمکیاں دے کر میری زبان کھلوانے کی کوشش کی تھی اور اس میں ناکامی کے بعد انھوں نے مجھ

پر بدترین تشدد کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے ایک لفظ تک نہ اگلوا سکے کیونکہ میرے محکمے نے میری ٹریننگ کے دوران مجھے تشدد برداشت کرنے کی تربیت بھی دی تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں اپنے ملک اور وطن سے اپنی جان کے عوض غداری کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور میرا یقین تھا، ہے اور انشاء اللہ آخری سانس تک رہے گا کہ اپنے مذہب اور قبیلے کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنے والے مسلمان شہید ہوتے ہیں اور یہ بلند ترین درجہ حاصل کرنا ہر سچے مسلمان کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ سردار نہ تو مسلمان تھا اور نہ ہی وہ اپنے مذہب و ملت کے لیے ہم سے صف آرا تھا۔ ذاتی اقتدار کی خواہش تشدد کی پہلی لہر کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے اور ہمارے سابقہ برسراقتدار سیاست دانوں کی طرح وہ بھاگ کر برطانیہ اور امریکہ میں سیاسی پناہ طلب کرتے یا اس کی درخواست کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمارے جانباز اور دلیر فوجی ہزاروں لاکھوں گولیوں اور آگ برساتے گولوں کے درمیان یوں بے دھڑک چلے جاتے ہیں جیسے ان پر پھول برس رہے ہوں۔ اس کی وجہ ان کا واضح نصب العین اور شہادت کا درجہ پانے کی آرزو ہوتی ہے۔ میں نے لڑکوں کو کہا کہ اسی رسی کے ساتھ سردار کو باندھ کر اور چھت میں پڑے کنڈے میں رسی ڈال کر اسے الٹا لٹکا دو۔ لڑکے ابھی سردار کے ہاتھ پاؤں باندھ ہی رہے تھے کہ سردار بول اٹھا، ”میں سب کچھ بتاتا ہوں۔ کوئی بات چھپا کر نہیں رکھوں گا۔ مجھ پر یقین کرو اور مجھے جسمانی اذیت (Torture) نہ کرو۔“ ”ہم اپنا کام کرتے ہیں اور تم بولنا شروع کرو۔ اگر تم نے سچ بولا اور اپنی سچائی کے ثبوت دیے اور ہمیں اس پر یقین بھی آ گیا تو تمھیں اذیت نہیں دی جائے گی لیکن تمھاری بکواس سننے کے لیے ہم اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ ایک بات کا دھیان رکھنا کہ تمھارے پاس آنے والے دونوں ”حجام“ ہماری سختی کو برداشت نہ کرتے ہوئے سب کچھ پٹر پٹر بول دیں گے۔ یہ واکی ٹاکی اور ریوالور دونوں فوجی استعمال کے ہیں جنھیں تمھارے دوست JCO نے فراہم کیا ہے اور انھیں یہاں پہنچانے والے دونوں حجام ہی ہیں۔ سچائی تک پہنچنے کے لیے ہمیں زیادہ تردّد نہیں کرنا پڑے گا اس لیے تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ تم خود ہی ہمیں سب کچھ تفصیلاً بتا کر اذیت سے بچ جاؤ۔“ میں نے سردار کو یہ وارننگ دے کر لڑکوں کو اشارہ کیا جو اب تک سردار کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے الٹا لٹکانے کے لیے کنڈے میں رسی ڈال رہے تھے۔ سردار کو میری گفتگو سے یقین ہوچکا تھا کہ اب صرف سچ بول کر ہی وہ بچ سکتا ہے۔ وہ کہنے لگا، ”ریوالور اور واکی ٹاکی مجھے JCO نے بھیجے تھے۔ میرے پاس آنے والے دونوں شخص واقعی حجام ہیں لیکن یہ سب سامان وہ لے کر آئے تھے۔ میرے ایک ہمدرد اور بہی خواہ نے دوسرا واکی ٹاکی اپنے پاس رکھا ہے تاکہ مجھ سے رابطہ کرسکے۔ اس کا نام موہن رام ہے اور وہ میرا مشیر بھی ہے۔ پروگرام کے مطابق مجھے کسی رات کو کھڑکی کے راستے یہاں سے نکل کر اس کے پاس جانا تھا۔ اس نے اپنے حامیوں کو اکٹھا کر رکھا ہے۔ ان کے ساتھ مل کر ہمیں حویلی پر شب خون مارنا اور آپ لوگوں کو ہلاک کرکے حویلی پر قبضہ کرنا تھا۔ میری ماں اور بھائی کو بھی اسی شب خون کے دوران قید کرنا اور

ماں سے موروثی جواہرات کے حصول کے بعد ان دونوں اور اپنی رانی کو بھی ہلاک کرنا شامل تھا۔ میری بات کی سچائی کی تصدیق حجام اور موہن رام کرسکتے ہیں اگر آپ ان کی زبان کھلوا سکیں۔“ میں نے سردار سے جب یونہی پوچھا کہ حویلی میں اس تک کھانا لانے والوں کو بھی کیا اس نے خرید لیا ہے تو وہ بولا ”کسی خادمہ کے لیے رانی بننا خواب میں بھی ممکن نہیں۔ میں نے ایک خادمہ کو اپنی رانی بنانے کا ایسا یقین دلایا ہے کہ وہ میرے لیے بڑے سے بڑا کام کرنے کو بھی تیار ہے۔ اس نے تو مجھے یہاں تک کہا ہے کہ وہ آپ سب کے کھانے میں زہر ملا کر سب کو ختم کرنے کو بھی تیار ہے۔ میری موہن رام سے صرف چند سیکنڈوں کے لیے واکی ٹاکی پر بات ہوئی ہے۔“ خادمہ کا نام ذہن میں رکھ کر میں نے لڑکوں سے کہا کہ سردار کے ہاتھ پاؤں دہری رسی سے اتنی مضبوطی سے باندھیں کہ وہ حرکت تک نہ کرسکے اور اسے پلنگ پر ڈال دیں۔ اس کام سے فارغ ہوکر کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے سردار کو کہا، ”تمھاری باتوں کی تصدیق کرکے میں آج رات پھر یہاں آؤں گا اور پھر فیصلہ کروں گا کہ تم سے کیا سلوک کیا جائے؟ سردار کو کمرے میں بند کرکے اور تھائی پہریدار کو نگرانی میں اور سختی پیدا کرنے اور خادماؤں سمیت کسی کو بھی کمرے میں داخل نہ ہونے دینے کی ہدایت کرکے ہم تہ خانے سے باہر آئے اور لڑکوں کو واپس بھیج کر میں رانی سے ملنے زنان خانے کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔

رانی سے جلد ہی ملاقات ہوگئی۔ میں نے اسے ریوالور اور واکی ٹاکی دکھاتے ہوئے کہا کہ تمھاری ممتا کے باعث میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان گنوانے کو ہرگز تیار نہیں اس لیے میں مجبوراً حویلی کے تمام اختیارات خود سنبھال رہا ہوں۔ میں نے اس غدار خادمہ کا بتایا تو رانی نے اسے فوراً طلب کیا۔ وہ آئی تو رانی نے طنزیہ طور پر اسے نئی رانی کہہ کر مخاطب کیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا بھید کھل چکا ہے۔ وہ رانی کے قدموں میں گر گئی اور اپنی غداری کی معافی مانگنے لگی۔ رانی نے یکایک اپنے لباس کے اندر سے ایک خنجر نکالا اور خادمہ کی پیٹھ میں گھونپ دیا اور بولی، ”غداروں کے لیے یہی معافی ہے کہ انھیں زندگی کے بوجھ سے آزاد کر دیا جائے۔“ تڑپتی خادمہ کو اسی حالت میں چھوڑ کر رانی نے اپنے مشیر کو طلب کیا اور اسے سارا واقعہ بتا کر کہا کہ موہن رام اور دونوں حجاموں کو حراست میں لے کر حویلی میں لے آئے۔ مشیر کے ساتھ میں نے اپنے دو مسلح تھائی ساتھی بھی بھیج دیے۔ دو گھنٹے کے اندر ہی یہ تینوں بندھے ہاتھوں حویلی میں پہنچا دیے گئے۔ رانی کا غصہ عروج پر تھا۔ اس نے حویلی کے صحن میں ان تینوں سے کچھ سوال کیے۔ اسی اثنا میں حویلی کے تیر انداز پہریدار وہاں آ چکے تھے۔ انھوں نے رانی کے حکم پر ان تینوں پر تیر برسائے اور وہ وہیں ڈھیر ہوگئے۔ واپسی پر میں نے رانی کو کہا کہ یہاں پر ایک ایک لمحہ ہمارے لیے مزید مشکلات پیدا کر رہا ہے اس لیے ہمیں جلد از جلد یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے۔ رانی میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولی، ”میں بھی ان حالات کے پیش نظر یہاں سے جلد نکلنا چاہتی ہوں۔ کل رات تمھارے ساتھیوں کے ذریعے مدفون خزانہ نکلوا کر تمھارے حوالے کردوں گی۔ اس کے

بعد روانگی میں جتنی تاخیر ہوگی وہ تمھاری وجہ سے ہوگی۔ ہم چلنے کے لیے ہر دم تیار ہیں۔'' ادھر میں سوچ رہا تھا کہ قبیلے میں اپنے مخالفین اور سازشیوں کو تو رانی نے ٹھکانے لگا دیا لیکن اپنے سردار بیٹے کے متعلق وہ بالکل خاموش ہے اور مجھے پہلے بھی کہہ چکی ہے کہ اسے کوئی گزند نہ پہنچے۔ اسے زندہ چھوڑنے کی صورت میں ہمارے حویلی سے رخصت ہوتے ہی سردار ہمیں رانگاماٹی میں ہی روک لے گا یا کم از کم بھرپور مزاحمت کرے گا۔ اس کا کوئی حل نہ رانی کے پاس تھا اور نہ میرے پاس۔ اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ہم سردار کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے جائیں اور کھلنا سے اپنی روانگی کے وقت اسے چھوڑیں۔ اس طرح ہم بھی چکمہ مخالفین اور سردار کی ریشہ دوانیوں سے کسی حد تک محفوظ رہیں گے اور سردار کی جان بھی بچ جائے گی۔ میں نے اپنے اس خیال پر مکمل پلان بنانا شروع کیا جس میں یہ بھی شامل تھا کہ رانی کو اس بارے میں صرف روانگی کے وقت ہی بتایا جائے۔ حویلی کا چارج لے کر میں نے رانی کے مشیر کو کہا کہ بنگلہ دیشی فوجی بھی رانگاماٹی آئے تو اسے باتوں میں لگا کر مجھے فوری اطلاع دی جائے تا کہ میرے مسلح آدمی اسے حراست میں لے کر یہاں لے آئیں۔

حویلی سے جب تین مردوں اور ایک عورت کی نعشیں قصبے میں پہنچیں تو کہرام مچ گیا۔ سب یہی سمجھنے لگے کہ ان سب کو ہمارے ایما پر قتل کیا گیا ہے۔ رضی کی بیوی نے مجھے بتایا کہ قبیلے کے لوگ آپس میں چاہے ایک دوسرے کے کتنے ہی دشمن اور مخالف کیوں نہ ہوں، باہر والوں کے مقابلے میں ہم آواز ہوجاتے ہیں۔ تمام لوگ یہی باتیں کر رہے ہیں کہ سرداری کا جھگڑا اور رانی اور چھوٹے بیٹے کی اسیری اور بڑے بیٹے کا سردار بننا سب حویلی کے باسیوں اور قبیلے والوں کے اپنے مسائل ہیں۔ باہر والوں کا ان معاملات میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی یہ بات کسی حد تک درست بھی تھی۔ میرے یہاں آنے کا مقصد بھی صرف رانی، چھوٹے بیٹے اور جواہرات کے خزانے کو راولپنڈی میں راجہ تری دیو تک پہنچانا تھا۔ لیکن دوران سفر ہمیں مجبوراً اور اپنی جانیں بچانے کے لیے اتنے لوگوں کو ہلاک کرنا پڑا۔ راجہ کی غیر موجودگی میں رانگاماٹی میں جو کھیل کھیلا گیا تھا وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میرے اپنے کئی ہمراہی راستے میں اپنی جانیں گنوا بیٹھے تھے اور اب رانگاماٹی میں بھی حالات کے پیش نظر صاف دکھائی دے رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں قتل و غارت کے سمندر سے گزرنا ہوگا۔ موہن رام قبیلے کا ایک سرکردہ شخص اور معزول سردار کا مشیر تھا۔ اس کی لاش لے کر قبیلے کے لوگ حویلی کے باہر آ کر احتجاج کرنا چاہتے تھے۔ انھیں خوف تھا تو صرف ہمارے اسلحے کا ورنہ وہ کبھی کے ہمیں اپنے تیروں کا نشانہ بنا چکے ہوتے۔ رضی کی بیوی نے باہر کی سب صورت حال سنا کر مجھے کہا کہ قبیلے والے پہلے ہی اس کی رضی سے شادی کے باعث اس کے خلاف تھے اور اسے قبیلے سے خارج کر چکے تھے۔ اب حویلی میں اس کے آنے سے وہ اس کے پہلے کی نسبت بہت زیادہ خلاف ہو چکے ہیں اور اس نے یہاں تک سنا ہے کہ قبیلے کے کچھ شرپسند لوگ اس کے جھونپڑے کو آگ لگا کر جھونپڑے کے ساتھ اسے بھی بھسم کر دینا چاہتے

ہیں۔ لہٰذا اسے حویلی میں ہی ٹھہرنے کی اجازت دی جائے اور جب رضی واپس آجائے تو وہ بھی یہیں رہے اور یہ دونوں میاں بیوی ہمارے ساتھ ہی رانگاماٹی سے رخصت ہوں۔ میں نے اسے حویلی کے زنان خانے میں رہنے کے لیے بھیج دیا۔ تقریباً دوپہر کے وقت ہمیں اطلاع دی گئی کہ رانی کے مشیر کو زہریلے تیروں سے ہلاک کر دیا گیا ہے اور شرپسند اس کے بیوی بچوں کو گھر میں زندہ جلا دینے کے درپے ہیں اور اس کے گھر کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ مشیر کے چند حامی اور دوست ابھی تک تو شرپسندوں کو روکے ہوئے ہیں لیکن ان کی مزاحمت کم پڑتی جا رہی ہے جبکہ آگ لگانے والوں اور مخالفوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مجھے اب فوری فیصلہ کرنا تھا کیونکہ میرے خیال میں مشیر کے گھر کو آگ لگانے کے بعد مخالفین نے حویلی کا رخ کرنا تھا اور ان کے غیض و غضب کا Centre Point میں اور میرے ساتھی تھے۔ میں نے بجائے محصور ہو کر اپنا دفاع کرنے کے فوجی اصطلاح میں ''دشمن کی زمین پر لڑنے'' کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے مشیر کے گھر پر مخالفین سے دو دو ہاتھ کرنے کو ترجیح دی اور دو تھائی اور قیصر کے ایک ساتھی کو حویلی میں چھوڑ کر باقی سارے تھائیوں کے ساتھ چھوٹا بڑا اسلحہ لے کر مشیر کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ حویلی کے چند تیر انداز بھی ہمارے ساتھ تھے اور وہی ہمیں مشیر کے گھر لے گئے جسے کم از کم تین چار سو بلوائیوں نے گھیر رکھا تھا اور اب وہ مٹی کے تیل میں تر کیے ہوئے کپڑے اپنے تیروں پر لگا کر جلتے تیر گھر پر پھینک رہے تھے۔ رانگاماٹی میں راجہ کی حویلی سمیت سارے صاحب حیثیت لوگوں کے گھروں میں لکڑی بہت زیادہ استعمال ہوتی تھی جو جلتے تیروں کی بارش میں بہت جلد آگ پکڑ سکتی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ بلوائیوں کو آج ایسا مزہ چکھاؤں گا جسے وہ مدتوں فراموش نہ کر سکیں۔ ہمارے وہاں پہنچنے پر پیچھے کھڑے بلوائیوں نے ہمیں دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتے ہم نے ان پر سیدھا فائر کھول دیا۔ بنگلہ دیشی فوج سے چھینی ہوئی رائفلیں جن کی وافر گولیاں ہمارے پاس تھیں، ہمارے بہت کام آئیں۔ رائفلوں کے علاوہ ہم ریوالوروں سے بھی چن چن کر نشانہ لگا رہے تھے۔ مجھ میں اور میرے ساتھیوں میں اس وقت انسانی زندگی کے لیے رحم کا جذبہ ختم ہو چکا تھا۔ بلوائی بھاگ رہے تھے اور ہماری گولیاں ان بھاگتے چوہوں کو گرا رہی تھیں۔ ہماری فائرنگ زیادہ سے زیادہ دس منٹ جاری رہی اور کم و بیش تیس پینتیس بلوائی ہلاک اور ان سے دگنے زخمی ہوئے۔ میری زندگی میں ایسے صرف دو تین مواقع آئے تھے جب میں ہر قسم کے جذبۂ انسانی کو بھول کر وحشی درندہ بن گیا تھا۔ 71ء کی جنگ کے بعد بمبئی میں CBI کے کارکنوں کو ہلاک کرتے وقت اور کھٹمنڈو میں مہاجروں کے روپ میں مکتی باہنی والوں کو مارتے ہوئے میری بالکل ایسی ہی ذہنی کیفیت تھی۔

بلوائی لاشیں اور تڑپتے زخمیوں کو چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے۔ مشیر کے حامی گھر کے اندر سے بلوائیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ان کے بھی دو آدمی مدافعت کے دوران بلوائیوں کے ہاتھوں اب تک ہلاک ہو چکے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر گھر سے باہر نکلے تو میں نے اپنے ساتھ آنے والے تیر اندازوں کے

ذریعے گھر کے مکینوں کو کہلوایا کہ ان کا یہاں ان حالات میں رہنا خارج از بحث ہے، لہٰذا وہ اپنا ضروری اور قیمتی سامان لے کر ہمارے ساتھ حویلی چلیں۔ ایک گھنٹے میں وہ سب ہمارے ہمراہ حویلی کی جانب چل پڑے۔ رانگا ماٹی اس وقت بالکل کرفیو زدہ علاقے کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ تمام دکانیں اور بازار بند تھے۔ گلیاں اور رستے سنسان تھے اور ہو کا عالم طاری تھا۔ ہم حویلی میں پہنچے تو رانی کو پہلے ہی اس واقعے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ ہماری منتظر تھی۔ مشیر کے خاندان کو تو اس نے مہمان خانے کے دو کمروں میں بھجوا دیا اور مجھے اکیلے میں بلا کر باز پرس کرنے لگی کہ میں نے اسے بتائے بغیر اور بلا اجازت یہ قدم کیوں اٹھایا؟ میں حالات کی سنگینی اور اس خوں ریزی سے چڑچڑا ہو رہا تھا۔ بلوائیوں کی اموات کا ذمہ دار میں تھا لیکن میں نے یہ قدم اپنی کسی ذاتی رنجش یا فائدے کے لیے نہیں بلکہ انتہائی مجبوری کی حالت میں اور رانی کے سردار بیٹے کی سازشوں اور رانی اور اس کے چھوٹے بیٹے اور حویلی کے تحفظ کے لیے اٹھایا تھا اور اب رانی مجھ سے سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔ میں نے رانی کو بڑے خشک لہجے میں جواب دیا، ''میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے لیے میں تمھیں ہرگز جواب دہ نہیں۔ ہمارے یہاں آنے سے پیشتر تم اور تمھارا چھوٹا بیٹا برسوں سے اپنے سردار بیٹے کی قید میں رہے اور میں نے تمھیں اس کی قید سے رہائی دلائی۔ اب تک جو کچھ بھی ہوا اور آئندہ ہوگا اس کا واحد ذمہ دار تمھارا بڑا بیٹا ہے۔ اپنے انھی قبیلے والوں کے علم میں ہونے کے باوجود وہ تمھیں برسوں قید سے رہائی نہ دلا سکے۔ آج ہی تم نے اپنے قبیلے کے تین مردوں اور ایک عورت کو تیروں اور خنجر سے ہلاک کیا ہے جس کے نتیجے میں بلوائیوں نے تمھارے مشیر کو مار ڈالا اور وہ اس کے گھر کو آگ لگا کر گھر کے افراد کو بھی زندہ جلانے کے درپے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے حویلی کا رخ کرنا تھا اور اگر انھیں ہمارا خوف نہ ہوتا تو وہ آج یقیناً تمھاری اور تمھارے بیٹے کی تکہ بوٹی کر دیتے۔ تمھیں قید سے رہائی کیا ملی کہ تم مجھ سے باز پرس کرنے اور حکم چلانے لگی ہو۔ یاد رکھو کہ تم بیشک راجہ کی بیوی ہو لیکن میرے لیے محض ایک بے بس عورت ہو جسے میں راجہ کو دیے ہوئے قول کو نبھاتے ہوئے یہاں سے لے جانے آیا ہوں۔ میں نے تمھیں پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ میں فوری طور پر حویلی کے انتظامات سنبھال رہا ہوں۔ اس لیے یاد رکھو کہ میں اپنے کسی قول و فعل کا تمھیں جواب دہ نہیں ہوں۔ اس لیے آئندہ مجھ سے نہ تو کبھی رانی بن کر سوال کرنا اور نہ ہی میرے معاملات میں دخل دینا ورنہ میرے پاس اس کا صرف ایک ہی حل رہ جائے گا کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے فوری چلا جاؤں۔ تمھارے مخالفین اور معزول بیٹے کو جب ہمارے جانے کا علم ہوگا تو وہ ہمارا تو کچھ نہ بگاڑ سکیں گے کیونکہ ہمارے پاس اتنا اسلحہ اور گولیاں ہیں کہ تمھارے قبیلے جیسے تین چار مزید قبیلے بھی سامنے آجائیں تو انھیں بھی ختم کر کے ہمارے پاس خاصا ایمونیشن بچ جائے گا۔ تم اپنا سوچو کہ تمھارا بڑا بیٹا اور اس کے حامی تمھارا کیا حشر کریں گے؟''

میں جانتا تھا کہ اقتدار کا نشہ سب کو اور خصوصاً جب کوئی عورت چاہے وقتی اقتدار ہی حاصل

کرے، اتنا زیادہ چڑھ جاتا ہے کہ وہ ہوش و حواس سے عاری ہو جاتی ہے۔ اسی مصنوعی نشے کو اتارنے کے لیے یہ میں نے رانی کو حالات کے آئینے میں اس کا اصل عکس دکھایا تھا۔ رانی جو پہلے بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی، میری باتیں سن کر بالکل بھیگی بلی بن گئی۔ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکلتی تھی۔ رانی سے ایک عام عورت بننے میں اسے چند لمحے لگے۔ بڑی مری ہوئی آواز میں وہ بولی، ''آئندہ آپ کے معاملات میں میری اور میرے چھوٹے بیٹے کی طرف سے ہرگز دخل اندازی نہ ہوگی۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو آج رات ہی مدفون خزانہ نکال لیں۔ پاکستان کب اور کس راستے سے جانا ہے، وہ بھی آپ کا فیصلہ ہوگا۔ جب تک رانگا ماٹی میں ہمارا قیام ہے میں صرف آپ کی مرضی اور اجازت سے حویلی کے اندر اور باہر آپ کے احکامات کے مطابق قبیلے کے لوگوں سے رابطہ کروں گی کیونکہ زبان نہ جاننے کے باعث آپ ڈائریکٹ ان سے بات نہیں کر سکتے۔ رانگا ماٹی سے نکلنے کے بعد آپ میری آواز تک نہ سنیں گے۔ آپ سے میری ایک ہی التجا ہے کہ مجھے اور میرے بیٹے کو بخیر و عافیت راجہ صاحب تک پہنچا دیں۔''

رانی کو اس کا ''صحیح'' مقام دکھا کر میں تہہ خانے میں معزول سردار کے پاس گیا۔ تھائی پہریدار نے اتنی سختی کر رکھی تھی کہ سردار کے لیے بھیجا گیا کھانا بھی ابھی ویسے ہی پڑا تھا کیونکہ سردار کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ میں نے پہریدار کو بھیج کر دو ساتھیوں کو بلوایا جنھوں نے سردار کے ہاتھ اور پاؤں کھولے۔ بھوک سے سردار کا برا حال تھا۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے اسے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ اس نے حراست سے بھاگنے کا جو پلان بنایا تھا اس کے نتیجے میں نہ صرف اس کا یہ حال ہوا بلکہ رانی بننے کے شوق میں مبتلا خادمہ، اس کا مشیر اور دونوں حجام بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کے حامیوں نے رانی کے مشیر کو ہلاک کر کے اس کے گھر کو آگ لگانی چاہی تو درجنوں حامی تو موقعے پر ہی ہلاک کر دیے گئے جبکہ بیسیوں مزید زخمی حامی اب تک مر چکے ہوں گے اور اس سب قتل و غارت کی وجہ وہ ہے۔ اگر وہ ہمارے خلاف سازشیں نہ کرتا تو حالات اس نہج تک نہ پہنچتے۔ اب بھی وقت ہے کہ وہ انسان بن جائے اور ہمیں مزید خون خرابہ کیے بغیر یہاں سے جانے میں تعاون کرے۔ جب اسی نے بالآخر راجہ بننا ہے تو کیا وہ صبر سے چند روز یہاں گزار نہیں سکتا۔ سردار خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا اور کچھ سوچ کر بولا، ''میرا یہ آپ سے وعدہ ہے کہ میں آپ کے راستے میں اب نہ تو کوئی رکاوٹ ڈالوں گا اور نہ ہی یہاں سے فرار ہونے اور نہ ہی کسی سے بھی رابطے کی کوشش کروں گا۔'' جذبۂ خیرسگالی کے طور پر اس نے اپنے پلنگ کے ایک پوشیدہ خانے سے ایک بڑا خنجر نکال کر مجھے دیا اور بولا، ''تلاشی کے دوران یہ جگہ آپ کی نظروں میں نہ آسکی۔ اب تو آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ میں نے آپ سے اب جو وعدہ کیا ہے اسے ایفا کروں گا۔'' میں جو ہمیشہ دوسروں پر بھروسہ کر لیتا ہوں سردار کی اس حرکت سے پھر اس کے چکمے میں آگیا اور ساتھیوں کو کہا کہ اب اس کے ہاتھ پاؤں نہ باندھیں۔ بہرحال تھائی پہریدار کو یہ ہدایت کر دی کہ اگر سردار کی کوئی ایسی ویسی حرکت دیکھے تو اسے ٹانگوں میں گولی مار کر بھاگنے نہ دے

اور اگر کوئی بھی مرد یا عورت اس سے ملنے کی زبردستی کوشش کرے تو اسے بھی ہلاک کر دے۔

شام خاصی گہری ہو چکی تھی جب میں نے رانی کو پیغام بھجوایا کہ میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک گھنٹے بعد آؤں گا تاکہ آج رات جواہرات والا کام کر دیا جائے۔ رانی کا جواب آیا کہ بہتر رہے گا کہ رات کا کھانا کھا کر جب بیشتر خادم اور خادمائیں چلی جاتی ہیں، اس وقت یہ کام کیا جائے۔ لہٰذا رات کے بارہ بجے ہم لوگ آئیں۔ رات بارہ بجے قیصر، نمبر ٹو اور ان کے چار ساتھیوں کو لے کر میں زنان خانے میں گیا۔ رانی ہماری منتظر تھی۔ کدالیں اور پھاوڑے بھی اس نے منگوا لیے تھے اور اس کے چار قابل اعتبار ملازم بھی موجود تھے۔ رانی میری آج دن کی گفتگو سے خاصی دل گرفتہ نظر آتی تھی۔ میں بھی روکھے انداز میں اس سے پیش آ رہا تھا۔ رانی نے ہمارے درمیان تناؤ کی کیفیت کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے انگریزی میں پوچھا، ''آپ تو اب حویلی کے چپے چپے سے واقف ہو چکے ہیں۔ ذرا بتایئے تو خزانہ کہاں دفن ہونا چاہیے؟'' ''ایسی جگہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔ بہرحال ان فضول باتوں میں اب وقت ضائع نہ کرو اور اصل کام کی طرف آؤ۔'' میرا یہ جواب سن کر رانی نے چپ چاپ اپنے خادموں کو کدالیں اور پھاوڑے اٹھانے کا کہا اور ہمیں لے کر زنان خانے کے اس کچن کی طرف چلی جو صرف رانی کے لیے بنایا گیا تھا اور بقول رانی کے وہ شوقیہ طور پر کبھی کبھی اس کچن میں کھانا تیار کرتی تھی۔ کچن سے ملحقہ ایک سٹور تھا جس میں کچن کی ضرورت کا سامان رکھا ہوا تھا۔ رانی نے اس سٹور کے ایک کونے سے سامان ہٹوا کر خادموں کو فرش کھودنے کا حکم دیا۔ پہلے ٹائل اکھیڑے گئے اور پھر کھدائی شروع ہوئی۔ یہ سب پتھریلا علاقہ تھا لیکن کھدائی کی جگہ پر پختہ اینٹیں بھری ہوئی تھیں۔ جب تقریباً دو فٹ گہرائی تک کی اینٹیں نکال لی گئیں تو رانی نے خدام کو واپس جانے کا کہا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ خادم خزانے کو دیکھ سکیں۔ خادموں کے جانے کے بعد میرے ساتھیوں نے اینٹیں نکالنی شروع کیں۔ یہ اینٹیں آج کل کی اینٹوں سے مختلف بہت پتلی اور چھوٹے سائز کی تھیں۔ مزید دو فٹ گہرائی تک اینٹیں نکالنے کے بعد زنگ آلود لوہے کا ایک بڑا چوکور ٹکڑا دکھائی دیا۔ اس ٹکڑے کو ہٹانے کے لیے چاروں طرف سے مزید اینٹیں ہٹائی گئیں اور بڑی مشکل سے اس ٹکڑے کو نکالا گیا۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کا ایک بھبکا سا نکلا۔ ہم سب پیچھے ہٹ گئے۔ مجھے یک لخت خیال آیا کہ مورنگ قبیلے کے جواہرات نکالتے وقت زہریلی تھیلی سے ہم بال بال بچے تھے۔ میں نے رانی کو کہا کہ ہمیں ایک موٹی چادر چاہیے جسے ہاتھ پر لپیٹ کر جواہرات کو نکالا جائے۔ رانی اندرونی کمروں سے ایک چادر اٹھا لائی۔ میرے نمبر ٹو نے چادر پورے بازو پر لپیٹ کر ہاتھ اندر کرنا چاہا لیکن وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ تھوڑی گہرائی تک ہاتھ اندر لے جا کر باہر نکال لیا۔ ہمارے پاس دو ٹارچ تھے جن کی روشنی میں نمبر ٹو نے ایک مردہ سانپ کی کھال اور سر کا کچھ حصہ دیکھ لیا تھا۔ اب قیصر کے ایک ساتھی نے چادر اپنے بازو کے گرد لپیٹی اور فرش پر لیٹ کر پہلے سانپ کی کھال کے ٹکڑے اور پھر چمڑے کی ایک بڑی تھیلی نکالی۔

اب وہاں مزید کچھ نہ تھا۔ تھیلی ایک طرف رکھوا کر میں نے لوہے کا ڈھکن پھر وہیں رکھنے اور اس پر اینٹیں رکھنے کا کہا۔ آدھ گھنٹے میں یہ کام بھی ہو گیا اور ٹائیل لگا کر ہم اس کھودی گئی جگہ کو تقریباً پہلی جیسی حالت میں لے آئے اور سٹور کا سامان واپس اپنی جگہ پر رکھ کر ہم سب اندرونی ڈرائنگ روم میں آئے۔ میں نے رانی سے خنجر لے کر اور ہاتھوں پر چادر لپیٹ کر چمڑے کی تھیلی کو چاک کر کے الٹ دیا۔ کمرے میں پیٹرومکس کی روشنی تھی۔ اس تھیلی میں سے کم از کم تین سو ناتراشیدہ ہیرے، یاقوت، پکھراج، نیلم اور زمرد ہمارے سامنے قالین پر ڈھیر پڑے تھے اور ناتراشیدہ ہونے کے باوجود روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ ان میں کچھ جواہرات غیر معمولی طور پر بڑے تھے اور باقی بھی خاصے بڑے سائز کے تھے۔ ہم سب اس خزانے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق جواہر کا یہ خزانہ ستر کی دہائی میں کم از کم تیس کروڑ کا ہونا چاہیے تھا۔ میرے کہنے پر رانی کاغذ اور قلم لے آئی اور خزانے کی تفصیل درج کر کے اس پر دستخط کر دیے۔ میرے کہنے پر قیصر نے چادر ہاتھ پر لپیٹ کر ان جواہرات کو ایک دوسری چادر میں ڈالا اور باتھ روم میں پانی سے ان کو خوب اچھی طرح سے دھویا تاکہ اگر ان پر بھی زہر لگا ہو تو دھل جائے۔ جواہرات کو سکھانے کے بعد میرے کہنے پر رانی تکیوں کے تین غلاف لے آئی جنھیں ایک دوسرے میں ڈال کر ایک بڑی تھیلی بنا لی اور سارے جواہرات اور ان کی تفصیل اور رانی کا دستخط شدہ خط بھی اس تھیلی میں ڈال کر ایک رسی سے اس کا منہ مضبوطی سے باندھ دیا۔ رانی سے رخصت ہو کر ہم مہمان خانے کی طرف لوٹ آئے۔ مورنگوں کے خزانے کے ساتھ اب اس خزانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر تھی اور میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں ان جواہرات کو محفوظ کر سکوں۔ سوچ سوچ کر یہی ترکیب ذہن میں آئی کہ انھیں اپنے جسم سے باندھ لوں کیونکہ اس طرح ان تک کسی کی پہنچ میرے مرنے کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔ دونوں خزانوں کا کل وزن تقریباً 8 کلو تھا۔ انھیں جسم سے باندھنے سے میری Mobility بھی یقیناً کم ہو جانی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

اگلے روز میں نے سب ساتھیوں، رانی اور اس کے لڑکے، کلپنا اور رضی کی بیوی کو کہا کہ کسی کے علم میں لائے بغیر چلنے کی پوری تیاری کر لیں۔ روانگی کے وقت میں صرف ایک گھنٹے کا نوٹس دوں گا۔ اب مجھے رضی کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ مزید دو دن اس کے انتظار میں گزر گئے۔ اس دوران رانگامائی میں ہمارے خلاف کیا کھچڑی پک رہی تھی مجھے اس کا کچھ بھی علم نہ ہو سکا۔ میرے ساتھی دو تین بار قصبے کا چکر لگا کر آئے۔ دکانیں وغیرہ کھلی تھیں اور بازاروں میں لوگوں کی آمد و رفت بھی معمول کے مطابق تھی۔ رانی نے مجھ سے اجازت لے کر حویلی کے چند خادم اور خادماؤں کو حویلی میں ہی روک لیا تھا۔ پہریدار اور تیر انداز بھی حویلی سے باہر نہیں جاتے تھے۔ حویلی میں مقیم افراد کے لیے خورد و نوش کا سامان لینے میرے چار ساتھی خادموں کے ساتھ بازار جاتے اور سامان لے کر آ جاتے۔ خچروں کے لیے گھاس بھی یہی لاتے تھے۔ حمید سارا وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتا تھا۔ ہم نے بھی اس کی خاموشی

اور اس روش پر کوئی دھیان نہ دیا۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ رانگاماٹی سے نکلتے وقت تھا۔ یہ بجا کہ میرے تمام ساتھی مسلح تھے لیکن رانی، اس کے لڑکے اور سامان کے ساتھ ہم حملے کی صورت میں کسی اوٹ میں بیٹھ کر مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ ہمیں کھلی جگہ پر مقابلہ کرنا تھا اور چکمہ قبیلے کے لڑاکے رنگوں سے جسموں کو کیموفلاج کیے درختوں کے ٹہنوں پر پتوں میں چھپ کر بے آواز زہریلے تیروں کی ہم پر بارش کرسکتے تھے۔ برما میں جادوگرنی نے پانی کے تھال میں مجھے ایسا ہی منظر دکھایا تھا۔ میں ان حالات میں زیادہ سے زیادہ یہی احتیاط کرسکتا تھا کہ حملہ ہونے کی صورت میں ہمراہی خواتین اور راجہ کے لڑکے کو خچروں پر بٹھا کر دور بھیج دیتا اور ہم مرد حملہ آوروں سے مقابلے کرتے۔

ساتھیوں کو تربیت دینے کے لیے میں نے حویلی کے تین پہریداروں کو منتخب کیا اور رانی کے ذریعے انھیں سمجھایا کہ وہ سہ پہر تین بجے جسموں کو کیموفلاج کرکے حویلی میں تین درختوں پر چڑھ جائیں اور جب ہم وہاں سے گزریں تو ہمارے اردگرد تیر پھینکیں جو ہمیں نہ لگیں۔ یہ انتظام کرکے میں نے سارے ساتھیوں کو کہا کہ آج سہ پہر اسلحے کے بغیر حویلی کے صحن میں چہل قدمی کریں گے۔ صرف میں نے اپنا پستول اور ریوالور اپنے ساتھ رکھا اور مقررہ وقت پر ساتھیوں سے دوبارہ تصدیق کرکے کہ وہ سب غیر مسلح ہیں، میں انھیں لے کر حویلی کے صحن میں چلا آیا۔ میں نے اپنے ساتھ اسلحہ صرف اس خدشے کے پیش نظر رکھا تھا کہ اگر تیر اندازوں کی نیت بدل جائے تو انھیں زیر کرسکوں۔ ہم درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ہمارے اردگرد تیر برسنے لگے۔ تیروں کی بوچھاڑ دیکھ کر میرے غیر مسلح ساتھی حیران و ششدر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ یہ واقعہ ان کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ انھیں یقیناً یہ خیال آیا ہوگا کہ انھیں غیر مسلح کرکے میں دانستہ یہاں اس لیے لایا ہوں کہ وہ تیروں کا نشانہ بنیں۔ میں نے تیر اندازوں کو اشارے سے تیر پھینکنے سے روکا اور نیچے اترنے کا کہا۔ تینوں تیر انداز درختوں سے کود کر نیچے آگئے تو میں نے اپنے بکھرے ہوئے بھاگتے ساتھیوں کو آوازیں دے کر واپس بلایا۔ وہ شک و شبے کا شکار سراسیمہ پہلے تو وہیں رک کر مجھے دیکھتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ میرے قریب چلے آئے۔ تیر انداز بھی میرے قریب کھڑے تھے۔ میں نے سب کو بتایا کہ میں نے یہ سب کچھ آپ کی عملی ٹریننگ کے لیے کیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ واپسی کے دوران ہمیں اصل حملہ آوروں کا سامنا کرنا پڑے۔ میں نے آپ کو غیر مسلح اس لیے کیا تھا کہ اصلی حملہ سمجھتے ہوئے آپ تیر اندازوں پر فائر نہ کریں۔ آپ نے اب ہم پر بے خبری میں اصلی حملہ ہونے کا عملی مظاہرہ دیکھ لیا ہے۔ اس لیے دوران سفر اپنی نگاہوں اور اسلحے کا رخ درختوں پر مرکوز رکھیں اور ذرا سا شک ہونے پر بھی فائر کھول دیں۔ جب ان کو اس حملے کی اصلیت معلوم ہوگئی تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

رانی کا دوسرا مشیر بھی پہلے مشیر کی ہلاکت کے بعد حویلی میں نہیں آیا تھا۔ شام کو پریشان حال رضی حویلی میں آیا اور بولا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے جھونپڑے کو نظر آتش کردیا گیا ہے اور اس کی

بیوی غائب ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اس کی بیوی حویلی میں ہے اور بالکل صحیح سلامت ہے تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے بتایا کہ اسے کشتیوں کے انتظام میں اتنے روز اس لیے لگ گئے کیونکہ دریائی بازار کل ہی اس گاؤں کے قریب پہنچا ہے۔ اس نے گاؤں کے سربراہ کے ذریعے تین کشتیوں کا انتظام کیا ہے جو پرسوں سہ پہر چار بجے سے گاؤں کے گھاٹ پر ہمیں چٹاگانگ لے جانے کے لیے تیار ملیں گی اور اگلی صبح دس بجے تک ہمارا انتظار کریں گی۔ پندرہ ہزار ٹکہ ان کا معاوضہ طے ہوا ہے۔ حالات کے پیش نظر میں اس موقعے کو گنوانا نہیں چاہتا تھا لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ کل صبح ہی یہاں سے کوچ کرلینا چاہیے۔ رضی کے مطابق آٹھ گھنٹے کے پیدل سفر سے ہم اس گاؤں تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے صبح _ 6 بجے روانگی کا وقت مقرر کیا اور ساتھیوں کو تیاری کا کہہ کر رانی کو روانگی کا بتانے زنان خانے میں گیا۔ رانی سے فارغ ہوکر میں نے معزول سردار کے تہہ خانے کا رخ کیا۔ اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو میرے اوسان خطا ہوگئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ تھائی پہریدار کی لاش دروازے میں ہی پڑی تھی اور سردار بمعہ اس کی رائفل کے غائب تھا اور کھڑکی سے ایک رسی لٹک رہی تھی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ رسی کہاں سے آئی۔ میں ملحقہ باتھ روم میں گیا تو وہاں بھی ایک کھڑکی تھی جس پر بھی ایک چھجہ بنا ہوا تھا۔ سردار کی نگرانی اور کمرے کی تلاشی میں ہم سب سے چوک ہوگئی تھی۔ سردار کو یقیناً دو رسیاں بھیجی گئی تھیں۔ ایک ہمیں دھوکہ دینے کے لیے اور دوسری استعمال کے لیے۔ ایک رسی ملنے پر ہم اس طرف سے مطمئن ہوگئے تھے اور باقی وقت دوسری چیزوں کی تلاش میں صرف کیا تھا۔ میں نے پہریدار تھائی کی لاش کو گھسیٹ کر سردار کے بستر پر ڈالا اور کمبل اوڑھا دیا۔ دروازے کو تالا لگا کر میں نے رانی کو سردار کے فرار کی خبر بتائے بغیر اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور قیصر اور نمبر ٹو کو بلا کر ساری حقیقت بتائی۔ سردار کے فرار کی بات سن کر وہ پریشان تو بہت ہوئے لیکن میری اس بات سے وہ متفق تھے کہ ہمیں کل صبح ضرور روانہ ہوجانا چاہیے تاکہ سردار کو ہمارے خلاف حملے کی تیاری کا کم سے کم وقت ملے۔

آٹھواں باب

رضی اور میں بالکل ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے نہایت دھیمی آواز میں اس سے پوچھا کہ کیا اس نے ایک مکان کی چھت پر ٹارچ کی جلتی بجھتی روشنی دیکھی تھی۔ اس نے ہاں کہتے ہوئے کہا، ''اس روشنی کے فوری بعد الو بولنے کی آوازیں بھی آئی تھیں۔ جنگلوں میں میری زندگی بیتی ہے۔ میں اسی وقت پہچان گیا تھا کہ یہ اصلی الو کی نہیں بلکہ یہ آواز کسی انسان نے نکالی تھی۔ الو رات کے صرف پہلے آدھے حصے میں ہی بولتے ہیں، صبح نہیں۔'' میں نے کہا، ''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری روانگی اور اس راستے کا علم مخالفین کو ہو چکا ہے اور ہم پر حملہ کرنے والوں کو الو کی آواز میں ہماری آمد کا سگنل دیا گیا ہے۔'' میں نے قیصر کے ایک ساتھی کو جو ہمارے ساتھ ہی چل رہا تھا سرگوشی میں کہا کہ پیچھے جا کر سب ساتھیوں کو بتادے کہ ریڈ الرٹ (Red Alert) رہیں۔ دشمن کو ہماری اس راستے سے روانگی کا علم ہو چکا ہے اور کسی لمحے بھی ہمارا ''استقبال'' ہو سکتا ہے۔ قیصر کا ساتھی باقیوں کو اطلاع دینے پیچھے چلا گیا۔ ہم اس وقت گھنے جنگل سے گزر رہے تھے جہاں بے ترتیب درخت اتنے قریب تھے کہ سیدھا آگے بڑھنے کے بجائے ہمیں آڑا ترچھا (Zig Zag) ہو کر چلنا پڑ رہا تھا۔ ہمارے قدموں تلے سوکھے پتے چرمرا کر ہمارے چلنے اور راستے کی نشان دہی کر رہے تھے۔ ہم بمشکل دو سو میٹر آگے بڑھے ہوں گے کہ ہمارے خچر یکبارگی ہنہنانے لگے۔ اُن میں خطرے کو بھانپ لینے کی حس انسان سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم اب حملہ آوروں کے بہت قریب تھے، میں نے اپنے چاروں طرف پھیلے درختوں کے جھنڈ پر اوپری جانب سب مشین گن سے فائرنگ کی۔ یہ فائرنگ میرے ساتھیوں کے لیے سگنل تھی۔ انہوں نے بھی اسی طرح فائرنگ شروع کر دی۔ جنگل گولیوں کی آواز سے گونج اٹھا اور پرندے گولیوں کی آواز سے خوف زدہ ہو کر اپنے گھونسلوں سے

اڑنے لگے۔ فائرنگ اور پرندوں کے شور مچانے سے جنگل میں رات کی خاموشی کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ ابھی تک ہم پر نہ ہی کوئی تیر پھینکا گیا تھا اور نہ ہی کوئی حملہ آور دکھائی دیا تھا۔ حملہ آوروں کو اپنے قریب ہونے کو میں اپنا وہم تو کہہ سکتا تھا لیکن خچروں کے ہنہنانے کی کیا وجہ تھی؟ یکایک مجھے خیال آیا کہ بہت ممکن ہے کہ درختوں پر چڑھے حملہ آور ابھی ہم سے دور ہوں لیکن کچھ حملہ آور خاموشی سے ہمارے متوازی چل رہے ہوں اور ان کے قدموں تلے مسلے جانے والے پتوں کی آواز سے خچر ہنہنا رہے ہوں۔ قدرت نے جانوروں کو بعض ایسی خصوصی حسیات عطا کی ہیں جو انسانوں میں نہیں۔ بلی اندھیرے میں بھی اتنا صاف دیکھ سکتی ہے جیسے انسان روز روشن میں۔ چیونٹیوں کو بارش ہونے کا بہت پہلے علم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی خوراک کو محفوظ جگہ پر منتقل کر دیتی ہیں۔ زلزلہ آنے سے پہلے کتے مخصوص آوازیں نکال کر روتے ہیں۔ سرخ آندھی آنے سے پہلے شتر مرغ اپنے سر ریت میں چھپا لیتے ہیں۔ ہمارے خچروں کا ہنہنانا بلاوجہ نہیں تھا۔ میں نے اب درختوں کے اوپری حصوں پر فائر کرنے کے بجائے اپنے چاروں طرف زمین سے چار فٹ بلندی پر فائر کیے اور ہمیں پہلی انسانی چیخ سنائی دی۔ قافلے کو وہیں روک کر ٹارچوں کی روشنی میں ہم اس آواز کی طرف گئے۔ ایک چکمہ مرد جس کے جسم پر رنگ لگے ہوئے تھے زمین پر پڑا کراہ رہا تھا اور قریب ہی اس کا بھالا پڑا تھا۔ گولی اس کی چھاتی میں لگی تھی اور وہ چند لمحوں کا مہمان تھا۔ میں نے فوری رضی کی بیوی کو وہاں بلوایا تاکہ مرتے وقت یہ چکمہ اپنی ہم قبیلہ کو ہی حملہ کرنے والوں کا پلان بتادے۔ رضی کی بیوی کو وہ صرف یہی بتا کر دم توڑ گیا کہ چار پانچ بھالے بردار قافلے کے دونوں جانب ہمارے متوازی چل رہے ہیں اور سو سے زیادہ تیر انداز جنگل کے خاتمے کے قریب درختوں پر بیٹھے ہمارے منتظر ہیں اور انہیں تاکید کی گئی ہے کہ وہ ہم پر اس وقت یکباری تیر برسائیں جب ہم جنگل سے نکل رہے ہوں۔ اس طرح نہ تو ہم پیچھے جنگل میں لوٹ کر درختوں کی اوٹ میں چھپ سکیں گے اور نہ ہی آگے کھلی پتھریلی زمین پر ہمیں کوئی پناہ مل سکے گی۔ تیر اندازوں کے پاس زہر میں بجھے تیر ہیں اور ہم بارہ اسلحہ برداروں کو ختم کرنا ان کے لیے چنداں مشکل نہیں کیونکہ تعداد میں وہ ہم سے دس گنا زیادہ ہیں۔ انہیں یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی بمعہ رانی اور سردار کے چھوٹے بھائی کے بچنے نہ پائے۔ رضی کی بیوی کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہمارے متوازی چلنے والے بھالا برداروں کو ایک دوسرے سے رابطے کے لیے الو کی آواز اور اکٹھا کرنے کے لیے مینڈک کی آواز کا سگنل مقرر کیا گیا ہے۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ اس کی سانس اکھڑ گئی اور وہ نمستے کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر قید زندگی سے آزاد ہو گیا۔ میں نے قافلے کو فوراً آگے بڑھنے کو کہا لیکن رضی بولا، ''تھوڑا سا آگے جا کر ہم رک جاتے ہیں اور میں پہلے الو اور پھر مینڈک کے ٹرانے کی آواز نکال کر باقی بھالا برداروں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر انہیں ہم ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر جنگل میں ہی ہم سورج کے

طلوع ہونے کا انتظار کریں گے اور روشنی میں جنگل سے باہر نکلیں گے تاکہ تیر اندازوں کو دیکھ کر ان پر فائر کرسکیں۔" میرے استفسار پر کہ جنگل سے گزرنے کا کوئی متعین راستہ ہے جس پر تیر انداز ہمارا انتظار کر رہے ہیں اور کیا ہم راستہ بدل کر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے، رضی بولا، "کوئی متعین راستہ تو نہیں ہے لیکن برسوں سے یہیں سے گزرنے کی وجہ سے یہی مروجہ راستہ ہے ورنہ اس کے دونوں اطراف جنگل اتنا گھنا اور خود رو پودے اتنے زیادہ ہیں جنہیں بڑے چاقوؤں سے کاٹے بغیر کوئی انسان گزر نہیں سکتا۔ اس راستے پر تو رکاوٹ بننے والے درختوں کو قبائلیوں نے کاٹ کر آمدورفت کے لیے راستہ بنا لیا ہے۔" تقریباً سو میٹر مزید آگے بڑھنے کے بعد ہم نے قافلہ روک لیا۔ رضی نے قافلے کے بائیں جانب دس پندرہ قدم جاکر پہلے الو کی اور پھر مینڈک کی آواز نکالی۔ الو کی آواز کے جواب میں ویسی ہی ہمارے آگے اور پیچھے سے چار آوازیں سنائی دیں اور مینڈک کی آواز کے نکالنے کے چند منٹ کے اندر چار بھالا بردار اس جگہ آگئے جہاں سے رضی نے آوازیں نکالی تھیں۔ میری ہدایت کے مطابق رضی یہ آوازیں نکال کر فوراً ہی قافلے میں آگیا تھا۔ ہمیں بھالا برداروں کی آمد کا علم پتوں کے چرمرانے سے ہوا۔ میرے آرڈر کے مطابق میرے "Go" کہنے پر یکبارگی ہماری ٹارچیں روشن ہوئیں اور ان کی روشنی نے اُس جگہ کا احاطہ کر لیا جہاں چاروں بھالا بردار اپنے بلانے والے ساتھی کا انتظار کر رہے تھے۔ روشنی پڑتے ہی انہوں نے اندھیرے میں روشن ٹارچوں کی طرف دیکھا عین اسی وقت ہماری آٹومیٹک رائفلوں نے ان پر گولیاں برسائیں اور چاروں وہیں ڈھیر ہوگئے۔ ہم اپنی اس کامیابی پر بڑے خوش تھے کہ ہماری نگرانی کرنے والوں کو ہم نے ختم کردیا تھا اور اب صرف آخری اور بڑی لڑائی تیر اندازوں سے ہونی تھی۔ اب پو پھٹ رہی تھی اور پرندے اپنی خوراک کی تلاش میں اڑنے کو پر تول رہے تھے۔ رضی نے ایک جگہ مجھے قافلہ روکنے کا کہا۔ اس کے مطابق مزید آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد جنگل نے ختم ہوجانا تھا اور اس جگہ سے آگے کہیں بھی تیر انداز چھپے بیٹھے ہوسکتے تھے۔

سورج طلوع ہونے کے خاصی دیر کے بعد جنگل میں روشنی کا احساس ہوتا ہے۔ اب ہم نے جب دوبارہ سفر شروع کیا تو سورج کی کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن کر آرہی تھیں۔ بے آواز تیروں اور نفری میں ہم سے دس گنا زیادہ دشمنوں سے مقابلے کا احساس ہم سب ہی کو تھا۔ میں نے قافلے کو اسی ترتیب میں چلنے کا حکم دیا۔ صرف دو تھائی اور قیصر کے دو ساتھیوں کو کہا کہ وہ قافلے کے دونوں اطراف بیس بیس فٹ کی دوری پر چلیں اور درختوں پر نگاہ رکھیں تاکہ تیر اندازوں کو ہم پر حملے کے وقت انہیں خود ہماری دوطرفہ فائرنگ سے بچاؤ کی وجہ سے قافلے پر Concentration کا موقع نہ ملنے پائے۔ دوسرے انہوں نے خود کو قافلے کی گزرگاہ کی دونوں جانب کے درختوں کے پتوں میں چھپایا ہوگا اور ان کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ اپنی پچھلی جانب سے بھی پتوں کی آڑ لے سکیں۔ ہمارے

متوازی چلنے والے ساتھیوں کو گھنے درختوں میں سے گزرنا اگرچہ خاصا دشوار تھا لیکن ناممکن نہ تھا اور جب جان پر بنی ہو تو ایسی رکاوٹوں کی کون پرواہ کرتا ہے؟ اپنے سب مسلح ساتھیوں کو میرا Standing Order یہ تھا کہ اگر انہیں درختوں میں چھپا کوئی بندہ نظر آئے تو بلا تاخیر اس پر فائر کریں اور اگر ایسی صورت پیش نہ آئے تو جب تک میں سب مشین گن سے فائر نہ کروں کوئی بھی فائر نہ کرے اور میرے فائر کے بعد مسلسل درختوں پر فائر کرتے جائیں جب تک کے جنگل سے باہر نکل کر میں فائر بند نہ کروں۔ اس آرڈر سے میرا مقصد یہ تھا کہ تیرا انداز جو کہ یقیناً درختوں پر چھپے بیٹھے ہوں گے، انہیں ہم اپنے مسلسل فائر میں اتنا الجھادیں کہ انہیں تیر چلانے کا موقع ہی نہ مل سکے اور اس وقت اپنا فائر بند کریں جب ہم ان کے تیروں کی رینج سے باہر نکل جائیں۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ کھلی جگہ پر اور جنگل سے باہر نکلنے کے بعد بھی ہمیں دشمن کی طرف سے سردار کی ہم سے چھینی رائفل اور دوسرے فائر آرمز کا سامنا بھی کرنا پڑسکتا ہے۔ اس لیے میں نے رضی کو کہا کہ میرے ساتھی جنگل سے باہر نکلنے کے بعد بھی پیچھے چھوڑے درختوں پر فائر کریں گے جبکہ ہم دونوں جو قافلے کے آگے چل رہے ہیں، سامنے کا دھیان بھی رکھیں گے۔ ہمارا قافلہ آگے بڑھتا جارہا تھا کہ رضی نے اشارے سے مجھے دکھایا۔ ہم سے تقریباً ایک سو میٹر کے فاصلے پر کھلی جگہ پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی تھیں یعنی وہاں پر جنگل ختم ہوجاتا تھا۔ اسی سو میٹر کے اندر تیر انداز چھپے ہوئے تھے۔ بھالا بردار لڑاکے نے بھی مرتے وقت یہی کہا تھا کہ تیر اندازوں کو ہم پر کھلی جگہ پر پہنچتے ہی اٹیک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سو سے زیادہ تیر انداز جنگل کے آخری درختوں پر تو خود کو چھپا نہیں سکتے تھے لہٰذا جب کھلی جگہ ساٹھ میٹر کے لگ بھگ دور رہ گئی تو میں نے اللہ کا نام لے کر اپنی مشین گن سے سامنے اور اپنی دونوں اطراف کے درختوں پر فائر کھول دیا۔ میرے فائر کے ساتھ ہی میرے تمام ساتھیوں کے اسلحے بھی گولیاں برسانے لگے۔ یقین جانیے جیسے بیروں سے لدے پیڑ پر پتھر مارنے سے ڈھیروں بیر گرتے ہیں ویسے ہی درجنوں رنگوں سے خود کو کیموفلاج کیے ہوئے چکمہ تیر انداز درختوں سے گرنے لگے۔ کئی تو ہمارے اتنے قریب گرے کہ محض چند انچ کے فاصلے سے ہم ان کے جسموں تلے دبنے سے بچے۔ مختلف اسلحوں سے کیے جانے والے فائروں، گرنے والے چکموں کی چیخوں اور پرندوں کے اڑنے کی آوازوں کے باہم ملنے سے جنگل کے اس حصے میں ایک حشر بپا تھا۔ جن تیر اندازوں کو میری اور رضی کی گولیاں Miss کر رہی تھیں، انہیں میرے ساتھیوں کی گولیوں نے جا لیا۔ میری سٹریٹجی کے مطابق ہمارے راستے کے ایک ایک درخت پر میرے اور میرے ساتھیوں نے مختلف زاویوں سے چار چار بار فائر کیے۔ ہمارا قافلہ بڑھتا جارہا تھا۔ یہاں پر حمید نے اپنی کارکردگی دکھائی اور خچروں کو قابو میں رکھا۔ اس دوران ہم پر بغیر نشانے کے آٹھ دس تیر پھینکے گئے تھے۔ تیر اندازوں نے یقیناً ہمیں نشانے پر لے رکھا تھا اور اس انتظار میں تھے کہ ہم ان کی رینج میں آجائیں تو تیر چلائیں۔ ہماری گولیوں نے

انہیں اس کی مہلت ہی نہ دی اور ان کے گرتے وقت تیر ان کی کمانوں سے نکلے اور ادھر اُدھر جا پڑے۔ ہمارے محتاط اندازے کے مطابق جنگل سے نکلنے اور ہمارے پچھلی جانب ہمارے فائر کرنے سے گرنے والے تیراندازوں کی کل تعداد پچانوے سے زیادہ۔ کھلی جگہ پر بھی ہم آگے بڑھتے ہوئے جب اس رینج سے باہر آگئے جہاں جنگل سے چھوڑے گئے تیر ہم تک نہ پہنچ سکیں تو میں نے قافلے کو رکنے کا حکم دیا۔ میرے تمام ساتھی، رانی اس کا لڑکا اور خچر بالکل صحیح سلامت تھے۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور مشین گن زمین پر رکھنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ سامنے سے فائر کی گئی رائفل کی ایک گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی اور پھر مسلسل رائفل کا فائر آنے لگا۔

میرے ساتھی ایسی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے مکمل ٹرینڈ تھے۔ ہم سب چند سیکنڈ میں ہی پتھروں کی اوٹ میں آکر آنے والے فائر کا جواب دینے لگے۔ قیصر کرالنگ کرتے ہوئے خچروں کی طرف گیا لیکن اس کے ان تک پہنچنے سے پہلے ہی دونوں خچر گولیوں کا نشانہ بن کر ڈھیر ہوچکے تھے۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی رانی، کلپنا اور رضی کی بیوی پتھروں کی اوٹ میں جا چھپیں۔ راجے کا چھوٹا لڑکا بار بار کھڑا ہوکر ہم پر آنے والے فائر کی طرف تیر چلا رہا تھا۔ میں نے اسے سختی سے منع کیا اور کسی محفوظ پتھر کے پیچھے خاموشی سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ہم پر شدید فائر ہورہا تھا۔ گولیوں کے رخ اور فائر کی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کم از کم تین رائفلیں ہم پر گولیاں برسا رہی تھیں۔ اس وقت سورج کی روشنی خاصی پھیل چکی تھی۔ مجھے ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ فائرنگ کی آوازیں اگر بنگلہ دیشی فوج اور پولیس کی کسی قریبی چوکی تک پہنچ گئیں تو وہ بھی یہاں آجائیں گے۔ میں اور میرے ساتھی غیرقانونی طور پر بنگلہ دیش میں داخل ہوئے تھے اور ہمارے پاس پیپر ملز کی فوجی چوکی سے چھینا اسلحہ بھی تھا۔ ان کی آمد سے ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔ میرے جسم پر بندھا خزانہ بھی وہ ''غائب'' کرکے ہمیں لمبے عرصے کے لیے جیل میں ڈال سکتے تھے بلکہ خود سے ہمارا مصنوعی مقابلہ دکھا کر ہمیں یہیں ہلاک بھی کرسکتے تھے۔ میں نے قیصر کو اشاروں سے سمجھایا اور ہم دونوں کرالنگ کرتے ہوئے ہم پر آنے والے فائر سے دائیں اور بائیں جانب چلے گئے۔ میں چاہتا تھا کہ ہمارے بقیہ ساتھی دشمنوں کو فائرنگ میں الجھائے رکھیں اور قیصر اور میں دشمنوں کی نظر میں آئے بغیر ان کے پیچھے پہنچ کر ان پر حملہ کریں۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک فائرنگ کا تبادلہ جاری رہا اور اس دوران میں اور قیصر ہم پر فائر کرنے والوں کے پیچھے پہنچ گئے۔ تین بڑے پتھروں کے پیچھے بیٹھے چار آدمی ہمارے قافلے پر گولیاں برسا رہے تھے۔ میرا اور قیصر کا نظری رابطہ قائم تھا۔ میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ دو کا وہ اور دو کا میں شکار کروں گا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے Go کا سگنل دیا۔ ہم دونوں بیک وقت کھڑے ہوگئے اور اپنے اپنے ٹارگٹوں کا نشانہ لے کر گولیاں داغیں۔ یہ چاروں جو بڑے پتھروں کی اوٹ میں خود کو محفوظ سمجھے ہوئے اپنے دائیں بائیں اور عقب سے غافل تھے،

گولیاں لگنے سے اچھلے اور ان کی رائفلیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں۔ ان میں سے دو تو گولیاں لگتے ہی ہلاک ہوگئے تھے اور جن دو کی کمر اور شانے میں گولیاں لگی تھیں۔ وہ زخمی پرندوں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ ہمارے ساتھیوں کا فائر ابھی تک جاری تھا۔ ان کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچنے کے لیے میں نے پہلے دشمنوں کی ایک رائفل پر سفید رومال باندھ کر بلند کیا اور جب فائر تھما تو خود کھڑا ہوگیا۔ ساتھیوں نے مجھے پہچانتے ہی نعرہ لگایا۔ میں نے اشاروں اور بلند آوازوں سے انہیں کہا کہ آپ سب بمعہ سامان کے یہاں آجائیں۔ زخمی دشمنوں میں سے ایک بنگالی لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہنے لگا، ''میں نے سن 71ء میں پاکستانی فوج سے فرار ہوکر اور مکتی باہنی والوں کے ساتھ مل کر درجنوں پاکستانی شہریوں کو بیدردی سے ہلاک کیا تھا۔ میں اس وقت حوالدار تھا اور اپنی ''کارکردگی'' کے باعث آج JCO ہوں اور قدرت کی ستم ظریفی کہ آج ایک پاکستانی کے ہاتھوں ہی موت کے منہ میں پہنچا ہوں۔'' اس آخری وقت میں شاید وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ درد سے کراہتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میرے ساتھ دو آدمی بھی ہماری فوج کے سپاہی ہیں اور تیسرا سردار کا ایک سویلین دوست ہے۔ آپ کے قافلے کو روکنے اور مقابلہ کرنے کی ساری پلاننگ میری تھی۔ ہم نے سردار کے تیر اندازوں کا آپ کے ہاتھوں برا حشر ہوتے دیکھ لیا تھا اور میں نے سردار کو مشورہ دیا تھا کہ ان حالات میں مقابلے کا خیال دل سے نکال کر آپ کے قافلے کو نکل جانے دے لیکن وہ نہ مانا اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ جب سو کے قریب تیر انداز آپ نے مار گرائے تو ہماری چار رائفلیں کب تک آپ کو روک سکتی تھیں؟'' ''سردار کہاں ہے؟'' اس مرتے ہوئے JCO سے میں نے پوچھا۔ اس نے اشارے سے دائیں طرف جہاں صرف چار پانچ درخت تھے، اشارہ کرتے ہوئے کہا ''سردار ان درختوں پر اپنے چھ تیر اندازوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ آپ مجھے معاف کردیں اور اللہ بھی مجھے معاف کرے۔ میری آپ سے ایک درخواست ہے کہ مجھے ایک گولی مار کر ہلاک کردیں۔ درد کی اذیت ناقابل برداشت ہوچکی ہے اور اگر میں زندہ بچ بھی گیا تو میرا کورٹ مارشل ہوگا۔ میں آپ کو اپنا خون معاف کرتا ہوں۔'' میرے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی اسے خون کی قے آئی اور اس نے دم توڑ دیا۔

اس دوران میرے تمام ساتھی خچروں پر لدا سامان اٹھائے ہمارے پاس پہنچ چکے تھے۔ میں انہیں وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر قیصر اور نمبر ٹو کے ہمراہ درختوں کے اس جھنڈ کی طرف چل پڑا جہاں سردار اور اس کے تیر انداز چھپے ہوئے تھے۔ تیروں کی رینج میں آنے سے پہلے ہی ہم نے آگے بڑھتے ہوئے درختوں پر فائرنگ شروع کردی۔ ہماری فائرنگ اتنی شدید تھی کہ آٹھ دس گولیاں چلانے سے چار تیر اندازوں کی لاشیں نیچے آن گریں۔ ان کے ساتھ ہی دو تیر انداز جن کی رانوں پر گولیاں لگی تھیں، کود کر نیچے آن گرے اور اپنے ترکش اور کمان پرے پھینک کر تم سے جاں بخشی کی بھیک

مانگنے لگے۔ میں نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے انگریزی میں اونچی آواز میں کہا، ''سردار! تمہارا کھیل ختم ہوچکا ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم سے مکالمہ بازی کرسکیں۔ اگر بیس سیکنڈ میں تم نے نیچے آکر ہتھیار نہ ڈالے تو ہم گولیوں سے تمہیں چھلنی کر دیں گے۔'' میں نے اونچی آواز میں کاؤنٹ ڈاؤن شروع کردیا۔ ابھی آٹھ سیکنڈ ہی گنے تھے کہ مجھ پر رائفل کا فائر ہوا اور گولی میرے دائیں کندھے سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ ساتھ ہی ساتھ سردار کی رائفل گری اور ساتھ ہی وہ بڑے بے ڈھب طریقے سے نیچے گرا۔ قیصر اور نمبر ٹو نے فوراً اس پر اپنا اسلحہ تان لیا۔ سردار منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن ہم تینوں کی طرف ہاتھ باندھ کر ایسی ملتجی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ یہ میرا قیاس تھا جس کی تائید سردار نے بھی کی کہ اس نے زندگی میں پہلی بار 3MM رائفل چلائی تھی جسے اس نے تھائی پہریدار سے چھینا تھا۔ حویلی کے شاہانہ اور آرام دہ ماحول میں پرورش پانے اور سردار بننے کے بعد عیاشوں میں غرق سردار نے اس رائفل سے میرا نشانہ تو لے لیا لیکن درخت کے تنے پر بیٹھنے اور گولی چلنے کے دھچکے (Reaction) سے ناواقف ہونے کے باعث اپنا توازن اور رائفل پر اپنا کنٹرول برقرار نہ رکھ سکا۔ جس کے نتیجے میں گولی مجھے مس (Miss) کرگئی، رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ خود بھی دھڑام سے نیچے آن گرا۔

میرے نمبر ٹو نے پہلے تو دونوں تیر اندازوں کو ایک ایک گولی مار کر زندگی سے آزاد کیا۔

قیصر نے سردار کو اس کے لمبے بالوں سے پیچھے سے پکڑا اور ہم واپس اپنے قافلے سے آن ملے۔ سردار کو دیکھ کر میرے تھائی ساتھیوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور وہ اپنے پہریدار ساتھی کی المناک موت کا بدلہ لینے کو بے چین تھے۔ سردار کو قیصر نے زبردستی گھٹنوں کے بل بٹھادیا۔ وہ ابھی تک اس کے بال پکڑے ہوئے تھا۔ سردار کے سامنے ہی اس کی ماں اور چھوٹا بھائی کھڑے تھے اور سارے تھائی اس پر اپنا اسلحہ تانے ہوئے میرے اشارے کے منتظر تھے کہ اسے گولیاں مار کر اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرسکیں۔ سردار نے اس منظر کو دیکھ کر پھر ہاتھ جوڑ دیے۔ اس سے پہلے کہ تھائی اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کردیتے اس کی ماں نے بیٹے کی جان بخشی کی التجا کی۔ میں نے اپنی سب مشین گن نیچے رکھ کر اپنا پسٹل نکالا اور سردار کو مخاطب کرتے ہوئے بولا، ''ان ایک سو سے زیادہ ہلاکتوں کے صرف تم ذمہ دار ہو۔ میں تو یہاں تمہارے راجہ بننے کا شاہی فرمان لے کر اور تمہاری ماں اور بھائی کو ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا لیکن تم نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہماری راہ میں ہر طرف روڑے اٹکائے۔ تم اتنے بے غیرت ہو کہ میرے تھائی ساتھی کو ہلاک کرکے اب اسی کے ہم وطنوں کے آگے ہاتھ جوڑ رہے ہو۔ ہمارا تو تم سے کوئی رشتہ یا تعلق نہیں تھا لیکن تم تو اپنی ماں اور بھائی کو بھی بلاوجہ ہلاک کرنے کے درپے تھے۔ تم نے اپنی بیوی کو اس قدر مارا کہ وہ ایک ٹانگ سے محروم ہوگئی۔ اپنے سردار بننے کے زعم میں تم انسانیت سے اس قدر دور ہوگئے کہ ہماری ساتھی اور اپنی

مہمان کلپنا کو تم نے زبردستی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ تم عقل و دانش سے اس قدر عاری ہو کہ یہ تک نہ سمجھ سکے کہ جو لوگ سفر کی صعوبتیں اٹھا کر اور انتہائی خطرناک حالات سے گزر کر رانگاماٹی تک آئے ہیں کیا وہ تمہارے اشارے پر بلاچوں چرا اپنے اپنے سینے کھول کر رکھ دیں گے کہ تمہارے تیر اندازوں کے تیروں کا نشانہ بن سکیں۔ میں تمہیں ہلاک کرکے اپنے ساتھی کی موت کا انتقام لے سکتا ہوں لیکن تمہارے مرنے سے میرا انتقام پورا نہ ہوگا۔ میں تمہیں زندہ رہنے دوں گا لیکن اس صورت میں کہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک تمہیں میرے انتقام کی یاد آتی رہے گی اور تم اسے کبھی فراموش نہ کرسکو گے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے قیصر کو کہا کہ اسے کھڑا کرو۔ قیصر نے جھٹکے سے اس کے بال کھینچے اور وہ کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس کے دائیں گھٹنے کے جوڑ پر تین فائر کیے۔ ان گولیوں سے اس کی ٹانگ کی ہڈی اور گھٹنے کی چپنی (Stepnie) یقیناً چکنا چور ہوگئی ہوں گی۔ میں نے تھائیوں کو کہا کہ اپنے ہتھیار نیچے کرلیں۔ سردار درد کے مارے چیخیں مار رہا تھا۔ میں نے اسے کہا، ''اگر تم میں غیرت ہے تو اپنے خنجر سے خودکشی کرلو ورنہ اس راستے سے گزرنے والوں کا انتظار کرو۔ کوئی نہ کوئی بھلا مانس تمہیں رانگاماٹی تک پہنچادے گا۔'' سردار کی ماں اپنے سردار بیٹے سے میری ہونے گفتگو سن رہی تھی۔ میں نے قافلے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ خچروں پر بندھا سامان میرے سب ساتھیوں نے بانٹ کر اٹھا لیا تھا۔ رانی اور اس کے بیٹے کو بھی اب پیدل ہی ہمارے ساتھ چلنا تھا۔ چلتے وقت رانی یکلخت زخمی سردار بیٹے کی طرف بڑھی اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔ یہ سردار کے کرتوتوں کا پھل تھا جو سردار بیٹے کو اپنی رانی ماں سے ملا۔ ہمارا قافلہ روانہ ہوا تو مزید پانچ رائفلیں اور ایمونیشن ہمارے ساتھ تھا جو سردار اور JCO اور اس کے ساتھیوں سے ہمیں ملیں۔ رات کے نو بجے ہم دریائی گاؤں میں پہنچے۔ رضی نے گاؤں کے سربراہ کو ہماری آمد کے متعلق بتایا۔ رضی کو میں نے سختی سے منع کردیا تھا کہ رانی اور بیٹے کی اصلیت سربراہ یا کسی اور پر ظاہر نہ ہو۔ لیکن سربراہ نے رانی کو دیکھتے ہی پہچان لیا کیونکہ وہ راجہ تری دیو کے دور میں کئی بار رانگاماٹی کی شاہی تقریبات میں شرکت کرچکا تھا۔ اس نے اپنی ہمت اور وسائل سے بڑھ کر ہماری میزبانی کی۔ اپنے گھر کے اور اردگرد بنے کئی مکان اس نے فوری خالی کروائے اور ہمیں ان میں ٹھہرایا۔ رانی، اس کے بیٹے، کلپنا اور رضی کی بیوی کو اس نے اپنے گھر میں سب سے آرام دہ کمرے دیے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی چکمہ قبیلے کی رانی اور راجے کا بیٹا اس کے مہمان بنیں گے۔ ہم گزشتہ رات بھر جاگتے رہے تھے اور آج صبح سے جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آیا تھا اور اس کے علاوہ یہاں تک کے سفر نے ہمیں بالکل نڈھال کردیا تھا۔ کھانا کھا کر ہم جو لمبی تان کر سوئے تو دوسرے روز دوپہر تک سوتے ہی رہے۔

قارئین گرامی! آپ نے ''جانباز'' کے گزشتہ اوراق میں ہمارے رانگاماٹی سے واپسی کے آغاز سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات پڑھ چکے ہیں۔ یہیں پر ''جانباز'' کا ایک حصہ ختم ہوجاتا

ہے۔ لیکن ہماری مشکلات، دشواریاں، اپنوں کی غداریاں، دشمنوں کی ریشہ دوانیاں اور نادیدہ قوتوں کے حصار میں گھر جانے کے واقعات ختم نہیں ہوئے بلکہ ان میں خاصا اضافہ ہوگیا۔ ان تمام گزشتہ اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کو تحریر کرتے وقت میری ذہنی اور جسمانی حالت پر جتنا دباؤ پڑا ہے اسے میں ہی جانتا ہوں۔ آتشی شیشے سے سورج کی شعاعوں کو کسی کپڑے یا کاغذ پر ایک نقطے کی صورت میں مرتکز کرنے سے جیسے وہ کاغذ یا کپڑا جل اٹھتا ہے، ان بیتے ہوئے واقعات کو سمیٹتے ہوئے میری حالت بالکل ویسی ہی ہوچکی ہے۔ رات کو سوتے ہوئے میں کئی بار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ میری رفیقۂ حیات نے بھی متعدد بار مجھے بتایا ہے کہ سوتے ہوئے میں اکثر بڑبڑاتا ہوں اور میرے بے ربط الفاظ میں اکثر جادوگرنی، جواہرات، نحوست اور خون کے لفظ وہ سمجھ سکی ہے۔ اس داستان کو تحریر کرتے وقت میں خود کو دوبارہ انہی حالات میں گھرا محسوس کرتا ہوں جن کا خیال آنے سے ہی جسم میں جھرجھری آتی اور دماغ پھٹنے لگتا ہے۔

میرا جی چاہتا ہے کہ ''جانباز'' کو آگے بڑھانے سے پہلے آپ سے اپنے ملک کے موجودہ حالات کے حوالے سے چند باتیں کرلوں۔ ملک کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے کوئی ذی ہوش خاموش نہیں رہ سکتا۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہمارے ملک کے عوام اپنی سادہ لوحی کے باعث اپنے حکمرانوں کے ملک و ملت کی بھلائی کے جھوٹے وعدوں کے پیچھے چھپے مکروہ عزائم سے بے خبر ان کی ہر بات پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے قربانیوں پر قربانیاں دیتے چلے آئے ہیں۔ امریکہ بہادر نے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے یہودی عزائم کو پورا کرنے کے لیے دنیا بھر کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کررکھا ہے۔ وہ مشرق وسطیٰ کے تیل سے مالامال مسلم ممالک پر عراق کے حملے کا خوف بٹھا کر دونوں ہاتھوں سے نہ صرف ان کی دولت لوٹ رہا ہے بلکہ اپنے ناکارہ اور پرانے جنگی ہتھیار بہت مہنگے داموں انہیں بیچ رہا ہے بلکہ اسی ''جھوٹے خوف'' کو وجہ بنا کر اپنی بری، بحری اور فضائی فوج بھی ان ملکوں میں تعینات کر رکھی ہے جن کے تمام اخراجات یہ مسلم ممالک برداشت کر رہے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکستان ایٹمی قوت بن چکا ہے جس پر تمام مسلم ممالک کو فخر اور غیر مسلم ممالک کو تشویش ہے۔ دنیا میں بہت سے ممالک ایٹمی ہتھیار بنا چکے ہیں یا بنا رہے ہیں جن میں امریکہ، روس، چین، برطانیہ، فرانس، اسرائیل، شمالی کوریا اور کئی ایک روسی چنگل سے آزاد شدہ ریاستیں اور بھارت شامل ہیں لیکن پاکستان اور بھارت میں مشترکہ سرحدوں اور مسئلۂ کشمیر کے باعث جنگ ہونے اور ایٹمی ہتھیار استعمال ہونے کا خطرہ ہے۔ بھارت فطرتاً ایک ڈرپوک ملک ہے۔ گیدڑ بھبھکیاں تو بہت دیتا ہے لیکن اس میں پاکستان سے اکیلے لڑنے کی جرأت نہیں اس لیے اس نے اسرائیل کو اپنا ہمنوا بنا لیا ہے۔ اسرائیل اپنے وجود کے پہلے دن سے ہی ان ممالک کے خلاف حالت

جنگ میں ہے جن کی سرحدیں اس سے ملتی ہیں یا قریب ہیں اور یا جنہوں نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ اسرائیل بے شک چھوٹا ملک سہی لیکن اس کا ہر مرد اور عورت جنگی تربیت حاصل کرچکا ہے۔ بھارت سے Shake Hand کے بعد اسرائیل نے بھارت کے ایما پر سیاحوں کے روپ میں اپنے کمانڈوز مقبوضہ کشمیر میں بھیجے تھے جو ہمارے کہوٹہ کے ایٹمی پلانٹ سے صرف چھ سات کلومیٹر دُوری پر پکڑے گئے۔ آج کل پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنے کی سازش میں بھارت اور اسرائیل شامل ہیں اور ان کو امریکہ اور برطانیہ کی آشیرباد بھی مل چکی ہے اور بھارت نے پاکستانی سرحدوں کے قریب اپنے ہوائی اڈے بھی اسرائیلی طیاروں خصوصاً F-16E کو جو پاکستان کے F-16 سے بدرجہا بہتر اور Up-Graded ہیں اور جن میں حملہ کرنے کے علاقے میں سیکڑوں میل کے دائرے میں مواصلاتی نظام کو جام کرنے کی صلاحیت بھی ہے استعمال کرنے کی اجازت بھی دے رکھی ہے۔ اسی اسرائیل کی شہ پر بھارت کی کشمیر کی کنٹرول لائن کے علاوہ پاکستانی کی بین الاقوامی سرحد پر بلاجواز فائرنگ اور مداخلت میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ حالیہ فوجی حکومت کے آنے سے قبل باون سال سے ملکی لٹیرے سیاست دانوں اور حکمرانوں کے ظلم وستم اور ملکی دولت کو لوٹنے والوں کے احتساب اور ملکی دولت کے واپس آنے کی امید نے عوام کے مردہ جسموں میں زندگی کی جو لہر دوڑا دی تھی اسے اس حکومت کی سست روی پھر سے مایوسی میں بدل رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نوکر شاہی اپنی گہری جڑوں کے باعث اس فوجی حکومت کو بھی بے بس کرنے کے درپے ہے۔ ایک طرف یہ مردار خور حکمران اپنے ضمیر فروش وکلا کے ذریعے اپنے خلاف مقدمات کو بلاجواز طول دے رہے ہیں اور دوسری طرف امریکہ اور اس کے مغربی حواری ہمارے اندرونی معاملات میں اس قدر دخل دے رہے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک پر ان کی حکمرانی ہے۔ ہمارے صدر اور چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف فور سٹار جنرل ہیں۔ انہیں اگر یقین ہے کہ جن حکمرانوں کا انہوں نے تختہ الٹ کر انہیں پابند زنداں کیا ہے، وہ واقعی ملکی غدار اور لٹیرے ہیں تو انہیں فوجی عدالتوں کے ذریعے سزا دے کر کیفر کردار تک کیوں نہیں پہنچاتے!؟ اگر ایک فوجی کا کسی غلطی یا ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے پر کورٹ مارشل ہوسکتا ہے اور کسی فوجی کو میدان جنگ سے بھاگنے پر سزائے موت ملتی ہے تو ان لٹیروں حکمرانوں کو جنہوں نے پورے ملک کو بیچ کھایا اور ملکی سالمیت کو انتہائی خطرے میں ڈال دیا تھا، ان کے بھی فوجی عدالتوں کے ذریعے فوری فیصلہ کیوں نہیں کیے جاتے؟ اگر جنرل صاحب کے ذہن میں امریکہ، جاپان اور مغربی ممالک کا دباؤ ہے تو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دباؤ چند افراد کو معزول کرنے اور حراست میں لینے کے لیے نہیں بلکہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ہے۔ ان ممالک کو ان کے جائز مفادات کے تحفظ کی یقین دہانی کرادی جائے تو ان کا دباؤ بھی ختم ہوجائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چین، ایران، عراق، لیبیا، کیوبا اور شمالی کوریا کی طرح امریکہ اور اس کے

حواری ممالک سے ناطہ توڑ دیا جائے۔ ہم ورلڈ بنک اور IMF کو ان سے لیے گئے قرض سے کئی گنا زیادہ سود ادا کر چکے ہیں۔ ان سے ناطہ توڑ کر اور قرض کی ادائیگی روک کر بھی ہم زندہ رہ سکیں گے۔ آخر ایران، لیبیا، شمالی کوریا، عراق اور سب سے بڑھ کر چین بھی ان سود خور مہاجنوں کی ''امداد'' کے بغیر زندہ ہیں اور ہم سے بدرجہا بہتر، باعزت اور خود مختاری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان مہاجن سود خود ممالک کے ''بھرپور تعاون'' کے باوجود ہمارے ملک کے اسّی فیصد عوام زندگی کی بنیادی سہولتوں سے بھی محروم ہیں۔ ان کے ''غیرمحسوس'' تعاون کے بغیر بھی ہم مرنہیں جائیں گے۔ باقی رہا ان کے بغیر بھارت کے ہم پر حملہ کرنے کا خدشہ تو یقین جانیے، بھارتی ہندو کی دھوتی پاکستان کے ایٹم بم کا نام سنتے ہی خراب ہوجاتی ہے۔ بس اپنی ایٹمی تنصیبات کو محفوظ رکھیں۔ بھارت ہمیشہ کوسوں دور سے ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجا بجا کر ہمیں ستاتا رہے گا لیکن اسے ہمارے قریب آنے کی کبھی جرأت نہ ہوگی۔ ہم تو ''بحرظلمات میں گھوڑے دوڑانے'' والے ہیں۔ یہ دھوتی پرشاد ہمارے مقابل کہاں آسکتے ہیں!؟

نواں باب

گاؤں کے سربراہ نے ہماری میزبانی اور خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے دوران اس نے بتایا کہ اس کے گاؤں کے چند لوگ راستے میں زخمی پڑے چکمہ سردار کو رانگاماٹی چھوڑ آئے ہیں۔ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے گاؤں واپس پہنچے ہیں اور انھوں نے بتایا ہے کہ راستے میں انھوں نے دو سو سے زیادہ زخمی اور مردہ چکمہ لڑاکے جوانوں کو بھی دیکھا تھا جس کی اطلاع انھوں نے ان کے قبیلے والوں کو دی اور قبیلے والے لاشیں اور زخمیوں کو اٹھانے اسی وقت روانہ ہوگئے۔ رانی اور اس کے لڑکے کی اس کے گاؤں میں مسلح غیرملکیوں کے ہمراہ آمد، سردار کے زخمی ہونے اور اتنی بڑی تعداد میں لڑاکوں کے زخمی اور ہلاک ہونے سے سربراہ معاملے کی تہہ تک یقیناً پہنچ چکا تھا لیکن نہ اس نے ہمیں کریدنے کی کوشش کی اور نہ ہی ہم نے اسے کچھ بتایا۔ ویسے اس کے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے اپنے آدمیوں سے بار بار ہمیں لے جانے والی کشتیوں کے بارے میں پوچھنے سے صاف عیاں تھا کہ وہ ہمارے جلد از جلد اپنے گاؤں سے جانے کا خواہش مند ہے۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے نکل جائیں۔ ہمیں چکمہ قبیلے کے ہم سے انتقام لینے کی تو کوئی فکر نہ تھی کیونکہ ان کے آدھے سے زیادہ جنگجو ہمارے ہاتھوں ہلاک اور زخمی ہوچکے تھے اور ان میں اب ہمیں للکارنے کی سکت باقی نہ تھی۔ ہمیں صرف بنگلہ دیشی فوج کا خطرہ تھا۔ اپنے تین فوجیوں کی گولیوں سے ہلاکت پر وہ خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ چکمہ قبیلے والے ہم سے انتقام لینے کے لیے فوج سے رابطہ کرکے انھیں اگر مقابلے کی جگہ تک لے آئے تو پھر ان فوجیوں کا ہماری تلاش میں اس گاؤں تک آنا یقینی تھا۔ اس لیے ان کی آمد سے پہلے ہی ہمارا یہاں سے رخصت ہونا ہماری سلامتی کے لیے لازمی تھا۔ شام پانچ بجے کے قریب کشتیوں کی آمد کی اطلاع ملی اور ہم بھاگم بھاگ تینوں کشتیوں

میں سوار ہوگئے۔ سربراہ نے رانی اور اس کے لڑکے کے لیے کشتی میں بیٹھنے کے لیے دو کرسیاں بھی بھیج دیں۔ ہمیں رخصت کرتے ہوئے سربراہ نے رضی کی وساطت سے مجھے کہلوایا کہ وہ رانی اور لڑکے کے ہمراہ ہماری یہاں اچانک آمد کی وجہ جان چکا ہے اور ہمیں یقین دلاتا ہے کہ وہ یا اس کے گاؤں والے کسی کو بھی ہمارے یہاں رات گزارنے اور چٹاگانگ جانے کا نہیں بتائیں گے۔ راجہ تری دیو کے اس پر کئی احسان ہیں اور وہ کسی حالت میں بھی ہمارے متعلق ایک لفظ تک زبان پر نہ لائے گا۔

فروختگی کے سامان سے لدی تینوں کشتیوں (یہ بادبانی نہیں بلکہ انجن سے چلنے والی بڑی اور چپٹے عرشے والی کشتیاں تھیں) رام اور سیتا نامی دو پہاڑوں کے بیچ تیز رفتار جھاگ اڑاتے اور بل کھاتے کرنافلی دریا میں چٹاگانگ کے لیے روانہ ہوئیں۔ دریا کے تیز بہاؤ میں رفتار اور کنٹرول بے قابو ہونے کی وجہ سے کشتیوں کے پیچھے الٹے چل رہے تھے۔ تین گھنٹے تک تیز بہاؤ سے لڑتے اور پہاڑی گزرگاہ میں بل کھاتے دریا میں کشتیوں کو کنٹرول کرتے گزر گئے۔ میں اور میرے ساتھی کشتیوں پر لدے سامان کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ رضی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی جگہ سے اٹھتا اور ہمیں بتاتا کہ اب کتنا سفر باقی رہ گیا ہے۔ سب سے اگلی کشتی میں قیصر اپنے آدھے ساتھیوں اور آدھے تھائیوں کے ساتھ تھا۔ درمیان والی کشتی میں راجے کا لڑکا، رانی، کلپنا، رضی اور رضی کی بیوی، میں اور میرا نمبر ٹو تھا اور آخری کشتی میں قیصر کے باقی ساتھی اور تھائی تھے۔ ہمارے پروگرام کے مطابق ہماری کشتیوں کو چٹاگانگ میں کشتیوں کے گھاٹ پر ہمیں اتارنا تھا جو نارائن گنج میں تھا۔ میں چٹاگانگ آخری بار سن 65ء کی پاک بھارت جنگ کے فوری بعد گیا تھا۔ اس وقت یہ مشرقی پاکستان یعنی میرا ملک تھا اور اسی جگہ اب میں چوری چھپے جا رہا تھے۔ چند غداروں کی غداری کے باعث دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان دولخت ہوچکی تھی اور اب اپنے ہی ملک کے اس حصے میں داخلے کے لیے پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت تھی۔ چٹاگانگ میں قیام کے دوران کئی مشرقی پاکستانی میرے گہرے دوست بن چکے تھے۔ جن میں شاہجہاں ہوٹل کا مالک بھی تھا۔ رات کے اندھیرے میں ٹمٹماتی روشنیوں میں ہم چٹاگانگ میں گھاٹ پر اترے۔ رضی زور دے رہا تھا کہ اس کے یہاں کئی جاننے والے ہیں اس لیے ان کے ہاں جا کر ٹھہریں۔ لیکن میں نے اس کی تجویز رد کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ ہم پہلے اصفہانی کالونی میں جائیں گے۔

میں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اصفہانی ٹی کمپنی چٹاگانگ میں کیا تھا اور پاکستان میں میری تازہ ترین معلومات کے مطابق اس کمپنی کے مالکان بنگلہ دیش بننے کے بعد بھی چٹاگانگ اور ڈھاکے میں اپنا کاروبار جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس کمپنی میں میرے سینئر اور مجھے کام سکھانے والے محمود شیرازی تھے۔ ان کا تو انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کی ایک قریبی عزیزہ تارا باجی مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتیں اور مشفقانہ برتاؤ کرتی تھیں۔ وہ کمپنی کے مالکان کی بھی نزدیکی رشتہ دار تھیں۔ گھاٹ سے ہم سب سائیکل رکشاؤں میں بیٹھے اور اصفہانی کالونی کی طرف روانہ ہوئے۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ ہم تارا باجی کی

وساطت سے چٹاگانگ میں سارا وقت یا تو اصفہانی کالونی کے گیسٹ ہاؤس میں گزاریں گے اور اگر یہ ممکن یہ ہوا تو کم از کم کوئی متبادل اور محفوظ جگہ ملنے تک یہاں قیام کریں۔ ہم اصفہانی کالونی پہنچے۔ تارا باجی مجھے اچانک دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ یہ جنتی خاتون اس وقت پچپن برس کی ہوں گی انھوں نے اسی وقت دو تین فون کیے اور گیسٹ ہاؤس کے چار کمرے ہمیں لے دیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تارا باجی نے اسی وقت اپنی خادمہ کو جو انھی کے فلیٹ میں رہتی تھی، جگایا اور اپنے گھر کے علاوہ ہمسایوں سے انڈے اور ڈبل روٹی منگوا کر ہم سب کے لیے آملیٹ، ٹوسٹ اور چائے بنوائی۔ تارا باجی غیر شادی شدہ اور مذہب کی بے حد پابند تھیں۔ میں نے انھیں مختصراً یہاں بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے آنے اور چکمہ کی رانی اور اس کے بیٹے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق بتایا۔ انھوں نے مادرانہ شفقت کے ساتھ مجھے سختی سے منع کیا کہ میں اشد ضرورت کے بغیر شہر میں نہ جاؤں کیونکہ بنگلہ دیشی ابھی تک مغربی پاکستانیوں کے خون کے پیاسے ہیں اور اگر مجھے مجبوراً باہر جانا پڑے تو خود کو بھارتی شہری کہوں۔ انھوں نے مجھے کہا کہ وہ ڈھاکہ میں صدری اصفہانی جو کمپنی کے چیئرمین ہیں کو فون کر کے یہاں کے انچارج کے ذریعے ہمارے لیے ایک چھوٹے سٹیمر کا بندوبست کرنے کی بات کریں گی جو ہمیں کھلنا لے جائے۔ میں نے انھیں کہا کہ کوشش کریں کہ ہماری یہاں آمد کا کسی بھی غیر متعلقہ یا ناقابل بھروسہ شخص کو علم نہ ہوسکے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی کہہ دیا کہ بلاوجہ کالونی سے باہر نہ نکلیں۔ میں نے رانی اور اپنے ہمراہ دوسری خواتین کا تارا باجی سے تعارف کروایا۔ مزید ایک دن اور رات تو ہم نے کالونی میں ہی گزارے لیکن میری سیماب صفت طبیعت اس پابندی کو قبول نہ کرسکی۔ مجھے مشرقی پاکستان سے قلبی لگاؤ تھا اور میں اس سرزمین کو جو کبھی ہماری تھی اور جسے ہم نے علیحدگی سے بچانے کے لیے لاکھوں انسانوں کے خون سے آبیاری کی تھی، دیکھے بغیر کیسے واپس جاسکتا تھا۔ میں نے تارا باجی کو بتایا کہ میں دو روز کے لیے ڈھاکہ جا رہا ہوں۔ ان کے بے حد منع کرنے کے باوجود میں اپنی ضد پر اڑا رہا اور بالآخر تیسری صبح قیصر کو ہمراہ لے کر میں شہر کی جانب نکلا۔ ہمارے سائیڈ آرمز ہمارے ساتھ تھے۔ میں نے قیصر کو شاہجہاں ہوٹل، مسکا ہوٹل، چٹاگانگ ریسٹ ہاؤس (جہاں میں نے ملازمت کے دوران خاصا عرصہ قیام کیا تھا اور جسے سن 71ء میں 25 مارچ سے پہلے اور سقوط ڈھاکہ کے بعد چٹاگانگ میں غیر بنگالیوں کی مرکزی مقتل گاہ بنا دیا گیا تھا) آگرہ آباد روڈ میں اپنا دفتر، جم خانہ کلب، ٹائیگر پاس وغیرہ دکھائے اور شام چار بجے کی فلائیٹ سے ہم ہندوانے ناموں اور بھارتی CBI کے افسر ہونے کا کہہ کر ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ میں نے اپنا اور قیصر کا اسلحہ پائلٹ کے حوالے کیا جو ہمیں ڈھاکہ ایئرپورٹ پر لوٹا دیا گیا۔ پٹنگا ایئرپورٹ سے جہاز نے ٹیک آف کیا۔ یہ فوکر فرینڈ شپ یعنی F-28 جہاز تھا۔ ڈھائی گھنٹے کے اندر ہم ڈھاکہ انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر جا اترے۔ بھارت نے اس دور میں بنگلہ دیش میں اپنے قدم اتنے مضبوطی سے جمائے ہوئے تھے کہ ہم سے چٹاگانگ ایئرپورٹ کے متعلقہ افسران نے بھی ہمارے پاسپورٹ طلب نہیں کیے۔ ڈھاکہ

ایئرپورٹ سے ہم نے ٹیکسی لی اور سیدھے بے بی آئس کریم میں فرید خان سے ملنے گئے لیکن وہاں جاکے معلوم ہوا کہ وہ بمبئی گیا ہوا ہے۔ میں نے وہیں اس کے ملازموں سے ہارون کا ایڈریس لیا۔ ہارون کئی بنگالی اردو فلموں میں ہیرو آچکا تھا اور ایک اوسط درجے کا صنعت کار بھی تھا۔ ہم ڈھاکہ چھاؤنی میں اس کے گھر گئے۔ ہارون میرا اور فرید کا مشترکہ دوست تھا۔ اس نے مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھا تو بے اختیار آگے بڑھ کر گلے لگایا اور ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھی تو اس نے بتایا کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد اس کی تمام انڈسٹری ضبط کرکے اسے نظر بند کردیا گیا تھا۔ جب حالات کچھ نارمل ہوئے تو جنرل ارشاد کی وجہ سے جو اس کا دوست تھا، اس کی انڈسٹری اسے واپس کردی گئی اور بنگلہ دیش کی شہریت بھی مل گئی۔ میرے متعلق جب اس نے پوچھا تو میں نے اسے گول مول جواب دیا اور کہا کہ چند روز کے لیے ایک ضروری کام سے ڈھاکہ آیا ہوں۔ میرے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں بنگلہ دیش میں بغیر پاسپورٹ کے اور کسی مہم پر آیا ہوں۔ وہ صنعت کار تھا اور بنگلہ دیشی شہری تھا۔ اپنی وجہ سے میں اسے کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ میرا دوست تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہم آج شام ہی چٹاگانگ سے ڈھاکہ پہنچے ہیں اور ہمیشہ کی طرح ڈھاکہ میں میرا قیام شاد باغ ہوٹل سے ملحقہ نواب آف ڈھاکہ حبیب اللہ کے گرین ہوٹل میں ہوگا تو وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگا اور بولا، ''گرین ہوٹل تو سقوط ڈھاکہ کے بعد ہی بند ہوگیا تھا اور نواب ڈھاکہ کا انتقال ہوچکا ہے۔'' میں نے اسے کہا کہ میں ایئرپورٹ سے سیدھا بے بی آئس کریم اور وہاں سے تمھارے پاس آیا ہوں اور مجھے گرین ہوٹل کے بند ہونے کا علم نہیں۔ ہارون ہم پاکستانیوں (وہ قیصر کو بھی پاکستانی سمجھتا تھا) کو ڈھاکہ چھاؤنی میں اپنی کوٹھی میں ٹھہرانے سے پس و پیش میں مبتلا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں ایم اے خان جونیئر سے ملنا چاہتا ہوں۔ (ایم اے خان جونیئر اور سنیئر دونوں سگے بھائی اور پاکستان فلم انڈسٹری کے ستون سمجھے جاتے تھے اور دونوں میرے گہرے دوت تھے۔ جونیئر ایک فلم ایکٹریس (غالباً کلاوتی) سے شادی کرکے مشرقی پاکستان اور پھر بنگلہ دیش میں ہی رہنے لگا اور وہاں بھی کئی فلمیں پروڈیوس کیں) نواب پور روڈ پر اس کا دفتر تھا۔ ہارون کے ساتھ ڈنر کرکے اور اگلے روز ملنے کا وعدہ کرکے ہم پھر شہر میں آگئے اور موتی جھیل کے ایک ہوٹل (نام یاد نہیں آرہا) میں دو کمرے لیے۔ ایم اے خان جونیئر اور دوسرے دوستوں سے ملنے کا پروگرام اگلے روز پر رکھ کر ہم جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

دوسرے روز گیارہ بجے میں اور قیصر نواب پور روڈ پر ایم اے خان جونیئر سے ملنے گئے۔ لاہور میں میکلوڈ روڈ پر رتن سینما کے تقریباً بالمقابل سینئر اور جونیئر خانوں کا عالیشان دفتر تھا اور ان سے ملنے والوں کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ گھنٹوں انتظار گاہ میں بیٹھنے کے بعد ملاقات کا موقع ملتا تھا۔ مغلیہ دور کے مشہور بادشاہ گروں (King Makers) کی طرح لاہور کی فلم انڈسٹری میں ڈائریکٹروں، پروڈیوسروں اور

آرٹسٹوں کو اوپر پہنچانے اور نیچے گرانے میں ان بھائیوں کا خاص مقام تھا اور سبھی انھیں اپنی خوشامد اور جی حضوری سے خوش کرکے اپنا الو سیدھا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ وہی ایم اے خان جونیئر ایک تیسرے درجے کی ایکٹریس کے عشق میں اپنی ساری شان و شوکت چھوڑ کر اب نواب پور روڈ ڈھاکہ میں ایک بوسیدہ عمارت کی تیسری منزل پر تین کمروں کے ایک معمولی فلیٹ میں رہتا تھا۔ اسی فلیٹ کے ایک کمرے میں جسے اس نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا، ہماری ملاقات ہوئی۔ ساون کے اندھے کو ہر سو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ مجھے مل کر وہ یہی سمجھا کہ میں بھی کوئی فلم وغیرہ بنانے کے چکر میں ڈھاکہ آیا ہوں۔ اس سے پہلے ہی کہ اسے اعتماد میں لے کر میں اپنے یہاں آنے کا مقصد بیان کروں، اس نے اپنے پاس رکھی کئی باکس آفس ہٹ کہانیوں کا ذکر شروع کردیا اور تان یہاں پر توڑی کہ بہت تھوڑے سرمائے سے وہ ایسی فلم بناسکتا ہے جو اتنی کامیاب ہوگی کہ سینماؤں سے اسے پولیس ہی اُتار سکے گی۔ اس کی اس گفتگو سے مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ اسے روپے کی اشد ضرورت ہے اور اگر اسے میرے بنگلہ دیش آنے کا اصل مقصد کا پتہ چل گیا تو اس سے یہ بھی بعید نہیں کہ متعلقہ حکام کو ہمارے بارے میں اطلاع دے کر انعام حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ قیصر تو اس ملاقات کے دوران بالکل خاموش رہا اور میں آدھ گھنٹے میں جلد ہی دوبارہ ملنے اور فلم کی بات کو آگے بڑھانے کا وعدہ کرکے اس سے رخصت ہوا۔ نواب پور روڈ کے آغاز میں گلستان سینما کے بالکل قریب پاکستان کی اس وقت کی سپرسٹار شبنم کے شوہر رابن گھوش کے بھائی بادل گھوش کا دفتر تھا۔ یہ کرسچین فیملی تھی اور میں بادل گھوش سے سن 65ء کی پاک بھارت جنگ کے فوری بعد ڈھاکہ کلب میں کئی بار مل چکا تھا اور میری اس سے خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ بادل گھوش کے دفتر میں اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے میں نے اچانک کچھ یاد آجانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اسے کہا کہ مجھے فوری طور پر پاکستان فون کرنا ہے اس لیے میں اجازت چاہتا ہوں تاکہ سنٹرل ٹیلی فون آفس جاکر فون کرسکوں۔ بادل کے دفتر میں کئی ٹیلی فون تھے۔ اس نے مجھے اپنے ٹیلی فون کو استعمال کرنے کی آفر کی۔ ان دنوں بین الاقوامی کالوں کے لیے ڈائریکٹ ڈائلنگ شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے اسلام آباد اور راولپنڈی کے دو نمبر دیے۔ ایک راجہ تری دیو کا اور دوسرا اپنے دوست راجہ سرفراز DSP کا جو بھٹو صاحب کا سرکاری باڈی گارڈ اور سیکیورٹی کا انچارج تھا۔ بادل گھوش کے تجارتی کاروبار کے باعث اس نے آپریٹر سے Lightning Call کے ذریعے بیس منٹ میں ہی راجہ تری دیو کے دفتر سے کال ملا دی۔ میں نے راجہ کو مختصراً اور ''محفوظ'' الفاظ میں بتایا کہ کام ہوگیا ہے اور ''سارا سامان'' اس وقت چٹاگانگ میں ہے لیکن ''پارٹنر'' پہلے کھلنا جانا اور کسی رفیق الاسلام سے ملنا چاہتا ہے۔ ٹیلی فون پر راجے کی آواز سے ہی مجھے محسوس ہوگیا کہ رفیق الاسلام اور کھلنا کا سن کر اس کی تیوری پر بل پڑ گئے ہوں گے۔ وہ کہنے لگا، ''پارٹنر کو کھلنا جانے سے روکنے کے لیے بیشک اسے ختم کردو اور چھوٹے پارٹنر اور ''کارگو'' کے ساتھ واپس لوٹ آؤ۔'' میں راجے کا

مقصد سمجھ چکا تھا اس لیے اسے جواب دیا، ''آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے بھی کھلنا ہی بہتر رہے گا ویسے میں پوری کوشش کروں گا کہ کھلنا میں رفیق الاسلام سے ملے بغیر ہی پاکستان آجائیں۔ آپ ایک مہربانی کریں کہ بنکاک میں ہمارے سفیر کو کہہ دیں کہ میرے اور میرے ہمراہیوں کے لیے یک طرفہ پاسپورٹ ہمارے وہاں پہنچنے پر بنوا دے۔ میرے ساتھ کچھ اور ساتھی بھی پاکستان آنا چاہتے ہیں لہٰذا ان کے پاسپورٹ بننے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔'' راجہ نے اطمینان کے لیے دوبارہ پوچھا۔ ''کیا سارا کارگو (یعنی جواہرات) محفوظ ہے۔'' میرے ہاں کہنے پر اس نے بنکاک سفارت خانے سے پاسپورٹ بنوانے کا وعدہ کرکے فون بند کردیا۔ میں نے اسے جان بوجھ کر اس کے سردار لڑکے کے ہمارے ساتھ لڑائی میں زخمی ہونے کی بات اس لیے نہیں کی کہ شفقت پدری کے باعث راجہ مجھ سے بے رخی اور سختی سے بات نہ کرے۔ کیونکہ اتنی مشکلات اور مصیبتوں سے گزر کر اور سینکڑوں انسانوں کی ہلاکت اور کئی بار موت کے منہ سے گزرنے کے بعد میری اپنی حالت ایسی تھی کہ مجھ میں ذرا سی تنقید بھی برداشت کرنے کی قوت نہ تھی۔ اگر راجہ تری دیو مجھ سے سختی سے بات کرتا تو میں اسے تو کیا اس کے بڑوں کو بھی خاطر میں نہ لاتا لہٰذا میں نے اس کے بیٹے سے لڑائی کی بات کو گول کردیا۔ اس سے بات کرنے کے فوری بعد آپریٹر نے راجہ سرفراز خان سے میری کال ملوائی۔ راجہ سرفراز کو جب میں نے بتایا کہ میں ڈھاکہ سے بول رہا ہوں تو اس نے بین السطور (Between the Lines) مجھے بتایا کہ یہاں حزب اختلاف کے گٹھ جوڑ سے ''نو ستاروں'' کا متحدہ محاذ وجود میں آچکا ہے۔ امریکہ بھی موجودہ حکومت کے خلاف ہے اور امریکی وزیر خارجہ (Secretary of State) ہنری کسنجر وزیراعظم بھٹو کو ایٹمی پلانٹ کی تعمیر بند نہ کرنے کی وجہ سے عبرتناک انجام کی دھمکی دے کر گیا ہے اور حکومت ملکی اور غیر ملکی مخالفت کے باعث بڑی مشکل میں بلکہ ڈانواں ڈول ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم جلد از جلد واپس آجاؤ۔ میں نے راجہ سرفراز کو اپنے گاؤں کا ایڈریس بتا کر کہا کہ میری والدہ کو فوری خط لکھ کر بتائے کہ میں خیریت سے ہوں اور انشاء اللہ جلد ہی واپس پہنچ جاؤں گا۔ قارئین! یہ سن 77ء کا آغاز تھا اور اسی سال کے آخر میں بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر مارشل لا نافذ کردیا گیا۔ میں ابھی بادل گھوش کے دفتر میں ہی بیٹھا تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ فون سنتے ہی اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔ فون پر بات ختم کرکے اس نے مجھے بتایا کہ یہاں کی انٹیلی جنس بیورو (IB) والوں کا فون تھا اور وہ پوچھ رہے تھے کہ اُس کے دفتر سے پاکستان میں دونوں فون ایک وفاقی وزیر کو اور دوسرا وزیراعظم ہاؤس میں کیے گئے تھے۔ وہ دونوں فون کالز کی وجہ جاننا چاہتے تھے۔ بادل گھوش نے کہا کہ IB والوں کو تو میں کچھ دے دلا کر خاموش کردوں گا۔ لیکن تم اب میرے دفتر سے چلے جاؤ کیونکہ تمھارا ان سے کہیں ٹاکرہ نہ ہوجائے، وہ آنے ہی والے ہیں۔

بادل گھوش سے رخصت ہوکر میں اور قیصر رمنا گرین میں اصفہانی کے چیئرمین صدری اصفہانی کے گھر گئے، وہاں سے معلوم ہوا کہ ان کا نیا دفتر موتی جھیل میں ہے۔ دفتر میں صدری کے علاوہ ''بڑے

صاحب'' مرزا احمد اصفہانی سے بھی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہی مجھے اپنی کمپنی میں ملازم رکھا تھا اور مجھ سے بڑا مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔ صدری بھی چٹاگانگ میں میری ملازمت کے دوران مجھ سے بہت خوش تھے اور میری اکثر ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔ ان کو جب میں نے کھلنا جانے کے لیے اپنی پرابلم بتائی تو بڑے صاحب کے کہنے پر صدری نے چٹاگانگ میں اپنے دفتر میں فون کرکے وہاں کے انچارج کو کہا کہ ہمارا جو اسٹیمر چائے اور دوسرا سامان لے کر کھلنا جانے والا ہے اس پر ہمارے بیس مہمان بھی جائیں گے، لہٰذا اسٹیمر پر ان کے آرام دہ سفر کا انتظام کیا جائے۔ صدری نے مجھے بتایا کہ تارا باجی نے بھی اسی سلسلے میں اسے فون کیا تھا۔ میں نے صدری سے کہا کہ کھلنا میں ہفتہ دس روز ٹھہرنے کے بعد مجھے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بنکاک جانا ہے۔ کیا وہ سمندری راستے سے ہمارے بنکاک جانے کا انتظام بھی کر سکتا ہے؟ میری بات سن کر صدری نے مجھ سے پوچھا، ''ہمارے ہاں ملازمت کے دوران تم ایک بالکل سیدھے سادھے اور اپنے کام سے کام رکھنے والے نوجوان تھے۔ اب اتنی بڑی تبدیلی تم میں آچکی ہے کہ ڈھاکہ آکر بذریعہ ہوائی جہاز یا لگژری کوچ یا فیری کے کھلنا جانے کے بجائے تم چٹاگانگ سے بحری راستے سے کھلنا اور پھر کھلنا سے ہی بحری راستے سے بنکاک جانا چاہتے ہو۔ سیدھے راستے سے کیوں نہیں جاتے۔ کیا تمھارے پاس پاسپورٹ نہیں یا کوئی ایسی وجہ ہے جسے تم پوشیدہ رکھنا چاہتے ہو؟'' میں نے صدری کو کہا، ''آپ میرے سابقہ باس اور محسن ہیں اور اسی امید پر میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ ہر ممکن حد تک میری مدد کریں گے۔ میں آپ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا لیکن یہ ایسا راز ہے جسے اخفا نہ کرنے کا میں نے عہد کیا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی مجھے اپنے عہد کی پاسداری کرتے ہوئے اسے توڑنے پر مجبور نہیں کریں گے۔'' صدری نے خاموشی سے میری بات سنی اور بولا، ''میں تمھیں اپنے عہد کو توڑنے پر ہرگز مجبور نہیں کروں گا۔ تمھیں بنکاک لے جانے کے لیے بہترین مقام کھلنا ہی ہے۔ کیونکہ وہاں سے غیر ممالک کے لیے کوئی کارگو سٹیمر نہیں چلتا۔ اسی لیے وہاں امیگریشن اور کسٹم کے محکمے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ بنکاک جانے کے لیے ایک بڑے کارگو اسٹیمر کا میں انتظام کردوں گا۔'' ''ایسے اسٹیمر کے بنکاک جانے کے جو بھی اخراجات ہوں گے میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔'' میری یہ بات سن کر صدری اصفہانی نے ہنستے ہوئے جواب دیا، ''تم نے ابھی مجھے اپنا سابق باس اور محسن کہا ہے اس لیے یاد رکھو کہ باس چاہے موجودہ ہو یا سابق، وہ اپنے موجودہ یا سابقہ ملازمین کو ہمیشہ کچھ دیتا ہے، ان سے لیتا نہیں۔''

صدری کی امید افزا باتوں سے مجھے بڑا حوصلہ ملا تھا۔ اس سے رخصت ہوکر ہم اپنے ہوٹل میں آئے اور اپنا سفری سامان لے کر سیدھے ایئرپورٹ گئے اور شام چھ بجے کی فلائٹ سے چٹاگانگ کے لیے پرواز کرگئے۔ اصفہانی کالونی میں میرے ساتھی بھی بالکل بخیر و عافیت تھے۔ میں پہلے تارا باجی سے ملا اور انھیں صدری صاحب اور بڑے صاحب سے اپنی ملاقات کا بتایا۔ پھر رانی سے ملا اور اسے کہا کہ کھلنا

جانے کے لیے اسٹیمر کا انتظام ہوگیا ہے لیکن اس کی روانگی تک ہمیں مزید چند روز یہیں انتظار کرنا ہوگا۔ اپنے ساتھیوں کو بھی میں نے کھلنا جانے کا بتایا۔ تھائی بہت خوش تھے کیونکہ انھیں اپنے ملک تھائی لینڈ جلد جانے کا موقع مل رہا تھا۔ ہم سب کو اطمینان تھا کہ ہمارا آئندہ سفر سکون اور اطمینان سے طے ہوگا۔ رات کا کھانا کھا کر میں ابھی سونے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ گیسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور بتایا کہ دو موٹر سائیکل سوار پولیس افسر گیسٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پولیس کی یہاں آمد اور مجھ سے ملنے کے لیے آنا میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ میں نے پھر سے لباس پہنا اور بطور احتیاط اپنا پسٹل اور ریوالور جیکٹ کی جیبوں میں رکھ کر قیصر کے کمرے میں گیا اور اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ کاسموپولیٹن وردی پہنے ایک انسپکٹر اور سب انسپکٹر وہاں بیٹھے تھے۔ میرے استفسار پر انھوں نے کہا کہ غیر بنگلہ دیشیوں کے لیے ملک کے کسی بھی شہر میں جاکر پہلے متعلقہ پولیس اسٹیشن میں انھیں اپنی آمد اور جاتے ہوئے اپنی روانگی کی اطلاع دینی لازمی ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق آپ اور آپ کے ساتھی کئی روز سے یہاں مقیم ہیں اور آپ نے ابھی تک پولیس سٹیشن میں اپنی آمد کی اطلاع نہ دے کر قانون کی خلاف ورزی کی ہے، لہٰذا مجھے اور میرے ساتھیوں کو ابھی پولیس سٹیشن چلنا ہوگا۔

ان پولیس افسران کی باتوں اور لب و لہجے سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ انھیں میرے اور قیصر کے ڈھاکہ جاتے وقت پتنگا ایئرپورٹ چٹاگانگ پر خود کو بھارتی IB کے افسران ہونے کی اطلاع بھی مل چکی ہے۔ بنگلہ دیش بنانے میں بھارت کے فوجی کردار اور اس کی بنگلہ دیش پر مضبوط گرفت کے باعث (بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بھارت نے اس ملک کے تمام بڑے کارخانوں کی مشینری، ریلوے انجن، بوگیاں حتیٰ کہ ریلوے پٹریاں بھی اپنے ملک میں پہنچا دی تھیں اور بنگلہ دیش حکومت سے پندرہ سالہ معاہدے کے تحت اس کو فوج کے صرف دو یا تین ڈویژن رکھنے کی اجازت دی تھی۔ سول اور فوج میں اس کا اتنا عمل دخل تھا کہ بنگلہ دیش ایک آزاد ملک کے بجائے بھارتی کالونی بن کر رہ گیا تھا) اسی لیے پولیس افسران نہایت دھیمے اور معذرت خواہ لہجے میں مجھ سے بات کر رہے تھے۔ میں نے اسی تاثر کو برقرار رکھنے کے لیے درشت لہجے میں انھیں کہا ہم بھارتی IB کے افسران ہیں اور کلکتہ اور چٹاگانگ کی بندرگاہوں پر شرپسندوں کے ذریعے گڑبڑ کرنے کی ایک سازش کی تحقیقات کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ہمارے مخالفین کے گروہ میں عورتوں کے علاوہ تھائی لینڈ کے چند باشندے بھی شامل ہیں۔ اس لیے ہمارے ساتھ ہمارے محکمے کی عورتیں اور ہمارے پے رول پر ہمارے تھائی ورکر بھی شامل ہیں تاکہ ہم سازشیوں تک پہنچ کر ان کا قلع قمع کر سکیں۔ میں اپنے نائب کے ہمراہ اسی سلسلے میں ڈھاکہ میں اپنے سفارت خانے میں گیا تھا اور پتنگا ایئرپورٹ پر اپنی شناخت بھی کروائی تھی۔ اپنی آمد اور شناخت کو چھپانے کے لیے ہم نے اصفہانی کالونی میں رہائش رکھی ہے اور آپ یہاں بھی آ دھمکے۔ کیا آپ

چاہتے ہیں کہ آپ کے ہمراہ میں اور میرے ہمراہ آنے والے لوگ تھانے جاکر اپنی شناخت اور آمد درج کرواکر اپنے انتہائی خفیہ مشن کو طشت از بام کر دیں؟ میں ابھی اپنے سفارت خانے کو آپ کی آمد کی اطلاع دے کر آپ کے افسر اعلیٰ سے آپ کی بے جا مداخلت کے لیے آپ کی سرزنش اور تنزلی کے لیے کہتا ہوں۔ میری باتیں سن کر دونوں پولیس افسران کے تو پسینے چھوٹ گئے اور وہ میری منتیں کرنے لگے کہ ان کی اس ''گستاخی'' کو معاف کر کے معاملے کو یہیں رفع دفع کر دیا جائے۔ ان پولیس والوں کو تو میں نے ذرا اور ڈرا دھمکا کر اور پھر ان کی ''گستاخی کو معاف'' کر کے رخصت کیا لیکن میرے ذہن میں یہ سوال کلبلانے لگا کہ ''یہ آزادی'' اس خطے کے لوگوں کو ان کے غدار لیڈروں کے بہکاوے میں آنے سے ملی ہے؟ پاکستانی ہوتے ہوئے تو وہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے شہری اور بلاشک وشبہ آزاد تھے لیکن اب دھوتی پرشاد بھارتی ہندوؤں کے غلام بن کر ان کے اتنے نیچے لگ چکے ہیں کہ ان کے پولیس افسران میں بھی اتنی جرأت نہیں کہ کسی سویلین کے خود کو بھارتی IB کا افسر ہونے کا زبانی کہنے پر اس سے پاسپورٹ اور ویزہ تو دور کی بات ہے، محکمانہ شناختی کارڈ ہی دیکھنے کا مطالبہ کر سکیں۔

میں اگلے روز آگرہ آباد روڈ پر اصفہانی کے دفتر گیا۔ وہاں کا انچارج بھی اصفہانی خاندان کا ہی ایک فرد تھا۔ اس نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور بتایا کہ آئندہ چھ سات روز میں ایک کارگو اسٹیمر ان کا اور کئی دوسری کمپنیوں کا سامان لے کر کھلنا جائے گا۔ اسی اسٹیمر پر وہ صدری کہنے کے مطابق بیس مہمانوں کے سفر کا انتظام کر رہا ہے اور روانگی سے چوبیس گھنٹے قبل وہ ہمیں اصفہانی کالونی میں اطلاع بھجوا دے گا۔ اس نے مزید کہا کہ صدری نے آپ کی روانگی کو پوشیدہ رکھنے کے لیے مجھے خاص ہدایت کی ہے، لہٰذا آپ کو اسٹیمر تک ہمارے ایک کارگو ٹرک میں جانا پڑے گا۔ اس کے تعاون کا شکریہ ادا کر کے میں اس سے رخصت ہوا۔

قیصر اور اس کے ساتھیوں کی دیکھا دیکھی تھائیوں میں بھی شکار کا شوق پیدا ہوچکا تھا۔ ہمارے آئندہ چار روز کالونی میں ہی شکار کی اور احتیاطی تدابیر کے اختیار کرنے کی باتوں میں گزر گئے۔ اس دوران میں دو تین بار شہر گیا اور اسلحہ صاف کرنے کا تیل لے آیا۔ قیصر اور اس کے ساتھیوں نے تمام اسلحے کو صاف کیا اور اس کی آئیلنگ کی۔ ہم سب ذہنی طور پر شکار کے لیے بالکل تیار تھے۔ میں نے سارے جواہرات اور روپیہ تارا باجی کے پاس ایک سوٹ کیس خرید کر امانتاً رکھوا دیے تھے۔ میں گزشتہ صفحات میں لکھ چکا ہوں کہ متحدہ پاکستان کے تمام شہروں میں سے مجھے چٹاگانگ سب سے زیادہ پسند تھا۔ حالانکہ دیکھنے میں اس شہر میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ مچھر بے شمار اور سڑکیں ٹوٹی پھوٹی تھیں لیکن آدھے سے زیادہ شہر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بنا ہوا تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اور خوشنما پھولوں کے باغ تھے۔ شہر کے بالکل قریب ایک جھیل اور پانچ چھ میل دور کھلا سمندر تھا جہاں اکثر شہری پکنک کے لیے جاتے تھے۔ آغاز جوانی کے دور میں مجھے یہ شہر ایسا بھایا کہ آج تک اس کی یاد دل سے محو نہ ہوسکی۔ میں یہاں

اپنے ان چند دنوں کے قیام کے دوران تقریباً ہر شام قیصر اور نمبر ٹو کے ہمراہ شہر میں نکل جاتا۔ رانی اور اپنی ہمراہی خواتین کو میں نے کالونی سے باہر نکلنے کی سختی سے ممانعت کردی تھی۔ سردار کے لڑکے کو میں نے انگریزی رسائل اور کتابیں لادی تھیں اور وہ اپنے کمرے میں انھیں پڑھنے میں منہمک رہتا تھا۔ ایک روز قیصر اور نمبر ٹو نے کہا کہ سارے ساتھی شہر میں کم ازکم ایک بار جانے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ میں نے انھیں اپنے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ ایک شام ہم سب اصفہانی کمپنی کے ملازمین کو لے جانے والی منی بس میں شہر گھومنے کے لیے گئے۔ میں نے سب کو نئی مارکیٹ دکھائی جہاں پر سینکڑوں دکانوں میں ضرورت کا سب سامان ملتا تھا۔ وہاں سے میں انھیں مسکا ہوٹل کے ساتھ رس گلے کی دکان پر لے گیا۔ اس دکان کے رس گلے سارے چٹاگانگ میں مشہور تھے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے اس دکان پر پیش آیا واقعہ پیش خدمت ہے۔ اس دکان پر کڑھایوں میں دودھ بھی بکتا تھا۔ میری ملازمت کے دوران چٹاگانگ میں لاہور کے بھولو پہلوان کے پٹھے آئے ہوئے تھے۔ وہ دودھ پینے کے لیے اس دکان پر گئے۔ دکاندار نے کڑھائی میں ماپ کے برتن سے دودھ نکال کردینا چاہا تو پہلوانوں نے کڑھائی سے گلاسوں میں دودھ نکال کر پینا شروع کردیا اور چند منٹوں میں ہی کڑھائی خالی کرکے مزید دودھ مانگا۔ دکان میں باقی تازہ دودھ تھا وہ سب بھی پی کر جب انھوں نے مزید دودھ مانگا تو دکاندار ان کی خوراک اور تن و نوش دیکھ کر اتنا گھبرایا کہ بغیر پیسے لیے اپنی دکان چھوڑ کر بھاگ گیا اور اس کے ملازم بھی دکان سے باہر آگئے۔ پہلوانوں نے اب رس گلوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا اور تھوڑی ہی دیر میں ساری دکان میں کھانے پینے کی کوئی شے بھی باقی نہ رہی۔ پہلوان تو کھاپی کر ڈکاریں لیتے چلے گئے اور جب دوسرے روز دکاندار کو پیسے دینے گئے تو اس نے پیسے لینے سے انکار کردیا اور اس کے عوض انھیں یہ کہا کہ آئندہ وہ اس کی دکان پر نہ آئیں کیونکہ ان کی اس خوش خوراکی کے باعث اس کے لگے بندھے گاہک چھوٹ جائیں گے۔ میں اور میرے ساتھی رس گلے کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ مجھے میرے اصلی نام سے کسی نے پکارا۔ پہلے تو میں نے سنی ان سنی کردی لیکن جب کسی کے ہاتھ میرے کندھے پر پڑے تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے فوراً یاد آگیا کہ یہ بنگالی رائے نامی ہندو میری تربیلہ ڈیم میں ملازمت کے دوران ہماری غیرملکی کمپنی میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ تھا اور کمپنی کے پاکستانی ملازمین اور خصوصاً مزدوروں کی تنخواہوں میں بلاوجہ کاٹ چھانٹ کرتا اور اوور ٹائم کے پیسے کوئی نہ کوئی عذر بناکر کاٹ لیتا تھا۔ ہر طرح سے شریفانہ کوشش کے باوجود جب وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو ایک روز مزدوروں نے اسے کالونی میں اس کی رہائش گاہ کے راستے پر جاتے ہوئے پکڑ لیا اور اس کی خوب ٹھکائی کی۔ میں بھی موقع پر موجود تھا اور میرے اشارے پر کمپنی کے سیکیورٹی گارڈز نے بھی اسے چھڑانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ دوسرے روز یہ معاملہ ریٹائرڈ بریگیڈیر ظفر جو چیف سیکیورٹی آفیسر اور پرسانل منیجر تھے کے سامنے پیش ہوا تو میں نے اور سیکیورٹی گارڈز نے اس واقعے سے قطعی لاعلمی بتائی اور کوئی گواہ نہ ہونے کے باعث اسے پیٹنے والوں

کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہ ہوسکی۔ تب سے رائے نامی یہ اکاؤنٹنٹ میرے انتہائی خلاف ہوگیا لیکن اس نے اپنے بغض کا کبھی برملا اظہار نہ کیا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد غیرملکی کمپنی کے افسران نے خصوصی طور پر حفاظتی انتظام کرکے اسے بنگلہ دیش بھجوایا تھا۔ اب اسی رائے نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا اور چھوٹتے ہی بولا، ''کیا مجھے تم نے پہچانا ہے؟ میں وہی رائے ہوں جسے تربیلہ میں تم نے مزدوروں سے پٹوایا تھا اور گواہی دیتے وقت سارے واقعے سے مکر گئے تھے۔ یہ بتاؤ چٹاگانگ میں کیسے آئے ہو اور کہاں ٹھہرے ہو؟'' اس کے لب و لہجے اور انداز گفتگو سے مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ مجھے یہاں دیکھ کر اس کے انتقامی جذبات پھر سے بھڑک اٹھے ہیں اور یہ یقیناً ہمارے لیے یہاں مشکلات پیدا کرے گا۔ میں نے اسے کہا کہ بہتر ہوگا کہ ہم دکان سے باہر جاکر باتیں کریں۔ گواہی دیتے وقت میں مجبور تھا اور مجھ پر اوپر سے دباؤ تھا۔ میں تمھیں ساری بات بتاکر تمھاری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ قیصر میرے ساتھ ہی بیٹھا ہماری ساری گفتگو سن رہا تھا۔ میں نے رائے کو ظاہری مخاطب کرتے ہوئے اور قیصر کو سمجھانے کے لیے کہا کہ میں اکیلا ہی یہاں آیا ہوں اور ہم ریلوے سٹیشن کی طرف چلتے ہوئے باتیں کریں گے۔ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور رائے کے ساتھ ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اب رات پڑ چکی تھی۔ ریلوے سٹیشن اور اس دکان کے درمیان خاصی جگہ سنسان تھی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے اس سنسان جگہ پر پہنچے تو میں نے جوتے کے تسمے باندھنے کے بہانے جھک کر پیچھے دیکھا تو ایک گاڑی جس کی ہیڈ لائٹس کے بجائے پارکنگ لائٹس جل رہی تھیں، نہایت آہستگی سے ہمارے پیچھے آرہی تھی۔ میں نے آگے پیچھے دیکھ کر کہ کوئی اور گاڑی یا پیدل شخص تو ہمارے پیچھے نہیں، اس گاڑی کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ گاڑی ہمارے بالکل قریب آکر رک گئی۔ قیصر اور اس کے دو ساتھی فوراً ہی گاڑی سے باہر نکلے اور اس سے پہلے کہ رائے کچھ بھانپ سکے، ان تینوں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ میں نے اصفہانی کی اس منی بس کے ڈرائیور کو چوہدری عزیز بلڈنگ لال ڈگی کی طرف چلنے کو کہا۔ لال ڈگی سیاسی جلسوں کے لیے مشہور میدان تھا۔ اس کے آخر میں جاکر میں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو کہا۔ اس سفر کے دوران قیصر کے ساتھیوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے بولنے یا چیخ مارنے سے روک رکھا تھا۔ یہ تینوں اسے اسی حالت میں گاڑی سے باہر لائے۔ میرے اشارے پر نمبر ٹو نے اپنے ایک ساتھی سے سرگوشی میں کچھ کہا، وہ بھی نیچے اتر گیا۔ یہاں بالکل اندھیرا تھا اور صرف چند درخت تھے۔ میں سب کو اشاروں میں ہدایات دے رہا تھا۔ درختوں کے قریب رائے کو قیصر اور اس کے ساتھی لے گئے اور تھائی نے اپنے خنجر سے اس کی گردن علیحدہ کردی۔ میں نے رائے کی لاش کی شناخت میں ہر ممکن تاخیر کے لیے اس کے تمام کپڑے، جوتے اور انگوٹھیاں وغیرہ اُتروا لیں اور اس کا سر اسی کے کپڑوں میں انگوٹھیوں اور جوتوں اور ایک وزنی پتھر کے ساتھ بندھوا کر ساتھ لے لیا۔ ہم پھر ریلوے روڈ کی طرف چلے اور نیوی کی گن بوٹس کے قریب جہاں دریا سڑک کے بالکل ساتھ بہتا ہے، وہاں دریا میں اسے پھینک کر کالونی واپس آگئے۔

رائے کو ختم کرنا میرے لیے اس لیے بہت ضروری تھا کیونکہ وہ متعلقہ حکام کو بتا کر ہم سب کو گرفتار کروا سکتا تھا۔ اس سے صرف یہ غلطی ہوئی کہ چٹاگانگ میں مجھے نہتا سمجھ کر اپنی حفاظت اور گرد و پیش سے اس لیے غافل ہوگیا تھا کہ اب میں پوری طرح اس کی گرفت میں تھا اور بچ کر کہاں جا سکتا تھا؟

رائے کو ٹھکانے لگانے کے اگلے روز سارے چٹاگانگ میں بغیر سر کے ننگی لاش ملنے کا شور مچ گیا۔ لاش کسی ہندو کی تھی، یہ جاننے کے بعد شہر کے ہندوؤں نے خاصا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا اور ضلعی سول انتظامیہ اور پولیس کے اعلیٰ افسر کے دفاتر پر احتجاجی مظاہرے کیے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد مغربی پاکستان میں مقیم ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد چٹاگانگ میں آباد ہوگئی تھی اور ان میں مسلمانوں کے خلاف اتنا تعصب تھا کہ کسی غیر بنگلہ دیشی مسلمان کو برداشت کرنا تو دُور کی بات ہے یہ بنگلہ دیشی اور چٹاگانگ کے قدیم رہائشی مسلمانوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ سارے کاروبار پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ مارواڑی ہندو جو 25 مارچ سن 71ء کے ملٹری آپریشن کے بعد ہندوستان بھاگ گئے تھے، انھوں نے سقوط ڈھاکہ کے بعد واپس آ کر نہ صرف اپنا سابقہ کاروبار دوبارہ سنبھال لیا تھا بلکہ جو چند مغربی پاکستانی تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان میں سیٹل ہوگئے تھے اور جن کی بڑی اچھی کاروباری ساکھ تھی، ان کے بزنس پر بھی انھوں نے قبضہ جما یا تھا۔ بنگلہ دیشی مسلمان جو مجیب الرحمٰن کے بقول سقوط ڈھاکہ سے پہلے مغربی پاکستانیوں کے ''غلام'' تھے اب فی الحقیقت ہندوؤں کے غلام بن چکے تھے۔ چائے کے بزنس میں چٹاگانگ میں صرف ایک مسلمان کمپنی اصفہانیوں کی تھی۔ ان کا کاروبار بھی بہت سمٹ چکا تھا۔ فلیور ٹی کمپنی Flavour Tea Co. کے مالک خواجہ وحید جو چٹاگانگ میں چائے کے بزنس میں اصفہانی، بروک بانڈ اور لپٹن ٹی کی ٹکر کے تھے، بڑی مشکل سے جان بچا کر مغربی پاکستان پہنچے تھے۔ شیخ مجیب مشرقی پاکستان کی پٹ سن اور چائے کو Cash Crops (غیر ملکی سرمایہ لانے والی فصلیں) کہہ کر اور ''ہمار دیش، تمہ ر دیش، سنار دیش'' کا نعرہ لگا کر مشرقی پاکستانیوں کو سنہرے مستقبل کے خواب دکھا کر پاکستان کی وحدت توڑنے میں کامیاب ہوا تھا، ان Cash Crops کی بیرونی منڈیوں میں کھپت ختم ہوجانے کے باعث بنگلہ دیشیوں کو بہت بڑے مالی بحران میں ڈال چکا تھا۔ سری لنکا، کینیا اور بھارت نے چائے کی عالمی منڈیوں پر نہ صرف قبضہ جمالیا تھا بلکہ بنگلہ دیشی چائے کے مقابلے میں اپنی چائے کے دام بھی کم رکھے تھے۔ مشرقی پاکستانی چائے کا سقوط ڈھاکہ سے پیشتر مغربی پاکستان ہی واحد خریدار تھا اور یہ خریدار بھی اب ان سے ناطہ توڑ بیٹھا تھا۔ مشرقی پاکستان کی دوسری Cash Crop پٹ سن تھی جس کی دنیا بھر میں مانگ بھی تھی اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ سقوط ڈھاکہ کے فوری بعد نائیلون، پلاسٹک اور دوسرے کیمیکل اجزا سے بنے خام مال نے پٹ سن کے مقابلے میں بہت کم لاگت پر مضبوط اور صاف ستھرے ہونے کے باعث پٹ سن کی عالمی منڈیوں پر قبضہ جمایا تھا۔ پاکستان کی طرح دنیا بھر کے ممالک اب پٹ سن کے اس بہترین نعم البدل کو استعمال کر رہے ہیں اور بنگلہ دیش کی یہ دونوں Cash Crops اب صرف بنگلہ دیش کے اندر ہی

استعمال ہو رہی ہیں۔

بات چلی تھی رائے کے قتل پر چٹاگانگ میں ہندوؤں کے شور شرابے اور احتجاج کی جس کی تان تین بنگلہ دیشی اور چٹاگانگ کے مقامی مسلمانوں کے قتل پر ٹوٹی۔ ہمیں اس ہنگامہ آرائی کی تمام خبریں گیسٹ ہاؤس کے مسلمان چوکیدار نے بتائیں اور ہمیں شہر کے مخدوش حالات کے پیش نظر کالونی سے باہر اور شہر میں نہ جانے کا مشورہ دیا حالانکہ اسے ہماری یہاں آمد کے اصلی مقصد کا بالکل علم نہیں تھا اور اس نے یہ مشورہ ہمیں اصفہانی مالکان کے مہمان اور ہم سب کو مسلمان سمجھتے ہوئے دیا تھا۔ تھائی لینڈ سے سفر کے آغاز سے اب تک ہمارے بال بے تحاشہ بڑھ چکے تھے۔ چوکیدار ہی ہمارے لیے دو مسلمان حجام لے کر آیا جنھوں نے ہمارے بال کاٹے۔ چٹاگانگ میں میرے بہت سارے جان پہچان والے تھے لیکن حالات کے پیش نظر اور اپنی خواہش کے باوجود میں ان سے نہ ملا۔ اپنی سروس کے دوران یہاں پر اپنے مسلمان دوستوں پر بھی مجھے اعتماد نہ تھا۔ کیونکہ دونوں حصوں کے سیاست دانوں نے نفرتوں کے ایسے زہریلے بیج بوئے تھے جن کے اثرات سے دوستی اور خلوص کے جذبے مردہ ہو چکے تھے۔ مولوی فرید احمد کو جو مشرقی پاکستانی سیاست دان اور اس خطے کی پاکستان سے علیحدگی کے خلاف تھے، کو ڈھاکہ کے امریکن کلچرل سینٹر کے قریب ابلتے تیل میں جلا کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ چوہدری فضل الرحمٰن جو چٹاگانگ کے رہنے والے سیاست دان اور مسلم لیگی لیڈر تھے اور متحدہ پاکستان کے دو مرتبہ عارضی صدر بھی بنے تھے، سقوط ڈھاکہ کے وقت مشرقی پاکستان چلے گئے تھے۔ انھیں مجیب الرحمٰن کی حکومت نے جیل میں ڈال دیا اور پاکستان کے خلاف بیان نہ دینے کی پاداش میں جیل میں ہی زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ ''جانباز'' تحریر کرتے وقت جب بھی بنگلہ دیش کا ذکر آتا ہے تو سن 71ء کے خون کے آنسو رلانے والے واقعات، اپنوں کی غداری اور اپنے دشمن بھارت کی عیاری سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے دولخت ہونے اور لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کو لرزا دینے والے مظالم سے شہید کرنے کی داستانیں، مشرقی پاکستان میں آباد بہاری مسلمانوں کی سقوط ڈھاکہ کے بعد زبوں حالی جنھیں دنیا کے کسی ملک کی شہریت حاصل نہیں اور جن کی ایک نسل اپنے وطن پاکستان کی سرزمین کو دیکھنے کی خواہش دل میں لیے ہی زیر زمین دفن ہوچکی ہے۔ بہاری مسلمانوں کی تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان ہجرت کے بعد سقوط ڈھاکہ کے بعد دوبارہ ہجرت اور کھٹمنڈو کے راستے پاکستان آتے ہوئے ہمارے سفارتی حکام کی سفاکی کے چشم دید واقعات، کھٹمنڈو شہر کے سب سے بڑے پارک رتنا پارک جسے فیلڈ مارشل ایوب خان کے سرکاری دورے کے دوران ایوب پارک کا نام دیا گیا تھا اور اس اعزاز پر ہم پاکستانیوں کے سر فخر سے بلند ہوجاتے تھے، اسی پارک میں سقوط ڈھاکہ کے بعد کھٹمنڈو آنے والے مہاجر خاندانوں کی بے بسی کے باعث مہاجر کنواری لڑکیوں کے پانچ روپے اور کھانے کے عوض سرعام عزت کے سودے ہوتے دیکھ کر اور پاکستانی سفارت خانے کے حکام کی بے حسی اور ان مظلوموں کے لیے غیر ملکی امداد کو ہڑپ کر جانے کے واقعات کو تحریر

کرنے سے میں باز نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ پاکستانیوں اور خصوصاً ہماری نوجوان نسل کو مغربی موسیقی (Pop Songs) اور ڈسکو میں پھنسا کر ہمارے بیرونی دشمنوں نے مملکت خداداد پاکستان کے معرض وجود میں آنے کی وجہ اور ان لاکھوں شہدا کے خون ناحق سے پاکستان کی آبیاری کرنے والوں کی یاد کو ان کے دلوں سے محو کر دیا ہے، جسے میں پھر سے زندہ کرنے کی اپنی سی سعی کر رہا ہوں۔

ڈھاکے سے واپسی پر اصفہانی کالونی میں ہمیں رہتے مزید آٹھ روز گزر گئے تو چٹاگانگ میں اس کمپنی کا سربراہ شام کو میرے پاس آیا (وہ بھی اسی کالونی میں رہتا تھا) اور بتایا کہ کھلنا جانے والا اسٹیمر کل بعد دوپہر تین بجے روانہ ہو جائے گا اس لیے ہم تیار رہیں۔ کل بارہ بجے کمپنی کا کارگو ٹرک ہمیں لینے کالونی میں آئے گا اور ہمیں اسٹیمر کے گینگ وے پر اُتار دے گا۔ اسٹیمر پر ہماری رہائش کا انتظام ہو چکا ہے اور اسٹیمر کے کپتان نے ہمیں بحفاظت کھلنا پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔

دوسرے روز مقررہ وقت پر ٹرک آگیا اور تارا باجی سے رخصت ہو کر اور اپنا سامان اور جواہرات کا سوٹ کیس لے کر ہم سب ٹرک میں سوار ہو گئے۔ اس بند ٹرک کا عقبی کینوس کا پردہ گرا دیا گیا اور آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ پردہ اٹھا کر ہمیں اترنے کا کہا گیا۔ ہم سب جلد جلد اسٹیمر پر سوار ہوئے۔ اسٹیمر پر رکھے کارٹنوں کے درمیان خالی جگہوں پر کچھ گدے بچھے ہوئے تھے اور اسٹیمر کے نچلے حصے میں بنے پانچ کیبن بھی ہمارے لیے مخصوص تھے۔ میں نے دو کیبنوں میں تینوں خواتین اور راجے کے لڑکے کو بھیجا۔ بقیہ تین کیبنوں میں میرے علاوہ قیصر، نمبرٹو اور دو تھائی اور قیصر کے ساتھی چلے گئے۔ میں نے اسٹیمر پر بھی سب کی ڈیوٹی لگا دی کہ میرے سمیت ہم سب چار چار کی ٹولی میں چار چار گھنٹے عرشے پر مسلح ہو کر نگرانی کریں گے۔ تقریباً چار بجے اسٹیمر نے روانگی کا بھونپو دیا اور دریائے کرنافلی سے سمندر کی طرف بڑھنے لگا۔ کپتان نے ہمیں کہا کہ ہم جب تک کھلے سمندر میں نہ پہنچ جائیں، خود کو چھپا کر رکھیں کیونکہ اسی دریا میں پتنگا پیچ سے پہلے بحری فوج کی گن بوٹس کی جیٹی اور کوسٹ گارڈ والوں کی تیز رفتار مسلح سپیڈ بوٹس گشت کرتی ہیں۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد کپتان نے مجھے بتایا کہ ہم کھلے سمندر میں پہنچ چکے ہیں اور ہمارا اسٹیمر ساحل سے تین سے سات میل دور رہ کر کھلنا جائے گا۔

مجھے راجہ تری دیو کی ٹیلی فونک ہدایت تھی کہ رانی کو کھلنا نہ لے جاؤں اور نہ ہی رفیق الاسلام سے ملنے دوں چاہے مجھے رانی کو ہلاک ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ادھر رانی کے پاکستان جانے سے پہلے کھلنا جانے اور رفیق الاسلام سے ملنے کے پرزور اصرار سے میں بھی اس اصرار کے اسرار کی تلاش میں تھا۔ میں رانی کے کیبن میں گیا اور اس کے بیٹے کو کہا کہ وہ عرشے پر کھلی ہوا کھائے اور سمندر کا نظارہ کرے اتنی دیر میں میں رانی صاحبہ سے علیحدگی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکا خاموشی سے عرشے پر چلا گیا۔ میں نے رانی کو کہا کہ چٹاگانگ میں رہائش کے دوران میری راجہ صاحب سے ٹیلی فون پر بات ہوئی ہے۔ ہمارے کھلنا جانے کے پروگرام کو انھوں نے سختی سے رد کر دیا ہے۔ ادھر تمھارے کھلنا جانے پر اصرار کرنے

کی وجہ میں ابھی تک نہیں جان سکا ہوں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مجھے سب بات کھل کر اور صاف صاف بتاؤ کہ تم کھلنا کیوں جانا چاہتی ہو؟ رانی کچھ دیر فرش پر نظریں گاڑے بیٹھی رہی جیسے فیصلہ کر رہی ہو کہ مجھے حقیقت بتائے یا نہ بتائے۔ پھر بولی، ”میں نے تمھیں پہلے بھی کہا کہ رفیق الاسلام بڑے اثر و رسوخ کے مالک ہیں اور وہ ہمیں بنکاک لے جانے کے لیے کسی چھوٹے جہاز کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اسی لیے میں کھلنا جانے پر زور دے رہی تھی۔“ ”اگر صرف یہی وجہ ہے تو مجھے رفیق الاسلام سے مدد لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے اپنے ایسے وسائل ہیں جن سے میں بنکاک جانے کا انتظام کر سکتا ہوں، لہٰذا میں کپتان کو کہتا ہوں کہ اسٹیمر یہیں سے موڑ کر برما کی جانب چلے جہاں سے ہم سمندری راستے سے بنکاک چلے جائیں گے۔“ میں نے یہ الفاظ کہے تو رانی پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھنے لگی پر کچھ نہ بولی۔ میں جانے کے لیے اٹھا تو رانی نے انگریزی میں مجھے کہا، ”پلیز اسٹیمر کا رخ نہ بدلو۔ میرے کھلنا جانے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ کیا تم مجھے یقین دلاتے ہو کہ میرے راز کو راز ہی رکھو گے۔“ رانی کی اس بات سے میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا، ”تمھاری بات کو راز رکھنے کا وعدہ صرف اس حد تک ہے کہ جس سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور کھلنا سے تم یقیناً ہمارے ساتھ پاکستان جاؤ گی ورنہ مجھے تمھاری لاش کو تابوت میں رکھ کر پاکستان لے جانا ہوگا کیونکہ میرا بھی راجہ سے یہی وعدہ ہے۔“

رانی میرا جواب سن کر پھر تذبذب میں پڑ گئی۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا اور جب اس کی خاموشی نہ ٹوٹی تو میں نے پھر اٹھتے ہوئے کہا، ”شام ڈھل رہی ہے اور رات کو اسٹیمر کا رُخ موڑنا اور نئی منزل کے رُخ کا صحیح تعین کرنا مشکل ہوگا، لہٰذا میں کپتان کے پاس جا رہا ہوں۔“ میں کیبن کے دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ رانی نے مجھے روکتے ہوئے کہا، ”سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہاں سے آغاز کروں۔ راجہ کی بے رغبتی اور بے اعتنائی سے یا اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر عقل و حواس کھونے سے یا راجہ کے دوست کے دوستی کے پردے میں میرے قریب آ کر مجھ سے اس غلطی کا ارتکاب کروانے پر جس کا خمیازہ دو زندہ ہستیاں آج تک بھگت رہی ہیں اور شاید مرتے دم تک انھیں اس عذاب سے نجات نہ ملے۔“ رانی اتنی بات کہہ کر خاموش ہو گئی۔ میں واپس پلٹا اور کیبن میں دوسرے بیڈ پر جو راجہ کے لڑکے کا تھا بیٹھتے ہوئے کہا، ”انسان خطا کا پتلا ہے اور کوئی غلطی بھی ایسی نہیں جس کا اس دنیا میں مداوا نہ ہو سکے۔ باقی رہا مرنے کے بعد سزا و جزا کی بات تو دنیا کے تمام مذاہب کے پیروکار اس ایک بات پر یقیناً متفق ہیں کہ وہ Supreme Power (اعلیٰ ترین طاقت) جسے مسلمان اللہ، عیسائی گاڈ اور ہندو ایشور کہتے ہیں، اپنی مخلوق کی غلطیوں کو معاف کرنے اور درگزر کرنے والی ہے۔ آپ کے ابتدائی چند کلمات سے مجھے آپ کی مجبوری اور حالات کی سنگینی کا کچھ کچھ اندازہ تو ہو گیا ہے۔ اب آپ اگر کھل کر ساری بات تفصیل سے بتا دیں تو میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے راز کو راز ہی رکھوں گا اور آپ کی مشکلات کو دور کرنے

کی حتی الوسع کوشش بھی کروں گا۔" قارئین! یہ راز میں کبھی بھی زبان پر نہ لاتا اور نہ ہی تحریر کرتا لیکن رانی اور راجہ اب اس دنیا میں نہیں اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ دوسرے متعلقہ افراد بھی یا تو مر کھپ گئے ہوں گے اور اگر زندہ ہیں تو یہ راز اب سے بہت پہلے طشت از بام ہو چکا ہوگا۔ جہاں تک راز والی شخصیت کا تعلق ہے تو وہ آج کل کراچی میں ہے اور اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ خوش و خرم اور نہایت آسودہ زندگی بسر کر رہی ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اس کا صحیح نام تحریر نہیں کیا اور اس نے بھی پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

رانی ایک پڑھی لکھی اور حساس عورت تھی۔ اس کے بڑے بیٹے اور چکمہ سردار کو اس کے سامنے ہی میں نے گھٹنوں پر تین فائر کر کے زخمی اور ہمیشہ کے لیے معذور کر دیا تھا۔ رانی نے مجھے فائر کرنے سے روکنے کے بجائے اس پر تھوکا اور ایک بھی احتجاجی لفظ اس کی زبان پر نہ آیا۔ لیکن اس وقت اپنا راز بیان کرتے ہوئے اس پر نسوانی حیا اور شرم غالب تھی۔ نگاہیں فرش پر گاڑے اور فرش کی لکڑی کو پاؤں کے انگوٹھے سے کریدتے ہوئے بڑی مشکل سے وہ بولی، "یہ شرمناک واقعہ 1967ء کا ہے۔ راجہ صاحب اپنی خرمستیوں میں مشغول مہینوں یورپ اور امریکہ میں گزارتے۔ بھٹو صاحب سے ان کی دیرینہ دوستی تھی۔ یحییٰ خان کے مارشل لا لگانے سے پہلے کے رانگاماٹی سے گئے ہوئے راجہ صاحب سن 70ء میں چند روز کے لیے قبیلے میں آئے اور پھر واپس چلے گئے۔ ان کی رانگاماٹی سے مسلسل اور برسوں کی غیر موجودگی کے دوران ان کی ہدایت کے مطابق مجھے ان کے دوستوں کی میزبانی کرنی پڑتی تھی۔ راجہ صاحب کا میرے لیے یہ حکم بھی تھا کہ ان کے دوستوں کی میزبانی میں خود کروں اور راجہ صاحب کی کمی محسوس نہ ہونے دوں۔ راجہ صاحب کے ایک دوست رفیق الاسلام ان کی غیر موجودگی میں اکثر رانگاماٹی آنے لگے۔ مہمانوں کی میزبانی میں انھیں شراب بھی پیش کی جاتی تھی۔ راجہ صاحب نے مجھ سے شادی کے بعد مجھے بھی اپنی مے نوشی میں شریک کر لیا تھا۔ میں شراب کی عادی تو نہیں لیکن ان کی غیر حاضری میں جب طبیعت بے حد اکتا جاتی تو کبھی کبھی اکیلے بھی پینے لگی۔ رفیق الاسلام جب بھی رانگاماٹی آتے تو اپنے ساتھ اسکاچ وہسکی کا ایک کارٹن ضرور لاتے کیونکہ راجہ صاحب سے ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ سن 67ء کے موسم سرما میں ایک شام میں اکیلے ہی پی رہی تھی کہ رفیق الاسلام آ گئے۔ میں اس روز تنہائی کے احساس کو مٹانے کے لیے دوپہر سے ہی پی رہی تھی لیکن پینے سے یہ احساس دوچند ہو گیا۔ رفیق الاسلام میری مے نوشی کو بھانپ گئے اور جب خود پینے لگے تو مجھے بھی ساتھ دینے پر مجبور کرنے لگے۔ پہلے تو میں انکار کرتی رہی لیکن ایک تو شراب کے نشے اور دوسرے رفیق کے مسلسل اصرار کرنے پر آخرکار ہتھیار ڈال دیے۔ ہماری یہ محفل خاصی دیر تک جاری رہی۔ شراب کے نشے نے میرے ہوش و حواس بالکل معطل کر دیے تھے۔ میری اسی حالت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رفیق نے خادموں کو واپس بھیج دیا۔ میں نشے میں اتنی مدہوش تھی کہ میری سدھ بدھ جاتی رہی۔ صبح جب نشہ اترا تو احساس ہوا کہ رفیق رات

بھر میری عزت سے کھیلتا رہا۔ نشے نے اس کی حالت بھی غیر کر رکھی تھی اور صبح ہماری ایسی حالت تھی کہ ہم ایک دوسرے سے آنکھیں چار کرنے سے بھی کترا رہے تھے۔ رفیق تو اسی دن واپس چلا گیا لیکن مجھے رات کے گناہ کا ایسا تحفہ دے گیا جو نو ماہ بعد سونیا کی شکل میں دنیا میں آ گیا۔ جب ایک گناہ سرزد ہو جائے تو اسے چھپانے کے لیے مزید گناہوں کی ایک لڑی بنتی جاتی ہے۔ میں نے اپنے حاملہ ہونے کو پہلے تو سب سے چھپایا لیکن جب یہ ممکن نہ رہا تو اپنی ایک خاص خادمہ اور قبیلے کی ایک دائی کو مجبوراً رازدار بنانا پڑا۔ میں نے رفیق کو خط لکھ کر بلوایا کیونکہ اس رات کے حادثے کے بعد اس نے رانگاماٹی آنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ میری زچگی کے پندرھویں روز رفیق رانگاماٹی آیا تو میں نے بچی اس کے حوالے کی کیونکہ رانگاماٹی میں اس کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ رفیق بچی کو لے کر کھلنا چلا گیا اور بقول اس کے اس بچی کی پرورش کے لیے ایک آیا اور گورنس رکھ لی۔ وقتاً فوقتاً وہ یہاں آ کر مجھے سونیا کی خیریت سے آگاہ کرتا رہا۔ میں نے زچگی سے فرصت پانے کے بعد خادمہ اور دائی کو جنھیں رازدار بنانے کے بعد حویلی سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی، اپنے ایک خادم کو بھاری رقم کے عوض ٹھکانے لگوا دیا۔ راجہ صاحب سن 70ء کے گئے ہوئے پھر کبھی رانگاماٹی نہ آئے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد میرا بڑا بیٹا سردار بن گیا۔ اس نے کبھی اس بات کا اظہار تو نہیں کیا لیکن اس کے رویے سے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے کان میں بچی کے پیدا ہونے کی بھنک پڑ چکی ہے۔

کئی بار جب میں نے اس کی بے راہ روی پر اسے ٹوکا تو اس نے بڑی حقارت سے مجھے جواب دیا کہ مجھے نصیحت کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ رفیق آج سے ایک برس قبل آخری بار یہاں آیا تھا اور اس نے مجھے بتایا کہ سونیا کو اس نے کانونٹ سکول میں داخل کروا دیا ہے۔ اب سونیا تقریباً نو برس کی ہو گی۔ اسے دیکھنے اور ملنے کو میں ہر وقت تڑپتی رہتی ہوں اور اب پاکستان جاتے وقت اسے ملنا اور اگر ممکن ہوا تو اسے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتی ہوں لیکن بالکل خفیہ طور پر۔ میرا چھوٹا بیٹا ابھی تک اس سارے واقعے سے لاعلم ہے۔ میں نے تمھیں اپنا راز بتا دیا ہے اور اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو۔ میری خواہش ہے کہ سونیا بھی خفیہ طور پر اور میرے اس کے ساتھ رشتے کو نہ جانتے ہوئے ہمارے ساتھ پاکستان چلے اور وہاں تم اسے کسی اچھے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کروا دو۔ میرے پاس ذاتی بیش قیمت جواہرات ہیں۔ جنھیں بیچ کر تم اس کی آئندہ ساری زندگی کی آسائشیں اسے دے سکتے ہو۔"

رانی نے بات ختم کی اور اپنی بات کا ردعمل دیکھنے کے لیے سر اٹھایا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اپنا سب سے بڑا راز مجھے بتا کر اس کے چہرے پر نمایاں تناؤ اور گھبراہٹ ختم ہو چکی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے منوں بوجھ اس کے سینے سے ہٹ گیا ہو اور وہ خود کو ہلکی پھلکی محسوس کر رہی تھی۔ میری شروع زندگی سے یہ اصول یا بہتر الفاظ میں فطرت ہے کہ کوئی انسان بھی جب مجھے اصل حقیقت

سے آگاہ کر کے مدد طلب کرے تو میں اس سے بھرپور تعاون کرتے ہوئے ہر قسم کی حدود بھی پھلانگ جاتا ہوں اور اس کے برعکس جو اکڑ جائے اور مخالفت میں آگے آئے، اسے جب تک نیست و نابود نہ کر دوں مجھے چین نہیں آتا۔ میں نے رانی سے وعدہ کیا کہ سونیا یقیناً ہمارے ساتھ پاکستان جائے گی اور اس کی خواہش کے مطابق اس کی رہائش اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام کر دیا جائے گا اور راجہ کو اس بات کی بھنک بھی نہ پڑے گی۔ میں نے رانی سے پوچھا کہ کیا رفیق الاسلام کے لیے اس کے دل میں اب کوئی نرم گوشہ ہے کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ سونیا کو ہمارے ساتھ بھیجنے میں وہ پس و پیش کرے گا اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہمیں شاید اس سے سختی کرنی پڑے۔ رانی نے کہا، ”تم نرم گوشے کی بات کرتے ہو۔ اس کی ذلالت، خود غرضی اور میرے حواس معطل کر کے جو ظلم اس نے مجھ پر کیا اسی کے باعث اب تک میں اور میری بیٹی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ اگر میرے بس میں ہو تو میں اس کے جسم کے بے شمار ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دوں۔ اس بھیانک رات کے بعد وہ جب بھی مجھے ملنے آیا میں نے اس سے بات کرنا بھی محض اس لیے گوارا کیا کیونکہ میری بیٹی اس کے قبضے میں تھی۔ ہر بار وہ میری بیٹی کے اخراجات پورے کرنے کے عوض مجھ سے قیمتی جواہرات لے جاتا رہا۔ حالانکہ وہ خود خاصا صاحب حیثیت اور اثر و رسوخ کا مالک ہے۔“ سونیا کی پہچان کے لیے میں نے جب رانی سے پوچھا تو اس نے مجھے سوٹ کیس سے نکال کر ایک تصویر دی۔ ”میری بے حد منتوں کے بعد آج سے ایک برس پہلے اس نے مجھے سونیا کی یہ تصویر دی تھی۔“ یہ ایک آٹھ نو سالہ بچی کی تصویر تھی جو کانونٹ سکول کی یونیفارم پہنے تھی اور اس بچی کی شکل ماں سے بے حد ملتی تھی۔ ”سونیا کے دائیں بازو پر پیدائشی ایک بڑا سیاہ نشان ہے۔ اس نشان سے آپ کو سونیا کی شناخت میں دشواری نہیں ہوگی۔“ رانی اگرچہ مجھے سب کچھ بتا چکی تھی لیکن اپنا راز بتانے کے باوجود وہ مجھ سے آنکھیں چار کرنے سے کترا رہی تھی۔ میں نے بھی اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے اٹھتے ہوئے اسے دوبارہ بھرپور تعاون کی یقین دہانی کروائی اور کہا کہ اب ہم اس موضوع پر تبھی بات کریں گے جب سونیا ہمارے ساتھ ہوگی۔ یہ کہہ کر میں اس کے کیبن سے باہر آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ حالات کی ستم ظریفی نے مجھے کچھ اس طرح گھیر رکھا ہے کہ ایک مشکل سے ابھی چھٹکارا بھی نہیں ہوتا کہ دوسری گلے پڑ جاتی ہے۔ رانی اور سونیا کے معاملے کا اگرچہ میری اصلی مہم سے کوئی واسطہ نہ تھا اور میں اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے صاف انکار بھی کر سکتا تھا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ ان مجبور ماں بیٹی کی مدد کر کے شاید میرے گناہوں اور سینکڑوں انسانی زندگیوں کو ختم کرنے کا کچھ کفارہ ادا ہو جائے یا کم از کم میرے دل پر اتنی انسانی زندگیوں کے اتلاف سے پڑے بوجھ میں کچھ کمی ہی ہو جائے۔

بنگلہ دیش میں اندرون ملک چلنے والے اسٹیمر چپٹے ہوتے ہیں اور ان کے عقبی حصے میں لکڑی کے چپٹے شہتیروں سے بنا ایک بہت بڑا گول پنکھا نما چکر جس کا کچھ حصہ پانی میں ہوتا ہے، سٹیم انجن سے چلتا اور پانی کو پیچھے دھکیل کر اسٹیمر کو آگے بڑھاتا ہے۔ چپٹے پیندے کی وجہ سے اسٹیمر کم گہرے پانی میں

بھی جا سکتا ہے اور اس کی رفتار بھی نسبتاً تھوڑی ہوتی ہے۔ چٹاگانگ سے روانہ ہو کر اور سارے جنوبی بنگلہ دیش کا چکر کاٹ کر چوتھے روز شام کو یہ اسٹیمر دریائے پدما کے ڈیلٹے کی ایک بڑی شاخ کے قریب ہرن گھاٹا پر لنگر انداز ہوا۔ یہاں سے پانی اور ایندھن لے کر اگلے روز بعد دوپہر ہم دریائے پدما میں داخل ہوئے۔ یہاں کپتان کی مہارت دیکھنے کا موقع ملا۔ ڈیلٹا میں پانی کی گہرائی بہت کم اور جگہ جگہ پانی میں مٹی کے ٹیلے پانی سے سر نکالے دکھائی دیتے ہیں۔ ان ٹیلوں سے بچتے ہم بالآخر اس مقام پر پہنچے جہاں دریائے پدما ایک بھرپور دریا کی صورت میں یکجا بہتا ہے۔ یہاں سے تقریباً پچاس کلومیٹر اسی دریا کے کنارے کھلنا واقع ہے۔ ہمارے بائیں جانب قریب ہی بھارتی سرحد تھی اور ہم سندر بن میں داخل ہو چکے تھے۔

دنیا بھر میں دو قدرتی طلسم مشہور ہیں۔ ایک صحرا کا اور دوسرا جنگل کا۔ صحرا کا طلسم دیکھنے کا موقع تو مجھے بہت بعد میں ملا جب میں سن 78ء کے آخر میں بسلسلۂ ملازمت سعودی عرب گیا لیکن جنگل کا طلسم اب میں اور میرے ساتھی دیکھ رہے تھے۔ دنیا کا دوسرا سب سے بڑا گھنا جنگل اور شکارگاہ دریائے پدما کے دونوں اطراف میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ہمارا اسٹیمر پانی کے بہاؤ کے الٹی جانب آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا اور میں اور میرے سارے ساتھی عرشے پر کھڑے اس ہوشربا جنگل کا نظارہ کر رہے تھے۔ کسی جگہ دریا کا پاٹ اتنا چھوٹا ہو جاتا کہ جنگلی چیتے جست بھر کر اسٹیمر تک آ سکتے تھے اور کہیں پاٹ کی چوڑائی اتنی زیادہ ہو جاتی کہ اسٹیمر سے دونوں کنارے پچیس میٹر سے بھی زیادہ دور ہو جاتے۔ بانس کی مخصوص خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ کئی بادبانی کشتیاں بھی دریا میں چل رہی تھیں جن میں سے کچھ پر یا تو سامان خرید و فروخت لدا ہوا تھا اور بعض مچھیروں کی تھیں۔ دو تین لانچیں بھی ہمارے پاس سے گزریں۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ ہم دونوں اطراف میں صرف کناروں پر اگے درخت ہی دیکھ پائے لیکن ان کے پیچھے کیا تھا، ہمیں ان کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ ہمیں کئی بار درندوں مثلاً شیر اور چیتوں کی دھاڑیں بھی سنائی دیں۔ ایک مقام پر ہاتھیوں کا غول بھی گزرتے ہوئے محسوس ہوا کیونکہ سوکھے پتوں کے چرمرانے کی اتنی زیادہ اور مسلسل آواز آئی جیسے ان پر متعدد بار بھاری بھرکم وزن پڑ رہا ہو۔ نیز ہوا چلنے سے درختوں کی سرسراہٹ اور اس ماحول نے مل کر ایسا سماں باندھ دیا تھا جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں اطراف کے جنگل میں کہیں کہیں پگڈنڈیاں بھی دکھائی دیں۔ یہ غالباً ان چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کے باسیوں کی گزرگاہیں تھیں جن کے گاؤں جنگل کے شروع میں ہی واقع تھے۔ دونوں کناروں پر یہ پگڈنڈیاں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھیں اور یہیں پر چھوٹی کشتیاں بھی تھیں جو ان دیہاتوں میں رہنے والوں کو دریا کے آر پار لے جاتی تھیں۔ اسٹیمر کا کپتان بھی ہماری اس جنگل میں محویت کو دیکھ کر ہمارے پاس آ گیا اور اس نے بتایا کہ اصل جنگل تو دونوں کناروں سے ایک ایک میل اندر سے شروع ہوتا ہے۔ یہ تو دریا کے کنارے پر اگے درخت ہیں اور یہاں کے دیہات اسی ایک میل کے اندر واقع ہیں

ورنہ اصل جنگل تو اتنا گھنا ہے کہ سوائے اکا دکا شکار پارٹیوں کے کوئی بھی اندرونی حصے میں جانے کی جرأت نہیں کرتا اور یہ دیہاتی مچھلی پکڑ کر اور بانس کاٹ کر اپنی روزی کماتے ہیں۔

سات گھنٹے کے سفر کے بعد جنگل چھدرا ہونا شروع ہوا اور چند میل مزید آگے بڑھنے پر کھلنا آ گیا اور اسٹیمر گھاٹ پر لنگر انداز ہو گیا۔ میں کھلنا میں اپنی ملازمت کے دوران ایک مرتبہ آ چکا تھا۔ ان دنوں یہاں کا سلیم ہوٹل بہت مشہور تھا اور اسی ہوٹل میں چند روز میں نے قیام کیا تھا۔ اسٹیمر کے کپتان نے مجھے بتایا کہ اس ہوٹل کا مالک سقوط ڈھاکہ کے بعد یا تو مغربی پاکستان چلا گیا یا فسادات میں مارا گیا۔ ہوٹل اب بھی موجود تھا لیکن مالک کوئی ہندو تھا۔ ہم سب نے اسی ہوٹل میں خود کو بنگلہ دیشی، بھارتی اور آسامی ظاہر کرتے ہوئے کمرے لیے اور وہ رات ہم نے آرام کرنے میں گزاری۔ میں نے رانی کے بھید کو ظاہر نہ کرتے ہوئے قیصر سے کہا کہ ہمارے کھلنا آنے کا مقصد یہاں کی ایک مقتدر شخصیت رفیق الاسلام سے ملنا اور اس سے چند معاملات طے کرنے ہیں لہٰذا ہم پہلے اس سے ملیں گے اور بعد میں شکار کے لیے سندر بن جائیں گے۔ مجھے تھوڑی بہت بنگالی زبان آتی ہے۔ دوسرے روز قیصر، میں اور میرا نمبر ٹو بازار گئے۔ کھلنا میں آغاز پاکستان سے ہی فوجی چھاؤنی تھی اور بھارتی بارڈر قریب ہونے کی وجہ سے یہاں ایک بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تھا جو جیسور کے ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے منسلک تھا۔ چھاؤنی ہونے کے باعث شہر دو انتظامی حصوں میں تقسیم تھا۔ 25 مارچ سن 71ء سے قبل اسی چھاؤنی میں ایسٹ پاکستان رجمنٹ بھی متعین تھی جس میں خال خال مغربی پاکستانی فوجی بھی تھے اور اس کا کمانڈنگ آفیسر بھی مغربی پاکستان کا ایک کرنل تھا۔ اسی رجمنٹ نے بغاوت کر کے اپنے مغربی پاکستانی ساتھیوں اور اپنے کمانڈنگ آفیسر کو ہلاک کر کے اس کی حاملہ بیوی اور گیارہ سالہ بچے کو بھی مار ڈالا تھا اور اس کی بیوی کا پیٹ چاک کر کے بچے کو نکالا اور دونوں بچوں کے سر کاٹ کر مردہ ماں کے سینے پر رکھ کر تصویریں اتاری تھیں جنھیں بین الاقوامی رسائل نے 25 مارچ کے پاکستان کے ملٹری ایکشن لینے کے بعد امن کے چند ماہ کے دوران شائع کیا تھا۔

کھلنا شہر اور چھاؤنی دونوں کی حالت ابتر تھی۔ بھارت نے ظاہری طور پر تو مشرقی پاکستانیوں کی ’’ہمدردی اور انھیں پاکستان سے آزادی‘‘ دلانے کے بہانے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تھا لیکن سقوط ڈھاکہ کے بعد مسلمانوں سے اپنی ازلی دشمنی کے باعث پورے مشرقی پاکستان کی جو اب بنگلہ دیش بن چکا تھا، اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ مشرقی پاکستان کی انڈسٹری، ریلوے اور فوجی چھاؤنیاں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بھی ان کی توڑ پھوڑ، لوٹ مار اور تباہی کا خصوصی نشانہ بنیں۔ بھارت کی اسی دوستی کے پردے میں چھپی دشمنی کا جب بنگلہ دیشیوں کو احساس ہوا اور ان کی آنکھوں نے بھارت کی عیاری اور دشمنی دیکھی تو اس سارے سانحے کے موجب مجیب الرحمٰن کو جو ان کا انتہائی ہر دل عزیز لیڈر اور Freedom Fighter تھا، بمعہ سارے خاندان کے بے دردی سے ہلاک کر دیا۔ شومئی قسمت سے اس کی بیٹی حسینہ

واجد ان دنوں بیرون ملک تھی، لہٰذا اس فیملی میں سے صرف وہی باقی بچی اور آج بھی بھارت کے زیر سایہ اپنی جذباتی قوم کو بھارتی بھونپو سے بے وقوف بنا رہی ہے۔ کھلنا شہر اور چھاؤنی دونوں کی حالت انتہائی خستہ تھی۔ بہت سے عمارتیں جو سن 71ء کی بھارتی گولہ باری سے متاثر ہوئی تھیں، اس وقت تک اسی حالت میں تھیں۔ رفیق الاسلام کھلنا کی مشہور و معروف شخصیت تھا اور اس کے بارے میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جب بھارتی فوجیں دسمبر سن 71ء میں کھلنا میں داخل ہوئیں تو انھیں خوش آمدید کہنے اور بھارتی فوجی افسران اور جوانوں کو پھولوں کے ہار پہنانے میں وہ پیش پیش تھا۔ کھلنا چھاؤنی کے علاقے میں اس کا عالیشان بنگلہ تھا۔ یہاں پر اس کے اثر و رسوخ اور چھاؤنی میں رہائش گاہ ہونے کی وجہ سے میں نے اپنی سٹریٹجی بدلی اور اس سے پہلی ملاقات میں ہی سونیا کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کو مؤخر کر دیا۔ ہمارے لباس بھی ایسے نہیں تھے کہ ہمیں وہ کوئی اہمیت دیتا۔ بنگلے کے برآمدے میں آدھ گھنٹہ انتظار کروانے کے بعد جب وہ ہمارے پاس آیا تو ہم نے اسے یہ بتایا کہ ہم بھارتی ہیں اور ہمارے ساتھ ہمارے بھارتی اور تھائی دوست بھی ہیں۔ سندر بن میں شکار کا شوق ہمیں یہاں لے آیا ہے اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ صرف آپ کی مدد اور تعاون سے ہی ہم شکار کے لیے گائیڈ اور ضروری سامان حاصل کر سکتے ہیں۔ میں نے خود کو بھارتی جنرل چوہدری کا قریبی عزیز بتا کر متعارف کرایا (سن 65ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران بھارتی کمانڈر انچیف چوہدری جسے بھارت میں بنے وجینت نامی ٹینکوں پر بڑا ناز تھا اور جن کا چونڈہ کے میدان جنگ میں پاکستانی فوج نے Sitting Ducks (بیٹھی ہوئی بطخوں) کی طرح اپنی آر آر اور بزوکا سے اتنی اچھی طرح سے شکار کیا تھا کہ ان ٹینکوں کی رجمنٹس کو جنھیں جنرل چوہدری نے Black Elephants (سیاہ ہاتھی) کا نام دے کر ناقابل تسخیر بیان کیا تھا، خود ان کی فوج کے لیے راجہ پورس کے ہاتھی ثابت ہوئیں۔ انھی ٹینکوں اور پاکستان پر بے خبری میں حملہ کرنے کے باعث جنرل چوہدری نے دعویٰ کیا تھا کہ 6 ستمبر سن 65ء کی شام کو وہسکی کا پیگ وہ لاہور جم خانہ میں پیئے گا۔ اس نے بھارتی حکومت کو اپنی کامیابی کا اس حد تک یقین دلایا تھا کہ بھارتی محکمہ اطلاعات نے چاندنی چوک دہلی کے ایک بازار میں دکانوں کے بورڈ اردو میں لکھوا کر اور اس بازار میں اپنے فوجیوں کو گھومتے پھرتے دکھا کر ایک فلم بنا کر دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ یہ بھارتی فوجی لاہور کے انارکلی بازار میں گھوم رہے ہیں۔ یہ فلم BBC نے اپنے ٹیلی ویژن پر بھی دکھائی تھی حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ بھارتی فوجیں پاکستان میں بنی BRB نہر کو بھی عبور نہ کر سکیں اور باٹا پور تک ان کی پیش قدمی کو روک کر پاکستانی فوج نے انھیں جو پیچھے دھکیلنا شروع کیا تو جنگ بندی کے وقت بھارت کا پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ بمعہ ان کے خاصے بڑے قصبے کھیم کرن تک پاکستانی فوج کے قبضے میں تھا۔ جنرل چوہدری کی لاہور کے جم خانہ میں شراب پینے کی خواہش بھارت کے لیے ایک دہشت ناک خواب ہی بنی رہی اور جنگ کے خاتمے کے بعد اس بڑ بولے جنرل کو کمانڈر انچیف کے عہدے سے ہٹا دیا گیا) رفیق الاسلام نے

جنرل چوہدری سے رشتہ داری اور بھارتی فوج سے میرے تعلقات کے پیش نظر مجھے اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے کہا، ''آپ کی ضرورت کی ہر چیز میں مہیا کر دوں گا۔ شکار کا لائسنس (پرمٹ) بھی آپ کو دلوا دوں گا لیکن اس کے لیے آپ کو خاصی رقم خرچ کرنا پڑے گی۔'' ''آپ خرچ کی پرواہ نہ کیجیے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ڈالروں کی گڈی نکال کر لہراتے ہوئے اسے دکھا کر پھر اپنی جیب میں ڈال لی۔ میں نے اسی قسط کے آغاز میں صحرا اور جنگل کے طلسم کا ذکر کیا ہے۔ تیسرا طلسم امریکی ڈالروں کا ہے۔ جس میں آج کل دنیا بھر کے تمام ممالک جکڑے ہوئے ہیں۔ میرے پاس ڈالروں کی جھلک دیکھ کر رفیق الاسلام بھی ان کے طلسم کے شکنجے میں آ گیا۔ ''ارے آپ برآمدے میں کیوں بیٹھے ہیں۔ یہاں تو بہت مچھر ہیں۔ میں بھی کتنا احمق ہوں کہ مجھے بھی اس کا احساس نہ ہوا۔ چلئے اندر ڈرائنگ روم میں چلیں۔''
رفیق ہمیں برآمدے سے اپنے ڈرائنگ روم میں لے آیا اور اپنے دو تین ملازموں کو بلا کر کہا کہ ان معزز مہمانوں کے لیے چائے مٹھائی وغیرہ لے کر آئیں۔ ''شکاری تو ہمیشہ خود کو چاک و چوبند رکھنے کے لیے پیتے ہیں۔ میرے پاس اسکاچ وسکی کا بھی انتظام ہے۔ آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں اور ہماری میزبانی سے لطف اندوز ہوں۔ اس کے علاوہ اگر آپ کو کسی خاص شے کی طلب ہو تو وہ بھی پیش کر دی جائے گی۔'' مجھ سے فوری بے تکلفی اور اپنائیت ظاہر کرتے ہوئے میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے رفیق الاسلام نے مسکراتے ہوئے سرگوشی میں مجھے کہا، ''یہاں کی عورتیں سانولی تو ہیں لیکن مچھلی کھانے والی عورت کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ میں آپ کی بھرپور میزبانی کر کے خوشی محسوس کروں گا۔''
ڈالروں کا طلسم سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ میں نے ''شکار'' کے آگے چارہ ڈالنے کی غرض سے ہزار ڈالر رفیق کو دیتے ہوئے کہا، ''فی الحال یہ ابتدائی اخراجات کے لیے تھوڑی سی رقم قبول کریں۔ مزید جتنے بھی اخراجات ہوں گے، آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔'' رفیق کو میں نے بتایا کہ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ درشن ہوٹل (سابقہ سلیم ہوٹل) میں ٹھہرا ہوں۔ اس سے رات کے کھانے کی دعوت کی معذرت کرتے ہوئے اور آئندہ کسی روز کے لیے ملتوی کرنے کا کہہ کر ہم واپس لوٹے۔ ہم نے ہوٹل میں کمرے لیتے ہوئے ایک عقلمندی کی تھی کہ اپنی ساتھی خواتین اور سردار کے لڑکے کو بنگلہ دیشی مسافر لکھوایا تھا جبکہ خود کو بھارتی اور تھائی اور ان سے اپنا کوئی تعلق واسطہ ظاہر نہیں کیا تھا، ہوٹل والوں نے بھی انھیں اسٹیمر کے مسافر سمجھتے ہوئے کمرے دیے تھے۔ ڈالروں کا چارہ کام دے چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ رفیق اگر آج شام نہیں تو کل ضرور مجھے ملنے ہوٹل آئے گا اور ہمیں آئندہ کی منصوبہ بندی بھی کرنی تھی۔

دسواں باب

حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے آئندہ لائحہ عمل کے لیے جو منصوبہ بندی کی اس کی ابتدا میں نے رانی سے ملنے سے کی۔ میں نے اسے رفیق سے اپنی آج کی ملاقات کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا، ''ہمیں سونیا کو رفیق کے چنگل سے چھڑانے اور بحفاظت یہاں سے نکلنے کے لیے سب سے پہلے رفیق کو اپنے دام میں پھانسنا پڑے گا۔ رفیق سے ڈائریکٹ مڈبھیڑ سے میں نہیں گھبراتا اور نہ ہی میرے ساتھی میرا کوئی بھی حکم ماننے سے انکار کریں گے چاہے اس میں ان کو جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس طرح ہم سونیا تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ اس نے تمہاری بچی کا نام سونیا ہی رکھا ہے یا کسی اور نام سے اسے یہاں رکھا گیا ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ ہم اس کی عمر کی ہر بچی کے بازو پر قدرتی نشان دیکھ کر اسے تلاش کریں۔ اگر رفیق کو ہلاک کرنے سے بھی ہمیں سونیا مل سکتی تو ہم یہ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ رفیق کنٹونمنٹ کے علاقے میں رہتا ہے اور بقول تمہارے اور آج کی ملاقات سے مجھے بھی یہی احساس ہوا ہے کہ چھاؤنی کے افسران سے بھی اس کے خاصے تعلقات ہوں گے اور وہ کافی اثر و رسوخ کا مالک ہوگا۔ مجھے اس سے سندربن میں شکار کرنے میں اس کی معاونت حاصل کرنے کے بہانے اس سے بے تکلفانہ تعلقات استوار کرنے ہوں گے اور آج اس سے ملاقات کے دوران میں نے اسے ایک ہزار ڈالر دے کر اس کام کی ابتدا کر دی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے ذرا سا بھی شک نہ ہونے پائے کہ ہم رانگاماٹی سے آئے ہیں اور تم اور تمہارا بیٹا ہمارے ہمراہ اسی ہوٹل میں مقیم ہو۔ ہمارا اصل مقصد سونیا کا حصول ہے لہٰذا ابھی سے ہم پوری احتیاط برتیں گے۔ اس لیے لہٰذا کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ تم اور تمہارا بیٹا دراصل کون ہیں یا ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی ہیں۔'' میں نے اسے ایک ہزار ڈالر دیتے ہوئے کہا کہ آئندہ ہوٹل اور کھانے پینے

کے اخراجات اس رقم سے ادا کرنا اور مجھے جب بھی تم سے ملنے کی ضرورت ہوگی میں رات کو دو بجے تمہارے کمرے کا دروازہ دوبار تسلسل سے اور دوبار چند لمحوں کے وقفے سے کھٹکھٹاؤں گا اور تم ضرورت پڑنے پر اپنے لڑکے سے اسی وقت اور اسی طرح میرا دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے بلوانا۔ اپنے لڑکے کو بھی سختی سے تاکید کردو کہ وہ کمرے سے ہرگز ہرگز باہر نہ نکلے۔ باقی خواتین ساتھیوں کو بھی کہنا کہ صرف تمہارے ذریعے ہی مجھ سے رابطہ کریں۔ رانی نے ایک بڑی عقلمندی کی بات کی کہ وہ، اس کا لڑکا اور دیگر خواتین بنگلہ دیشی باشندوں کے طور پر یہاں ٹھہری ہیں اور ہوٹل والوں کے ذریعے ڈالر بنگلہ دیشی کرنسی میں تبدیل کرانے سے ان پر شک کیا جاسکتا ہے۔ یہ واقعی بڑی دُور اندیشی کی بات تھی۔ بنگلہ دیش ان دنوں فارن ایکسچینج کے سخت ترین قحط سے دوچار تھا اور کھلی مارکیٹ میں ڈالر سرکاری ریٹ سے چار گناہ زیادہ ویلیو رکھتا تھا۔ کسی بنگلہ دیشی کا اپنے ملک میں ہی امریکی ڈالر دے کر بل ادا کرنا سب کو شک وشبہے میں ڈال سکتا تھا۔ میں نے رانی سے ڈالر واپس لے لیے اور مزید ہدایات دے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ دوسرے روز میں نے نمبر ٹو کو دو ہزار ڈالر دیے اور رضی کی رہنمائی میں اسے بازار بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ ضرورت کا کچھ سامان خرید کر واپس آگئے۔ انہوں نے بڑی آسانی سے 105 ٹکا (بنگلہ دیشی کرنسی) فی ڈالر کے عوض تبدیل کروائے تھے۔ ایک لاکھ ٹکے تو میں نے رات کو رانی کو دیے اور باقی ایک لاکھ سے زیادہ ٹکے اپنے ساتھیوں میں بانٹ دیے تاکہ وہ بھی اپنی ضرورت کی اشیا لے سکیں۔

حسب توقع دوسرے دن گیارہ بجے ہی رفیق درشن ہوٹل میں مجھے ملنے آگیا اور کہنے لگا کہ دو تین روز میں شکار کا پرمٹ مل جائے گا۔ میں نے باتوں باتوں میں اسے کریدا تو معلوم ہوا کہ اس کے سول اور فوجی حکام سے تعلقات بے شک تھے لیکن اتنے گہرے نہیں جتنے وہ ظاہر کرتا تھا۔ اس کی پہنچ صرف تھانے اور DSP تک اور سول میں AC تک تھی۔ فوج میں بھی میجر سے اوپر کا کوئی عہدیدار اس کا بے تکلف دوست نہ تھا۔ میرے خیال کے مطابق رفیق نے پاکستان دشمنی اور بھارتی فوج کے استقبال کرنے میں جو نمایاں کردار ادا کیا تھا یہ اسی کے باعث تھا کہ نہ تو حکومت اور فوج کے اوپر کے لیول تک اس کی رسائی تھی اور نہ ہی اس کے اس کردار کو سراہا گیا تھا۔ غداری کے جراثیم ایک بار کسی میں سرائیت کرجائیں تو پھر کبھی ختم نہیں ہوتے۔ جس نے ایک بار اپنے ملک اور وطن سے غداری کی، وہ دوبارہ بھی کرسکتا ہے۔ مجیب الرحمٰن کو اپنے وطن سے غداری کی سزا پاکستانیوں نے نہیں بلکہ بنگلہ دیشیوں نے دی تھی۔ پاکستان نے تو ملک کے دولخت ہونے کا انتہائی بڑا سانحہ بھی برداشت کرکے اسے صحیح سلامت In one piece بنگلہ دیش بھیج دیا تھا۔ وطن کے غداروں کا انجام ہمیشہ انتہائی بھیانک اور عبرت ناک ہوتا ہے۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ کو برطانوی فوج نے اس کے خسر حکیم احسن کی مخبری پر ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کیا تھا اور اس کی غداری کی وجہ سے برصغیر سے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ یہی حکیم احسن جب انگریزوں سے اپنی وطن فروشی اور غداری کا انعام لینے گیا تو تاریخ کے

مطابق انگریزوں نے اسے کہا کہ جب تم اپنے وطن سے غداری کرسکتے ہو تو تم سے یہ بھی بعید نہیں کہ ہم سے بھی غداری کرو۔ اسی غدار کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے بجائے انعام واکرام سے نوازنے کے توپ دم (توپ کے منہ پر باندھ کر توپ چلادی) کردیا اور اس کے غلیظ جسم کے چیتھڑے فضا میں بکھر گئے۔ میسور کے حکمران سلطان ٹیپو سے غداری کرکے میر صادق نے جو ٹیپو کا وزیر تھا، انگریزوں سے جنگ کے دوران سرنگا پٹم کے قلعے کے دروازے کھلوا کر انگریزوں کی فوج کو اندر داخل ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ٹیپو سلطان جس کے نام سے ایسٹ انڈیا کمپنی کانپتی تھی، انگریزوں سے دست بدست لڑتا ہوا یہ کہہ کر شہید ہوا کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ ٹیپو کی شہادت کے بعد انگریزوں نے اس کی بہادری اور وطن پرستی کا اعتراف کرتے ہوئے پورے شاہی اعزاز کے ساتھ اسے دفن کیا۔ اس وقت آسمان پر یکایک بادل چھاگئے اور ان کی ہیبت ناک چمک اور کڑک نے اس مرد مجاہد کو آخری سلامی دی۔ میر صادق کو اس کی غداری کے عوض کمپنی کی حکومت نے سات پشتوں تک کا وظیفہ منظور کیا۔ بات کچھ لمبی ہورہی ہے لیکن ہے دلچسپ اور عبرتناک بھی، لہٰذا اسے تحریر کررہا ہوں۔ انگریزوں کے برصغیر پر سو سالہ دور حکومت میں کبھی بھی انگریز سول حکمرانوں کی تعداد ڈھائی تین ہزار سے زیادہ نہیں رہی۔ ان کے سارے دور حکومت کا انتظام برصغیر کے ہی باشندوں نے ملازمت کرکے اور زمینیں لے کر وڈیرے، سردار اور جاگیردار بن کر سنبھلا۔ اگر آج کے دن سرداروں، وڈیروں اور جاگیرداروں اور خطاب حاصل کرنے والوں کا شجرۂ نسب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے دادا، پردادا انگریزوں کے کتے نہلایا کرتے تھے یا پھر کتوں کی طرح ان کے سامنے دم ہلاتے تھے۔ وطن سے غداری کے عوض ہی ان کو یہ جاگیریں اور خطاب ملے جن پر ان کی اولاد آج بھی ''فخر'' کرتی ہے۔ میر صادق کے ورثا جب ہر مہینے اپنے وظیفے کی رقم لینے سرکاری خزانے جاتے تو بالکل آج کل کی عدالتوں کی طرح چپڑاسی باآواز بلند انہیں اس طرح پکارتا ''میر صادق غدار کے ورثا حاضر ہوں؟'' کیونکہ خزانے کے مہتمم اور دیگر سارے اہلکار برصغیر کے باشندے ہی تھے اور میر صادق کی غداری کی وجہ سے ان کی آزادی انگریزوں کی غلامی میں بدل گئی تھی۔ متحدہ ہندوستان میں سینکڑوں ریاستیں محض اس لیے بنا دی گئیں کہ ان کے راجے، مہاراجے اور نواب انگریزوں کی جوتیاں چاٹتے تھے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں لاہور کے ایچی سن کالج میں صرف انہی جاگیرداروں اور رؤسا کی اولاد کو داخلہ ملتا تھا جنہیں انگریزوں سے وفاداری کی باقاعدہ ترغیب دی جاتی تھی۔ پنجاب کے سب سے بڑے جاگیردار ٹوانے تھے۔ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں ان کے جد امجد انگریزی فوج میں سپاہی تھے اور جنگ میں رنجیت سنگھ کی انگریزوں سے شکست کے بعد ان حضرت کا ہاتھ مسلمان قیدیوں کے سر کاٹتے کاٹتے سوج کر تلوار کے دستے میں پھنس گیا تھا۔ حسن ابدال کی مشہور ومعروف حیات فیملی کے اس دور کا سربراہ کرنل نکلسن کا خدمت گار سپاہی تھا جو اس کے زخمی ہونے پر اسے اٹھا کر ایک چٹان تلے لے گیا۔ اس

"خدمت" کے عوض اسے ڈھیر ساری زمین دے کر جاگیردار بنا دیا گیا۔ چوری کا مال اور لاٹھیوں کے گز کی مثال کے مصداق انگریزوں کی جی حضوری میں جس نے جتنی زیادہ دم ہلائی اسے اتنی ہی زیادہ زمینیں اور انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ برصغیر کی تمام ریاستوں کے والیوں نے جتنی غداری کی انہیں اتنے ہی انعام و اکرام اور خطابات دیے گئے۔ ان میں سب سے نمایاں نظام حیدرآباد تھا جس نے ٹیپو سلطان کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اسے ملکہ وکٹوریہ نے دوسرے خطابات کے ساتھ "فرزند ارجمند" کا خصوصی خطاب دیا تھا۔ یہ تھی اور ہے غداروں کی اصلیت جسے میں نے مختصر ترین الفاظ میں تحریر کیا ہے۔ رفیق الاسلام کے بنگلہ دیشی حکومت سے مراسم اس لیے بھی گہرے نہ ہوسکے کیونکہ وہ مسلمان تھا اور مسلمانوں کا ازلی دشمن بھارت اس وقت بنگلہ دیش پر بالکل اسی طرح چھایا ہوا تھا جیسے آج کل پاکستان پر امریکہ۔

رفیق سے ہوٹل میں ملاقات کے دوران میں نے اس پر اپنی امارت کا سکہ بٹھانے کے لیے تین ہزار ڈالر دے کر کہا کہ انہیں بنگلہ دیشی کرنسی میں تبدیل کروا دے تاکہ میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے مقامی اخراجات پورے کروں۔ رفیق دو گھنٹے بعد واپس لوٹا اور مجھے 80 ٹکہ فی ڈالر کے حساب سے بنگلہ دیشی کرنسی دی۔ اس کی بے ایمانی اور بدنیتی اسی بات سے ظاہر ہوگئی تھی کیونکہ میں نے صبح ہی 105 ٹکہ فی ڈالر کے حساب سے دو ہزار ڈالر تبدیل کروائے تھے۔ رفیق کے چہرے اور آنکھوں سے لومڑی کی مکاری ٹپکتی تھی اور اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے مجھے بھی اس سے زیادہ عیاری اور ہشیاری دکھانے کی ضرورت تھی۔ رفیق نے آج پھر مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا لیکن میں نے طبیعت کی خرابی اور تھکاوٹ کا کہہ کر ٹال دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد ہوٹل سے جائے تاکہ میں کانونٹ اسکول سے کسی طرح معلوم کرسکوں کہ وہاں واقعی سونیا نام کی کوئی لڑکی پڑھتی ہے۔ مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ اپنے قد وقامت کے باعث سونیا کی تلاش میں مجھے پہچان نہ لیا جائے اور ہم اپنی منزل سے اتنے قریب پہنچ کر بھی اسے پا نہ سکیں۔ کانونٹ میں زیر تعلیم بچیوں کا ہوسٹل بھی اسکول کی حدود میں واقع تھا۔ میں نے رضی کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ہوسٹل کے چوکیدار سے پیسے کے زور پر دوستی کرے اور اس کے ذریعے سونیا کا پتہ چلائے۔ رفیق نے اسے یقیناً اپنے گھر میں تو رکھا نہیں ہوگا۔ اگر اس کا کوئی وجود تھا تو وہ یقیناً ہوسٹل میں رہتی ہوگی۔ رضی شام کو واپس لوٹا اور مجھے اپنی کارکردگی بتاتے ہوئے کہا کہ چوکیدار سے اس نے اپنی باتوں سے دوستی کا آغاز تو کر دیا ہے لیکن آج اس نے سونیا کے متعلق کوئی بات نہیں کی کیونکہ دوستی کے پہلے دن ہی اس طرح کی چھان بین چوکیدار کو شک میں ڈال سکتی تھی۔

آئندہ دو روز رضی کے کانونٹ اسکول کے ہوسٹل کے چوکیدار سے دوستی بڑھانے اور مطلب کی بات زبان پر لانے میں گزرے۔ ان دو دنوں میں رفیق بھی دو بار مجھے ہوٹل میں ملنے آیا۔ وہ ہر بار مجھے اپنے گھر پر کھانے کی دعوت ضرور دیتا اور میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے معذرت کرلیتا۔ رفیق کو

ان ملاقاتوں کے دوران میں نے یہ بھی کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ سندربن میں شکار کی شوقین غیرملکی پارٹیوں کے لیے کھلنا میں ایک بیس کیمپ (Base Camp) قائم کروں جہاں سے انہیں مزدور، گائیڈ، شکار کے دوران خورد و نوش کے سامان کی فراہمی کے علاوہ بڑے شکار کے لیے مخصوص رائفلیں مثلاً Express 555 اور ان کا ایمونیشن وغیرہ بھی مہیا کیا جاسکے۔ اس طرح ان غیرملکی شکار پارٹیوں سے ہم اصل اخراجات سے دو تین گنا منافع اور وہ بھی فارن ایکسچینج میں کما سکتے ہیں۔ میں بھارتی شہری ہونے کے باعث یہاں پر یہ نہایت منفعت بخش کاروبار نہیں کرسکتا اور میری خواہش ہے کہ کوئی مقامی بنگلہ دیشی اپنے نام سے بیس کیمپ بنائے اور دیگر انتظام سنبھالے۔ جہاں تک سرمائے کا تعلق ہے تو اس کی فراہمی اور شکاری رائفلوں کا حصول میری ذمہ داری ہوگی اور میں اپنے بنگلہ دیشی پارٹنر کو منافع میں سے برابر کا حصہ دینے کو تیار ہوں۔ میری بات سن کر رفیق فوراً بول اٹھا، "میرے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ سب کام میں بخوشی اور بہت آسانی سے کرسکتا ہوں۔ شکار پارٹیوں کے لیے شکار کے پرمٹ کا حصول میرے لیے بہت آسان ہے۔ نہایت کم معاوضے پر میں مزدوروں اور گائیڈز کا انتظام بھی کرسکتا ہوں جن کا بھرپور معاوضہ ہم غیرملکیوں سے لیں گے۔ بیس کیمپ کے لیے اپنے گھر کا ایک حصہ مخصوص کرکے یا شہر میں کوئی مناسب جگہ کرائے پر لے کر اس کام کا آغاز کرسکتے ہیں۔" "کیا آپ اپنی وزارت خارجہ کے ذریعے غیرممالک میں اپنے سفارت خانوں کے ذریعے کھلنا میں شکار کی سہولت مہیا ہونے اور شکار کے لیے غیرملکیوں کو راغب کرنے کا بندوبست کرسکتے ہیں؟ اس کام میں کامیابی کی صورت میں آپ کی حکومت کو بھی اچھا خاصا زرمبادلہ مل سکے گا۔" میرے اس سوال پر رفیق سوچ میں پڑگیا اور پھر بولا، "میں اس کے لیے بھی پوری کوشش کروں گا۔" میں نے رفیق سے یہ سوال محض اس لیے پوچھا تھا کہ اس کے حکومتی حلقوں میں رسائی کی حد کو جان سکوں۔ اپنی باتوں اور بیس کیمپ بنانے کے پروگرام بنانے میں ہم نے دونوں ملاقاتوں کا بیشتر وقت گزار دیا۔ تیسرے روز شام کو رضی نے مجھے بتایا کہ چوکیدار نے اسے بتایا ہے کہ ہوسٹل میں سونیا نام کی کوئی بچی نہیں رہتی۔ باتوں باتوں میں رضی نے اس سے یہ بھی معلوم کرلیا ہے کہ ہوسٹل میں مقیم بچیوں کے والدین اور ورثا ہر ہفتے یا پندرہ روز بعد ان سے ملنے اور انہیں (Week end) اتوار کی چھٹی کے لیے اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ کوئی بھی ایسی بچی نہیں ہے جسے لینے کوئی نہ آتا ہو۔ رضی نے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ رفیق الاسلام جو کھلنا میں شیطان کی طرح مشہور تھا کبھی بھی اس ہوسٹل میں نہیں آیا۔ رضی نے مزید کہا کہ چوکیدار پر خاصے پیسے خرچ کرکے اس نے کانونٹ اسکول کی ایک نائب منتظم خاتون کا نام اور پتہ لے لیا ہے جسے اسکول میں ملازمت کرتے ہوئے بیس برس سے بھی زیادہ عرصہ ہوچکا ہے اور وہ ہر بچی کے کوائف سے بخوبی واقف ہے۔ ہمیں اب تک سونیا کی تلاش میں ذرا سی بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی اور ہم اب تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ میں نے رضی کی تجویز مان لی اور تھوڑی دیر بعد ہی ہم منز

ڈیوڈ کے گھر کی طرف چلے پڑے۔ میں نے رضی کے علاوہ قیصر اور نمبر ٹو کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا۔ مسز ڈیوڈ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ وہ بیوہ تھی اور جب ہم اس کے اوسط درجے کے گھر پہنچے تو وہ ایک نوجوان کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھی۔ میں نے تینوں ساتھیوں کو اس کے مکان کے قریب ہی موجود رہنے کا کہہ کر اس کی کال بیل دبائی۔ دروازہ ایک نوجوان نے کھولا۔ میں نے اسے ایک ہندوانہ نیا نام بتا کر کہا کہ مجھے مسز ڈیوڈ سے ابھی اور بہت ضروری ملنا ہے۔ نوجوان شراب پیے ہوئے تھا اور اس کے منہ سے دیسی شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔ اس نے مجھے کہا کہ تم نے ہماری محفل کے رنگ مین بھنگ ڈال دی ہے۔ کیا تم اپنی ملاقات کسی اور وقت کے لیے ملتوی نہیں کرسکتے ہو؟ یہ نوجوان یقیناً کرسچین تھا کیونکہ وہ صحیح تلفظ کے ساتھ انگریزی بول رہا تھا۔ ہوٹل سے چلتے وقت میں دس ڈالروں والی ایک گڈی ہمراہ لایا تھا۔ میں نے اسے بیس ڈالر دیتے ہوئے کہا، ’’مجھے مسز ڈیوڈ سے بہت ضروری ملنا ہے اور ان بیس ڈالروں سے تم اس سے بھی زیادہ رنگین محفل کہیں اور بھی سجا سکتے ہو۔‘‘ ڈالر جیب میں ڈالتے ہوئے وہ نوجوان اندر گیا اور چھ سات منٹ میں ہی باہر آکر بولا، ’’تم اندر جاسکتے ہو کیونکہ اب میں جا رہا ہوں، Have a nice time (اچھا وقت گزارنا)‘‘ کہہ کر وہ نوجوان چلا گیا اور چند لمحوں بعد ہی میں مسز ڈیوڈ کے ڈرائنگ روم میں تھا۔ جس کا انتہائی معمولی فرنیچر اور اس کی خستگی سے مسز ڈیوڈ کی مالی بدحالی ظاہر تھی۔ مقامی شراب کی دو بوتلیں میز پر پڑی تھیں اور مسز ڈیوڈ شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسی ہندوانہ نام سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اسے کہا میں ایک ضروری اور اہم کام سے تمہارے پاس اس وقت آیا ہوں، کیا تم مجھے بیٹھنے کا نہیں کہو گی؟‘‘ برصغیر کا کرسچین خواہ کسی بھی طبقے کا ہو، تہذیب اور شائستگی میں وہ اپنے ہم عصر ہندو اور مسلمانوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ مسز ڈیوڈ تو اینگلو پاکستانی تھی۔ بڑے معذرت خواہانہ لہجے میں اس نے کہا کہ وہ اس وقت ایک بالکل اجنبی کو اپنے گھر میں دیکھ کر اور دیسی شراب کے نشے کے زیر اثر ہونے کے باعث Receive کرنے کے آداب سے غافل ہوگئی تھی۔ مجھے اپنے سامنے بڑی بوسیدہ کرسی پر بٹھا کر اس نے مجھے مے نوشی میں شریک ہونے کی پیش کش کرتے ہوئے کہا، ’’یہاں پر صرف یہی میسر ہے۔‘‘ میرے انکار پر وہ بولی، ’’میرے والد انگریز اور ماں بنگالن تھی۔ والد تو میری پیدائش سے پہلے سے ہی انگلینڈ چلے گئے اور پھر کبھی واپس نہ لوٹے۔ میری ماں نے بھی عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ جوان ہونے پر ایک اینگلو پاکستانی سے میری شادی ہوگئی۔ میرے شوہر مسٹر ڈیوڈ کا کھلنا کے کانونٹ میں تبادلہ ہوگیا اور چند ماہ بعد ہی دریا میں تیرتے ہوئے وہ ڈوب گئے۔ میری مدد کرتے ہوئے کانونٹ کی انتظامیہ نے مجھے یہاں ملازمت دے دی اور تبھی سے میں یہاں زندگی کے دن گزار رہی ہوں۔ آپ فرمائیں کہ مجھ سے کس کام کے لیے آپ نے اس وقت غریب خانے پر آنے کی زحمت کی؟‘‘ میں مسز ڈیوڈ سے چند منٹوں کی گفتگو، گھر کی خستہ حالی اور نوجوان کے ساتھ اس کی مے نوشی سے بھانپ گیا تھا

کہ وہ خاصی آزاد خیال ہے اور اسے پیسوں کی بھی بہت ضرورت ہے۔ بلاوجہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے میں نے ڈائریکٹ اپنے مطلب کی بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈالروں کی گڈی میں نے جیب سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ’’مسز ڈیوڈ! تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے اور مجھے کچھ انفارمیشن چاہیے۔ تمہاری اور میری ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ ڈالر بہترین ذریعہ ہیں۔ تم میری مطلوبہ انفارمیشن مجھے دو اور اس انفارمیشن کے عوض میں ڈالر تمہارے سامنے رکھتا جاؤں گا۔ جتنی زیادہ اور مطلوبہ اطلاع تم مجھے دوگی اتنے ہی ڈالر تمہارے سامنے آتے جائیں گے۔ بولو، کیا تمہیں یہ سودا منظور ہے؟‘‘ مسز ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے دس ڈالر اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا، ’’کیا سونیا نام کی کوئی لڑکی تمہارے سکول میں پڑھتی ہے جس کا نام شاید کچھ اور ہو لیکن اس کے بازو پر ایک پیدائشی بڑا گول نشان ہے؟‘‘ مسز ڈیوڈ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ’’ایسی بھی کوئی بچی اس سکول میں نہیں پڑھتی۔‘‘ مزید دس ڈالر دے کر میں نے پھر پوچھا، ’’تم کسی ایسی بچی کو جانتی ہو جسے یہاں کی مشہور شخصیت رفیق الاسلام کبھی بھی ملنے آیا ہو؟‘‘ مسز ڈیوڈ کچھ دیر سوچتے ہوئے بولی، ’’میں رفیق کو جانتی ہوں، وہ ایک عیاش، بدمعاش اور عیار انسان ہے۔ میں اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اس کی بدمعاشی کا شکار بھی ہوچکی ہوں لیکن پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ سکول یا ہوسٹل میں کسی سے کبھی بھی ملنے نہیں آیا۔‘‘ میں مایوس ہوچلا تھا۔ میرا آخری کارڈ سونیا کی تصویر تھی۔ ’’یہ قریباً سال دو سال پہلے کی تصویر ہے۔ کیا تم نے اس تصویر والی لڑکی کو کبھی دیکھا ہے؟‘‘ یہ کہتے ہوئے میں نے مزید بیس ڈالر ٹیبل پر رکھ دیے۔ مسز ڈیوڈ نے غور سے تصویر کو دیکھتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں مایوس ہوکر اٹھنے ہی والا تھا کہ یکایک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے پھر دس ڈالر میز پر رکھتے ہوئے پوچھا، ’’کانونٹ میں کم سے کم کس عمر تک کے بچوں کو داخلہ ملتا ہے؟‘‘ ’’کم از کم چار سال کے بچوں کو۔‘‘ مسز ڈیوڈ کا یہ جواب سن کر میں مخمصے میں پڑ گیا۔ سونیا بقول رانی گیارہ روز کی تھی جب رفیق اسے اپنے ہمراہ لے آیا تھا۔ دیگر اہل خانہ کے باعث وہ اسے اپنے گھر میں تو رکھ نہیں سکتا تھا؟ پھر اس نے بچی کو کہاں رکھا تھا۔ مسز ڈیوڈ کے مطابق تصویر والی بچی بھی کانونٹ کی طالبہ نہیں تھی حالانکہ تصویر میں اس نے کانونٹ سکول کی مخصوص یونیفارم پہنی ہوئی تھی اور اس کی شکل بھی ماں سے بہت ملتی تھی۔ اس کا صریحاً مطلب یہ تھا کہ بچی زندہ تھی اور اسے کانونٹ کی یونیفارم پہنا کر تصویر اُتاری گئی تھی۔ مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ اس دور میں پاکستان میں مسلمانوں کا کوئی ایسا ادارہ اور تنظیم نہیں تھی جو نوزائیدہ اور لاوارث بچوں کی پرورش کی ذمہ داری لے۔ جناب عبدالستار ایدھی پاکستان میں اس نیک کام کے بانی ہیں۔ البتہ بھارت میں عیسائی اور کئی ہندو ادارے یہ کام کرتے تھے۔ بچی کا نام سونیا ماں کا نہیں بلکہ رفیق کا رکھا ہوا تھا۔ میں نے مسز ڈیوڈ سے پوچھا کہ یہاں کوئی ایسا ہندو یا عیسائی ادارہ ہے جو لاوارث نوزائیدہ بچوں کی پرورش کی ذمہ داری لے؟ مسز ڈیوڈ بولی، ’’ہم تو پروٹسٹنٹ عقائد کے ہیں۔

یہاں کیتھولک چرچ کے زیر اہتمام ایک Monastery (خانقاہ) ہے جو لاوارث نوزائیدہ بچیوں کی پرورش کرکے انہیں (Nun) نن بناتی ہے۔" میرا دل کہنے لگا کہ سونیا کا پتہ مجھے اس Monastery سے چل سکتا ہے۔ الجھن صرف یہ تھی کہ اس خانقاہ کے اندر تک میری پہنچ اگر ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان خانقاہوں میں پرورش پانے والی بچیاں اور عورتیں سر سے پاؤں تک اپنے جسم کو ڈھانپے رکھتی ہیں جبکہ سونیا نے کانونٹ اسکول کا سکرٹ پہنا ہوا تھا۔ Monastery میں جسم اور سر کو ڈھانپنے والا مخصوص لباس پہننے پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ یہاں کی لڑکیوں اور عورتوں کے سر کے بال بھی مونڈ دیے جاتے ہیں تاکہ وہ دنیا کی لذتوں کا خیال بھی دل میں نہ لائیں اور صرف اور صرف عبادت یا فلاح کے کاموں میں دلچسپی لیں۔ میں نے سونیا کی تصویر کو پھر غور اور باریک بینی سے دیکھا تو صاف دکھائی دیا کہ کانونٹ کی یونیفارم پہنے کسی بچی کے جسم پر کسی دوسری بچی کا چہرہ لگا کر تصویر بنائی گئی ہے۔ رفیق کی یہ چالاکی جانتے ہی مجھے یقین ہوگیا کہ چہرے والی لڑکی یقیناً خانقاہ میں موجود ہے۔ میں نے مسز ڈیوڈ کو ایک ہزار ڈالر دینے کا وعدہ کرتے ہوئے کہا کہ تمہارے لیے یہ مشکل نہیں ہوگا اگر تم اس خانقاہ میں جاکر اس چہرے والی بچی کو تلاش کرو جس کی بڑی نشانی اس کے بازو پر پیدائشی سیاہ داغ ہے۔ مسز ڈیوڈ نے اگلے روز ہی Monastery میں جاکر بچی کا کھوج لگانے کا وعدہ کیا اور اگلی رات سات بجے دوبارہ ملاقات کا طے کرکے میں امید وبیم کی حالت میں اپنے ہوٹل لوٹ آیا۔

رات کو دو بجے رانی سے ملاقات کے دوران میں نے دانستہ سونیا کے کانونٹ سکول میں نہ ہونے اور اپنی مسز ڈیوڈ کے ذریعے عیسائی خانقاہ میں تلاش کرنے کا ذکر نہیں کیا۔ میں اس کی ماتا کے جذبے کو شکست و ریخت سے بچانا چاہتا تھا۔ سونیا کے ملنے کی صرف موہوم سی امید تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ بس امید و بیم کی کیفیت میں جس میں امید بہت ہی کم تھی، رانی کی ماتا کو ڈال کر اس دکھی دل ماں کو اور دکھی کروں۔ میرے اپنے گھریلو حالات میں میری ماں صرف اپنی محبت اور ماتا کی وجہ سے میری سابقہ بیوی کے ظلم و ستم کا مسلسل شکار بنی ہوئی شکایت کا ایک لفظ تک زبان پر نہ لاتی تھی۔ کسی کار یا بس کے شاک ابزربز (Shock Abserbers) کی طرح ناہموار سڑک کے تمام جھٹکے اور بوجھ خود برداشت کرکے مسافروں کو اس سے بچانے کی طرح میری والدہ مرحومہ نے تمام ذہنی اور جسمانی صدمات خود پر سہہ کر گھر کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچانے کی کوشش میں اپنی جان دے دی لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔

اگلے روز رفیق شکار کا پرمٹ لے کر آگیا اور مجھے یہ بتا کر کہ اپنے تعلقات کے باوجود بڑی مشکل سے چار سو ڈالر رشوت دے کر اس نے یہ پرمٹ حاصل کیا ہے، مجھ سے مزید چار سو ڈالر اینٹھ لیے۔ میں بھی جان بوجھ کر بیوقوف بنا اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ سونیا کا سراغ اگر مل بھی جائے تب بھی اس کی معاونت کے بغیر اس کا حصول ہمارے لیے بہت مشکل اور

دشوار طلب ہوگا۔ میں چاہتا تھا کہ رفیق کو ایک بار اپنے ہمراہ سندر بن جانے پر رضامند کرلوں۔ وہاں جاکر اس سے میں دو دو ہاتھ کروں گا۔ یہ گھی صرف ٹیڑھی انگلی سے ہی نکل سکتا تھا اور کھلنا شہر میں صرف بے حد مجبوری کی حالت میں ہی اس سے ایسا سلوک کیا جاسکتا تھا اور اس میں بھی اس کی جان جانے کی زیادہ اور اپنے مقصد کے حصول میں کامیابی کی بہت کم صورت دکھائی دیتی تھی۔ فوجی چھاؤنی ہونے کی وجہ سے ہمیں یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ ایک اور دشواری سونیا کے زبردستی یا ہنگامے سے حاصل کرنے کے بعد یہاں سے نکلنے کی تھی۔ اسٹیمر کے کپتان نے چاٹگانگ میں اصفہانی کے سربراہ کی ہدایت پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار آنے پر وہ ہمیں اپنے ساتھ ہرن گھاٹا تک لے جائے گا جہاں ایک بڑا اسٹیمر ہمارا منتظر ہوگا جو ہمیں بنکاک پہنچائے گا۔ اسٹیمر کے کھلنا آنے میں ابھی اٹھارہ انیس دن باقی تھے۔ اگر اس دوران سونیا ہمیں مل بھی جاتی تو ہم کو یہاں سے فوری نکلنا چاہیے تھا۔ ہم اسٹیمر کا یہاں پر قطعاً انتظار نہیں کرسکتے تھے۔ کھلنا سے تو ہم کوئی بڑی لانچ بھی کرائے پر لے کر ہرن گھاٹا تک جاسکتے تھے لیکن بڑے اسٹیمر کے انتظار میں ہرن گھاٹا جیسے چھوٹے مقام پر ہمارے رہنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہرن گھاٹا بنگلہ دیش کا ایک ساحلی چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اگر ہمارے وہاں ہمارے ٹھہرنے کا کوئی انتظام ہو بھی جاتا تو بھی بنگلہ دیشی حکومت کے متعلقہ اہلکار وہاں پہنچ کر ہمیں منٹوں میں پکڑ سکتے تھے۔ ایسی صورت حال میں صرف ایک ہی رستہ دکھائی دیتا تھا کہ کھلنا سے ہم کوئی ایسی بڑی لانچ لیں جو ہمیں کھلے سمندر میں بنگلہ دیشی سمندری حدود سے باہر بین الاقوامی سمندر تک لے جائے اور ہمارے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک بڑا اسٹیمر نہ آجائے۔ رضی کا بنگلہ دیشی ہونا اور زبان پر عبور ہمارے بہت کام آیا، اسی کے ذریعے میں نے ایک بڑی اور محفوظ لانچ کا انتظام کیا جو ایمرجنسی کی صورت میں ہمیں بین الاقوامی سمندر تک لے جانے اور وہاں دس روز تک اسٹیمر کے انتظار میں رکنے کو تیار تھی اور جس کا بہت زیادہ معاوضہ مانگا گیا۔ کوئی دوسرا چارہ نہ ہونے کے باعث میں نے یہ معاوضہ دینا بھی منظور کرلیا۔ یہ میرا یہاں سے نکلنے کا متبادل انتظام تھا کیونکہ ابھی تک ہمیں علم نہیں تھا کہ ہماری روانگی کب ممکن ہوگی؟

شام کو سات بجے میں قیصر اور نمبر ٹو کے ساتھ پھر مسز ڈیوڈ کے گھر گیا۔ وہ میری ہی منتظر تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ بعد دوپہر Monastery (خانقاہ) میں گئی تھی اور ہیڈ نن کے ساتھ جو اسے جانتی ہے اس نے نن بننے والی سب لڑکیوں کو دیکھا۔ تصویر کے چہرے والی لڑکی ان میں موجود تھی۔ مزید یقین کے لیے اس نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر یونہی اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھیں اور اسے کہا کہ تمہارے ہاتھ کی لکیریں بتاتی ہیں کہ تمہارے دائیں بازو پر ایک پیدائشی سیاہ نشان ہے۔ مسز ڈیوڈ نے بتایا کہ بچی یہ سن کر حیران رہ گئی اور پوچھنے لگی کہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ واقعی میرے بازو پر نشان ہے۔ میں نے نشان دیکھنا چاہا۔ پہلے تو اس نے انکار کیا اور پھر بڑی مشکل سے جھجکتے ہوئے مجھے نشان دکھایا۔

مسز ڈیوڈ کہنے لگی، ''ان نن بننے والی بچیوں کو دنیا کی آسائشوں اور لوگوں سے ملنے جلنے، بات کرنے حتیٰ کہ آنکھیں ملانے کی بھی سختی سے ممانعت ہے، انہوں نے نہ کبھی ریڈیو دیکھا ہے اور نہ ہی سینما، بازار بھی وہ نہیں جاسکتیں کہ کہیں دنیاوی آسائشیں انہیں اپنی طرف راغب نہ کرلیں۔ ان کے بال تک مونڈ دیے جاتے ہیں تاکہ ان کو اپنے حسین ہونے کا خیال بھی نہ آئے اور وہ کلی طور پر یکسوئی سے مذہب میں خود کو سمولیں۔ ان کی Outing (باہر جانا) صرف کسی مذہبی تہوار پر گرجے جانے تک محدود ہے اور وہ بھی بند گاڑی میں۔ آج سے تین روز بعد کیتھولک گرجے میں ایک مذہبی تقریب میں شرکت کے لیے یہ بچیاں جائیں گی۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے ساتھ چرچ میں جاکر اس بچی کی نشان دہی کرسکتی ہوں۔''

مسز ڈیوڈ تو یہ کہہ کر چپ ہوگئی اور مجھے بہت بڑی الجھن میں ڈال دیا۔ بچی کو دیکھنے اور اسے نکالنے کا موقع صرف گرجے میں یا ان کے واپسی کے سفر کے دوران ممکن تھا۔ منزل سامنے تھی لیکن بیچ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی جسے عبور کرنے کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ میرے پوچھنے پر مسز ڈیوڈ نے کہا کہ اس مذہبی تہوار کے ٹھیک چودہ روز بعد ایک اور تہوار ہے، اس میں بھی یہ بچیاں اسی گرجے میں آئیں گی۔ میں نے مسز ڈیوڈ کو کہا کہ تین روز بعد والے تہوار میں وہ میرے ہمراہ گرجے میں چلے۔ بچی کو چہرے سے شناخت کرکے میں اسے ہزار ڈالر دے دوں گا۔ مسز ڈیوڈ نے کہا کہ بچی کا نام سونیا نہیں بلکہ روزین ہے۔ میرے پوچھنے پر مسز ڈیوڈ نے یہ بھی بتایا کہ خانقاہ میں بچی کے آنے کا مکمل ریکارڈ ہوتا ہے لیکن اس تک رسائی ناممکن ہے اور ذرا سی پوچھ گچھ بھی خانقاہ کے نگرانوں کو شبے میں ڈال سکتی ہے اور ایسی صورت میں وہ ریکارڈ فوری تلف کرکے اس راز پر ہمیشہ کے لیے پردہ ڈال دیتے ہیں۔

میں مسز ڈیوڈ سے رخصت ہوکر ہوٹل واپس آگیا۔ میری الجھنوں اور مشکلات میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ بچی کو اٹھانا مشکل نہ تھا لیکن اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کھلنا سے نکلنا اور بین الاقوامی سمندر تک بحفاظت پہنچنا ناممکن دکھائی دیتا تھا۔ سوچتے سوچتے میرا سر درد سے پھٹنے لگا اور میں اسپرو کی چار گولیاں کھا کر سوگیا۔ اگلے روز صبح میں نے قیصر اور نمبر ٹو کو اپنے کمرے میں بلایا اور ساری صورت حال انہیں بتا کر ان سے پوچھا کہ اگر ان کے ذہن میں کوئی تجویز ہو تو بتائیں۔ ان کی سوچ کی سوئی بھی وہیں پر اٹکی جہاں پر میں پھنسا ہوا تھا کہ بحفاظت واپسی کیسے ہوگی؟ کافی سوچنے اور بحث مباحثے کے بعد آخرکار یہ فیصلہ ہوا کہ بچی کو گرجے میں پہچان کر ہم رفیق کو سندر بن چلنے پر آمادہ کریں۔ جنگل میں ہی اس پر اپنی اصلیت ظاہر کرکے بچی کے متعلق پوچھیں۔ دونوں صورتوں میں یعنی اگر وہ خوفزدہ ہوکر سچ بتا دے یا جھوٹ بول کر اس سارے واقعے سے انکاری ہو اسے وہیں ختم کردیا جائے۔ اس کی موت سے ہمیں کم از کم ہماری شناخت کرنے والے اور ہمیں نقصان پہنچانے والے شخص سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔ دوسرا فیصلہ یہ ہوا کہ میں چٹاگانگ فون کرکے اصفہانی کے سربراہ کو کہوں کہ ہم اسٹیمر پر نہیں بلکہ کھلنا سے کرائے پر لی ہوئی لانچوں پر کھلے سمندر میں پہنچیں گے۔ بڑا اسٹیمر (ہماری

طے شدہ تاریخ کے مطابق) ہرن گھاٹا سے جنوب میں تین سمندری میل کے فاصلے پر ہمارا انتظار کرے۔ تیسرا فیصلہ یہ ہوا کہ میرے، رضی، قیصر اور نمبر ٹو کے سوا اپنے تمام ساتھیوں کو ہم اپنے ایکشن کے دن سے چوبیں گھنٹے پہلے لانچ پر سمندر میں ہمارے منتظر بڑے اسٹیمر تک بھیج دیں کیونکہ ایکشن کے فوری بعد سب کا سست رفتار لانچ پر سفر خطرے سے خالی نہ ہوگا جبکہ ہم چاروں اور بچی تیز رفتار موٹر بوٹ پر یہ فاصلہ آدھے سے بھی کم وقت میں طے کرسکیں گے۔ ہم نے جو پروگرام ترتیب دیا تھا وہ میرے نزدیک فول پروف ہرگز نہ تھا لیکن اس سے بہتر کوئی دوسرا حل بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں دن چڑھے شہر کے واحد ٹیلی فون و ٹیلی گراف آفس گیا اور چٹاگانگ سے اصفہانی کے سربراہ سے بات کی۔ اس نے بتایا کہ جو اسٹیمر ہمیں کھلنا لے گیا تھا وہ تو کسی دوسری کمپنی کا کارگو اسٹیمر تھا لیکن جس پر ہمیں بنکاک جانا ہے وہ اصفہانی کمپنی کی ملکیت ہے اور صدری اصفہانی کی ہدایت کے مطابق جب بھی آپ کو ضرورت ہو آپ ایک ہفتہ پہلے فون کردیں، یہ اسٹیمر مقررہ وقت پر ہرن گھاٹا کے سامنے چند میل کے فاصلے پر آپ کو مل جائے گا۔ اسٹیمر کے کپتان کو ہم یہ بھی ہدایت کردیں گے کہ آپ کی اجازت کے بغیر لنگر نہ اٹھائے اور اس اسٹیمر پر آپ سمیت بیس افراد کی خوراک اور پانی کا ایک بڑا کا ذخیرہ بھی ہوگا۔ ان امید افزا باتوں سے مجھے بڑی تقویت ملی۔ اب صرف کھلنا سے اسٹیمر تک پہنچنے کا مرحلہ تھا۔ میں نے سوچا کہ پروگرام کے مطابق کرایہ دے کر یہ سفر کریں گے اور اگر کوئی گڑبڑ دکھائی دی تو پھر ہمارا اسلحہ اس مسئلے کو حل کرے گا۔ فون کرکے میں واپس ہوٹل آیا تو رفیق میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ہم شکار پر جانے کو تیار ہیں، لہٰذا وہ شکار پارٹی کے لیے ضروری سامان کا انتظام کرے۔ میں نے شکار پر جانے کے لیے جو دن مقرر کیا اس سے ایک روز پہلے مجھے مسز ڈیوڈ کے ساتھ چرچ میں سونیا کو دیکھنے جانا تھا۔ رفیق نے مجھ سے شکار کی تیاری، خورد و نوش کے سامان، مزدوروں اور دو گائیڈز کے لیے مزید پانچ سو ڈالر طلب کیے۔ میں نے خاموشی سے اسے یہ رقم دے دی لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ شکار پر ہم صرف اسی صورت میں جائیں گے اگر وہ بھی ہمارے ساتھ جائے۔ میں نے گرمجوشی اور بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''میرے تمام ساتھی حیثیت میں مجھ سے بہت کمتر ہیں۔ ان کے ساتھ شکار پر جاتے ہوئے مجھے خاک لطف آئے گا۔ تمہارا ساتھ ہوگا تو مجھے احساس ہوگا کہ میرا کوئی ہم پلہ بھی ہمراہ ہے اور اب تو تم میرے بزنس پارٹنر ہو لہٰذا تمہیں بغیر عذر کے ہر حالت میں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ تھوڑی سی رد و کد کے بعد رفیق مان گیا اور مجھ سے بے تکلفی سے ''اچھا پارٹنر گڈ بائی'' کہہ کر رخصت ہوا۔ میں دل میں ہنس رہا تھا کہ میرے ساتھ یہ اس کا شاید آخری گڈ بائی ہو۔ شام کو میری طبیعت کچھ مکدر سی تھی۔ میں گھومنے کے لیے اکیلا ہی نکل کھڑا ہوا۔ ابھی میں کینٹ کی حدود میں داخل ہی ہوا تھا کہ سامنے سے ایک جیپ آئی اور میرے قریب سے گزر گئی۔ چند سیکنڈ بعد بریکیں لگنے کی آواز آئی۔ جیپ ریورس میں واپس آئی اور

میرے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں فرنٹ سیٹ پر ایک فل کرنل وردی پر سرخ ربن لگائے بیٹھا تھا۔ مجھے چند لمحے دیکھنے کے بعد وہ جیپ سے اترا اور میرا اصل نام لے کر بولا، ”ہیلو۔ تم یہاں کہاں! کب آئے۔ کیسے آئے اور کہاں ٹھہرے ہو؟“ وہ سوال پوچھے جا رہا تھا کہ مجھے یاد آ گیا۔ 65ء کی جنگ کے فوری بعد جب میں چٹاگانگ گیا تھا تو وہاں میرے جگری دوست کیپٹن ظہیر بٹ کے ذریعے لیفٹیننٹ مزمل مجھ سے متعارف ہوا تھا۔ بعد میں ہم تینوں کی کئی بھرپور شامیں اکٹھی گزریں تھیں۔ میرے 65ء کے قیام کے دوران یہ میرا گہرا دوست بن چکا تھا اور ہم اکثر بھارت کی شکست اور آئندہ اس کی سرزنش کرنے کی باتیں کرتے تھے۔

کرنل مزمل بے شک میرا بے تکلف دوست تھا لیکن ان دنوں کا (سن 65ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد) جب ہم سب پاکستانی تھے اور ان دنوں کا لیفٹیننٹ مزمل مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک نظر سے دیکھتا تھا اور اس فوج کا افسر تھا جو متحدہ پاکستان کی سرحدوں کے دفاع کی ذمہ دار تھی اور آج کا کرنل مزمل بنگلہ دیشی فوج کا افسر تھا جو پاکستان کو غاصب اور اپنا دشمن تصور کرتی تھی اور 16 دسمبر 71ء کے منحوس دن کو جب سقوط ڈھاکہ ہوا، اپنا یوم آزادی مناتی تھی۔ اس ملک کا علیحدہ جھنڈا، علیحدہ قومی ترانہ اور پاکستان کے لیے انتہائی مخالفانہ جذبات تھے۔ کرنل مزمل سے اس اچانک اور غیر متوقع ٹکراؤ سے میں فی الحقیقت گھبرا گیا۔ میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔ مزمل چند لمحے میرے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر یکایک آگے بڑھ کر مجھے گلے لگاتا ہوا آہستگی سے بولا، ”میری کرنل کی وردی دیکھ کر گھبرا گئے ہو یا اس لیے کہ میں بنگلہ دیشی فوج کا افسر ہوں لیکن دوست یہ کبھی نہ بھولنا کہ میرے خیالات اور جذبات میں پاکستان سے جو والہانہ عقیدت تھی، وہ ختم ہو گئی ہے یا اس میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے پاکستانی تھا، پاکستانی ہوں اور انشاء اللہ مرتے دم تک پاکستانی رہوں گا۔ حالات کی ستم ظریفی اور ہمارے لیڈروں کی غداری اور وطن فروشی سے ملک بے شک دو ٹکڑے ہو گیا لیکن میرے دل اور جذبات کے ٹکڑے نہ ہو سکے۔ تمہاری بھارت میں سرگرمیوں کی مفصل رپورٹ اور تصویریں یہاں بھی پہنچ چکی ہیں۔ میں نے وہ سب رپورٹ پڑھی ہے اور میں تم پر ناز کرتا ہوں کہ تم نے سویلین ہوتے ہوئے بھارت میں جو کارنامے سرانجام دیے ہیں، میں فوجی وردی میں اور مکمل فوجی تربیت یافتہ ہونے کے باوجود صرف اپنے کندھوں کے Brass (عہدے کے نشان) میں اضافہ کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکا اور اب ہم عملی طور پر بھارت کے غلام بن چکے ہیں۔“ مزمل نے یہ ساری باتیں مجھ سے معانقے کے دوران کہیں۔ اس کا ڈرائیور بھی حیرت سے ہمارے اس طویل معانقے کو دیکھ رہا تھا۔ مزمل کی حالت ایسی تھی کہ جو لاوا سالوں سے ان کے اندر ابل رہا تھا، وہ پھٹ کر باہر آ نکلا تھا۔ میں نے سرگوشی میں ہی اسے کہا، ”کرنل مزمل، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم کہیں علیحدہ بیٹھ کر باتیں کریں اور اپنے دلوں کا احوال بیان کریں۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ کرنل مزمل نے میری بات سن کر ہنستے

ہوئے جواب دیا، ”میرے گھر سے بہتر کوئی جگہ نہیں اور تمہیں ابھی میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہوگا۔ میں تمہارا کوئی عذر نہیں سنوں گا، تمہارا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ یوں سمجھ لو کہ تم میری حراست میں ہو (You are under arrest)“ مزمل کے ان مخلصانہ جذبات کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو پچھلی سیٹ پر جانے کا کہا اور خود سٹیرنگ پر بیٹھ گیا اور اس کی جیپ ہمیں لیے چھاؤنی میں اس کے بنگلے میں جا کر ٹھہری۔ ہماری گزشتہ ملاقاتوں کے دوران مزمل کی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن اب اس کی ایک سلجھی ہوئی اور اس کے ہم خیال بیوی اور دو بچے تھے۔ مزمل مجھ سے مل کر خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو بلایا۔ بیوی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی وہ بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا، ”دیکھو یہ ہیں میرے چٹاگانگ کے وہی دوست جن کی سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارت میں بہادری اور جان فروشی کے واقعات میں تمہیں اکثر سنایا کرتا تھا۔“ اس کی بیوی نے نہایت خوش دلی سے مجھے اپنے گھر میں خوش آمدید کہا اور بولی، ”مزمل تو آپ کی اور کیپٹن ظہیر بٹ کی باتیں کرتے نہیں تھکتے۔ ان کی میرے ساتھ گفتگو کا موضوع اکثر و بیشتر آپ دونوں اور متحدہ پاکستان کا ذکر ہی ہوتا ہے۔“ میرے جواب دینے سے پہلے ہی مزمل بولا (ذرا اس کے الفاظ ملاحظہ کریں) ”طاہرہ! دراصل ہم پاکستانی بڑے بے مروت ہیں۔ آنکھوں سے دُور کیا ہوئے کہ دل سے بھی دُور ہو جاتے ہیں۔ میری طرف ہی دیکھو کہ میں نے ظہیر کے متعلق ابھی تک اس سے نہیں پوچھا۔ یقیناً اب وہ بریگیڈیئر ہوگا۔“ ظہیر کا نام آتے ہی میرے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری اس کیفیت کو دونوں میاں بیوی نے بھانپ لیا اور مزمل کہنے لگا، ”کیوں کیا بات ہے۔ ظہیر خیریت سے تو ہے؟“ میں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا، ”ظہیر سن 72ء میں لیفٹیننٹ کرنل اور گیارہویں ڈویژن کا (Assistant Director of Supplies) ADOS تھا۔ اس کی بیوی شمیم بے حد ملنسار اور خوش مزاج تھی اور وہ دو ننھے منے بچوں کا باپ تھا۔ اس کی ترغیب اور مدد سے مجھے بھارت میں انتہائی اہم مشن سرانجام دینے کے لیے چنا گیا تھا۔ ADOS ہونے کی وجہ سے اپنے ڈویژن کی ضروریات کی مقامی سپلائی اس کے ذمے تھی اور اسی وجہ سے ٹھیکیدار اس کے اردگرد گھومتے رہتے تھے۔ ایک ٹھیکیدار نے اس سے ٹھیکے لینے اور قربت بڑھانے کے لیے ایک طوائف زادی کا سہارا لیا اور اپنے دفتر کی سیکریٹری کے طور پر اس سے ظہیر کو متعارف کروایا۔ شومئی قسمت سے اس حرافہ نے ایسا جال بنا کہ ظہیر اس میں پھنس گیا۔ میرے بھارت جانے سے پہلے میں نے اسے بہت سمجھایا کہ اس چلتر عورت سے بچو لیکن ظہیر پر اس کا جادو اتنا اثر کر چکا تھا کہ میرا سمجھانا تو ایک طرف رہا، اس کی بیوی اور بچے بھی اسے اس حرافہ کے چنگل سے نہ نکال سکے۔ اس ٹھیکیدار پر ظہیر کی مہربانیاں بڑھتی گئیں اور مارکیٹ ریٹ سے بہت زیادہ ریٹ کے ٹینڈر صرف اسی ٹھیکیدار کے منظور ہونے لگے۔ ظہیر بٹ کی آنکھیں تب کھلیں جب اس فاحشہ عورت نے اسے یہ بتایا کہ وہ اس کے بچے

کی ماں بننے والی ہے اس لیے یا وہ اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر اس سے نکاح کرے ورنہ اسے دس لاکھ روپیہ دے۔ میں بھارت جاچکا تھا جب اس عورت نے ظہیر سے روپے کا مطالبہ کیا اور یہ دھمکی دی کہ اگر اس کی دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بھی نہ مانی گئی تو وہ یہ راز نہ صرف اس کی بیوی اور خاندان والوں پر ظاہر کر دے گی بلکہ اس کے افسران سے بھی ٹھیکیدار پر اس کی "مہربانیوں" کے ثبوت کے ساتھ رپورٹ کرے گی۔ دوسرے ٹھیکیداروں نے بھی ظہیر کے متعلق اس بارے میں کچھ ثبوت پیش کیے تھے اور اس کے خلاف پہلے ہی انکوائری ہو رہی تھی۔ ظہیر اس فاحشہ کے شکنجے میں اس بری طرح پھنس چکا تھا کہ اسے کوئی راہ فرار دکھائی نہ دی۔ ایک روز وہ اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ گوجرانوالہ اپنے سسرال گیا اور رات کو بیوی کے نام خط میں تمام واقعات لکھ کر صبح گوجرانوالہ ریلوے اسٹیشن کے قریب لاہور سے پنڈی جانے والی ریل کے گزرنے کے وقت پٹری پر سر رکھ دیا۔ اس کا سر دھڑ سے جدا ہو کر دُور جا پڑا۔ اس کی بیوی شمیم بیوہ اور اس کے معصوم بچے یتیم ہوگئے اور وہ فاحشہ عورت شیبا حسن پاکستان ٹیلی وژن پر مشہور ڈرامہ سیریز "سونا چاندی" میں چاندی کے کردار میں آج بھی جانی پہچانی اداکارہ ہے۔ مجھے ظہیر بٹ کی ان المناک حالات میں خودکشی کا بھارت سے واپسی پر ظہیر کی بیوی سے پتہ چلا اور میں نے اپنے مخلص ساتھیوں کے ساتھ اس فاحشہ عورت کو ایک رات شاہی قلعہ لاہور کے ہیرامنڈی والے دروازہ کے قریب ہیرامنڈی کے شروع میں ہی اُس کے گھر سے اُٹھا لیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا اسے اذیتیں دے کر ہلاک کروں گا کہ لیکن ظہیر کے ہی ایک فوجی دوست نے جو اس کارروائی میں میرے ساتھ شریک تھا، مجھے یہ کہہ کر اس حرافہ کو ہلاک کرنے سے روکا کہ ظہیر کے افسران نے اس کی خودکشی کو ڈیوٹی کے دوران حادثاتی موت قرار دے کر اس کی بیوہ اور بچوں کی خاصی مالی معاونت کی ہے۔ شیبا کو ہلاک کرنے سے یہ دبا ہوا معاملہ پھر اٹھ کھڑا ہوگا۔ ہم کچھ بھی کرلیں ظہیر تو دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ ہمارا انتقام تو پورا ہوجائے گا لیکن ظہیر کی بیوہ اور بچے اس مالی امداد سے محروم ہوجائیں گے جو ظہیر کے "دوستوں" نے اس راز پر پردہ ڈال کر انہیں فراہم کی ہے۔ میں تو انتقام کی آگ میں جل رہا تھا اور تصویر کے اس رخ کو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے انتقامی جذبات کو دبا کر میں نے اس حرافہ کی اچھی طرح پٹائی کر کے اسے ادھ موا حالت میں چھوڑا۔ (قارئین! آج بھی اگر کبھی اتفاقاً شیبا حسن سے آمنا سامنا ہوجاتا ہے تو وہ مجھے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ میں نے یہ اندوہناک واقعہ من و عن تحریر کر دیا ہے اور اگر کسی کو اس میں شک ہو تو میں اسے اس واقعہ کے سو فیصد درست ہونے کے ایک نہیں کئی ثبوت دے سکتا ہوں) مزمل میری بات بڑے غور سے سن رہا تھا۔ ظہیر کی موت کا سن کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے پہلے کے خوشگوار ماحول پر افسردگی چھاگئی۔ ہم نے سن 65ء کی حسین یادوں کا ذکر شروع کیا لیکن ماحول کی افسردگی ختم نہ ہوسکی۔ مزمل کے گھر میں نے رات کے کھانے کے چند لقمے زہر مار کیے۔ مزمل اپنی جیپ خود ڈرائیو کرتے ہوئے مجھے

درشن ہوٹل چھوڑنے آیا اور مجھے جلد از جلد ملنے کا کہہ کر یہ الفاظ کہتے ہوئے رخصت ہوا۔ "فاصلوں کی دُوری صرف جغرافیائی ہے۔ ہمارے دلوں، ہماری سوچ اور ہم خیالی کو دنیا کی کوئی طاقت تقسیم نہیں کرسکتی۔ تم یہاں کیوں اور کس مشن پر آئے ہو اگر کسی مصلحت کے باعث تم مجھے نہیں بتلاسکتے تو میں ہرگز اصرار نہیں کروں گا لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ یہاں تمہارا ایک بے حد مخلص دوست تمہاری ہر قسم کی مدد و معاونت کے لیے موجود ہے اور اس کے درجنوں ہم خیال اسی کے محکمے کے لوگ بھی تمہارا ساتھ دینے میں ہرگز پس و پیش نہ کریں گے۔"

مزمل کی پرخلوص باتیں سن کر مجھے بڑی خوشی اور سکون ملا۔ میری سوچیں اس انتہا تک جاپہنچیں جہاں میں نے بنگلہ دیش اور پاکستان کو پھر سے متحدہ پاکستان کی صورت میں دیکھا۔ اس مشن کے دوران اور بعد میں سن 85ء میں بنگلہ دیش میں میں نے بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال پایا۔ اگر ان دونوں ممالک کو پرخلوص لیڈر مل جاتے یا مل جائیں تو یہ خواب ایک حقیقت بن سکتا ہے اور نفرتیں محبت میں بدل سکتی ہیں۔ میں انہی خیالوں میں ڈوبا سوگیا۔ اگلے روز مسز ڈیوڈ مقررہ وقت پر مجھے کیتھولک چرچ میں ملی۔ ہم اگلی بنچوں پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ پیانو پر مذہبی گیتوں کے بعد روشن موم بتیاں اٹھائے اور سفید براق لباس پہنے چند بچیاں چرچ کے عقبی دروازے سے داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے ننھی راہبوں کا ایک گروہ تھا۔ سرتاپا سیاہ لباس میں ملبوس ان ننھی راہبوں (Nuns) کے گلوں میں لمبی تسبیح اور صلیب تھی۔ آہستہ اور بے آواز قدموں سے چلتی یہ لڑکیاں سٹیج کے پیچھے ایک قطار میں کھڑی ہوگئیں۔ مسز ڈیوڈ نے ایک راہبہ بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ روزین (سونیا) ہے۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا تو اس میں اپنی ماں کے واضح نقوش دکھائی دیے۔ مسز ڈیوڈ مجھے پہلی ہی بتا چکی تھی کہ اس بچی کے بازو پر پیدائشی نشان اس نے خود دیکھا ہے۔ یہ بچیاں اس حکم کے باوجود کہ کسی سے بھی آنکھیں چار نہ کی جائیں، کبھی کبھی صرف آنکھیں گھما کر ادھر اُدھر دیکھ لیتی تھیں۔ مسز ڈیوڈ نے مجھے اس بچی سے اپنی ملاقات کا یقین دلانے کے لیے ایسے ہی ایک موقعے پر بچی کو دیکھتے ہوئے ہاتھ لہرا کر (Wave) کیا۔ بچی نے اسے دیکھ لیا اور دھیمے سے مسکرائی۔ مجھے بھی اس بچی کے اصلی سونیا ہونے کا یقین ہوچکا تھا۔ چرچ سے نکل کر میں نے مسز ڈیوڈ کو ہزار ڈالر دیے اور خود ان بچیوں کے وین میں سوار ہونے تک چرچ کے کمپاؤنڈ میں ہی کھڑا رہا۔ وین کے روانہ ہونے کے بعد میں نے ایک سائیکل رکشہ کرائے پر لی اور خانقاہ تک جاکر اسی راستے سے واپس آگیا۔ میں صرف ایسی مناسب جگہ کی تلاش میں خانقاہ گیا تھا جہاں وین کو روک کر سونیا کو اٹھایا جائے۔ وین کو روکنا ہمارے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ چار انچ لمبے تین رخوں والے لوہے کے موٹے سروں پر ویلڈ ہوئے کیلوں کے دس بارہ سیٹ سڑک پر ایک لائن میں رکھ کر ہم وین کے ٹائر پنکچر کرسکتے تھے۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ مزمل بھی نہ صرف اس معاملے میں بلکہ ہماری روانگی میں بھی ہماری ہر ممکن مدد کرے گا۔ مجھے

اپنا یہ مشن کامیابی سے ہمکنار ہوتے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ انہی سوچوں میں گم پورے سکون کے ساتھ میں اپنے ہوٹل واپس پہنچا۔

پروگرام کے مطابق ہمیں اگلے روز شکار کے لیے سندر بن جانا تھا۔ میں ابھی تک یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ کرنل مزمل کو اپنا شریک راز بناؤں یا نہیں لیکن یہ طے تھا کہ اگلے روز شام کو میں اگر مزمل سے ملنے اس کے گھر نہ گیا تو اس نے یقیناً درشن ہوٹل میں فون کرکے مجھ سے کانٹیکٹ کرنا تھا۔ اگر اسے یہ بتایا جاتا کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت سندر بن شکار کے لیے چلا گیا ہوں تو اسے یقیناً اس بات کا دکھ ہوتا کہ میں نے اسے اپنے اس پروگرام کا کیوں نہیں بتایا۔ مجھے ہوٹل میں چھوڑتے وقت اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ اگلی شام میں اسے فون کروں اور وہ مجھے لینے کے لیے اپنی جیپ بھیج دے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنے ''ہم خیال'' فوجی افسروں سے مجھے ملائے گا۔ مجھے کھلنا میں اپنے مشن کو خوش اسلوبی سے مکمل کرنے اور یہاں سے اپنی محفوظ روانگی کے لیے ایک باثر اور مخلص شخص کی ضرورت تھی۔ قدرت نے میرا یہ مسئلہ مزمل سے اچانک ملاقات کی صورت میں حل ہونے کا اشارہ دیا تھا۔ اس کی گرمجوشی اور پاکستان سے والہانہ عقیدت سے مجھے یقین سا ہو رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ امکان کی آخری حد تک تعاون کرے گا۔ میں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ سندر بن جانے کا پروگرام فی الحال ایک دو روز کے لیے ملتوی کردیا جائے۔ رفیق ایک گھٹیا اور بکاؤ مال تھا۔ مزدوروں، گائیڈ اور کل کی روانگی کے انتظامات کے اخراجات کے سلسلے میں اسے اگر ایک سو ڈالر بھی دیے جاتے تو وہ بار بار اتنے نفع بخش کام کی خواہش کرتا۔ میں نے پہلے اسے فون کرکے اپنی طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کرکے شکار کے پروگرام کو چند دنوں کے لیے ملتوی کرنے کا کہا اور اسے یہ بھی کہہ دیا کہ اس نے ہماری روانگی کی مد میں جو اخراجات کیے ہیں ان کے لیے وہ کل صبح مجھ سے سو ڈالر لے جائے۔ رفیق حسب توقع بڑی خوشی سے مان گیا۔ اس فون کے بعد میں نے قیصر اور نمبر ٹو کو ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بلوایا اور کرنل مزمل سے اپنی اچانک ملاقات کی روئیداد سنائی۔ دونوں نے اس بالکل غیر متوقع ملاقات کو امداد غیبی سمجھتے ہوئے مجھے مشورہ دیا کہ کرنل مزمل سے کل ضرور ملوں اور موقع دیکھ کر اپنے مشن کا محض سرسری طور پر ذکر کروں اور اگر اس نے دلچسپی ظاہر کی تو پھر بھی اچھی طرح سے اپنی تسلی ہونے پر اسے اس مشن کے متعلق تفصیلاً بتاؤں اور دیکھوں کہ وہ ہماری بحفاظت روانگی کے لیے اپنی مدد کی کس حد تک پیش کش کرتا ہے۔ قیصر کے الفاظ تھے، ''بھائی جان! آپ کے دوست اس کرنل نے اگر ہماری مدد کی تو ہم اس کے بے حد مشکور ہوں گے ورنہ اس کے ملنے سے پہلے بھی ہم نے اس مشن کو سرانجام دینے میں کسی ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ میں تو ہر کام کو آغاز سے انجام تک پہنچانے میں اللہ پاک کی رحمت اور اپنے ریوالور اور چاقو پر بھروسہ کرتا ہوں'' میں نے انہیں یہ کہہ کر رخصت کیا کہ اپنے ساتھیوں کو جاکر بتا دیں کہ شکار کا پروگرام دو چار روز کے لیے ملتوی کردیا گیا ہے۔ قیصر کے بقول وہ سب کل صبح شکار پر جانے کے لیے مکمل تیاری کی حالت

میں تھے۔ رات کو دو بجے میں نے رانی کو کہا کہ اگرچہ ابھی تک کوئی واضح صورت سامنے نہیں آئی لیکن ایک بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی بچی کھلنا میں ہی ہے اور ہم انشاء اللہ اسے اپنے ساتھ لے کر یہاں سے روانہ ہوں گے۔ رفیق نے آپ کو اس کے نام اور کانونٹ میں تعلیم پانے کے متعلق جو کچھ بتایا تھا وہ سب غلط ہے۔ آپ کی بچی کے حصول اور اسے بحفاظت یہاں سے لے جانے میں کچھ دشواریاں حائل ہیں جن پر قابو پانے میں چند روز لگیں گے۔ اسی لیے ہم نے شکار کا پروگرام فی الحال ملتوی کردیا ہے۔ آپ صرف یہ خیال رکھیں کہ یہاں کسی مرد یا عورت سے بھی ملنے سے گریز کریں کیونکہ مجھے میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ رفیق نے یقیناً ہماری اصلیت جاننے کے لیے کچھ جاسوس چھوڑ رکھے ہوں گے۔''

اگلے روز مزمل سے ملنے اور اپنے مشن کے متعلق گفتگو کا آغاز کرنے کے خدوخال بنانے میں مصروف میں نجانے کب سوگیا۔ رات کا پون حصہ تو گزر چکا تھا جب رانی سے ملاقات ہوئی۔ میں دن چڑھے تک سوتا رہا اور آنکھ تب کھلی جب میرا دروازہ پیٹا جا رہا تھا۔ بیرے نے بتایا کہ رفیق صاحب ملنے آئے ہیں۔ رات بھر جاگنے سے میری طبیعت خاصی مضمحل ہو رہی تھی۔ میں نے رفیق کو کمرے میں ہی بلالیا۔ وہ میری تیمارداری کے بہانے آیا تھا لیکن رخصت تب ہوا جب میرے سو ڈالر اس کی جیب میں چلے گئے۔ دن کا خاصا وقت میں نے قیصر اور باقی ساتھیوں کے ساتھ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں گزارا۔ ہم تو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور آج ہمیں کوئی کام نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ڈائننگ ہال میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن دو شخص ایک ہی ٹیبل پر ہماری آمد سے پہلے کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم تقریباً چار گھنٹے وہاں بیٹھے رہے اور اس دوران وہاں دو مرتبہ چائے اور دوپہر کا کھانا کھایا، لیکن ان دونوں نے صرف ایک مرتبہ چائے منگوائی۔ بیٹھنے کے دوران وہ بالکل خاموش رہے اور آپس میں بھی انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہماری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے ہوں۔ جاسوسی میں وہ بالکل اناڑی لگتے تھے لہٰذا جلد ہی وہ میری نگاہوں میں آگئے۔ جب ہم ڈائننگ ہال سے اٹھے تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ میں اپنے کمرے کے دروازے تک جاکر پھر ڈائننگ ہال میں واپس آگیا۔ وہ جاچکے تھے۔ میرا شک یقین میں بدل گیا کہ ہماری نگرانی ہورہی ہے۔ اتنے اناڑی ''جاسوس'' کسی محکمے کے نہیں ہوسکتے تھے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ رفیق کے بھیجے ہوئے کتے تھے جو ہماری بو سونگھنے آئے تھے۔

شام چھ بجے میں نہا دھوکر اور تر و تازہ ہوکر کرنل مزمل کو فون کرنے جانے ہی والا تھا کہ بیرے نے بتایا کہ میرا فون آیا ہے (درشن ہوٹل کے کمروں میں ٹیلی فون کی سہولت مہیا نہیں تھی اور یہ ہمارے لیے بہتر ہی تھا کیونکہ رفیق دوسرے کمروں میں فون کرکے اگر رانی کی آواز سن لیتا تو پہچان کر فوراً ہمارے یہاں آنے کے مقصد کی تہہ تک پہنچ جاتا) یہ کرنل مزمل کا فون تھا۔ دوستی کے زعم میں اس

نے مجھ پر خود کو اتنا بااختیار سمجھ لیا تھا کہ اس نے کہا، ''میں نے تمہیں لانے کو جیپ بھیج دی ہے۔ رات کے کھانے پر چند دوست بھی ہمارے ساتھ ہوں گے، لہٰذا جلد واپسی کی توقع مت رکھنا۔ کل ویسے بھی اتوار ہے اور کسی کو بھی صبح اٹھنے کی مجبوری نہیں۔'' میرا جواب سنے بغیر ہی اس نے فون بند کردیا۔ کوئی اور ہوتا تو میں اس بدتمیزی اور گفتگو کے انداز پر چراغ پا ہوجاتا لیکن مزمل پرانا اور بے تکلف دوست تھا اور چٹاگانگ میں بھی ہم ایک دوسرے سے ملنے یا کھانے میں شرکت کی دعوت اسی تحکمانہ انداز میں دیا کرتے تھے۔ پندرہ منٹ میں کرنل کی جیپ آگئی۔ اپنے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں وہ میرا انتظار کررہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بغیر رسمی کلمات کے وہ چھوٹتے ہی بولا، ''رات تمہارے جانے کے بعد طاہرہ نے مجھ سے لڑنا شروع کردیا کہ تم نے بھائی جان کو یہ کیوں نہیں بتایا کہ میں ستار بجاتی ہوں اور اردو گانے بھی اچھے خاصے گالیتی ہوں۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ ہمارے دوست آجائیں تم طاہرہ کا ستار اور گانا سن لو کیونکہ کھانے کے بعد صرف مردوں کی محفل جمے گی۔'' مزمل نے طاہرہ کے سامنے ہی یہ بات کی تھی۔ پہلے تو وہ کچھ جھجکی اور شرمائی لیکن میرے اصرار پر اس نے پاکستان کے دو تین جنگی نغمے سنائے جو سن 65ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ہر خاص و عام پاکستانی کی زبان پر تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی اس محفل کے بعد مزمل کے دوستوں کی آمد شروع ہوئی۔ مدعوئین میں ایک بریگیڈیئر، دو لیفٹیننٹ کرنل دو میجر اور ایک کیپٹن تھا۔ مزمل نے سب سے میرا تعارف اپنے دیرینہ دوست اور پاکستانی کی حیثیت سے کروایا۔ رات کے کھانے پر بھی ہمارا زیادہ تر موضوع پاکستان اور بنگلہ دیش کے خوشگوار تعلقات کی استواری اور ان دومملکتوں کے پھر سے ایک ہوجانے کی توقعات کی امید ہی رہا۔ مجھے سب مہمانوں کی گفتگو سے یہ محسوس ہورہا تھا کہ ان کے خیال میں متحدہ پاکستان سے علیحدگی کی وجہ ان کے غدار لیڈروں کے جذباتی اور ناعاقبت اندیشانہ نعرے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ غدار صرف مشرقی پاکستان میں ہی نہیں بلکہ ان سے دوچند پاکستان میں تھے۔ ''ادھر ہم ادھر تم'' کا نعرہ بھٹو نے لگایا تھا۔ سلامتی کونسل میں پولینڈ کی جنگ بندی کی قرارداد کو بھٹو نے پھاڑا تھا جس میں بھارت اور پاکستان کی افواج کی اپنے اپنے ملکوں میں واپسی جس سے صرف بھارتی فوج کی مشرقی پاکستان سے بھارت واپسی ہوتی کیونکہ اس ساری جنگ کے دوران پاکستانی فوج تو اپنے ملک میں ہی تھی اور جارح اور حملہ آور صرف بھارتی فوج تھی اور پاکستان کی تاریخ کے واحد منصفانہ اور شفاف الیکشن جس میں عوامی لیگ کو واضح اکثریت ملی تھی، بجائے حکومت سونپنے کے اس کے لیڈر کو گرفتار کرکے مغربی پاکستان لے جانے والے بھی مغربی پاکستانی تھے۔ اس لیے اس علیحدگی کی ذمہ داری صرف مشرقی پاکستانیوں پر نہیں بلکہ ان سے زیادہ مغربی پاکستان کے غدار لیڈروں پر تھی۔ اس کھانے میں شریک ہم سبھی کی سوچ یکساں تھی کہ ایک مکمل اور مضبوط گھر کے مکین اگر اپنے اختلافات کے باعث گھر کے درمیان میں ایک دیوار کھڑی کردیں تو گھر کے سبھی مکینوں کو نہ صرف تکلیف ہوگی بلکہ یوں محسوس ہوگا جیسے سب کا دم گھٹ رہا ہو۔ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم

میں کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے مزمل نے میرا مکمل اور بھرپور تعارف کرواتے ہوئے جب انہیں بتایا کہ میں نے تین سال سے زیادہ عرصہ بھارت میں گزار کر جو مشن انجام دیے اور بھارت کو ناکوں چنے چبوائے اس کی مفصل رپورٹ اس نے ہیڈکوارٹرز میں خود پڑھی ہے تو سب نے میری ہمت، بہادری اور وطن کے لیے جانثاری کے جذبے کو بے حد سراہا۔ مزمل نے اپنے ان سینئر اور جونیئر افسران کو مدعو کیا تھا جن کے متعلق اس نے گزشتہ رات بتایا تھا کہ وہ اپنے ہم خیال فوجی افسران سے بھی ملوائے گا۔ بریگیڈیئر نے میرے کھلنا آنے کی وجہ پوچھی تو میں نے مختصراً اتنا بتایا کہ ایک معمولی سے ذاتی کام کے علاوہ ہمارا مقصد سندر بن میں شکار کھیلنا ہے۔ ہم نے تو آج صبح شکار کے لیے روانہ ہونا تھا لیکن مزمل کی وجہ سے اس پروگرام کو دو تین روز کے لیے ملتوی کیا ہے۔ مزمل نے شکار کے انتظام کے لیے اپنی مدد کی پیش کش کی تو میں نے کہا کہ تمام انتظام یہاں کی معروف شخصیت رفیق الاسلام نے کردیا ہے تو ایک لیفٹیننٹ کرنل فوراً بولا، ''شاید تم اس رفیق کی بات کررہے ہو جس نے بھارتی افواج کو ہار پہنا کر کھلنا میں ان کا استقبال کیا تھا۔ وہ رفیق نہیں شیطان ہے۔ اس سے بچ کے رہنا۔'' مزمل رفیق کا نام سن کر سوچ میں پڑگیا اور پھر جیسے دل میں کوئی حتمی فیصلہ کرتے ہوئے بولا، ''رفیق کو اپنے ساتھ شکار پر ضرور لے جانا۔ شکار کے دوران پاؤں پھسلنے یا بھڑ کے کاٹنے سے بھی نشانہ چوک سکتا ہے اور بجائے مطلوبہ شکار کے رفیق بھی اس گولی کا نشانہ بن سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوجائے تو نہ صرف کھلنا کے رہنے والوں پر بلکہ سارے بنگلہ دیشیوں پر تمہارا احسان ہوگا۔'' کرنل مزمل نے Between the lines (بین السطور) دل کی بات مجھے کہہ دی تھی۔ بریگیڈیئر نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا، ''شکار کے دوران ایسے ''واقعات'' اکثر پیش آجاتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے یا تمہارے ساتھیوں کے خلاف کوئی انکوائری نہ ہونے دوں گا۔ تم صرف گولی کے چوک جانے سے اس کی موت واقع ہونے کی رپورٹ ایک ایس پی کو اور اس کی کاپی مجھے دینا۔ باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔'' حالات کو اپنے موافق دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ ان ہم خیال افسران سے سونیا کے متعلق بات چھیڑوں کہ بریگیڈیئر نے مزمل کو کہا، Check all the doors and windows (سارے دروازے اور کھڑکیاں چیک کرو)۔ مزمل نے پانچ منٹ کے بعد واپس آکر کہا کہ سب ٹھیک ہے اور ملٹری پولیس کے چھ جوان پہرے پر ہیں۔'' میں حیران تھا کہ اتنی بے تکلفی اور یگانگت کے بعد یکایک یہ تبدیلی کیوں؟

کرنل مزمل بھی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ تمام افسران بھی پرسکون خاموشی سے بیٹھے تھے۔ بریگیڈیئر نے اس دوران سگار سلگا لیا۔ پریشان تو صرف میں تھا کہ یکایک یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری پریشانی میرے چہرے سے عیاں تھی جسے شاید سب نے محسوس بھی کیا۔ اپنے سینئر افسر کے سامنے ان میں سے بولا تو کوئی بھی نہیں لیکن ان سب کے چہروں پر دبی مسکراہٹ تھی جس سے میری الجھن میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ اس سکوت کو بالآخر بریگیڈیئر نے توڑا۔ سگار کی راکھ کو ایش ٹرے میں جھاڑتے

ہوئے وہ بولا، ”یہ محض ایک اتفاق نہیں بلکہ ہمارے ہم خیال ایک میجر جنرل نے تین چار ماہ کی تگ و دو کے بعد ہمیں کھلنا میں یکجا کردیا ہے ورنہ پہلے ہم مختلف رجمنٹس اور بریگیڈز میں بکھرے ہوئے تھے۔ تمہیں یقیناً علم ہوگا کہ بھارتی بارڈر یہاں سے قریب ہی ہے۔ جیسور چھاؤنی میں بھارتی دباؤ کی وجہ سے وہاں ایسے سینئر افسر تعینات کیے گئے ہیں جن کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جیسور بنگلہ دیشی نہیں بلکہ بھارتی چھاؤنی ہے۔ سرحد پار سے بھارتی فوجی افسران مہینے میں دس بارہ روز جیسور میں گزارتے ہیں اور ان ہی کے مشوروں اور ہدایات کے مطابق سرحد پار سے جاسوس ہماری محدود فوج میں بھارت مخالف جوانوں اور افسران کو تلاش کرتے اور ان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان جوانوں اور افسران کو یا تو سبکدوش کرکے ان کی مسلسل Surveillance (نگرانی) کی جاتی ہے اور یا انہیں کسی رات غائب کردیا جاتا ہے۔ معمولی سی اور رسمی انکوائری کے بعد انہیں Deserter (مفرور) قرار دیا جاتا ہے اور ان کی تلاش کے احکام دیے جاتے ہیں لیکن یہ صرف فائل ورک تک ہی محدود ہوتا ہے۔ عملی طور پر اب تک نہ تو کبھی ان کی تلاش کی گئی ہے اور نہ ہی ایسا کوئی Deserter آج تک پکڑا گیا ہے۔ کھلنا میں ہم نے مختلف ذرائع سے معلومات اکٹھی کرکے ایک مفصل رپورٹ تیار کی ہے۔ جس کی روشنی میں ایک پلان بھی ترتیب دیا ہے۔ جیسور چھاؤنی میں ایک ہیلی پیڈ (ہیلی کاپٹر اترنے اور اڑنے کی جگہ) ہے جہاں سے بھارتی سینئر افسران ہیلی کاپٹروں میں کلکتہ سے اس چھاؤنی میں آتے جاتے ہیں اور ان کا Flying Route (پرواز کا راستہ) سندر بن کے اس علاقے سے ہے جہاں پر شکار پارٹیاں جاتی ہیں۔ Air Pockets (ہوا کے دباؤ) سے بچنے کے لیے یہ ہیلی کاپٹر اس علاقے پر آٹھ سو سے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہیں۔ ہمارے پلان کے مطابق اگر کسی ایسے بھارتی ہیلی کاپٹر کو اس علاقے میں مارگرایا جائے تو بھارتی تحقیقات سے صاف معلوم ہوگا کہ یہ حادثہ کسی فنی خرابی سے نہیں ہوا بلکہ دانستہ اسے Hit کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا آٹھ بھارتی افسران ہلاک ہوں گے، بھارتی فوج کا جیسور چھاؤنی کے افسران پر اعتماد ختم ہوجائے گا اور وہاں کے GOC کا ٹرانسفر کر دیا جائے گا۔ ہم نے پورا انتظام کررکھا ہے کہ ایسی صورت میں اس جنرل کو جیسور بھیجا جائے گا جو ہمارا ہم خیال ہے۔ اس طرح جیسور چھاؤنی بھی ہمارے گروپ کے جنرل کی کمان میں آجائے گی۔ اس کام کے لیے ہم بزوکا (کندھے پر رکھ کر چلانے والا ہتھیار جس سے فائر کیے ہوئے راکٹ سے ٹینکوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے) استعمال کرسکتے ہیں۔ یہاں کھلنا چھاؤنی میں ہمارے پاس سن 71ء میں بھارتی فوج سے چھینے ہوئے دو بزوکا اور دس راکٹ ہیں جن کا چھاؤنی کے اسلحہ خانے میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ ہمارا پلان تقریباً پانچ ماہ قبل سے تیار پڑا ہے لیکن ہم اس پر آج تک عمل اس لیے نہیں کرسکے کیونکہ ہمیں اپنے ماتحت جوانوں، جے سی اوز اور افسران پر اعتماد نہیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ ابھی تک کھلنا چھاؤنی کے پورے بریگیڈ کی نفری میں ہمارے ہم خیال گروپ کے صرف یہی افسران ہیں جو اس کمرے میں بیٹھے ہیں اور

چودہ سپاہی اور NCO ہیں جن میں سے چھ ملٹری پولیس والے باہر پہرے پر ہیں۔ ان سب کی وفاداری کسی بھی قسم کے شک و شبے سے بالاتر ہے۔ اسی بریگیڈ میں ہماری سوچ سے اختلاف رکھنے والے ہمارے خلاف جاسوسی اور ہماری نقل و حرکت کی نگرانی بھی کرتے ہیں۔ اسی لیے ہمارا پلان ابھی تک سردخانے میں ہی ہے۔ کل تم سے ملنے کے بعد آج صبح کرنل مزمل نے مجھ سے تمہارے متعلق بات کی۔ بھارت میں تمہاری تمام کارگزاری کو یہ پہلے ہی کئی مرتبہ ہم سے تفصیلاً بیان کرچکا تھا۔ تمہاری یہاں موجودگی کا سن کر ہم نے آج بعد دوپہر میٹنگ کی اور آج رات ہی تم سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ بزوکا کی رینج ہزار فٹ سے زیادہ ہے اور اس رینج میں یہ ٹینک کی چھ انچ موٹی چادر کو پھاڑ دیتا ہے۔ ہیلی کاپٹر تو اگر پندرہ سو فٹ بھی بلند ہو تو یہ اس کے پرخچے اڑا دے گا۔ اسے چلانے کے لیے دو افراد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے نشانہ لینا بہت آسان ہے۔ ہمارے ہم خیال افسر اور جوان بھی یہ کام سرانجام دینے کو تیار ہیں لیکن ان کی چھاؤنی سے باہر اور ڈیوٹی کے علاوہ نقل و حرکت کی سختی سے نگرانی کے باعث ہم اپنے اس مشن کی تکمیل سے پہلے یا بعد میں Expose ہونے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ کیا تم اپنے شکار کے پروگرام کے دوران اس مشن کو سرانجام دینے کی ذمہ داری اُٹھا سکتے ہو؟ مجھے یقین ہے کہ بزوکا کے دو فائر کرنے کی ٹریننگ سے تم اس کا آزادانہ اور کامیاب استعمال کرسکوگے۔ استعمال کے بعد تم اسے ہینڈ گرنیڈ سے وہیں تلف بھی کرسکتے ہو۔ ہم تمہیں ہیلی کاپٹر کے روٹ اور سندر بن میں اس جگہ کی نشاندہی کے لیے مکمل نقشہ اور اس کی بھارت کی پرواز کے دن اور وقت سے بھی آگاہ کر دیں گے۔“

بریگیڈیئر اپنی بات مکمل کرکے خاموش ہوگیا اور سب نے میرے جواب کے انتظار میں میری طرف دیکھنا شروع کیا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور یہ چند لمحے اس سوچ میں نہیں گزرے کہ مجھے یہ مشن ہاتھ میں لینا چاہیے یا نہیں بلکہ میری سوچ کا زاویہ یہ تھا کہ سینئر بھارتی فوجیوں کی ہلاکت اور یہ جان کر کہ ان کے ہیلی کاپٹر کو Hit کیا گیا ہے ان کی بنگلہ دیش کے متعلق اپنی حمایت کی خوش فہمی کو کتنا صدمہ پہنچے گا اور اس سے مجھے کتنی راحت اور سکون ملے گا؟ میں نے یہ کہتے ہوئے اس مشن کو انجام دینے کی ذمہ داری قبول کرلی کہ یہ مشن جتنا آپ کے لیے اہم ہے اس سے زیادہ میرے لیے ہے۔ سقوط ڈھاکہ اور مقبوضہ کشمیر میں نہتے کشمیریوں پر بھارت کے ہر روز ڈھائے جانے والے مظالم سے میرے دل پر لگے زخموں میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔ میں دہلی میں DMI کے مجھ پر کیے گئے تشدد کو زندگی کی آخری سانس تک بھلا نہیں سکوں گا۔ اس مشن کی کامیابی میرے رستے زخموں پر مرہم کا کام دے گی۔“ میرے ہاں کہتے ہی سب فرداً فرداً مجھ سے گلے ملے اور ہم نے اللہ پاک کے حضور نہایت عاجزی سے مشن کی کامیابی اور پاکستان اور بنگلہ دیش کے پھر سے ایک وحدت بننے کے لیے دعا مانگی۔ اس کے بعد جو باتیں ہوئیں اور جن انتہائی اہم اور خفیہ رپورٹس کی فائلیں مجھے دی گئیں انہیں میں قومی راز اور مفاد کے لیے تحریر نہیں کرسکتا۔ مختصراً اتنا عرض کرتا ہوں کہ بزوکا کے دو فائر کرنے کی مجھے اور قیصر کو خفیہ ٹریننگ دی گئی۔ سندر

بن میں شکار کے دوران ہم نے بھارتی ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں ایک بھارتی میجر جنرل اور کئی سینئر افسر ہلاک ہوئے۔ بھارتی اور بنگلہ دیشی اخباروں میں یہ خبر جلی حروف سے شائع ہوئی اور حسب توقع بھارتی تحقیقات کے بعد اس حادثے کو سازش قرار دیا گیا جس کے نتیجے میں جیسور چھاؤنی کا GOC اور کئی سینئر افسران کا تبادلہ کردیا گیا اور جب میں پاکستان واپس لوٹا تو میرے پاس انتہائی خفیہ اور اہم فائلوں کا پلندہ تھا جسے میں نے پاکستانی متعلقہ حکام کے حوالے کیا۔

اپنا سارے راز، پلان اور اس کی ذمہ داری مجھے سونپ کر مجھ پر جو اعتماد کیا گیا تھا اسے ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے وہیں فیصلہ کیا تھا کہ سونیا کو وین روک کر اٹھانے اور کھلنا سے کھلے سمندر تک پہنچنے میں اپنی دشواری اور چکمہ رانی کی یہاں موجودگی کا انہیں بتادوں۔ بریگیڈیئر نے میری بات نہایت غور سے سنی اور کہا کہ وہ ہماری خواہش اور دیے گئے وقت کے مطابق ہماری شکار پارٹی کی روانگی کے بعد رانی، اس کے لڑکے اور دوسری خواتین کو بنکاک جانے والے جہاز تک حفاظت سے پہنچانے اور پھر ہماری شکار پارٹی کو بھی اس جہاز تک چھوڑنے کے لیے فوجی سپیڈ بوٹ پر مسلح فوجیوں کو ہماری حفاظت کے لیے بھیجے گا۔ علاوہ ازیں اپنے اعتماد کے فوجی جوانوں کی سویلین لباس میں ہمارے ہوٹل پر چوبیس گھنٹے نگرانی کا انتظام کردے گا تاکہ کوئی مخالف ہماری ساتھی خواتین یا دوسرے ساتھیوں تک نہ پہنچ پائے۔ اس نے مزمل کو کہا کہ ہوٹل کے اندر یا باہر اگر کوئی بھی مشکوک شخص نظر آئے تو اسے حراست میں لے کر چھاؤنی میں FIU والوں کے حوالے کردیا جائے تاکہ وہ ''اچھی طرح'' سے پوچھ گچھ کرسکیں۔ رات گئے ہماری یہ محفل ختم ہوئی اور میں نئے ولولے، نئے جذبے اور اپنے ازلی دشمن بھارت کو ایک اور جھٹکا دینے کے خیالوں میں گھرا مزمل کی جیپ پر اپنے ہوٹل لوٹا۔

اگلی صبح میں نے رفیق کو فون پر کہا کہ ایک ہفتے بعد ٹھیک آج کے روز ہم انشاء اللہ شکار پر ضرور روانہ ہوں گے۔ رفیق نے اتنے لمبے التوا کی وجہ جاننے کے لیے پوچھا اور کہا میں گزشتہ شام گئے آپ کے ہوٹل آیا تھا تو معلوم ہوا کہ آپ باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں دو گھنٹے تک آپ کا ڈائننگ ہال میں انتظار کرتا رہا۔'' میں نے اسے بتایا کہ میں بھارت فون کرنے ٹیلی فون ایکسچینج گیا تھا۔ اول تو لائن ہی بہت دیر کے بعد ملی اور دوران گفتگو بھی لائن میں گڑبڑ رہی اس لیے دوبارہ کال بک کرکے بات کی جس کے باعث رات گئے ہوٹل واپس آیا۔ آئندہ چار روز میں اور قیصر بریگیڈیئر کے معتمد جوانوں اور ایک افسر کے ساتھ بزوکا سے نشانہ لینے اور فائر کرنے کی پریکٹس کرتے رہے۔ بزوکا سے ایک گھٹنے کے بل بیٹھ کر اور اسے کندھے پر رکھ کر سامنے کے ٹارگٹ کا نشانہ لینا اور دوسرے ساتھی کا اس میں پروپلر راکٹ لوڈ کرنا اور فائر کے لیے ''سب تیار'' کی تھپکی کا سگنل دینا بہت آسان تھا لیکن آسمان کی طرف فائر کرنے کی پوزیشن لینا اور صحیح نشانہ لگانا خاصا دشوار تھا۔ میں نے آسمان کی طرف بزوکا سے تین فائر کیے اور مجھے ٹریننگ دینے والوں کے مطابق ان کی رائے تھی کہ اس صورت میں نیم دراز ہوکر ٹارگٹ کو

نشانہ بنانے کی مجھ میں اسی فیصد صلاحیت ہے اور میں سمجھتا تھا کہ صلاحیت وغیرہ کچھ نہیں۔ اللہ پاک کی رحمت پر میرا یقین کامل اور اپنے ازلی دشمن بھارت سے شدید نفرت اور انتقام کا جذبہ مجھے اپنے مشن میں سو فیصد کامیابی دے گا۔ بریگیڈیئر اور ہم خیال فوجیوں سے میٹنگ کے اگلے روز سے ہی سویلین لباس والے دو فوجی ہماری جاسوسی کرنے والوں کی تلاش میں ہوٹل کے اندر اور باہر منڈلانے لگے۔ چھ گھنٹے کی ڈیوٹی دینے کے بعد دو اور فوجی آجاتے اور یہ نگرانی چوبیس گھنٹے جاری رہتی۔ اس دوران غالباً رفیق کے بھیجے ہوئے دونوں اناڑی جاسوس بھی ایک بار آئے۔ میں نے تو انہیں نظر انداز کردیا لیکن شام کو مزمل سے فون پر بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ دو ''پالتو کبوتر'' مل گئے ہیں اور انہیں ہم خوب اچھا دانہ کھلا رہے ہیں اور تمہاری بنکاک روانگی تک ہم انہیں اپنے پاس ہی رکھیں گے۔ مزمل نے ملاقات کے دوران بتایا کہ صرف چھ سات تھپڑوں سے ہی انہوں نے بتادیا کہ رفیق نے انہیں میری نقل و حرکت کی اطلاع دینے کے لیے مقرر کیا تھا۔ ہماری شکار کے لیے روانگی میں ابھی تین دن باقی تھے کہ رات کو رانی نے مجھے بتایا کہ ان کے کمروں کے قریب ہی ایک کمرے میں دو عورتیں آکر ٹھہری ہیں اور آج دن میں تین چار مرتبہ انہوں نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا اور مجھ سے ملنا چاہا لیکن دروازہ کھولے بغیر ہی ہر بار ہم نے انہیں باہر ہی سے اپنی مصروفیت کا بہانہ کر رخصت کردیا۔ رانی پڑھی لکھی اور سمجھ دار عورت تھی اس نے ہوٹل کے منیجر کو بلوا کر اپنے لڑکے کے ذریعے کہلوایا کہ کچھ عورتوں نے بغیر کسی وجہ اور بلا جان پہچان کے ان کا دروازہ کئی بار کھٹکھٹایا اور وہ انہیں بلاوجہ پریشان کررہی ہیں۔ میں نے رانی کو کہا کہ وہ ہرگز انہیں نہ ملے اور اگر وہ کل دوبارہ آئیں تو مجھے بیرے کے ذریعے فوراً اطلاع بھجوائے۔ میں ان سے خود سمجھ لوں گا۔ اگلے روز ان عورتوں نے پھر رانی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو رانی نے مجھے اطلاع دی۔ میں نے رضی کو بیرے کے ہمراہ ان کے پاس بھیجا اور رضی نے ان کو دھمکایا کہ اگر وہ اب ان کمروں کی طرف بھی گئیں تو ان کا برا حشر کردیا جائے گا۔ کینوس کے تھیلوں میں بند بزوکا اور راکٹ ہماری روانگی سے دو روز پہلے ہمیں پہنچا دیے گئے۔ روانگی والے روز رفیق بمعہ گائیڈ اور مزدوروں کے صبح ہی آپہنچا۔ اسے حسن اتفاق کہیے یا مشیت ایزدی کہ رفیق نے شکار کے لیے وہی علاقہ چنا تھا جہاں نقشے کے مطابق ہمیں جانا تھا۔

گیارھواں باب

شکار پر روانگی سے پہلے میں نے اپنے آئندہ کے پروگرام میں چند تبدیلیاں کیں۔ رانی، اس کے بیٹے اور خواتین کو اپنے شکار سے واپسی سے پہلے جہاز تک بھیجنے کے بجائے انھیں کھلنا میں ہی رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اپنی کھلنا میں غیرموجودگی کے دوران اب ان کی شناخت کی ذمہ داری بریگیڈیئر اور کرنل مزمل نے اٹھا لی تھی اور سویلین لباس پہنے فوجی سپاہی چوبیس گھنٹے ان کی نگہداشت کے لیے موجود تھے۔ میں نے کرنل مزمل کو بھی رانی اور اس کے بیٹے سے ملوایا اور رانی کو کہا کہ میری غیر موجودگی میں اسے اگر کوئی بھی ضرورت پیش آئے تو کرنل مزمل سے دفتر یا گھر کے ٹیلی فون پر رابطہ کرے۔ میں نے رانی کو دس ہزار ڈالر بھی دیے کہ اگر ہماری واپسی میں دیر ہوجائے یا کوئی ضرورت درپیش ہو تو ان ڈالروں کو استعمال میں لائے۔ رانی کے دیے ہوئے اور مگھ اور مورنگ قبیلے کے جواہرات بھی رانی کو دیے لیکن اس نے ان کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کردیا۔ میں نے کرنل مزمل کے ذریعے کھلنا کے نیشنل بینک میں ایک لاکر لے کر تمام جواہرات اس میں رکھے۔ قیصر اور نمبرٹو نے مجھے مشورہ دیا کہ حمید کو یہاں سے رخصت کر دیا جائے لیکن میں نے ان کی تجویز یہ کہہ کر مسترد کردی کہ حمید سے یہ بات بھی ناممکن نہیں کہ وہ رانگاماٹی جاکر سردار کو ہمارے کھلنا میں قیام کا بتادے۔ بیشک یہاں کے فوجی افسران میری ہرممکن مدد کرتے لیکن بنگلہ دیش میں ہم سب پاسپورٹ اور ویزہ کے بغیر تھے اور حمید کو کرنافلی پیپرملز میں فوجی چوکی پر ہمارے حملے کا بھی علم تھا۔

ہم پر جاسوسی کا شبہ بھی کیا جاسکتا تھا اور اگر ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاتے تو فوجی افسران کا تعاون اور ہمدردی بھی ایک حد سے آگے نہ جاسکتی تھی اور میں ایسا کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا لہٰذا ساری صورت حال قیصر اور نمبرٹو پر واضح کر کے میں نے صاف الفاظ میں انھیں کہا کہ ہماری

ہمراہیوں میں سے کوئی بھی اگر واپس جانا چاہے تو میں اسے جانے کی اجازت دینے کے بجائے اسے ہلاک کرنا زیادہ بہتر سمجھوں گا۔ کرنل مزمل کی اس آفر کو بھی میں نے رد کردیا کہ ہماری غیرموجودگی میں کھلنا میں رہنے والوں کو کنٹونمنٹ کے گیسٹ ہاؤس میں منتقل کردیا جائے کیونکہ کنٹونمنٹ میں اس طرح عارضی رہائش رکھنے والوں کا اس متحدہ پاکستان کے حامی گروپ کے مخالفین کی نظر میں آجانا عین ممکن تھا۔ اپنے پروگرام میں ان تبدیلیوں کے علاوہ میں نے اپنی شکار سے واپسی کی واضح اور حتمی تاریخ کے نہ ہونے کے سبب چٹاگانگ میں اصفہانی کے جہاز کو ہرن گھاٹا بلوانے کو بھی اپنی واپسی تک موخر کردیا۔

ان تمام انتظامات کے بعد رفیق سے نئی مقررہ تاریخ کو ہم صبح آٹھ بجے اپنے تمام ساز و سامان، بزوکا اور راکٹوں کے تھیلے اور اپنے اسلحہ کے ساتھ روانگی کے لیے بالکل تیار تھے۔ رفیق بھی دو گائیڈ اور چھ مزدوروں اور خوردونوش کے سامان کو کرائے پر لی ہوئی لانچ پر چھوڑ کر ہمیں لینے آگیا۔ تقریباً ساڑھے نو بجے ہماری لانچ نے اپنا سفر شروع کیا۔ میں نے کرنل مزمل کے دیے ہوئے مفصل نقشوں اور ہیلی کاپٹروں کے فضائی راستے کی تفصیل کو اپنے لباس کے اندر محفوظ کرلیا تھا۔ ہماری روانگی کی صبح سے قبل رات کو مزمل نے مجھے بتایا تھا کہ بھارتی ہیلی کاپٹر کا آئندہ آٹھ روز میں دوبارہ جیسور چھاؤنی جانا متوقع ہے اور اس روٹ پر کوئی بنگلہ دیشی ہیلی کاپٹر پرواز نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں ہیلی کاپٹر پر بنے بھارتی فوجی نشان اس کی کم بلندی پر پرواز کی وجہ سے صاف دکھائی دیتے ہیں لہٰذا جونہی کوئی ہیلی کوپٹر دیکھو، بلادریغ اسے اڑا دینا۔ ہمیں دو ہینڈ گرنیڈ بھی دیے گئے تاکہ کامیاب کارروائی کے بعد بزوکا کو تباہ کیا جاسکے۔

لانچ نے ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں اس مقام پر پہنچادیا جہاں سے ہمارا پیدل سفر شروع ہوتا تھا۔ وہاں پر چند چھوٹی کشتیاں بھی موجود تھیں اور اس جگہ کو شکاری گھاٹ کہتے تھے۔ یہ سندر بن کا وہ حصہ تھا جسے شکار کے لیے موزوں ترین کہا جاتا تھا۔ یہاں سے پانچ پگڈنڈیاں مختلف اطراف میں جاتی تھیں۔ گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ ان پگڈنڈیوں میں سے تین ان اطراف کو جاتی ہیں جہاں عام طور پر چھوٹا شکار ملتا ہے اور چھوٹی شکار پارٹیاں جنگل میں صرف دو تین میل تک اندر جاکر شکار کرتے اور واپس آجاتے ہیں۔ باقی دو پگڈنڈیاں بڑے شکار کے لیے جانے والوں کے لیے ہیں اور ان میں سے ایک باگرہاٹ سے گزرتی ہے۔ بڑی شکاری پارٹیاں جنگل میں آٹھ دس روز قیام کرتیں اور مطلوبہ شکار کی تلاش میں کئی کئی دن بھٹکتی رہتی ہیں۔ ہمارے پاس بڑے شکار کی مخصوص رائفلیں اور بندوقیں نہیں تھیں لیکن رفیق نے ہمیں ایسی گولیاں کھلنا سے لادی تھیں جن سے ہم اپنی رائفلوں سے شیر اور چیتے کا شکار کرسکتے تھے۔ میری اور میرے ساتھیوں کی سوچ یہ تھی کہ بڑے شکار کی مخصوص رائفلیں صرف ایری کے چاؤ چونچلے ہیں۔ ورنہ عام رائفل سے بھی شکار کیا جاسکتا ہے۔ صرف ہاتھی کے شکار کے لیے مخصوص رائفل کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم کھلنا شکار کھیلنے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ ہمارا یہ پروگرام

سندربن کے قریب ہونے کی بنا پر اچانک ہی بغیر پیشگی تیاری کے بنا تھا۔ برما سے رانگامائی کے سفر کے دوران بھی ہم نے کئی بار ہرن اور نیل گائے کا شکار اپنے عام اسلحے سے کیا تھا۔ اژدھے کو بھی عام اسلحے سے ہلاک کیا تھا۔ قیصر کے بقول گولی چاہے Express 555 سے چلائی گئی ہو یا ریوالور سے، کسی جاندار سے ٹکرا کر واپس نہیں آتی اور جہاں ایک گولی پوری طرح اثرانداز نہ ہو وہاں چار پانچ یا دس گولیاں وہی ریزلٹ دیتی ہیں جو Express 555 کی ایک گولی۔ یہ داستان بلکہ حقیقت ہے۔ قیصر نے کتنی صحیح بات کی تھی۔ اب تازہ ترین کارگل کی لڑائی کو ہی سامنے رکھیں تو آپ کو احساس ہوگا کہ جذبہ ایمانی سے سرشار چند سو مجاہدین نے اپنے صحیح مقصد کے حصول کے لیے اپنے ہلکے ہتھیاروں سے بھارت کی چالیس ہزار فوج کو یوں گھیر لیا تھا کہ سامان رسد کی سپلائی بند ہونے سے انھیں خوراک کے لالے پڑ گئے تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کے ستر ہزار فوجی، جنگی طیارے، توپخانے کی سوئیڈن سے حاصل کردہ بوفر توپیں غرضیکہ ان کا حرب وضرب کا تمام سامان بیکار ثابت ہوا اور اپنے چالیس ہزار فوجیوں کو بچانے کے لیے بھارت نے ساری دنیا میں واویلا مچادیا۔ دنیا بھر کے ممالک سے التجائیں کیں کہ بھگوان کے لیے پاکستان سے کہو کہ مجاہدین کو واپس بلالے حالانکہ یہ مجاہدین پاکستانی فوجی نہیں تھے بلکہ شہادت پانے کی آرزو لیے مقبوضہ کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی فریاد پر لبیک کہتے ہوئے مجاہدین تھے۔ یہ چند سو مجاہدین جب بھارت کو اپنے Muscles (طاقت) دکھا کر واپس لوٹے تو بھارت کو اس کے ''بہادر اور نڈر'' گیارہ سو سے زائد بھارتی فوجیوں کی سڑتی اور بدبو پھیلاتی لاشوں کا تحفہ دینے کے علاوہ ساڑھے چار ارب کا نقصان پہنچا چکے تھے۔ بھارتی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بقول بوفرز کی سپر ہیوی توپ کے ایک گولے کی قیمت گیارہ سو ڈالر ہے اور ان توپوں سے داغے گئے ہزاروں گولے اور مارٹرز اور دوسرے ہتھیاروں کے لاکھوں فائر، جنگی جہازوں سے گرائے گئے سینکڑوں بم اور گن شپ ہیلی کاپٹروں کی مشین گن کی گولیاں ان مجاہدین کا بال بھی بانکا نہ کرسکیں۔ ان مجاہدین کے ایک نمائندے کے بقول کارگل سے ان کی واپسی کی ایک بڑی وجہ ان بھارتی فوجیوں کی لاشوں کی سڑانڈ اور بدبو تھی جو مجاہدین کے لیے ناقابل برداشت ہوچکی تھی۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجیوں میں اتنا حوصلہ بھی نہ تھا کہ مجاہدین کی موجودگی میں اپنے مرنے والے فوجیوں کی لاشیں ہی اُٹھا لیتے۔

جنگل میں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ رضی بھی اپنی ملازمت کے دوران جنگلوں میں ڈیوٹی انجام دیتا رہا تھا میں نے اسے تاکید کی تھی کہ جنگلوں سے اپنی واقفیت کسی پر ظاہر نہ کرے اور اگر گائیڈ کوئی خلاف معمول ہدایت دیں یا غلط مشورہ دیں تو صرف مجھے بتادے۔ رفیق بھی اپنے ساتھ ایک اعلیٰ غیرملکی بندوق لایا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو کہہ دیا تھا کہ رفیق کی طرف سے چوکنا رہیں۔ رضی نے مزدوروں میں سے ایک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس کی شکل جانی پہچانی لگنے کے باعث اس نے چکمہ زبان میں اس سے کوئی بات پوچھی تو مزدور نے بے

خیالی میں پہلے اس زبان میں آدھا جواب دیا اور اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی بات ادھوری چھوڑ کر بنگالی زبان میں کہنے لگا کہ کونسی زبان بول رہے ہو۔ میں نے ساتھیوں کو اس مزدور پر خاص نگاہ رکھنے کا کہا۔ تقریباً دو میل چلنے کے بعد گھنا جنگل شروع ہوا۔ گائیڈز نے کہا کہ آج رات ہم یہیں کیمپ کریں گے اور صبح گھنے جنگل میں داخل ہوں گے۔ رضی نے بھی ان کی تائید کی اور ہم نے وہیں ایک مناسب جگہ دیکھ کر کیمپ لگایا اور اس کے اردگرد لکڑیوں کا الاؤ روشن کردیا۔ رفیق ایک کھانا بنانے والا بھی ہمراہ لایا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر میں نے اپنے ساتھیوں کو باری باری پہرہ دینے کی ڈیوٹی سونپی اور پھر دانیاں تان کر سوگئے۔ میں چکمہ زبان جاننے والے مزدور اور رفیق کے گٹھ جوڑ کے متعلق سوچنے لگا لیکن جلد ہی اس خیال کو جھٹک دیا۔ رفیق کو بہرحال میں نے اس جنگل میں ہلاک کرنا تھا۔ جہاں ایک وہاں ایک اور سہی لیکن چکمہ مزدور کا راز میں اسے ہلاک کرنے سے پیشتر ضرور جاننا چاہتا تھا۔

اگلی صبح پو پھٹتے ہی ہم نے ہلکا پھلکا ناشتہ کیا اور کیمپ اکھیڑ کر گھنے جنگل میں داخل ہوگئے۔ یہاں پر آگے بڑھنا خاصا دشوار تھا۔ پگڈنڈی کو گرے ہوئے پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ گائیڈ ہمارے آگے راستہ بناتے اور راستے میں حائل ٹہنیوں اور جھاڑیوں کو ہٹاتے۔ ان کے پیچھے ہماری شکار پارٹی اپنے لوڈڈ ہتھیار اٹھائے اور ہمارے پیچھے مزدور ہمارا کیمپنگ کا سامان اٹھائے سنگل فائل میں چل رہے تھے۔ جس مزدور نے بزوکا اور گولوں والے بیگ اٹھا رکھے تھے اسے میں نے اپنے پیچھے اور اپنے ساتھیوں کے آگے چلنے کا کہا تھا۔ ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جنگل میں ابھی تک اکا دکا چھوٹے جنگلی جانور ہی دکھائی دیئے تھے۔ راستے میں اب تک ایک سانپوں کا جوڑا بھی دکھائی دیا۔ چونکہ وہ پگڈنڈی پر نہیں تھے لہٰذا ہم بھی خاموشی سے گزر چکے۔ ہم مہذب انسانوں کی بستی سے نکل کر جنگل کے باسیوں کے علاقے میں آچکے تھے اور ان کی راجدھانی میں ان سے بلاوجہ تعرض کرنے کی ہمیں کیا ضرورت تھی۔ گائیڈز نے ہمیں متنبہ کردیا تھا کہ اس حصے میں چیتے درختوں کے تنوں پر بیٹھے اچانک جست لگا کر حملہ کر دیتے ہیں اور سانپ بھی بکثرت ہیں لہٰذا اپنے قدموں اور اردگرد کے نزدیکی درختوں پر خاص دھیان دیں۔ ہم پدما ندی کے بہاؤ کے مشرقی جانب جا رہے تھے اور ہماری منزل باگر ہاٹ تھی۔ بنگالی زبان میں باگر شیر کو کہتے ہیں۔ یہاں مشہور زمانہ بنگال ٹائیگر اور ہاتھی بکثرت ہوتے ہیں اور ہرن اور نیل گائے بھی اکثر اسی علاقے میں ملتے ہیں۔ باگرہاٹ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں جنگلی ہاتھیوں کو پکڑنے والے رہتے ہیں اور گائیڈز کو معاوضہ لے کر قریبی حصے میں بنگال ٹائیگرز کے صحیح ٹھکانوں کا پتہ بتاتے ہیں۔

باگرہاٹ میں شکاریوں کی سہولت کے لیے انگریزوں کے دور کا بنا ہوا ایک ڈاک بنگلہ بھی بنا ہوا ہے۔ باگرہاٹ اور اس کے گرد ونواح میں شکار سے فارغ ہو کر ہمیں پھر اسی راستے سے واپس جا کر پدما ندی کو عبور کر کے اس کے غربی جانب کے جنگل میں جانا تھا اور وہاں ہماری منزل

ٹووا (Towa) تھی۔ اس علاقے میں ہم زیادہ گہرائی تک آگے نہیں جاسکتے تھے کیونکہ بھارتی سرحد بالکل قریب تھی۔ یہاں آبی پرندوں کے علاوہ ہرن بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ (ٹووا اور کالی گنج کے درمیان کے علاقے کی مزل کے دیے ہوئے نقشے پر بھارتی ہیلی کاپٹر کے روٹ کی نشاندہی کی گئی تھی)

شام ڈھلے ہم باگرہاٹ پہنچے۔ گائیڈ ہمیں اسی ڈاک بنگلے میں لے گیا۔ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بنا ہوا یہ ڈاک بنگلہ شکاریوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں تھا۔ بڑی شکاری پارٹیاں یہاں ہفتوں قیام کرتی تھیں۔ ہمارے پاس چونکہ شکار کے لیے مناسب اسلحہ نہیں تھا اس لیے ہم نے شکار کے ایک بھرپور پروگرام کے بجائے شکار کے ساتھ ساتھ تفریح اور اپنے مشن کی انجام دہی کے لیے محض شکار کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ڈاک بنگلے کا بوڑھا چوکیدار انگریزوں کے دور سے یہاں چوکیداری کرنے کی وجہ سے اچھی خاصی انگریزی جانتا تھا۔ اس نے اپنے لڑکوں کی مدد سے ہمارے لیے جھٹ پٹ کمرے تیار کیے اور پوچھا کہ رات کے کھانے میں ہم مرغی پسند کریں گے یا شکار۔ میں نے شکار کو ترجیح دی تو چوکیدار کے ایک لڑکے نے اپنی توڑے دار بندوق (اس قدیم طرز کی بندوق کی نال میں بارود ڈال کر لوہے کی ایک گولی ڈالی جاتی ہے اور اسے چلانے کے لیے نال کے اوپر ٹریگر کے قریب ایک سوراخ پر ٹوپی رکھ کر ٹریگر دبایا جاتا ہے۔ ٹریگر کی چوٹ ٹوپی پر پڑنے سے ٹوپی کے اندورنی حصے سے شعلہ نکلتا ہے جس سے بارود آگ پکڑ کر جلتا اور لوہے کی گولی نال سے باہر پھینکتا ہے۔ نال میں بارود اگر زیادہ ڈال دیا جائے تو وہ اکثر پھٹ جاتی ہے۔ چوکیدار کے لڑکے نے یہ توڑے دار بندوق ہمارے سامنے بھری اور جنگل میں چلا گیا۔ اسے گئے بمشکل پچیس منٹ گزرے ہوں گے کہ بندوق چلنے کی آواز آئی اور تھوڑی دیر میں ہی وہ لڑکا ہانپتا ہوا ایک ہرن کو گھسیٹتا ڈاک بنگلے میں لے آیا۔ تینوں باپ بیٹوں نے ہرن کو صاف کر کے اسے آگ پر بھونا۔ اسی دوران رفیق نے اپنے سامان میں سے اسکاچ وہسکی نکالی۔ چوکیدار نے بوتل دیکھ کر کہا ”صاحب! یہ ولائتی شراب تو آپ پیتے ہی رہتے ہیں۔ آج ہماری بنی ہوئی مقامی تاڑی پئیں۔ آپ کو لطف آجائے گا۔“ میں دیکھ رہا تھا کہ قیصر، نمبر ٹو اور دوسرے ساتھی بھی پینے کی خواہش رکھتے تھے۔ میں نے چوکیدار کو چھ بوتلیں لانے کا کہا۔ چوکیدار تھوڑی دیر میں ہی بوتلیں لے آیا۔ اوروں کے متعلق تو مجھے علم نہ تھا لیکن نمبر ٹو اسکاچ کی پوری بوتل پی کر بھی ہوش و حواس میں رہتا تھا۔ سفید رنگ کی تاڑی سے آدھے بھرے ہوئے گلاس چوکیدار نے سب کو دیے جسے چند منٹوں میں ختم کر کے پینے والوں نے مزید تاڑی طلب کی۔ چوکیدار بوتلیں لینے گیا تو رفیق یہ کہہ کر کہ اسکاچ وہسکی کے نشے کے مقابلے میں اس تاڑی کی کیا حیثیت ہے اپنی بوتل لینے کے لیے اٹھا اور ابھی اسی کمرے میں رکھی اپنی بوتل تک پہنچا بھی نہ تھا کہ یکدم دھڑام سے فرش پر بے سدھ گر گیا۔ اسے اٹھانے کے لیے قیصر اور نمبر ٹو اٹھے تو وہ بھی چکرا کر گر گئے۔ میں حیران تھا کہ انھیں کیا ہوا ہے۔ مجھے تاڑی میں زہر ملا ہونے کا بھی خیال آیا۔ میں دوسرے کمروں میں گیا تو وہاں بھی تاڑی پینے والوں

کی یہی حالت تھی۔ میں چکرا کر رہ گیا۔ اتنے میں چوکیدار کے لڑکے مزید بوتلیں لے کر آگئے۔ میں ان پینے والوں کی یہ حالت دیکھ سمجھا کہ ہم کس سازش کا شکار ہوگئے ہیں۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور چوکیدار کے لڑکوں پر تان کر ان سے پینے والوں کی حالت کا پوچھا۔ وہ ہنسنے لگے اور بولے ”یہ تاڑی چسکیاں لے کر پی جاتی ہے۔ ان سب نے غٹا غٹ پی لی ہوگی تبھی ان کی یہ حالت ہوئی ہے۔“ ان لڑکوں نے پانی سے گلاس بھر بھر کر ان پر پھینکے تو انھیں ہوش آیا اور آدھ گھنٹے میں ان کے حواس بجا ہوئے۔ ہم نے ہرن کا بھنا گوشت کھایا اور آئندہ صبح کے شکار کے پروگرام بناتے ہوئے سو گئے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مزید ایک رات یہاں گزار کر ہم واپس چلیں گے اور پدما کے دوسرے کنارے پر جنگل میں ٹووا تک جائیں گے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ بنگال ٹائیگر اگر کل نہ مل سکا تو اس کے انتظار میں ہم مزید یہاں نہیں رکیں گے۔

صبح ناشتہ دیتے ہوئے چوکیدار نے بتایا کہ باگرہاٹ کے قریب ہی ”کھیدا“ ہو رہا ہے اگر آپ چاہیں تو آپ کو دکھانے کے لیے لے چلوں۔ یہ لفظ میرے لیے اجنبی تھا۔ میرے پوچھنے پر وہ بولا کہ جنگلی ہاتھیوں کو پکڑنے، انھیں پابہ زنجیر کرنے اور سدھانے کو کھیدا کہتے ہیں میں نے ساتھیوں سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ آج کھیدا دیکھیں گے اور کل شکار کے لیے جائیں گے لہٰذا واپس روانگی کل کے بجائے پرسوں پر ملتوی کرتے ہوئے ہم دیکھنے کے لیے تیار ہوگئے۔ ہم اپنا اسلحہ بھی ساتھ لے گئے تاکہ اگر موقع ملا تو شکار بھی کر لیں گے۔ باگرہاٹ سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر عین جنگل کے بیچ میں درخت کاٹ کر جگہ صاف کی گئی تھی اور ایک بڑے دائرے میں بہت بڑے اور موٹے بانسوں کو زمین میں ایک دوسرے کے ساتھ گاڑ کر اور مضبوط رسیوں سے انھیں باندھ کر دوہری باڑھ بنائی گئی تھی۔ بانس زمین میں اتنی گہرائی تک گڑے اور اتنی مضبوطی سے ایک دوسرے اتنے قریب قریب بندھے ہوئے تھے کہ باہر سے اندر دیکھنے کے لیے ذرا سی بھی جھری نہ تھی۔

اس سرکل کے اندر جانے کا صرف ایک راستہ تھا۔ ایسے ہی موٹے بانسوں کا اتنا ہی مضبوط ایک تقریباً پچیس فٹ چوڑا اور سرکل کی بلندی جتنا ٹکڑا رسوں سے سرکل کے اوپری حصے تک کھینچ کر اردگرد کے درختوں سے اسے باندھ دیا گیا تھا یعنی اس سرکل میں داخلے کا واحد رستہ پچیس فٹ چوڑا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو کھیدا کے لیے کام کرنے والے اور چند تماش بین جن میں دو تین غیر ملکی بھی تھے۔ درختوں پر خاموشی سے بیٹھے تھے۔ ہم بھی سرکل کے اردگرد نزدیکی درختوں پر چڑھ گئے۔ قیصر، نمبر ٹو اور چوکیدار میرے ساتھ ہی درخت کے ایک ٹہن پر بیٹھے تھے۔ ہمیں وہاں بیٹھے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ میں یونہی بیٹھنے سے اکتا گیا تھا اور قریب تھا کہ درخت سے اتر کر ساتھیوں کے ہمراہ یہاں سے چلوں کہ ہاتھی کی چنگھاڑ سنائی دی۔ چوکیدار نے سرگوشی میں مجھے بتایا کہ یہ مادہ سدھائی ہوئی ہتھنی کی آواز تھی اور یہ مخصوص آواز ہتھنی صرف اس وقت نکالتی ہے جب اسے نر ہاتھی کی خواہش ہو۔ ایسی طرح

تین چار بار وقفے وقفے سے چنگھاڑنے کے بعد ہتھنی خاموش ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی چوکیدار نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا کہ ہتھنی آرہی ہے۔ چند منٹوں میں ہی ہتھنی نمودار ہوئی اور آہستہ خرامی سے سرکل کے گیٹ سے اندر چلی گئی۔ اس ہتھنی کے پیچھے چھ نر ہاتھی آرہے تھے جن میں سب سے بڑا ہاتھی ان کے آگے تھا۔ چوکیدار نے اسے لہجے میں مجھے بتایا کہ یہ چھ ہاتھی جنگلی ہیں اور اپنے گروہ کے لیڈر ہاتھی کے بھروسے پر اس کے ساتھ آرہے ہیں۔ لیڈر ہاتھی مستی میں جھومتا ہوا سرکل کے گیٹ میں داخل ہوا اور اس کے پیچھے آنے والے ہاتھی بھی اس کی پیروی میں سرکل میں داخل ہوگئے۔ لیڈر ہاتھی خرمستیوں کے لیے ہتھنی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کھیدا والوں کے دو آدمی بجلی کی تیزی سے درختوں سے اتر کر گیٹ کے اوپری حصے پر چڑھ گئے اور بندھے ہوئے گیٹ کی رسیاں کاٹ دیں۔ گیٹ تیزی سے نیچے آیا جسے کھیدا والوں کے چار پانچ ساتھیوں نے سرکل سے مضبوط رسیوں سے باندھ کر راستہ بند کردیا۔ ہم درخت کی بلندی پر بیٹھے اندر کا حال بھی دیکھ رہے تھے۔ لیڈر تو ہتھنی کی آواز اور قرب کے حصول میں ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس کے ہمراہی ہاتھیوں نے جب دیکھا کہ باہر نکلنے کا راستہ بند ہوچکا ہے تو پہلے تو انھوں نے سرکل کے بانسوں کو اپنے ماتھوں کی ٹکروں سے گرانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ناکام ہوکر چنگھاڑنے لگے۔ ہاتھی خاصا عقلمند جانور ہے۔ جب انھیں یقین ہوگیا کہ اپنے لیڈر کی ناسمجھی کے باعث وہ قید ہوگئے ہیں تو وہ چنگھاڑتے ہوئے اپنے لیڈر پر حملہ آور ہوئے اور اسے گھیر کر اپنے دانتوں سے اس کا پیٹ پھاڑ کر اسے ہلاک کردیا۔ ان میں سے ایک ہاتھی خود بھی لیڈر کو مارتے ہوئے زخمی ہوگیا۔ چوکیدار نے مجھے بتایا کہ آٹھ روز تک ان قیدی ہاتھیوں کو بھوکا رکھا جائے گا اور بھوک پیاس سے جب ان کی قوت مدافعت کم پڑ جائے گی تو دو سدھائے ہوئے ہاتھی اس گیٹ سے اندر داخل کیے جائیں گے اور وہ یکے بعد دیگرے پانچوں ہاتھیوں کو اپنے بیچ میں جکڑلیں گے اور تجربہ کار ہاتھی سدھانے والے ان جنگلی ہاتھیوں کے پاوں میں بھاری سنگل ڈال دیں گے۔ اس عمل کے دوران کئی بار ان جنگلی ہاتھیوں کے پاؤں میں سنگل ڈالتے ہوئے کئی افراد ان کے پاؤں تلے کچلے بھی گئے ہیں۔ سنگل ڈالنے کے بعد ان قیدی ہاتھیوں کو خوراک دی جائے گی اور اپنے لیڈر کی حماقت کے باعث یہ قیدی ہاتھی انسان کے ہاتھوں اپنی غلامی قبول کرلیں گے۔ پھر ان کو سدھایا جائے گا اور بار برداری اور خصوصی طور پر جنگل کے درختوں کے تنوں کو اپنی سونڈ سے اٹھا کر دریا یا فیکٹری تک پہنچانے کا کام ان سے لیا جائے گا۔ اس دوران یہ غلامی کے عادی اور انسان کی صحبت کے عادی ہوچکے ہوں گے اور اس وقت انھیں اگر بالکل آزاد بھی چھوڑ دیا جائے تو یہ واپس اپنے ٹھکانے پر آجائیں گے کیونکہ ان کی آزادی کی خواہش تب تک بالکل ختم ہوچکی ہوگی۔

بعد دوپہر ہم کھیدے کا پہلا حصہ دیکھ کر درختوں سے اترے اور واپس ڈاک بنگلے کی راہ لی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اپنے لیڈر کی غلطی کی سزا ان ہاتھیوں نے اسے فوراً ہی دے دی اور ایک ہم

ہیں کہ اپنے لیڈروں کی غداری، وطن فروشی اور ذاتی فوائد کے لیے پوری قوم کو گروی رکھنے اور دوسروں کا غلام بننے کا ہمیں پورا یقین ہونے کے باوجود ہم خود تو ان سے باز پرس کرتے نہیں اور اگر کوئی جری اور نڈر شخص ان کی ان حرکتوں کا نوٹس لے تو بجائے اسے داد دینے کے اس فرسودہ اور بے ڈھنگے آئین کے حوالے سے احتجاج کرنا شروع کردیتے ہیں جس کی شکل انھی غداروں نے متعدد ترامیم (Amendments) کرکے اتنی بگاڑ دی ہے کہ اسے اپنا قومی آئین کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے مارشل لا لگانے کے بعد صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ چودہ صفحے کا یہ کتابچہ قومی آئین نہیں بلکہ محض ردی کا ٹکڑا ہے جسے ایک شخص نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے صرف اپنے مفاد کے لیے بنایا ہے۔ آج بھی ہم ایسی ہی صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف نے اگرچہ اس آئین کو ختم نہیں کیا جس میں مسلسل اور متعدد ترامیم (Amendments) کرکے نواز شریف نے سارے اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کرکے کم از کم مزید بیس سال پاکستان کے سیاہ وسفید کا مالک اور امیر المؤمنین بننے کی تیاری کی تھی اور آج اس کے چند حواری اور چمچے اسی آئین کے حوالے سے احتجاج کررہے ہیں۔ خدارا ذرا اس آئین کو پڑھیں اور دیکھیں کہ کیا یہ ہمارا قومی آئین ہے یا رائے ونڈ کے محلات ہیں اباجی کے مشوروں سے ترامیم کیا ہوا وہ کتابچہ ہے جس کے ذریعے تازندگی حکومت کرنے کی راہ بنائی گئی ہے۔ پچھلے دنوں اخبار میں پڑھا تھا کہ شہباز شریف نے بیان دیا ہے کہ فوجی حکام کو نواز شریف سے شکایات تھیں لیکن میرے حکمران بننے پر وہ راضی تھے۔ معلوم نہیں اس شریف فیملی اور بھٹو خاندان کو یہ غلط احساس کیونکر ہوا ہے کہ پاکستان پر حکومت کرنے کا صرف انھی دو خاندانوں کو پیدائشی حق حاصل ہے۔ سن 87ء سے تو یہی دیکھنے میں آرہا ہے کہ جیسے صرف یہ دونوں ''شاہی خاندان'' ہی پاکستان پر غاصبانہ حکومت کرنے کے لیے وجود میں آئے ہیں۔

کھیدا دیکھنے کے بعد ڈاک بنگلے کو واپس جاتے ہوئے چوکیدار نے مجھے کہا کہ باگرہاٹ میں اس کا گھر ہے۔ اگر ہم وہاں کچھ دیر آرام کرنے کے لیے ٹھہر جائیں تو وہ ہمارے لیے آملیٹ چاول اور چائے بنوائے گا اور کچھ دیر وہاں ستانے کے بعد غروب آفتاب کے وقت اگر ہم ڈاک بنگلے کی طرف روانہ ہوں تو بہت ممکن ہے کہ ایک دو ہرن شکار کرسکیں کیونکہ اس وقت ہرن سارا دن خوراک کے حصول کی تلاش کے بعد پانی پینے کے لیے ہمارے راستے میں ایک نشیبی جگہ پر جمع پانی کے ایک جوہڑ سے پیاس بجھانے آتے ہیں۔ چوکیدار مجھ سے بڑا انعام لینے کی خواہش میں ہمارے یہاں قیام کے دوران ہمیں زیادہ سے زیادہ خوش اور مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ درخت کے تنوں پر گھنٹوں بیٹھے اور کھیدا دیکھتے ہم سب خاصے تھک چکے تھے۔ رفیق کا تو برا حال تھا۔ میں نے ساتھیوں کے مشورے سے چوکیدار کی اس دعوت کو قبول کیا۔ قیصر نے بھی چوکیدار کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ اتنے افراد کا اتنے

اسلحے کے ساتھ سندر بن سے شکار کے بغیر خالی ہاتھ لوٹنا اچھا نہیں لگتا۔ ہم سب باگرہاٹ میں چوکیدار کے مکان پر پہنچے۔ چھوٹے سے گھر کے اندر تو اتنی گنجائش نہ تھی کہ وہ ہمیں اندر سے لے جاتا۔ اپنے گھر اور ادھر اُدھر سے مانگی تانگی چارپائیاں اور تکیے لے کر اس نے اپنے گھر کے قریب ایک بڑے درخت کے سائے میں ہمارے ستانے کا انتظام کیا اور خود کھانا اور چائے بنوانے چلا گیا۔ اس گاؤں سے ڈاک بنگلہ تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا اور انھی دو میلوں میں وہ جوہڑ پڑتا تھا جس پر ہرن اپنی پیاس بجھانے آتے تھے۔ اس سارے مشن کے دوران قیصر نے مجھ سے اپنی رفاقت، بے لوث جاں نثاری اور بہادری سے میرے دل میں اتنی جگہ بنالی تھی کہ وہ مجھ سے حدود میں رہ کر بے تکلفی کے تعلقات پر آچکا تھا۔ گورکھپور کا ہوائی اڈہ اڑانے، DMI دہلی میں میری حراست کے دوران مجھے رہا کرانے کی کوشش میں DMI ہیڈ کوارٹرز پر بموں کے دھماکے، کھٹمنڈو میں میری ایک ٹیلی فون کال پر اپنے ساتھیوں سمیت آنا اور مکتی باہنی والوں کو جہنم رسید کرنا، اور اب پھر میرے ٹیلی فون کرنے پر بغیر پاسپورٹ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آسام میں ملنا اور مورنگ، مگھ اور چکمہ قبائل سے مقابلے میں اپنی جان کی پرواہ نہ کرنا اور اپنے ہی دو ساتھیوں کی سازش اور غداری بے نقاب ہونے پر انھیں ہلاک کرنا۔ ان سب واقعات کی زنجیر کی روشنی میں جب میں اس کے متعلق سوچتا تو اتنی محبت خلوص اور جاںنثاری کے جذبے کا عشرِ عشیر بھی کسی بھی شخص حتیٰ کہ اپنے انتہائی قریبی رشتہ داروں میں بھی دکھائی نہ دیتا۔ رشتہ دار تو خلوص کے بجائے دشمنی میں پیش پیش تھے اور مجھے زک پہنچانے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ گھریلو ناچاقی اور حالات سے گھبرا کر میں نے فرار کی راہ اپنائی تھی اور کوئی نہ کوئی عذر یا بہانہ بنا کر بھٹکتا پھرتا تھا۔ گزشتہ اقساط میں بھی کہیں تحریر کرچکا ہوں کہ سن 71ء میں سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارت جاکر انتہائی خطرناک مشن انجام دینے کے لیے میں نے اپنی خدمات اپنے محکمے کو خود پیش کی تھیں اور مجھے زبردستی بھارت دھکیلا نہیں گیا تھا۔ بھارت جانے کے لیے اگر اسی فیصد وجہ بھارت سے شکست کے صدمے کو بھارت میں اس سے حساب چکا کر اپنے جذبے کی تسکین تھی تو بیس فیصد میرے گھریلو حالات تھے جن کی اصلاح ناممکن تھی اور میں ان سے دور رہتا تھا۔ بھارت کھٹمنڈو اور اب بنگلہ دیش میں قیصر کے مثبت کردار نے اسے میرے بہت قریب کردیا تھا۔ میرا کوئی بھائی بہن نہیں۔ قیصر واقعی ایک نہایت اچھے اور روایتی چھوٹے بھائی کے کردار کا عملی نمونہ تھا۔ ورنہ آج کل کے اکثر سگے بھائی تو جان کے دشمن ہوتے ہیں۔ قیصر نے روایتی اچھے بھائی کی کمی پوری کردی تھی۔ ستانے کے دوران قیصر اپنی کھاٹ (چارپائی) سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”بھائی جان! کھیدے کے دوران میں نے کئی بار نوٹ کیا کہ رفیق نے اپنی بندوق سے نشانہ باندھنے کی ظاہراً مشق کرتے ہوئے کئی بار آپ کو شست میں لیا۔ اس کی بندوق لوڈڈ ہے۔ آپ کو نشانے میں لے کر صرف ٹریگر دبانا باقی تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دل میں بھی اتفاقیہ ٹریگر دب جانے کا عذر

کرکے آپ کو ہلاک کرنا مقصود ہے۔ کیوں نہ ہم کسی بہانے سے اس کی بندوق اپنے قبضے میں لے لیں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے لباس میں ریوالور یا پسٹل چھپا رکھا ہے۔ حالات کے پیشِ نظر میں اس پر قطعی بھروسہ نہیں کرسکتا۔“ میں نے قیصر کو کہا کہ تم اس کی حرکات و سکنات پر اپنی توجہ رکھو۔ رات کو ڈاک بنگلے میں اسے تاڑی پلوا کر اور بے ہوش کرکے ہم اس کے لباس کی تلاشی بھی لے لیں گے۔ قیصر بولا ”بھائی جان! آپ کو تو علم ہے کہ دہلی میں مرحوم بشیر بھائی نے مجھے اسلحہ، کارتوس اور گولیاں بنانے کا فن سکھایا تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس کی بے ہوشی کے دوران میں اور میرے ساتھی لڑکے اس کے سارے کارتوسوں اور گولیوں سے بارود نکال کر ان میں مٹی بھر دیں۔ یہ سارا کام ہم آدھ گھنٹے میں کردیں گے اور اس کی بندوق اور لباس میں چھپا اسلحہ اسی کے پاس رہنے دیں گے۔ اگر اس کی نیت خراب ہوئی تو وہ آپ پر اور ہم پر اپنا اسلحہ استعمال کرنے کی کوشش کرے گا جس میں ناکامی پھر اس کی خفت اور خوفزدہ ہونے سے ہم نہ صرف لطف اندوز ہوں گے بلکہ اسے ہلاک کرنے کا جواز بھی، ہمیں مل جائے گا۔ اس کے دوران ہم مزدور کے روپ میں آئے ہوئے چکمہ جاسوس کو بھی ختم کردیں گے۔“ قیصر کی اس تجویز پر میں پھڑک اٹھا اور اسے یہ کام کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ تاکید کی کہ ایسا ضرور کرے۔ باگرگھاٹ سے واپسی کے وقت سورج غرب ہو رہا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ جوہڑ کے قریب ہی ہمیں ہرنوں کی ایک ڈار دکھائی دی۔ ہرن بہت چوکنا چوپایہ ہے اور اس میں سونگھنے اور خطرے کو بھانپنے کی حس بہت زیادہ ہے۔ وہ جوہڑ کے قریب ہی تھے کہ انھوں نے اپنے کان کھڑے کیے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی وہ چوکڑیاں بھرتے واپس بھاگے۔ ان بھاگتے ہرنوں پر ہم نے سات آٹھ فائر کیے جن سے صرف دو ہرن گھائل ہوئے اور باقی سب جنگل میں غائب ہوگئے۔ قیصر اور اس کے ساتھی گھائل ہرنوں کی طرف بھاگے اور انھیں وہیں ذبح کردیا۔ مزدور ہرن اٹھا کر ڈاک بنگلے میں لے آئے۔ ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ ہم میں سے کن کے فائروں سے ہرن گھائل ہوئے تھے لیکن یقیناً ان میں رفیق شامل نہ تھا۔ وہ میرے بالکل قریب تھا اور ابھی اپنی بندوق شانے پر سیٹ ہی کر رہا تھا کہ فائر ہوگئے۔ یہ شکار بہرحال ہماری ساری پارٹی کا کارنامہ تھا۔ ہم کندھوں پر اپنا اسلحہ رکھے فاتحانہ شان سے ڈاک بنگلے پہنچے۔ چوکیدار کو کسی نے خصوصی طور پر بتایا نہیں تھا لیکن میرے سارے ہمراہیوں کے رویے سے اسی بخوبی اندازہ ہوچکا تھا کہ اس پارٹی کا لیڈر میں ہوں لہٰذا وہ ہر بات مجھے ہی بتاتا اور مجھ سے ہی احکام لیتا۔ ساتھیوں کی فرمائش پر ایک ہرن آگ پر بھونا گیا اور دوسرے ہرن کا سالن بنایا گیا۔ دیگچے اور چاول چوکیدار نے مہیا کیے۔ میں نے اسے آج تاڑی کی چھ بوتلیں لانے کا کہا۔

تاڑی پینے سے رفیق نے پہلے تو انکار کیا لیکن میرے زور دینے پر اور یہ کہنے پر کہ شکار پارٹی میں سب برابر کے شریک ہیں لہٰذا اگر تم اسکاچ وہسکی پینا چاہتے ہو تو پھر میرے تمام ساتھیوں کو

بھی پلاؤ، وہ تاڑی پینے پر راضی ہوا۔ میں نے ساقی بنتے ہوئے اسے تاڑی سے لبالب بھرا گلاس دیا۔ پہلے تو وہ چسکیاں لینے لگا اور اسے جب تھوڑا سا نشہ چڑھا تو میں نے Bottoms up (گلاس ایک ہی بار خالی کرنا) کہا تو وہ پورا گلاس چڑھا گیا۔ میں نے دوبارہ اس کا گلاس بھرا اور اسے بھی اس نے ایک ہی مرتبہ ختم کیا۔ قیصر اور اس کے ساتھیوں نے ہرن پکانے میں مصروفیت کا بہانہ کرکے کھانا تیار کرنے کے بعد پینے کا کہا۔ میں نے جب محسوس کیا کہ تاڑی اپنا اثر دکھا چکی ہوگی تو میں نے رفیق کو صحن میں چلنے اور ہرن پکتا دیکھنے کے لیے کہا لیکن وہ تو اٹھنے کے قابل بھی نہ تھا۔ میں نے اسے اٹھاتے ہوئے دو تین جھٹکے دیے اور وہ بے سدھ ہوگیا۔ قیصر نے اس کے لباس کی تلاشی لی اور ایک تیس بور کا پسٹل اور گولیوں کا پیکٹ نکالا۔ اس کے کارتوس کی پیٹی اور لوڈڈ بندوق میں سے کارتوس نکالے اور پچیس منٹ میں ہی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کارتوسوں میں سے بارود اور گولیاں نکال کر مٹی بھری۔ پسٹل کی گولیوں کو بغیر مناسب اوزاروں کو کھولنا دشوار تھا۔ اس کا علاج قیصر نے یہ کیا کہ پسٹل کی گولیوں کا پیکٹ خالی کرکے اس میں اپنے بتیس بور کے ریوالور کی گولیاں رکھ دیں اور پسٹل اور اس کا میگزین بھی خالی کرکے پسٹل اور گولیوں کا ڈبہ اس کے لباس میں رکھ دیا۔ مٹی بھرے کارتوسوں کی پیٹی اور کارتوسوں سے لوڈڈ بندوق بھی اپنی جگہ پر رکھ دی گئی۔ اس کام سے فراغت پاکر پانی کے چھینٹے رفیق کے چہرے پر مار کر اسے ہوش میں لایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھانا بھی تیار ہوگیا۔ کھانا کھا کر صبح شکار پر جانے کے لیے تازہ دم ہونے کے لیے ہم جلد ہی سو گئے۔ درخت کے تنوں پر مسلسل کئی گھنٹے بیٹھنے سے ہم تھکے ہوئے تھے۔ تھائی بھی نشے میں مدہوش تھے۔ میں نے قیصر کے ساتھیوں کی ایک ایک گھنٹہ پہرہ دینے کی ڈیوٹی لگائی میری آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہورہی تھیں لہٰذا جلد ہی خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ہم ناشتے سے فارغ ہوکر بڑے شکار کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ہم سارا دن جنگل میں ٹہنیاں کاٹ کر رستہ بناتے اور شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ باگرہاٹ میں شکار کی صحیح نشان دہی کرنے والوں نے ہمیں بتادیا تھا کہ ایک بڑی امریکن شکار پارٹی ہماری آمد سے دو دن پہلے ہی یہاں شکار کے لیے بیس روز ٹھہری تھی لیکن ان کے ہاتھ بھی ہرنوں کے علاوہ صرف ایک بنگال ٹائیگر آیا اور وہ بھی گائے کا چارہ باندھنے اور درختوں پر مچانیں باندھ کر تین راتوں کی خواری کے بعد۔ ان کے بقول ایک روزہ شکار کے لیے یہ امید باندھنا کہ بڑا شکار مل جائے، حماقت ہے۔ اتفاقیہ کسی چیتے یا بنگال ٹائیگر سے مدبھیڑ ہوجائے تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھے۔ بہرحال جب ہم شام کو لوٹے تو ہم صرف ایک ہرن اور چیتے سے مشابہہ ایک جنگلی بلی کا شکار کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ میں نے شکار پر روانگی سے قبل ایک گائیڈ کو شکاری گھاٹ بھیج کر اگلے روز بارہ بجے دن ایک موٹر لانچ کا انتظام کرنے کا کہا تھا جو ہمیں ٹوو‌ا (Towa) جانے کے لیے اس کے نزدیک ترین گھاٹ تک لے جائے۔ رات کو کھانے کے بعد دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں اور اگلی صبح ہم نے

شکاری گھاٹ کا رخ کیا۔ راستے میں قیصر نے کئی بار مجھے اشارے سے رفیق کو چکمہ مزدور کے ساتھ سرگوشیاں کرتے ہوئے دکھایا۔ میں نے ہر بار رفیق کو کہا کہ میرے ساتھ چلے کیونکہ میں اکیلا اور اس کے بغیر بوریت محسوس کرتا ہوں۔ ڈاک بنگلے کے چوکیدار کو میں نے پندرہ ہزار ٹکہ اس کی خدمات کے لیے ٹپ دی تھی۔ یہ ٹپ اس کی توقع سے زیادہ تھی کیونکہ تاڑی، کھانے پینے کے سامان اور اس کے بیٹے کے مارے ہوئے ہرن کے لیے میں دس ہزار ٹکہ پہلے ہی اسے دے چکا تھا۔ ٹووا کے لیے لانچ نے ہمیں ایک گھنٹے میں ہی نزدیکی گھاٹ پر پہنچادیا۔ یہ گھاٹ دریا کے غربی کنارے پر تھا۔ رفیق نے مجھے دوبار کہا کہ ایک مزدور (چکمہ) واپس جانا چاہتا ہے لیکن میں نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ہماری شکار پارٹی کے جتنے افراد ہمارے ساتھ آئے تھے وہ سب ہمارے ساتھ ہی واپس جاسکیں گے۔ ہم آدھے شکار کے دوران کسی کو بھی واپس بھیجنے اور نیا مزدور لینے اور اس پر بھروسہ کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ رفیق کو مجھ سے اتنے کرخت لہجے میں انکار سننے کی توقع نہ تھی۔ لیکن ڈالروں کے لالچ میں وہ خاموش ہوگیا۔ ادھر میں چاہتا تھا کہ ہمارے سفر اور ٹووا جانے کی اطلاع رفیق کسی کو بھی بھجوا نہ سکے۔

اس گھاٹ سے ہمارا قافلہ جنگل میں داخل ہوا۔ گائیڈ کو میں نے کہہ دیا تھا کہ ہمیں ٹووا کی طرف جانا ہے لہٰذا اس نے اس پگڈنڈی کا رخ کیا۔ رفیق بالکل خاموشی سے میرے ساتھ چل رہا تھا حالانکہ پہلے وہ بلا رکے بولتا رہتا تھا۔ اور اپنی اسی چرب زبانی کے باعث وہ دوسروں پر چھا جانے کی کوشش کرتا اور اکثر اس میں کامیاب رہتا تھا۔ باگرہاٹ سے واپسی پر جب میں نے اسے دوٹوک الفاظ میں چکمہ مزدور کو واپس نہ بھیجنے کا کہا تو شاید پہلی بار اسے یہ احساس ہوا کہ میرا رویہ بدلا بدلا سا ہے۔ ڈاک بنگلے کے چوکیدار کو بھی میں نے اس سے مشورہ کیے بغیر ٹپ دی تھی۔ چونکہ شکار کے لیے مزدوروں اور گائیڈوں کا انتظام بھی اسی نے کیا تھا اس لیے شاید وہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ ہم اسے اپنی شکار پارٹی کا قائد سمجھتے ہوئے اس سے ہر بات میں مشورہ کریں گے اور حتمی فیصلہ اسی کا ہوگا۔ ٹووا کے جنگل کا گھنا حصہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ گائیڈ نے ہمیں یہاں سے بھی گھنے جنگل میں داخلے سے پہلے کیمپنگ کا کہا۔ میرے ساتھی تو پہلے سے ہی میری حیثیت جانتے تھے لیکن گائیڈ اور مزدور بھی اب ہر کام مجھ سے پوچھ کر کرنے لگے۔ یہ صورت حال رفیق کے لیے ناقابل برداشت نہیں تو تکلیف دہ ضرور تھی۔ رات کے لیے کیمپ لگاتے ہوئے میں نے اس کی خاموشی اور بیزاری کا سبب پوچھا تو وہ کہنے لگا ''میں آپ کا میزبان ہوں اور آپ مہمان لیکن مجھے یہ محسوس ہورہا ہے کہ جیسے میں آپ کا ادنیٰ مہمان اور اجنبی ہوں۔ نہ تو آپ مجھ سے کسی بات میں مشورہ کرتے ہیں اور نہ ہی میری کوئی بات مانتے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے رفیق کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''رفیق صاحب! آپ کو یونہی غلط فہمی ہوگئی ہے کہ آپ کو اہمیت نہیں دی جارہی۔ میرے ساتھیوں کا لیڈر میں ہوں اسی لیے وہ ہر بات کے لیے میری اجازت لیتے ہیں۔ گائیڈ اور مزدور آپ نے بھرتی کیے ہیں اور جہاں تک میں

سمجھتا ہوں، شکار کے دوران گائیڈ ہمارے لیڈر ہیں۔ مزدوروں کا کام سامان اٹھانا اور ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ وہ تو ہمارے کچھ کہے بغیر ہی اپنی ڈیوٹی خودبخود ادا کررہے ہیں۔ اگر اصل لیڈر اور میزبان کو آپ جاننا چاہتے ہیں تو وہ روپیہ اور ڈالر ہیں جن کے بغیر ہم شکار پر آنا تو کجا سانس بھی نہیں لے سکتے۔ لہٰذا اس بلاوجہ کی سوچ کو چھوڑیں اور شکار کا لطف اٹھائیں‘‘ میں نے بین السطور اپنی بات اس پر واضح کردی تھی جسے وہ یقیناً سمجھ بھی گیا تھا لہٰذا تھوڑی دیر میں ہی وہ نارمل ہوگیا۔ کیمپ میں رات کے کھانے کا انتظام بھی گائیڈ نے کیا تھا۔ گھاٹ سے اس نے ڈھیر ساری مچھلی خریدلی تھی اور چاول ہمارے سٹاک میں تھے۔ میں نے گھاٹ سے کیمپ تک کے سفر کے دوران محسوس کیا کہ شکاری گھاٹ کے مقابلے میں اس گھاٹ پر آمد و رفت نسبتاً بہت کم تھی۔ میرے پوچھنے پر گائیڈ نے بتایا کہ اول تو یہ علاقہ دلدلی ہے اور دوسرے بھارتی سرحد قریب ہونے کے باعث لوگ اس طرف آنے سے کتراتے ہیں کیونکہ سن 71ء کی جنگ کے دوران بھارتی پیش قدمی کو روکنے کے لیے پاکستانی فوج نے یہاں بارودی سرنگیں بچھادی تھیں جنھیں اب تک نکالا نہیں گیا اور ان سرنگوں کے پھٹنے سے بیسیوں ہلاکتوں کے بعد لوگوں کی آمد و رفت صرف جنگل کے قریبی دیہاتوں تک محدود ہوچکی ہے اور سوا پگڈنڈیوں کے لوگ ادھر ادھر جانے سے گھبراتے ہیں۔ اس نے مزید کہا کہ ہمارا سفر بھی پگڈنڈیوں پر ہی ہوگا۔ ٹووا سے آگے کالی گنج کا علاقہ بارودی سرنگوں سے پاک ہے لہٰذا اصل شکار کی تلاش ہم اسی علاقے میں کریں گے۔ مجھے بھارتی سمجھتے ہوئے گائیڈ نے پاکستان اور پاکستانی افواج کو صلواتیں سنانی شروع کریں۔ میں کچھ دیر تو خاموش رہا لیکن جب اس کی بکواس برداشت سے باہر ہونے لگی تو میں نے اسے یہ کہہ کر چپ کروادیا۔ ’’ہم یہاں شکار اور تفریح کے لیے آئے ہیں، جنگی اور سیاسی باتیں کرنے کے لیے نہیں لہٰذا شکار کی باتیں کرو یا چپ رہو۔‘‘

اگلی صبح میں نے روانگی سے پہلے رفیق کو کہا کہ وہ شکار پارٹی کو چلنے کا آرڈر دے اور قافلے کے لیڈر کی حیثیت سے گائیڈ کے ساتھ چلے اور اسے ہدایات دے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی قائد بننے کی تشنگی بھی پوری ہوجائے کیونکہ آگے جانے کا سفر تو اس نے اپنے قدموں سے طے کرنا تھا لیکن اس کی واپسی مزدوروں کے کندھوں پر کھاٹ (چارپائی) پر ہونی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں اور مزدوروں کو کہہ دیا تھا کہ کسی حالت میں بھی پگڈنڈی سے باہر قدم نہ رکھیں۔ گھنا جنگل شروع ہوچکا تھا اور پگڈنڈی اور دونوں اطراف جنگل کی زمین سیم زدہ تھی۔ بنگلہ دیش کے دریا پدما اور بھارتی دریا ہگلی کا یہ درمیانی علاقہ ان کے ڈیلٹاؤں اور غیرمعمولی بارشوں کے باعث دلدلوں اور حشرات الارض سے بھرا پڑا تھا۔ قارئین کو شاید علم نہ ہو کہ سندربن کے جنگلات کا چالیس فیصد حصہ بھارت میں اور ساٹھ فیصد بنگلہ دیش میں ہے۔ سندربن کے جنگل میں سرحد کی صحیح نشان دہی ناممکن العمل ہے۔ اگر کوئی ایسا کرنا چاہے تو اس مفروضہ حدبندی میں سینکڑوں ہزاروں درخت آدھے بنگلہ دیش اور آدھے بھارتی سرحد میں

ہوں گے۔ ٹووا پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہوگئی۔ کوئی شکار تو ہمیں دکھائی تک نہیں دیا البتہ سانپ اور جونکیں (Leeches) بکثرت تھیں۔ بندر اور لنگور بھی درختوں پر کودتے اور چھلانگیں لگاتے اکثر دکھائی دیے۔ گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ اس جنگل میں لمبی دم والے ایسے لنگور بھی ہیں جن کی جسمانی ساخت اور طاقت اس قدر زیادہ ہے کہ ایک درخت سے دوسرے درخت کو چھلانگنے کے دوران اگر انھیں دوسرے درخت پر کوئی خطرہ محسوس ہو تو آدھے رستے سے ہی فضا میں پلٹ کر کودنے والے درخت پر آجاتے ہیں۔ گائیڈ نے اپنی بات کی تائید میں ہمیں اس کا عملی مظاہرہ بھی دکھایا۔

لنگور کے اس کرتب کو دیکھتے ہی میری سوچ کا رخ پھر بھارت کی طرف چلا گیا۔ ہنومان (بندر) کو دیوتا ماننے اور اُس کی پوجا کرنے والے بھارتی ہندوؤں کی خصلت بھی اپنے اسی دیوتا کی طرح ہے۔ حالات موافق ہوں تو یہ آگے بڑھتے ہیں اور حالات اگر ان کی امیدوں کے خلاف دکھائی دیں تو آدھے رستے سے ہی پلٹ کر بڑے ’’معصوم‘‘ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد بھارتی وزیراعظم جواہر لعل نہرو نے بڑے دھوم دھڑکے سے اعلان کیا تھا کہ وہ کشمیر کے عوام کو منصفانہ حقِ خود ارادیت کے ذریعے بھرپور موقع دیں گے کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ وہ بھارت سے الحاق چاہتے ہیں یا پاکستان سے۔ اسی ضمن میں سلامتی کونسل کی قراردادوں کو بھی بھارت نے تسلیم کیا تھا۔ لیکن جب بھارتی خفیہ ایجنسیوں نے انھیں بتایا کہ بھارتی روپوؤں کی جھنکار، خوشحالی کے جھوٹے وعدوں اور آستین کے سانپ شیخ عبداللہ غدار کی چکنی چپڑی باتوں کے باوجود کشمیری عوام پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں تو نہرو اپنے وعدے سے مکر گیا اُس کے بعد لال بہادر شاستری، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی اور آج تک کے بھارتی حکمرانوں کی سوئی کشمیریوں کو حق خودارادیت دینے سے نہ کرنے پر اٹکی ہوئی ہے اور سلامتی کونسل کی قراردادوں کو وہ اب فرسودہ کہتے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر کے باشندوں کو خوشحالی اور ترقی دینے کے بجائے سات لاکھ بھارتی فوجیوں کا تحفہ دیا گیا جن کے شب و روز کے مظالم سے عرش بھی تھرا اٹھا ہوگا۔ شیخ عبداللہ کا بیٹا فاردق عبداللہ اپنے ہم وطنوں سے غداری میں باپ سے بھی چند قدم آگے نکل گیا۔ چند ماہ پیشتر اس نے ایک تقریر کے دوران کہا، ’’میں بھارتی ہوں اور مسلمان سے زیادہ ہندو ہوں۔‘‘ میرے خیال میں اس نے اپنی ساری زندگی میں یہی ایک بات صحیح کہی ہے۔ یہ ’’راز‘‘ شاید اس کی ماں نے اسے بتایا ہوگا۔ گزشتہ برسوں میں بھارت نے ایٹمی دھماکے کیے۔ ان دھماکوں کے ساتھ ہی بھارتی وزیراعظم کے پاکستان کے متعلق لب و لہجے میں رعونت، کرختگی آگئی اور وہ دھمکیاں دینے لگا۔ پاکستان کے جوابی ایٹمی دھماکے ہوئے تو لالہ جی کی دھوتی خراب ہوگئی اور وہ فوراً ہی پاکستان کی خوشحالی اور ترقی کی دعائیں اور دونوں ممالک میں قیامِ امن کی راگنیاں الاپنے لگے۔ خوف اور دہشت سے اس کی یہ حالت ہوگئی کہ بھارتی اور کشمیری مسلمانوں سے ایک میٹنگ کے دوران نماز کا وقت ہوا تو منافقت کی سبھی حدود کو پھلانگتے ہوئے وہ بھی نماز میں شریک ہوگیا۔ یہ ہے خصلت اور فطرت ہنومان کی پوجا

کرنے والوں کی۔

ٹووا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ ہم نے اپنا کیمپ قصبے کی حدود میں ہی لگا دیا۔ سارے بنگلہ دیش کی طرح یہاں بھی شام ڈھلتے ہی ہو کا عالم چھا گیا۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہاں کے باشندے سرِ شام ہی گھروں میں چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ اکثر جنگلی چیتے یا بنگالی ٹائیگر شکار نہ ملنے کی وجہ سے آبادیوں کا رخ کرتے اور انسانوں کا شکار کرتے ہیں۔ ایک بار انسانی خون منہ کو لگ جائے تو پھر کوئی اور شکار ان کو نہیں بھاتا۔ گائیڈ نے کہا کہ قصبے کے درجنوں لوگ چیتوں اور بنگالی ٹائیگر کی خوراک بن چکے ہیں اور آج کل بھی کئی آدم خور اس علاقے میں انسانوں کے شکار کے لیے پھرتے ہیں۔ گائیڈ کی باتوں سے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ آدم خور درندوں کے واقعات کو وہ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے۔ ایک کامیاب گائیڈ اسی کو سمجھا جاتا ہے جو شکار نہ ملنے کی صورت میں ایسے من گھڑت واقعات سنا کر شکاریوں کی مایوسی کو کم کرے اور انھیں زیادہ سے زیادہ عرصہ جنگل میں ٹھہرنے اور بڑے آدم خوروں کے شکار کی ترغیب دے کر اپنا معاوضہ کھرا کرے۔ بہرحال میں نے اپنے کیمپ کے گرد اپنے ساتھیوں کی پہرے کی ڈیوٹیاں لگا دیں اور الاؤ بھی روشن کر دیا۔ صبح پہرے داروں کے مطابق شیر اور چیتے تو دور کی بات ہے، کوئی بلی بھی کیمپ کے قریب نہ آئی۔ البتہ انھوں نے دو تین مرتبہ شیر کی دھاڑ ضرور سنی۔ ان کے بقول یہ آواز کم از کم دو میل کے فاصلے سے آئی تھی۔

اگلے روز علی الصبح ہی ہم ناشتے سے فارغ ہو کر پھر جنگل میں داخل ہو گئے۔ اب ہماری منزل کالی گنج اور ٹووا کا درمیانی حصہ تھا۔ یہاں دلدل بھی نہ تھی اور جنگل بھی زیادہ گھنا نہ تھا۔ سندر بن کا درمیانی حصہ ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ بنگالی ٹائیگر اور چیتے اکثر اسی علاقے میں ملتے ہیں کیونکہ گھنے جنگل میں ان کو شکار ملنے اور بھاگتے شکار کا پیچھا کرنے کا موقع نہیں ملتا اور دلدل بھی ان کے چلنے پھرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ ٹووا سے کالی گنج بمشکل آٹھ نو میل کے فاصلے پر تھا اور یہ دونوں قصبات بھارتی بارڈر کے بالکل قریب تھے۔ ہم نے تقریباً آدھا راستہ طے کیا تھا کہ ہمیں پگڈنڈی کے قریب ہی ایک ادھ کھائے ہرن کا بقیہ حصے دکھائی دیا۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ یقیناً کسی بڑے چیتے یا شیر کا شکار ہے۔ شکار کے بعد یہ پیٹ بھرنے پر اپنے شکار کا بقیہ جھاڑیوں میں چھپا کر رکھ دیتے ہیں اور دوسرے روز بھوک لگنے پر دوبارہ وہیں آ کر بقیہ حصہ کھاتے ہیں۔ اس وقفے میں گوشت خستہ ہو کر ان کے لئے اور لذیذ ہو جاتا ہے۔ دوسرے جنگلی جانور بھوکے ہونے کے باوجود شیر اور چیتے کے چھوڑے ہوئے شکار کو سونگھتے تک نہیں کیونکہ انھیں جنگل کے بادشاہ کا خوف ہوتا ہے۔ گائیڈ کی ہدایت کے مطابق مزدوروں نے ہمارا سامان یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک درخت تلے رکھ دیا۔ گائیڈ نے ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے ہمیں شکار کے مشرقی جانب لے جا کر دو تین درختوں تلے بٹھا دیا۔ اس نے ہوا کا رخ اس لئے دیکھا کیونکہ شیر یا چیتے کو اس طرف آتے ہوئے ہماری بو نہ آ جائے اور وہ ڈر کر شکار تک

آئے بنا واپس نہ لوٹ جائے۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ میرے "شکار" بلکہ شکاروں کے لئے یہ مناسب ترین جگہ تھی۔ نقشے کے مطابق بھارتی ہیلی کاپٹر نے بھی کم و بیش اسی علاقے پر سے گزرنا تھا اور میری مردم خوری کا رفیق اور چکمہ مزدور نے بھی یہیں شکار ہونا تھا۔

شکاری پارٹی میں میرے ساتھیوں، مزدوروں، رفیق اور گائیڈز کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ہم صرف ایک دو قریبی درختوں پر بیٹھ نہیں سکتے تھے اس لیے گائیڈ کے مشورے کو نظر انداز کر کے میں نے غیر مسلح مزدوروں اور گائیڈز کو درختوں پر بیٹھنے کا کہا جبکہ میں نے اور میرے مسلح ساتھیوں نے زمین پر ہی درختوں کی اوٹ میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ رفیق خاصا ڈرا ہوا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا اور ایک درخت کے تنے پر جا بیٹھا۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ ہم آدھے دائرے کی صورت میں بیٹھیں گے کیونکہ اگر شیر آیا تو اسے ہلاک کرنے کی کوشش میں خود اپنے ساتھیوں کی گولیوں کا ہی شکار نہ ہو جائیں۔ میں یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ بڑے شکار کا ہم میں سے کسی کو بھی تجربہ نہیں تھا اس لیے روایتی طریقے سے ہٹ کر اور مچانیں بنا کر شکار کرنے کے بجائے میں اپنے وضع کیے ہوئے طریقے پر عمل کر رہا تھا۔ میرے اس فیصلے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہمارے پاس اول تو روایتی طریقے سے شکار کرنے کے انتظامات کے لیے نہ تو وقت تھا اور نہ ہی اس طرح کے شکار کا ساز و سامان ہمارے پاس تھا۔ میرے ساتھیوں سمیت مجھے بھی یہ خواہش یا شوق نہیں تھا کہ شکار کا سہرا کسی ایک کے سر بندھے۔ ہمارے پاس آٹومیٹک رائفلیں اور دو سب مشین گنیں تھیں جن کی دو تین گولیاں بھی شیر کو ڈھیر کر سکتی تھیں۔ میں نے احتیاطاً ایک تدبیر کی تھی کہ اپنے ساتھیوں میں سے تین کی یہ ڈیوٹی لگا دی کہ وہ ہمارے عقب کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنا رخ پچھلی جانب رکھیں کیونکہ شیر کے آنے کا کوئی مخصوص راستہ نہیں تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہم تو اس کے چھوڑے ہوئے اور کھائے ہرن پر نظریں جمائے بیٹھے رہیں اور وہ ہماری پشت سے آ کر ہم پر حملہ آور ہو جائے۔ گائیڈ کے مطابق شیر عموماً تقریباً آدھی رات کو اپنا بچا ہوا شکار کھانے آتا ہے۔ اندھیرا پھیلتے ہی ہم نے اپنے سامان رسد سے جو کچھ بھی ہاتھ لگا، کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی اور اپنی طے شدہ جگہوں پر درختوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی بقول کسے: "عشق آساں نمود اول، ولے افتاد مشکل ہا" کے مصداق ہمیں شکاریوں کی مشکلات اور اذیتوں کا بخوبی احساس ہو گیا۔ بڑے بڑے مچھروں، مکوڑوں اور بڑی چیونٹیوں نے کاٹ کاٹ کر میرا برا حال کر دیا تھا۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو ان کی پہنچ سے باہر ہو۔ جہاں مچھر نہیں جا سکتے تھے وہاں چیونٹیوں نے اپنا کمال دکھانا شروع کر دیا میرا چہرہ ان دونوں کا مشترکہ تختہ مشق بنا ہوا تھا۔ قہر درویش برجان درویش۔ تین گھنٹے سے زیادہ اپنے خون سے ان کی میزبانی کرتے کرتے میں بے حال ہو گیا اور "باز آئے اس شوق سے ہم" کہہ کر اٹھنے ہی والا تھا کہ ساتھیوں سے کہوں کہ وہ بھی شکار کا خیال چھوڑیں کہ اچانک پہلے بندروں کے چیخنے کی آوازیں آئیں اور ساتھ ہی درختوں پر بسیرا کرنے والے

پرندے بھی اپنے گھونسلے چھوڑ کر اڑنے لگے۔ ان کی ملی جلی آوازوں سے خوف صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ایسا شور تبھی مچتا ہے جب کوئی بڑا درندہ قریب ہو۔ میں دم سادھے وہیں بیٹھا رہا اور اندھیرے میں اندازے سے نظریں بچے ہوئے شکار پر گاڑ دیں۔ اچانک ہی مجھے شکار سے قدرے بائیں جانب دو جلتی ہوئی مشعلوں جیسی روشنی دکھائی دی۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اندھیرے میں شیر کی آنکھیں ایسے ہی چمکتی ہیں۔ یہ روشنی حرکت نہیں کر رہی تھی۔ اگر یہ کسی درندے کی آنکھیں تھیں تو یقیناً اسے بھی ہماری یہاں موجودگی کا احساس ہو چکا تھا اور میرا قیاس تھا کہ وہ کہیں خوفزدہ ہو کر واپس نہ پلٹ جائے، میں نے اپنی سب مشین گن سے اس پر اندازے سے چھ سات فائر کیے۔ میرے فائر کے ساتھ ہی ساتھیوں کے فائر کی بھی آوازیں آئیں۔ ان فائروں کے ساتھ ہی شیر کی دھاڑ سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ پانچ منٹ انتظار کے بعد میں نے اپنے ٹارچ کی روشنی وہاں پر ڈالی تو ایک بنگال ٹائیگر گرا ہوا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ میرے ساتھیوں کے پاس بھی ٹارچیں تھیں۔ میرے روشن کرتے ہی سب نے اپنی ٹارچیں جلائیں۔ میں شیر کی جانب بڑھا تو گائیڈ نے بلند آواز سے مجھے قریب جانے سے منع کیا کیونکہ زخمی اور دم توڑتا شیر بھی ایک بار اپنی ساری طاقت مجتمع کر کے حملہ کر دیتا ہے۔ گائیڈ کی تنبیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے میں اس کے قریب گیا۔ میرے ساتھی بھی تقریباً اسی وقت اس کے قریب پہنچے۔ میں نے شیر کے سر میں دو گولیاں قریب سے فائر کیں جن سے وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ گائیڈ، رفیق اور مزدور بھی درختوں سے نیچے اتر آئے۔ ہمارا شکار ایک نر بنگال ٹائیگر تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ موٹی دھاریاں تھیں اور قد و قامت اور جسمانی طور پر یہ عام چیتے سے بہت بڑا تھا اور اس کا چہرہ بھی چیتے سے مختلف تھا۔ اسے سر سے پاؤں تک سترہ اٹھارہ گولیاں لگی تھیں۔ ہم نے مزدوروں کو الاؤ روشن کرنے اور کھانا بنانے والے کو چائے بنانے کا کہا۔ رفیق نے کہا کہ اس نے بھی دو ''فائر'' کیے تھے۔ اس کے فائروں کی حقیقت میں اور میرے ساتھی جانتے تھے لیکن میں نے کہا کہ یقیناً اس کے فائر سب سے پہلے اسے لگے ہیں۔ رفیق اپنے سامان میں سے ایک کیمرہ لے آیا اور ٹائیگر پر ایک پاؤں رکھ کر اور ایک ہاتھ میں بندوق پکڑے قیصر سے اپنی تصویر اُتروائی۔

میں نے ساتھیوں کو کہا کہ یہیں کسی مناسب جگہ کیمپ لگائیں۔ کیونکہ مارے جانے والے ٹائیگر اور ہمارے فائروں کی آواز سے اس جگہ اب دوسرے درندوں کے آنے کا امکان نہیں۔ رفیق بار بار کہہ رہا تھا کہ ہم نے ناحق اتنے فائر کر کے ٹائیگر کی کھال کا ستیاناس کر دیا ورنہ اس کے دو فائر ہی کافی تھے۔ میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اپنے ''اناڑی پن اور حماقت'' کا اعتراف کیا۔ رفیق نے گائیڈ کو کہا کہ اب جیسی بھی ہے، ٹائیگر کی کھال اور سر اتروائے کیونکہ وہ انھیں ہمراہ لے جائے گا اور اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنائے گا۔ ہم نے بقیہ رات سوتے جاگتے گزاری۔ دوسرے روز میں نے اپنی طبیعت کی خرابی کا عذر کرتے ہوئے اس کیمپ میں مزید چوبیس گھنٹے قیام کرنے کا کہا۔

میرے سر میں واقعی سخت درد ہو رہا تھا لیکن میرے یہاں قیام کو طول دینے کا مقصد بھارتی ہیلی کاپٹر کی آمد کا انتظار تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر پہلی بار ہی ہیلی کاپٹر ہمارے اوپر سے گزرا تو ہم اس پر فائر کریں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو پہلی بار اس کے گزرنے کی صحیح جگہ کی نشان دہی کریں گے اور دوسری بار اس جگہ سے فائر کریں گے۔ کالی گھاٹ یہاں سے نزدیک ہی تھا۔ میں نے گائیڈ کو کہا کہ وہ مزدوروں کو ہمراہ لے جائے اور کالی گھاٹ سے خورد و نوش کی چیزیں لے آئے۔ مزدوروں میں چکمہ مزدور نے بھی کالی گھاٹ جانے کی خواہش کی لیکن میں نے اسے اجازت نہ دی۔ گائیڈوں کے جانے کے بعد میں نے قیصر کو کہا کہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ بزوکا اور اس کے گولوں کے تھیلوں میں سے بزوکا اور گولے نکالے اور دو تین بار انھیں چلانے کی مشق کی۔ ہمارا یہ کام خاصا مشکل تھا۔ ایک تو بزوکا صرف سامنے فائر کرنے والا ہتھیار ہے اور اس سے آسمان کی طرف صحیح نشانہ بہت مشکل ہے۔ دوسری دشواری یہ تھی کہ ہیلی کاپٹر ہمیں دکھائی بھی دے جاتا تو بمشکل دس سیکنڈ ہمارے سامنے اور ہماری رینج میں رہتا اور ان دس سیکنڈوں میں مجھے اسے نشانہ لینے کی پوزیشن لینا اور فائر کرنا تھا۔ تیسری دشواری یہ تھی کہ ہیلی کاپٹر نے فضا میں معلق نہیں رہنا تھا بلکہ ہمیں اسے اُڑتے ہوئے کو نشانہ بنانا تھا اور ہمیں بزوکا کے میزائل کی صحیح رفتار کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اسے، ہیلی کاپٹر سے کتنا آگے فائر کریں تاکہ میزائل کے اس بلندی تک پہنچنے تک ہیلی کاپٹر اس کی زد میں آجائے۔ میں نے بریگیڈیئر اور کرنل مزمل سے اس وقت جذباتی ہو کر وعدہ تو کر لیا تھا۔ لیکن اب مجھے اس مشن میں کامیابی کا بہت کم امکان دکھائی دیتا تھا۔ قیصر سے صلاح مشورے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے تین اور ساتھیوں کو اس مشن میں شامل کریں۔ جو ہیلی کاپٹر کو دیکھتے ہی اپنی آٹومیٹک رائفلوں اور میری سب مشین گن سے اس پر مسلسل فائر کریں۔ بہت ممکن ہے کہ ان کی کوئی گولی کارگر ثابت ہو ادھر میں اور قیصر بزوکا سے فائر کریں۔ بزوکا سے ان دس سیکنڈوں میں صرف ایک فائر ممکن تھا اور اس کا میزائل آج کل کے اسٹنگر میزائل کی طرح اپنے ٹارگٹ کے انجن کی گرمی کے اخراج کی جگہ کو Follow (پیچھا) نہیں کرتا۔ بزوکا کے ایک گولے کے صحیح وقت اور صحیح جگہ پر Moving Target (حرکت پذیر ٹارگٹ) کو ہٹ کرنے کے چانسز (Chances) بہت کم تھے جبکہ ان دس سیکنڈ کے دوران کم از کم ایک سو گولیوں سے ٹارگٹ کے ہٹ ہونے کے امکان بہت زیادہ تھے۔ میں نے حالات کے پیش نظر بزوکا کے فائر سے زیادہ اپنے فائر آرمز پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی دونوں سب مشین گنوں اور آٹومیٹک رائفلوں کو اس مشن کی کامیابی کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ بھارت میں بھی میں نے اپنے سینئرز کے دفتری ٹیبل پر بنائے گئے پلانز (Plans) کو ہمیشہ پس پشت ڈال کر حالات کے پیش نظر اپنی Planning پر عمل کیا تھا کیونکہ مجھے مثبت نتائج حاصل کرنے تھے۔ میں نے یہاں بھی اپنا وہی طریقہ استعمال کیا۔ قیصر کے ساتھی چار لڑکوں کو میں نے اپنی دونوں سب مشین گن اور دونوں رائفل دے کر کہا کہ ہمیں ایک ہیلی کاپٹر کو ہٹ

کرتا ہے۔ رفتار کم ہونے کے باعث ہیلی کاپٹر کی آواز اس کے دکھائی دینے سے خاصی پہلے سنائی دیتی ہے لہٰذا انھیں اپنے ہتھیاروں سے شست لینے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔ میں نے انھیں بتایا کہ وہ ہیلی کاپٹر کو شست میں لے کر فائر نہ کریں بلکہ اس کی پرواز کے راستے پر شست اس سے کم از کم ایک فٹ آگے لے کر مسلسل فائر کریں اور اس کے دورانِ پرواز یہ فاصلہ کم نہ ہونے دیں کیونکہ ان کی گولیوں کو اس بلندی تک پہنچنے میں اتنا وقت لگے گا کہ ایک فٹ آگے فائر کی ہوئی گولیاں اسے ہٹ (Hit) کرسکیں گی۔ میں نے انھیں تمام اسلحہ دوبارہ چیک کرنے اور پورا لوڈ کرنے کے علاوہ فالتو میگزین بھی لوڈ کرنے اور خالی میگزین علیحدہ کرنے اور نئے میگزین لگانے میں کم از کم وقت صرف کرنے کی تاکید کرتے ہوئے اس کی پریکٹس کرنے کا کہا۔ مزمل کے دیے ہوئے نقشے کو باریک بینی سے دیکھتے ہوئے میں نے اپنی موجودہ پوزیشن اور ہیلی کاپٹر کے روٹ کا تعین کرتے ہوئے دیکھا کہ جہاں پر ہم کھڑے تھے، ہیلی کاپٹر نے وہاں سے ایک میل کے دائرے کے اندر سے گزرنا تھا نقشے کے مطابق میں نے اس جگہ کا تعین کیا جو روٹ کے دائرے کے وسط میں تھی۔ میں نے اس جگہ سے ہی اپنی کارروائی کرنی تھی۔ میں نے بھی کئی بار نیم دراز ہوکر بزوکا سے فائر کرنے کی پریکٹس کی۔ پھر ہم سب اس دائرے کے وسط میں تعین شدہ جگہ پر پہنچے اور لڑکوں کو فائر کرنے کے لیے وہ پوائنٹس (Points) دکھائے جہاں سے ہیلی کاپٹر زیادہ عرصے تک دکھائی دے سکتا تھا۔ اپنے لیے بھی جگہ کا تعین کرکے جب ہم کیمپ میں واپس لوٹے تو رفیق ابھی بھی سو رہا تھا اور لڑکوں کے چہرے اس مشن میں شرکت کے خیال سے دمک رہے تھے۔ میں نے نمبرٹو کو رفیق، چکمہ مزدور اور حمید پر خاص نگاہ رکھنے کا کہا۔ ہمارے لیے ایک پریشانی مزدوروں اور گائیڈز کی تھی۔ ان کی موجودگی میں ہیلی کاپٹر کو ہٹ کرنے سے ہمارا یہ خفیہ مشن فوراً ہی طشت از بام ہو جاتا۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ شام کو مزدوروں اور گائیڈ کو یہ کہہ کر ٹوڈا بھیج دیا کہ وہ وہاں ہمارا انتظار کریں۔ ہم کالی گنج سے واپسی پر انھیں وہاں ملیں گے۔ رفیق نے مجھ سے کئی بار پوچھا کہ ایسا کیوں کر رہے ہو لیکن میں نے اسے ٹال دیا اور صرف چکمہ مزدور کو اپنے ساتھ رکھا۔ رات کو ہماری اپنی پارٹی کے علاوہ صرف رفیق اور چکمہ مزدور ہی ہمارے ساتھ تھے اور ہمیں اگلی صبح کا بے چینی سے انتظار تھا کہ اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچاسکیں۔

اسے آپ ہمارا ولولہ کہیں، مشن کو سو فیصد کامیابی سے انجام کی خواہش یا اس میں ناکامی کا خدشہ اور اس سے پیدا ہونے والی مشکلات کا احساس۔ وجہ چاہے کچھ بھی تھی لیکن ہم سب بے چین تھے۔ ہم بار بار اپنی گھڑیاں دیکھتے۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ساری رات ہم نے سوتے جاگتے گزار دی۔ نمبرٹو کو بھی میں نے مشن کے متعلق بتا کر اپنا ہمراز بنالیا تھا۔ میں نے اس کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ رفیق اور چکمہ مزدور پر سخت نگرانی رکھیں اور خصوصی طور پر ہماری کیمپ سے غیر حاضری کے دوران اسے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ اگر یہ حوائج ضروری سے فراغت کے

لیے بھی جانا چاہیں تو کم از کم دو آدمی ان کے ہمراہ جائیں اور انھیں بھاگنے کا ہرگز موقع نہ دیں۔ میں نے نمبرٹو کو یہ بھی بتادیا کہ رفیق کی بندوق یا پستول سے ہرگز خوف زدہ نہ ہوں کیونکہ یہ دونوں اب محض لوہے کے دو ٹکڑے ہیں۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کریں تو بے شک ان کی ٹانگوں پر فائر کردیں۔ یہ تمام ہدایات دے کر صبح سات بجے ہم نے اپنے Firing Spot (فائر کرنے کی عین جگہ) پر پہنچ کر اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ میں بار بار اللہ پاک سے دعا کرتا کہ بھارتی ہیلی کاپٹر عین اسی جگہ اور ہماری فائرنگ رینج سے گزرے۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہی ہمیں ہیلی کاپٹر دکھائی دیا۔ یہ چھوٹا اور غالباً ''اپاچی'' میک کا چاپر تھا جس میں پائیلٹ کے علاوہ چار افراد کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ چھوٹا اور ہلکا ہونے کے باعث یہ زیادہ بلندی پر پرواہ نہیں کرسکتا اور فوج میں OP کے فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ ہماری پوزیشن سے ستر درجے کے فاصلے پر سات آٹھ سو فٹ بلندی پر بھارت کی جانب (کلکتہ) جارہا تھا۔ جونہی یہ ہماری فائرنگ رینج میں پہنچا میں نے فائر کا آرڈر دیا۔ آرڈر ملتے ہی دونوں سب مشین گنوں اور رائفلوں نے گولیاں برسانی شروع کردیں۔ اتنی دیر میں میں بھی نیم دراز ہوکر بزوکا سے پوزیشن لے چکا تھا۔ قیصر نے میزائل لوڈ کرکے مجھے All OK اور فائر کا سگنل کی تھپکی دی۔ بزوکا کے ٹارگٹ فائنڈر (Target Finder) سے میں دیکھ رہا تھا کہ ہیلی کاپٹر کی ہموار پرواز یکدم لڑکھڑائی اور ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا انجن یا کنٹرول سسٹم بیکار ہوچکا ہو۔ یقیناً لڑکوں کی مسلسل فائرنگ سے وہ ہٹ ہوچکا تھا۔ یہی وقت تھا جب میرے بزوکا سے میزائل نکلا۔ میزائل فائر کرتے ہوئے بزوکا چلانے والے کو ذرا سا بھی دھچکا محسوس نہیں ہوتا کیونکہ اس کے فائر کا Re-action (ردعمل) نہیں ہوتا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا، آگ کا گولہ دکھائی دیا اور ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔ ہم سب نے اس کامیابی پر خوشی سے نعرہ لگایا اور بے ساختگی سے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ فضا میں پھٹنے سے ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے زمین کے خاصے بڑے علاقے میں بکھر کر گرے اس میں سوار لوگوں کی جھلسی ہوئی لاشیں بھی ٹکڑوں میں بکھری ہوں گی۔ ہم نے اپنا اسلحہ سنبھالا اور جلد جلد کیمپ میں واپس پہنچے۔ کیمپ کا سارا سامان تو گزشتہ شام ہی میں نے مزدوروں اور گائیڈز کے ہمراہ ٹوڈا بھیج دیا تھا اور کیمپنگ کی جگہ پر صرف میرے تھائی ساتھی، رفیق اور چکمہ مزدور ہی تھے۔ میں نے بزوکا کو بجائے تھیلے میں ڈالنے کے کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ رفیق اور چکمہ مزدور زمین پر بیٹھے تھے اور تھائیوں نے ان کو غیرمحسوس انداز میں گھیرے میں لے رکھا تھا۔ نمبرٹو نے مجھے بتایا کہ دھماکے کی آواز سنتے ہی رفیق اور مزدور نے پہلے ہماری جانب اور پھر ٹوڈا جانے کی کوشش کی لیکن میں نے انھیں آپ کے واپس لوٹنے تک رکنے کا کہا۔ پہلے تو یہ بحث کرنے اور مجھ رعب جمانے لگے لیکن باقی ساتھیوں نے جب ان کے گرد گھیرا ڈال لیا تو یہ بڑبڑاتے ہوئے یہاں بیٹھ گئے۔ میں نے مصنوعی غصے سے نمبرٹو سے کہا کہ ''رفیق

صاحب نہایت معزز اور ہمارے میزبان ہیں۔ انھیں یقیناً بھوک لگی ہوگی یا کسی کام سے یہ ٹووا جانا چاہتے ہوں گے۔ ہمیں یہاں سے گئے خاصی دیر ہوگئی تھی یہ ہمارے بارے میں بھی متفکر ہوں گے اس لیے ہماری تلاش میں جانا چاہتے ہوں گے۔ تم نے انھیں کیوں روکا۔'' میں نے رفیق کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے نمبرٹو اور اس کے ساتھیوں کی ''گستاخی'' کی معافی مانگی اور کہا ''رفیق صاحب ایک عجیب بات ہوگئی۔ ہم یونہی نشانہ بازی کررہے تھے اور اتفاقاً ہماری چند گولیاں ایک گزرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو جالگیں اور یہ بھی محض اتفاقاً ہی ہوا کہ پریکٹس کے دوران بزوکا سے فائر کیا ہوا میزائل بھی اسی ہیلی کاپٹر سے ٹکرا گیا اور وہ اور اس کے مسافر جو یقیناً اعلیٰ بھارتی فوجی افسر ہوں گے ''جہنم واصل'' ہوئے۔ میرے بھارتی فوجیوں کی ہلاکت کو جہنم واصل کہنے سے رفیق چونکا اور کہنے لگا۔ ''میں تمہارے بارے میں پہلے ہی شک میں پڑ گیا تھا کیونکہ کرنل مزمل جو بنگلہ دیش کا دشمن ہے، میں نے اس کے ساتھ تمہیں اس کی جیپ میں دیکھا تھا۔ یہ بتاؤ کہ تم درحقیقت کون ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا ''کیا میرے انسان ہونے میں آپ کو کوئی شک ہے کہ آپ مجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں اور ہم یہاں شکار کے لیے آئے ہیں۔ شکار کس کا ہوگا شاید میں نے آپ پر واضح نہیں کیا تھا۔ چلو اب بتادیتا ہوں۔ مجھے جانوروں سے زیادہ انسانوں اور خصوصاً غداروں کے شکار کا شوق ہے۔ کیا تم ہی نے سقوط ڈھاکہ کے دوران کھلنا میں بھارتی فوجیوں کو ہار پہنا کر ان کا استقبال نہیں کیا تھا؟ کھلنا میں بھارتی فوجیوں کی آمد کے وقت تو پاک بھارت جنگ جاری تھی اور بنگلہ دیش بھی معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ کیا تم نے اس وقت اپنے وطن پاکستان سے غداری نہیں کی تھی۔'' رفیق آنکھیں پھاڑے میری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے دل کا غبار نکالتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''چوبیس برس پاکستان کا نمک کھانے اور اس کا شہری کہلانے کے بعد چند ملکی غداروں اور بھارت کی شاطرانہ چالوں اور مکتی باہنی کے بھیس میں بھارتی فوجی مشرقی پاکستان میں بھیج کر اپنے وطن عزیز کو دولخت ہوتے دیکھنے والے شہریوں کی تین کیٹیگریز (Catagories) ہیں۔ پہلی میں وہ لوگ تھے جو اپنے ملک کو دشمن کی سازشوں کا شکار ہوتے دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے اور ملک دشمنوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ دوسری کیٹیگری میں وہ لوگ تھے جو خاموشی سے اس صدمے کو سہہ گئے اور تیری کیٹیگری میں تم اور وہ غدار تھے جنھوں نے وطن فروشی میں اہم کردار ادا کیا اور پاکستانی افواج کو سامنے سے بھارتی فوج اور پیچھے سے تم جیسے وطن غداروں کی گولیوں کی بوچھاڑ سہنی پڑی۔'' میں ابھی مزید بولتا لیکن میں نے دیکھا کہ رفیق میرے بولنے کے دوران غیرمحسوس طریقے سے مجھ سے پیچھے ہٹتا گیا اور اچانک اپنی بندوق مجھ پر تان کر ٹریگر دبا دیا۔ مٹی بھرے کارتوسوں سے جب بندوق ٹھس بھی نہ ہوئی اور صرف ٹریگر چلنے کی آواز آئی تو اس نے بندوق پھینک کر اپنا پسٹل نکالا اور مجھ پر فائر کرنا چاہا۔ خالی پسٹل نے بھی جب ساتھ نہ دیا تو رفیق اسے بھی پھینک کر میری طرف لپکا اور میرے پاؤں پر گر کر مجھ سے معافیاں مانگنے اور جاں بخشی کی

التجائیں کرنے لگا۔ میں نے نمبرٹو کو کہا کہ چکمہ مزدور کو اپنی گرفت میں لے لیں۔ میں نے رفیق کو دو تین ٹھڈے مارے اور کہا کہ اٹھ کر بیٹھے اور میرے سوالوں کا جواب دے۔ اس کے بعد ہی میں اس کے متعلق کچھ فیصلہ کروں گا۔ میں ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا اور رفیق کو سامنے زمین پر بیٹھنے اور اپنے ہاتھ اپنی گردن کے پیچھے باندھنے کا کہا۔ میں نے بلند آواز میں رفیق کو سناتے ہوئے قیصر کو کہا کہ رفیق کے پیچھے کھڑا ہوجائے۔ میرے جس سوال کا بھی رفیق نے غلط جواب دیا تو میں ہاتھ سے اشارہ کروں گا تم اپنے جوتے پوری طاقت سے اس کے سر پر مارنا اور اپنے دو ساتھیوں کو کہے کہ اسے بازوؤں سے پکڑ لیں تاکہ یہ ہل جل نہ سکے اور جوتوں کی ضرب ٹھیک اس کے سر پر لگے۔ سو جوتے لگانے کے بعد یہ کام اپنے دوسرے ساتھی کو سونپ دینا۔ کیونکہ اتنے جوتے کھانے سے شاید اس بے غیرت پر اثر نہ ہو لیکن تم تھک چکے ہوگے۔ میں نے رفیق کی قوت مدافعت (Resistance) ختم کرنے اور اسے Breaking Point پر لانے کے لیے جان بوجھ کر جوتے مارنے کی تعداد بتائی تھی۔ جب قیصر کے ساتھیوں نے اسے بازوؤں سے جکڑ لیا اور قیصر اپنا بوٹ اتار کر اس کے پیچھے کھڑا ہوگیا تو میں نے رفیق سے پوچھا ''سونیا کہاں ہے؟'' ''کون سونیا'' رفیق کے اس جواب پر میں نے قیصر کو اشارہ کیا اس کے تیسرے جوتے پر ہی رفیق بولا ''وہی سونیا جو راجہ تری دیو کی بیٹی ہے؟'' ''راجہ کی نہیں بلکہ رانی کو شراب کے نشے میں مدہوش کرکے تمہارے سیاہ کارنامے کے باعث جو اس دنیا میں آئی ہے وہ سونیا'' میرے اس سوال نما جواب پر رفیق خاموشی سے پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے قیصر کو کہا ''یہ اس تھوڑے مہذبانہ طریقے سے نہیں بولے گا۔ اب اسے مسلسل جوتے مارنا شروع کرو اور تب رکنا جب یہ سونیا کی پیدائش سے لے کر اب تک کے تمام واقعات تفصیلاً اور بغیر رکے بتانے پر رضامند ہوجائے'' میرے کہنے پر قیصر نے اس کے سر پر جوتوں کی بوچھاڑ کردی لیکن پہلے اس کے منہ میں رومال ٹھونس کر اسے چیخنے چلانے اور شور مچانے سے بھی روک دیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور آنکھیں بند کرکے جوتے پڑنے کی تعداد گننے لگا۔ غالباً بیس بائیس گنے ہوں گے کہ قیصر بولا ''بھائی جان یہ سب کچھ بتانے پر رضامند ہوگیا ہے۔'' اس کے پندرہ جوتے اور مارو کہ اسے یہ بھی یاد رہے کہ اسے صرف بولنا ہی نہیں بلکہ سچ بولنا ہے۔ سونیا کے متعلق ہمیں سب پتہ چل چکا ہے۔ اس کی یہ ''خدمت'' ہم صرف اس لیے کررہے ہیں کہ یہ اپنی زبان سے ہمیں سچ بتادے۔'' میں نے یہ کہہ کر پھر آنکھیں بند کرلیں۔ سر پر پھر جوتے لگنے کی آواز آنے لگی۔ جب قیصر نے ہاتھ روکا تو میں نے رفیق سے پوچھا ''کیا سب کچھ اپنی زبان سے اگل دو گے اور مجھے سوال کرنے کی ضرورت تو پیش نہیں آئے گی۔ ورنہ میرے ہر سوال کے ساتھ تمہارے سر کی دھنائی پھر صفر سے شروع ہوگی۔'' رفیق کے اثبات میں سرہلانے پر میں نے قیصر کو اس کے منہ سے کپڑا ہٹانے کا کہا۔ اس کے دونوں بازوں ساتھیوں نے جکڑے رکھے تھے۔ رفیق نے کوئی راہ فرار نہ دیکھ کر اپنے سر کو سہلانے کی اجازت مانگی۔ میں نے سختی

سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''بولو اور صرف بولو کیونکہ اسی کی تمہیں اجازت دی گئی ہے۔'' میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اصلیت جان کر ان دونوں سے چھٹکارا پایا جائے کیونکہ یہ جگہ میری زیر زمین تہہ خانہ یا سیف ہاؤس (Safe House) نہ تھا بلکہ ہم جنگل میں کالی گھاٹ کے قریب اس جگہ پر تھے جہاں شکاریوں کے علاوہ کالی گھاٹ اور ٹووا کے لوگوں کی آمدورفت بھی ہوتی تھی اور بھارتی ہیلی کاپٹر کی تباہی کے بعد تحقیقاتی اور تلاش کرنے والی فوجی ٹیموں کی جلد آمد بھی متوقع تھی۔ رفیق کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہوچکی تھی۔ وہ اٹک اٹک کر بولنے لگا ''میری بدقسمتی اسی روز شروع ہوگئی تھی جب آپ سے ملاقات ہوئی۔ چکمہ قبیلے کے سردار کا پیغام لے کر یہ مزدور کے بھیس میں سردار کا سپاہی چند روز قبل یہاں آیا تھا اور اس نے آپ کو پہچان بھی لیا تھا۔ میری بدقسمتی کہ میں نے اسی وقت آپ کا بھید فوج میں اپنے دوستوں کو نہ بتایا اور نہ ہی ان سے کرنل مزمل کا آپ سے ملنے کا ذکر کیا کیونکہ بھارتی جاسوس آپ کی اصلیت جان کر مجھے مقابلتاً بہت زیادہ انعام دیتے۔ میری تیسری بدقسمتی یہ کہ آپ کے ہمراہ شکار پر چلا آیا اور چوتھی بدقسمتی یہ کہ میری بندوق اور پسٹل نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا۔ چوٹوں کی وجہ سے میرا سردرد سے پھٹ رہا ہے اور مجھ میں زیادہ بولنے کی تاب نہیں۔ سونیا میری بچی ہے اور روزین نام سے عیسائی خانقاہ میں رہتی ہے۔ اس کو میں نے رانگاماٹی سے لاتے ہی خانقاہ والوں کے حوالے کر دیا تھا اور وہ شروع ہی سے خود کو عیسائی سمجھتی ہے اور راہبہ بننے کی تعلیم پا رہی ہے صرف میں ہی اس کا بھید جانتا ہوں۔ مجھے زندہ رکھ کر ہی آپ اسے پاسکتے ہیں۔ مجھے زندہ رکھنے میں ہی آپ کا فائدہ ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے پورا تعاون کروں گا'' یہ کہہ کر رفیق یا تو واقعی بے ہوش ہوگیا اور یا اس نے بے ہوشی کا ڈرامہ کیا۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ رفیق نے جو کچھ بھی اگلا ہے اور تعاون کی جو پیش کش کی ہے وہ دل سے نہیں بلکہ جان کے خوف اور جوتوں کی چوٹ لگنے کی وجہ سے کی ہے۔ مسز ڈیوڈ کی بات کی تصدیق رفیق نے کردی تھی۔ اس سے زیادہ کی مجھے ضرورت بھی نہ تھی۔ سونیا کو حاصل کرنے کا میرا اپنا پلان تھا اور زہریلے سانپ کو زخمی کرکے چھوڑنا میری عادت نہ تھی۔

بارھواں باب

میں نے قیصر، اس کے ساتھیوں اور نمبرٹو کو بھی میٹنگ میں شامل کیا۔ ایک بات تو طے شدہ تھی کہ رفیق اور چکمہ مزدور کو لازمی ہلاک کرنا ہے۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ ہمارے پاس وقت کی بہت کمی تھی۔ فوجی تحقیقاتی ٹیمیں کسی وقت بھی اس علاقے کو Condon (گھیرے میں لینا) کرسکتی تھیں۔ ہمیں اس علاقے سے جلد از جلد تحقیقاتی ٹیموں کی پہنچ سے باہر نکلنا، بزوکا کو تباہ کرنا، میزائلوں کو چھپانا اور رفیق اور چکمہ مزدور کا خاتمہ کرنا تھا۔ سب سے پہلے ہم نے بزوکا کے میزائل ایک درخت کے قریب گڑھا کھود کر اس میں دفن کیے۔ ہدایات کے مطابق بزوکا کو ہمیں ہینڈ گرنیڈ سے تباہ کرنا تھا لیکن گرنیڈ پھٹنے کا دھماکہ گزرنے والے شہریوں اور اگر کوئی تحقیقاتی ٹیم قرب و جوار میں ہوئی تو اسے متوجہ کرسکتا تھا۔ ہم نے بزوکا کو بھی بجائے تباہ کرنے کے ایک گہرا گڑھا کھود کر اس میں دفن کردیا اور رفیق اور چکمہ مزدور کے منہ بند کرکے اور پشت پر ان کے ہاتھ باندھ کر ٹووا کی طرف روانہ ہوئے۔ ان دونوں کو ہلاک کرنے میں دو رکاوٹیں تھیں۔ پہلی پسٹل یا کسی دوسرے ہتھیار کے دھماکے کی آواز اور ان کی لاشوں پر گولی لگنے کے نشان اور دوسری مزدوروں اور گائیڈز کو ان کے مرنے کی ایسی وجوہات بتانا جن سے وہ قائل ہوسکیں۔ شکار کے دوران نشانے کے اچانک چوک جانے اور انہی دو کو لگنے کا واقعہ خود مجھے بھی مطمئن نہیں کررہا تھا تو ان کو کیسے یقین آتا۔ گائیڈز اور مزدوروں کو بلاسبب اپنے سے پہلے بلاوجہ ٹووا بھیج دینا اور صرف ان دونوں کو روکنا، ہیلی کاپٹر کی تباہی اور ان دونوں کی پراسرار ہلاکت، اگر کوئی بھی ذی ہوش انسان ان بکھری ہوئی کڑیوں کو ملانے بیٹھتا تو کڑیوں کی زنجیر یقیناً میرے گلے میں ہی فٹ ہوتی۔ رفیق بھی چونکہ تمام واقعات کا شاہد تھا بلکہ میں نے خود اسے بھارتی ہیلی کاپٹر کو تباہ کرنے کا بتایا تھا اس لیے اب وہ خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ اگرچہ ان دونوں کے منہ بند اور ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن انہیں یہ یقین ضرور تھا

کہ راستے میں ملنے والے راہ گیروں کے ذریعے اور یا ٹووا پہنچ کر ان کے منہ اور ہاتھ تو کھلوا دیے جائیں گے اور ہمارے منہ اور ہاتھ باندھ دیے جائیں گے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ ٹووا کی طرف ہمارا اٹھنے والا ہر قدم ہمیں درپیش آنے والی مشکلات اور ان دونوں کو آزادی کے قریب کرتا جا رہا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ ان حالات میں ہمارا آگے بڑھنا خطرناک ہے۔ ہیلی کاپٹر کی تباہی اور رفیق کے ساتھ ہمارے ''سلوک'' کے باعث ہم پہلے ہی Abnormal تھے۔ اب ان دونوں سے چھٹکارا پانے کا کوئی مناسب اور محفوظ طریقہ سمجھ میں نہ آنے کے باعث ہمارے اپنے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ میرے ساتھی خاموشی سے میرے ہر حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ بطور اپنے لیڈر کے میری کوئی غلطی انہیں کھیدے کے دوران جنگلی ہاتھیوں کے محصور ہونے کے بعد اپنے لیڈر کو ہلاک کرنے والا واقعہ کہیں مجھ پر بھی دہرایا نہ جائے۔ میں نے مروّجہ راستہ چھوڑ کر جنگل کے تقریباً دو سو میٹر اندر جا کر بیٹھنے اور اپنی اس مشکل کا حال سوچنے کا فیصلہ کیا۔ راستے سے ہٹ کر جب ہم جنگل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگے تو رفیق اور مزدور نے اس طرف جانے میں مزاحمت کرتے ہوئے پہلے تو بند مونہوں سے غوں غوں کی آوازیں نکالیں اور جب میرے ساتھی انہیں دھکیلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے تو پہلے رفیق اور پھر مزدور زمین پر لیٹ گئے۔ رفیق کی پشت پر کینوس کا ایک چھوٹا سا بیگ بندھا ہوا تھا۔ اسے اٹھانے کی کوشش میں اس بیگ پر ہاتھ پڑا تو قیصر کے ایک ساتھی نے بتایا کہ بیگ میں ایک بوتل بھی ہے۔ ہم نے بیگ کو کھول کر دیکھا تو اس میں اسکاچ وہسکی کی ایک بھری ہوئی سیل بند بوتل کے علاوہ کپڑوں کا ایک جوڑا اور کنگھی شیشہ وغیرہ تھے۔ میرے کہنے پر ساتھیوں نے بوتل نکال لی۔ ان دونوں کو ٹھڈے مار کر اٹھایا اور دھکیلتے ہوئے انہیں بدقت تھوڑا سا مزید جنگل کے اندر لے گئے۔ وہیں ایک جگہ پر بیٹھ کر میں ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل سوچنے لگا۔ سگریٹ نکالنے کے لیے میں نے اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب کے دوسرے خانے میں زہریلے تیر کا رومال میں لپٹا ہوا ٹکڑا ملا جسے میں وہاں محفوظ کرنے کے بعد بالکل بھول چکا تھا۔ میں نے سگرٹ سلگا لیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ میرے ساتھی بھی یقیناً یہی سوچ رہے ہوں گے۔ مجھے اپنے متعلق بڑا گمان تھا کہ میں صحیح فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگاتا لیکن گزشتہ چار سال سے بھارت، کھٹمنڈو اور اب تھائی لینڈ، برما اور بھارت میں مورنگ، مگھ اور چکمہ قبائل اور ان کے بعد آج صبح تک پے در پے اور مسلسل غیر یقینی کی کیفیت اور غیر معمولی حالات نے میری جو حالت کر دی تھی اسے بیان کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔ مجھ میں سب سے بڑی تبدیلی میری صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت میں نمایاں کمی تھی۔ آج بھی میری حالت یہ ہے کہ ''غازی'' اور ''جانباز'' کو تحریر کرتے وقت میرے چہرے پر تناؤ اور اضطراب کو میری رفیقۂ حیات اور دوست احباب صاف محسوس کرتے ہیں۔ ماضی میں گزرے ہوئے واقعات کو یکجا کرتے ہوئے جب آج بھی میری حالت ایسی ہو جاتی ہے تو قارئین میری اس وقت کی حالت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جب میں ان مشکلات میں گھرا

ہوا تھا۔ جب کوئی بھی صحیح حل دماغ میں نہ آیا اور وقت کے تیزی سے گزرنے کا احساس بڑھتا گیا تو میں نے جو فیصلہ کیا وہ ناپختہ اور کمزور تھا۔ میرے ساتھی بھی بالکل خاموش تھے اور میرے کئی بار ان سے پوچھنے کے باوجود وہ کوئی حل نہ بتا سکے اور خاموش رہنے میں ہی انہوں نے اپنی عافیت سمجھی۔

میں نے نمبر ٹو کو کہا کہ رفیق کے منہ سے کپڑا ہٹا کر اس کا منہ کھول دے اور قیصر سے کہا کہ وہسکی کی بوتل کھول کر بوتل اس کے منہ میں ڈال دے اور جب تک شراب کا آخری قطرہ بھی اس کے حلق سے نیچے اتر نہ جائے، نہ تو بوتل اس کے منہ سے ہٹائے اور نہ ہی شراب کو باہر گرنے دے۔ دس منٹ میں یہ سارا عمل مکمل ہو گیا تو میں نے نمبر ٹو کو کہا کہ رفیق کو درخت کے سہارے بٹھا دے تاکہ ساری شراب اس کے معدے میں چلی جائے۔ رفیق نے تھوڑی دیر تو اس زبردستی کی شراب نوشی کے خلاف جدوجہد کی اور پھر نڈھال ہو گیا۔ اس سے فارغ ہو کر چکمہ مزدور کو میرے کہنے پر پکڑ کر بٹھایا گیا اور میں نے زہریلا تیر اس کی گردن میں تین جگہ اس طرح چبھویا جیسے کسی سانپ نے اسے کاٹا ہو۔ مزدور دو تین مرتبہ پھڑکا اور پانچ منٹ میں ہی اس کی جان نکل گئی۔ اس کے منہ سے کپڑا ہٹا کر اور ہاتھ کھول کر ایک نزدیکی درخت کے قریب اس طرح لٹایا گیا جیسے کسی زہریلے سانپ نے اسے کاٹا ہو۔ مزدور سے فارغ ہو کر میں نے اپنے ریوالور کے دستے سے رفیق کے سر کی اس مخصوص جگہ پر چار پانچ سخت چوٹیں لگائیں جہاں حرام مغز ہوتا ہے۔ رفیق تو شراب کے اثر سے بے ہوش ہو چکا تھا اس لیے اس نے سر پر چوٹیں لگنے سے آہ بھی نہ بھری اور ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی نبض دیکھ کر اور اس کے نتھنوں سے آئینہ لگا کر جب مجھے تسلی ہو گئی کہ وہ مر چکا ہے تو قیصر نے اس کی ساری جیبوں اور بیگ کی تلاشی لی اور کرنسی کے سوا تمام کاغذات نکال لیے۔ یہ بنگلہ اور انگریزی میں لکھے ہوئے کاغذ تھے۔ بوتل اس کے قریب رکھ کر کارتوسوں کی پیٹی اور بندوق بھی قیصر نے اٹھا لی اور میرے کہنے پر اس کے پسٹل میں تیس بور کی اس کی اپنی گولیاں ڈال دیں اور اپنی بتیس بور کی گولیوں سے بھرا پیکٹ بھی نکال لیا۔ بندوق سے مٹی بھرے کارتوس بھی نکال لیے گئے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر جلد از جلد ٹووا پہنچا جائے۔

ہم تیز قدمی سے چلتے ہوئے ٹووا پہنچے۔ میں نے گائیڈ کو کہا کہ رفیق اور مزدور ہم سے بچھڑ کر ہم سے پہلے ہی یہاں آنے کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ ہم نے واپس آتے ہوئے انہیں بہت تلاش کیا لیکن وہ نہ ملے۔ میں نے انجان بنتے ہوئے گائیڈ سے پوچھا کہ یہ دونوں کب کے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ گائیڈ کے یہ بتانے پر کہ وہ ابھی تک یہاں نہیں آئے میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے کہا ''وہ شاید کسی اور شکار پارٹی کے ہمراہ ابھی جنگل میں ہی ہوں گے۔ ہمیں واپس کھلنا جانا ہے لہٰذا ان کا انتظار کرنے کے بجائے تین مزدوروں کے ساتھ دوسرا گائیڈ یہاں ہی ٹھہرے اور ان کے ہمراہ واپس آئے اور تم دو مزدوروں کے ساتھ ہمارے ساتھ کھلنا چلو۔ کھلنا پہنچ کر میں تمہاری اور مزدوروں کی بقایا ادائیگی کر دوں گا۔'' گائیڈ نے دوسرے گائیڈ اور تین مزدوروں اور کھانا بنانے والے کو وہیں رفیق کا انتظار کرنے

کا کہا اور دو مزدوروں کے ساتھ ہمارا سامان اٹھا کر گھاٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ شام ڈھلنے کے بعد ہم کھلنا پہنچے۔ میں نے ساتھیوں کو ایک ریسٹوران میں بٹھایا اور خود سیدھا کرنل مزمل کے گھر پہنچا۔ کرنل مزمل گھر پر ہی تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے وہ بولا۔ ''ہیلی کاپٹر کی تباہی کی خبر ہمیں صبح دس بجے ہی مل گئی تھی۔ اطلاعات کے مطابق ہماری تحقیقاتی ٹیم تو حادثے کے ایک گھنٹے بعد ہی حادثے کے مقام کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔ آج بعد دوپہر بھارتی ٹیم بھی جیسور پہنچ گئی ہے۔ ہیلی کاپٹر میں سوار ایک میجر جنرل، ایک بریگیڈیئر، دو میجر اور پائلٹ تھے جو سارے مارے گئے اور ان آٹھ لاشوں کے اعضا وسیع علاقے میں بکھر گئے۔'' میں نے مزمل کو رفیق اور مزدور کی ہلاکت اور مزدوروں اور گائیڈز کو ان کے متعلق اپنی لاعلمی کا بتاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پورا احساس ہے کہ میری اس بات میں کوئی وزن نہیں ہے لیکن ایک طرف میں فوجی تحقیقاتی ٹیم سے آمنا سامنا ہونے سے کترا رہا تھا دوسری طرف رفیق کو ٹھکانے لگانا بھی ضروری تھا کیونکہ اسے میری اصلیت کا پتہ چل چکا تھا اور وہ اسی انتظار میں تھا کہ مجھ پر کاری وار کر سکے۔ اس نے خود اپنی زبان سے اعتراف کیا تھا کہ اس نے مجھے تمہارے ساتھ تمہاری جیپ میں دیکھا تھا اور وہ بقول اس کے ''بدقسمتی'' سے اپنے حامی اور تمہارے مخالف افسران کو یہ بات نہ بتا سکا۔ وہ دراصل بھارتی جاسوسوں کو میرے متعلق پوری معلومات دے کر انعام میں بڑی رقم ہتھیانے کے انتظار میں تھا۔'' کرنل مزمل میری باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ''رفیق کی پراسرار موت کو اس کے حامی افسران خاموشی سے برداشت نہیں کریں گے۔ تفتیش شروع ہوئی تو پہلے مرحلے میں ہی اس کا ہمارے ساتھ جانا ظاہر ہوجائے گا۔ میں اور میرے ساتھی غیر قانونی طور پر اور بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے بنگلہ دیش میں داخل ہوئے ہیں۔ رانی اور دوسری خواتین کھلنا میں ہیں۔ ہمارا سامان بھی درشن ہوٹل میں ہے۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر میں نے اپنے ساتھیوں کو ابھی تک ہوٹل جانے کی اجازت نہیں دی ہے اور وہ ایک ریسٹوران میں بیٹھے ہیں۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ اسی لیے میں سیدھا تمہارے پاس آیا ہوں۔'' کرنل مزمل نے میری ساری بات توجہ سے سن کر جواب دیا ''مجھے بریگیڈیئر صاحب سے بات کرنا پڑے گی۔ ویسے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔ تمہیں ہم نے اس مشن کی ذمہ داری بہت سوچ سمجھ کر سونپی تھی۔ ہم تمہیں کبھی Disown (لاتعلقی) نہ کریں گے چاہے ہمیں کھل کر ہی اپنے مخالفین کے سامنے آنا پڑے۔'' یہ کہہ کر کرنل مزمل بریگیڈیئر کو فون کرنے ڈرائنگ روم کے دوسرے کونے میں چلا گیا۔ ادھر میں نے بھی دل کو یہ سمجھا کر ڈھارس دی کہ میں نے کوئی کام بھی ذاتی فائدے کے لیے نہیں کیا ہے۔ بھارت میں DMI کی حراست بہت بڑی مصیبت تھی۔ اللہ پاک نے مجھے اس میں سے نکالا تو یہاں بھی اس کی ذات پاک بہتری کا ضرور کوئی رستہ نکال دے گی۔

مزمل فون کر کے واپس میرے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا جیسے کچھ فیصلہ کر رہا ہو

اور پھر بولا ''دیکھو دوست تم راولپنڈی سے یہاں اتنی مصیبتیں کس کے لیے اٹھا کر آئے ہو، ایک دوست کے لیے۔ یہاں میں تمہیں اچانک ملا۔ بحیثیت پرانے دوست کے مجھے تمہاری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنی چاہیے تھی لیکن بجائے اس کے میں نے تمہیں ایک خطرناک مشن سونپ دیا۔ تم نے کامیابی سے مشن انجام دیا اور مشکلات میں گھر گئے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ہم پس پردہ رہ کر تمہاری امداد کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ تم سے زیادتی اور کہنے والے کی کمینگی ہوگی۔ بریگیڈیئر سے ایسا ہی جواب سن کر میں نے ٹیلی فون پٹخ دیا تھا۔ میں نے ہی تمہیں کھلنا میں اس مصیبت میں ڈالا ہے اور اپنی پوری ذمہ داری اور تم سے دوستی کے ناطے میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے اگر اپنی عزیز ترین متاع بھی قربان کرنی پڑی یا جان بھی دینی پڑی تو میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ مجھ پر یقین رکھو' یہ کہہ کر مزمل چند لمحے خاموش رہا اور پھر بولا ''جب تک ہم درپیش مشکلات کا تجزیہ (Analysis) نہیں کریں گے تو ان کا حل بھی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اگر ہم مشکلات کو یکجا کر کے ان کا حل تلاش کرنے کے لیے سب کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں بانٹ دیں تو مشکلات کی ترتیب کچھ یوں بنے گی (1) تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کا بنگلہ دیش میں غیر قانونی داخلہ اور واپسی کے وقت چیکنگ کا خدشہ (2) چکمہ سردار کا ہماری تلاش کے لیے رفیق کے پاس اپنا لڑاکا سپاہی بھیجنا اور اس کی ہلاکت (3) ہیلی کاپٹر کی تباہی کی تحقیقات کرنے والی ٹیموں کا رفیق اور چکمہ مزدور کی لاشوں کے ذریعے گائیڈ اور ہم تک پہنچنے کا امکان (4) رانی اور دوسری خواتین کا درشن ہوٹل میں قیام جواب ہم سب کے لیے غیر محفوظ ہوچکا تھا (5) سونیا کا حصول (6) قیصر اور اس کے ساتھیوں کا بنگلہ دیش سے بھارت میں محفوظ طریقے سے داخلہ (7) رفیق اور مزدور کی ہلاکت کی تفتیش کے پہلے مرحلے میں ہی ان کا ہمارے ساتھ شکار پر جانے اور پراسرار ہلاکت کا انکشاف ہونا (8) گائیڈ کا تفتیشی ٹیم کو یہ بتانا کہ میرے کہنے پر وہ ٹوواواپس گئے (9) کھلنا میں رفیق کے بھارت کے حامی افسران سے خصوصی تعلقات کے باعث اس کی ہلاکت کی تفتیش میں خاصی دلچسپی لینا۔ میں نے اور کرنل مزمل نے ان تمام مسائل کا علیحدہ علیحدہ جو حل تلاش کیا وہ یہ تھا (1) بنگلہ دیش میں میرے اور میرے ساتھیوں کے غیر قانونی داخلے کا صرف ہمیں اور ہمارے حامی فوجی افسران کو ہی علم ہے لہٰذا اس مسئلے کو فی الحال نہ چھیڑا جائے اور ہمیں جلد از جلد بنگلہ دیش سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے (2) چکمہ سردار زخمی ہے اور جب تک اسے اپنے بھیجے گئے لڑاکا سپاہی کے ذریعے ہمارے کھلنا میں ہونے کی تصدیق نہ ہوجائے اس کی طرف سے مزید کسی اقدام کی توقع نہیں کرنی چاہیے (3) تحقیقاتی ٹیموں کے ہم تک پہنچنے کی بہت کم توقع ہے کیونکہ ہمارے متعلق صرف رفیق اور چکمہ مزدور ہی انہیں بتا سکتے تھے اور مردے بولا نہیں کرتے لہٰذا فی الحال دونوں گائیڈز کو فوری طور پر FIU کی حراست میں لے لیا جائے اور ان پر سختی کر کے انہیں دھمکایا جائے کہ وہ ہمارے متعلق لب کشائی نہ کریں اور ہماری کھلنا سے روانگی سے قبل انہیں رہا نہ کیا جائے۔ دوسرے مزدور اپنی جان بچانے اور تفتیش کے مرحلوں سے گذرنے کے خوف سے اپنی زبانیں بند

رکھیں گے (4) میرے ساتھیوں کی کنٹونمنٹ کے گیسٹ ہاؤس میں بریگیڈیئر کے ذاتی مہمانوں کے طور پر منتقلی تاکہ بریگیڈیئر اگر حالات ناموافق ہوئے تو اپنی (Involvement) ملوث ہونے کے باعث اپنے تمام وسائل سے ہمارے تحفظ کی کوشش کرے۔ درشن ہوٹل میں مقیم خواتین کو فوری طور پر فوجی حفاظت میں مزمل کی بیوی طاہرہ کے میکے باریسال میں منتقل کیا جائے جہاں وہ بالکل محفوظ ہوں گے (5) سونیا کے حصول کے لیے ہمارا طریقہ مناسب ترین ہے لہٰذا اسی پر مناسب وقت پر عمل کیا جائے (6) جیسور کے قریب بھارت اور بنگلہ دیش کی مشترکہ سرحد پر نگرانی نہ ہونے کے برابر ہے اور قیصر اور اس کے ساتھیوں کی حفاظت اور سرحد پار کرانے کے لیے مزمل اپنے حامی فوجی ان کے ہمراہ بھیجے گا (7) رفیق ایک عادی شراب نوش کے طور پر مشہور ہے۔ زیادہ شراب پینے سے اس کی موت واقع ہونا خلاف توقع نہیں ہوسکتا۔ مزدور "سانپ کے ڈسنے" سے ہلاک ہوا اور جنگل میں اس طرح ہلاکتیں ہونی معمول کی بات ہے۔ رفیق کی جیب میں ڈالروں کی موجودگی۔ ہیلی کاپٹروں کی تباہی اور زیادہ شراب پینے سے ہلاکت کو Link (تعلق) کرکے مزمل اپنے مخبروں کے ذریعے شہر میں ایسی افواہیں پھیلا دے گا جن سے تفتیشی ٹیموں کا رخ موڑا جاسکتا ہے۔ بھارتی بزوکا اور میزائلوں کے ان کی لاشوں کے قریب ہی ملنے کی وجہ سے یہ بھی کہانی پھیلائی جاسکتی ہے کہ بھارت میں بھارت مخالفوں نے رفیق کو بزوکا مہیا کیا اور وہ شکار کے بہانے کالی گنج کے قریب بھارتی ہیلی کاپٹر کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوگیا بنگلہ دیش کے مخالف چکمہ قبیلے کے لڑکے کا مزدور کے روپ میں اس کے ساتھ ہونا اس کہانی کو مزید تقویت دے گا۔ بزوکا اور میزائلوں کو تحقیقاتی ٹیمیں بالآخر تلاش کرلیں گی کیونکہ ان کے پاس (Metal Finder) (زمین میں مدفون دھات کا سراغ لگانے والا آلہ) بھی ہوتے ہیں۔ بھارت کے بنے ہوئے یا اس کی فوج میں رائج اس اسلحے کے ملنے کے بعد ان کی تفتیش کا رخ چاہے وقتی طور پر ہی سہی بھارتی فوج میں ان کے مخالفین کی طرف مڑ جائے گا (8) گائیڈ جب ہماری خفیہ حراست میں ہوں گے تو ان کا تحقیقاتی ٹیموں کو کچھ بتانا ناممکن ہے (9) رفیق کے متعلق ہیلی کاپٹر کو تباہ کرنے کی ایسی کہانی پھیلائی جائے گی جس کے بعد اس کے حامی افسران بھی اپنی جان بچانے کے لیے خوف سے اس سے اپنے خصوصی اور دوستانہ تعلقات کے اظہار سے بھی منکر ہوجائیں گے۔

ہماری یہ پلاننگ بھی اگرچہ کمزور بنیادوں پر بنی اور فول پروف نہ تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے بہتر تھی۔ مزمل اور میں اکھٹے ہی اس کے گھر سے نکلے۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد کرنل نے مجھے تمام انتظام کرکے درشن ہوٹل میں مجھے ملنا تھا۔ میں پہلے ریسٹورانٹ میں ساتھیوں کے پاس گیا اور مختصراً انہیں پروگرام بتا کر ان کے ساتھ ہی درشن ہوٹل میں چلا آیا۔ ساتھی اپنی تیاری میں مصروف ہوگئے اور میں نے رانی سے مل کر سب کو ایک گھنٹے کے اندر تیار ہونے کا کہا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد ایک میجر دو فوجی ٹرک لے کر ہوٹل آگیا۔ ایک ٹرک میں مزمل کی بیوی طاہرہ اور بچے بیٹھے تھے۔ میں نے اس دوران ہوٹل سے Check out

ہونے کے لیے سب کمروں کی ادائیگی کردی تھی۔ رانی اس کا بیٹا اور دوسری ساتھی خواتین اس ٹرک میں بیٹھ گئیں اور میجر انہیں لے کر باریسال کی طرف روانہ ہوگیا۔ دوسرے ٹرک میں میرے ساتھی اور میں ایک JCO کے ساتھ کینٹ میں گیسٹ ہاؤس کی طرف چلے۔ مزمل گیسٹ ہاؤس میں ہمارا منتظر تھا جہاں اس نے چار کمرے ہمارے لیے ریزرو کرا رکھے تھے۔ مزمل نے مجھے کہا کہا آئندہ چند روز ہم گیسٹ ہاؤس سے باہر نکلنے سے احتراز کریں اور اگر کوئی سویلین یا وردی والا پوچھے تو اسے بتائیں کہ بریگیڈیئر حق کے مہمان ہیں۔ مزید چند ہدایات دے کر مزمل رخصت ہونے لگا تو میں نے اسے کہا کہ میں کل چٹاگانگ فون کرنا چاہتا ہوں تاکہ اصفہانی کا جہاز ہرن گھاٹا پر آجائے۔ مزمل نے کہا کہ اسی JCO کے ساتھ وہ ایک جیپ بھیجے گا جس پر میں شہر جاؤں۔ مزمل بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ مجھے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا "اگرچہ ہم ابھی پوری طرح سے تیار نہیں ہیں لیکن یقین رکھو اگر تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ساتھ انیس بیس بھی ہوئی تو دلوں میں پکتا ہوا لاوا یہیں سے پھٹ کر باہر آجائے گا۔ تمہیں اچھی طرح سے بتانے کا موقع نہیں ملا۔ ہماری آرمڈ فورسز کو سقوط ڈھاکہ کے بعد جلد ہی احساس ہوگیا تھا کہ بھارت نے ہمارے ساتھ ہمدردی جتا کر ایسی چال چلی ہے کہ ہم ان کے غلام بن کر رہ گئے ہیں اس نے کہا They all need someone to break the Ice (انہیں صرف یہی انتظار ہے کہ کوئی پہلا قدم اٹھائے) مزمل کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے کے آرام دہ بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اگرچہ ہم تعداد میں بہت تھوڑے ہیں لیکن اگر ہماری موجودگی میں ایسی نوبت آئی تو ہم ان کے شانہ بشانہ لڑیں گے۔ ایسی ہی باتیں سوچتا ہوا میں سوگیا۔ اگلے روز گیارہ بجے JCO جیپ لے کر آیا اور میں نے ٹیلی فون آفس سے چٹاگانگ فون کرکے اصفہانی کے انچارج کو کہا کہ اپنے عملے کے علاوہ ہمارے بیس افراد کے لیے کم از کم ایک ماہ کے خورد ونوش کے سامان سے بھرا اسٹیمر بھیج دے اور کپتان کو ہدایت کرے کہ ہرن گھاٹا پر ہمارا انتظار کرے چاہے اسے مہینہ بھر بھی وہاں رکنا پڑے۔ فون کرنے کے بعد میں نے کرنسی ڈیلر سے کچھ ڈالر بنگلہ دیشی ٹکوں میں تبدیل کروائے۔ ساتھیوں نے اپنی ضرورت کے سامان کی لسٹ مجھے دی تھی۔ میں نے سب سامان خریدا اور چند غیرملکی رسائل لے کر گیسٹ ہاؤس واپس آگیا۔

آئندہ چند روز میں اور میرے ساتھی گیسٹ ہاؤس سے باہر نہ نکلے۔ مزمل ہر صبح فون پر ہماری خیریت دریافت کرتا اور ہر شام مجھے ملنے آجاتا۔ اس کی کھلنا چھاؤنی میں سینیارٹی کے لحاظ سے دوسری پوزیشن تھی۔ اس کی ہر روز آمد اور ہمارے بریگیڈیئر حق کے مہمان ہونے کے باعث گیسٹ ہاؤس کی انتظامیہ ہماری بہت عزت کرتی اور دونوں وقت کے کھانے ہم سے پوچھ کر تیار کیے جاتے۔ ایک روز میں اکیلا ہی دن کے وقت شہر گیا اور لوہے کی چار انچ لمبی اور خاص موٹی کیلیں خرید کر ویلڈنگ کی ایک دکان سے تین تین کیلوں کو مختلف اطراف میں رکھ کر ان کے سروں کو یکجا کرکے ویلڈ کروایا۔ میں نے ایسے بیس سیٹ بنوائے۔ مزمل سے یہ پروگرام طے ہوا تھا کہ میں سونیا کو اغوا کرکے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک

اسپیڈ بوٹ میں ہرن گھاٹا لے جاؤں اور مزمل باریسال سے رانی، اس کے لڑکے اور دوسری خواتین کو اپنے حامی فوجیوں کے پہرے میں کھلنا لاکر فوجی پہرے میں ہی کسی اسپیڈ بوٹ پر ہرن گھاٹا بھجوادے گا۔ باریسال جانے کے تیسرے روز مزمل کی بیوی واپس کھلنا آئی اور بتایا کہ اس کے میکے میں مزمل کے دوست کے مہمانوں کو خوش آمدید کہا گیا ہے اور وہ وہاں بخیریت اور بالکل محفوظ ہیں۔ رفیق کے بارے میں مزمل سے ہی پتہ چلا کہ اس کی اور چکمہ مزدور کی لاشیں کھلنا لائی گئی ہیں۔ گائیڈز کے FIU کی حراست میں ہونے کے بعد شہر میں مختلف قسم کی چہ میگوئیاں ہورہی ہیں۔ ان دونوں کی پراسرار حالات میں موت واقع ہونے کی پولیس میں رپورٹ درج کروادی گئی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق رفیق کی موت زیادہ شراب پینے سے اور مزدور کی کسی زہریلے سانپ کے کاٹنے سے ہوئی ہے۔ ہیلی کاپٹر کی تباہی کی تحقیقات کرنے والی ٹیموں کو ہیلی کاپٹر اور لاشوں کے جھلسے ہوئے ٹکڑوں کے علاوہ میزائل کے ٹکڑے اور چلی ہوئی گولیاں بھی ملی ہیں جن سے تحقیقاتی ٹیمیں اس حتمی نتیجے پر پہنچی ہیں کہ ہیلی کاپٹر کی تباہی کسی فنی خرابی کے باعث نہیں ہوئی بلکہ اسے مختلف ہتھیاروں سے ہٹ کیا گیا ہے۔ بنگلہ دیشی ٹیم بھارت کے خوف سے اس حادثے کو بھارت کے مخالف بھارتی دہشت گردوں کی کارروائی کہہ رہی ہے جبکہ بھارتی ٹیم اس حادثے کو بھارت مخالف بنگلہ دیشیوں کے سر تھوپ رہی ہے۔ ایک اور امکان پر دونوں ٹیمیں متفق ہیں کہ اس میں پاکستان کی کسی جاسوس ایجنسی کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ تحقیقات جاری ہے اور ابھی کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچی۔ مزمل جب یہ سب مجھے بتارہا تھا تو اس کے چہرے پر فکر کی لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ میرے پوچھنے پر پہلے تو وہ انکار کرتا رہا لیکن جب میرا اصرار بڑھا تو مزمل نے بتایا کہ صبح ہی جیسور چھاؤنی سے FIU کا ایک یونٹ یہاں پہنچا ہے اور ان کی تفتیش کا آغاز رفیق کے گھر والوں سے پوچھ گچھ سے ہوا ہے۔ یہ یونٹ آٹھ افراد پر مشتمل ہے اور اس کے آدمی سارے شہر سے اس بارے میں اطلاعات اکٹھی کررہے ہیں۔ یہ باتیں کھلنا کی FIU نے اسے بتائی ہیں کیونکہ کھلنا کا FIU جیسور کے FIU کی نگرانی کررہا ہے۔

کھلنا کینٹ کے گیسٹ ہاؤس میں میرے ساتھی اور میں ایک طرح سے نظربند تھے۔ بھارتی تحقیقاتی ٹیم اور جیسور سے آنے والے FIU کے یونٹ کھلنا میں اپنی تحقیقات کررہے تھے اور کھلنا میں متعین FIU کا مختصر عملہ ان دونوں ٹیموں کی تحقیقات کی خفیہ نگرانی (Surveillance) میں مصروف تھا اور کرنل مزمل کو اپنی روزانہ کارکردگی کی رپورٹ دیتا تھا اور کرنل مزمل ہر شام مجھے اسے ملنے والی رپورٹس کی بنیاد پر دونوں ٹیموں کی پروگریس بتاتا۔ رفیق کے گھر کے افراد سے بھی ان دونوں ٹیموں کو سوائے اس کے کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ رفیق ایک شکار پارٹی کے ساتھ گیا تھا اور اس کی لاش واپس آئی۔ دونوں لاشوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹس سے بھی کثرت سے شراب نوشی اور زہریلے سانپ کے ڈسنے سے موت واقع ہونے کے سوا کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ دونوں گائیڈ بھی ''غائب'' کردیے گئے تھے۔ لہٰذا چار روز کی تحقیقات سے ہیلی

کاپٹر کی تباہی کا شکاری پارٹی سے کوئی تعلق ثابت نہ ہوسکا اور دونوں ٹیمیں ناکام ہوکر اور نئے خطوط پر تحقیقات کا رخ موڑنے پر مجبور ہوکر کھلنا سے واپس چلی گئیں۔ ایک شام میں نے کرنل مزمل کو کہا کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ فی الوقت تو خطرہ تو ٹل گیا ہے لیکن بالکل ختم نہیں ہوا۔ گیسٹ ہاؤس میں ہمارا زیادہ عرصے تک قیام تمہارے مخالف فوجی افسران کو ہماری طرف متوجہ کرسکتا ہے لہٰذا ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ مزمل اگرچہ مجھے ہماری سلامتی کے متعلق کافی تسلی دیتا رہا لیکن میری چھٹی حس مجھے بار بار جھنجھوڑ کر کہہ رہی تھی کہ یہاں خطرہ ہے اور ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ مجھے اپنی ذات سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی سلامتی کی فکر تھی۔ خدانخواستہ اگر ہم پکڑے جاتے تو میرے ساتھی بغیر کسی لالچ، غرض اور مقصد کے صرف میرا ساتھ دینے اور دوستی نبھانے کے ناکردہ گناہ کی پاداش میں سزا پاتے۔ مزمل سے خاصی بحث وتمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میرے تھائی ساتھیوں کو ایک ٹرک بمعہ ان کے سامان کے آج رات باریسال لے جائے جہاں مزمل کے سسرال والے ان کے قیام و طعام کا بندوبست کریں اور اسی ٹرک پر کلپنا کو کھلنا لایا جائے اور ایک سپیڈ بوٹ پر فوجی جوانوں کے ساتھ قیصر اور اس کے ساتھی، سپنا اور میں جیسور سے اوپر شمال کی طرف درسنا (Darsana) جائیں اور قیصر، سپنا اور ساتھیوں کو بارڈر کراس کراکے میں فوجی جوانوں کے ہمراہ کھلنا واپس لوٹ آؤں۔ میری واپسی پر باریسال سے رانی، اس کے لڑکے اور رضی کی بیوی اور میرے تھائی ساتھیوں کو فوری کھلنا لایا جائے اور تھائیوں اور رضی کے سوا باقی سب کو ہرن گھاٹا بھیج دیا جائے اور میں بعد میں، رضی اور تھائی ساتھی سونیا کو اٹھا کر فوراً ہرن گھاٹا چلے جائیں۔ کرنل مزمل نے رات نو بجے فوجی ٹرک بھیج دیا، جس پر تھائی ساتھی باریسال کے لیے روانہ ہوگئے۔ اگلی صبح سپنا کو لے کر ٹرک واپس آگیا اور صبح تقریباً نو بجے ایک تیز رفتار موٹر بوٹ پر تین باوردی فوجی جن میں ایک JCO تھا، میں، رضی، سپنا اور قیصر اور اس کے ساتھی درسنا کے لیے روانہ ہوئے۔ میرے پاس اتنا روپیہ تو تھا نہیں کہ قیصر اور اس کے ساتھیوں کو مگھ اور مورنگ کے جواہرات میں ان کے حصے کی رقم ادا کرسکوں لہٰذا بنک لاکر سے اندازاً ان کے حصے کے جواہرات اور 8 ہزار ڈالر لے کر میں نے روانگی سے پہلے قیصر کے حوالے کیے۔ مزمل نے حالات کے پیش نظر JCO کو بریگیڈیئر حق کا ایک خط دیا جو ہمارے لیے پروانہ راہداری تھا اور JCO کو ہمیں بطور اس کے غیرملکی مہمانوں کے درسنا تک لے جانا اور واپس لانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ مزمل نے کہا کہ جیسور سے گزرتے وقت فوجی دریائی گشتی پارٹیوں نے اگر ہمیں روکا تو یہ خط دکھا دیا جائے۔ ہم اگرچہ دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت سفر کررہے تھے لیکن سپیڈ بوٹ کے طاقتور انجن کے باعث ہماری رفتار خاصی اچھی تھی۔ جیسور بلکہ درسنا تک دریا کے پاٹ کے دونوں طرف خاصی تعداد میں درخت تھے اور انہی درختوں کے ساتھ فوجی دریائی گشتی پارٹیوں کی ہیوی مشین گنوں سے لیس موٹر بوٹس کھڑی تھیں۔ ہماری بوٹ کے فوجی ان کشتیوں کو دیکھتے ہی کھڑے ہوجاتے۔ باوردی فوجیوں کو ہماری بوٹ میں دیکھ کر ہم سے کوئی تعرض نہ کیا گیا اور کھلنا کا فاصلہ

ہم نے سات گھنٹے میں طے کیا۔ اس دوران دو مرتبہ بوٹ کے انجن کو ریسٹ دینے کے لیے بوٹ کو کنارے پر لایا گیا اور ہم نے بھی کنارے پر لیٹ کر کمر سیدھی کی اور کرنل مزمل کے بھیجے ہوئے سینڈوچ کھائے۔

دنیا بھر میں جن ممالک کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں وہاں قانونی طور پر سرحد پار کرنے والوں کے علاوہ غیرقانونی سرحد پار کرنے والوں کو تعداد بھی کچھ کم نہیں ہوتی اور وہاں کے مقامی لوگ اجرت لے کر نہ صرف محفوظ پوائنٹس (Points) تک لے جاتے ہیں بلکہ زیادہ اجرت لے کر سرحد کے پار محفوظ مقامات تک چھوڑنے بھی چلے جاتے ہیں۔ دونوں اطراف کے بارڈر کے نگرانوں سے بھی ان کے رابطے ہوتے ہیں اور بارڈر کراس کرتے وقت یہ نگران روپیہ لے کر اپنی آنکھیں اور کان بند رکھتے ہیں۔ رضی نے شام تک ایسے دو مقامی آدمی تلاش کر لیے جنہوں نے بھارت جانے والے ہمارے ساتھیوں کو نہ صرف بارڈر کراس کرانے بلکہ بھارت میں شانتی پور تک لے جانے کی ہامی بھری۔ دونوں کی اجرت بمعہ دونوں اطراف کے فوجی نگرانوں کو ہڈی دینے کے لیے ایک ہزار ڈالر طے ہوئی۔ درسنا سے بارڈر صرف چار کلومیٹر ہے۔ شام سات بجے قیصر اور اس کے ساتھی مجھ سے گلے مل کر وداع ہوئے۔ ان بے لوث دوستوں سے اس وداعی ملاقات کے دوران ہم سب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے ان سے جدا ہو کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ میں نے قیصر کو کہا کہ شانتی نگر پہنچ کر وہ پہلا کام یہ کرے کہ کھلنا میں کرنل مزمل کے گھر کے پتے پر تار بھیج اپنی خیریت کی اطلاع دے۔ پروگرام کے مطابق قیصر نے شانتی نگر سے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ سپنا کو چھوڑنے دار جلنگ جانا تھا اور باقی ساتھیوں نے دہلی۔ سپنا نے بھی مجھ سے میرا پاکستان کا ایڈریس لیا اور وعدہ کیا کہ وہ مجھ سے خط و کتابت رکھے گی۔ میں نے قیصر کو کہا کہ آٹومیٹک رائفلیں اپنے ہمراہ لے جائے اور اگر بارڈر کراس کرتے ہوئے کوئی رکاوٹ پیش آئے تو اسلحے کو ضرور استعمال کرے۔ دشمن کے ہاتھوں مرنے سے پہلے دشمنوں کو ہلاک کرنے سے یہ حسرت تو باقی نہیں رہتی کہ مقابلہ کیے بغیر بزدلوں کی طرح مارے گئے۔ غرضیکہ انہیں رخصت کر کے میں نے اسی جگہ پر چند گھنٹے رکنے کا فیصلہ کیا کیونکہ بارڈر کراس کروانے والے دونوں افراد اپنے ایک اور آدمی کو اپنے ہمراہ لے جا رہے تھے جس نے بارڈر کراس کر کے اور انڈین BSF (بارڈر سیکیورٹی فورس) کی چوکیوں اور گشت کے ایریا سے نکلنے کے بعد قیصر کا لکھا ہوا رقعہ مجھے لا کر دینا تھا۔ صبح چار بجے کے قریب وہ آدمی واپس لوٹا۔ قیصر نے لکھا تھا کہ وہ بخیریت بارڈر سے گزر کر محفوظ علاقے (Safe Zone) میں پہنچ گئے ہیں اور انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ قیصر اور ساتھیوں کے جانے کے بعد میں نے آنکھ تک نہیں جھپکائی تھی۔ رقعہ ملنے کے بعد مجھے تسلی ہوئی اور کمر سیدھی کرنے کو میں اور رضی وہیں لیٹ گئے۔ صبح آٹھ بجے ہم موٹر بوٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ فوجی ہمارے انتظار میں تھے۔ واپسی کے سفر میں ہماری بوٹ کی رفتار دریا کے بہاؤ کی جانب چلنے اور وزن کم ہونے سے نسبتاً زیادہ تھی۔

ہم جیسور سے بھی بخیر و عافیت نکل آئے۔ راستے میں دو تین جگہ کنارے پر رک ہم نے پیٹ کی آگ بجھائی اور شام ہوتے ہوتے ہم کھلنا پہنچ گئے۔

تینوں فوجیوں کے ہمراہ ہی میں کرنل مزمل کے گھر گیا۔ فوجی تو کرنل مزمل کو ڈیوٹی انجام دینے کا بتا کر اپنے یونٹ میں واپس چلے گئے۔ رضی میرے ساتھ تھا۔ کرنل مزمل کے ڈرائنگ روم میں ہی ہم نے رات کا کھانا کھایا۔ اپنی خاصی بڑی کوٹھی کے ایک کمرے میں مزمل نے رضی کے ٹھہرنے کا انتظام کیا اور اسے کمرے میں بھیج کر مجھے کہا کہ جب تک کھلنا سے ہماری واپسی نہیں ہوتی۔ ہمیں نہایت ہوشیاری اور رازداری سے یہاں رہنا ہوگا۔ ''میرے ماتحت FIU کے یونٹ نے مجھے آج بتایا ہے کہ اگرچہ بھارتی اور جیسور کی تحقیقاتی ٹیمیں واپس چلی گئی ہیں لیکن اپنے چند کارکنوں کو یہیں چھوڑ گئی ہیں اور وہ سارے شہر میں کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ وہ درشن ہوٹل اور بعد میں کینٹ کے گیسٹ ہاؤس میں بھی گئے۔ بریگیڈیئر حق سے اس کے مہمانوں کے کوائف پوچھنے کی تو ان میں ہمت نہیں تھی لیکن درشن ہوٹل اور گیسٹ ہاؤس کے سٹاف سے انہوں نے تمہارے متعلق خاصی چھان بین کی ہے۔ دونوں گائیڈ ابھی ہماری حراست میں ہی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان کے گھروں پر بھی ٹیموں کے کارکن گئے تھے۔ میں نے اور بریگیڈیئر حق نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر کل بھی جیسور چھاؤنی اور بھارتی ٹیموں کے کارکن یہاں کینٹ میں دکھائی دیئے تو انہیں بھی حراست میں لے لیا جائے کیونکہ فوجی قانون کے مطابق بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں بغیر اجازت کے سویلین لباس میں بغیر کسی بظاہر وجہ کے مشتبہ حالت میں گھومنے والے بے شک اپنے ہی ڈویژن کے آدمی کیوں نہ ہوں انہیں پوچھ گچھ کے لیے روکا جا سکتا ہے۔ آج رات ہمارے حامی افسران کی ایک میٹنگ بھی رکھی گئی ہے کیونکہ ہمیں خدشہ ہے کہ جیسور چھاؤنی والے بھارتی ہیلی کاپٹر کی اپنی حدود میں تباہی سے ہراساں ہو کر بغیر کسی معقول شہادت کے سارا الزام ہم پر ہی نہ تھوپ دیں۔'' مزمل نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے مجھے پھر یقین دلایا کہ فکر کی ایسی کوئی بات نہیں۔ رضی بنگلہ دیش کا شہری ہے اور سارے ملک میں کہیں بھی جا سکتا ہے لیکن کسی قسم کا کوئی رسک نہ لیتے ہوئے ہم دونوں اس کے گھر پر ہی رہیں۔ اپنی کوٹھی کے مہمان خانے میں مجھے چھوڑ کر مزمل واپس چلا گیا۔ میں نے حساب لگایا تو سونیا کے چرچ جانے میں ابھی پانچ دن باقی تھے اور یہی ایک موقع تھا جس سے ہم آسانی سے سونیا کو اٹھا سکتے تھے۔ خانقاہ (Monastery) پر دھاوا بولنے اور سونیا کو وہاں سے اٹھانے کے لیے میرے وسائل اس وقت بھی بہت کم تھے جب قیصر اور اس کے ساتھی میرے ساتھ تھے۔ ان کے جانے کے بعد اب میرے ساتھیوں کی نفری اور اسلحہ بھی آدھے سے کم رہ گیا تھا اور اس موجودہ نفری میں حمید اور رضی بھی غیر مسلح تھے۔ خانقاہ پر دھاوا بولنے اور ایک نن طالبہ کو اٹھانے پر نہ صرف سارے بنگلہ دیش میں شور مچ جاتا بلکہ دنیا بھر کے عیسائی ممالک کے احتجاج کے باعث بنگلہ دیش کی حکومت پوری طرح حرکت میں آجاتی۔ خانقاہ کی وین سے چرچ سے واپسی پر اس بچی کا اغوا کسی شخص کی ذاتی حرکت سمجھی جاتی اور

صرف مقامی انتظامیہ ہی اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس واقع کی تفتیش کرتی۔ ہمارا منصوبہ اگرچہ کم خطرناک تھا لیکن اگر کوئی ہوشیار ضلعی حاکم کھلنا میں داخل اور باہر جانے والے دریائی راستے کی ہی ناکہ بندی کردیتا تو ہمارا بچ نکلنا محال ہوتا۔ میں اس منصوبہ بندی کو آخری ٹچ دیتے ہوئے سو گیا اور صبح کرنل مزمل کو کہا کہ میرے تھائی ساتھیوں کو باریسال سے پرسوں یہاں بلوا لے اور خواتین کہ کہہ بھیجے کہ بالکل تیاری کی حالت میں رہیں۔ انہیں کسی وقت بھی کھلنا آنا اور ہرن گھاٹا پہنچنا ہوگا۔ مزمل نے میرے کہنے پر اپنے ایک بااعتماد JCO کو بھیجا جس کے ساتھ شہر جا کر میں نے بنک لاکر سے تمام جواہرات اور رقم نکال لی۔ حالات لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہونے کے آثار تھے اور شاید بعد میں یہ ممکن نہ ہوتا کہ میں شہر جاسکوں۔

ہم نے اپنے بچاؤ کے لیے جو وقتی اقدام کیے تھے ان کے نتیجے میں ہم قدرے محفوظ تو ہوگئے تھے لیکن خطرہ پوری طرح سے ٹلا نہیں تھا۔ ایک اور مسئلہ جس کے متعلق میں نے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، یکایک سامنے آگیا۔ Monastery (خانقاہ) کی وین کو چرچ سے واپسی کے سفر کے دوران روک کر سونیا کو اٹھانے تک کا پروگرام تو ٹھیک تھا لیکن جن باتوں کو ہم نے غیردانستہ طور پر نظر انداز کردیا تھا وہ یکایک سامنے آگئیں۔ سونیا کو تو پیدائش سے پندرہ یوم کے اندر خانقاہ والوں کے حوالے کردیا گیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اس میں وہ خود کو ایک کٹر کیتھولک عیسائی اور خانقاہ میں دی گئی تعلیم کے مطابق حضرت عیسیٰ کے نقش قدم پر چل کر دنیاوی لذات سے بیزاری اور صرف اپنے مذہب کی خدمت اور تقدس کے لیے دنیا میں آئی تھی۔ ہم نے اپنے پروگرام میں اس بات کو بالکل نظر انداز کردیا تھا کہ خانقاہ کی وین سے اٹھاتے وقت سب سے زیادہ Resistance (مخالفانہ جدوجہد) سونیا نے کرنی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھانے کے لیے مہینوں کا عرصہ درکار تھا کہ وہ ایک بے غیرت مسلمان کی بیٹی ہے جسے اس کا باپ خانقاہ میں چھوڑ گیا تھا اور اس کی ماں چکمہ کی رانی ہے جو اپنی مجبوریوں کے باعث اس کی محبت اور اپنی ممتا کے جذبے کو دل میں چھپائے برسوں سے اب تک اس کے باپ کے ہاتھوں مسلسل بلیک میل ہورہی تھی اور ہم اسے خانقاہ کے اس قیدخانے سے نکال کر لے جارہے ہیں جہاں جوان ننوں کے ساتھ پادری، گاڈفادر کے بہروپ میں ایسے گھناؤنے کھیل کھیلتے ہیں کہ شرم سے انسانیت بھی منہ چھپالیتی ہے۔ سونیا اتنی چھوٹی اور معصوم بچی تھی کہ اسے خاموش رکھنے کے لیے ہم اس پر کوئی سختی بھی کرنے کو تیار نہیں تھے۔ میں خود ذاتی طور پر یہ نہیں چاہتا تھا کہ عیسائی خانقاہ کے ظاہری پرامن ماحول سے نکالتے ہوئے سونیا کو اسلام کا پہلا نمونہ جبروتشدد مار دھاڑ، گولیاں چلنے، خون خرابے کی صورت میں دیکھنا پڑے۔ عیسائیت کی بنیادی تبلیغ کہ کوئی اگر ایک تھپڑ مارے تو دوسرا گال مارنے والے کے سامنے کردو کے برعکس اسلام میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے اور آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور جان کے بدلے جان لینے کی اجازت ہے۔ اسلام میں دشمن کو معاف کرنا بھی بڑی بہادری اور نیکی سمجھا جاتا ہے لیکن اس کو دین فطرت بھی اسی لیے کہا

جاتا ہے کہ انسانی فطری جذبات کو سرے سے کچلنے سے ہی معرفت اور مذہب کی معراج نہیں ملتی بلکہ دنیاداری کے تمام تقاضے حدود میں رہ کر پورے کرنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ان تقاضوں کو پورا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ میری مشکل یہ تھی کہ سونیا کو اسلام کے مذہبی اصول اور تبلیغ سے راغب تو بعد میں کیا جانا تھا اور اسے اٹھانے کے دوران جو کارروائی ہم نے کرنی تھی اس کی وجہ سے First Impression is the Last Impression کے مطابق اس کے ناپختہ ذہن میں اسلام کے خلاف نفرت پیدا ہوجانے کا پورا احتمال تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک کار کی ضرورت تھی۔ کھلنا میں ان دنوں بمشکل پندرہ بیس موٹریں تھیں اور کوئی ایک ٹیکسی بھی نہیں تھی۔ پھر ہرن گھاٹا میں جہاز پر پہنچنے تک سونیا کی سخت نگرانی کرنی تھی تاکہ وہ شور مچا کر لوگوں کو متوجہ کرنے اور ہماری قید سے نکلنے کی جدوجہد نہ کرسکے۔ خانقاہ میں ننوں کی تربیت میں مردوں سے چھو جانا تو بڑی بات ہے، ان سے آنکھیں ملانے کی بھی سختی سے ممانعت ہے۔ ایسے سخت ماحول میں تربیت پانے والی بچی ہم مردوں کے اسے جسمانی طور پر اٹھانے کو اپنی تربیت کے مطابق ذہنی طور پر قبول نہ کرتے ہوئے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتی تھی جس میں خودکشی کی کوشش میں اس کی جان بھی جاسکتی تھی۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ سونیا کو اٹھانے کی کارروائی ہمیں دن دہاڑے کرنی تھی۔ اگرچہ ہم نے اس کارروائی کے لیے ایک نسبتاً سنسان جگہ چنی تھی لیکن پھر بھی راہ گیروں سے آمنا سامنا ہونے کا پچانوے فیصد امکان تھا۔ یہ جزئیات جن پر ہم نے پہلے توجہ نہیں دی تھی اب بہت بڑا مسئلہ بن کر سامنے آئی تھیں۔ سونیا کو اٹھانے کا پروگرام ہم نے اپنے طور پر بنایا تھا۔ کرنل مزمل پہلے ہی ہمیں پناہ دینے، قیصر اور دوسرے ساتھیوں کو بارڈر کراس کرانے میں ہماری بھرپور مدد کرنے اور تحقیقاتی ٹیموں سے ہمیں بچانے کی کوشش میں بے حد Tension میں تھا۔ اب سونیا کے مسئلہ میں اس کی مدد مانگ کر میں اسے مزید پریشانیوں میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔

چاروں طرف نگاہیں دوڑانے کے بعد مجھے مسز ڈیوڈ کا خیال آیا۔ پیسے کی اسے بے حد ضرورت تھی۔ جوانی میں ہی شوہر کی حادثاتی موت کے بعد وہ تنہا رہ گئی تھی۔ اب ڈھلتی جوانی میں اپنی جسمانی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ پیسوں کا لالچ دے کر مردوں کو اپنی جانب راغب کرتی تھی۔ وہ بے وقوف بھی نہیں تھی کیونکہ خانقاہ میں اس نے سونیا کے بازو پر پیدائشی نشان دیکھنے کے لیے فوری طور پر جو کہانی گھڑی تھی وہ کسی عام سی عورت کے بس کی بات نہ تھی۔ اپنے مذہب سے بھی اسے زیادہ لگاؤ نہ تھا ورنہ وہ خانقاہ کی اندرونی باتیں اور کہانیاں مجھے نہ سناتی۔ میں نے بہت سوچ و بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ پیسے کے زور پر مسز ڈیوڈ کو خریدا جائے اور میرے تھائی ساتھی سونیا کے ساتھ کھلنا سے روانگی تک اس کے گھر میں ٹھہریں۔ سونیا بھی مسز ڈیوڈ کی وجہ سے خود کو صرف اجنبیوں میں گھرا محسوس نہیں کرے گی اور انگریزی زبان میں مسز ڈیوڈ اسے نہ صرف دلاسہ دے گی بلکہ مختصراً اصل حقائق سے بھی اسے آگاہ کرے گی تاکہ جب ہم سونیا کو لے کر جہاز پر جائیں اور وہ اپنی ماں سے ملے تو وہ ممتا کے

جذبے سے کسی حد تک آگاہ ہو چکی ہو۔

اسی شام میں مسز ڈیوڈ سے ملنے اس کے گھر گیا۔ اس نے میرا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مسز ڈیوڈ کی آج کی شام خالی ہی جا رہی تھی۔ تنہائیوں سے اکتائی ہوئی مسز ڈیوڈ نے پرزور اصرار سے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ میں نے یہ دعوت اس لیے قبول کر لی کہ مجھے اس سے سونیا کے متعلق بہت سی باتیں کرنی اور معاملات طے کرنے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی تیسرا ہماری گفتگو میں مخل ہو۔ میں نے مسز ڈیوڈ کو کہا کہ ہماری آج کی محفل میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں ہونا چاہیے لہٰذا اگر کوئی اسے ملنے آئے تو وہ اسے باہر سے ہی رخصت کر دے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مسز ڈیوڈ بوتل اور گلاس لے آئی۔ میں نے پینے سے معذرت چاہی تو وہ اکیلی ہی پینے لگی۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ آج کی شام صرف اس کے نام ہو لہٰذا جب میں نے سونیا کی بات چھیڑی تو وہ کچھ تو نشے کے زیر اثر ہونے اور کچھ نسوانی ناز و انداز دکھاتے ہوئے بولی، ”میں تو یہ سمجھی تھی کہ تم صرف مجھ سے ملنے آئے ہو اور اسی لیے تم نے مجھے کہا تھا کہ کوئی تیسرا شخص رنگ میں بھنگ نہ ڈالے۔ بہرحال سونیا کے متعلق جو بھی کہنا چاہتے ہو، جلد کہہ ڈالو۔ پھر ہم صرف اپنی محفل سجائیں گے۔“ مسز ڈیوڈ کی باتوں سے میں سمجھ گیا کہ اس وقت اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہے کہ جو چاہوں اس سے منوا سکتا ہوں۔ میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں خود بھی آج اسی موڈ میں آیا ہوں کہ اپنی اور تمہاری تنہائیوں کو دور کروں لیکن میرے دماغ پر جو بوجھ ہے پہلے میں اس سے نجات پانا چاہتا ہوں تا کہ پھر یکسوئی سے ہم آج کی شام انجوائے کر سکیں۔ سونیا کو اٹھانے کے بعد اور ہمارے کھلنا سے جانے تک تمہارے گھر سے زیادہ موزوں مجھے کوئی اور جگہ دکھائی نہیں دیتی۔ میرے تمام ساتھی اور میں جو اس دوران تمہارے گھر میں ہی رہیں گے ہم سب سونیا کے لیے اجنبی ہیں۔ تم سے اس کی پہلے سے شناسائی اسے بہلانے میں بہت کام آئے گی۔ میرے سارے ساتھی مسلح ہوں گے اور وہ سونیا کو تمہارے گھر سے بھاگنے نہیں دیں گے اور تم اسے بہلا کر رکھو گی اور دنیا کی رنگینیوں سے آشنا کرو گی۔ اس کام کا معاوضہ تمہیں پانچ ہزار ڈالر ملے گا اور اگر تم کھلنا اور بنگلہ دیش سے اکتا چکی ہو تو میں تمہیں اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے کا بھی وعدہ کرتا ہوں جہاں تم نئے ماحول میں نئی زندگی کا آغاز کر سکتی ہو۔ ابھی تمہارے پاس خاصا وقت ہے۔ یہاں تو تم زندگی کے آخری سانس تک مسز ڈیوڈ یا ڈیوڈ کی بیوہ ہی کہلاؤ گی۔ پاکستان میں تم بنگلہ دیش اور اپنے ماضی کو بھول کر زندگی کی نئی راہوں پر چل سکتی ہو۔“ مسز ڈیوڈ نے شاید زندگی بھر اکٹھے پانچ ہزار ڈالر دیکھے بھی نہ تھے۔ اس وقت کے کرنسی ریٹ کے مطابق اتنے ڈالروں کے سوا پانچ لاکھ ٹکے ملتے تھے۔ اس نے میری خواہش کے مطابق میرا کام کرنے کی فوری حامی بھر لی۔

میں رات دو بجے کے قریب مزمل کے بنگلے پر پہنچا۔ حالانکہ میں رضی کو اپنے مسز ڈیوڈ سے

ملنے کا بتا کر گیا تھا لیکن میرے واپس پہنچنے پر رضی مجھے جاگتے ہوئے ملا اور اس نے بتایا کہ مزمل تین بار اس سے میری بخیریت واپسی کا پوچھنے آیا تھا۔ اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ گیا تھا اور وہ تھا وین سے سونیا کو اٹھا کر مسز ڈیوڈ کے گھر تک لے جانے کے لیے ٹرانسپورٹ کا حصول۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نے اگلے روز مزمل سے کہا کہ باریسال سے دو فوجی ٹرکوں میں سے ایک میں رانی اس کے لڑکے اور رضی کی بیوی کو لایا جائے اور دوسرے میں میرے ساتھیوں کو۔ تم حسب وعدہ سپیڈ بوٹ کا انتظام کرو تا کہ خواتین والا ٹرک سیدھا گھاٹ پر جائے اور بوٹ انہیں تمہارے فوجیوں کے پہرے میں ہرن گھاٹا تک لے جائے۔ دوسرے ٹرک میں میرے ساتھیوں کو لایا جائے جو یہاں مسز ڈیوڈ کے گھر قیام کریں گے۔ ہمارے لیے بھی ایک سپیڈ بوٹ چاہیے جو پہلی بوٹ کی طرح ہمیں بھی ہرن گھاٹا لے جائے۔ دونوں ٹرک رات کو کھلنا پہنچیں اور دونوں بوٹس اسی رات ہی روانہ ہوں۔ میں نے ٹرانسپورٹ کا مسئلہ بتایا تو مزمل نے کہا کہ اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ ایک فوجی ٹرک وین روکنے کی جگہ سے سو فٹ پہلے کھڑا ہو گا۔ تم اور تمہارے ساتھی سونیا کو لے کر ٹرک تک پہنچ جائیں اور جہاں کہو گے، ٹرک تمہیں چھوڑ آئے گا۔ یہ مسئلہ حل ہو گیا لیکن ایک مشکل ابھی باقی تھی جس کا کوئی حل ابھی تک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس رات میں پھر مسز ڈیوڈ کو طے شدہ معاوضے کا ایڈوانس ایک ہزار ڈالر دینے گیا اس سے دوران گفتگو یہ کہا کہ سونیا کو وین سے لے کر تمہارے گھر تک پہنچانے اور پھر یہاں اور یہاں سے ہرن گھاٹ تک پہنچانے کے دوران شور مچانے سے کیونکر باز رکھا جائے۔ مسز ڈیوڈ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی ”یہاں ایک کرسچین ڈاکٹر ہے جس نے کئی بار میری مشکلات اور بے اعتدالیوں سے مجھے نجات دلائی ہے میں اسے ابھی بلا کر لاتی ہوں۔ اس کا گھر قریب ہی ہے تم یہیں بیٹھو شاید وہ اس مشکل کا کوئی حل نکال سکے۔“ مسز ڈیوڈ تھوڑی دیر بعد ہی ڈاکٹر کے ساتھ آ گئی۔ اسے کہا کہ اگر ان کے مسئلے کا کوئی معقول حل بتائے تو یہ اس کا خاصا معاوضہ دیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ چونکہ مسز ڈیوڈ ہماری کارروائی میں خود بھی ملوث ہے اس لیے اس نے ڈاکٹر کو ساری بات نہیں بتائی ہو گی۔ ڈاکٹر نے کہا ”میں آپ کو پانچ چھ سال کی عمر کے بچے کے لیے 6 سی سی (6CC) کی بیہوشی کی دوا بنا دوں گا۔ ایک سی سی کے انجکشن سے بچہ تین سے چار گھنٹے بے ہوش رہے گا اور اس کے کوئی برے اثرات (After Effects) بھی نہیں ہوں گے۔ انجکشن لگتے ہی بچہ بے ہوش ہو جائے گا۔ چونکہ یہ کام غیر قانونی ہے لہٰذا میں ان چھ انجکشنوں کا معاوضہ ایک سو ڈالر لوں گا۔“ میں نے حامی بھر لی اور ڈاکٹر اگلے روز بعد دوپہر یہ انجکشن مسز ڈیوڈ کو دینے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ ڈاکٹر کو جانے سے پہلے میں نے سو ڈالر تھما دیے اور تھوڑی دیر بعد میں بھی مسز ڈیوڈ سے رخصت ہوا۔ ظاہری طور پر میں نے سارے مسائل کا حل ڈھونڈ نکالا تھا لیکن نادیدہ مشکلات میرے اس اطمینان پر مسکرا رہی تھیں۔

میں نے جانباز اور اس سے پہلے غازی میں بھی یہی کوشش کی ہے کہ قارئین میری ان دونوں سچی داستانوں کو جس شوق سے پڑھتے ہیں ان کو ان داستانوں کے واقعات کے ساتھ ساتھ پاکستان کے

ازلی دشمن بھارت کی سازشوں اور اکھنڈ بھارت بنانے کی کوششوں سے آگاہ کروں اور انہیں بتاؤں کہ ہمارے ہم وطنوں کو کس طرح غداری کی ترغیب دی جاتی ہے۔ قیام پاکستان سے آج تک اپنے اس ازلی دشمن کی سازشوں اور اپنوں کی غداری کے باعث ہماری بھارت سے تین جنگیں ہوچکی ہیں۔ سن 65ء کی جنگ میں جبکہ ہماری افواج نے اپنے خون سے بہادری کی وہ داستان رقم کی جس پر دنیا بھر کے فوجی مبصروں نے دانتوں میں انگلیاں داب لیں اور اپنے سے پانچ گنا عددی برتری رکھنے والے بھارت کے غیراعلانیہ جنگ شروع کرنے اور بھارتی کمانڈر انچیف جنرل چوہدری کی چھ ستمبر کی شام کا پیگ لاہور جم خانہ میں پینے اور تین روز میں پاکستان کو فتح کرنے کی بڑ ہانکنے کو ان کے لیے ایک بھیانک خواب بتا دیا اور UNO میں بھارتی نمائندے کا بار بار یہ کہنا کہ ''ہم ابھی اور اسی وقت جنگ بند کرنے کو تیار ہیں۔'' اور مکمل شکست سے بچنے کے لیے تاشقند میں پاکستان سے جنگ بندی کا معاہدہ ہونے کی خوشی میں بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری کا خوشی سے ہارٹ فیل ہوگیا۔ اس کے مرنے کے بعد اندرا گاندھی وزیراعظم بنی تو اس نے اپنے خارجہ سیکریٹری ڈی۔ پی۔ دھر کو خصوصی طور پر سپین بھیجا کہ وہاں کی لائبریریاں کھنگالے اور ان وجوہات پر مبنی مفصل رپورٹ تیار کرے جن کے باعث مسلمانوں کے سپین فتح کرنے اور تقریباً سات سو سال اس وسیع سلطنت پر دھڑلے سے حکومت کرنے کے بعد سو سال سے بھی کم عرصہ میں اس بری طرح سے خاتمہ ہوا کہ آج پورے سپین میں کوئی ایک بھی مسلمان اس کی شہریت کے حقوق نہیں رکھتا۔ ڈی۔ پی دھر نے چھ ماہ کی محنت و کاوش کے بعد جو رپورٹ تیار کی اس کو Rise and Fall of Muslims in Spain (سپین میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان) کا عنوان دیا گیا۔ اس رپورٹ کے مطابق سپین کی وسیع سلطنت کے حکمرانوں کے بیسیوں بیٹے ہوتے تھے جن میں سے ولی عہد ایک ہوتا اور دوسرے بیٹوں کو سلطنت میں پھیلے بیسیوں قلعے اور ان سے منسلک بہت بڑے رقبے دیے جاتے۔ یورپی ریاستیں جو سپین کی اسلامی سلطنت کا نام سنتے ہی تھرتھر کانپتی تھیں، ان قلعہ دار شہزادوں کو شراب اور شباب مہیا کرکے اور انہیں یہ احساس دلاکر کہ انہیں ولی عہد نہ بنا کر ان کی حق تلفی کی گئی ہے۔ ان کو ایک ایک کرکے وفاق سے علیحدہ کرنے اور اپنی آزاد ریاستیں قائم کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ وفاق کمزور ہوتا گیا اور ان ننھی منی آزاد ریاستوں کے حکمران شہزادے شراب و شباب کے نشے میں ایسے غرق ہونے کہ جب نشہ اترا تو عیسائی ریاستوں کے حکمرانوں کی ریشہ دوانیوں سے نہ تو وفاق باقی بچا تھا اور نہ ہی یہ ننھی منی ریاستیں اپنا وجود برقرار رکھ سکیں اور آج سپین میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت، عظمت اور شان و شوکت کے صرف قصے ہی باقی بچے ہیں یا غرناطہ کی وہ عظیم الشان مسجد جسے میوزیم اور لائبریری بنادیا گیا ہے اور جہاں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے صدیوں بعد اذان دی تھی۔ اندرا گاندھی نے بعین وہی طریقہ اپناتے ہوئے، مغربی پاکستان کے ون یونٹ کے پاکستانی غدار لیڈروں کے ہاتھوں حصے بخرے کروائے۔ یحیٰی خان جیسے شرابی کبابی اور عیاش صدر کے گرد جنرل رانی، ترانہ اور بلیک بیوٹی جیسی غدار

عورتوں کا حصار قائم کیا اور بڑی کاوش سے دو ''عظیم محبّ وطن'' پاکستانی لیڈر ڈھونڈے۔ مشرقی پاکستان میں مجیب اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو۔ الیکشن کے بعد اپنے اقتدار کے حصول پر دونوں اتنے مصر رہے کہ جب کوئی بھی فیصلہ نہ ہوسکا تو ''ادھر ہم ادھر تم'' کا نعرہ لگا کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کو دولخت کر دیا۔ قارئین! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ کیا یہ دونوں لیڈر قوم اور وطن کے غدار اور بھارت کے پے رول پر نہیں تھے؟ مشرقی پاکستان میں بھارت نے فوجی مداخلت کرکے پاکستانی افواج کے رسد کے تمام راستے کاٹ کر ان سے ہتھیار رکھوائے۔ ادھر مغربی پاکستان میں پاکستانی افواج کو سختی سے پابند کیا گیا کہ بھارتی علاقے میں ہرگز داخل نہ ہوں۔ لہٰذا پاکستان کا فرسٹ آرمڈ ڈویژن دوران جنگ چھانگا مانگا کے جنگلوں میں پکنک مناتا رہا اور اس جنگ کا انجام مشرقی پاکستان میں سقوط ڈھاکہ اور نوے ہزار پاکستانی فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے اور مغربی پاکستان میں پانچ ہزار مربعہ میل علاقہ بھارت کے حوالے کرنے سے ہوا۔ کشمیر میں سیز فائر لائن پر بھارتی فوجی سٹریٹجی کے لیے موزوں علاقے اس کے حوالے کرکے نئی حد بندی کو کنٹرول لائن کا نام دے دیا گیا۔ یہ ایک منطقی بات ہے کہ ایک دوسرے کی مخالف دو قوتوں بیک وقت صحیح راستے پر نہیں ہوسکتیں۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت مجیب مغربی پاکستان میں قید تھا اور اس وقت کے بنگلہ دیشیوں کے اس ''عظیم لیڈر'' کی جاں بخشی اور رہائی کے عوض پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے باعزت سودے بازی کرسکتا تھا لیکن بھٹو صاحب نے اپنے اس ساتھی کو غیرمشروط طور پر رہا کر دیا۔ تمام اسلامی ممالک نے بنگلہ دیشی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا جن کے تیل اور دولت کی مدد کے بغیر بنگلہ دیشی حکومت ہرگز قائم نہ رہ سکتی تھی۔ بنگلہ دیش کو اسلامی ممالک میں سب سے پہلے پاکستان کے سول مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو نے تسلیم کیا لہٰذا تیل کی دولت سے مالا مال مسلم ممالک کو جن کی بنگلہ دیش سے اپنی کوئی مخالفت نہ تھی، اسے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہی۔ اب آگے سنیے۔ پاکستان کے نوے ہزار فوجی بھارت کی قید میں تھے۔ ہندو بنیادی طور پر کنجوس ہے۔ نوے ہزار پاکستانی جوانوں اور افسروں کی خوراک اور انہیں قید میں رکھنے کے انتظامات پر بے تحاشہ اٹھنے والے خرچ پر بھارت بے حد پریشان تھا۔ پھر دنیا بھر کے ممالک کے لعن طعن سے مجبور ہوکر جب بھارت پاکستانی قیدیوں کو خود ہی چھوڑنے والا تھا اس وقت بھٹو صاحب نے بار بار شملے اور مری جاکر بالآخر ذلت آمیز شرائط پر شملہ معاہدہ کرلیا جس کی سزا خصوصاً کشمیر کے مسئلہ پر ہم پاکستانی اور کشمیری بھائی (مسئلے کا حل صرف دوطرفہ بات چیت سے حل کرنا) آج تک بھگت رہے ہیں۔ یہ دونوں غدار وطن تھے اور بالآخر اپنے عبرتناک انجام کو پہنچے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ فوج اندرون ملک غداروں کو کبھی نہیں بخشتی۔ اسے میں تو محض اتفاق نہیں بلکہ اللہ پاک، جو ہر شے پر قادر ہے، کی طرف سے ایک وارننگ سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں ''سربراہانِ مملکت'' اپنے ہی مقرر کردہ جن آرمی چیف آف سٹاف کے ہاتھوں اپنے عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے ان دونوں کے نام ضیاء الحق اور ضیاء الرحمٰن تھے۔ حق اور رحمان اللہ پاک کے اسمائے

حسنیٰ ہیں اور ضیا (روشنی) اگر رحمت ہو تو نور اور اگر قہر ہو تو بجلی بن کر گرتی ہے۔

قارئین! جانباز تحریر کرنے سے میرا مقصد آپ کو صرف تفریحی دلچسپی مہیا کرنا ہی نہیں بلکہ ان اندوہناک واقعات کو جو پاکستانی قوم کے دلوں سے محو ہو چکے ہیں اور خصوصاً جن سے نئی پود ناآشنا ہے، انہیں پھر سے یاد دلانا اور اپنے ازلی دشمن کی پہچان کرانا ہے جس کے الیکٹرانک میڈیا کے زی، سونی اور نامعلوم کون کون سے چینل ہماری قوم اور خصوصاً نوجوان پود کو اپنے اسلاف کے کارناموں اور ''بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے والوں'' کو ان کے دلوں سے دور کر کے مادھوری ڈکشٹ کے ڈانس اور ایشوریا رائے کے حسن کے جال میں پھانس رہے ہیں۔ ہمارے اندرون ملک غداروں اور وطن فروشوں کی بھی کمی نہیں۔ لسانیت، صوبائیت اور مذہبی اور مسلکی فرقوں کے لاتعداد جالوں میں پھانس کر ان وطن دشمنوں نے اس عظیم قوم کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ آج جس پاکستانی سے بھی پوچھیں تو پہلے وہ پٹھان ہے، پنجابی ہے، سندھی ہے، مہاجر ہے یا بلوچ ہے لیکن خود کو کوئی پہلے پاکستانی نہیں کہتا۔ یہی حال مذہبی فرقوں کا ہے۔ ایک اللہ، ایک رسول اور ایک قرآن مجید فرقان حمید کو ماننے والے پاکستانی مسلمانوں مختلف مسلکوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور ان کے شر سے نہ مسجدیں محفوظ ہیں اور نہ ہی امام بارگاہیں۔ سب خود کو مسلمان کہتے ہیں لیکن اپنے وطن میں ہم مذہبوں کا خون بہانے میں انہیں ذرا بھی عار نہیں۔ کیا اسلام نے انہیں یہی سبق سکھایا ہے؟ اسلام (سلامتی) کے یہ پیروکار کس منہ سے خالق حقیقی کے سامنے جائیں گے۔ جو کچھ ہنود و یہود سے نہ ہوسکا وہ کام یہ مذہبی جنونی انجام دے رہے ہیں۔ خدارا آنکھیں کھولیں اور اپنے گرد و پیش دیکھیں۔ کشمیر، عراق اور چیچنیا اور بوسنیا میں کن کا خون بہہ رہا ہے۔ ہم وہاں کے مسلمانوں کے خون ناحق پر تو آنسو بہاتے ہیں لیکن اپنے ملک میں جب ایک مسلمان گمراہ کن تقاریر کے زیر اثر دوسرے بے گناہ مسلمان کو قتل کرتا ہے تو ہمارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کیا کشمیر، عراق، بوسنیا اور چیچنیا میں صرف ایک ہی مسلک کے مسلمان ہیں؟ جی نہیں وہاں بھی علماء سو نے بے بنیاد فرقوں میں مسلمانوں کو تقسیم کر رکھا ہے لیکن ہمیں ان کے مختلف فرقوں سے تعرض نہیں۔ وہاں کے سب فرقوں کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم اور خون ناحق پر ہم واویلا کرتے ہیں لیکن کیا اپنے وطن میں بھی ہماری سوچ کا یہی انداز ہے؟ خدارا آپس کی نفرتوں اور تفرقہ بندیوں کو چھوڑیں۔ ہم جب تک ایک وحدت نہیں بنیں گے اور جب تک ہم ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب کو ماننے والوں کو اپنے سگے بھائی کی طرح عزیز نہیں سمجھیں گے تب تک ہنود و یہود اور صیہونیت کے ظلم و ستم کی تلوار ہمارے سروں پر لٹکتی رہے گی۔ کشمیر، افغانستان، عراق اور چیچنیا بھی اسی دنیا کے ممالک ہیں۔ آپس کے لڑائی جھگڑوں نے ہمیں اتنا کمزور کر دیا ہے کہ ہمارا بھی ان جیسا حشر ہوسکتا ہے۔ چودہ کروڑ پاکستانیوں کے اس ملک پر دنیا بھر میں ہمارے مخالف ممالک (خصوصاً ہمارے ایٹمی طاقت بننے کے بعد) ہمیں مٹانے کے درپے ہیں۔ اگر ہم اب بھی نہ سنبھلے تو کہیں ہم بھی سپین میں مسلمانوں کی حکومت اور شان و

شوکت کی طرح کا قصہ پارینہ بن کر ہی نہ رہ جائیں اور غرناطہ کے محلات کی طرح صرف ''رائے ونڈ میں جاتی امرا کے محلات'' ہی سیاحوں کی سیرگاہ کے لیے باقی رہ جائیں اور ہماری داستان بھی نہ ہو داستانوں میں۔

میں رات دس بجے کے قریب کرنل مزمل کے گھر پہنچا تو وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ بھارتی قصبے شانتی پور سے قیصر کا فون آیا ہے۔ اس کے ساتھی ایک دکان سے خریداری کر رہے تھے اور وہ دکان کے باہر کھڑا تھا۔ رائفلیں اور چھوٹے ہتھیار بھی ان کے پاس تھے کہ چند پولیس والے شہر میں معمول کی گشت کرتے ہوئے اس دکان کے پاس آئے۔ اس کے ساتھی اس وقت دکان سے باہر نکل رہے تھے۔ چونکہ بھارت میں کسی شہری کا سرعام اسلحہ لے کر چلنا خلاف قانون ہے لہٰذا پولیس والوں نے انہیں روک کر اسلحے کے متعلق پوچھا۔ ان کے پاس تو اسلحے کے لائسنس بھی نہیں تھے۔ کوئی معقول جواب نہ دے سکنے پر پولیس والوں نے انہیں اپنے ہمراہ تھانے لے جانا چاہا۔ لڑکوں نے مزاحمت کی اور ایک لڑکے نے اچانک اپنا ریوالور نکال کر پولیس پر فائرنگ کر دی جس سے ایک سپاہی شدید زخمی ہوگیا۔ بازار میں لوگوں نے گھیرا ڈال دیا اور پولیس والوں نے سب پر قابو پا کر اسلحہ چھین لیا اور انہیں تھانے لے گئے۔ سپنا اور قیصر چونکہ باہر کھڑے تھے لہٰذا وہ حراست سے بچ گئے اور تھانے تک ان کا پیچھا کر کے وہاں سے سیدھا ٹیلی فون آفس گئے اور رمیش نام سے کال بک کی اور تمام واقعہ مزمل کو بتایا۔ میرے موجود نہ ہونے کے باعث قیصر نے کہا کہ جب تک اس کا مجھ سے رابطہ نہ ہوگا وہ ٹیلی فون آفس میں ہی رہے گا کیونکہ ٹیلی فون آفس کا فون نمبر اس نے لکھوایا ہے۔ مزمل نے کہا کہ قریب پانچ بجے شام اسے قیصر کی کال موصول ہوئی تھی اور بقول قیصر کے دو گھنٹے قبل اس نے یہ ارجنٹ کال بک کی تھی۔ پہلے تو صرف مزمل کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں لیکن اب میری حالت بھی اس جیسی ہوگئی۔ سونیا کو اٹھانے کی سب تیاریاں مکمل تھیں۔ کھلنا سے روانگی کا بھی محفوظ اور معقول انتظام ہو چکا تھا۔ میں ان انتظامات سے خاصا مطمئن تھا کہ یکایک یہ نئی افتاد پڑ گئی جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ میں نے تھوڑی دیر مزمل سے صلاح و مشورہ کے بعد شہر کے ٹیلی فون آفس سے قیصر کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ مزمل کا فوجی ڈرائیور مجھے ٹیلی فون آفس لے گیا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے جب میں نے شانتی پور ٹیلی فون آفس میں ''رمیش'' کے لیے لائٹنگ ارجنٹ کال بک کی۔ مجھے آدھے گھنٹے میں ہی کال مل گئی کیونکہ میرے ساتھ باوردی فوجی حوالدار تھا۔ میں نے رمیش (قیصر) کو کہا کہ وہ اس مشکل اور مصیبت کا حوصلے سے مقابلہ کرے۔ ''تم لوگ بھارتی شہری ہو۔ ساتھیوں کے مذہب کے متعلق پولیس والے اب تک سب جان چکے ہوں گے۔ تم کسی طرح تھانیدار کو رشوت دے کر اس بات پر راضی کرو کہ وہ ساتھیوں پر جسمانی تشدد نہ کرے اور اسے یہ کہو کہ ان گرفتار لوگوں کے لواحقین چار پانچ روز میں یہاں پہنچ جائیں گے اور تم سے مالی معاملہ طے کر لیں گے لہٰذا ان کی FIR ان کے لواحقین کے

آنے تک نہ کاٹے۔ اگر ان کے لواحقین تم کو مطمئن نہ کرسکے تو پھر جو جی میں آئے کرنا۔ اپنا ان سے کوئی تعلق ظاہر نہ کرنا سوائے اس کے کہ یہ بھی تمہاری طرح یو۔پی کے رہنے والے ہیں۔ فوری پیسہ ملنے اور مزید بہت زیادہ ملنے کے لالچ میں تھانیدار یقیناً تمہاری بات مان جائے گا۔ کسی مناسب ہوٹل میں جہاں ٹیلی فون کی سہولت مہیا ہو، قیام کرنا اور ہر شام سات بجے مزمل کے نمبر پر ہی مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ کرکے روز کی صورت حال سے آگاہ کرنا۔ یہاں ہمارا سب کام بالکل تیار ہے۔ اسے نبٹا کر میں جلد از جلد تم تک پہنچتا ہوں اور انشاء اللہ لڑکوں کو حراست سے چھڑالیں گے''۔ ٹیلی فون پر قیصر کو تسلی دے کر میں مزمل کے گھر لوٹ آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی قیصر کا پھر فون آیا اور اس نے شانتی پور کے ایک ہوٹل کا نمبر بتاتے ہوئے کہا کہ اس نے کنگ ہوٹل میں کمرہ لے لیا ہے اور اب وہ تھانے جارہا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ روپیہ بڑے بڑوں کو خرید سکتا ہے۔ تھانیدار کو ایک ہزار ڈالر دینا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پالتو کتے کی طرح تمہارے سامنے دم ہلانے لگے گا۔ میں یہاں کا کام مکمل ہوتے ہی تمہاری طرف روانہ ہوجاؤں گا۔

مزمل ٹیلی فون پر میری گفتگو سن رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اچانک پڑنے والی افتاد کے باعث میرے طے شدہ پروگرام میں کچھ تبدیلی ہوگی۔ سونیا کو اٹھانے کے بعد اسے رانی، اس کے لڑکے، رضی کی بیوی اور حمید کے ہمراہ ہرن گھاٹا لے جانے کے لیے میرے تین تھائی ساتھی بھی ان کے ہمراہ جائیں گے اور بقیہ تین ساتھی، رضی اور میں شانتی پور جائیں گے۔ مزمل کو میں نے کہا ''قیصر اور اس کے ساتھیوں نے مجھ سے دوستی کی حدود کو بھی پار کر دیا ہے۔ وہ مجھے اتنے عزیز ہیں کہ اگر مجھے انہیں رہائی دلانے کے لیے اپنی جان بھی دینی پڑی تو ہرگز دریغ نہ کروں گا۔ ایک بار نہیں بلکہ درجنوں بار قیصر اور اس کے ساتھی بغیر کسی لالچ کے میرے اور موت کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہوئے۔ آج ان پر میری وجہ سے مشکل آن پڑی ہے تو میں ان کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔'' مزمل چند لمحے سوچتا رہا اور بولا ''دوست! چٹاگانگ میں میری تمہاری ملاقات اور دوستی بہت مختصر عرصے تک رہی۔ اسی مختصر مدت کے تعلقات کے ناطے تم نے محض ہماری ضرورت کے لیے وہ کام کیا جو تمہارے آنے سے پہلے صرف ہماری دلی آرزو سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ تمہارے دل میں قیصر کے لیے جو جذبات ہیں ویسے ہی میرے اور میرے ساتھی افسروں کے دل میں تمہارے لیے ہیں۔ تمہاری اس مشکل میں ہم تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے، میرے انتہائی وفادار اور قابل اعتماد تین فوجی جن میں ایک JCO بھی ہے اور وہ کھلنا میں پہلے بھی تمہیں مل چکے ہیں، سویلین لباس میں مسلح ہوکر تمہارے ساتھ شانتی پور جائیں گے۔ بھارت سے ان کو بھی بے حد نفرت اور عداوت ہے۔ تمہاری کمانڈ میں وہ تمہارا ہر حکم بجالائیں گے اور تمہارے ساتھیوں کو چھڑوانے میں اپنی جانوں کی بھی پرواہ نہ کریں گے۔'' مزمل کی ان باتوں سے مجھے بڑی تقویت پہنچی۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ شانتی پور میں ساتھیوں کو چھڑوانے کے بعد انہیں بجائے وہیں سے خشکی کے راستے دہلی اور دارجلنگ بھیجنے کے ہم انہیں شانتی پور سے قریب ہی رانا گھاٹ کے راستے واپس بنگلہ دیش میں لے آئیں اور ہرن گھاٹا

سے اسٹیمر پر پہلے ہوڑا (Haora) کلکتہ کے ساحل پر انہیں اتار کر پھر بنکاک جائیں گے۔ ہمارے گروپ میں صرف رضی ہی بنگالی زبان جانتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہم ساتھیوں کو تو چھڑوالیں لیکن ان کا اسلحہ ہمیں شاید واپس نہ مل سکے۔ اب تین مسلح بنگالی زبان جاننے والے فوجیوں کے ہمراہ ہونے سے نہ صرف ہماری نفری بلکہ اسلحے کی کمی بھی پوری ہوجاتی تھی اور واپس بنگلہ دیش کے سفر میں بھی ان کی وجہ سے ہمیں خاصی سہولت مل سکتی تھی۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ جب تک ہم شانتی پور نہ پہنچ جائیں، میں اپنے تھائی ساتھیوں اور رضی کو قیصر اور اس کے ساتھیوں کے مصیبت میں گھرنے کے متعلق کچھ نہ بتاؤں کیونکہ عین ممکن ہے کہ خن سا اور عمر خان کے بھیجے ہوئے یہ لوگ جنہیں صرف میری مدد کرنے اور رانگا ماٹی تک جانے اور وہاں سے واپس آنے کا حکم دیا گیا تھا شائد بھارت میں قیصر اور اس کے ساتھیوں کو درپیش افتاد سے نکالنے کے لیے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگانے سے انکار کردیں۔

مقررہ وقت پر مزمل کے باریسال بھیجے ہوئے دونوں ٹرک رانی، اس کے لڑکے اور اور رضی کی بیوی اور حمید کو ایک ٹرک میں اور دوسرے ٹرک میں تھائی ساتھیوں کو لے کر کھلنا پہنچ گئے۔ رانی والا ٹرک تو سیدھا گھاٹ کے اس مقام پر گیا جہاں تین مسلح فوجی (JCO اور دو جوان جنہوں نے ہمارے ساتھ شانتی پور بھی جانا تھا) ایک بڑی لانچ میں ان کے منتظر تھے۔ میں بھی مزمل کی جیپ میں وہیں پہنچ گیا۔ لانچ کے کپتان اور فوجیوں کو پہلے ہی ہرن گھاٹا پر اسٹیمر کے متعلق بریف کیا جاچکا تھا۔ میں نے رانی کو کہا کہ وہ اسٹیمر پر ہمارا انتظار کرے چاہے کتنے دن ہی لگ جائیں۔ سونیا بھی بہت جلد ان تک پہنچ جائے گی۔ انہیں روانہ کرکے میں مزمل کے گھر آیا۔ اس کے گھر کے قریب ہی تھائی ساتھیوں والا ٹرک کھڑا تھا۔ اسی ٹرک میں انہیں لے کر میں مسز ڈیوڈ کے گھر پہنچا۔ وہ سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگایا اور تھائی ساتھیوں کو اس کے حوالے کیا۔ ان کے لیے مسز ڈیوڈ نے دو کمرے پہلے ہی سے تیار کر رکھے تھے اور کھانا بھی تیار تھا۔ اس وقت رات کے اڑھائی بج رہے تھے جب ہم مسز ڈیوڈ کے گھر پہنچے۔ مسز ڈیوڈ نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے گھر کے سامنے کے دروازے کو تالا لگادیا ہے اور اب عقبی دروازے کو استعمال کیا جائے گا۔ اس نے یہ حفاظتی انتظام اس لیے کیا تھا کہ اس کے پاس وقت بے وقت آنے والے دوستوں اور احباب کو یہ پتہ نہ چل سکے کہ چند اجنبی اس کے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مسز ڈیوڈ نے مجھے بتایا کہ اس نے بھی اپنا ضروری سامان پیک کرلیا ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہی پاکستان جائے گی۔ میں نے اسے کہا کہ خوب سوچ کر اور ہر پہلو کو دیکھتے ہوئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے کیونکہ ایک بار پاکستان جاکر اس کا واپس لوٹنا ناممکن ہوگا۔ اس نے جواب دیا کہ یہ اس کا قطعی فیصلہ ہے اور اگر اس میں کوئی رکاوٹ ہوئی تو وہ صرف میرے اسے اپنے ہمراہ نہ لے جانے کے باعث ہوگی۔ مجھے بھی کھلنا سے ہرن گھاٹا میں اسٹیمر تک پہنچنے اور پھر اسٹیمر کے سفر کے دوران اور آئندہ پاکستان میں بھی سونیا کو سمجھانے اور شور مچانے اور بھاگنے کی کوشش سے باز رکھنے کے لیے مسز ڈیوڈ کی ضرورت تھی کیونکہ اپنی رانی ماں سمیت ہم سب

اس کے لیے اجنبی تھے۔ صرف مسز ڈیوڈ ہی سے اس کی پہلے سے تھوڑی سی واقفیت اور صورت آشنائی تھی اور وہی اسے سمجھانے اور رام کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوسکتی تھی۔ مسز ڈیوڈ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر اسے بیہوشی کی دوا اور سرنج دے گیا ہے۔ یہ دوا کی خون کی نس میں لگانے والی تھی۔ ڈاکٹر نے ہماری ضرورت کے پیش نظر اپنی جانب سے کلوروفارم سے بھری ایک بوتل بھی دی تھی جسے رومال پر چھڑک کر اور رومال ناک پر لگانے سے چند سیکنڈوں میں بیہوش کیا جاسکتا تھا۔ سونیا کو وین سے اتارتے وقت ہمارے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ اس کی خون کی نس تلاش کرتے لہٰذا میں نے اس وقت کلوروفارم سے سونیا کو بیہوش کرنے کا فیصلہ کیا۔

کرنل مزمل کے گھر مجھے پہنچتے پہنچتے صبح کے چار بج چکے تھے۔ میں باوجود کوشش کے سونہ سکا۔ میرا دل و دماغ اس وقت دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک حصے میں سونیا کے حصول میں کامیابی اور اسے بخیریت اسٹیمر تک پہنچانے کا خیال تھا اور دوسرے حصے میں قیصر اور اس کے ساتھیوں کو اس ناگہانی مصیبت سے نکالنے کی مختلف ترکیبیں اور ان میں کامیابی کے امکانات کی سوچ۔ ان خیالات میں گھرا ہوا میں بھلا کیونکر سوسکتا تھا۔ صبح آٹھ بجے جب مزمل کا ملازم ناشتہ لے کر آیا تو میں بدستور جاگ رہا تھا۔ ناشتے کے ساتھ تیز چائے کے دو کپ پینے سے طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ دو گھنٹے کی نیند لینے کے بعد میں اٹھ بیٹھا اور نہا دھوکر اور تازہ دم ہوکر مسز ڈیوڈ کے گھر کے لیے روانہ ہوا۔ مجھے بہرحال شام سات بجے قیصر کے فون کا مزمل کے گھر پر انتظار کرنا تھا۔ کل ہمارا سونیا کے لیے ایکشن ڈے تھا اور کل رات کو ہی سونیا کو تین تھائیوں اور تین فوجیوں کے ہمراہ ہرن گھاٹا بھیجنا تھا۔ اب تو مسز ڈیوڈ نے بھی شریک سفر ہونا تھا۔ میں نے مسز ڈیوڈ کو کہا کہ اگر پروگرام کے مطابق سب ٹھیک رہا تو کل رات دس بجے اسے سونیا اور میرے ساتھیوں کے ہمراہ ہرن گھاٹا کے لیے روانہ ہونا ہے لہٰذا اپنی مکمل تیاری کرلے۔ تھائی ساتھیوں کو بھی میں نے سب پروگرام سمجھادیا اور سختی سے ہدایت کی کہ کسی بھی صورت میں گولی نہ چلائیں اور پروگرام کے مطابق تین تھائی تین فوجیوں اور حمید کے ساتھ سونیا اور مسز ڈیوڈ کو لے کر ہرن گھاٹا میں ہمارے منتظر اسٹیمر پر جائیں گے اور نمبر ٹو اور دو ساتھی میرے ہمراہ ایک چھوٹے سے مشن کے لیے اگلے روز جیسور سے کچھ آگے درسنا کے قریب بھارتی حدود میں جائیں گے۔ کسی نے اس پروگرام پر اعتراض نہیں کیا۔ نمبر ٹو نے مجھ سے پوچھا کہ اب کیا مشن ہے تو میں نے مختصراً جواب دیا۔ ”اگر تم یا تمہارے ساتھی میرے لیے کسی مصیبت میں گرفتار ہوجاؤ تو کیا تم مجھ سے توقع رکھتے ہو کہ میں آپ لوگوں کو مصیبت میں گرفتار چھوڑ کر چلا جاؤں گا؟“

تیرھواں باب

مجھے اپنے ساتھیوں کا حال تو معلوم نہ تھا لیکن میری اپنی حالت ماضی میں انجام دیے گئے مشنوں سے قبل کی حالت سے قطعاً برعکس تھی۔ ماضی میں مشنوں کے ایکشن ڈے سے قبل میری ایک دو راتیں جاگتے گزرتی تھیں اور مشن میں کامیابی یا ناکامی کی سوچ سے میں بے چین رہتا تھا لیکن اس رات میں بھرپور نیند سویا اور صبح جب اٹھا تو بالکل تروتازہ تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ شاید یہ تھی کہ ایک کے بعد ایک مسلسل خطرات سے کھیلتے ہوئے میری ذہنی حالت اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں ڈر، خوف اور جان جانے کا خدشہ بے معنی ہوجاتا ہے۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہوگئیں کہ مصداق میں اب ایسے حالات کا عادی ہوچکا تھا۔ ایک پریشانی ختم نہیں ہوتی تھی کہ دوسری نازل ہوجاتی تھی۔ قیصر، اس کے ساتھیوں اور کلپنا کو بارڈر کراس کروا کے میں ان کی طرف سے مطمئن ہوچکا تھا اور اب صرف سونیا کو اٹھانے اور اسٹیمر کے ذریعے بنکاک اور پھر پاکستان جانے کے سوا کوئی دوسرا مسئلہ درپیش نہ تھا کہ اچانک قیصر کے ٹیلی فون سے صورتِ حال یک لخت بدل گئی۔ اب مجھے سونیا کو اسٹیمر پر چھوڑنے کے بعد پھر بھارت کا بارڈر کراس کرنا اور پولیس کی حراست سے قیصر کے ساتھیوں کو چھڑوانا تھا۔ میں بھارت میں پہلے ہی وانٹڈ (Wanted) تھا اور بھارتی اخبارات میں میر لاکھوں کی تعداد میں تصویریں شائع ہوچکی تھیں اور مجھے زندہ یا مردہ پیش کرنے پر انعام تھا اور اب یہ میرا قطعی فیصلہ تھا کہ کچھ بھی ہو اور صورت حال کتنی ہی خطرناک کیوں نہ ہو میں شانتی پور جاکر اپنے ساتھیوں کو چھڑوانے کی پوری کوشش کروں گا چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

گرجے میں مذہبی تقریب سہ پہر چار بجے تھی۔ کرنل مزمل نے ٹرک کا انتظام کردیا تھا۔ میں دوپہر دو بجے ہی مسز ڈیوڈ کے گھر ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ پروگرام کے مطابق تین تھائی ساتھیوں نے

مسز ڈیوڈ اور سونیا کے ساتھ اسٹیمر پر ہی رہنا تھا اور میرے نمبر ٹو، رضی اور دو تھائیوں نے اسٹیمر تک لے جانے والی بڑی سپیڈ بوٹ میں میرے ساتھ ہی واپس کھلنا آنا اور پھر درسنا کے بارڈر سے بھارت میں داخل ہونا تھا۔ مسز ڈیوڈ نے بوٹ میں محدود جگہ ہونے کے باعث صرف دو سوٹ کیس تیار کیے تھے۔ تھائی ساتھیوں نے بھی اپنا غیر ضروری سامان مسز ڈیوڈ کے گھر پر ہی چھوڑنا مناسب سمجھا جسے ہم بھارت سے واپسی پر اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے۔ تمام تیاری مکمل کر کے ہم ساڑھے تین بجے ہی خانقاہ کی وین کے واپسی کے راستے پر پہلے سے منتخب نسبتاً سنسان جگہ پر پہنچ گئے۔ چار بجے مزمل کا بھیجا ہوا فوجی ٹرک بھی آگیا جسے ہم نے وین کو روکنے کے مقام سے تقریباً ساٹھ میٹر دور رکنے کا کہا۔ اس ٹرک میں بھی وہی تینوں فوجی تھے جنھوں نے ہمارے ساتھ اسٹیمر تک اور پھر واپس آکر بھارت میں شانتی پور جانا تھا۔ اس وقت تو یہ یونیفارم پہنے ہوئے تھے لیکن بھارت میں انھوں نے سویلین لباس میں جانا تھا۔ میں نے لمبی کیلوں کے بنے ہوئے Tyre Bursters (ٹائر پھاڑنے والوں) کے ناکام ہونے کی صورت میں نمبر ٹو اور رضی کی جس کا نشانہ بہت اچھا تھا، یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ سڑک پر کیل پھینکنے کے مقام سے تیس فٹ آگے پوزیشن لے کر بیٹھ جائیں اور اگر کیلوں سے وین کے ٹائر نہ پھٹے تو وہ فائرنگ سے اس کے ٹائر پھاڑ دیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق وین کے رکنے اور ہمارے سونیا کو لے کر ٹرک تک جانے میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ صرف ہونے تھے۔ اس دوران اگر کوئی دوسری گاڑی اس سڑک پر دکھائی دیتی اور وین کے قریب رکتی تو دو تھائیوں نے ڈرائیور سے اس کی گاڑی کی چابی لینی تھی۔ ہمیں یہ بھی احتیاط کرنی تھی کہ فوجی ٹرک سے ہم اغوا کنندگان کا کوئی تعلق دکھائی نہ دے اس لیے ہم نے ٹرک کو اس جگہ کھڑا کیا تھا جہاں سڑک ''L'' ٹرن لے کر مڑتی تھی۔ فوجی JCO نے مجھے بتایا کہ سپیڈ بوٹ ایک طے شدہ مقام پر پانچ بجے بالکل تیار حالت میں موجود ہوگی۔ اب نئے پروگرام کے مطابق ہمیں سونیا کو لے کر پہلے مسز ڈیوڈ کے گھر جانا اور پندرہ منٹ میں ہی مسز ڈیوڈ اور سامان کو لے کر سیدھے گھاٹ پر جانا تھا۔ مسز ڈیوڈ نے مجھے بتایا تھا کہ چرچ میں مذہبی تقریب زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں ختم ہوجائے گی۔ یعنی چھ اور ساڑھے چھ کے درمیان وین نے خانقاہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ہم اب پوری طرح سے تیار سڑک کے دونوں جانب وین کی واپسی کے انتظار میں تھے۔ ہماری اصل بے چینی اب شروع ہوئی۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ گزارنا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں نے کیلوں کے آدھے سیٹ ایک تھائی ساتھی کو دیے جو سڑک کے دوسری جانب میرے مقابل کھڑا تھا۔ ہم سے ساٹھ میٹر کے فاصلے پر L ٹرن سے گزر کر وین ہمیں دکھائی دینی تھی اور وین کو دیکھنے کے بعد ہم نے کیلوں کے سیٹ سڑک پر پھینکنے تھے۔ شام چھ بجے ڈھلتے سورج کی روشنی درختوں کے باعث خاصی کم ہوجاتی تھی اس لیے مجھے یہ بھی خیال رکھنا تھا کہ ہم کسی غلط گاڑی کو نہ روک بیٹھیں۔ کھلنا میں بہت کم گاڑیاں تھیں۔ خانقاہ کی وین کا رنگ سیاہ تھا جسے صرف میں نے ہی ایک بار دیکھا تھا۔ ساٹھ میٹر دُور سے گاڑی کا نمبر پڑھنا ناممکن تھا اس لیے مجھے صرف اپنی

یاداشت پر بھروسہ کرنا تھا۔

میں نے وقت گزاری اور اس سڑک پر ٹریفک کا لوڈ دیکھنے کے لیے آنے جانے والی تمام گاڑیوں اور سائیکل رکشاؤں کو گننا شروع کیا۔ یہ مصروف سڑک نہ تھی اور بقول مسز ڈیوڈ کے خانقاہ سے تھوڑی دور آگے جاکر ختم ہوجاتی تھی۔ اس سڑک پر بنے گھروں، بنگلوں اور دکانوں کو پیچھے چھوڑ کر ہم نے ایسی جگہ چنی تھی جہاں اردگرد کوئی آبادی اور دکان نہ تھی۔ چھ بجے تک صرف دو گاڑیاں اور تقریباً آٹھ رکشے اس سڑک پر سے گزرے۔ پیدل چلنے والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی جو چھ بجے تک گھٹتے گھٹتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ وین کی آمد کا وقت قریب آچکا تھا۔ میں نے سڑک کے بیچ آکر سب ساتھیوں کو ریڈ الرٹ کا سگنل دیا اور پھر اپنی پہلے والی پوزیشن پر آگیا۔

پونے سات بجے سڑک کے L ٹرن سے وین نمودار ہوئی۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک پر اس کی رفتار خاصی کم تھی۔ میں نے سڑک پر کیلوں کے سیٹ پھینکے اور اسی وقت تھائی ساتھی نے بھی اپنے سیٹ پھینک دیئے۔ میں نے رومال نکال کر اس پر کلوروفارم چھڑکا اور رومال جیب میں رکھ کر اپنا سائیلنسر والا پسٹل نکال لیا۔ وین ہمارے سامنے پہنچی تو کیلوں کے سیٹوں نے اپنے کمال دکھایا۔ اس کے دونوں فرنٹ ٹائر ٹھس کر کے بیٹھ گئے اور ہم سے تقریباً بیس میٹر دور جاکر وین رک گئی۔ وین کے آہستہ ہوتے ہی ہم سب نے اس کی طرف بھاگنا شروع کردیا اور جب وین رکی تو ہم اس کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ نمبر ٹو نے اپنے ریوالور سے ڈرائیور کو ہینڈز اپ کرایا۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک مدر نن (MotherNun) بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ دو تھائی ساتھیوں نے وین کا سلائیڈنگ دروازہ کھولا۔ اندر دس نن بچیاں ایک سے لباس پہنے بیٹھی تھیں۔ میرے ہاتھ میں پسٹل دیکھ کر سب بے انتہا گھبرا گئیں۔ میں نے انھیں انگریزی میں کہا کہ اگر تم سب بالکل خاموش رہیں تو تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ مجھے روزین کو پہچاننا دشوار ہو رہا تھا میں نے بلند آواز میں روزین سے کہا تو سب بچیوں کی نگاہیں بے ساختگی میں ایک بچی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ روزین (سونیا) تھی۔ میں اسے اچھی طرح سے پہچان کر اس کی طرف بڑھا وہ گھبرا کر سمٹی اور چیخنے لگی۔ میں نے جلدی سے پسٹل جیب میں رکھ کر کلوروفارم والا رومال اس کی ناک سے لگادیا۔ اس دوران نمبر ٹو نے ڈرائیور پر دوسرے تھائی کی ڈیوٹی لگا کر وین کے کھلے دروازے میں کھڑے ہوکر سب بچیوں پر ریوالور تان کر انھیں چپ کرا رہا تھا۔ میں نے روزین کو گردن کی پشت سے تھام کر کلوروفارم والا رومال اس کی ناک سے لگایا تھا تاکہ وہ ہل جل نہ سکے اور کلوروفارم پوری طرح سے اثر کرے تقریباً پینتالیس سیکنڈ بعد میں نے رومال ہٹایا تو اس کی گردن ڈھلک چکی تھی۔ میں نے نمبر ٹو کو اشارہ کیا اور ہم دونوں نے اسے کھینچ کر باہر نکالا۔ تھائی ساتھیوں نے اسے اٹھایا اور ٹرک کی طرف بھاگے۔ نمبر ٹو نے مجھے کہا کہ آپ بھی جائیں جب تک آپ سڑک کے ٹرن سے اوجھل نہ ہوجائیں اس وقت تک میں باقی بچیوں، مدر نن اور ڈرائیور کو خاموش کرائے

رکھوں گا۔ میں بھی ٹرک کی طرف بھاگا۔ اس دوران سڑک پر کوئی گاڑی، رکشہ یا راہ گیر دکھائی نہ دیا۔ میں ٹرک میں سوار ہورہا تھا کہ نمبر تو بھی آگیا۔ ٹرک جو پہلے ہی سے سٹارٹ تھا، ہم سب کے بیٹھتے ہی روانہ ہوگیا۔ ٹرک ڈرائیور کے ساتھ صرف JCO بیٹھا تھا اور ہم سب پیچھے تھے۔ ہم تھوڑا ہی آگے پہنچے تھے کہ مجھے کرنل مزمل کی جیپ دکھائی دی۔ وہ جیپ کے باہر کھڑا تھا۔ میں نے اسے سب اچھا کا سگنل دیا۔ ہم آگے بڑھ گئے اور مزمل کی جیپ فاصلہ چھوڑ کر ہمارا پیچھا کرنے لگی۔ جیپ وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ ٹرک مسز ڈیوڈ کے گھر کے پچھواڑے کھڑا ہوا۔ میرے اور رضی کے سوا سب ساتھی بھاگ کر گھر میں داخل ہوئے اور منٹوں میں اپنا اور مسز ڈیوڈ کا سامان اور مسز ڈیوڈ کو لیے واپس لوٹے۔ مکان کے سامنے کے دروازے پر تو مسز ڈیوڈ نے پہلے ہی تالا لگا رکھا تھا گھر سے باہر آکر اس نے پچھواڑے والے دروازے پر بھی تالا لگا دیا۔ جب سب ٹرک میں بیٹھ گئے تو ٹرک نے گھاٹ کا رخ کیا۔ اس وقت ٹھیک ساڑھے سات بجے تھے یعنی وین کو روکنے سے اب تک ہم نے صرف چالیس منٹوں میں نہ صرف اپنی کارروائی مکمل کی تھی بلکہ مسز ڈیوڈ کے گھر پہنچ کر گھاٹ کی طرف روانہ بھی ہو چکے تھے۔

ٹرک گھاٹ پر پہنچا تو سپیڈ بوٹ بالکل کنارے سے لگی کھڑی تھی۔ پہلے دو تھائی اترے اور سونیا کو اٹھا کر بوٹ کی طرف بڑھے۔ ایک اور تھائی نے مسز ڈیوڈ کو سہارا دے کر اتارا۔ ہم سب کے بعد تینوں فوجی بھی بوٹ میں آگئے اور ٹرک واپس چلا گیا۔ اس وقت تک مکمل اندھیرا چھا چکا تھا اور میرے خیال میں ہماری اس ساری کارروائی کو کسی نے بھی نوٹ نہیں کیا تھا۔ بوٹ کے دونوں انجن ہمارے وہاں پہنچتے ہی سٹارٹ ہوگئے تھے۔ بوٹ آہستہ رفتار سے کنارے سے دریا کے بیچ دھارے میں پہنچی اور پھر پوری رفتار سے ہرن گھاٹا کی طرف روانہ ہوگئی۔ مسز ڈیوڈ بے ہوش سونیا کا سر اپنے زانوؤں پر رکھے سہلا رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ سونیا کو ہرن گھاٹا پہنچنے تک ہوش میں نہیں آنا چاہیے۔ لہٰذا جب تم محسوس کرو کہ وہ ہوش میں آرہی ہے تو مجھے بتانا تاکہ میں پھر رومال سونگھا کر اسے بے ہوش کردوں۔ یہ مشن اگرچہ مشکل نہیں تھا لیکن اس کی ٹینشن (Tension) بہت زیادہ تھی۔ مقابلہ برابر کے مسلح افراد سے ہو تو گھبراہٹ ہرگز نہیں ہوتی۔ کیونکہ انجام کار دونوں فریقین میں سے کچھ کو مرنا اور کچھ کو بھاگنا ہوتا ہے۔ یہاں معاملہ الٹ تھا۔ ایک معصوم بچی کو زبردستی اٹھانا اور کوئی گزند پہنچائے بغیر منزل تک کامیابی سے جانا تھا۔ میں نے سگرٹ سلگایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ مجھے وین میں بیٹھی بچیوں کے دہشت زدہ چہرے اور خوف سے ان کی خاموشی کا منظر بار بار یاد آرہا تھا۔ یقیناً ان سب بچیوں کا ماضی اور خانقاہ میں داخلہ سونیا جیسے حالات کے باعث ہی ہوا ہوگا ورنہ کون اپنی اولاد کو جانتے بوجھتے ہوئے ایسے جہنم میں دھکیلتا ہوگا جس سے زندگی کی آخری سانس تک چھٹکارا ناممکن ہے۔ ایسی تمام ننھی راہباؤں کا بچپن ماں باپ کی ممتا اور شفقت کے بغیر اس دم گھٹنے والے ماحول میں، جوانی پادریوں کی ہوس کا شکار بنتے ہوئے اور بڑھاپا بیماری میں موت کی آرزو میں گزرتا ہوگا۔

ہرن گھاٹا تک سفر کے دوران میرا سارا وقت سونیا، قیصر اس کے ساتھیوں کے متعلق سوچتے اور سگریٹ پھونکتے گزرا۔ تقریباً آدھا سفر طے ہوا تھا تو مسز ڈیوڈ نے مجھے بتایا کہ سونیا نے ایک بار ہاتھ ہلایا اور ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھولی ہیں۔ وہ ہوش میں آرہی تھی۔ میں نے بادل نخواستہ اسے پھر سے بیہوش کرنے کے لیے رومال پر تھوڑا سا کلوروفارم چھڑک کر اس کی ناک پر لگا دیا۔ بیہوشی کے دوران تو اسے کچھ بھی علم نہیں تھا کہ اسے کہاں لے جایا جارہا ہے۔ میں تو اس وقت سے ڈر رہا تھا جب اسے اسٹیمر پر ہوش آئے گا اور وہ جب خود کو اجنبی جگہ پر اجنبی لوگوں کے درمیان گھرا ہوا پائے گی۔ اور جب اس کے ننھے سے دماغ میں اسے وین سے اغوا کرنے کا منظر ابھرے گا اور پیدائش سے اغوا ہونے تک کے ماحول اور تربیت کے خلاف ماحول ملے گا۔ کیا اس کا ننھا سا دماغ اس تبدیلی کے ماحول کے بوجھ کو برداشت کرسکے گا۔ میں نے تو اسے خانقاہ کے قیدخانے سے بھی بدتر ماحول سے نکال کر آزاد فضا میں لانے اور ایک ماں کی ممتا کے جذبے کی تسکین کی خاطر اتنا خطرناک قدم اُٹھایا تھا جس میں ناکام ہونے کی صورت میں نہ صرف میں بلکہ میرے ساتھی، کرنل مزمل اور تینوں فوجی بھی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوسکتے تھے لیکن سونیا کی تربیت کے مطابق خانقاہ کا ماحول اس کے لیے آزاد اور جہاں اسے لے جایا جارہا تھا، وہ قیدخانہ تھا۔ کیا وہ اس اتنی بڑی تبدیلی کو برداشت بھی کرسکے گی یا نہیں؟ میں انھیں سوچوں میں گم تھا کہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے JCO نے کہا کہ ہم ہرن گھاٹا پہنچنے کے قریب ہیں اور دور کھلے سمندر میں جس جہاز کی ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دے رہی ہیں وہ اسٹیمر کی ہیں۔ دریا میں تو ہماری بوٹ بڑی تیزی سے Smoothly (رواں) چل رہی تھیں لیکن کھلے سمندر میں اس کی رفتار میں بھی کمی آگئی اور وہ ڈگمگانے لگی۔ سمندر کے بعد اندر جاکر گہرائی کی وجہ سے سمندر کی لہریں بہت کم ہوجاتی ہیں لیکن ساحل کے قریبی حصے میں ان لہروں کا جوش وخروش کم گہرائی کے باعث بہت بڑھ جاتا ہے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ ان لہروں سے لڑتی اور اوپر نیچے ہوتی ہماری بوٹ بالآخر اسٹیمر سے جا لگی۔ اسٹیمر والوں نے بھی ہماری بوٹ کی اکلوتی لائٹ کو دیکھ لیا تھا اور وہ ہمارے انتظار میں ہی تھے۔ انھوں نے بوٹ کے انجن بند ہوتے ہی رسی کی بنی گئی سیڑھیاں لٹکا دیں۔ رضی نے ملاحوں کو کہا کہ ایک بے ہوش ساتھی کو بھی اوپر لانا ہے۔ یہ سن کر انھوں نے دو مضبوط رسوں میں بندھا ہوا ایک تختہ نیچے اتارا۔ میں اس تختے پر بیٹھ گیا اور دو تھائیوں نے سونیا کو اٹھا کر میری گود میں ڈال دیا اور مسز ڈیوڈ بھی تختے پر چڑھ آئی۔ ساتھیوں نے ملاحوں کو اشارہ کیا جنھوں نے تختے کو اوپر کھینچنا شروع کیا۔ بوٹ کو اسٹیمر سے باندھ کر میرے تمام ساتھی، تینوں فوجی اور بوٹ کا کیپٹن اور اس کے دو اسسٹنٹ بھی اسٹیمر پر رسیوں کے ذریعے چڑھ آئے۔ اس وقت صبح کے تین بج رہے تھے۔ تختے کے عرشے پر پہنچتے ہی ملاحوں نے سونیا کو اُٹھا لیا۔ اسٹیمر کا کپتان بھی وہیں موجود تھا۔ میں نے اسے کہا کہ سونیا، مسز ڈیوڈ اور مجھے رانی کے پاس جانا ہے اور وہ میرے ساتھیوں کے آرام کرنے اور ہم سب کے کھانے کا فوری بندوبست کرے۔ کپتان نے اپنے نائب کو

میری ہدایت کے مطابق احکام دیے اور مجھے، مسز ڈیوڈ اور ایک ملاح جس نے سونیا کو اٹھا رکھا تھا کو لے کر رانی کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ عرشے سے سیڑھیاں اتر کر چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے اور ان کے نیچے انجن روم تھا۔ ایک کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور رانی جسے شاید ہماری آمد کی اطلاع مل چکی تھی، دروازے میں کھڑی تھی۔ ہم کیبن کے اندر داخل ہوئے اور ملاح نے ایک بیڈ پر سونیا کو لٹا دیا۔ کیبن میں دو بنکر بیڈ (Bunker Bed) تھے یعنی اوپر تلے چار افراد کے سونے کی جگہ تھی۔ میں نے رانی کو کہا ''لیجیے! آپ کی بیٹی سونیا (روزین) کو لے آیا ہوں۔ اس کے بازو پر نشان کو دیکھئے۔ اسے پہچانیے اور اپنی ممتا کی تسکین کے علاوہ اپنی محبت سے اس کے ذہن سے خانقاہ کے ماحول کو نکالیے۔ میں نے اپنا فرض پورا کردیا ہے اب آگے آپ کی باری ہے۔ اس کے ذہن پر صرف خانقاہ کا ماحول چھایا ہوا ہے۔ آپ کو اسے آزاد دنیا سے روشناس کرانے اور اپنا بنانے میں خاصی جدوجہد کرنی پڑے گی۔'' مسز ڈیوڈ سے رانی کا تعارف کرواتے ہوئے میں نے سونیا کو لانے میں اس کی مدد کا مختصر الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے کہا ''سونیا صرف مسز ڈیوڈ کو ہی پہچانتی ہے۔ یہ ہمارے ساتھ ہی پاکستان جائیں گے اور سونیا کو بہلانے اور سمجھانے میں آپ کی بہت معاونت کریں گی۔'' رانی سونیا کا سر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ بیٹی سے ملنے کی خوشی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہنے لگی۔ وہ بار بار سونیا کے ماتھے اور گالوں کو چومتی اور مجھے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتی۔ میں نے رانی کو بتا دیا کہ ہم نے سونیا کو اٹھاتے وقت اس کو چیخنے چلانے اور جدوجہد سے باز رکھنے کے لیے بیہوش کردیا تھا اور کلوروفارم کا اثر ختم ہوتے ہی وہ ہوش میں آجائے گی۔ تھوڑی دیر میں ہی میرے اور مسز ڈیوڈ کے لیے آملیٹ ٹوسٹ اور چائے آگئی۔ کیپٹن کے نائب نے مجھے بتایا کہ میرے ہمراہ آنے والے تمام لوگوں کے لیے مچھلی اور چاول تیار کیے جارہے ہیں۔ میں نے نائب کو کہا کہ مجھے ٹھیک گیارہ بجے اٹھادے اور کیپٹن کو کہے کہ میں ساڑھے گیارہ بجے اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ ملک کا اور جہاز کا کپتان جہاز کا بادشاہ ہوتا ہے اور جہاز پر اس کا کہا ہوا ہر لفظ حرف آخر ہوتا ہے۔ اس اسٹیمر کے کپتان کو مالکان (اصفہانی) کی طرف سے ایسی ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ مجھ سے بالکل ملازم اور مالک کی طرح پیش آرہا تھا۔ میں سونے کے لیے اوپر کے ایک برتھ پر چلا گیا اور مسز ڈیوڈ اور رانی نیچے کے برتھوں پر رہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ گیارہ بجے تک سو کر تازہ دم ہوجاؤں گا کیونکہ ابھی میرا کام ادھورا تھا۔ مجھے قیصر تک پہنچنا اور ساتھیوں کو چھڑانا تھا۔ میں گہری نیند میں تھا کہ کیبن میں شور و غل کی آواز سے میری نیند ٹوٹ گئی۔ سونیا ہوش میں آچکی تھی اور اس نئے ماحول میں گھبرا کر چیخ چیخ کر رو رہی تھی میں برتھ سے نیچے اترا۔ مجھے دیکھتے ساتھ ہی سونیا اور زور سے چلانے لگی اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''مجھے اس سے بچاؤ۔ اس نے مجھے اغوا کیا ہے۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔'' مسز ڈیوڈ اور رانی اسے سمجھانے اور قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کررہی تھیں لیکن سونیا ان کے ہاتھ سے نکلے جارہی تھی۔ میں سامنے کی

برتھ پر بیٹھ گیا۔ سونیا مجھے دیکھ کر سہم گئی اور مسز ڈیوڈ کی گود میں چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ رانی نے مسز ڈیوڈ کو پانی کا گلاس دیا بڑی مشکل سے سونیا نے دو گھونٹ پیے۔ میں نے مسز ڈیوڈ سے پوچھا کہ سونیا کب ہوش میں آئی۔ اس نے بتایا کہ تقریباً بیس منٹ قبل اس نے آنکھیں کھولیں۔ پہلے تو خالی خالی نگاہوں سے ہمیں دیکھتی رہی اور جب ذرا حواس بحال ہوئے اور دماغ نے کام شروع کیا تو ایک دم چیخنے اور رونے لگی۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو آٹھ بج رہے تھے۔ مجھے ساڑھے گیارہ بجے کیپٹن سے ملنا اور اسے مزید ہدایات دینی تھیں اور بارہ کے لگ بھگ ہمیں واپس جانا تھا۔ میں نے سوچا کہ سونیا کو جو ذہنی جھٹکا پہنچا ہے اس کا اثر بہلانے، پچکارنے اور پیار سے دور نہیں ہوگا لہٰذا اسے ایک اور جھٹکے کی ضرورت ہے جس سے پہلے کا اثر ختم ہو۔ میں نے رانی اور مسز ڈیوڈ کو آنکھ سے اشارہ کیا اور زوردار آواز میں کہا ''روزین کو برتھ پر بٹھا کر تم دونوں میری برتھ پر آجاؤ۔'' روزین نے میری بات سن کر مسز ڈیوڈ کا گریبان مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ صرف اس سے آشنا تھی لہٰذا قدرتی طور پر اسے مسز ڈیوڈ پر تھوڑا بہت اعتماد تھا۔ مسز ڈیوڈ نے زبردستی اپنا گریبان چھڑوایا اور رانی کے ساتھ دوسری برتھ پر بیٹھ گئی۔ کیبن کی گول کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں روزین کی برتھ پر بیٹھ گیا۔ وہ سہم کر برتھ کے کونے سے جا لگی اور پھر زور زور سے رونا شروع کردیا۔ میں نے اپنا ریوالور نکالا اور کھلی کھڑکی سے ایک فائر کیا۔ چھوٹے سے کیبن میں گولی چلنے کی آواز دوچند ہوگئی اور سارا کیبن لرز اٹھا۔ گولی روزین کے سر کے اوپر سے گزری تھی۔ میں نے روزین کو کہا۔ ''اگر اب تم نے رونا بند نہ کیا اور میری بات غور سے نہ سنی تو دوسری گولی تمہارے سر پر ماروں گا'' روزین خوف سے دہشت زدہ ہوکر فوراً خاموش ہوگئی۔ میں نے مسز ڈیوڈ کو کہا کہ روزین کو پورا گلاس پانی پلائے۔ کلوروفارم کے اثر اور مسلسل رونے سے روزین کو پانی ضرورت تھی۔ پانی پینے کے بعد روزین سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نرم لہجے میں روزین کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ''روزین! تمہارے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ایک دھوکے باز تمہیں خانقاہ میں چھوڑ گیا تھا۔ خانقاہ والوں نے تمہیں اور تو بہت کچھ سکھایا ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ انھوں نے تمہیں نہ تو ماں باپ کی محبت اور شفقت کے بارے میں کچھ بتایا ہوگا اور نہ ہی تمہیں یہ معلوم ہونے دیا ہوگا کہ تم خانقاہ میں کیسے پہنچی۔ کوئی بھی جاندار بغیر ماں باپ کے دنیا میں نہیں آسکتا۔ جس طرح میں تمہیں وین سے اٹھا کر یہاں تک لایا ہوں ویسے ہی اس دھوکے باز نے تمہاری ماں سے تمہیں اس وقت چھین کر خانقاہ میں داخل کروادیا جب تم صرف پندرہ دن کی تھی۔ اس وقت سے آج تک تمہاری ماں کا ایک ایک پل تمہاری یاد میں بے قراری اور تم سے بچھڑنے کے غم اور تمہیں پانے کی آرزو میں گزرا ہے۔ تمہاری ماں تمہارے سامنے بیٹھی ہے۔ اس کی تم سے بچھڑنے کی بے قراری کے باعث ہم نے خطرہ مول لے کر تمہیں وین سے اٹھایا اور یہاں تمہاری ماں کے پاس لے آئے۔ تمہاری ماں تمہارے سامنے بیٹھی ہے۔ اسی کی تم سے بچھڑنے کی بے قراری کے باعث ہم نے خطرہ مول لے کر تمہیں وین سے اٹھایا اور یہاں

تمہاری ماں کے پاس لے آئے۔ مسز ڈیوڈ کو تو تم جانتی ہو۔ وہ تمہیں بتائیں گی کہ میرا ایک ایک لفظ سچا ہے اور تمہیں تمہاری ماں کے پاس لانے میں ہمیں کتنی دشواریوں سے گزرنا پڑا۔ تمہاری خانقاہ کا ماحول بالکل اس کیبن جیسا ہے۔ تمہیں سوائے خانقاہ اور چرچ کے کچھ بھی نہیں بتایا گیا حالانکہ یہ دنیا بہت وسیع، رنگدار اور خوشبوؤں سے بھری پڑی ہے۔ اب تم خانقاہ کو تو بھول جاؤ کیونکہ تم وہاں کبھی بھی واپس نہ جاسکو گی۔ تمہیں میری باتیں بہت نامانوس لگ رہی ہوں گی کیونکہ تم سے ایسی باتیں پہلے کسی نے نہیں کیں۔ اٹھو اور اپنی ماں کے گلے سے لگ جاؤ۔ تمہیں اس کی ممتا کی تپش سے اتنا سکون اور راحت ملے گی جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتی۔" میں نہ معلوم اور کیا کچھ کہتا رہا کیونکہ اس وقت میں بھی بہت جذباتی ہو رہا تھا اور اس کے علاوہ مجھے پورا احساس تھا کہ اگر میں اپنی اس کوشش میں ناکام ہوگیا تو پھر روزین کو دنیا کی کوئی طاقت اپنی ماں اور دنیا کی طرف راغب نہ کرسکے گی اور اس کی ان سے نفرت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ میری اس بات کا یا ریوالور کے خوف کا یہ اثر ہوا کہ روزین نے ایک دو بار کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ کلوروفارم کے اثر اور رونے کی نقاہت کے باعث وہ ٹھیک طرح سے کھڑی نہ ہو پارہی تھی۔ میں نے اسے بازو پکڑ کر اٹھایا۔ میرے سہارے وہ رانی کی طرف بڑھی اور اس کی گود میں منہ چھپا کر اس سے لپٹ گئی۔ یہ دیکھ کر مجھے پورا اطمینان ہوگیا۔ کیونکہ اگر ماں کی گود میں ممتا اپنا اثر نہ دکھائے تو پھر اس لافانی رشتے کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔

معصوم بیٹی ماں کی گود میں سکڑی سمٹائی بیٹھی اور اس کے سینے پہ سر رکھے یوں لپٹی ہوئی تھی جیسے ماں کی آغوش میں اسے پناہ مل گئی ہو۔ اس کی ڈبڈباتی آنکھوں اور چہرے سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ جو سکون، اطمینان اور راحت اسے مل رہی ہے اس سے وہ اب تک ناآشنا تھی۔ (خانقاہ) (Monastery) میں اسے شاید کبھی بھی کسی نے گود میں لے کر پیار نہ کیا ہو۔ روزین کے لیے یہ پہلا اور انوکھا تجربہ تھا جس سے وہ لطف اندوز ہورہی تھی۔ ماں کی بے قراری کو بھی چین آگیا تھا۔ رانی کے چہرے سے اطمینان اور اس کی ممتا کو سکون ملنے کے تاثرات صاف پڑھے جارہے تھے۔ یہ ایسا حقیقی اور فطری منظر تھا جسے قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ خود مجھ پر جو کیفیت طاری تھی اسے بیان کرنا بھی میرے بس میں نہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر میرا ذہن بھی ماضی میں میرے بچپنے کی طرف لوٹ گیا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میں نے شروع بچپنے میں ہوش سنبھالتے کے وقت سے بوتل سے دودھ پلاتے، دلیہ کھلاتے، نہلاتے، مجھے پیار کرتے اور اپنے ساتھ سلاتے جسے دیکھا، اسے ہی اپنی ماں سمجھا۔ گھر میں اور ملنے والے سبھی اس خاتون کو میری ماں کہتے تھے۔ وہ بھی میری اتنی ناز برداری کرتی تھیں جو شاید کوئی نہ کرسکے۔ یہاں تک کہ میرے والد کی پولیس سروس کے دوران مختلف مقامات اور ضلعوں میں تبدیلی ہونے کے باعث میں بیشتر وقت اپنی ماں کے ساتھ راولپنڈی میں رہا۔ دو تین ماہ بعد ایک مرد اور ایک عورت ہمارے گھر آتے، میرے لیے بہت سارے کھلونے لاتے اور بہت سا پیار کرکے چند روز بعد

واپس چلے جاتے۔ راولپنڈی میں ہی میں سکول میں داخل ہوا۔ میں دوسری جماعت میں تھا کہ ایک روز وہ مرد اور عورت آئے اور چند روز ہمارے گھر رہنے کے بعد جب واپس جانے لگے تو میرا سامان بھی پیک کردیا گیا اور مجھے بتایا گیا کہ مجھے آئندہ ان کے ساتھ رہنا ہے۔ میرے لیے اپنی ماں سے بچھڑنا انتہائی خلاف توقع بات تھی۔ میں مچل اٹھا کہ میں اپنی ماں کے ساتھ رہوں گا اور اس کے بغیر کہیں نہ جاؤں گا۔ اس وقت مجھے بتایا گیا کہ جن خاتون کو میں اب تک اپنی ماں سمجھتا رہا ہوں، وہ دراصل میری ماں نہیں بلکہ میرے والد کے ساتھ آنے والی خاتون کی بیوہ پھوپھی ہیں اور میری اصل ماں وہ ہیں جو میرے والد کے ساتھ آتی ہیں۔ میرا ننھا ذہن اس گورکھ دھندے کو نہ سمجھ سکا اور نہ ہی میں ماں کو چھوڑ کر ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوا۔ بالآخر میری ماں بھی ہمارے ساتھ ضلع جھنگ میں اٹھارہ ہزاری چلی آئیں جہاں میرے والد تھانے کے SHO تھے۔ یہاں مجھے سکول میں داخل کروادیا گیا یہاں میرے والد اور حقیقی والدہ نے مجھے بہت پیار دیا اور جب میں ان سے کچھ مانوس ہوگیا تو تقریباً ایک ماہ بعد ایک روز میرے والد مجھے اٹھارہ ہزاری کے قریب ہیڈ ورکس لے گئے۔ اس روز جاتے وقت میری ماں نے مجھے بہت پیار کیا اور ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی۔ جب ہم ہیڈ ورکس سے واپس آئے تو میری ماں جاچکی تھی۔ میں بہت چیخا چلایا لیکن سب بے سود۔ طوعاً و کرہاً مجھے اپنے والد اور حقیقی ماں کے ساتھ ہی رہنا پڑا۔ سال میں ایک دو مرتبہ میری ماں جنھیں میں آپا کہتا تھا ہمیں ملنے ضرور آتیں اور مجھے اپنے ساتھ لپٹا لپٹا کر بے حال ہوجاتیں۔ جتنے روز وہ ہمارے گھر رہتیں میں انھی کے ساتھ سوتا اور میں اس حقیقت کا اعتراف کیے بنا نہیں رہ سکتا، باوجود اس کے کہ میری حقیقی ماں اور والد نے مجھے بے حد پیار دیا، مجھے وہ سکون اور راحت کبھی نہ ملا جو آپا جی کے پاس رہنے سے ملتی تھی۔ یونہی وقت گزرتا رہا۔

گھر میں رہتے ہوئے والدین کی ڈانٹ ڈپٹ کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں پر مجھے ہمیشہ آپا جی کی یاد ستاتی جنھوں نے مجھ سے کبھی اونچی آواز میں بات تک نہ کی تھی۔ گارڈن کالج راولپنڈی میں چار سالہ دور تعلیم میں میں بلاناغہ آپا جی کے گھر جاتا رہا اور وہ بھی میرے اصرار پر اکثر چار پانچ دن اور بعض اوقات دو تین ماہ ہمارے گھر پر قیام کرتیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں بسلسلہ روزگار مشرقی پاکستان چلا گیا۔ میں جب بھی چھٹی لے کر پنڈی اپنے والدین کے پاس آتا تو آپا جی کے گھر چند روز رہ کر انھیں اپنے گھر لے آتا اور میری چھٹی کا سارا عرصہ وہ ہمارے ساتھ ہی رہتیں۔ ان کی ممتا اور محبت میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ان کا بھی صرف ایک ہی بیٹا تھا جس سے ان کی اکثر ناچاقی رہتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے چٹاگانگ سے اپنی پہلی تنخواہ آپا جی کو منی آرڈر کی تھی۔ میری عمر چھبیس سال کی تھی جب آپا جی کا انتقال ہوا۔ اس وقت تک میری ایسی کیفیت تھی کہ میں جب بھی آپا جی کے ساتھ ان کے بستر پر لیٹتا اور وہ آہستہ آہستہ اپنی لرزتی انگلیوں سے میری کنپٹیوں کو سہلاتیں تو مجھے فوری نیند آجاتی۔ اب اس فانی دنیا میں نہ آپا جی ہیں اور نہ میرے والدین لیکن آج بھی میرا یہ حال ہے کہ اگر

مجھے کوئی پریشانی ہوتو اپنے والدین کی یاد سے پہلے مجھے آپا جی یاد آتی ہیں اور میں تلاوت اور فاتحے کے ثواب کا ہدیہ بھیجتے ہوئے اپنے والدین کے ساتھ آپا جی کو برابر کا شریک رکھتا ہوں۔

دوسرے کیبن میں جاکر نہا دھوکر تازہ دم ہوکر میں جہاز کے کیپٹن کے پاس گیا اور اسے ہماری واپسی تک یہیں ٹھہرنے کی ہدایت کی۔ کیپٹن نے مجھے بتایا کہ ہماری سپیڈ بوٹ کا ایک انجن (Out Boat Engine) خراب ہوگیا ہے جسے بوٹ کا کیپٹن اور اسٹیمر کے انجینئر ٹھیک کررہے ہیں اور اس مرمت میں خاصا وقت صرف ہوگا اور شاید آج ہماری روانگی نہ ہوسکے۔ ہمارے شیڈول کے مطابق ہمیں شام تک درسنا پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے تینوں فوجیوں اور بوٹ کے کپتان کو وہیں بلوایا اور یہ فیصلہ ہوا کہ اگلی صبح نو بجے تک ہم اپنی روانگی ملتوی کردیں۔ اسٹیمر کا وائرلیس رابطہ چٹاگانگ میں اصفہانی کے ہیڈ آفس سے تھا۔ میں نے دفتر کے انچارج کو کہا کہ کرنل مزمل کو ٹیلی فون کرکے بتادے کہ انجن کی خرابی کے باعث ہم نے اپنی واپس روانگی ایک دن کے لیے ملتوی کردی ہے۔ تینوں فوجیوں کو بھی کرنل مزمل نے بیس روز کی چھٹی دی تھی لہٰذا انھیں بھی واپسی کی جلدی نہ تھی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ درپیش مہم کے لیے میرے ساتھی اور فوجی تازہ دم ہوجائیں۔ کچھ دیر اپنے ساتھیوں سے خوش گپیاں کرنے اور ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا کر میں رانی کے کیبن میں آیا۔ رانی نے کھلنا میں قیام کے دوران رضی کی بیوی کو بازار بھیج کر سونیا کے لیے فراک، جین اور بہت سے ریڈی میڈ کپڑے اور کھلونے منگوالیے تھے۔ سونیا کو اس نے اس وقت فراک پہنادیا تھا۔ سر سے پاؤں سے ڈھکے لباس کے بجائے یہ لباس پہنے سونیا بہت اچھی لگ رہی تھی اور وہ بھی خانقاہ کی پابندی اوقات اور انتہائی خشک ماحول سے آزادی پاکر خاص مطمئن اور خوش دکھائی دیتی تھی کیونکہ یہاں صرف محبت تھی، پیار تھا، ممتا تھی اور کوئی پابندی نہ تھی۔ خانقاہ میں بچوں کی فطری آزادی کھیلنے اور ہنسنے پر سخت پابندی سے ان کی ان قدرتی خواہشات کو کچل دیا جاتا تھا۔ سونیا کو یہ آزادی عجیب عجیب لیکن خوش کن لگ رہی تھی۔ میں کیبن میں داخل ہوا تو وہ گڑیوں اور دوسرے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ساتھ ہی وہ انھیں چھوڑ کر ماں کی آغوش میں آبیٹی جیسے ماں کی گود اس کی پناہ گاہ ہو۔ میں کھلونوں کے قریب بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے سونیا کو اپنے پاس بلایا۔ سونیا جھجکی، لیکن ماں کے کہنے اور میرے پیار بھرے اصرار پر میرے قریب آگئی (خانقاہ میں سونیا کو انگریزی اور بنگلہ دیشی زبان سکھائی گئی تھی۔ میں اس سے صرف انگریزی میں بات کرتا تھا) میں نے اس سے گڑیوں اور کھلونے کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ اس نے گڑیاں اور کھلونے بھی زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ میں اس سے باتیں کرتا اور کھلونوں کے متعلق بتاتا رہا اور ایک گھنٹے میں ہی وہ میرے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم مجھے کیسے پکاروگی تو وہ بولی۔ ''ممی نے مجھے بتایا ہے کہ تم میرے انکل ہو اور بہت اچھے ہو'' ''یہ تو تمہاری ممی نے تمہیں بتایا ہے۔ تم خود مجھے کیا سمجھتی ہو۔ اچھا یا برا؟'' میرے یہ پوچھنے پر سونیا کچھ شرمائی اور پھر آنکھیں جھکا کر بولی ''گڈ انکل'' میں نے بڑے کر سونیا

کا ماتھا چوم لیا اور وہ بھی میرا ہاتھ پکڑ کر دبانے لگی۔ پیار و محبت کی ترسی ہوئی یہ بچی مجھے بہت اچھی لگی اور میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور تھوڑی دیر میں ہی ہم بے تکلف دوست بن گئے۔ میری غیرموجودگی میں ہی سونیا، رانی اور مسز ڈیوڈ کھانا کھا چکی تھیں۔ سونیا کو نیند آنے لگی تو مسز ڈیوڈ اور رانی نے اسے تھپک تھپک کر سلادیا۔ میں کیبن سے جانے لگا تو رانی بھی میرے پیچھے اٹھ کر آگئی اور کہنے لگی کہ اسے مجھ سے علیحدگی میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔ میں اسے لے کر اپنے کیبن میں آگیا تو وہ بولی ''میرا بیٹا ابھی تک سونیا کی اصلیت سے آگاہ نہیں۔ تمہاری غیرموجودگی میں وہ کیبن میں آیا تھا اور سونیا کے متعلق پوچھنے لگا۔ میں نے اسے یہ کہہ دیا کہ سونیا تمہارے ایک دوست کی بیٹی ہے جسے تم ہمارے ہمراہ پاکستان لے جارہے ہو۔ سونیا کی اصلیت اسے ہرگز معلوم نہیں ہونی چاہیے۔ اسے سونیا سے میرے پیار اور اسے مجھے ممی کہنے پر کچھ شک سا ہوگیا ہے۔ ممکن ہے رانگا ماٹی میں بھی اسے اس بات کی بھنک پڑ چکی ہو۔ تم اس سے ملو اور اسے سونیا کے متعلق کچھ ایسی بات بتاؤ کہ اگر اسے کوئی شک ہو تو وہ ختم ہوجائے اور پاکستان میں راجہ صاحب کو اگر وہ کچھ ایسی ویسی بات بتائے تو تم اس کی تردید کرسکو۔ میں جانتی ہوں کہ سونیا سے میری رفاقت صرف کراچی تک ہے۔ اس کے بعد نامعلوم مجھے اس سے ملنا نصیب ہو یا نہ۔ سونیا کے مستقبل کے متعلق سب پلاننگ تم نے ہی کرنی ہے۔ میرے پاس بہت سارے ذاتی قیمتی جواہرات ہیں جنھیں بیچ کر تم مالی طور پر اس کے مستقبل کو محفوظ کرسکتے ہو۔ میں تمہیں یہ بات رانی یا راجہ صاحب کی بیوی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دکھی اور اپنی بچی کے لیے ممتا کی ماری ایک مجبور ماں کی مجبوری کے باعث کررہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری اس استدعا کو رد نہیں کروگے۔'' میں نے رانی کو تسلی دی اور کہا کہ وہ بے فکر رہے۔ سونیا مجھے بھی بہت پیاری لگتی ہے اور میں اس کے مستقبل کی بہتری کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ یہ کہہ کر میں نے رانی کو واپس بھیج دیا اور راجہ کے لڑکے کے کیبن میں چلا گیا۔ وہ کسی رسالے کی ورق گردانی میں لگا ہوا تھا۔ اس نے مجھے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور پھر رسالے پر نظریں جمالیں۔ مجھے اس کا یہ انداز بہت برا لگا۔ میں نے اسے سخت لہجے میں کہا ''کیا کسی نے تمہیں اتنی تمیز بھی نہیں سکھائی کہ اپنے سے بڑوں کا احترام کیا جاتا ہے، ان کے آنے پر کھڑے ہوجاتے ہیں اور انھیں سلام (Wish) کرتے ہیں'' رسالے پر نظریں جمائے ہوئے ہی وہ بولا ''میں چکمہ قبیلے کے سردار راجہ تری دیو کا بیٹا ہوں اور میرے باپ نے تمہیں مجھ کو رانگا ماٹی سے پاکستان لے جانے کے لیے خاصی رقم دی ہوگی۔ مجھ پر تمہارا کوئی احسان نہیں ہے۔'' اس کی بات سن کر مجھے فی الحقیقت بہت غصہ آیا۔ میں نے اسے گلے سے پکڑ کر کھڑا کیا اور کرخت لہجے میں کہا ''اس وقت تم اور تمہاری ماں رانگا ماٹی میں نہیں جہاں تم دونوں تمہارے بڑے بھائی کی حراست میں تھے بلکہ میرے اسٹیمر پر ہو اور بے بس انسانوں کے سوا تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارے باپ کا کروڑوں کی مالیت کا موروثی خزانہ بھی میری تحویل میں ہے۔ اور

اگر میں چاہوں اور تم دونوں کو یہیں گولی مار کر سمندر میں پھینک دوں تو مجھ سے پوچھنے والا کوئی نہیں اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ میں نے تمہارے سردار بھائی کو گولیاں مار کر ہمیشہ کے لیے معذور کردیا ہے اور تمہارے قبیلے کے لڑاکوں کو چن چن کر ایسے مارا ہے جیسے کوئی چوہوں کو بھی ایسے نہیں مارتا۔ میری کہی ہوئی بات جب کوئی نہ مانے تو میرا پستول یا تو اس سے میری بات منواتا ہے یا اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیتا ہے۔ یہ کہہ کر میں نے ایک زوردار تھپڑ اسے رسید کیا۔ سردار کا لڑکا برتھ پر گر گیا۔ میں نے اسے پھر گردن سے پکڑ کر کھڑا کیا اور چار پانچ اور تھپڑ مارے میری اتنی قربانیاں دینے کے بعد اس بلونگڑے نے ایسی بات کی تھی کہ میں اپنے غصے پر قابو نہ پاسکا۔

سردار کا لڑکا برتھ پر گرا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں خوف اور میرے لیے نفرت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ''تمہاری بدتمیزی اور بداخلاقی کی سزا یہ ہے کہ پاکستان پہنچنے تک تم اس کیبن سے باہر نہیں جاؤ گے اور اگر تم نے باہر جانے کی کوشش کی تو میرے ساتھی مار مار کر تمہاری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔'' یہ کہہ کر میں باہر جانے لگا تو لڑکے نے سہمی ہوئی آواز میں مجھ سے پوچھا ''وہ لڑکی کون ہے جسے گزشتہ رات تم یہاں لائے ہو اور جو میری ماں کو ممی کہتی ہے۔ میری ماں ہر روز صبح میرے پاس آتی تھی لیکن اس لڑکی کی وجہ سے وہ ابھی تک میرے پاس نہیں آئی۔ میں ماں کے کیبن میں گیا تو میری ماں اس لڑکی کو اپنے سینے سے لپٹائے ہوئی تھی اور وہ لڑکی بار بار اسے ممی کہتی تھی۔ ماں نے میری طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی اور میں مایوس اور شرمندہ ہوکر ان کے کیبن سے چلا آیا'' یہ وہ جذبہ رقابت تھا جو ہر بچے میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کے والدین نومولود بچے میں محو ہوکر اپنے بڑے بچوں سے غفلت برتنے لگتے ہیں اور بڑے بچوں میں احساس محرومی اور نومولود کے لیے جذبۂ رقابت کا باعث بنتا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر میں پلٹ کر کیبن کی دوسری برتھ پر بیٹھ گیا اور لڑکے کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''وہ میرے ایک دوست کی بچی ہے جو کراچی میں رہتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد میرے دوست نے اپنی اس نومولود بچی کو اپنے ایک دوست کے گھر اس لیے چھوڑا تھا کہ بنگلہ دیش سے بھارت اور پھر بھارت سے گزرتے ہوئے کھٹمنڈو اور کھٹمنڈو سے پاکستان پہنچنے کے دوران سفر میں صعوبتیں یہ بچی برداشت نہ کر پاتی۔ حالات کے نارمل ہونے کے بعد میرے دوست نے بچی کو پاکستان لے جانا تھا۔ جس وقت تمہیں اور تمہاری ماں کو لینے میں بنگلہ دیش آنے لگا تو میرے دوست نے مجھے اپنی بچی کو بھی اپنے ساتھ لانے کی ذمہ داری سونپی۔ یہ بچی چونکہ اب تک ان بنگلہ دیشی پرورش کرنے والوں کو اپنے ماں باپ سمجھتی تھی اس لیے اس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کردیا۔ ہم سب کے یہ سمجھانے پر اس کی اصلی ماں جہاز میں اس کی منتظر ہے یہ بڑی مشکل سے میرے ساتھ آنے پر رضامند ہوئی۔ میں نے رانی صاحبہ کو سب بات بتا کر انھیں کہا کہ کراچی تک وہ اس کی ماں بن کر اس کا دل بہلائیں۔ کراچی پہنچ کر میں اس بچی کو اس کے اصل والدین کے سپرد کر دوں گا۔ میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند

نہیں ہوں۔ یہ ساری بات میں نے تمہیں محض اس لیے بتائی ہے کہ تم کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوجاؤ۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تم اصل بات جان کر بچی کو اپنی چھوٹی بہن کی طرح پیار دو گے۔ اب یہ تمہاری مرضی اور تمہارا فیصلہ ہوگا کہ کراچی پہنچنے تک تم کیبن میں قیدی کی طرح رہنا چاہو گے یا بچی کے ساتھ گھل مل کر اور اسے چھوٹی بہن سمجھتے ہوئے اس کا دل بہلاؤ گے'' یہ کہہ کر میں اٹھنے لگا تو لڑکا کھڑا ہوگیا اور بولا ''انکل! میں اپنی گستاخی پر بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کردیجیے۔ میرے دل میں شکوک اور غلط فہمیوں کا ایک طوفان اٹھا ہوا تھا جس نے میرے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب کردی تھی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس بچی کو میں اپنی چھوٹی بہن سمجھتے ہوئے اس کی دلجوئی کروں گا اور اس کا دل بہلاؤں گا۔ میں سچے دل سے آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ اگر آپ نے آئندہ میرے عمل میں کوئی غلطی دیکھی تو جو چاہے سزا مجھے دیجیے گا۔'' میں نے لڑکے کو اپنے قریب بلا کر اسے تھپکی دی اور کہا ''مجھے یقین ہے کہ تم اپنے وعدے کو نبھاؤ گے۔ تمہیں نہ صرف کیبن سے باہر جانے بلکہ سارے اسٹیمر پر گھومنے پھرنے کی پوری اجازت ہے۔ صرف اتنا یاد رکھنا کہ بچی سے اس کے ماضی کو کریدنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔ میں نے اور تمہاری ماں نے بڑی مشکل سے اس کے ذہن سے اس کے ماضی کی یادوں کو کھرچا ہے۔ اسے تم صرف بہلانے کی کوشش کرنا'' یہ کہہ کر میں اس کے کیبن سے باہر چلا آیا۔

شام تک ہماری بوٹ کا انجن ٹھیک ہوگیا۔ رضی کی بیوی مسز ڈیوڈ کو بھی میں نے رانی کے کیبن میں بھیج دیا تھا۔ رانی ان سب کے ساتھ شام کو عرشے پر سونیا کو لے گئیں۔ کھلی فضا، چاروں طرف سمندر اور ڈھلتے سورج کا نظارہ۔ سونیا نے زندگی میں پہلی بار کھلی فضا میں سانس لیا تھا۔ وہ عرشے کے ایک طرف سے دوسری طرف دوڑتی پھرتی تھی۔ جیسے کال کوٹھڑی میں برسوں رہنے والے کسی قیدی کو اچانک رہائی مل جائے تو وہ کھلی فضا سے اپنی محرومی کے دور کا زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرنا چاہتا ہے بالکل ویسی ہی حالت سونیا کی تھی۔ رات کو کھانے کے بعد میں ایک بار پھر رانی کے کیبن میں گیا۔ جہاز کے کپتان سے عملے کے لیے رکھا ہوا لوڈو میں نے سونیا کے لیے بھجوا دیا تھا۔ کیبن میں سردار کا لڑکا سونیا کو لوڈو سے کھیلنا سمجھا رہا تھا۔ میں نے رانی کو اشارے سے باہر بلایا اور کہا کہ میں صبح واپس جارہا ہوں۔ تم لوگوں کو کچھ دن ہرن گھاٹا میں ہی رہنا ہوگا۔ تمہارے لڑکے کو کچھ سختی اور کچھ نرمی سے میں نے سمجھایا ہے اور سونیا کے متعلق اس کے جو شکوک تھے انھیں زائل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ دیکھنے میں تو وہ اب نارمل ہے لیکن سونیا کو اس کے ساتھ اکیلے کہیں نہ جانے دینا۔ سونیا تمہاری بچی ہے لیکن مجھے بھی اس تھوڑے سے وقت میں اس سے اتنا لگاؤ ہوگیا ہے کہ میری غیر موجودگی میں اگر اسے کوئی گزند پہنچی تو میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ سونیا کو پیار کرکے اور گڈ نائٹ کہہ کر میں اپنے کیبن میں آگیا۔ صبح نو بجے ہمیں درسنا کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج بھرپور نیند سے لطف اندوز ہوجاؤں کیونکہ آئندہ نہ جانے کتنی راتیں کس حال میں گزارنی پڑیں۔

صبح ٹھیک نو بجے ہماری بوٹ روانہ ہوئی۔ بوٹ میں میرے ساتھ نمبر ٹو اور اس کے دو ساتھی، رضی اور تینوں فوجی تھے۔ میں نے آئندہ چوبیس گھنٹوں کے لیے ہم سب کے لیے خاصی تعداد میں سینڈوچ بنوا لیے تھے اور پانی بھی ذخیرہ کرلیا تھا۔ پروگرام کے مطابق کھلنا کے گھاٹ پر ہمیں ایک گھنٹہ رکنا تھا تاکہ بوٹ کے انجنوں کے لیے پٹرول کے ڈرم لے لیے جائیں اور تینوں فوجی وردیاں اتار کر سویلین لباس بھی پہن لیں۔ ہمارے پاس کل اسلحہ دو سب مشین گنیں، تھائیوں کی ایک رائفل کے علاوہ فوجیوں کی تین رائفلیں اور میرے پسٹل اور ریوالور کے علاوہ چھ ریوالور اور خاصی تعداد میں ان کی گولیاں تھیں۔ ہماری بوٹ چونکہ بہاؤ کے خلاف جارہی تھی لہٰذا اس کی رفتار نسبتاً کم تھی۔ تقریباً تین بجے ہم کھلنا پہنچے۔ فوجیوں نے گھاٹ پر ہی اپنی وردیاں اتار کر سویلین لباس پہنے جنھیں وہ اپنے بیگز میں ساتھ لائے تھے۔ پٹرول وغیرہ لے کر ہم چار بجے کے لگ بھگ درسنا کے لیے روانہ ہوئے۔ شہر جانے کا رسک ہم نے نہ لینا ہی مناسب سمجھا کیونکہ ہماری غیر موجودگی میں کھلنا میں بھارتی ہیلی کاپٹر کی تباہی اور سونیا کے اغوا ہونے سے حالات نے نامعلوم کیا رخ اختیار کیا ہو اور اب ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ پہلے یہاں کے ناموافق حالات کا سامنا کرتے اور پھر درسنا جاتے۔ رات نو بجے کے قریب ہم بغیر کسی رکاوٹ کے درسنا پہنچے۔ رضی نے انھی بارڈر کراس کروانے والوں کو ڈھونڈا جو قیصر اور اس کے ساتھیوں کو لے جاچکے تھے۔ اس بار انھوں نے شانتی پور تک لے جانے کا ایک ہزار ڈالر کا مطالبہ کیا۔ میں نے ہاں کہہ کر اس سودے کی حامی بھرلی۔ ہمارے ساتھ دو افراد نے جانا تھا لیکن جب ہم چلنے لگے تو وہ تین ہوگئے۔ میرے استفسار پر ان دونوں نے بتایا کہ پہلے کی طرح تیسرا آدمی بارڈر کراس کرنے کے بعد محفوظ جگہ سے واپس لوٹ آئے گا اور ان کے گھر والوں کو بخیریت بارڈر کراس کرنے کی اطلاع دے گا۔ دو ممالک کے غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنے کا یہ میرا پہلا موقع نہیں تھا۔ گائیڈ ہمیشہ کم سے کم تعداد میں ہمراہ جاتے ہیں تاکہ اگر بارڈر کے رکھوالے چیلنج کریں تو ان کے کم سے کم آدمی پکڑے جائیں اور اگر فرار ہونا ہو تب بھی زیادہ افراد کی نسبت ایک آدھ کا فرار ہونا بہت آسان ہوتا ہے۔ یہاں معاملہ الٹا تھا۔ تینوں میں سے ایک نے محفوظ مقام سے واپس لوٹنا یا دوسرے معنوں میں ہم سے الگ ہونا تھا۔ میرے دل میں تیسرے آدمی کے متعلق جو شک پیدا ہوا تھا اسے میں نے کسی پر بھی ظاہر نہ کیا۔ ہمیں بارڈر کراس کیے زیادہ سے زیادہ بیس منٹ ہوئے تھے جب وہ ''محفوظ جگہ'' آگئی جہاں سے تیسرے نے واپس لوٹنا تھا۔ درسنا سے ان کے ساتھ روانہ ہوئے ہمیں ایک گھنٹہ ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک گھنٹے میں یہ شخص ہمارے روانگی کے مقام تک پہنچ سکتا تھا جبکہ قیصر اور اس کے ساتھیوں کی روانگی کے بعد یہ شخص پانچ گھنٹے بعد ہمارے پاس آیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ شانتی پور یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے اور ہمیں مزید کتنا وقت چلنا ہوگا۔ ''صاحب! وہ سامنے جو روشنیاں نظر آرہی ہیں وہ شانتی پور کی ہیں اور ایک گھنٹے میں ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔'' ایک گائیڈ نے جواب دیا۔ اس کے جواب سے

ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ تیسرا آدمی قیصر اور اس کے ساتھیوں سے یہاں پر علیحدہ ہوکر واپس نہیں لوٹا تھا بلکہ اس سے ذرا فاصلے پر دوڑتا ہوا شانتی پور گیا تھا اور پولیس اسٹیشن میں قیصر وغیرہ کی اطلاع دے کر پھر ہمارے پاس آیا تھا اور اب ہمارے ساتھ بھی یہی سلوک ہونے والا تھا۔ JCO نے بھی کہا تھا کہ وہ پہلے بھی شانتی پور جاچکا تھا اور اس کی واپسی رانا گھاٹ سے ہوئی تھی۔ میں نے چند سیکنڈ میں سارے معاملے کو ذہن میں دہرایا اور اس سے پہلے کہ کسی کی سمجھ میں کچھ آئے میں نے سائیلنسر والا پسٹل نکالا اور دونوں گائیڈوں کو سر میں گولیاں مار کر انھیں وہیں ڈھیر کردیا اور تیسرے سے پوچھا کہ سچ بتادے کہ اس نے پہلے پھیرے میں واپس لوٹنے سے پہلے شانتی پور جاکر کس کو میرے ساتھیوں کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ میرے سبھی ساتھی حیران تھے کہ مجھے کیا ہوگیا ہے جو میں نے دونوں گائیڈوں کو مار دیا ہے لیکن کسی نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ میرے ساتھی میری طبیعت سے بخوبی واقف تھے اور فوجی ڈسپلن کی پابندی کرتے ہوئے اپنے کمانڈر سے کوئی جرح نہیں کرسکتے تھے۔ تیسرا آدمی اپنے دو ساتھیوں کا حشر دیکھ کر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے پسٹل اس کی کنپٹی سے لگادیا اور ٹہوکا دے کر بولنے کو کہا۔ بنگالی میں اس نے جو جواب دیا، رضی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ''میں نے شانتی پور جاکر تھانے کے انچارج کو بتایا تھا کہ چند غیر ملکی ایک عورت کے ساتھ غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرکے شانتی پور آرہے ہیں۔ انچارج نے مجھے ایک ہزار بھارتی روپے انعام میں دیے۔ اس سے پہلے بھی میں نے کئی بار بارڈر کراس کرنے والے بنگلہ دیشی مسلمان بہاریوں کو شانتی پور میں پکڑوایا ہے۔ میں بنگلہ دیشی نہیں بلکہ بھارت میں یہاں سے قریب ہی ایک سرحدی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میرے یہ دونوں ساتھی بھی میرے گاؤں کے رہنے والے ہیں اور ہم روزانہ بنگلہ دیش میں شکار کی تلاش میں آتے تھے۔ یہاں بارڈر پر دونوں طرف کوئی چیکنگ نہیں ہوتی لہٰذا غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنے کے لیے یہ جگہ شروع سے بہت مشہور ہے۔'' یہ ساری بات سننے تک میں نے اس کی کنپٹی سے اپنا پسٹل لگائے رکھا تھا۔ میں نے پسٹل ہٹایا لیکن لبلبی دبانے کے بعد۔ وہ تیسرا بھی وہیں ڈھیر ہوگیا۔ رضی نے گائیڈ کی قمیض سے ہزار ڈالر نکالے اور مجھے دے دیے۔ ہم نے ان کی لاشوں کو وہیں رہنے دیا اور JCO کی رہنمائی میں شانتی پور کی طرف چل پڑے۔ ہم خاموشی سے شانتی پور کی طرف بڑھ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کس پر بھروسہ کیا جائے۔ سب ہی پیسوں کے لالچ میں انسانی زندگیوں کے سودے کررہے تھے اور باوجود ہر ممکن احتیاط کرنے اور چوکنا رہنے کے ہم کئی بار دھوکہ کھاچکے تھے۔ محض ہزار روپے کے لالچ میں ان تینوں نے میرے ساتھیوں کی زندگیوں کا سودا کیا تھا اور اب ہمارے ساتھ بھی وہی کچھ کرنے والے تھے۔ انسانی زندگی لیتے وقت مجھے بھی دکھ ہوتا تھا۔ لیکن مجھے مجبوراً ایسے انتہائی قدم اٹھانے پڑتے تھے کیونکہ زخمی سانپ، اپنے وطن سے اور مجھ سے غداری کرنے والوں کو زندہ چھوڑنا میری سرشت میں نہیں۔ شانتی پور پہنچ کر ہم نے کنگ ہوٹل ڈھونڈا۔ ہم نے اپنا اسلحہ چادروں میں چھپا کر لاٹھیوں کی صورت میں

پکڑ رکھا تھا۔ ہم سب ہوٹل سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہوگئے اور رضی کو ہوٹل میں بھیجا کہ "رمیش" (قیصر) کا پتہ کرے اور اسے بلا لائے۔ رضی ہوٹل کی طرف گیا۔ ہم قدرے اندھیری جگہ پر کھڑے تھے اور ہمارے دل بے چینی سے دھڑک رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی رضی اکیلا واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ رمیش (قیصر) اپنے کمرے میں موجود نہیں ہے اور اس کے پوچھنے پر ریسیپشن والوں نے بتایا ہے کہ رمیش کمرے میں اکیلا رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کلپنا کو اس نے اسی ہوٹل کے کسی اور کمرے میں یا کسی دوسرے ہوٹل میں ٹھہرایا ہے۔ مجھے قیصر کی ذہانت پر بھروسہ تھا۔ اس نے کلپنا کو اپنے ساتھ نہ رکھ کر عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ حالات کے پیش نظر وہ خود کسی وقت بھی کسی مشکل میں گرفتار ہوسکتا تھا۔ اگر کلپنا اسی کے کمرے میں ٹھہری ہوتی تو وہ بھی ساتھ ہی دھر لی جاتی۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ ہمیں اس ہوٹل کے قریب ہی کسی دوسرے ہوٹل میں ٹھہرنا چاہیے۔ ICO نے جو اس سرحدی قصبے میں پہلے بھی آچکا تھا یہ مشورہ دیا کہ اس چھوٹے سے قصبے میں ہم آٹھ افراد کا ایک ہی ہوٹل میں رہنا ہمیں مشکوک ٹھہرا سکتا ہے لہٰذا ہم میں سے چار افراد رمیش کے ہوٹل میں اور دوسرے چار اس ہوٹل کے قریب ہی ٹیگور ہوٹل میں قیام کریں۔ دو ٹولیوں میں مختلف جگہوں پر رہ کر ہم ایک دوسرے کی نگرانی بھی کرسکیں گے اور اگر کوئی ٹولی مشکل میں پڑگئی تو دوسری ٹولی اس کی مدد بھی کرسکے گی۔ شانتی پور میں صرف یہ دو ہی ہوٹل تھے۔

میں نے تینوں تھائیوں اور رضی کو ٹیگور ہوٹل میں بھیج دیا اور خود تینوں فوجیوں کے ہمراہ کنگ ہوٹل میں کمرے کے لیے میں نے رضی کو تین سو ڈالر ہوٹل کے اخراجات کے لیے دیے۔ رضی کا تھائیوں کے ساتھ رہنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس علاقے میں بھی بنگالی بولی جاتی تھی جس سے تھائی نا آشنا تھے۔ میں نے رضی کو یہ بھی کہا کہ ٹیگور ہوٹل میں تھائیوں کو ٹھہرانے کے بعد وہ کنگ ہوٹل کی ریسپشن کی لابی میں آکر بیٹھ جائے اور قیصر کی واپسی کا انتظار کرے۔ کنگ ہوٹل میں تین کمرے لے کر اور ذرا تازہ دم ہوکر میں ہوٹل کی لابی میں آیا تو رضی میرا منتظر تھا۔ اس کے پاس میرے لیے دو خبریں تھیں۔ پہلی یہ کہ کلپنا ٹیگور ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے جسے اس نے ریسپشن سے گزرتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ دوسری خبر یہ تھی کہ قیصر ہوٹل میں واپس لوٹ آیا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ لابی میں میرے قریب ہی پڑے صوفے پر بیٹھ گیا اور اپنا چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے مجھ سے سرگوشی میں آپ کے متعلق پوچھا میرے ہاں کہنے پر اس نے کہا کہ یہاں قریب ہی مون ریسٹورانٹ ہے۔ وہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جائے گا۔ اس نے صرف آپ کو وہاں ملنے کے لیے بلایا ہے اور یہ بھی کہا ہے اس ہوٹل میں اس سے ملنے سے احتراز کریں کیونکہ پولیس والے اس کی نگرانی کررہے ہیں۔

رضی کو قیصر سے ملے پون گھنٹہ ہوچکا تھا۔ میں نے رضی کو کہا کہ میرے نمبر ٹو کو کہے کہ اپنے دونوں ساتھیوں سمیت مون ریسٹورنٹ کے باہر چھوٹے ہتھیاروں سے مسلح ہوکر ہماری نگرانی کریں۔ مون

ریسٹورنٹ ان دونوں ہوٹلوں کے درمیان تھا۔ میں اندر چلا گیا اور رضی تھائیوں کو بتانے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ مجھے ریسٹورنٹ میں بیٹھے بمشکل پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ پہلے قیصر اندر آیا اور میرے ساتھ کی میز پر میرے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے پیچھے ہی رضی اندر داخل ہوا اور قدرے فاصلے پر ایک ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے مجھے اشارے سے بتایا کہ تینوں ساتھی باہر موجود ہیں۔ قیصر نے اور میں نے چائے کے الگ الگ آرڈر دیے۔ قیصر دھیمی آواز میں بولا "ہم بڑی مشکل میں پھنس چکے ہیں۔ سارے ساتھی حوالات میں بند ہیں۔ تھانیدار بڑی مشکل سے ہزار ڈالر لے کر اس بات پر رضامند ہوا ہے کہ گرفتار ساتھیوں کی FIR صرف چار روز تک نہ کاٹے گا۔ اس کی دی ہوئی مہلت کل ختم ہورہی ہے۔ میں کلپنا کو ٹیگور ہوٹل میں ٹھہرایا ہے اور اسے پانچ ہزار ڈالر دے کر کہا کہ اگر ایک ہفتے تک ہم یہاں سے نہ جاسکے تو وہ اکیلی ہی دارجلنگ چلی جائے۔ تھانیدار نے ساتھیوں کا سارا اسلحہ تھانے کے مال خانے میں رکھوا دیا ہے۔ ساتھیوں پر اس نے فی الحال کوئی جسمانی تشدد نہیں کیا۔ لیکن میرے ہزار یقین دلانے کے باوجود کہ اسے ساتھیوں کی رہائی کے عوض مالا مال کر دیا جائے گا، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے میری بات پر یقین نہیں۔ میری بھی نگرانی ہورہی ہے۔ آپ کے سامنے جو شخص سفید دھوتی اور گلابی قمیص پہنے بیٹھا ہے وہ تھانے کا مخبر یا سپاہی ہے۔ تین افراد باری باری چوبیس گھنٹے میری نگرانی کرتے ہیں۔ میں نے سارے ڈالر اور جواہر اپنی کمر کے گرد باندھ رکھے ہیں۔ یہاں سے نکل کر میں انھیں آپ کے حوالے کر دوں گا کیونکہ مجھے کسی وقت بھی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ میرے پاس ایک ریوالور اور پینتالیس گولیاں ہیں۔ آپ سے فون پر کھلنا بات کرنے سے ہمیں بہت حوصلہ ہوا اور میں نے گرفتار ساتھیوں کو بھی آپ کے آنے کا بتا دیا تھا۔ آپ کے یہاں آنے میں دیر سے میں مایوس نہیں ہوا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور بالضرور آئیں گے بلکہ میں تو آپ کے لیے متفکر تھا کہ کہیں آپ وہاں کسی مصیبت میں نہ پھنس گئے ہوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں جن سے میں آپ کے یہاں آنے کا شکریہ ادا کرسکوں" قیصر لگاتار بولے جارہا تھا حالانکہ وہ عام حالات میں بہت کم بات کرتا تھا۔ یقیناً وہ اس نئی افتاد سے گھبرا گیا تھا۔ اپنی ذمہ داری پر وہ ساتھیوں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ دو تو رانگاماٹی پہنچنے سے پہلے ہی مال کے لالچ کے باعث ہلاک ہوچکے تھے اور اب باقی سارے ساتھی یہاں پکڑے جاچکے تھے۔ وہ کس منہ سے اکیلا واپس دہلی جاتا۔ میں نے قیصر کو تسلی دیتے ہوئے کہا "فکر نہ کرو۔ میں آگیا ہوں اور میرے ساتھ تین تھائی اور تین مسلح بنگلہ دیشی فوجی بھی ہیں۔ ساتھیوں کو چھڑوانے کے لیے ہم جان کی بازی لگادیں گے۔ گھی اگر سیدھی انگلی سے نہ نکلا تو ٹیڑھی انگلی سے نکالیں گے۔ تم مجھے تھانے کا محل وقوع، تھانیدار کی شکل وصورت اور تھانے میں موجود نفری کی اندازاً تعداد بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ تھانے کا مال خانہ تھانے میں کس جگہ واقع ہے۔ یہ سب کچھ لکھ کر رضی کو دینا جو ڈیڑھ گھنٹے بعد اسی جگہ تمہارا منتظر ہوگا۔" یہ کہہ کر میں نے چائے کا بل دیا اور ریسٹورنٹ سے باہر آگیا۔ تھائی ساتھی باہر ریسٹورانٹ کے

دونوں جانب پھیل کر کھڑے تھے۔ چند منٹوں بعد قیصر بھی باہر آ گیا اور پاس سے گزرتے ہوئے ایک بہت چوڑی ڈبل پیٹی (بیلٹ) مجھے دی جس میں ڈالر اور جواہرات تھے۔ قیصر تو آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے ہی گلابی قمیض والا اور رضی ساتھ ساتھ نکلے۔ نگرانی کرنے والا تو قیصر کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ رضی کو میں نے اسی ریسٹورانٹ میں قیصر سے مانگی ہوئی معلومات کا پرچہ لینے اور اسے فوراً مجھ تک پہنچانے کی ڈیوٹی لگائی۔ ہوٹل میں رابرٹ مائیکل کے نام سے میں نے اندراج کرایا تھا کیونکہ بھارت میں سرحدی قصبے میں کسی مسلمان کا ٹھہرنا ہی اسے مشکوک بنا دیتا ہے۔ میرے سارے ساتھی بھی ہندو اور کرسچین ناموں سے ہوٹل میں ٹھہرے تھے دو گھنٹے بعد رضی قیصر کا دیا ہوا رقعہ لے کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے تینوں فوجیوں کو بھی اپنے کمرے میں بلوالیا اور قیصر کا رقعہ پڑھنے لگا۔ اس نے تھانے کی عمارت کا نقشہ بنایا تھا جس میں حوالات اور مال خانے کی نشاندہی کی تھی۔ تھانے کی کل نفری (قیصر کے اندازے کے مطابق) سولہ افراد پر مشتمل تھی اور تھانے کا سارا عملہ ہندو تھا۔ ریوالور سے مسلح صرف تھانیدار اور ASI رہتے تھے۔ باقی سب عملہ ہاتھوں میں لاٹھیاں رکھتے تھے۔ میں نے یہ سب معلومات فوجیوں کو بتا کر انھیں اپنا پلان بتایا۔ میرے پلان کے مطابق ہمیں کل شام ڈھلنے کے بعد تھانے پر حملہ کرنا تھا۔ اس وقت تھانیدار، ASI اور ہیڈمحرر وغیرہ تھانے میں عموماً موجود ہوتے ہیں۔ پلان کے مطابق میں نے تھانیدار کو اور قیصر نے ASI کو غیر مسلح کرنا اور اپنے اسلحے کی نوک پر ان سے مال خانے اور حوالات کی چابیاں لینی اور اپنا اسلحہ لینا اور ساتھیوں کو چھڑوانا تھا۔ اس دور افتادہ تھانے میں سنٹرل الارم سسٹم کا ہونا بعید از قیاس تھا۔ ساتھیوں کو چھڑوانے اور مسلح کرنے کے بعد مال خانے میں تھانیدار سمیت ساری نفری کو ایک ایک کر کے اندر لانا اور تھائیوں کو ان کے گلے کاٹ کر ہلاک کرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کارروائی کے دوران بارودی اسلحے کا استعمال سوائے اشد ضرورت کے ہرگز نہ کیا جائے اور خاموشی سے ساری نفری کو ہلاک کر کے ہم JCO کی قیادت میں فوراً رانا گھاٹ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ قصبے والے خال خال ہی رات کو تھانے کی طرف جاتے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ ہماری اس کارروائی کا علم قصبے والوں اور پولیس کے اعلیٰ افسران کو اگلی صبح سے پہلے نہ ہو تب تک ہم ان کی پہنچ سے دور نکل چکے ہوں گے۔ کارروائی سے پہلے ہوٹلوں سے اپنا سامان اٹھائیں گے (چیک آؤٹ نہیں ہوں گے) اور کلپنا کو سامان کے ساتھ قصبے کے باہر اس جگہ انتظار کرنے کا کہیں گے جہاں سے ہمیں رانا گھاٹ کے لیے گزرنا ہوگا۔ میرے پلان کو سب نے سراہا۔ صرف ایک تبدیلی یہ کی گئی کہ قصبے کے کسی بھی شخص کی وہاں موجودگی کے امکان کے پیش نظر تھانے پر دھاوے کا وقت رات کے نو بجے رکھا جائے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ رانا گھاٹ جانے کے رستے میں ہی تھانہ پڑتا تھا، یعنی ہمیں اپنی کارروای کے بعد قصبے میں دوبارہ داخل نہیں ہونا تھا۔ JCO کے مطابق شانتی پور سے رانا گھاٹ کا سفر چھ سے سات گھنٹے کا تھا اور بقول اس کے ہم انشاء اللہ آٹھویں گھنٹے میں بنگلہ دیش میں ہوں گے۔

پلان کی تفصیلات اور وقت طے کر کے میں نے فوجیوں کو رخصت کیا اور کھانا کھا کر تھانے میں کارروائی کی جزئیات میں کھو گیا۔ تھانیدار کو قابو کر کے ہمیں پہلے مال خانہ کھولنا اور بعد میں حوالات سے ساتھیوں کو نکالنا تھا۔ میں نے پروگرام میں دو تین تبدیلیاں کیں۔ تھانیدار کو قابو کر کے ہمیں مال خانے سے بھی پہلے اس سے ملحقہ تھانے کے اسلحہ خانے پر قبضہ کرنا تھا تاکہ کارروائی کے دوران کوئی پولیس والا مسلح نہ ہو سکے۔ تھانے کے بڑے گیٹ پر رضی نے تھانے میں اگر کوئی آئے تو اسے یہ کہہ کر واپس لوٹانا تھا کہ پولیس کمشنر اچانک معائنے کے لیے آیا ہوا ہے اور اگر کوئی پولیس والا آئے تو اسے فوری اندر بھیجنا تھا۔ تھانے کی ٹیلی فون کی لائن Disconnect کرنی تھی۔ ہمارا یہ پلان دیکھنے میں تو بالکل ٹھیک لگ رہا تھا اگر تھانے کے حالات ہماری توقع کے عین مطابق ہوتے۔ دوسری صورت میں ہمیں فوراً اسلحے کا استعمال کرنا تھا کیونکہ ایک بار تھانے میں گھس کر پلان کو ملتوی کرنا اور واپس لوٹنا ناممکن تھا۔ تھانے میں ایک جیپ کا ہونا لازمی تھا۔ ہم اس جیپ سے کسی حد تک فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ جیپ ہمارے واپس جانے کے راستے کی نشاندہی بھی کر سکتی تھی اس لیے اسے استعمال نہ کرنے کی صورت میں اسے دوسرے کے لیے ناقابل استعمال بنانا ضروری تھا۔ انھی سوچوں میں کھویا ہوا میں سو گیا۔ اگلے دن میں رضی اور تھائیوں کے پاس گیا اور انھیں آج رات کو اٹیک کے منصوبے سے آگاہ کیا۔ سب نے میرے پلان کی تائید کی اور میں نے انھیں رات آٹھ بجے اپنے ہوٹل کو چھوڑ کر سامان اور اسلحے کے ساتھ تھانے سے قریب دو سو گز آگے رکنے کا کہا۔ وہیں پر کلپنا نے ہمارا انتظار کرنا تھا۔ رضی کے ذریعے مون ریسٹورنٹ میں قیصر کو بلوا کر سب پلان سمجھایا۔ اس نے پونے نو بجے تھانے کے بیرونی گیٹ پر ہمیں ملنا تھا اور رضی نے کلپنا کو لے کر تھانے سے آگے مقررہ مقام پر چھوڑنا اور تھانے کے باہر ہمیں ملنا تھا۔ تینوں فوجیوں اور تھائیوں نے دو دو کی ٹولی میں ٹھیک پونے نو بجے تھانے پہنچنا تھا۔ سب کو مکمل ہدایات دے کر اور گھڑیاں ملا کر میں واپس اپنے ہوٹل آ گیا اور وضو کر کے دو رکعت نفل اپنی کامیابی کے لیے ادا کیے اور گڑگڑا کر رب العزت سے دعا کی کہ مجھے اس مشن میں کامیابی عطا کرے۔ اس مشن میں خدانخواستہ ناکامی کی صورت میں کم از کم میں تو اپنی جان دے دیتا۔ قیصر کے ساتھیوں کی گرفتاری میرے دل و دماغ پر اتنا بڑا بوجھ بن چکی تھی جس کو بیان کرنا مشکل ہے۔ میری وجہ سے یہ سب مصیبت میں گرفتار ہوئے تھے اور اب یہ میرا فرض تھا کہ انھیں رہا کراؤں یا اس کوشش میں اپنی جان دے دوں۔ رب ذوالجلال والاکرام کی ذات اور اس کے قادر مطلق ہونے پر یقین کامل اور اس سے اپنی حاجت بیان کرنے اور مدد مانگنے سے میرے دل کو بڑا سہارا ملا۔ دن کا باقی وقت میں نے کمرے میں آرام کرنے میں گزارا۔ رات کو کارروائی میں کامیابی کے بعد ہمیں مسلسل آٹھ گھنٹے چلنا تھا جس کے لیے ہمارا تازہ دم ہونا لازمی تھا۔ خدانخواستہ اگر امیدوں کے برعکس صورت حال پیش آئی تو میں نے اس کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

ابھی شام کے سات ہی بجے تھے کہ ہوٹل میں شوروغل کی وجہ سے میں اپنے کمرے سے باہر آگیا۔ دو ڈنڈے بردار سپاہی ''رمیش'' کی تلاش میں آئے تھے اور اس کے کمرے کے دروازے کو پیٹ رہے تھے۔ ہوٹل کا منیجر انھیں بار بار کہہ رہا تھا کہ رمیش ہوٹل سے باہر گیا ہے لیکن وہ سنی ان سنی کر کے دروازے کو مسلسل پیٹے جا رہے تھے۔ میں جلدی سے کمرے کے اندر گیا اور فوری طور پر روانگی کی تیاری کر کے اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر ہوٹل کی ریسیپشن پر آگیا۔ میرے سامنے ہی قیصر ہوٹل میں داخل ہوا۔ میں نے اسے ہوٹل کی پہلی منزل پر اس کے کمرے پر پولیس کی موجودگی کا بتایا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم اشاروں میں باتیں کرتے۔ قیصر نے کہا کہ کمرے میں اس کا صرف کپڑوں کا ایک بیگ ہی پڑا ہے۔ میں نے قیصر کو کہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے ہوٹل سے باہر چلا جائے اور اس وقت واپس لوٹے جب پولیس والوں کے ساتھ تھانے پہنچنے کا وقت ہمارے اٹیک کرنے کے وقت کے مطابق ہو۔ قیصر میری بات سن کر وہیں سے واپس لوٹ گیا۔ اس ہوٹل کے ریسٹورانٹ میں گلابی قمیض والا مخبر اب بھی بیٹھا ہوا تھا۔ قیصر سے بات کرتے وقت میں کن اکھیوں سے اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہمیں باتیں کرتے دیکھ کر جیب سے کاغذ اور پین نکال کر اس پر کچھ لکھا اور قیصر کے باہر جاتے ہی وہ ہوٹل کے دروازے تک گیا اور پھر واپس لوٹ آیا۔ اب میں بھی اس کی نگرانی کی لسٹ میں شامل ہو چکا تھا اور شاید وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ رمیش کے پیچھے جائے یا میری نگرانی کرے۔ اسے یقیناً پولیس کے سپاہیوں کی ہوٹل میں آمد کا پتہ تھا۔ اب ہمارے پاس وقت بہت کم تھا میں فوجیوں کے کمروں میں گیا اور JCO کو کہا انھیں اب جلد از جلد ہوٹل سے نکل جانا چاہیے۔ اگلے پانچ سات منٹ میں وہ بھی اپنا سامان اور چادروں میں چھپی لاٹھیاں (رائفلیں) لے کر ریسیپشن پر آگئے اور ہوٹل سے چیک آؤٹ کر کے ریسٹورانٹ میں بیٹھ گئے۔ میں بھاگم بھاگ ٹیگور ہوٹل میں گیا۔ وہاں بھی سارے تھائی، رضی اور کلپنا تیار بیٹھے تھے۔ میں نے انھیں کہا کہ حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ اب مقررہ وقت تک انتظار نہیں کیا جا سکتا لہٰذا وہ جلد از جلد اپنے مقررہ مقامات تک پہنچ جائیں اور میرا باقی ساتھیوں کا انتظار کریں۔ انھیں یہ ہدایات دے کر میں پھر کنگ ہوٹل کی طرف آیا۔ راستے میں قیصر کی مخصوص سیٹی بجی۔ میں وہیں رک گیا اور قیصر ایک دکان کی اوٹ سے نکل آیا۔ میں نے اسے کہا کہ اب یہی بہتر ہے کہ وہ ابھی اپنے ہوٹل واپس جائے اور سپاہیوں کے ہمراہ تھانے جائے۔ قانون کے مطابق صرف دو سپاہی نہ تو تمھیں گرفتار کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہتھکڑی لگا سکتے ہیں۔ تم ان کے ساتھ آہستہ چلتے ہوئے تھانے جاؤ۔ ہم بھی اس وقت تک وہاں پہنچ چکے ہوں گے اور پروگرام کے مطابق فوری ہی اپنی کارروائی شروع کر دیں گے۔ قیصر کو میں نے ہوٹل واپس جانے اور سپاہیوں کے ہمراہ تھانے جانے کا اس لیے کہا تھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ہماری کارروائی کے دوران پولیس کی زیادہ سے زیادہ نفری تھانے میں موجود ہو۔ قیصر اور میں تقریباً آگے پیچھے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ قیصر سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور چند منٹوں میں ہی اپنا بیگ اٹھائے دونوں سپاہیوں کے ساتھ

ہوٹل سے نکل گیا۔ میں نے فوجیوں کو اشارہ کیا اور وہ بھی ہوٹل سے باہر چلے گئے۔ میں بھی بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو گلابی قمیض والا مخبر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ تھانے کی طرف جانے میں ہماری ترتیب یوں تھی کہ تقریباً پچاس میٹر آگے قیصر اور دونوں سپاہی اور پیچھے تینوں فوجی اور ان سے بیس میٹر پیچھے میں اور مجھ سے تھوڑا ہی پیچھے نمبر ٹو تھا۔ جب تھانہ سامنے دکھائی دینے لگا تو فوجی رک گئے اور میں اور نمبر ٹو آگے بڑھ گئے۔ تھانے سے چند قدم آگے میرا نمبر ٹو اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ کھڑا تھا۔ میں تھائیوں سے چند قدم اور آگے چلا گیا۔ قیصر تو تھانے کے اندر جا چکا تھا لہٰذا مخبر میری اصلیت جاننے (کیونکہ میں نے ہوٹل میں اس کے سامنے قیصر سے بات کی تھی) اور انعام کے لالچ میں میرے پیچھے لگ گیا۔ وہ بھی تھائیوں سے آگے بڑھ آیا۔ میں یکلخت واپس پلٹا اور مخبر کو گلے سے دبوچ لیا۔ سارے تھائی میرے پاس آگئے۔ میں نے نمبر ٹو کو کہا ''یہ پہلے قیصر کی اور اب میری مخبری اور اصلیت جاننے کے لیے یہاں آیا ہے۔ کیوں نہ ہم اپنی کارروائی کا اسی سے آغاز کریں۔'' اسے یونہی گردن سے دبوچے میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک تھائی نے اس کی پیٹھ میں عین دل کے مقام پر اپنا خنجر گھونپا اور خنجر کو گھما دیا۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر میں نے اس کی آواز بند کر رکھی تھی۔ وہ تھوڑا سا تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ ہم نے اس کی لاش گھسیٹ کر سڑک کے دو رویہ درختوں سے پرے پھینکی۔ اسی اثنا میں رضی بھی کلپنا کو مقررہ جگہ پر چھوڑ کر واپس آچکا تھا۔ رضی تھانے کے باہر کھڑا ہو گیا اور ہم ایک ایک کر کے تھانے میں داخل ہوئے۔ تھانے کے صحن میں تین لاشیں پڑی تھیں۔ یہ بارڈر کراس کروانے والوں کی تھیں اور پوسٹمارٹم کے بعد تھانے لائی گئی تھیں کیونکہ وہ علاقہ جہاں ہم نے انھیں ہلاک کیا تھا، اسی تھانے کی حدود میں تھا۔ لاشوں کے پاس کوئی نہ تھا اور غالباً ان کے لواحقین کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ میں نقشے کو ذہن میں رکھتے ہوئے SHO کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں SHO اور ASI دونوں کرسیوں پر بیٹھے تھے اور ایک جانب قیصر کھڑا تھا۔ SHO کے کمرے کے باہر بیٹھے سپاہی نے مجھے بغیر اجازت اندر جانے سے روکا تھا لیکن اسے شٹ اپ کہہ کر میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ SHO نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے انگریزی میں کہا ''میں انڈین ایسٹرن آرمی کی انٹیلی جنس سے ہوں اور جیسور کے قریب ہمارے ہیلی کاپٹر کی تباہی کی تحقیقات کے لیے پہلے جیسور اور پھر وہاں سے درسنا کے راستے شانتی پور آیا ہوں۔ میرے تین ماتحت بھی میرے ساتھ ہیں اور ہم کنگ ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ ہماری تحقیقات کے مطابق چند بھارتی غداروں نے اس ہیلی کاپٹر کو تباہ کیا ہے اور وہ اب شانتی نگر میں تمھاری حراست میں ہیں۔ میں تم سے فوری طور پر انتہائی ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس ان غداروں کے خلاف ثبوت کے لیے ایک خط ہی کافی ہے جو مجھے جائے وقوعہ سے ملا ہے۔ میرے پاس آؤ تاکہ تمھیں یہ خط دکھاؤں۔'' SHO کے لیے میری اچانک آمد، میرا انداز گفتگو اور ایسٹرن آرمی کی انٹیلی جنس سے میرا تعلق ہونا اتنا غیر متوقع تھا کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل سلب ہو گئی۔ میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا

ہوگیا۔ SHO اپنی کرسی سے اٹھا، مجھے سلیوٹ کیا اور میرے پاس آگیا۔ قیصر میری ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ SHO کے اپنے قریب آتے ہی میں نے جیب سے سائیلنسر والا پسٹل نکالا اور اس کی کنپٹی سے لگادیا اور اس کا سرکاری ریوالور بیلٹ کے پاؤچ سے نکال لیا۔ اسی وقت قیصر ASI پر جھپٹا جو ہماری طرف دیکھ رہا تھا اور اپنا ریوالور اس پر تان کر اس کا سرکاری ریوالور لے لیا۔ ان دونوں پولیس والوں کو میں نے کمرے کی دیوار سے ساتھ ساتھ کھڑے ہوکر ہاتھ سر پر باندھنے کو کہا جس کی بلاچون وچرا انھوں نے تعمیل کی۔ کمرے کے دروازے پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دونوں کو اپنے پسٹل کی زد میں لیتے ہوئے قیصر کو کہا کہ دروازے پر بیٹھے سپاہی کو کہے کہ SHO نے ہیڈ محرر کو فوری طور پر مال خانے، اسلحہ خانے اور حوالات کی چابیاں لے کر آنے کا کہا ہے۔ قیصر نے سپاہی کو پیغام دینے کے لیے دروازہ کھولا اور ہنستے ہوئے پلٹ کر مجھے کہا۔ ''ہمارے ساتھیوں نے یہ کام پہلے ہی کر رکھا ہے اور تھانے کا سارا عملہ سروں پر ہاتھ باندھے الٹا لیٹا ہے۔'' میرے کہنے پر قیصر نے دروازہ بند کردیا۔ میں ہر قسم کے رسک کو بھی ممکن حد تک کم کرنا چاہتا تھا اور میری نگاہ میں دشمن کو زندہ رکھنا بڑا رسک تھا۔ میں نے یکے بعد دیگر SHO اور ASI کی کنپٹیوں پر اپنے پسٹل کی نال رکھ کر دو فائر کیے۔ میرے پسٹل کا سائیلنسر بہت اعلیٰ کوالٹی کا تھا۔ ٹھس کی ہلکی سے دو آوازیں آئیں اور دونوں پولیس والے گولیاں لگنے کے بعد ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لینے کی کوشش میں ناخنوں سے دیوار کھرچتے ہوئے فرش پر گر کر ڈھیر ہوگئے۔ ان کے دونوں پسٹل اپنی جیبوں میں ڈال کر ہم SHO کے کمرے سے باہر آئے۔ وہاں عجیب سماں تھا۔ تھانے کے درمیانی بڑے کمرے میں تھانے میں موجود سارا عملہ بالکل خاموش سروں پر ہاتھ باندھے فرش پر الٹا لیٹا ہوا تھا۔ JCO نے ہیڈ محرر سے اسلحہ خانے، مال خانے اور حوالات کی چابیاں لے لی تھیں اور قیصر کے سارے ساتھی حوالات سے باہر کھڑے تھے۔ میں نے پولیس والوں کے دونوں ریوالور قیصر کے ساتھیوں کو دیے۔ دو تھائیوں کو تھانے کی عمارت کے باہر اور کمپاؤنڈ کے اندر پہرے پر لگایا۔ JCO اپنے ایک سپاہی کے ساتھ اسلحہ خانے اور مال خانے کے تالے کھولنے لگا۔ اس بڑے درمیانی کمرے میں ہی SHO، ہیڈ محرر، اسلحہ خانے، مال خانے اور حوالات کے دروازے تھے۔ ہیڈ محرر اتنا خوفزدہ تھا کہ JCO کو اس نے چابیوں کے دو بڑے گچھوں میں سے خود ہی ہماری مطلوبہ چابیاں تھمادی تھیں۔ مال خانے کے اندر بہت کچھ سامان پڑا تھا۔ قیصر کے ساتھیوں نے وہاں سے صرف اپنا اپنا اسلحہ اور گولیاں اٹھالیں۔ اب اسلحہ خانے کا دروازہ کھولا گیا۔ وہاں پر پرانی تھری ناٹ تھری کی رائفلیں، دو سٹین گنیں ایک آنسو گیس پھینکنے والی گن اور اس کے درجنوں شیل اور تمام اسلحے کی بے شمار گولیاں پڑی تھیں۔ میں نے ساتھیوں کو دونوں سٹین گنیں، ان کی گولیاں، فالتو میگزین اور سرکاری ریوالوروں کی خاصی تعداد میں گولیاں اُٹھانے کا کہا۔ ہم اسلحہ خانے سے باہر آگئے۔ فرش پر لیٹے ہوئے کل سولہ پولیس والے تھے۔ بھارتی بنگال اور بنگلہ دیش میں ASI سے کم عہدے کے پولیس والے قمیص اور ڈھیلی نیکریں پہنتے ہیں۔

ان میں سے کئی کی خوف کے مارے نیکریں خراب ہوچکی تھیں۔ پہلے سے فیصلہ ہونے کے باوجود انھیں ہلاک کرنے کی میری نیت ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ میرے اسی خیال اور سوچ میں چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ ایک سپاہی یکلخت کھڑا ہوگیا اور قیصر کے ایک ساتھی پر جھپٹا۔ اسی لمحے میں پسٹل سے گولی نکلی اور اس کی پشت میں جا لگی۔ وہ چیخنے لگا تو میری دوسری گولی نے اسے بالکل خاموش کرادیا۔ میرے دل میں چند لمحوں کے لیے ہمدردی کا جو جذبہ ابھرا تھا وہ پھر وحشت اور درندگی میں بدل گیا۔ میں نے قیصر کے دو ساتھیوں کو باہر پہرے پر لگا کر دونوں تھائیوں کو اندر بلوالیا اور انھیں مال خانے میں جانے کو کہا۔ نمبر ٹو بھی ان کے ساتھ ہی مال خانے میں چلا گیا۔ فوجی ایک ایک سپاہی کو ٹھوکر مار کر اٹھاتے اور اسے سر پر ہاتھ باندھے مال خانے کے اندر لے جاتے۔ اندر تھائی اتنی صفائی اور پھرتی سے ان کی گردنیں کاٹ رہے تھے کہ باہر ذرا سی بھی آواز نہیں آتی تھی البتہ ان کا خون بہہ کر بڑے کمرے میں آرہا تھا۔ ان پندرہ سپاہیوں اور ہیڈ محرر کو (ایک سپاہی تو میری گولیوں سے پہلے ہی ہلاک ہوچکا تھا) پورے اکیس منٹ میں جہنم رسید کرکے نمبر ٹو اور اس کے دونوں ساتھی مال خانے سے باہر آگئے۔ قیصر کے ساتھیوں نے مال خانے، اسلحہ خانے، حوالات اور SHO کے کمرے کو تالے لگائے۔ دونوں تھائیوں کی قمیصیں سپاہیوں کے خون سے لال ہورہی تھیں۔ انھوں نے جھٹ پٹ قمیصیں بدلیں اور ہم سب تھانے سے باہر آگئے۔ تھانے کی مین بلڈنگ میں داخلی دروازے کو بھی تالا لگادیا گیا۔ قیصر نے جیپ کا ڈسٹری بیوٹر کور اور گورنر نکال لیا۔ رضی ابھی تک باہر کھڑا تھا۔ بنگلہ دیشی فوجیوں سے چھینی ہوئی ایک رائفل میں نے بمعہ گولیوں کے رضی کو دلوائی اور تھائی ساتھی کو اس کے بدلے سٹین گن دی۔ اس ساری کارروائی میں ہمارے اندازاً پینتالیس منٹ صرف ہوئے تھے۔ رات کا گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہم خاموشی سے رانا گھاٹ کی طرف چل پڑے۔ کلپنا تھانے سے تھوڑی دور ہی اندھیرے میں کھڑی ہمارا انتظار کررہی تھی۔ اس کے پاس پڑا سامان اٹھالیا گیا۔ قیصر نے ایک عقلمندی کی تھی کہ شانتی پور سے اس نے بڑے ٹارچ اور سیل خرید لیے تھے۔ JCO کی رہنمائی میں ہم نے رانا گھاٹ کی طرف تیز رفتاری سے بڑھنا شروع کیا۔ ہم تھانے کے ٹیلی فون کی تاریں کاٹنا بھول گئے تھے۔ قیصر نے مجھے یاد دلایا تو میں نے کہا ''تھانے میں کوئی زندہ ہوگا تو جواب دے گا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بج بج کر خود ہی خاموش ہوجائے گی۔''

چودھواں باب

ٹیلی فون کی لائن نہ کاٹنے کی غلطی تو محض ہماری جلد بازی اور غفلت کی وجہ سے ہوئی تھی اس کا جواب دے کر میں نے وقتی طور پر تو قیصر کو مطمئن کر دیا تھا اور خود بھی اسے زیادہ اہمیت نہ دی لیکن میری اس حد سے زیادہ خود اعتمادی اور چوک کا ہم کو بہت جلد خمیازہ بھگتنا پڑا۔ واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں آئندہ پیش آنے والے حالات کی وجہ یہاں بیان کرتا ہوں جس کا علم ہمیں بعد میں ہوا۔ SHO کے گھر پر بھی ٹیلی فون تھا۔ جب روز کے معمول سے زیادہ وقت گزرنے پر بھی SHO گھر نہ پہنچا تو اس کے گھر والوں نے تھانے فون کیا۔ کوئی جواب نہ ملنے پر آئندہ دو تین گھنٹوں میں جب نہ تو SHO گھر آیا اور نہ ہی تھانے سے کسی نے فون Attend کیا تو اس کے گھر والوں نے اپنے ملازم کو تھانے بھیجا۔ جس نے واپس آ کر بتایا کہ تھانے کے مین گیٹ پر تھالا لگا ہوا ہے اور تھانے کی سب بتیاں روشن ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ تھانیدار کے باپ نے جو ایک ریٹائرڈ فوجی تھا، جب خود تھانے جا کر تالا لگا دیکھا تو وہ سیدھا شانتی نگر کے قریب ہی فوجی چوکی پر گیا اور چوکی کے انچارج میجر کو صورت حال بتائی۔ میجر اپنے چند سپاہیوں اور تھانیدار کے باپ کو لے کر اپنی جیب میں تھانے پہنچا اور وہ مین گیٹ کا تالا توڑ کر اندر داخل ہوئے۔ تھانے کی اندرونی عمارت کا دروازہ کھول کر جب وہ مین ہال میں داخل ہوئے تو مقتولین کے خون سے فرش بھرا ہوا تھا۔ تھانے میں داخل ہونے کے بیس منٹ کے اندر ہی ساری صورت حال ان پر واضح ہوگئی۔ میجر نے SHO کے فون سے ہی پولیس اور فوج کے اعلیٰ حکام سے رابطہ کیا اور ایک گھنٹے میں ہی شانتی پور سے باہر نکلنے کے تمام راستوں کی ناکہ بندی کردی گئی بلکہ بنگلہ دیش سے ملنے والے سرحدی نگرانوں (BSF) کو بھی چوکس کر دیا گیا۔ تھانے کے بڑے کمرے میں بہنے والے خون سے ہم میں سے کئی کے جوتے لتھڑ گئے

تھے اور ہمارے ان خونی قدموں کے نشان رانا گھاٹ کے راستے پر بھی پائے گئے۔ دونوں تھائی مقتولین کے خون کے چھینٹوں سے بھری قیمصیں بھی وہیں چھوڑ گئے تھے۔ فوجیوں نے فوری طور پر سراغ رساں کتے منگوائے جنھوں نے ان قیمصوں کی بو پر تھائیوں کا پیچھا کرنا اور ہم سب تک پہنچنا تھا۔ فوجیوں اور پولیس کے اعلیٰ حکام کی شانتی پور میں آمد اور ہمیں پکڑنے کے انتظامات میں دو گھنٹے سے زائد صرف ہوگئے۔ رانا گھاٹ کی طرف ہمارے جانے کا یقین ہونے پر خصوصی طور پر فوجی سراغ رساں کتے، فوجی جوانوں اور قریبی پولیس کی چوکیوں کی نفری کی ٹولیاں ہمارے تعاقب کے لیے تیار کی گئیں۔ اب ہماری سنیے! ہمیں مسلسل چلتے ہوئے تقریباً چھ گھنٹے ہو چکے تھے اور ہم تھکن سے بے حال دس پندرہ منٹ ستانے کے لیے رکے ہوئے تھے کہ ہمیں اپنے پیچھے درختوں کے گرے ہوئے پتوں کے چرمرانے کی آواز آئی۔ ہم سب چوکنے ہوگئے لیکن ابھی کچھ سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ مدھم لائیٹ والے سائیکل پر بھارتی فوجی وردی پہنے ایک جوان ہمارے پاس آ کر سائیکل سے اترا اور ہانپتے ہوئے بنگالی زبان میں بولا ”مجھے فوراً اپنے لیڈر سے ملواؤ“ اس کے وہاں پہنچتے ہی ہم نے اپنے سائیڈ آرمز (چھوٹا اسلحہ) نکال لیے تھے۔ JCO اسے میرے پاس لے آیا اور اسے کہا کہ یہ ہمارے لیڈر ہیں۔ بھارتی فوجی نے بنگالی زبان میں جو کچھ کہا اس کا ترجمہ JCO نے اردو میں کہا (JCO بیس برس سے زیادہ عرصے سے فوج میں تھا اور سقوط ڈھاکہ سے قبل کراچی اور لاہور میں بھی تعینات رہ چکا تھا اور بخوبی اردو بولتا تھا) قسط کے شروع میں شانتی پور کے حالات اسی نے بتائے تھے۔ بھارتی فوج کا یہ JCO بھی مسلمان تھا اور مسلمانوں اور پاکستان سے ہمدردی کے جذبات رکھتا تھا۔ اسے جب ہمارا تعاقب میں جانے کے انتظامات کا علم ہوا تو اپنے ہمدردی کے جذبے پر قابو نہ پاسکنے کے باعث وہ ہمیں یہ سب بتانے کے لیے اپنے سائیکل پر رات کو ٹھوکریں کھاتا اور گرتا پڑتا ہم تک پہنچا تھا۔ چونکہ ہمارے خلاف آپریشن میں یہ خود شریک نہ تھا لہٰذا اسے موقع مل گیا کہ ہم پر اچانک افتاد پڑنے سے قبل ہمیں آگاہ کر سکے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس راستے پر چونکہ جیپ اور ٹرک نہیں آسکتے اس لیے ہمارے تعاقب میں آنے والی ٹیمیں پیدل ہی آ رہی ہوں گی لیکن سورج طلوع ہونے پر بھارتی فوج کے ہیلی کاپٹر بھی ان ٹیموں کی مدد کے لیے آجائیں گے۔ وہ بھارتی فوجی صرف پندرہ منٹ ہمارے پاس رکا اور یہ کہتے ہوئے ہم سے رخصت ہوا ”میں نے مسلمان ہونے کے ناطے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ آگے آپ کی قسمت، اللہ آپ کو دشمن سے بچائے اور اور آپ کی رہنمائی کرے“ وہ یہ کہہ کر اور ہم سے رخصت ہو کر کچھ آگے جا کر غائب ہوگیا لیکن میں آج تک اس کے مذہبی فرض کی ادائیگی پر اسے غائبانہ سلیوٹ کرتا ہوں۔ اس کے جانے کے پانچ منٹ کے اندر ہی ہم آگے کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ مجھے رہ رہ کر اس بھارتی فوجی کا خیال آ رہا تھا کہ اسے کیسے معلوم ہوا کہ گروپ لیڈر یعنی میں مسلمان ہوں۔ میرے ساتھیوں کے سوا سارے شانتی پور میں کسی کو بھی علم نہ تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ ہوٹل

میں بھی میں نے رابرٹ مائیکل اور بھارتی شہری ہونے کا اندراج کرایا تھا۔ میں جتنا اس کے متعلق سوچتا، اتنا ہی میرا دماغ الجھتا جاتا۔ بالآخر میں نے اسے اللہ پاک کی طرف سے غیبی امداد سمجھا۔

ہم سب بہت پریشان تھے۔ ہمیں بیک وقت کئی اطراف سے دشمنوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ کھوجی کتے، فوجی اور پولیس کی تعاقبی ٹیمیں۔ بھارتی بارڈر فورس (BSF) کے علاوہ فوجی ہیلی کاپٹر اور پھر دریا عبور کرنے کی مشکلات، یہ سب مشکلات اور مصیبتیں ہم پر بیک وقت نازل ہو چکی تھیں۔ میں نے کھوجی کتوں کو بھٹکانے کے لیے سب سے پہلے بیس منٹ کے فاصلے پر اگے دو درخت چنے اور دونوں تھائیوں کو کہا کہ وہ ان دونوں کے گرد OO کی شکل میں دس مرتبہ گھومیں کیونکہ کھوجی کتے تھائیوں کی بو پر ان دونوں درختوں کے گرد اسی شکل میں گھومتے رہیں گے اور آگے نہیں بڑھیں گے۔

ہمارا تعاقب کرنے والی ٹیموں کے خطرے سے بہت زیادہ خطرہ ہمیں BSF اور ہیلی کاپٹروں سے تھا۔ ہماری ساتھی JCO کے مطابق رانا گھاٹ خاصا مشہور اور دریا پار جانے کا اس علاقے میں واحد راستہ تھا۔ اس گھاٹ سے ہمیں کرائے کی بادبانی کشتی میں سفر کرنا تھا۔ رانا گھاٹ بھارتی علاقہ اور سرحد سے قریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ JCO نے کہا کہ رانا گھاٹ جانا تو صریحاً خودکشی کے مترادف ہے کیونکہ ہمارا تعاقب کرنے والوں کا سارا زور ہمارے قدموں کے نشانوں کے مطابق اسی طرف ہوگا۔ اس علاقے سے واقفیت کی بنا پر اس نے کہا کہ میرے خیال میں ہمارے بچنے کی صرف ایک موہوم سی صورت ہے۔ اس وقت ہم رانا گھاٹ کے قریب ہیں۔ ہم یہیں سے اپنا راستہ تبدیل کر کے کالنا (Kalna) جاتے ہیں اور وہاں سے بس میں سفر کر کے بردھامن (Barddhaman) چلتے ہیں۔ یہ ایک بڑا شہر اور ریلوے جنکشن بھی ہے اور یہاں میرے قریبی سسرالی دوست رہتے ہیں۔ وہ ہمیں یقیناً پناہ بھی دیں گے اور ہماری محفوظ روانگی کا انتظام بھی کر دیں گے۔ میں اس تمام علاقے سے بالکل ناواقف تھا۔ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے JCO کی تجویز مان لی۔ اس کی دو اور وجوہات بھی تھیں۔ بھارتی مسلمان فوجی کے مطابق BSF کو چوکنا کر دیا گیا تھا اور رانا گھاٹ کی طرف ہمارے قدموں کے نشان دیکھ کر بھارتی تعاقب کرنے والی ٹیموں کا یہی خیال ہوگا کہ ہم رانا گھاٹ سے سرحد عبور کر کے بنگلہ دیش میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ بھارتی سرحد اور رانا گھاٹ کو تو انہوں نے یقیناً سیل (Seal) کر دیا ہوگا۔ بعین ایسے ہی حالات کی وجہ سے دہلی میں DMI کی حراست سے فرار ہو کر میں نے بجائے پاکستان کا رخ کرنے کے بھارت کے انتہائی اندر اور بمبئی جیسے بڑے شہر میں جانے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی فیصلے کی بدولت بھارتی حکومت اخباروں میں میری لاکھوں تصاویر شائع کروانے کے باوجود مجھے گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بقول JCO اس کے دوست ہمارے آئندہ کے محفوظ سفر کا بھی انتظام کر دیں گے تو وہ قیصر اور اس کے ساتھیوں کا بھی بھارت کے اس اندرونی شہر سے دہلی جانے کا

انتظام بھی بہت آسانی سے کر سکتے تھے۔ ہم نے فوری طور پر راستہ بدلا اور بجائے جنوب مشرق کے مغرب کی طرف چل پڑے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم کالنا پہنچے۔ سورج ابھی طلوع ہو رہا تھا۔ بردھامن جانے والی پہلی بس میں ہم علیحدہ علیحدہ بیٹھ گئے۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک پر تقریباً سو کلومیٹر کا فاصلہ پانچ گھنٹے میں طے کر کے ہم بردھامن پہنچے۔ یہاں بھی سائیکل رکشاؤں کی بہتات تھی۔ JCO سب سے آگے والے رکشے میں سوار تھا اور اس کے پیچھے ہمارے رکشاؤں کی قطار تھی۔ ہمارے رکشاؤں کو قدرے فاصلے پر روک کر JCO اپنے سسرالی دوست کے گھر گیا اور تھوڑی ہی دیر میں اپنے دوست کے ساتھ لوٹ آیا۔ ہم نے احتیاطاً اپنے رکشاؤں کو وہیں سے فارغ کر دیا اور دو دو کی ٹولی میں غیر محسوس طور پر JCO کے دوست کے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ درمیانے درجے کا گھر تھا جس میں ڈرائنگ روم وغیرہ نہیں بلکہ بیرونی کمرے میں ہی مہمانوں کو بٹھایا جاتا تھا۔ JCO نے ہماری واردات کو گول کرتے ہوئے اپنے دوست سے ہمارا رسمی تعارف کروایا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ بھارتی تفتیش کا دائرہ وسیع ہو، کم از کم قیصر اور اس کے ساتھی اور کلپنا بھارتی بنگال سے نکل جائیں۔ میرے کہنے پر JCO اپنے دوست کے ہمراہ ریلوے سٹیشن گیا اور کلکتے کی چھ ٹکٹیں لے آیا۔ کلکتہ سے ہوڑا ایکسپریس سیدھی دہلی جاتی تھی۔ شام سات بجے قیصر اور اس کے ساتھی اور کلپنا ہم سے پہلے کی طرح گلے مل کر رخصت ہوئے۔ JCO کو میں نے کہا کہ جب تک ٹرین چل نہ پڑے وہ سٹیشن پر ہی رہے۔ JCO ساڑھے آٹھ بجے واپس لوٹا اور کہنے لگا کہ وہ ٹرین کے روانہ ہونے کے بعد واپس لوٹا ہے اور سٹیشن پر کسی قسم کی خلاف معمول کوئی سرگرمی دکھائی نہیں دی۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ بھارت کے سب سے زیادہ آبادی والے شہر کلکتہ میں قیصر اپنے ساتھیوں سمیت بالکل محفوظ ہوگا کیونکہ بھارتی تحقیقاتی اور تعاقب کرنے والی ٹیموں کے لیے ہم کوئی شناخت بھی چھوڑ نہیں آئے تھے۔ جو ہمیں پہچانتے تھے وہ صرف پولیس والے تھے جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا تھا اور میں چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ بھارتی تعاقبی ٹیمیں رانا گھاٹ پر ہر آنے والے شخص کی بھرپور تلاشی لینے اور پوچھ گچھ کرنے کے بعد انہیں کلیئر (Clear) کرنے کے بعد خود کس قدر مایوسی کا شکار ہو رہی ہوں گی۔ قیصر کو روانگی کے وقت میں نے اس کے جواہرات اور ڈالر لوٹاتے وقت مزید دو ہزار ڈالر دیے اور اسے کہا کہ دہلی پہنچ کر کرنل مزمل کو PCO سے فون کر کے اپنے بخیریت پہنچنے کی اطلاع دے۔ قیصر نے اپنے ساتھیوں اور کلپنا کے ساتھ پہلے دہلی جانا تھا اور کلپنا کو جسے اس نے اپنی بہن بنالیا تھا، اپنے گھر میں چند روز رکھ کر اور سفر کی تھکان اتار کر پھر دارجلنگ چھوڑنے جانا تھا۔ کلپنا کا بھی چونکہ کوئی قریبی اور خونی رشتہ دار موجود نہیں تھا اس لیے اسے بھی دراجلنگ جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ قیصر اور اس کے ساتھیوں کے جانے کے بعد ہماری تعداد پھر بھی اتنی زیادہ تھی کہ اس گھر میں ہم سب سما نہیں سکتے تھے۔ JCO کے دوست نے اپنے بھائی کے گھر میں ہم میں سے نصف کی رہائش کا انتظام کیا۔ میں، نمبر ٹو اور تھائی

ساتھیوں کے ساتھ میزبان کے بھائی کے گھر میں چلا آیا جو اس کے گھر سے قریب ہی تھا۔ بردھامن میں ہمیں رہتے چار روز بیت گئے لیکن واپسی کا کوئی معقول اور مناسب راستہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہماری کی ہوئی واردات معمولی نہ تھی کہ چند روز کی تفتیش کے بعد اسے بھلا دیا جائے۔ اب تک تفتیش کا دائرہ یقیناً وسیع ہوچکا ہوگا۔ بردھامن اتنا بڑا شہر نہ تھا کہ ہم کسی کی نگاہ میں آئے بغیر یہاں اپنے قیام کو بے فائدہ طول دیتے۔ بہت سوچ و بچار کے بعد ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ کلکتے چلا جائے۔ وہاں سے کارگوشپ (مال بردار سمندری جہاز) اور چھوٹے بڑے اسٹیمر بآسانی مل سکتے تھے۔ میرے پاس ڈالر بھی ختم ہونے والے تھے۔ کلکتے کی مارکیٹ میں، میں چند جواہرات بیچ کر اپنی ضرورت بھی پوری کرسکتا تھا۔ یہ فیصلہ ہونے کے بعد اسی شام ہم کلکتے کے لیے روانہ ہوگئے۔۔ تینوں فوجیوں کو ملاکر ہم کل آٹھ افراد تھے۔ دس گھنٹے کے سفر کے بعد ہماری ٹرین کلکتہ پہنچ گئی اور ہم نے چوک بازار میں راجیہ ہوٹل میں کمرے لے لیے۔

راجیہ ہوٹل میں بھی ہم نے بھارتی شہری اور ہندو ناموں کا اندراج کرواکے کمرے لیے تھے۔ یہ اوسط سے ذرا اونچے معیار کا ہوٹل تھا اور اس دور میں اس کے سنگل کمرے کا کرایہ دوسو روپیہ روزانہ تھا۔ کلکتہ ایک بہت وسیع اور دور تک پھیلا ہوا شہر ہے۔ جیسے پاکستان میں پنج ند کے مقام پر پانچ دریاؤں کا پانی مل کر ایک بہت بڑے دریا کی صورت اختیار کرلیتا ہے، ویسے ہی بھارت میں کلکتہ کے قریب گنگا سمیت کئی دریا مل کر سمندر میں گرتے ہیں۔ ان کئی دریاؤں کے ملنے سے دریا کا پاٹ بہت چوڑا اور گہرائی بہت زیادہ ہے۔ ایشیا کا مشہور ہوڑا برج (Hoara Bridge) کلکتے کے شہر کے ان دو حصوں کو ملاتا ہے جن کے بیچ سے یہ دریا بہتا ہے۔ بھارت کے اس سب سے زیادہ آبادی والے شہر میں میلوں دور تک پھیلی ہوئی کالونیاں ہیں لیکن چوک بازار کی کلکتہ میں وہی مرکزی حیثیت ہے جو کراچی میں صدر اور ایمپریس مارکیٹ کی ہے۔ میں نے ہوٹل سے دہلی میں عارف اور نذیر کے گھروں میں فون کرکے قیصر اور اس کے ساتھیوں کی دہلی بخیریت واپسی کے متعلق پوچھا۔ میرے یہ دونوں مخلص دوست میری کلکتے میں آمد پر بہت حیران ہوئے اور خیروعافیت دریافت کرنے اور دوستانہ گلے شکوے کرنے بعد دونوں نے بتایا کہ قیصر اور اس کے ساتھی ابھی تک دہلی نہیں پہنچے۔ یہ بات سن کر مجھے بڑا اچنبھا ہوا کیونکہ ہم سے چار روز پیشتر قیصر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بردھامن سے کلکتے کے لیے روانہ ہوا تھا اور اب تک انھیں دہلی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے عارف کو کہا کہ میں ایک گھنٹے بعد اسے دوبارہ فون کروں گا اور اتنی دیر میں وہ قیصر کے گھر والوں سے پتہ کرے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ دہلی پہنچ کر اس نے ابھی تک ان سے رابطہ نہ کیا ہو۔ میں قیصر کے دہلی نہ پہنچنے سے پریشان ہوگیا تھا اور کئی قسم کے وہموں اور اندیشوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ اس بات کا بھی بڑا امکان تھا کہ بردھامن سے کلکتے یا کلکتے سے دہلی کے سفر کے دوران وہ کسی افتاد کا شکار نہ ہوگئے ہوں۔ ایک گھنٹے بعد میرے فون

کرنے پر عارف نے بتایا کہ قیصر کے گھر والوں نے بتایا ہے کہ اس کا تین روز قبل کلکتے سے ہی فون آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت چند روز میں دہلی پہنچ جائے گا۔ یہ جان کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ میرے نمبرٹو اور اس کے ساتھیوں نے جو تھائی لینڈ سے روانگی کے وقت سے اب تک صرف اپنی ڈیوٹی نبھاتے قیدیوں کی طرح پابند تھے، یہاں پہنچ کر ذرا آزادی کا سانس لیا اور مجھ سے شہر میں گھومنے کی اجازت مانگی۔ میں نے ان کے ہمراہ دو فوجیوں کو بھیجا تاکہ اگر کوئی مشکل پڑے تو وہ ساتھ دے سکیں اور اگر راستہ بھول جائیں تو فوجیوں کے بنگالی زبان جاننے سے ہوٹل واپس پہنچ سکیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے مگھ اور مورنگ کے جواہرات میں سے تکونے یاقوت علیحدہ کیے اور باقی سب کو فروخت کرنے کے لیے JCO کے ہمراہ جواہرات کی مارکیٹ میں چلا گیا۔

ناتراشیدہ جواہرات خریدنے والے یوں تو بے شمار جوہری تھے لیکن صرف دو ایسے جوہری تھے جو بڑے سے بڑا مال خریدنے کی استطاعت رکھنے کی شہرت کے حامل تھے۔ ہم ان میں سے پہلے جوہری کے پاس گئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرکے دکان کے مالک کو علیحدہ کمرے میں اپنے جواہرات کا ذخیرہ دکھایا۔ وہ بجلی کی تیز روشنی میں ایک ایک پتھر کو غور سے دیکھتا اور اسے علیحدہ رکھ کر کاغذ پر کچھ تحریر کرتا۔ سب جواہر کا معائنہ کرنے کے بعد وہ کہنے لگا۔ ”آپ سارے جواہر اکٹھے ہی کیوں نہیں لے آئے۔ شاید آپ نے ایسا اس لیے کیا ہوگا کہ میں اتنے سارے پتھر یا تو خرید نہ سکوں اور یا پھر ان کی کم قیمت لگا دوں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم ایماندار کاروباری ہیں اور راجے مہاراجے اپنے موروثی جواہرات بھی ہمارے پاس فروخت کرتے ہیں اور میں بھگوان کی کرپا سے یہ کھیپ اور پہلی کھیپ سے پچاس گناہ زیادہ جواہر خریدنے کی طاقت رکھتا ہوں“ مجھے اس کی بات سمجھ میں نہ آئی اور میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ جوہری اپنی بات کی وضاحت میں کہنے لگا۔ ”دو روز پیشتر دو صاحب ایسے ہی جواہرات فروخت کرنے میرے پاس آئے تھے۔ ان کے جواہرات میں ایک نیلم بالکل اسی وزن اور نمونے کا تھا اور بالکل اسی کی طرح سینکڑوں برس قدیم طریقے پر اسے لاکٹ کی صورت دی گئی تھی اور اسی طرح کا ایک سوراخ اس کے کونے پر بھی تھا۔ اسی لیے میں نے یہ بات آپ سے کی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے جوہری نے نیلم کا ایک ٹکڑا اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے نہ تو کبھی ان جواہرات کو غور سے دیکھا اور پرکھا تھا اور نہ ہی قیصر کو اس کے اس ساتھیوں کا حصہ جواہرات میں سے چن کر دیا تھا۔ میرے استفسار پر کہ پہلی کھیپ لانے والے کیا جواہرات بیچ گئے ہیں؟ جوہری نے جواب دیا ”ہمارا سودا پرسوں طے ہوگیا تھا۔ کل اتوار تھا لہٰذا آج وہ جواہرات لے کر اپنی رقم لینے آئیں گے۔ کلکتے کے اس جوہری نے ہم سے اتنا بڑا سودا کرنے کے لیے ہماری آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ناتراشیدہ جواہرات کی صحیح قیمت لگانا خاصا مشکل کا ہے۔ جوہری نے اپنے بھائی کو بھی وہیں بلالیا اور وہ پھر سے ایک ایک کرکے ان کا وزن اور تراشنے کے بعد کے وزن کا موازنہ کرکے قیمت

لگانے لگے۔ ہمیں وہاں بیٹھے ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ دکان کے ملازم نے کمرے میں آکر جوہری کو بنگالی میں کچھ بتایا۔ JCO نے مجھے سرگوشی میں کہا کہ ملازم نے مالک کو کہا ہے کہ پرسوں جواہر بیچنے والے آگئے ہیں۔ جوہری شاید یہ چاہتا تھا کہ ہمارا ٹاکرہ نہ ہو۔ اس لیے میں نے خود ہی اسے کہہ دیا کہ ہمارے ان ساتھیوں کو یہیں بلوالیں۔ جوہری نے بادل نخواستہ انھیں بھی اسی کمرے میں بلوایا۔ میرے سامنے قیصر اور اس کے دو ساتھی ہمیں یہاں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ میں نے آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے قیصر اور اس کے ساتھیوں سے رسمی سا ہاتھ ملایا اور کہا کہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم بھی ایسی دکان پر آئے جہاں آپ نے جواہر فروخت کیے ہیں۔ تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد میں نے جوہری کو کہا کہ آپ اب ان کی قیمت لگائیں۔ جوہری نے بھائی سے سر جوڑ کر مشورہ کرنے کے بعد مجھے نوے لاکھ کی آفر دی۔ میں بھارتی ہندو اور خصوصاً مارواڑیوں کی فطرت سے بخوبی آگاہ تھا۔ میں نے کہا ”لالہ جی! کیا آپ مذاق کررہے ہیں؟ ان انمول جواہرات کو نوے لاکھ میں فروخت کرنے سے تو بہتر ہے کہ میں انھیں سمندر میں پھینک دوں۔ مجھے یہ سودا منظور نہیں۔“ میں نے اپنے جواہرات سمیٹتے ہوئے قیصر کو کہا۔ ”تم بھی سودا کینسل کرو۔ ان جواہرات کی صحیح قیمت ہمیں یہاں نہیں ملے گی۔“ جوہری نے جو یہ دو بڑے سودے ہاتھ سے نکلتے دیکھے تو گھبرا گیا اور کہنے لگا ”آپ بتایئے آپ کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”لالہ جی! ان جواہر کو خریدنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ آپ نے اتنی کم قیمت لگائی ہے کہ آپ سے Bargaining (سودا بازی) بھی ممکن نہیں۔ قیصر نے اسی دوران مجھے بتایا کہ جوہری نے اسے چھبیس لاکھ کی آفر دی تھی جسے اس نے جواہر کی شناخت نہ ہونے پر منظور کرلیا تھا۔ ہم جانے لگے تو جوہری نے کہا کہ میں دونوں کے جواہر کا دو کروڑ دینے کو تیار ہوں۔ ہمارے انکار اور کمرے سے باہر نکلتے وقت وہ سوا دو کروڑ پر آگیا۔ میں نے اسے کہا۔ ”اسی لیے میں نے اپنے ساتھی کو پہلے آپ کے پاس بھیجا تھا اور دو روز بعد خود آیا۔ بہرحال ہم نے اگر انھیں پھینکنا بھی ہوا تو تین کروڑ سے کم میں نہیں پھینکیں گے۔ آپ سوچ لیجیے۔ ہم پرسوں پھر آئیں گے۔ ممکن ہے اس دوران ہمیں ہماری توقع سے بھی زیادہ اچھی آفر مل جائے“ لالہ جی نیم رضامند تھے۔ کہنے لگے ”اپنا ایڈریس دے جائیں۔ میں مشورہ کرکے آپ سے رابطہ کروں گا۔“ ”ایسے سودوں میں ایڈریس نہیں دیا جاتا۔ ہم پرسوں پھر آئیں گے بشرطیکہ ہمیں اس سے اچھی آفر نہ ملی۔“ یہ کہہ کر میں JCO، قیصر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ دکان سے باہر آگیا۔ کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد ہم نے دو ٹیکسیاں لیں اور راجیہ ہوٹل آگئے۔ قیصر اور اس کے ساتھیوں کو گلے سے لگاتے ہوئے میں نے اسے کہا کہ جان بوجھ کر حفاظتی نقطۂ نظر سے میں نے دکان میں ان سے رسمی علیک سلیک کی تھی۔ ان کے لیے تو میں بے حد فکرمند تھا اور آج صبح تین بار میں نے عارف اور نذیر کو فون کرکے آپ کے بخیر واپس لوٹنے کے متعلق پوچھا۔ میرے تیسرے فون پر جب عارف نے تمہارے گھر والوں سے رابطہ

کرکے مجھے بتایا کہ تم نے اپنے گھر والوں کو چند روز میں واپس لوٹنے کا کہا ہے تو میری جان میں جان آئی۔ جوہری کی دکان پر اتفاقیہ ملنے پر ہم سب بہت خوش تھے۔ قیصر نے بتایا کہ وہ اپنے ساتھیوں اور کلپنا کے ساتھ ایمبیسڈر ہوٹل میں مقیم ہے۔ اس نے دبی زبان میں کہا کہ وہ جواہرات کو یہاں اس لیے فروخت کرنا چاہتا تھا کہ اپنے سب ساتھیوں اور کلپنا کو ان کا حصہ دے دے۔ دہلی میں ان جواہر کو فروخت کرنے سے وہ اس لیے گھبراتا ہے کہ وہاں کا رہائشی ہونے کے باعث بہت سے لوگ اس کی اصلی والی حالت جانتے ہیں اور اتنی مالیت کے جواہرات وہاں فروخت کرنے سے اس کی حیثیت مشکوک ہوسکتی ہے۔ قیصر نے مزید یہ کہا کیوں نہ یہاں کے جوہری کے پاس وہ کم از کم اپنے حصے کے جواہرات ہی فروخت کردے کیونکہ اس کے ساتھی جلد از جلد اپنے گھروں کو جانے کے لیے بیتاب ہیں۔ میں نے قیصر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ مارواڑی ہندو اپنے باپ کو بھی ڈنڈی مارنے سے نہیں چوکتے۔ تمہارے ساتھیوں کو میں سمجھاتا ہوں۔ جہاں اتنا عرصہ وہ اپنے گھروں سے علیحدہ رہیں ہیں وہاں مزید صرف چند روز اور سہی۔ میں نے جو سوچا ہے اگر ویسا ہوگیا تو ہمیں اس مارواڑی کی آفر سے دگنی سے بھی زیادہ رقم مل سکتی ہے۔ میں نے قیصر کو اشارہ کیا اور وہ میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر چلا آیا۔ کلکتے میں جگہ جگہ PCO بنے ہوئے تھے۔ میں نے بمبئی میں حاجی مستان کے لیے ارجنٹ کال بک کروائی۔ کال تو جلد ہی مل گئی لیکن ٹیلی فون Attend کرنے والوں نے جب تک میری اچھی طرح سے فون پر چھان بین نہ کرلی مجھے حاجی مستان سے نہ ملوایا۔ تقریباً چھ منٹ اسی کون، کہاں سے اور کیوں، آخرکار جب حاجی مستان نے میری آواز سنی اور مجھے پہچانا تو مجھے ”ایک منٹ پلیز“ کہہ کر اس نے فون اٹینڈ کرنے والوں کو جو گالیاں دیں، فون پر مجھے وہ بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ ان سے فارغ ہوکر حاجی مستان نے مجھ سے بات شروع کی اور کہا کہ خن سا کا میرے متعلق پیغام اسے خاصی مدت گزری مل چکا ہے اور وہ اسی انتظار میں تھا کہ میں اس سے کب رابطہ کروں گا۔ میں نے اسے کہا کہ ایک چھوٹی سی مشکل درپیش ہے۔ میرے ساتھ میرے تیرہ ساتھی بھی اور میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ حاجی مستان بولا ”آپ سب یہاں بمبئی کیوں نہیں آجاتے“ میں نے جواب دیا ”تم میرے متعلق سب کچھ جانتے ہو۔ میں کیونکر آسکتا ہوں۔“ ”کیا تمہارے ساتھی بھی....“ حاجی مستان نے پوچھا۔ ”نہیں۔ وہ سب کلیئر ہیں۔ مشکل صرف میری ہے۔“ میرا یہ جواب سن کر حاجی مستان نے کہا ”اگر تم چاہتے ہو تو میں کلکتے آجاتا ہوں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ تم بمبئی آجاؤ۔ میں اپنے چار انتہائی وفادار ساتھی آج ہی تمہارے پاس بھیج دیتا ہوں اور کلکتے میں بھی اپنے نمائندے کو کہتا ہوں کہ آپ سب کو بحفاظت جہاز پر سوار کرائے۔ بمبئی میں میں خود سانتا کروز ایئرپورٹ پر موجود ہوں گا۔“ غرضیکہ بہت یقین دہانیوں کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ حاجی مستان کے چار آدمی آج ہی کلکتے پہنچ جائیں گے اور ان کو ہم اپنا سارا اسلحہ دے دیں۔ وہ ہمارا اسلحہ یہاں کے نمائندے کے پاس امانتاً رکھوا

کر اگلی صبح ہمارے ساتھ بمبئی پرواز کر جائیں گے۔ بمبئی سے واپسی پر ہمارا اسلحہ ہمیں لوٹا دیا جائے گا۔ اسلحہ کلکتے میں چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ ایئرپورٹ پر اسلحے کی چیکنگ کی جاتی تھی اور ہوائی جہاز پر اسلحہ ساتھ لے جانا ممنوع تھا۔ PCO سے میں قیصر کے ہمراہ ہی ایمبیسڈر ہوٹل گیا اور قیصر کے ساتھیوں سے کلپنا سے مل کر انھیں کل صبح بمبئی روانگی کا کہا۔ حاجی مستان کے آدمیوں نے میرے ہوٹل میں آنا تھا لہٰذا میں نے قیصر کو کہا کہ اپنا اور ساتھیوں کا تمام اسلحہ چیک کر کے میرے ہوٹل پہنچا دے۔ شام کو قیصر اور اس کے ساتھی اپنا اسلحہ دو بڑے سوٹ کیسوں میں ڈال کر میرے ہوٹل میں لے آئے۔ رات ساڑھے آٹھ بجے مجھے ریسپشن سے فون آیا کہ چار افراد مجھ سے ملنا چاہتے ہیں (میں نے ہوٹل میں اپنا نام دیپ چند لکھوایا تھا) میں نے ہوٹل کے فون پر ان سے بات کی تو انہوں نے صرف یہ کہا کہ وہ بمبئی سے آئے ہیں۔ یہ سن کر میں نے انھیں کمرے میں بلوایا۔

میرے کمرے میں آنے والے چاروں میں سے صرف ایک کو میں پہچانتا تھا۔ دہلی میں DMI کی حراست سے میرے فرار کے بعد ممبئی میں حاجی مستان کے جوہو والے بنگلے میں قیام کے دوران میری حفاظت پر مامور چار محافظوں کا نگران وحید تھا اور وہاں سی بی آئی کے افسران کو ہلاک کرنے اور نیوناگ پاڑے میں میری کور اسٹوری (Cover Story) والے فلیٹ میں گھاٹی اور اس کے آشنا کو ہلاک کرتے وقت بھی میرا معاون تھا۔ اس نے تین دوسرے آنے والوں کے متعلق مجھے بتایا کہ حاجی صاحب نے انھیں آپ کو بہ حفظ و امان ممبئی پہنچانے کی ذمہ داری سونپی ہے۔ یہ تینوں مجھ سے ہاتھ ملا کر باادب ہو کر خاموشی سے میرے کمرے میں بیٹھ گئے اور وحید مجھ سے میرے دوسرے ساتھیوں کے متعلق پوچھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے تیرہ ساتھیوں میں سے ایک عورت بھی ہے۔ اس نے میرے کمرے سے حاجی مستان کے کلکتے کے نمائندے کو فون کیا۔ حاجی مستان نے اسے پہلے ہی ممبئی سے ٹیلیفون پر میرے متعلق ہدایات دے دی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں وہ راجیہ ہوٹل پہنچ گیا۔ اس نے کہا کہ کل صبح دس بجے کی فلائٹ پر اس نے ممبئی کے لیے اٹھارہ سیٹیں بک کی ہیں۔ مجھ سے ساتھیوں کے نام لے کر وہ ان چاروں کو اپنے ہمراہ لے گیا اور کہا کہ صبح آٹھ بجے گاڑیاں راجیہ ہوٹل اور ایمبیسڈر ہوٹل سے ہم سب کو ایئر پورٹ لے جائیں گی۔ وہ رخصت ہوئے تو میں نے تینوں فوجیوں، تھائیوں اور قیصر کو صبح آٹھ بجے روانگی کا کہا۔ شام کو ہم مختلف ٹولیوں میں شہر میں گھومنے نکل گئے۔ میں رات کو نو بجے جب واپس لوٹا تو ہوٹل والوں سے معلوم ہوا کہ میری غیر موجودگی میں ممبئی سے دو مرتبہ کال آئی تھی۔ میں پھر قریبی PCO گیا کیونکہ ہوٹل سے حاجی مستان کو فون کرنا غیر محفوظ تھا میں نے ممبئی میں حاجی مستان کا خصوصی نمبر ملا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم انشاء اللہ کل صبح دس بجے کی فلائٹ سے ممبئی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ میں جب سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو ممبئی میں گزرا ہوا وقت میرے تصور میں گھومنے لگا۔ DMI کی حراست سے فرار

ہو کر میں بے یار و مددگار زخمی حالت میں ممبئی آیا تھا۔ وہاں رحمت کے فرشتے کے روپ میں حاجی مستان مجھے ملا اور پھر جو کچھ اس نے میرے لیے کیا اور جس طرح میری دلجوئی کی، وہ سب واقعات ایک فلم کی طرح میرے تصور کے پردے سے گزرنے لگے۔ اس سب کی وجہ میری ذات یا شخصیت نہ تھی بلکہ حاجی مستان کی پاکستان اور مسلمانوں سے والہانہ محبت تھی۔ عام دیکھنے والوں کے لیے تو حاجی مستان اور یوسف پٹیل دو اسمگلر تھے، نماز بھی وہ شاید ہی کبھی پڑھتے ہوں گے، لیکن ان کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے محبت، ہندوؤں سے نفرت اور پاکستان سے عقیدت اس بلندی پر تھی جس تک آج کل کے علمائے سو، سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور لٹیرے حکمرانوں کی سوچ بھی پہنچ نہیں سکتی۔ خود ہی غور فرمائیں کہ ان مولاناؤں، سیاسی لیڈروں اور لٹیرے حکمرانوں کا آغاز کس مالی کسمپرسی کی حالت میں ہوا اور آج وہ دولت کے انباروں پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف بے نظیر بھٹو جس کی اقتدار حاصل کرنے کی شرمناک حد تک خواہش کی واقعی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ وہ ملک ملک جا کر اپنے باپ کی طرح "اقتدار ہمیں دو، حکومت ہمیں دو" کی رٹ لگا رہی ہے۔ شوہر جیل میں ہے لیکن اب اسے اس کی بھی پرواہ نہیں "مسلسل کھچڑی کھانے سے جی آخر اکتا جاتا ہے۔" دوسری طرف شریفوں کا شریف نواز شریف ہے۔ جیل میں ہے اور اس کی سوئی "میں وزیراعظم ہوں" پر اٹکی ہوئی ہے۔ بے نظیر نے مشرقی پنجاب کے سرفروش سکھوں کی فائل "مروت" میں بھارت کو دیدی جس کے نتیجے میں ہزاروں سکھوں کو بھارتی حکومت نے قتل کر دیا۔ نواز شریف اتفاق فاؤنڈری کے بنے ہوئے کارخانے بھارت کو فروخت کرنے اور اپنے کارخانوں کی چینی بھارت کو صرف کاغذوں میں سستے داموں "بیچ" کر اور پھر مہنگے داموں وہی چینی "خرید" کر اپنے ملک کا نصف ارب روپیہ ڈکار گئے اور بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھانے (غرض صرف اپنا ذاتی لالچ تھی) کے لیے لاہور تا دہلی بس سروس کا ڈھونگ رچا کر اپنی "حب الوطنی" کا شملہ اونچا کرنے لگے۔ اقتدار کا نشہ ان دونوں کو کچھ ایسا چڑھا ہے کہ اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ کل ہی آزاد کشمیر میں نکیال سیکٹر میں بھارتی فوجیوں کے رات کے اندھیرے میں بے گناہ شہریوں پر شب خون مار کر سفاکی کی انتہا کرتے ہوئے چودہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو شہید کرنے اور سر کاٹ کر لے جانے کے واقعے پر ان دو سابق وزرائے اعظم کے کانوں پر جوں نہیں رینگی۔ یہ انھی کے کرتوتوں کا کڑوا پھل ہے جو ہم کھا رہے ہیں۔ ایک مرد مجاہد نے ضبط کی انتہا ختم ہونے پر جب نواز شریف کو اس کے اصل مقام تک پہنچایا اور بے نظیر کو وطن واپسی پر جیل کی سلاخیں دکھائی دینے لگیں تو ان دونوں کے چمچے احتجاج کرنے کے لیے باہر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف صاحب! ان برساتی مینڈکوں کو ٹرانے دیجیے اور ان غلیظ کیڑوں کی صفائی کا عمل جلد از جلد مکمل کریں۔ پوری قوم آپ کے ساتھ ہے۔ کلنٹن پاکستان آئے تو بسم اللہ، نہ آئے تو شکر الحمدللہ۔ کلنٹن کے پاکستان آنے یا نہ آنے کو صرف نااہل اور کرپٹ بیوروکریسی اچھال رہی ہے اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اگر وہ

پاکستان نہ آئے تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ آپ فوجی ہیں اور گولی کی طرح سیدھی بات کرتے ہیں۔ خدارا! ان سیاسی شعبدے بازیوں کے چکر سے خود کو بچائیں۔ یقین جانئے پوری قوم آپ کے ساتھ ہے۔ ان ہنگاموں اور ہڑتال کرنے والوں سے سختی سے نمٹئے۔ ذرا سختی ہوئی تو ان سب کے شور و غوغے جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔ آپ کو اللہ پاک نے یہ موقع دیا ہے کہ ان غاصبوں اور لٹیروں سے ملک کو بچائیں۔ اگر خدانخواستہ آپ نے حوصلہ ہار دیا تو یقین جانئے۔ یہ بچا کھچا پاکستان بھی مشرقی پاکستان کی طرح قصۂ پارینہ بن جائے گا۔ ان ''جمہوریت'' کے علمبرداروں میں سے ایک نے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر قوم کو دھوکہ دیا اور دوسرے نے کشکول توڑنے کا نعرہ لگا کر پہلے سے بڑا کشکول ہمارے ہاتھوں میں تھما دیا۔ گزشتہ تیرہ برسوں میں ملک جو ''ترقی'' ہوئی ہے وہ اتفاق برادرز، رائے ونڈ میں جاتی امرا، چوٹی ڈیرہ غازی خان میں صدارتی محل، 70 کلفٹن اور نوڈیرو لاڑکانہ میں، ان حکمرانوں کے گھروں کو وزیراعظم ہاؤس کا درجہ دینے، غریب اور مقروض قوم کے پیسے سے اپنے لیے نئے نئے جہاز خریدنے، بینکوں سے زبردستی قرضے لینے اور واپس نہ کرنے کی حد تک ہے۔ بیرون ملک ترقی سرے محل اور لندن اور یورپ میں عالیشان گھر خریدنے اور ان حکمرانوں کی لوٹ کھسوٹ کے پیسوں سے سوئس بینکوں کے بھرنے کی ہوئی ہے، ان سے تو ہزار گنا بہتر پاکستان کا وہ نامی گرامی سابق اسمگلر ہے جس کے زیرِ زمین ذرائع کے بغیر کہوٹہ پلانٹ کی تعمیر ممکن نہیں تھی۔

اگلے روز ہم ہوائی جہاز سے ممبئی کے لیے پرواز کر گئے۔ روانگی سے پہلے ہم نے اپنے اسلحے سے بھرے سوٹ کیس کلکتہ کے نمائندے کے حوالے کیے۔ ساناتا کروز ایئرپورٹ کے اندر حاجی مستان کے کارندے اور باہر وہ خود موجود تھا۔ حاجی مستان کو دیکھتے ہی میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ شاید یہی حالت اس کی بھی تھی۔ تمام احتیاطی تدابیر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہم بھینچ بھینچ کر گلے ملے۔ مستان کا موٹر کاروں کا ایک بڑا کارواں وہاں موجود تھا جن میں اس کے محافظوں کی دو گاڑیوں کے علاوہ ہم سب کو لینے کے لیے چھ کاریں تھیں۔ میں مستان کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھ گیا اور ہمارا یہ قافلہ ایئرپورٹ سے تھوڑی دور جا کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ میرے سارے ساتھیوں کو حاجی مستان کے بمبے گیراج کے مہمان خانوں میں ٹھہرنا تھا جبکہ مجھے وہ اپنے ساتھ مالابار ہل والے بنگلے میں لے گیا۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ میں ممبئی میں ماضی سے گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں کھویا ہوا تھا اور حاجی مستان اپنی عادت کے مطابق مجھ سے پاکستان سے روانگی کے بعد اب تک پیش آنے والے حالات تفصیلاً سننے پر مصر تھا۔ یہ واقعات نہ تو خوش کن تھے اور نہ ہی مجھے خون کی ہولیاں کھیلنے میں اپنی کامیابیاں بیان کرکے اپنی بڑائی جتانا مقصود تھا۔ حاجی مستان کے بے حد اصرار کے آگے آخرکار مجھے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ واقعات سنانے کا آغاز ہوا تو یہ سلسلہ تین دن تک جاری رہا۔ میں

بولتے بولتے تھک گیا لیکن حاجی مستان کا اشتیاق بڑھتا ہی گیا اور جب بالآخر میں نے اسے کہا کہ اب کوئی بات بھی ایسی نہیں رہی جو میں نے بیان نہ کی ہو تو حاجی مستان نے میرے ممبئی سے جانے کے بعد اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بتانا شروع کیے۔ وہ کہنے لگا ''تمہارے یہاں سے جانے کے بعد کے چند ماہ تو سکون سے گزرے اور حاجی علی کی درگاہ میں تم نے جو فیصلہ کرایا تھا اس پر عمل ہوتا رہا لیکن پھر ہمارے درمیان پھوٹ ڈالنے والے آگئے۔ پہلے تو یوسف پٹیل نے رسمی سے شکوے کیے جو آہستہ آہستہ مخالفت میں بدل گئے۔ ہم دونوں کے ایک ہو جانے سے جن کا دھندا چوپٹ ہو گیا تھا وہ پھر پر پرزے نکال رہے تھے۔ میں نے یوسف کو بارہا ان کے عزائم سے آگاہ کیا لیکن اس نے بجائے اپنے گرد حلقہ بنائے ہوئے ان منافقوں سے پیچھا چھڑانے کے انھیں اور قریب کر لیا۔ مجھے میرے کارندوں کے ذریعے ایک ایک پل کی خبر ملتی تھی۔ ایسی بدمعاملگی کے باعث ایک بار خن سا بھی یہاں آیا اور اس نے بھی یوسف پٹیل کی غلط فہمی کو دور کرانے کی کوشش کی لیکن وہ بھی مایوس لوٹ گیا۔ خن سا کا اصول ہے کہ کسی بھی ملک میں وہ صرف ایک ہی پارٹی کو اپنا مال بھیجتا ہے۔ پھر وہ پارٹی دوسرے تھوک خریداروں کو نہایت معمولی منافع پر ان کی ضرورت کا مال سپلائی کرتی ہے۔ یہاں پورے ملک میں، میں اسکا نمائندہ ہوں۔ گولڈن ٹرائی اینگل سے یہاں پر دوسری پارٹیوں تک مال سپلائی کرنے کے دوران سارا رسک میرا ہوتا ہے۔ میں نے یوسف کو یہاں تک کہا کہ میں اسے مال بغیر منافع کے سپلائی کرنے کو تیار ہوں لیکن وہ تو بین الاقوامی مارکیٹ میں اپنا مقام بنانے کے درپے ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف نے خن سا کے مال کی بجائے ترکی سے مال منگوانا شروع کیا۔ ایک بار اس کی ایک بڑی کھیپ ترکی میں ہی پکڑی گئی جس کا یوسف کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس نے اپنے حواریوں کے اکسانے پر مجھ پر مخبری کا الزام عائد کر دیا۔ میں نے اس کو بہت یقین دلایا، قسمیں اٹھائیں لیکن اس کے کان کچھ ایسے بھرے گئے تھے کہ میرے صفائی دینے کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کبھی کبھار جب اچانک ہم ایک دوسرے کے سامنے آجاتے ہیں تو یوسف رسمی سلام کرکے منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ میرے کئی کارندے اس کے ایما پر مارے جا چکے ہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ اس دھندے سے میری کمائی کا بہت بڑا حصہ اس علاقے کے ضرورت مند مسلمانوں پر خرچ ہوتا ہے اور ممبئی اور مضافات کے مسلمان مجھ پر جان چھڑکتے ہیں۔ یوسف کو یہ بات بھی کھٹکتی ہے۔ میں تو اس مسلسل درد سری سے اکتا چکا ہوں۔ ہم میں پھوٹ پڑنے کے باعث ہی بھارتی حکومت ہمیں کئی بار وارننگ دے چکی ہے اور شیوسینا والوں نے تو ایک دوبار اعلانیہ مجھے للکارا ہے۔ اگرچہ میں نے ان کے للکارنے کا ایسا سخت جواب دیا ہے کہ ان کو اپنے نو غنڈوں کی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے لیکن آخر کب تک میں ان محاذوں پر اکیلا لڑتا رہوں گا۔ میرا بیٹا عباس تو اتنا سیدھا ہے کہ اس میں مخالفین کی چالاکیوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ میں تو بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ سارا

کاروبار سمیٹ کر کسی دوسرے ملک میں جا بسوں اور پرسکون زندگی کے دن گزاروں۔ ایسا کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہاں کے مسلمان ہیں جنھیں میرے جاتے ہی شیوسینا والے کچا چبا جائیں گے۔'' مستان اپنی داستان سنا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ان دو بڑوں کی پھوٹ سے نہ صرف ان دونوں کا نام ختم ہوجائے گا بلکہ یہاں کے مسلمان بھی بے آسرا رہ جائیں گے۔

ہمیں بمبئی آئے ہوئے تین روز گزر چکے تھے۔ میرے ساری ہمراہی بھی گیراج میں حاجی مستان کے مہمان خانۂ میں مقیم تھے۔ میں ہر روز ایک مرتبہ وحید کے ساتھ انھیں ملنے ضرور جاتا۔ حاجی مستان نے مہمان نوازی کی حد کردی تھی۔ میرے ہمراہیوں کے لیے انواع و اقسام کے کھانے، مشروبات اور ان کی خواہش کے مطابق ہر شے مہیا کی جارہی تھی۔ میں تو مستان کا مہمان خصوصی تھا لیکن میرے ساتھیوں کو بھی VIP ٹریٹمنٹ دیا جارہا تھا۔ چوتھے روز میں نے حاجی مستان کو کہا میرے پاس تو تمھیں سنانے کے لیے اب کوئی بات باقی نہیں رہی۔ میرے ہمراہیوں میں سے قیصر اور کلپنا کو بلواؤ۔ قیصر کے متعلق میں تمھیں یہاں پہلی بار اپنی آمد کے دوران بھی بتاچکا ہوں۔ گورکھپور کا ہوائی اڈہ میرے پاکستانی نمبر ٹو حبیب اور قیصر نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر اڑایا تھا اور کھٹمنڈو میں بھی مکتی باہنی کو جہنم واصل کرنے کے لیے میں نے اپنی مدد کے لیے اسے ہی بلوایا تھا اور اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکتی باہنی والوں کو چن چن کر ہلاک کیا تھا۔ کلپنا کے ماضی میں بیتے ہوئے واقعات کو مختصراً بتائے ہوئے میں نے اسے کہا کہ ان دونوں کے پاس بھی تمہاری دلچسپی کے لیے بہت سے واقعات ہیں۔ حاجی مستان ان پڑھ تھا۔ بہت ہی غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ بندرگاہ پر ایک مزدور کے حیثیت سے اس نے کام شروع کیا اور چند ہی سالوں میں وہ اپنی جدوجہد اور معاملہ فہمی کی وجہ سے بمبئی کی زیر زمین دنیا اور برصغیر کے اسمگلروں کا بے تاج بادشاہ بن گیا۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے اسے جن مشکلات کا سامنا اور رکاوٹوں کو عبور کرنا پڑا۔ وہ سب ہندوؤں کی طرف سے تھیں جو اس کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ ہندوؤں نے اسے راستے سے ہٹانے کی بارہا کوششیں بھی کیں لیکن مستان ہر بار ان کے بچھائے ہوئے جال سے بچ نکلا۔ مستان کا قد چھ فٹ چار انچ تھا اور اس کے بقول وہ نوجوانی میں اتنا تندرست اور صحت مند تھا کہ اکیلا ہی چار پانچ دشمنوں پر بھاری تھا۔ ایک بار ہندو مخالفین نے بے خبری میں اس پر اسی کے گروہ میں شامل اپنے آدمیوں سے حملہ کروایا۔ ان سب کے پاس ہاکیاں اور بڑے چاقو تھے۔ حاجی مستان اکیلا ہی اپنے غدار کارکنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہوگیا اور حملہ آوروں نے لاٹھیوں اور ہاکیوں سے اس کے بائیں بازو اور ٹانگ پر اتنی لاٹھیاں اور ہاکیاں برسائیں کہ کئی جگہ سے وہ چکنا چور ہوگئیں۔ جسم کے اسی جانب چاقوؤں سے اتنے وار کیے کہ حملہ آور اسے مردہ سمجھ کر چلے گئے۔ یہ تو اس کی زندگی باقی تھی کہ عین اس وقت جب اس کی زندگی کے تار ٹوٹنے لگے تو اس کے گروہ کے حامی وہاں پہنچ گئے۔ انڈر گراؤنڈ کام کرنے والوں کو اچھے

ڈاکٹروں کا تعارف بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ڈاکٹر زخمی کے مخالفین کے خوف سے علاج کرنے سے بھی کتراتا ہے۔ حاجی مستان کا علاج خفیہ طور پر اس کی ایک پناہ گاہ میں ہوا۔ زندگی کی بازی تو وہ جیت گیا لیکن اس کی بائیں ٹانگ اور بازوؤں کی ہڈیاں ٹھیک طور پر نہ جڑ سکیں۔ چاقوؤں کے گہرے گھاؤ تو مندمل ہوگئے لیکن وہ پوری طرح سے صحت یاب نہ ہوسکا۔ اپنی قوت ارادی کے زور پر وہ پھر میدان میں آنے کے قابل ہوا تو اس نے حملہ آوروں اور مخالف گروہوں کا خاتمہ کردیا لیکن اس کی اپنی جسمانی کمزوری بڑھتی گئی۔ وہ لنگڑا کر چلتا اور اس کا بایاں بازو بھی پوری طرح حرکت نہ کرسکتا تھا۔ خوراک بھی وہ پرہیزی کھاتا تھا۔ ہندوؤں کے دیے ہوئے ان تحفوں سے ان کے دل میں تمام ہندوؤں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ کسی مسلمان کی ہندوؤں کے خلاف کامیابی کا کوئی واقعہ سنتا تو اس کے حد درجہ عزت کرتا۔ اس کی نفسیاتی وجہ یہ تھی کہ بھارتی ہندوؤں کو زک پہنچانے والوں کے متعلق وہ یہ سوچتا، گویا اس کا بدلہ لیا گیا ہے۔ میرے ساتھ حاجی مستان کے اس خصوصی مہربانہ رویے کی وجہ بھی یہ تھی کہ بھارت میں اپنے تین سال سے زیادہ قیام کے دوران بھارتی افواج کو جو نقصان میں نے پہنچائے تھے اور جس طرح ان کے آرمی ہیڈکوارٹر سے اطلاعات لینے کے لیے Bridges (پل) بنائے تھے اور اس دشمن ملک میں اپنے چار ساتھیوں اور دہلی میں اپنے ہم خیال بشیر گیرج والے اور قیصر اور دوسرے لڑکوں کے تعاون سے بھارتی حکومت کے لیے ہم ایک ہوا بن چکے تھے، انھیں جان کر حاجی مستان کو یہ محسوس ہوا تھا گویا ہم نے اس کا بدلہ لے لیا ہے۔ قیصر کے متعلق جب میں نے اسے بتایا تو اس نے مصنوعی ناراضگی سے مجھے کہا کہ میں نے اتنے روز تک اس کا ذکر کیوں نہ کیا۔ حاجی مستان نے مجھے بتایا کہ گورکھپور کے ہوائی اڈے کی تباہی کا زخم بھارتی حکومت اور فوج کے دلوں میں مدتوں ہرا رہے گا۔

اس نے مجھے کہا کہ میں فون پر قیصر اور کلپنا کو کہوں کہ تیار ہوجائیں اور ایک گھنٹے بعد گیرج کی ایک گاڑی انھیں لے کر یہاں آجائے گی۔ قیصر اور کلپنا مالابار ہل کے بنگلے پر پہنچے تو حاجی مستان نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ میں نے اس سے قیصر کا تعارف کروانہ چاہا تو مستان نے مجھے کہا کہ آپ چپ رہیں۔ قیصر کا تعارف میں آپ سے کرواتا ہوں۔ اب مستان نے بشیر کے گیرج سے لے کر دہلی میں چھبیس جنوری کی پریڈ، گورکھپور کے ہوائی اڈے، نیو ایئر نائٹ پر اکبر ہوٹل میں دھماکوں سے لے کر گورکھپور اور پھر کھٹمنڈو میں قیصر اس کے ساتھیوں کے تمام واقعات اس روانی سے دہرائے جیسے یہ سب کچھ اس کے سامنے ہوا ہو۔ میری بتائی ہوئی باتوں کو اس نے اتنی تفصیل سے بیان کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ یہ سب کچھ اس کے انتقامی جنون کو تسکین ملنے کی وجہ سے تھا کہ اس کی یادداشت میں ایک ایک واقعے کی تفصیل محفوظ تھی۔ قیصر یوپی اور دہلی والوں کی طرح عجز و انکساری سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں اس کی حد سے زیادہ خاموشی اور ''جی نہیں۔ میں کیا ہوں۔ میں نے کچھ

بھی نہیں کیا۔" وغیرہ کے فقروں سے پریشان ہوگیا کہ کہیں حاجی مستان ان تمام واقعات کو لاف زنی ہی نہ سمجھ بیٹھے۔ میں نے قیصر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم کسی انٹیروگیشن سنٹر میں نہیں بیٹھے ہو جہاں تم خود پر لگائے گئے "الزامات" کی جواب دہی میں جی نہیں، جی نہیں کہہ رہے ہو۔ تم نے جو کارنامے انجام دیے ہیں تمھیں ان پر فخر کرنا اور انھیں بیان کرنے میں ہرگز جھجکنا نہیں چاہیے۔ حاجی مستان تمھاری زبانی تمھاری جانفروشی کی داستان سننا چاہتے ہیں۔" غرضیکہ یہ سارا دن قیصر اور کلپنا سے حاجی مستان کی گفتگو میں ہی گزر گیا۔ رات کے پرتکلف کھانے کے بعد جب ان دونوں کو مستان نے رخصت کیا تو ہمیں تنہائی میسر آئی۔ میرے پوچھنے پر حاجی مستان نے کہا کہ میں آج کل بیشتر وقت گھر پر ہی گزارتا ہوں۔ میرے مزید استفسار پر وہ بولا۔ "میرے کاروباری حالات آج کل ٹھنڈے پڑے ہوئے ہیں۔ میرے کئی معتبر کارکن مال وصول کرتے اور ڈیلیوری دیتے وقت پکڑے گئے ہیں۔ انھیں میں نے پولیس سے چھڑوا تو لیا ہے لیکن ان کا "چہرہ" ہونے سے اب وہ میرے کام کے نہیں رہے تھے۔ میں نے ان کو خاصی معقول رقم دے کر زندگی کا باقی وقت خاموشی سے گزارنے کا کہا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصے میں وہ میرے بدترین دشمن گوکھلے کے گروہ میں یکے بعد دیگرے شامل ہوگئے۔ میرے سارے خفیہ ٹھکانے ان کو معلوم ہیں اور ان کی میرے ان ٹھکانوں تک رسائی ہوچکی ہے۔ ان ٹھکانوں کا مال میں نے بروقت ادھر ادھر کردیا اور جب پولیس نے وہاں چھاپے مارے تو انھیں سوائے خالی پیٹیوں کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔ نئے آدمی رکھتے وقت بھی بہت احتیاط اور چھان بین کرنی پڑتی ہے کہ کہیں یہ بھی مخالفین کے بھیجے ہوئے نہ ہوں اور یوسف پٹیل بلاوجہ میرا دشمن ہوگیا ہے۔ لہٰذا میں نے یہی بہتر سمجھا کہ کچھ عرصے کے لیے کام بالکل بند کردوں۔ چھوٹے پیمانے پر محدود کام کرنے سے میری بنی ہوئی ساکھ ختم ہوجائے گی لیکن میرے یکلخت کام بند کرنے سے میرے مخالفین اس سوچ میں پڑ گئے ہیں کہ مستان یکایک کوئی دھماکہ کرے گا۔ میں تو سمندروں میں پل کر بڑا ہوا ہوں اور تم بھی یقیناً جانتے ہوگے کہ جہاز ران جب سمندر کو بالکل خاموش اور پرسکون دیکھتے ہیں تو فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ سمندر کے سکون اور خاموشی میں کسی بڑے طوفان کی آمد پوشیدہ ہے۔ مسلسل کام کرتے کرتے میں بھی تھک گیا ہوں اور کچھ عرصہ خاموشی اور سکون میں گزار کر تازہ دم ہونے اور مخالفوں کا سکون غارت کرنے میں گزار رہا ہوں۔ تم نے کلکتے سے فون پر کہا تھا کہ کوئی مشکل درپیش ہے۔ مجھے ابھی تک تم نے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔" میں نے کہا "تمھاری مہمان نوازی میں موقع ہی نہیں ملا کہ اپنی مشکل بیان کرسکوں۔ میرے پاس مگھ اور مورنگ قبیلے کے ناتراشیدہ جواہرات ہیں۔ کلکتے کے ایک جوہری نے ان کی قیمت بڑھاتے بڑھاتے سوا دو کروڑ لگائی اور تین کروڑ پر بھی وہ نیم رضامند تھا۔ میرے خیال میں ان کی صحیح قیمت اس سے زیادہ ہونی چاہیے۔ ان جواہرات کی جو بھی رقم ملے گی وہ مجھے میرے تمام ساتھیوں بمعہ دو ہلاک ہونے والوں کے لواحقین میں تقسیم کرنی ہے۔ بس یہی مشکل

ہے کہ ان کی صحیح قیمت مل جائے دوسری مشکل یہاں یا کلکتے سے بنگلہ دیش میں ہرن گھاٹ تک ہم سب کے محفوظ سفر کا انتظام کرنا ہے جہاں ایک بڑا اسٹیمر ہمارے انتظار میں لنگرانداز ہے اور جس پر ہم نے بنکاک جانا ہے۔" حاجی مستان نے میری بات سن کر ہنستے ہوئے کہا "میں تو سمجھا تھا کہ نامعلوم کونسی ایسی مشکلات ہیں جن کے لیے تم پریشان ہو۔ یہ دونوں مسئلے تو میں دو تین دن میں حل کردوں گا۔" حاجی مستان نے اسی وقت اپنے ایک کارندے کو بلایا اور اسے سیٹھ کریم کے گھر فون کرکے اس سے بات کروانے کا کہا۔ چند منٹوں میں ہی سیٹھ کریم لائن پر تھا۔ مستان نے گجراتی زبان میں اس سے بات کی اور فون بند کرکے مجھے کہا کہ کل صبح دس بجے سیٹھ کریم ہم کو جوہو والے بنگلے میں ملے گا اور مجھے پورا یقین ہے کہ اس کی لگائی ہوئی قیمت سے زیادہ سارے ہندوستان میں تمھیں کوئی آفر نہیں ملے گی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مستان نے پھر گوکھلے کا ذکر شروع کردیا۔ اس کی باتوں سے مجھے محسوس ہوا کہ گوکھلا اس کے دل و دماغ پر سوار ہے اور مستان اگرچہ کھلے بندوں اس کا اظہار نہیں کررہا لیکن وہ اس کی دن بدن ترقی سے خائف ہے اور اسے نیچا دکھانے کا کوئی رستہ اسے سجھائی نہیں دیتا۔ اپنے چند مخصوص معتمد کارکنوں کے سوا اس کا اپنے گروہ کے باقی لوگوں پر سے اعتبار بھی ختم ہوچکا ہے۔ اسی گفتگو کے دوران اس نے مجھ سے دبی زبان میں قیصر کے متعلق بھی دو مرتبہ پوچھا کہ کیا وہ اس کے گروہ میں شامل ہوسکتا ہے۔ میں مسلمانوں کے اس عظیم خیرخواہ اور سرپرست کو کسی مغالطے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے اسے قیصر کے متعلق بتاتے ہوئے کہا "قیصر کی وفاداری اور جانثاری کسی شک و شبے سے بالاتر ہے۔ اسے اگر یہ کہا جائے کہ دشمنوں کو ختم کرنا ہے تو وہ آخری گولی تک ان پر چلانے سے دریغ نہیں کرے گا لیکن اس میں معاملہ فہمی اور موقع پر خود کوئی فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں۔ وہ بے حد لیڈر اور اپنی جان کی پرواہ نہ کرنے والا ہے لیکن اس سے کام لینے کے لیے ایک نڈر کی ہمہ وقت ضرورت ہے۔" میری بات سن کر مستان خاموش ہوگیا اور اس کے چہرے پر مایوسی دکھائی دینے لگی۔ مستان کے مجھ پر بہت احسان تھے بلکہ یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ DMI کی حراست سے فرار ہونے کے بعد بمبئی پہنچنے پر اگر مستان مجھے سہارا نہ دیتا تو بہت ممکن تھا کہ میں کسی فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتا یا پھر سے بھارتی انٹیلی جنس کی ایجنسیوں کے ہتھے چڑھ جاتا۔ میں نے مستان کو کہا کہ میں اس کی پریشانی بخوبی سمجھ گیا ہوں۔ مجھے دو تین دن میں اس کا حل ڈھونڈنے کا موقع دے۔ انشاء اللہ اس کی پریشانی دور کرنے کا کوئی ذریعہ ضرور نکل آئے گا۔

اگلے روز ساڑھے دس بجے ہم (حاجی مستان اور میں) جوہو والے بنگلے پر پہنچ گئے۔ اس بنگلے سے بھی میرے ماضی کی یادیں وابستہ تھیں۔ بمبئی میں اپنے قیام کا سارا وقت میں نے اسی بنگلے میں ہی گزارا تھا۔ یہیں پر میرا علاج ہوتا رہا اور اسی بنگلے میں بھارتی CBI کے کتے میری بو سونگھتے ہوئے پہنچے تھے۔ ایک ڈپٹی ڈائریکٹر تھا اور تین اس کے ماتحت۔ ان چاروں کو ہلاک کرکے ان کی

لاشیں انھی کی سرکاری گاڑی میں رکھ کر میں مستان کے کارندوں کے ہمراہ نیوناگ پاڑے کے اس فلیٹ پر پہنچا تھا جسے میرے محکمے نے میری کورسٹوری کے لیے خریدا ہوا تھا اور اس فلیٹ کی گھاٹن ملازمہ جس نے CBI والوں کو میری مخبری کی تھی، اس کے آشنا کے ساتھ ہلاک کرکے CBI والوں کی لاشوں کے ہمراہ اداکار محمود کے فلم سٹوڈیو کلامندر کی پارکنگ میں چھوڑ کر گاڑی کو آگ لگا دی تھی۔ محمود کے بھائی الطاف نے مجھے پہچان لیا تھا اور محمود کو کہا تھا کہ مجھے اپنے سٹوڈیو سے پکڑوا کر وہ Over a night all india hero (ایک رات میں سارے بھارت کا ہیرو بن سکتا ہے) الطاف کی یہ بات میں نے سن لی تھی اسی لیے ان کے سٹوڈیو میں CBI والوں کی گاڑی کو بمعہ چھ لاشوں کے آگ لگا کر میں نے ان کو اچھی خاصی مشکل میں ڈال دیا تھا۔

بنگلے کے ڈرائنگ روم میں سیٹھ کریم دس بجے سے بیٹھا ہمارا انتظار کررہا تھا۔ گزشتہ رات کو حاجی مستان کے اچانک بلانے سے سیٹھ کریم بہت خوفزدہ دکھائی دیتا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہیں وہ سلام کرتے ہوئے باادب کھڑا ہوگیا۔ حاجی مستان دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے ہاتھ نہیں ملاتا تھا۔ سیٹھ کریم کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور خشک لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا ''یہ میرے انتہائی قریبی دوست ہیں۔ ان کو چند جواہرات فروخت کرنے ہیں۔ تمہیں اسی لیے بلایا ہے کہ ان جواہرات کی صحیح قیمت لگاؤ۔ قیمت لگاتے وقت یہ ضرور یاد رکھنا کہ ان کی فروختگی میں میرا ہاتھ ہے اور مجھے شکایت کا موقع نہ ملے'' مستان کے کہنے پر میں نے سارے جواہرات میز پر ڈھیر کردیے۔ ناتراشے ہونے کے باوجود ان کی چمک بجلی کی روشنی میں دوچند ہوگئی۔ سیٹھ کریم ایک ایک کرکے انھیں جانچنے لگا۔ ان کا وزن کرنے کے لیے بجلی کا ترازو اور سائز دیکھنے کا آلہ وہ ہمراہ لایا تھا۔ سیٹھ کریم اور اس کا اسسٹنٹ اپنے کام میں مشغول ہوگئے۔ اسی دوران چائے اور بسکٹ آگئے۔ تقریباً ایک گھنٹے میں سیٹھ کریم فارغ ہوا۔ ایک کاغذ پر اس نے الگ الگ ہر ایک پتھر کا وزن سائیز اور کوالٹی لکھ لی تھی۔ AC چلنے کے باوجود اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ رہی تھی۔ جانچ کے کام سے فارغ ہوکر اس نے عینک اتاری اور صوفے کی پشت سے سر لگا کر بولا۔ ''مستان سیٹھ! مجھے آپ جانتے ہیں۔ میں نے آپ سے کبھی ہیرا پھیری نہیں کی۔ میری نگاہ میں ان تمام جواہرات کی قیمت چار کروڑ پینتیس لاکھ ہے۔ اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو جتنا آپ فرمائیں میں دینے کو تیار ہوں۔ مجھے آپ کی خوشنودی سب سے زیادہ عزیز ہے۔'' مستان کے بالکل ساتھ ہی میں بیٹھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اثبات میں اس کا ہاتھ دبایا۔ حاجی مستان صوفے پر اسی نیم دراز حالت میں بولا ''کریم سیٹھ! اس سودے میں کیا تم کچھ نقصان اُٹھا رہے ہو؟''۔ ''جی نہیں'' کریم بولا ''مجھے اس میں معقول منافع ہونے کی توقع ہے۔ خطرہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان پتھروں کی تراش خراش میں ذرا سی بے احتیاطی سے پتھر ٹوٹ جاتا ہے۔'' حاجی مستان اسی انداز میں بولا ''ٹھیک ہے، ان کو تمہاری

قیمت منظور ہے لیکن... مجھے یہ اچھی طرح سے معلوم ہے کہ تم جواہر کی اسمگلنگ کا دھندہ بھی کرتے ہو اور ان کی قیمت امریکی ڈالروں میں ادا کرتے ہو۔ تم کو تین کروڑ کے مساوی امریکی ڈالر سرکاری نرخوں پر دینے ہوں گے اور باقی رقم بھارتی کرنسی میں اور ساری ادائیگی نقد اور آج شام تک ہوجانی چاہیے۔ شام چھ بجے تم رقم لے کر یہیں پہنچ جانا۔ یہ جواہرات بے شک اپنے ساتھ لے جاؤ۔ لیکن شام کے چھ سے ساڑھے چھ نہیں ہونے چاہئیں۔'' سیٹھ کریم نے جلد جلد جواہرات سمیٹے اور سلام کرتے ہوئے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ قیمت دیے بغیر سیٹھ کریم کے جواہرات کے لے جانے کا ایک لمحے کو مجھے احساس تو ہوا جسے میں نے فوراً جھٹک دیا۔ سارے بمبئی اور اس کے مضافات میں ہندو مسلمان یا کسی بھی مذہب والے کی جرأت نہ تھی کہ حاجی مستان سے دھوکہ کرسکے۔ ہم تھوڑی دیر وہیں بیٹھے اور پھر مالابار کے بنگلے کی طرف جانے لگے تو میں نے مستان کو کہا کہ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دن کا باقی وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ مستان نے ڈرائیور کو بیبے گیراج چلنے کا کہا اور 20 منٹ میں ہماری گاڑی اور حاجی مستان کے محافظوں کی تینوں گاڑیاں بیبے گیرج میں داخل ہوئیں۔ حاجی مستان نے مہمان خانوں کی قطار کے قریب مجھے اتار اور کہا کہ وہ چھ بجے تک یہاں آجائے گا اور پھر ہم جوہو والے بنگلے میں جائیں گے۔ مجھے چھوڑ کر حاجی مستان چلاگیا اور میں نے قیصر کے کمرے کا رخ کیا اور نمبرٹو کو بھی وہیں بلوالیا۔ میں نے سب سے پہلے تو انھیں یہ مژدہ سنایا کہ جواہرات کا سودا ہوگیا ہے اور چار کروڑ پینتیس لاکھ کی رقم بھارتی کرنسی اور ڈالروں کی صورت میں آج شام مجھے مل جائے گی جسے تمام ساتھیوں اور مرنے والوں کے ورثا میں برابر تقسیم کردیا جائے گا۔ تھائی ساتھیوں کو ڈالروں میں ساری رقم ملے گی۔ اس کے بعد میں نے ان دونوں کو کہا کہ حاجی مستان کو ایک شخص نے پریشان کررکھا ہے اور اس سے پیچھا چھڑانے کی اسے کوئی معقول صورت سمجھ میں نہیں آرہی۔ مستان کے مجھ پر اتنے زیادہ احسان ہیں کہ اسے بتائے بغیر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے اس مخالف کو میں خود ٹھکانے لگاؤں۔ میں نے انھیں کہا ''یہ فیصلہ میں نے خود کیا ہے اور آپ پر ہرگز لازم نہیں ہے کہ آپ اس مشن میں میرا ساتھ دیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہوگا اگر آپ اپنی شمولیت سے انکار کردیں۔ بغیر کسی دباؤ کے یہ صرف آپ کی مرضی اور فیصلہ ہوگا کہ میں اس مشن پر تنہا جاؤں یا آپ میرے ہمراہ ہوں'' قیصر اور نمبرٹو تو تقریباً بیک وقت بولے اور ان دونوں نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ شروع سے اب تک ہم سب پر سرد گرم حالات، مشکلات اور دشمنوں سے مقابلے میں ایک ساتھ رہے ہیں۔ آپ خود کو لیڈر سمجھ کر کبھی پیچھے نہیں رہے اور ہر مقابلے میں آپ نے ہی قیادت کی ہے۔ آپ نے ایسا سوچا بھی کیونکہ آپ کو ہم اب اکیلا جانے دیں گے۔ جتنے مقابلے ہوئے اور جتنے لوگوں کو ہم نے ہلاک کیا ان سے ہماری کوئی ذاتی دشمنی نہ تھی۔ یہ ٹیم ورک تھا کہ آپ کے دشمنوں اور مخالفین کو ہم نے ختم کیا اور بقول قیصر کے، جب ہم مصیبت میں گرفتار ہوگئے تو آپ نے سر دھڑ کی بازی لگا کر

ہمیں چھڑوایا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم آپ کو اکیلا اس مشن پر جانے دیں۔ جسے پورا کرنے کی حامی آپ نے اپنی ذاتی مخالفت کے لیے نہیں بلکہ اپنے محسن کی پریشانی کو ختم کرنے کے لیے بھری ہے۔ میں نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ دل و جان سے میرا ساتھ دینے کو تیار ہیں تو میں نے انھیں کہا ''حاجی مستان ہمیں کبھی بھی اپنے اس دشمن کو ختم کرنے کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈالنے کی اجازت نہیں دے گا۔ یہاں پر ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے اور حاجی مستان سے اسلحہ مانگنے سے وہ سمجھ جائے گا کہ ہمارے ارادے کیا ہیں۔ لہٰذا میں یوسف پٹیل سے کوئی اور بہانہ کرکے اسلحہ لوں گا کیونکہ مستان سے بھی اس کے تعلقات آج کل خوشگوار نہیں ہیں اس لیے شاید وہ مستان کے دشمن کو ختم کرنے کے لیے اسلحہ دینے میں ٹال مٹول کرے۔ اسلحے کے حصول کی پرابلم تو میں حل کرلوں گا۔ ابھی تک مستان کے دشمن کے نام کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا لیکن انڈر گراؤنڈ کام کرنے والوں میں وہ نمایاں ہے لہٰذا اس کے متعلق مفصل معلومات بھی مجھے مل جائیں گی۔ اس کے متعلق مجھے ایک بات ہی معلوم ہوئی ہے کہ زیر زمین کام کرنے والے گروہوں کے سرداروں کی نسبت وہ زیادہ محتاط رہتا ہے اور اس تک پہنچنے میں بہت زیادہ دشواریاں حائل ہوں گی۔ دنیا کے ہر مرد کی طرح عورت بھی یقیناً اس کی کمزوری ہوگی۔ کلپنا خوبصورت بھی ہے، جوان بھی ہے اور چالاک بھی۔ اگر وہ ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہوجائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس شخص تک پہنچنے کی ساری رکاوٹیں ختم ہوسکتی ہیں۔ ایک بار وہ سامنے آجائے تو ہم تو اسے ہلاک کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں گے جبکہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم کس نیت سے آئے ہیں لہٰذا پہلے ہماری طرف سے گولیاں چلیں گی اور اس طرح کے حالات میں پہل کرنے والا ہی اکثر کامیاب ہوتا ہے۔'' میں نے بات ختم کی تو قیصر بولا ''کلپنا کو اس کام کے لیے رضامند کرنا میری ذمہ داری ہے۔ جب سے میں نے اسے بہن کہا ہے وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرنے لگی ہے۔ اس کی فطرت میں بھی مہم جو ہی ہے۔ آپ کی وہ بے انتہا عزت کرتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے کہنے اور آپ کے لیے کام کرنے کو فوراً رضامند ہوجائے گی'' میں نے قیصر اور نمبرٹو کو اپنے ساتھیوں سے رائے لینے اور ان کے اس مشن کے لیے اگر وہ خوشی سے رضامند ہوں تو ذہنی طور پر انھیں تیار کرنے کا کہا اور وحید کے ساتھ مالابار ہل والے بنگلے پر چلا آیا۔

میں نے باتوں باتوں میں حاجی مستان سے گوکھلے کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ٹھکانے کے متعلق پوچھا تو مستان نے بتایا کہ وہ شیوا جی پارک کے بالکل قریب اونچی دیواروں والے سرخ رنگ کے بنگلے میں رہتا ہے۔ میرے مزید کریدنے پر اس نے کہا کہ یہ شخص شروع میں اس کے پاس کام کرنے کے لیے آیا تھا۔ ''میں سانپ پر تو اعتبار کرسکتا ہوں لیکن ہندو پر نہیں۔ مجھ سے مایوس ہوکر یہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں کام کرنے لگا۔ شیر کی طرح نڈر اور لومڑی کی طرح مکار اس شخص نے تھوڑے ہی عرصے میں ہندوؤں پر مشتمل اپنا گروہ بنا لیا۔ مالی طور پر مستحکم ہندوؤں نے اس کی سرپرستی

کی اور دیکھتے ہی دیکھتے زیر زمین کام کرنے والوں میں نمایاں مقام بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے یوسف پٹیل کو کئی بار کہا کہ گوکھلے ابھی اس قابل نہیں ہوا کہ ہمارا مقابلہ کرسکے اور ہمیں چیلنج کرے لیکن اگر ابھی اس کی بیخ کنی نہ کی گئی تو ایک روز یہ ہمارے لیے مصیبت بن جائے گا۔ یوسف تو مجھے گرانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے میرے خدشے کو کوئی اہمیت نہ دی بلکہ مجھے یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ مجھ سے مال خرید کر وہ گوکھلے کو سپلائی کرتا رہا ہے۔ ابھی تک گوکھلے کو بیرون ملک منڈیوں سے ڈائریکٹ مال خریدنے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے اور وہ اب بھی یوسف پٹیل سے ترکی کا بنا ہوا مال خریدتا ہے۔ مستان سے باتوں باتوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ گوکھلے بھرے جسم کا اور سانولے رنگ کا چالیس کے لپیٹے میں ہے اور سر پر ہمیشہ استرا پھرائے رکھتا ہے۔ کسی حادثے میں اس کی بائیں آنکھ ضائع ہوگئی تھی اور سا عیب کو چھپانے کے لیے وہ ہمیشہ اس آنکھ کو سیاہ پٹی سے ڈھانپے رکھتا ہے۔ مجھے سب سے اہم یہ بات معلوم ہوئی کہ اس نے اپنے دو ہم شکل رکھے ہوئے ہیں جو بالکل اس جیسا لباس پہنتے اور اس جیسا حلیہ بنائے رہتے ہیں۔ عام آدمی کے لیے یہ پہچاننا دشوار ہے کہ اصلی گوکھلے کون ہے لیکن اگر غور دیکھا جائے تو اصلی گوکھلے کے بایاں ہاتھ کی چھ انگلیاں ہیں۔ میں نے تو باتوں میں لگا کر حاجی مستان سے اتنی معلومات حاصل کرلیں تو اسے احساس ہوا کہ میں گوکھلے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہوں۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا مگر اس کا اصرار بڑھتا گیا اور وہ کہنے لگا۔ ''اگر تم گوکھلے کو ختم کرنے کا سوچ رہے ہو تو اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال دو۔ تم میرے مہمان ہو اور میں تمہیں کبھی بھی اجازت نہیں دوں گا کہ تم اپنی جان خطرے میں ڈالو۔'' ایسی کوئی بات نہیں اور پھر تم تو جانتے ہو کہ ہمارا سارا اسلحہ کلکتے میں تمہارے نمائندے کے پاس ہے۔ بغیر اسلحے کے میں کیونکر ایسی حماقت کرنے کا سوچ سکتا ہوں۔'' اسلحے کی بات سن کر حاجی مستان کو کچھ یقین آیا کہ میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں حالانکہ اسلحے کے حصول کے لیے میں اپنی پلاننگ کو آخری ٹچ دے چکا تھا۔

مالابار ہلز کے بنگلے میں باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ شام کے ٹھیک چھ بجے مستان کے ایک کارکن نے ڈرائنگ روم میں آکر بتایا کہ تینوں گاڑیاں اور محافظ جانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم دونوں محافظوں سمیت جوہو کے بنگلے پر پہنچے تو پونے سات بج رہے تھے۔ سیٹھ کریم چھ بجنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں گئے تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ بڑے بریف کیسوں میں تین کروڑ بھارتی کرنسی کے مساوی ڈالر اور ایک کروڑ چالیس لاکھ بھارتی روپے تھے۔ سیٹھ کریم دونوں بریف کیس ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا: ''مستان سیٹھ! دوکان پر جاکر میں نے ان جواہر کو دوبارہ پرکھا اور پھر حساب کیا تو چار کروڑ چالیس لاکھ روپے بنے۔ اس لیے میں طے شدہ سودے کے علاوہ پانچ لاکھ مزید لے آیا ہوں۔'' یہ حاجی مستان کا خوف تھا جس نے سیٹھ کریم کو مزید پانچ لاکھ دینے پر مجبور کیا۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد سیٹھ کریم رخصت ہوا تو حاجی مستان کہنے لگا۔

''آج رات کا کھانا یہیں منگوالیتے ہیں۔ کام بند ہونے کے بعد میں مسلسل مالابار کے بنگلے میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا ہوں۔'' حاجی مستان نے اپنے ایک کارندے کو بلاکر کہا کہ رات کا کھانا یہیں لے آئے۔ ہم باتیں کررہے تھے کہ سگرٹ نکالنے کے لیے میں نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو مگھ اور مورنگ قبیلوں کے سرداروں کی نشانیاں دونوں تکونے یاقوت جو میری اس جیب کی اندرونی خفیہ جیب میں رکھے تھے، میری انگلیوں سے ٹکرائے۔ میں نے دونوں یاقوت نکال لیے اور مستان کو دکھائے۔ مگھ اور مورنگ قبیلوں کی پوری داستان وہ مجھ سے پہلے ہی تفصیلاً سن چکا تھا۔ وہ بڑے شوق سے ان یاقوتوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ ان کے اوپر جو لکیریں کھدی ہوئی ہیں، وہ اس خزانے کا نقشہ ہیں اور جب یہ دونوں یاقوت ایک مستطیل کی صورت میں رکھ جائیں تو پورا نقشہ بن جاتا ہے۔ حاجی مستان ان یاقوتوں میں اتنی دلچسپی لے رہا تھا جیسے اسی نے ان یاقوتوں اور نقشے کا کھوج لگایا ہو۔ میں نے مستان کی ان یاقوتوں میں دلچسپی دیکھتے ہوئے اسے کہا ''مستان بھائی! میری ایک ضرورت ہے لیکن اسے بتانے سے پہلے تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ میری ضرورت پوری کروگے'' ''میں نے کبھی انکار کیا ہے۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ تمہارا ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری ضرورت پوری کروں گا'' مستان نے یاقوتوں کی مستطیل بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''مستان بھائی! تم وعدہ کرچکے ہو اس لیے وعدہ سے پھرنا نہیں۔ یہ دونوں یاقوت اپنے ایک غریب لیکن مخلص بھائی کا تحفہ سمجھتے ہوئے قبول کرو۔'' میں نے کہا۔ مستان بے یقینی کی کیفیت سے دوچار کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ یاقوت اب بھی اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔ ''لیکن یہ تو بہت قیمتی ہیں اور ان میں ایک تاریخ پوشیدہ ہے۔'' مستان نے انکار کی صورت میں مجھے جواب دیا۔ ''چاہے کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں لیکن تمہاری پرخلوص دوستی کے سامنے ہیچ ہیں۔ میں قسم کھاکے کہتا ہوں کہ اگر تم نے انھیں قبول نہ کیا تو ابھی تمہارے سامنے میں انھیں فرش پر اپنے جوتے کی ایڑیوں تلے کچل کر ریزہ ریزہ کردوں گا۔ میری طبیعت اور ضد کو تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اچھا بھائی مجھے تمہارا تحفہ بصد شکریہ قبول ہے۔ ایک تکلیف اور کرنا۔ کل میرے منشی کو ان یاقوتوں کی تمام تفصیل لکھا دینا تاکہ اسے یاد کرکے میں اپنے دوستوں کو یہ دکھاتے ہوئے ان کے حصول میں تمہاری بہادری کے قصے بیان کرسکوں۔'' حاجی مستان یہ کہہ کر میرے قریب کھسک آیا اور کہنے لگا۔ ''ان یاقوتوں کو دیکھ کر اور ان کی تاریخ سن کر یہ بات کئی بار میرے لبوں تک آئی کہ تم یہ یاقوت مجھے فروخت کردو لیکن تمہارے مزاج کو جانتے ہوئے میں دل کی بات نہ کہہ سکا۔ شاید میرے چہرے سے تم نے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ یاقوت مجھے کتنے پسند ہیں۔ اب میں اس داستان کو مکمل کرنے کے لیے ایک کام کرتا ہوں۔'' مستان نے اپنے کارندے کو کہا کہ فوراً سیٹھ کریم سے فون پر رابطہ کرائے۔ سیٹھ کریم ابھی اپنی دکان پر ہی تھا۔ مستان نے اسے کہا کہ وہ تمام جواہرات لے کر فوراً اسی بنگلے پر آجائے۔

اس فون کے بعد حاجی مستان نے دو مختلف نمبروں پر فون کرکے گجراتی میں کوئی بات کی۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی سیٹھ کریم اور پھر دو انجان لوگ بنگلے پر آگئے۔ (حاجی مستان نے سیٹھ کریم کو ویٹنگ روم میں بیٹھنے کو کہا۔ دونوں انجان آدمی ایک ایک بریف کیس لیے ہوئے تھے۔ مستان کو بریف کیس دے کر وہ واپس چلے گئے) اب مستان نے سیٹھ کریم کو بلایا۔ وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ مستان نے اسے کہا کہ بیگ کھول کر جواہرات اسے دکھائے۔ کریم نے بیگ کھولا۔ مستان نے جواہرات دیکھ کر کریم سیٹھ کو کہا کہ میں نے جواہرات فروخت کرنے کا ارادہ بدل لیا ہے لٰہذا وہ اپنے روپے لے جائے سیٹھ کریم کو اس کے نوٹوں بھرے دونوں بریف کیس واپس کردیے گئے اور وہ چلا گیا۔ میں حیران تھا کہ جب میں نے سیٹھ کریم کے سامنے میز پر سارے جواہرات پلٹے تھے تو حاجی مستان نے آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن اب اس نے سارے جواہرات واپس منگوائے۔ حاجی مستان کے چہرے سے ایسی خوشی ٹپکی پڑتی تھی جیسے کسی بچے کو اچانک ہی اس کا پسندیدہ کھلونا مل گیا ہو۔ جواہرات کو بیگ میں ڈالتے ہوئے حاجی مستان مسکراتے ہوئے بولا ''ان یاقوتوں کے بغیر یہ جواہرات بیکار تھے اور جواہرات کے بغیر ان یاقوتوں کی اصل حقیقت اور خزانہ ملنے کا کوئی یقین نہ کرتا۔ اس لیے میں نے دونوں کو یکجا کردیا ہے۔ اب دوستوں کو دکھانے کے لیے یاقوت اور ثبوت کے طور پر جواہرات میرے پاس ہیں اور ان دونوں میں چھپی ہوئی تمہاری بہادری کی داستان جسے میں فخریہ بیان کروں گا۔ میں نے اپنے کاروبار تعلق والوں سے تین کروڑ کے ڈالر اور ایک کروڑ چالیس لاکھ بھارتی روپے منگوائے ہیں جو ان بریف کیسوں میں ہیں۔'' اتنی دیر میں ہی کھانا آگیا۔ حاجی مستان کے لیے پرہیزی کھانا تھا اور میرے لیے چار پانچ قسم کے مختلف پرتکلف کھانے۔ کھانا کھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ حاجی مستان ارب پتی ہے۔ اس کے نام سے دشمن کانپتے ہیں۔ اپنی دولت سے یہ دنیا بھر کی خوشیاں خرید سکتا ہے لیکن صحت نہیں۔ اللہ پاک نے ہمیں جن نعمتوں سے نوازا ہے ہم کبھی ان کے متعلق سوچتے اور جو میسر نہیں اس کی آرزو میں گھلے جاتے ہیں۔ کسی اندھے سے آنکھوں کی قیمت پوچھیں اور کسی بہرے گونگے سے سننے اور بولنے کی۔ کسی معذور سے مکمل صحت یابی کی تو آپ کو احساس ہوگا کہ اللہ پاک نے ہمیں کتنی انمول نعمتوں سے نوازا ہے۔ ہمیں ہر وقت ان نعمتوں کے لیے اللہ پاک کا شکر ادا کرنا چاہیے تاکہ وہ راضی ہو اور ہمیں اپنی مزید نعمتوں سے نوازے اور ہماری حاجات پوری کرے۔ (الٰہی آمین)

دوسرے روز میں مستان سے اجازت لے کر محبوب سٹوڈیوز کے قریب ان فلیٹوں میں گیا جہاں پہلی بار میں یوسف پٹیل سے ملا تھا۔ وہ فلیٹ جینٹ فلم ایکٹر کے نام پر یوسف نے خریدے تھے۔ اس بار بھی مجھے کسی نے یہ نہ بتایا کہ یوسف پٹیل ابھی تک وہیں مقیم ہے یا کہیں اور شفٹ کرگیا ہے۔ اب تو میرے پاس اسلحہ بھی نہیں تھا کہ اس کے زور پر ہی وہاں کے رہائشیوں سے سچ اگلوالوں۔

حاجی مستان نے دو گاڑیاں میرے ہمراہ کی تھیں۔ ایک میں وحید اور میں تھے اور دوسری میں محافظ۔ میں نے وحید کو بتایا کہ پہلی بار یوسف پٹیل کو میں انھی فلیٹوں میں ملا تھا اور میں نے ہی حاجی مستان اور یوسف پٹیل کی صلح کروائی تھی۔ وحید بے خیالی میں بولا ”یوسف پٹیل تو اب یہاں نہیں رہتا بلکہ اس نے میرین ڈرائیو پر تاج محل ہوٹل کے قریب ہی ایک بلڈنگ خرید لی ہے جس کے تیسرے مالے (فلور) پر وہ خود رہتا ہے اور نچلی دو منزلوں میں اس کے محافظ اور کارکن رہتے ہیں۔“ میں نے وحید کو کہا کہ کیا وہ مجھے وہ بلڈنگ دکھا سکتا ہے۔ حاجی مستان کی وحید کو ہدایت تھی کہ میں جہاں بھی جانا چاہوں، مجھے لے جایا جائے۔ وحید نے میرین ڈرائیو سے گزرتے ہوئے مجھے یوسف پٹیل کی بلڈنگ دکھائی۔ واپسی پر میں بمبے گیرج گیا اور قیصر اور نمبرٹو سے پوچھا کہ کیا انہوں نے اپنے ساتھیوں سے مشن میں شمولیت کے لیے پوچھ لیا ہے؟ دونوں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ سارے ساتھی دل و جان سے آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ میرے خیال میں ان کی رضامندی کی ایک بڑی وجہ جواہرات کی فروختگی سے ان کو حصے میں ملنے والی بڑی رقم تھی۔ شاید ان کو یہ وہم ہو کہ انکار کی صورت میں ان کا حصہ دینے سے میں انکار کردوں گا۔ حالانکہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اگر وہ میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیتے تب بھی میں ان کو پورا حصہ دے کر رخصت کرتا۔ قیصر نے مجھے کہا کہ کلپنا مجھے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے قیصر کے کمرے میں ہی بلوا لیا۔ کلپنا روہانسی ہورہی تھی اس نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کب سے ایک قیدی کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ بمبئی سب کے سپنوں کا شہر ہے اور کلپنا کے لیے یہاں آکر بھی یہ شہر ایک سپنا ہی بنا ہوا ہے۔ یہاں سے مجھے تو ایک طرف، ہمارے کسی ساتھی کو بھی باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ مجھے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کسی روز آپ اچانک یہاں سے روانگی کا کہہ دیں گے۔ قیصر بھائی نے مجھے آپ کے مشن کے متعلق بتایا ہے۔ میں اپنی پوری صلاحیتوں سے کام لے کر آپ کے مشن میں اپنا کردار ادا کروں گی۔ آپ پلیز یہ کریں کہ ہمیں یہاں گھومنے پھرنے کی اجازت دیں تاکہ ہم تازہ دم ہوسکیں۔“ میں نے واقعی یہاں پہنچ کر اپنے تمام ساتھیوں کی اس خواہش کو فراموش کردیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”آپ لوگ جہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، کوئی ہوٹل نہیں جہاں سے آپ جب چاہیں باہر جائیں اور جب جی چاہے واپس لوٹیں۔ ابھی ہم سب بھارت میں ہی اور شانتی پور کا واقعہ بھی تازہ ہے۔ بہرحال میں انتظام کروں گا کہ تین تین کی ٹولیوں میں کل آپ کو شہر میں گھمایا جائے۔ ہر گاڑی میں ایک محافظ اور ڈرائیور ہوگا اور آپ سب ان کے ساتھ ہی جائیں گے اور ساتھ ہی واپس لوٹیں گے۔“ یہ کہہ کر میں بمبئے گیرج سے مالابار ہل والے بنگلے میں لوٹ آیا اور رات کے کھانے پر حاجی مستان کو کہا کہ میرے ساتھی بمبئی میں گھومنا پھرنا چاہتے ہیں اور میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ کل تین تین کی ٹولیوں میں ڈرائیور اور محافظ کے ساتھ انھیں شہر دیکھنے بھیجوں گا۔ حاجی مستان نے ہنستے ہوئے کہا ”تمہارا کیا ہوا وعدہ ضرور پورا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے

اپنے ایک کارکن کو بلا کر کہا کہ ان سب کے لیے ڈرائیور، محافظ اور گاڑیوں کا انتظام کرے۔ بنگلہ دیشی فوجی تو اپنے بستروں سے ایسے چپکے تھے کہ باہر نکلنے کا کام ہی نہ لیتے تھے۔ نہایت عمدہ خوراک، آرام دہ بستروں میں گھریلو پریشانیوں اور ڈیوٹی کی سختی سے انھیں شاید پہلی بار نجات ملی تھی اور وہ چھٹی کا حقیقی لطف اٹھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد منشی آگیا جو مگھ اور مورنگ قبیلوں سے ہمارے نبرد آزما ہونے اور خزانہ پانے کے واقعات مجھ سے سن سن کر گجراتی زبان میں تحریر کررہا تھا۔ حاجی مستان بھی میرے ساتھ ہی بیٹھا ہوا اس داستان کے واقعات دوبارہ سن رہا تھا۔ مگھ قبیلے سے مقابلے کا ذکر کرتے ہوئے میں نے حاجی مستان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”مجھے ہر وقت اپنے ساتھ پسٹل رکھنے کی ایسی عادت پڑچکی ہے کہ اس کے بغیر میں خود کو نامکمل اور ادھورا سمجھتا ہوں کہ تم مجھے بمبئی میں رہائش کے دوران ایک پسٹل عاریتاً دے سکتے ہو۔“ میری بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ مستان نے منشی کو گجراتی میں کچھ کہا اور تھوڑی دیر میں ہی تیس بور کے دو پسٹل اور ان کے دو دو بھرے ہوئے فالتو میگزین لے کر ایک کارکن کمرے میں آگیا۔ دونوں پسٹل برٹش Webley and Scott کمپنی کے بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایک پسٹل اور چاروں فالتو میگزین اٹھائے۔ حاجی مستان نے مزاحیہ انداز میں مجھ سے پوچھا ”کیا پھر ہتھیلی میں کھجلی ہورہی ہے جو چاروں فالتو میگزین لے لیے۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”ابھی تو کھجلی نہیں ہورہی۔ لیکن نہ جانے کب شروع ہوجائے۔ اس لیے حفظ ماتقدم کے لیے چاروں میگزین اٹھائے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں شب بخیر کہتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ کل ہر صورت میں یوسف پٹیل سے ملوں گا۔

پندرھواں باب

اگلی صبح آٹھ بجے میں حاجی مستان سے ملے بغیر بنگلے سے باہر نکل آیا اور ایک ٹیکسی لے کر میرین ڈرائیو پر یوسف پٹیل کی بلڈنگ کے قریب جاکر ٹیکسی کو فارغ کردیا اور بلڈنگ کے مین گیٹ پر جاکر گھنٹی بجائی۔ گیٹ کی دیوار پر انٹر کام لگا ہوا تھا۔ کسی نے نیند بھری آواز میں پوچھا کون ہے اور کس سے ملنا ہے؟ میں نے کہا کہ یوسف پٹیل سے ملنا ہے۔ جواب آیا ''کیوں ملنا ہے؟'' میں جانتا تھا کہ اس کے کارندے مجھے اس سوال جواب کے چکر میں باہر سے ہی لوٹادیں گے۔ میں نے غصے بھری آواز میں دو تین گالیاں نکال کر اسے کہا ''تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ باہر آؤ اور مجھ سے بات کرو۔ اگر تم نے اپنی یہی بے تکی بکواس جاری رکھی تو میں یوسف سے ملنے پر اسے بتاؤں گا کہ تمہارے احمق اور گدھے کے دماغ والے آدمی نے مجھے باہر کھڑا رکھ کر بلاوجہ پریشان کیا ہے اور پھر وہ تمہارا جو حشر کرے گا اسے تم بخوبی جانتے ہو۔'' میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور چند منٹوں میں آنکھیں ملتا ہوا ایک کالا بھجنگ آدمی باہر آیا اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے مجھے پہچاننے کی کوشش میں ناکام ہوکر بمبئی کے نچلے طبقے کی زبان میں مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اسے مارتے ہوئے کہا۔ ''یوسف کو جاکر بتاؤ کہ نام پوچھنے پر میں نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ تمہیں کسی نے اتنا بھی نہیں سکھایا کہ اس دھندے میں تیرے جیسے نہلے دھلے نہ تو نام پوچھتے ہیں اور نہ ہی انھیں نام بتایا جاتا ہے۔'' تھپڑ اور میرے انداز گفتگو سے اس کی نیند کافور ہوگئی اور وہ خاموشی سے مجھے اندر لے جاکر اور ایک اوسط درجے کے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلاگیا۔ میں نے صوفے سے ٹیک لگاکر سگریٹ جلایا اور پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے کے مصداق انتظار میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ سٹین گنوں سے مسلح دو آدمی کمرے میں آئے اور دروازے کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ میں

نے جان بوجھ کر ان کی طرف لاپرواہی برتتے ہوئے اپنے پاؤں سامنے پڑی میز پر رکھے اور سگریٹ کا دھواں اگلنے لگا۔ چند منٹوں میں ہی کمرے میں ایک شخص داخل ہوا جس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ''ارے صاحب! آپ یہاں'' کہتے ہوئے میرے قریب آیا اور بولا ''صاحب آپ نے مجھے پہچانا۔ میں کھٹمنڈو میں حاجی مستان کے آدمی کے ساتھ آپ کو روپے دینے آیا تھا'' اس کے یہ کہنے سے مجھے بھی یاد آگیا کہ حاجی مستان اور یوسف پٹیل نے کھٹمنڈو سے میرے فون پر بہاری مہاجروں کی حالت زار بیان کرنے پر ان کی امداد کے لیے مجھے جو رقم بھیجی تھی اسے لانے والے دو آدمیوں میں سے ایک یہ تھا اور مجھے رقم دے کر یہ دونوں اسی روز بمبئی لوٹ گئے تھے۔ مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد یہ آدمی مجھے لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر لے گیا اور ایک بہت اعلیٰ سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بولا۔ ''سیٹھ ساری رات باہر رہا ہے اور ابھی سو رہا ہے۔ میں اسے جاکر بتاتا ہوں اور آپ کے لیے چائے بجھواتا ہوں۔'' یہ کہہ کر یہ دونوں مسلح آدمیوں کو لے کر چلاگیا۔ میری شناخت ہوچکی تھی اس لیے مسلح پہریداروں کا اب وہاں ٹھہرنا بیکار تھا۔

چائے اور لوازمات سے میں فارغ ہوا ہی تھا کہ یوسف پٹیل کمرے میں داخل ہوا اور دیر تک مجھ سے لپٹا رہا۔ میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ کر اس نے مجھ سے خیر و عافیت دریافت کی اور کھٹمنڈو سے پاکستان جانے تک کے واقعات پوچھتا رہا۔ اس کی باتوں میں وہی خلوص اور آنکھوں میں خوشی کی وہی چمک تھی جو بمبئی میں گزشتہ قیام کے دوران میں نے دیکھی تھی۔ میں نے دوران گفتگو محسوس کیا کہ یوسف کی زبان پر کئی بار کوئی بات آکر اٹک گئی۔ میں کچھ کچھ تو سمجھ گیا تھا لہٰذا میں نے اسے بتایا کہ چند روز قبل میں اپنے تیرہ ساتھیوں کے ساتھ بمبئی آیا ہوں اور حاجی مستان کے پاس ٹھہرا ہوں۔ وہ یہ سن کر چپ سا ہوگیا تو میں نے کہا ''یوسف بھائی میں ایک ایسے مشن پر آیا ہوں کہ اپنے ساتھیوں سمیت کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ بمبئی میں میرے دو ہی پرخلوص دوست ہیں۔ تم اور حاجی مستان۔ تمہاری تلاش میں میں محبوب اسٹوڈیوز کے قریب جینت کے فلیٹوں میں گیا تھا۔ جب وہاں سے بھی تمہارا کچھ پتہ نہ چلا تو بہت تلاش کے بعد آج تم تک پہنچ سکا ہوں۔ مستان سے مجھے صرف یہی معلوم ہوا ہے کہ تم دونوں میں پھر کوئی رنجش پیدا ہوچکی ہے اور دھندے میں تم دونوں پھر ایک دوسرے کو مات دینے اور زک پہنچانے میں لگے ہوئے ہو اور حاجی علیؒ کی درگاہ پر کیے ہوئے عہد پر تم دونوں زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے۔ دولت تو تم دونوں نے اتنی کمالی ہے کہ اگر دھندہ چھوڑ بھی دو تو تمہاری سات پشتیں عیش و آرام سے زندگی بسر کرسکتی ہیں۔ مجھے فکر ہے تو یہاں کے ان بے بس مسلمانوں کی جو تمہارے اس لڑائی جھگڑے میں تمہاری اجارہ داری ختم ہونے کے بعد ہندوؤں کی درندگی کا شکار ہوجائیں گے۔'' یوسف نے میری بات بڑے تحمل سے سنی اور پھر حاجی مستان کے خلاف شکایتوں کے پٹارے کھول دیے۔ ان دونوں کی شکایتوں کا لب لباب یہ تھا کہ بمبئی بلکہ پورے بھارت

میں زیرِ زمین کام کرنے والوں کا لیڈر یا بے تاج بادشاہ ایک ہی ہوسکتا تھا۔ یوسف پٹیل خود تو وہ مقام حاصل نہ کرسکا لیکن اس کی مخالفت نے حاجی مستان کے قدم اکھیڑ دیے تھے۔ یہ دراصل اس دھندے میں ملوث ہندو گروہوں، سیاسی لیڈروں اور سرمایہ داروں کی چال تھی کہ ان دونوں کو آپس میں لڑا کر اس حد تک کمزور کردیا جائے کہ آخر میں ان کے ایک ہی جھٹکے سے یہ قدآور شخصیتیں زمیں بوس ہوجائیں۔ انجام کار ہندوؤں کی سازش کامیاب رہی۔ حاجی مستان نے یہ دھندا بالکل چھوڑ دیا اور انتہائی بلندی سے پستی کے اس مقام پر گرنے کا صدمہ برداشت نہ کرسکنے کے باعث مرگیا۔ یوسف پٹیل تو پہلے ہی ہندوؤں کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا مستان کے گزر جانے کے بعد یوسف پٹیل کو گرفتار کرلیا گیا اور اپنی ساری دولت لٹانے کے باعث جب برسوں بعد اسے رہائی ملی تو وہ جلد ہی قید زندگی سے بھی رہا ہوگیا۔

میں نے یوسف کو کہا کہ میں ایک بار پھر کوشش کروں گا کہ تمہاری ایک میٹنگ ہو اور تم دونوں اپنے اپنے گلے شکوے دور کرکے پھر سے ایک ہوجاؤ۔ اس وقت میں تمہارے پاس اپنے ایک کام سے آیا ہوں۔ مجھے تین اسٹین گنیں اور بارہ ریوالور اور ان کی خاصی مقدار میں گولیاں چاہئیں۔ مشن کی کامیاب تکمیل کے بعد میں یہ سارا اسلحہ تمہیں واپس لوٹادوں گا اور اگر مشن ناکام رہا تو یہ سمجھ کر معاف کردینا کہ مرنے والوں پر قرض کا بوجھ نہیں چھوڑا کرتے۔" یوسف نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ جذبات کی شدت سے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا "مرنے کی باتیں نہ کرو۔ تم اپنے مشن میں انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگے۔ تمہاری ضرورت کا اسلحہ تمہیں آج شام پانچ بجے تک مل جائے گا۔" ایک ٹیکسی میں ٹھیک پانچ بجے یہ اسلحہ لے کر احمد (وہی کارندہ جو کھٹمنڈو آیا تھا اور آج بھی جس نے مجھے یوسف سے ملوایا تھا) بمبئے گیرج سے پچاس قدم آگے تمہیں ملے گا۔ مجھ سے صرف یہ وعدہ کرو کہ بمبئی سے جانے سے قبل تم مجھے ضرور ملوگے۔ اگر کوئی مالی ضرورت درپیش ہے تو جتنا کہو ابھی حاضر کردیتا ہوں" میں نے یوسف کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے آدمی احمد کے ساتھ مجھے بمبئے گیرج تک چھوڑنے آئے اور احمد نے مجھے وہ جگہ دکھائی جہاں پانچ بجے اس نے مجھے ملنا تھا۔ یہ دونوں یعنی حاجی مستان اور یوسف پٹیل آپس کی مخالفت کے باوجود مجھ سے بے حد خلوص اور محبت سے پیش آئے تھے۔ میں نے جب حاجی مستان سے یوسف سے صرف اپنی ملاقات کا ذکر کیا تو اس نے بھی برا نہیں منایا بلکہ یہ کہا کہ یوسف تمہارے ساتھ تو بہت پرخلوص ہے اور ہمیشہ تمہاری تعریف کرتا تھا۔ شام پونے پانچ بجے میں اپنے تمام ساتھیوں کو بمبئے گیرج سے باہر لایا۔ ٹھیک پانچ بجے ٹیکسی اپنے مقررہ مقام پر پہنچ گئی۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور میری دی ہوئی ہدایات کے مطابق میرے سارے ساتھی ایک ایک کرکے ٹیکسی کے پاس سے گزرتے ہوئے اسلحے کے تھیلے لے کر واپس بمبئے گیرج پہنچ گئے۔ میں نے ایک اسٹین گن نمبر ٹو اور ایک JCO کو اور باقی سارے ساتھیوں کو ریوالور دیے۔ اب

ہم سب مسلح تھے۔ مشن کے لیے اسلحے کے حصول کا مسئلہ حل ہوگیا تھا اب اگلا مرحلہ گوکھلے کے بنگلے میں داخل ہونے کا تھا۔ ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا تھا کہ ہم اس وقت بنگلے میں داخل ہوں جب اصلی گوکھلے بنگلے میں موجود ہو۔ اسی کام کے لیے میں نے کلپنا کو منتخب کیا تھا (کلپنا کو میں سپنا اس لیے لکھ رہا ہوں کیونکہ شانتی پور اور کلکتے کے ہوٹلوں میں ہم سب نے ہندو بن کر کمرے لیے تھے اور کلپنا کا نام بھی سپنا لکھوایا تھا۔ کلپنا کو یہ نام اتنا پسند آیا کہ ہم نے اسے سپنا کے نام سے ہی پکارنا شروع کردیا) میں نے سارے ساتھیوں کو کہا کہ پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے تین تین کی ٹولی میں گیرج سے باہر نکلیں اور ٹیکسیوں میں شیواجی پارک کے جنوبی حصے کے شروع ہونے سے ذرا پہلے سرخ رنگ کی اونچی دیواروں والے کوٹھی کے قریب ٹیکسیوں کو چھوڑ دیں اور اس کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے محل وقوع کو ذہن نشین کریں۔ اس کوٹھی کے بالکل ساتھ ایک چھوٹی سڑک کوٹھی کے عقبی حصے کی سڑک سے ملتی ہوئی آگے جاکر دوسری بڑی سڑک پر ختم ہوتی ہے۔ چھوٹی سڑک پر جاکر کوٹھی کے عقبی حصے کو بھی دیکھیں اور کوٹھی کے عقب سے اندر جانے کے چھوٹے دروازے اور چار دیوار کی بلندی بھی دیکھیں۔ بہت ممکن ہے کہ ہمیں دیوار پھلانگ کر اندر جانا پڑے۔ کوٹھی کے چاروں اطراف دیوار کے اندر اور باہر حفاظتی اقدام کو بھی نوٹ کریں اور یہ بھی دیکھیں کہ دیوار کے اندر بجلی کی حفاظتی تاریں لگی ہوئی ہیں یا نہیں۔ غرضیکہ ہر ٹولی اپنے اپنے طور پر اس کوٹھی، اس کے حفاظتی اقدام اور اندر داخل ہونے کے ممکن ذرائع کی مفصل رپورٹ تیار کرے۔ یہ بھی نوٹ کریں کہ دو گھنٹے کے اندر کتنی بار سامنے کا بڑا دروازہ اور عقبی چھوٹا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک اور اہم بات ذہن میں رکھیں کہ اس دو منزلہ کوٹھی کی اوپری منزل کی گیلری میں مسلح پہریدار موجود ہوتے ہیں یا نہیں کیونکہ گوکھلے کی رہائش اسی منزل پر ہے۔ آنے جانے والی گاڑیوں کے نمبر نوٹ کریں اور یہ بھی دیکھنے کی کوشش کریں کہ گاڑی کی عقبی نشست پر سر کے بالوں کے بغیر کوئی شخص بیٹھا ہے یا نہیں۔ میں کل دن کو آپ کی رپورٹیں لینے آؤں گا۔ ساتھیوں سے رخصت ہوکر میں نے سڑک سے ٹیکسی لی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور سارا بمبئی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک سکھ تھا۔ میں نے پنجابی بول کر جلد ہی اس سے بے تکلفی پر اتر آیا۔ شیواجی پارک جاتے ہوئے میں نے اسے کہا کہ میں لدھیانے سے آیا ہوں۔ دہلی میں ایکسپورٹ امپورٹ کے کاروبار میں اتنا زیادہ خسارہ ہوا کہ لاکھوں کا مقروض ہوکر یہاں قسمت آزمانے چلا آیا۔ میں شیواجی پارک میں گھومنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے جارہا ہوں کہ گوکھلے نام کے ایک اسمگلر سے ملوں جو پارک کے قریب ہی رہتا ہے اور اسے اپنی پپتا سنا کر اس کے گروہ میں شامل ہوجاؤں۔ میں نے اسے کہا کہ ہم پنجابی دلیر اور مالک کے وفادار ہوتے ہیں ایک صرف دماغی طور پر ان بمبئی والوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے ورنہ اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر ہیں۔ سردار جی میری باتیں سنتے رہے اور جب میں خاموش ہوا تو بولے "ان اسمگلروں کو ہمارے جیسے نڈر اور بے

وقوف افراد کی ہمیشہ تلاش رہتی ہے اور جب تک ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں ناک کے بال بنائے رکھتے ہیں۔ جب ان کی ضرورت پوری ہوجائے یا اپنے نڈرپن کی وجہ سے پکڑے جائیں تو یہ پلٹ کر یہ بھی نہیں پوچھتے کہ کس حال میں ہو۔ میں بھی آج سے نو سال پہلے جالندھر سے یہاں قسمت آزمائی اور لاکھوں کروڑوں میں کھیلنے کے خواب دیکھتے ہوئے یہاں آیا تھا اور جلد ہی یہاں کے ایک اسمگلر کے گروہ میں شامل ہوگیا۔ گروہ کے سردار کی نظروں میں نمایاں مقام بنانے کے لیے میں بغیر دیکھے بھالے خطرناک کاموں میں کودنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے دو سالوں میں پولیس کی ناکہ بندی توڑ کر مالک کا سامان بچا کر نکالتا رہا لیکن ایک بار پولیس نے گھیرا ڈال کر مال سمیت مجھے پکڑنے کے لیے فائرنگ شروع کر دی۔ ٹانگ میں گولی لگنے سے میں زخمی ہوکر گرفتار ہوگیا۔ زخم خراب ہونے کی وجہ سے میری ٹانگ کاٹ دی گئی اور چار سال کی سزا کاٹ کر میں تین سال قبل جیل سے رہا ہوا ہوں۔ میں نے بے انتہا تشدد سہنے کے باوجود گروہ کی نشان دہی نہیں کی۔ جیل سے رہائی کے بعد میں گروہ کے سردار کے پاس گیا تو اس نے مجھے ذلیل کرکے نکال دیا۔ تھوڑی بہت جو جمع پونجی تھی اس سے میں نے ٹیکسی خریدی اور لکڑی کی مصنوعی ٹانگ لگوا کر اب ٹیکسی چلاتا ہوں۔ اب میری یہی خواہش ہے کہ کسی طرح بھی اپنے سردار سے بدلہ لوں۔ گوکھلے ایک نیا اسمگلر ہے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اپنا اچھا خاصا مقام بناچکا ہے۔ میری ظاہری حالت تو ایسی نہیں کہ اس تک ڈائریکٹ پہنچ سکوں اور نہ ہی میں اس کے کسی کام لائق ہوں۔ یہاں ایک عورت سے گوکھلے کے قریبی تعلقات ہیں اور میری اطلاع کے مطابق وہ گوکھلے کو لڑکیاں سپلائی کرتی ہے۔ آپ کو اس تک پہنچادیتا ہوں۔ آگے آپ جانیں اور آپ کا کام۔'' میرے اچھا کہنے پر سردار جی نے ٹیکسی گھمائی اور میرین ڈرائیو کی ایک بلڈنگ بلاک کے سامنے مجھے اتار کر کہا ''اس عورت کا نام موزما ہے اور وہ جوانی میں فلموں میں کام کرتی تھی۔

اگلے روز صبح نو بجے میں نمبئے گیرج گیا اور قیصر کے کمرے میں نمبرٹو، رضی اور سپنا کو بلوا کر گزشتہ شام کو ان کے گوکھلے کے بنگلے کی سروے رپورٹ مانگی۔ میری پہلے سے حاصل کردہ معلومات میں انھوں نے یہ اضافہ کیا کہ بنگلے کے مین گیٹ بجلی سے کھلتے اور بند ہوتے ہیں اور چار دیواری کے اندرونی جانب بجلی کی ننگی تاریں لگی ہوئی ہیں۔ بنگلے کے لان کے داہنی جانب ایک سوئمنگ پول بھی ہے۔ مین گیٹ کے اندرونی جانب دو مسلح پہریدار اور دو عقبی جانب کی نگرانی کرتے ہیں۔ عقبی جانب کا دروازہ قیصر نے دو مرتبہ کھلتے دیکھا تھا۔ اس دروازے سے بنگلے کے ملازمین کی آمد و رفت ہوتی تھی۔ رضی نے دو مرتبہ ڈبل ڈیکر بس کی اوپری منزل پر بیٹھ کر بنگلے کے اندرونی منظر کو دیکھا تھا۔ بنگلے کے باہر ظاہر طور پر کوئی نگرانی نہیں تھے اور باہر سے اندر جانے والے پہلے انٹرکام پر بات کرتے تھے۔ مین گیٹ میرے ساتھیوں کی وہاں پر موجودگی کے دوران ایک مرتبہ بھی نہیں کھلا۔ رضی نے یہ بھی بتایا کہ

سیاہ رنگ کی بالکل ایک جیسی تین کاروں کے علاوہ دو ہائی روف وین جیسی گاڑیوں بھی وہاں کھڑی تھیں۔ بنگلے کے گیراج میں نامعلوم اور کتنی گاڑیاں ہوں گی۔ ان تمام معلومات کی روشنی میں گوکھلے تک رسائی ناممکن دکھائی دیتی تھی۔ ان حالات کی روشنی میں میں نے فی الحال سپنا اور منورما کے ذریعے گوکھلے تک پہنچنے کے خیال کو ملتوی کردیا کیونکہ ان کے ذریعے کامیابی کا بہت کم امکان تھا۔ میں نے ساتھیوں کو آج کا دن جی بھر کر بمبئی کی سیر کرنے کی اجازت دی اور کہا کہ ہمیں جلد از جلد اس مشن کو مکمل کرکے ہرن گھاٹا پہنچنا ہے کیونکہ اسٹیمر آخر کب تک وہاں ہمارے انتظار میں لنگر انداز رہے گا۔ میرے ذہن میں اس مشن کی تکمیل کے لیے ایک بالکل نیا خاکہ ابھرا تھا اور میری سوچ کے مطابق اگر اس سے متعلقہ کام ٹھیک طرح سے ہوگئے تو گوکھلے تک میں اور میرے ساتھی بغیر کسی روک ٹوک کے پہنچ سکیں گے۔

ساتھیوں سے رخصت ہوکر میں نے وحید کے ہمراہ جوہو والے بنگلے کا رخ کیا۔ حاجی مستان تو کبھی بھی میرے اس خیال سے متفق نہ ہوتا اس لیے میں نے وحید کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ بمبئی میں اپنے قیام کے پہلے دور میں اور اب ان چند دنوں میں میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وحید، حاجی مستان کا خیرخواہ، نڈر اور قابل اعتماد ساتھی تھا اور مستان کی بہتری کے لیے وہ کسی بھی دشوار کام میں میرا ہاتھ بٹانے سے ہرگز انکار نہ کرتا۔ حاجی مستان اپنے تمام کارندوں کو وحید کے ذریعے ہی احکام بھیجتا تھا اس لیے مستان کے تمام کارندے وحید کی کہی ہوئی کسی بات کو بھی بلاچون و چرا مان کر اس پر عمل کرتے تھے۔ جوہو کے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں وحید کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے میں نے کہا ''حاجی مستان تم پر بہت اعتماد کرتا ہے اور تم بھی اس کے جانثار ساتھی ہو۔ حاجی آج کل جس پریشانی میں گھرا ہوا ہے، مجھے اس کے متعلق بخوبی علم ہے لیکن وہ مجھے کبھی بھی اجازت نہیں دے گا کہ اس کی پریشانی رفع کرنے کی کوشش میں، میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کو خطرے میں ڈالوں۔ تمہارے سوا اس کا کوئی ایسا معتمد ساتھی دکھائی نہیں دیتا جو اس معاملے میں میری مدد کرسکے۔ تم بتاؤ کہ کیا تم حاجی مستان کے علم میں لائے بغیر اپنے طور پر میرا ساتھ دینے کو تیار ہو۔'' وحید میری بات سن کر بولا ''مستان سیٹھ کی بھلائی کے لیے تو میں اپنی جان بھی قربان کردوں تب بھی اس کے احسانات کا بدلہ اتار نہ پاؤں گا۔ آپ بتایئے، مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں صرف مستان سیٹھ سے غداری نہیں کرسکتا۔ باقی ہر کام اپنے وسائل اور امکان سے بڑھ کر کرنے کو تیار ہوں۔'' وحید کے چہرے سے اس کے دلی جذبات عیاں تھے جن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، خلوص دل سے کہا ہے۔ میں نے اسے کہا ''دیکھو وحید! یہ انتہائی رازداری کا معاملہ ہے۔ وقت کم ہے اور کام زیادہ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم یہ کام کرسکتے ہو۔ مجھے گوکھلے کو ختم کرنا ہے اور اس کے لیے مجھے کل شام یا زیادہ سے زیادہ پرسوں شام چار بجے تک، دو پولیس جیپ، تین سیاہ رنگ کی ہندوستان یا ایمبیسڈر میک کی

گاڑیاں، ایک انسپکٹر، ایک سب انسپکٹر اور آٹھ سپاہیوں کی مکمل وردیاں، دو اسٹین گنیں اور ایک ایسا ٹیلی فون جہاں سے مجھے بالکل علیحدگی میں فون کرنے اور فون کال ریسیو کرنے کی سہولت مل سکے اور فون نمبر ایسا ہو جسے گوکھلے کسی طور بھی نہ جانتا ہو کی ضرورت ہے۔'' وحید چند منٹ سوچتا رہا اور پھر بولا۔ جیپیں تو ہمارے پاس سات آٹھ ہیں اور چند گھنٹوں میں ان پر خاکی رنگ کرکے اور ان پر Police لکھوا کر انھیں پولیس جیپوں کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حاجی صاحب کا تمام اسلحہ میرے ایک اسسٹنٹ کی تحویل میں ہے۔ اس سے سٹین گنیں اور گولیاں لینا میرے لیے ذرا بھی مشکل نہیں۔ پولیس کی سلی سلائی وردیاں بازار میں ملتی ہیں۔ میں یہ وردیاں اور رینک کے نشان دو گھنٹے میں خرید لوں گا۔ باقی رہا ٹیلی فون تو میرے گھر کے ایک علیحدہ ٹیلی فون سے جس کے نمبر کا صرف حاجی صاحب اور میرے ایک اسسٹنٹ کے سوا کسی کو علم نہیں۔ مسئلہ تین سیاہ کاروں کا ہے۔ بمبئی میں درجنوں رینٹ اے کار والے ہیں۔ ان سے تین سیاہ ایمبیڈر گاڑیاں مل سکتی ہیں لیکن وہ اپنے ڈرائیوروں کے ساتھ گاڑیاں دیتے ہیں۔ میں ڈرائیوروں کے ساتھ گاڑیاں لے لوں گا اور گاڑیاں اپنے ایک دوست کے گھر لے جاکر ڈرائیوروں کو چائے میں بیہوشی کی دوا ملاکر پانچ چھ گھنٹے کے لیے بیہوش کردیا جائے گا اور گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں بھی بدل دی جائیں گی۔ آپ وردیوں اور جوتوں کا ناپ دیں تاکہ میں اپنے ذمے کام کا آغاز کروں'' میرے کہنے پر وحید نے بمبئے گیرج میں فون ملایا اور میں نے قیصر کو فون پر بلوا کر کہا کہ اپنے اور اپنے ساتھیوں تینوں فوجیوں نمبرٹو اور اس کے ساتھیوں اور رضی کے ناموں کے ساتھ ان سب کی پینٹ، قمیص اور جوتے کے ناپ لکھ کر رکھے اور وحید کو دے جو آج کسی وقت اس کے پاس آئے گا۔ ہم جوہو کے بنگلے سے ایک ساتھ نکلے۔ ہماری گاڑی میں محافظ اور ڈرائیور بھی تھا۔ وحید نے راستے میں اتر کر ٹیکسی پکڑی اور میں مالابار والے بنگلے میں چلا آیا۔ اس دوران میں نے اپنے منصوبے کو قابل عمل بنانے کے لیے آخری پچ دے دیے تھے۔ بھارت کی مرکزی حکومت میں ایک ICS مونا سکھ کیول سنگھ وزارت خارجہ میں سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوکر مشیر خارجہ کی حیثیت سے اہم ذمہ داریاں ادا کررہا تھا۔ یہ سکھ تقسیم ہند سے قبل راولپنڈی میں کمشنر تھا اور میں نے اس کا سوانگ بھر کر گوکھلے تک پہنچنے کا پروگرام بنایا تھا۔ شام ڈھلے وحید مالابار کے بنگلے پر آیا۔ میں اس وقت حاجی مستان کے ساتھ بیٹھا گپ بازی کررہا تھا۔ وحید نے مجھے اشارہ کیا اور تھوڑی دیر بعد میں حاجی مستان سے بمبئی گھومنے کی اجازت لے کر وحید کے ہمراہ محافظوں والی گاڑی میں میرین ڈرائیو کی طرف چل پڑا۔ ہم ہل ٹاپ ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ وحید نے مجھے بتایا کہ اس نے وردیوں اور جوتوں کے ناپ لے لیے ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ فوجی JCO کے لیے انسپکٹر اور ان کے ایک سپاہی کے لیے سب انسپکٹر اور باقی سب کے لیے سپاہی کی وردیاں اور جوتے خرید لے۔ وحید نے مجھے بتایا کہ تین ایمبیسڈر سیاہ گاڑیوں کا بھی اس نے انتظام کرلیا ہے اور کل تین بجے وہ انھیں

لے کر اپنے دوست کے گھر پہنچ جائے گا۔ حاجی مستان کی دو جیپوں کو آج رات خاکی رنگ کرکے انھیں پولیس کی جیپیں بنادیا جائے گا اور سب گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں بھی بدل دی جائیں گی۔ گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو بیہوش کرنے کے لیے اس نے خاصی مقدار میں بیہوشی کی دوا اور کلوروفارم بھی لے لی ہے اور اسٹین گنیں بھی وہ رات کو اسلحہ خانے سے نکلوالے گا۔ وحید نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بڑی مشکل سے اس نے یوسف پٹیل کے ایک خاص معتمد سے گوکھلے کے ڈائریکٹ فون کے دو نمبر بھی حاصل کرلیے ہیں اور کل قبل از دوپہر اس نے اپنی بیوی بچوں کو اپنے سسرال جانے کا کہہ دیا ہے اس لیے اس کا گھر خالی ہوگا۔ ہم نے یہ پروگرام سیٹ کیا کہ کل دو بجے بعد دوپہر میرے تمام ساتھی ٹیکسیوں میں وحید کے گھر پہنچیں گے۔ تین بجے تینوں سیاہ گاڑیاں اس کے دوست کے گھر پہنچیں گی اور ان کے ڈرائیوں کو وہیں بے ہوش کردیا جائے گا۔ دونوں جیپیں دو بجے وحید کے گھر پہنچ جائیں گی اور ان کے ڈرائیوروں کو رخصت کردیا جائے گا۔ میرے تین ساتھی وحید کے دوست کے گھر جاکر تینوں گاڑیاں لے آئیں گے اور وحید کے گھر پر ہی وردیاں پہنیں گے۔ اس کے آگے کیا کچھ کرنا تھا، وحید کو سوائے اس کے کچھ علم نہ تھا کہ ہمارا یہ مشن گوکھلے کو ختم کرنے کا ہے۔

ہل ٹاپ ہوٹل کے ریسٹورانٹ سے ہم بمبئے گیرج آئے۔ میں نے تمام ساتھیوں کو مشن کی تفصیلات بتاکر نمبرٹو اور اس کے ایک ساتھی کی ڈیوٹی مین گیٹ کے پہریداروں کو قابو میں کرنے پر لگائی۔ قیصر نے میرے اسسٹنٹ کے طور پر میرے ہمراہ اور تینوں فوجیوں کو ہمارے حفاظتی گارڈ کے طور پر ہمارے قریب رہ کر مجھے اور اردگرد کے محافظوں کو کور کرنا تھا اور قیصر کے ساتھیوں نے عقبی حصے اور رضی نے رہائشی منزل کی گیلری سے محافظوں کو کور کرنا تھا۔ میرا سب تھائیوں کے لیے یہ جنرل آرڈر تھا کہ مسلح محافظوں سے اسلحہ چھین لیا جائے اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو اس پر گولی چلادی جائے۔ ہمارے پاس کل چار اسٹین گنوں میں سے ایک JCO کو، ایک نمبرٹو کو اور ایک رضی اور ایک قیصر کے ایک ساتھی کو عقبی حصے کی نگرانی کے لیے دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ گوکھلے کے محافظوں کا اسلحہ بھی میرے ساتھیوں کے کام آسکتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ تبھی ممکن تھا جب ہم ایک بار مین گیٹ کے اندر داخل ہوجائیں اور میرے ساتھی گوکھلے کے پہریداروں پر ان کی بے خبری میں حملہ آور ہوں۔ میں نے اپنے سارے ساتھیوں کو تین بار ان کی تعیناتی کی جگہیں سمجھا کر انھیں اچھی طرح سے ذہن نشین کروا دیں۔ میں نے انھیں یہ بھی تنبیہہ کی کہ گوکھلے کے پہریداروں پر صرف اس وقت قابو پانے کی کوشش کی جائے جب JCO انھیں سگنل دے کیونکہ یہ کام قبل از وقت کرنے سے گوکھلے اتنے بڑے گھر میں خفیہ جگہوں پر غائب بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا کوئی ہم شکل میرے سامنے آئے۔ لہٰذا میرا اطمینان ہوتے ہی قیصر JCO کو بتائے گا اور JCO باقی ساتھیوں کو سگنل دے گا تب ہی وہ اپنی کارروائی کریں۔ اس سے پہلے وہ لان میں پہریداروں کے قریب رہیں اور عقبی حصے میں بھی سگنل

ملنے کے بعد جائیں۔ یہ تمام ہدایات دے کر میں مالا بار ہلز والے بنگلے میں چلا گیا۔

حاجی مستان گزشتہ دو روز سے میرے خلاف معمول زیادہ وقت بنگلے سے باہر رہنے کو نوٹ کرچکا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ آخر میں اتنا وقت کہاں گزارتا ہوں اور اکثر اسے بتائے بغیر ہی باہر چلا جاتا ہوں۔ میں نے اس کی بات کو مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا ''میں تمہارے خلاف ایک سازش کررہا ہوں اور اسی میں دن کا بیشتر وقت باہر گزرتا ہے۔'' مستان کہنے لگا ''سازش کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے پاس اسلحہ ہے اور میں خالی ہاتھ ہوں۔ مجھ پر بیشک گولی چلاکر مجھے ہلاک کردو۔ مرتے وقت مجھے اتنا تو اطمینان ہوگا کہ ایک بہادر دوست کے ہاتھوں مررہا ہوں، کسی مکار اور بزدل دشمن کے ہاتھوں نہیں۔'' میں نے بڑھ کر مستان کو گلے لگالیا اور کہا ''مستان! دراصل بات یہ ہے کہ میں دو تین روز میں واپس جانا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ جانے سے پہلے چند ان کانٹوں کو سمیٹ لوں جن کی چبھن کا درد یہاں کے سارے مسلمان محسوس کررہے ہیں۔'' میری بات کی تہہ کو نہ سمجھتے ہوئے بھی مستان کہنے لگا۔ ''تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔ میرے آدمی اور میں اپنے تمام وسائل کے ساتھ تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔'' میں نے پھر بات کو ٹالتے ہوئے کہا ''مستان! کیا تم مجھے اپنا ساتھی نہیں سمجھتے ہو۔ میں اور میرے تمام ساتھی تمہارے وسائل کی وجہ سے یہاں بے خوف وخطر رہتے اور گھومتے پھرتے ہیں۔ بہرحال اگر تم بہت ہی اصرار کرتے ہو تو انشاء اللہ کل رات تمہیں تفصیلاً سب کچھ بتا دوں گا۔ ابھی اس لیے نہیں بتاسکتا کیونکہ اس مشق کو میں نے ہرصورت میں انجام دینے کا تہیہ کیا ہوا ہے اور اگر تم نے اس پر اعتراض کیا تو میں بڑے مخمصے میں پڑ جاؤں گا۔''

اس رات کافی دیر تک میں اور حاجی مستان بمبئی کے زیرزمین کام کرنے والوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں گوکھلے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن یہ بھی چاہتا تھا کہ مستان کو گوکھلے میں میری اتنی زیادہ دلچسپی کے باعث میرے اصل عزائم اور کل کے مشن کے متعلق کوئی شک نہ پڑجائے۔ میں نے اسے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے اسلحے کے کلکتہ میں ہونے کا کہہ کر اس بارے میں خاصا مطمئن تو کردیا تھا کہ ہم اگر چاہیں بھی تو بغیر معقول اسلحے کے گوکھلے سے کیونکر بھڑ سکتے ہیں اور مستان سے بھی میں نے ایک پسٹل کے سوا کوئی دوسرا ہتھیار نہیں لیا تھا۔ اسے یہ کہہ کر گفتگو کا رخ یہاں کے زیر زمین کام کرنے والوں کی طرف موڑا تھا کہ یہاں کے مختلف گروہوں کے متعلق میں اس لیے زیادہ جانکاری حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ پاکستان میں میرے محکمے نے مجھے بتایا تھا کہ بھارت کے بعض اسمگلروں کے پاکستانی اسمگلروں سے خفیہ رابطے ہیں اور پاکستان کے ذریعہ یہ اسمگلر افغانستان میں بنی ہوئی منشیات بھارت کو سپلائی کرتے ہیں۔ دونو ممالک کے خفیہ رابطوں والے ان اسمگلروں میں سے بعض تو صرف کاروباری حد تک ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہیں لیکن چند کے متعلق ٹھوس شواہد ملے ہیں کہ وہ پاکستانی اسمگلروں کے

ذریعے پاکستان کی دفاعی تیاریوں اور خصوصاً ایٹمی پلانٹ کے متعلق معلومات بھی حاصل کررہے ہیں۔ ان بھارتی اسمگلروں کو بھارتی حکومت اور سول اور فوجی خفیہ ایجنسیوں خصوصاً DMI اور انٹیلی جنس کور کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اسی لیے میں ان کے متعلق سوالات پوچھ رہا ہوں۔ حاجی مستان جو بڑی دلچسپی اور غور سے میری باتیں سن رہا تھا کہنے لگا ''میں تو سمجھا تھا کہ تمہارے کہنے کے مطابق تمہارا اپنے محکمے سے واسطہ ختم ہوچکا ہے اس لیے میں نے اس موضوع پر تم سے کوئی بات نہیں کی'' ''مستان بھائی! چھٹتی نہیں یہ کافر منہ سے لگی ہوئی کے مطابق ظاہری تعلق ختم ہونے کے بعد بھی اس سے واسطہ ختم نہیں ہوتا۔ جس طرح وطن سے دور رہ کر بھی وطن کی محبت اور بھلائی کے جذبات ختم نہیں ہوتے بالکل ویسے ہی اس محکمے سے علیحدہ ہوکر بھی اس کے لیے کوئی مفید کام معلومات پہنچانے سے باز نہیں رہا جاسکتا اور یہ محکمہ بھی اپنے سابق ملازمین کی خدمات کو نہ تو کبھی فراموش کرتا ہے اور نہ ہی ان کی حاصل کردہ معلومات کو ردی کی ٹوکری میں پھینکتا ہے۔ تمہیں یقیناً علم ہوگا کہ اس محکمے میں تنخواہ اتنی کم ملتی ہے کہ کوئی بھی انسان محض تنخواہ کے لالچ میں اس میں شامل نہیں ہوتا۔ حب الوطنی اور ملک وقوم سے محبت کے جذبات رکھنے والے ہی کسی مادی لالچ کے بغیر اس محکمے کو اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے سبکدوش ہونے والے ملازمین اور اس محکمے میں وطن کی محبت کا جذبہ ہمیشہ کے لیے ایک مضبوط رابطہ بنائے رکھتا ہے کیونکہ دونوں کا اول و آخر مقصد وطن پرستی اور ملک وملت کی بھلائی ہے'' میری باتیں سن کر مستان گہری سوچ میں پڑگیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا وہ بکھرے ہوئے واقعات کو یکجا کررہا ہو۔ چند لمحوں بعد وہ سوچ کے سمندر سے باہر نکلا اور بولا ''یہاں پر میمن کمیونٹی کا ایک گروہ بڑی تیزی سے ابھر رہا ہے۔ میمن بنیادی طور پر تجارت کرتے اور کاروباری لوگ ہیں۔ بمبئی کے کاروباری ہندوؤں کو اگر کوئی زچ کر رہا ہے تو وہ میمن، بورے اور گجراتی مسلمان ہیں۔ یہ امن پسند اور لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والے ہیں لیکن ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے جب پانی سر سے اونچا ہوگیا تو ان کا ایک گروہ مکمل تیاری کے ساتھ پوری طرح مسلح ہوکر ہندو سازشیوں کے سامنے خم ٹھونک کر سامنے آگیا۔ وسائل اور بھرپور مالی امداد ان کے کاروباری طبقے نے مہیا کی۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ ایک شریف انسان جب تنگ آکر غنڈہ گردی پر اتر آئے تو اس سے زیادہ خطرناک اور کوئی نہیں ہوتا اور جب کاروباری لوگ اپنے کاروباری داؤ پیچ کے تجربات کو زیر زمین کاموں میں استعمال کرنے لگیں تو سب کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ میمن پاکستان کے بے حد خیرخواہ ہیں اور ان کے پاس ان پاکستانی اور بھارتی اسمگلروں کے متعلق مفصل معلومات ہیں جو پاکستان کے دفاعی اور سلامتی کے رازوں کو خریدتے اور بیچتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں ایک دو روز میں ہی اس گروہ کے لیڈر سے تمہاری ملاقات کرواتا ہوں۔ تمہارے متعلق میرے اطمینان دلانے پر کہ تم ایک محب وطن پاکستانی ہو اور تمہارے گزشتہ کارنامے بیان کرکے مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں ان پاکستانی دشمن گروہوں کے متعلق مفصل معلومات

دیں گے جو بظاہر پاکستانی ہیں اور اندورنی طور پر پاکستان کی جڑیں کاٹنے میں مشغول ہیں۔"

"تمہارے خیال میں کیا گوکھلے بھی ان میں سے ایک ہے جو پاکستانی دفاعی راز خریدتا ہے۔" میرے اس سوال کا مستان نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "یقیناً ورنہ بھارتی حکومت اور خفیہ ایجنسیوں کی معاونت اسے کیسے حاصل ہوتی۔ میمن گروہ بھی گوکھلے کی پاکستان دشمن سرگرمیوں سے بخوبی واقف ہے لیکن یہ بنیادی طور پر کاروباری لوگ جس طرح کاروبار میں نفع نقصان کا پہلے پوری طرح سے اندازہ کرکے کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں ویسے ہی گوکھلے کے خلاف انھوں نے ابھی تک اس لیے ہاتھ نہیں ڈالا کیونکہ انھیں یہ خدشہ ہے کہ اگر وہ اپنے Attempt (کوشش) میں ناکام ہوگئے تو اس کا خمیازہ ان کی ساری کمیونٹی کو بھگتنا پڑے گا اور بھارت کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہوجائے گی۔ شاید وہ ابھی تک اس پوزیشن میں نہیں آئے کہ گوکھلے کے خلاف اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکیں۔"

رات کو خاصی دیر تک حاجی مستان سے اس موضوع پر باتیں کرنے کے بعد میں اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔ رات کو سونے سے پہلے اور صبح اٹھنے کے بعد میں نے باری تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ وہ ہمیں آج کے مشن میں کامیابی سے ہمکنار کرے۔ گوکھلے نہ صرف حاجی مستان کا دشمن تھا بلکہ پاکستان کے خلاف خطرناک سرگرمیوں میں بھی ملوث تھا اور اس کا خاتمہ کرنے میں اب حاجی مستان سے میری دوستی اور اس کے احسانوں کا بدلہ چکانے کی خواہش کے علاوہ ایک پاکستان دشمن کو جہنم واصل کرنے کا جذبہ بھی شامل ہوگیا تھا۔

اگلی صبح ناشتے کی ٹیبل پر میں اکیلا تھا۔ حاجی مستان کے متعلق معلوم ہوا کہ اسے فلو اور بخار ہوگیا ہے لہٰذا آج وہ ناشتے میں شامل نہ ہوسکے گا۔ میں بمبئے گیرج جانے کا سوچ رہا تھا کہ وحید آگیا اور اس نے بتایا کہ اس کے ذمے اب تک کے جو کام تھے وہ ہوچکے ہیں۔ دو جیپوں کو خاکی رنگ کرکے پولیس کی جیپیں بنادیا گیاہے اور میرے ساتھیوں کو ان کی وردیاں بھی پہنادی گئی ہیں اور تینوں پرائیویٹ سیاہ گاڑیاں بھی مقررہ وقت پر اس کے دوست کے گھر پر پہنچ جائیں گی۔ میں نے وحید کو ان اخراجات کے لیے روپیہ دینا چاہا تو اس نے کہا کہ اس نے سب کی ادائیگی کردی ہے اور تمام اخراجات کی تفصیل لکھ کر وہ رات کو مجھے دے گا۔ وحید کے ساتھ ہی میں بمبئے گیرج گیااور ساتھیوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا اور انھیں (Last minute Instructions) آخری ہدایات دے کر وحید کے ہمراہ اس کے گھر چلا گیا۔ بمبئی کی آب و ہوا کے مطابق عام طور پر صرف پینٹ اور قمیص پہنتا تھا۔ آج صبح میں نے اپنا ایک عمدہ سفاری سوٹ پریس کروایا تھا اور اب وہی پہنے ہوئے تھا۔ مجھے کیول سنگھ کے بہروپ میں جانے کے لیے ایسے کپڑے پہننا لازمی تھا۔ دو بجے بعد دوپہر میں نے وحید کے گھر سے گوکھلے کے ایک ڈائریکٹ نمبر کو ڈائل کیا۔ (وحید کو میں نے کل یہ بھی کہا تھا کہ ایئر انڈیا کی آج کی قبل از دوپہر دہلی سے بمبئی آمد اور رات کو دہلی جانے والی فلائیٹ کے نمبر معلوم کرے اور دہلی

جانے والی فلائیٹ پر کیول سنگھ کے نام سے فرسٹ کلاس کی سیٹ بھی بک کروادے۔ اس نے یہ کام بھی کردیا تھا) فون گوکھلے کے کسی کارندے نے اٹھایا۔ میں نے اسے کہا کہ گوکھلے صاحب کو کہے کہ دہلی وزارت خارجہ سے کیول سنگھ لائن پر ہیں۔ گوکھلے فوراً ہی لائن پر آگیا۔ "میں گوکھلے بول رہا ہوں" یہ سنتے ہی میں نے اسے ہولڈ کرنے کا کہا اور چند سیکنڈ بعد آواز بدل کر بولا "Am I Speaking to Mr. Gokhalay" (کیا میں گوکھلے سے مخاطب ہوں) "Yes Sir, Yes Sir, I am Gokhalay" (جی ہاں، جی ہاں میں گوکھلے ہوں) میں نے الفاظ چبا چبا کر دھیمی آواز میں گوکھلے کو کہا "مسٹر گوکھلے! میں وزارت خارجہ کا مشیر کیول سنگھ ہوں۔ ایک خاص اور خفیہ مشن کے لیے مجھے پردھان منتری (وزیراعظم) کے حکم پر تم سے آج پانچ بجے شام ملنا اور آج رات ہی دہلی واپس جانا ہے۔ میں ٹھیک پانچ بجے تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا۔ تمہارے تمام ٹیلی فون Under Observation ہیں اس لیے فون پر اس سے زیادہ کچھ نہیں بتاسکتا۔ میرے ساتھ Escort Police (محافظ پولیس) اور میرا حفاظتی دستہ ہوگا۔ اپنے پہریدار دربانوں کو کہہ دینا کہ پولیس کا ہوٹر سنتے ہی گیٹ کھول دیں۔ مشن کی اہمیت اور رازداری کے لیے میں نہیں چاہتا کہ ہماری بات کا کسی دوسرے کو علم ہو" یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا مشن تھا جس کو بھرپور تیاری کے بغیر عجلب میں ترتیب دیا گیا تھا۔ گوکھلے کے کسی سوال کرنے سے پہلے ہی میں نے فون اس لیے بند کردیا تھا کیونکہ اعلیٰ سرکاری حکام کا یہی انداز ہوتا ہے۔ "خفیہ مشن" ہونے کی وجہ سے گوکھلے دہلی یا بمبئی میں کسی سے اصل کیول سنگھ کی آمد کی بات نہیں کرسکتا تھا۔ میرے کہنے کے مطابق وہ صرف ایئر انڈیا سے میرے آج رات واپس جانے کی تصدیق کرسکتا تھا۔ سو اس کا بھی میں نے کیول سنگھ کے نام سے سیٹ بک کروا کے انتظام کردیا تھا۔ میرے فون بند کرنے کے چند منٹ کے اندر میرے تمام ساتھی وحید کے گھر پہنچ گئے اور پولیس کی وردیاں پہن لیں۔ "پولیس" کی دونوں جیپیں بھی مقررہ وقت پر وہاں پہنچ چکی تھیں۔ وحید ٹھیک تین بجے قیصر، رضی اور JCO (JCO اور رضی پولیس کی وردیوں میں تھے) کو لے کر اپنے دوست کے گھر کی طرف ایک جیپ میں روانہ ہوا۔ اور سوا چار بجے تینوں سیاہ ایمبیسڈر گاڑیاں اور جیپ لے کر واپس وحید کے گھر پہنچے۔ ہماری روانگی کا وقت ہوچکا تھا۔ اللہ کا نام لے کر ہم سب نے اپنے اپنے اسلحے کو آخری بار چیک کیا۔ قیصر سویلین لباس میں میرے ساتھ ایک ایمبیسڈر گاڑی میں بیٹھا اور رضی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اس کے ساتھ قیصر کا ایک وردی پہنے ساتھی بیٹھ گیا۔ ہوٹر والی جیپ میں JCO اور دوسری جیپ میں سب انسپکٹر کی وردی والا JCO کا سپاہی بیٹھا اور باقی گاڑیوں میں سارے ساتھی بیٹھ گئے۔ ہمارے قافلے کی پوزیشن یوں تھی کہ سب سے آگے ہوٹر والی جیپ اس کے پیچھے تینوں ایمبیسڈر گاڑیاں جن میں سے پہلی میں، میں، قیصر، رضی اور قیصر کا ایک ساتھی تھے۔ پچھلی دو گاڑیوں میں دو دو ساتھی تھے اور آخر میں جیپ میں "ہمارا سب انسپکٹر" بنگلہ دیشی فوجی اور

باقی ساتھی تھے۔ ہمارا یہ کاروان آہستہ رفتار سے روانہ ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ ٹھیک پانچ بجے ہم گوکھلے کے بنگلے پر پہنچیں۔ ہم نے وہ راستہ اختیار کیا جو صوبائی دارالحکومت کے مہمان خانے سے ہوتا ہوا شیواجی پارک جاتا تھا۔ بھارت میں چاہے وزیراعظم ہی گاڑی میں کیوں نہ بیٹھا ہو، عوامی ٹریفک کو روکنے اور بند سگنل کو کراس نہیں کیا جاتا۔ یہ لعنت صرف پاکستان میں ہی ہے کہ جمہوریت کے علمبردار جب کسی عہدے پر فائز ہوجاتے ہیں تو ایک صوبائی وزیر کے لیے بھی ٹریفک بند کردی جاتی ہے۔ سارے ملک کی آدھی سے زیادہ پولیس تو ان بھاری مینڈیٹ حاصل کرنے والے حکمرانوں کو ان کو یہ ''مینڈیٹ'' دینے والوں سے دور رکھنے اور ان کی حفاظت پر مامور ہوتی تھی۔ کیا عجب تماشہ ہے کہ جب حکمران تھے تب بھی خود بلٹ پروف گاڑیوں میں سفر کرتے اور آگے پیچھے محافظوں اور پولیس کی درجنوں گاڑیاں اور سینکڑوں پولیس والے اور کمانڈو حفاظت کے لیے مامور ہوتے تھے۔ اب جیل میں ہیں تو تب بھی بلٹ پروف (بکتر بند) گاڑی میں ہی جیل سے عدالت آتے اور جاتے ہیں اور بیسیوں محافظ ہمراہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مرسیڈیز کی آرام دہ سیٹوں کے بجائے اب پولیس کی بکتربند کی سخت نشست پر بیٹھنا پڑتا ہے اور یہ نہ ایئرکینڈیشنڈ ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے دروازے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان تن آسانوں کے تن و توش آسانی سے اندر جاسکیں۔ ٹھیک پانچ بجے ہمارا قافلہ گوکھلے کے بنگلے پر پہنچا اور حسب ہدایت اگلی جیپ نے ہوٹر بجانا شروع کیا۔

گوکھلے کے دربان تو جیسے ہمارے انتظار میں ہی تھے۔ ہوٹر کی آواز سنتے ہی لوہے کے بجلی سے کھلنے اور بند ہونے والے گیٹ کی دید بان کھڑکی سے کسی نے جھانکا اور مین گیٹ کا سلائیڈنگ دروازہ کھلنا شروع ہوا۔ اس دوران میں نے اوپری منزل کی گیلری میں دو مسلح آدمیوں کو دیکھا۔ ان کے درمیان سر کے بالوں سے آزاد ایک چھوٹے قد کا آدمی کھڑا تھا۔ ہماری گاڑیاں بنگلے میں داخل ہونے لگیں تو وہ آدمی گیلری سے اندر چلاگیا۔ روایتی طور پر اگلی جیپ نے سائیڈ پر ہوکر میری گاڑی کو آگے بڑھنے کا موقع دیا اور جب تک کہ میری گاڑی جہاں اصل عمارت کے اندر داخل ہونے کی جگہ پر پہنچی جہاں گوکھلے کے چار مسلح پہریدار کھڑے تھے، ہمارا انسپکٹر، سب انسپکٹر اور سپاہی انھی جیپوں اور گاڑیوں سے نکل کر میری گاڑی کے قریب آگئے۔ میری گاڑی سے پہلے اگلی سیٹ پر بیٹھا سپاہی اور قیصر باہر نکلے۔ گوکھلے کے دربانوں نے میری گاڑی کا دروازہ کھولنا چاہا تو انسپکٹر نے انھیں روک دیا۔ قیصر نے دربانوں سے پوچھا ''ہمارے صاحب کا استقبال کون کرے گا صرف تم پہریدار؟'' اتنی دیر میں ہی ایک ''گوکھلے'' آیا۔ قیصر نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ انسپکٹر، سب انسپکٹر اور دو سپاہیوں نے مجھے سلیوٹ کیا۔ گوکھلے آگے بڑھا تو میں گاڑی سے باہر نکلا اور پرنام کرتے ہوئے گوکھلے کے پیچھے ہی اندر داخل ہوگیا۔ بمبئی پولیس کے افسر اپنی پی کیپ پر پیلی پٹی لگاتے ہیں۔ پولیس کا ہر جگہ ویسے ہی اچھا خاصا رعب ہوتا ہے۔ تین پھول کندھے پر لگائے اور پیلی پٹی والی پی کیپ پہنے انسپکٹر نے جب

دربانوں کو اندر جانے سے روکا تو وہ تو وہیں رک گئے۔ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو میرے سپاہیوں نے گیٹ کے دربانوں اور ان چار محافظوں کو غیرمحسوس انداز میں اپنے نشانہ پر لے رکھا تھا بلکہ زیادہ بہتر الفاظ میں اپنے اپنے شکار کو چن لیا تھا۔ گوکھلے کے دونوں ہاتھوں کی پانچ پانچ انگلیاں تھیں۔ ہم لوگ بنگلے میں داخل تو ہو ہی چکے تھے۔ میں نے گوکھلے کے اس ڈرامے کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا اور خاموشی سے میں اور قیصر اس کے ساتھ نچلی منزل کے وسطی ہال میں داخل ہوگئے۔ اس ہال کے درمیان سے کارپیٹڈ سیڑھی اوپری منزل کو جاتی تھی لیکن گوکھلے وسطی ہال کے ایک کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ کمرہ نہایت اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ ایک بڑا ڈرائینگ روم تھا۔ گوکھلے نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کو کہا تو میں نے کھردرے انداز میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس بہت کم وقت ہے اس لیے گوکھلے کو بلواؤ۔'' گوکھلے حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا تو میں نے اسے کہا ''دیکھو مسٹر! یہ ڈرامہ بازی اور ایکٹنگ دوسروں کے ساتھ کرنے میں شاید تم کامیاب ہوجاتے ہو لیکن ہم وزارت خارجہ والے اتنے بھولے نہیں کہ اصل اور نقل میں پہچان نہ کرسکیں۔ تمہارے ساتھ چلتے ہوئے ہی مجھے محسوس ہوگیا تھا کہ تم مالک نہیں بلکہ نوکر ہو۔'' میری بات سن کر گوکھلے خاموشی سے ڈرائنگ روم میں کھلنے والے ایک کمرے میں داخل ہوا اور دو تین منٹ میں ہی اپنے ایک اور ہم شکل اور ہم وضع قطع اور اپنی طرح ہی الٹی دھوتی اور کرتا پہنے ایک اور گوکھلے کے ساتھ اس کمرے سے باہر نکلا۔ ان دونوں میں اصل کی تمیز کرنا واقعی بہت مشکل تھا۔ اس نئے گوکھلے کے دائیں ہاتھ کی چھ انگلیاں تھیں۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ بولا۔ ''سر ہم نے وزارت خارجہ کے افسران کی باریک بینی کے متعلق واقعات تو بہت سارے سن رکھے تھے لیکن ان کا آنکھوں دیکھا مظاہرہ آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ کرپا کرکے مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ آپ نے یہ کیونکر جانا کہ یہ اصل گوکھلے نہیں ہے۔'' میں نے ہاتھ ملاتے وقت ٹٹول کر اچھی طرح سے دیکھ لیا تھا کہ اس گوکھلے کی چھنگلی اصلی ہے۔ میں نے اسے کہا ''مالک اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق بات کرتا ہے اور ملازم مالک کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ تمہارے اس بہروپیے نے جب مجھے گاڑی سے اترتے ہوئے پرنام کیا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے آنکھیں چار کرتے ہوئے میرا سواگت کرتا۔ میں تم سے ملنے تمہارے گھر آیا تھا۔ اس لیے اسے خوش دلی اور کھلے بازوؤں سے (With Opern Arms) مجھے ریسیو (Receive) کرنا چاہیے تھا اور اس کی حالت ایسی تھی جیسے پتلی گھر میں ناچتی کودتی پتلیوں کی ہوتی ہے جن کی ایک ایک حرکت تماشہ دکھانے والوں کے ہاتھوں میں پکڑے دھاگوں کے تابع ہوتی ہے۔ بہرحال میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے آج ہی دہلی جانا ہے۔ اس لیے میں اصل بات کی طرف آتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے میں نے قیصر کو کہا ''امرناتھ فائل دو'' ''سر وہ تو گاڑی میں پڑی ہے۔ میں ابھی لایا'' قیصر یہ کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔ فائل والی بات اصل میں ہمارا کوڈ تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ قیصر گاڑی سے فائل نکالنے کے

بہانے لان میں جا کر یہ دیکھے کہ سب صورت حال ہمارے قابو میں ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ایک خالی فائل گاڑی میں رکھ دی تھی۔ میں نے گوکھلے کو کہا کہ اپنے اس ڈپلیکیٹ (Duplicate) کو واپس بھیجے۔ معاملہ چونکہ بہت اہم ہے اس لیے میٹنگ کے دوران تمہارے اور میرے سوا صرف میرا PA ہمارے ساتھ ہوگا۔ گوکھلے نے اسے اشارہ کیا اور وہ فوراً ہی کمرے سے باہر چلا گیا۔ گوکھلے کہنے لگا ''سر! میں تو سمجھتا تھا کہ آپ بہت Aged (ادھیڑ عمر) ہوں گے۔ لیکن آپ تو بھگوان کی کرپا سے بالکل جوان ہیں'' میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مسکرانے لگا۔ اسی اثنا میں قیصر فائل لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور فائل مجھے تھماتے ہوئے میرا ہاتھ دباتے ہوئے سب کچھ ٹھیک اور قابو میں ہے کا سگنل دیا۔ میں نے گوکھلے کو کہا ''اب ہم میٹنگ شروع کرتے ہیں۔ ایک سنگل صوفے پر میں بیٹھ گیا اور میرے قریب ہی بڑے صوفے پر گوکھلے بیٹھ گیا۔ میں نے فائل میز پر رکھتے ہوئے کہا ''میں عینک نکال لوں۔'' قیصر میرے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔ میرے بالکل سامنے دیوار پر ایک بہت بڑے شیشے نے آدھی دیوار کو کور (Cover) کر رکھا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا تو قیصر کا ہاتھ بھی اس کی جیب میں جا چکا تھا۔ بیک وقت ہم دونوں نے اپنے پسٹل اور ریوالور نکالے۔ میں نے گوکھلے کی طرف پسٹل کی نال کرتے ہوئے کہا ''مسٹر گوکھلے! تمہارے زیر زمین سرگرمیوں نے ودیش منتری (وزیر خارجہ) کو بہت پریشان کر رکھا ہے اس لیے ان کے حکم کے مطابق میں تمہیں ختم کرنے یہاں آیا ہوں'' گوکھلے کا رنگ فق اور چہرہ پیلا پڑ گیا۔ چندن لگی ہوئی اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا ''میں اصل گوکھلے نہیں ہوں بلکہ اس کا ڈپلیکیٹ ہوں بھگوان کہ لیے مجھ بے گناہ کو نہ ماریں'' میں نے ہاتھ ملاتے وقت اس کی چھنگلی کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور یہی اصل گوکھلے تھا۔ چنانچہ میں نے بڑے آرام سے جواب دیا۔ ''کوئی بات نہیں۔ اگر تم ڈپلیکیٹ ہو تو پھر تو میں تمہیں ضرور ہلاک کروں گا کیونکہ یہی جاننے کے لیے ہم نے اسلحہ نکالا تھا۔ اصل گوکھلے کو تو ہمیں اپنے ہمراہ دہلی لے جانے کے آرڈر ملے ہیں'' میں نے اس مکار ہندو کو اس کی مکاری سے مارنے کا تہیہ کیا تھا۔ میری بات سن کر وہ گڑگڑانے لگا ''نہیں سر! مجھے مت ماریے۔ میں ہی اصلی گوکھلے ہوں۔ یہ دیکھیں میری چھٹی انگلی۔ یہی میرے اصل ہونے کا ثبوت ہے۔'' یہ کہتے ہوئے گوکھلے نے اپنا چھ انگلیوں والا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں اس کی مکاری اور چالبازی اور اپنی جان بچانے کے لیے اس کی اس کوشش سے محظوظ ہو رہا تھا۔ لیکن کسی فلمی سین کی طرح میں اسے طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ میرے پسٹل کی نال سے دو گولیاں نکلیں اور گوکھلے کے سر میں پیوست ہو گئیں۔ وہ اچھلا اور صوفے پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ قیصر نے اپنے ریوالور سے اس کے سینے پر دو فائر کیے تاکہ اس کے جہنم واصل ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ آدھے منٹ انتظار کے بعد ہم دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ بند ڈرائنگ روم سے فائروں کی آواز باہر پہنچ چکی تھی اور میرے ساتھی

چن چن کر مسلح پہریداروں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ اپنے ساتھی پہریداروں کو بیری کے بیروں کی طرح گرتے دیکھ کر تین پہریداروں نے اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ اسی اثنا میں عقبی جانب سے بھی دو پہریداروں کو ختم کر کے میرے ساتھی واپس لان میں آ گئے۔ بنگلے سے باہر راہگیروں کو اندر کے حالات کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ فائروں کی آوازیں سن کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ پہلی منزل کی گیلری میں کھڑے میرے ساتھیوں نے وہیں کھڑے ہوئے مجھے بتایا کہ سڑک پر ہو کا عالم طاری ہے اور دور دور تک کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا۔ میں قیصر اور تین ساتھیوں کے ہمراہ پہلی منزل پر گیا جہاں گوکھلے کی رہائش تھی۔ ایک اندر سے بند دروازے کو ہم نے ریوالور کے تین فائروں سے کھولا۔ اس کمرے میں گوکھلے کی بیوی اور دو بچے دیوار سے لگے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے اس کی بیوی کو کہا کہ انھیں کچھ نہیں کہا جائے گا اگر وہ بڑی تجوری اور خفیہ تجوریاں کھول دے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ گوکھلے مر چکا ہے اور سارے بنگلے پر ہمارا قبضہ ہے۔ اس کی بیوی نے اس کمرے میں پڑی بڑی تجوری اور اس کمرے کے پچھلے بیڈ روم میں دوہری دیوار میں پوشیدہ تجوری کھول دی (دولت مند ہندوؤں اور خصوصاً زیر زمین کام کرنے والے ہندوؤں میں یہ رواج ہے کہ ایک ظاہری تجوری میں تھوڑا بہت مال رکھتے ہیں اور خفیہ تجوری میں ان کی ساری دولت اور قیمتی زر و جواہر ہوتے ہیں۔ سندھ کے مشہور و معروف رانا چندر سنگھ کے گھر میں بھی دو مختلف کمروں میں ایک سامنے پڑی ہوئی اور ایک خفیہ تجوری ہے) میرے ساتھیوں نے دونوں تجوریوں کا سارا مال دو بڑے سوٹ کیسوں میں بھرا۔ میں نے بھی انھیں اس لیے نہیں روکا کیونکہ یہ مال غنیمت ان سب کا حق تھا اور اپنی جانوں پر کھیل کر انھوں نے یہ معرکہ سر کیا تھا۔ خفیہ تجوری کے نچلے حصے کا ایک تہائی حصہ بند تھا۔ میں نے گوکھلے ایک بچے کے سینے پر پستول رکھ کر اس کی بیوی سے وہ نچلا حصہ کھلوایا۔ اس حصے کو کھولنے کے لیے دیوار پر ٹنگی ایک تصویر کے نیچے چھپا ہوا ایک بٹن تھا جس کے دبانے سے وہ حصہ کھلا۔ اس میں دو ڈائریاں، دو فائلیں اور دو بیش قیمت ہیرے پڑے تھے۔ میں نے بمعہ ہیروں کے یہ سارا سامان اپنے قبضے میں کر لیا (ملتان کے بنگلے پر جا کر ان ڈائیریاں اور فائلوں کو جب میں نے اطمینان سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ ان ڈائیریوں میں ان پاکستانی اسمگلروں اور سیاست دانوں کے نام، کوڈ نمبر اور ان سے رابطہ کرنے کی مفصل تفصیلات درج تھیں جو پاکستان کے خلاف بھارتی روپے کے لالچ میں کام کرتے تھے۔ انھی میں کہوٹہ ایٹمی پلانٹ کے اصل محل وقوع اور اس کے زیر تعمیر اور مکمل حصوں کی تعمیر اور دیکھ بھال کرنے والے ان غداروں کے نام بھی درج تھے جو پاکستان کے اس انتہائی اہم پلانٹ پر کام کی ہر ایک تفصیل بھارت کو گوکھلے کے ذریعے مہیا کرتے تھے۔ گوکھلے کی تیز رفتار لانچیں پاکستانی غداروں سے تمام خفیہ اطلاعات وصول کرنے اور اس غداری کا معاوضہ دینے کے لیے بمبئی اور کراچی کے درمیان سمندر میں مچھیروں کے بہروپ میں پاکستان غداروں سے ملتے تھے۔ فائلوں میں پاکستانی

برسراقتدار پارٹی کے چند وزرا کی عیاشی کے دوران کھینچی گئی خفیہ تصویریں بھی تھیں جن کی وجہ سے یہ خفیہ معلومات بھارت کو مہیا کر کے اپنی عیاشی کے سیاہ کارناموں کی پردہ پوشی کر رہے تھے۔ یہ معلومات پاکستان کے لیے بہت اہم تھیں۔ ایک فائل میں ہیرا منڈی لاہور کی اس طوائف کی ''اداؤں'' کا بھی مفصل ذکر تھا جس کے ایک وفاقی وزیر سے اتنے ''گہرے اور قریبی'' تعلقات تھے کہ اسے پچیس ہزار روپیہ دے کر اس کے ایک ٹیلی فون پر وہ مرکزی وزیر پاکستان میں کسی جگہ بھی چوبیں گھنٹوں میں ٹیلی فون لگوا دیتا تھا جبکہ حقداروں کی فائیلیں برسوں دھول میں اٹی سڑتی رہتی تھی۔ اس وزیر کا بھی تفصیلی ذکر تھا۔ جو شاعر بھی تھے اور مقرر بھی، مولانا بھی تھے اور وہسکی سے بھی بلاناغہ شغل فرماتے تھے)

ڈائیریوں اور فائلوں میں گجراتی اور مرہٹی زبانوں میں جن سے میں نابلد تھا لکھا ہوا تھا۔

میں نے حاجی مستان کے ایک بااعتماد آدمی سے ان کا انگریزی میں ترجمہ کروایا اور اصل فائلوں اور ڈائیریوں کے ساتھ یہ ترجمہ شدہ تفصیلات پاکستان واپس پہنچنے پر اپنے سابقہ محکمے کے حوالے کیں۔

قیصر نے میرے PA کا کردار عملی طور پر بھرپور طریقے سے ادا کیا تھا۔ گوکھلے کے رہائشی کمروں میں کئی ٹیلی فون پڑے تھے۔ ہمارے پاس کٹر Cutter تو تھا نہیں قیصر نے تمام ٹیلی فونوں کے ریسیور بقیہ سیٹوں سے اکھیڑ کر سارے ٹیلی فون ناکارہ کر دیے۔ یہی حال گراؤنڈ فلور میں ڈرائنگ روم، مین ہال اور برآمدے میں پڑے ٹیلی فونوں کا کیا گیا۔ ڈرائنگ روم جہاں گوکھلے کی لاش پڑی تھی سے ملحقہ کمرے میں جب ہم داخل ہوئے تو کھڑکیاں بند ہونے کے باوجود ایک پردہ ہل رہا تھا میں نے پردے کو ہٹایا تو گوکھلے کا ہمشکل اس کے پیچھے کھڑا بری طرح لرز رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ اسے زندہ اپنے ہمراہ لے جائیں گے۔ گوکھلے کے ڈپلیکیٹ کا رول ادا کرنے کے دوران اسے یقیناً بہت سی ایسی باتوں کا علم ہونا چاہیے تھا جو حاجی مستان کے لیے مفید ثابت ہوتیں۔ میں نے اس نقلی گوکھلے کو اپنے پاس بلایا تو وہ لرزتا کانپتا ہوا آگے بڑھا اور سیدھا میرے قدموں میں گر گیا۔ جب ہم اوپری منزل پر گئے تھے تو اس کے ڈرائنگ روم میں گوکھلے کی لاش دیکھ کر اور فائروں کی آوازوں سے سمجھ لیا ہوگا کہ گوکھلے کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ یہ اب گڑگڑا کر اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

میں نے اسے کہا کہ بالکل خاموش ہو جائے ورنہ ابھی گولی مار دوں گا۔ قیصر نے اس دوران اپنے چاقو سے پردے کے ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونسا اور دوسرے ٹکڑوں سے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر پشت پر اس کے ہاتھ باندھ دیے۔ گوکھلے کی بیوی کو میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر دو گھنٹے سے پہلے اس نے دروازے کی طرف قدم بھی بڑھایا تو دروازے کے باہر کھڑے ہمارے آدمی اسے اور اس کے بچوں کو فوری ہلاک کر دیں گے۔ ہم نے اس کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا تھا۔

گراؤنڈ سے نقلی گوکھلے کے ساتھ ہم برآمدے میں آئے تو میرے ساتھی عقبی جانب سے فارغ ہو کر لان میں پہنچ چکے تھے۔ بنگلے کے عقبی حصے میں گوکھلے کے گھر والوں اور پہریداروں اور ملازمین کے

لیے علیحدہ علیحدہ کچن بنے ہوئے تھے۔ میرے ساتھیوں نے بتایا کہ پہریداروں کو تو انھوں نے پہلے ہلے میں ہی ہلاک کر دیا تھا اور کچن میں کام کرنے والوں اور گھریلو ملازمین کے گلے قیصر کے ساتھیوں نے اپنے چاقوؤں سے کاٹ دیے۔ گھریلو ملازمین کو ہلاک کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی قیصر کے ساتھیوں نے اس کی مجھ سے اجازت لی تھی۔ میری باز پرس پر قیصر کا ایک ساتھی بولا ''بھائی جان! آپ نے تو واپس پاکستان چلے جانا ہے لیکن ہمیں بھارت میں ہی رہنا ہے اس لیے ہم اپنے خلاف گواہی دینے کے لیے کوئی ثبوت چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ دونوں سوٹ کیس اور فائلیں گاڑی میں رکھ کر ہم واپس لوٹنے کے لیے تیار تھے۔ اب تک چار کے سوا سارے پہریدار مارے جا چکے تھے۔ یہ چار پہریدار اپنا اسلحہ لان میں پھینک کر ہاتھ اٹھا کر کھڑے تھے۔ سب کا اسلحہ بھی پولیس جیپوں میں رکھ دیا گیا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان چار پہریداروں کا کیا کیا جائے کہ JCO نے ایک لائن میں کھڑے ان چاروں پہریداروں پر اپنی سٹین گن سے اچانک فائر کھول دیا اور تقریباً پوری میگزین ان پر خالی کر دی۔ میں نے JCO سے پوچھا کہ بغیر میری اجازت اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''سر! میں نے فوجی ٹریننگ پاکستانی انسٹرکٹروں (Instructors) سے لی ہے اور ہمیں سب سے پہلے جو سبق پڑھا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اپنے دشمن کو اس سے پہلے ہلاک کر دوں کہ وہ تمہیں ہلاک کرے۔ بھارتی ہندو اور خصوصاً مسلح ہندو ہمارے دشمن ہیں اور دشمن کو ہلاک کرنے کے لیے فوج میں افسروں سے پہلے اجازت نہیں لی جاتی۔'' میرا بحث میں پڑنا اس لیے فضول تھا کیونکہ یہ چاروں پہریدار بھی ہلاک ہو چکے تھے۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے دل کو یہ سمجھایا کہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ میں نے سب کو گاڑیوں میں سوار ہونے کا کہا۔ قیصر نے مین گیٹ کے اندرونی جانب پہریداروں کے لیے بنے کمرے میں جا کر انٹر کام کے تار بھی اکھیڑ ڈالے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ واپسی کا سفر کاروان کی صورت میں اکھٹے جانے کے بجائے علیحدہ علیحدہ کیا جائے۔ دونوں جیپیں سیدھی بمبئے گیرج میں جائیں اور تینوں ایمبیسڈر کاریں وحید کے گھر پہنچیں جہاں سوار کو اتار کر اپنے اپنے لباس پہنے جائیں اور جیپیں اور گاڑیاں چلانے والوں کے لباس بھی بمبئے گیرج میں باقی ساتھی اپنے ہمراہ لے جائیں۔ جب سب گاڑیوں میں بیٹھ گئے تو قیصر نے پہریداروں کے کمرے میں لگے بٹن کو دبایا۔ مین گیٹ پورا کھل گیا تو ساری گاڑیاں سڑک پر آ کر اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں نے اپنی گاڑی دروازے کے باہر کھڑی کی۔ قیصر نے دروازہ بند کرنے والا بٹن دبایا۔ دروازہ بند ہونے لگا تو قیصر بھاگ کر دروازہ مکمل بند ہونے سے پہلے باہر آ گیا اور ہماری گاڑی تیزی سے وحید کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ گوکھلے کے گھر میں ہماری پہلی فائرنگ سے سڑک سے گزرنے والے بھاگ گئے تھے۔ JCO کی آخری فائرنگ جو تقریباً پینتالیس منٹ کے بعد ہوئی تھی، کی وجہ سے اب سڑک راہ گیروں سے پھر خالی ہو چکی تھی۔

ہماری گاڑی نے تقریباً آدھا کلومیٹر ہی طے کیا تھا کہ سامنے سے تیز رفتار تین گاڑیاں آتی دکھائی دیں اور ہمارے قریب پہنچ کر سڑک کے درمیان میں رک گئیں۔ ہمیں مجبوراً اپنی گاڑی روکنی پڑی۔ ہم نے فوری طور پر اپنا اسلحہ ہاتھوں میں لے لیا۔ درمیان والی گاڑی حاجی مستان کی تھی اور اس میں مستان بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اپنی گاڑی سے اترا۔ قیصر بھی میرے ساتھ ہی گاڑی سے نکل آیا۔ مستان کی گاڑی کے آگے اور پیچھے والی گاڑیوں میں اس کے مسلح آدمی بیٹھے تھے۔ مستان نے مجھے اور قیصر کو اپنی گاڑی میں بٹھانا چاہا تو میں نے اسے کہا کہ ہماری گاڑی میں نقلی گوکھلے بھی ہے۔ یہ سن کر مستان کے حکم پر اس کی گاڑی کو ہماری گاڑی کے قریب لایا گیا اور نقلی گوکھلے کو بھی اس میں بٹھا دیا گیا۔ ہماری گاڑی میں اب رضی اور قیصر کا ایک ساتھی تھا۔ میں نے مستان کو کہا کہ ہماری گاڑی کو وحید کے گھر جانا ہے۔ مستان نے اگلی سیٹ پر بیٹھے ایک محافظ کو ہماری گاڑی میں وحید کے گھر جانے کا کہا۔ محافظ ہماری کار میں وحید کے گھر کی طرف روانہ ہوا اور مستان کی تینوں گاڑیوں نے جوہو والے بنگلے کا رخ کیا۔ سفر کے دوران مستان نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور سارا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ بنگلے پر پہنچ کر ہم ڈرائنگ روم جا کر بیٹھ گئے۔ حاجی مستان نے اپنے محافظوں کو کہا کہ نقلی گوکھلے کی تلاشی لے کر اسی حالت میں ایک کمرے میں بند کر دیں۔ ڈرائنگ روم میں مستان، میں اور قیصر بیٹھے تھے اور خاموشی طاری تھی۔ قیصر تو میری اجازت کے بغیر گفتگو کا آغاز نہیں کر سکتا تھا اور میری اور مستان کی حالت ایسی تھی کہ ہم دونوں گفتگو کا آغاز کرنے سے گھبرا رہے تھے۔ ہمارے بغیر کہے ہی بنگلے کے ملازمین چائے اور کیک وغیرہ کمرے میں لے آئے اور چائے بنا کر کپ میز پر رکھ کر چلے گئے۔ ہم نے چائے پینی شروع کی تو مستان نے میرا نام لے کر کہا ”مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی کہ آپ مجھے بالکل لاعلم رکھ کر میری بے خبری میں گوکھلے کے گھر پر حملہ آور ہوں گے۔ مجھے تو آج بعد دوپہر یوسف پٹیل نے فون پر بتایا کہ آپ اس سے خاصا اسلحہ لے آئے تھے۔ میں حیران تھا کہ آپ کو اگر ضرورت تھی تو مجھ سے اسلحہ کیوں نہیں لیا۔ وحید بھی کل سے بیشتر وقت غائب رہا۔ میں نے اپنے طور پر انکوائری کی تو معلوم ہوا کہ وحید نے بمبئی گیرج سے دو جیپوں پر خاکی رنگ کروا کے ان پر پولیس لکھوایا ہے۔ اب سے ایک گھنٹہ پہلے وحید بمبئی گیرج میں آیا۔ جب میں نے اس سے پوچھا تو پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا لیکن جب میں نے سختی سے اس سے باز پرس کی تو اس نے بتایا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گوکھلے کے بنگلے پر گئے ہیں۔ یوسف پٹیل وحید کے اعتراف سے تھوڑی دیر قبل ہی مجھے آپ کے اسلحہ لینے کے متعلق بتا چکا تھا۔ یوسف پٹیل سے میرے تعلقات اب نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس نے ٹیلی فون پر مجھے کہا تھا کہ اس کے فون کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ آپ کسی خطرناک کام میں الجھ کر نقصان نہ اٹھا بیٹھیں۔ وہ بے شک میرا مخالف سہی لیکن آپ سے پرخلوص ہے اور آپ کی بے حد عزت کرتا ہے۔ وحید نے جب آپ کے گوکھلے کے بنگلے پر جانے کا بتایا تو صرف دس منٹ میں

مجھے اپنے جتنے مسلح محافظ بھی مل سکے، انھیں لے کر میں گوکھلے کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا اور راستے میں ہی آپ مل گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی بخیر و عافیت ہیں۔ آپ نقلی گوکھلے کو تو پکڑ لائے ہیں۔ اب اصلی گوکھلے اپنے سارے وسائل سے کام لے کر آپ کا پتہ چلائے گا۔ زیر زمین کام کرنے والوں سے کوئی بات بھی زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ آپ کے متعلق علم ہونے پر وہ اپنی پوری طاقت سے ہم پر حملہ آور ہوگا۔ میں گوکھلے سے بہت آسانی سے نبٹ لیتا اگر یوسف پٹیل اس کا ہمدرد نہ ہوتا۔ میں ان دونوں کا بھی مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن مجھے اس کے لیے میمن گروپ کی مدد درکار ہوگی اور پتہ نہیں کہ وہ یوسف پٹیل کے خلاف کارروائی میں میرا ساتھ دیں گے بھی یا نہیں۔“ حاجی مستان مسلسل بولے جا رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ گوکھلے پر ہمارے ”ناکام حملے“ سے وہ کچھ ڈرا ہوا بھی ہے۔ میں نے مستان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”بس کرو مستان بھائی اور میری بات سنو۔ ہم نے اصلی گوکھلے اور اس کے بنگلے میں موجود اس کے تمام پہریداروں اور کارکنوں کو بمعہ اس کے کچن میں کام کرنے والوں کو جہنم واصل کر دیا ہے۔ اس کے بنگلے میں موجود تمام افراد میں سے صرف اس کی بیوی اور دو بچوں کو ہم نے نہیں مارا اور انھیں ایک کمرے میں بند کر آئے ہیں۔ اصل گوکھلے کی پہچان اس کے داہنے ہاتھ کی چھ انگلیاں ہیں جنھیں میں نے اچھی طرح چیک کیا تھا۔“ حاجی مستان منہ پھاڑے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”گوکھلے نے شروع میں مجھے بھی اس نقلی گوکھلے کو سامنے بھیج کر چکمہ دینے کی کوشش کی تھی لیکن میرے آگے اس کی کوئی چالاکی کام نہ آسکی۔“ میں نے مستان کو شروع سے آخر تک اپنے مشن کی تفصیلات بتائیں۔ میری پلاننگ سن کر حاجی مستان حیران رہ گیا اور کہنے لگا ”میں خود کو بڑا دلیر اور اچھا پلانر سمجھتا تھا لیکن تمہارے مقابلے میں تو میں پاسنگ بھی نہیں۔ کہاں وزارت خارجہ کا کیول سنگھ اور گوکھلے سے خفیہ میٹنگ کے لیے اس کا بمبئی آنا اور پولیس کی جیپوں کے ساتھ کاروان کی صورت میں گوکھلے کے گھر جانا۔ میں تو قیامت تک ایسی عمدہ پلاننگ نہیں کر سکتا تھا۔ گوکھلے بھی کیول سنگھ کی ”زبانی“ اپنے ساتھ خفیہ میٹنگ کا سن کر خود کو بہت بڑی شے سمجھتے ہوئے احتیاطی تدابیر کو نظر انداز کر گیا ہوگا۔“ ”میں نے اسے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس نے نقلی گوکھلے کو میرے سامنے لا کر اپنی طرف سے بڑی چالاکی دکھائی تھی لیکن میں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وحید کی معاونت کے بغیر میں اس مشن پر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تمہارا بہت بڑا خیر خواہ اور جانثار ہے۔ میں نے ہی اسے سختی سے منع کیا تھا کہ میرے اس مشن کی تمہیں بھنک بھی نہ پڑنے پائے کیونکہ تم مجھے اس مشن پر کبھی بھی جانے نہ دو گے۔ اسی لیے میں نے اسلحہ بھی یوسف پٹیل سے لیا تھا۔ میں گوکھلے کے بیڈ روم کی سامنے والی اور خفیہ تجوریاں کھلوا کر اس کی تمام جمع پونجی جواہرات دو ڈائریاں دو فائلیں اور دو بیش قیمت ہیرے بھی ساتھ لے آیا ہوں۔ اس کی دولت تو میں اپنے ساتھیوں میں بانٹ دوں گا کیونکہ انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر

اس مشن کی تکمیل کی ہے۔ ڈائیریاں اور فائلوں میں گجراتی اور مرہٹی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ ان میں یقیناً تمہارے اور پاکستان کے مفاد میں بہت کچھ ہوگا۔ ان کو پڑھنے اور انگریزی میں ترجمہ کرنے والے کسی قابل بھروسہ شخص کا تمہیں انتظام کرنا ہوگا۔" یہ کہہ کر میں صوفے پر دراز ہوگیا۔ حاجی مستان اپنے صوفے پر سے اٹھا اور میرے سامنے آکر کہنے لگا "ذرا کھڑے ہوجائیں" کچھ سمجھے بغیر میں کھڑا ہوگیا تو مستان مجھ سے لپٹ گیا۔ کافی دیر بعد جب وہ مجھ سے علیحدہ ہوا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ضبط کا سیلاب اپنے بند توڑ چکا تھا۔ بہتے آنسوؤں میں ہی وہ کہنے لگا۔ "دنیا تو ویسے ہی بھائی اور اولاد کی آرزو کرتی ہے۔ جسے تم جیسا دوست مل جائے اسے بھائیوں اور اولاد کی کیا ضرورت ہے" میں نے مستان کو رونے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "مستان بھائی! میں تو ہوا کے اس جھونکے کی طرح ہوں جو ذرا دیر کے لیے آکر چلا جاتا ہے۔ تمہارا دل بہت بڑا ہے جو اتنی چھوٹی سی بات کو اتنی اہمیت دے رہے ہو۔ بہرحال ہمیں اب ذرا نقلی گوکھلے کی خبر لینی چاہیے۔ اس سے بھی ہمیں خاصی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں" مستان نے دو تین فون کرکے اپنے آدمیوں کو گوکھلے کے خاتمے کی خبر سنائی اور مجھے کہا "آج دیر تک ہم یہیں رہیں گے کیونکہ میمن گروہ کے سردار کو بھی میں نے گوکھلے کے خاتمے کی خبر دے کر آج رات تم سے ملوانے کے لیے یہیں بلوایا ہے۔" یہ کہہ کر مستان نے گھنٹی بجا کر اپنے ایک محافظ کو کہا "گوکھلے سیٹھ کو اسی حالت میں یہاں لے آؤ۔"

تھوڑی دیر میں ہی مستان کے محافظ "سیٹھ گوکھلے نمبر دو" کو ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ بدستور اسی حالت میں بندھے ہوئے تھے۔ مستان کے محافظوں نے گوکھلے کو پہلے بھی دیکھا ہوا تھا اور وہ اس کی انڈر گراؤنڈ سرگرمیوں سے بھی بخوبی واقف ہوں گے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر وہ اچنبھے میں پڑ چکے تھے کہ وہ اتنے مشہور اور طاقت والے انسان کو ایسی خستہ اور بری حالت میں حاجی مستان کے سامنے لا رہے ہیں۔ مستان کے کہنے پر اس کی آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ کھول دیے گئے۔ گوکھلے کی ان لوگوں پر اتنی ہیبت طاری تھی کہ انھوں نے گوکھلے کے ہاتھ کھولتے ہی اپنے ریوالور ہولسٹروں سے باہر نکال لیے۔ میرے خیال میں ان کو توقع تھی کہ اپنی رہائی کے عوض وہ حاجی مستان سے کوئی سودے بازی کرے گا یا ابھی اس کے گروہ کے آدمی اپنے سردار کو چھڑوانے کے لیے اس بنگلے پر حملہ آور ہوں گے۔ لیکن ہوا ان کی توقع کے برعکس۔ "گوکھلے سیٹھ" ہاتھ کھلتے ہی پہلے میرے اور پھر حاجی مستان کے قدموں میں گڑگڑانے لگا کہ اس کی جاں بخشی کردی جائے۔ مستان کو تو اس وقت کوئی بات سوجھی نہیں۔ میں نے اسے کہا "تم اپنے سیٹھ کے بہروپ میں اس کا رول ادا کرتے تھے۔ کیا اس نے تمہیں یہ بھی کہا تھا کہ اگر جان پر بن جائے تو جاں بخشی کے لیے دشمن کے قدموں میں گر جاؤ" "جناب مجھے معاف کردیں۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میری شکل گوکھلے سے ملتی تھی اور مجھے اس کا ڈپلیکیٹ بن کر اس کا رول ادا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ لڑائی تو آپ بڑوں کی

تھی۔ میں غریب مفت میں مارا گیا" وہ میرے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ میں نے اسے کہا "تم ابھی مارے نہیں گئے ہو لیکن واقعی مفت میں مارے جاؤ گے اگر تم نے ہمارے سوالوں کے صحیح جواب نہ دیے اور کوئی بات چھپانے کی کوشش کی۔" نہیں سرکار۔ بھگوان کی سوگند میں کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ جو کچھ میرے علم میں ہے آپ کو ہر ایک بات بتاؤں گا۔" مستان کے پہریداروں کو ابھی تک حقیقت کا علم نہیں تھا۔ وہ حیرانی سے گوکھلے سیٹھ اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ مستان نے اپنے محافظوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یوں آنکھیں پھاڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ میرے اس بھائی نے گوکھلے کو ختم کرکے اس کے دھندے کی بساط ہمیشہ کے لیے لپیٹ دی ہے۔ یہ گوکھلے کا ہم شکل ہے جسے وہ آگے رکھ کر دھندا کرتا اور اپنی جان بچاتا تھا۔ میرے بھائی نے اس کمینے کی سازشوں سے ہمیں ہمیشہ کے لیے چھٹکارا دلا دیا ہے۔" میں اب بالکل خاموش تھا کیونکہ یہاں کی زیر زمین سرگرمیوں کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں تھا جن کے متعلق میں گوکھلے سیٹھ سے سوال کرتا۔ مستان نے اس سے پوچھا "میرا نام جانتے ہو؟" "ہاں سرکار آپ حاجی مستان سیٹھ ہیں۔" اب حاجی مستان کے سوالوں اور گوکھلے کے جوابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ مزید گزرے ہوں گے کہ ایک پہریدار نے آکر بتایا کہ وحید آیا ہے۔ مستان نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ مستان نے فون اٹھایا اور آواز سن کر ٹیلی فون سیٹ کا وہ بٹن دبا دیا جس سے فون کرنے والے کی آواز سیٹ کے سپیکر میں آتی ہے۔ فون یوسف پٹیل کا تھا۔ اس نے مستان سے کہا۔ "گوکھلے کو بمعہ اس کے گروہ کے آج شام مار دیا گیا ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کام تمہارا نہیں بلکہ ہمارے مشترکہ مہمان کا ہے۔" ہمارے مہمان کا نہیں بلکہ میرے بھائی نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔" مستان نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ میرا بھی بھائی ہے اگر یقین نہیں آتا تو اس سے پوچھ لو۔ اسی لیے ہتھیار بھی وہ مجھ سے ہی لے گیا تھا" یوسف پٹیل نے جواب دیا۔ اب میرے لیے ان دونوں کی باتیں ناقابل برداشت ہوچکی تھیں۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ کے نزدیک ہوکر اسپیکر میں زور سے کہا "اور اب تم دونوں کا بھائی تمہاری باتوں اور بے احتیاطی کے سبب عنقریب جیل کی سلاخوں کے پیچھے اور پھر جلد ہی پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جائے گا۔ کیا تم دونوں کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ تمہارے سب ٹیلیفونوں پر آبزرویشن (Observation) لگی ہوئی ہے" میری آواز سنتے ہی یوسف پٹیل نے اپنا ٹیلی فون بند کردیا مستان نے بھی فوراً ٹیلی فون بند کردیا۔ میں نے تو یونہی آبزرویشن والی بات کہہ دی تھی لیکن مستان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ خوشی اور جذبات کے دھارے میں بہتے ہوئے یہ دونوں اس بات کو فراموش کر گئے تھے کہ ان جیسا دھندا کرنے والوں کے ٹیلی فون ہمیشہ انڈر آبزرویشن رہتے ہیں۔ حاجی مستان پچھتاوے کی علامت بنا مجھے کہنے لگا۔ "میں جان پر کھیل جاؤں گا لیکن تم پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا" میں نے اس کی خوشی ملیا میٹ ہوتے دیکھ کر

اسی تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو یونہی یہ بات کہہ کر تمہاری گفتگو کی طوالت کو ختم کرنا چاہا تھا۔ بہرحال قیصر اور اس کے ساتھیوں کو کل دہلی ضرور بھیجنا ہے اور میں بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جلد از جلد کلکتے جاکر ہرن گھاٹا کے لیے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔ تم بھی یقیناً یہی چاہتے ہوں گے کہ کسی مصیبت میں پھنسنے سے پہلے ہی ہم بمبئی سے نکل جائیں۔''

وحید ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران ہی ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ مستان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تم نے میری لاعلمی میں جو کچھ بھی کیا ہے میرے اس بھائی نے تمہاری ایسی وکالت کی ہے کہ میں نے تمہیں نہ صرف معاف کردیا ہے بلکہ میں ہونے والے تمام اخراجات کے علاوہ دو لاکھ روپے تمہیں انعام میں دیتا ہوں۔ منشی سے تم یہ سب رقم لے لینا۔ قیصر، اس کے ساتھیوں اور سپنا کے لیے کل بعد دوپہر کی دہلی کی فلائیٹ کے لیے ٹکٹ لے لینا'' میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ جہاز سے نہیں بلکہ ریل کے ذریعے ان کو بھیجنا ہے۔ جہاز پر اسلحہ جا نہیں سکتا اور میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ دوران سفر خدانخواستہ اگر ان پر کوئی مشکل آن پڑی تو یہ بغیر ہتھیاروں کے مارے جائیں'' مستان میری بات سمجھ گیا اور اس نے وحید کو کل شام دہلی جانے والی ٹرین پر ان کے لیے سیٹیں بک کروانے کا کہا۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کہا کہ دہلی جانے والے ساتھی کلیان تک لوکل ٹرین میں اور وہاں سے دہلی جانے والی ٹرین میں بیٹھیں گے کیونکہ آج کی واردات کے بعد ایئرپورٹ کے علاوہ بمبئے سنٹرل اور وکٹوریہ ٹرمینس(Victoria Terminus) پر بمبئی سے باہر جانے والوں کی چیکنگ شروع ہوچکی ہوگی۔ گوکھلے تو ہندوؤں اور بھارتی حکومت کا چہیتا تھا'' یہ کہتے ہوئے میری نظر نقلی گوکھلے پر پڑی۔ وہ قالین پر ابھی تک ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا۔ ''حد ہوگئی ہماری حماقت کی'' میں نے نقلی گوکھلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو یہ صرف ہمارا چشم دید گواہ تھا اور اب تو یہ نہ صرف آپ کی باتیں سن چکا ہے بلکہ ہمارے آئندہ پروگرام اور روانگی کے متعلق بھی سب کچھ جان چکا ہے۔'' واقعی ہم سب نے اس کی موجودگی کو نظرانداز کردیا تھا۔ مستان نے ایک آنکھ دباتے ہوئے جواب دیا ''یہ بے ضرر ہے۔ اس کو ہم جلد ہی آزاد کردیں گے'' حاجی کو اس سے کوئی اہم باتیں معلوم نہ ہوسکیں تھیں۔ اس کا مکمل ایڈریس پوچھ کر اس نے وحید کو کہا ''اس کے گھر والوں کے لیے ایک لاکھ روپیہ لے کر پہلے اس کے گھر والوں کو دینا اور پھر گھر کے قریب ہی اسے آزاد کردینا'' وحید نے پہریداروں کو کہا کہ اس کا منہ کپڑے سے بند کردیا جائے اور ہاتھ پشت پر باندھ دیے جائیں۔ پہریدار اپنا شروع کرنے ہی والے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ غنی میمن اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ آیا ہے اور انڈر گراؤنڈ کام کرنے والوں کے اصول کے مطابق انھوں نے اپنا تمام اسلحہ پہریداروں کے حوالے کردیا ہے۔ مستان نے انھیں فوراً اندر بلوا لیا اور کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ اس گروہ کا لیڈر غنی میمن درمیانے جسم اور قد کا تیس پینتیس سالہ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس

کی تیز، چمکدار اور جسم میں کھب جانے والی عقابی آنکھیں تھیں۔ تعارف کے بغیر ہی وہ میری طرف بڑھا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا ''ہم مسلمانوں کے مشترکہ دشمن اور اس کے گروہ کو ختم کرنے پر میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں'' میں جواب دینے کے لیے موزوں الفاظ کے انتخاب میں ہی تھا کہ نقلی گوکھلے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا ''حاجی بھائی آپ نے تو بتایا تھا اور ہمیں بھی آج شام ''معلوم'' ہوا تھا کہ گوکھلے مارا جاچکا ہے لیکن یہ تو یہاں زندہ سلامت موجود ہے'' ''غنی بھائی یہ اصل گوکھلے کا ہمزاد ہے۔ گوکھلے کو اوپر بھیج دیا گیا ہے اور اس ہمزاد کو بھی عنقریب اس کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ اس کا ایک اور ہمزاد ہمیں ابھی تک ملا نہیں۔ گوکھلے ان دونوں کی وہاں کمی محسوس کررہا ہوگا لہٰذا اسے بھی تلاش کرکے اس کے پاس روانہ کردیا جائے گا۔'' نقل گوکھلے اپنی ''آزادی'' کا سن کر چیخنے چلانے لگا تھا لیکن منہ بند ہونے کے باعث صرف غوں غوں ہی کرسکا اور مستان کے آدمی اسے کھینچ کر باہر لے گئے۔ اگلے روز مستان نے مجھے بتایا کہ اس کے گھر والوں کو ایک لاکھ روپیہ دے کر گھر کے نزدیک ہی اس کے آدمیوں نے چاقو سے اس کا گلا کاٹ کر لاش فٹ پاتھ پر پھینک دی تھی۔

غنی مجھے اور میں غنی کو پرکھنے کی کوشش میں تھے اور یہ اندازہ لگارہے تھے کہ ہم دونوں کتنے پانی میں ہیں۔ غنی نے مجھ سے چند سوال پوچھے تو میں نے ان کا جواب دینے کے بجائے اسے کہا کہ ہم عملی کام کرنے والے ہیں۔ سوالات تو ان سے پوچھے جاتے ہیں جن کے کام کا کوئی نمونہ سامنے نہ ہو۔ ویسے بھی میری عادت ہے کہ میں ایسے سوالوں کا جواب دینا پسند نہیں کرتا جن سے کوئی میری کارکردگی کو جانچنا چاہے۔ میرے متعلق تم کو مستان بھائی نے اچھا خاصا بتادیا ہے۔ تم اپنے متعلق بتاؤ کہ تم کیا کرتے ہو اور آئندہ کے کیا پروگرام ہیں۔ مستان نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ کہیں گفتگو میں کشیدگی پیدا نہ ہوجائے یہ کہتے ہوئے گفتگو کا رخ موڑا ''میرے خیال میں پہلے کھانا کھالیا جائے۔ بھوک سے میرا تو برا حال ہورہا ہے۔'' پندرہ منٹ میں ہی ڈائننگ روم سے لذیذ کھانوں کی لپٹیں آنے لگیں۔ ہم نے کھانے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو کی اور بعد میں بھی ایسی گفتگو سے احتراز کیا جو کشیدگی کا سبب بن سکے۔ رات تقریباً ایک بجے ہماری محفل برخواست ہوئی۔ غنی میمن نے گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ''میں نے آپ سے جان بوجھ کر ایسے سوال کیے تھے جن کا جواب دینے کو کوئی معقول آدمی تیار نہ ہوتا۔ حاجی مستان سیٹھ کے بقول آپ ٹھوس شخصیت کے مالک ہیں۔ گوکھلے کو ختم کرکے آپ نے ہمیں ایک ہر روز بڑھتی ہوئی اذیت سے نجات دلادی ہے۔ میری تو صدق دل سے خواہش ہے کہ آپ مستان سیٹھ اور یوسف پٹیل کے اختلافات ختم کروادیں۔ اگر ہم تینوں اکٹھے مل کر کام کریں تو پورے بھارت میں ہم سے ٹکر لینے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا۔'' یہ کہہ کر غنی اور اس کے ساتھی ہم سے رخصت ہوئے۔ قیصر کے بمبئے گیرج چھوڑنے کے لیے مستان نے اپنے محافظوں کے ساتھ ایک گاڑی میں اسے بھیجا اور دوسری دو گاڑیوں میں ہم محافظوں کے ساتھ مالابار والے بنگلے

کی طرف روانہ ہوئے۔ گاڑی میں مستان نے مجھ سے پوچھا ''غنی کے متعلق تم نے کیا رائے قائم کی'' میں نے مستان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ''مستان بھائی! تمہارے دھندے میں ان کی پوزیشن تم بہتر جانتے ہو۔ اس مختصر ملاقات میں مجھے تو یہی محسوس ہوا ہے کہ یہ لوگ چمڑی جائے، دمڑی نہ جائے کہ اصول پر کام کرنے والے ہیں۔ گوکھلے کے خاتمے کے بعد اب یہ تمہارے اور یوسف کے بازوؤں کے سہارے اپنا مقام بنانا چاہتے ہیں اور اگر ایک بار یہ اس مقام پر پہنچ گے تو تم دونوں کو مکھن کے بال کی طرح علیحدہ کردیں گے۔ میرے خیال میں وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ تم اور یوسف مل کر ان کو اپنی اوقات میں رکھو۔ تم دونوں کے پاس طاقت، ہمت، پیسہ اور وسیع تعلقات ہیں۔ اگر یہ ایک بار طاقت پکڑ گئے تو تمہارے لیے گوکھلے سے بڑھ کر خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔'' میں خاموش ہوا تو مستان کہنے لگا ''میں تم سے بالکل متفق ہوں۔ گوکھلے کی وجہ سے ہی میں ان سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کررہا تھا۔ یہاں سے جانے سے پہلے تم یوسف کو تو ضرور ملوگے۔ اسے میری طرف سے یقین دلانا کہ میرے دل میں اس کے خلاف کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری بات وہ غور سے سنے گا۔ ہم دونوں نہ تو غنی کی طرح جوان ہیں کہ یہ سوچیں کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے اور نہ ہی ہمیں نئے تعلقات بڑھانے کی ضرورت ہے۔ غنی نے بڑی احمقانہ بات کی تھی کہ اگر ہم تینوں مل جائیں تو کوئی ہم سے ٹکر نہیں لے سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یوسف اور میں صاف دلی سے ایک دوسرے کا ساتھ دیں تو اس میمن ٹولے سمیت کوئی میلی آنکھ سے ہماری طرف دیکھ نہیں سکتا۔'' میں مستان کا عندیہ سمجھ گیا تھا۔ وہ یوسف سے تعلقات کی ازسرنو استواری چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ صبح میں یوسف سے ملنے جاؤں گا اور پوری کوشش کروں گا کہ تمہاری غلط فہمیوں کو دور کردوں۔ یوسف بھی دل کا بہت اچھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات ٹھکرائے گا نہیں'' اتنی دیر میں ہماری گاڑیاں بنگلے پر پہنچ گئیں۔ میں دن بھر کی کارروائی سے ذہنی اور جسمانی تھکن سے چور ہورہا تھا۔ میں نے مستان سے اجازت لے کر اپنے بیڈ روم کا رخ کیا اور جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

سولھواں باب

اگلے روز صبح میں مگھ اور مورنگ قبائل کے جواہرات کی فروختگی سے ملنے والے چار کروڑ چالیس لاکھ روپے اور گوکھلے کی تجوریوں سے ملنے والی ساری دولت، زیورات وغیرہ لے کر بیس گیرج گیا اور یہ تمام رقم اپنے سارے ساتھیوں میں یکساں تقسیم کردی۔ ہرن گھاٹا پر اسیر میں ہمارے منتظر ساتھیوں کا برابر کا حصہ میں نے علیحدہ کردیا تھا۔ میرا بھی اس سب دولت میں برابر کا حصہ تھا۔ سپنا کو میں نے پندرہ لاکھ روپے اور چند زیورات دیے۔ گوکھلے کی تجوری سے ملنے والے دو بڑے ہیرے میں نے بحیثیت لیڈر کے اپنے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ مسلسل بھاگتے اور مختلف معرکوں میں جان ہتھیلی پر لیے ہوئے اپنے مخالفین اور اپنے اور اپنے دوستوں کے دشمنوں کا خون بہاتے بہاتے میں تنگ آچکا تھا۔ میرے گھریلو حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہوچکے تھے کہ اپنا گھر مجھے جنت بجائے جہنم دکھائی دیتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنے حصے کی رقم اور دونوں ہیروں کی فروختگی سے ملنے والی رقم سے میں آدھی گھر والوں کو دے کر خود کسی تیسرے ملک میں جاکر ازسرنو زندگی کا آغاز کروں گا جس میں صرف امن ہوگا، گھریلو خوشیاں ہوں گی، راحتیں ہوں گی۔ میں اس زندگی سے اب تھک چکا تھا اور نئی زندگی شروع کرنے کی سوچ میں خاصا دور جاچکا تھا لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شد۔ تقدیر میرے ان خیالی خاکوں پر مسکرا رہی تھی کیونکہ مجھے ابھی مشکلات، مصائب اور خون کے کئی سمندروں سے گزرنا تھا۔

آج سارا دن میں نے قیصر اور ساتھیوں کے ساتھ گزارا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ میری ہر مشکل میں کام آنے والے ان ساتھیوں کے ساتھ آغاز ملاقات سے ہی یہ جب بھی مجھے ملے یا میرے ساتھ رہے ہمارا تمام وقت مشکلات کا سامنا کرنے، دشمنوں سے نبردآزما ہونے اور خون بہانے میں ہی گزرا۔ اتنے مخلص ساتھیوں کے ساتھ میں کھلے اور پرسکون ذہن کے ساتھ چند لمحے بھی خوش گپیاں یا سیر

وتفریح نہ کرسکا تھا۔ دہلی میں بشیر کی گیرج میں پہلی ملاقات سے لے کر آج تک یہ میری ہر مشکل میں میرے ساتھ رہے۔ DMI کی حراست سے مجھے رہائی دلانے کے لیے انہوں نے اس کے ہیڈکوارٹر پر دستی بموں سے حملہ کیا۔ اس سے پہلے دہلی میں 26 جنوری کی پریڈ اور نیوایئرنائٹ پر انہوں نے ہی دھماکے کیے تھے اور گورکھپور کا ہوائی اڈہ تباہ کرنے میں بھی سارا عملی کام انہوں نے اور میرے محکمے کے نمبرٹو حبیب نے کیا تھا۔ مکھ، مورنگ اور چکمہ قبائل سے تصادم میں یہ میرا ہراول دستہ تھے۔ اگرچہ میرے کارواں میں تھائی ساتھی، رضی اور بنگلہ دیشی فوجی بھی شامل ہوچکے تھے لیکن اس تمام عرصے میں ہمیں سکون کا ایک لمحہ بھی نصیب نہ ہوا تھا اور آج دہلی والے ساتھیوں کا یہ گروہ واپس جارہا تھا۔ میں نے تقریباً آدھا گھنٹہ قیصر کے ساتھ علیحدگی میں گزارا اور اسے دہلی میں عارف اور نذیر کے لیے خطوط دیے۔ میں نے قیصر کو ایک خط کرنل شنکر کے نام دیتے ہوئے کہا کہ چند روز آرام کرنے کے بعد وہ سروسز کلب میں جاکر کرنل شنکر کا پتہ کرے اور اگر وہ مل جائے (میں نے قیصر کو کرنل شنکر کا حلیہ اچھی طرح سے ذہن نشین کرادیا تھا) تو اسے میرا خط دے کر فوراً ہی واپس چلا جائے۔ اس علیحدہ ملاقات کے بعد میں پھر تمام ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ بمبئے گیرج ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور گیرج صرف نام کا ہے۔ اس میں مہمان خانے، تہہ خانے، گودام، ملاقات کے کمرے اور نامعلوم کیا کچھ بنا ہوا ہے۔ حاجی مستان نے ایک بڑے کمرے میں میرے دہلی جانے والے ساتھیوں کو الوداعی پارٹی دینے کا انتظام کیا تھا۔ تھائیوں اور دوسرے پینے والوں کے لیے اعلیٰ وہسکی اور باقیوں کے لیے ہرقسم کے مشروبات اور لذیذ کھانوں پر مشتمل یہ پارٹی دو بجے بعد دوپہر تک جاری رہی۔ حاجی مستان بھی تھوڑی دیر کے لیے اس میں شریک ہوا۔ اس نے اپنے محافظوں سے ایک تھیلا لے کر اس میں سے بند لفافے نکال کر میرے تمام ساتھیوں بمعہ سپنا کے دیے۔ ہر لفافے میں بھارتی ساتھیوں کے لیے تین تین لاکھ روپے اور تھائیوں اور بنگلہ دیشیوں کے لیے اس کے مساوی امریکی ڈالر تھے۔ ابھی پارٹی جاری تھی اور ہم سب خوش گپیوں میں مشغول تھے کہ اچانک اور خلاف توقع مستان کے محافظوں کے ساتھ یوسف پٹیل اپنے محافظوں کے ساتھ ہال میں داخل ہوا۔ دونوں کے محافظ اسے اندر چھوڑ کر ہال سے باہر چلے گئے۔ یوسف حاجی مستان کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھا میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا ''خیر تو ہے جو مجھے بیس لاکھ روپے لے کر یہاں بلوایا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر میں حیران وششدر رہ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تو اسے نہیں بلوایا۔ مستان ہمارے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ہی پٹیل کو تمہارا نام لے کر یہاں بلوایا ہے۔ ہمارے اتنے بڑے دشمن گروہ کا خاتمہ کرنے والوں کے کچھ ساتھی آج جارہے ہیں اور ان کی الوداعی پارٹی میں اس ''کدو'' کی شمولیت ضروری تھی۔ (پٹیل کو گنجا ہونے کے باعث اس کے بے تکلف اور ہم عصر دوست پیار سے اسے کدو کہتے تھے) پٹیل خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے مجھ سے ہی مخاطب رہا۔ ''اس کالے بانس (مستان، دبلا پتلا، چھ فٹ سے زیادہ لمبا گہرے

سانولے رنگ کا تھا) نے مجھے تو ڈرا ہی دیا تھا۔'' ان دونوں کے اس بے تکلفانہ انداز تخاطب سے مجھے پورا یقین ہوگیا کہ ان کے درمیان کشیدگی کی جو پتلی سی دیوار ہے، یہ دونوں اسے گرانا چاہتے ہیں لیکن یہ وقت اس کام کے لیے ناموزوں تھا۔ میں نے پٹیل کو قیصر اور اس کے ساتھیوں سے متعارف کراتے ہوئے کہا کہ میرے انتہائی مخلص اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ساتھ دینے والے ساتھیوں کا یہ گروپ آج واپس دہلی جارہا ہے۔ پٹیل ان سے بہت خوش دلی سے ملا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ ''ہمارا یہ دوست بہت خوش نصیب ہے جسے آپ جیسے مخلص ساتھی مل گئے۔ بھارت اور کھٹمنڈو کے سارے کارنامے جو ان کے ساتھ آپ نے انجام دیے تھے انہیں یہ تفصیلاً بتاچکے ہیں اور کل کا واقعہ تو کسی حد تک ہمارا چشم دید ہے۔ وہ سارا اسلحہ آپ کا یہ دوست مجھ سے لے گیا تھا۔ وہ بھی آپ کی نذر ہے اور یہ بیس لاکھ روپے کل کے مشن میں شامل ہونے والے تمام ساتھیوں کے لیے میری طرف سے نذرانہ ہے۔'' یہ کہہ کر یوسف پٹیل نے ایک بریف کیس مجھے دیا جس میں سوسو کے نوٹوں والی گڈیاں پڑی تھیں۔ میں نے JCO کو کہا کہ کل کے مشن میں شامل ہونے والے ساتھیوں میں انہیں یکساں تقسیم کردے۔ یوسف نے مجھ سے پوچھا کہ جانے والے ساتھی جہاز سے جارہے ہیں یا ٹرین سے۔ مستان نے جو ''کالے بانس'' کی تشبیہہ سے چڑچڑا سا ہورہا تھا، جواب دیا۔ ''کوئی احمق ہی اتنے اسلحے سمیت جہاز سے جانے کا سوچ سکتا ہے۔'' پٹیل نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا ''کسی جاہل نے نہ تو خود آج کے اخبار پڑھے ہوں گے اور نہ ہی آپ کو دیے ہوں گے'' یہ کہتے ہوئے اخبارات کا ایک بڑا پلندہ مجھے دیتے ہوئے اس نے کہا ''ان تمام اخباروں میں کل کے واقعے کی مفصل خبریں اور دو میں تو اس واقعے سے متعلق اداریے بھی چھپے ہیں۔ انہیں آرام سے پڑھ لیجیے گا۔ میں اپنے دو محافظ انہیں دہلی تک بحفاظت پہنچانے کے لیے ہمراہ بھیجوں گا'' مستان نے جواباً کہا ''میرے تین محافظ بھی ان کے ساتھ جارہے ہیں'' تھوڑی دیر تک ان دونوں میں دوستانہ انداز میں یہ الفاظ کی جنگ جاری رہی اور پٹیل اور اس کے محافظ کولڈ ڈرنکس وغیرہ پی کر رخصت ہوگئے۔ پٹیل نے جاتے وقت کہا کہ مقررہ وقت پر وہ کولابا سٹیشن کے باہر ہمیں ملے گا کیونکہ پروگرام کے مطابق اسی اسٹیشن سے میرے ساتھیوں نے کلیان کے لیے لوکل ٹرین پر جانا تھا۔ سہ پہر چار بجے میں وحید اور چھ محافظوں کے ساتھ قیصر اور اس کے ساتھیوں اور سپنا کے ساتھ کولابا پہنچے۔ قیصر اور ساتھیوں سے گلے مل کر الوداعی ملاقات میں نے بمبئے گیرج میں ہی کرلی تھی۔ سٹیشن کے باہر پٹیل اپنے محافظوں سمیت موجود تھا۔ مستان اور پٹیل کے پانچوں محافظ قیصر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہوئے۔ بچھڑتے وقت ہم سب کی آنکھیں پرنم تھیں۔ ٹرین روانہ ہوئی تو اس کے اوجھل ہونے تک ہم ہاتھ ہلاکر الوداع کہتے رہے۔ ہم سٹیشن سے واپس چلنے لگے تو پٹیل نے وحید کو کہا ''مستان سیٹھ کو کہہ دینا کہ ہمارے یہ دوست آج رات میرے ہی پاس ٹھہریں گے اور میں کل دن کو انہیں واپس چھوڑ جاؤں گا'' یہ کہہ کر پٹیل نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھالیا اور ہم ایک گھنٹے میں میرین ڈرائیو پر اس کی بلڈنگ میں

پہنچ گئے۔

واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے یہاں عرض ہے کہ میری ہدایت کے مطابق بمبئی سے روانگی کے تیسرے دن صبح قیصر نے دہلی کے کسی PCO سے فون کرکے مجھے بتایا کہ وہ اپنے تمام ساتھیوں اور محافظوں کے ہمراہ بخیریت دہلی پہنچ گئے ہیں اور محافظ وہاں ایک دن آرام کرکے آج بذریعہ ٹرین بمبئی کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ آج وہ کسی وقت عارف اور نذیر کو میرے خط بھی پہنچادے گا اور دو تین روز میں کرنل شنکر کو بھی میرا خط دے آئے گا۔ سپنا نے دہلی پہنچ کر اپنا دارجلنگ جانے کا پروگرام کینسل کررہا ہے اور میرے بے حد اصرار اور سمجھانے کے باوجود وہ آج سہ پہر ایئر انڈیا کی فلائیٹ سے واپس بمبئی آرہی ہے لہٰذا آج شام سات بجے اسے ایئرپورٹ سے ریسیو کرلیا جائے ورنہ وہ خود ہی بمبئی گیرج پہنچ جائے گی۔ قیصر نے مجھے یہ بھی کہا کہ سپنا کے بمبئی پہنچنے پر میں اسے فون کروں اور بہت ممکن ہے کہ دو تین روز کے اندر وہ بھی بمبئی آجائے ''یہاں آکر مجھے بڑی گھٹن محسوس ہورہی ہے۔ میں آپ کے کلکتے واپسی کے پروگرام میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا۔ اگر آپ مجھے بمبئی میں نہ مل سکے تو میں پھر بھی بمبئی میں ہی رہنے اور نئی زندگی شروع کرنے کا سوچ رہا ہوں'' قیصر کی آواز بھرائی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے اس سے اس اچانک اور اتنا بڑا فیصلہ کرنے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا ''بھائی جان! فون پر میں نہیں بتاسکتا کہ یہاں مجھ پر کیا بیتی۔ اگر آپ کو میرا اتنا ہی خیال ہے تو اپنی روانگی تین چار روز کے لیے ملتوی کردیں میں جلد از جلد آپ کے پاس آجاؤں گا۔'' یہ کہہ کر قیصر نے فون بند کردیا اور مجھے بڑے مخمسے میں ڈال دیا۔ میں جلد از جلد یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا۔ بمبئی میں اپنے قیام کو طول دینا میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ گوکھلے والی واردات کے علاوہ میں ماضی میں DMI - کی حراست سے فرار ہونے کے بعد سارے بھارت میں وانٹڈ تھا۔ گوکھلے کی بیوی اور بچے میرے اور قیصر کے چہرے شناس تھے اور ان کی مدد سے بمبئی کی پولیس نے ہمارے قدوقامت کی تفصیل کے علاوہ ہمارے چہروں کے خاکے بھی بنائے ہوں گے۔ بھارتی حکومت بھی گوکھلے کی سرپرست تھی اس لیے پولیس ہماری تلاش میں اپنی پوری توانائیاں صرف کررہی تھی۔ اخبارات میں گوکھلے اور اس کے گروہ کے خاتمے کو سمگلروں کے کسی ایسے گروہ کی کارروائی لکھا گیا تھا جن سے اس کی کاروباری عداوت تھی۔ ایک اخبار کے اداریے میں تو کھلے الفاظ میں یہ کارروائی کسی مسلمان سمگلر گروہ کے سر تھوپی گئی تھی۔ بمبئی بلکہ اس دور کے سارے بھارت میں مسلمانوں کے صرف تین گروہ نمایاں تھے اور اس اخبار نے لکھا تھا کہ یہ کارروائی یقینی طور پر حاجی مستان، یوسف پٹیل یا غنی میمن میں سے کسی ایک نے کی ہے۔ ان حالات میں حاجی مستان کے پاس میرا قیام اور یوسف پٹیل اور غنی میمن سے میرا رابطہ مجھے اس واردات میں ملوث کرنے کے لیے بہت کافی تھا جبکہ میں پہلے ہی وانٹڈ تھا اور اب یک نہ شد دو شد یعنی قیصر اور سپنا کی بمبئی واپسی اور قیصر کا مجھے چند روز مزید یہاں ٹھہرنے پر اصرار نے مجھے بڑی مشکل میں

ڈال دیا تھا۔

یوسف پٹیل کے ڈرائنگ روم میں صرف ہم دونوں بیٹھے تھے۔ میں قیصر اور اس کے ساتھیوں کی بمبئی سے بخیریت روانگی سے ایک طرف اگر اداس تھا تو دوسری طرف ذہنی طور پر اپنی ذمہ داری میں کمی کے باعث خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ یوسف کے دیے ہوئے اخبارات میرے ساتھ ہی تھے۔ میں انہیں پڑھنے لگا تو یوسف بولا ''ان میں صرف واردات اور مقتولین کے نام درج ہیں۔ تمام لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی گئی ہیں اور گوکھلے کی بیوی اور بچوں سے پولیس کو جو کچھ معلوم ہوا ہے۔ اس کی باب کوئی بات نہیں لکھی گئی۔ اخبارات نے اپنی قیاس آرائیوں میں اس واردات کو مخالف گروہوں کا کام لکھا ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ یا تو جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنے بقیہ ساتھیوں کے ہمراہ کسی ایسی جگہ قیام کریں جس کا ظاہری طور پر اس دھندے والوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مستان نے ایک بڑی حماقت یہ کی ہے کہ غنی میمن کو آپ کے متعلق سب کچھ بتادیا ہے۔ غنی میمن نے آپ سے جوہو بنگلے میں ملنے سے پہلے ہی مجھے فون کرکے بتادیا تھا کہ وہ مستان کے بلاوے پر وہاں جارہا ہے اور مستان نے اسے کہا ہے کہ وہ غنی سے اس شخصیت کو ملائے گا جس نے گوکھلے کے گروہ کو ختم کیا ہے۔ آپ اسلحہ مجھ سے لے کر گئے تھے لیکن میں نے غنی یا کسی اور سے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ صرف مستان کو میں نے آپ کے اسلحہ لینے کے لیے محض اس لیے بتایا تھا کہ کہیں آپ کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں'' پٹیل تو یہ کہہ کر خاموش ہوگیا اور میں اس سوچ میں غرق ہوگیا کہ میں کتنی بڑی مصیبت مول لے چکا ہوں۔

یوسف پٹیل نے جو کچھ بھی مجھے کہا، وہ مستان کی مخالفت میں نہیں بلکہ میری بہتری اور حفاظت کے نکتہ نظر سے کہا تھا۔ گوکھلے کے گروہ کا خاتمہ کوئی عام واقعہ یا حادثہ نہیں تھا جسے بھارتی حکومت اور پولیس کوئی اہمیت نہ دیتی۔ بھارتی حکومت تو گوکھلے اور اس کے گروپ کی پوری طرح سے سرپرستی کررہی تھی۔ اگر اس کے گروپ کے بجائے اتنی تعداد میں عام لوگ بھی ہلاک کردیے جاتے تو صوبائی اور مرکزی حکومت، پولیس اور خفیہ ایجنسیاں پوری طرح سے حکومت میں آجائیں۔ میں نے سنجیدگی سے حالات اور ان کے ردعمل کا جائزہ لیا تو بہت گھمبیر صورت دکھائی دی۔ بچنے کی کوئی فول پروف صورت تو سمجھ میں نہیں آئی لیکن فوری طور پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی ایسی جگہ شفٹ ہونا جس کا کسی طور بھی ان زیرزمین کام کرنے والوں سے واسطہ تعلق نہ ہو، بہت ضروری اور اہم تھا۔ یوسف پٹیل سے جب میں نے پوچھا کہ اس نے مجھے حاجی مستان کے گھر اور بمبئی گیرج سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو شفٹ ہونے کا جو مشورہ دیا ہے تو کیا وہ کسی محفوظ جگہ کا انتظام کرسکتا ہے تو اس نے جواب دیا۔ ''یوں تو بہت سی جگہیں ہیں جن کے مالکان کا نہ تو ہمارے دھندے سے ڈائریکٹ واسطہ ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسری زیرزمین سرگرمیوں میں ملوث ہیں لیکن ایسے ''شریف لوگ'' ہم سے کام لیتے وقت تو ہمارے قدموں میں

اپنے سر رکھ دیتے ہیں لیکن جب ہمیں کبھی ان کی ضرورت پڑ جائے تو اپنی مصنوع شرافت کے داغدار ہوجانے کا عذر کرکے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کے لیے فوری دستیاب اور محفوظ جگہ YMCA ہے۔ بمبئی میں ان کے تین مردانہ ہوسٹل ہیں اور اس تنظیم کا جنرل سیکریٹری میرا نہ صرف اچھا دوست ہے بلکہ میرے زیر احسان بھی ہے۔ اس کے ذریعے میں آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے ٹھہرنے کا انتظام کرسکتا ہوں۔ YMCA میں آپ کی رہائش کی کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوگی'

موجودہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر میں نے پٹیل کی اس پیشکش کو قبول کرلیا۔ کھانے کے بعد پٹیل نے مستان کو فون کرکے کہا کہ وہ ابھی ایسے ملنے آرہا ہے۔ ادھر میں نے بھیے گیرج میں نمبر ٹو کو فون پر کہا کہ تمام ساتھیوں کے ساتھ ایک گھنٹے میں روانگی کے لیے تیار ہو جائے۔ پٹیل نے دوسرا فون جنرل سیکریٹری کو کیا اور کہا کہ YMCA کے اندھیری (بمبئی کے ایک علاقے کا نام جہاں فلم اسٹوڈیوز وغیرہ ہیں) کے ہوسٹل میں چھ کمرے فوری طور پر۔ رابرٹ مائیکل اور گروپ کے لیے بک کروا دے۔ ٹیلی فونوں سے فارغ ہوکر یوسف مجھے ہمراہ لے کر مستان کے جوہو والے بنگلے پر پہنچا اور تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد مستان بھی اس بات پر متفق ہوگیا کہ حالات کے پیش نظر ہمیں فوری طور پر کسی محفوظ جگہ شفٹ کرجانا چاہیے۔ اس نے بھیے گیرج میں اپنے کارندوں کو کہا کہ میرے تمام ساتھیوں کو سامان اور اسلحے سمیت لے کر مالابار ہلز کے بنگلے پر آجائے۔ غرضیکہ رات دو بجے تک میں اور میرے ساتھی اپنے سامان اور اسلحے کو کوروں (Covers) میں چھپا کر اندھیری کے YMCA کے کمروں میں پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے اپنے متعلق یہ لکھایا کہ دہلی کے اینجل بینڈ (Angel Band) والے ہیں اور بمبئی کے ایک فلم ساز کے بلاوے پر یہاں آئے ہیں۔ وہاں ہم سب نے اپنے اندراج کرسچین ناموں سے کرائے۔ یوسف پٹیل کا ایک گودام اس ہوٹل کے بالکل قریب واقع تھا جس میں ٹیلی فون بھی تھا۔ مستان اور یوسف نے اپنے دو دو آدمی وہاں ہماری حفاظت اور نگرانی کے لیے چھوڑے اور مجھے کہا کہ میں YMCA سے فون کے بجائے گودام کے فون سے ان سے رابطہ رکھوں۔ مستان نے کہا کہ آئندہ دو تین روز میں وہ اسی علاقے میں ہمارے لیے ایک بنگلے کا انتظام کردے گا جسے بمبئی اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار میں ہماری نقصان اٹھانے والا ایک بیوپاری بیچنا چاہتا تھا اور اپنے ایک بے ضرر دوست کے نام پر مستان نے اسے خریدا ہے۔ میرا بمبئی میں اب کوئی کام نہ تھا اور میں جلد از جلد ہرن گھاٹا پہنچنا چاہتا تھا اور اب یہاں صرف اس لیے رکا ہوا تھا کہ گوکھلے کے گروہ کے خاتمے کے بعد پولیس اور ایجنسیوں کی چیکنگ اور ہنگامہ کم پڑ جائے تو ہم بآسانی اور بحفاظت یہاں سے نکل جائیں۔ مستان اور یوسف نے مجھے کہا کہ ہم بغیر ضرورت ہوسٹل سے باہر نہ نکلیں۔ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا مستان نے اور رات کا کھانا یوسف نے بھیجنے کی پیشکش کی جسے قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ YMCA کی کینٹین میں صرف چائے اور بسکٹ ملتے تھے۔ میں جسمانی اور ذہنی طور پر اتنا تھکا ہوا تھا کہ میں نے YMCA کے خاموش اور پرسکون

ماحول میں اپنی تھکان اتارنے اور ذہن کو تازہ کرنے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور دو روز ہر صبح ڈھیر سارے اخبار پڑھنے اور ساتھیوں سے ہر روز ملنے اور گپ شپ کرنے میں گزار دیے اور ہوسٹل سے باہر نہ نکلا۔

پاکستان سے چکمہ قبیلے کے صدر مقام رانگاماٹی کے لیے نکلنے کے دوران سے اب تک غالباً صرف یہ دو دن ایسے تھے جن میں مجھے اخبارات کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔ پاکستان کے متعلق خبروں سے اندازہ ہوا کہ وہاں کے سیاسی حالات بہت خراب ہوچکے تھے اور ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ڈول رہی تھی۔ تمام سیاسی پارٹیوں نے حکومت کے خلاف مشترکہ محاذ آرائی شروع کردی تھی۔ مغربی پاکستان (جو اب صرف پاکستان رہ گیا تھا) کے عوام نے روٹی کپڑا اور مکان کے دلفریب نعرے کے جال میں پھنس کر پیپلز پارٹی کو بڑھ چڑھ کر ووٹ دیے تھے لیکن عوامی حکومت بنانے کے دعوے کرنے والے برسر اقتدار آکر عوام کو اور ان سے کیے گئے وعدوں کو بھول چکے تھے۔ چاروں صوبوں کے گورنر یا تو نواب تھے اور یا بڑے جاگیردار۔ سارے وزرا اس بچے کھچے پاکستان کے لہو کے آخری قطرے سے نچوڑنے اور اپنا تمام وقت بجائے ملک کے تعمیری کاموں میں صرف کرنے کے عیاشیوں میں مشغول تھے۔ دوسری سیاسی پارٹیوں نے جب اس لوٹ کھسوٹ کو دیکھا تو ان کی زبانوں سے بھی رال بہنے لگی اور انہوں نے حکومت کے خلاف ایکا کرلیا۔ مولانا مفتی محمود کی دینی قابلیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن سیاست کے اس غلیظ کھیل کو وہ سمجھ نہ سکے۔ قبل ازیں جب انہیں صوبہ سرحد کا چیف منسٹر بنا دیا گیا تھا تو اسلحے کے لائسنس وہ خود منظور کرتے تھے۔ انہوں نے ایک ایسی درخواست بھی منظور کرلی جس میں درخواست دینے والے نے ساڑھے تین انچ دہانے کی توپ کا لائسنس مانگا تھا۔ تربیلے میں میری ملازمت کے دوران جب وہ سرحد کے چیف منسٹر بنے تو مسجد کے حجرے سے نکل کر انہوں نے پشاور میں کارنیوال (سرکس، میلہ ٹھیلہ) لگانے والے مشہور دولت مند جان محمد کی سنگ مرمر کی کوٹھی اپنی رہائش کے لیے چنی۔ اس کوٹھی میں جو دو تین ایئر کنڈیشنز لگے ہوئے تھے، انہیں ناکافی سمجھتے ہوئے انہوں نے مزید چودہ ایئر کنڈیشنز لگانے کا حکم دیا۔ چیف سیکریٹری نے تربیلہ ڈیم بنانے والی کمپنی تربیلا جوائنٹ ونچر کو فوری طور پر چودہ ایئر کنڈیشنز مہیا کرنے کا کہا اور کمپنی کے ایک ٹرک میں ایئر کنڈیشنز لاد کر میں خود پشاور گیا۔ مرحوم حیات محمد شیر پاؤ گورنر اور سرحد کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے تھے۔ میں ان کے گورنر بننے سے پہلے پشاور کے حبیب ہوٹل میں دو تین بار مل چکا تھا۔ وہ مسلسل سگریٹ پیتے تھے اور صرف چرس بھرے۔ گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر زون ایف بننے کے بعد وہ گورنر ہاؤس میں شفٹ کرگئے۔ وہاں بھی ان سے ایک بار ملاقات ہوئی تو وہاں وہ چرس بھرا سگرٹ پی رہے تھے۔ نواب صادق حسین قریشی جیسا مفلوج شخص پنجاب کا وزیر اعلیٰ تھا جس کے ہاتھ پاؤں اس کے قابو میں نہ تھے۔ کراچی میں جام صادق علی پلاٹوں کی تھوک سیل لگائے ہوئے تھے بلکہ شنید ہے کہ بھٹو نے انہیں کہا تھا کہ 70۔ کلفٹن (بھٹو کا ذاتی گھر) اور قائداعظم کا مزار

نہ بیچنا باقی چاہے ساری کراچی بیچ دو۔ پاکستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کا صرف ایک مطمع نظر تھا کہ قومی خزانے اور ملکی وسائل کو لوٹو، لوٹو، لوٹو۔ صدیوں قبل ایران کے ایک صوفی منش شاعر کا ایک شعر نہ صرف اس دور کے بلکہ بارہ اکتوبر سن 99ء سے قبل کے ہر دور پر صادق آتا ہے۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن وزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمن ساختہ اند

(میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ کفن چوروں نے قبروں کی تقسیم کے لیے انجمن بنالی ہے۔ پاکستان کی یہ سیاسی پارٹیاں بھی کفن چوروں کی انجمن کی طرح معرض وجود میں آئی ہیں۔ ہر نئے آنے والوں نے پچھلے حکمرانوں کو برا کہا اور خود برسراقتدار آکر برائی میں پچھلوں کو مات کر گئے۔ پاکستان میں شروع سے یہی چلن رہا ہے۔ اس لیے تو ایوب خان کے دور میں جب برسراقتدار ایوب اور حزب اختلاف کے لیڈر ان کے بڑے بھائی سردار بہادر خان تھے، کسی دل جلے اسمبلی کے ممبر نے فلور پر یہ شعر پڑھا تھا۔

یہ راز اب کوئی راز نہیں، سب اہل چمن نے جان لیا
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے، انجام گلستاں کیا ہوگا

آج کے اخبارات میں شہ سرخیوں میں نواز شریف کا عدالت میں دیا ہوا یہ بیان چھپا ہے کہ آئینی وزیراعظم اور آئینی حکومت کو ''سابق'' جنرل پرویز مشرف نے ہائی جیک کرلیا ہے۔ یعنی معاملہ صرف آئینی اور غیر آئینی کا ہے۔ کوئی ان احمقوں سے یہ نہیں پوچھتا کہ یہ آئینی وزیراعظم پنجاب کے چیف منسٹر بننے سے لے کر دو مرتبہ وزیراعظم بننے کے دوران جو ساری ملکی دولت اور وسائل کو مسلسل ہائی جیک کرتے رہے ہیں۔ اس وقت آئین کہاں تھا۔ کیا ملکی میں وزیراعظم کو لوٹ کھسوٹ اور ہر قسم کی دھاندلی کی بھی آزادی دی گئی ہے۔ ان کے بھرپور انجینیر ڈ مینڈیٹ کی اصلیت یہ ہے کہ پاکستان کے کل ووٹروں کے اٹھارہ فیصد سے بھی کم نے ووٹ ڈالے تھے۔ باقی بیاسی فیصد نے یا تو ووٹ ڈالے ہی نہیں تھے یا پھر سلیمانی ٹوپی میں غائب ہوگئے۔ ظاہری اٹھارہ فیصد ووٹوں میں بھی دھاندلی کر کے مسلم لیگ کو اکثریتی ووٹ حاصل کرنے والی پارٹی بنا کر حکومت اس شریف زادے کے سپرد کردی گئی۔ یہ ہے ان کے بھرپور مینڈیٹ کی اصل داستان۔ اب جب عوام کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور جنرل پرویز مشرف صاحب نے عوامی خواہشات کے عین مطابق ان صاحب کو ان ''اصلی تھاں'' دکھائی تو یہ آئینی اور غیر آئینی کے چکروں میں عوام کو پھانس کر اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں۔ پاکستان کے عوام اب مزید بے وقوف بننے کو تیار نہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ اگر ان حضرت کو ایک گھنٹے کے لیے بھی آزاد چھوڑ دیا جائے تو غیض وغضب سے بھرے عوام ان کی تکا بوٹی کردیں گے اور بھاری مینڈیٹ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔

میں تو سیدھا سادھا انسان ہوں اور گولی کی طرح سیدھی بات کرتا ہوں۔ وکلا کی چکردار اور الجھانے والی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں اپنی اور اپنے ہمنوا قارئین کی طرف سے میاں صاحب اور بے نظیر صاحبہ سے صرف دو سوال پوچھتا ہوں۔ میاں صاحب کی اتفاق فاؤنڈری قیام پاکستان سے قبل معرض وجود میں آچکی تھی اور دھیمے انداز میں ترقی کررہی تھی۔ آپ کے پنجاب کے وزیراعلیٰ اور پاکستان کے دو مرتبہ وزیراعظم بننے کے دوران یہ 1985ء سے 1999ء کے چودہ سال کے عرصے میں یکا یک آسمان کو کیسے چھونے لگ گئی اور آپ درجنوں ملوں کے مالک اور ملک اور بیرون ملک میں اربوں کی دولت اور عالیشان مکانات کے مالک کیسے بن گئے جبکہ لاہور میں ہی بٹالہ انجینیر نگ ورکس اسی دوران مسلسل روبہ زوال ہوکر بالآخر ختم ہوگئی۔ مسلسل کمرشل بنک کو میاں منشا کو کم قیمت پر فروخت کرنے کے ایک ہفتے کے اندر واپڈا ہاؤس برانچ لاہور میں پانچ ہزار روپے سے اکاؤنٹ کھول کر آپ کو تیس کروڑ روپے کا قرضہ کیونکر مل گیا۔ رائے ونڈ کے محلات 1985ء سے قبل کیوں نہ تعمیر ہوسکے۔ چودہ سال کے طویل عرصے میں آپ کی انڈسٹری فرش سے عرش تک کیونکر جا پہنچی جبکہ پاکستان میں آپ ہی کے شعبے کی دوسری انڈسٹریاں مسلسل خسارے میں جارہی ہیں۔ یقیناً یہ آپ کا کمال نہیں بلکہ وزیراعلیٰ اور وزیراعظم کی کرسیاں ملنے کے باعث ہوا۔

محترمہ بے نظیر صاحبہ! اب تو خدارا تسلیم کرلیں کہ سرے محل آپ کا ہی ہے۔ یہ محل اور آپ کی اربوں کی دولت کے سوئس بنکوں میں انبار آپ کے وزیراعظم بننے سے پہلے کیوں نہ تھے۔ 70 کلفٹن کا مکان تو آپ کے دادا سر شاہنواز بھٹو نے جونا گڑھ کی دولت سے بنایا تھا جس کے وہ وزیراعظم تھے۔ اس کے بعد تمام دولت اور جائیداد آپ نے وزیراعظم بننے کے بعد ملکی وسائل کی لوٹ کھسوٹ کے ذریعے بنائی۔ اگر یہ دولت اور جائیداد آپ کو وراثت میں ملی ہوتی تو آپ کی بہن صنم بھٹو اور دونوں مقتول بھائی آپ سے بہت زیادہ دولت اور جائیداد کے مالک ہوتے۔ یہ سب کچھ یہیں رہ جانا ہے۔ خدا کا خوف کیجیے میاں صاحب اور بے نظیر صاحبہ اور پاکستانی عوام کا روپیہ انہیں لوٹا کر خود کو ہلکے پھلکے محسوس کریں اور اس نہ ختم ہونے والے عذاب سے بچیں جو قبر سے شروع ہوگا اور جس سے مفر نہیں۔

دو دن آرام ہی میرے نصیب میں تھا۔ تیسرے دن بیک وقت کئی باتیں ہوگئیں۔ گیارہ بجے دن کے قریب حاجی مستان کا آدمی آیا اور کہنے لگا۔ حاجی صاحب نے فوری بلایا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی مالابار ہلز والے بنگلے پر گیا تو مستان نے کہا کہ دہلی سے قیصر کا فون آیا تھا وہ آپ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتا تھا اور ابھی دوبارہ فون کرے گا۔ پندرہ منٹ کے اندر قیصر کا دوبارہ فون آیا اور اس نے بتایا کہ سپنا آج بعد دوپہر کی فلائیٹ سے بمبئی واپس آرہی ہے اور دو تین روز میں وہ خود بھی آرہا ہے۔ میں تو جلد از جلد بمبئی سے نکلنے کی سوچ میں تھا۔ اب مجھے ان کی وجہ سے اپنے قیام کو طول دینا پڑا اور اسی روز اندھیری میں حاجی مستان کے نئے خریدے ہوئے بنگلے میں ہم شفٹ ہوگئے۔

حاجی مستان نے اس بنگلے میں ہماری سہولت اور آرام کے لیے مکمل انتظام کردیا تھا۔ دو باورچی کچن میں اور دو لڑکے بنگلے کی کی صفائی کے لیے تھے۔ بنگلہ بیچنے والے سے مستان نے اسے فرنیچر اور دیگر سامان سمیت خریدا تھا۔ ضرورت اور آرام کے تمام لوازمات کے علاوہ مستان نے دو ایسی پرائیویٹ کاریں بھی وہاں بھجوادی تھیں جن کے مالکان کا اس کالے دھندے والوں سے کوئی ظاہری تعلق نہ تھا۔ سابقہ مالک کے دو ٹیلی فون بھی موجود تھے۔ مستان نے اپنے چھ محافظوں اور وحید کو بھی ہماری حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے ہمہ وقت وہاں رہنے کا حکم دیا تھا۔ یہ اس کے خلوص اور دوستی کا ایک ادنیٰ اظہار تھا۔ میرے ساتھ اس کی قربت اس شام تک پہنچ چکی تھی جہاں دوست کی خاطر زندگی کی بھی کوئی وقت نہیں رہتی۔ شام سات بجے کی فلائیٹ پر سپنا آرہی تھی جس لینے کے لیے وحید کے پہنچنے کے بیس منٹ بعد میں نے اسے ڈرائنگ روم میں طلب کیا اور چند رسمی باتوں کے بعد اس سے واپس آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے اسے کہا کہ میں تو اپنے گردوپیش ان گنت مشکلات اور پریشانیوں سے نکلنے کی کوشش کررہا ہوں اور تم نے واپس آکر ان میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ پروگرام کے مطابق تم نے دہلی سے قیصر کے ہمراہ دارجلنگ جانا تھا۔ اس پروگرام میں یکا یک تبدیلی کی وجہ کیا ہے، قیصر خود بھی ایک دو روز میں یہاں آنے والا ہے، آخر اس سب کا مطلب کیا ہے۔ سپنا بھرائی ہوئی آنکھوں سے میرے سوال اور اپنی واپسی پر میری بیزاری کی باتیں سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہوا تب وہ ٹھہری ہوئی آواز میں کہنے لگی ”میں نے دہلی جاکر دارجلنگ میں اپنے والد کے پراپرٹی منیجر کو فون کیا تھا۔ وہ ہمارا قریبی رشتہ دار بھی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کلپنا ہوں اور میرے ماتا پتا انتہائی نامساعد حالات میں پرلوگ سدھار چکے ہیں۔ آپ کو تو علم ہے کہ کئی برس کے بعد میں نے دارجلنگ والوں سے رابطہ کیا تھا۔ منیجر نے مجھے اور میرے ماتا پتا کو پہچاننے سے صاف انکار کردیا اور کہا کہ وہ کسی بھی نہیں جانتا۔ ہماری برسوں کی غیر حاضری کے دوران اس نے حکام سے مل ملا کر ہماری ساری جائیداد، چائے کے کھیت اور کارخانہ کاغذات میں ردوبدل کرواکے اپنے نام کروالیا ہے۔ میں نے دو اور قریبی رشتہ داروں کو بھی فون کیا اور انہیں منیجر کی بے ایمانی اور مجھے نہ پہچاننے کے بارے میں بتایا تو مجھ سے یہ سن کر وہ بھی مجھے اور میرے ماتا پتا کو نہیں جانتے۔ میں نے منیجر کو یہ بھی کہا تھا کہ میں دارجلنگ آکر قانون کا سہارا لے کر اس کا بھانڈا پھوڑ دوں گی تو اس نے کہا کہ میرے دارجلنگ پہنچتے ساتھ ہی وہ مجھے میرے ماتا پتا کے پاس بھجوانے کا انتظام کردے گا۔ میں نے قیصر بھائی کو یہ بات بتائی تو اس نے کہا کہ چند روز میں وہ اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرکے میرے ہمراہ دارجلنگ جائے گا اور منیجر کو سیدھا کرکے سارا معاملہ ٹھیک کردے گا۔ اب قیصر بھائی کی سنیے۔ اس پر تو دہلی پہنچ کر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ دہلی بغیر پیشگی اطلاع دیے پہنچے تھے۔ میں ان کے ہمراہ ہی ان کے گھر گئی۔“اس وقت ان کی بیوی گھر سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ گھر جانے کی قیصر بھائی کو بے حد خوشی تھی۔ حصے کی رقم کے مطابق ان کے اپنے چھتیس لاکھ اور

مرنے والے دو ساتھیوں کے ورثا کے لیے بیس لاکھ روپے ان کے پاس تھے۔ انہوں نے روپے رکھنے کے لیے الماری کھولی تو اس میں ان کے محلے کے ہی ایک آدمی کے دو محبت نامے ان کے ہاتھ آگئے جو اس نے قیصر بھائی کی غیرموجودگی میں ان کی بیوی کو لکھے تھے۔ قیصر بھائی کا صدمے سے برا حال تھا۔ بیوی کی گھر واپسی پر جب انہوں نے ان خطوں کے متعلق باز پرس کی تو ان کی بیوی صاف مکر گئی بلکہ قیصر بھائی پر الٹا الزام لگایا اور رونے پیٹنے لگی کہ وہ بہن کے روپ میں اپنی محبوبہ یعنی مجھے گھر لے کر آئے ہیں۔ قیصر بھائی تو پہلے ہی طیش میں تھے۔ خود پر بے بنیاد الزام لگانے پر انہوں نے قرآن اٹھا کر اپنی صفائی دی۔ جب وہ اس پر بھی مطمئن نہ ہوئی اور ان دو خطوط کے متعلق بھی کوئی معقول صفائی نہ دے سکی تو قیصر نے اپنی والدہ کو پانچ لاکھ روپے دیے اور بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اور ان کے بچوں کو ان کی والدہ نے سنبھال لیا۔ قیصر بھائی اس واقعے سے بہت دل برداشتہ ہوچکے ہیں۔ ان کے گھر میں میرا مزید ٹھہرنا ان کے عزیز و اقارب اور محلے والوں کو بھی شک میں مبتلا کرسکتا تھا کیونکہ ان کی بیوی نے واویلا کرتے ہوئے سارے محلے والوں کو ان کے خلاف جھوٹی باتیں کہہ کر بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ لہٰذا قیصر بھائی نے آج فون کرکے آپ کو بتایا اور ایئرپورٹ سے مجھے بمبئی کے لیے جہاز پر روانہ کردیا اور وہ خود بھی کل یا پرسوں تک ساتھیوں کے ورثا تک ان کے پیسے پہنچا کر اور آپ کے کسی فوجی دوست کو خط دے کر بمبئی کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔“ میں نے خاموشی سے سپنا کی ساری بات سنی۔ اس کی بیان کردہ ساری داستان میں جب جھوٹ کا کوئی پہلو نظر نہ آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بمبئی تو آگئی ہے، اب آئندہ کے لیے اس کے کیا ارادے ہیں۔ ”میں تو محض تمہارے اور قیصر کے انتظار میں یہاں پڑا ہوں اور جلد از جلد یہاں سے واپس ہرن گھاٹا جانا چاہتا ہوں جہاں اسٹیمر میں میرے ساتھی، رانی، اس کا لڑکا، رضی کی بیوی اور اسٹیمر کا کپتان میرا انتظار کرتے کرتے اکتا چکے ہوں گے اور کہیں یہ نہ ہو کہ میری واپسی میں تاخیر کے باعث کپتان جہاز کو لے کر واپس چٹاگانگ چلا جائے۔“ سپنا میری باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آنکھیں جھکائے اور ساڑھی کے پلو کو انگلیوں پر لپیٹتے اور کھولتے ہوئے وہ بولی۔ ”میرے ماضی کو آپ نہ صرف جانتے بلکہ آنکھوں سے دیکھ بھی چکے ہیں۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی بیتی اس میں میری مرضی کا ذرا سا بھی عمل دخل نہ تھا۔ ہر عورت کی جسمانی کمزوری اور بے بسی سے جس طرح ہوس پرست اپنا مقصد پورا کرتے ہیں ویسے ہی میں پہلے اپنے والدین کے قاتل سردار اور پھر چکمہ کے سردار کی ہوس کی بھینٹ چڑھی۔ آپ کو دیکھا تو مجھے آپ کی ذات میں اپنا نجات دہندہ دکھائی دیا۔ ہوٹل میں آپ نے کلپنا کے بجائے سپنا لکھایا تو میں نے یہ سوچا کہ جیسے آپ نے میرا نام بدلا ہے، ویسے ہی آپ میری ہر شے اور دھرم بھی بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ آپ نے مجھے کلپنا سے سپنا بنایا تو سائرہ بھی بناسکتے ہیں اور اگر آپ نے ایسا کیا تو میں اسے اپنی انتہائی خوش نصیبی سمجھوں گی۔“ یہ کہہ کر سپنا خاموش ہوگئی۔ بہت تھوڑے الفاظ میں وہ بہت کچھ کہہ گئی تھی۔

اس کی آنکھیں بدستور جھکی ہوئی تھیں اور ہاتھ کی انگلیوں پر ساڑھی کا پلو لپیٹنے اور کھولنے کا عمل بھی جاری تھا۔ مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی اس اچانک اور انتہائی خلاف توقع بات کا میں کیا جواب دوں۔ اپنے گھریلو حالات سے میں انتہائی برگشتہ تھا اور میری سوچ یہی تھی کہ ازسرنو اپنی نئی گھریلو زندگی کا آغاز کروں۔ سپنا حسین، جوان، پڑھی لکھی اور دل موہ لینے والی شخصیت کی حامل تھی۔ میرے جیسے غیر معمولی حالات کا شکار کوئی بھی شخص اس کی سیاہ اور گھنی زلفوں اور سمندر کی طرح گہری اور خوابیدہ آنکھوں میں سکون حاصل کرسکتا تھا۔ وہ دلیر اور صاف گو تھی اور یہ سب خوبیاں بیک وقت بہت کم عورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ میں نے سپنا کو کہا ”تمہاری ساری بات کا مقصد میں سمجھ گیا ہوں۔ تم اپنی زندگی میں سکون اور راحت کی متلاشی ہو اور میری زندگی میں دور دور تک ان دونوں کا نام و نشان تک نہیں۔ تم مردوں کے ظلم وستم اور جبر کا شکار بنی رہی ہو اور میں نے اپنی ماں کی خواہش کے احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے خود جہنم کی آگ میں کود پڑا تھا جس کی حدت سے آج تک میں اور میری ماں سلگ رہے ہیں۔ موجود حالات میں میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کسی وقت بھی دشمنوں کی گولیاں میرا کام تمام کرسکتی ہیں۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اگر تم اپنی بات پر قائم ہو تو مجھے تھوڑا وقت سوچنے کا موقع دو تا کہ ہم سوچ سمجھ کر ایسا فیصلہ کریں جس پر بعد میں ہم دونوں کو پچھتانا نہ پڑے۔ نئی زندگی شروع کرنے میں تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جبکہ مجھے اس مقصد کے لیے پہلے ان کانٹوں کو ہٹانا ضروری ہے جن کے باعث میرا دل زخموں سے بھرا پڑا ہے۔“ وہ مجھے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لفظ شب بخیر غالباً اس نے دہلی میں سنا تھا اور مجھے یہ کہہ کر اس نے یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ اس میں خود کو تبدیل کرنے اور میری مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کتنی صلاحیت ہے۔

اگلے روز بعد دوپہر قیصر بھی بمبئے گیرج ہوتا ہوا بنگلے پر پہنچ گیا۔ اس نے تفصیل سے مجھے دہلی میں پیش آنے والے واقعات سنائے جن کا ذکر سپنا پہلے ہی کرچکی تھی۔ بیوی کے رویے اور اچانک وہ جتنی امنگیں، آرزوئیں اور مستقبل کی خوشیوں کے سہانے سپنوں کو حقیقت میں بدلنے کا سوچتے ہوئے دہلی پہنچا تھا اور اپنی بیوی کے رویے اور اس کی وفا کے پردے کو پھٹے دیکھ کر وہ اتنا ہی آزردہ اور غمگین دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کی ساری بات سن کر اس سے پوچھا کہ بیوی کو طلاق دینے میں اس نے کیا کچھ جلدی نہیں کی تو وہ بولا ”بھائی جان! مکھی کو دیکھتے ہوئے کوئی اسے نگل نہیں سکتا۔ میں تو اپنی بیوی کی بے وفائی کے ثبوت پا کر اسے گولی مارنے لگا تھا لیکن سوچ کر باز رہا کہ اسے اور ایک کتیا کو مارنا برابر ہے اور کسی کتیا کو مار کر میں پھانسی نہیں چڑھنا چاہتا۔ اپنی عزت بچانے کے لیے انسان جان پر کھیل جاتا ہے لیکن اسی عزت کی رکھوالی جب شوقیہ عزت لٹانے لگ جائے تو اس سے کنارہ کشی ہی سب سے بہتر حل ہے۔ ماں اور بچوں کے لیے میں کافی روپیہ چھوڑ آیا ہوں اور یہ تہیہ کرکے یہاں آیا ہوں کہ اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کروں گا۔ میں کرنل شنکر کو آپ کا خط خود دے کر آیا ہوں۔ میں نے اسے

خط دیتے ہوئے جب آپ کا نام لیا (ونود چوپڑا) تو اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا لیکن میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ حالات کے پیش نظر یہ مناسب نہیں ہے۔ خط میں تمام تفصیل موجود ہے۔ میں تو صرف ہرکارہ ہوں خط پڑھ کر آپ جیسے چاہیں کریں۔ میری بات سن کر اس نے بھی بیٹھنے پر زور نہیں دیا۔ یہ خط میں کل شام ڈھلے سپنا کو ایئرپورٹ پر چھوڑ کر اسے دینے گیا تھا۔“ قیصر کے آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی سپنا بھی آکر ہماری باتوں میں شریک ہوگئی اور ابھی ہم تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہی تھے کہ مستان کے پہریداروں نے مجھے بتایا کہ یوسف پٹیل مجھ سے فوری طور پر ہل ٹاپ ہوٹل میں ملنا چاہتا ہے۔ میں نے قیصر اور سپنا کو ساتھ لیا اور مستان کی گاڑی میں میرین ڈرائیو پر ہل ٹاپ ہوٹل پہنچ گئے۔ ہوٹل کے باہر ہی یوسف پٹیل کے دو آدمی کھڑے تھے وہ ہمیں ہوٹل کے پانچویں فلور پر ایک کمرے میں لے گئے۔ یوسف وہاں ہمارا بے تابی سے منتظر تھا۔ قیصر اور سپنا کو میرے ساتھ دیکھ کر وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا کیونکہ یہ دونوں کوہلا اسٹیشن پر اس کی موجودگی میں دہلی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ میں نے مختصراً اسے یہ بتایا کہ یہ دونوں دہلی واپس آگئے ہیں اور ابھی میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرے ساتھ ہی کچھ عرصہ رہیں گے۔ پٹیل نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”مجھے اپنے نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ غنی میمن گوکھلے کے خاتمے کے بعد اس کی جگہ لینے کے لیے تگ و دو کررہا ہے۔ ہمارے دھندے میں کاروباری دوستوں کے مفاد کو نقصان پہنچائے بغیر اپنا بہتر مقام بنانے کی حد تک کوشش جائز سمجھی جاتی ہے لیکن غنی میمن نے لالچ میں آکر اس اصول کو فراموش کردیا ہے۔ میرے مخبروں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ بمبئے کے پولیس کمشنر سے اس نے علیحدگی میں ملاقات کی ہے۔ اس کے بعد سے ہی سویلین کپڑوں میں پولیس اور خفیہ والوں کے کارکن میرے گھر اور مستان کے بمبئے گیرج اور جوہو والے بنگلے کی نگرانی کررہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گوکھلے کے خلاف کارروائی کے متعلق اس نے ہم دونوں اور تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے متعلق پولیس کمشنر کو بتادیا ہے۔ چونکہ نہ تو اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے اور نہ ہی پولیس کے پاس کوئی عینی گواہ اس لیے پولیس نے ابھی تک اپنی کارروائی صرف ہماری نگرانی تک محدود رکھی ہے۔ گوکھلے کی بیوی اور بچوں کی مدد سے تمہارے اور قیصر کے جو خاکے بنائے گئے ہیں وہ میں نے پولیس کے ایک انسپکٹر سے جو ہمارے لیے کام کرتا ہے لے لیے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے مستان نے فوٹو کاپی ہوئے دو خاکے میرے سامنے رکھ دیے۔ دونوں خاکوں پر میری اور قیصر کی اسی فیصد تک درست تصویریں بنی ہوئی تھیں اور ہر خاکے پر ہمارا رنگ، قد، اندازاً عمر اور حلیہ لکھا ہوا تھا۔ یہ بھی خاصی حد تک درست تھا۔ یوسف کہنے لگا۔ ”اس پولیس انسپکٹر کے بقول اگر آئندہ تین چار روز تک پولیس ڈائریکٹ تم تک نہ پہنچ سکی تو پھر ان خاکوں کو اخبارات میں شائع کرادیا جائے گا۔“ اپنا خاکہ دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ اگر پولیس نے اپنے گزشتہ دو سالوں کے ریکارڈ کی چھان بین کی تو انہیں یقیناً میری وہ تصویریں ضرور مل جائیں گی جو DMI کی حراست سے فرار ہونے کے بعد اخبارات میں شائع کرائی

گئی تھیں۔ پٹیل نے مجھے کہا کہ اب بہتر یہی ہے کہ مچھیروں کے روپ میں آپ لوگ گھاس بندر سے تین مختلف لانچوں میں بمبئی سے چلے جائیں۔ میرے پاس اتنی بڑی لانچیں ہیں جو آپ اور آپ کے ساتھیوں کو بحفاظت کلکتے تک پہنچا سکتی ہیں۔ آگے کا انتظام مستان کر دے گا۔

یوسف پٹیل سے دونوں تصویری خاکے لے کر میں قیصر اور سپنا کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکلا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہم سیدھے مستان کے پاس چلتے ہیں لیکن فوری ہی خیال آیا کہ مستان کے جوہو والے بنگلے، بمبئے گیرج کی اگر پولیس اور خفیہ والے نگرانی کر رہے ہیں تو مالابار ہلز والا بنگلہ بھی یقیناً زیرِ نگرانی ہوگا اس لیے وہاں جانا بھی مناسب نہیں۔ ہماری اولین ضرورت یہ تھی کہ میں اور میرے تمام ساتھی اکٹھے ایک جگہ پر ہوں تاکہ کسی ناخوشگوار صورت میں وہ حالات کا مل کر مقابلہ کر سکیں۔ میں نے ڈرائیور کو اندھیری والے بنگلے پر چلنے کو کہا۔ ہمارے محافظ دوسری گاڑی میں تھے۔ بنگلے پر پہنچ کر میں نے وحید کو کہا کہ حالات لحہ بہ لحہ ہمارے خلاف ہو رہے ہیں میرے اور قیصر کے تصویری خاکے بھی بن چکے ہیں اور یوسف نے بتایا ہے کہ بمبئے گیرج اور جوہو والے بنگلے کی بھی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اس لیے میں بھی مستان سیٹھ سے فوری طور پر رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ وحید کا چہرہ پہلے ہی اترا ہوا تھا۔ میری ساری بات خاموشی سے سن کر وحید نے کہا ”آپ کی غیر موجودگی میں مستان سیٹھ کے دو بار فون آ چکے ہیں۔ اس نے یہ سب باتیں مجھے بتا دی تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی بتایا تھا اور مجھے تاکید کی تھی کہ آپ کو یہ سب بتا کر پریشان نہ کروں لیکن اب جبکہ آپ کو پہلے ہی بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے تو اب آپ سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مالابار ہلز والے بنگلے کی بھی نگرانی شروع ہو چکی ہے۔ گو کھلے کے خاتمے پر صوبائی پولیس اور انتظامیہ بظاہر تو صرف قافلوں کی تلاش میں ہے لیکن اندرونی طور پر انہوں نے یہ چال چلی ہے کہ ہندو مسلم فساد کروا کے مسلمان لڑنے والوں اور ان کے حامیوں کو سامنے لایا جائے۔ شیوسینا والوں نے انہی کی شہہ پر میٹرو سینما کے قریب بلاوجہ چار مسلمان راہ گیروں کو چھرے گھونپ کر ہلاک کر دیا ہے۔ یہ ہندو مسلم فساد کی شروعات ہے۔ مسلمان یقیناً اس کا بدلہ لیں گے اور یہ فساد گھنٹوں میں بڑھتے بڑھتے سارے بمبئی میں پھیل جائے گا۔ حکومت معمول کے مطابق جب خاصی تعداد میں دونوں طرف کے افراد ہلاک ہو جائیں گے تو کرفیو لگا کر گھر گھر تلاشی کے بہانے مسلمانوں کے گھروں سے چن چن کر اپنے مطلوبہ بندوں کو نکال کر شیوسینا والوں کے حوالے کر دیں گے جن کی پھر کبھی کوئی خبر نہیں ملتی۔ مستان سیٹھ نے ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کی مکمل تیاری کر رکھی ہے، اس کا ایک بالکل خفیہ اور محفوظ ٹیلی فون ہے۔ میں اس پر آپ کی مستان سیٹھ سے بات کرواتا ہوں۔“ تھوڑی دیر میں ہی مستان سے ٹیلی فون پر رابطہ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ یوسف سے بھی اس کی بات ہو چکی ہے اور یہی بہتر ہے کہ ہندو مسلم فساد بڑھنے سے پہلے ہی آپ یوسف کی لانچوں پر کلکتے چلے جائیں۔ اس کی تین لانچیں اتنی بڑی اور طاقتور انجنوں والی ہیں کہ ایران کے ساحلوں تک جا کر ترکی کی منشیات لاتی ہیں۔

میں نے یوسف کو کہہ دیا ہے کہ کل رات آپ سب کی روانگی کا انتظام کرے۔ کلکتے میں میرا نمائندہ آپ کا منتظر ہوگا اور وہ ایک خصوصی اسٹیمر پر آپ کو بنگلہ دیش میں مطلوبہ مقام پر بحفاظت پہنچا دے گا۔ میرے تین انتہائی وفادار محافظ یہاں سے بنگلہ دیش تک آپ کو چھوڑنے جائیں گے۔ میں آپ کو آج رات ہی آپ کا روپیہ، جواہرات اور بڑا اسلحہ بھجوا دیتا ہوں۔ حالات کے پیشِ نظر ممکن ہے میں آپ کو الوداع کہنے نہ آ سکوں۔ کلکتے پہنچنے پر آپ مجھے فوری طور پر فون پر اپنے بخیریت پہنچنے کی اطلاع دیں۔ جب تک آپ کا فون نہیں آئے گا میں آپ کے لیے پریشان اور فکرمند رہوں گا۔“ مستان نے کلکتے میں اپنے نمائندے کے ٹیلی فون مجھے لکھوائے اور کہا کہ وہ یوسف کو دوبارہ فون کر کے ہماری روانگی کے پروگرام کو کنفرم کرنے کی اطلاع دے گا۔ اسی رات حاجی مستان کے آدمی ۱۰ پمپ ایکشن رائفلیں اور ان کا ڈھیر سارا ایمونیشن اور چکمہ قبیلے کے تمام جواہرات اور روپیہ جو میں نے مستان کے پاس امانتاً رکھوایا تھا لے کر آ گئے۔ میں نے ایک رائفل اپنے لیے رکھ کر باقی سب اسلحہ اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ دو مشین گنیں اور ریوالور پہلے ہی سب کے پاس تھے۔ میں نے انہیں کل شام روانگی کا بتایا اور کہا کہ بالکل سادہ لباس پہنیں۔ ہماری روانگی کا سن کر قیصر اور سپنا نے بھی ہمارے ساتھ ہی جانے پر اتنا اصرار کیا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ ان دونوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنے ماضی کے ہر رشتے اور تعلق کو ختم کر چکے ہیں۔ اور اگر میں انہیں اپنے ساتھ نہ لے گیا تو وہ یہاں بھٹکتے رہ جائیں گے۔ میرے بارہا کہنے پر بھی کہ مجھے بالآخر پاکستان جانا ہے وہ میرے ہمراہ کم از کم بنکاک تک جانے پر مصر رہے۔ اگلا سارا دن ہماری روانگی کی تیاریوں اور پمپ ایکشن رائفلوں کو لوڈ اور ان لوڈ کرنے اور ان سے نشانہ باندھنے کی پریکٹس میں گزرا۔ سرِ شام ہی یوسف پٹیل کی چار کاریں ہمیں لینے کے لیے آ گئیں۔ چند منٹ کے وقفے سے مستان کی ایک گاڑی میں اس کے تین محافظ بھی بنگلہ دیش تک ہمارے ساتھ جانے کے لیے آ گئے۔ شام کو سات بجے ہمارا قافلہ گھاس بندر کی طرف روانہ ہوا جہاں یوسف پٹیل کی تین لانچیں ہماری منتظر تھیں۔

ہم گھاس بندر پر گاڑیوں سے اتر ہی رہے تھے کہ حاجی مستان اور یوسف پٹیل اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں پہنچے اور بغیر کوئی وجہ بیان کیے ہمیں فوراً واپس گاڑیوں میں سوار ہونے کا کہا اور چند منٹوں میں ہی ہم سب اپنی گاڑیوں میں واپس اندھیری کے بنگلے کی طرف تیزی سے روانہ ہو گئے حاجی مستان اور یوسف پٹیل اپنی تمام احتیاطی تدابیر کو نظر انداز کرتے ہوئے گھاس بندر پہنچے تھے۔ میں حیران تھا کہ روانگی کے پروگرام کو آخری شکل دینے کے بعد جب کہ ہم چند منٹوں میں لانچوں میں سوار ہونے والے تھے، یکایک پروگرام میں تبدیلی کیوں ہو گئی۔ بنگلے پر پہنچ کر مستان نے کہا کہ ہمارا سامان گاڑیوں میں ہی رہنے دیا جائے اور مجھے کہا کہ ہم ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔ تم ساتھیوں کو کہہ دو کہ وہ اپنے کمروں میں جائیں کیونکہ ایک گھنٹے بعد روانگی ہوگی اور تم ہمارے پاس ڈرائنگ روم میں اکیلے آ جاؤ۔ میں ساتھیوں کو ہدایات دے کر ڈرائنگ روم میں آیا تو یوسف نے بات شروع کرتے ہوئے کہا ”یہاں کے حالات بہت

تیزی سے خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے تھوڑی دیر قبل ہی پتہ چلا ہے کہ کوسٹ گارڈ والے ہر گزرنے والی لانچ کی سختی سے تلاشی لے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لانچ کلکتے جاتے ہوئے سری لنکا اور بھارتی سمندر کے بیچ سے گزرنا پڑتا ہے۔ میرے لانچ ماسٹروں کا کہنا ہے کہ سمندر کے اس حصے میں بھارتی اور سری لنکن بحریہ بغیر چیکنگ کے کسی کو گزرنے نہیں دیتی۔ ان کا مقصد سری لنکا میں تامل ناڈو کارروائیوں کو روکنا ہے۔ اتنے اسلحے کے ساتھ وہاں سے بغیر چیکنگ کے گزرنا محال ہے۔" حاجی مستان نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "میرے بمبئے سنٹرل اور وکٹوریہ پر ریلوے پولیس میں ریلوے کے چند مسلمان بڑے اہلکاروں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں۔ میں نے ان سے بات کی ہے۔ آج رات ٹھیک دس بجے آپ اور آپ کے ساتھیوں کے لیے ہوڑا ایکسپریس پر جمشید پور جنکشن کے لیے ایئر کنڈیشنڈ کوچ کے ٹکٹ لے لیے گئے ہیں۔ ہمارے محافظ بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ ریلوے والوں نے جمشید پور تک آپ کو بحفاظت پہنچانے کی ذمہ داری لی ہے۔ لہٰذا آپ آج اس ٹرین سے روانہ ہو جائیں۔ بمبئی میں فسادات شروع ہونے کے باعث ریلوے اسٹیشن تقریباً سنسان ہیں۔ اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ فسادات ختم ہونے اور حالات پرسکون ہونے تک یہاں رہیں یا آج ہی یہاں سے نکل جائیں۔" میں نے آج رات ہی جمشید پور جانے کا فیصلہ کیا جہاں سے کلکتہ زیادہ دور نہ تھا۔ سب تدبیریں ناکام ہو جائیں تو انسان کو اپنی کشتی لہروں کے رحم و کرم پر ہی چھوڑنی پڑتی ہے۔ جو کچھ بھی پکا ہوا تھا ہم نے جلدی جلدی زہر مار کیا اور ٹھیک سوا نو بجے ہماری گاڑیوں کا قافلہ وکٹوریہ ٹرمینس کی طرف روانہ ہوا۔ ریلوے اسٹیشن کی گہما گہمی ختم ہو چکی تھی۔ قلی بھی اکا دکا ہی تھے۔ حاجی مستان کے واقف ریلوے کے اہلکار اور ریلوے پولیس والے ہمارے ساتھ ایئر کینڈیشنڈ کوچ کی طرف روانہ ہوئے۔ یوسف اور مستان مجھ سے بغلگیر ہوئے اور مستان نے مجھے کہا۔ "میں نے ان اہلکاروں اور پولیس والوں کو صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اگر آپ لوگوں کو تھوڑا سا بھی گزند پہنچا تو ان کے گھر والوں کی لاشیں انہیں ملیں گی۔" میں دیکھ رہا تھا کہ دونوں کے چہروں سے ہر پریشانی اور گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔ ٹھیک دس بجے انجن نے روانگی کا وسل دیا اور ٹرین رینگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ حاجی مستان اور یوسف دیر تک ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں الوداع کہتے رہے۔ گاڑی اسٹیشن سے باہر نکلی تو میں اپنے کوپے میں آیا۔ اس میں نیچے کی تین برتھوں پر ریلوے کی طرف سے فراہم کردہ بستر بچھے ہوئے تھے۔ اوپر کی برتھ پر میرا اور سپنا کا سامان تھا۔ سب سے اوپر کی برتھ مستان کے محافظ نے سنبھال لی تھی۔ نیچے کی دو برتھوں پر میں اور سپنا بیٹھ گئے۔ ڈائننگ کار بند ہونے سے پہلے ہم سب کے لیے چائے اور بسکٹ بھیجے گئے۔ میں نے تمام ساتھیوں کو نہایت چوکنا اور اپنا اپنا اسلحہ تیار رکھنے کا کہہ دیا تھا۔ سونے سے پہلے میں نے تمام ساتھیوں کے ڈبوں میں جا کر انہیں مختصر الفاظ میں روانگی کے پروگرام میں تبدیلی کی وجہ بتائی اور انہیں مطمئن کر کے اور مزید ہدایات دے کر اپنے کوپے میں آ گیا۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر نیند تو خاک آنی تھی۔ خاصی دیر تک میں آنکھیں بند کیے

جاگتا رہا اور رات کے آخری پہر کے قریب میری آنکھ لگ گئی۔ میں جب جاگا تو خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ ٹرین فراٹے بھرتی چھوٹے اسٹیشنوں پر رکے بغیر اڑی جا رہی تھی۔ ہم بمبئی اور مہاراشٹر کے علاقے سے نکل آئے تھے۔ بوگی کے چاروں دروازوں کے نزدیک متان کے اہلکار پہرے کی ڈیوٹی پر بیٹھ چکے تھے۔ سپنا نے بتایا کہ ریلوے اہلکار دو مرتبہ ناشتے کا پوچھنے آ چکے ہیں مگر اس نے انہیں یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ میں ابھی سو رہا ہوں۔ میں باتھ روم میں نہا کر تازہ دم ہو کر باہر آیا تو ناشتہ آ چکا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے قیصر اور نمبر ٹو کو بھی اپنے کوپے میں بلوا لیا۔ اب تک کا ہمارا سفر بخیر و عافیت طے ہوا تھا۔ ہمارے ہمسفر ریلوے کے ایک اہلکار نے مجھے بتایا کہ شام ساڑھے پانچ بجے ہم جمشید پور پہنچ جائیں گے۔ یہ ٹرین اگرچہ ہوڑا (کلکتہ) تک جاتی ہے لیکن پروگرام کے مطابق ہمیں جمشید پور سے پسنجر ٹرین پکڑنی ہے۔ ہمارے پاس چونکہ بہت زیادہ اسلحہ تھا اس لیے ٹرین کی تبدیلی کے دوران یہ اسلحہ قلیوں اور ریلوے پولیس کی نگاہ میں بھی آ سکتا تھا۔ میں نے اس اہلکار کو کہا کہ وہ جمشید پور جنکشن سے اسی ٹرین سے ہمارے لیے کلکتہ تک کے ٹکٹ خریدے۔ مستان کے حکم کے مطابق اسے دوران سفر میری ہدایات پر عمل کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے پیسے دیے اور جمشید پور سے وہ ہمارے لیے کلکتہ تک کے ٹکٹ خرید لایا، چونکہ اب زیادہ سفر باقی نہیں تھا اور مستان کا خوف بھی تھا لہٰذا ان سب اہلکاروں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں کلکتہ اسٹیشن سے باہر چھوڑ کر ہی وہ واپس جائیں گے۔ رات ساڑھے دس بجے ہماری ٹرین ہوڑا پہنچی اور ہم سب نے اسٹیشن سے باہر آ کر ٹیکسیاں لیں اور ریلوے کے اہلکار واپس اسٹیشن پر چلے گئے۔ میری عادت ہے کہ عین موقع پر میں پہلے سے طے شدہ پروگرام تبدیل کر لیتا ہوں۔ میں نے پہلے والے ہوٹل میں ٹھہرنے کے بجائے اسٹیشن پر لگے اشتہاری بورڈ پڑھ کر ایک فور اسٹار چندا ہوٹل میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ہوٹل میں بھی ہم نے بھارتی اور ہندوانہ ناموں سے اسٹیشن پر اپنے کارڈ بھرے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے وقت دیکھا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے اس وقت مستان کے نمائندے کو فون کرنے کے بجائے بمبئی میں مستان کے خفیہ نمبر پر اسے فون کیا اور خیریت سے یہاں پہنچنے کا بتاتے ہوئے کہا کہ میں اس کے نمائندے کو صبح فون کروں گا اور وہ یوسف کو بھی بتا دے کہ ہم بخیر و عافیت یہاں پہنچ گئے ہیں۔ مستان نے کہا کہ اس کے نمائندے کو میں ابھی فون کر دوں ورنہ وہ رات بھر ہمارے انتظار میں جاگتا رہے گا۔ میں نے اس کے نمائندے کو فون پر اپنے پہنچنے اور ہوٹل کا نام بتایا تو اس نے کہا کہ تمام انتظام مکمل ہے اور صبح دس بجے وہ مجھے ملنے ہوٹل آئے گا۔

اگلے روز دس بجے مستان کا نمائندہ چندا ہوٹل میں آیا اور ہاؤس فون سے مجھ سے اجازت لے کر میرے کمرے میں آ گیا۔ یہ ریحان نامی بنگالی مسلمان تھا۔ مجھے اس نے بتایا کہ اس نے ایک چھوٹے اسٹیمر کا انتظام کر رکھا ہے۔ حفاظتی نقطۂ نظر سے اس نے اسٹیمر کے مالک کپتان کو صرف یہ بتایا

ہے کہ بنگلہ دیش جانا ہے۔ مخصوص مقام ہرن گھاٹا کا جہاں آپ نے جانا ہے اسٹیمر کی روانگی کے وقت اسے بتایا جائے گا۔ ریحان نے مجھے کہا کہ باوجود ہر کوشش کے اسے کوئی ایسا مناسب اسٹیمر نہیں مل سکا جس کا مالک اور کپتان مسلمان ہو لہٰذا مجبوراً اس ہندو کو زیادہ رقم دے کر آپ کو لے جانے پر تیار کیا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ مستان سیٹھ کے مہمان ہیں۔ یہ بتانے سے وہ جانے سے ہی انکار کر دیتا۔ اسٹیمر کا کل عملہ بمعہ کپتان چودہ افراد پر مشتمل ہے اور اس اسٹیمر پر 6 عدد چھوٹے کیبن بھی بنے ہوئے ہیں۔ جن میں آپ کی رہائش ہوگی۔ اس کے علاوہ دوسرے کیبن کپتان جو اسٹیمر کا مالک بھی ہے کے لیے اور اس کے نائب کے لیے ہیں۔ ہندوؤں کے مزاج اور مسلمان دشمنی کو آپ یقیناً جانتے ہوں گے اس لیے آپ دوران سفر محتاط رہیں۔ کل صبح سات بجے ہماری لانچیں آپ کو Outer Ancher (کھلے سمندر) میں اس مقام پر لے جائیں گی جہاں اسٹیمر لنگر انداز ہوگا۔ ساحل سے لانچوں پر اس لیے جانا ہوگا کیونکہ آپ اور آپ کے ہمراہیوں کے پاس پاسپورٹ نہیں ہیں اور سیر کے بہانے آپ لانچوں پر جائیں گے۔ ہماری ایک مخصوص لانچ آپ اور آپ کے ساتھیوں کا سامان لے کر ساحل سے آپ کی روانگی سے پندرہ منٹ پہلے چل پڑے گی۔ میں آپ کے ساتھ اسٹیمر تک جاؤں گا۔ آپ نے جو اسلحہ میرے پاس بمبئی جانے سے قبل رکھوایا تھا وہ بھی سامان والی لانچ میں جائے گا۔'' ریحان نے جب اپنی ساری کارگزاری بیان کر دی تو میں نے اسے کہا کہ حاجی مستان نے اپنے تین آدمی ہمیں ہرن گھاٹ تک چھوڑنے کے لیے بھیجے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ان کی ضرورت نہیں اس لیے کل صبح ہماری روانگی کے بعد انہیں واپس بمبئی بھیج دیا جائے۔ ریحان نے کہا کہ میں اپنے ہاتھ سے ان کی واپسی کا لکھ کر دوں ورنہ مستان سیٹھ ان کا حشر نشر کر دے گا۔ میں نے وہیں ہوٹل کے لیٹر پیڈ پر مستان کے نام خط لکھ کر ریحان کو دیا جس میں اپنی خواہش کے مطابق اس کے بھیجے ہوئے محافظوں کو یہیں سے واپس جانے کا تحریر کیا۔ ریحان مجھ سے اجازت لے کر ہماری روانگی کی مزید تیاریوں کے لیے چلا گیا۔ اس نے کہا کہ اگر سمندر پرسکون رہا تو روانگی کے تیسرے روز ہم ہرن گھاٹا پہنچ جائیں گے۔ چوڑے پیندے کے یہ اسٹیمر ساحل سے سات آٹھ میل کے اندر ہی چلتے ہیں اور زیادہ گہرے سمندر میں نہیں جاتے۔ ریحان کے جانے کے بعد میں نے قیصر کو اپنے کمرے میں بلوایا اور کہا کہ تمام ساتھیوں کو کل صبح روانگی کے متعلق بتا دے۔ اسٹیمر کے کپتان کا ہندو ہونے کا سن کر مجھے ایک بات سوجھی اور میں نے نمبر ٹو، قیصر اور رضی کو اپنے کمرے میں بلوا کر کہا کہ اسٹیمر پر رضی خود کو ہمارے گروپ کا لیڈر بتائے کیونکہ اسٹیمر کا کپتان اور دوسرا عملہ آپس میں بنگالی زبان میں باتیں کریں گے اور رضی بحیثیت گروپ لیڈر کے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزار سکتا اور ان کی باتیں سمجھ سکتا ہے۔ رضی خود کو بنگالی زبان سے ناآشنا بتائے۔ اب تک بھارتی ہندوؤں کے ساتھ گزارے ہوئے وقت اور پیش آئے واقعات کے باعث میں کسی سانپ پر تو بھروسہ کر سکتا تھا لیکن بھارتی ہندو پر نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اسٹیمر پر پہنچتے ہی تمام ساتھی اپنا اپنا اسلحہ تیار

حالت میں رکھیں اور اسٹیمر پر دوران سفر کم از کم دو دو کی ٹولی میں گھومیں اور ہمہ وقت چوکنے رہیں۔ اس میٹنگ کے تھوڑی دیر بعد ہی سپنا نے مجھ سے فون پر اجازت لی اور میرے کمرے میں آ گئی۔ اس نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں لیکن اس کی آنکھوں سے مسلسل ایک سوال جھلک رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کی بات زباں پر لا کر خود پیش قدمی کی تھی لیکن اب اس پر عورت کی فطری حیا غالب تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ اب میں خود اس موضوع کا آغاز کروں۔ میں نے اس کے دل کی بات سمجھتے ہوئے کہا ''دیکھو سپنا جو خواب تم دیکھ رہی ہو اس کی تعبیر الٹ بھی ہو سکتی ہے۔ حالات کے پیش نظر میں نہ تو تمہیں فوری طور پر کوئی حتمی جواب دے سکتا ہوں اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ تم جذبات کے دھارے میں بہہ کر زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلد کرو۔ سوچ سمجھ کر اور ہر پہلو کو پیش نظر رکھ کر جو فیصلہ کیا جاتا ہے وہی درست اور دیرپا ہوتا ہے۔ وقت کی ٹھوکروں نے مجھے اپنے جذبات پر قابو پانا سکھا دیا ہے۔ میں اب تم سے صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ ہرن گھاٹا پہنچ کر میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔ تم میرے ساتھ ہی ہو اور قدرت کو جو منظور ہوا وہ سامنے آ جائے گا۔ جوانی میں قدم رکھتے ہی تم نے مردوں کی زیادتیاں اور چیرہ دستیاں دیکھی ہیں اب دارجلنگ میں تم اپنے منیجر اور رشتہ داروں کی بے ایمانی اور بددیانتی سے تم خود کو بے سہارا سمجھ رہی ہو اور تمہیں اس وقت مظبوط بازوؤں کے سہارے کی ضرورت ہے۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ تمہاری یہ ضرورت بھی پوری ہو جائے۔'' سپنا نے بڑے تحمل سے میری بات سنی۔ میں نے شاید اس کے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر جانے کے لئے پلٹی لیکن دو تین قدم اٹھانے کے بعد ہی دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہنے لگی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اچھی طرح رو لے تاکہ اس کے دل میں چھپا غبار نکل جائے اور وہ ذہنی طور پر ہلکی ہو جائے۔ میں نے اسے دھیرے سے الگ کیا اور صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ جب اس کا رونا تھما تو میں نے کہا کہ ہم کل صبح یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ ہم نے ہرن گھاٹا سے بنکاک اور پھر پاکستان جانا ہے۔ لہٰذا وہ ابھی قیصر اور نمبر ٹو کے ساتھ جا کر اپنے لیے کپڑے اور ضرورت کی اشیا خرید لے۔ میں نے اسے بیس ہزار روپے خریداری کے لئے دئے۔ میں چاہتا تھا کہ اس طرح شاید سپنا کا دھیان بٹ جائے۔ میرے تمام ساتھی بھی کلکتے کی آخری بار سیر کے لیے سپنا، قیصر اور نمبر ٹو کے ہمراہ نکل کھڑے ہوئے۔ بعد دوپہر یہ سب واپس لوٹے اور اپنی اپنی خریداری دکھانے میرے کمرے میں آ گئے۔ سپنا کو کلکتے میں صرف ساڑھیاں اور جوتے ہی مل سکے۔ اس نے بڑا نفیس قسم کا زیور بھی خرید لیا تھا۔ قیصر اور باقی ساتھیوں نے اپنے ضرورت کا سامان خریدنے کے علاوہ کشمیری بازار سے اپنے اپنے اسلحوں کے لیے کور بھی خرید لے لیے تھے۔ غرضیکہ شام تک ہم روانگی کے لیے بالکل تیار ہو چکے تھے۔ میں نے مستان کو فون کر کے بتایا کہ ریحان نے کل صبح ہماری روانگی کا انتظام کیا ہے اور میں آئندہ بنکاک سے اسے فون کروں گا۔ مستان نے بمبئی کے متعلق بتاتے ہوئے کہا کہ

ہندو مسلم فساد میں شدت پیدا ہوچکی ہے اور یہ فساد پھیل کر احمد آباد تک جا پہنچا ہے۔ اس کے اور یوسف پٹیل کے معلوم ٹھکانوں کی زبردست نگرانی ہورہی ہے۔ چونکہ گو کھلے کے معاملے میں ہم ظاہری طور پر ملوث نہیں ہیں اس لیے ہم پر تو ہاتھ ڈالنے کی پولیس اور خفیہ والوں نے جرأت نہیں کی لیکن ہمارے پاس پر آنے جانے والے سے وہ باہر ہی باہر پوچھ گچھ کررہے ہیں۔ تصویری خاکوں سے مشابہت رکھنے والے کئی پٹھانوں کو بھی حراست میں لے لیا گیا ہے اور میرے اور یوسف کے مقرر کردہ وکیل انہیں پولیس کی حراست سے چھڑوانے میں دن رات مصروف ہیں۔ ''فسادات میں آٹھ مسلمان اور پینتیس سے زیادہ ہندو ہلاک ہوچکے ہیں اور ان سے دوچند گھائل ہسپتالوں میں ہیں۔ شیوسینا والوں کو اس بار منہ کی کھانی پڑی ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے حملہ آور گروہوں کو اکثر چھریاں اور خنجر مار کر گٹروں میں پھینک دیا ہے۔'' (بمبئی کے گٹروں کا قطر ایک منزلہ مکان سے بھی بڑا ہے) میں نے مستان کو کہا کہ حالات کچھ ایسے ہیں کہ شاید مجھے بہت جلد دہلی اور بمبئی آنا پڑے اور اگر ایسا ہوا تو میرے حلیے سے بڑے سے بڑا نظر شناس اور تجربہ کار انسان بھی مجھے پہچان نہیں پائے گا۔ یوسف پٹیل کا میری طرف سے شکریہ ادا کرنے کا کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔

اگلی صبح ساڑھے چھ بجے صبح ہی ہم سب اپنے ہوٹل سے چیک آؤٹ ہوئے اور ٹیکسیاں (جنہیں ریحان نے پہلے ہی بک کر رکھا تھا) ہمیں لے کر روانہ ہوگئیں۔ کلکتے کی صبح ہر ساحلی شہر کی طرح دھند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ٹیکسیاں ہمیں ایک ایسے ساحل پر لے گئیں جہاں صرف چار لانچیں کھڑی تھیں۔ ایک لانچ میں ہمارا سارا سامان لادا گیا اور باقی تین لانچوں میں ریحان بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر سمندر میں اس سمت روانہ ہوا جہاں اسٹیمر کھڑا تھا۔ ساحل سے اسٹیمر تک کا سفر ایسا Out of the way (عام راستے سے مختلف) تھا کہ بغیر کسی قسم کی چیکنگ اور کوسٹ گارڈ کی نگاہوں میں آئے بغیر ہم بخیریت اسٹیمر تک پہنچ گئے۔ میرے ساتھیوں نے سارا سامان اسٹیمر میں منتقل کیا۔ ریحان نے میری ہدایت کے مطابق رضی کو گروپ لیڈر کے طور پر کپتان سے متعارف کروایا اور ہمیں الوداع کہہ کر لانچ میں واپس چلا گیا۔ اسٹیمر نے لنگر اٹھایا اور تیزی سے مقررہ سمندری حد پر جاکر بنگلہ دیش کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایک دو برتھوں والے کیبن میں میرا سامان رکھ دیا گیا۔ میں اسٹیمر کا جائزہ لینے کے لیے عرشے پر آیا تو دیکھا کہ رضی پہلے ہی کپتان کے ساتھ کھڑا ہے۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔ دونوں نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ میری ہدایت کے مطابق رضی کپتان سے اردو میں بات کررہا تھا اور کپتان بنگالی اور ہندی ملی اردو میں جواب دے رہا تھا۔ رضی نے اس سے سفر کے دوران خوراک کے متعلق پوچھا تو کپتان نے کہا کہ زیحان (ریحان) صاحب آپ سب کے لیے کھانے پینے کی اشیا کا خاصا ذخیرہ اسٹیمر میں صبح ہی بھجوا چکے ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر اسٹیمر کے انجن روم کی طرف جانے لگا تو کپتان نے سخت لہجے میں مجھے کہا ''ادھر جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' میں خاموشی سے پلٹ آیا۔ میری چھٹی حس

کہہ رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ میں نے قیصر کو جو کیبن کی گھٹن سے پریشان ہوکر عرشے پر آگیا تھا کہا کہ سارے ساتھیوں کو جاکر کہہ آئے کہ اپنا اپنا سلحہ لے کر تیار رہیں۔ میں نے قیصر کو کہا ''مجھے ایسے محسوس ہورہا ہے کہ انجن روم میں کوئی ایسی بات ہے جسے کپتان ہم سے چھپانا چاہتا ہے اور میں صرف اسی انتظار میں ہوں کہ اسٹیمر کلکتے سے اتنا دور نکل آئے جہاں سے کوسٹ گارڈ کی رینج ختم ہوجاتی ہے۔ پھر ہم انجن روم میں جاکر وہاں کا جائزہ لیں گے اور اگر سب ٹھیک نہ ہوا تو اسٹیمر کی وائرلیس سسٹم اور نیویگیشن کنٹرول پر قبضہ کرکے کپتان کو اسلحے کی نوک پر مجبور کریں گے کہ کوئی ہیرا پھیری کیے بغیر ہمیں سیدھا ہرن گھاٹ لے جائے۔'' میں اپنی جیکٹ گرمی کے باعث کیبن میں ہی اتار آیا تھا جس میں میرا پسٹل اور ریوالور تھے۔ جیکٹ لینے کے لیے میں کیبن میں گیا تو دیکھا کہ سپنا نے کیبن کی دوسری برتھ سنبھال رکھی ہے۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی وہ بولی۔ ''دوسرے کیبنوں میں غیر مردوں کے ساتھ رہنے کے بجائے میں آپ کے کیبن میں آگئی ہوں۔ اگر آپ کو میرا یہاں رہنا پسند نہیں تو میں عرشے پر سارا وقت گزارنے کو ترجیح دوں گی۔'' میرے پاس اس کی اس دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے اسے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں، اپنی جیکٹ اٹھائی اور عرشے پر آگیا۔ اسٹیمر کلکتے سے اتنا آگے بڑھ آیا تھا کہ اب دور ساحل پر ریت اور ناریل کے اکا دکا درخت ہی دکھائی دیتے تھے۔ سورج بھی سروں کے عین اوپر پہنچ چکا تھا۔ رضی عرشے پر ایک بینچ پر بیٹھا تھا اور میرے تمام ساتھی ایک ایک کرکے اپنے چھوٹے اسلحے اور JCO سٹین گن کو لباس میں چھپائے عرشے پر آگئے۔ میں نے نمبر ٹو کو کہا کہ ٹھیک دو بجے ہم انجن روم میں جائیں گے۔ اس لیے ساتھیوں کو بتادے کہ تیار رہیں۔ ٹھیک دو بجے میں قیصر اور JCO کے ساتھ انجن روم کے داخلے کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ دروازے کے باہر عرشے پر اسٹیمر کے دو کارکن کھڑے تھے۔ انہوں نے بنگالی میں پوچھا کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ میں نے انگریزی میں کہا ''انجن روم میں'' عرشے پر ہی ایک بلند کیبن میں اسٹیمر کا نیویگیشن سسٹم اور ملحقہ کیبن میں وائرلیس سیٹ نصب تھا اور کپتان اسٹیمر کے کنٹرول کے پہیے کو تھامے کھڑا تھا۔ اسٹیمر کے ملازموں نے چلا کر اسے کہا کہ یہ لوگ انجن روم میں جانا چاہتے ہیں۔ کپتان وہیل اپنے نائب کے سپرد کرکے فوراً ہمارے پاس آگیا اور بنگالی میں گالی دے کر کہنے لگا۔ ''تم شالا ادھر کیسے جاسکتا ہے۔ یہاں سے دفع ہوجاؤ۔'' یہ الفاظ کپتان کے منہ سے نکلے اور میں نے پوری طاقت سے ایک گھونسہ اس کے داہنے رخسار پر مارا۔ وہ عرشے پر گر گیا اور اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ شاید اس کا کوئی دانت وانت ٹوٹ گیا تھا۔

کپتان کو میرا گھونسہ لگتے اور گرتے دیکھ کر میرے ساتھیوں نے میرے کچھ کہے بغیر ہی Sensitive Points (حساس مقامات پر) اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ قیصر بھاگتا ہوا نیویگیشن روم میں گیا اور نائب کپتان کو اپنے ریوالور کی زد میں لے لیا۔ رضی نے ایک ساتھی کے ساتھ اسٹیمر کے کارکنوں اور کیبنوں اور کچن میں کام کرنے والوں پر اپنی رائفلیں تان لیں اور انہیں بالکل خاموش رہنے

اور اپنی اپنی جگہ پر خاموش رہنے کا حکم دیا۔ JCO اور دو ساتھی میرے ساتھ کھڑے تھے۔ انہوں نے کپتان کو جو ہکا بکا سراسیمہ اور انتہائی دہشت زدہ دکھائی دے رہا تھا، کھڑا ہونے کا کہا۔ وہ اپنے چہرے کو ایک ہاتھ سے تھامے فوراً ہی کھڑا ہوگیا۔ ایک ساتھی نے جہاز کے دونوں کارکنوں کو جو انجن روم کے دروازے پر کھڑے تھے، سر پر ان کے ہاتھ رکھوا کر الٹا دیا اور کپتان کو آگے لگائے ہوئے میں، JCO اور ایک ساتھی انجن روم کی سڑھیاں اُترنے لگے۔ انجن روم میں دو انجینئرز اور دو انجن آپریٹر، انجن کی دیکھ بھال اور شافٹ کے انجن کے جوڑ پر آئلنگ کر رہے تھے۔ یہاں اچھی خاصی گرمی اور حبس تھا۔ اور دیواروں اور چھتوں پر لگے پنکھے پوری افتاد سے چلتے ہوئے بھی اِس گرمی کو کم کرنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ ظاہری طور پر انجن روم میں کوئی ایسی بات دکھائی نہ دیتی تھی جس کی وجہ سے ہمیں انجن روم میں داخلے سے روکا گیا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا تو سیڑھیوں کے خاتمے کے بالکل ساتھ بائیں جانب ایک دروازہ دکھائی دیا۔ میں نے اپنا پسٹل اور ریوالور دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھے تھے۔ JCO نے اپنی اسٹین گن سے آپریٹروں اور انجینئروں کو اشارے سے کہا حسب معمول خاموشی سے اپنے کام میں مشغول رہیں۔ میرے ساتھی نے کپتان کو کور (Cover) کیا ہوا تھا۔ میں نے بند دروازے کو زوردار کک ماری اور اس کے دونوں پٹ کھل گئے۔ اس ورکشاپ میں ایک لیتھ مشین اور دوسری مشینی اوزاروں کے درمیان دو بنچوں پر پسینے میں بھیگی وردیاں پہنے ایک پولیس انسپکٹر، پولیس کے دو سپاہی اور چار بھارتی فوجی جن میں ایک کیپٹن، ایک JCO اور دو جوان بیٹھے تھے۔ سپاہیوں کی رائفلیں اور جوانوں کی اسٹین گنیں ورکشاپ کی دیوار کے پاس پڑی تھیں اور کیپٹن، JCO اور پولیس انسپکٹر کے سائیڈ آرمز (پستول۔ ریوالور) ان کی کمروں میں بندھے ہولسٹروں میں تھے۔ ورکشاپ کے اندر میں اکیلا تھا اور یہ چھ اور بمعہ اسلحے میرے پاس سوچنے سمجھنے یا ساتھیوں کو بلانے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اپنے ریوالور اور پسٹل سے بیک وقت ان سب پر تابڑ توڑ گولیاں برسائیں اور اپنے دونوں اسلحوں کے ٹریگروں پر میری انگلیوں کا دباؤ تب کم ہوا جب جب دونوں کی آخری گولیاں بھی فائر ہوگئیں۔ میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اس وقت میرے دل و دماغ پر فوج کا یہ بنیادی مقولہ ہی قابض تھا Kill your enemy before he kill you (اپنے دشمن کو اس سے پہلے ہلاک کر دو کہ وہ تمہیں ہلاک کرے) انجن روم میں گولیاں چلنے کی آواز سن کر JCO نے ساتھی کو انجن روم کے اسٹاف کو کور کرنے کا کہا اور کپتان کو لیے ورکشاپ میں آگیا۔ میرا ریوالور اور پسٹل بالکل خالی تھے۔ میں نے JCO سے اس کی سٹین گن لی اور کپتان کو اوندھے منہ لیٹنے کا حکم دیتے ہوئے JCO کو کہا کہ سب سے پہلے فوجی کپتان، JCO اور انسپکٹر پولیس کے سائیڈ آرمز نکالے اور جوانوں کی رائفلیں اور اسٹین گنیں ورکشاپ میں ہی محفوظ جگہ رکھ کر تب ان سب کی حالت دیکھے کہ مرچکے ہیں یا صرف زخمی ہوئے ہیں۔ ان کو گولیاں لگنے کے باعث درد سے ان کی چیخوں سے ورکشاپ کے چھوٹے کمرے کی فضا میں اتنا شور بپا تھا کہ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ

کون زندہ ہے اور کون زخمی۔ JCO نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سب کا اسلحہ ورکشاپ کے دروازے کے قریب رکھ دیا اور پھر ان میں سے ہر ایک کے پاس جاکر اور اچھی طرح ٹٹول کر اپنی تسلی کرتے ہوئے میرے پاس آکر خالص فوجی انداز میں بولا۔ ''دو جوان مر چکا ہے اور چار زخمی ہے۔'' اس نے بھی فوجیوں کی ایک اسٹین گن اُٹھا لی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ عرشے پر جائے اور جہاز کے دونوں ملازمین جو دروازے پر موجود ہیں انہیں اور ان کی نگرانی کرنے والے ساتھی کو یہاں لے آئے۔ JCO پانچ منٹ میں ان تینوں کو لے کر ورکشاپ میں آگیا اور میرے حکم کے مطابق بیس منٹ میں دو مردہ اور چار زخمیوں اور ان کے اسلحے کو عرشے پر پہنچا دیا گیا۔ انجن روم میں کام کرنے والوں کو میں نے چلاتے ہوئے کہا (انجنوں کے چلنے سے وہاں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی) ''اپنا کام معمول کے مطابق اور خاموشی سے کیے جاؤ اگر ذرا سی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تمہارا حشر بھی ان ہلاکتوں کی طرح ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے نگرانی کرنے والے ساتھی کو اپنی سٹین گن دی اور اس طرح اونچی آواز میں اسے کہا کہ اگر کوئی زیادہ سمجھداری دکھانے کی کوشش کرے تو اسے گولیوں سے بھون دینا۔ یہ ہدایت دے کر میں کپتان کو ساتھ لیے عرشے پر جانے والی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ مجھے دو فائروں کی آواز آئی۔ پھر عرشے پر پہنچے تو میں نے دیکھا کہ بھارتی JCO عرشے پر اپنے اسلحے کے ڈھیر کے قریب ہی مرا پڑا ہے اور ہمارے JCO کی اسٹین گن سے دھواں نکل رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر JCO میرے قریب آیا اور بولا ''سر! اس کے کندھے میں گولی لگی تھی۔ مجھے اپنی طرف سے غافل سمجھتے ہوئے یہ اچانک اٹھ کر اپنے اسلحے کی طرف بھاگا۔ میں نے اسے ہالٹ (رُکو) کہا لیکن یہ نہ رکا لہٰذا میں نے اس پر دو فائر کردیے'' اب ہمارے سامنے تین لاشیں اور تین زندہ، ایک بھارتی فوج کا کیپٹن، ایک انسپکٹر پولیس اور ایک فوجی جوان موجود تھے۔ میں نے چونکہ بغیر صحیح نشانہ لیے ان پر فائر کیے تھے اس لیے صرف دو جوانوں کے سینوں پر گولیاں لگی تھیں جو موقع پر ہی ہلاک ہوگئے اور اب بھارتی JCO بھی مرچکا تھا۔ کیپٹن کے بازو میں اور پولیس انسپکٹر کے پیٹ کے دائیں جانب اور فوجی جوان کے بازو میں گولیاں لگی تھیں۔ میں نے بھارتی کیپٹن اور پولیس انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ اسٹیمر پر اپنے آنے کی بالکل صحیح وجہ بتادیں تو شاید میں ان کے ساتھ نرمی برتوں۔ کیپٹن نے اپنا نام اور نمبر بتاتے ہوئے کہا ''جنیوا کنونشن کے مطابق میں صرف اپنا نام اور نمبر ہی بتاسکتا ہوں اور جنگی قیدی کی حیثیت سے میرے ساتھ جنیوا کنونشن کے چارٹر کے مطابق سلوک کیا جائے'' میں نے اسے کہا ''تم ملکی جنگ میں قیدی نہیں بنے بلکہ سازش کے تحت اس اسٹیمر پر سوار ہوئے ہو اور مجھے وہ سب طریقے آتے ہیں جن سے تم سچ بولنے کو خوشی سے مان جاؤ گے۔ میں تمہیں پانچ سیکنڈ دیتا ہوں۔ اس مہلت میں فیصلہ کرلو کہ خود بولوگے یا ہمیں بلوانا پڑے گا۔'' عرشے پر فائروں کی آواز سن کر دونوں بنگلہ دیشی فوجی جوان اور سپنا بھی عرشے پر آچکی تھی۔ ٹھیک پانچ سیکنڈ کے بعد میں نے اپنے JCO کو کہا کہ اپنے جوانوں کو حکم دے کہ کیپٹن کے

زخمی بازو پر پاؤں رکھ کر اسے توڑ دیں۔ مجھے DMI کی حراست کے دوران خود پر بھارتی کتوں کے کیے ہوئے تشدد کا ایک ایک لمحہ یاد تھا اور یہ میری آرزو تھی کہ اس سے بڑھ کر ان پر تشدد کروں تا کہ میرے انتقامی جذبے کو تسکین مل سکے لیکن اس کیپٹن نے میری یہ آرزو بھی پوری نہ ہونے دی۔ زخمی بازو پر دباؤ پڑتے ہی وہ چیخنے چلانے اور منتیں کرنے لگا کہ اسے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ وہ سب کچھ سچ سچ بتا دے گا۔ میرے کہنے پر جوانوں نے اس کے بازو کو چھوڑا۔ کیپٹن نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ اسے پانی پلایا گیا تو وہ بولا۔ ''میں آفیشل ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔ میں پونا میں 39 ماؤنٹین ڈویژن میں ہوں۔ گوکھلے اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے بعد جو تصویری خاکے شائع ہوئے اس میں آپ کا خاکہ ہماری فائل میں محفوظ آپ کی ان تصاویر سے بالکل ملتا تھا جو DMI دہلی سے آپ کے فرار کے بعد نہ صرف اخبارات میں شائع ہوئی تھیں بلکہ تمام ڈویژن اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بھی بھیجی گئی تھیں۔ میں فائل کی تصویریں لے کر اپنے بٹ مین اور ایک جوان کے ساتھ دو ہفتے کی چھٹی لے کر بمبئی آیا اور پولیس کمشنر کو فائل کا فوٹو دکھایا۔ گوکھلے کے قتل کے بعد ایک بھارتی تنظیم نے آپ کی زندہ یا مردہ گرفتار کے لیے بیس لاکھ انعام رکھا ہے۔ بمبئی پولیس کو یقین تھا کہ آپ بمبئی کے کسی مسلمان اسمگلر گروپ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ پولیس کہ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آپ لانچوں کے ذریعے بمبئی سے جا رہے ہیں۔ پولیس کے ساتھ مل کر ہم نے گھاس بندر پر چھاپہ مارا تو آپ یا کوئی لانچ بھی وہاں موجود نہیں تھی۔ اسی دوران دوسرے نمبر کے ذریعے پولیس کو اطلاع ملی کہ آپ کسی دوسرے ذریعے سے بمبئی سے نکلیں گے۔ ہم آپ کو تلاش کرتے رہے لیکن ناکامی ہوئی۔ پھر اچانک ہمیں خبر ملی کہ آپ کلکتہ کے کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بمبئی کے پولیس کمشنر اور میں نے انعامی رقم آدھی آدھی بانٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا چنانچہ کلکتے آتے وقت اس نے انسپکٹر چرناور اور دو سپاہی ہمارے ساتھ بھیجے۔ ہم تو کلکتے کے بے شمار ہوٹلوں میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیں گے۔'' میں نے انسپکٹر سے پوچھا تو اس نے کیپٹن کے بیان کی تائید کی۔ مجھے ان سے مزید کچھ نہیں پوچھنا تھا۔ میں نے JCO سے مشورہ کیا اور JCO نے میرا اشارہ پاتے ہی ان تینوں پر انہی کی سٹین گن سے گولیاں برسا کر ان کو ختم کر دیا۔ اسٹیمر اب پوری طرح میرے کنٹرول میں تھا۔ ہر جہاز کی طرح اسٹیمر میں بھی ورکشاپ ہوتی ہے جس میں کوئلے سے جلنے والی بھٹی ہوتی ہے اور اس بھٹی میں جلتی آگ میں گرم کر کے اسٹیمر کے ٹوٹے اور خراب ہوئے پرزوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ اسٹیمر کے ملازمین نے میرے حکم پر ان کی وردیاں اتار لیں اور انجن روم کی آگ میں انہیں جلا ڈالا۔ مرنے والے سب ہندو تھے لہٰذا ان سے favour (مہربانی) کرتے ہوئے میں نے ان کی لاشوں کو بجائے سمندر میں پھینکنے کے انجن روم کی بڑی بھٹی میں جلانے کا حکم دیا۔ میرے حکم کی تعمیل کی گئی۔ مجھ پر پھر جنوں طاری ہو چکا تھا۔ میرے دو ساتھی بھٹی کے قریب کھڑے انہیں خاک میں تبدیل ہوتے دیکھتے رہے اور میں عرشے پر چمنی سے ڈیزل کے دھوئیں کے ساتھ ان کی لاشوں کا سفید دھواں دیکھنے میں محو

رہا۔ اس دوران جہاز کی ورکشاپ، سیڑھیوں اور عرشے پر سے سارا خون صاف کر کے اسے دھو ڈالا گیا۔ میں نے رائفلیں تو سمندر میں پھنکوا دیں کیونکہ ہمارے پاس ضرورت سے زیادہ اسلحہ تھا۔ لیکن انکی اسٹین گنیں اور ریوالور میں نے اپنے اسلحے اسٹاک میں رکھوا دیں۔

پے در پے اور برسوں پر محیط خون کی ہولی کھیلتے کھیلتے میری ذہنی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ میں جب بھی اپنے خلاف کوئی سازش یا مجھے گرفتار اور ہلاک کرنے کی پلاننگ کو قبل از وقت جان جاتا تو پھر اپنے خلاف کام کرنے والوں کو زندہ ہرگز نہ چھوڑتا۔ گورکھپور میں ہوائی اڈے کی تباہی سے پہلے ہم نے جو دو گاڑیاں چھینی تھیں ان کے مالکان کو زندہ چھوڑنے کی وجہ سے ہی DMI والے مجھ تک پہنچنے اور گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے تھے اور مجھ پر جتنا تشدد DMI میں کیا گیا تھا اس کی وجہ محض ان گاڑیوں کے مالکان کو زندہ چھوڑنا تھا۔ قارئین مجھے جو کچھ بھی سمجھیں لیکن میں نے اپنی اصل دماغی اور دل کیفیت بیان کر دی ہے۔ جہاز کے کپتان کو جو ان فوجیوں اور پولیس والوں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا، میں نے کہا کہ میرے آدمی ہر وقت نیوگیشن روم میں موجود رہیں گے اور اگر ذرا سی ہیرا پھیری بھی کی گئی تو اس کا حشر بھی ان فوجیوں اور پولیس والوں جیسا ہوگا۔ وائرلیس پر میں نے چند فائر کر کے اسے ناکارہ بنا دیا۔ کچن میں کھانا تیار کرنے والوں کو میرے ساتھی وہ کھانا پہلے انہیں کھلاتے، پھر کپتان کو اور پھر ہم سب کھاتے۔ میں نے یہ قدم احتیاطاً اٹھایا تھا کہ کہیں یہ سازشی لوگ ہمیں کھانے میں زہر نہ دے دیں۔ ان سے ایسا کرنا کچھ بعید نہ تھا۔ میں ہندو کی فطرت اور اس کی مکارانہ چالوں کو بخوبی جان چکا تھا اس لیے کسی قسم کا کوئی بھی رسک لینے کو تیار نہ تھا۔ میرے مسلح ساتھی انجن روم اور نیوگیشن روم کی ہمہ وقت نگرانی کرتے تھے۔ ادھر جہاز کے سارے عملے کی یہ حالت تھی کہ اجازت لیے بغیر وہ گردن تک نہ موڑتے تھے۔ تیسرے دن کپتان نے لرزتے کانپتے مجھ سے پوچھا کہ ہمیں بنگلہ دیش میں کہاں جانا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہرن گھاٹا کے سامنے کھلے سمندر میں۔ اس دوران میں اور قیصر ایک کیبن میں خاصا وقت اکٹھے گزار کر ایک ایسا کام کر رہے تھے جس کی کسی کو کانوں کان کوئی خبر نہ تھی۔

سترھواں باب

اسٹیمر کا مالک کپتان بھارتی فوجیوں اور پولیس والوں کا حشر دیکھ کر بالکل چوہا بن چکا تھا۔ مجھے گالی نکالنے اور ''شالا'' کہنے والے اس کپتان اور اس کے نائب سے دن میں جتنی بار بھی میرا آمنا سامنا ہوتا، یہ دونوں میرے پاؤں چھوتے۔ میں نے انہیں اس حرکت سے اس لیے منع نہیں کیا کیونکہ جس مذہب کے یہ پیروکار تھے اس میں تو خود اپنے ہاتھ سے پتھر کو تراش کر اور مٹی سے سینکڑوں دیویاں اور دیوتا بنا کر یہ ان کے آگے ماتھا ٹیکتے ہیں۔ میں تو ان پتھروں اور مٹی کے بے جان بتوں کے مقابلے میں زندہ اور اشرف المخلوق تھا اور ان طاقت کی پرستش کرنے والے کو میں نے سجدہ نہیں بلکہ ان کی کمزوری اور پستی کے ان کے اپنے طریقۂ اظہار کی اجازت دی تھی۔ ان کا مذہب بھی عجیب اور ان کی عبادت کے طور طریقے بھی دنیا سے مختلف ہیں۔ یہ صرف طاقت اور دوست کے پجاری ہیں۔ سورج کی حدت اور روشنی سے انہوں نے سورج کو دیوتا مان لیا۔ سانپ کا زہر دیکھا تو ناگ دیوتا، بندر کی درختوں کو چھلانگنے کی طاقت اور پھرتی دیکھی تو ہنومان دیوتا بنا لیا۔ ایک قدیم جادوگرنی جو انسانی خون پیتی تھی اس کی داستان سن کر خون بھری زبان منہ سے باہر نکالے کالی ماتا بنا ڈالی، دولت سے کام سلجھتے دیکھے تو لکشمی ماتا اور راگ راگنیوں سے دل بہلتے دیکھا تو سرسوتی دیوی۔ غرضیکہ دنیا کی کون سی ایسی طاقت ہے جسے ہندوؤں نے اپنا دیوتا اور دیوی بنا کر اس کی پوجا نہ کرتے ہوں۔ ہم وحدہ لاشریک کے ماننے والے جو قادر مطلق ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، ان انسانی ہاتھوں سے بنے ہوئے سینکڑوں بتوں کے پوجنے والوں سے اپنی عزت و توقیر کروانے میں (کم از کم میری سوچ کے مطابق) حق بجانب ہیں۔ میں تو اس انتظار میں ہوں کہ بہت جلد ان کے بھگوانوں اور دیوتاؤں میں ایٹمی طاقت کی پوجا کے لیے ایک اور بت کا اضافہ ہونے والا ہے۔

تیسرے روز صبح دس بجے کے قریب اسٹیمر کے کپتان نے مجھے پیغام بھیجا کہ ہم ہرن گھاٹا کے قریب پہنچ چکے ہیں اور بین الاقوامی سمندر میں ہر گھاٹا کے سامنے ایک اسٹیمر لنگرانداز ہے۔ میں نے چونکہ اپنے اسٹیمر کا وائرلیس سیٹ ناکارہ کردیا تھا اس لیے ہرن گھاٹا والے اسٹیمر سے رابطہ ناممکن تھا۔ میں نے کپتان کو کہا کہ اپنے اسٹیمر کو ایک فرلانگ کے فاصلے پر روک دے۔ سفر کے دوران میں نے قیصر کے ساتھ جس خفیہ کام کی تیاری کی تھی وہ بھی مکمل ہوچکا تھا۔ اسٹیمر ہمارے قبضے میں ہونے کے باعث ہم بلا روک ٹوک ورکشاپ میں جاتے اور اسٹیمر کے ٹولز اور دوسرا سامان استعمال کرتے تھے۔ ہرن گھاٹا سے ہمیں گئے کافی روز بیت گئے تھے اس لیے احتیاط کے پیش نظر میں نے رضی، JCO اور ایک سپاہی کو اسٹیمر کی لائف بوٹ پر اس اسٹیمر پر جانے کا کہا کہ حالات دیکھ کر واپس آکر ہمیں بتائیں تاکہ ہم اپنا اسٹیمر اس کے قریب لے جاسکیں۔ تھوڑی دیر میں ہی JCO سپاہی کو دوسرے اسٹیمر پر چھوڑ کر اور اس اسٹیمر کی ایک لائف بوٹ لے کر واپس آگیا اور کہنے لگا کہ وہاں سب خیریت ہے اور سب لوگ بڑی بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ساتھیوں کو بمعہ سامان دوسرے اسٹیمر پر بھیجا اور قیصر، میں، رضی اور JCO نے سب سے آخر میں جانے کا فیصلہ کیا۔ میں ان تینوں کے ساتھ انجن روم میں گیا اور قیصر نے جو دہلی میں بشیر گیرج والے کا شاگرد اور خود بہت اچھا مکینک تھا) انجن روم سے تیل کا ایک خالی کنستر جو ہم نے دو روز پہلے ہی انجن روم سے اٹھالیا تھا، دونوں ہاتھوں سے تھاما ہوا تھا۔ اس کنستر میں ہم نے قیصر کے ہمراہ لائے چھ دستی بموں اور تقریباً ایک سو پچاس گولیوں کا بارود بھر کر ایک ٹائم بم بنایا تھا۔ ورکشاپ سے تاریں اور گھڑی اتار کر ہم نے اس بم کو آن کرنے سے ٹھیک ایک گھنٹے بعد پھٹنے پر سیٹ کرلیا تھا۔ ٹارچ کے سیلوں سے ٹھیک وقت پر شعلہ نکلنا تھا جس سے بارود نے آگ پکڑنی تھی۔ ہم نے یہ کنستر انجن روم میں تیل کے ٹینک کے ساتھ فٹ کردیا۔ اسے آپ ہماری درندگی کہیں یا کچھ اور نام دیں لیکن ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس اسٹیمر کو بمعہ اس کے تمام عملے سمندر میں غرق کرنا ہے۔ ہم اپنے خلاف کسی طرح کا کوئی ثبوت یا عینی گواہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے جو بھارت جاکر آرمی کیپٹن، پولیس انسپکٹر اور جوانوں کی ہلاکت کا چشم دید گواہ بن سکے۔ اسٹیمر پر سوار ہونے سے پہلے آرمی کیپٹن نے اسٹیمر کے کپتان کو یقیناً بتادیا تھا کہ میں وہی ہوں جو بھارت میں دو سال قبل اچھی خاصی دہشت پھیلانے اور گورکھپور کے ہوائی اڈے کو تباہ کرنے کا ذمہ دار ہوں اور ہمارے گروپ نے ہی گزشتہ دنوں گوکھلے کا بھی خاتمہ کیا ہے۔ اگر بھارتی حکومت کو ہماری صحیح لوکیشن اور سفر کے راستے کا علم ہوجاتا تو وہ بنگلہ دیش اور تھائی لینڈ کی حکومتوں سے ہمیں طلب کرسکتی تھی بلکہ بین الاقوامی سمندری حدود سے بھی اپنی گن بوٹس اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے کمانڈو ایکشن کرکے ہمیں گرفتار یا ہم سب کو سمندر میں غرق بھی کرسکتی تھی۔ بم فٹ کرنے کے بعد اسٹیمر کے کپتان، نائب کپتان اور عملے چودہ افراد کو قیصر اور JCO نے اپنی گنوں سے فائر کرکے

ہلاک کیا اور ہم اس اسٹیمر سے اپنی لائف بوٹ میں اتر آئے۔ قیصر نے بم کو آن کردیا تھا۔ ساتھیوں سے ملنے اور ہماری غیر موجودگی کے دوران پیش آئے واقعات تو بعد میں تحریر کروں گا۔ اس اسٹیمر پر پہنچ کر مجھے سب سے پہلے یہ بتایا گیا کہ اس کے کپتان کا میرے ساتھیوں کے ساتھ رویہ نہ صرف خراب تھا بلکہ اس نے ان کا راشن بھی آدھا کردیا تھا تو میں قیصر اور رضی کو لے کر اس کے پاس عرشے پر گیا۔ اپنی عادت کے مطابق میں نے اس سے کوئی بات کیے بغیر اسے پہلے ایک تھپڑ مارا اور پھر گردن سے پکڑ کر عرشے کے اس جانب لے گیا جس طرف کلکتے والا اسٹیمر کھڑا تھا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑے ہوئے ہی کہا ”اس اسٹیمر کو اچھی طرح دیکھ لو کیونکہ یہ چند منٹ بعد ہی اپنے کپتان اور سارے عملے کی لاشوں سمیت نظروں سے غائب ہونے والا ہے۔“ بم آن کرنے سے اب تک چھیالیس منٹ گزر چکے تھے۔ میرے ساتھیوں نے اپنا اسلحہ ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا۔ ٹھیک چار منٹ بعد اس اسٹیمر میں پہلے ایک دھماکہ ہوا جس کے چند لمحوں بعد ایک بڑا دھماکہ ہوا۔ ہمارے بم کے پھٹنے سے حسب توقع اسٹیمر کے آئل ٹینکس نے بھی آگ پکڑلی تھی اور آئل ٹینکس کے پھٹنے سے اسٹیمر کے پیندے میں نہ صرف سوراخ ہوگیا تھا بلکہ سارے اسٹیمر پر آگ بھڑک اٹھی تھی۔ آدھ گھنٹے سے کچھ کم وقت میں ہی وہ اسٹیمر سمندر میں بمعہ لاشوں کے غرق ہوگیا اور سمندر کی لہروں پر لکڑے کے چند تختے اور پانی پر تھوڑا سا جلتا ہوا تیل رہ گیا۔ ”اگر کبھی میری حکم عدولی کی تو تمہارا تمہارے ساتھیوں اور اسٹیمر سمیت یہی حشر ہوگا۔ یہ بنگالی (بنگلہ دیشی) کپتان ڈر سے تھرتھر کانپتے ہوئے بولا ”سر! تم ہمارا ماسٹر ہے اور گاڈ قسم ہم تمہارا سب حکم مانے گا۔“ معلوم ہوا کہ یہ حضرت بنگلہ دیشی کرسچین تھے اور خود کو ابھی تک انگریزوں کا نمائندہ سمجھتے ہوئے دوسروں سے برتر سمجھتے تھے۔ میری دھمکی اور اسٹیمر کے ڈوبنے کا عملی نظارے کرکے اس کپتان نے بنکاک تک کے سفر کے دوران مجھے یا میرے کسی ساتھی کو شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اصفہانی والوں نے خوراک کی اتنی زیادہ مقررہ اس اسٹیمر پر ذخیرہ کردی تھی کہ مزید ایک ماہ تک ہم سب کے لیے بہت کافی رہتی۔ کپتان نے فوری طور پر اسٹیمر کا سب سے اعلیٰ کیبن جس پر اس کا قبضہ تھا، میرے بغیر کہے میرے لیے خالی کردیا۔ دو گھنٹے بعد بنگلہ دیشی JCO اپنے دو ساتھیوں سمیت کلکتے والی لائف بوٹ سے اپنی واپسی کے لیے تیار ہوچکے تھے۔ میں نے کرنل مزمل کے لیے اس کو ایک خط دیا۔ وہ تینوں ہم سب سے یوں گلے ملے جیسے بچپن کے ساتھی ہوں۔ ہر ایک کو مکھ اور مورنگ قبیلے کے خزانے اور گوکھلے کی دولت میں سے برابر کا حصہ ملا تھا۔ ان تینوں نے کہا کہ وہ واپس جاکر اپنی کمپنی میں رپورٹ کرکے فوری طور پر استعفیٰ دے دیں گے۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ میں پاکستان جاکر بہت جلد ہی بنگلہ دیش اور بھارت جاؤں گا۔ JCO نے کہا کہ آئندہ ایک ماہ کے اندر وہ فوج سے فارغ ہوجائیں گے اور وہ صدق دل سے میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ بنگلہ دیش جاتے ہی اپنے پاسپورٹ بنوائیں۔ میں کرنل مزمل سے مسلسل رابطے میں رہوں گا اور اگر ان تینو

نے اپنا یہ فیصلہ نہ بدلا تو کرنل مزمل کے ذریعے میں انہیں اطلاع دوں گا کہ وہ کس ملک میں کب اور کہاں ملیں۔ اپنی سرکاری رائفلوں اور میرے دیئے گئے ایک ایک ریوالور کے ساتھ وہ روتی آنکھوں سے ہم سے رخصت ہوکر لائف بوٹ میں اتر گئے۔ اس لائف بوٹ کے ذریعے انہوں نے صرف ہرن گھاٹا تک جانا تھا اور پھر وہاں سے کمرشل لانچ پر کھلنا تک کا سفر طے کرنا تھا۔ میں بہت تھک چکا تھا اس لیے قیصر اور نمبر ٹو کو یہ ہدایت دے کر کہ وہ اسٹیمر کے حالات پر نگاہ رکھیں، میں اپنے کیبن میں آگیا۔ اس اسٹیمر پر پہلے سے موجود سب ساتھی ہمارے بھارتی اسٹیمر سے اس اسٹیمر تک آنے اور اس کے غرق ہونے کا عرشے سے نظارہ کررہے تھے۔ میں نے کپتان کو اپنے کیبن میں جانے سے پہلے کہہ دیا تھا کہ لنگر اٹھائے اور ہمیں بنکاک لے چلے۔ رانی نے ایک مرتبہ مجھ سے ملنے کی خواہش کی لیکن میں نے اسے کہلا بھیجا کہ میں اگلے روز اس سے ملوں گا۔ بنگلہ دیشی فوجی ساتھیوں کی لائف بوٹ نگاہوں سے اوجھل ہوئی ہی تھی کہ ہمارے اسٹیمر نے لنگر اٹھا دیا اور مزید کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگا اور اس کا رخ بنکاک کی طرف تھا۔ سپنا بھی رات کے کھانے کے وقت میرے کیبن میں آئی لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ آج رات آرام اور سکون کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ میں نے آج کی رات اپنی زندگی کے کچھ اہم فیصلے کرنے ہیں جن کے لیے مجھ تنہائی اور یکسوئی چاہیے۔ سپنا خاموشی سے واپس چلی گئی۔ میں بستر پر دراز ہوگیا۔ درد سے میرے جسم کا انگ انگ دھک رہا تھا لیکن نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ اس کی وجہ یقیناً یہ تھی کہ مجھے آج رات واقعی کچھ اہم فیصلے کرنے تھے۔

رات کو بستر پر لیٹے ہوئے مجھے جو مسئلہ سب سے زیادہ پریشان کررہا تھا وہ سپنا کا تھا۔ قبیلے کے سردار کو ہمارے ہلاک کرنے کے بعد وہ ہمارے ساتھ ہی چلی آئی تھی اور رانگا ماٹی سے کھلنا اور بھارت میں شانتی پور، کلکتہ اور بمبئی میں قیام کے آخری دو تین دنوں سے پہلے اس نے موقع ملنے کے باوجود وہ نہ تو مجھ سے کبھی اس طرح ملی تھی اور نہ ہی اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ بمبئی سے دہلی روانگی کے وقت بھی جب وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور جارہی تھی، اس نے اس طرح کی کوئی غیر معمولی بات نہیں کی تھی۔ بمبئی دوبارہ آنے کے بعد ہی یکایک اس کے رویے میں یہ تبدیلی آئی۔ قیصر نے حسب وعدہ دہلی سے اس کے ساتھ دارجلنگ جانا تھا لیکن سپنا نے دہلی میں ہی قیصر کو اپنے منیجر اور رشتے داروں کو فون کرکے ان کے اسے نہ پہچاننے اور دارجلنگ جانے پر اسے ہلاک کرنے کا کہا تھا جس پر اس نے دارجلنگ کا پروگرام ہی یکسر موقوف کردیا اور قیصر کے ہمراہ واپس بمبئی چلی آئی حالانکہ سپنا کے بقول اس کے والدین کی دارجلنگ میں کروڑوں روپے کی پراپرٹی اور چائے کے باغات تھے۔ ایک نڈر اور باہمت عورت کا صرف ٹیلی فون پر دھمکی ملنے سے ہی اپنی اتنی بڑی جائیداد کو چھوڑ دینا مجھے عجیب سا محسوس ہورہا تھا۔ سپنا نے اپنے متعلق ہمیں جو کچھ بتایا تھا ہم نے اس پر پورا یقین کرلیا تھا۔ میرے پوچھنے پر قیصر نے سپنا کے متعلق کہا کہ دہلی میں شاپنگ کے لیے وہ اکیلی گئی تھی

اور کئی گھنٹوں بعد جب وہ لوٹی تو اس نے کہا کہ اس نے کسی PCO سے وارجلنگ فون کیے تھے حالانکہ قیصر کے گھر میں بھی فون تھا جسے وہ استعمال کرسکتی تھی۔ ایک لڑکی یا عورت کا مجھ پر یکا یک اس حد تک گرویدہ ہوجانا اور میرے ساتھ دوسرے ملک (پاکستان) جانے اور اپنا مذہب تک تبدیل کرنے پر خوشی سے آمادہ ہونا میرے دماغ میں فٹ نہیں ہورہا تھا۔ میں اس لیے کو جتنا سوچتا اتنا ہی میرا دماغ اس میں الجھتا جاتا۔ میرے سامنے اور بھی کئی مسائل تھے لہٰذا میں نے سپنا کے لیے اپنی تسلی اور تفتیش کو فی الحال ملتوی کرکے دوسرے اہم مسائل پر اپنی توجہ مبذول کی۔ راجہ تری دیو رائے نے بنکاک میں پاکستانی سفارت خانے سے اپنی رانی اور بیٹے کے لیے پاکستانی پاسپورٹ بنوانے کا کہا تھا اور اب میرے ہمراہ ان کے علاوہ رضی، اس کی بیوی، مسز ڈیوڈ، سونیا، سپنا اور قیصر بھی تھے۔ میں خود رابرٹ مائیکل کے نام کے پاسپورٹ پر پہلے تھائی لینڈ میں داخل ہوا تھا۔ کیا سفارت خانے والے ان سب کے پاسپورٹ بنادیں گے اور ان کو اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے کا میں کیا جواز پیش کرسکوں گا۔ عمر اور خن سا کے دو دو افراد دوران سفر ہلاک ہوئے تھے۔ عمر کا ایک اور خن سا کے دو آدمی میرے ہاتھوں اور ایک چکمہ سردار کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ہمارے بنکاک کے ساحل سے اترتے ہی خن سا کو ہماری آمد کی اطلاع مل جاتی تھی۔ اگر ان دونوں نے میرے ان کے آدمیوں کو ہلاک کرنے کے جواز کو تسلیم نہ کیا تو پھر کیا ہوگا۔ حمید نے واپس برما جانا تھا۔ اس کی واپسی کا کیا انتظام ہوگا۔ یہ تو فوری نوعیت کے مسائل تھے۔ اگر میں ان سے بخوبی عہدہ برا ہوجاتا تو کراچی میں مجھے سونیا کے سکول اور ہوسٹل میں رہائش کا انتظام کرنا تھا۔ قیصر نے اگرچہ اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی لیکن اس کا ایک شیرخوار بیٹا، والدہ اور بہن بھائی تھے۔ اگر اس نے پاکستان سے بھارت واپس جانا چاہا تو اس کی کیا صورت ہوگی۔ سپنا اگر میری تحقیق اور تفتیش سے بالکل سچی ثابت ہوئی تو اس وقت میں کیا کروں گا۔ ایسے ہی متعدد سوالات اور مسائل میرے ذہن میں کلبلاتے رہے اور انہی میں کھویا ہوا میں ساری رات جاگتا رہا۔

اگلی صبح ضروریات اور ناشتے سے فارغ ہوکر میں نے رانی کو اپنے کیبن میں بلوایا۔ اس نے آتے ساتھ ہی کہا کہ وہ تو ہمارا انتظار کرتے کرتے تقریباً مایوس ہوچکی تھی۔ اس کے بقول سونیا اس سے بہت مانوس ہوچکی تھی اور پاکستان پہنچ کر اسے پھر ہوسٹل میں اکیلا چھوڑنا اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اپنے لڑکے کے متعلق اس نے بتایا کہ ہمارے جانے کے چند روز بعد تک تو وہ ٹھیک رہا لیکن پھر اس نے پر پرزے نکالنے شروع کردیے اور ایک بار تو اس نے سونیا کو جو رانی کے کیبن میں اس کے زانو پر سر رکھے سورہی تھی، جھٹک کر اٹھایا اور دو تین تھپڑ بھی مارے۔ اس کا رویہ سونیا اور رانی کے ساتھ دن بدن کرخت ہوتا گیا اور اب نوبت یہاں آن پہنچی تھی کہ دونوں ماں بیٹے میں بول چال بالکل بند تھی اور لڑکے نے اسے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ وہ پاکستان پہنچنے پر اپنے باپ کو سونیا اور اپنی

ماں کے متعلق سب کچھ بتادے گا۔ حالانکہ اسٹیمر پر کھلنا روانگی سے پہلے میں نے راجہ کے لڑکے کو اچھی طرح ذہن نشین کروایا تھا کہ سونیا سے اس کی ماں کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور کراچی پہنچتے ساتھ ہی میں اسے اس کے والد اور اپنے دولت کے حوالے کر دوں گا۔ اس وقت تو اس نے میرے کہے پر یقین کرلیا تھا لیکن میری غیرموجودگی میں اپنی ماں کے سونیا کے ساتھ حد سے زیادہ التفات اور محبت نے شاید اسے پھر سے شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے رانی کو کہا کہ اب میں آگیا ہوں اور وہ اپنے لڑکے کی طرف سے فکرمند نہ ہو۔ میں اسے سمجھانے کی پوری کوشش کروں گا اور سونیا کے لیے بھی پاکستان میں ایسا انتظام کردوں گا کہ اسے تنہائی محسوس نہ ہو۔ اسے تسلی دے کر میں جہاز کے کپتان کے پاس گیا اور اسے کہا کہ اسٹیمر کو برما کی سمندری حدود میں ساحل کے اتنے قریب لے جائے جہاں رنگون اور اس کے گرد و نواح والے مچھیروں کی کشتیاں ہوتی ہیں کیونکہ میرے ایک ساتھی کو کسی مچھیرے کی کشتی کے ذریعے برما جانا ہے۔ ہرن گھاٹا سے روانگی کے چوتھے روز ہی ہمیں برمی مچھیروں کی ایک کشتی دکھائی ۔ میں نے حمید کے ساتھ لائف بوٹ میں دو تھائی ساتھیوں کو بھیجا کہ معقول رقم دے کر ان مچھیروں کو حمید کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ کریں۔ دو گھنٹے میں ہی تھائی حمید کو مچھیروں کی کشتی میں سوار کراکر واپس لوٹ آئے اور مجھے بتایا کہ برمی زبان میں حمید نے خود ان سے بات کی تھی اور وہ انہیں اپنے ہمراہ لیجانے پر آمادہ ہوگئے۔ اسٹیمر نے پھر اپنا لنگر اٹھایا اور اب ہم سیدھے بنکاک کی طرف روانہ ہوئے۔ بنکاک جانے کے لیے اسٹیمر کو گہرے پانیوں میں سے گزرنا تھا۔ عیسائی کپتان کافی جہاں دیدہ تھا۔ اس کے بقول اسٹیمر میں گہرے پانیوں میں سمندری طوفان کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی اس لیے اس نے ہواؤں کا رخ اور لہروں سے اندازہ لگانے کے علاوہ وائرلیس پر آئندہ موسمی حالات سے مسلسل آگاہی رکھی اور مزید سات روز کے سفر کے بعد اس نے بتایا کہ ہم بنکاک کی بندرگاہ کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ بجائے بنکاک کی بندرگاہ پر جانے کے اس کے قریب کسی ساحلی حصے پر اسٹیمر کو لے جائے۔ میرے تھائی ہمراہیوں سمیت کسی کے پاس بھی پاسپورٹ نہ تھا اور ہمیں غیرقانونی طور پر تھائی لینڈ میں داخل ہونا تھا۔ تھائی پولیس اور امیگریشن والوں کے متعلق مجھے علم تھا کہ پیسے کے زور پر وہ کوئی بھی ناجائز کام کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں اور پھر خن سا اور بنکاک کے گردونواح میں بھائی خان کا نام لینا ہی کافی تھا لیکن میں اس موقع پر کسی قسم کا خطرہ بھی مول لینے کو تیار نہ تھا۔ بعد دوپہر اسٹیمر ہمیں بنکاک کی بندرگاہ سے قریباً پانچ میل دور ساحل پر ایسی جگہ لے آیا جہاں آس پاس نہ تو کوئی آبادی تھی اور نہ ہی کوئی شخص ساحل پر دکھائی دے رہا تھا۔ اصفہانی کے سربراہ اور چٹاگانگ کے دفتر کے انچارج کے لیے میں نے دو خطوط کپتان کے حوالے کیے اور اسٹیمر کی دونوں لائف بوٹس کے تین پھیروں میں ہم سب بمع سارے سامان اور اسلحے کے ساحل پر پہنچ گئے۔ لائف بوٹس کے واپس پہنچتے ہی اسٹیمر نے لنگر اٹھایا اور بندرگاہ کی طرف روانہ ہوگیا جہاں سے اس نے

واپسی کے سفر کے لیے تیل وغیرہ لینا تھا۔ ادھر ہم اپنا سامان اٹھا کر تیز تیز چلتے ہوئے ساحل سے دور ہوگئے تاکہ کوئی ہم پر غیر قانونی طور پر تھائی لینڈ میں داخلے کا شک نہ کرسکے۔ ہم تقریباً دو میل چلے ہوں گے کہ ہمیں سڑک دکھائی دی۔ ہم نے سڑک کے قریب ہی پڑاؤ کیا۔ نمبرٹو کو میں نے کہا کہ ہم سے قدرے فاصلے پر سڑک پر جاکر کسی گاڑی پر لفٹ لے کر بنکاک جائے اور سری وانگ روڈ پر انٹرنیشنل پلازہ ہوٹل سیان کی دو ویگنیں لے آئے اور ہوٹل انتظامیہ سے ہم سب کے لیے کمرے بک کرنے کا کہے۔ دو ڈھائی گھنٹے میں ہی نمبرٹو دو ویگنیں لے کر آگیا اور ہم سب سورج غروب ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی انٹرنیشنل پلازہ ہوٹل پہنچ گئے۔ میں نے تھائی ساتھیوں کو کہا کہ وہ آج رات ہوٹل میں ہی قیام کریں اور کل تازہ دم ہوکر سنائی گولک جائیں اور عمر خان اور خن سا کے لیے میرے خطوط بھی ہمراہ لے جائیں۔ میں اپنے کمرے میں ابھی غسل کرہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ لائن پر دوسری طرف ایک تھائی نے میرا اصلی نام لیتے ہوئے کہا کہ خن سا نے بخیریت واپس لوٹنے کی مبارک باد دی ہے اور کہا ہے کہ پرسوں بعد دوپہر تین بجے انٹرنیشنل ہوٹل کی لابی میں اس کا نمائندہ مجھے ملے گا میں نے سفید سوٹ اور کوٹ پر سرخ گلاب کا پھول لگایا ہوگا۔ اس سے ملتے وقت میں اپنے تھائی ساتھیوں کو اپنے ساتھ ہی رکھوں۔ یہ ٹیلی فونک پیغام سن کر میں نے نمبرٹو کو بلایا اور کہا کہ خن سا کے حکم کے مطابق انہیں پرسوں تک میرے ہمراہ ہی رہنا ہوگا۔ رات کو کھانے کے بعد میرے کمرے میں سپنا کا فون آیا۔ وہ مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں ہی بلالیا اور اس سے پہلے کہ وہ گفتگو کا آغاز کرے میں نے اسے کہا کہ میں کل دن کو اس سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں اس لیے بعد دوپہر وہ اپنے کمرے میں ہی رہے۔ سپنا نے کہا کہ وہ اس وقت مجھ سے اس لیے ملنا چاہتی تھی کیونکہ سردار کے لڑکے نے تین مرتبہ اسے ہاؤس ٹیلی فون پر کہا ہے کہ وہ میرے کمرے میں آنا چاہتا ہے اور اس کی آواز سے معلوم ہورہا تھا کہ اس نے بے تحاشہ شراب چڑھا رکھی ہے۔ میرے بیرونی مسائل ہی کچھ کم نہ تھے اور سردار کا لڑکا میرے لیے مسلسل سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ میں نے سپنا کو کہا کہ وہ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کرکے رکھے۔ میں سردار کے لڑکے سے ابھی بات کرتا ہوں۔ سپنا کو واپس بھیج کر میں سردار کے لڑکے کے کمرے میں گیا۔ وہاں ایک انجان تھائی اس کے ساتھ بیٹھا مے نوشی میں مشغول تھا۔ سردار کے لڑکے نے اتنی چڑھا رکھی تھی کہ اسے اپنی سدھ بدھ نہ تھی۔ ایسی حالت میں اس سے بات کرنا بے سود تھا۔ میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

اگلے روز دس بجے میں بنکاک کے سنٹرل ٹیلی فون آفس گیا اور پاکستان میں راجہ تری دیو رائے، بمبئی میں حامی مستان اور یوسف پٹیل، کھلنا میں کرنل مزمل اور ڈھاکہ میں صدری اصفہانی کے لیے کالز بک کروائیں۔ جی تو بہت چاہتا تھا کہ اپنے گھروں والوں کی خیریت بھی معلوم کروں۔ میرے

اپنے گاؤں اور گھر میں ٹیلی فون نہ ہونے کے باعث قریبی قصبے بھیرہ میں چند ایسے دوست تھے جنہیں فون کرکے میں اپنے گھروالوں سے رابطہ کرسکتا یا کم از کم اپنی ضعیف والدہ کی صحت اور زندگی اور اپنے گھر کے حالات معلوم کرتا تھا لیکن پے در پے مشکلات، مخالفوں متعدد مقابلوں اور ان کا خون بہانے سے میری ذہنی کیفیت ایسی ہوچکی تھی کہ مجھ میں اتنا بھی حوصلہ نہ تھا کہ اپنے گھروالوں کے متعلق کوئی بھی بری خبر سن سکوں۔ No news is a good news (کوئی خبر نہ ملنا اچھی خبر ہے) کے مطابق میں اپنے گھریلو حالات سے بے خبری تو برداشت کرسکتا تھا لیکن کوئی بری خبر سننے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

صدری اصفہانی سے لائن سب سے پہلے ملی۔ میں نے اس کے اور چٹاگانگ میں ان کے دفتر کے انچارج کے تعاون کا بے حد شکریہ ادا کیا اور اسے بتایا کہ اس کا اسٹیمر ہمیں کل بنکاک میں اتار کر تیل وغیرہ لینے کے لیے بندرگاہ پر چلا گیا ہے۔ اس کے بعد کرنل مزمل سے بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ کھلنا سے ہماری آخری بار روانگی کے بعد جیسور چھاؤنی اور بھارتی تحقیقاتی ٹیموں کے نمائندوں نے اپنی پوری توجہ کھلنا پر مرکوز کردی تھی۔ بھارت میں سرحدی قصبے شانتی پور کے تھانے میں سارے اہلکاروں کے قتل اور ہمارے بردھامن (Barddaman) میں ہمارے پہنچنے کی اطلاع انہیں مل گئی تھی اور اسی کے باعث تحقیقاتی ٹیمیں ہیلی کاپٹر کی تباہی، رفیق کے قتل اور شانتی پور اور پھر بردھامن میں ہماری موجودگی کے باعث ان تمام واقعات کو بھارت میں حکومت مخالف اندرونی گروپوں کی کارروائی سمجھ رہے ہیں۔ JCO اور دونوں فوجیوں نے ڈیوٹی پر حاضر ہوکر فوج سے ریلیز (Release) لینے کے لیے درخواستیں دے دی ہیں اور میں جلد از جلد انہیں ریلیز دلوانے کے لیے کوشاں ہوں۔ JCO کی زبانی بمبئی میں تمہارے سارے کارنامے اور کلکتے کے اسٹیمر کے ساتھ تمہارے سلوک کا سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے خود بھی اپنی فوج کو چھوڑ کر جہاں دشمن کے خلاف اپنے جذبات کو دبانے کے سوا اخراج کی کوئی صورت نہیں، تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے کا خواہاں ہوں۔ اگر تمہیں منظور ہو تو کل رات گھر پر فون کرکے مجھے بتادینا۔ تمہاری بھابھی نے بھی منظوری دے دی ہے۔ اگر تم نے گرین سگنل دیا تو میں خود، JCO اور دونوں سپاہیوں اور بہت ممکن ہے دوچار اور انتہائی کارآمد لوگوں کے ساتھ پاسپورٹ بنواکر ایک ماہ کے اندر تمہارے ساتھ کام کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں گے۔ میں نے مزمل کو کہا کہ اس کا اور اس کے گروہ کا میرے ساتھ شامل ہونا میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ صرف ایک بات وہ سمجھ لے کہ میرے ساتھ کام کرنے والے مجھے بھائی اور ٹیم کا ایک ساتھی سمجھتے ہیں لیکن تمام فیصلے میں کرتا ہوں اور وہ بغیر کوئی بحث یا اعتراض کے اس پر عمل کرتے ہیں۔ تم میرے دوست ہو، ہماری ٹیم میں قیصر کے ساتھ تم کو بھی صرف کاموں کے معاملے میں میرا نائب بن کر میرے فیصلے پر عمل کرنا ہوگا۔ مزمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تمہارا نائب بننا تو بڑی بات ہے میں تو

ٹیم کے دوسرے ممبران کی طرح بھی تمہارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں۔ فوج کے ڈسپلن کو تو تم بخوبی جانتے ہو۔ باقی سب ممبران کی طرح تم میرے بھی چیف ہوگے اور اگر تم نے مجھے اپنا نمبر ٹو بننے کے قابل سمجھا تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔'' اگلی شام مزمل سے پھر رابطہ کرنے کا وعدہ کرکے میں نے فون بند کردیا۔ مزمل کی بروقت آفر سے مجھے اپنے آئندہ کے پروگرام کے واضح خدوخال دکھائی دینے لگے۔ مجھے خن سا اور عمر کے بھیجے ہوئے آدمیوں نے بھرپور تعاون دیا تھا لیکن اس کی بنیادی وجہ ان کے آقاؤں کا دھمکی اور خوف تھا جبکہ میری خواہش تھی کہ میرے اپنے آئندہ پروگرام میں ایسے لوگ شامل ہوں جن میں پاکستان دوستی اور بھارت دشمنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو اور وہ کسی مجبوری کے باعث نہیں بلکہ اپنی خوشی اور شوق اور جذبۂ شہادت کی خواہش کے ساتھ میرے ہمراہی بنیں۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارت کی چیرہ دستیاں حد سے بڑھ رہی تھیں۔ امریکہ کے اس وقت کے سیکریٹری آف سٹیٹ ہنری کسنجر نے ذوالفقار علی بھٹو کو کھلے الفاظ میں دھمکی دی تھی کہ اگر پاکستان نے اپنا نیوکلیر پاور بننے کی کوشش کو جاری رکھا تو اس کا عبرتناک انجام ہوگا اور روشنیوں کے شہر کراچی کو مستقل اندھیرے اور تاریکی میں ڈبو دیا جائے گا۔ اس وقت سارے پاکستان میں صرف کراچی میں کینیڈا کا دیا ہوا کینوپ کا ایٹمی بجلی گھر ہی کراچی کو بجلی مہیا کررہا تھا اور اسے چلانے کے لیے بھاری پانی (Heavy Water) بھی ہمیں امپورٹ کرنا پڑتا تھا۔ اس پانی کی ترسیل میں رکاوٹ کراچی کو فی الحقیقت اندھیروں میں ڈبو دیتی۔ پاکستان اس وقت کی نیوکلیر پاور بننے کی کوشش کو روکنے اور عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کی دھمکی اگرچہ بھٹو کو دی گئی تھی لیکن حقیقت میں ساری پاکستانی قوم کے منہ پر طمانچہ مارا گیا تھا۔ بھارت کے 74ء میں ایٹمی دھماکے پر مغربی ممالک نے اپنی آنکھیں اور کان بند اور لب سی لیے تھے لیکن پاکستان کے ''اسلامی بم'' کے متعلق دنیا بھر کے اخبارات، ٹیلی ویژن اور ریڈیو مسلسل پروپیگنڈا کررہے تھے حالانکہ اس وقت اس اسلامی بم کا دور دور تک وجود نہ تھا اور پاکستانی سائنسدان ابھی اس جانب صرف ابتدائی مراحل کی تحقیق میں ہی کوشاں تھے۔ یہ سب جھوٹا پروپیگنڈا اسرائیل اپنی مشہور خفیہ ایجنسی کے ذریعے دنیا بھر میں کروا رہا تھا۔ اللہ پاک رحم وکرم سے ایران عراق، کویت، سعودی عرب، لیبیا اور تمام اماراتی ریاستیں اور برونائی تیل کی دولت سے مالا مال مسلم ممالک تھے۔ اگر یہ مسلم دشمن ممالک کو اپنے تیل کی ترسیل بند کردیتے تو مغربی ممالک جن کا تیل پر انحصار اس قدر بڑھ چکا تھا کہ وہ سردیوں کی شدت میں اپنے شہریوں کو گرم پانی اور گرم ہوا مہیا کرنے کے لیے بھی تیل کے محتاج تھیں، میں بغاوتیں ہوجاتیں۔ تیل کے بے اندازہ دولت سے یہ مسلم ممالک مالا مال تھے۔ اپنے تحفظ کے لیے جب پاکستان اور عراق نے نیوکلیر پاور بننے کی طرف قدم اٹھایا تو ان مسلم ممالک نے پاکستان اور عراق کی بھرپور مالی امداد کی۔ دشمن اسلام ممالک سے یہ برداشت نہ ہوسکا تو پاکستان اور عراق کو پہلے ڈرایا اور دھمکایا گیا لیکن جب انہوں نے ان دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہ کی تو بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا

اور اسرائیلی جہازوں نے سعودی عربیہ کے اوپر سے پرواز کرکے عراق کے ایٹمی پلانٹ کو بمباری سے تباہ کردیا حالانکہ اس وقت سعودی عرب کے پاس پانچ امریکی اواکس جہاز تھے، جن میں سے دو ہر وقت اڑتے رہتے تھے اور ان میں اتنی صلاحیت تھی کہ سعودی عرب کی حدود کے اندر فضا میں کوئی بھی چیز داخل ہوتی تو ان کے ریڈار سے وارننگ کی گھنٹیاں بج اٹھتیں لیکن اسرائیل جہاز وسطی سعودی عربیہ سے گزر کر خلیج کی طرف سے عراق پر حملہ آور ہوئے لیکن ان اواکس نے ان کی سعودی حدود میں پرواز کی کوئی اطلاع نہ دی۔ میں نے خود ریاض میں دیکھا ہے کہ پرانے ہوائی اڈے پر اواکس جہاز رکھے گئے تھے اور ان کا سارا عملہ امریکی تھا۔ غیر ملکی تو دور کی بات ہے کسی سعودی اعلیٰ ترین افسر (مثلاً سعودی سول ایوی ایشن کے اس وقت کے چیئرمین ڈاکٹر ناصر اوصاف) کو بھی اس اڈے پر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اواکس سے حاصل کردہ تمام معلومات پہلے ترکی میں امریکی ایئربیس کو خفیہ کوڈ میں بھیجی جاتیں اور وہ تمام معلومات میں سے اہم کو علیحدہ کرکے باقی پھر اواکس کے (Revceiving Station) ریاض میں معلومات وصول کرنے والے امریکی سٹیشن کو بھیجتے اور پھر یہ ''اہم اور ضروری معلومات'' سعودی حکومت کو دی جاتیں جو پڑھے جانے کے بجائے سیدھی ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کے قابل ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ عراقی ایٹمی پلانٹ پر اسرائیلی جہازوں کا سعودی عرب پر سے پرواز کرنے کا عمل اور حملہ کرنا کوئی ''اہم بات'' تو تھی نہیں کہ سعودی حکومت کو پیش از وقت سعودی فضا میں اسرائیلی طیاروں کے داخل ہونے کی اطلاع دی جاتی۔ اسرائیلی جہاز پلانٹ تباہ کرکے اس روٹ سے واپس اسرائیل میں اپنے ٹھکانوں پر پہنچ بھی گئے لیکن سعودی حکومت کو اواکس (Air warning and control system) جہازوں نے کوئی اطلاع نہ دی۔ پاکستان کا ایٹمی پلانٹ بھی بھارت اور اسرائیل جہازوں سے بمباری کرکے تباہ کرنے کی کئی بار کوششیں ہوئیں لیکن ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کی ٹیم نے کہوٹہ کے پہاڑوں میں سرنگیں کھود کر پہاڑوں کے اندر ایسی جگہ پر پلانٹ نصب کیا ہے کہ ایٹم بم تو کیا، ہائیڈروجن بم بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ انتہائی پیچیدہ اور مکمل فول پروف راڈارز جو دشمن کے جہازوں کی کئی سو میل سے نشان دہی کرکے پاکستان کی ایئرفورس کو فوری اطلاع دیتے ہیں کے علاوہ سارے کہوٹہ اور گرد ونواح میں سینکڑوں ایسے بہت بڑے غبارے انتہائی مضبوط زنجیروں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں جو دس سیکنڈ میں اتنی بلندی پر پہنچ جاتے ہیں کہ اگر دشمن کا کوئی جہاز کہوٹہ کے اوپر پہنچ بھی جائے تو ان غباروں سے (جن میں بھڑک اٹھنے والی گیس بھری ہوتی ہے) ٹکرا کر وہیں بھسم ہوجائے۔ فضائی راستے سے کہوٹے تک پہنچنے میں ناکام ہوکر اسرائیلی کمانڈوز نے مقبوضہ کشمیر سے سیاحوں کے بھیس میں پہاڑی راستوں پر پیدل چل کر کہوٹہ تک پہنچنے کی کوشش کی تو خفیہ 440 وولٹ بجلی کی تاروں اور ہماری فوجی جاسوس ایجنسیوں کے جوانوں نے ان کا ایسا استقبال کیا کہ پھر ان کا کچھ پتہ نہ چلا۔ فرانس کے پاکستان میں سفیر بڑی جرأت دکھاتے ہوئے کار پر اپنا فوجی جھنڈا لہراتے

ہوئے کہوٹہ میں پلانٹ کو جانے والی سڑک جس پر داخلے کی جگہ پر بیریر (Barrier) اور Private Road No Tress Passing (پرائیویٹ سڑک اور آگے جانے کی اجازت نہیں واضح طور پر لکھا ہوا ہے، بیریر پر ڈیوٹی پر موجود لوگوں کو ڈرا دھمکا کر آگے نکل گئے۔ بیریر پر پہرہ دینے والوں نے بھی انہیں آگے جانے کی اجازت دے دی کیونکہ انہیں بخوبی علم تھا کہ آگے ان کا کیا حشر ہونے والا ہے وہ تھوڑی دور ہی بڑھے ہوں گے کہ اچانک بکریوں کا ایک گلہ سڑک پر آ گیا۔ سفیر کی گاڑی بکریوں کے سڑک پر آنے اور ٹکرانے سے پہلے ہی رک گئی لیکن دو بکریوں کی ٹانگیں بغیر ٹکر لگے ''ٹوٹ'' گئی تھی اور ان کے ''چرواہوں'' نے سفیر صاحب، ان کے ساتھی اور ڈرائیور کو کراٹے کے وہ ہاتھ دکھائے کہ بڑی مشکل سے ان چرواہوں سے اپنی ہڈی پسلی بچا کر سفیر صاحب کی گاڑی وہیں سے واپس پلٹی اور کئی روز تک یہ تینوں ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے۔ آپ خود ہی بتایئے کہ ان ''مشٹنڈے ان پڑھ چرواہوں'' سے جن کی دو بکریوں کی ٹانگیں کار کی ٹکر سے ''ٹوٹ'' گئی تھیں، سفیر صاحب ایسے ''سلوک'' کے سوا اور کیا توقع کر سکتے تھے۔ میری بھی خواہش تھی کہ اپنے ہم خیال اور نڈر ساتھیوں کا ایسا گروہ بناؤں جو پاکستان کے دشمن اور اسلام کے خلاف کام کرنے والے ممالک کی متحرک جاسوس ایجنسیوں اور ان کی حکومتوں کو تگنی ناچ نچا سکیں۔ میرے اب تک کے تجربے سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ سوائے اسرائیل کی موساد کے پاکستان کے خلاف کام کرنے والی ساری خفیہ ایجنسیاں صرف اپنے وطن کی محبت کے لیے ہی نہیں بلکہ پیسے کے حصول کے لیے بھی کام کرتی ہیں صرف اسرائیلی موساد عظیم تر اسرائیل کے قیام کو خواب سے حقیقت بنانے کے لیے دل و جان سے کوشاں ہیں۔ لڑنے کا مزہ بھی وہیں آتا ہے جہاں مقابلہ برابر کا ہو۔ کرنل مزمل کی آفر سے مجھے اپنی خیالی منزل حقیقت میں تبدیل ہوتے دکھائی دینے لگی۔ اگلی رات میں نے اسے فون کر کے اس کی شمولیت کو بصد شوق خوش آمدید کہا۔ راجہ تری دیو سے بڑی مشکل سے رابطہ ہوا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اس کی بیوی، لڑکے اور خزانے کے ساتھ میں بنکاک پہنچ چکا ہوں اور میرے ہمراہ اس کی بیوی اور لڑکے کے علاوہ چند ساتھی بھی ہیں جن کے لیے پاکستانی پاسپورٹ درکار ہیں تو راجے نے کہا کہ پاکستانی ایمبیسی والے پاسپورٹ بنانے میں پانچ چھ روز لگا دیں گے اس لیے خزانہ لینے کے لیے میں فوری طور پر خود بنکاک آ جاتا ہوں تو میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ جب تک ہم سب پاکستان پہنچ نہ جائیں، میں خزانہ تمہیں نہیں دوں گا۔ راجہ میرے اس جواب سے چراغ پا تو بہت ہوا لیکن بنکاک میں اس کی کیا چلتی تھی اور مجھے بھی وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ مجھ سے بلاوجہ تکرار کرنے اور رعب ڈالنے والوں کو میں اپنی زبان سے جواب دینے کے بجائے پستول یا ریوالور کی گولی سے جواب دیتا ہوں اور ان ہتھیاروں سے چلی ہوئی گولیاں کسی چھوٹے بڑے، صاحب اقتدار یا مجبور دولت مند یا غریب میں ہرگز تمیز نہیں کرتیں۔ راجہ نے مجبور ہو کر کہا کہ وہ آج ہی بنکاک میں پاکستانی سفیر کو یہ ہدایت دے گا کہ بغیر کسی سوال جواب

کے میری دی ہوئی لسٹ کے مطابق پاسپورٹ بنوا دے۔

حاجی مستان اور یوسف پٹیل سے یکے بعد دیگرے بات ہوئی۔ دونوں نے ہمارے بخیر و عافیت بنکاک پہنچنے پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ میں پاکستان میں چند روز ہی قیام کر سکوں گا۔ ہندوؤں کے مقولے کے مطابق مجھ پر سنیچر سوار ہے لہٰذا کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہ سکتا۔ قیصر اور سپنا بھی شاید میرے ہمراہ پاکستان جائیں اور ساتھ ہی واپس لوٹ آئیں۔ پاکستان کے خیرخواہ چند بنگلہ دیشی بھی دل و جان سے میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں۔ قیصر کے ساتھی بھی ہمارے مشن میں ساتھ دینے کا وعدہ کر کے دہلی ہیں۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ میں نے جس خارزار وادی میں قدم رکھا ہے اسے اس طرح سے عبور کروں کہ بعد میں آنے والوں کے لیے رستہ بن جائے اور یا پھر یہ وادی خاروں سے پاک ہو کر مہکتے پھولوں سے بھر جائے۔ مستان اور یوسف کو میں مختصراً اپنے گھریلو حالات کی سنگینی بتا چکا تھا لہٰذا وہ سمجھتے تھے کہ میں اپنی گھریلو پریشانیوں سے گھبرا کر کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لوں۔ دونوں نے یہی کیا کہ بہتر یہی ہے کہ پاکستان میں اپنے قیام کو مختصراً کر کے ایک مہینہ بنکاک، سنگاپور اور ملائیشیا میں محض تفریح کے لیے گزارو۔ تمہیں اس وقت سکون اور آرام کی بہت ضرورت ہے۔ اس ایک مہینے میں دل و دماغ پر کوئی بوجھ نہ رکھو۔ اس دوران اگر تمہارے بنگلہ دیشی ساتھی اور قیصر کے گزشتہ مشنوں میں لائے ہوئے لڑکے بھی تمہارے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہو گئے تو بیشک اپنے فیصلے کے مطابق اپنا گروہ تشکیل دے کر اپنے مشن کو آگے بڑھاؤ۔ ہم دونوں دامے درمے، سخنے تمہاری ہر ممکن نہ صرف مدد کریں گے بلکہ تمہیں اندرونی اور انتہائی خفیہ ان چالوں سے بھی آگاہ کریں گے جو دنیا بھر میں پاکستان دشمن عناصر نے اسلام کے اس قلعے کو سر کرنے کے لیے تیار کر رکھی ہیں جبکہ ان پر عمل پیرا بھی ہیں۔

اتنی ٹیلی فون کالز کے بعد جب میں ہوٹل لوٹا تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ میں نے ریسپشن سے کمرے کی چابی لی تو ساتھ ہی سپنا کی لکھی ہوئی دو چٹیں بھی ملیں کہ مجھے فوراً ملیں۔ میں سخت اذیت میں ہوں۔ میں نے وہیں سے ہاؤس ٹیلی فون پر سپنا سے بات کی تو اس کی رندھی ہوئی آواز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خاصی دیر تک روتی رہی ہے۔ میں سیدھا اس کے کمرے میں گیا تو سپنا نے بتایا کہ راجے کا لڑکا صبح سے کئی بار نہ صرف ٹیلی فون پر اسے پریشان کر چکا ہے بلکہ چار مرتبہ اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اسے اندر بلانے کے لیے زور دیتا رہا ہے۔ راجے کا لڑکا ہمارے لیے مصیبت بن چکا تھا۔ میں نے قیصر کو بھی سپنا کے کمرے میں ہی بلوا لیا اور راجے کے لڑکے کو بھی فون پر کہا کہ وہ سپنا کے کمرے میں آئے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ لڑکے نے جواب دیا کہ باتیں تمہیں کرنی ہیں لہٰذا تم میرے کمرے میں آؤ اور یہ یاد رکھنا کہ میں تمہارا ماتحت نہیں بلکہ راجہ تری دیو کا لڑکا ہوں۔ اس کی یہ بات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے نمبر تو

اور اس کے ایک ساتھی کو یہیں بلوالیا اور ہم چاروں لڑکے کمرے کی طرف گئے۔ دروازے کے سامنے صرف میں کھڑا رہا اور میرے تینوں ساتھی دونوں سائیڈوں سے لگے ہوئے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک تھائی نے دروازہ کھولا جو شکل سے ہی غنڈہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں قماش کے تین اور تھائی موجو تھے اور بعد دوپہر کی شراب کی محفل کا آغاز ہوچکا تھا۔ (دن کے وقت پینے والے زیادہ تر جن اور برین سے آغاز کرتے ہیں) ان غنڈوں نے مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے میز پر تین بڑے چاقو اور ایک پسٹل رکھا ہوا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو راجے کے لڑکے اور چاروں تھائیوں نے میری آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ان کی اسلحے کی نمائش کی اس بچکانہ حرکت سے میں ہنس پڑا۔ میرے پیچھے قیصر، نمبرٹو اور اس کا ساتھی بھی کمرے میں آگئے۔ میں اس ہوٹل میں کوئی ہنگامہ کرنا نہیں چاہتا تھا اور میرا مقصد صرف یہ تھا کہ راجے کا لڑکا کو اچھی طرح سے سبق دیا جائے۔ میں وہیں کھڑے کھڑے نمبرٹو کو انگریزی میں کہا کہ ان سور کی اولاد تھائیوں کو بتائے کہ میں کون ہوں اور خن سا سے میرے کیسے تعلقات ہیں۔ نمبرٹو نے بمشکل دو منٹ میں تھائی زبان میں انہیں مخاطب کیا اور دو بار خن سا کا نام کیا۔ سپنا بھی ہمارے پیچھے پیچھے اس کمرے میں آچکی تھی۔ نمبرٹو کی دو منٹ کی تعارفی گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ چاروں تھائی اپنے اپنے اسلحے اٹھا کر جانے لگے تو میں نے انگریزی میں کہا ''انہیں یہیں چھوڑ جاؤ''۔ وہ پس و پیش کرنے لگے تو میں نے اپنا پسٹل نکال لیا۔ ادھر قیصر نے نمبرٹو کے ساتھی کے ساتھ ان چاروں کو تھپڑ مارنے شروع کیے۔ تھپڑ لگنے کی دیر تھی کہ چاروں غنڈے اپنا اسلحہ وہیں چھوڑ کر دم دبا کر بھاگ گئے۔ راجے کا لڑکا گزشتہ شام سے مسلسل شراب پینے سے خو کو چوہے کے بجائے شیر سمجھنے لگا تھا۔ تھائی غنڈوں کو بھاگتے دیکھ کر میز پر پڑے پسٹل کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے میں نے ایک زوردار کک جمائی۔ وہ لڑکھیاں کھاتے ہوئے فرش پر جاگرا۔ میرے اشارے پر نمبرٹو اور اس کے ساتھی نے اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھایا۔ میں نے اسے کہا ''تم سپنا کو اپنے کمرے میں بلا رہے تھے اور اس میں ناکام ہوکر کئی بار اس کے کمرے میں جانے کی کوشش بھی کی۔ سپنا اب تمہارے سامنے ہے بولو اسے کیا کہنا چاہتے ہو۔'' راجے کا لڑکا بولا ''یہ اپنے قبیلے کے سردار کی داشتہ تھی اور پھر میرے بھائی کے ساتھ بھی ایک رات گزار چکی ہے۔ اگر میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑی'' میں اس بدقماش لڑکے کے ساتھ کچھ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ قیصر نے اسے پکڑ کر اس کی دھنائی شروع کردی جس میں نمبرٹو اور اس کا ساتھی بھی شریک ہوگئے اور اسے اس وقت چھوڑا جب وہ مکمل طور پر بیہوش ہوچکا تھا۔ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر اور دروازہ بند کرکے ہم اس کے کمرے سے باہر آگئے۔ مجھے آج سپنا سے اس کے ماضی کے متعلق کچھ سوال پوچھنے تھے لیکن میں نے انہیں اگلے دن پر ملتوی کردیا اور کھانا کھا کر پاکستانی سفارت خانے کو چل دیا۔ چلنے سے پہلے میں نے قیصر کو کہا کہ ہوٹل میں ہی فوٹوگرافر کی دکان سے سپنا، رانی اور اس کے لڑکے اور رضی اور اس کی بیوی،

مسز ڈیوڈ اور سونیا کے پاسپورٹ سائز کے چھ چھ فوٹو بنوائے۔ سونیا کا نام میں نے اپنے پاسپورٹ پر درج کروانے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ راجہ کو کسی قسم کا بھی سونیا کے متعلق شک پیدا ہو۔ میں یہ سب پیش بندی کے لیے کررہا تھا کیونکہ سونیا اتنی پیاری گڑیا جیسی معلوم بچی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ اسے اپنی بیٹی بنالوں لیکن جب اپنے گھر کی طرف دیکھتا تھا تو دل کہتا تھا کہ کیوں اس معصوم بچی کو اس جہنم میں دھکیلنے کا سوچ رہے ہو جس سے تم خود بچتے پھرتے ہو۔ بنکاک میں پاکستانی سفارت خانہ گریس (Grace) ہوٹل کے بالکل سامنے سڑک کی دوسری جانب واقع ہے۔ گیٹ پر ہی پہریدار نے مجھ سے ایسے ذاتی سوال پوچھے جیسے شادی کے طالب کسی امیدوار سے لڑکی کے والدین پوچھتے ہیں۔ اس کے سب سوالوں کے بے حد تحمل سے جواب دینے کے بعد اس نے مجھے تھرڈ سیکریٹری تک جانے کی اجازت دی۔ سفارت خانے کی چار دیواری میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زندہ فرعونوں کی سلطنت میں آگیا ہوں۔ آدھ گھنٹہ انتظار کروانے کے بعد تھرڈ سیکریٹری نے مجھے شرف باریابی بخشا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے سفیر صاحب سے ملنا ہے تو اس نے میرے پاسپورٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا کیا Over Stay (مقررہ وقت سے زیادہ قیام) کا مسئلہ ہے ہے۔ میں نے کہا ''جناب مجھے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں سفیر صاحب کو ملنا ہے اور انہیں اسلام آباد سے میری آمد کی اطلاع بھی مل چکی ہے۔'' سیکریٹری نے دوٹوک انکار کرتے ہوئے کہا کہ جب تک تم اپنا مسئلہ مجھے نہیں بتاؤ گے، سفیر تک نہیں جاسکتے۔ پاسپورٹ پر میرا نام رابرٹ مائیکل اور مذہب عیسائیت درج تھا اس لیے بھی مجھ سے اچھوتوں جیسا سلوک کیا جارہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے کمرے سے باہر آگیا۔ سفارت خانے کے ایک چپڑاسی کو ایک سو بھات (تھائی کرنسی) نذرانہ پیش کیا تو اس نے بتایا کہ پہلی منزل پر آخری کمرہ سفیر کا ہے اور پہلے اس کے پرائیویٹ سیکریٹری سے اجازت لینی ہوگی۔ میں کھٹمنڈو میں پاکستانی سفارت خانے میں گارڈز سے لے کر سفیر تک کی فرعونیت کو نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ انہیں تکلے کی طرح سیدھا بھی کرچکا تھا۔ میں پہلی منزل پر گیا اور پرائیویٹ سیکریٹری کے کمرے کے باہر چپڑاسی کے منع کرنے ک باوجود اندر چلا گیا۔ چپڑاسی میرے پیچھے ہی اندر آیا اور سیکریٹری کو میری گستاخی کا بتایا۔ ''مجھے سفیر سے فوری ملنا ہے۔'' میں نے اس کی غصے سے بھری نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بغیر اجازت لیے اندر کیوں آئے؟'' پرائیویٹ سیکریٹری نے تحکمانہ لہجے میں مجھ سے پوچھا ''اس لیے کہ یہ سفارت خانہ تمہاری ماں کے جہیز کا حصہ نہیں بلکہ پاکستانی عوام کی ملکیت ہے اور اگر پانچ منٹ کے اندر تم نے مجھے سفیر سے نہ ملایا تو میں تمہاری ہڈیاں توڑ دوں گا۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے اسی کی ٹیبل سے کاغذ اور قلم اٹھایا اور اس پر راجہ تری دیو کے حوالے سے لکھا کہ مجھے فوری ملنا ہے۔ یہ کاغذ اس کے سامنے رکھ کر میں نے پسٹل نکالا اور اس کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے اسے کہا کہ سفیر کے کمرے میں جائے۔ جو کام شرافت، اخلاق اور تحمل مزاجی سے نہ ہوسکا وہ

کام پسٹل کی نال نے کر دکھایا۔ سیکریٹری میرا کاغذ لے کر سفیر کے کمرے کی طرف گیا۔ میں اس کے پیچھے ہی تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو اس کے ساتھ ہی میں بھی کمرے میں چلا گیا۔ شاندار فرنیچر سے آراستہ اس بڑے کمرے میں آبنوس کی بڑی آفس ٹیبل کے پیچھے سفیر صاحب ایگزیکٹو چیئر پر بیٹھے تھے۔ یہی وقت تھا کہ یا میں عینک کے پیچھے اس کی گھورتی آنکھوں اور ماتھے پر پڑی شکنوں سے متاثر ہوکر ہتھیار ڈال دیتا اور یا اپنے طرزِ عمل سے اسے احساس دلاتا کہ یہ شخص اگر گھی سیدھی انگلی نہ نکلے تو ٹیڑھی انگلی سے بھی نکال سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ سفیر کہے میں اس کے بالکل سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور جوتوں سمیت پاؤں اس کی ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا ''سفارت خانے کے گیٹ سے لے کر تمہارے کمرے میں آنے تک مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا ہے کہ عوامی خزانے پر پلنے والے چپڑاسی اور گارڈز سے لے کر تم تک عوامی خادم (Public Servants) خود کو پاکستان کے خودمختار مالک سمجھتے ہو اور تمہاری یہی غلط فہمی دور کرنے کے لیے میں نے اپنی شریفانہ کوشش کو ناکام ہوتے دیکھ کر پسٹل کا سہارا لیا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری یہ بناوٹی عزت بنی رہے تو اپنے PS کو کمرے سے باہر بھیجو ورنہ کل کے اخبارات کی شہ سرخیوں میں تمہارے متعلق خبریں شائع ہوں گی۔'' سفیر نے میرے تیور دیکھتے ہوئے اپنے PS کو جانے اور چائے لانے کا حکم دیا۔ ابھی تک اس نے میرا چند سطری کاغذ نہیں پڑھا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ راجہ تری دیو رائے نے اسے آج ہدایات دی ہوں گی۔ میں کل دن کو پھر آؤں گا اور مجھے اپنے ہمراہیوں کے لیے دو گھنٹے کے اندر پاسپورٹ مل جانے چاہئیں۔ یہ کہہ کر میں اٹھا اور سفیر کے چائے پینے کے لیے زور دینے کے باوجود کمرے سے نکلتے وقت اسے کہا ''اپنے سٹاف کو بتا دینا کہ ہمیں بغیر کسی روک ٹوک کے تمہارے پاس آنے دیا جائے اور تم بھی کسی فرضی میٹنگ کا عذر کرکے نہ تو سفارت خانے سے غائب ہونا اور نہ ہی ہمیں انتظار کرنے کا کہا جائے۔ میں تمہاری رہائش گاہ اور تمہاری فیملی کے افراد کے متعلق پوری جانکاری رکھتا ہوں۔ مجھے اس بات پر مجبور نہ کرنا کہ مجھے سفارت خانے کے بجائے تمہارے گھر پر دستک دینی پڑے۔'' یہ کہہ کہ میں سفارت خانے سے باہر آگیا۔ میں جانتا تھا کہ میرا طرزِ عمل شریفانہ نہ تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ چائے پینے کے لیے میں نے سامنے ہی گریس ہوٹل میں چلا گیا۔ یہ ہوٹل مڈل ایسٹ کے تیل کی دولت سے مالامال عرب شیوخ اور ان کے حواریوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس ہوٹل میں عربی طرز رہائش سے آراستہ کمرے، لابیاں اور ڈرائنگ ہال ہیں۔ فرشی نشستوں کے لیے قیمتی ایرانی قالین، دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے اور جابجا بڑے حقے جنہیں عربی زبان میں شیشہ کہتے ہیں، پڑے ہوئے تھے۔ ہم جیسے غریبوں کو تو اس ہوٹل والے گھاس بھی نہیں ڈالتے۔ اپنے ممالک میں اسلامی قوانین کی سختی سے نکل کر یہاں پہنچ کر یہ عرب شیوخ بے لگام گھوڑوں کی طرح ہر قسم کی اخلاقی حدود کو پھاند جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں تسبیح، ہندوؤں میں مالا اور عیسائیوں

میں (Rosary) بڑی تسبیح کا میں نے ایک ہی مقصد کے لیے استعمال ہوتے دیکھا ہے یعنی اپنے اپنے عقائد اور مذہب کے مطابق عبادت کرنا لیکن گریس ہوٹل میں پہلی بار میں نے تھائی زبان سے بے بہرہ اسی پچاس سال کے عرب شیوخ کو جنہیں ان کے حواریوں نے دونوں جانب سے تھام رکھا تھا، فاحشہ عورتوں سے تسبیح کے دانے گن کر بھاؤ تاؤ کرتے دیکھا ہے ان بوڑھے شیوخ کی بڑھاپے کے باعث جسمانی حالت ایسی تھی کہ اپنے قدموں بغیر سہارے کے کھڑے بھی نہیں ہوسکتے تھے لیکن ایک وقت میں چھ چھ فاحشہ عورتیں ساری رات ان کے ساتھ بسر کرتی تھیں۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

میں اپنے ہوٹل میں واپس لوٹا تو قیصر نے مجھے بتایا کہ سب کی پاسپورٹ سائز کی تصویریں بنوالی گئی ہیں۔ اس سے فارغ ہوا تو رانی کا پیغام ملا۔ میں رانی کے کمرے میں گیا تو رانی نے شکوہ کیا کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے اس کے لڑکے کو مارا ہے۔ میں نے اس کے لڑکے کی تمام حرکات اسے بتا کر کہا ''جب تک آپ لوگ میرے ساتھ ہیں اس وقت تک یہ میری ذمہ داری ہے کہ سب کا خیال رکھوں اور کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہ ہونے دوں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارے لڑکے کی جنسی خواہش کو پورا کرنے کی اجازت دے دوں تاکہ ایک اور سونیا دنیا میں آجائے۔ تمہارے لڑکے کو تو میں بہت زیادہ سزا دینا چاہتا تھا۔ وہ تھائی غنڈوں کا پستول اٹھا کر ہم پر فائر کرنا چاہتا تھا اور میرا یہ اصول ہے کہ جب کسی کے پستول یا کسی اسلحہ کی نال کا رخ میری یا میرے ساتھیوں کی طرف ہوتا ہے تو پھر میں اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔ اپنے لڑکے کو اچھی طرح سے سمجھادو کہ اگر آئندہ اس نے ایسی حرکت کی یا میری حکم عدولی کی تو اپنے قدموں سے پاکستان پہنچنے کے بجائے چار لوگ اس کا کفن بکس اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کے باپ کے پاس لے جائیں گے۔'' رانی خود بھی اپنے لڑکے کی خودسری سے نالاں تھی۔ میری بات سن کر کہنے لگی ''اس کے ساتھ جو مناسب سمجھو وہی سلوک کرو۔ مجھے تو میری سونیا مل گئی ہے اور اب میرا دل اس خیال سے ہی تڑپ اٹھتا ہے کہ مجھے بہت جلد اس سے جدا ہونا پڑے گا۔'' میں نے رانی کو راجہ تری دیو سے ہونے والی گفتگو کا بتایا اور کہا ''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راجہ صرف اپنے جواہرات میں ہی Interested (دلچسپی رکھتا) ہے۔ میں آئندہ دو تین روز میں دو دنوں کے لیے سنگاپور جارہا ہوں۔ وہاں کی جواہرات کی مارکیٹ نہایت معقول قیمت پر انہیں فروخت کیا جاسکتا ہے۔ اگر تم چاہو تو سونیا کے لیے جو جواہرات تم نے الگ رکھے ہیں انہیں بھی وہیں فروخت کردیا جائے۔'' رانی نے فوراً ہی اپنے سوٹ کیس میں سے جواہرات سے بھری چمڑے کی ایک بڑی تھیلی نکال کر مجھے دی۔ میرے ذہن میں یکایک ایک خیال آیا۔ میں نے رانی کو کہا ''جیسے کہ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں، راجہ کو صرف جواہرات سے دلچسپی ہے جن سے وہ اپنی بھرپور عیاشی کرنے کی

آرزوئیں پوری کرنا چاہتا ہے۔ اسلام آباد میں اس کے رہنے میں تم یقیناً اس کی عیاشیوں کی راہ میں حائل ہوگی۔ اگر تم چاہو تم ہیں پاکستان میں راجہ صاحب سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے سارے موروثی جواہرات تم نے لاکر میں بنکاک کے ایک بنک میں رکھوادیے ہیں اور اسی شرط پر تم انہیں راجہ کو دوگی اگر وہ تمہیں کراچی میں مستقل رہنے کی اجازت دے۔ رضی کی بیوی بھی تمہارے ساتھ ہی رہے گی اور سونیا ہر وقت تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ راجہ تمہاری شرط فوراً مان جائے گا کیونکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کوہ خود بھی تمہیں اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرے گا۔'' رانی کو میری تجویز بہت اچھی لگی اور یہی فیصلہ ہوا کہ موروثی جواہرات کو بنکاک کے کسی معتبر بنک کے لاکر میں رکھوادیا جائے۔ میں جانتا تھا کہ ہمارے پاکستان پہنچنے پر اپنے جواہرات نہ ملنے پر راجہ چراغ پا ہوجائے گا اور عین ممکن تھا کہ وہ میرے خلاف کوئی کارروائی کرے لیکن ایک تو رانی کے میرے ہم نوا ہونے اور دوسرے پیپلز پارٹی کی حکومت کے ڈانو ڈول ہونے کے باعث اس کے لیے شاید یہ ممکن نہ ہوتا۔ قیصر اور رضی نے بھی ہمارے ساتھ ہونا تھا اور ہمارا اسلحہ بھی جس نے اب تک ہمارے تمام مخالفین کو جہنم رسید کیا تھا، وہاں بھی ہمارے تحفظ کے لیے استعمال ہوسکتا تھا۔ جواہرات بالآخر راجہ کو ہی ملنے تھے اور ان کے حصول کے لیے راجہ کو رانی کی خواہش کے آگے جھکنا ہی پڑتا۔ شام کو میں نے مزمل کو فون کیا اور ہم نے طے کیا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد بنکاک کے انٹرنیشنل پلازہ ہوٹل میں وہ JCO، سپاہیوں اور اگر ممکن ہوا تو میری شرائط پر عمل کرنے اور ساتھ دینے والے پاکستان کے حامی ساتھیوں کے ہمراہ مجھے ملے گا اور ہم میں سے جو بھی پہلے آئے وہ پندرہ روز دوسروں کا انتظار کرے۔ اگلے روز صبح ہی میں نے بنکاک کے بنک آف امریکہ میں اکاؤنٹ کھول کر ایک لاکر میں جواہرات اپنے نام سے رکھوا دیے۔ بعد دوپہر میں اورینٹل ہوٹل میں خن سا کے نمائندے سے ملنے گیا۔ ٹھیک تین بجے سفید سوٹ پر سرخ گلاب لگائے ایک شخص ہوٹل کی لابی میں آیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد مجھے اپنی گاڑی میں لے کر بنکاک کے دوسرے حصے میں لے گیا جسے سمندر پر بنے ایک پل نے ملا رکھا ہے۔ وہاں رہائشی فلیٹوں کے ایک کمپلیکس میں مجھے ایک شاندار فلیٹ میں لے جایا گیا۔ ڈرائنگ روم میں مجھے بیٹھے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ خن سا اور عمر خان اندرونی کمرے سے اکٹھے ڈرائنگ میں داخل ہوئے اور میں حیران رہ گیا جب نمبر ٹو اور اس کے ساتھی بھی ان کے پیچھے ہی اسی دروازے سے ڈرائنگ روم میں آکر باآدب کھڑے ہوگئے۔ خن سا اور عمر نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔ خن سا اور عمر کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ ہم سب خاموش تھے۔ خن سا نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا ''میرے آدمیوں کو بلاوجہ ہلاک کرنے والوں کو میں اذیت ناک موت سے دوچار کرتا ہوں۔ تمہاری حفاظت کے لیے بھیجے گئے لاؤسیوں کی ہلاکت کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلوایا تھا لیکن تمہارے ساتھ بھیجے گئے ان تھائیوں نے جب مجھے

اصل حقیقت بتائی اور میرے ایک خاص معتمد ساتھی کی میرے خلاف سازش کا بتایا تو مجھے احساس ہوا کہ لاعلمی میں رہتے ہوئے تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ وہ غدار اب تک اپنے انجام سے دوچار ہوچکا ہے۔ میں نے ہی تمہارے تھائی ساتھیوں کو اس ہدایت کے ساتھ یہاں دو بجے بلوایا تھا کہ تمہیں نہ بتایا جائے تمہارا نمبر ٹو تم سے اتنا متاثر ہوچکا ہے کہ جب میں نے اسے صحیح صورت حال جاننے کے بعد انعام دینا چاہا تو اس نے انعام میں عمر کے گروہ سے علیحدگی اور تمہارے آئندہ مشنوں میں تمہارا ساتھ دینے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اصولی طور پر ہمارے گروہ میں جب کوئی شامل ہوتا ہے تو ہم اسے کسی صورت علیحدہ نہیں کرتے لیکن اس کی خواہش اور تمہارے احسان کے بدلے ہم اس اصول کو توڑنے پر بھی تیار ہیں۔ اگر تم بھی اسے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہو تو ہم اسے بخوشی اجازت دیں گے۔ مستان سے بھی میری کل رات فون پر گفتگو ہوئی ہے۔ تمہارے آئندہ کے ارادے جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ تم اپنے وطن دشمنوں کو ملیامیٹ کرنے کا فیصلہ کرچکے ہو۔ میرے پاس تمہارے بہت کارآمد INFOs (معلومات) ہیں۔ کھٹمنڈو میں تم نے جس اسرائیلی موساد کی ایجنٹ لڑکی کی جان بچائی تھی، وہ بھی تمہارے اخلاق سے بہت متاثر ہے اور اتفاقاً آج کل یہیں پر ہے۔ اس نے موساد کو چھوڑ کر میرے پاس پناہ لی ہے۔ وہ بھی موساد کی زیادتیوں سے نالاں ہوچکی تھی۔ اس کے پاس بھی تمہارے لیے موساد کی بہت سی اندرونی خبریں اور مفید اطلاعات ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو تو کل گیارہ بجے وہ تم سے یہیں پر مل سکتی ہے۔ تمہیں اپنے مشنوں کی تکمیل کے لیے جو کچھ بھی اور جہاں بھی درکار ہوا، بلاتکلف مجھے بتادینا۔ میرا نمائندہ جو آج اورینٹل ہوٹل میں تمہیں ملا تھا، ہر روز تم سے رات دس بجے فون پر رابطہ کرے گا۔'' میں نے خن سا اور عمر سے ان کے تعاون کا جس کے بغیر میرا رانگاماٹی پہنچنا ناممکن تھا، بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ نمبر ٹو کی وفاداری اور دلیری شک وشبے سے بالاتر ہے اور اسے میں اپنے آئندہ کے مشنوں میں ہمراہ رکھ کر خوشی محسوس کروں گا۔ اسرائیلی لڑکی سے میں کل گیارہ بجے ضرور ملنا چاہوں گا مجھے چونکہ بنکاک شہر کے مختلف علاقوں سے واقفیت نہیں ہے اس لیے مجھے لینے کے لیے اگر آپ صبح دس بجے گاڑی بھیج دیں تو بہت آسانی رہے گی۔ بنکاک میں چند روز قیام کے بعد میں پاکستان جاکر بہت جلد واپس لوٹ رہا ہوں۔ نمبر ٹو کو میں آج اپنے واپسی کے پروگرام کے متعلق بتادوں گا۔ اس دوران یہ اپنے گھر والوں کے ہمراہ رہے۔ مجھے اب یا دوبارہ واپسی پر اگر کوئی ضرورت محسوس ہوئی میں تو آپ کے نمائندے کو بتادوں گا۔ عمر نے مجھے کہا کہ وہ آج سات بجے مجھے ملنے ہوٹل میں آئے گا۔ میں نے خن سا اور عمر کا دربار شکریہ ادا کیا اور ان سے رخصت ہوکر اسی گاڑی میں اپنے ہوٹل پہنچا۔

شام کو سات بجے عمر اپنے گارڈز کے ہمراہ میرے ہوٹل آیا۔ میرے کمرے میں صرف ہم دونوں ہی تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد عمر نے کہا ''میرے اس وقت آنے کا مقصد یہ ہے کہ میں

نے اور خن سا نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے آئندہ کے مشنوں میں تمہاری مالی ضروریات کو ہم پورا کریں اس لیے کل صبح میں تمہیں اپنے ہمراہ امریکن، ایکسپریس بنک میں لے جا کر بیس لاکھ ڈالر کے تمہارے نام کے ٹریولرز چیک بنوادوں گا۔ تم جانتے ہو کہ میں اسمگلنگ کی کمائی کا ایک پیسہ بھی اپنے اور اپنے گھر والوں پر خرچ نہیں کرتا اور اس کمائی کا تمام روپیہ فلپائن، ملائیشیا اور تھائی لینڈ کے مسلم چھاپہ ماروں کی ضروریات پر خرچ کرتا ہوں۔ چونکہ ہمارا نصب العین ایک ہی ہے اس لیے اس رقم کو میرا احسان نہیں بلکہ اس عظیم مقصد میں میری طرف سے شمولیت سمجھنا۔ خن سا نے یہ وعدہ کیا ہے کہ تم دنیا میں چاہے کہیں بھی جاؤ تو تمہاری ضرورت کے مطابق اسلحہ اور افراد وہ مہیا کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری اس پیشکش کو قبول کروگے" ایسے مشنوں میں ڈھیروں روپے کی واقعی ضرورت پڑتی ہے۔ اب تک تو میں مکھ اور مورنگ قبیلوں کے جواہرات کی فروختگی اور گوکھلے کی تجوری کی دولت سے ہی کام چلا رہا تھا۔ لیکن آئندہ درپیش مشنوں کے لیے مجھے خاصے سرمائے کی ضرورت تھی۔ عمر کی آفر سے میری یہ پریشانی بھی دور ہوگی۔ اگلی صبح عمر آٹھ بجے مجھے ہمراہ لے کر امریکن ایکسپریس بنک گیا اور میرے نام کے بیس لاکھ ڈالر کے ٹریلور چیک بنوادیے۔ ہم ہوٹل واپس پہنچے تو خن سا کی گاڑی میری منتظر تھی۔ عمر سے گلے مل کر اور الوداع ہو کر میں خن سا کی گاڑی سے اسی فلیٹ پر پہنچ گیا۔ اسرائیلی لڑکی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ رسمی باتوں کے بعد ہم جلد ہی اپنے اصل مقصد کی طرف آگئے۔ میرے طلب کرنے پر ایک پیڈ لایا گیا جس پر میں نے اپنے ذاتی بنائے ہوئے کوڈ میں اسرائیلی لڑکی کی بتائی ہوئی موساد کی انتہائی اہم اندرونی باتیں، ان کے اب تک کے ڈھکے چھپے عزائم، اسرائیل بھارت گٹھ جوڑ اور پاکستان کے خلاف سازشوں کے جال بچھائے جانے کی تفصیلات کے علاوہ سعودی عرب، ایران، عراق، کویت اور متحدہ عرب امارات میں موساد کی کارروائیوں اور روسی - KGBاور امریکی CIA کے موساد کے ساتھ تعاون کی تمام باتیں نوٹ کرلیں۔ اس لڑکی نے مجھے فلسطین، سعودی عربیہ اور ایران میں ان لوگوں کے نام اور پتے بھی لکھائے جو موساد اور CIA کے پے رول پر اپنے ہی ملکوں سے غداری کررہے تھے۔ پاکستان میں موساد اور -CIA کے چند ایجنٹوں کے نام اور پتے بھی اس نے لکھوائے۔ اس لڑکی نے ترکی میں موساد کے لیے کام کرنے والے تین ایسے ترک باشندوں کے نام اور پتے بھی دیے جن کا مطمع نظر صرف حصول زر تھا اور وہ پیسے کی لالچ میں اپنی وفاداریاں بھی تبدیل کرسکتے تھے۔ غرضیکہ دو ڈھائی گھنٹے کی اس میٹنگ میں مجھے اتنی خفیہ اور کارآمد اطلاعات ملیں جن کا کسی اور ذریعے سے حصول ناممکن تھا۔ اس لڑکی سے فارغ ہو کر میں اپنے ہوٹل واپس آگیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستان کی ہزیمت کو برداشت نہ کرتے ہوئے میں نے بھارت سے اپنے طور بدلہ لینے کے لیے اپنی خدمات بغیر کسی مالی فائدے کے اپنے محکمے کو پیش کی تھیں۔ پہلے میرا ہدف صرف بھارت تھا اور مجھے اپنے محکمے کی تفویض کردہ حدود میں رہ کر ہی

کام کرنا تھا۔ اس وقت بھارت میں دوران قیام میں نے اپنے طور پر بغیر اجازت کے جو مشن انجام دیے تھے، مجھ سے اس لیے ان کے متعلق اس لیے باز پرس نہ کی گئی کیونکہ میرا ہر مشن کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔ لیکن اب میں نے کسی اوپر والے کی ہدایت کے بغیر اپنی سرخی کے مطابق اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اپنے مشن پورے کرنے تھے اور ان کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوچکا تھا۔ میں اسے تائید ایزدی سمجھتا تھا کہ اب تک تیاری کے تمام ابتدائی مراحل بخیروخوبی طے ہوچکے تھے۔ مالی ضروریات کے علاوہ مجھے ان ساتھیوں کا تعاون بھی حاصل تھا جو اپنے ملک و ملت کے لیے اپنی جانیں نچھاور کرنے کی ہرگز پرواہ نہیں کرتے تھے۔ نمبر ٹو تھائی مسلمان تھا لیکن پاکستان کے دشمنوں کو ملیامیٹ کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ مزمل اور تینوں فوجی بنگلہ دیشی اور قیصر اور اس کے ساتھی بھارتی تھے لیکن ان کے دلوں میں پاکستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر قدرت کو منظور ہوا تو میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے اپنے ہدف کو یقیناً حاصل کرلوں گا۔ اسرائیل لڑکی سے ہی مجھے پہلی بار علم ہوا کہ امریکی وزیرخارجہ ہنری کسنجر یہودی النسل ہے اور مسلمانوں سے اس کی نفرت انتہا سے بڑھی ہوئی ہے اسی لیے اس نے پاکستان آکر ایٹمی ریسرچ کو بند نہ کرنے پر عبرتناک انجام کی دھمکی دی تھی۔

پاکستانی سفارت خانے میں جانے کا پروگرام میں نے ایک تو اپنی مصروفیت اور دوسرے اپنے ہمراہیوں کو سکھانے پڑھانے کی وجہ سے ایک دن کے لیے ملتوی کردیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر سفارت خانے میں اگر ان سے کوئی سوال پوچھا جائے تو وہ اس کا مناسب جواب دے سکیں۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ راجے کا بیٹا وہاں جا کر میرے اور میرے ساتھیوں کے متعلق الٹ پلٹ باتیں نہ کردے۔ قیصر اور رضی سے مشورہ کرکے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی صورت پیش آئی تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ نیم پاگل ہے۔ رانی کو بھی میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ بھی یہی کہے کہ یہ پیدائشی طور پر کمزور دماغ کا ہے اور اسے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ اگلے روز دس بجے صبح ہم سفارت خانے گئے۔ قیصر اور رضی لڑکے کو دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا اور وہ خود کو چھڑوانے کے لیے زور لگاتے ہوئے ہم سب کو صلواتیں سنا رہا تھا۔ سفیر صاحب کو میری دھمکی اثر دکھا چکی تھی۔ بغیر کسی سوال جواب کے ہمارے پاسپورٹ بننے لگے تو مجھے ایک اہلکار نے کہا کہ سفیر صاحب نے صرف پاکستان جانے کے لیے یکطرفہ پاسپورٹ بنانے کا کہا ہے۔ یہ سن کر میں نے سفارتی عملے کو پاسپورٹ بنانے سے روک دیا اور خود سفیر کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اندر چلا گیا۔ اس کے چپڑاسی اور پرائیویٹ سیکریٹری میں میرا پرسوں کا رویہ دیکھ کر مجھے روکنے کی ہمت نہ تھی۔ سفیر کے پاس دو مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے نہ تو ان کی موجودگی کا کوئی نوٹس لیا اور نہ ہی کوئی تکلف برتا۔ میں نے چھوٹتے ہی سفیر کو کہا کہ ہمیں یکطرفہ نہیں بلکہ پانچ سال کی مدت والے انٹرنیشنل پاسپورٹ چاہییں۔ وہ جواب میں کچھ کہنے لگا تو اسے موقع دیے بغیر میں نے کہا کہ اگر میرا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو رات کو

اس کے گھر پر ”ملاقاتی“ بھیجوں گا۔ میں نے اتنے بے ٹوک لہجے میں یہ بات کی کہ سفیر نے انٹرکام پر اپنے PS کو کہا کہ ہمیں ریگولر مدت کے انٹرنیشنل پاسپورٹ دیے جائیں۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی میرے ہمراہ پاکستان جانے والے تمام مرد و زن کے پاسپورٹ بن گئے۔ ہم اپنے ہوٹل واپس لوٹے تو پاسپورٹ لینے والے سب ساتھی تو خوش تھے مجھے یہ خیال ستا رہا تھا کہ کراچی ایئرپورٹ پر اترتے ہی ہم کہیں دھر نہ لیے جائیں۔ سفیر صاحب میری دھمکی اور سخت رویے کو بھولیں گے نہیں اور یقیناً پاکستان میں وزارت خارجہ کے ذریعے ایئرپورٹ پر ہی ہمیں گرفتار کروادیں گے۔ راجہ تری دیو رائے نے بھی جواہرات ہمراہ نہ لانے پر ہماری کوئی مدد نہ کرنی تھی۔ رات کو ٹھیک دس بجے خن سا کے نمائندے کا فون آیا تو میں نے اسے کہا کہ ایک مشکل درپیش ہے اس لیے اگر خن سا ابھی بنکاک میں بھی ہے تو میں اس سے فوری ملنا چاہتا ہوں۔ دوسری صورت میں مجھے تمہاری مدد درکار ہوگی۔ نمائندے نے صرف یہ کہہ کر فون بند کردیا کہ آدھ گھنٹے میں وہ دوبارہ مجھے فون کرے گا۔ بیس منٹ بعد ہی اس کا فون آگیا اور اس نے بتایا کہ خن سا ابھی یہیں ہے اور تمہیں ملنے کے لیے گاڑی بھجوادی گئی ہے۔ رات ساڑھے گیارہ کے قریب اسی فلیٹ میں میری خن سا اور عمر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انہیں پاسپورٹ بننے اور سفیر کے ساتھ اپنے رویے کا بتایا اور پاکستان پہنچنے پر اپنے خدشات بیان کیے۔ خن سا نے ساری بات سن کر کہا کہ ان خدشات کا تدارک کیا جاسکتا ہے۔ یہ سارے پاسپورٹ اپنے پاس رکھو اور میرے آدمی کو جو صبح دس بجے تمہارے ہوٹل آئے گا تم اپنے سب ساتھیوں کی ایک ایک پاسپورٹ سائز تصویر اور سب کے لیے اپنے پسندیدہ مسلم نام اور پاسپورٹس کے لیے ضروری معلومات اور کوائف لکھ کر اسے دے دینا، شام تک تمہیں نئے پاسپورٹ مل جائیں گے۔ اگلے روز تم اپنے تمام ہمراہیوں کے ساتھ ان نئے پاسپورٹوں کے ساتھ سنگاپور چلے جانا اور دو تین روز وہاں گزار کر کوالالمپور (ملائیشیا) آنا اور ایک رات وہاں گزار کر ان ہی پاسپورٹوں پر پاکستان جانا۔ سفیر نے اگر وزارت خارجہ کو تمہارے متعلق کوئی اطلاع دی تو امیگریشن والے ان ناموں اور پاسپورٹ نمبروں والوں کو کراچی ایئرپورٹ پر تلاش کریں گے جو سفیر نے انہیں دیے ہوں گے جبکہ تم اور تمہارے ساتھی ہمارے بنے ہوئے پاسپورٹوں پر بلا کسی روک ٹوک کے ایئرپورٹ سے نکل جاؤ گے۔ سنگاپور جاتے وقت میرے نمائندے کے آدمی بنکاک ایئرپورٹ پر سب پاسپورٹوں پر Entry کی مہریں بھی لگوادیں گے جبکہ ان پاسپورٹوں پر پاکستان سے روانگی کی مہریں بھی لگی ہوں گی۔ خن سا کی باتیں سن کر میں تعجب سے اسے دیکھنے لگا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میرا اصول یہ ہے کہ جب بھی کوئی غیر قانونی کام کیا جائے تو وہ آدھا نہیں بلکہ مکمل غیر قانونی ہو۔ تم نے راجہ کی سفارش پر غیر پاکستانیوں کے پاکستانی پاسپورٹ اپنے سفارت خانے سے بنوا کر اپنی آزادی ان کے پاس گروی رکھ دی ہے۔ وہ جب بھی چاہیں تمہیں اس بنا پر گزند پہنچاسکتے ہیں۔ میرے پاس دنیا بھر کے پاسپورٹ ویزے کی مہریں اور ٹکٹوں کا اسٹاک

موجود ہے۔ میرے کارندے جب بھی کسی دوسرے ملک میں جاتے ہیں تو ان کے پاس ڈرگز (منشیات) ہوتی ہیں اور وہ ہمارے پاسپورٹ استعمال کرتے ہیں اور کبھی بھی پکڑے نہیں گئے۔ تم آدھا کام غیر قانونی اور آدھا قانونی کر کے سمجھتے ہو کہ بچ جاؤ گے۔ تم نے ہرن گھاٹا میں بھارتی اسٹیمر کو تباہ اور اس کے تمام عملے کو ہلاک کیوں کیا تھا۔ محض اپنے خلاف ثبوت مٹانے کو۔ شانتی پور کے تھانے کے سارے عملے کی تمہارے ہاتھوں ہلاکت کی بھی یہی وجہ تھی۔ لیکن اپنے ملک جاتے ہوئے تم نے احتیاط کو نظر انداز کردیا۔ پاکستان میں تمہارا کوئی مخالف اگر چاہے تو رابرٹ مائیکل کے نام سے تمہارا پاسپورٹ بننے اور اس پر سفر کرنے کے جرم کی پاداش میں تمہیں جیل میں ڈلواسکتا ہے۔ ہمارے پاسپورٹوں کا ذخیرہ جعلی نہیں بلکہ اصل پاسپورٹوں اور ویزے کی مہروں پر مشتمل ہے جو بشمول پاکستان باقی سارے ممالک کے اسی محکمے کے افسران نے ہمیں فروخت کیے ہیں اور بالکل محفوظ ہیں۔“ خن سا کی باتوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔ واقعی میں لاعلمی میں اپنے اور اپنے ہمراہیوں کو بڑے خطرے میں ڈال رہا تھا۔ خن سا نے عمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”سنگاپور سے کوالالمپور آنے سے پہلے عمر سے ٹیلی فون پر رابطہ کرلینا۔ اپنا تمام اسلحہ کل صبح میرے نمائندے کے آدمی کے حوالے کردینا۔ سنگاپور میں تمہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کوالالمپور سے لفٹ ہنسا کی پرواز پر عمر کے آدمی تمہیں جہاز پر سوار کرائیں گے اور تمہارا اسلحہ جہاز کے عملے (Crew) کے حوالے کردیں گے جو کراچی ایئرپورٹ کے باہر تمہیں مل جائے گا۔“ مجھے تمام ہدایات دے کر خن سا اور عمر اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے ہاتھ ملا کر اندرونی دروازے سے اندر چلے گئے اور خن سا کا ایک کارندہ مجھے میرے ہوٹل چھوڑ آیا۔ اگلے روز صبح ہی مجھ سمیت میرے سارے ہمراہیوں نے مختلف پوز میں تصویریں بنوائیں۔ سب کے مختلف نام اور دیگر کوائف لکھے گئے۔ سپنا نے ضد کر کے اپنا نام سائرہ لکھوایا۔ گیارہ بجے ہم نے اپنا تمام اسلحہ اور تصویریں وغیرہ خن سا کے نمائندے کے حوالے کیں اور اس روز شام ڈھلے ہم سب کو نئے پاسپورٹ مل گئے جن پر سولہ روز قبل کراچی ایئرپورٹ سے ہماری روانگی اور اسی روز کی بنکاک آمد کی امیگریشن کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ ہم سب کے لیے خن سا نے تھائی ایئر سے بنکاک، سنگاپور، کوالالمپور کے ٹکٹ بھی بھجوادیے تھے۔ میں نے نئے پاسپورٹ ملنے پر سب ساتھیوں کے سفارت خانے میں بنے پاسپورٹ تلف کردیے۔ صرف اپنا رابرٹ مائیکل کا پاسپورٹ اُس نمائندے کو دیا اور کہا کہ اسے حفاظت سے رکھا جائے کیونکہ میں نے اسی پاسپورٹ پر درج رابرٹ مائیکل نام اور نمبر کے مطابق بنک آف امریکہ میں اکاؤنٹ کھولا اور لاکر لیا تھا جس میں راجہ کے جواہرات رکھے تھے۔ اگلی صبح نو بجے ہم تھائی ایئر سے سنگاپور کے لیے روانہ ہوگئے۔ میرا نمبر ٹو تھائی اور اس کے ساتھی بھی ہمارے ساتھ ہی ہوٹل سے چیک آؤٹ ہوئے۔ وہ ایئرپورٹ پر ہمیں چھوڑنے اور دوبارہ یقین دہانی کرانے آئے تھے کہ وہ میرے آئندہ مشنوں میں دل و جان سے میرا ساتھ دینے کو تیار ہیں اور ایک ماہ بعد وہ

میرے سگنل کے منتظر ہوں گے۔ تھائی ایئر کے جہاز نے آدھ گھنٹے کوالالمپور میں رکنے کے بعد ڈیڑھ گھنٹے میں ہمیں سنگاپور میں چنگی ایئرپورٹ پر اتارا اور ہم ٹیکسیوں میں ہیوالاک (Havalock) روڈ پر اپولو ہوٹل (Appolo Hotel) میں چیک ان ہوگئے۔ سردار کا لڑکا میری توقع کے برعکس دونوں ایئرپورٹس اور سفر کے دوران بالکل خاموش رہا۔ صرف میرے پاسپورٹ پر میرا اصلی نام اور صحیح کوائف درج تھے۔ اس نو منزلہ ہوٹل پر ہم نے ایک ہی فلور پر کمرے لیے۔ شام کو ہم گھومنے کے لیے آرچڈ پر گئے۔ اگلے روز صبح مجھے رانی اور اپنے حصے کے جواہرات اور دونوں ہیرے جو گوکھلے کی تجوری سے ملے تھے، فروخت کرنے اور بعد دوپہر گھومنے پھرنے کے لیے سنتوزا جزیرے (Santoza Island) جانا تھا جبکہ اس سے اگلے دن ہم نے سنگاپور کا مشہور زمانہ چڑیا گھر (Zoo) جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

یہاں پر میں سنگاپور کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سنگاپور اور ملائیشیا کو دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادی ملنے کے وقت ملائیشیا کا ایک صوبہ تھا۔ یہاں پر اس وقت چینی النسل ملائیشیز اور سکھ زیادہ تعداد میں آباد تھے۔ سکھوں نے ہی اس صوبے کا نام سنگاپور یعنی سکھوں یا شیروں (سنگھ شیروں کو کہتے ہیں) کا مسکن رکھا تھا۔ ملائیشیا مسلمان مملکت ہے اور مسلمانوں میں غدار ہمیشہ سے اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ یہاں کے ایک مسلمان وزیراعظم نے اربوں ڈالر کے عوض اپنا ایک صوبہ (ہرجائی۔ ریجان) تھائی لینڈ اور دوسرا صوبہ سنگاپور اپنے چینی النسل باشندوں کو بیچ دیا۔ چینیوں کا لیڈر لی کوان یو تھا جو 1991ء تک سنگاپور کا وزیراعظم اور اب حکومت کا مشیرِاعلیٰ ہے۔ ملائیشیا کے بیشتر چینی النسل شہری سنگاپور منتقل ہوگئے۔ لیڈر اور حکمران پرخلوص ہوں تو ملک کو ترقی کرتے دیر نہیں لگتی۔ ملائیشیا سے علیحدگی کے وقت سنگاپوری دو ڈالر کے عوض ملائشین کرنسی کا ایک رنگٹ ملتا تھا۔ لیکن اب ایک سنگاپوری ڈالر کے عوض سوا دو رنگٹ ملتے ہیں۔ سنگاپور کی آزادی کے وقت پاکستانی ایک روپے کا ایک سنگاپور ملتا تھا جبکہ آج 31 پاکستانی روپوں کا ایک سنگاپوری ڈالر ملتا ہے۔ سنگاپور میں قدرتی وسائل صفر ہیں۔ وہ پانی بھی ملائیشیا سے خریدتے ہیں۔ لیکن انہوں نے چالیس میل قطر کے اس ملک کو بنانے میں اتنی جدوجہد کی ہے کہ آج سنگاپور دنیا کے چند معاشی طور پر مضبوط ممالک میں شامل ہے۔ آزادی کے وقت لکڑی کے مکانوں پر مشتمل اس ملک میں اب ہرسو سر بفلک عمارات دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی عمارت بھی چالیس منزلوں سے کم نہیں۔ ڈائمنڈ سٹی بلڈنگ ایک سو ایک منزلوں اور سٹیمفورڈ ہوٹل (Stamford Hotel) چھیاسی منزلوں پر مشتمل ہے۔ دنیا کی جدید ترین اور بہترین زیرزمین ریلوے سنگاپور میں ہے۔ حکومت نے اس مملکت کی آبادی کو پچیس لاکھ سے نہ بڑھنے کا پلان عوام کو دیا تھا اور عوام کے تعاون سے بیس پچیس ہزار کی کمی و بیشی کے سوا آبادی پچیس لاکھ سے نہ تو کبھی چوبیس اور نہ ہی کبھی چھبیس لاکھ ہوتی ہے۔ حکومت عوام کی خیرخواہ اور عوام قانون کا بے حد احترام کرتے ہیں سنگاپور کی آزادی کے ہیرو لی کوانگ یو کا چوبیس برس سے زیادہ ملک کا وزیراعظم رہا۔ ملک کا تمام خزانہ اپنی

دسترس میں ہونے کے باوجود ایک پچاس ساٹھ منزلہ عمارت میں صرف ایک تین بیڈ روم کا فلیٹ ذاتی ملکیت ہے۔ یعنی اس کے پاس ذاتی ملکیت میں چند فٹ زمین بھی نہیں ہے۔ اس کے پاس نہ تو سرے محل اور بلاول ہاؤس ہے اور نہ ہی جاتی امرا کے محلات۔ حکومت سے عملی علیحدگی کے باوجود عوام اس کی بے انتہا عزت کرتے اور اسے قوم کا باپ سمجھتے ہیں۔ سنگاپور ایئر لائینز کے آغاز کے وقت پاکستانی پائلٹ اور پٹے پر دوسرے ملکوں سے جہاز لیے گئے تھے لیکن آج حالت یہ ہے کہ پاکستان سنگاپور کے متروکہ جہاز لینے کے لیے کوشاں ہے۔

سنگاپور میں اس دور میں ڈائمنڈ سٹی بلڈنگ تعمیر نہیں ہوئی تھی اور جواہرات کا زیادہ تر کاروبار ہانگ کانگ میں ہوتا تھا۔ سنگاپور میں سرگون روڈ اور آرچڈ روڈ پر جواہرات کی خرید و فروخت کی چند دکانیں تھیں۔ میں آرچڈ روڈ پر لیری جیولرز Larry Jewellers میں گیا جو فرانس کی ایک مشہور جواہرات کی کمپنی کی شاخ تھی۔ میں نے رانی کے اور اپنے جواہرات کے علاوہ گوکھلے کی تجوری سے ملنے والے ہیرے انہیں دکھائے۔ اتنی زیادہ مقدار میں ناتراشیدہ جواہرات اور تراشیدہ ہیرے نے دیکھ کر اس دکان کا منیجر خود کوئی فیصلہ نہ کرسکا اور کہنے لگا کہ میں ان جواہرات کو ہانگ کانگ میں اپنی کمپنی کے ہیڈ آفس کو دکھانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اعتبار کریں تو میں آپ کو ان کی رسید دے کر آج بعد دوپہر ہانگ کانگ جاکر اپنی آفر سے آپ کو بذریعہ فون مطلع کردوں گا ورنہ آپ بھی میرے ہمراہ چلیں اور اگر آپ کو ہماری آفر منظور نہ ہوئی تو وہاں بہت سے دوسرے ایسے جیولرز ہیں جو انہیں خریدنے میں Interested ہوں گے۔ میں نے منیجر کو کہا کہ وہ جواہرات لے کر ہانگ کانگ چلا جائے۔ وہاں سے فون پر جو آفر وہ دے گا اگر مجھے منظور ہوئی تو سودا ہوجائے گا ورنہ وہ اپنی ہانگ کانگ والی دکان میں میرا انتظار کرے۔ میں پہلی فلائٹ سے وہاں پہنچ کر جواہرات اس سے لے لوں گا۔ منیجر نے ہر ایک تراشیدہ اور ناتراشیدہ اور ناتراشتہ جواہر کا الگ الگ وزن کیا، سائز لکھا اور پولورائیڈ کیمرے پر سے ایک جواہر کی تصویر اتار کر اور رسید بنا کر مجھے دی۔ اگلے روز اس کا فون آیا اور اس نے رانی کے جواہرات کے ایک کروڑ پینتیس لاکھ، میرے حصے کے جواہرات کے چالیس لاکھ اور دونوں ہیروں کے پچپن لاکھ سنگاپور ڈالر قیمت لگائی۔ (اس وقت پاکستانی روپیہ اور سنگاپور ڈالر تقریباً برابر مالیت کے تھے) میں نے رانی کو بتایا تو اس نے فوری منظور کرلیا۔ یہ آفر میری توقع سے بھی زیادہ تھی۔ منیجر نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ ممکن ہے بلجیم یا فرانس میں آپ کو اس سے زیادہ رقم کی آفر مل جائے لیکن وہاں پر آپ کو ان جواہرات کے حصول اور خود مالک ہونے کے ثبوت بھی دینے پڑیں گے۔ میں نے منیجر کو کہا تھا کہ ایک گھنٹے بعد وہ اپنی آفر پر نظرثانی کرکے مجھے دوبارہ فون کرے تب میں اسے بتادوں گا کہ یہ سودا اس سے ہوسکتا ہے یا نہیں۔ ایک گھنٹے بعد اس نے فون کیا اور اپنی آفر میں پندرہ فیصد اضافہ کرتے ہوئے کہا اب جیسے آپ کی مرضی۔ میں نے ہاں کر دی اور دوسرے

روز فوز اس نے سنگاپور میں مجھے تمام رقم کی ادائیگی کردی۔ لیری جیولرز کی دوکان پر میں پہلی بار صبح کے وقت گیا تھا۔ اسی روز پروگرام کے مطابق ہم سب ساتھیوں سمیت سنتوزا جزیرے (Santoza Island) پر گئے۔ یہ جزیرہ سنگاپوریوں کے لیے تفریح اور پکنک کا مقام ہے۔ سنگاپور سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر اس جزیدے پر کیبل کار اور سمندر میں فیری (کشتی) کے ذریعے جاسکتے ہیں۔ ہم کیبل کار سے گئے۔ لوہے کے مضبوط رسوں سے لٹکتے بیسیوں کیبن جن میں ہر ایک پر دو تین افراد بیٹھ سکتے ہیں، سمندر کے اوپر سو فٹ سے بھی زیادہ بلندی پر مشینوں کے ذریعے دن بھر آر پار آتے جاتے ہیں۔ کیبل کار میں میرے ساتھ سپنا بیٹھی۔ اس نے تنہائی کے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ذومعنی الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا "میں تو چاہتی تھی کہ شادی کے بعد میں ہنی مون سنگاپور میں گزاروں گی۔" میں اس موضوع پر گفتگو سے گریز کررہا تھا۔ میری نظریں اپنے خوابوں میں بسے نسوانی عکس کی متلاشی تھیں۔ ویسے بھی کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے میں سپنا کے ماضی اور دارجلنگ میں اس سے والدین کی جائیداد جس کی وہ واحد وارث تھی، بقول اس کے ٹیلی فون پر ملی ایک دھمکی سے خوفزدہ ہوکر دستبردار ہونے کی اصل وجہ جاننا چاہتا تھا۔ اگر وہ کوئی عام اور کمزور دل کی لڑکی ہوتی تو پھر بھی اس کا یہ قدم کسی حد تک قابل قبول تھا لیکن اس دلیری اور نڈرپن کو دیکھتے ہوئے میں اس بات پر یقین کرنے سے قطعی انکاری تھا کہ اس نے خوفزدہ ہوکر اپنی جائیداد سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں جلدی نہیں کرتا لیکن جب کوئی فیصلہ کرلیتا ہوں تو اس سے کبھی واپس نہیں ہٹتا۔ میں بہت جلد تم سے چند باتیں پوچھوں گا اور اپنے متعلق بھی وہ باتیں بتاؤں گا جن کا ابھی تک تمہیں علم نہیں۔ اس میٹنگ میں ہم ایک حتمی فیصلہ کریں گے اس لیے تم تھوڑا وقت اور انتظار کرو۔

سنتوزا جزیدے پر چھوٹی پٹڑی کی تفریحی ریل گاڑیاں سارے جزیرے کے گرد گھومتی ہیں۔ جزیرے کے وسط میں ریسٹوران، عجائب گھر اور کئی تفریحی گیمز تھیں۔ اب تو ان میں میوزیکل فاؤنٹین اور موی عجائب گھر کا بھی اضافہ ہوچکا ہے۔ بہرحال شام ڈھلے ہم اس تفریحی جزیرے سے پوری طرح لطف اندوز ہوکر اپنے ہوٹل واپس پہنچے۔ دوسرے روز لیری جیولرز کے منیجر نے امریکن ڈالرز میں مجھے جواہرات اور ہیروں کی قیمت ادا کی۔ میں نے رانی کے جواہرات کے ڈالر اسے دیے۔ مشن کے آغاز سے اور پاکستان سے روانہ ہونے کے بعد سے لے کر سنگاپور آنے تک میرا اور میرے ساتھیوں کا ایک لمحہ بھی ہتھیاروں کے بغیر نہیں گزرا تھا لیکن سنگاپور میں ہم بغیر ہتھیاروں کے تھے۔ جزیرے سے واپسی پر راجہ کے لڑکے کو قابو میں رکھنے کے لیے میں نے پیپلز پارک سے ایک ایسا نقلی پستول خریدا جو دیکھنے میں بالکل اصل لگتا تھا۔ اگلے روز ہم ZOO (چڑیا گھر) دیکھنے گئے۔ یہ میلوں کا پھیلا ہوا تھا اور اس چڑیا گھر میں شیر چیتے اور دوسرے جنگلی درندے پنجروں میں بند نہیں جبکہ کئی کئی

ایکڑوں میں پھیلے ہوئے رقبوں میں بالکل آزاد پھر رہے تھے۔ لوہے کی اونچی مضبوط تاروں سے گھرے ہوئے ان حصوں میں بالکل جنگل کا ماحول بنایا گیا تھا۔ میں وہاں بھی پاکستان کے لاہور اور کراچی کے چڑیا گھروں میں پنجروں میں بند جنگلی درندوں کی حالت زار کا سوچتا رہا۔ پاکستان میں اتنے وسیع اور بے آباد رقبے ان شہروں میں موجود ہیں جہاں سنگاپور کے چڑیا گھر سے کئی گناہ بڑے چڑیا گھر بنائے جاسکتے ہیں لیکن یہاں کے حکمرانوں کو اپنی لوٹ کھسوٹ سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کہ اس طرف دھیان دیتے۔

تین روز سنگاپور میں گزارنے کے بعد ہم تھائی ایئر کے بقیہ ٹکٹوں کے مطابق کوالالمپور پہنچے۔ عمر خان کو میں نے سنگاپور سے سنائی گولک فون کرکے اپنی روانگی کی اطلاع دے دی تھی۔ کوالالمپور میں ہم سنٹرل ہالی ڈے ان ہوٹل میں ٹھہرے جن کے متعلق عمر نے مجھے ہی بریف کردیا تھا۔ دو روز بعد رم خان ہوٹل میں مجھ سے ملا اور مجھے بتایا کہ پرسوں کے لفٹ ہنسا کے جہاز پر ہمارے لیے سیٹیں بک کروادی گئی ہیں۔ خن سا کے مہیا کردہ میرے پاسپورٹ پر میرا نام جاوید اختر لکھا گیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے دلوں کا حال تو میں نہیں جانتا تھا لیکن اپنے وطن پاکستان جانے کی مجھے ذرا برابر خوشی نہ تھی بلکہ میرے دل میں ان دیکھے اندیشوں اور وسوسوں نے مجھے بے حال کردیا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ راجہ تری دیو کی طرف سے تھا۔ دوسرے ممالک میں تو ہر قسم کے خطرات سے کھیلنے اور دشمنوں کو ہلاک کرنے میں ہم پیشہ کامیاب رہے تھے لیکن اپنے وطن میں بغیر کوئی جرم کیے میں ذلت اور رسوائی سے بہت ڈرتا تھا۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں کہ واپسی کے سفر کے دوران میں خود کو انتہائی بزدل سمجھ رہا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں عوام حکومت کسی کی پگڑی اچھالنے اور اسے ذلیل و رسوا کرنے میں زور و شور سے مصروف تھی۔ لاہور کے شاہی قلعے کے زمین دوز عقوبت خانے اور مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے قریب دلائی کیمپ اس بات کے گواہ تھے کہ وہاں بے گناہوں پر ناکردہ گناہوں کی پاداش میں کیسے کیسے اذیت ناک اور انسانیت سے گرے ہوئے وہ مظالم ڈھائے جارہے تھے کہ انسانیت کانپ کانپ اٹھتی تھی۔ میں اب پچھتا رہا تھا کہ اول تو میں نے راجہ تری دیو کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے اس مشن پر جانے کی حامی ہی کیوں بھری اور دوسرے رانی اور سونیا کی ہمدردی میں راجہ کے جواہرات بنکاک میں کیوں چھوڑ آیا۔ اگر اسے اپنے جواہرات مل جاتے تو وہ میرا مشکور ہوتا اور میری ہر ممکن مدد کرتا لیکن بغیر جواہرات کے جانے سے اس کا چراغ پا ہونا لازمی تھا۔ سوچ سوچ کر میں نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ اپنے ساتھیوں کو کوالالمپور میں چھوڑ کر صرف رانی، سونیا اور میں اس کے لڑکے کے ساتھ کراچی جاؤں اور وہاں جب راجہ تری دیو سے رانی کے معاملات طے ہوجائیں تو وہیں سے بنکاک واپس آکر جواہرات لوں اور کوالالمپور سے پھر ساتھیوں سمیت پاکستان جاؤں۔ میرے پروگرام کے مطابق مجھے اپنے آئندہ مشنوں کا آغاز ایران سے کرنا تھا۔ ایران میں ان

دنوں شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی اور وہ خود اور اس کی حکومت امریکہ اور امریکن یہودی لابی کے ہاتھوں کھیل رہی تھی۔ ان دنوں جائز طریقے سے ایران کا ویزہ ملنا یا اس میں داخل ہونا ناممکن تھا۔ کوئٹہ کے راستے ہم زاہدان تک نسبتاً بآسانی جاسکتے تھے۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی خیریت بھی مطلوب تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ پاکستان میں بلاوجہ کسی مشکل میں گرفتار ہوجائیں۔ میں نے یہ تجویز ساتھیوں کے سامنے رکھی۔ وہ تو مان گئے لیکن سپنا ضد کرنے لگی کہ وہ میرے ہمراہ پاکستان ضرور جائے گی چاہے مجھے دو تین روز میں ہی واپس لوٹنا پڑے۔ میں نے ہزار دقت سے اسے سمجھایا۔ شام کو ہم سب ہوٹل کی کافی شاپ میں چائے پی رہے تھے کہ میرے استفسار پر رانی نے بتایا کہ اس کا لڑکا اپنے کمرے میں شاید سورہا ہے کیونکہ کئی بار کھٹکھٹانے کے باوجود وہ نہیں جاگا۔ میں نے کافی شاپ کے ہاؤس فون پر اس کے کمرے کا نمبر ملایا تو گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے کمرے سے کوئی جواب کیوں نہیں آرہا۔ میں نے ریسپشن پر جاکر منیجر سے کہا کہ اس کمرے کی چابی غلطی سے اندر رہ گئی ہے لہٰذا ماسٹر چابی سے اسے کھلوادیا جائے۔ منیجر نے ہوٹل کے دو کارکنوں کو ماسٹر چابی دے کر میرے ہمراہ بھیجا۔ کمرہ کھلا تو میں نے کارکنوں کو واپس بھیج دیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا اور راجے کے لڑکے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں نے باتھ روم دیکھ کر مزید تسلی کرلی اور دروازہ بند کرکے کافی شاپ میں بیٹھے ساتھیوں کو بتایا کہ لڑکا غائب ہے۔ یہ لڑکا ہمارے لیے مسلسل مصیبت بنا ہوا تھا۔ میں نے رانی، سونیا اور لڑکے کے ہمراہ اگلے روز گیارہ بجے کی فلائٹ سے کراچی جانا تھا اور اب یہ غائب تھا۔ اتنے بڑے اور انجان شہر میں اس کی تلاش بھی ناممکن تھی۔ میں سرپکڑ کر رہ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ عمر نے حسب وعدہ کل کی فلائٹ سے ہمارا اسلحہ بھی لفٹ ہنسا کے جہاز سے کراچی بجھوانا تھا۔ میں نے سب سے پہلے تو عمر کو سنائی گولک فون کیا۔ بدقسمتی سے وہ گھر پر اور نہ ہی دفتر میں موجود تھا۔ میں نے دونوں جگہوں پر پیغام چھوڑا کہ عمر کے پہنچتے ہی اسے کہا جائے کہ سنٹرل ہالی ڈے ان کوالالمپور میں فون کرے۔ میں اتنا بے چین ہورہا تھا کہ کافی شاپ سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں آنکھیں بند کیے سوچوں میں غرق میں اپنے بیڈ پر دراز تھا کہ مجھے اپنے ماتھے کو نازک انگلیوں سے دبانے کا احساس ہوا۔ مجھے بھی سکون کی ضرورت تھی لہٰذا میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ یکایک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لوہے کی کیلیں میرے ماتھے میں گھسی جارہی ہیں۔ میں نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ یہ سپنا تھی نامعلوم کس وقت وہ میرے کمرے میں آئی اور میرا ماتھا سہلانے لگی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ماتھے سے ہٹانا چاہا تو مجھے ایسے لگا جیسے میں اپنے ماتھے پر سے من بھر وزن اٹھانے کی لاحاصل کوشش کررہا ہوں۔ اپنی ساری جسمانی طاقت کو اکٹھا کرکے میں بڑی مشکل سے اپنے بیڈ سے اٹھا اور پھولے ہوئے سانس لیتا سامنے پڑی کرسی پر جابیٹھا۔ میں حیران تھا کہ سپنا میں یکایک اتنی طاقت کیسے آگئی ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور اس کی چمکتی

آنکھیں خون کی طرح سرخ ہورہی تھیں اسے میں نے ایسی حالت میں آج پہلی بار دیکھا تھا۔ میں حیران و سراسیمہ اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ بھاری اور سخت لہجے میں بولی ”تم نے مجھے، میری ماں اور میرے محبوب کو گولیوں سے ہلاک کرکے اور ہمارے جسموں کو جلاکر یہ سمجھ لیا تھا کہ ہماری آتمائیں بھی ہمارے جسموں کے ساتھ ہی جل گئی ہیں لیکن آتما ہمیشہ زندہ رہتی ہے اگر تم سمجھتے تھے کہ ہمیں مار کر تم اپنی زندگی شانتی سے گزار سکو گے تو یہ تمہاری بھول تھی۔ یاد کرو وہ رات جب میری ماں نے تمہیں پانی کے لگن میں تمہارا حال اور مستقبل دکھایا تھا اور تم سے معاوضے میں تمہارے ایک ساتھی کو میرا جیون ساتھی بنانے کی خواہش کی تھی۔ تمہارا ساتھی خود میرے پاس آیا تھا اور تم نے ہمیں ایک ہونے سے پہلے ہی مار دیا۔ میں چاہتی تھی کہ تمہیں اسی وقت اپنی انگلیاں تمہارے سر میں گھسیٹر کر ہلاک کردوں لیکن نامعلوم تم اپنے دائیں بازو پر کیا باندھ رکھا ہے کہ میری طاقت سلب ہوکررہ گئی۔ اب میں جارہی ہوں لیکن یاد رکھنا کہ ایک میں تمہارا پیچھا کبھی نہ چھوڑوں گی۔ میں آتما ہوں میں اور زیادہ تپسیا کروں گی، منتروں کا جاپ کروں گی اور اس طاقت کا توڑ کروں گی جو تمہارے بازو پر بندھی ہوئی ہے۔ میں اب جارہی ہوں لیکن بہت جلد ہی واپس آؤں گی۔“ میں آنکھیں جھپکے بغیر سپنا کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک جھٹکا لگا اور اس کی آنکھوں کی سرخی اور چہرے کا تناؤ ختم ہوگیا۔ اب وہ حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے کرسی پر بیٹھا دیکھ کر اس کے چہرے پر مایوسی چھاگئی اور وہ اپنی مدہم اور نارمل آواز میں کہنے لگی ”میں تو سمجھی تھی کہ میرے قرب سے آپ کو سکون ملے گا لیکن شاید آپ کو میرا اپنے بیڈ پر بیٹھنا پسند نہیں آیا۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں آپ کے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں نے اسے روکتے ہوئے کہا ”سپنا تم یہیں بیٹھی رہو اور مجھے یہ بتاؤ کہ جب سے تم میرے کمرے میں آئی ہو تو کیا تمہارے ساتھ کوئی غیرمعمولی بات ہوئی ہے یا تم نے کوئی غیرمعمولی بات محسوس کی ہے“ سپنا تعجب سے میری بات سن رہی تھی۔ میں خاموش ہوا تو وہ بولی ”کوئی غیرمعمولی بات نہ تو ہوئی اور نہ ہی میں نے محسوس کی۔ آپ کے کمرے میں آکر بیڈ پر بیٹھے ہوئے میں بڑی خوشی محسوس کررہی تھی کہ آپ نے مجھے نہیں روکا۔ میں اپنی زندگی کے تصورات میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک میں نے آپ کو کرسی پر بیٹھا دیکھا۔ میں تو اپنے خیالات میں ایسی گم تھی کہ جب آپ نے مجھ سے بات کی تو اس وقت مجھے احساس ہوا کہ آپ اپنے بیڈ پر لیٹے ہونے کے بجائے کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں“۔ مجھے ساری بات سمجھ میں آگئی۔ جادوگرنی کی بیٹی کی شیطانی روح مجھ سے بدلہ لینے کے لیے سپنا کے جسم میں حلول کرگئی تھی۔ مجھ سے سپنا نے اس شیطانی آتما کے حلول ہونے کے دوران جو باتیں کی تھیں، سپنا ان سے بالکل بے خبر تھی۔ میں نے سپنا پر جادوگرنی کی آتما کے اس میں حلول کرنے کا ذکر نہیں کیا اور اسے یہ کہہ کر اپنے کمرے میں جانے کا کہا کہ میں کچھ دیر کے لیئے سونا چاہتا ہوں۔ سپنا کے جانے کے بعد میں پھر بیڈ پر چلا گیا۔ گزرے ہوئے سارے واقعات ایک ایک کرکے میری آنکھوں

کے آگے سے گزرنے لگے۔ برما میں ارکان کے صوبے میں جادوگرنی، اس کی بیٹی اور اپنے تھائی ساتھی کو جادوگرنی کے سحر سے اپنے ہوش و حواس کھوکر اپنی جیکٹ اتار کر جادوگرنی کی بیٹی کے ساتھ جابیٹھا تھا۔ میں نے ان تینوں کو گولیاں مار کر ہلاک کردیا تھا اور ان کے مردہ جسموں پر پٹرول ڈال کر آگ لگادی تھی۔ جادوگرنی اور اس کی بیٹی کو ہلاک کرنے کے بعد سے آج تک میں غیرمتوقع مشکلات میں گھرتا جاتا تھا۔ بھارت میں آسام کے بارڈر سے داخل ہوا تو بھارتی فوج کا میجر میرے پیچھے پڑگیا۔ اسے ختم کرکے آگے بڑھے تو مکھ اور مورنگ قبائل سے بلاوجہ جھڑپوں میں اتنے افراد ہلاک ہوئے۔ رانگاماٹی پہنچنے سے پہلے بنگلہ دیشی فوجیوں کو ہمیں مجبوراً ہلاک کرنا پڑا۔ چکمہ قبیلے کے سردار کی مخالفت کے باعث ایک سو کے قریب ان کے لڑاکے ہمارے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ چٹاگانگ میں بھی ایک مخبر کو ہلاک کرنا پڑا۔ کھلنا میں رفیق اور بھارتی ہیلی کاپٹر کو تباہ کرنا اور پھر شانتی پور میں تھانے کے سارے عملے اور گائیڈز کو مارنا اور بمبئی میں گوکھلے کے گروہ کا خاتمہ کرنا۔ یہ سب نہ تو میرے پروگرام میں شامل تھا اور نہ ہی مجھے ایسی Situation (حالات) سے دوچار ہونے کا ذرا سا بھی شائبہ تھا۔ بھارتی سٹیمر کو ڈبونے اور سارے عملے کو ہلاک کرنا بھی پہلے سے طے شدہ نہ تھا۔ حالات خود بخود ایسا رخ اختیار کرتے گئے کہ ہمیں اتنا زیادہ خون بہانا پڑا۔ کسی بھی انسان کو ہلاک کرنے سے چاہے وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، خوشی نہیں ہوتی۔ لیکن میری اور میرے ساتھیوں کی حالت ایسی ہوچکی تھی کہ اگر ہمیں جنونی قاتل کہا جاتا تو غلط نہ ہوتا۔ مجھے اب احساس ہورہا تھا کہ اب بے حساب گولیوں کے تبادلے کے باوجود مجھے ذرا سی خراش تک نہ آئی تھی مجھ پر تاک تاک کر گولیاں اور زہر میں بجھے ہوئے تیر برسائے گئے لیکن میں ان سے بھی بچ نکلا۔ میرے بازو پر جو تعویذ بندھا تھا اس پر اللہ پاک کے اسمائے جمالی اور ان پانچ برگزیدہ ہستیوں کے نام تھے جو میرے عقیدے کے مطابق اللہ پاک کو سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ یہ سب اللہ پاک کا کرم اور تعویذ کا اثر تھا کہ جادوگرنی کی روح بھی سوائے میرے لیے مشکلات پیدا کرنے کے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچاسکی۔ اس شیطانی آتما نے ظاہر ہوکر مجھے چیلنج کیا تھا اس بار تو وہ سپنا کے جسم میں داخل ہوئی تھی اور اگر اس شیطانی آتما کو جلد از جلد ختم نہ کیا جاتا تو میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ لائن پر عمر تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کوالالمپور میں ہی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں اس سے فوری ملنا چاہتا ہوں اور سب سے پہلے وہ اپنے آدمیوں سے کہے کہ ہمارے کل پاکستان روانگی ملتوی ہوگئی ہے لہٰذا ہمارا اسلحہ ایئرپورٹ پر نہ پہنچائیں۔ عمر نے فون پر ہی ہمارا پاکستان جانے کا پروگرام ملتوی کرنے کی وجہ پوچھنی چاہی تو میں نے کہا۔ ''عمر بھائی صرف باتیں کرکے وقت برباد کرنے کے بجائے اگر تم فوری میرے پاس آجاؤ تو ممکن ہے کہ درپیش مشکل کا کوئی حل نکل آئے ورنہ بہت دیر ہوجائے گی'' آدھ گھنٹے میں عمر ہوٹل میں آگیا۔ میں نے اسے راجے کے لڑکے غائب

ہونے کا بتایا تو اس نے کہا ''میں نے اپنے تین محافظ تمہیں بتائے بغیر ہوٹل میں آپ لوگوں کی حفاظت کے لیے مقرر کردیے تھے۔ میرے یہاں پہنچنے پر دو محافظوں نے بتایا کہ میرے ہمراہیوں میں سے ایک نوجوان لڑکا ہوٹل سے باہر نکلا تو ایک محافظ نے یہ سمجھتے ہوئے کہ انجان شہر ہونے کے باعث وہ کہیں راستہ نہ بھول جائے، اس کے پیچھے چلاگیا۔ وہ یا تو لڑکے کے ہمراہ واپس آجائے گا ورنہ اکیلا آکر یہ بتادے گا کہ لڑکا کہاں پر ہے۔ اس لیے لڑکے کے لیے فکر کرنے کی ضرورت نہیں'' میں نے اسے تفصیلاً جادوگرنی کا واقعہ بتاکر کہا کہ سپنا میں آج پہلی مرتبہ جادوگرنی کی بیٹی کی روح حلول کرگئی تھی۔ اس دوران سپنا نے جو باتیں کیں اسے ان باتوں کا پہلے قطعی علم نہ تھا۔ میں نے روح کے حلول کرنے کے دوران سپنا کی حالت، آواز اور اس کی انگلیوں کی طاقت اور اس کی وہ ساری باتیں عمر کو بتائیں اور کہا ''اگر جادوگرنی نے مجھے ماضی، حال اور مستقبل کے عکس پانی کے لگن میں دکھائے نہ ہوتے اور ماضی اور حال کے عکس بالکل درست نہ ہوتے تو میں کبھی بھی سپنا کی اس کیفیت کو کسی غیر انسانی طاقت کی وجہ تسلیم نہ کرتا لیکن آنکھوں دیکھے حالات کو جھٹلا بھی نہیں سکتا'' عمر کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا ''ہم کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں۔ میرے ایک قریبی عزیز کی بیوی کی بے راہ روی سے تنگ آکر اس کے شوہر نے اسے گلاگھونٹ کر ہلاک کردیا اور دوسری شادی کرلی تھی۔ اس کی سابقہ بیوی کی روح بھی اس کی دوسری بیوی میں حلول کرجاتی تھی اور وہ عورت بالکل ٹھیک ٹھاک اور نارمل حالت سے یکایک ایسی ہوجاتی جیسی تم نے سپنا کی بتائی ہے۔ گنٹنگ ہائیٹس (Genting Heights) جو جو کوالالمپور سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک آٹھ ہزار فٹ اونچا پہاڑ ہے، کہ راستے ہیں ایک غار میں ایک بوما (جادوگر یا سفلی عمل دور کرنے والا رہتا ہے۔ اس کے عمل سے میرے عزیز کی سابقہ بیوی کی روح جو اس کی دوسری بیوی میں داخل ہوجاتی تھی۔ اسے بومے نے اپنے عمل سے اسے اتنی اذیت دی کہ وہ دوبارہ واپس نہ آنے کی قسم اٹھا کر چلی گئی اور پھر کبھی واپس نہ آئی۔ وہ بوما کتنا بھی لالچ دو، اپنی کٹیا اور غار سے باہر نہیں آتا۔ اس نے کٹیا کے گرد حصار بنا رکھا ہے۔ ہمیں سپنا کو لے کر اس کے پاس جانا ہوگا لیکن سپنا کو یہ علم نہ ہونے دینا کہ ہم اسے کس مقصد کے لیے ساتھ لے جارہے ہیں۔ وہ بوما اپنا عمل آدھی رات کے وقت کرتا ہے۔' عمر نے مجھے یہ بھی کہا کہ رات کو ٹھیک دس بجے اس کی ایک گاڑی مجھے اور سپنا کو بوما کے پاس لے جائے گی تب تک وہ بھی وہاں پہنچ جائے گا۔ عمر تقریباً ایک گھنٹہ میرے ہمراہ رہا۔ اس دوران راجے کا بیٹا واپس لوٹ آیا تھا۔ میں نے اس سے بغیر اجازت باہر جانے کی وجہ پوچھی تو اس نے بڑے اکھڑے انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا ''میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔ تم نے اب تک مجھ سے جو سلوک کیا ہے۔ اس کا جواب تمہیں پاکستان جاکر دینا ہوگا۔'' عمر کے ساتھ ہی میں ہوٹل سے باہر آیا تو محافظ نے بتایا کہ رانی کا لڑکا موٹر سائیکل رکشہ لے کر سیدھا پاکستانی سفارت خانے گیا اور تقریباً دو گھنٹے اندر رہا۔ اس کی واپسی پر سوٹ میں ملبوس سفارت خانہ کا

کوئی افسر اس کے ساتھ اس عمارت سے باہر آیا اور سفارت خانے کی گاڑی اسے ہوٹل چھوڑ گئی۔ محافظ موٹر سائیکل رکشے پر گاڑی کے پیچھے ہوٹل پہنچا۔ میں سمجھ گیا کہ سفارت خانے میں لڑکے نے افسران کی منت سماجت کرکے پاکستان میں اپنے باپ سے بات کی ہوگی اور اس کے باپ کی ہدایت پر ہی سفارت خانے کی گاڑی اسے ہوٹل چھوڑنے آئی ہوگی۔ لڑکے کا پاسپورٹ میرے پاس تھا لیکن راجہ کی ہدایت پر اس کے لیے نیا پاسپورٹ بھی بن سکتا تھا۔ عمر سے مشورہ کرنے کے بعد ہم محافظوں سمیت ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ میں نے لڑکے کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازہ کھول کر لڑکے نے جونہی باہر جھانکا، میں دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہوا۔ میرے پیچھے ہی محافظ اور عمر بھی کمرے میں آگئے۔ میرے کہنے پر دو محافظوں نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور تیسرے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے اپنے محکمے میں لی ہوئی ٹریننگ کے مطابق اس کی کنپٹی کی مخصوص نسوں کو دبایا۔ آدھ منٹ میں ہی وہ مکمل بیہوش ہوکر محافظوں کے ہاتھوں میں جھولنے لگا۔ عمر کے اشارے پر محافظ اسے اٹھا کر ہوٹل کے باہر عمر کے محافظوں کی گاڑی میں لے گئے۔ عمر نے ویٹر کو کمرے میں طلب کیا اور لڑکے کا سارا سامان چیک کروا کر بیل بوائے کے ذریعے ریسپشن پر منگوایا اور اس کے کمرے کی ادائیگی کرکے اسے چیک آوٹ کروادیا۔ عمر نے چلتے وقت مجھے کہا کہ اس لڑکے سے اپنی واقفیت اور کسی قسم کے تعلق کو ظاہر نہ کرنے کا میں اپنے ساتھیوں کو کہہ دوں۔ یہ لڑکا ہماری پاکستان روانگی کے وقت تک اس کے اس معتمد ساتھی کے پاس نظر بند رہے گا جس کے پاس کوالالمپور پہلی بار آنے پر ہم گئے تھے۔ میں نے عمر کے رخصت ہونے کے بعد سپنا کو کہا کہ آج رات میں تمہیں لمبی سیر کے لیے گنٹنگ ہائیٹس پر لے جاؤں گا وہ یہ سن کر خوشی سے پاگل ہوگئی اور رات کو دس بجے جب ہم عمر کی گاڑی کے انتظار میں ریسپشن کی لابی میں بیٹھے تھے تو وہ نیلی ساڑھی میں بہت بھلی دکھائی دے رہی تھی۔

عمر کی ایک گاڑی ٹھیک دس بجے ہمیں لینے کے لیے ہوٹل پہنچ گئی۔ ایک محافظ بھی ہمراہ تھا۔ مین روڈ پر تقریباً چالیس کلومیٹر جانے کے بعد ہماری گاڑی اس سڑک پر ہولی جو گینٹنگ ہائیٹس کو جاتی تھی۔ دو کلومیٹر کے بعد ہی چڑھائی شروع ہوگئی۔ بہت سے قارئین نے راولپنڈی سے مری اور مری سے نتھیا گلی جانے والی سڑکوں پر سفر کیا ہوگا۔ ان کے مقابلے میں یہ سڑک پینتالیس درجے کے زاویے پر بلندی کی طرف جارہی تھی۔ آٹھ سلنڈر انجن کے باوجود ہماری گاڑی نے زیادہ سفر پہلے گیئر میں ہی کیا۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر جنوب مشرقی ایشیا کا سب سے بڑا کسینو (جوا خانہ) اور ایک دس منزلہ ہوٹل کے علاوہ کئی چھوٹے ہوٹل بھی بنے ہوئے ہیں۔ اس جوئے خانے میں درجنوں رولیٹ اور سلاٹ (Slot) کے علاوہ ہر قسم کا جوا ہوتا ہے۔ اسے بلاشبہ ایشیا کا مونٹے کارلو کہا جاسکتا ہے۔ ہماری گاڑی آدھے راستے میں ہی ایک تنگ سڑک پر کچھ دور آگے جاکر رک گئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ عمر خان نے ہمیں یہیں رکنے اور اسکا انتظار کرنے کا کہا تھا۔ پون گھنٹے بعد عمر خان بھی اپنے محافظوں

سمیت وہاں پہنچ گیا اور ہمیں لے کر اس گپھا (غار) کی طرف چلا جہاں بوما رہتا تھا۔ اندھیری رات میں ٹارچوں کی روشنی میں ہم غار کے اندر داخل ہوئے۔ غار کے شروع میں ہی لکڑیوں کے جلتے الاؤ کی روشنی میں سفید لمبی داڑھی اور لمبی جٹاؤں والا ایک سادھو بیٹھا کسی منتر کے جاپ میں مشغول تھا۔ سپنا بہت حیران تھی کہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہم کدھر جارہے ہیں۔ اس نے مجھ سے ایک بار پوچھا بھی۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے خود بھی صحیح علم نہیں۔ غار میں سادھو کو دیکھ کر وہ اور بھی پریشان ہوگئی۔ عمر کے محافظ غار کے باہر ہی رک گئے تھے۔ عمر سادھو کے سامنے الاؤ کے نزدیک بیٹھ گیا اور اس کی تقلید کرتے ہوئے سپنا اور میں بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ سادھو نے جاپ کا ایک دور ختم کرکے آنکھیں کھولیں۔ عمر نے ملائیشین زبان میں ایک دو لفظ ہی بولے تھے کہ سادھو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ کرادیا اور آگ میں کچھ ڈال کر جس سے آگ تیزی سے بھڑکی، پھر جاپ شروع کردیا۔ یکایک سپنا کی حالت بگڑنے لگی اور اس پر وہی کیفیت طاری ہوگئی۔ جیسی ہوٹل کے کمرے میں ہوئی تھی۔ سادھو نے آگ میں پھر کچھ ڈالا۔ سپنا تلملارہی تھی۔ میں اور عمر اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔ یکایک سپنا نے بھاری اور کرخت آواز میں ایک چیخ ماری اور کراہتے ہوئے اردو میں بولی ”مجھے کیوں اذیت دے رہے ہو۔ اصل پاپی تمہارے سامنے بیٹھا ہے جس نے میری ماں، میرے ہونے والے پتی اور مجھے گولیاں مار کر ہلاک کیا اور پھر ہمارے بے جان جسموں کو آگ سے جلا ڈالا۔ سزا اس پاپی کو دو“ سادھو نے سپنا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اردو میں کہا (عمر نے بعد میں بتایا کہ سادھو کو ملائیشین زبان کے سوا کسی نے کبھی نہ کچھ پوچھا ہے اور نہ ہی سادھو نے پہلے کسی اور زبان میں بات کی تھی) ”پاپی اگر یہ ہے تو اس بے گناہ لڑکی کو تو کیوں پریشان کررہی ہے۔ جا اور اپنے دشمن سے بھڑ جا لیکن تجھ میں نہ تو اب اتنی طاقت ہے اور نہ کبھی ہوگی کیونکہ جو تعویذ اس نے اپنے بازو سے باندھ رکھا ہے۔ اس کے باعث کوئی جادوئی طاقت اسے زیر نہیں کرسکتی۔ تیری ماں کی آتما نے بھی اس سے بدلہ لینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس تعویذ کے آگے اس کی کچھ نہ چلی اور سوائے اسے وقتی مشکلات میں پھنسانے اور اس کے ہاتھوں اس کے دشمنوں کو مروانے کے کچھ نہ کرسکی۔ تیری تپسیا تو تیری ماں سے بہت کم ہے۔ جب وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی تو تو کیا کرسکتی ہے۔“ ”میں اسے اس کے اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں ہلاک کرواؤں گی۔“ سپنا نے اسی کیفیت میں جواب دیا۔ ”کم بخت چھوکری تو شاید یہ نہیں جانتی کہ میں کتنی شکتی کا مالک ہوں اور شاید یہ بھی بھول بیٹھی ہے کہ کوئی آتما جب کسی دوسرے کے جسم میں داخل ہوتی ہے تو اس کی شکتی بھی اسی جسم کی شکتی کے برابر ہوجاتی ہے۔ اس وقت تو ایک عورت کے جسم میں ہے اور تیری شکتی اسی عورت کی اپنی شکتی جتنی رہ گئی ہے، اب میرے وار سے بچ“۔ سادھو نے یہ کہتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ سے زمین پر پڑے مٹھی بھر کے موٹھ اٹھائے سپنا کو مارے۔ سپنا کو لگتے ہوئے موٹھ زمین پر گرے اور سب کو فوراً ہی آگ لگ گئی۔ موٹھوں کے جلتے

ہی سپنا اسی بھاری آواز میں چیخنے لگی۔ ''میں جل گئی، بھگوان کے لیے مجھے معاف کردو'' چیختے اور کراہتے ہوئے سپنا کھڑی ہوگئی۔ وہ اپنے جسم پر یوں ہاتھ مار رہی تھی جیسے آگ بجھا رہی ہو۔ سپنا کی یہ حالت دیکھ کر عمر اور میں بھی کھڑے ہوگئے اور اسے تھامنے لگے ہی تھے کہ سادھو نے ہمیں بلند آواز سے پیچھے ہٹنے کا کہا۔ سپنا کی چیخیں بلند سے بلند تر ہو رہی تھیں اور وہ بغیر پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ سادھو نے پھر مٹھی بھر کر موٹھ سپنا کو مارے۔ یہ موٹھ بھی سپنا کو لگتے ساتھ ہی جل اٹھے۔ سادھو سپنا کو تڑپتے دیکھ کر بولا ''اس کا شریر تو پہلے ہی بھسم ہوچکا تھا آج اس کی آتما بھی جل گئی۔'' تڑپتی تلملاتی سپنا بھی زمین پر ڈھیر ہوچکی تھی۔ سادھو نے پھر ایک مٹھی موٹھ سپنا کو مارے لیکن اس بار اس کو آگ نہیں لگی۔ سادھو نے یہ دیکھ کر کہا۔ ''اس لڑکی کو اب اس گندی آتما سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا ہے اور اسے جلد ہی ہوش آجائے گا'' یہ کہہ کر سادھو نے مجھے کہا ''تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہارے تعویذ کی وجہ سے میری شکتی کم ہوتی جا رہی ہے'' یہ کہہ کر سادھو پھر اپنے جاپ میں مشغول ہوگیا۔ میں نے سپنا کو بازو پکڑ کر ہلایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نقاہت کے مارے اس کے منہ سے بات نہیں نکلی تھی۔ میں نے اور عمر نے اسے پکڑ کر کھڑا کیا اور بازوؤں کے سہارے اسے غار سے باہر لائے۔ سپنا ابھی تک کمزوری کے باعث نیم بیہوش تھی۔ اسی حال میں ہم نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور تیزی سے کوالالمپور کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہمارے آگے عمر کی گاڑی تھی۔ ہوٹل پہنچ کر بھی سپنا اس قابل نہ ہوئی تھی کہ خود لفٹ تک جاسکے۔ ریسپشن سے اس کے کمرے کی چابی لے کر عمر اور میں اسے سہارا دیے اس کے کمرے میں لے گئے اور اسے بیڈ پر لٹا کر کمرہ بند کرکے باہر آگئے۔ عمر نے مجھے بتایا کہ سفلی علم کا یہ ماہر سادھو جادو کرنے اور اتارنے کے ایک ہزار رنگٹ اور بدروح کو بھگانے کے پانچ ہزار رنگٹ فیس لیتا ہے۔ چونکہ مجھے اس کا علم تھا اس لیے واپس آنے سے پہلے میں نے پانچ ہزار رنگٹ کے نوٹ اس کے بائیں جانب پڑے پیالے میں رکھ دیے تھے۔ اگلی صبح میں نے سپنا کو ہاؤس فون کیا تو وہ بڑی تھکی ہوئی اور مضمحل آواز میں بولی ''آپ کے ساتھ Long Drive (لمبی سیر) پر جانے کے لیے میں بالکل تیار تھی۔ پھر نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں اپنے بیڈ پر ایسی گری کے آج صبح ہی ہوش آیا۔ رات میں نے اتنا بھیانک سپنا دیکھا ہے کہ خوف سے ابھی تک کانپ رہی ہوں۔ میں تو جانے کے لیے بالکل تیار تھی اور اب بھی میں نے وہی لباس پہنا ہوا ہے'' میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ اگر طبیعت ناساز ہو تو بھیانک سپنے آتے ہیں۔ تم ناشتہ وغیرہ کرو اور اس وقت تک آرام کرو جب تک تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک نہ ہوجائے۔

اسی صبح دس بجے کے قریب مجھے ریسپشن سے فون آیا کہ پاکستانی سفارت خانے کے دو افسر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ انہیں کافی شاپ میں بٹھایا جائے۔ میں تیار ہوکر وہیں آتا ہوں۔ کافی شاپ میں مجھے ملنے والے ایک فرسٹ سیکریٹری اور سیکنڈ ملٹری اتاچی تھے۔ رسمی علیک سلیک

کے بعد وہ اپنی فرعونیت کو برقرار رکھتے ہوئے مجھ سے میرے کوائف پوچھنے لگے۔ میں نے شروع میں انہیں نہایت تحمل سے جواب دیے۔ شاید انہوں نے میری تحمل مزاجی کو بزدلی سمجھا اور ان کا لہجہ سخت ہوتا گیا۔ میں ان کے اس رویے کو بڑی مشکل سے برداشت کر رہا تھا۔ جب ان کے سوال ذاتی نوعیت پر آگئے تو میری قوت برداشت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ میں نے آخری کوشش سمجھتے ہوئے انہیں کہا کہ میرے پاس ان کو بتانے کے لیے مزید کوئی بات نہیں لہٰذا میں اجازت چاہتا ہوں تو سیکنڈ ملٹری اتاچی نے مجھے اسی فرعونیت کے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا You can't leave this place without my permission (تم میری اجازت کے بغیر یہاں سے نہیں اٹھ سکتے) میرا صبر کا پیمانہ اب لبریز ہوچکا تھا۔ عمر کے بھیجے ہوئے گارڈز لابی میں بیٹھے تھے۔ میں نے بیک وقت سیکنڈ ملٹری اتاچی کو ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور گارڈز کو بلایا۔ تینوں گارڈ بھاگتے ہوئے میرے پاس آگئے۔ میں نے ایک سے پسٹل لیا اور سیکنڈ ملٹری اتاچی کی اس کی نال کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ You insist on my not leaving this place without your permission (کیا تم اب بھی یہی چاہتے ہو کہ تمہاری اجازت کے بغیر میں یہ جگہ نہ چھوڑوں) وہ تو تھپڑ کھانے کے بعد ہکابکا مجھے دیکھتا رہا۔ فرسٹ سیکریٹری چونکہ سیاسی آدمی تھا لہٰذا اس نے پینترا بدلتے ہوئے کہا ''میرے خیال میں کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے میجر۔ تمہیں اتنے سخت لہجے میں ان کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ ہم نے دراصل راجہ تری دیو کے لڑکے کے سفارت خانے آنے اور یہ یقین دلانے پر کہ وہ وفاقی وزیر کا لڑکا ہے، اس کی بات راجہ صاحب سے کروائی۔ راجہ صاحب نے اسی کال کے دوران مجھے کہا کہ اس کی بیوی اور لڑکا کوالالمپور میں ہیں اور اسی کے لڑکے نے اس سے بات کی ہے لہٰذا ہم ہوٹل جاکر پتہ کریں کہ آپ لوگ پاکستان کب جا رہے ہیں۔ ہمارے یہاں آنے کی یہی وجہ تھی اور دوران گفتگو تلخی پیدا ہونے کی کوئی دوسری وجہ نہ تھی'' سیکریٹری خاموش ہوا تو میں نے کہا ''تلخی آپ کے انداز گفتگو سے پیدا ہوئی ہے آپ بیوروکریٹس اور سول سرونٹس خود کو بجائے عوام کے ملازم سمجھنے کے سب کو جانور سمجھتے ہوئے ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ میں راجہ سے آپ کے سامنے ابھی بات کرتا ہوں اور آپ کی اس غلط فہمی کو دور کرواتا ہوں کہ راجہ یا آپ لوگ مجھ کو قطعاً Dictate (حکم دینا) نہیں کرسکتے۔ میں نے کافی ٹیبل سے ہی ایک ٹشو پیپر پر راجے کا ٹیلی فون نمبر لکھا اور ریسپشن کو ہدایت دی کہ لائیٹننگ کال Lightning Call (بہت ہی جلد ملنے والی کال) ملوائیں۔ پندرہ منٹ کے اندر ہی اسسٹنٹ منیجر نے ٹیلی فون ہمارے میز پر رکھتے ہوئے کہا Sir, Your man is on the line (جناب آپ کا مطلوبہ آدمی لائن پر ہے) میں نے راجہ کی آواز پہچانتے ہوئے بغیر علیک سلیک کے کہا ''دیکھو راجہ! میں تمہارے کام سے بڑی جان جوکھوں سے تمہاری بیوی اور لڑکے اور تمہاری مطلوبہ شے کے ساتھ یہاں پہنچا ہوں۔ تمہارا لڑکا کل شام ایمبیسی گیا تھا۔ حالانکہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے لیکن واپسی پر

اس نے بغیر کسی کو بتائے بل ادا کر کے چیک آؤٹ کیا اور تب سے غائب ہے۔ اسے کال بھی ایمبیسی والوں نے کروائی اور پیسے بھی دیے جن سے وہ چیک آؤٹ ہوا۔ آج دس بجے سے فرسٹ سیکریٹری اور سیکنڈ ملٹری اتاچی ہوٹل آ کر مجھ سے تضحیک آمیز لہجے میں الٹے سیدھے سوال پوچھ رہے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے تمہارے لڑکے کو انہوں نے غائب کروالیا ہے۔ پاکستان کے سیاسی حالات تم بہتر جانتے ہو کہ کس نہج پر ہیں۔ شاید یہ تمہارے لڑکے کے عوض تم سے کوئی بات منوانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے میں نے پاکستان لوٹنا چند روز کے لیے ملتوی کر دیا ہے۔ اس دوران میں تمہارے لڑکے کو تلاش کروں گا اور پھر ہم اکٹھے پاکستان آ جائیں گے۔ یہ تو ہے بعد کی ساری بات۔ اب اگر تم اپنے منسٹر ہونے کے زعم میں مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہو تو یہ نہ بھولنا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ کوالالمپور میں ہوں اور تمہاری بیوی، لڑکا اور تمہاری جان سے قیمتی متاع بھی یہیں ہے۔ تمہاری حکومت کسی وقت بھی ڈھے سکتی ہے اور میں تب تک یہاں انتظار کرنا بہتر سمجھوں گا۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ کہ ان Swines (سور کے بچوں کو) کو کہہ دو کہ میرے کام میں روڑے نہ اٹکائیں ورنہ تمہاری بے وقوفی کی سزا تمہارے سمیت انہیں بھی بھگتنی پڑے گی‘‘ راجہ نے میری بات بالکل خاموشی سے سنی اور کہنے لگا ’’مجھے افسوس ہے کہ ان لوگوں نے تمہیں بلاوجہ پریشان کیا۔ انہیں ٹیلی فون دو تاکہ میں انہیں کہہ دوں کہ تمہیں تمہارا کام پوری آزادی سے کرنے دیں۔ مجھ سے صرف یہ وعدہ کرو کہ میری بیوی، لڑکے اور مطلوبہ اشیا کو بحفاظت مجھ تک پہنچا دو گے۔‘‘ میں نے کوئی جواب دیے بغیر ٹیلی فون فرسٹ سیکریٹری کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ راجہ نے اسے کیا کہا لیکن ساری گفتگو کے دوران وہ یس سر، آل رائیٹ سر کے سوا کچھ نہ بولا۔ فون بند کرنے کے بعد فرسٹ سیکریٹری مجھ سے مخاطب ہوا۔ ’’آپ پوری طرح سے تسلی کر لیں ہم نے راجہ کے لڑکے کو صرف فون کال کروائی اور ہزار رنگٹ بطور قرض دیے۔ اس کے بعد ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔ لڑکے کی تلاش میں ہم آپ کی پوری مدد کرنے کو تیار ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر سیکریٹری اور سیکنڈ ملٹری اتاچی نے مجھ سے اپنی درشت رویے کی معافی مانگی اور ہوٹل سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے رضی اور قیصر سے اپنے کمرے میں میٹنگ کی اور آئندہ کے لائحہ عمل سوچنے لگے۔ گزشتہ صفحات میں مسز ڈیوڈ کی موجودگی کا میں نے ذکر نہیں کیا تھا۔ مسز ڈیوڈ ہمارے ہمراہ تھی اور خن سا نے کرسچین نام سے اس کا پاسپورٹ بھی بنوا دیا تھا۔

ہم نے ابھی تک صرف ایک ساتھ مل کر پہلے تو پاکستان کے دشمنوں اور غداروں اور پھر اسلامی ممالک میں یہود و نصاریٰ کی سازشوں کو بے نقاب کرنے اور ان ممالک کی حکومتوں کے ذریعے ان کو کچلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ابھی تک مجھ سے صرف چند ہم خیال ساتھیوں نے اس عظیم مقصد کے لیے شمولیت کا وعدہ کیا تھا۔ ابھی صرف مقصد ہی پیش نظر تھا لیکن اس کے آغاز کرنے کی جگہ اور وقت بھی طے ہوا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، قیصر میرے کہنے پر آگ میں بھی بلا سوچے سمجھے

کود پڑتا لیکن کسی مشن کو ترتیب دینے اور اس کی قیادت کرنے کا اس میں فقدان تھا۔ رضی سے ایسی توقع رکھنی ہی حماقت تھی چنانچہ اس میٹنگ میں جو بھی فیصلے ہوئے، وہ میرے تھے۔ قیصر اور رضی نے بغیر کسی بحث یا اختلاف کے انہیں فوراً مان لیا۔ میں نے اس میٹنگ میں پہلا فیصلہ یہ کیا کہ ہمیں بنکاک کو اپنا بیس کیمپ بنانا چاہئے کیونکہ اول یہاں سے ہم نہ صرف بھارت میں اپنے ہمدرد دوستوں مثلاً حاجی مستان اور یوسف پٹیل سے بآسانی رابطہ کر سکتے ہیں بلکہ عمر، خن سا اور ان کے نمائندوں سے بھی ہم فوری مدد طلب کر سکیں گے۔ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں ہمارے گروپ اور خصوصاً میرے لیے نسبتاً بہت دشواریاں ہوں گی۔ بھارت میں قیصر، اس کے ساتھی اور میں بھارتی حکومت کو مطلوب تھے اور بنگلہ دیش میں بھی ہماری یہی پوزیشن تھی۔ کرنل مزمل کو ملازمت کے دوران ہی شک و شبے سے دیکھا جاتا تھا۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد تو بھارت کی سرپرستی میں بننے والی حکومت اس کی نقل و حرکت پر خصوصی نگاہ رکھتی اور اسی صورتِ حال کا اس کے ہم خیال بنگلہ دیشی ساتھیوں کو بھی سامنا کرنا پڑتا۔ پاکستان میں ان دنوں سیاسی صورت حال ابتر تھی۔ بھٹو کی حکومت کی مخالفت میں مخالف جماعتوں کا نو ستاروں کا اتحاد بن چکا تھا اور بھٹو اپنی حکومت بچانے کے لیے اپنے مخالفین کو کچلنے کے لیے ساری حکومتی مشینری کو استعمال کر رہا تھا۔ خود اس کی حکومت میں بھی عیاش، غدار اور وطن فروشوں کی کمی نہ تھی۔ حکومت کی مخالف سیاسی پارٹیوں کا اتحاد بھی پاکستان کی خیرخواہی یا سلامتی کے لیے نہیں بلکہ لوٹ کھسوٹ میں اپنا حصہ لینے کے لیے بالکل ان مردار خور گدھوں کی طرح تھا جو کسی نیم جان جسم کے گرد حلقہ باندھے اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب اس کی جان نکلے اور وہ اس کا گوشت نوچنا شروع کریں۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں دم سادھے خاموش بیٹھی تھیں کیونکہ بھٹو حکومت نے افواج پاکستان کی تذلیل کر کے ان کے بل و پر نوچ لیے تھے۔ پاکستان کی سلامتی اور بقا کے حاجی شہری کانوں میں انگلیاں ٹھونسے اور آنکھیں بند کیے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ بھٹو کی تشکیل کردہ FSF (فیڈرل سیکیورٹی فورس) جسے میں اور میرے ہم خیال لاکھوں پاکستانی Organised Gang of Armed Gangsters (مسلح غنڈوں کا تربیت یافتہ گروہ) کہتے تھے کے ہاتھوں کسی بھی پاکستان کی عزت محفوظ نہ تھی۔ اس دور اور اس سے پہلے اور بعد کے ادوار کے متعلق انشاء اللہ جانباز کے باب دوئم میں وہ تلخ حقائق لکھوں گا جنہیں دانستہ پاکستانی عوام سے اب تک چھپایا گیا ہے۔ غازی اور جانباز لکھنے اور قارئین تک انہیں پہنچانے کے صلے میں ملکی اور غیر ملکی دشمنوں نے مجھ پر دو بار کراچی میں قاتلانہ حملہ کیا ہے لیکن اللہ پاک کی مدد اور لاکھوں قارئین کی دعاؤں سے میں دونوں حملوں میں بال بال بچ گیا۔ اب ایک شخص نے (میرا قاری نہیں) اخبار کے منتظمین اعلیٰ کو کہا ہے کہ جانباز کو صرف داستان کی حد تک ہی محدود رکھا جائے کیونکہ بقول اس کے بعض لوگوں کو اس داستان میں کبھی کبھی میں جو ملکی حالات پر تبصرہ اور ملکی وسائل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والوں کے متعلق اظہار خیال کرتا ہوں،

وہ پسند نہیں۔ ادھر میری فطرت یا سوچ ایسی ہے کہ میں جب تک اپنی داستان میں ان کے کالے کرتوتوں کو منظر عام پر نہ لاؤں، تو نہ تو میری تسلی ہوتی ہے اور نہ ہی میں سمجھتا ہوں کہ بحیثیت ایک غیر پیشہ ور رائٹر کے میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ میں اچھے کو اچھا اور برے کو برا لکھوں گا۔

میں نے بنکاک کو بیس کیمپ بنانے کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا کیونکہ یہاں میں اور میرے ساتھی بالکل محفوظ اور تھائی حکومت کو مطلوب نہ تھے۔ میرا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ میرے ہمراہ رانی، اس کا بیٹا، سونیا، مسز ڈیوڈ، رضی اور اس کی بیوی، سپنا اور قیصر جائیں گے اور عمر کے نمائندے کو بجائے ہمارا تمام اسلحہ پاکستان بھیجنے کے صرف چار ریوالور، ایک پسٹل اور ان کی وافر مقدار میں گولیاں بھیجنے کا کہا جائے کیونکہ ہمیں پاکستان میں زیادہ قیام نہیں کرنا تھا۔ میرا تیسرا فیصلہ یہ تھا کہ راجہ کے موروثی جواہرات بھی بنکاک کے لاکر سے نکلوا کر ہم اپنے ہمراہ لے جائیں۔ راجہ شکل سے صرف مجھے پہچانتا تھا اس لیے کراچی ایئرپورٹ پر راجہ کی جانب سے اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو صرف میرے ساتھ ہوگی۔ اس لیے جواہرات قیصر اپنے جسم کے ساتھ باندھ کر جائے۔ راجے کے پاس قیصر کی شناخت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لیے وہ عام مسافروں کی طرح کراچی ایئرپورٹ سے بخیریت نکل جائے گا۔ چوتھا فیصلہ یہ تھا کہ میں، قیصر اور رضی اور سپنا اپنا بیشتر روپیہ بنکاک کے کسی بنک میں جمع کروادیں اور بہت کم روپیہ ہمراہ لے جائیں۔ اس فیصلے میں صرف یہ ترمیم کی گئی کہ میرے سوا باقی سارے ساتھی فی الحال کوالالمپور میں کسی بنک میں اکاؤنٹ کھول کر اپنا روپیہ جمع کروادیں۔ میں نے رانی کو اپنا پروگرام بنایا تو اس نے بھی کہا کہ وہ بھی اپنا اکاؤنٹ کوالالمپور میں ہی کھول کر اپنا روپیہ یہیں جمع کروائے گی اور ہمراہ صرف پانچ لاکھ پاکستانی روپے کے سارے ڈالر لے جائے گی۔ سپنا نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ اپنے ہمراہ بہت کم روپیہ پاکستان لے جائے گی۔ میں نے سبھی کو ایک گھنٹے میں تیار ہونے کا کہا اور کوالالمپور کے گرنڈلے بنک میں سب نے اپنے اپنے اکاؤنٹ کھول لیے۔ رانی اپنے بیٹے کی گمشدگی سے پریشان تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ اس کا بیٹا بالکل محفوظ اور خیریت سے ہے اور حفاظتی نقطۂ نظر سے میں نے اپنے ایک دوست کے پاس اسے بھجوادیا ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہی پاکستان جائے گا۔ اس شام میں بنکاک پرواز کرگیا اور اگلی صبح بنک سے جواہرات نکلوا کر اور اپنا روپیہ اور عمر کے دیے ہوئے ٹریولز چیک لاکر میں رکھ کر بعد دوپہر کی فلائٹ سے کوالالمپور لوٹ آیا۔ اب ہم پاکستان روانگی کے لیے بالکل تیار تھے۔

جی تو بہت چاہتا ہے کہ امریکی صدر کلنٹن کی چند گھنٹوں (سٹاپ اوور) پاکستان آمد اور پاکستانی عوام سے خطاب اور قیام پاکستان سے لے کر آج تک کے پاس امریکن تعلقات اور امریکہ کی پاکستان سے ”بے لوث“ دوستی نبھانے کے ان گنت واقعات کے علاوہ صدر کلنٹن کے پاکستانی عوام سے خطاب کے مطابق دنیا بھر میں مسلمان کی فلاح و بہبود“ کے لیے امریکن ”جدوجہد“ اور اس کے

”خوشگوار“ نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے نورالدین زندگی، صلاح الدین ایوبی سے لے کر نواب سراج الدولہ اور ٹیپو شہید تک صلیبی جنگوں کے سلسلے، برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے برصغیر میں شہنشاہ جہانگیر کے دور حکومت میں کسمپرسی کی حالت میں آنے اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر سے ”حسن سلوک“ کے واقعات اور پاکستانی حکمرانوں کے امریکہ پر اندھے اعتماد اور بڈبیڑ (پشاور) میں امریکی فضائیہ کو اڈہ بنانے کی اجازت دینے اور امریکی جاسوس طیارے U-2 کی روس پر پرواز کے دوران گرائے جانے پر روس کے ردعمل سے لے کر کشمیر، عراق، ایران، لیبیا، بوسنیا اور چیچنیا پر مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہا کرنے کے پیچھے خفیہ ہاتھوں کو بے نقاب کردوں اور انشاء اللہ ضرور کروں گا۔ اب صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کشمیر میں مجاہدین، اسامہ بن لادن، داؤد ابراہیم اور ایمل کانسی کو مغربی دنیا میں جسے اب دہشت گرد اور ایسے ہی دوسرے خطابات سے نوازا جارہا ہے۔ ایسے ہی خطابات نورالدین زندگی، صلاح الدین ایوبی، ٹیپو شہید اور نواب سراج الدولہ کو اس وقت مغربی دنیا نے عطا کیے۔ بربر قبائل نے دیگر مسلمانوں کے ساتھ سپین کو فتح کیا تھا۔ اس وقت انگریزی لغت میں ایک نئے لفظ کا بربر فاتحین کی نسب سے اضافہ ہوا۔ Barbarian (ظالم۔ وحشی) Barbarious (ظلم۔ دہشت گردی) اور ہم پاکستانیوں نے اسی انگلش لفظ سے ناسمجھی میں اپنی لغت میں بربریت کا اپنی معنوں میں اضافہ کرلیا۔

رات کو کوالالمپور واپس پہنچ کر میں نے پاکستان روانگی کو آخری ٹچ دیے اور عمر کے نمائندے کو کہا کہ ہم انشاء اللہ پرسوں کی فلائٹ سے پاکستان جانے کو بالکل تیار ہیں اور صرف چار ریوالور، ایک پسٹل اور کافی تعداد میں ان کی گولیاں ہمارے ساتھ بھیجنے کا انتظار کیا جائے۔ پرسوں بھی آگئی اور دو بجے کی لفت ہنسا کی فلائٹ پر ہم کراچی جانے کے لیے ایئرپورٹ پر پہنچے۔ راجے کے لڑکے کو بھی ایئرپورٹ پر ہی لایا گیا۔ دوران پرواز کوئی غلط حرکت کرنے سے روکنے کے لیے اسے مسکن دوا ویلیم valium کی اتنی مقدار کھلا دی گئی تھی کہ وہ تقریباً نیم بیہوش تھا۔ ساڑھے سات گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد ہمارا جہاز کراچی ایئرپورٹ پر اترا۔ پلان کے مطابق پہلے خواتین، پھر میں اور قیصر اور راجے کے لڑکے کو تھامے امیگریشن سے کسٹم سے فارغ ہوکر ایئرپورٹ سے باہر آئے۔ جہاز کا کپتان اور دوسرا عملہ اس دور میں بغیر کسی چیکنگ کے ایئرپورٹ سے باہر آتے تھے۔ ہم ابھی ایئرپورٹ روڈ (اس سڑک کو شاہراہ فیصل کا نام بعد میں دیا گیا) پر ٹیکسیوں میں پہنچے تو لفت ہنسا والوں کی گاڑی میں کپتان ہمارا منتظر تھا۔ اس نے ہمارے اسلحے کا بیگ میرے حوالے کیا اور میرے سب ساتھی میٹروپول ہوٹل میں چیک ان ہوئے جبکہ رانی، اس کا لڑکا اور میں نے پیلس ہوٹل (جہاں آج کل شیریٹن ہوٹل ہے) میں کمرے لیے۔ ہم رات کو تقریباً دس بجے کراچی ایئرپورٹ پر اترے اور رات بارہ بجے ہوٹلوں میں پہنچے۔ میں نے پیلس ہوٹل سے اس وقت راجہ تری دیو کو اس کے گھر پر فون کیا۔ وہ نشے میں دھت تھا اور فون پر دوسری آوازوں سے محسوس ہوا کہ تتلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ہے

میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ کراچی پہنچ چکا ہوں۔ راجے نے نشے میں ڈوبی آواز میں میری بات کاٹتے ہوئے انگریزی میں بولا۔ ''مجھے صرف یہ بتاؤ کہ میری متاع عزیز بھی ساتھ لائے ہو یا نہیں'' میں نے اسے کہا کہ اس وقت تمہاری حالت ایسی نہیں اور نہ ہی تم اکیلے ہو کہ تمام باتیں تمہیں بتائی جائیں۔ میں کل دس بجے صبح تمہیں پھر فون کروں گا۔ اب صرف اتنا جان لو کہ تمہیں کراچی آنا پڑے گا اور رانی سے تمہارے معاملات طے ہوتے ہی تمہارے جواہرات تمہیں مل جائیں گے۔ راجے نے کہا کہ میں کل بعد دوپہر کراچی پہنچ کر قصر ناز میں ٹھہروں گا۔ تم مجھے وہاں پانچ بجے شام ملنا۔ اگلے روز میں نے رانی کے کمرے میں جاکر اسے گزشتہ رات ٹیلی فون پر راجے سے ہونے والی گفتگو کے متعلق بتایا اور کہا کہ میں سونیا کو آج بعد دوپہر رضی کی بیوی اور مسز ڈیوڈ کے پاس چھوڑ آؤں گا۔ راجہ سے شام کو میں، تم اور تمہارا لڑکا ملیں گے۔ اس سے دوٹوک الفاظ میں کہہ دینا کہ تم کراچی میں رہنا چاہتی ہو اور تم جواہرات اسے صرف اسی صورت میں دوگی اگر اس نے تمہاری بات مان لی۔ ''مجھے یقین ہے کہ راجہ تمہاری شرط فوراً مان جائے گا۔ تم اسے صاف کہہ دینا کہ جواہرات بنکاک کے ایک بنک میں محفوظ ہیں اور میں تمہاری تائید کرتے ہوئے انہیں دو روز میں پاکستان منگوانے کی ذمہ داری اٹھالوں گا۔ راجہ ملکی سیاسی حالات کے باعث کراچی میں زیادہ دن ٹھہر نہیں سکتا۔ وہ تمہاری شرط مان کر اسلام آباد واپس چلا جائے گا اور میں دو دنوں میں تمہاری رہائش کے لیے مناسب گھر لے کر تمہیں، سونیا، رضی کی بیوی، سپنا اور مسز ڈیوڈ کو وہاں شفٹ کروں گا۔ راجے کو دو روز بعد دوبارہ فون کرکے میں اسے جواہرات لانے کا بتاکر کراچی بلاؤں گا اور تمہاری موجودگی میں جواہرات میں اسے دوں گا۔ تم اپنے اخراجات لے لینا جو بعد میں تمہارے کام آئیں گے۔'' میری ساری بات سن کر رانی بولی ''میں نے ان جواہرات میں سے اپنے اور اپنے لڑکے کے لیے خاصا حصہ پہلے ہی نکال کر علیحدہ کردیا تھا۔ میں اپنے شوہر کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ اگر اس نے میری بات ماننے سے انکار کیا تو میں اسے اخبارات کے ذریعے عریاں کرنے کی دھمکی دوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ پریس (Press) کا نام سنتے ہی وہ گھبرا جائے گا۔ علاوہ ازیں اس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ جواہرات اس کے ہیں۔ اگر اس نے کوئی حیل و حجت کی تو میں اسے عدالت میں جانے کی دھمکی بھی دوں گی اور جواہرات کے وجود کی قطعی منکر ہوجاؤں گی۔'' رانی کی بات سن کر میں سوچ میں پڑگیا۔ راجہ نہ صرف میرا دوست تھا بلکہ محسن بھی تھا۔ اس کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے میں نے اس مشن پر جانے کی حامی بھری تھی۔ اصولی طور پر ان جواہرات کا مالک راجہ تھا اور اس نے مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ بیش قیمت جواہرات لانے کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ رانی نے جواہرات چھپا کر رکھے ہیں، انہیں رانی سے لے کر سارے جواہرات راجہ کے حوالے کروں گا اور پھر اسے کہوں گا کہ اپنے لڑکے یا کم از کم صرف رانی کے باعزت طور پر رہنے کے لیے کچھ جواہر

اسے دے۔ وہ میری بات مانے یا نہ مانے اس کی مرضی۔ لیکن میں امانت میں خیانت نہ ہونے دوں گا۔ سونیا کی صورت میں رانی پہلے ہی راجہ کی عزت مٹی میں ملاچکی تھی۔ میرے ہوتے ہوئے اور میرے علم میں لاکر میں رانی کو یہ خیانت ہرگز کرنے نہ دوں گا۔

سونیا کے حصول کے لیے میں نے رانی سے جس قدر تعاون کیا تھا اور اس کے راز کو راز ہی رہنے دینے کا وعدہ اور کراچی میں سونیا کے لیے رہائش اور تعلیم کے بندوبست کی ذمہ داری اٹھانے اور اب رانی کے بھی سونیا کے لیے کراچی رہنے کا جو پلان بنایا تھا ان سب کی وجہ ماں کی ممتا کو تسکین ملنے اور معصوم بچی کو ماں کی گود کی گرمی سے علیحدہ نہ کرنا تھی۔ میں نے رانی کو صاف کہہ دیا کہ راجہ کے موروثی تمام جواہرات میں ہر حالت میں راجہ تک پہنچاؤں گا چاہے اس کے لیے مجھے بھاری سے بھاری قیمت ادا کرنی پڑے۔ تمہارے جتنے جائز مطالبے تھے میں نے انہیں فوراً مان لیا صرف سونیا کو (Monastery) عیسائی خانقاہ والوں سے چھڑوانے کے لیے ہم کھلنا گئے اور وہاں اور اس کے بعد ہمیں جن جن مشکلات سے گزرنا پڑا ان سب کا نقطۂ آغاز سونیا تھی۔ کراچی میں سونیا کی معقول رہائش اور تعلیم کے انتظام کی ذمہ داری بھی میں نے تمہارے لیے اٹھائی تھی۔ گزشتہ دنوں تم نے سونیا کے ساتھ ہی کراچی میں رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے اس پر بھی تمہاری تائید میں پلان بنالیا لیکن راجے کے موروثی جواہرات میں سے ایک حصہ اس کی لاعلمی میں غائب کرنے کی میں تمہیں ہرگز اجازت نہ دوں گا۔ اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ وہ تمام جواہرات میرے حوالے کردو۔ رانی نے جواہرات مجھے دینے میں لیت ولعل کرتے ہوئے اپنے دلائل دینے شروع کیے تو میں نے اسے وہیں روک کر کہا۔ ''رانی صاحبہ! ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ جواہرات یا تو اس کمرے میں تمہارے سامان میں موجود ہیں اور اگر تم انہیں رضی کی بیوی یا مسز ڈیوڈ کے حوالے کر آئی ہو تو تم نے بڑی حماقت کی ہے۔ بہرحال جواہرات اگر اس کمرے میں ہیں تو خود ہی مجھے دے دو ورنہ میں کمرے میں تمہارے تمام سامان کے علاوہ ہر اس جگہ کی انہیں تلاش کروں گا جہاں انہیں چھپایا جاسکتا ہے۔ چاہے وہ تمہارا جسم ہی کیوں نہ ہو۔'' رانی بخوبی جانتی تھی کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ وہ صوفے پر سے اٹھی اور باتھ روم کی طرف گئی۔ میں اس کے پیچھے ہی گیا۔ اس نے فلش کے پانی کے ٹینک کا ڈھکن اٹھایا اور پانی میں تربتر چمڑے کی ایک تھیلی نکال کر مجھے تھمادی۔ میں رانی کی چالاکی پر حیران تھا۔ رانی باتھ روم سے باہر نکلی۔ میں بھی اس کے پیچھے باہر آرہا تھا کہ اچانک بجلی کی طرح ایک خیال میرے دماغ میں کوندا۔ میں نے واپس پلٹ کر پانی کی ٹنکی کا ڈھکن اٹھایا اور ہاتھ سے اس کے اندر ادھر ادھر ٹٹولنے لگا۔ اتنی ہی بڑی چمڑے کی ایک اور تھیلی میرے ہاتھ لگی۔ اب تو میں نے باتھ روم کے علاوہ کمرے کے فرنیچر، قالین، پردے، بیڈ اور بستر سب الٹ پلٹ کر رکھ دیے۔ میں نے رانی کے سوٹ کیسوں کی بھی مکمل تلاشی لی۔ ایک سوٹ کیس میں عورتوں کے خصوصی استعمال کے ایک

زیر جامے میں چھپائی ہوئی ایک چھوٹی تھیلی جس میں بھی جواہرات تھے۔ کمرے کی سب چیزوں کی اچھی طرح سے چھان پھٹکنے کے بعد میں نے کمرے میں پڑے ٹیلی فون پر ہاؤس کیپنگ والی دو عورتوں کو بلوایا اور انہیں کہا رانی کی جسمانی تلاشی لیں۔ پہلے تو وہ جھجکیں لیکن میری ایک ہی بھبھکی سے انہوں نے تلاشی لینی شروع کردی۔ رانی کا رنگ فق ہورہا تھا۔ چند منٹوں میں ہی انہوں نے رانی کے جسم کے مختلف حصوں پر بندھی تین تھیلیاں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے یہ چھ تھیلیاں سنبھالیں اور ہاؤس کیپنگ والوں کو کمرے کا سامان درست حالت میں کرنے کا کہہ کر میٹروپول ہوٹل چلا آیا۔ سپنا کو لے کر میں مسز ڈیوڈ کے کمرے میں گیا جہاں سونیا بھی اس کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے سونیا اور مسز ڈیوڈ کے سوٹ کیسوں کی تلاشی لی تو سونیا کے سوٹ کیس کی تہہ میں ایک جگہ ابھری ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے تہہ کا کپڑا کاٹا تو وہاں سے بھی جواہرات سے بھری ایک تھیلی برآمد ہوئی۔ تلاشی کا یہ کام سونیا اور مسز ڈیوڈ کی موجودگی میں ہوا۔ سونیا بڑے غور سے مجھے سوٹ کیسوں کی تلاشی لیتے دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی معصوم تھی کہ سوٹ کیس سے تھیلی نکلتے دیکھ کر انگلش میں بولی ”انکل! ممی نے ایسی ہی ایک تھیلی میری کمر کے گرد بھی باندھ دی ہے اور ایک تھیلی آنٹی (مسز ڈیوڈ) کو بھی دی ہے۔“ معصوم بچی کے اس راز کو افشا کرنے پر میں مسکرادیا اور مسز ڈیوڈ کا چہرہ خوف کے پسینے سے بھیگ گیا۔ سونیا نے اپنی تھیلی خود مجھے دی اور مسز ڈیوڈ نے خاموشی سے اپنے سوٹ کیس میں سے تھیلی نکال کر مجھے دی۔ میں نے رضی اور اس کی بیوی سے بھی کرید کرید کر پوچھا لیکن انہوں نے قسمیں اٹھائیں کہ انہیں رانی نے ایسی کوئی چیز نہیں دی۔ رانے کے چھپائے ہوئے جواہرات کی آٹھ تھیلیاں اب میرے پاس تھیں۔ میں نے رضی اور قیصر کو کہا کہ میں ساڑھے چار بجے انہیں لینے کے لیے میٹروپول ہوٹل آؤں گا وہ مسلح حالت میں تیار رہیں۔ میں نے ایک پسٹل و میگزین ایک ریوالور اور ان کی فالتو گولیاں بھی لے لیں۔ قیصر کے پاس راجہ کے سارے جواہرات تھے۔ میں نے ان آٹھ تھیلیوں والے جواہرات بھی ان میں شامل کردیے اور اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ مسز ڈیوڈ کو بھی جو تھیلی مجھے دینے کے بعد آنکھیں ملانے سے کترا رہی تھی یہ کہا کہ وہ خود اور سونیا کو بھی ساڑھے چار بجے تک تیار کرکے میرا یا قیصر کا انتظار کریں۔

میں نے اپنی زندگی کے بڑے بڑے فیصلے چند لمحوں میں کیے تھے اور ان میں اللہ پاک نے مجھے ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار کیا۔ آج بھی ایک ایسا ہی مرحلہ درپیش تھا اور میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جس مشن پر راجہ تری دیو رائے نے مجھے بھیجا تھا اس کا آخری سین آج ہی مکمل ہوجائے۔ خوش اسلوبی سے یا گولیوں سے میں اس کا ڈراپ سین آج ہی کرنا چاہتا تھا۔ شام ٹھیک ساڑھے چار بجے میں قیصر، رضی، سونیا اور مسز ڈیوڈ کو قصر ناز کے سامنے جم خانہ کلب کی لاؤنج میں بٹھا کر پیلس ہوٹل چلیں ہوٹل سے رانی اور اس کے لڑکے کو لے کر قصر ناز چلا آیا۔ قارئین کو علم ہوگا کہ میٹروپول ہوٹل اور

پیلس ہوٹل (موجود شیرٹین ہوٹل) بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھے اور ان دونوں کے درمیان قصرناز اور جم خانہ کلب ہے۔ ٹھیک پانچ بجے قصرناز کی ریسپشن سے میں نے راجہ تری دیو کے کمرے میں فون کیا۔ راجہ کے سیکریٹری نے فوراً ہی ہمیں راجہ کے سوائٹ میں بلالیا۔ میں رانی اور راجے کے لڑکے کے ہمراہ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

رانی نے آگے بڑھ کر اس کے قدم چھوئے اور لڑکا اس کے پیروں کو چھو کر اس سے لپٹ گیا۔ چند منٹ بیوی اور لڑکے سے باتیں کرنے کے بعد راجہ نے اپنے لڑکے کو اپنے سیکریٹری کے کمرے میں بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد راجہ نے مجھ سے پوچھا ”سونیا کہاں ہے؟“ میں حیران تھا کہ راجہ کو سونیا کے متعلق کیونکر معلوم ہوا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ راجہ کو کیا جواب دوں۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی جسے راجہ نے ہی توڑتے ہوئے کہا ”رفیق الاسلام مجھ سے سونیا کی پرورش کے لیے دو ماہ پہلے تک خرچ لیتا رہا ہے اور میں بنگلہ دیش میں مقیم اپنے دوستوں کے ذریعے اس کے تمام مطالبات پورے کرتا رہا ہوں“ یہ اچنبھے کا پہاڑ تھا جو رانی اور مجھ پر ٹوٹا۔ میں نے راجہ کو کہا ”رفیق الاسلام کو تو میں جہنم واصل کرچکا ہوں لیکن سونیا میرے ساتھ ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نہ تو اسے کسی بات کا علم ہے اور نہ ہی وہ آپ کی زندگی میں کبھی دخیل ہوگی۔“ راجہ مسلسل شراب پیے جارہا تھا۔ راجہ نے ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ”سونیا کو بلاؤ“ میں کمرے سے باہر آیا اور جم خانہ کلب سے سونیا، قیصر، رضی اور مسز ڈیوڈ کو ساتھ لے کر قصرناز کی ریسپشن میں بٹھایا اور قیصر اور رضی کو اپنے اسلحے پر مضبوط گرفت رکھنے کا کہہ کر سونیا کو لے کر راجہ کے کمرے میں چلا آیا۔ راجہ مسلسل شراب کے جام پر جام چڑھا کر اپنی بیوی کی حماقت کی وجہ سے اپنی رسوائی اور سارا سانحے کا مجھے علم ہونے کے باعث شرمندگی اور اپنی خاندانی عزت کی دھجیاں بکھرنے کی وجہ سے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ سونیا نے اسے گڈ ایوننگ سر کہا۔ راجہ نے اسے اپنے قریب بلایا اور اسے پیار کرتے ہوئے اس کے ماتھے کو چوما اور صرف دو مرتبہ کاش، کاش کہہ کر خاموش ہوگیا۔ انتہائی ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا ”اگر میرے جواہرات یہاں ہوتے تو...“ لوہا گرم اور اس پر چوٹ لگانے کا یہ صحیح موقع تھا۔ ”راجہ صاحب! جواہرات یہیں ہیں اور ابھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔“ میں فوری ریسپشن پر آیا اور سارے جواہرات جو قیصر نے ایک سوٹ کیس میں ڈال رکھے تھے لے کر راجہ کے کمرے میں آیا اور سوٹ کیس اس کے سامنے کھول دیا۔ یہ ایسا جذباتی منظر تھا جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے اور قلم اس کی مکمل عکاسی کرنے سے معذور ہے۔ راجہ نے سوٹ کیس میں پڑے جواہرات پر اچٹتی نگاہ ڈالی۔ پھر رانی اور سونیا پر نگاہیں گھماتے ہوئے میرے چہرے پر نظریں جمالیں۔ شاید بھری دنیا میں مجھ اکیلے کو ہی وہ اپنا ہمدرد سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھے کہا ”ان جواہرات کے برابر چار حصے کرو“

میں نے اپنی دانست میں جواہرات کی قسم، سائز اور مول کے مطابق ان کے چار حصے کر کے راجہ کے سامنے پڑی میز پر چار ڈھیریاں بنادیں۔ راجہ نے ڈھیریاں دیکھتے ہوئے ان میں چند جواہرات کو رد و بدل کیا کیونکہ اسے جواہرات کی پہچان تھی۔ اس کے بعد راجہ صوفے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا اور رانی کو مخاطب کر کے بولا۔ ''ایک ڈھیری تمہارے لیے اور ایک سونیا کے لیے ہے۔ ان میں سے اپنی پسند کی دو ڈھیریاں اٹھالو۔ باقی کی دو ڈھیریاں میرے اور میرے لڑکے کے لیے ہیں'' پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''تم نے دوستی کا حق ادا کردیا ہے۔ باقی کی دونوں ڈھیریوں میں سے جتنے چاہے جواہرات لے لو پھر بھی میں تمہارے احسان کا بدلہ اتار نہ سکوں گا۔ ایک اور آخری احسان مجھ پر کرو۔ سونیا مسلمان کی بیٹی ہے۔ اسے مسلمان کر کے کسی معقول اور شریف گھرانے میں اس کی پرورش اور قیام کا انتظام کردو۔'' میں نے کہا ''رانی صاحبہ بھی یہی چاہتی ہیں اور وہ خود بھی کراچی میں رہ کر سونیا کی پرورش کرنا چاہتی ہیں۔'' ''یہی سب سے مناسب رہے گا۔ میں نے وزارات سے استعفٰی دے دیا تھا۔ بھٹو صاحب نے مجھے جنوبی امریکہ میں سفیر مقرر کرنے کا وعدہ کیا ہے اور میں صرف تمہاری واپسی کے انتظار میں تھا۔ جو حالات بیت چکے ہیں ان میں رانی کا میرے ساتھ رہنا ناممکن ہے اس لیے تم ان کی کراچی میں رہائش کا انتظام کردو اور سونیا بھی ان کے ساتھ ہی رہے لیکن اسے مسلمان ضرور کرنا۔'' رانی کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے خاموشی سے دو ڈھیریاں اٹھائیں۔ رانی کے چھپائے ہوئے جواہرات سے یہ تقریباً دگنے سے بھی زیادہ مالیت کی تھیں۔ رانی کے جواہرات میں نے باتھ روم سے ایک بڑا تولیہ لے کر اور اس میں باندھ کر رانی کے حوالے کیے اور باقی جواہرات سوٹ کیس میں ڈال کر اسے بند کرنے لگا تو راجہ نے کہا ''دوست! تم نے اپنے لیے کچھ نہیں لیا۔'' ''مجھے بالکل ضرورت نہیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں آپ کی امانت آپ تک بخیریت پہنچانے میں کامیاب ہوا ہوں اور اللہ پاک نے مجھے سرخرو کیا ہے۔'' راجہ نے روتی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تمہیں یہ بھی علم ہے کہ ہمارے ہاں سے کوئی خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔'' یہ کہتے ہوئے راجہ نے ایک مٹھی میں جس قدر جواہرات آسکتے تھے، مجھے دینے چاہے لیکن میں نے انکار کردیا اور اس کے بہت زور دینے پر صرف ایک ٹکڑا اٹھالیا۔ راجہ نے سونیا کو پھر قریب بلا کر اسے پیار کیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ یہ ہمارے لیے جانے کا پیغام تھا۔ رانی، سونیا اور میں راجہ کے کمرے سے باہر نکلے اور میں سوچ رہا تھا کہ میں نے کسی غلط آدمی کے لیے اپنی جان کی بازی نہیں لگائی تھی۔

جانباز۔ دوم

پہلا باب

جانباز کے حصہ دوئم کے آغاز میں میں حصہ اول کی آخری قسط میں تشنہ جواب واقعات بیان کرتا ہوں۔ راجہ تری دیو سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ بھٹو صاحب کے دورِ حکومت کے آخری ایام میں اسے جنوبی امریکا کے کسی ملک میں سفیر بنا دیا گیا تھا۔ راجہ نے اپنے بیٹے کو انگلینڈ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا اور خود ایک فرانسیسی عورت سے شادی رچالی اور کچھ عرصے بعد ہی وہ عورت راجہ کے بچے کھچے جوہرات لے کر یورپ بھاگ گئی۔ میں نے نرسری میں کرائے پر ایک بنگلہ لے کر رانی، سونیا، رضی کی بیوی اور مسز ڈیوڈ کو وہاں شفٹ کر دیا۔ سونیا کو ایک سادہ سی تقریب میں مشرف با اسلام کیا گیا۔ رانی کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال ہوگیا۔ اس وقت میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بنکاک میں تھا۔ مسز ڈیوڈ نے فون پر مجھے اس کے انتقال کی خبر سنائی۔ سونیا کو میں نے کراچی کے ایک اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ سونیا کا جو ماں کے مرنے کے بعد پھر اکیلی رہ گئی تھی، رضی کی بیوی اور مسز ڈیوڈ نے پورا خیال رکھا اور اسے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ سونیا نے شروع زندگی سے ہی اکیلے رہنے کی عادت کی وجہ سے ماں کی جدائی کے صدمے کو بھی برداشت کرلیا۔ کراچی میں میرے ایک بزنس مین دوست نے سونیا کی دیکھ بھال اور خبر گیری کا ذمہ اٹھایا تھا۔ سونیا نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تو میرے دوست نے اپنے بیٹے سے اس کی شادی کر دی۔ ہم نے حتی الوسع یہ کوشش کی کہ سونیا کے ماضی کا کسی کو علم نہ ہو سکے۔ آج کل سونیا کراچی میں اپنے محبت کرنے والے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ ڈیفنس میں اپنی ذاتی کوٹھی میں نہایت خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ میں کبھی کبھار اس سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں یاسیت چھا جاتی ہے کیوں کہ اسے

اپنا ماضی یاد آجاتا ہے۔ اس نے شروع میں مجھے بتایا تھا کہ شادی سے پہلے اور بعد میں بھی اس کے سسرال والوں نے بھی کبھی اس کا ماضی کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے دوست اور سونیا کے سسر نے بھی جسے میں مختصراً سونیا کا ماضی بتا چکا تھا، اس راز کو ہمیشہ راز ہی رہنے دیا۔ سونیا کے متعلق اس نے سب کو یہی کہا کہ وہ اس کے ایک مشرقی پاکستانی دوست کی بیٹی ہے جو سقوط ڈھاکا کے وقت کھلنا میں تھے اور زخمی حالت میں بڑی مشکل سے جان بچا کر اور صرف سونیا کو لے کر کراچی پہنچ سکے اور چند ہفتوں بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ سونیا بالکل اکیلی رہ گئی تو انھوں نے سونیا کو اپنالیا اور اس کے جوان ہونے پر اپنے بیٹے سے اس کی شادی کردی۔ میں جان بوجھ کر سونیا کا اسلامی نام تحریر نہیں کررہا ہوں کیوں کہ میں نے اسے گزشتہ ماہ ہی بتایا تھا کہ کائنات اخبار میں اپنی داستان جانباز میں اس کا پورا واقعہ تحریر کروں گا لیکن کوئی ایسا Clue (اشارہ) نہیں دوں گا جس سے کوئی اس تک پہنچ سکے۔ پاکستان میں ہمارے مختصر قیام کے دوران سپنا بھی رانی، سونیا اور دوسری خواتین کے ہمراہ اسی نرسری والے بنگلے میں رہی جب کہ قیصر، رضی اور میں میٹرو پول ہوٹل میں مقیم رہے۔

میرے پاس ڈھیروں روپیہ بھی تھا اور اپنے گاؤں جانے کی بے انتہا خواہش بھی تھی لیکن میں اپنے گھریلو حالات کے پیش نظر گھر جانے سے ڈرتا تھا۔ اسی سوچ بچار میں چند روز گزر گئے لیکن اپنی ماں اور اپنے بیٹے کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں بالآخر چند روز کے لیے اپنے گاؤں چلا گیا۔ اپنے گاؤں کے قریبی قصبے میں ویگن سے اتر کر تانگے میں سوار ہوا تو میرا دل بلیوں اچھل رہا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ گاؤں پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی۔ گھر کے قریب تانگہ رکا تو رشتے دار اور گاؤں کے لوگ جمع ہوگئے۔ ان میں میرا بیٹا شجاع بھی تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۶ برس کے قریب تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر سینے سے لپٹالیا۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کراچی اور لاہور سے گھر والوں کے لیے اتنی خریداری کی تھی کہ تین تانگوں میں بہ مشکل سارا سامان آسکا۔ میرے تایا زاد سب سے بڑے بھائی نے مجھے گھر جانے سے پہلے علیحدہ بلا کر کہا کہ ضبط اور تحمل سے کام لینا۔ میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ اپنے بیٹے اور بھائی صاحب کے ہمراہ میں گھر میں داخل ہوا۔ میرا گھر جو میری شادی سے پہلے جنت کی طرح دکھائی دیتا تھا اب اجاڑ اور ویرانی کا شاہ کار بنا ہوا تھا۔ گھر کے صحن میں جہاں پہلے مہکتے پھولوں کی کیاریاں تھی، پھل دار درخت اور درمیان میں فوارہ تھا، وہاں اب ہر طرف خودرو گھاس اور سوکھے پتے تھے۔ میں گھر کے اندر داخل ہوا تو میری والدہ ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھیں اور اچھے وقتوں کی ایک خادمہ ان کے پاؤں داب رہی تھی۔ میں تو انھیں اچھا بھلا اور تن درست چھوڑ کر گیا تھا لیکن اب وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھیں۔ میں ان کے قدموں میں بیٹھنے لگا تو انھوں نے بڑی مشکل سے اٹھ کر مجھے گلے لگالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میرا تایا زاد بھائی قریبی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ والدہ بار بار میرے ماتھے اور چہرے کو چومتیں۔ جب ان کا رونا کچھ تھما تو میں نے ان سے پوچھا کہ ان

کی یہ کیا حالت ہوچکی ہے تو انھوں نے کہا۔ ''کچھ بیمار رہی ہوں۔ اب ٹھیک ہوجاؤں گی۔'' اسی اثنا میں تانگوں سے سارا سامان اٹھا کر ہمارے برآمدے میں رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے بیوی کے متعلق پوچھا تو والدہ تو خاموش رہیں لیکن خادمہ پھٹ پڑی۔ ''اسی نے ان کی یہ حالت بنادی ہے۔ سارا دن گھر سے باہر رہتی ہے اور جتنا وقت گھر میں رہتی ہے، اماں جی کو کوسنے دیتی اور بلاوجہ جھگڑتی رہتی ہے۔'' خادمہ نے ہی مجھے بتایا کہ اس نے اپنا الگ چولھا بنالیا ہے۔ یعنی میرے گھر میں جس کے ۱۱ کمرے ہیں اور صرف میری ماں، بیوی اور ۶ سال کا بچہ رہتا ہے، دو الگ الگ چولھے جلتے ہیں۔ خادمہ نے یہ بھی بتایا کہ اماں جی اپنی ضعیفی اور بیماری کی وجہ سے خود تو کچھ پکانے سے معذور ہیں جب بھی وقت ملتا ہے، وہ آکر اماں جی کے لیے پرہیزی کھانا بنا دیتی ہے ورنہ یا تو وہ بھوکی رہتی ہیں یا تایا زاد کے گھر سے ان کے لیے کھانا آجاتا ہے، میرا لڑکا شجاع بھی گھریلو حالات کی خرابی سے ہر وقت سہما سہما رہتا ہے۔ گاؤں میں بات فوراً پھیل جاتی ہے۔ میری بیوی کو پتا چلا تو وہ معمول سے پہلے ہی گھر لوٹ آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری بیوی کو میرا گھر آنا ناگوار گزرا ہے کیوں کہ وہ تو اس انتظار میں گھڑیاں گن رہی تھی کہ کب یہ بڑھیا (میری والدہ) مرتی ہے اور وہ اپنے میکے والوں کے ساتھ ہر شے پر قابض ہوجاتی ہے۔ میں جو گھر سے باہر دھاڑتا تھا اور دشمنوں کو ہلاک کرتے وقت چوہے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، اپنے گھر میں خود چوہا بن جاتا تھا۔ جس کی صرف اور صرف وجہ یہ تھی کہ میری والدہ اپنے پوتے یعنی میرے بیٹے سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ اس بار بھی میں نے گھر کی اور والدہ کی حالت زار دیکھتے ہوئے والدہ کو کہا کہ میں بیوی کو طلاق دیتا ہوں تاکہ آپ کی بھی اس مسلسل عذاب سے جان چھوٹے اور اس عورت کے گھر میں ہمہ وقت ہنگامہ بپا کرنے سے گاؤں والے جو ہمارے خاندان کی بے حد عزت کرتے ہیں اور اب ان کی عورتیں اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر اس عورت کی یاوہ گوئی سے ہر روز محظوظ ہوتی ہیں اس سے بھی چھٹکارا ملے۔ لیکن والدہ نے میرے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ ایسا ہرگز نہ کرنا۔ میں شجاع کی جدائی برداشت نہیں کرسکتی اور اس کے لیے میں ہر ظلم سہنے کو تیار ہوں۔ میری بیوی کو صرف میرے لائے ہوئے سامان سے دلچسپی تھی، قصہ کوتاہ میں اگلے روز ٹیکسی میں والدہ کو راولپنڈی لے گیا اور ملٹری اسپتال (MH) میں داخل کروا دیا۔ میری والدہ کی صحت ۱۹ روز MH میں علاج کے بعد کچھ بہتر ہوئی اور ان کے بے حد زور دینے کے بعد میں انھیں گاؤں واپس لے آیا۔

قارئین! میں نے جانباز کے اس سلسلے میں اپنی ذاتی زندگی کے اس پہلو کو اس لیے تحریر کیا ہے کہ انھیں یہ بتا سکوں کہ میں شروع زندگی سے ہی اس خون خرابے اور اپنی زندگی کو خطروں میں ڈالنے کا عادی نہ تھا۔ اسکول اور کالج اور اس کے بعد ملازمت کے دوران... شادی سے پہلے میں بڑا ہنسنے والا، کھلنڈرا اور شوخ تھا۔ دوست مجھے جانِ محفل اور One Man Show (محفل کو گرمانے والا) کہتے تھے۔ موسیقی سے مجھے بڑا لگاؤ تھا۔ شادی کے بعد مزاجوں کے اختلاف اور جھگڑوں نے میری زندگی کی تمام رنگینیوں

کو مجھ سے چھین لیا۔ خاندانی عزت و وقار کی اپنی بیوی کے ہاتھوں دھجیاں بکھرتے دیکھ کر میں ضبط کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ گیا جہاں میرے چہرے پر کرختگی اور دل میں انتقام کے شعلے مسلسل بھڑکنے لگے۔ ان جذبات کے نکاس کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ انھی حالات میں ۷۱ء کے دسمبر میں سقوطِ ڈھاکا ہوا۔ میں اپنے گھر میں اپنے اور اپنے خاندان کی دشمن بیوی کے خلاف تو والدہ کی منت سماجت کی وجہ سے کچھ نہ کرسکتا تھا، لیکن ملک و ملت کے دشمن بھارت کے ہاتھوں تذلیل کو برداشت نہ کرسکا کیوں کہ اس تذلیل کا بدلہ لینے سے مجھے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ میں جو گھریلو حالات کی سنگینی کو ضبط کرتے کرتے دم گھٹ ہوچکا تھا اور میری نفرت کے لاوے کو نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملتا تھا، اسے نکالنے کے لیے بھارت سے بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ ہر دشمن کو ہلاک کرتے وقت میرے ذہن کے کسی گوشے میں اپنی سابقہ بیوی کا تصور ضرور ابھرتا جس نے میرے جنت جیسے گھر کو جہنم بنا دیا تھا۔ قارئین گرامی! میرا گھر کسی آنے والی دلہن کے لیے ہمارے معاشرے کے مطابق ایک مثالی گھر سمجھا جاتا تھا۔ نہ سسر، نہ دیور، نہ کوئی نند یا جیٹھانی اور دیورانی کوئی نہ تھا۔ صرف شوہر اور اس کی ضعیف والدہ تھی۔ اور والدہ بھی کوئی جاہل یا ان پڑھ نہیں بلکہ اپنے وقتوں کی میٹرک جنھیں عربی، فارسی اور انگریزی پر یکساں دسترس تھی۔ اگر میری بیوی چاہتی تو میرے گھر کو مثالی گھر بناسکتی تھی۔ لیکن اس کی تو صرف ایک ہی خواہش تھی کہ یہ بڑھیا (میری والدہ) جلد از جلد مرے اور وہ اپنی ماں، بھائیوں اور بہنوں کو میرے گھر میں لا بسائے۔ کیوں کہ میری شادی کے وقت اس کی ماں دارالامان میں، دونوں بھائی راولپنڈی ٹرنک بازار کے یتیم خانے میں اور تین بہنیں استانیوں کے گھروں میں رہتی تھیں۔ میری والدہ نے خدا ترسی کرتے ہوئے اس عورت سے میری شادی کی تھی اور اپنے خاندان میں ناک رکھنے کے لیے ڈھیر سا زیور، کپڑے اور دیگر سامان شادی سے پہلے ہی خرید کر اسے دلہن کے جہیز کے طور پر گھر لائی تھیں۔ اس مصیبت سے شرعی طور پر ۱۷ فروری ۸۴ء کو ینبع سعودی عربیہ میں اور قانونی طور پر ۳۰ ستمبر ۸۹ء کو طلاق دے کر جان چھوٹی۔ جانباز تحریر کرتے وقت ماضی کا ایک ایک واقعہ ایک فلم کی طرح میرے ذہن کے پردے پر دکھائی دیتا ہے۔ جیسے اور واقعات تحریر کرکے قارئین کو میں نے اپنے ہر اچھے برے کام سے آگاہ کیا ہے اور کروں گا، ویسے ہی اپنی ذاتی زندگی کے اس گوشے سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے کیوں کہ آخر کار میں بھی انسان ہوں اور اپنی زندگی کے اس تلخ حصے کو آخر کب تک دل میں چھپائے رکھتا۔۔۔

☆☆

والدہ کی بیماری اور MH میں ان کے داخلے کے دوران میں اٹھارہ انیس روز راولپنڈی میں رہا۔ دوسرے روز ہی میں اپنے سابقہ محکمے کے دفتر میں گیا اور سینئر متعلقہ افسران کو گوکھلے کی ڈائری دی۔ جس میں ان پاکستانی سیاست دانوں، کاروباری افراد اور سرکاری افسران کے نام، پتے اور کوڈ نمبروں کے علاوہ وہ رقوم درج تھیں جو گوکھلے کے پاکستانی روابط کے ذریعے ان غداروں تک پہنچائی جاتی تھیں

جنھوں نے بظاہر تو حب الوطنی اور قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا لیکن اندرونی طور پر بھارت کے مفاد میں کام کرتے ہوئے پاکستان کی جڑیں کاٹنے اور بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں مشغول تھے۔ پاکستان کے خلاف یہ کام انتہائی منظم طریقے سے ہورہا تھا اور اس میں چوٹی سے لے کر نیچے تک کے سیاست دان اور نوکر شاہی کے افراد شامل تھے۔ ڈائری میں ان کے نام اور کرتوت دیکھ کر میرے محکمے کے افسران دانتوں میں انگلیاں داب کر بیٹھ گئے۔ انھیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ غدارانِ وطن کی گرفت کہاں سے شروع کریں۔ اس دور میں حکمرانوں نے پاکستانی فوج کی اتنی تذلیل کردی تھی کہ وہ اپنی بارکوں میں دبکی بیٹھی تھی۔ مسلح غنڈوں کا گروہ F.S.F (Federal Security Force) (Gang Of Organised Gangsters) والے ہر طرف دندناتے پھرتے تھے۔ وہ حکمرانوں کو خوش کرنے کے لیے سیاسی مخالفین کو پکڑ کر لے جاتے اور پھر ان کا کچھ پتا نہ چلتا۔ اس بھیانک خواب جیسی حکومت کے خاتمے کے بعد FSF کے پکڑے ہوئے بعض افراد تو دلائی کیمپ (مظفر آباد، آزاد کشمیر کے قریب) اٹک کے قلعے اور شاہی قلعہ لاہور کے زیر زمین عقوبت خانوں سے ملے اور بہت سوں کا کچھ پتا نہ چلا کہ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

اس وقت میں اپنے سابقہ محکمے کا ملازم نہ تھا۔ میں نے یہ ڈائری متعلقہ افسران تک پہنچا کر اپنا فرض پورا کردیا تھا۔ رسمی باتوں کے علاوہ میں نے اپنے سابقہ افسران کو نہ تو یہ بتایا کہ یہ ڈائری کیوں کر میرے ہاتھ لگی اور نہ ہی انھیں اپنے آئندہ کے پروگرام کا پتا چلنے دیا۔ انھوں نے بھی مجھے تھوڑا بہت کریدنے کے بعد اس بارے میں خاموشی اختیار کرلی۔ مجھے تو یہ خاصے عرصے بعد اسی محکمے کے ایک اعلیٰ افسر رڈ ربن (Red Ribbon) کے ذریعے پتا چلا کہ محکمے کے ایک اعلیٰ افسر نے دلیری دکھاتے ہوئے یہ ڈائری اس وقت کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل ضیا الحق کے سامنے پیش کردی تھی۔ جنرل صاحب بھی حالات پر پوری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ڈائری میں حزبِ اقتدار کے علاوہ حزبِ اختلاف اور ۹ ستاروں کے اتحادیوں میں سے بھی کئی شخصیتوں کے نام درج تھے۔ جب ان دونوں نے ملک کی بندر بانٹ کرنے کے لیے آپس میں گٹھ جوڑ کرلیا اور رات کے ۱۲ بجے ملک کی سب پارٹیوں نے متفقہ راضی نامے پر دستخط کردیے تو ان کے ارادوں کو جانتے ہوئے اسی رات جنرل ضیا الحق نے مارشل لا نافذ کردیا۔

راولپنڈی MH میں بہترین علاج اور مناسب دیکھ بھال کے باعث میری والدہ تیزی سے صحت یابی کی طرف لوٹ رہی تھیں۔ اپنے بے لوث دوستوں راجا سرفراز، اعجاز، حسین احمد حسینی، افتخار، ابوالحسن شاہ اور سلیم میرزا کے ساتھ گزارے ہوئے یہ پندرہ دن میری جھلسی ہوئی زندگی میں باغ و بہار اور مہکتی ہوئی ہواؤں اور سکون کی تھپکیاں دیتے ہوئے لمحات میں بہت جلد گزر گئے۔ بیسویں روز میں اپنی والدہ کو لے کر واپس گاؤں پہنچا۔ میری والدہ کے چہرے پر زندگی کی چمک لوٹ آئی تھی۔ گاؤں میں میں نے دو مستقل ملازمائیں والدہ کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے مقرر کیں اور دو بینکوں میں

والدہ کے نام ۱۰لاکھ روپے جمع کروائے۔ بیوی کو بھی آخری موقع دیتے ہوئے ۶ ہندسوں میں اس کے نام سے اکاؤنٹ کھولا۔ دس بارہ مزدوروں اور مستریوں کے ساتھ گھر کی حالت درست کروائی اور ۵ روز گھر میں قیام کرنے کے بعد روانہ ہونے لگا۔ گاؤں آتے وقت میں تین تانگوں میں سامان بھر کر لایا تھا۔ جاتے وقت صرف ایک چھوٹا سوٹ کیس میرے ہمراہ تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ مزید چند روز گھر میں ٹھہروں لیکن میری والدہ نے زور دے دے کر مجھے واپس بھیجا کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ میری بدخصلت بیوی میری موجودگی میں کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھے جسے میں برداشت نہ کرسکوں اور نوبت خون خرابے تک پہنچے۔ مجھے گاؤں سے واپس جانے کا کہتے ہوئے انھوں نے آنسو بھری آنکھوں اور لرزتی آواز میں مجھے کہا۔ ”اب تم واپس چلے جاؤ۔ میں ہر قسم کا ظلم وستم سہنے کے لیے تیار ہوں لیکن تمھیں اپنی آنکھوں سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھوتے دیکھ نہیں سکوں گی۔ تمھیں بھی میرے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ تم نے میری دیکھ بھال اور خدمت کے لیے بہت معقول انتظام کردیا ہے اور رشتے دار بھی پیسے کے لالچ میں میری خبر گیری کریں گے۔“ میں بخوبی جانتا تھا کہ میری والدہ مجھے طفل تسلیاں دے رہی ہیں۔ بیوی کے نام خاصی بڑی رقم میں نے انھی کے کہنے پر بینک میں رکھوائی تھی کہ وہ ان پر ظلم وستم کرنے سے باز رہے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ سانپ کو کتنا ہی دودھ کیوں نہ پلا دو وہ ڈسنے سے باز نہیں رہتا۔ گاؤں سے میں پھر راولپنڈی آیا اور دو روز اپنے محکمے کے ایک ایسے افسر سے جو مجھ سے بے حد پرخلوص تھے (انھوں نے بھارت سے میری پہلی بار واپسی پر میرے انجام دیے مشنوں کے پیش نظر میری رپورٹ بناتے وقت آخر میں یہ الفاظ لکھے تھے۔ ”یہ شخص اپنے وطن کی محبت میں اپنی زندگی کے ساتھ غنڈہ گردی کرتا ہے“) اسرائیلی موساد اور امریکن CIA کے گٹھ جوڑ کے متعلق چند نہایت مفید معلومات حاصل کیں۔ یہ تمام معلومات Of The Record (غیر سرکاری) طور پر مجھے دی گئیں اور ان کی روشنی میں ایران اور سعودی عرب میں ان جاسوس ایجنسیوں سے دو دو ہاتھ کرنے میں مجھے بہت مدد ملی۔ راولپنڈی سے بذریعہ جہاز میں کراچی پہنچا۔ کراچی میں ہمارے قیام کے دوران ہی جنرل ضیا الحق نے مارشل لا لگا دیا اور بین الاقوامی پروازوں پر ملک سے باہر جانے والوں کی سختی سے جانچ پڑتال کی جانے لگی۔ ہمارا اب کراچی میں مزید رکنا بے سود تھا۔ کراچی میں ایک بہت اونچے درجے کے سابقہ بیوروکریٹ جو میری کراچی میں ٹیکنیشن ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کے دوران میرے افسر اعلیٰ تھے، کی وساطت سے ہم بآسانی بینکاک کے لیے پرواز کر گئے۔ جانے سے پہلے ہم رانی، سونیا، مسز ڈیوڈ اور رضی کی بیوی سے ملے۔ میں نے رضی کی بیوی اور مسز ڈیوڈ کو خاصی رقم دی تاکہ انھیں کوئی مالی دشواری پیش نہ آئے۔ واپسی کے سفر میں قیصر، رضی اور سپنا میرے ہمراہ تھے۔ بینکاک پہنچ کر ہم رائل پلازہ ہوٹل میں ٹھہرے جہاں کرنل مزمل اور JCO اور سپاہیوں کے علاوہ تھائی نمبر ٹو نے بھی ہمیں ملنا تھا۔ ابھی تک ان میں سے کوئی بھی یہاں نہ پہنچا تھا اور طے کیے گئے فیصلے کے مطابق ہمیں اب ان کا انتظار

کرنا تھا۔ میں نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور امارات، عراق اور سعودی عرب کے سفارت خانوں میں جانے اور ان سے موساد کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا پروگرام بنانے لگا۔ بینکاک پہنچے ہمیں دوسرا دن تھا کہ خن سا کے نمائندے نے مجھے ٹیلی فون پر کہا کہ آج رات ۹ بجے وہ مجھے ملنے آرہا ہے۔ رات کو اس کے ملنے پر میں نے کہا کہ اگر ممکن ہو تو میں خن سا کو ملنا چاہتا ہوں۔ نمائندے نے مجھے جواب دینے کے لیے ۲۴ گھنٹے کی مہلت طلب کی۔ ادھر قیصر نے بھی دہلی اپنے گھر فون کر کے اپنی والدہ اور بچوں کی خیریت دریافت کی۔ سپنا ابھی تک ہمارے لیے ایک بڑا سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ قبیلے کے سردار کو ہلاک کرنے کے بعد سے اب تک وہ ہم سب سے چپکی ہوئی تھی۔ قیصر کے ساتھ وہ دہلی اس لیے گئی تھی کہ وہاں سے وہ قیصر کے ہمراہ دارجلنگ جا کر اپنے والدین کی کروڑوں کی جائیداد کو حاصل کرے گی لیکن قیصر کے گھر میں فون ہونے کے باوجود وہ اکیلی پہلی بار دہلی شہر میں چند گھنٹوں کے لیے گئی اور واپسی پر یہ بتایا کہ اس نے کسی PCO سے دارجلنگ فون کیا تھا۔ اس کے والد کے منشی اور دوسرے قریبی رشتہ داروں نے اسے پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے اسے یہ دھمکی دی کہ اگر وہ دارجلنگ آئی تو اسے مروا دیا جائے گا۔ اور سپنا جیسی دلیر لڑکی صرف ٹیلی فون پر یہ دھمکی سن کر اپنی کروڑوں کی جائیداد سے بھی دست بردار ہوگئی۔ یہ بات نہ میرے اور نہ ہی قیصر کے دماغ میں فٹ بیٹھتی تھی۔ سپنا، کلپنا یا جو بھی اس کا نام تھا، اس کے بقول وہ دارجلنگ کے کانونٹ اسکول میں پڑھتی رہی تھی۔ اگر اس کے والدین کے منیجر اور قریبی رشتہ دار پیسے اور جائیداد کے لالچ میں اسے پہچاننے سے انکار کررہے تھے تو کانونٹ اسکول میں اس کا ریکارڈ، تصویریں اور سہیلیوں کے والدین جنھیں اس کی جائیداد سے کوئی غرض نہ تھی، اسے پہچاننے سے ہرگز انکار نہ کرتے۔ ان کی تصدیق کے ساتھ سپنا عدالت سے نہ صرف اپنی جائیداد واپس لے سکتی تھی بلکہ اس کی جائیداد کے غاصبوں کو لمبی مدت کے لیے جیل بھی بھجوا سکتی تھی۔ جائیداد کے حصول کے لیے دوسری صورت قیصر اور اس کے ساتھیوں کی عملی مدد تھی جن کے ذریعے جائیداد کے منیجر اور ایک دو غاصب رشتہ داروں کو قتل کردینے سے بھی یہ مسئلہ حل ہوسکتا تھا لیکن سپنا نے ان دونوں طریقوں کو مسترد کرتے ہوئے بمبئی واپس آنے پر زور دیا تھا۔ ایک طرف وہ خود کو اتنی ڈری ہوئی اور خوف زدہ ظاہر کررہی تھی اور دوسری طرف وہ ہمارے آئندہ مشنوں میں ہمارا بھرپور ساتھ دینے کو تیار تھی جن میں ہر ہر لمحے جان جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے قیصر سے سپنا کے اس دو رخے انداز پر تفصیلی گفتگو کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ سپنا کی اصلیت جانی جائے اور اس کام کا آغاز دارجلنگ سے کیا جائے۔ میں نے قیصر سے سپنا کا دارجلنگ کا ایڈریس لیا جو اس نے بمبئی سے چلتے وقت قیصر کو دیا تھا۔ دارجلنگ کے ٹیلی فون نمبر قیصر کے پاس بھی نہ تھے۔ میں نے قیصر کی موجودگی میں سپنا کو اپنے کمرے میں بلوایا اور اسے کہا کہ وہ دارجلنگ میں اپنے منیجر اور عزیزوں کے نام، فون نمبر اور کانونٹ اسکول میں اپنے رول نمبر اور وہاں پڑھنے کے سالوں کی تفصیل لکھ دے

کیوں کہ حاجی مستان کے ذریعے میں اس کی جائیداد واگزار کروا دوں گا۔ ''مجھے اپنی جائیداد، گھر اور بینک بیلنس سے اب قطعاً کوئی غرض نہیں، میں انھیں بھلا بیٹھی ہوں'' سپنا نے میرے سوال کا یہ جواب دیا۔ ''لیکن مجھے غرض ہے۔ میں اپنے کسی ساتھی کے ساتھ ایسا کھلا ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا اور خصوصاً جب کہ تمھاری جائیداد کا حصول ہمارے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے'' میں نے سپنا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد سپنا بولی۔ ''ایک ایسی بات ہے جو میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔'' ''اور ہم کسی کو بھی اپنے مشنوں میں اس وقت شریک نہیں کرتے جب تک اس کا ماضی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے نہ ہو۔ ہم نے کسی سے ذاتی عداوت کا بدلہ لینے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ملک وملت کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے دشمنوں کو بے نقاب کرنے اور انھیں ختم کرنے کے لیے یہ مشن انجام دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ہم کیسے تم پر بھروسا اور اعتماد کرسکتے ہیں جب تک کہ ہمیں تمھارے ماضی کے متعلق پوری تسلی نہ ہوجائے۔ ابھی تک ہم تمھارے متعلق صرف یہ جانتے ہیں کہ تم کو قبیلے کے سردار نے زبردستی اپنے پاس رکھا ہوا تھا جسے ہلاک کر کے ہم تمھیں اپنے ساتھ لے آئے۔ تم نے دارجلنگ جانے کا کہا تو قیصر اپنے ساتھیوں سمیت تمھیں وہاں پہچانے کے لیے تمھیں اپنے ہمراہ دہلی لے گیا۔ وہاں تم نے کسی PCO سے فون کر کے اور تمھارے بقول اپنے منیجر کی دھمکی سن کر وہاں جانے اور اپنی جائیداد سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر تمھاری بات پر یقین کرلیا جائے تو تم اتنی ڈرپوک اور بزدل ہو کہ ہم کسی صورت میں بھی تمھیں اپنے ہمراہ نہیں لے جائیں گے جہاں قدم قدم پر موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اگر کوئی اور وجہ ہے تو جب تک تم ہم پر اعتماد کر کے تفصیلاً تمام صورتِ حال ہمیں نہیں بتاؤ گی۔ ہم کیسے تم پر بھروسا کر کے تمھیں اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں جہاں ہمارے خفیہ مشنوں کے لیک (Leak) ہونے سے نہ صرف ہم سب مارے جائیں گے بلکہ دوست ممالک کے ساتھ بھی پاکستان کی ساکھ متاثر ہوگی۔''
سپنا روہانسی ہورہی تھی۔ کہنے لگی ''مجھے ایک رات کی مہلت دیں۔ کل تمام باتیں آپ کو بتا دوں گی۔''

☆☆

انسان کی یہ فطرت ہے کہ بعض اوقات وہ جذبات کے تحت بعض ایسے فیصلے کرلیتا ہے جن پر بعد میں وہ پچھتاتا ہے۔ میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ راجا تری دیو کا سونپا ہوا کام میں نے بخوبی مکمل کردیا تھا۔ اس کی تکمیل کے دوران مجھے اور میرے ساتھیوں کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کتنے انسانوں کا ہم نے خون بہایا اور خود ہم موت کے منھ سے کتنی بار بال بال بچے، ان کا تفصیلی ذکر آپ جانباز کے حصہ اوّل میں پڑھ چکے ہیں۔ اصولی طور پر تو ہمیں چاہیے تھا کہ اب جب کہ ہمارے پاس بہت کافی دولت تھی اور ہم اپنی آئندہ زندگی چین اور آرام سے گزار سکتے تھے، ہمیں نئے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن اپنی سیماب صفت طبیعت، ناگفتہ بہ گھریلو حالات سے بیزاری اور فرار کے علاوہ اپنے وطن کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سازشوں کا علم ہونے کے بعد خاموشی سے انھیں اور ان

کی گھناؤنی سازشوں کو دیکھتے رہنے اور ان کے خلاف کچھ نہ کرنے اور آنکھیں بند کیے رکھنے کا ''حوصلہ'' نہ ہونے کے باعث میں نے اور میرے ساتھیوں نے اس عملی جہاد کا بیڑا اٹھایا تھا۔ پچھتاوا یا کمی تھی تو صرف یہ کہ کام بہت بڑا اور کئی ممالک میں جا کر کرنا تھا اور ہماری نفری بہت ہی کم اور وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ گوکھلے کی ڈائری جب میں نے اپنے سابقہ محکمے کے ایک اعلیٰ افسر کو دی جو پاکستان کی بہتری کے لیے مر مٹنے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتے تھے اور بعد میں وہ اسی محکمے کے ڈائریکٹر جنرل بنے اور لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے اور ان دنوں لیفٹیننٹ کرنل تھے، بولے ''یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کہ پاکستان کے اندر اور باہر کون کون سی طاقتیں اسے تباہ کرنے کے درپے ہیں، ہم وسائل ہونے کے باوجود کچھ نہیں کرسکتے۔ بھٹو نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ افواجِ پاکستان کی تذلیل کرنا وہ اپنا حق سمجھتا ہے اور اس کام میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ڈائری میں جن ملکی غداروں کے نام پتے وغیرہ لکھے ہوئے ہیں، ہم آج کل ان پر بھی ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے ہیں، بیرونِ ملک دشمنوں تک پہنچنا تو دور کی بات ہے۔ تم تو آزاد ہو اور بقول تمھارے تم نے اپنے ہم خیال ساتھیوں کا ایک گروہ بھی تشکیل دے دیا ہے۔ اگر ہمت، حوصلہ اور وطن سے محبت ہے تو کود جاؤ اس خاردار وادی میں اور اللہ پاک کی مدد اور تائید ایزدی پر بھروسا رکھو۔ راستے خود بخود کھلتے جائیں گے۔ میں تمھیں اپنا خفیہ اور لندن میں ایک ہمدرد کا ٹیلی فون نمبر دیتا ہوں۔ اگر ضرورت پڑے تو ہمیں فون کرلینا۔ ہم تمھاری ہر ممکن مدد کریں گے۔''

بینکاک میں جب مجھے بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے اور پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ کا علم ہوا تو سب سے پہلے مجھے اپنے سابقہ محکمے کا خیال آیا کہ یقیناً اب ان کے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کس چکے ہوں گے اور انھوں نے فوری طور پر ملکی غداروں پر ہاتھ ڈالا ہوگا اور ہوا بھی یہی۔ پاکستان میں فوری طور پر ملک کے دشمنوں اور غداروں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ فوج نے جو سن ۱۷ء کے سیاسی سانحے کے نتیجے میں شکست کے بعد چھاؤنیوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، سیاست کی غلاظت کی بدبو کو برداشت سے باہر ہونے کے باعث مارشل لا لگا دیا تھا۔ انھوں نے چن چن کر ملکی غداروں کی بیخ کنی کی اور آج تک ان کا پتا نہ چل سکا۔

اگلے روز خن سا کے نمائندے نے فون پر مجھے بتایا کہ خن سا کو بینکاک آنے میں چھ سات روز لگیں گے۔ ٹیلی فون سے رابطہ ہونے پر جب اسے میرے متعلق بتایا گیا تو اس نے کہا کہ اس کی غیر موجودگی کے دوران میرا جو بھی کام ہو، وہ کردیا جائے۔ میں نے نمائندے کو کہا کہ مجھے اس اسرائیلی لڑکی سے ملنا ہے جو پہلے موساد کے لیے کام کرتی تھی اور اب خن سا کی پناہ میں ہے۔ نمائندے نے بتایا کہ وہ لڑکی بینکاک میں ہی ہے۔ چوں کہ موساد والے اب اس کی جان کے درپے ہیں اس لیے اسے ہوٹل میں لانے کے بجائے وہ اگلے روز چار بجے مجھے اس جگہ لے جائے گا جہاں وہ لڑکی ہمارے

چند دوسرے کارکنوں کے ہمراہ ٹھہری ہوئی ہے۔ ملاقات کا وقت طے کر کے میں نے قیصر کو ہمراہ چلنے کے لیے کہا۔ سپنا نے ابھی تک اپنے ماضی کے متعلق مجھے وعدہ کرنے کے باوجود کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے قیصر کی موجودگی میں ہی اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔ سپنا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے کل رات سے اب تک پلک تک نہ جھپکی تھی۔ میں نے چند رسمی باتوں کے بعد اسے کہا کہ ابھی تک اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ سپنا کچھ دیر سوچتی رہی اور بولی ''کیا میں آپ سے تنہائی میں بات کرسکتی ہوں۔'' اس سے پہلے کہ میں اسے جواب دوں، قیصر صوفے سے اٹھ کر جانے لگا۔ میں نے سختی سے قیصر کو کمرے سے باہر جانے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''میری اجازت کے بغیر تم کمرے سے باہر نہیں جاسکتے۔ اور سپنا کو جو کچھ بتانا ہے وہ تمھاری موجودگی میں ہی بتائے گی۔ میں اپنے گروپ کے ممبروں سے علیحدہ علیحدہ بات کر کے اعتماد کی اس فضا کو ہرگز ختم نہ ہونے دوں گا جو اب تک قائم ہے۔'' سپنا کو مجھ سے اس بے رخی کی توقع نہ تھی۔ وہ تو اپنے دل میں کچھ اور ہی امیدیں لگائے بیٹھی تھی۔ ادھر میرا یہ حال تھا کہ مجھے اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے عورت کے نام سے ہی نفرت ہوچکی تھی۔ مجھے در در بھٹکنے اور کٹی پتنگ کی طرح ہوا میں ہچکولے کھانے پر ایک عورت نے ہی مجبور کیا تھا اور اب میں دوبارہ کسی کے چنگل میں پھنسنے کو ہرگز تیار نہ تھا۔ برما میں جادوگرنی نے مجھے جس نسوانی چہرے کا عکس دکھایا تھا، میں اسی کو اپنی منزل سمجھ کر اس کی تلاش میں تھا اور سپنا میں اس عکس والی کوئی بات نہ تھی۔

سپنا نے میرے تیور دیکھے تو کچھ گھبرا گئی اور کہنے لگی۔ ''میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں، شاید زبانی اپنا مقصد صحیح طور پر بیان نہ کرسکوں۔ مجھے ایک دن کا مزید موقع دیں۔ میں سب کچھ لکھ کر آپ کو دے دوں گی اور میری تحریر سے جو کچھ آپ کو سمجھ میں نہ آئے اس کو زبانی واضح کروں گی اور آپ کے ہر سوال کا جواب بھی دوں گی''۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر اسے واپس بھیج دیا اور قیصر کو کہا ''تم میرے انتہائی قابل اعتماد ساتھی ہو۔ آج سے تم میرے سیکنڈ ان کمانڈ (نمبر ٹو) ہو گے۔ کرنل مزمل یا کوئی اور کتنا ہی تجربہ کار کیوں نہ ہو، ہمارے گروپ میں شامل ہونے والوں کو میرے بعد صرف تمھارے احکام پر عمل کرنا ہوگا اپنا نمبر ٹو بنانے کے بعد تمھیں میرا پہلا حکم یا نصیحت یہ ہے کہ اپنے گروپ میں شامل افراد سے کوئی بھی بات علیحدہ بلا کر یا دوسروں سے چھپا کر مت کرنا۔ ہمیں اپنے گروپ کے افراد میں باہمی اعتماد کو قائم رکھنے پر پوری توجہ دینی ہے اور اسی صورت میں ہم اپنے آئندہ مشنوں میں کامیابی حاصل کرسکیں گے۔''

اگلے روز سہ پہر چار بجے خن سا کے نمائندے کا بھیجا ہوا ڈرائیور مجھے اور قیصر کو لے کر سمندر پر بنے پل سے گزر کر شہر کے دوسرے حصے میں بنے ان فلیٹوں کے سلسلے میں لے گیا جہاں خن سا اور عمر سے ملاقات ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ درجنوں فلیٹوں کا یہ سلسلہ خن سا کی ملکیت ہے اور

ان میں اس کے مختلف کاموں میں ملوث کارندے اور نمائندے رہتے ہیں۔ ایک فلیٹ کے معمولی سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں ہمیں بٹھا کر ڈرائیور چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہی اسرائیلی لڑکی وہاں آ گئی۔ وہ بڑی تیز اور موقع محل کے مطابق فوری جواب دینے والی تھی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی وہ بولی ''تم نے کھٹمنڈو میں میری جان بچائی اور میں نے تمھاری، لہٰذا حساب برابر ہوگیا۔ کھٹمنڈو میں جس حد تک معلومات میں تمھیں دے سکتی تھی، میں نے تمھیں دیں۔ پھر یہاں بینکاک میں تم نے جو کچھ پوچھا، میں نے اس سے بڑھ کر تمھیں بتایا بلکہ تمھارے ملک کے دشمنوں کے نام اور پتے بھی تمھیں دیے۔ اب پھر تم مجھے ملنے آگئے ہو۔ اگر میں تمھیں اتنی ہی پسند آگئی ہوں تو مجھے اپنا کیوں نہیں لیتے۔ تمھارے مذہب میں تو ایک وقت میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔'' یہ بات اس نے مذاق میں کہی تھی لہٰذا میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تمھاری پیش کش واقعی بہت خوب صورت ہے۔ لیکن میرا اصول یہ ہے کہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے میں جذباتی وابستگی نہیں رکھ سکتا۔ فی الحال تو میں تمھیں یہ کہنے آیا ہوں کہ تم میرے گروپ میں صدقِ دل سے شامل ہوجاؤ۔ موساد والوں کے سلوک سے تم خود نفرت کرتی ہو۔ اگر میرے گروپ میں تم شامل ہوگئیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمھیں تمھارے وطن کو کوئی نقصان پہنچانے کا نہیں کہوں گا لیکن میرے اپنے وطن کے خلاف کام کرنے والوں کو ختم کرنے میں تمھیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا چاہے وہ موساد کے کارکن ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر تم میری پیش کش کو قبول کرلو تو میں خن سا سے اجازت لے کر تمھیں اپنے گروپ میں شامل کرلوں گا۔ مالی طور پر تمھیں اتنا کچھ ملے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں اور اس کی ضمانت خن سا دے گا۔'' وہ لڑکی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ''میں Jew (یہودی ہوں اور اسرائیلی) اور تم مسلمان اور پاکستانی ہو۔ کیا ہم دونوں ایک دوسرے پر اعتبار کرسکتے ہیں؟''۔

''ہم دونوں نے کھٹمنڈو میں ایک دوسرے کی جانیں بچائی تھیں۔ تمھیں بچاتے وقت کم از کم میرے دل میں تمھارے یہودی اور اسرائیلی ہونے کا ذرا بھر بھی احساس نہیں تھا۔ میرے نزدیک اس وقت تم صرف ایک کم زور اور بے بس لڑکی تھیں جو غنڈوں سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہی تھی۔ اگر ہم ایک دوسرے کی جانیں بچا سکتے ہیں تو اکٹھے مل کر کام کیوں نہیں کرسکتے۔ ایسا کام جس میں ہمارے ممالک اور مذہبوں کے لیے ہمارے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔'' میں نے لڑکی کو رام کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میرے لیے یہ لڑکی اگر خلوصِ دل سے کام کرتی تو بے حد فائدہ مند ثابت ہوسکتی تھی۔ یہ موساد کی جاسوسی کی مکمل تربیت یافتہ تھی۔ انگریزی، عربی اور عبرانی زبانیں روانی سے بول سکتی تھی اور موساد کے طریقۂ کار کو اچھی طرح نہ صرف جانتی تھی بلکہ بھارتی جاسوسی ایجنسیوں DMI, CBI اور Intellegence Corps کے ساتھ بھی کام کرچکی اور ان کے جاسوسوں کو اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔ ''میں تمھارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں اور تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ تمھارے لیے بہت

کارآمد ثابت ہوں گی۔ خن سا سے اجازت تم لو گے۔ اس کے اجازت دینے کا مطلب ہی میرے مالی مفاد کی ضمانت ہے۔ ایک بات اور... میں حشیش اور ہیروئن کی عادی ہوچکی ہوں۔ انھیں اپنے ساتھ لے جانا اور سنبھالنا میری ذمہ داری ہوگی اور ان کی قیمت تم ادا کرو گے۔'' ''مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہتے ہوئے اس سے ایک مخصوص انداز میں ہاتھ ملایا۔ ''تم پاکستانی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اپنی محکمانہ شناخت ضرور کروا دیتے ہو۔ کیا اس طرح ہاتھ ملانا ضروری تھا؟ میں سمجھتی ہوں کہ موساد کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے تمھیں ٹریننگ بھی دینی پڑے گی۔'' لڑکی نے ہاتھ ملانے کے بعد مجھے کہا۔ میں مسکرا دیا۔ میں نے دانستہ لڑکی سے مخصوص انداز میں ہاتھ ملایا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اسے میرے سابقہ محکمے کے متعلق کس قدر معلومات حاصل ہیں۔ دوسرے کیا چرس اور ہیروئن کے نشے نے اس کے دماغ کو بالکل ہی ماؤف تو نہیں کردیا ہے۔ کیوں کہ ایک جاسوس کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے اور میرے سابقہ محکمے میں ٹریننگ کے دوران دی گئی ہدایات کے مطابق ایک اچھے جاسوس کی دو کے بجائے ۸ آنکھیں ہونی چاہییں۔

یہ لڑکی دماغی طور پر ابھی تک ٹھیک تھی۔ میں اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے خالص فوجی انداز میں سلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''Sir, you can trust on my loyalty and obedience (جناب۔ آپ میری وفاداری اور اطاعت گزاری پر بھروسا کرسکتے ہیں)۔ خن سا سے اجازت لینے کا مرحلہ ابھی باقی تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔ میں مستقبل کے مشنوں کی پلاننگ کو اس لڑکی کی شمولیت سے نئے زاویوں سے دیکھتے ہوئے امید و بیم کی کیفیت میں اپنے ہوٹل پہنچا۔ ریسپشن میں میرے نام کی سلپ پر لکھا ہوا تھا کہ کھلنا (بنگلہ دیش) سے میرے لیے فون آیا تھا۔ یہ یقیناً کرنل مزمل کا فون تھا کیوں کہ ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ وہ فون کرتے وقت اپنا نام نہیں بتائے گا اور اسی روز رات کو ۱۰ بجے میں اسے فون کروں گا۔

☆☆

رات کو میں نے کرنل مزمل سے فون پر بات کی۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ اس نے JCO اور دونوں سپاہیوں نے ایک ایک سال کی چھٹی لے لی ہے اور دوب بینکاک آنے کے لیے بالکل تیار بیٹھے میرے گرین سگنل کا انتظار کررہے ہیں۔ کرنل مزمل نے کہا کہ اس کی بیوی مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اپنی بیوی کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایک وفا شعار بیوی کی طرح اس نے مجھے کہا ''بھائی صاحب! مزمل ہمیں میرے میکے میں چھوڑ کر آپ کے پاس آئیں گے۔ میں ان کے جذبۂ جہاد اور وطن کی محبت میں کام کرنے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی لیکن آپ کو مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ اسے بخیر و عافیت واپس پہنچائیں گے وہ بہت زیادہ جذباتی ہورہے ہیں اور آپ کی دیکھا دیکھی ہر خطرناک کام کرگزرنے

کو بھی تیار ہیں۔ آپ یہ ضرور یاد رکھیے گا کہ ان کی غیر حاضری میں ان کے بچے اور میں ایک ایک لمحہ گن کر ان کی واپسی کی راہ دیکھیں گے۔'' میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''مزمل کو میں کنٹرول میں رکھوں گا۔ باقی رہی سلامتی کی بات تو زندگی اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی گارنٹی میں کیسے دے سکتا ہوں۔ مشنوں کی تکمیل کے دوران کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر تم اپنے دل کو ہر قسم کے حالات کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں کرسکتیں تو بہتر ہے کہ مزمل کو یہاں آنے سے باز رکھو۔ میں اور میرے دوسرے ساتھی کسی فیکٹری کے بنے ہوئے انسان نہیں ہیں۔ ہم سب کے بھی گھر والے ہیں اور یہ بخوبی جانتے ہیں کہ ہمیں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ تمھارا شوہر تو فوج میں ہے کیا تم نے اس سے شادی کے وقت فوج کے افسرانِ اعلیٰ سے اس کی زندگی کی ضمانت طلب کی تھی؟ میری باتیں تمھیں ضرور کڑوی لگ رہی ہوں گی لیکن میں تم سے حقیقت چھپانا نہیں چاہتا۔ ہم لوگ پکنک پر نہیں بلکہ دشمنوں کی صفوں میں گھس کر ان کی پاکستان کے خلاف پلاننگ کو تہس نہس کرنے جارہے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک مطمع نظر ہے اور اس کی تکمیل کے دوران اگر ہم مارے گئے تو ہم شہید ہوں گے۔ اور کامیاب ہوئے تو غازی۔ ہم نے صرف یہ دو صورتیں ہی سامنے رکھی ہیں۔ تیسری صورت جنرل نیازی والی ہے جس نے سقوطِ ڈھاکا کے وقت ۳۲ ہزار لڑاکا فوجوں کے ڈھاکا میں موجود ہونے اور وافر ایمونیشن کے باوجود بھارتی جنرل اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ یہ تیسری صورت ہماری ڈکشنری میں نہیں ہے۔ ابھی وقت ہے۔ اچھی طرح سے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کرو کہ مزمل کو ہمارا ساتھ دینا چاہیے یا نہیں۔'' اب پھر ٹیلی فون کا ریسیور مزمل نے لے لیا اور ہنستے ہوئے بولا ''تمھاری بھابی تو بے وقوف اور کم ہمت ہے۔ پاسنگ آؤٹ پریڈ کے وقت میں نے جو حلف اٹھایا تھا اسے نبھانے کا اب موقع مل رہا ہے۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اور میرے ساتھی تمھیں کبھی بھی شرمندہ ہونے کا موقع نہیں دیں گے۔ میرا ایک ہم خیال میجر بھی ہمارے ساتھ آئے گا۔ اب ہم صرف تمھارے بلاوے کے انتظار میں ہیں۔'' کرنل مزمل نے یہ بھی کہا کہ وہ آئندہ دو روز میں اپنی بیوی اور بچوں کو اپنے سسرال چھوڑ کر کھلنا واپس آجائے گا اور آج سے چوتھے روز رات کو میں اسے فون کر کے آئندہ کے لیے ہدایات دوں۔ اس دوران اس کے ساتھ آنے والے چاروں ساتھی بھی اس کے ہمراہ اسی کے بنگلے میں ٹھہریں گے۔

مزمل سے بات کر کے میں نے اپنے ہمراہ جانے والے ساتھیوں کی گنتی کی۔ قیصر، رضی اور تین تھائی اور پانچ بنگلہ دیشی، اسرائیلی لڑکی، سپنا اور میں، ہم مکمل ملا کر ۱۳ افراد تھے لیکن بینکاک سے روانگی کے وقت ہماری تعداد ۱۲ تھی کیوں کہ تھائی نمبر ٹو کے ایک ساتھی نے ہمارا ساتھ دینے سے معذرت کرلی تھی۔ میرے پروگرام کے مطابق ہمیں اپنے آئندہ مشنوں کا آغاز سعودی عربیہ سے کرنا تھا۔ مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق امریکا (USA) کے پاسپورٹوں پر موساد کے درجنوں ایجنٹ سعودی عربیہ میں داخل ہوچکے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ اقتدار کے آغاز میں لاہور میں پہلی سمت

کانفرنس (Summit) میں تقریباً سبھی مسلم ممالک کے سربراہان شامل ہوئے تھے۔ بھٹو کے ذہین اور فطین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ صرف ہوسِ اقتدار میں اس نے پاکستان کے دولخت ہونے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس نے تیل کی دولت سے مالا مال مسلم ممالک کے سربراہان کو کہا تھا کہ وہ محض اپنا معاشی ڈھانچا مضبوط کرنے کے لیے مغربی ممالک اور امریکا کو اپنا تیل نہ بیچیں۔ یہ ان کا ایسا ہتھیار ہے جو ان ممالک کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ دنیا بھر میں تیل کی سب سے زیادہ کھپت انھی ممالک میں ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکا میں تو عوام کو سردیوں میں گھروں کو گرم رکھنے کے لیے بھی تیل سے ہی انرجی حاصل کی جاتی ہے۔ ان کے سمندری جہاز، سڑکوں کی ٹرانسپورٹ، ریلوے اور ہوائی جہازوں کے علاوہ فوج، نیوی اور ایئرفورس بھی تیل کے بغیر بالکل مفلوج ہوسکتی ہے۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل نے امریکا کو تیل دینے سے انکار کردیا تو امریکا میں پٹرول اور ڈیزل کی راشن بندی شروع ہوگئی۔ امریکا نے سعودی عرب کے تیل کے کنوؤں پر اپنی فوج سے بزور قبضہ کرنے کی دھمکی دی تو شاہ فیصل کے حکم پر سارے سعودی عرب کے تیل کے کنوؤں پر Explosives (دھماکہ خیز بم) لگادیے گئے کہ اگر امریکا بزور قبضہ کرنا چاہے تو ان Explosives کے دھماکوں سے تیل کے کنوؤں کو ہی بند کردیا جائے جن کی بحالی کے لیے سالوں کی مدت درکار ہوگی۔ امریکا نے بالآخر سعودی عرب کے مطالبے پر گھٹنے ٹیک دیے اور تیل کی فی بیرل قیمت میں اضافہ کردیا۔ اس کے ساتھ ہی امریکی پاسپورٹوں پر موساد کے اسرائیلی جاسوس سعودی عرب میں داخل ہوگئے۔ فلسطینیوں کے روپ میں موساد کے وہ ایجنٹ بھی وہاں بھیجے گئے جو روانی سے عربی بولتے تھے۔ موساد کی جاسوس عورتیں بھی مصری پاسپورٹوں پر سعودی عربیہ میں اسکول ٹیچر، نرسیں اور لیبارٹری ٹیکنیشنوں کے روپ میں پہنچیں۔ شاہ فیصل نے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کے لیے اپنے خزانوں کے منھ کھول دیے تھے۔ امریکا اور مغربی ممالک بھلا یہ کیسے برداشت کرسکتے تھے کہ پاکستان بھی ایٹمی طاقت بن جائے حالاں کہ ۱۹۷۴ء میں بھارت ایٹمی دھماکا کرچکا تھا۔ شاہ فیصل کا پاکستان کی طرف اتنا جھکاؤ یہ ممالک برداشت نہ کرسکے۔ یہودیوں اور امریکا کی سازش بالآخر کامیاب ہوئی۔ شاہ فیصل کی سیکورٹی بے حد سخت کردی گئی تھی۔ اس لیے اس کے ایک بھتیجے کو آلۂ کار بنایا گیا اور اس ناہنجار نے شاہی محل کے اس مخصوص حصے میں جا کر جہاں صرف خاندان کے قریبی لوگ ہی جاسکتے تھے، شاہ فیصل کو گولیاں مار کر ہلاک کردیا۔ میرے پاس چند مشکوک نام اور ایڈریس تھے جن کے متعلق گمان تھا کہ وہ اسرائیلی ایجنٹ ہیں اور وہ سعودی عرب کے پاسپورٹوں پر عنقریب پاکستان جانے والے تھے۔ میرے سابقہ محکمے کے دوست افسر نے مجھے کہا تھا کہ ہم پوری کوشش کریں گے کہ پاکستان میں داخل ہوتے ہی انھیں گرفتار کرلیا جائے لیکن ایسے کئی ایجنٹوں کا بچ نکلنا بھی عین ممکن ہے۔ ہم سرکاری طور پر سعودی عربیہ میں کوئی کارروائی نہیں کرسکتے لیکن اگر غیر سرکاری طور پر ان کے سعودی عرب کے نیٹ ورک کو توڑ دیا جائے تو نہ صرف پاکستان کا ایٹمی پلانٹ بچ جائے گا جو ابھی تکمیل کے مراحل میں

ہے بلکہ اس نیٹ ورک کے کارکنوں سے دوسرے نیٹ ورکس کے متعلق بھی اگلوایا جاسکتا ہے جن سے ہم ابھی تک بے خبر ہیں۔ ہمارے منصوبے کے مطابق ہمیں سب سے پہلے القیصم کے صوبے میں الرس اور غیزہ جانا تھا جہاں الرس کے بجلی گھر میں موساد کا ایک ایجنٹ مصری انجینئر کے طور پر کام کررہا تھا۔ اس کی بیوی بھی ظاہراً مصری لیکن درحقیقت موساد کی جاسوسہ تھی۔ مصدقہ اطلاع کے مطابق بریدہ شہر میں فندق سلیمان (سلیمان ہوٹل) جس کا کل انتظام ایک انتہائی متعصب بھارتی ہوٹلوں کی چین کے مالک اوبرائے کے پاس تھا (پاکستان میں بھی اوبرائے کی ملکیت میں برصغیر کی تقسیم سے پہلے لاہور میں فلیٹیز، پنڈی میں فلیش مین، مری میں سیسل اور پشاور میں بھی ایک ہوٹل تھا۔ اس کے بھارت جانے کے بعد ان ہوٹلوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا) سعودی عرب کے قوانین بہت سخت ہیں وہاں کسی ملکی یا غیر ملکی کو بارودی اسلحہ تو بڑی بات ہے، بچوں کی ایئرگن اور غلیل تک رکھنے کی بھی اجازت نہیں۔ ہمیں وہاں مقامی خنجروں سے ہی کام چلانا تھا۔

میں، محمد خان اور خن سا کی بینکاک میں آمد کے انتظار میں تھا۔ ادھر سپنا کی خاموشی اور اپنے ماضی کے متعلق کچھ بتانے سے گریز نے اسے بڑا پراسرار بنا دیا تھا۔ وہ بنگلہ دیش اور بمبئی میں ہمارے سارے کاموں سے آگاہ تھی اور ہمارے آئندہ کے مشنوں کے متعلق بھی اچھا خاصا جانتی تھی۔ میں عجیب گومگو کی حالت میں تھا۔ اگر میں اسے اپنے گروپ سے نکال دیتا تو ہمارے ماضی کے کاموں اور آئندہ کے مشنوں کے طشت ازبام ہونے کا خدشہ تھا اور اگر اسے پوری طرح سے کلیر (Clear) کیے بغیر اپنے ہمراہ لے جاتا تو وہ ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑوا بھی سکتی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اب اس نے حسب وعدہ اپنے ماضی کو تفصیلاً تحریر کر کے نہ دیا اور حاجی مستان کے ذریعے اس کے بیان کردہ ماضی کی تصدیق نہ ہوسکی تو میرے پاس ایک ہی صورت تھی کہ اسے ہلاک کردیا جائے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے سپنا کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میں نے سپنا سے پوچھا کہ کیا اس نے تمام واقعات کو تحریر کردیا ہے تو وہ بولی ’’وہ تو میں نے قیصر کی موجودگی کی وجہ سے بہانہ تراشا تھا۔ میں آپ کو سب کچھ سچ بتانے کو تیار ہوں۔‘‘ میں نے کہا ’’پھر وقت ضائع نہ کرو اور فوراً بولنا شروع کردو لیکن یہ یاد رکھنا کہ جب تک تمھاری کہی ہوئی ہر بات کی تصدیق نہ ہوجائے میں محض تمھارے بتانے سے مطمئن نہیں ہوں گا۔‘‘ سپنا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ’’آپ بے شک میری کہی ہوئی ایک ایک بات کی تصدیق کرلیں لیکن بھگوان کے لیے مجھ سے بدگمان نہ ہوں۔ دارجلنگ میں میرے ماتا پتا کی کروڑوں کی جائیداد اور لاکھوں روپیہ بینک میں ہے۔ میں آپ کو جائیداد کی تفصیل، بینک اکاؤنٹ نمبر اور اپنے منیجر اور رشتہ داروں کے ٹیلی فون نمبر دیتی ہوں۔ آپ ان سے تصدیق کرلیں۔ دارجلنگ میں میرے ماتا پتا اور میں بڑی پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ میں کانونٹ اسکول میں کیمبرج میں پڑھتی تھی۔ ایک روز ایک ٹیچر نے مجھے اپنے گھر پر بلایا۔

میں اپنی اس ٹیچر کے گھر پہلے بھی کئی بار جاچکی تھی لہٰذا اس شام بھی بلا جھجک چلی گئی۔ ٹیچر نے مجھے اپنے چھوٹے سے گھر کے بیڈ روم میں بٹھایا۔ دارجلنگ میں اکثر مکانات لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔ ساتھ کے کمرے سے مردانہ ہنسی مذاق کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرے پوچھنے پر ٹیچر نے بتایا کہ اس کا بھائی اور دوست اس کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ٹیچر نے مجھے جونیئر کلاسوں کے امتحانی پرچوں پر اس کے دیے ہوئے نمبروں کو جمع کرنے کا کہا۔ میں خوشی خوشی یہ کام کررہی تھی کہ ساتھ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تینوں آدمی آچانک آدھمکے اور میری بھرپور مزاحمت کے باوجود انھوں نے میری آبروریزی کی اور میری بے لباسی کی حالت میں تصویریں بنالیں۔ میں نیم بے ہوش تھی۔ جب ہوش بحال ہوئے تو وہ سب جا چکے تھے اور ٹیچر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ کہنے لگی کہ اگر تمھارے پتا نے مجھے دو لاکھ روپیہ نہ دیا تو تمھاری برہنہ تصویر سارے اسکول میں تقسیم کروا دوں گی۔ اگر صرف روپے کی بات ہوتی تو میرے پتا دو لاکھ سے زیادہ روپیہ بھی دے دیتے لیکن مجھے تو بے آبرو کردیا گیا تھا۔ غصے اور انتقام کی آگ میں میں جل رہی تھی۔ ٹیچر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا جب میں نے پھلوں کی ٹوکری پر رکھی چھری اٹھائی اور ٹیچر پر اتنے وار کیے کہ وہ وہیں مرگئی۔ میں باہر نکلی تو ساتھ کے گھر میں رہنے والی ٹیچر نے مجھے دیکھ لیا۔ میرے لباس پر جا بجا خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔

☆☆

میں بھاگتی ہوئی گھر پہنچی اور ماتاجی کو سارا واقعہ بتا دیا۔ انھوں نے پتا جی سے بات کی اور اسی رات کو ہم دارجلنگ سے اپنی کار میں شل گری (Shillgari) علی پور دواس (Ali Pur Ducs) سے ہوتے ہوئے کوچ بہار (Koch Bihar) آگئے۔ میرے ماتا پتا اور میں ٹیچر کے قتل میں میرے گرفتار ہونے سے ڈرتے تھے۔ میری ماتا گھر میں پڑے اپنے سارے گہنے اور روپیہ ساتھ لے آئی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ ہم بنگلہ دیش میں ڈھاکے میں ان کے ایک دوست کے جائیں گے اور وہاں سے میرے بچاؤ کی کوئی ترکیب کریں گے۔ ہمارے پاس پاسپورٹ تو تھے نہیں لہٰذا ہم نے خچروں پر اس راستے سے بنگلہ دیش میں داخل ہونا چاہا جس پر مورنگ اور مگھ قبائل آباد تھے۔ میرے ماتا پتا بہت سیدھے اور ڈرپوک تھے۔ مگھ قبیلے کے سردار کو انھوں نے تمام واقعہ بتا دیا تاکہ اس کی ہمدردی اور مدد حاصل کرسکیں لیکن سردار نے ان دونوں کو گہنوں اور روپے کے لالچ میں قتل کردیا اور مجھے جبراً اپنی بیوی بنالیا۔ خزانہ ڈھونڈنے کی کہانی میں نے اس لیے بتائی تھی کہ میرا اپنی ٹیچر کو قتل کرنے کا راز افشا نہ ہوجائے۔ اس کے بعد آپ لوگ آگئے اور میں آپ کے ساتھ ہی رہی۔ بمبئی سے قیصر کے ہمراہ میں دہلی گئی۔ راز کے افشا ہونے کے خوف کے باعث میں نے ایک PCO سے دارجلنگ اپنی ایک سہیلی کو فون کیا تو اس نے بتایا کہ پولیس ابھی بھی میری تلاش میں ہے اور میرے دارجلنگ پہنچتے ہی مجھے گرفتار کرلیا جائے گا۔ قیصر بھی بھارت میں پولیس کو مطلوب تھے لہٰذا وہ میری کوئی مدد نہ کرسکتے تھے۔ اس لیے

میں نے دوسری جھوٹی کہانی گھڑی کہ میرے پتا کے منیجر اور رشتہ داروں نے مجھے پہچاننے سے انکار کردیا ہے اور جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی ہے۔ اس لیے میں قیصر کے ہمراہ ہی بمبئی چلی آئی اور اب تک آپ کے ساتھ ہوں۔'' یہ سارا واقعہ سنا کر سپنا نے مجھے ایک کاغذ جس پر دارجلنگ میں اس کی سہیلی، منیجر اور اسکول کے نام پتے اور ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے، مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ پوری طرح سے میری چھان بین کروا سکتے ہیں۔ اگر کوئی بات جھوٹی نکلی تو میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں اور اگر سب باتیں درست ثابت ہوئیں تو آپ کو... آپ کو...'' وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی اور روتے ہوئے میرے کمرے سے چلی گئی اور میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

سپنا کی کہانی کے سچ جھوٹ کو پرکھنے کے لیے میں تھوڑی دیر بعد سینٹرل PCO گیا اور حاجی مستان کو فون کیا۔ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے یوسف پٹیل کے نمبر گھمائے۔ وہ گھر پر موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے بینکاک پہنچنے کا بتا کر اور رسمی بات چیت کے بعد سپنا کے دیے ہوئے نمبر اسے لکھوائے اور کہا کہ دارجلنگ میں کلپنا (سپنا کا اصل نام) کے متعلق تمام معلومات کر کے مجھے ہوٹل میں فون کر کے بتائے۔ یوسف نے مجھے بتایا کہ گوکھلے کے خاتمے کے بعد اب ساری مارکیٹ پر ان دونوں کا قبضہ ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی کہا کہ میں حاجی مستان کو کہوں کہ وہ پرانی کدورتوں کو بھلا کر نئے سرے سے مل کر کام کرے۔ مستان کے متعلق اس نے کہا کہ ابھی تک اس نے اسے مال کی پوری سپلائی بحال نہیں کی ہے اور اگر اس نے مزید ٹال مٹول سے کام لیا تو پھر اسے مجبوراً کسی نئے سپلائر کا انتظام کرنا ہوگا۔ میں نے یوسف کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میں نہ صرف مستان سے اس مسئلے پر بات کروں گا بلکہ خن سا سے بھی کہوں گا کہ وہ مستان کو تمھیں پوری سپلائی دینے کا کہے۔ گزشتہ اقساط میں کہیں عرض کرچکا ہوں کہ خن سا نے مجھے بتایا تھا کہ ہر ملک میں وہ صرف ایک پارٹی کو مال سپلائی کرتا ہے اور بھارت میں اس کی سپلائی صرف حاجی مستان کو ہوتی ہے۔ پیسے کا لالچ ایسا ہوتا ہے کہ انسان اکثر اپنے وعدے وعید بھول جاتا ہے۔ دو بار تو میں حاجی مستان اور یوسف پٹیل کی صلح کروا چکا تھا اور دونوں نے ایک ساتھ مل کر کام کرنے کی قسمیں اٹھائیں تھیں اور اب پھر ان کے تعلقات میں خلیج پیدا ہونے لگی تھی۔ یوسف سے بات کرنے کے بعد میں اپنے ہوٹل پلٹ آیا۔ قیصر نے مجھے بتایا کہ سپنا مسلسل روئے جارہی ہے اور اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا ہے۔ میں نے ہاؤس فون پر سپنا کو کہا کہ وہ جلد از جلد میرے کمرے میں آجائے۔ قیصر تو پہلے ہی میرے کمرے میں موجود تھا۔ سپنا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ میں نے دانستہ اس کی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے دونوں کو بتایا کہ کرنل مزمل اپنے ساتھیوں سمیت ایک ہفتے تک یہاں پہنچ جائے گا اور ہمارے ساتھ تھائی ساتھیوں اور رضی کے علاوہ ایک اسرائیلی لڑکی بھی جو موساد کے لیے کام کرچکی ہے، ہمراہ ہوگی۔ اب ہم کو ذہنی طور پر مشن پر روانگی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہم جس ملک میں جارہے ہیں اس کی زبان سے قطعی ناواقف ہیں۔ اس لیے ہمیں

اپنی شناخت چھپانے اور مشن کی تکمیل میں خاصی دشواری پیش آسکتی ہے۔ میں نے سپنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم بھی اس مشن میں ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہو؟'' میں نے یہ بات سپنا کو دلاسہ دینے کے لیے کہی تھی کیوں کہ میری بے رخی سے وہ بے حد آزردہ ہوچکی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ جب تک دارجلنگ سے اس کی بیان کردہ داستان کی تصدیق نہ ہوجائے وہ کہیں مایوس ہوکر ہمیں چھوڑ کر چلی نہ جائے اور ہمارے لیے مزید پریشانیوں کا باعث بنے۔ سپنا میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں سے بولی ''اگر آپ کا ساتھ نہ دینا ہوتا تو میں آپ کے ہمراہ پاکستان کیوں جاتی۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں بالکل تنہا اور لاوارث ہوں۔ قبیلے کے سردار کے چنگل سے رہائی دلوا کر آپ نے مجھے دوبارہ زندگی دی اور مجھ میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے ناسمجھی کے باعث یہ غلطی کی کہ آپ سے کئی باتوں کو چھپایا۔ اب جب کہ ہر بات آپ کو بتادی ہے تو مجھے آپ پر یہ یقین ہے کہ میری کہی ہوئی باتوں کی تصدیق ہونے پر آپ مجھ سے اپنی بدگمانی کو ختم کردیں گے اور مجھے اپنے ہمراہ رکھیں گے۔'' غرضیکہ اس مختصر Sitting کے خاتمے پر ہم نے رضی کو بھی بلوالیا اور مشن پر جانے کے لیے بغیر اس ملک کا نام لیے اپنی تیاریوں کے متعلق باتیں کیں۔ رات کو میں نے خن سا کے نمائندے کو فون کیا اور اسے کہا کہ ہمیں کراٹے کی مختصر مدت میں بھرپور ٹریننگ دینے کے لیے کسی بلیک بیلٹ استاد کی فوری ضرورت ہے۔ سعودی عرب میں بارودی اسلحے (Fire Weapons) کے بغیر ہمیں خنجروں کے علاوہ کراٹے کے داؤ پیچوں کے ساتھ مخالفین کو زیر کرنا تھا۔ ہمارے ہوٹل میں تو ایسی تربیت لینے کے لیے کوئی موزوں جگہ نہ تھی اس لیے خن سا کے نمائندے نے کہا کہ کل صبح ۲ بجے وہ ایک وین بھیج دے گا جو ہمیں روز گارڈن (Rose Gardens) کے قریب لے جائے گی جہاں کراٹے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس کے استاد کو یہ ہدایت بھی کردی جائے گی کہ کم سے کم وقت میں ہمیں اپنے بچاؤ اور مخالفین کو زیر کرنے کی تربیت دے۔ ہمارے پاس تربیت پانے کے لیے مخصوص لباس نہیں تھے چناں چہ اس گفتگو کے فوری بعد میں، قیصر، رضی اور سپنا کو لے کر سری وانگ روڈ کے خاتمے پر ٹریکوڈورا (Tracudora) ہوٹل کے شاپنگ سینٹر میں گیا اور سب کے لیے مناسب لباس خرید لیے۔

اگلی صبح سے ہی ہماری ٹریننگ شروع ہوگئی۔ تیسرے روز میرا تھائی نمبر ٹو اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ آگیا۔ وہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرے اور ہمارے ساتھ ہی ٹریننگ لینے لگے۔ میں نے دو روز بعد کرنل مزمل کو فون کیا اور اسے اپنے ساتھیوں سمیت بینکاک آنے کا کہا۔ دو روز بعد وہ بھی بینکاک پہنچ گئے۔ کرنل مزمل اور اس کے ساتھیوں کا جوش وخروش دیکھنے کے قابل تھا۔ قیصر، رضی، تھائی ساتھی، بنگلہ دیشی، JCO اور دونوں سپاہی تو میرے پہلے بھی شریک کار رہ چکے تھے اس لیے ہم بالکل نارمل تھے۔ کرنل مزمل اور میجر کی حالت بالکل ان نوجوان سیکنڈ لیفٹیننٹس کی طرح تھی جن پر پاسنگ آؤٹ کے بعد فوجی وردی پہنتے ہی دشمن کو نیست و نابود کرنے کی دھن سوار ہوجاتی ہے۔ کرنل مزمل نے میجر کو پہلے یہ

سمجھا دیا تھا کہ میرے یعنی گروپ لیڈر کے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہوگی اور سوائے نجی محفل کے وہ مجھے سر کہہ کر مخاطب کریں گے۔ ہم سب ہر صبح تیار ہوکر کراٹے کی تربیت کے حصول کے لیے چلے جاتے۔ میں نے سپنا کو بتا دیا تھا کہ اسرائیلی لڑکی کراٹے کی ماہر ہے۔ سپنا اس لیے پوری محنت اور لگن سے کراٹے کے داؤ پیچ سیکھ رہی تھی۔ بنگلہ دیشی میجر عمران نے کمانڈو کورس کیا ہوا تھا لہٰذا اسے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ میں نے بھی اپنی تربیت کے دوران جوڈو اور کراٹے کے ابتدائی کورس کیے ہوئے تھے اور خاصے عرصے سے عملی مشنوں میں حصہ لیتے رہنے کی وجہ سے میرا جسم بھی ہر قسم کی تربیتی سختی برداشت کرسکتا تھا۔ صحیح دشواری کرنا مزمل، رضی، قیصر اور JCO منصف اور دونوں سپاہیوں دین محمد اور اکرم اور تھائی نمبر ۲ اور اس کے ساتھی (جنھیں میں نے عبداللہ اور شان کے نام دیے تھے) کو پیش آرہی تھی۔ پانچ سات منٹ کی ریاضت کے بعد ہی ان کے سانس پھول جاتے اور ان کے ایکشن میں کمی آجاتی۔ استاد تو کبھی بھی اپنے شاگرد سے مطمئن نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمارا استاد ہم سے کبھی مطمئن ہوا۔ اٹھارہ دن کی ریاضت کے بعد اس نے یہ کہہ کر ہماری ٹریننگ ختم کردی کہ اس سے زیادہ اور ایڈوانس ٹریننگ میں ہماری جسمانی ہڈیوں اور مسلز (Muscles) کو نقصان پہنچنے کا امکان ہے۔ بہرحال ہمیں اس نے اس قابل بنا دیا کہ ہم میں سے ہر کوئی دو تین غیر تربیت یافتہ افراد کو زیر کرسکے۔

اب میں پھر پیچھے کی طرف لوٹتا ہوں۔ خن سا بینکاک میں میری آمد کے آٹھویں دن مجھ سے ملا۔ عمر بھی اس کے ہمراہ تھا۔ خن سا نے اسرائیلی لڑکی (جسے میں نے ماہا کا نام دیا) کو بھی ہمارے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی لیکن علیحدگی میں مجھے کہا ''سانپ اور یہودی پر کبھی اعتبار نہ کرنا اور اس لڑکی کو ایسا کوئی مشن نہ سونپنا جس میں پورا اختیار اسی کے پاس ہو۔ اس پر کسی وقت بھی مسلم دشمنی غالب آسکتی ہے اور تمھیں نقصان پہنچا کر اسے ذرہ بھر بھی افسوس نہ ہوگا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ یہ تمھارے ساتھ غداری نہیں کرے گی کیوں کہ موساد سے یہ علیحدہ ہوچکی ہے اور چرس اور ہیروئن کی لت کو پورا کرنے کے لیے اسے ہمہ وقت تمھاری ضرورت ہوگی پھر بھی اگر اس نے تمھارے احکام کی خلاف ورزی کی تو بلا دریغ اسے ختم کردینا کیوں کہ رازدانِ دشمن بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے۔ قارئین! اپنے مشنوں پر روانگی سے پہلے میں یہ حالات تفصیلاً اس لیے تحریر کررہا ہوں کہ آپ کو علم ہوسکے کہ ہم جن سے مقابلہ کرنے اور انھیں زیر کرنے جارہے تھے، ان کے بے پناہ وسائل اور امریکا اور اسرائیل کی حکومتوں کی پشت پناہی کے مقابلے میں ہماری بے سروسامانی کی کیا حالت تھی۔ ممکن ہے بعض قارئین میری اس داستان کو محض افسانہ سمجھ رہے ہوں لیکن یہ حقیقت اور سچائی پر مبنی ہے۔ کیا حضرت علی، حضرت خالد بن ولید، موسیٰ بن نصیر، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی اور ٹیپو شہید کے کارنامے بھی افسانے تھے۔ موجودہ دور میں اسامہ بن لادن جس نے امریکا اور مغربی ممالک کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں، بھی کیا ایک افسانہ ہے؟'' ہمیں بھی اپنی حب الوطنی سے بہت زیادہ اللہ پاک کی مدد پر بھروسا تھا اور جب

یقین محکم ہو تو تقدیریں بھی بدل جاتی ہیں۔

☆☆

انھی دنوں یوسف پٹیل کا فون آیا۔ اس نے اپنے ذرائع سے دارجلنگ میں سپنا کے متعلق جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق سپنا نے جو کچھ بتایا تھا وہ سو فی صد درست تھا۔ اس نے اپنی ٹیچر کو قتل کیا تھا اور مقتول ٹیچر کے ہمسائے میں رہنے والی دوسری ٹیچر نے پولیس کو یہ بیان دیا تھا کہ اس نے سپنا کو مقتولہ ٹیچر کے گھر سے نکلتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور سپنا کے لباس پر خون کے بڑے بڑے دھبے لگے ہوئے تھے۔ پولیس جب سپنا کے گھر پہنچی تو گھر بند تھا اور اس کے بعد سے آج تک سپنا اور اس کے والدین کا کچھ پتا نہ چلا۔ پولیس سپنا کی ٹیچر کے قتل کے الزام میں اب تک اس کی تلاش میں تھی اور اسے مفرور قاتل قرار دے چکی تھی۔ سپنا کے والدین کے چائے کے باغات، چائے بنانے کا کارخانہ اور کروڑوں کی جائیداد تھی جس کی ان کا منیجر دیکھ بھال کر رہا تھا۔ یوسف نے مجھے کہا کہ سپنا کے دفاع کے لیے وہ اچھے سے اچھا وکیل مقرر کر سکتا ہے لیکن سپنا کو پہلے گرفتاری دینی ہوگی اور اپنے ماتا پتا کے مگھ قبیلے کے سردار کے ہاتھوں قتل ہونے کے ثبوت بھی دینے ہوں گے۔ یوسف نے بمبئی میں جس وکیل سے بات کی تھی، اس کے مطابق سپنا کو سزا ہونے کے ۸۰ فی صد اور بری ہونے کا ۲۰ فی صد چانس تھا۔ اگر وہ ٹیچر کے قتل کے بعد فوری پولیس کے پاس چلی جاتی تو اس کا میڈیکل چیک اپ ہوتا اور والدین بھی اس کی بھرپور مدد کر سکتے تھے لیکن اب نہ صرف ٹیچر بلکہ اس کے ماتا پتا کے قتل کا بھی اس پر الزام تھا۔ میں نے صرف قیصر کو یوسف کے فون کا بتایا۔ سپنا بالکل بے گناہ تھی لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ اس کا کیا کیا جائے۔ اگلے دن حاجی مستان کا فون آیا۔ وہ گوا (Goa) گیا ہوا تھا۔ میں نے اسے مختصراً اپنے آئندہ کے مشنوں کے متعلق بتایا تو وہ کچھ چڑ سا گیا۔ ”بھائی۔ اپنی جان کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو۔ تم یا تمھارے ساتھیوں کا گروہ اس ساری غلاظت کو صاف نہیں کر سکتا، جو پاکستان کے بیرونی دشمنوں اور اندرونی ملک غداروں کے دلوں پر جم چکی ہے۔ تم نے اپنی ہمت سے بہت زیادہ کام کیا اور دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ کسی یورپی ملک کے لیے تم نے یہ کارنامے انجام دیے ہوتے تو اس کے شہروں کے چوراہوں پر تمھارے مجسمے نصب ہوتے لیکن تمھارے اپنے ملک نے تمھیں کیا دیا۔ اب بھی وقت ہے۔ اب بس کرو یہ سب کچھ اور امن اور سکون سے اپنی زندگی گزارو۔“ مستان نے مجھے میرے ارادوں سے باز رکھنے کے لیے کہا۔ ”مستان بھائی! نہ تو پہلے میں نے کسی مادی لالچ کے عوض اپنے وطن کی حقیر سی خدمت کی ہے اور نہ ہی اب کوئی مادی مقصد میرے پیش نظر ہے۔ تم خود جو بمبئی اور گرد و نواح کے مسلمانوں کی سرپرستی کر رہے ہو اور اتنے خطرات میں گھر کر جو کچھ کما رہے ہو وہ سب انھی مسلمانوں کے تحفظ کے لیے لٹا دیتے ہو تو تمھیں اس کا کیا مادی فائدہ پہنچتا ہے۔ مجھے کوئی اَن جان یہ بات کہتا تو میں اس کی نادانی کو دور کرتا لیکن تم خود وہی کچھ کر رہے ہو

جو میں کر رہا ہوں اور مجھے اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہو۔ مستان بھائی، یہ کم بخت دل اور اس میں وطن اور ملت کی محبت ہے جو ہم سے یہ کام کروا رہی ہے۔ میرے ساتھ تو اب بھارتی مسلمانوں کے علاوہ بنگلہ دیشی مسلمان اور تھائی غیر مسلم بھی میرے مشن میں شریک ہیں۔ مجھے پیچھے ہٹنے کے بجائے کامیابی سے قدم آگے بڑھانے کا کہو کیوں کہ ہمارا نصب العین ایک ہی ہے۔“ میں نے مستان کی بات کا جواب دیا تو وہ کہنے لگا۔ ”یہ میں نہیں بلکہ تم سے میری محبت کہہ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمھارے اٹھے ہوئے قدم واپس نہیں آتے بس اپنی زندگی کا خیال رکھنا کیوں کہ تم میرے لیے بہت قیمتی ہو۔ تمھیں اپنے مشنوں کے لیے جو کچھ بھی چاہیے بلا جھجک مجھے بتا دو۔ میری دولت کا آخری پیسا بھی اگر تمھاری ضرورت پر صرف ہو تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔“ ”مجھے اپنے مشنوں کے لیے تمھارا تعاون درکار ہے۔ میں نے خن سا اور عمر سے ابھی تفصیلی بات نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ ان سے ہو سکا، وہ کریں گے اور باقی کے لیے میں تمھیں اور یوسف کو تکلیف دوں گا۔ یوسف کو تم سے گلہ ہے کہ تم اس کو مطلوبہ سپلائی نہیں دے رہے ہو۔ مستان بھائی! یوسف طبیعت کا اچھا اور صاف گو ہے۔ بے شک تم اسے اچھا نہیں سمجھتے لیکن مسلمانوں کے وسیع تر مفاد کے لیے اس سے پورا تعاون کرو۔“ میرا جواب سن کر مستان لاجواب ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ ایک دن چھوڑ کر مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ رکھے گا اور یوسف کو بھی سپلائی کی مقدار بڑھا دے گا۔

میں اور میرے ساتھی ذہنی طور پر سعودی عرب جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ اب ہمیں خن سا اور عمر سے سپنا اور اسرائیلی لڑکی کے اسلامی نام سے پاسپورٹ بنوانے تھے اور سعودی سفارت خانے سے رابطے کے بغیر سعودی عرب کے بزنس ویزے لینے تھے۔ سعودی قانون کے مطابق چوں کہ کوئی عورت اپنے محرم کے بغیر سفر نہیں کر سکتی اس لیے قیصر کا نام سپنا (سیما) کے اور عمران کا ماہا کے بھائی کے طور پر ان کے پاسپورٹس پر لکھوانا تھا۔ خن سا ابھی بینکاک میں ہی تھا لیکن میں نے اس سے ملنے سے پیش تر عمر خان سے ملنا ضروری سمجھا۔ عمر کے ذریعے ہی میں خن سا سے متعارف ہوا تھا لہٰذا یہ اچھا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ عمر خان سے بالا بالا ہی خن سا سے اپنی ضروریات بیان کروں۔ میں نے عمر کو اس کے بینکاک کے گھر میں فون کیا۔ عمر خان کو بس ایک ہی شوق تھا۔ نت نئی شادیاں رچانے کا۔ دو تین کو تو وہ چھوڑ چکا تھا۔ اس وقت اس کی تین بیویاں تھیں۔ ایک کوٹا بارو میں، ایک سنائی گولک میں اور ایک بینکاک میں۔ بینکاک والی بیوی چینی النسل تھی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا تو وہ کہنے لگی کہ عمر بڑی پریشانی کی حالت میں تمھارے ہوٹل ہی گیا ہے۔ مجھے فون بند کیے پانچ سات منٹ ہی گزرے تھے کہ عمر کا ریسپشن سے فون آیا۔ میری آواز سن کر وہ کہنے لگا کہ وہ سیدھا میرے کمرے میں آ رہا ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بولا ”تم تو سمجھتے تھے کہ تھائی لینڈ میں تم محفوظ ہو لیکن چند گھنٹے پہلے ہی خن سا کو اطلاع ملی ہے کہ بھارتی CBI کا ایک افسر اور دو بھارتی فوجی کمانڈو آج ہی تمھارے ہوٹل

میں ٹھہرے ہیں۔ خن سا کا ایک آدمی اسی ہوٹل میں ٹیلی فون آپریٹر ہے اس نے CBI کے افسر کی بھارتی سفارت خانے سے ہونے والی گفتگوسنی (Intersept) ہے۔ چوں کہ تم اور تمھارے بیش تر ساتھی اپنے اصلی ناموں سے یہاں نہیں ٹھہرے ہو اس لیے CBI کے افسر نے تمھاری اور کرنل مزمل کی شکل و صورت کے بارے میں اپنے سفارت خانے کو بتایا ہے۔ CBI کے افسر نے اپنے سفارت خانے کے فسٹ ملٹری اتارنی کو یہی کہا ہے کہ تم دونوں کی تصدیق ہوجانے پر بجائے گرفتاری اور بھارت لے جانے کے جھنجھٹ میں پڑنے کے اس کے ہمراہ آنے والے کمانڈو تم دونوں کو یہیں ٹھکانے لگادیں گے۔ ٹیلی فون آپریٹر نے خن سا کو CBI کے افسر کا کمرہ نمبر بھی بتا دیا ہے۔ اب وہ یقیناً تمھاری اور مزمل کی نگرانی (Surveillance) کریں گے اور موقع پاکر اپنا وار کردیں گے۔ خن سا نے یہ ساری بات مجھے بتائی اور کہا میں فوری طور پر تمھارے اور تمھارے ساتھیوں کے لیے اسلحہ لے کر تم سے ملوں اور ساری بات بتاؤں۔ اسلحہ گاڑی میں پڑا ہے اور میرا ایک محافظ جو کمرے کے باہر کھڑا ہے، اسلحے سے بھرے دونوں سوٹ کیس لے کر یہاں آجائے گا۔ دریں اثنا تم اپنے ساتھیوں کو یہاں بلوالو اور انھیں ساری صورتِ حال بتا کر مسلح کردو۔ میں واپس جاتا ہوں کیوں کہ میرا زیادہ دیر یہاں رکنا مجھے بھی مشکوک بنا دے گا۔ اسلحے کے مدفون سوٹ کیس میرے حوالے کر کے عمر خان جانے کے لیے اٹھا تو میں نے اسے کہا کہ میں خن سا سے سپنا اور اسرائیلی لڑکی کے پاسپورٹس اور ہم سب کے لیے سعودی عرب کے بزنس ویزوں کے علاوہ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہمیں سعودی عرب میں داخلے کے بعد ہم سب کے لیے Side Arms یعنی پسٹل اور ریوالور اور ان کی گولیاں مل جائیں تو ہم کو اپنے مشنوں کی تکمیل میں بڑی آسانی ہوگی۔ ''پاسپورٹ اور ویزے خن سا لگوا دے گا اور تمھارا مطلوبہ اسلحہ ریاض میں شاہراہ ستین پر میرا ایک کارندہ اپنے اپارٹمنٹ پر تمھارے حوالے کردے گا۔ سائیڈ آرمز کے علاوہ میں ۲۴ دستی بم بھی بھجوا دیتا ہوں۔ ممکن ہے تمھیں ان کی ضرورت بھی پڑ جائے۔'' یہ کہہ کر عمر نے مجھے اپنے کارندے کا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر لکھوایا اور کہا۔ ''بھارتی کتوں کو ختم کرنے میں اگر کوئی دشواری ہو تو یہ کام میں کروا دیتا ہوں۔'' ''عمر خان، تم کہاں کہاں ہمارے مخالفین اور دشمنوں کو ختم کرو گے۔ میں تو خوش ہوں کہ ہمیں اپنے مشنوں کا آغاز بینکاک سے ہی کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں اپنے نئے ساتھیوں کی صلاحیت بھی آزمالوں گا اور ہمارے ہاتھ جو کافی دنوں سے بے کار رہنے کے باعث سست ہو رہے ہیں، وہ بھی کھل جائیں گے۔'' عمر کے جانے کے بعد میں نے مزمل، میجر عمران اور قیصر کو فون کر کے کہا کہ تمام ساتھیوں کے ساتھ ۱۵ منٹ میں میرے کمرے میں آجائیں۔ سارے ساتھی یک جا ہوئے تو میں نے انھیں بتایا کہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے بھارتی CBI کا ایک افسر اور دو فوجی کمانڈو اس ہوٹل میں پہنچ چکے ہیں اور ہمیں نہ صرف انھیں خاموشی سے جہنم واصل کرنا ہے بلکہ یہ کھوج بھی لگانا ہے کہ انھیں کس نے ہمارے بینکاک آنے اور اس ہوٹل میں ٹھہرنے کی اطلاع دی۔ عمر کی انفارمیشن کے مطابق انھیں

ابھی تک صرف مزمل اور میرے متعلق علم ہوسکا ہے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ انھیں ہمارے باقی ساتھیوں کا علم ہو اور وہ مزید کمک حاصل کرسکیں، ہمیں ان کو ٹھکانے لگانا ہے۔ میں نے دونوں سوٹ کیسوں میں پڑا اسلحہ تمام ساتھیوں میں تقسیم کیا۔ اپنے لیے میں نے ایک پسٹل اور تین فالتو میگزین لیے۔ کرنل مزمل اور میجر عمران کہنے لگے کہ صرف ہم دونوں ہی ان تینوں بھارتیوں سے نبرد آزما ہوں گے لیکن میں نے انھیں سختی سے روک دیا اور کہا کہ دشمن تین ہیں لیکن ہم میں سے چھ ان کے مقابل جائیں گے۔ میں دراصل ابھی تک مزمل اور عمران کی کارکردگی نہیں دیکھ سکا تھا اور اصلی مشنوں کے آغاز سے پہلے ہی کسی قسم کا خطرہ (Risk) مول لینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے مزمل اور عمران کا ساتھ دینے کے لیے JCO، تھائی نمبر ٹو، شان اور خود کو چنا۔ مزمل اور عمران کہنے لگے کہ یہ بھارتی سورما جیسور چھاؤنی سے ہماری مخبری ہونے پر یہاں تک پہنچے ہیں لیکن میرا کہنا تھا کہ ان کو بینکاک بلکہ اسی ہوٹل سے کسی نے بھارتی سفارت خانے کو اطلاع دے کر بلوایا ہے کیوں کہ انھیں ابھی تک میجر عمران کے متعلق علم نہیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ بہرحال یہ فیصلہ ہوا کہ آج رات ہی ان تینوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔ عمر خان نے مجھے صرف CBI کے افسر کے کمرے کا نمبر دیا تھا۔ ہمیں پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ دونوں بھارتی فوجی کن ناموں سے کون سے کمروں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھے چوں کہ شک تھا کہ ہماری مخبری اسی ہوٹل سے ہوئی ہے اس لیے ریسپشن سے ان کے متعلق معلوم کرنا حماقت تھی۔ مجھے یکایک خیال آیا کہ بجائے ان تینوں سے بہ یک وقت بھڑ جانے سے بہتر ہے کہ پہلے CBI کے افسر کو ٹھکانے لگایا جائے اور بعد میں دونوں فوجیوں کو۔ میں نے مزمل اور عمران کو اپنی تجویز بتائی تو انھوں نے اسے پسند کیا۔ ہم نے رات ۱۱ بجے اس کے کمرے میں دھاوا بولنے کا پروگرام بنایا۔ میرے ہمراہ میجر عمران اور قیصر نے جانا تھا۔ ہم نے فائر آرم استعمال کرنے کے بجائے جسمانی طاقت اور خنجر کو استعمال کرنا تھا اور قیصر رام پوری چاقو اور خنجر استعمال کرنے میں ماہر تھا۔ تمام پروگرام سیٹ کر کے میرے ساتھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور رات ٹھیک پونے گیارہ بجے عمران اور قیصر میرے پاس آگئے۔ اس ہوٹل میں اس وقت شراب کے نشے میں دھت مسافروں اور ان کے ساتھیوں نے ایک ہنگامہ بپا کیا ہوا تھا۔ ہوٹل کے نائٹ کلب میں شرابی مہمانوں اور کال گرلز کے ساتھ ساتھ ہوٹل کی مالکہ رانی بھی مے نوشی اور اونچی آواز کے مغربی میوزک پر اچھل کود میں مصروف تھی۔

❁

دوسرا باب

میں نے اپنے کمرے سے روم سروس کو فون پر کہا کہ کمرے میں پڑے تھرموس کو ٹھنڈے پانی سے بھر دیں اور کمرہ نمبر CBI کے افسر کا بتایا۔ فون کے بعد ہم تینوں یعنی عمران، قیصر اور میں چوتھے فلور پر اس کمرے کے قریب پہنچ گئے۔ فلور کی گیلری میں مدھم روشنی کے بلب جل رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہی روم سروس کا باوردی ملازم ٹرے میں جگ اٹھائے آیا اور اس کمرے کے دروازے کو ناک (Nonck) کرنے لگا۔ پانی کا انتخاب میں نے اس لیے کیا تھا کہ بینکاک میں موسم خاصا گرم ہوتا ہے اور ٹھنڈے پانی کی ہر کسی کو طلب ہوتی ہے۔ ویٹر کے دروازہ کھٹکھٹاتے ہی ہم اسے احساس دلائے بغیر دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ CBI والا بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھا۔ اس نے بند دروازے میں لگے پیپ ہول (Peep Hole) سے یقیناً پہلے باوردی ویٹر کو دیکھا اور ویٹر کے بتانے پر کہ وہ ٹھنڈا پانی لایا ہے، دروازہ کھول دیا۔ ویٹر کمرے میں داخل ہوا اور تھرماس میں پانی ڈال کر جب واپس دروازے کے باہر گیا تو ہم تینوں بہ یک وقت کمرے میں داخل ہوئے۔ ہم نے اپنے بازوؤں سے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے تاکہ ویٹر شناخت نہ کر سکے۔ ویٹر کے دروازے سے باہر نکلنے کے بعد اور قیصر کے دروازہ اندر سے بند کرنے سے پہلے میں اونچی آواز میں ”ہیلو پوری صاحب، طبیعت تو ٹھیک ہے اور کیا بات ہے جو آپ نے ہمیں اس وقت طلب کیا“ کہا تاکہ ویٹر ہماری طرف سے مطمئن ہو کر چلا جائے۔ CBI کا افسر ہکا بکا ہمیں چند لمحے، دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اسے ساری صورتِ حال سمجھ آ گئی۔ وہ اپنے بیڈ کی طرف لپکا جس کے تکیے کے نیچے اس کا ریوالور پڑا تھا لیکن عمران نے جمپ مار کر اسے پلنگ پر ہی دبوچ لیا۔ قیصر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور میں نے تکیے کے نیچے سے اس کا ریوالور اٹھالیا۔ ہمارے اس بالکل غیر متوقع اور یک لخت حملے سے CBI کا یہ افسر اتنا بوکھلا گیا تھا کہ

اس کے منہ سے آواز نکلی تو درکنار اس نے خود کو عمران اور قیصر کی گرفت سے چھڑوانے کی کوشش تک نہ کی۔ قیصر نے اپنا رام پوری چاقو نکالا اور قریب تھا کہ اسے گھونپ دیتا لیکن میں نے اسے روکتے ہوئے کہا ”اس بے چارے تنخواہ دار ملازم کو مار کر ہم کیا کریں گے۔ اگر یہ ہمیں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے نام، ان کے بینکاک آنے کا مقصد اور ان کو ہماری مخبری کرنے والے کے متعلق سب کچھ صحیح بتا دے تو ہم اسے زندہ چھوڑ دیں گے۔“ میں نے یہ بات اتنی اونچی آواز میں کہی کہ CBI والا اچھی طرح سے سن لے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے عمران کو کہا کہ اسے سیدھا لٹا کہ اس کے سینے پر بیٹھ جائے اور قیصر کو کہا کہ چاقو اس کی گردن پر رکھے اور اگر اس نے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو اس کی گردن کاٹ دے۔ اسے سیدھا کیا گیا تو میں نے اس سے پوچھا ”بتاؤ کچھ کہنا چاہتے ہو یا نہیں“ سینے پر دو من سے زیادہ وزن اور گردن پر چاقو ہو تو بڑے بڑے جغادریوں کی پھٹکری پھل ہو جاتی ہے یہ بھارتی لالہ کس شمار میں تھا۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کر اس نے اس تیزی سے بولنا شروع کیا کہ مجھے اسے کہنا پڑا کہ آہستہ بولے اور کمرے میں ہوٹل کے لیٹر پیڈ اور قلم سے میں نے اس کی باتوں کے نوٹس لکھنے شروع کیے۔ نام مرلی دھرن پوری، تعیناتی CBI ہیڈ کوارٹرز دہلی، عہدہ ڈپٹی ڈائریکٹر، ہمراہیوں کے نام میجر کیلاش اور کیپٹن بھنڈارے اور دونوں کا تعلق اسپیشل گروپ سے، مخبری پہلے جیسور چھاؤنی (بنگلہ دیش) سے اور دوسری رائل پلازہ ہوٹل بینکاک (جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے) کے منیجر گپتے نے کی جو بھارتی CBI کے پے رول پر ہے۔ بھارتی سفارت خانے میں تینوں ملٹری اتاچیز اور فسٹ سیکریٹری سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ تمام معاملے کو جانتے ہیں میجر اور کیپٹن کمرہ نمبر ۴۰۵ اور ۴۰۶ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہوٹل کے دو ویٹروں کو رشوت دے کر ہماری نگرانی اور ہمارے تمام ساتھیوں کی تعداد اور نام معلوم کرنے کی ڈیوٹی سونپی گئی ہے۔ ہم تینوں نے تین ریوالور اور گولیاں بھارتی سفارت خانے سے لی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

پوری تو نان اسٹاپ ایسے بولتا جا رہا تھا جیسے وہ ہمیں پکڑنے اور ہلاک کرنے کے لیے یہاں نہیں آیا بلکہ جیسے ہمارا مخبر ہو اور اپنی ساری تفتیش اور تحقیق ہمیں بتا رہا ہو۔ اپنی یک طرفہ گفتگو کے دوران جسے میں نے انتہائی مختصر کر کے لکھا ہے، اس نے تین چار مرتبہ گھگھیائی آواز میں کہا ”آپ مجھے زندہ تو چھوڑ دیں گے نا“ اور پھر بولنا شروع کر دیتا۔ مجھے اس کی یہ حالت دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ یہ اس پوری بزدل قوم کا فرد تھا جس نے چند ہزار سواروں کے ساتھ برصغیر پر حملہ آور ہونے والے مسلمان سرداروں اور سلاطین کے آگے ہمیشہ گھٹنے ٹیکے۔ کس کس کا حوالہ دوں۔ محمد بن قاسم، سلطان محمود غزنوی، سلجوقی، غوری، لودھی اور تغلق خاندان کے علاوہ خاندان غلامان اور پھر مغلوں میں سے کس کو اس برصغیر کے ہندو راجوں، مہاراجوں نے ایک بار بھی شکست دی یا کم از کم جم کر مقابلہ ہی کیا۔ مسلمان آتے اور سارے برصغیر کے سورما حکمرانوں کی حکومتوں کو روندتے اور تاراج کر کے واپس لوٹ جاتے۔ ان کے لیے

برصغیر پر حملہ کرنا پولو کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا جس میں ہمیشہ انھی کی جیت ہوتی ہر قسم کے سامان حرب ضرب سے لیس لاکھوں کی فوج اور سیکڑوں ہاتھیوں کی دیوار کھڑی کر کے ان ہندو حکمرانوں نے یہاں تک کیا کہ اپنے پیادہ فوجیوں کے پاؤں لوہے کی زنجیروں میں جکڑ ڈالے لیکن اللہ اکبر کا نعرہ سنتے ہی ہندو فوجیوں کے بھاگنے میں نہ تو لوہے کی سنگل حائل ہوئی اور نہ ہی ان کے دیوتا گنیش (ہاتھی) کے جومتے جھامتے پہاڑ جیسے جسم۔ ہندو حکمرانوں کی مجموعی طاقت نہ تو اپنے سب سے بڑے دیوتا سومنات کو محمود غزنوی کے گرز سے ٹوٹنے سے بچا سکی اور نہ ہی راجہ داہر کے پجاریوں کے منتر اور شکست سے بچنے کے لیے پجاریوں کے کہنے پر اپنی سگی بہن سے شادی محمد بن قاسم کے بڑھتے ہوئے قدم روک سکی۔ راجہ داہر تو تیرہ سو سال قبل مرکھپ گیا لیکن اس کی ناجائز اولاد آج بھی مسلمان غداروں کے روپ میں اسے محب وطن اور جانباز اور محمد بن قاسم کو لٹیرا کہتی ہے۔ لعنت ہو ایسی جانبازی پر اور ایسے خیالات پر۔ جب مسلمانوں نے برصغیر میں جم کر رہنے اور حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تو ہندوؤں نے ان کے پاؤں میں اپنے ماتھے ٹیک دیے۔

مسلمان حکمرانوں کے سامنے آتے ہی ہندوؤں کی جو حالت ہوتی تھی اس کی ایک مثال ہندوؤں کی سب سے بہادر ذات راجپوتوں میں سب سے اعلیٰ وارفع خاندان سورج ونسی کے حکمران راجا مان سنگھ کا اپنی بہن رانی جودھابائی کو مغل شہنشاہ اکبر اعظم کی بے نکاحی زوجیت (جودھا بائی کبھی بھی مسلمان نہیں ہوئی) میں دینا ہے جب کہ ہندو مذہب کے مطابق مسلمان کا سایہ پڑنے سے بھی وہ بھرشٹ (ناپاک) ہوجاتے ہیں۔ سندھ کا مشہور جاگیردار اور غدار رانا چندر سنگھ بھی سورج ونسی خاندان سے ہے اس لیے اب ضرورت ہے ایک اکبر اعظم کی۔ پشاور سے جہلم تک کے حکمران راجا جے پال کو احمد شاہ ابدالی نے چار مرتبہ شکست دی۔ وہ ہر بار اسے قیدی بنا کر کابل لے جاتا اور بھرے دربار میں اس سے اپنے پاؤں دھلوا کر چھوڑ دیتا کیوں کہ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ جب بھی چاہے اس چوہے کو مار سکتا ہے۔ لہٰذا اس سے کھیلتا رہا۔

اب بھارت نے پرتھوی اور پاکستان نے غوری میزائل بنائے ہیں۔ ذرا غوری اور پرتھوی کا واقعہ بھی سن لیجیے۔ برصغیر کے ہندو حکمرانوں میں دہلی اور اجمیر کے راجا پرتھوی راج چوہان کی بہادری اور دلیری کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ وہی حضرت تھے جو اپنے ایک مخالف راجا کے دربار سے اس کی جوان بیٹی سنجو گپتا کو زبردستی گھوڑے پر بیٹھا کر بھاگ آئے تھے۔ پرتھوی راج کا غوری سے پہلی بار مقابلہ ہوا تو سامانِ رسد نہ ملنے اور اندھیرا چھا جانے کے باعث ہار جیت کے بغیر غوری کو واپس لوٹنا پڑا۔ اس نے سزا کے طور پر اپنے تمام سرداروں کے منہ پر چوپایوں کی خوراک سے بھرے توبڑے بندھوا دیے اور خود ننگے فرش پر سونا اور ۲۴ گھنٹے میں صرف ایک بار کھانا شروع کیا۔ اگلے برس پوری تیاری کے ساتھ وہ پھر پرتھوی راج کے مقابل آیا۔ پرتھوی راج کے ہمراہ اس وقت کم از کم ۹ راجاؤں کی فوج اور سامان حرب

ضرب تھا۔ مسلمانوں کے پہلے حملے میں ہی ہندو فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ تاریخ میں درج ایک محتاط اندازے کے مطابق ہندوؤں کی فوج ایک لاکھ بیس ہزار پیادوں اور پینتیس ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل تھی جب کہ غوری کی فوج میں کل ۱۴ ہزار سوار اور پیادہ ایک بھی نہ تھا۔ شام ڈھلنے سے پہلے ہی ہندو فوج پرتھوی راج کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئی۔ پرتھوی راج جس ہاتھی پر سوار تھا، غوری کے ایک سوار نے تلوار کے وار سے اس ہاتھی کی سونڈ کاٹ ڈالی۔ ہاتھی شدت درد سے بھاگا اور دریائے جمنا کے بیچ میں بیٹھ کر پرتھوی راج سمیت ہلاک ہوگیا اب بھی اگر موقع آیا تو ان شاء اللہ ہم پرتھوی راج کی طرح پرتھوی میزائل بنانے والوں کو صرف جمنا میں ہی نہیں بلکہ بھارت کے سارے دریاؤں کے علاوہ سمندر میں غرق کردیں گے کیوں کہ ان کی آبادی اتنی بڑھ چکی ہے کہ دریاؤں میں سما نہ سکے گی۔

ہمیں پوری سے جب سب انفارمیشن مل گئی تو میں نے قیصر کو کہا ''اب اسے ختم کرو'' لیکن میجر عمران نے جو ابھی تک پوری کی چھاتی پر بیٹھا ہوا تھا، قیصر کو روکتے ہوئے پوری کی گردن دبانی شروع کی اور اسے تب چھوڑا جب وہ بالکل ختم ہوگیا ''سر، میں نے کراٹے کے ساتھ مارشل آرٹ کے اس فن کی بھی تربیت حاصل کی ہے جس میں دشمن کو بغیر خون بہائے ہلاک کیا جاسکتا ہے۔ آئی ایم سوری کہ میں نے آپ کے آرڈر کے مطابق عمل نہ ہونے دیا'' میجر عمران نے پیش بندی کرتے ہوئے مجھے اسے سرزنش کرنے کا کوئی موقع نہ چھوڑا تھا۔ ''That's All Right (ٹھیک ہے) لیکن آئندہ ڈسپلن کی پوری پابندی کی جائے گی'' قیصر اور عمران نے پوری کی لاش کو بستر پر لٹا کر چادر اوڑھا دی کیوں کہ AC پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ اس کا ریوالور لے کر اور کمرے میں اپنی موجودگی کے تمام نشان مٹا کر اور ہوٹل کے رائٹنگ پیڈ اور قلم اپنے ہمراہ لے کر ہم ایک ایک کر کے پوری کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ ہم تینوں نے اپنے فلور کی لابی میں پہنچ کر یہ فیصلہ کیا کہ بجائے وقفہ دینے کے دونوں فوجیوں کو آج رات ہی ٹھکانے لگا دیا جائے تاکہ ہوٹل والوں کو تینوں کے مرنے کا ایک ساتھ ہی پتا چلے اور یہ دونوں فوجی بھی پوری کی ہلاکت کا جان کر ہوٹل چھوڑ کر کہیں اور نہ چلے جائیں۔ اب ہمارا رخ کمرہ نمبر ۴۰۵ کی طرف تھا جس میں میجر کیلاش ٹھہرا ہوا تھا۔ میجر اور کیپٹن کے دروازے کھلوانے کی کوئی صورت سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ دونوں فوجی تو ایک ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے کی آوازوں سے خوب آشنا ہوں گے۔ لیکن پوری کے ساتھ ان کا رابطہ بہت کم عرصے سے ہوگا۔ اس لیے انھیں یکے بعد دیگرے پوری کے کمرے میں ہی بلایا جائے۔ ہم پھر پوری کے کمرے میں آگئے اور میں نے ٹیلی فون کے ریسیور پر رومال رکھ کر میجر کیلاش کے کمرے میں فون کیا۔ کیلاش نے نیند بھری آواز میں ہیلو کہا تو میں نے پوری کی آواز کی نقل کرتے ہوئے کہا ''میجر! ہوٹل کا منیجر اس وقت میرے کمرے میں ہے اور بہت کارآمد Info (اطلاع) لایا ہے۔ لہٰذا فوری طور پر میرے کمرے میں چلے آؤ'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔ میں نے جو چال چلی تھی اس کی کامیابی یا ناکامی میجر کی عقل و دانش پر تھی۔

میں نے دانہ پھینک دیا تھا اور جال میں پھنسنا یا نہ پھنسنا اس کا کام تھا۔ میجر عمران اور قیصر داخلی دروازے کی اندرونی جانب پردوں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے پوری کی لاش کے چہرے پر سے چادر پلٹ دی اور دروازے کی طرف پیٹھ کر کے سنگل صوفے پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے پوری سے باتیں کررہا ہوں۔ چند لمحوں بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اسی آواز میں کہا "Come in Major- The Door is Open" (میجر اندر آجاؤ دروازہ کھلا ہے)۔ میجر کمرے میں داخل ہوا اور پوری کے بیڈ کے طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ میجر عمران اور قیصر نے بہ یک وقت اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ قالین پر گرا۔ میجر عمران اس سے دو بدو مقابلہ کرنا چاہتا تھا کیوں کہ دونوں کمانڈو ٹریننگ لے چکے تھے۔ لیکن یہ وقت اس قسم کے مقابلے کا نہ تھا۔ میں نے قیصر کو کہا ختم کرو اسے۔ میرے منہ سے بات نکلتے ساتھ ہی قیصر نے اپنا چاقو اتنی تیزی سے اس کی گردن پر پھیرا کہ میجر کا سرتن سے جدا ہوگیا لیکن اس کا لاشہ کئی منٹ تک پھڑکتا رہا۔

☆☆

میجر عمران نے زندگی میں شاید پہلی بار چاقو سے کسی کی گردن کٹتے اور سرتن سے جدا ہوتے دیکھا تھا۔ اسے ابکائی سی آئی۔ قیصر اس کی یہ حالت دیکھ کر ہنس پڑا اور بولا ''عمران صاحب! دور سے گولی چلا کر کسی کو ہلاک کرنا اور بات ہے اور چاقو سے گردن کاٹ کر علیحدہ کرنا اور بات۔ خیر میں آپ کو چاقو چلانے میں ماہر کردوں گا اور آپ مجھے بدلے میں کراٹے کے مزید داؤ پیچ سکھلا دینا۔'' بھارتی میجر کی گردن سے خون فوارے کی طرح بہہ رہا تھا۔ قیصر اور عمران نے بھارتی میجر کی لاش گھسیٹ کر پوری کے پلنگ کے دوسری طرف ڈال دی۔ فرش بھی خون سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ اب میں نے فون اٹھا کر کیپٹن بھنڈارے کا نمبر ملایا اور پوری کی آواز میں اسے کہا ''بہت بڑی اور مفید اطلاع ملی ہے۔ میجر بھی میرے کمرے میں ہے تم بھی فوراً یہاں آجاؤ'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔ اس بار میں نے میجر عمران کو بیڈ کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے اور مجھے اور قیصر کو کور (Cover) دینے کا کہا کیوں کہ میں اس کمانڈو کیپٹن سے خود دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا۔ بھارت میں پہلی بار داخلے کے بعد میں نے صرف ایک بار کمانڈو کی ٹریننگ لیے ہوئے وجے کمار کو زیر کیا تھا اور اب میری خواہش تھی کہ خود آزما کر دیکھوں کہ مجھ میں کتنا دم خم باقی ہے۔ میں اور قیصر حسب سابق دروازے کے پردوں کے پیچھے چھپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔ میجر عمران جو دروازے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا تھا، بولا۔ "Come in Captain" (اندر آجاؤ کیپٹن) کیپٹن اندر آیا۔ یہ ایک گھٹے ہوئے جسم کا لمبا تڑنگا جوان تھا جس نے شب خوابی کا لباس پہنا ہوا تھا۔ دروازے سے چند فٹ اندر آ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ فرش پر بچھا قالین خون سے لت پت تھا۔ یہ وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ غالباً اسے خطرے کا احساس ہوچکا تھا۔ اسی وقت میں نے پردے سے باہر آ کر آہستہ سے کہا Are you Looking for

me Captain? (کیپٹن کیا تم مجھے تلاش کررہے ہو) اسی دوران قیصر نے دروازہ بند کردیا۔ کیپٹن میری آواز سن کر میری طرف پلٹا تو میں نے اس کے نازک حصے پر ایک زور دار کک جمائی۔ کیپٹن کو اس اچانک حملے کی توقع نہ تھی۔ کک بالکل صحیح جگہ پر پڑی تھی۔ وہ درد کی شدت سے دہرا ہوگیا۔ مجھے اسی موقعے کی تلاش تھی میں نے پے در پے اس دہرے ہوتے کیپٹن کے ماتھے، دونوں کنپٹیوں اور سر کے پیچھے گدی پر سات آٹھ ککس ماریں۔ یہ وہ جگہیں تھیں جہاں ضرب لگنے سے مخالف مرجاتا یا کم از کم بے ہوش ضرور ہوجاتا ہے۔ کیپٹن میرے حملے کو برداشت نہ کرسکا اور قالین پر چت ہوگیا۔ قیصر کھلا چاقو لیے سامنے کھڑا تھا کہ کیپٹن کی گردن کاٹے لیکن میں نے اسے منع کرتے ہوئے اس کی گردن کی ان مخصوص نسوں کو دبایا جو دماغ اور باقی جسم میں رابطے کا کام دیتی ہیں کیپٹن صرف بے ہوش ہوا تھا ان نسوں کے دبنے کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ بے ہوش شخص ہوش میں آجاتا ہے۔ کیپٹن بھنڈارے ہوش میں آیا۔ میں اس کے سینے پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کے دونوں بازوؤں کو میں نے اپنے گھٹنوں اور ٹانگوں سے دبا رکھا تھا اور میرے ہاتھ اس کی گردن پر ان نسوں پر تھے جن کو دبانے سے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں انسان ہلاک ہوجاتا ہے۔ میں نے اسی حالت میں بھنڈارے سے پوچھا ''مجھے پہچانتے ہو؟ میں وہی ہوں جس کی تلاش میں تم میجر کیلاش اور پوری یہاں آئے تھے۔ کیلاش اور پوری کی لاشیں اسی کمرے میں پڑی ہیں اور تمھارا بے جان جسم بھی بہت جلد ان میں شامل ہوجائے گا۔ تمھاری آتما جہاں بھی جائے تو اپنے بھگوانوں کو بتا دینا کہ میری موت کسی بت پرست یا کافر کے ہاتھوں نہیں ہوسکتی اس لیے کیوں خواہ مخواہ جانوں کا ضیاع کروا رہے ہو۔'' بھنڈارے کی آنکھیں نسوں پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے پھٹی جارہی تھیں۔ میں نے اسے کہا ''مجھے اچھی طرح سے پہچان لو تاکہ تمھاری آتما بھی میری شکل کو بھول نہ سکے۔'' یہ یک طرفہ گفتگو میرے جذبات اور ہندوؤں سے نفرت کی آئینہ دار تھی۔ ان نسوں کو دباتے وقت اپنے جسم کی پوری طاقت ہاتھوں کی انگلیوں میں مرتکز کرنی پڑتی ہے۔ میرے بولنے کے دوران یہ طاقت منتشر ہوگئی۔ بھنڈارے مضبوط جسم کا جوان تھا اس نے میری گرفت کو کم زور ہوتے محسوس کیا تو جھٹکے سے اٹھنے اور اپنے بازوؤں کو چھڑوانے کی کوشش کی اس کی اس حرکت سے میری پوری جسمانی طاقت پھر میرے ہاتھوں اور بازوؤں میں آگئی۔ اس کے جھٹکے سے اٹھنے کی کوشش میں اس کی گردن فرش سے کچھ اوپر اٹھ چکی تھی میں نے اپنے بائیں بازو سے اس کی گردن کو شکنجے میں لیا اور دائیں ہاتھ سے اس کے سر کو جھٹکا دیا۔ گردن کا منکا ٹوٹنے کی آواز قیصر نے بھی سنی۔ بھنڈارے کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ قیصر اور میجر عمران عمر میں مجھ سے چھوٹے اور بھرپور جوان تھے اور میں DMI دہلی کے ہیڈ کوارٹرز میں ایک ماہ اور ۶ دن بدترین عقوبت کا شکار رہ چکا تھا۔ یہ دونوں حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے کہ میں نے نہتے ہاتھوں کیوں کر اس بھارتی کمانڈو کیپٹن کو اتنی آسانی سے ٹھکانے لگا دیا کہ اسے آہ تک بھرنے کا موقع نہ ملا۔ میں نے قیصر کے ساتھ مل کر کیپٹن کی لاش کو بھی میجر کی لاش کے

ساتھ ہی پھینک دیا۔ ہمارے یہ تینوں ظاہری دشمن ہلاک ہوچکے تھے لیکن ایک چشم دید گواہ یعنی پانی لانے والا ویٹر زندہ موجود تھا جس کی گواہی ہمیں بڑی مشکلات میں پھنسا سکتی تھی۔ میں نے اسی کمرے سے فون پر روم سروس والوں سے ٹھنڈا پانی منگوایا۔ میرے خیال میں ہر فلور کے لیے روم سروس کے تین ویٹر مقرر تھے۔ اسے اس ویٹر کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس بار بھی پانی وہی ویٹر لایا۔ شاید اس کی موت کا وقت آچکا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی کا جگ ٹرے میں اٹھائے دروازہ کھٹکھٹا کر کمرے میں داخل ہوا۔ ابھی اس کی نگاہ فرش پر پڑے خون پر پڑی بھی نہیں تھی کہ میں نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا اور قیصر نے اس کے پیٹ اور سینے پر چاقو کے چار پانچ وار کیے۔ قیصر اپنا رام پوری چاقو ہر بار گھونپنے کے بعد گھما دیتا تھا تاکہ چاقو جسم کے اندر جانے کے بعد اردگرد کے جسمانی حصوں کو بھی کاٹ ڈالے۔ جب قیصر کو یقین ہوگیا کہ ویٹر مرچکا ہے تو اس نے چاقو پر لگے خون کو اس کے لباس سے صاف کیا اور میں نے اس کے بے جان جسم کو اوندھے منہ ٹرے اور جگ پر ڈال دیا۔ یہ ویٹر بالکل بے گناہ تھا جو ہمارے ہاتھوں مارا گیا لیکن ہمارے پاس اسے ہلاک کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے کے مصداق اس کی اس طرح بلاوجہ موت ہوئی تھی۔ ہم تینوں پوری کے کمرے کو اندر سے بند کر کے باہر آئے اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ مجھے ویٹر کو ہلاک کرنے کا قلق بھی تھا لیکن پوری کے کمرے کے باہر ہمیں دیکھنے والے چشم دید گواہ کو ختم کرنا بھی ہمارے لیے ضروری تھا۔

اگلی صبح سارے ہوٹل میں شور مچا تھا کہ تین مہمانوں اور ایک ویٹر کا قتل ہوگیا ہے اور چاروں کی لاشیں ہوٹل کے ایک کمرے میں پڑی ہیں۔ سری وانگ روڈ پر اس ہوٹل سے زیادہ سے زیادہ سو فٹ کے فاصلے پر پولیس اسٹیشن ہے۔ پولیس کے درجنوں سپاہی اور افسر ہوٹل میں چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ میں گراؤنڈ فلور پر ریسیپشن پر گیا تو ہوٹل کی مالکہ رانی اور منیجر گپتے وہاں کھڑے پولیس افسران سے باتیں کررہے تھے۔ ان دونوں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے بہت سارے گیسٹ فوری طور پر ہوٹل چھوڑنا چاہتے تھے جنھیں پولیس والوں نے روک رکھا تھا۔ میں پولیس افسران کے پاس گیا اور گپتے سے پوچھا ”مسٹر گپتے کیا بات ہے۔ یہ ہڑبونگ سی کیوں مچی ہے اور اتنے پولیس والے یہاں کیا کررہے ہیں۔ کیا پولیس کا کوئی فنکشن ہورہا ہے۔“ گپتے اور رانی تو خاموش رہے۔ گپتے بہ یک وقت زہر سے بھری اور خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایک پولیس افسر نے مودبانہ لہجے میں (کاش ہماری پولیس بھی شرافت سے بات کرنا تو سیکھ لے) مجھ سے پوچھا کہ کیا میں بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوں؟ میں نے اسی کے لہجے میں اسے ہاں میں جواب دیا۔ اس پولیس آفیسر نے پھر پوچھا کہ میں کہاں سے اور کیوں آیا ہوں۔ ”میں اپنے پاکستانی اور بنگلہ دیشی ساتھیوں کے ہمراہ یہاں سیر و تفریح اور دل بہلانے آیا ہوں اور اس سے پہلے بھی اس ہوٹل میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رہ چکا ہوں۔ رانی

اور مسٹر گپتے مجھے بخوبی پہچانتے ہیں۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے گپتے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا ”مسٹر گپتے کیا تم مجھے بہت اچھی طرح سے نہیں جانتے ہو۔“ گپتے گھبرا گیا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولا ”میں آپ کو جانتا ہوں آپ ہمارے معزز مہمان ہیں“ میں نے پولیس افسر سے پوچھا کہ بات کیا ہے تو اس نے بتایا کہ چار خون ہوگئے ہیں جس میں تین مہمان اور ایک ویٹر ہے اور چاروں کی لاشیں ایک کمرے میں پڑی ہیں۔ ”یہ بھی LSD (نشہ آور گولیاں جو ان دنوں بینکاک میں بہت مقبول تھیں) یا ہیروئن کا چکر ہوگا“ میں نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ اس ہوٹل میں پہلے قیام کے دوران مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہماری آمد سے چند روز پیش تر اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں دو مہمان قتل ہوگئے تھے کیوں کہ ان کا ہیروئن کے سپلائر سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ ”یہ قتل کب ہوئے تھے؟“ یہ پولیس آفیسر غالباً نیا تھا جسے پہلے کی دو ہلاکتوں کے بارے میں علم نہ تھا اس کے پوچھنے پر میں نے جواب دیا ”مجھے تو سرسری سی بات معلوم ہوئی تھی۔ مسٹر گپتے کو صحیح علم ہوگا کیوں کہ یہ ہوٹل کے منیجر ہیں۔ رانی نے گھبرا کر کہا ”چلیے دفتر میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں باتیں کرنے سے گاہکوں پر برا اثر پڑے گا۔“ رانی ہم سب کو دفتر میں لے جانے کے لیے آگے بڑھی تو میں نے کام کا عذر کر کے معذرت کرلی۔ آگے آگے رانی اور تین پولیس آفیسر اور پیچھے میں اور گپتے تھے میں نے سرگوشی میں گپتے کو کہا ”گپتے اپنے ہاتھ کی لکیروں کو اچھی طرح سے دیکھ لو، کہیں تمھاری زندگی کی لکیر ختم تو نہیں ہوگئی۔ اگر ہوش مندی سے کام نہ لیا تو پانچویں لاش تمھاری ہوگی۔“ یہ کہہ کر میں ان سے الگ ہوا اور اپنے کمرے میں جاکر قیصر کے ذریعے سب ساتھیوں کو بلوایا اور کہا کہ وقتی طور پر اپنا اپنا اسلحہ اور چاقو ایک سوٹ کیس میں رکھ کر مجھے دے دیں۔ ۱۰ منٹ میں ہی اسلحے سے بھرا سوٹ کیس میرے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں نے یہ سوٹ کیس اپنے فلور کی گیلری کے ایک کونے پر سنٹرل ایئرکنڈیشننگ کے پائپ گزرنے کی False ceiling (مصنوعی چھت) کے ایک چوکور ٹکڑے کو ہٹا کر اندر دھکیل کر چھت کے ٹکڑے کو دوبارہ اپنی جگہ پر فٹ کردیا۔ رانی نے جلد از جلد لاشوں کو ہوٹل سے اٹھوانے کے لیے غالباً پولیس والوں کو رشوت دے کر ساری کارروائی دو گھنٹوں میں مکمل کروادی۔ ہم سے بھی پولیس والوں نے کوئی تفتیش وغیرہ نہیں کی تین روز بعد میں نے سوٹ کیس نکال کر اسلحہ ساتھیوں کو دے دیا۔ گپتے کا ہم نے جو حشر کیا وہ آگے پڑھیے گا۔

☆☆

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ میں نے اپنے آئندہ مشنوں کے لیے بینکاک کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا۔ کیوں کہ اوّل تو ہم سب ساتھیوں میں سے یہاں کی پولیس کو کوئی مطلوب نہیں تھا اور ہم آزادی سے اپنی روانگی کی تیاریاں کرسکتے تھے۔ دوسری وجہ خن سا اور عمر خان کا یہاں پر ہمیں مکمل تعاون حاصل تھا۔ خن سا کے ذریعے ہم شک و شبہے سے پاک ایسے جعلی پاسپورٹ اور ویزے حاصل کرسکتے تھے جو

ان ممالک میں ہمارے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کرسکتے جہاں ہم نے جانا تھا۔ سعودی عرب میں عمر خان نے ہمارے لیے اسلحے کا انتظام بھی کردیا تھا۔ ان دنوں مشرق وسطیٰ کے تیل کی دولت سے مالا مال مسلم ممالک میں پاکستانیوں اور بنگلہ دیشیوں کو بڑی عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ وہاں پر ہر پاکستانی کو چاہے وہ مزدور ہی کیوں نہ ہو، داکتور (ڈاکٹر) یا مہندس (انجینئر) کہا جاتا تھا۔ ان ممالک کی تعمیر میں پاکستانیوں نے بہت محنت کی تھی۔ یہ تو ۸۰ء کے عشرے میں جب پاکستانیوں نے ان ممالک مثلاً سعودی عربیہ، دوبئی اور ابوظہبی وغیرہ میں بلدیہ کے ٹھیکے لے کر اور ہاتھوں میں جھاڑو پکڑ کر سڑکوں کی صفائی شروع کی تو ان ممالک میں ان کی قدر و منزلت ختم ہوگئی۔ شاہ خالد کے دور میں ریاض میں سربراہ کانفرنس ہوئی تو ریاض کی بلدیہ جس کا ٹھیکا پاکستانیوں کے پاس تھا۔ ریاض شہر کو دلہن کی طرح سجا دیا۔ سعودی عرب کے انگریزی کے سب سے مقبول روزنامے سعودی گزٹ کے صفحہ اوّل کے آدھے حصے پر ایک شلوار قمیص پہنے اور ہاتھوں میں خاکروبوں والا بڑا جھاڑو تھامے ایک پاکستانی کی تصویر شائع ہوئی جس کا کیپشن تھا Well Done Rafiq (رفیق بہت خوب کام کیا) بس اس روز سے ہی سارے پاکستانیوں اور شلوار قمیص پہننے والوں کو خاکروب ہی سمجھا جانے لگا۔ بے روزگاری کے مارے ہوئے پاکستانیوں نے بھی ان ممالک میں گھٹیا سے گھٹیا کام کرنے میں بھی کوئی عار نہ سمجھا۔ میں نے تو جدہ میں بنی مالک میں مالشیے اور ہیجڑوں کے غول بھی دیکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانیوں کی ساری قدر و منزلت ختم ہوگئی۔ حد یہ کہ دوبئی کے سب سے بڑے پارک میں شلوار قمیص پہن کر جانے والوں پر پابندی لگادی گئی اور ان عربی بولنے والے ممالک میں باقی تمام ممالک کے مسلم باشندوں کو صدیق اور پاکستانیوں کو رفیق کا خطاب ملا۔

ہوٹل کے منیجر گپتے کو میں نے ذرا دھمکا کر وقتی طور پر تو خاموش کردیا تھا لیکن بینکاک میں ایسے دشمن کا زندہ رہنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ پوری اور بھارتی فوجیوں کو ہلاک کرنے کے پانچویں روز ہمیں بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر اس دشمن سے پیچھا چھڑوانے کا موقع مل گیا۔ قیصر اور میں ہوٹل کے ریسیپشن پر اپنے اور ساتھیوں کے بلوں کی ادائیگی کے لیے کھڑے تھے کہ ایک اجنبی تھائی میرے بالکل ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''خن سا نے مجھے آپ کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ گپتے ابھی ابھی انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے سامنے مہاراجا ڈریپرز اینڈ ٹیلرز کی دکان پر گیا ہے۔ اب ذرا اس مہاراجا دکان کے مالک کا ذکر بھی سن لیجیے، یہ حضرت امریکا کے بہت حامی ہیں۔ ویت نام کی جنگ کے دوران اس نے امریکی فوجیوں کی جو مختصر مدت کی چھٹی پر بینکاک آتے تھے، بہت ''سیوا'' کی۔ بینکاک کو گناہ کی دنیا کا سب سے بڑا اڈہ بنانے میں اس کی کاوشوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ جن کے دوران ہی ان سردار صاحب نے غالباً دن کے ٹھیک ۱۲ بجے اپنی خدمات کے عوض ایک امریکی جنرل سے امریکی فوج میں کوئی عہدہ مانگا۔ امریکی جنرل بھی موڈ میں تھا اس نے اس سردار جی کو ۶ اسٹار جنرل کا عہدہ دیا بلکہ ایک امریکی وردی کے کندھوں پر ۶ اسٹار لگا کر اسے وردی پہنائی اور

تصویریں کھینچی گئیں (قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ امریکا، برطانیہ، روس، چین، پاکستان، بھارت یا دنیا کے کسی ملک میں بھی ۶ اسٹار جنرل نہیں ہوتا۔ برطانیہ، پاکستان اور بھارت میں ایک اسٹار بریگیڈ، دو اسٹار میجر جنرل، تین اسٹار لیفٹیننٹ جنرل اور چار اسٹار پورے جنرل کے لیے ہوتے ہیں۔ ان ممالک میں پانچ اسٹار فیلڈ مارشل کے ہوتے ہیں جیسے برطانیہ میں فیلڈ مارشل منٹگمری، فیلڈ مارشل آکن لک، پاکستان میں فیلڈ مارشل ایوب خان اور بھارت میں فیلڈ مارشل مانک شا تھے۔ امریکا میں سب سے بڑے جنرل کو 5 Star General (۵ ستاروں والا جنرل) کہا جاتا ہے۔ یہ اسٹار ان کی سرکاری گاڑیوں پر لگائے جاتے ہیں۔ ۶ اسٹار جنرل پوری دنیا میں کسی فوج میں نہیں۔ سردار جی سے مذاق کیا گیا تھا جسے وہ سچ سمجھ بیٹھے اور آج بھی ان کی دکان کے وزیٹنگ کارڈز، لیٹر ہیڈز پر وہ خود کو ۶ اسٹار جنرل لکھتے ہیں یہ مذاق ویت نام کی جنگ سے اب تک جاری ہے اور سردار جی کی جتنی ڈاک آتی اور جاتی ہے اس پر انھیں ۶ اسٹار جنرل لکھا جاتا ہے۔ نیوز ویک میں بھی اسی واقعے کو The Biggest Joke (سب سے بڑا مذاق) کا ٹائٹل دے کر ایک آرٹیکل شائع ہوا تھا۔) میں اور قیصر سردار جی کی دکان کے باہر کھڑے رہے تھوڑی دیر بعد ہی گپتے وہاں پہنچا۔ اس کے وہاں آتے ہی ہم نے ایک ٹیکسی لی اور میں نے ڈرائیور کو دو ہزار بھات دیتے ہوئے کہا کہ ایک ناراض دوست کو راضی کرنے کے لیے ہمراہ لے جانا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ جانے میں پس و پیش کرے گا۔ تم اس کی کوئی بات نہ سننا اور جب ہم ٹیکسی میں بیٹھ جائیں تو ہمیں پتایا جانے والی سڑک پر لے جانا۔ اگر تم نے خوش اسلوبی سے کام کیا تو تمھیں مزید دو ہزار بھات دیں گے۔ ٹیکسی ڈرائیور فوراً راضی ہوگیا۔ جس شہر میں جسم فروشی اور منشیات کا استعمال عروج پر ہو، وہاں اغوا کی وارداتیں بھی اکثر ہوتی ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سودا طے ہوتے ہی اپنی گاڑی کی ڈگی سے دو نمبر پلیٹیں نکالیں اور گاڑی کی نمبر پلیٹوں کے اوپر فٹ کردیں۔ میں نے وہیں ایک بک اسٹال سے اخبار خریدا اور ہم دونوں گپتے کے دکان سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد گپتے دکان سے باہر آیا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی تھی یا ہماری خوش قسمتی کہ سڑک پر کوئی اور ٹیکسی نہ تھی۔ وہ سیدھا ہماری ٹیکسی کی طرف آیا اور ابھی ڈرائیور سے بات کرنے ہی لگا تھا کہ قیصر اور میں نے دونوں جانب سے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ میں نے اپنا ریوالور اور قیصر نے کھلا چاقو اخبار کے ورقوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ میں نے گپتے کو کہا۔ ''میرے اخبار کے اندر ریوالور ہے اور میرے ساتھی کے پاس چاقو، خاموشی سے ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ ورنہ یہیں پر تمھیں ختم کردیں گے۔'' میں نے ریوالور کی نال اس کی پسلیوں کے ساتھ لگادی۔ دوسری طرف قیصر نے چاقو کی نوک اسے چھوتے ہوئے اشارہ کیا کہ ٹیکسی میں بیٹھ جائے۔ گپتے کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنے لگا تو قیصر نے چاقو کا دباؤ بڑھا دیا۔ پچھلی سیٹ پر پہلے قیصر بیٹھا، میں نے دھکیل کر گپتے کو اندر کیا اور ساتھ ہی میں بیٹھ گیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے دوڑاتا ہوا پتایا کی سڑک پر

ہولیا۔ گپتے جس وقت بھی کوئی بات کرنے لگتا قیصر چاقو کی نوک زور چبھو دیتا۔ میں اور قیصر اس سڑک سے بالکل ناواقف تھے۔ میں نے ڈرائیور کو ہزار بھات دیتے ہوئے پوچھا ''کیا یہاں کوئی سنسان جگہ ہے؟'' ڈرائیور نے بھات جیب میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ''فکر نہ کرو! میں تمھیں وہیں لے جارہا ہوں۔ اس سڑک پر ان دنوں فیکٹریاں اور کارخانے بن رہے تھے۔ ڈرائیور ہمیں ایک ایسی نامکمل فیکٹری کی پشت پر لے گیا جس میں کام بالکل بند تھا اور کوئی چوکیدار وغیرہ بھی نہ تھا۔ گپتے کو اپنا انجام دکھائی دینے لگا تو اس کا سارا جسم کانپنے لگا اور وہ رونے اور گڑگڑانے لگا۔ ''اب تو تم سمجھ گئے ہو گے کہ ہم تمھیں یہاں کیوں لائے ہیں؟'' میں نے گپتے کو کہا تو اس کی گھگھی بندھ گئی۔ ''بھگوان کے لیے مجھ پر کرپا کرو۔ مجھے نہ مارو۔ تم جو کچھ بھی جاننا چاہتے ہو میں تمھیں حرف بحرف بتا دوں گا۔'' گپتے نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''دونوں فوجی اور پوری تو ختم ہوگئے۔ تمھارے سوا اور کون کون ہمارے متعلق جانتا ہے اور تم نے دہلی میں ہمارے متعلق کس کو اطلاع دی تھی۔'' میں نے گپتے سے پوچھا۔ اس کے منھ سے اب آواز بھی بڑی مشکل سے نکل رہی تھی ''میں نے کسی کو اطلاع نہیں دی۔ مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ پوری صاحب اور دونوں فوجی یہاں کسی کی تلاش میں آئے تھے اور بھارتی سفارت خانے کے ملٹری اتاچی نے مجھے فون پر کہا تھا کہ ان کے ساتھ تعاون کروں۔'' ''اب تو ہمارے متعلق سب کچھ جان گئے ہو اب تمھارا کیا ارادہ ہے'' میں نے پوچھا تو گپتے فوراً بولا ''بھگوان کی سوگند میں آپ کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ پوری اور دونوں فوجیوں اور ویٹر کو کسی منشیات فروش نے قتل کیا ہے۔ آپ لوگوں کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں۔'' میں نے قیصر کی طرف دیکھا تو اس نے اشارے سے کہا کہ اسے نیچے اتارا جائے۔ میں نے گپتے کو کہا ''اچھا۔ اب نیچے اترو'' گپتے نے اگلی سیٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نے قیصر کی مدد سے اسے باہر کھینچنا چاہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ٹیکسی ڈرائیور جو گردن موڑے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ بولا ''سر! کوئی نہ کوئی یہاں آجائے گا اس لیے جلد سے جلد اس سے فراغت پالیں۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں ہی آٹھ دس ماہ پیش تر آپ کو رائل پلازہ ہوٹل سے ان لوگوں کے پاس لے گیا تھا جن سے آپ نے اسلحہ لیا تھا۔ ڈرائیور گاڑی سے اتر آیا اور ہم تینوں نے کھینچ کھانچ کر گپتے کو باہر نکالا۔ گپتے گاڑی سے نکلتے ہی زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے چیخنے چلانے اور التجاؤں کی آواز بلند سے بلند تر ہورہی تھی۔ میں نے قیصر اور ڈرائیور کو پیچھے ہٹنے کا کہا اور گپتے پر تین فائر کردیے۔ گپتے کا جسم پہلے دو فائروں پر اچھلا لیکن تیسرے فائر پر اس میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ڈرائیور نے اس کے سینے سے کان لگا کر اور گردن کی نسوں کو ٹٹول کر اپنی تسلی کی اور بولا ''Finish (ختم ہوگیا)'' میرے کہے بغیر ڈرائیور نے اس کی تلاشی لی اور بٹوا، گھڑی اور ڈائری نکال کر مجھے دی۔ میں نے بٹوے میں سے کاغذات نکال کر بٹوا اور گھڑی ڈرائیور کو دیے اور وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے ہم دونوں کو لیے واپس بینکاک کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے ڈرائیور کو دو ہزار کے بجائے چار ہزار بھات دیے اور اس کا نام

پوچھا ''سر! ایسے حالات میں کوئی بھی اپنا صحیح نام نہیں بتاتا لیکن آپ سے کیا چھپانا۔ خن سا ہمارا Big Chief (بڑا مالک) ہے اور میں عمر خان کے لیے کام کرتا ہوں۔ میرا نام کریم ہے اور میں دراصل ملائیشیا کا رہنے والا ہوں۔'' مجھے یہ بڑے کام کا آدمی نظر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ میرے متعلق کئی ماہ پہلے ٹیکسی میں لے جانے کے سوا کچھ اور بھی جانتا ہے تو اس نے میرے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر تک بتا دیا اور بولا ''سر میرے ذمے یہی کام ہے کہ یہاں آنے والے مشکوک لوگوں پر نگاہ رکھوں۔ مجھے سونپے گئے فرائض کے مطابق آپ بھی مشکوک تھے لہٰذا میں نے آپ کے یہاں آتے ہی آپ کے ساتھیوں کی تعداد اور ہوٹل کے متعلق اپنے باس کو بتلا دیا۔'' اس کے اس اعتراف سے مجھے معلوم ہوا کہ خن سا نے ٹیکسی ڈرائیوروں اور مختلف ہوٹلوں کے اسٹاف کے ذریعے اپنی مخبری کا جال پھیلایا ہوا تھا۔ اسی لیے ہر بار میرے بینکاک آنے پر اس کا کارندہ مجھے فون کرتا تھا...!

☆☆

گپتے کی لاش کو فیکٹری کے ایک نامکمل کمرے میں ڈال کر ہم ٹیکسی میں واپس بینکاک چلے آئے۔ ٹیکسی ڈرائیور سے اب ہمارا خود کو چھپانا بے سود تھا۔ واپسی کے سفر کے دوران بینکاک شہر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے جعلی نمبر پلیٹیں اتار کر ایک کپڑے میں لپیٹیں اور ڈگی کے ایک خفیہ خانے میں رکھ دیں۔ وہ ہمیں رائل پلازہ ہوٹل چھوڑ کر جانے لگا تو میں نے اسے اپنا کمرہ نمبر بتاتے ہوئے کہا کہ کل ۳ بجے بعد دوپہر وہ مجھے ٹیکسی ڈرائیور کی وردی کے بجائے سیویلین لباس میں ملے۔ مجھے اپنے آئندہ مشنوں کے لیے افرادی قوت کی کمی تھی۔ کریم کی آنکھوں میں میں نے گپتے کو ہلاک کرتے وقت وہ چمک دیکھی تھی جیسی خود میری اور قیصر کی آنکھوں میں بھارتی ہندو مخالفین اور دشمنان پاکستان کو ہلاک کرتے پیدا ہوتی ہے۔ گپتے کاروباری ذہنیت کا مالک تھا اس لیے اس کی ڈائری میں بھارتی سفارت خانے کے فرسٹ سیکریٹری، فرسٹ اور سیکنڈ ملٹری اتاچی، CBI دہلی کے ڈائریکٹر، DMI دہلی کے ڈائریکٹر مہیش کے ناموں کے آگے جو رقم وصول ہوئی اور جو باقی تھی، ان کی تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ میری اور کرنل مزمل کی دو چھوٹی تصویریں بھی اس کے ڈائری کے کور میں رکھی ہوئی تھیں بٹوے کے کاغذات کچھ تو ہوٹل کے متعلق تھے۔ ایک مہاراجا ٹیلرز (۱۶سٹار جنرل) کی رسید تھی اور ایک کاغذ ایسا تھا جس پر میرے اور میرے تمام ساتھیوں کے نام اور کمروں کے نمبر درج تھے جو اس ہوٹل میں مقیم تھے۔ کاغذ کی تہوں سے صاف دکھائی پڑتا تھا کہ اسے آج ہی لکھا گیا ہے۔ گپتا نے یہ کاغذ مہاراجا کی دکان سے واپسی پر یقیناً بھارتی سفارت خانے میں کسی کو دینا جانا تھا۔ اس کی ڈائری کے اندراجات اور اس کاغذ پر درج اطلاعات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھارتی سفارت خانے اور دہلی میں متعلقہ حکام کو اطلاعات فراہم کر کے ان کے دام کھرے کرتا ہے۔ میں نے ساتھیوں کو گپتا کے متعلق بتایا۔ اب مجھے بھی اس کھیل میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اگلے روز صبح ہی خن سا کے پے رول پر کام کرنے والے اس

ہوٹل کے آپریٹر نے مجھے فون پر بتایا کہ گپتا کے غائب ہونے کی وجہ سے ہوٹل کی مالکہ رانی بہت پریشان ہے۔ اس سے ایک نئی اطلاع یہ ملی کہ رانی کا شوہر ایک ارب پتی سکھ ہے جو کہ بے حد بدصورت ہے اور اس کا سارا چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا ہے۔ رانی جوان اور بے حد خوب صورت تھی اور شوقین بھی۔ گپتے کو اس نے صرف اس کی سفید رنگت اور اچھے ناک نقشے کی وجہ سے اپنا منیجر بنایا تھا۔ گپتے نے بھی رانی کو صرف اپنے تک محدود رکھنے کے لیے اس کی بدقماشی کے کچھ ثبوت یقیناً حاصل کر لیے تھے کیوں کہ رانی جب کبھی بھی کسی پاکستانی، بھارتی یا یورپین گاہک کے ساتھ بے تکلف ہوتی (صدائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کے لیے) تو گپتے اس سے سب کے سامنے باز پرس کرتا اور سخت سست کہتا لیکن رانی پھر اسے منا لیتی۔ رانی کا شوہر اس سے علیحدہ اور اپنی ایسی رنگ رلیوں میں مصروف رہتا جہاں صرف روپے کے حسن کو ہی سراہا جاتا ہے۔ آپریٹر نے مجھے یہ بھی بتایا کہ گپتا نے اپنے کمرے کے اندرونی اور بیرونی لاک بدلوا کر نئے پیچیدہ لاک لگوائے تھے جو ہوٹل کی ماسٹر چابی یا دوسری چابیوں سے نہیں کھل سکتے تھے۔ میں حیران تھا کہ گپتے کی لاش کی تلاشی کے دوران چابیاں کیوں نہ ملیں۔ سہ پہر تین بجے کریم آیا تو میں نے اس سے چابیاں نہ ملنے کا ذکر کیا۔ وہ بولا ”چابیاں تو بٹوے کے زپ والے خانے میں تھیں“ اس نے دو چابیاں جیب سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ کریم سے میں نے اپنے مقصد پر آتے ہوئے چند سوال پوچھے تو اس نے کہا کہ وہ ان ملائیشین چھاپہ ماروں سے ہے جو ملائیشیا کے ایک سابق وزیراعظم کے اپنے صوبے ریحان کو تھائی لینڈ کے ہاتھوں فروخت کرنے کے بعد عمر خان کی سرپرستی میں دونوں حکومتوں کے خلاف مسلح جدوجہد کر رہے ہیں۔ میں نے اسے کہا ”کریم! ہماری جدوجہد کا دائرہ وسیع ہے لیکن مقصد ایک ہی۔ خن سا اور عمر خان میرے نہ صرف دوست ہیں بلکہ ہماری جدوجہد میں ہمارا بھرپور ساتھ دے رہے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہو تو میں عمر خان سے تمھیں مانگ لوں گا لیکن ہمارے گروہ میں شامل ہونے سے پہلے تمھیں ایک چھوٹے سے امتحان سے گزرنا ہوگا“ کریم نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے میں فخر ہوگا۔ خن سا اور عمر خان کسی ایسے ویسے کو تو ملتے بھی نہیں۔ آپ میں یقیناً کوئی ایسی بات ہوگی جو یہ دونوں آپ کے دوست بن گئے ہیں۔ آپ عمر خان سے میرے متعلق بات کر لیں پھر جیسا چاہیں امتحان لے لیں۔ میں ان شاء اللہ پورا اتروں گا۔“ کریم کے جانے کے بعد میں محض شغل کے طور پر رانی کے دفتر میں گیا۔ اس وقت بھی وہ گپتے کی گم شدگی کے متعلق کسی سے بات کر رہی تھی۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب اس نے ٹیلی فون رکھا تو میں نے اس سے انجان بنتے ہوئے پوچھا کہ تمھارا منیجر کل سے دکھائی نہیں دے رہا۔ مجھے اس سے کچھ کام تھا۔ ”کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ جلد ہی واپس آ جائیں گے۔ مجھے بتائیں کیا کام ہے؟“ رانی اپنی بے چینی چھپاتے ہوئے بولی۔ میں نے دونوں چابیاں اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا ”یہ چابیاں مجھے کل گپتے کے دفتر کے دروازے کے باہر ملی

تھیں۔ ہوٹل کے دوسرے کمروں کی چابیوں سے یہ مختلف ہیں اس لیے میں نے سوچا کہ منیجر کو یہ چابیاں دوں تاکہ جس کی ہوں، وہ اس سے لے جائے۔“ رانی چابیوں کو پہچانتی تھی، اس نے فوراً ہاتھ بڑھایا اور بولی۔ ”چابیاں مجھے دے دیں۔ میں گپتا کو دے دوں گی۔“ ”نہیں رانی صاحب، چابیاں میں گپتے کو ہی دوں گا۔ ہوٹل میں چار قتل ہو چکے ہیں اور اب گپتا بھی غائب ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ میں یہ چابیاں پولیس کو دوں تاکہ وہ اس کے کمرے کا دروازہ کھولے اور شاید انھیں گپتے کی گم شدگی کا کوئی سراغ مل سکے۔“ میں نے چابیاں جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ گھبراہٹ میں رانی کی آواز بیٹھ چکی تھی۔ ”دیکھیے پولیس کو یہ چابیاں ہرگز نہ دیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔“ ”صرف اصلیت جاننا جس کا سرا گپتے کے کمرے میں موجود ہے۔“ میرا جواب سن کر رانی بولی ”میں آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں۔ چابیاں مجھے دے دیجیے۔“ ”رانی! میں دوسروں کے چوسے ہوئے آم اور اگلے ہوئے نوالے نہیں کھاتا۔ تمھاری گپتے کے ساتھ رنگین راتوں کے قصے میں نے سن رکھے ہیں۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ گپتے نے اپنی نوکری پکی کرنے کے لیے ان رنگین راتوں کے ثبوت بھی اپنے کمرے میں چھپا کر رکھے ہیں اور پولیس نے اگر اس کا کمرہ کھولا تو وہ ثبوت بھی ان کے ہاتھ لگ جائیں گے اور جب تمھاری عیاشیوں کے ثبوت تمھارے شوہر کو ملیں گے تو وہ دودھ کی مکھی کی طرح تمھیں نکال باہر کرے گا۔ تمھیں اسی بات کا خوف ہے نا“ مجھے رانی کے چہرے میں اپنی سابقہ بیوی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا جس نے میری خاندانی عزت کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ رانی نے جب میرے تیور دیکھے تو میرے قدموں میں گر گئی۔ ”مجھ سے جو غلطیاں ہوئیں میں ان کی ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں لیکن میرے معصوم بچے کی خاطر سردار جی تک یہ بات نہ پہنچے۔“ رانی نے گڑگڑاتے ہوئے میرے پاؤں تھام رکھے تھے۔ ”صرف ایک صورت میں کہ میں اور میرے ساتھی گپتا کے کمرے کو کھولیں گے تم ہمارے ساتھ ہوگی لیکن خاموشی سے بیٹھی رہو گی اور کسی شے کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔ جب ہم مکمل تلاشی لے لیں گے تو پھر تم کو چابیاں دے دیں گے۔ بولو! کیا تمھیں منظور ہے یا نہیں۔“ میرا یہ حتمی فیصلہ سن کر رانی نے ہتھیار ڈال دیے اور میں قیصر، کرنل مزمل اور عمران کو تلاشی میں ساتھ دینے کا کہنے قیصر کے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆

ہوٹل کے منیجر گپتے کا کمرہ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے تو رانی فوراً کمرے کی الماریوں اور گپتے کے سوٹ کیسوں کی طرف لپکی، حالاں کہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خاموشی سے بیٹھی رہے گی اور کمرے کی تلاشی ہم لیں گے۔ میں نے اسے الماریاں کھولنے سے منع کیا تو اس نے کہا کہ ہوٹل کی مالک میں ہوں، مجھے کون روک سکتا ہے، اسے جلدی اس بات کی تھی کہ گپتے نے اس کی عیاشیوں کے جو ثبوت اکٹھے کر رکھے تھے، انھیں ہمارے ہاتھ لگنے سے پہلے ہی وہ تلف کر سکے۔ جب میری زبانی منع کرنے سے وہ باز نہ آئی تو عمران نے اسے تھپڑ مارا اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے صوفے پر لا پٹخا۔

ادھر قیصر نے اپنا رام پوری چاقو کھول کر اس کے چہرے کے قریب کرتے ہوئے اس کی تیز دھار پر انگلی پھیری اور بولا ''اگر ذرا بھی حرکت کی تو تمھارا چہرہ بگاڑ کر ایسا بھیانک بنادوں گا کہ تمھیں دیکھ کر لوگ خوف سے چیخنا شروع کردیں گے۔'' عورت کو سب سے زیادہ خوف اپنی عصمت کے لٹ جانے کا اور فاحشہ اور آزاد خیال عورتوں کو اپنے حسن کے خراب ہوجانے کا ہوتا ہے۔ یہیں پاکستان میں ہی دیکھ لیجیے۔ تمام بڑے شہروں کے پوش علاقوں میں بیوٹی پارلرز ان مغرب زدہ دولت مند خواتین سے ہر وقت بھرے رہتے ہیں جہاں یہ بیوٹی پارلرز والے جو دراصل حجام یا انھی کی برادری کے ہوتے ہیں، ان خواتین کو میک اپ کے نئے نئے طریقوں سے صرف Skin Deep (چہرے کی جلد تک) پرکشش بنانے کا کہہ کر ہر ایک سے ہزاروں روپے لوٹتے ہیں۔ کیا یہ میک اپ شوہروں کو لبھانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ہرگز نہیں کیوں کہ شوہر تو اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ الزبتھ آڈرین اور ریوالون (Revelon) کے فاؤنڈیشنز اور مختلف رنگوں کے چونے کے پیچھے اصل جلد کیسی ہے۔ یہ صرف ''دوسروں'' کو اپنی جانب متوجہ کرنے اور خود کو بجائے ۴۵ سالہ کے ۲۰ سال کی ''کڑی'' دکھائی دینے کی کوشش ہوتی ہے۔ رانی نے بھی جب اپنے میک اپ زدہ چہرے کو بھیانک بنا دینے کا سنا تو بالکل خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ گپتے کی الماریوں اور سوٹ کیسوں میں سے ہمیں اپنے کام کی یا رانی کے مطلب کی کوئی شے نہ ملی۔ وہ بھی کوئی کچی گولیاں کھیلنے والا نہیں تھا۔ دو بار بھرپور تلاشی لینے کے بعد ہم تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ کمرے میں کوئی ایسی شے نہ تھی اور دل اس بات کو مانتا نہیں تھا کہ گپتے کے ہاتھ بالکل صاف تھے۔ میں نے اس کے ایک سوٹ کیس میں پڑے چند کاغذات کو پھر کھنگالا تو مجھے گرینڈ لیز بینک کی ڈیپازٹ سلپ کے ساتھ پن کیا ہوا ایک بینک کا خط ملا جس میں اسی بینک کے لاکر کے سالانہ کرائے کی ادائیگی کا مطالبہ اور لاکر نمبر درج تھا۔ میں نے ڈرائیور کریم کی دی ہوئی دونوں چابیوں کو دیکھا ایک چابی تو اس کمرے کے دروازے کی تھی جب کہ دوسری لاکر کی جس پر لاکر کا وہی نمبر کھدا ہوا تھا جو خط میں درج تھا کسی کو کچھ بتائے بغیر میں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کمرے سے سب کو باہر آنے کا کہا اور کمرے کو دوبارہ لاک کردیا۔ میں کسی کے علم میں لائے بغیر اس ہوٹل میں گپتے کی ملازمت کے لیے دی ہوئی درخواست کی کاپی ہمراہ لے آیا تھا جس پر گپتے کے پورے دستخط تھے۔ رانی کا چہرہ بھی مطمئن دکھائی دینے لگا کہ گپتے نے اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں رکھا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ میری جیب میں دو آڈیو کیسٹیں بھی تھیں جو میں نے گپتے کے سوٹ کیس سے نکالی تھیں حالاں کہ بیس پچیس میوزک کیسٹیں اس کے ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ ہی پڑی تھیں۔

میں نے قیصر اور عمران کے ساتھ مزمل کے کمرے کا رخ کیا۔ مزمل کو ساری صورتِ حال بتا کر میں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ بینک لاکر سے ہمیں بہت کارآمد چیزیں ملیں گی۔ میں نے ہوٹل کے پیڈ پر ہی گپتے کے دستخط کی کاپی کرنی شروع کردی ایک گھنٹے کی کوشش میں کسی حد تک اس کے

دستخطوں کے مشابہہ دستخط کرنے لگ گیا۔ اگلے روز صبح میں نے اپنے دائیں ہاتھ پر پٹی باندھی اور قیصر، مزمل اور عمران کو ہم راہ لے کر ٹیکسی میں گرینڈ لیز بینک گیا۔ لاکرز تہ خانے میں تھے۔ میں نے رجسٹر پر لاکر نمبر اور اپنا نام لکھ کر گپتے کے دستخط کیے۔ میرے کیے ہوئے دستخطوں میں جو کمی بیشی تھی اسے میرے ہاتھ پر بندھی پٹی نے کور (Cover) کرلیا۔ انچارج اپنی چابی لے کر میرے ساتھ تہ خانے میں گیا اور لاکر میں اپنی چابی گھما ڈالی۔ اب میں نے اپنی چابی لگائی تو لاکر کھل گیا اور انچارج واپس اپنی سیٹ پر چلا گیا کیوں کہ لاکر والے کو Privacy (تنہائی) کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں حفظ ماتقدم کے طور پر ایک ایئر بیگ ہمراہ لے گیا تھا جس میں میرا پسٹل تھا۔ لاکر میں ڈھیروں کاغذات، ڈالرز اور پاؤنڈز، ۲۴ کیسٹ، دو ڈائریاں اور فولڈروں میں لگی تصاویر کے علاوہ تین البم اور نیگیٹو بھی تھے۔ میں نے سب کچھ ایئر بیگ میں بھر کر لاکر خالی کردیا۔ ہوٹل واپس پہنچ کر ہم نے مل کر سارے کاغذات اور ڈائریاں دیکھنی شروع کیں اور ہم پر گپتے کے بھید کھلتے گئے۔ گپتے بھارتی DMI (بھارتی جاسوس ایجنسی جس نے مجھے دہلی میں گرفتار کیا تھا) کے پے رول پر تھا اور رائل پلازہ اور دوسرے ہوٹلوں میں ٹھہرنے والے کھلنڈرے پاکستانیوں کو شراب اور عورتیں مہیا کر کے انھیں اپنے دام میں پھانستا اور اپنے کمرے میں شراب اور عورت کی دعوت دے کر کمرے میں لگے ہوئے خفیہ کیمرے سے ان کی ایسی حالت میں تصاویر بناتا جن کے باعث وہ پاکستان کے خلاف جاسوسی کرنے پر آمادہ ہوجاتے۔ ہوٹل میں رجسٹریشن کے وقت ان کے مکمل نام اور پاکستان میں ایڈریس رجسٹر میں درج ہوتے لہٰذا کوئی پاکستانی اگر جاسوسی کا وعدہ کر کے واپس چلا جاتا اور مطلوبہ کام نہ کرتا تو گپتا اپنے یعنی DMI کے ایجنٹوں کے ذریعے اسے دھمکاتا کہ کام نہ ہونے کی صورت میں اس کی غیر اخلاقی تصاویر اور جاسوسی پر آمادگی کی آواز کے کیسٹ پاکستانی جاسوس ایجنسیوں اور اس کے خاندان کے افراد تک بھجوا دے گا۔ پاکستانی خوف زدہ ہو کر خوشی یا مجبوری سے یہ کام کرتا اور ایک ایسے جال میں پھنس جاتا جس سے نکلنا ناممکن ہوتا۔ ان کیسٹوں میں ایسی ہی گفتگو اور دو البموں میں انھی کی تصاویر تھیں۔ فولڈر میں DMI دہلی سے میرے فرار کے بعد اخباروں میں چھپی تصاویر، ممبئی میں بنے ہمارے تصویری خاکے، جیسور میں بھارتی ہیلی کاپٹر کی تباہی کے بعد بھارتی تفتیشی ٹیم کی رپورٹ جس میں کرنل مزمل کا نام نمایاں تھا اور گو کھلے کے گروہ کے خاتمے میں میرا ہاتھ ہونے کے متعلق رپورٹس تھیں۔ ایک البم اور دو کیسٹ صرف رانی کی گپتے کے ساتھ بے حیائی کی حدوں کو پار کرتی مختلف جنسی پوزوں اور ایسی عریاں باتوں کے متعلق تھیں جنھیں تحریر کرنا تو درکنار، سوچتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ ایک کیسٹ میں رانی کی زبانی اپنے شوہر کو ہلاک کرنے کے مکمل پلان اور بقیہ زندگی گپتے کے ساتھ گزارنے اور اسے شوہر کی جائیداد میں سے معقول حصہ دینے کے متعلق تھی۔ اس روز ہمارا باقی سارا وقت یہ کیسٹیں سنتے گزر گیا۔ میں حیران تھا کہ کس کس طریقے سے بھارتی حکومت پاکستان کو پاکستانیوں کے ہی ہاتھوں تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ آج بھی جب ہمارے سیاسی برساتی

مینڈک پاکستان کے خلاف ٹرانے لگتے ہیں تو مجھے یہی خیال آتا ہے کہ ان کی اس بکواس کے پیچھے بھارتی سپلائی کی ہوئی دولت، شراب اور عورتوں کا ہاتھ ہے، اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ بھارت کی پاکستان سے دشمنی ایک مسلمہ امر ہے۔ پاکستان میں سابق وزیراعظم اور موجودہ عمر قیدی نواز شریف اگر پاکستان کا ہمدرد ہوتا اور پاکستان کے مفاد میں کام کررہا ہوتا تو اس کی معزولی پر بھارت میں خوشیاں منائی جاتیں کہ ایک صاحب اقتدار بھارت دشمن پاکستانی سے ان کی جان چھوٹی لیکن نواز شریف کی معزولی سے سب سے زیادہ دکھ بھارتی وزیراعظم واجپائی کو ہوا۔ جس کا ثبوت اس نے نہ صرف اپنے کئی بیانات بلکہ بھارتی افواج کو ریڈ الرٹ کر کے دیا کیوں کہ نواز شریف پاکستان کے نہیں بلکہ بھارت کے مفاد میں کام کررہا تھا۔ بھارتی اداکار فیروز خان کی بہن دلشاد بیگم کو سارے پاکستان میں صرف یہ گنجا ہی پسند آیا تھا جو بار بار نواز شریف کو ملنے (اور راز اگلوانے اور ہدایات دینے) پاکستان آرہی تھی۔ بھارت سے شریف گھرانے کے لگاؤ کی یہ حالت ہے کہ پاکستان میں ۶۰ فی صد افراد کو پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں اور نواز شریف نے اپنے اباجی جسے میں Fountain Head of Trouble (شرارت اور مصیبت کا منبع) کہتا ہوں، کی اجازت سے امرتسر کے قریب اپنے آبائی گاؤں جاتی امرا میں LDA (لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی) کا ۱۰ کروڑ روپیہ صاف پانی کی فراہمی کے لیے بھجوایا تھا۔ میاں شریف صاحب، آپ کروڑوں کے بجائے اربوں روپیہ بھارت میں اپنے آبائی گاؤں پر صرف کردیں۔ ان کی نگاہ میں آپ رہیں گے وہی لوہار کے لوہار ہی، جو گاؤں میں درانتیاں اور ہلوں کے پھل بناتے تھے۔ پاکستان میں آپ کو عزت ملی، دولت ملی، دو بار اقتدار ملا لیکن آپ اسی ملک کی جڑیں کاٹنے لگے اور انجام کار ۹×۵ فٹ کی کوٹھری اور دو بار عمر قید کی سزا ملی۔ اب بلائیے اپنے آبائی گاؤں جاتی امرا کے لوگوں کو کہ آپ کو چھڑوائیں۔ حکومت کے ریفرنس اور عدالتی سزائیں پوری ہوجانے کے بعد اگر آپ زندہ باہر آگئے تو ایک اور ریفرنس آپ کے لیے تیار ہوگا اور وہ ہوگا پاکستان کے عوام کے غیض وغضب کا ریفرنس جس کا فیصلہ پاکستانی عوام ہی کریں گے اور آپ کی اور آپ جیسے دوسرے غداروں کی تکہ بوٹی کردیں گے۔ بے نظیر بھٹو بھی جو خود کو بڑی دلیر اور نڈر سمجھتی ہیں اب کیوں بھیگی چوہیا کی طرح ملک ملک بھاگی پھرتی ہیں اگر ضمیر صاف اور کردار بے داغ ہو تو پھر ڈرنے کی کیا بات ہے کیوں نہیں پاکستان آ کر الزامات اور مقدمات کا سامنا کرتیں۔ شوہر تو پہلے ہی جیل میں ہے۔ بے نظیر بھی آ کر شامل ہوجائے تو خوب گزرے گی جو دونوں مل بیٹھیں گے۔ جنرل پرویز مشرف صاحب! وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ قوم میں جو امید پیدا ہوئی ہے وہ آپ کی سست رفتاری کے باعث خدانخواستہ ناامیدی میں نہ بدل جائے۔ بیوروکریٹس نے بھی جن کی پہلے پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں، گزشتہ ۱۲ اکتوبر کے بعد قوم کو مایوس کرنے کے لیے نادیدہ طاقتوں کے اشارے پر مہنگائی کا طوفان کھڑا کردیا ہے۔ ۱۲ اکتوبر کو قوم ایک انقلاب سمجھ رہی ہے۔ اسے حقیقی انقلاب کا رنگ روپ ہی دیجیے۔ ملک کے

اپنے پیدا کردہ پیاز، لہسن، آلو اور دیگر اشیا کی قیمتیں بڑھنے کا آخر کیا جواز ہے؟ جنرل صاحب! غدار کبھی خم ٹھونک کر سامنے نہیں آتے۔ وہ ہمیشہ چھپ کے وار کرتے ہیں۔ ایسے چھپے ہوئے غداروں کو اگر آپ اجازت دیں تو ہم سامنے لائیں۔ ٹھوس ثبوت ہم دیں گے، گرفت آپ کریں۔ اگر خدانخواستہ قوم اب مایوس ہوئی تو ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔

اگلے روز صبح میں رانی کے دفتر میں گیا۔ اس نے بڑی بیزاری سے مجھے بیٹھنے کا کہا اور سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے البم کی طرف جھپٹی۔ میں نے البم والا ہاتھ پیچھے کرلیا اور کرختگی سے بولا۔ آرام سے اپنی سیٹ پر بیٹھی رہو ورنہ یہ البم نہ صرف تمھارے ہوٹل کے سارے اسٹاف کو دکھا دوں گا بلکہ تمھارے شوہر کو اس البم کے ساتھ دو کیسٹ بھی بھینٹ کردوں گا جس میں تم نے گپتے کے ساتھ مل کر اسے ہلاک کرنے کا پلان بنایا تھا۔" رانی راز کھل جانے کے خوف سے دہشت زدہ ہو کر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ "پوز تو تم نے کمال کے بنائے ہیں" میں نے البم کی مختلف تصویریں دیکھتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تمھارے جسم میں ہڈی ہے ہی نہیں" میری یہ بات سنتے ہی رانی نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ "آپ دنیا میں جس کو بھی سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ آپ کو اس کی سوگند، میرے راز کو راز ہی رہنے دیں اور اسے سردار جی تک نہ پہنچائیں۔" رانی نے روتے ہوئے کہا "اچھا۔ لیکن تمھیں بھی میری چند شرائط ماننی ہوں گی۔" میرے جواب پر رانی بولی "مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ آپ جو کہیں گے میں کروں گی۔" رانی اپنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔

☆☆

میں نے رانی کو کہا "پوری اور دونوں بھارتی فوجیوں کی ہلاکت کو بھارتی سفارت خانہ ٹھنڈے شربت کے گھونٹ سمجھ کر نہیں پی گیا اور نہ ہی گپتے کی گم شدگی پر ان کا کوئی ردعمل نہیں ہوگا۔ بھارتی سفارت خانے نے اب تک جو کارروائی کی ہے اس کی گپتے کو پوری خبر تھی جسے اس نے تمھیں بھی یقیناً بتایا ہے۔ مجھے اس کی مفصل رپورٹ چاہیے اور ہماری یہاں موجودگی کے دوران وہ جو کارروائی بھی کریں اس کی رپورٹ بھی تم مجھے دو گی۔" "لیکن مجھے سفارت خانے میں ہونے والی باتوں کا کیوں کر پتا چل سکتا ہے؟" رانی نے پوچھا تو میں نے کہا "اب تک تم اپنی جوانی اور حسن کو اپنے شوق کو پورا کرنے پر لٹاتی رہی ہو۔ اب ذرا بھارتی ملٹری اتاچی نمبر ون، ٹو اور تھرڈ کو بھی اپنے حسن کے جال میں پھانسو اور انھیں علیحدہ علیحدہ رات کے کھانے اور شراب کی دعوت دو۔ گپتے کے کمرے میں ہی ان کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے انھیں ٹٹولو۔ وہ یقیناً سب کچھ اگل دیں گے۔ گپتے نے اپنے کمرے میں ایک ٹیپ ریکارڈر سامنے میز پر رکھا ہوا ہے جب کہ دوسرا جو انتہائی حساس ہے، اسے بیڈ کے نیچے فٹ کیا ہوا ہے اور مصنوعی پھولوں کے گلدان میں ایک پوشیدہ مائیکروفون ہے جس سے کمرے میں ہونے والی ساری گفتگو خفیہ ٹیپ میں ریکارڈ ہوجاتی ہے۔ خفیہ کیمرا بھی دیوار پر لگی پینٹنگ میں سوراخ کر کے

پینٹنگ کے پیچھے چھپایا گیا ہے۔ یہ کیمرا بھی بہت حساس ہے اور اعلیٰ عدسوں والا ہے اور بغیر فلیش کے بڑی واضح تصویریں اتارتا ہے۔ دیکھو تمھاری تصویریں کتنی صاف آئی ہیں۔ تصویر کھینچنے کے لیے ایک بٹن بیڈ کے سرھانے کی پچھلی جانب لگا ہوا ہے۔ کیمرا صرف بیڈ کی تصویریں اتارنے کے لیے فکس کیا ہوا ہے کیوں کہ اس کمرے میں ہونے والی ہر بات کا کلائمیکس بیڈ پر ہی ہوتا ہے۔ تمھیں ان تینوں کی مطلوبہ گفتگو بھی ریکارڈ کرنی ہے اور خاص پوزوں کی تصاویر بھی اتارنی ہیں۔‘‘ میں نے دراصل گزشتہ رات عمران، مزمل اور قیصر کے ہمراہ گپتے کے کمرے میں جا کر ان پوشیدہ چیزوں کا سراغ لگایا تھا۔ رانی میرا مطالبہ سن کر سوچ میں پڑ گئی تو میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا ’’تین چار دنوں میں تم ہمارا کام کر کے آزاد ہو جاؤ گی اور اگر تمھاری البم اور اپنے شوہر کو ہلاک کرنے کی کیسٹ اس تک پہنچ گئی تو تمھارا کیا حشر ہوگا اسے تم بخوبی جانتی ہو۔ ایک بات کا اور اضافہ کروں گا کہ اپنے دشمنوں کو اور راز جاننے والوں کو ہم بھی کبھی زندہ نہیں چھوڑتے۔ میرا ایک آدمی ویٹر کی وردی میں بھارتیوں کی موجودگی میں تمھاری سروس کرے گا اور Peep Hole سے ہم کمرے کے اندر ہونے والی تمام باتیں دیکھ رہے ہوں گے لہٰذا کسی قسم کی کوئی چالاکی کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔‘‘ رانی کو اچھی طرح سے سمجھا بجھا اور ڈرا سہا کر میں نے اسے کہا کہ وہ آج رات کے لیے سیکنڈ ملٹری اتاچی کو شب باشی کی دعوت میرے سامنے دے۔ رانی نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھتے ہوئے آپریٹر کو بھارتی سفارت خانے میں سیکنڈ ملٹری اتاچی سے ملانے کا کہا اور لائن ملنے پر اسے اتنی پیار و محبت سے دعوت دی کہ اس نے آج رات ۸ بجے آنے کا وعدہ کر لیا۔ دعوت دیتے وقت رانی کے چہرے پر بڑی رونق پیدا ہو گئی تھی۔ اس قسم کی بدقماش عورتیں برطانیہ کی ایک سابق ملکہ کوئین میری کی طرح ہر رات ایک نئے مرد سے دل بہلانے کی شوقین ہوتی ہیں۔ رانی کے دفتر سے اٹھ کر میں سیدھا ٹیلی فون آپریٹر کے پاس گیا۔ یہ خن سا کا آدمی تھا۔ میں نے اسے کہا کہ رانی کی ہر آنے اور جانے والی ٹیلی فون کال کو سنے اور شام کو سات بجے ڈیوٹی ختم ہونے پر مجھے مکمل رپورٹ دے۔ اس سے فارغ ہو کر میں مزمل کو ساتھ لے کر اس کے خفیہ ہوٹل کے قریب ہی کیمروں کی دکان پر گیا اور ایک اعلیٰ کوالٹی کا آٹومیٹک کیمرا اور اس کی اور گپتے کے کیمرے کے لیے ہائی اسپیڈ فلمیں خریدیں۔ پھر گپتے کے کمرے میں جا کر اس کے خفیہ کیمرے میں نئی فلم اور خفیہ ٹیپ ریکارڈر پر نئی کیسٹ لگائی۔ رضی کے لیے رانی سے ہوٹل کے ویٹروں والی وردی لی۔ غرضے کہ ہر طرح کے کیل کانٹوں سے لیس ہو کر ہم بھارتی سیکنڈ ملٹری اتاچی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے تمام ساتھیوں کو مسلح رہنے کا کہا تاکہ اگر ہمارے طے شدہ پروگرام کے دوران کوئی خلاف توقع ناخوش گوار صورت پیدا ہو جائے تو پھر ہم اپنے اسلحے سے کام لیں۔

بینکاک سے روانگی کے لیے ہماری تیاریاں ابھی نامکمل تھیں۔ مجھے خن سا کا بے چینی سے انتظار تھا تاکہ ہمارے لیے سعودی عرب کے ویزوں اور نئے شامل ہونے والوں کے لیے پاسپورٹ

وغیرہ بنوا دے۔ روانگی میں تاخیر کو میں اس لیے بھی بہتر سمجھتا تھا کہ مجھے اپنے گروپ میں عملی طور پر نئے شامل ہونے والوں کے متعلق یقین ہو جائے کہ کہیں وہ وقتی جذبے کے تحت تو اس گروپ میں شامل نہیں ہوئے اور اگر ایسی بات ہے تو وہ ہماری روانگی سے پہلے ہی Second Thought (دوبارہ سوچ پر) ہم سے علیحدہ ہو جائیں۔ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے بھارتیوں اور گپتے کو ٹھکانے لگانے سے مجھے ان کی کارکردگی کو جانچنے کا بھی موقع ملا تھا اور اب بھارتی ملٹری اتاچیز سے دو دو ہاتھ کر کے میں ان کی ذہنی حالت (IQ) کو بھی آزمانا چاہتا تھا۔ کرنل مزمل نے مجھے مشورہ دیا کہ رات کو بھارتی ملٹری اتاچی کی آمد پر رانی کی نگرانی کے لیے اگر ہم سپنا کو بھی رانی کے ہمراہ گپتا کے کمرے میں بھیج دیں تو رانی کو یہ موقعہ نہیں مل سکے گا کہ وہ ملٹری اتاچی کو ہمارے بچھائے ہوئے جال کے متعلق کچھ بتا سکے۔ میں نے مزمل کو کہا کہ اپنی عورتوں کے ذریعے دشمنوں کو نرغے میں لینے کا فن بھارتی ذہن کی پستی کا مظہر ہے۔ ہم ایسی نیچ حرکت نہیں کریں گے۔ رانی ہماری نہیں ان کی ساتھی ہے۔ یہ کام وہی کرے گی اور اپنی جان بچانے کے لیے پوری کوشش کرے گی کہ ملٹری اتاچی کو اپنے دام میں پھانس کر سب کچھ اگلوا لے کیوں کہ تبھی اس کی جان بھی بچ سکتی ہے۔ رات ساڑھے سات بجے رضی ہوٹل کے ویٹر کی وردی پہن کر گپتا کے کمرے کی جھاڑ پونجھ میں لگ گیا۔ رانی نے جیسا کہ میں نے اسے کہا تھا، دو مختلف قسم کی شراب، بیئر، گلاس، برف وغیرہ اس کمرے میں بھجوا دیے اور خود بھی پونے آٹھ بجے سج دھج کر اس کمرے میں آ بیٹھی، ملٹری اتاچی کے آنے تک مَیں نے اسے ٹیپ آن کرنے اور کیمرے سے تصویریں اتارنے کے خفیہ بٹن دکھا کر انھیں آپریٹ کرنے کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔ سیکنڈ ملٹری اتاچی تقریباً سوا آٹھ بجے آیا اور ریسیپشن سے اسے سیدھا گپتے کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا جاٹ میجر تھا جو پہلے ہی نشے میں چور تھا۔ رانی نے اس کا بڑی خوش دلی سے خیر مقدم کیا اور جام بھر بھر کر اسے دینے لگی۔ رضی نے بتایا جو ہر دس پندرہ منٹ بعد کسی نہ کسی بہانے کمرے میں جا رہا تھا، رانی خود بھی پینے والی تھی لیکن بقول رضی اس نے خود جام پر جام چڑھانے کے بجائے چسکیوں سے پینا شروع کیا۔ وہ جانتی تھی کہ ویٹر ہمارا آدمی ہے لہٰذا اس کے سامنے میجر پرشاد سے اس نے کئی بار ان ’’خطرناک لوگوں‘‘ کے متعلق بات کی جنھوں نے پوری اور دو بھارتی فوجی افسروں کے علاوہ اس کے ہوٹل کے ویٹر کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ دروازے کے پیپ ہول سے جھانکنے کی ذمہ داری میں نے میجر عمران اور قیصر کے سپرد کی تھی۔ پیپ ہول سے اندر کا حال خاک نظر آنا تھا اس لیے میں نے دروازے سے اس کے عدسے نکال لیے تھے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد عمران، قیصر اور رضی میرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ نگرانی چھوڑ کر کیوں آ گئے‘‘ ’’وہاں نگرانی کے لیے اب باقی کیا بچا ہے۔ کمرے کی بڑی بتیاں بجھا دی گئی ہیں اور رانی اور میجر پرشاد دونوں بیڈ پر ہیں‘‘ میں نے کرنل مزمل کے کمرے میں سب کے لیے کھانا منگوایا اور کھانے کے بعد دیر تک آج رات کا موضوع زیر بحث رہا۔

اگلے روز دن چڑھے رانی نے مجھے فون کیا۔ وہ اپنے دفتر میں مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اس قماش کی عورتیں اکثر دوطرفہ چال چلتی ہیں اس لیے بہت ممکن ہے کہ اپنے دفتر میں میرے ساتھ اپنی گفتگو ریکارڈ کرنے کے لیے اس نے کوئی خفیہ انتظام کر رکھا ہو اس لیے میں نے اسے کہا کہ میں گپتے کے دفتر میں اسے ملنے آرہا ہوں۔ ۱۰ منٹ بعد میں اور رانی تقریباً اکٹھے گپتے کے دفتر میں داخل ہوئے۔ رانی کے چہرے کا میک اپ جاٹ میجر کی درندگی کے نشانات چھپانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ رانی نے مجھے بتایا کہ اس کی پوری کوشش اور بار بار تینوں بھارتیوں اور ہوٹل کے ویٹر کی ہلاکت کے موضوع پر بات کرنے پر مجبور کرنے کے باوجود میجر پرشاد سے اس کے سوا اور کچھ نہ اگلوا سکی کہ بھارتی سفیر اور فسٹ ملٹری اتاچی نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور اسے اس بارے میں کچھ علم نہیں کہ کیا کارروائی ہورہی ہے۔ رانی نے یہ بتاتے ہوئے اچانک کہا ''سفارت خانے والوں کو تو آپ لوگوں پر ذرا شک نہیں کہ ان چاروں کے علاوہ گپتے کو بھی آپ لوگوں نے ہی ہلاک کیا ہے۔ آپ نے گپتے کی لاش کو بھی ایسا غائب کیا ہے کہ ابھی تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ پوری کے کمرے میں بھی آپ لوگوں نے اپنی شناخت کا کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔'' اور وہ اب تیری لاش کا بھی کوئی نشان نہیں چھوڑیں گے۔ حرام زادی کیا تو مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہی ہے؟'' میں نے آواز کو دھیمے رکھتے ہوئے رانی کو کہا۔ ''میرا کیا قصور ہے اگر پرشاد نے مجھے کوئی بات نہیں بتائی۔ میں نے تو ساری رات اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش میں جاگتے رہ کر گزار دی۔'' رانی نے سراسیمہ ہوکر کہا ''گپتے کے کمرے میں پرشاد نے پہلی رات اور تم نے درجنوں راتیں گزاری ہیں۔ گپتے کے ساتھ تو تم نے کبھی بھی مین لائٹ بجھا کر نائٹ بلب نہیں جلایا پھر گزشتہ رات تم نے نائٹ بلب کیوں جلایا۔ گپتے مر گیا ہے، اس کا تمھیں کیوں کر علم ہوا اور تم اتنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہو کہ گپتے کی لاش ابھی تک نہیں ملی۔ کیا وہ خودکشی کرنے کا کوئی نوٹ لکھ کر تمھارے پاس چھوڑ گیا تھا۔ اور تیسری بات...'' یہ کہتے ہوئے میں نے رانی کا پرس اٹھالیا جو اس نے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ حالاں کہ وہ اپنا پرس ہمیشہ کرسی یا صوفے کے بازو سے لٹکا کر رکھتی تھی۔ میں نے پرس کھولا تو اس میں میک اپ کے سامان کے اوپر ایک پاکٹ ٹیپ ریکارڈر ریکارڈنگ کررہا تھا ''اور تیسری بات یہ آن ہوا ٹیپ ریکارڈ ہے جس میں میری آواز ریکارڈ کر کے میری زبان میں ثبوت سفارت خانے والوں کو دینا چاہتی تھی'' رانی کا چہرہ خوف سے یک دم سفید پڑ گیا۔ میں نے اس کے پرس کو میز پر الٹا تو ۲۲ بور کا ایک ننھا پسٹل بھی نکل آیا۔ رانی میں اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنا پسٹل ہی اٹھا سکتی۔ میں نے پسٹل اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا، ٹیپ ریکارڈر ہاتھ میں پکڑا اور رانی کو کہا ''سب کچھ جاننے کے باوجود میں تمھیں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ ابھی میرے سامنے اپنے فسٹ ملٹری اتاچی کو فون کرو اور کہو کہ تمھارے ہاتھ کچھ ثبوت لگے ہیں اس لیے اگر وہ خود دوپہر ایک بجے ہوٹل آجائے تو وہ ثبوت اسے دے سکتی ہے۔

رانی نے مردہ ہاتھوں سے ٹیلی فون ریسیور اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اسے کہا کہ اس نے ملٹری اتاچی کو جو کہنا ہے پہلے اسے میرے سامنے دہرائے تاکہ اگر کوئی بات وہ بھول گئی ہو تو اسے ٹھیک کرسکوں۔ رانی نے اپنے الفاظ میں میری کہی ہوئی بات دہرائی اور پھر ٹیلی فون پر فسٹ ملٹری اتاچی سے رابطہ ہونے پر وہی بات اسے کہی اور اسے ایک بجے ہوٹل آنے پر راضی کرلیا۔ رانی گھبراہٹ میں یہ بھول گئی تھی کہ اس کا آن ہوا ریکارڈر میرے ہاتھ میں تھا جس میں اس کی دونوں بار کی ہوئی تمام باتیں ریکارڈ ہوچکی تھیں۔

☆☆

میں نے رانی کو کہا کہ فرسٹ ملٹری اتاچی کو وہ اپنے ذاتی کمرے میں لے جائے اور وہیں اس کی خاطر مدارت کرے۔ دوپہر کے ایک بجنے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے مزمل، عمران، قیصر اور JCO سے فوری طور پر مختصر میٹنگ کی اور میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا کہ ملٹری اتاچی سے بھارتی سفارت خانے کے قریب ہی دو دو ہاتھ کیے جائیں۔ میں رائل پلازہ ہوٹل کو جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے، مزید خون خرابے کا مرکز اس لیے بنانا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ پھر تھائی پولیس اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی تفتیش کا مرکز بھی یہی ہوٹل بن جاتا۔ ہم نے دو ٹیکسیاں لیں اور بھارتی سفارت خانے کے قریب انھیں چھوڑ دیا۔ عراقی سفارت خانہ بھی قریب ہی تھا اور اس علاقے میں لوگوں کی آمدورفت لگی رہتی تھی۔ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ایک ڈپلومیٹک نمبر والی گاڑی سفارت خانے سے باہر نکلی جس میں فل کرنل کی وردی میں ملبوس ملٹری اتاچی بیٹھا تھا۔ گاڑی کرنل خود چلا رہا تھا۔ میں نے گاڑی قریب آنے پر کرنل کی شکل دیکھی تو حیران رہ گیا۔ یہ باسو تھا جو کھٹمنڈو کے بھارتی سفارت خانے میں سیکنڈ ملٹری اتاچی اور میجر تھا۔ یہ پاکستان کا انتہائی دشمن اور متعصب بنگالی تھا۔ کھٹمنڈو سے میری روانگی کے وقت بھی یہ ایئرپورٹ پر نیپالی گورنمنٹ سے میری گرفتاری کے لیے حکم نامہ لینے کی کوشش میں ناکام ہوکر مجھے پرواز کرتے دیکھتا اور کف افسوس ملتے رہ گیا تھا۔ آج پھر اچانک اور غیر متوقع اس کا مجھ سے ٹاکرہ ہوگیا تھا۔ میرے ساتھی مجھ سے ذرا فاصلے پر الگ الگ پوزیشن لیے کھڑے تھے۔ کرنل باسو کو میرے بینکاک اور رائل پلازہ ہوٹل میں قیام کا یقینی علم تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھارتی فسٹ ملٹری اتاچی کو (HIT) ہٹ کرنے کی پلاننگ کی تھی۔ لیکن جب باسو کو دیکھا تو مجھے فوری طور پر اپنی پلاننگ میں تبدیلی کرنی پڑی۔ میں نے ساتھیوں کو سرخ رومال سے اشارہ دیا کہ گاڑی کو آرام سے نکل جانے دیں۔ ساتھی حیران تھے کہ میں نے یکایک پروگرام کیوں بدل ڈالا۔ ان کے استفسار پر میں نے انھیں کہا کہ وجہ بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی ہم ہوٹل واپس چلتے ہیں۔ ہوٹل واپس پہنچ کر میں نے انھیں تمام کہانی سنائی اور کہا کہ باسو سے میری ذاتی دشمنی بھی ہے لہٰذا اس سے میں اکیلے دو دو ہاتھ کروں گا اور آپ لوگ مجھے صرف کور دیں گے اور ہماری کارروائی اس کی ہوٹل سے واپسی پر ہوگی۔ میں نے وہیں سے خن سا کے

نمائندے کو فون کیا اور کہا کہ مجھے دو پرائیویٹ گاڑیوں اور دو ڈرائیوروں کی فوری ضرورت ہے۔ گاڑیوں کے نمبر پلیٹ اگر بدلے ہوئے ہوں تو بہت بہتر ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی نمائندے نے دو گاڑیاں بھجوادیں۔ باسو کو دیکھ کر مجھے کھٹمنڈو میں اپنی بے سرو سامانی اور بھارتی سفارت خانے اور خصوصی طور پر باسو کی مجھے گرفتار کرنے کی کوشش اور میرا لانڈری میں اپنے کپڑے تک چھوڑ کر گرفتاری سے بچنے کے لیے بھاگنا اور جہاز میں سوار ہونے کے بعد بھی میری جو ذہنی کیفیت تھی سب ایک ایک کر کے یاد آگئیں۔ اب میرے ذہن میں جو پلان تھا وہ پہلے سے یکسر مختلف تھا۔ میں باسو کو تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا تاکہ میرے انتقام کی آگ بجھ سکے۔ سری وانگ روڈ پر یک طرفہ ٹریفک چلتی تھی جب کہ اس سڑک کے خاتمے پر ٹریکوڈورا ہوٹل والی سڑک پر دو طرفہ ٹریفک تھی۔ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کھانا کھا کے کافی شاپ کے ایک گوشے میں ہم نے ڈیرہ جمایا اور باسو کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ میں باسو کے متعلق جانتا تھا کہ وہ بہت تیز ہے اور جب اسے رانی سے اپنے مقصد کی معلومات حاصل ہوجائیں گی تو وہ بلاوجہ ہوٹل میں نہیں رکے گا۔ کافی شاپ میں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہم نمائندے کی گاڑیوں میں بیٹھ کر سری وانگ روڈ کے خاتمے سے ذرا پہلے رک گئے۔ ہم میں سب سے تیز قیصر تھا۔ میں نے اس کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی کہ باسو کی گاڑی کے قریب پہنچنے پر وہ اچانک سڑک کے درمیان آجائے تاکہ باسو کو گاڑی روکنی پڑے۔ ہمیں صرف ۱۰ سیکنڈ درکار تھے جس میں ہم نے باسو کو مع اس کی گاڑی کے اغوا کرنا تھا۔ تین بجے سے کچھ اوپر ہوئے ہوں گے، جب کرنل باسو کی گاڑی دور سے آتی دکھائی دی۔ ہم سب بالکل تیار اور اس کے انتظار میں تھے۔ اس کی گاڑی کوئی ۲۰ فٹ کے فاصلے پر ہوگی جب قیصر یکایک اس کی گاڑی کے سامنے آگیا۔ باسو نے فل بریک لگائیں۔ گاڑی قیصر سے چند قدم پہلے ہی رک گئی تھی لیکن قیصر نے ایسا ظاہر کیا جیسے گاڑی اس سے ٹچ ہوگئی ہو۔ وہ سڑک پر گرا اور کراہتے ہوئے اٹھ کر گاڑی کے دائیں جانب آیا۔ باسو اسٹیرنگ ویل پر تھا۔ اس نے گاڑی سے اترنے کے لیے دروازہ کھولا ہی تھا کہ قیصر نے ریوالور کی نال اس کی طرف کرتے ہوئے اسے دوسری سیٹ کی طرف دھکیلا اور دوسرا دروازہ جو اندر سے لاک تھا، کھول دیا۔ آناً فاناً میجر عمران اس دروازے سے اندر داخل ہوا اور پچھلے دروازے کے لاک کھول دیے۔ قیصر نے میجر کی پی کیپ اتار کر پچھلی سیٹ پر پھینکی۔ اتنی دیر میں کرنل مزمل اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ باسو کے لیے یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ نہ تو اسے اس ساری کارروائی کا مطلب سمجھ آیا اور نہ ہی وہ مدد کے لیے کسی کو پکار سکا۔ قیصر نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھائی اور ہم اورینٹل ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ ہماری دونوں پرائیویٹ گاڑیاں ہمارے بالکل پیچھے آرہی تھیں۔ کمپاؤنڈ میں قیصر نے گاڑی روکی اور میں نے پچھلی گاڑی کے ڈرائیور کو اشارے سے بلایا۔ قیصر نے گاڑی سے باہر آکر پچھلی گاڑی کے ڈرائیور کو باسو کی گاڑی کے اسٹیرنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کی گاڑی سنبھالی۔ اس تمام دوران میجر عمران نے اپنا ریوالور باسو کی پسلیوں میں چبھوئے

رکھا اور اسے نہ تو بولنے اور نہ ہی پیچھے مڑ کر ہمیں دیکھنے کا موقع دیا۔ میں نے تھائی ڈرائیور کو ایئرپورٹ چلنے کا کہا اور ہمارا تین گاڑیوں کا قافلہ ایئرپورٹ کی طرف تیزی سے روانہ ہوگیا۔ ان دنوں بینکاک شہر اور ایئرپورٹ کو ملانے والی سڑک اکثر جگہوں پر بالکل سنسان ہوتی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور ایئرپورٹ سے آنے والے غیر ملکی مسافروں کو اسی سڑک پر ہلاک کر کے ان کا تمام مال و اسباب لوٹ لیتے تھے، عمران باسو کو بنگلہ زبان میں ہدایات دیتا رہا تھا۔ اور قیصر ایک لفظ تک نہ بولا تھا اب قیصر کی جگہ تھائی ڈرائیور نے لے لی تھی۔ چناں چہ شہر سے باہر آ کر جب میں نے انگلش میں کرنل باسو کو کہا ''باسو! کیا تم نے مجھے پہچانا؟ میں کھٹمنڈو والا آصف ہوں'' تو یقین جانیے باسو اپنی سیٹ سے ایک فٹ اچھلا (ان دنوں فرنٹ سیٹیں الگ الگ نہیں بلکہ دونوں دروازوں کے درمیان پچھلی سیٹ کی طرح ایک ہی بڑی سیٹ پر مشتمل ہوتی تھیں۔) میں نے باسو کو پھر کہا ''باسو! میری تم سے ملنے کی آرزو اور تمھاری موت بالآخر تمھیں بینکاک کھینچ ہی لائی۔ مرنے سے پہلے تم نے رانی کی کمپنی میں کچھ اچھا وقت گزار لیا سو اب مرنے کا تمھیں زیادہ دکھ نہیں ہوگا۔'' باسو جس کے حواس اڑے ہوئے تھے، ہکلاتی ہوئی زبان میں بولا ''مسٹر آصف، تمھاری اور میری مخالفت محکمانہ اور صرف کھٹمنڈو تک تھی۔ یہاں تو ہم نہ تو ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور نہ ہی مجھے تم سے کوئی رنجش ہے۔ بہرحال میں تم سے اپنے کھٹمنڈو کے رویے کی معافی مانگتا ہوں۔ مجھے For God Sake (اللہ کے واسطے) معاف کردو۔'' ''تمھاری اور میری دشمنی کی جڑیں بہت گہری اور پھیلی ہوئی ہیں۔ ہم میں بار بار مقابلے ہوتے رہے لیکن تمھاری بدقسمتی سے ہمیشہ تمھیں ہی شکست ہوئی۔ میں محمد بن قاسم تھا اور تم راجا داہر، میں نے تمھیں ہلاک کیا۔ پھر تم پرتھوی راج تھے اور میں شہاب الدین غوری، اس بار بھی تم ہی مارے گئے۔ تم ہیموں بقال تھے اور میں اکبر، تب بھی میں نے تمھاری گردن اپنے ننھے ہاتھوں سے اڑا دی تھی۔ تم راجا جے چند تھے اور میں احمد شاہ ابدالی اور میں نے چار بار تمھیں شکست دے کر اور ہر بار اپنے پاؤں دھلوا کر تمھیں یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ باز آجاؤ اپنی ریشہ دوانیوں سے لیکن تم نہ سمجھے۔ مسٹر باسو! تمھاری اور میری دشمنی نئی نہیں بلکہ جنم جنم کی ہے۔ اب بھی میں تمھیں مقابلے کا پورا موقع دوں گا۔ ہم تمھاری طرح بغل میں چھری اور منہ سے رام رام کہنے والے نہیں۔ ہم خم ٹھونک کر میدان میں اترتے ہیں اور دشمن کو للکار کر حملہ کرتے ہیں۔ تمھاری طرح سن ۶۵ء کی جنگ میں غیر اعلانیہ حملہ نہیں کرتے۔'' میں جذبات کی رو میں بہہ کر نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا کہ قیصر نے دفعتاً اپنی گاڑی ہماری گاڑی سے آگے لے جا کر روک دی۔ ہماری گاڑی بھی رک گئی تو قیصر نے پیچھے ایک جانب اشارہ کر کے کہا کہ بڑی سنسان اور مناسب جگہ ہے۔ ہم تینوں گاڑیاں سڑک سے اتار کر تقریباً ایک میل بائیں جانب کو چلے گئے۔ یہ ویسی ہی جگہ تھی جہاں اصفہانی کے اسٹیمر نے ہمیں اتارا تھا۔ میں نے ڈرائیور اور عمران کو کہا کہ باسو کی وردی اتار دیں۔ وردی اتار کر اور باسو کو دھکیلتے ہوئے وہ ایک ڈھلوان پر لے گئے۔ دونوں تھائی

ڈرائیور بھی ہمارے ساتھ ہی آ گئے تھے۔ میں نے باسو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”باسو! آج پھر تاریخ لکھی جا رہی ہے۔ میرے ساتھیوں میں سے کوئی بھی ہماری لڑائی میں میری مدد نہیں کرے گا تم بھی اگر اپنی ذات کے لیے نہیں تو کم از کم اپنے عہدے کا پاس کرتے ہوئے ہی بھاگنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ میرے ساتھی تمھیں گولی مار دیں گے۔ ہم دونوں نہتے لڑیں گے۔“ میں نے قریب ہی پڑے ایک بڑے پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ہم میں سے جو بھی دوسرے کو زیر کرے گا وہ اس پتھر سے اس کا سر کچل دے گا۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنا پسٹل مزمل کو دیا اور سب نے اپنے اپنے ہتھیار نکال کر ہمارے گرد گھیرا باندھ لیا۔ باسو جو اب تک بالکل خاموش تھا یک لخت میرے قدموں میں گر گیا اور منت سماجت کرنے لگا کہ اس کی جان بخش دوں۔ اس حالت میں پڑے ہوئے اس نے اچانک میری ٹانگیں کھینچیں اور میں پشت کے بل زمین پر گر گیا۔ اس غیر متوقع گرنے سے مجھے تھوڑی بہت جو چوٹ آئی بھی تو مجھے اس کا قطعاً احساس نہ ہوا۔ ہم دونوں تقریباً بہ یک وقت کھڑے ہوئے۔ باسو نے بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کا عملی ثبوت دے دیا تھا اب میری باری تھی میں نے پہلے تو اس کے گھٹنوں پر ککوں کی بوچھاڑ کر دی اور ساتھ ہی اس کی ناک اور آنکھوں پر مکوں کی اتنی ضربیں لگائیں کہ اس کا چہرہ خون میں نہا گیا۔ ہر چوٹ لگنے پر وہ چیختا اور کہتا۔ ”اب معاف کر دو۔ مجھے زندہ چھوڑ دو۔ پاکستان زندہ باد۔“ وہ انگریزی، بنگلہ اور ٹوٹی پھوٹی بنگالی نما اردو میں نامعلوم کیا کچھ بولتا رہا۔ اس دوران اس نے دو تین بار مجھے گھونسے مارنے کی کوشش بھی کی لیکن چھوٹا قد اور اسی نسبت سے چھوٹے بازو ہونے کے باعث اس کے گھونسے ہوا میں ہی چلتے رہے۔ اب اس نے بنگالی زبان میں مجھے گالیاں بکنی شروع کیں۔ میں بھی فی الحقیقت غصے میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ مجھے صرف یہ یاد ہے کہ وہ بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ میں نے وہ پتھر جو کم از کم ایک من کا ہوگا۔ دونوں ہاتھوں سے تھاما اور اسے اپنے سر سے بلند لے جا کر باسو کی طرف آیا۔ باسو نے لیٹے لیٹے اپنے بازو اوپر کیے جیسے پتھر کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اپنی پوری قوت سے پتھر اس کے سر پر دے مارا۔ پتھر کو روکنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ بھی یقیناً ٹوٹ گئے ہوں گے کیوں کہ پتھر لگنے سے اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو چکی تھی اور مغز کے ٹکڑے زمین پر پڑے تھے۔ اس کا خون سے بھرا چہرہ ٹوٹ پھوٹ کر ناقابل شناخت ہو چکا تھا۔ میرے سارے ساتھی اور دونوں تھائی حیرت زدہ نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی باسو کی لاش کو دیکھتے۔ میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ جلا کر دھواں نکالتے ہوئے کرخت اور اونچے لہجے میں کہا ”کیا تم لوگوں نے اس سے پہلے کوئی مردہ جسم نہیں دیکھا۔“ میرے سارے ساتھی اپنی محویت سے باہر آ گئے۔ میں نے قیصر کو کہا ”اگر ممکن ہو تو اس کی لاش کو اس کی گاڑی میں ڈال کر گاڑی کو آگ لگا دو۔“ قیصر میکینک تھا اس نے باسو کی کار کی ڈگی کھول کر چند اوزار نکالے اور اسی کی گاڑی کا پٹرول ٹینک علیحدہ کر دیا۔ باقی ساتھیوں نے باسو کی لاش کو گاڑی میں ڈالا۔ قیصر نے کچھ پٹرول باسو کے مردہ

جسم پر اور باقی پٹرول کچھ گاڑی کے اندر ڈالا اور باقی پٹرول ٹینک میں ہی رہنے دیا اور پٹرول ٹینک کو گاڑی کے اندر واپس رکھ دیا۔ ہم سب دور کھڑے چلتی گاڑی کو دیکھنے لگے چند لمحوں میں ہی پٹرول ٹینک نے آگ پکڑ لی اور دھماکے سے پھٹ گیا۔ اب گاڑی سے اونچے شعلے نکل رہے تھے۔ مجھے گوشت جلنے کی بو بھی آئی۔ باسو کا کریا کرم ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کے لوگ یہاں اکٹھے ہو جاتے ہم گاڑیوں میں بیٹھ کر تیزی سے شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆

کرنل باسو کی گم شدگی زیادہ دنوں چھپی نہ رہ سکی۔ وہ اپنے سفارت خانے کی ڈپلومیٹک نمبر والی گاڑی میں آیا تھا۔ مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق سفارت خانے والے دو روز تو اس کی تھائی لینڈ کے کسی شہر میں جانے اور واپسی کے منتظر رہے۔ لیکن جب وہ نہ پلٹا اور نہ ہی اس کی کوئی اطلاع ملی تو سفارت خانے والوں نے پولیس کو اطلاع دی۔ سیکنڈ ملٹری اتاچی کا چار روز پیش تر ہی رائل پلازہ ہوٹل میں خون ہو چکا تھا۔ پولیس ابھی اسی کی تفتیش میں مصروف تھی کہ فرسٹ ملٹری اتاچی بھی گم ہو گیا۔ پولیس نے اس نئی واردات کا کھوج بھی رائل پلازہ ہوٹل سے لگانا چاہا لیکن رانی کرنل کی ہوٹل میں آمد سے بالکل مکر گئی۔ ادھر پتایا روڈ سے ایک جلی ہوئی کار اور انسانی ڈھانچا ملا۔ وردی تو بالکل راکھ ہو گئی تھی لیکن وردی پر لگے شولڈر رینکس دھات کے بنے ہونے کی وجہ سے جل نہ سکے۔ ڈھانچے کے سر کی ہڈیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ یہ صریحاً قتل کا کیس تھا لیکن پولیس نے اسے گاڑی کو حادثے میں آگ لگنے کے باعث کرنل کی موت کی وجہ بیان کی۔ یہ سب باتیں مجھے خن سا کے نمائندے نے بتائیں جس سے میں نے دو پرائیویٹ گاڑیاں منگوائی تھیں۔ اس کے بقول پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں سے اپنے مراسم کی وجہ سے اس نے تفتیش کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ رانی نے بھی اسی میں اپنی عافیت سمجھی تھی کہ کرنل باسو کی ہوٹل میں آمد سے قطعی لاعلمی ظاہر کرے کیوں کہ خن سا کے نمائندے نے فون پر اسے بھی دھمکی دی تھی کہ اگر اس بارے میں اس نے اپنی زبان کھولی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ نمائندے نے مجھے یہ بھی کہا کہ خن سا اور عمر آئندہ دو روز میں بینکاک آ جائیں گے اور انھوں نے یہ پیغام بھی دیا ہے کہ ان کی آمد تک ہم اپنی سرگرمیاں بند رکھیں۔ سفارت خانے والوں نے کسی طرح ایک مقامی انگریزی اخبار میں پولیس کی جاری کردہ رپورٹ کے علاوہ نامعلوم لیکن مستند ذرائع کے حوالے سے یہ بھی شائع کر دیا کہ بھارت کے تین افسران اور سفارت خانے کے فرسٹ اور سیکنڈ ملٹری اتاچیز کے ایک ہفتے کے دوران قتل ہونے میں پاکستان کی ایک جاسوس ایجنسی کا ہاتھ ہے جس کے کارندے بینکاک میں دندناتے پھرتے ہیں اور پولیس بھی ان پر ہاتھ ڈالنے سے کتراتی ہے۔ جس روز اخبار میں یہ بات شائع ہوئی اسی روز بینکاک پولیس کے انسپکٹر جنرل نے پولیس ہیڈ کوارٹرز میں مجھے اور رانی کو طلب کیا۔ رانی نے فون پر مجھے بتایا کہ شام چار بجے وہ ہیڈ کوارٹرز میں جا رہی ہے۔ یہی وقت مجھے بھی دیا گیا تھا۔ اپنے ساتھیوں

کے زور دینے کے باوجود میں نے اکیلے جانے کو ترجیح دی کیوں کہ ایک یا دو ساتھیوں کو ہمراہ لے جانے کا فائدہ کچھ نہ تھا۔ الٹا وہ بھی مشکوک ہو جاتے۔ جانے سے پہلے میں نے خن سا کے نمائندے کو اپنے اکیلے پولیس ہیڈ کوارٹرز میں جانے کا بتا دیا۔ نمائندے نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بلا جھجک چلا جاؤں۔ پولیس آئی جی سے اس کی پہلے ہی بات ہوچکی ہے اور اگر وہ مجھے یہ کہے کہ میں تھائی لینڈ یا بینکاک سے چلا جاؤں تو میں اسے یہ کہوں کہ جب تک وہ مجھے اس کی وجہ اور بینکاک چھوڑنے کا حکم تحریری طور پر نہیں دے گا، میں نہیں جاؤں گا بلکہ اس Deport کرنے کے زبانی حکم کو عدالت میں چیلنج کروں گا۔

ٹھیک چار بجے رانی اپنی ذاتی کار میں ہوٹل کے دو ملازمین کے ہمراہ اور میں ٹیکسی میں پولیس ہیڈ کوارٹرز پہنچے۔ ہمیں فوراً ہی آئی جی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ آئی جی کا رویہ بڑا دوستانہ تھا۔ چائے اور بسکٹ سے ہماری تواضع کرتے ہوئے اس نے پہلے رانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس کے ہوٹل میں سات روز کے اندر چار خون ہوچکے ہیں۔ اس کا منیجر گپتے بھی غائب ہے جس کی گم شدگی کی رپورٹ ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر نے لکھوائی تھی۔ گپتے کی لاش ایک زیر تعمیر فیکٹری سے برآمد ہوچکی ہے۔ بھارتی سفارت خانے کے دو فوجی افسران کا خون بھی انھی دنوں ہوا ہے۔ ایک کی لاش ہوٹل سے اور دوسرے کی پتاٹیا روڈ پر ایک سنسان جگہ سے ملی ہے۔ لاش اور گاڑی دونوں جل کر ناقابل شناخت ہوچکے تھے۔ کیا وہ ان وارداتوں پر کوئی روشنی ڈالے گی۔ میں ڈر رہا تھا کہ گھبراہٹ میں رانی کچھ اول فول نہ بک دے لیکن اس نے نہایت تحمل سے جواب دیتے ہوئے کہا ''سر! میرا ہوٹل بینکاک کے بی کلاس ہوٹلوں میں مشہور ترین ہے۔ باہر سے آنے والے ٹورسٹ ہمیشہ میرے ہوٹل میں ٹھہرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے گیسٹ زیادہ تر بھارتی اور پاکستانی ہوتے ہیں۔ جس کمرے میں چار قتل ہوئے اس میں ایک بھارتی مسٹر پوری ٹھہرے ہوئے تھے۔ دو دوسرے مہمان بھی بھارتی تھے اور ان تینوں نے اپنے ناموں اور عہدوں کے بجائے صرف بھارتی شہری اور ٹورسٹ لکھوایا تھا۔ ان تینوں کے علاوہ میرے ہوٹل کا ایک ویٹر بھی قتل ہوگیا جس کے ورثا کو مجھے خاصی بھاری رقم ادا کرنی ہے۔ سفارت خانے کے افسر کا قتل میرے منیجر گپتے کے کمرے میں ہوا۔ جو دو دن پہلے سے ہی غائب تھا اور اس کے کمرے کی خصوصی چابی بھی صرف اسی کے پاس تھی۔ اب آپ بتا رہے ہیں کہ بھارتی سفارت خانے کے ایک اعلیٰ افسر کا قتل پتایا روڈ پر ہوا ہے۔ آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ میرے منیجر گپتے کی لاش بھی پتایا روڈ سے ہی ملی ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقتولین کا آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ تھا اور وہ کسی ایسے خفیہ کام میں ملوث تھے جس کے طشت ازبام ہونے پر ان کے مخالفین نے انھیں یکے بعد دیگرے ہلاک کردیا اور میرا ویٹر جو روم سروس میں ڈیوٹی دیتا تھا، بلاوجہ مارا گیا۔'' آئی جی رانی کے بولنے کے دوران پیڈ پر نوٹس لکھتا جارہا تھا۔ اس نے رانی کو رخصت کیا اور مجھ سے مخاطب ہوا ''مسٹر! آپ ان ہلاکتوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' ''میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اس خونی ہوٹل کو ہی چھوڑ دوں۔ میں اپنے

پاکستانی اور بنگلہ دیشی ساتھیوں کے ہمراہ یہاں سیر و تفریح کے لیے آیا ہوں۔ ہمارے ساتھ ایک ساتھی کی بہن بھی ہے۔ قتل و خون کا جو سلسلہ اس ہوٹل میں شروع ہوچکا ہے اس سے ہم ڈر گئے ہیں۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو مجھے یہ بتائیں کہ ہوٹل میں موجود سیکڑوں مہمانوں میں سے آپ نے صرف مجھے ہی کیوں بلایا ہے اور ان ہلاکتوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟'' آئی جی نے اپنی عینک اتاری اور چند سیکنڈ مجھے گھورتے رہنے کے بعد بولا ''بھارتی سفارت خانے نے ہمیں جو رپورٹ بھیجی ہے اس میں آپ کو پاکستان کی اعلیٰ ترین جاسوس ایجنسی کا کارکن بتایا ہے اور اس رپورٹ کے مطابق آپ بمبئی، کھٹمنڈو اور شانتی پور میں بھی متعدد افراد کو قتل کرچکے ہیں، اور یہاں بینکاک میں بھی ان ہلاکتوں کا آپ کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔'' آئی جی کی بات سن کر میں ہنس پڑا۔ ''یہ تو ان بھارتیوں کی پرانی عادت ہے۔ پاکستان سے دشمنی کے باعث یہ ہر بات میں پاکستان اور پاکستانی ایجنسیوں کو ملوث کرتے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے اب تک تین بار بھارت کی پاکستان سے جنگیں ہوچکی ہیں۔ سن ۷۱ء میں پاکستان میں سیاسی چپقلش کی وجہ سے بھارت نے پاکستان پر حملہ کردیا اور مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے بھیس میں اپنے فوجی بھیجے جنھوں نے سیاسی غداروں کو شہ دی اور خود مشرقی پاکستان کا قتل عام کر کے الزام پاکستانی افواج پر تھوپا اور جب مشرقی پاکستانی ان کے دھوکے میں آ کر پاکستانی افواج کے جو ان کے تحفظ کے لیے وہاں تعینات تھیں، خلاف ہوگئے تو غیر اعلانیہ جنگ شروع کر کے پاکستان کو دولخت کردیا۔ اب بھارت کے اندر آزادی کی متعدد تحریکیں چل رہی ہیں۔ بھارت نے حیدرآباد، جونا گڑھ اور کشمیر کی ریاستوں پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے بعد پرتگیزی مقبوضات گوا، دمن اور دیو پر اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر قبضہ کرلیا۔ بھارتیوں کو اپنے خلاف ہونے والی ہر کارروائی میں پاکستان ہی دکھائی دیتا ہے۔ خود سن ۷۴ء میں ایٹمی دھماکا کرلیا اور پاکستان کو جو ابھی ایٹمی طاقت بننے سے کوسوں دور ہے، اسلامی بم بنانے کا کہہ کر دنیا بھر میں واویلا مچا رہے ہیں۔ آپ خود ہی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اگر میں نے بمبئی، شانتی پور اور کھٹمنڈو میں متعدد بھارتی قتل کیے ہیں تو مجھے وہاں گرفتار کیوں نہیں کیا گیا۔ اگر بھارتی حکومت کے پاس میرے بھارت اور نیپال میں داخلے اور یہ قتل کرنے کے دستاویزی ثبوت ہیں تو انھیں سامنے لائے۔ جب میں بھارت اور نیپال میں گیا ہی نہیں تو وہاں قتل کیسے کرسکتا ہوں۔ بینکاک میں بھارتی ہلاکتوں کا میں صرف اسی حد تک ذمہ دار ہوں کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں جہاں یہ قتل ہوئے ہیں۔'' میں نے آئی جی کے سوال کے جواب میں کہا۔ آئی جی جو میری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ بولا ''آپ کو پاکستان اور بھارت دشمنی کی وجوہات پر خاصی دسترس ہے۔ مجھے سن تھان (خن سا کے نمائندے) کا فون آیا تھا اس لیے میں نے ان ہلاکتوں کی فائلوں کو ''اندھے قتلوں'' میں شامل کرنے کے لیے آپ کو اور ہوٹل کی مالکہ کو بلوایا تھا۔ میرا آپ کو ذاتی مشورہ یہ ہے کہ آپ جلد از جلد تھائی لینڈ سے چلے جائیں یا پھر پولیس گارڈ اپنی حفاظت کے لیے رکھنے کی اجازت دیں۔''

''جناب آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ، میں اور میرے ساتھی چند روز میں یہاں سے چلے جائیں گے۔ جہاں تک حفاظتی گارڈ کا تعلق ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میں اور میرے ساتھی نہ تو رات کو کسی ایسی ویسی جگہ جاتے ہیں اور نہ ہی دن میں، ہم جب بھی باہر جاتے ہیں تو اکٹھے جاتے ہیں اور بخوبی اپنی حفاظت کرسکتے ہیں۔'' آئی جی دروازے تک مجھے چھوڑنے آیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے مہربانہ رویے کی وجہ سن تھان کا فون تھا۔ میں پولیس ہیڈ کوارٹرز کے باہر آ کر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا ہوا ہی تھا کہ آگے پیچھے دو ٹیکسیاں آ کر رکیں۔ دونوں ٹیکسیوں میں میرے تمام ساتھی سو سپنا بیٹھے ہوئے تھے۔ مزمل ٹیکسی سے اترا اور کہنے لگا ''آپ کے منع کرنے کے باوجود ہم رہ نہ سکے اور آپ کے پیچھے ہی یہاں چلے آئے۔ ہم اپنے لیڈر کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔'' میں نے مزمل کا شکریہ ادا کیا اور اسی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم ہوٹل پہنچے تو رانی میری منتظر تھی۔ کہنے لگی ''میں نے آئی جی کو کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا؟'' ''تم نے تو کمال کردیا اور ساری ہلاکتوں کو بھارتیوں کے سر ہی تھوپ دیا'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ رانی سے میں نے پہلی بار مسکرا کر بات کی تھی۔ اس نے کہا ''پھر آج رات کا کھانا میرے ہمراہ کھایئے گا'' میں نے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ''ضرور۔ ہم سب رات ساڑھے آٹھ بجے ریسٹورانٹ میں تمھاری میزبانی کا لطف اٹھائیں گے'' رانی شاید یہ چاہتی تھی کہ میں اکیلے اس کے کمرے میں آؤں گا۔ اس نے بے دلی سے میرے ساتھیوں کو بھی کھانے میں شرکت کی دعوت دی۔ رات کوخن سا کے نمائندے سے میری فون پر بات ہوئی اور میں نے اسے آئی جی سے ملاقات کی روداد سنادی۔ میں رات کے گیارہ بجے سونے کے لیے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ مزمل کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ JCO منصف کی اس نے ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے کہ رات کو سونے سے پہلے تمام ساتھیوں کی فرداً فرداً گنتی کرے۔ رات ۱۰ بجے گنتی کے وقت عمران اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اب سے کوئی آدھا گھنٹا پہلے میں نے اسے اپنے کمرے میں تاش کھیلنے کے لیے فون کیا تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھا کئی بار فون کرنے اور سپاہی دین محمد کی اس کے کمرے کے باہر ڈیوٹی لگانے کے بعد جب اب تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی تو میں نے آپ کو اطلاع دی ہے۔ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے ان میں ایک ساتھی کا رات گیارہ بجے کے بعد تک بغیر کسی کو بتائے غائب رہنا بڑی پریشان کن بات تھی۔ میں نے مزمل اور قیصر کو کہا کہ وہ لباس تبدیل کر کے میرے کمرے میں آجائیں۔ ۱۵ منٹ میں ہی وہ تیار ہو کر اور اپنے اسلحے کے ساتھ میرے کمرے میں آگئے۔ اتنی دیر میں میں نے بھی شب خوابی کا لباس تبدیل کرلیا تھا۔ ہم ہوٹل کے دونوں ریسٹورنٹ، کافی شاپ اور نائٹ کلب میں گئے لیکن عمران کا کچھ پتا نہ چلا۔ ہوٹل کے ڈور مین سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ تقریباً ساڑھے دس بجے عمران نیچے آیا اور ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی ایک ٹیکسی لے کر کہیں چلا گیا۔ ہم حیران تھے کہ عمران ہمیں بتائے بغیر آخر کہاں گیا۔ رات دو بجے تک ہم اس کے انتظار میں کافی شاپ میں بیٹھے۔ رہے اور جب نیند کا بہت ہی غلبہ

ہوگیا تو اپنے کمروں میں لوٹ آئے۔ نیند تو خیر کسی کو کیا آنی تھی۔ رات کا باقی حصہ سوتے جاگتے ہی گزرا۔ صبح سات بجے میں نے عمران کے کمرے میں فون کیا تو نیند میں ڈوبی اُس کی آواز سنائی دی۔ میں نے اسے کہا کہ ٹھیک نو بجے میرے کمرے میں آئے۔ پھر میں نے قیصر اور مزمل کو فون پر بتایا کہ عمران آچکا ہے اور نو بجے وہ بھی میرے کمرے میں آجائیں۔

☆☆

صبح ۹ بجے عمران اور دوسرے ساتھیوں کے آنے سے پہلے ہی مزمل میرے کمرے میں آچکا تھا۔ غصے اور شرمندگی سے اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ غصہ بغیر اطلاع دیے، عمران کے غائب ہونے کی وجہ سے اور شرمندگی اس وجہ سے تھی کہ عمران کو وہ اپنے بھروسے کا قابل اعتماد ساتھی کہہ کر ہمراہ لایا تھا۔ میں نے مزمل کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا اور کہا کہ جب تک عمران اپنے غائب ہونے کی وجہ نہیں بتائے گا ہمیں بالکل نارمل رہنا ہوگا۔ قیصر اور عمران آگے پیچھے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے دونوں کو بیٹھنے کا کہا اور کچھ دیر موسم اور دھوپ کی تمازت کی باتیں کر کے عمران سے پوچھا کہ رات ۱۰ بجے گنتی کے بعد وہ کہاں چلا گیا تھا ''میجر عمران! یہاں پر تم بنگلہ دیشی فوج کے میجر نہیں بلکہ دوسرے تمام ساتھیوں کی طرح اس ٹیم کے ممبر ہو جس کا لیڈر میں ہوں۔ یہ میری ذمہ داری ہے کہ اپنی ٹیم کے تمام ممبران کی سلامتی کا خیال رکھوں۔ تمھارے گزشتہ رات غائب ہونے کے باعث ہم سب تمھارے لیے بے حد متفکر رہے اور میں تمھارے علاوہ ٹیم کے باقی ممبران کی زندگی کے لیے بھی فکرمند رہا۔ ہم میں سے اگر کوئی غدار ہو تو ہمارے سارے راز جاننے کی وجہ سے ہم سب کے لیے بے حد خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ کیا میں تم سے یہ پوچھنے میں حق بجانب نہیں ہوں کہ تم گزشتہ رات اپنی اس غیر ذمہ دار حرکت کی تفصیلاً وجہ بتا کر اپنی پوزیشن واضح کرو تاکہ ہمارے دلوں میں جو شک وشبہات ابھرے ہیں، وہ دور ہوسکیں۔'' عمران خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر ندامت یا خوف کے بجائے ایسے تاثرات تھے جیسے کہ کسی کے کیے ہوئے صحیح اور قابل تحسین کام کی اس سے باز پرس کی گئی ہو۔ میرے ساتھ بھی بعینہ ایسا ہی واقعہ بھارت سے پاکستان واپسی پر پیش آچکا تھا۔ بھارت میں گورکھ پور کا پہاڑوں کے اندر بنے ہوئے خفیہ ہوائی اڈے کو تباہ کرنا ہمارے گروپ کو دیے گئے مشنوں میں شامل نہیں تھا۔ میں نے یہ ہوائی اڈہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے اپنی پلاننگ کر کے تباہ کیا تھا۔ بھارت میں قیام کے دوران تو ہمیں اپنے افسران کی طرف سے اس خطرناک کام کو انجام دینے کی شاباشی ملی لیکن پاکستان واپس پہنچنے پر اونچے درجے کے افسران نے ناراضگی کا اظہار کیا اور مجھ سے پوچھا گیا کہ جب یہ ہوائی اڈہ تباہ کرنا تمھارے مشن میں شامل نہیں تھا تو پھر تم نے ایسا کیوں کیا۔ مجھے آج تک اس سوال کا جواب نہ مل سکا کہ دشمن کے ہوائی اڈے کو تباہ کر کے میں نے کون سی غلطی کی تھی۔ مجھے اور میرے گروپ کو بھارت میں کسی خیر سگالی کے مشن پر تو بھیجا نہیں گیا تھا جس کے دوران میں نے یہ گستاخی کر ڈالی۔ مجھے

بہت بعد میں معلوم ہوا کہ بھارت سے ہزار سال تک جنگ کرنے کے دعوے دار ذوالفقار علی بھٹو کو ہماری اس بڑی کامیابی سے ناخوشی ہوئی۔ کیوں کہ وہ اندرا گاندھی سے یہ خفیہ معاہدہ بھی کر آئے تھے کہ پاکستان کی بری افواج کو مسلسل ذلیل کر کے ان کے جذبۂ شہادت کو کچل دیا جائے گا۔ ایسی ہی صورتِ حال کارگل کے محاذ پر گزشتہ سال پیش آئی جب ایک ہزار سے بھی کم مجاہدین نے پاکستانی کمانڈوز کی سرکردگی میں بھارت کی چالیس ہزار فوج کو گھیرے میں لے کر انھیں اس حد تک بے دست و پا کردیا تھا کہ اگر مزید پندرہ روز محاصرہ جاری رہتا تو چالیس ہزار بھارتی فوجی سامانِ رسد کے نہ ہونے سے ہتھیار ڈال دیتے۔ جب مجاہدین کامیابی کے عین قریب پہنچ گئے تو بھارتی وزیراعظم نے پاکستانی روبوٹ وزیراعظم نواز شریف کی نہ جانے کون سی کل دبائی کہ نواز شریف صاحب نے کارگل کے سارے واقعے سے ہی لاعلمی ظاہر کی۔ مجاہدین جب تک اپنے مورچوں میں رہے ہر روز بھارتی فوجیوں کی لاشوں کے انبار لگتے رہے اور کسی بھارتی فوج میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں ہی اٹھا لیتا لیکن جب ہمارے کٹھ پتلی وزیراعظم کے حکم پر مجاہدین نے اپنے مورچے چھوڑے اور واپسی کا سفر اختیار کیا تو جن کا سوئیڈن کی بنی ہوئی ۱۵۵ ملی میٹر کی بوفر بھارتی توپیں بال بھی بیکا نہ کرسکیں، انھیں بھارتی اسالٹ رائفلوں سے چن چن کر نشانہ بنایا گیا۔ میاں صاحب کو تو ہر وقت اپنے حلوے مانڈے کی ہی فکر رہتی تھی۔ غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے مطابق نواز شریف کا باورچی خانہ اتنا بڑا تھا جس میں درمیانے درجے کے ۱۲ مکانات سما جائیں۔ سیاست میں نووارد بیگم نواز شریف کا گزشتہ دنوں یہ بیان جاری ہوا ہے کہ میرا شوہر نواز شریف تو صرف دال کھاتا تھا اور اس نے سری پائے وغیرہ کبھی بھی نہیں کھائے۔ میرے خیال میں اس صدی کا یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ میاں صاحب اگر صرف دال ہی کھاتے ہیں تو پھر کراچی میں میکڈونلڈ میں کیا کھانے گئے تھے۔ میاں صاحب کو تو اس ریسٹورانٹ سے بھوکا ہی واپس لوٹنا پڑا ہوگا کیوں کہ وہاں دال نہیں ملتی۔ میں ان شاء اللہ جلد ہی ایک علیحدہ اور مکمل کالم برصغیر کے لیڈروں اور سابقہ برسرِاقتدار حکمرانوں کی طبعی اور غیر طبعی موت کے بعد ان کی بیگمات اور اولاد کے سیاست میں داخل ہونے اور اپنے شوہروں اور ماں باپ کی لاشوں پر سیاست کا بازار گرم کرنے کے پس منظر اور حالات پیش کروں گا۔

ہم سب خاموشی سے عمران کے جواب کے انتظار میں تھے، عمران نے نظریں نیچی کیے ہوئے سکوت کو توڑا ”سب سے پہلے تو میں ڈسپلن کو توڑنے کی معافی چاہتا ہوں اور اس کے لیے جو بھی سزا تجویز کریں اسے خوشی سے بھگتنے کے لیے تیار ہوں لیکن اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے میری بغیر اطلاع کے غیر حاضری کی وجہ سن لیں۔ کل پولیس ہیڈ کوارٹرز کے قریب جب ہم آپ کے انتظار میں کھڑے تھے تو تین افراد جن میں سے دو پاکستانی یا بھارتی اور ایک تھائی تھا، رانی کی گاڑی میں بیٹھے اس کے دو محافظوں کے پاس آئے اور چند لمحے ان سے باتیں کر کے اپنی پہلے والی جگہ پر چلے گئے۔ یہی تینوں

افراد رات کو ریسٹورانٹ میں رانی کے ساتھ ہمارے کھانے کے دوران ریسٹورنٹ کے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ کرنل مزمل، قیصر اور آپ کی ان کی جانب پشت تھی، انھوں نے کھانے کے دوران سگریٹ کے پیکٹ میں رکھے خفیہ کیمرے سے ہماری تصویریں اتاریں۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہو کر اٹھے تو مزمل، قیصر اور آپ کی بے خبری میں انھوں نے پھر آپ کی تصویریں بنائیں۔ ہمارے اٹھنے کے دوران ان کے لیے کھانا آیا۔ لہٰذا اپنے کمرے میں واپس آ کر میں گنتی کے فوری بعد نیچے چلا گیا۔ اس دوران زیادہ سے زیادہ ۲۰ منٹ گزرے تھے جب میں نیچے آیا تو وہ کھانے سے فارغ ہو کر واپس جا رہے تھے۔ آپ کو اطلاع دینے کا وقت نہ تھا۔ وہ پرائیویٹ گاڑی میں بیٹھے تو میں نے ٹیکسی لے لی اور ان کا پیچھا کرنے لگا۔ ان کی گاڑی بھارتی سفارت خانے میں داخل ہوئی تو میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور دیوار پھلانگ کر سفارت خانے کے کمپاؤنڈ میں چلا گیا۔ جب وہ گاڑی پارکنگ میں لگا کر اتر رہے تھے تو میں ان کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میرے پاس ریوالور اور ایک آہنی مکہ تھا (لوہے کا بنا ہوا مکہ ہاتھ کی چاروں انگلیوں میں پہنا جاتا ہے، اس کا اندرونی حصہ ہتھیلی کے ساتھ لگتا ہے اور بیرونی حصے جو انگلیوں میں پہنا جاتا ہے، کے سروں میں لوہے کے مضبوط ٹکڑے ویلڈ کیے ہوتے ہیں۔ مخالف کے چہرے یا کنپٹیوں پر اس سے وار کیا جاتا ہے۔ کنپٹی پر اس کا ایک زور دار پنچ (Punch) انسان کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے) میں نے یکے بعد دیگرے ان تینوں کو سنبھلنے یا مدد کے لیے کسی کو پکارنے سے پہلے ہی ان کی کنپٹیوں پر اس مکے کے پنچ مار کر انھیں ختم کردیا۔ پارک کی ہوئی گاڑیوں کے پیچھے ان کے بے جان جسموں کو گھسیٹ کر میں نے ان کی تلاشی لی اور خفیہ کیمرا، تین پسٹل اور دو شناختی کارڈ، بٹوے اور دیگر کاغذات لے کر دیوار پھاند کر سفارت خانے کے باہر آگیا۔ اس علاقے میں پولیس کی پٹرولنگ پارٹیاں گشت کر رہی تھیں۔ ان سے بچتے بچاتے میں تقریباً چار کلومیٹر تک پیدل ہی آگے بڑھتا گیا۔ کلوپٹیرا ابراتھل ہاؤس کے قریب سے میں نے ایک ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اسے چھوڑ دیا اور پیدل چلتا ہوا ہوٹل تک پہنچا تاکہ شناخت نہ کیا جاسکوں۔“ یہ کہہ کر عمران نے تکیے کے غلاف میں لپٹے ریوالور، بٹوے، شناختی کارڈ اور دیگر کاغذات ہمارے سامنے ڈھیر کردیے۔ ”اگر میں آپ کو بتانے اوپر آتا تو یہ تینوں اس دوران جا چکے ہوتے۔ میرے پاس سوائے اکیلے ان کا پیچھا کرنے کے کوئی چوائس نہ تھی۔ اب آپ اپنا فیصلہ سنائیں اور جو سزا مناسب سمجھیں، مجھے دیں“ یہ کہہ کر عمران خاموش ہوگیا۔ مزمل جو عمران کی آمد سے پہلے غصے میں پیچ و تاب کھا رہا تھا، دھیمے مسکراتے ہوئے پسٹل اور کاغذات دیکھنے لگا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ عمران کو سزا سناؤں یا بڑھ کر گلے لگالوں۔ میں نے اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے عمران کو کہا ”تمھاری سزا کا فیصلہ محفوظ کرلیا گیا ہے، جو بعد میں تمھیں سنایا جائے گا۔ فی الحال ہم سب اکٹھے ناشتہ کرتے ہیں۔“ رائل پلازہ ہوٹل کی راتیں چوں کہ جاگتی تھیں اس لیے ہوٹل کے کسٹمر صبح دیر سے اٹھتے تھے۔ اور سوائے پیشگی آرڈر کے ہوٹل میں ناشتہ وغیرہ صبح ۹ بجے سے

پہلے سرو (Serve) نہیں ہوتا تھا۔

ناشتے کے بعد رات بھر کے رت جگے کی وجہ سے اپنی نیند پوری کرنے کے لیے سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے، دونوں بھارتی شناختی کارڈ بھارت کی GBI (سول جاسوسی ایجنسی) کے ایک ڈپٹی ڈائریکٹر اور ایک انسپکٹر کے تھے جب کہ ان کے تھائی ہمراہی کے متعلق فوری کچھ پتا نہ چل سکا۔ بھارتی حکومت نے اپنے CBI کے ڈپٹی ڈائریکٹر اور دو فوجی کمانڈو افسران کی ہلاکت کے بعد پھر CBI والوں کو آزمانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ دونوں بھی اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے کی عملی تصویر بن کر رہ گئے۔ ان کے تھائی ساتھی کے متعلق خن سا کے نمائندے کے ذریعے معلوم ہوا کہ بینکاک کا مشہور غنڈہ تھا جسے CBI والوں نے خاصے پیسے دے کر مجھے ہلاک کرنے کا کام سونپا تھا۔ خن سا کے نمائندے نے جو اسی شام خود ملنے ہوٹل آیا تھا، مجھ سے ان تینوں کی ہلاکت میں ہمارا ہاتھ ہونے کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا Offecially no and Unofficially Yes (سرکاری طور پر نہیں لیکن غیر سرکاری طور پر ہاں) نمائندہ ہنستے ہوئے کہنے لگا ''تم لوگ باز نہیں آؤ گے'' میں نے بھی اسی موڈ میں جواب دیا ''وہ ہمارا پیچھا چھوڑیں تو ہم بھی خاموش رہیں۔'' میں نے اسے سارا واقعہ تفصیلاً سنا ڈالا۔ نمائندہ کہنے لگا۔ ''بھارتی سفارت خانے میں تو آج ہنگامہ برپا ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق سب ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے اور کوس رہے ہیں کہ سفارت خانے کی سیکورٹی اتنی ناقص ہے۔ بچارا ٹھرڈ ملٹری اتاچی جو کیپٹن ہے، ہر ایک کے طنز اور نااہلی کے طعنوں کا شکار بنا ہوا ہے۔ خن سا اور عمر کل یقیناً بینکاک پہنچ جائیں گے۔ اس وقت تک کے لیے میرا یہ مشورہ اور استدعا ہے کہ آپ لوگ ہوٹل سے باہر نہ نکلیں۔ خن سا اور عمر کے یہاں پہنچنے کے ساتھ ہی میں آپ کی ان سے ملاقات کا انتظام کردوں گا۔ آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی حفاظت کی ذمہ داری خن سا نے مجھے سونپی ہے۔ میرے تعلقات اور اثر و رسوخ کی بھی ایک حد ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ آپ کا تحفظ میری پہنچ سے باہر ہوجائے۔'' خن سا کے نمائندے کے جانے کے بعد میں نے تمام ساتھیوں کو سپنا کے کمرے میں بلایا اور کہا کہ دو تین روز میں خن سا اور عمر سے ملاقات ہونے اور سفری کاغذات کی تیاری کے بعد ہم سعودی عرب کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ ہمیں اپنی ساری طاقت (Energy) بینکاک میں ہی ختم نہیں کردینی چاہیے لہٰذا بلاوجہ اور میری اجازت کے بغیر کوئی بھی ہوٹل سے باہر نہیں جائے گا اور ہوٹل کے ریسٹورنٹس اور لابی میں بھی کم سے کم دو دو کی ٹولی میں جائیں گے۔ ساتھیوں کو ہدایات دے کر میں اپنے کمرے میں آگیا۔ سپنا نے مجھ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہی تو میں نے اسے کہا کہ میں ذہنی طور پر فی الحال پریشان ہوں اس لیے اگر کوئی اہم بات نہ ہو تو اسے شام تک ملتوی کردے۔ شام ڈھلے ہم سب کرنل مزمل کے کمرے میں اکٹھے ہوئے تو میں نے عمران کو کہا ''تمھاری سزا سنانے کا وقت آگیا ہے۔ تمھیں سزا کے طور پر ایک بنگالی اور ایک اردو گانا سنانا ہوگا۔'' عمران نے بہت ٹال مٹول کی لیکن ہم

نے اُس کی ایک نہ سنی۔ اس نے دونوں زبانوں میں گانے سنائے۔ اس کی اچھی خاصی آواز تھی۔ سپنا نے مجھ سے علیحدگی میں بات کرنی چاہی۔ میں اسے اسی کمرے میں لے گیا تو وہ کہنے لگی ''رات میں بڑا بھیانک سپنا (خواب) دیکھا ہے کہ ہم سب مرے پڑے ہیں۔ موجودہ حالات میں ایسا ہونا ایک ہی طرح ممکن ہے کہ ہمیں کھانے میں زہر دے دیا جائے گا۔'' سپنا کی بات سنتے ہی میں چونک گیا۔ بھارتی سفارت خانے والوں اور رانی سے یکساں ممکن تھا کہ کوئی اور راہ نہ پاتے ہوئے ہمیں راستے سے ہٹانے کے لیے کھانے میں زہر دے دیں۔ سپنا کی بات سن کر میں بے چین ہوگیا۔ مجھے فوری طور پر متبادل اور محفوظ انتظام کرنا تھا۔

☆☆

گپتے کے ساتھ تصویروں اور کیسٹوں کی وجہ سے رانی کی ڈور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے رانی کو فون پر کہا کہ میں اس سے ملنے اس کے دفتر میں آرہا ہوں۔ رانی جو اپنے رہائشی کمرے میں جا چکی تھی، دفتر میں آگئی۔ میں نے اسے کہا کہ میرے ساتھی اس بات پر معترض ہیں کہ غیر مسلم باورچی ہوٹل میں کھانا بناتے ہیں۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم آئندہ اپنے فلور پر بنے ہوئے چھوٹے کچن میں مسلم باورچیوں کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھائیں گے۔ لہٰذا کھانا پکانے کے برتن اور پلیٹیں اور چائے کے لیے ہم سب کی ضرورت کے مطابق برتن چھوٹے کچن میں بھجوادے، رانی چیں بہ جبیں ہو کر بولی ''اس طرح تو سارے مہمان اپنے لیے علیحدہ کھانا بنوانے کا کہیں گے اور ہمارا ریسٹورنٹ بند ہوجائے گا، یہ ممکن نہیں ہے۔'' ''یقیناً ممکن ہے کیوں کہ دوسرے مہمانوں کے پاس نہ تو تمھاری تصویریں ہیں اور نہ ہی شوہر کو ہلاک کرنے کے پلان کی کیسٹیں'' میرا جواب سن کر رانی غصے سے لال بھبوکا ہوگئی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنے کیٹرنگ منیجر کو بلوایا اور اسے ہماری ضرورت کے مطابق تمام سامان فلور کے کچن میں بھجوانے کا کہا۔ منیجر چلا گیا تو رانی بولی۔ ''اب تک بڑے کچن کا کھانا کھاتے کھاتے یہ اچانک کیا سوجھی، کیا یہ شک تو پیدا نہیں ہوگیا کہ آپ لوگوں کے کھانے میں زہر نہ ڈلوادوں؟'' تم سے کچھ بھی بعید نہیں اگر تم اپنے شوہر کو ہلاک کر کے اس کی جائیداد پر اپنے عاشق کے ساتھ عیش کرنے کا پروگرام بنا سکتی ہو تو ہمارے متعلق بھی ایسا کرسکتی ہو لیکن میں نے ایسا انتظام کیا ہوا ہے کہ اگر مجھے یا میرے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی کوئی گزند پہنچا تو تمھارے راز کو کھولنے والی سب چیزیں خود بخود تمھارے شوہر تک پہنچ جائیں گی۔ ذرا یہ تو بتاؤ، آئی جی کے پاس جاتے وقت تمھارے دونوں محافظوں کی بھارتی سفارت خانے میں آئے ہوئے CBI کے افسروں سے تعلقات کی کیا نوعیت ہے۔'' رانی کا رنگ فق ہوگیا اور اس نے قسمیں اٹھانی شروع کردیں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے یقین دلانے کے لیے رانی نے دونوں محافظوں کو بلایا۔ ادھر میں نے اسی کے دفتر سے انٹرنل فون پر مزمل، عمران اور قیصر کو رانی کے دفتر میں آنے کا کہا۔ دونوں تھائی محافظ بھی دفتر میں آگئے۔ وہ صرف تھائی

زبان جانتے تھے، مزمل، عمران اور قیصر دفتر میں آئے تو عمران نے کہا۔ ''ان کو ہمارے ساتھ میرے کمرے میں بھیج دیجیے۔ ساری بات صاف ہوجائے گی۔'' رانی نے تھائی زبان میں محافظوں کو کچھ کہا اور وہ ہمارے ساتھ عمران کے کمرے میں چلے آئے۔ میں نے تھائی نمبر۲ (عبداللہ) کو عمران کے کمرے میں بلوایا اور اسے کہا کہ ان محافظوں کو کہے کہ بھارتی سفارت خانے والوں اور تھائی غنڈے کے ساتھ ان کی آئی جی کے دفتر کے باہر کیا بات ہوئی تھی۔ اگر انھوں نے سچ بتا دیا تو انھیں کچھ نہیں کہا جائے گا ورنہ خن سا کے آدمی ان کا جو حشر کریں گے اس کے ذمہ دار یہ خود ہوں گے۔ انھیں یہ بھی بتادے کہ وہ تینوں اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ تھائی نمبر۲ نے ان سے بات شروع کی۔ عمران نے JCO اور دونوں سپاہیوں کو بھی بلوالیا تھا۔ نمبر۲ کے ساتھ بات کرتے وقت ان کی آواز ذرا اونچی ہوئی تو مزمل کے اشارے پر دونوں سپاہیوں نے ان کو گردنوں سے پکڑ لیا اور JCO نے انھیں تھپڑ مارنے شروع کیے اور تھائی نمبر۲ کو کہا کہ انھیں کہے کہ ہمارے افسروں کے سامنے انھیں آواز اونچی کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ قصہ کوتاہ پندرہ منٹ میں ہی ان دونوں محافظوں کا دم خم ختم ہوگیا اور انھوں نے روتے ہوئے تھائی نمبر۲ کو بتایا کہ تھائی غنڈے نے دونوں بھارتیوں سے انھیں دو ہزار بھات لے کر دیے تھے اور ان کی یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ ہماری نقل و حرکت کی نگرانی کریں اور ہم میں سے کوئی اور خصوصاً میں جب ہوٹل سے باہر جاؤں تو وہ سری وانگ روڈ کے بائیں کونے پر ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان پر فون کر کے بتادیں۔ وہ دکان ایک بھارتی کی ہے اور یہ دونوں CBI والے اور تھائی غنڈے وہاں موجود رہیں گے۔ نمبر۲ نے مجھے انگریزی میں کہا کہ ان کی اس سے زیادہ حیثیت نہیں کہ انفارمر سے بڑھ کر کوئی کام کریں۔ نمبر۲ نے انھیں مزید دھمکا کر اور دو تین تھپڑ رسید کر کے مجھے اشارہ کیا اور میں نے انھیں جانے کی اجازت دے دی۔ اس رات کا کھانا ہم نے ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں کھایا اور اگلی صبح کھانے پینے کی ضرورت کا سب سامان بازار سے خرید لائے۔ دونوں سپاہی تھوڑا بہت کھانا بنالیتے تھے۔ میں نے خن سا کے نمائندے کو فون کر کے اپنا خدشہ بیان کرتے ہوئے دو مسلم باورچیوں کے لیے کہا تو اس نے دو گھنٹے میں ہی دو خانساماں بھجوادیے جنھوں نے بتایا کہ ایک پاکستانی ریسٹورنٹ کے مالکان سے چند روز کے لیے انھیں مستعار لیا گیا ہے۔ خن سا کے نمائندے نے یہ بھی بتایا کہ آج رات کو خن سا اور عمر خان بینکاک پہنچ جائیں گے۔

دوسرے دن خن سا نے شام کو مجھے ملنے کے لیے بلایا۔ عمر خان بھی وہیں موجود تھا۔ مجھے تو یہ خدشہ تھا کہ بینکاک میں ہماری سرگرمیوں سے خن سا مجھ سے خفا ہوگا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اسے ہماری ہر کارروائی کا تفصیلاً علم ہوچکا تھا۔ مجھے دیکھتے ساتھ ہی وہ قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔ عمر خان نے بھی اس کا خوش گوار موڈ دیکھ کر اس کا ساتھ دیا۔ خن سا نے عمر کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے واقعی ایک دلیر انسان کو مجھ سے متعارف کروایا ہے اور مجھے بھی اس بات کی خوشی ہے کہ میں کسی بزدل کی مدد نہیں

کر رہا ہوں۔ بینکاک میں تم نے بھارتی سفارت کاروں کو چار دیواری کے اندر محصور کردیا ہے۔ میں نے بھی ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ یا تو کسی کام میں ہاتھ ڈالو نہیں لیکن جب ایک بار کوئی کام کرنے کا عزم کرلو تو اسے پورا کرو،اور تب تک اس کی تکمیل میں لگے رہو جب تک کہ خود تمھاری تسلی نہ ہوجائے۔ میں نے تین ممالک کی سرحدوں کے اندر اپنا آزاد علاقہ بنایا ہوا ہے اور کسی بھی حکومت کی یہ جرأت نہیں کہ مجھ پر ہاتھ ڈال سکے۔ تینوں ملکوں کی پولیس اور فوج کہنے کو تو ہمیں گھیرے میں لیے ہوئے ہیں لیکن کسی میں بھی اتنی جرأت نہیں کہ میرے علاقے میں پاؤں بھی رکھ سکے۔ عمر خان نے مجھے بتایا تھا کہ پاکستان سے ملحقہ ایک ایسا علاقہ بھی ہے جس میں برٹش گورنمنٹ کو قدم رکھنے کی بھی کبھی جرأت نہیں ہوئی حالاں کہ اس وقت آدھی دنیا پر برطانیہ کا جھنڈا لہراتا تھا۔ خیر، بینکاک میں تو تم نے اپنے دل کے ارمان پورے کرلیے اب کیا ارادہ ہے۔ سعودی عرب جانا چاہتے ہو تو وہاں کے لیے پاسپورٹ اور ویزے میری ذمے داری اور اگر میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہو تو تمھارے تمام ساتھیوں کو بہت معقول کام دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔'' میں نے خن سا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس کے نمائندے نے ہماری توقع سے بڑھ کر ہماری مدد کی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ عمر خان اور تمھارے لیے کام کرنے والا ایک تھائی کریم نامی ٹیکسی ڈرائیور میرے کام کا آدمی ہے اور وہ اپنی خوشی سے ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ لہٰذا اسے ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے اور اس کے لیے اور اسرائیلی لڑکی کا ماہا کے اسلامی نام سے پاکستانی پاسپورٹ اور سعودی عرب کے ویزے لگوادیے جائیں۔ اس کے علاوہ میرے تمام ساتھیوں کے بھی سعودی عرب کے ویزے لگوادیے جائیں۔ خن سا نے کہا کہ کل صبح میرا نمائندہ تمھارے پاس آئے گا۔ جن جن کے لیے پاسپورٹ اور ویزوں کی ضرورت ہے ان کے نام اور دیگر کوائف اسے لکھ کر دے دینا۔ ۲۴ گھنٹوں کے اندر تم کو سب کچھ تیار مل جائے گا۔ تھائی ڈرائیور کریم کو بھی میرے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ عمر خود مجھے ہوٹل چھوڑنے آیا۔ اس نے کہا ''میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ خن سا نے کہیں تمھاری بینکاک میں قتل و غارت گری کا برا نہ منایا ہو لیکن اس نے تو تمھیں داد دی ہے۔ خن سا کا موڈ کبھی کبھار ہی خوش گوار ہوتا ہے۔ اس سے اگر کچھ لینا چاہتے ہو تو اب اچھا موقع ہے۔'' میں نے عمر خان کو جواب میں کہا ''میں پہلے ہی تم دونوں کے احسانات تلے اتنا دبا ہوا ہوں کہ سر نہیں اٹھا سکتا۔ سعودی عرب میں اسلحے کی فراہمی سے تم نے مجھے ایک بڑی سر دردی سے بچالیا ہے۔ میں نے جو بھی ضرورت تھی تم دونوں کو بیان کردی ہے اب صرف تائید ایزدی چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک ہماری ضرور مدد فرمائے گا کیوں کہ ہم کسی غلط مقصد کے لیے جان ہتھیلیوں پر لیے نہیں جارہے۔'' عمر خان مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

یہاں میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ سعودی عرب، ایران، شام اور ابوظہبی میں ہمارے جانے کا واحد مقصد ان اسرائیلی، برطانوی، امریکی اور بھارتی خفیہ ہاتھوں کو قطع کرنا تھا جو

ان ممالک میں بیٹھ کر پاکستان کے خلاف کام کررہے تھے۔ تیل کی دولت سے مالا مال یہ ممالک (سوائے شام کے) پاکستان کی ہرطرح سے مدد کررہے تھے جو ان پاکستان دشمن ممالک کو کھٹکتی تھی اور ان کے ایجنٹ ان ممالک میں اپنا اعتماد جما کر اور اکثر دھمکا کر ان ممالک کے فرماں رواؤں کو پاکستان کی امداد ختم کرنے پر مجبور کرتے رہتے تھے۔ ان کا اثر و رسوخ ان ممالک کے حکمرانوں پر اس قدر بڑھ چکا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ان ایجنٹوں کی باتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس کی ایک واضح مثال پاکستان کی صورت حال ہے۔ ہمارا واحد قصور یہ ہے کہ ہم نے تیسری دنیا کے بیش تر ممالک کی طرح امریکا اور مغربی ممالک سے اپنی ملکی ترقی کے لیے قرضہ لیا جسے ہمارے نااہل اور غاصب حکمران ہڑپ کر گئے اور پاکستان کی ساری ترقی اسلام آباد میں صدارتی محل، وزیراعظم ہاؤس اور پارلیمینٹ کی پرشکوہ عمارتوں تک ہی محدود رہی۔ ملک ہر سال قرض لے کر مزید مقروض ہوتا رہا اور عوام خوش حالی کے صرف خواب ہی دیکھتے رہ گئے۔ آخر کہاں گیا یہ سب قرضہ؟ اب ملک مقروض، عوام مہنگائی کی چکی میں پسے ہوئے آخری دموں پر اور ملک پر حکومت ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی جو یہاں تک ہمارے اندرونی معاملات میں دخیل ہوچکے ہیں کہ اٹھارہ انیس گریڈ کے سرکاری ملازمین کے تبادلے اور ترقی وتنزلی میں بھی ان کا حکم چلتا ہے۔ ہمیں فوجی لحاظ سے کم زور بلکہ ختم کرنے کی بھی پوری کوشش کی جارہی ہے۔ ہر ملک میں یہ شاطر وہاں کے حالات کے پیش نظر اپنی چالیں چلتے ہیں۔ سعودی عرب، ایران اور ابوظہبی کے حکمرانوں کو انھی شاطروں نے اسرائیل اور عراق کی فوجی طاقت سے ڈرا کر اپنا فرسودہ اسکریپ اسلحہ بیچنا شروع کیا۔ سعودی عرب ابوظہبی کو اسرائیل سے ڈرا کر امریکا نے اپنے F-15 لڑاکا جہاز دگنے داموں پر فروخت کیے جب کہ اسرائیل کو ان سے بدرجہا بہتر F-16 لڑاکا جہاز مفت میں دے دیے۔ ایران کو شاہ کے زمانے میں F-5 فینٹم جہاز بیچے جنھیں کسی بھی معقول ملک کی ہوائی فوج قبول کرنے پر تیار نہیں تھی۔ پاکستان کو F-16 جہاز دیے اور جب دیکھا کہ پاکستانی ہوا باز ان جہازوں سے بہترین نتائج حاصل کرسکتے ہیں تو ایڈوانس میں موصول کردہ رقم اور پاکستان کے آرڈر کردہ مزید F-16 جہازوں کی ترسیل روک دی گئی۔ بجائے عالمی عدالت انصاف میں جانے کے جہاں سے سو فی صد پاکستان کے حق میں فیصلہ ہوتا ہے، نواز شریف صاحب کی جیب گرم کی گئی اور انھی جہازوں کی دیکھ بھال کی مد میں ایڈوانس رقم سے منہا کر کے ایک چوتھائی رقم لوٹا دی گئی اور بقیہ رقم امریکی گندم اور امریکی جہازوں پر بھیجنے کی مد میں رکھ لی گئی۔ امریکا میں کاشت کاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے امریکی حکومت فالتو گندم مہنگے داموں خرید کر سمندر میں غرق کردیتی ہے اب وہی گندم F-16 لڑاکا جہازوں کے بدلے پاکستان کو اتنے مہنگے داموں لینی پڑی جس کی تقریباً نصف لاگت میں آسٹریلیا سے ہمیں گندم مل سکتی تھی۔

خن سا کا نمائندہ اگلی صبح ہمارے موجودہ پاسپورٹ اور نئے پاسپورٹوں کے لیے کوائف اور

تصاویر وغیرہ لے گیا۔ اور ٹھیک ۲۴ گھنٹوں بعد تین ماہ کے لیے سعودی عرب کے بزنس ویزے کی مہریں لگی ہوئیں پاسپورٹ اور تین روز بعد BOAC سے ریاض (سعودی عرب) کی اوکے ٹکٹیں مع ریٹرن ٹکٹ کے ہمیں مل گئے۔ ہم سب جانے کے لیے بے تاب تو تھے ہی جلد جلد چھوٹی موٹی تیاری کی اور تیسرے روز بالکل اچانک ہوٹل سے چیک آؤٹ ہو کر ایئرپورٹ کو روانہ ہوگئے۔ خن سا کے نمائندے کی دو کاریں ہماری حفاظت کے لیے اور وہ خود ہمیں ایئرپورٹ پر اپنے سامنے امیگریشن اور کسٹم کے تمام مراحل سے گزارنے کے لیے ان گاڑیوں میں اپنے نائبین کے ہمراہ موجود تھا۔

❁

تیسرا باب

بینکاک سے روانگی سے پیش تر میں چند وضاحتیں قارئین کے ریکارڈ کو درست رکھنے کے لیے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بینکاک میں بھارتی سفارت خانے کا سیکنڈ ملٹری اٹاچی میجر پرشاد رانی کی ایک رات کی میزبانی سے لطف اندوز ہو کر چلا گیا تھا۔ رانی نے اگلی صبح تو مجھے یہی بتایا تھا کہ ساری رات کے رت جگے کے باوجود وہ میجر پرشاد سے کوئی معلومات حاصل نہ کر سکی تھی۔ اسی شام ہمیں اطلاع ملی کہ میجر پرشاد کو صبح دفتر میں بیٹھے ہوئے اچانک خون آلود قے آئی اور میڈیکل ایڈ ملنے سے پہلے ہی وہ ہلاک ہو گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کی موت زہر خورانی سے ہوئی تھی۔ میرا پہلا شک رانی پر تھا۔ میرے کئی بار پوچھنے پر بھی رانی نے اس کی موت سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی لیکن میں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب میں نے میجر پرشاد کے ہوٹل آنے اور علی الصبح ہوٹل سے واپس جانے کے دوران کے واقعات کی تفصیل بتانے کے لیے رانی پر زور دیا تو وہ بالآخر پھٹ پڑی۔ ''اپنی مرضی کے خلاف مجھے آپ نے پرشاد کو دعوت دینے پر مجبور کیا۔ رات کو اس نے جس درندگی اور وحشت سے میرے ساتھ غیر انسانی اور غیر فطری سلوک کیا اس کے نتیجے میں شرم و غصے کے باعث میں نے صبح اورنج جوس میں اسے وہ چیز ملا کر پلا دی جو میں نے اپنے شوہر کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' چوں کہ میجر پرشاد کو ہم نے ہلاک نہیں کیا تھا اس لیے اس کی زہر خورانی سے موت کو ہم نے اپنے کھاتے میں نہیں ڈالا۔ بہرحال ہم رانی کی طرف سے محتاط ہو گئے اور سپنا کے خواب کو سننے کے بعد میں نے اپنے اور اپنے تمام ساتھیوں کے لیے علیحدہ کھانا بنوانے کا انتظام کیا تھا۔ اسرائیلی لڑکی ماہا نے اپنے چرس اور ہیروئن کے راشن کو سعودی عرب ہمراہ لے جانے کی خود ذمہ داری اٹھائی تھی۔ بینکاک ایئرپورٹ سے تو خن سا کے نمائندے کی وساطت سے بغیر کسی دشواری کے کسٹم اور چیکنگ وغیرہ سے

صاف نکل گئی۔ ریاض ایئرپورٹ پر بھی اس کی معمول کے مطابق عام قسم کی چیکنگ ہوئی۔ روانی سے عربی بولنے اور خوش شکل ہونے کے باعث وہاں کے کسٹم والوں نے بھی اس سے ہنس ہنس کر چند باتیں کیں اور گزر جانے دیا۔ ہم نے بینکاک ایئرپورٹ پر اپنا تمام اسلحہ خن سا کے نمائندے کے سپرد کر دیا تھا۔ صرف قیصر نے اپنا رام پوری چاقو اور عمران نے آہنی مکہ اپنے ہمراہ رکھا جس سے کسٹم والوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ہمارے پاس پورٹس کے مطابق سپنا قیصر کی اور ماہا کو عمران کی بہن ظاہر کیا گیا تھا کیوں کہ سعودی عرب میں محرم کے بغیر کسی غیر ملکی عورت کا داخلہ ممنوع تھا۔

ہم نئے ولولوں اور جذبوں سے لبریز دلوں کے ساتھ جہاز میں سوار ہوئے۔ BOAC کا جہاز پہلے کوالالمپور کے ہوائی اڈے پر اترا اور ایک گھنٹے بعد وہاں سے پرواز کر کے ۸ گھنٹوں بعد کراچی لینڈ کر گیا۔ کراچی میں ڈھائی گھنٹے میں تیل اور مسافروں کو لے کر اس نے پھر اڑان بھری اور اب ہماری منزل ریاض تھی۔ اس دور میں سعودی عرب کی تعمیر زوروں پر تھی۔ ہر روز سیکڑوں غیر ملکی جن میں اکثریت پاکستانیوں اور خصوصاً پٹھانوں کی تھی، سعودی عرب کی تعمیر میں حصہ لینے کے لیے وہاں جا رہے تھے۔ سعودی اب بہت ہوشیار اور سمجھ دار ہو چکے ہیں، ان دنوں اپنے قدیم رواج کے مطابق ہر آنے والے غیر ملکی کی زبانی کہی ہوئی باتوں کو درست سمجھتے تھے۔ سعودی ایئرپورٹس پر چیکنگ بھی برائے نام ہوتی تھی۔ سعودیوں کو عربی کے سوا کوئی دوسری زبان سمجھ میں نہیں آتی تھی اور آنے والوں کی حالت یہ تھی کہ مغربی ممالک کی بات تو دور کی ہے، پاکستانی اور بھارتی مسلمان بھی عربی زبان سے اتنے ہی نابلد تھے جتنے کے غیر مسلم۔ زبان سے ناآشنائی بھی کسٹم والوں سے بچنے کی ایک وجہ تھی۔ پٹھان کھانے اور پانی کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن نسوار اور چرس کے بغیر نہیں اور ان دونوں کا سعودی عرب میں داخلہ ممنوع تھا۔ پٹھانوں نے پشاوری چپل کے تلے کی دوہری تہہ کے درمیان چرس اور نسوار لانی شروع کی۔ وہ تو ایک بار ایک پٹھان کی جس نے اپنے سوٹ کیس میں پشاوری چپلوں کے جوڑوں کے علاوہ پہنی ہوئی چپل میں بھی چرس چھپا رکھی تھی، کسٹم سے گزرتے وقت اس کی چپل کے ایک پیر کا تلہ کھل گیا۔ چرس فرش پر گری اور سارے ہال میں اس کی بو پھیل گئی۔ اس واقعے کے بعد سے اب تک سعودی کسٹم والے کسی بھی پشاوری چپل کو اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک اسے چاقوؤں سے پھاڑ کر اپنی تسلی نہیں کر لیتے۔ ریاض ایئرپورٹ سے نکل کر ہم نے تین ٹیکسیاں لیں اور شاہرہ ستین کے شروع میں ہی بنے پٹرول پمپ پر گئے۔ میں نے ایئرپورٹ سے ہی عمر کے نمائندے کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی اور اسی نے ہمیں اس پٹرول پمپ پر آنے کا کہا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو وہ ہمارے انتظار میں تھا۔ میں اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور وہ ہمیں ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں لے گیا جہاں ہم سب نے قیام کرنا تھا۔ عمر کا نمائندہ عبدالخالق بھارتی تھا اور ریاض میں اس کی کپڑے کی دو بڑی دکانیں تھیں۔ ہم بینکاک سے ۹ بجے صبح کے روانہ ہوئے رات دو بجے ریاض پہنچے تھے۔ عبدالخالق نے اگلے

روز بعد دوپہر مجھے اسلحہ لا کر دینے کا وعدہ کیا اور اس کے جانے کے بعد ہم مسلسل ہوائی سفر کی تھکن سے چور ایئر کنڈیشنڈ کمروں کے آرام دہ بستروں میں جو گھسے تو دوسرے روز دوپہر بارہ بجے تک سوتے ہی رہے۔ بعد دوپہر عبدالخالق حسب وعدہ آ گیا۔ اس کے ساتھ دو بڑے سوٹ کیس تھے۔ جن میں ۱۴ ریوالور اور پسٹل خاصی تعداد میں ان کی گولیاں اور ۲۴ دستی بم تھے۔ اس کے مشورے سے ہم نے صوبہ القصیم کے دارالحکومت بریدہ بذریعہ سڑک جانے کا پروگرام بنایا۔ عبدالخالق نے ہی ہمیں بتایا کہ بریدہ شہر سعودی عرب کا بہت بڑا مذہبی مرکز ہے اور وہاں اور اس صوبے کے شہروں الرس اور عنیزہ میں چاہے کوئی غیر ملکی مغربی عورت ہی کیوں نہ ہو، بغیر برقعے کے نہیں جا سکتی۔ مزید برآں ان شہروں میں کوئی رہائشی ہوٹل نہیں ہے۔ سپنا اور ماہا کے لیے برقعے تو اس نے مہیا کر دیے اور مجھے کہا کہ ان شہروں میں ٹیکسی سروس بھی نہیں ہے لہٰذا بہتر رہے گا کہ ہم ریاض سے ہی گاڑیاں خرید لیں۔ ہم نے اسی کے ساتھ جا کر چار ٹیوٹا کریسیڈا انٹی گاڑیاں ۱۸ ہزار ریال فی گاڑی کے حساب سے خرید لیں۔ اس وقت کی پاکستانی کرنسی کے مطابق ہمیں ہر گاڑی صرف ۹۲ ہزار روپے میں پڑی۔ ایک دن میں ہی ہمیں ان کی رجسٹریشن نمبر پلیٹیں عبدالخالق نے بنوا کر لا دیں۔

☆☆

عبدالخالق نے ہی اپنے ذرائع سے میرا کرنل مزمل، عمران، قیصر، کریم، JCO منصف اور رضی کے لیے سات جعلی ڈرائیونگ لائسنس بھی بنوا دیے۔ عمر کا کارندہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی غیر قانونی کاموں کا ماہر تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے بتایا کہ ریاض میں جعلی پاسپورٹ تو معمولی بات ہے دنیا کے ہر ملک کے جعلی پاسپورٹ اور ویزے بھی ملتے ہیں اور یہ کام پاکستانیوں کا ایک گروہ کر رہا ہے۔ بریدہ میں ہماری رہائش کا اس نے یہ انتظام کیا کہ ایک ۹ کمروں کا مکان بریدہ میں اپنے ایک دوست کی وساطت سے کرائے پر لیا۔ چار ہزار ریال ماہوار کرائے پر یہ فرنیشڈ مکان ہمارے لیے بہت موزوں تھا۔ اب سوال تھا کھانا تیار کرنے کا تو ماہا اور سپنا نے اس کی ذمہ داری اٹھائی دونوں فوجی سپاہی گھر کی دیکھ بھال اور سودا سلف لانے کے لیے تیار تھے۔ بریدہ ریاض سے پونے چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور آج کل کی موجودہ شاہراہ ان دنوں زیر تعمیر تھی۔ عبدالخالق کے دوست نے ہمیں بریدہ شہر کے پوش علاقے میں گورنر پرنس عبداللہ کے امادہ کے قریب ٹیلی وژن اسٹیشن کے بالکل ساتھ بنے سرخ و سبز گھر پر ملنا تھا کیوں کہ یہی وسیع و عریض مکان ہمارے لیے کرائے پر لیا گیا تھا۔ ریاض میں ان انتظامات میں ہمارے ۵ روز صرف ہو گئے اور چھٹے روز علی الصبح ہم بریدہ جانے والی سڑک پر روانہ ہوئے۔ یہ چاروں گاڑیاں میں نے عمر کے دیے ہوئے ٹریولر چیکس کے ذریعے خریدی تھیں۔ سڑک کے زیر تعمیر ہونے اور لفٹ ہینڈ ڈرائیو گاڑیوں اور سڑک پر بائیں کے بجائے دائیں جانب ٹریفک چلنے کی وجہ سے ہم نے ۳۷۰ کلومیٹر کا فاصلہ ۷ گھنٹے میں طے کیا۔ ہماری ہمراہی عورتوں نے برقعے اوڑھ رکھے تھے اور ماہا

سارے سفر کے دوران چرس کے سگریٹ پھونکتی رہی۔ ٹی وی اسٹیشن کے ساتھ ہی سرخ و سبز گھر ہمیں جلد ہی مل گیا جہاں اورنگ زیب ہمارا انتظار کر رہا تھا کیوں کہ ہماری روانگی کے فوری بعد عبدالخالق نے اسے ٹیلی فون پر بتا دیا تھا۔ گھر کے سارے کمرے ایئر کنڈیشنڈ تھے۔ ہم نے ایک ایک کمرے میں دو دو ساتھیوں کو ٹھہرایا۔ میرے ساتھ کرنل مزمل کا بیڈ تھا۔ اورنگ زیب کو ہم نے سامانِ خورد و نوش، برتنوں اور دیگر ضروری اشیا کی لسٹ بنا کر دی اور دو گھنٹے میں اورنگ زیب نے ہمیں ضرورت کا سب سامان لا کر دے دیا۔

میں یہاں پر قارئین خصوصاً نوجوان نسل کے لیے سعودی عرب کے کچھ حالات تحریر کر رہا ہوں۔ عربیہ پہلے سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ سلطنت عثمانیہ کا سلطان ترکی میں رہتا تھا اور دنیا بھر کے تمام اسلامی ملک سلطنت عثمانیہ میں شامل تھے۔ برطانیہ جس کی حکومت آدھی دنیا میں تھی، مسلمانوں کی اس مرکزیت کو ختم کرنے کے درپے تھا۔ اس کے بھیجے ہوئے مشہور جاسوس کیپٹن لارنس (جس کے اوپر کئی مشہور فلمیں مثلاً لارنس آف عربیہ بھی بن چکی ہیں) نے عربی سیکھی اور جب روانی سے عربی بولنے لگ گیا تو عربوں کے بھیس میں عربیہ میں جا کر مختلف قبائل کو سلطنت عثمانیہ کے سلطان عبدالحمید دوئم کے خلاف اکسانے میں اس حد تک کامیاب ہوا کہ ان قبائل نے مرکز کے خلاف بغاوت کر کے سرکاری تنصیبات اور واحد ریلوے لائن کو کئی جگہوں سے اڑا کر مرکز سے عربیہ کا رابطہ ختم کر دیا۔ ترکی جو پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۸۔۱۹۱۴ء میں جرمنی کے ساتھ شامل تھا شکست کھا کر اس حد تک کم زور ہو چکا تھا کہ عربیہ کا دفاع نہ کر سکا۔ شریف مکہ (اردن کے موجودہ بادشاہ کا پر دادا) کو انگریزوں نے بے دخل کر کے اردن کا علاقہ دے دیا اور عربیہ پر سے سلطنت ہاشمیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ سارا عرب اس وقت مختلف قبائل میں بٹا ہوا تھا جو اقتدار کے حصول کے لیے آپس میں برسرپیکار تھے۔ اس وقت کویت کا ایک مہم جو عبدالعزیز صرف ۱۴۰ گھڑسواروں کے ساتھ عربیہ میں داخل ہوا۔ زلفی جو ریاض اور بریدہ کے درمیان میں ہے، کے قبیلے سے عبدالعزیز کی پہلی جنگ ہوئی اور قبیلے کے سردار کو ہلاک کر کے عبدالعزیز نے اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی اور پھر زلفی کے قبیلے کے ساتھ مل کر الراس، عنیزہ ال مجمع کے قبائل کو یکے بعد دیگرے شکست دے کر ہر قبیلے کے سردار کی بیٹی یا بیوی سے نکاح کرتا گیا۔ شکست خوردہ قبیلے ان شادیوں کی وجہ سے عبدالعزیز کا ساتھ دیتے گئے۔ پانچویں شادی سے پہلے وہ کسی سابقہ بیوی کو طلاق دے دیتا اور یوں تھوڑے ہی عرصے میں سارے عربیہ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اپنے دوست اور رہبر عبدالوہاب کے کہنے پر اس نے سارے ملک میں وہابیت کو رائج کیا اور ملک کو سعودی عرب کا نیا نام دیا یہ وہ دور تھا، جب سعودی عربیہ دنیا کے غریب ترین ممالک میں شمار ہوتا تھا اور حکومت کی تمام آمدنی حاجیوں اور عمرہ کرنے والے غیر ملکیوں سے خدمت کے نام پر ٹیکس کی وصولی سے ہوتی تھی بحری قزاقی بھی ان دنوں عروج پر تھی اور ایران اپنے حاجیوں کی حفاظت کے لیے سالانہ تین لاکھ ریال سعودی حکومت کو دیتا تھا۔ ۴۰ کی

دہائی میں سعودی عرب میں پٹرول نکل آیا اور یہ غریب ترین ملک دنیا کے انتہائی دولت مند ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ شاہ عبدالعزیز کے ۸۰ سے زیادہ لڑکے اور لگ بھگ اسی تعداد میں بیٹیاں تھیں۔ موجودہ شاہ فہد، پرنس عبداللہ، پرنس ماجد، پرنس سلطان اور سابقہ شاہ خالد، شاہ فہد اور شاہ سعود سب شاہ عبدالعزیز کے لڑکے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز نے ایک قانون یہ بنایا کہ اس کی اولاد میں سے جو بھی بادشاہ بنے اس کے بعد اس کی اولاد نہیں بلکہ بھائی کو بادشاہ بنایا جائے گا۔ رائل کونسل نئے بادشاہ اور ولی عہد کا انتخاب کرتی ہے اسی لیے شاہ فہد کا ولی عہد شہزادہ عبداللہ ہے ۸۰ سے زیادہ بیٹیوں کی اولاد در اولاد سے اب حالت یہ ہے کہ سعودی عرب میں ہر چوتھی موٹر پر شاہی نشان کی نمبر پلیٹ لگی ہوتی ہے۔ بلا مبالغہ ہزاروں کی تعداد میں شاہ عبدالعزیز کے پوتے، پوتیاں اور پڑپوتے وغیرہ ہیں۔ جن کے وظائف کم ہوتے ہوتے صرف تین چار ہزار ریال ماہوار تک رہ گئے ہیں اندرونی طور پر اس شاہی خاندان میں بڑی پھوٹ ہے جسے بڑی مشکل سے سنبھالا جارہا ہے۔ دشمن اسلام چاہتے ہیں کہ اس خاندان کا شیرازہ بکھر جائے تاکہ سعودی عرب پھر قبیلوں میں بٹ جائے جو تیل کی دولت کے لیے آپس میں برسرپیکار ہیں ولی عہد پرنس عبداللہ کا اندرونِ ملک بہت اثر رسوخ ہے اور وہ امریکا اور مغربی ممالک کی سازشوں سے بخوبی باخبر ہے اور ان سے نفرت کرتا ہے اس کا جھکاؤ پاکستان کی طرف ہے جو مغربی طاقتوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

اس مکان میں سیٹ (Set) ہونے اور بریدہ شہر سے واقف ہونے میں ہمیں دو روز لگے۔ اس دوران ہم نے عنیزہ اور الرس جا کر ان بڑے قصبات کا بھی جائزہ لیا اور الرس کے بجلی گھر کے مصری انجینئر کے گھر کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ بجلی گھر الرس میں تھا لیکن مصری انجینئر کی رہائش عنیزہ میں ۶ فلیٹس کے ایک کمپاؤنڈ میں تھی۔ جس کے باقی پانچ فلیٹس میں بھی مصری رہتے تھے۔ میں نے موساد کے اس مصری ایجنٹ سے ماہا کے ذریعے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے مشن کا آغاز میں نے فندق سلیمان کے بھارتی اے سی انجینئر وجے کمار سے کیا اور تیسرے روز میں نے مزمل، عمران اور قیصر کو ہمراہ لے کر فندق سلیمان میں کمرے لے لیے۔ ہم جب تک اس ہوٹل میں ٹھہرتے نہیں ہمیں وجے کمار کی اصلیت جاننے اور بھارتی ایجنٹ کے طور پر اس کارروائیوں کا علم نہیں ہوسکتا تھا۔ ہم اپنی دو گاڑیاں ہمراہ لے گئے تھے۔ اسی روز شام کو وجے کمار کو پہلی مرتبہ میں نے دیکھا میں نے اس سینٹرلی ایئرکنڈیشنڈ ہوٹل میں اپنے کمرے میں اے سی کی ہوا ٹھیک طور پر نہ آنے کی کئی بار شکایت کی۔ دو مرتبہ تو فلپائنی میکینک آیا۔ AC بالکل ٹھیک کام کررہا تھا لیکن میری تیسری بار شکایت کرنے پر وجے کمار خود آیا۔ یہ پینتیس سال سے کچھ اوپر کا ایک ہر وقت ہنستے رہنے والا دہلی کا رہائشی تھا۔ اس نے میرے کمرے میں آ کر خود کو متعارف کروایا اور بولا ”آپ کے کمرے کا AC بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کی پہلی شکایت پر میں نے مین یونٹ میں ٹمپریچر اور کم کردیا تھا۔ اس سے زیادہ ٹھنڈک تو صرف ہمالیہ پر ہی مل سکتی ہے“ وجے کا

لب و لہجہ پنجابی تھا۔ میں نے پنجابی بولتے ہوئے کہا ”جہاں تک ٹھنڈک کی بات ہے تو اس سے کہیں زیادہ کولنگ کرنے والے یونٹ بھی میں نے دیکھے ہیں بہرحال۔ تمھاری بات کو صحیح مانے بغیر چارہ بھی تو کوئی نہیں“ یہ کہتے ہوئے میں نے کمرے کے فریج سے فروٹ جوس کے دو یخ بستہ ٹن نکالے اور ایک وجے کو دیتے ہوئے کہا ”تمھارے چہرے کی مسکراہٹ سے ہی گرمی خاصی کم ہوگئی ہے۔ مدتوں بعد پنجابی بولنے والے کسی معقول آدمی سے ملا ہوں۔ کیا تم تھوڑا وقت میرے ساتھ کمرے میں گزار سکتے ہو؟“ وجے میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا تو میں نے اسے کہا ”میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر پاکستان سے نکل سکا ہوں۔ میں پاکستانی فوج میں میجر تھا اور ذوالفقار علی بھٹو کا بے حد فین تھا۔ اسی بنا پر میں نے بڑی مشکل سے اپنی ڈیوٹی پرائم منسٹر ہاؤس میں لگوائی تھی۔ بھٹو صاحب بھی مجھے خاصی لفٹ دیتے تھے۔ جب جنرل ضیا الحق نے بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا اور بھٹو صاحب کو ہاؤس اریسٹ (نظر بند) کردیا تو میں نے وزیراعظم ہاؤس میں اپنے سابقہ اثر و رسوخ کی وجہ سے فوری طور پر دوسرے نام سے ایک پاسپورٹ بنوایا اور انھی تعلقات کی بنا پر سعودی عرب کا بزنس ویزہ لے کر یہاں چلا آیا۔ اگر میں مزید چند روز بھی پاکستان میں رہ جاتا تو جنرل ضیا الحق کے ظالمانہ انتقام کا شکار ہوکر گرفتار کرلیا جاتا“ غرضے کہ ایسی کئی باتیں کر کے میں نے وجے کو اپنی پاکستان سے نکلنے کی باتیں سنا کر اسے اپنی کور اسٹوری (Cover Story) پر یقین دلانے کی کامیاب کوشش کی اور اسے بتایا کہ میں حکومت پاکستان کے اور خصوصاً پاکستان کی ایٹمی توانائی میں اب تک کی کامیابی کے چند ایسے خفیہ راز ہمراہ لے آیا ہوں جنھیں فروخت کر کے میں اچھی خاصی رقم حاصل کرسکتا ہوں اور ایسی پارٹیوں کی تلاش میں ہوں جو انھیں خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہوں۔ پاکستان سے میں پہلے بینکاک اور پھر وہاں سے ریاض آیا تاکہ کسی کو شک نہ پڑسکے۔ بینکاک میں مجھے بتایا گیا کہ سعودی عرب میں مجھے ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو ان رازوں کو خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہوں گے۔ بریدہ میں میرے آنے کا مقصد یہ ہے کہ مجھے سعودی عربیہ میں تلاش نہ کیا جاسکے۔ میں دو روز یہاں مزید قیام کے بعد جدہ جاؤں گا جہاں ایک تجارتی ادارے کے مالک کے متعلق مجھے ٹپ ملی ہے کہ وہ ایسے دستاویزی ثبوت خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہے“ وجے میری داستان بڑے غور سے سن رہا تھا۔ میں نے اپنی کور اسٹوری کو مزید رنگ دیتے ہوئے کہا ”مسٹر وجے! بعض اوقات ایک معمولی انسان کو اتفاقاً ایسے راز ہاتھ لگ جاتے ہیں جن کے حصول کے لیے دوسرے ممالک کی ایجنسیاں مدتوں کوشش کے باوجود ناکام رہتی ہیں۔ اور میری حالت یہ ہے کہ اتنے اہم راز میرے پاس ہیں اور میں خریدار کی تلاش میں بینکاک سے سعودی عرب آ گیا اور ابھی نا معلوم کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا“ میری کور اسٹوری اور پاکستان کے ایٹمی رازوں کا سن کر وجے کے منھ میں پانی بھر آیا اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ اپنا راز میرے آگے کھولے یا نہ کھولے۔ گرم لوہے پر آخری چوٹ لگاتے ہوئے میں نے کہا ”میں تو سابقہ فوجی

ہوں اس لیے سیدھی بات کرتا ہوں۔ مجھے یہ راز بیچنے کے لیے اگر اسرائیل یا بھارت بھی جانا پڑا تو میں چلا جاؤں گا۔ جدہ میں مجھے اس کمپنی کے مالک سے ملنا ہے اگر وہ تیار نہ ہوا تو میں آگے ہی بڑھتا جاؤں گا'' اب وجے کے لیے مزید برداشت کرنا مشکل تھا۔ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وہ بولا ''بہت ممکن ہے میں آپ کو یہیں پر ان رازوں کے خریدار لادوں جو آپ کو بہت معقول معاوضہ دے سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے آپ کو انھیں مطمئن کرنا ہوگا اور اگر سودا طے پا جائے تو مجھے ۱۰ فی صد کمیشن دینا ہوگا'' ''ان رازوں کی اہمیت صرف اسی وقت ہے جب کہ ان کے صحیح ہونے کے ثبوت بھی ہوں۔ اسی لیے میں ثبوت بھی ہمراہ لایا ہوں۔ تمھیں ۱۰ فی صد کمیشن بھی مل جائے گا۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے کہ خریداروں کو اپنے متعلق مجھے پوری تسلی کروانی ہوگی۔ کیوں کہ ایک بار راز جان لینے کے بعد وہ ادائیگی سے انکار بھی کرسکتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ پاکستان کی یا سعودی عرب کی کسی ایجنسی کے ہی لوگ ہوں اور میں ان کے پھندے میں پھنس جاؤں۔'' میں نے وجے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

☆☆

وجے جو پاکستان کے اہم راز پانے کی خوشی میں بے حال ہو رہا تھا کہنے لگا ''یہ میری ذمے داری ہے۔ خریداروں کے متعلق جب آپ کو پورا یقین ہوجائے کہ وہ صحیح لوگ ہیں تب ہی آپ انھیں صرف زبانی بتائیں اور اگر سودا طے پا جائے تو پھر آپ ایک ہاتھ سے راز دیں اور دوسرے ہاتھ سے رقم وصول کریں۔ میں جن سے آپ کو ملواؤں گا وہ اپنے ممالک کی جاسوسی ایجنسیوں کے چوٹی کے ایجنٹ ہیں ایک بار اور آپ کے ساتھ ہی تین اور گیسٹ بھی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ کیا وہ بھی آپ کے ساتھ ہیں؟'' وجے نے ہمارے اسلامی ناموں اور غیر ملکی ہونے کی وجہ سے ہوٹل میں ہمارے انٹری کارڈز پر ہمارے درج کیے ہوئے کوائف جان لیے تھے حالاں کہ یہ جان کاری اس کے فرائض میں شامل نہیں تھی۔ میں نے اس سے اپنے ساتھیوں کے متعلق اپنی لاعلمی ظاہر کرنا بے سود سمجھ کر اسے کہا ''میری ان کے ساتھ پہلی ملاقات بینکاک سے روانگی کے وقت طیارے میں ہوئی تھی۔ یہ بھی سعودی عرب آ رہے تھے ریاض سے ہم نے دو گاڑیاں خریدیں اور اکٹھے بریدہ آ گئے۔ یہ اپنی کمپنی کی پروڈکٹس کی مارکیٹنگ کے لیے سعودی عرب آئے ہیں۔ پروگرام کے مطابق ہم اکٹھے ہی جدہ جائیں گے اور پھر اپنی اپنی راہ لیں گے۔ ہم سفر اور ہم زبان ہونے کے ناتے میں ان سے بہت جلد ہی بے تکلف ہوگیا جیسے کہ تمھارے ساتھ'' وجے تھوڑی دیر اور میرے پاس بیٹھ کر اور اگلے روز شام کو مجھے ملنے کا کہہ کر چلا گیا۔ وجے نے یقیناً میرے ساتھیوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنی تھی اور مجھے یہ بھی خیال تھا کہ وہ میرے ساتھیوں سے بھی کسی بہانے مل کر ان کے سعودی عرب آنے کی وجہ کی ان سے تصدیق کرے گا۔ میں نے مزمل کو ہاؤس ٹیلی فون پر کہا ''مزمل صاحب دو تین روز میں تو ہم نے بچھڑ جانا ہے اس لیے اگر آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے پاس وقت ہو تو آدھے گھنٹے میں کافی شاپ میں آ جائیں۔ ذرا گپ شپ

رہے گی۔ میں نے اس رسمی انداز میں مزمل کو اس لیے فون کیا تھا کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ وجے نے ہوٹل کے فون آپریٹر کو ہماری گفتگو سننے کا ضرور کہا ہوگا۔ مزمل بھی میرے اندازِ تخاطب سے سمجھ گیا کہ کوئی ایسی ہی بات ہوگی۔ اس نے جواب میں کہا اس وقت تو میں آرام کر رہا ہوں اس لیے آدھے گھنٹے بعد نہیں بلکہ ایک گھنٹے بعد میں اور میرے کولیگ کافی شاپ میں آپ سے ملیں گے۔ کافی شاپ میں ملنے پر ہم سب نے آپس کی بے تکلفی کے بجائے رسمی تکلفات سے کام لیا اور کافی پیتے ہوئے میں نے بڑی آہستہ آواز میں انھیں وجے سے ملاقات کی تفصیل بتائی اور انھیں کہا کہ اگر کوئی پوچھے تو اپنی اسی کور اسٹوری پر قائم رہیں جو میں نے ان کے متعلق وجے کو بتائی ہے۔ کوئی گھنٹا بھر کافی شاپ میں بیٹھنے کے بعد ہم نے شہر جانے کا فیصلہ کیا۔ فندق سلیمان شہر کے ایک کونے پر واقع تھا۔ ہم شہر میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ واپسی پر جب کہ اندھیرا ہو رہا تھا ہم نے گھر کے قریب قیصر کو اتار دیا اور کہا کہ گھر میں باقی ساتھیوں کو بتادے کہ سوائے کسی اہم کام کے ہمیں ہوٹل میں نہ تو فون کریں اور نہ ہی ڈائریکٹ رابطہ کریں بلکہ جو بھی کام ہو اورنگ زیب کو فون پر بتادیں تاکہ وہ ہم سے رابطہ کرے۔ ہم امارہ (گورنر کی رہائش گاہ) کا ایک چکر لگا کر گھر کے قریب پہنچے تو قیصر سڑک کے ایک ویران حصے میں کھڑا تھا وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھا اور ہم پھر شہر میں اورنگ زیب کی دکان پر گئے۔ میں نے اسے کہا کہ میں اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ فندق سلیمان میں چند روز کے لیے ٹھہرا ہوں گھر میں مقیم باقی ساتھیوں کو میں نے ہم سے ڈائریکٹ رابطے سے منع کر دیا ہے اور وہ اب تمھارے ذریعے ہم تک اپنے پیغام بھیجیں گے ہوٹل میں تم صرف مزمل یا عمران اور قیصر سے ملنا اور زبانی یا تحریری پیغام دینا اور اگر کوئی ان کے متعلق پوچھے تو یہ کہنا کہ یہ اپنی کمپنی کی الیکٹرانک پروڈکٹس کی مارکیٹنگ کے لیے تم سے ملے ہیں۔ ہم واپس لوٹے تو قیصر نے کہا کہ پہلے ڈائننگ ہال میں کھانا کھا لیا جائے پھر کمروں میں جائیں گے وہ تو ہال میں بیٹھ گئے اور میں چند منٹ کے لیے اپنے کمرے میں آگیا۔ کمرے سے نکلتے وقت میں نے جان بوجھ کر اپنے کمرے کو ہاف لاک کیا تھا۔ اب کمرہ کھولتے وقت میں نے دیکھا کہ میرا کمرہ ڈبل لاک تھا۔ یقیناً ہماری غیر حاضری میں کوئی میرے کمرے میں داخل ہوا تھا اور چوں کہ گاہک کمرے کو ہمیشہ ڈبل لاک کرتے ہیں اس لیے کمرے میں جانے والے سے چوک ہوگئی تھی کہ اس نے کمرہ ڈبل لاک کر دیا میں نے کمرے میں پڑی اشیا کا عمیق نظروں سے جائزہ لیا تو بیڈ کے ساتھ پڑے سائیڈ ٹیبل پر مصنوعی پھولوں کے گلدستے میں ایک بالکل چھوٹا مائیکروفون لگا ہوا تھا (ایف ایم کے یہ مائیکروفون مرکری بیٹری سے چلتے ہیں اور ایک شارٹ رینج ٹرانسمیٹر کا کام دیتے ہیں یعنی کمرے میں جو بھی گفتگو ہو وہ پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلے پر ایف ایم کے ٹیپ ریکارڈ پر سنائی دے سکتی ہے) میرا سوٹ کیس بھی اپنی جگہ سے ذرا ہلا ہوا تھا اس لیے کھولا نہ جاسکا کہ اس میں چائنا لاک لگا ہوا تھا۔ وجے نے میری Surveillance (نگرانی) کا پورا انتظام کرلیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے ایٹمی رازوں کے

خریداروں کا جو ذکر کیا تھا وہ محض لاف زنی نہ تھی جب کہ یقیناً اس کا پاکستان کے خلاف جاسوسی کرنے والوں سے رابطہ تھا۔ میں نے کمرے کا اور اچھی طرح سے جائزہ لیا لیکن مجھے کوئی اور جاسوسی کا آلہ دکھائی نہ دیا۔ میں نے کمرہ بند کیا اور ڈائننگ ہال میں ساتھیوں کے پاس آگیا اور انھیں اپنے کمرے میں خفیہ مائیکروفون کا بتا کر کہا کہ وہ بھی اپنے کمروں میں چھپائے گئے مائیکروفون یا جاسوسی کے دوسرے آلات کو تلاش کریں اور ہاؤس ٹیلی فون پر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے وقت پوری احتیاط سے کام لیں ''میرے اندازے کے مطابق آئندہ دو تین روز کے اندر ہی ہمارا پاکستان کے مخالف جاسوسوں کے گروہ سے واسطہ پڑے گا اس لیے اپنا اسلحہ بالکل تیار حالت میں رکھیں اور دستی بم بھی ہر ایک ساتھی اپنے ساتھ رکھے۔'' یہ ہدایات دیتے ہوئے میں نے عمران اور قیصر کو کہا کہ اگر ضرورت درپیش آئی تو ہم بارودی اسلحے کا استعمال اپنے آخری ہتھیار کے طور پر کریں گے اس لیے آپ دونوں اپنا آہنی مکہ اور رام پوری تیار رکھیں۔ ہمیں زیادہ تر انحصار ان دونوں پر اور اپنی جسمانی طاقت پر ہی کرنا ہوگا خاصی دیر تک ہم ڈائننگ ہال اور پھر کافی شاپ میں بیٹھے رہے۔ اگلی صبح ناشتہ ہم نے کافی شاپ میں ہی کرنا تھا۔ شہر کا واحد ہوٹل ہونے کے باوجود اس میں بہت کم گاہک تھے۔ ہم نے یہ طے کرلیا تھا کہ ہم آئندہ ڈائننگ ہال اور کافی شاپ میں کسی مخصوص ٹیبل پر نہیں بیٹھیں گے بلکہ ہر بار مختلف ٹیبل پر بیٹھیں گے۔ صبح نو بجے ہم تقریباً اکٹھے ہی کافی شاپ میں پہنچے تو ہیڈ ویٹر ہمیں ایک ٹیبل کی طرف لے جانے لگا جس پر ریزروڈ کا کارڈ لگا ہوا تھا۔ عمران نے مسکراتے ہوئے ہیڈ ویٹر کو کہا ہم کھڑکی کے پاس والی ٹیبل پر بیٹھیں گے۔ ہیڈ ویٹر نے ہمیں اس مخصوص ٹیبل پر لے جانے کی اتنی کوشش کی کہ عمران کو مجبوراً اسے ڈانٹ کر کہنا پڑا کہ ہم اپنی پسند کی ٹیبل پر بیٹھیں گے ہر ٹیبل پر درمیان میں گلدان میں مصنوعی پھول سجے ہوئے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ ہمارے لیے مخصوص ٹیبل والے گلدان میں بھی خفیہ مائیکروفون ہوگا۔ اپنی پسند کی ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے کے بعد میں نے ساتھیوں کو کہا کہ لان میں ذرا چہل قدمی کرتے ہیں اور پھر آپ لوگ اپنی کور اسٹوری کے مطابق شہر میں الیکٹرونکس کی دکانوں پر جائیں اور اورنگ زیب کو بھی ملیں جب کہ میں اپنے کمرے میں جاؤں گا۔ لان میں آ کر میرے تینوں ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ ان کے کمروں کے گلدانوں میں خفیہ مائیکروفون چھپائے گئے ہیں۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ شہر کی طرف جاتے ہوئے اور دکانوں میں بھی اس بات کا دھیان رکھیں کہ آپ کی Mobile Surveillance (متحرک نگرانی) تو نہیں ہو رہی اور اگر ایسا ہو تو نگرانی کرنے والوں کی شکل و شباہت کو اپنے ذہنوں میں بٹھالیں لیکن نگرانی کرنے والوں کو یہ احساس ہرگز ہونے نہ پائے کہ آپ کو نگرانی کا پتا ہو چکا ہے۔ لان سے ہی ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے۔ قیصر، عمران اور مزمل گاڑی میں شہر چلے گئے جب کہ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرے کمرے میں جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی وجے کا فون آیا وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں بلالیا۔ وجے اپنے چہرے کی جھلاہٹ چھپانے میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ تھوڑی سی

رسمی گفتگو کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں شام کو خریداروں سے ملاقات کے لیے تیار ہوں۔ میرا اثبات میں مختصر جواب سن کر وہ بولا ''کیا تمام دستاویزی ثبوت آپ کے پاس یہاں موجود ہیں؟'' ''مسٹر وجے!'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''ہم فوجی سیدھے ضرور ہوتے ہیں لیکن بے وقوف نہیں۔ تمھارے خیال میں اتنے قیمتی اور انتہائی خفیہ کاغذات میں اپنے سوٹ کیس یا پینٹ کی جیب میں رکھ کر پھرتا ہوں۔ مسٹر وجے! وہ کاغذات اور خفیہ ایٹمی تعمیرات کے بلیو پرنٹ میں نے بریدہ پہنچ کر پہلے بینک کے لاکر میں رکھوائے اور پھر ہوٹل میں کمرہ لیا۔ آج شام کو خریداروں کے ساتھ تو صرف ابتدائی بات چیت ہوگی اور سودے طے پا جانے کی صورت میں بینک اوقات میں بینک کے اندر ہی انھیں کاغذات دوں گا اور وہیں ان سے رقم وصول کروں گا'' وجے جو شاید سمجھتا تھا کہ میں نے یہ کاغذات اپنے سوٹ کیس میں رکھے ہوں گے میری بات سن کر وہ کچھ مایوس سا دکھائی دینے لگا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا ''آپ کے خیال میں ان کاغذات کا معاوضہ کیا ہونا چاہیے'' ''تم بمبئی، دہلی، کلکتہ اور مدراس اور تل ابیب اور حیفہ کی تعمیرات اور وہاں کے رہائشیوں کی زندگیوں کی قیمت لگالو پھر تمھیں احساس ہوگا کہ میرا مطالبہ یعنی ۱۵ کروڑ ڈالر بہت ہی کم ہے (ان دنوں امریکن ڈالر اوپن مارکیٹ میں ۱۴ پاکستانی روپوں کے برابر تھا) میرا مطالبہ سن کر وجے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''وجے کمار! تم تو محض ایجنٹ ہو خریداروں کو ان ڈاکومینٹس کی اصل قیمت کا بخوبی علم ہوگا۔ ہاں اگر ان کے خیال میں میرے مطالبے سے کم رقم ہے تو انھیں بتادو کہ مجھ سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں اتنے اہم کاغذات جن میں اسلامی بم کی تیاری کے سارے مراحل نہ صرف تفصیلاً درج ہیں بلکہ یورینیم ۲۳۸ کے Enrichment (افزودگی) کا فارمولا بھی ہے جو ڈاکٹر قدیر خان سے حاصل کرنے کے لیے اسلامی ممالک اربوں ڈالر دینے کو تیار تھے کیا میں ریوڑیوں کے بھاؤ بیچ دوں گا؟'' وجے مجھے اکھڑتے دیکھ کر فوراً بولا ''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں میرے خریدار بڑی سے بڑی رقم دینے کے اہل ہیں انھیں صرف یہ قائل کرنا ہوگا کہ آپ کے پاس اتنے قیمتی کاغذات ہیں'' ''اور انھیں مجھے یہ یقین دلانا ہوگا کہ وہ واقعی اتنی بڑی رقم دینے کے اہل بھی ہیں یا نہیں مسٹر وجے اس قسم کے سودے باہمی اعتماد پر ہی طے پاتے ہیں۔ میں نہ تو انھیں جانچ پڑتال کے لیے کاغذات دوں گا اور نہ ہی وہ ۱۵ کروڑ ڈالروں سے بھرے سوٹ کیس مجھے یہ دکھانے کے لیے لائیں گے کہ وہ واقعی اتنی رقم ادا کرسکتے ہیں۔ مسٹر وجے تم اے سی انجینئر ہو اور تمھاری سوچ صرف اے سی پلانٹس تک ہی محدود ہے تمھاری پارٹی جب مجھے ملے گی تو باقی ساری باتیں خود بخود طے ہوجائیں گی۔ تم صرف دونوں پارٹیوں کو ملاؤ اور اپنے کمیشن سے غرض رکھو جو ڈیڑھ کروڑ ڈالر بنتا ہے۔'' وجے نے بھی اپنے کمیشن کا حساب لگایا ہوگا لیکن میرے منھ سے اتنی بڑی رقم کا سن کر اس پر غشی سی طاری ہونے لگی وہ کچھ کہنا چاہتا تھا میں نے اسے ٹوک کر کہا ''دوسری بات یہ کہ میرے اور میرے دوستوں کے کمروں میں گلدانوں میں

چھپائے گئے مائیکروفون ہم نے دیکھ لیے ہیں صبح کافی شاپ میں بھی ہمارے لیے مخصوص ٹیبل پر بھی گلدان میں مائیکروفون رکھا ہوا تھا یہ بچکانہ باتیں چھوڑ دو۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ جو اتنے بڑے سودے کرتے ہیں وہ اتنی معمولی باتوں سے بھی بے خبر ہوتے ہیں'' میری بات سن کر وجے کا رنگ فق ہوگیا اس نے میری بات کی کوئی تردید نہیں کی اور خاموشی سے گردن جھکالی اس نے اپنے ہتھیار پھینک دیے تھے اور میری ٹریننگ کے مطابق یہ میری خاصی بڑی کامیابی تھی کہ میں نے محض باتوں سے وجے کی Resistance Power (قوتِ مداخلت) کو ختم کردیا تھا۔

☆☆

شام کے تقریباً سات بجے تھے جب میرے کمرے میں وجے کمار کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ خریدار آچکے ہیں اور کافی شاپ کے ایک کونے کی میز پر میرا انتظار کررہے ہیں۔ میں نے مزمل، عمران اور قیصر کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں جب بھی ان کے دروازوں پر ایک مخصوص قسم کی دستک دوں تو وہ ہوٹل کی لابی، ریسٹورنٹ اور کافی شاپ میں مجھے دیکھتے ہوئے لان میں ٹہلنے چلے جائیں بلکہ مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دیں اور میں جہاں بیٹھا ہوں وہاں سے اتنے قریب رہیں کہ میرے بلانے پر فوراً آجائیں اور مسلح حالت میں رہیں۔ میں وجے کے فون کے ۱۵ منٹ بعد ساتھیوں کے دروازوں پر دستک دیتا ہوا کافی شاپ میں چلا گیا۔ وجے کافی شاپ میں داخلے کی جگہ پر کھڑا تھا اور کونے کی میز پر تین افراد جو شکل سے بھارتی لگتے تھے، بیٹھے ہوئے تھے۔ وجے نے میرے ساتھ ان کی طرف بڑھتے ہوئے سرگوشی میں کہا ''یہ تینوں آپ کے ڈاکومنٹس کو خریدنے کے فائنل اتھارٹی رکھتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھ کر اور تعارف کرا کے چلا جاؤں گا۔ ساری ڈیل (Deal) آپ نے ان کے ساتھ (Final Alise) (مکمل) کرنی ہے'' ہم اس ٹیبل کے قریب پہنچے تو تینوں خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔ وجے نے میرا اور ان کا صرف یہ تعارف کروایا ''ان کے پاس وہ ڈاکومنٹس ہیں جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا اور یہ تینوں صاحبان ان کو خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں'' انھوں نے نہ تو مجھ سے ہاتھ ملایا اور نہ ہی نام پوچھا۔ صرف مسکراہٹوں کے تبادلے کے بعد میں اور وجے خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وجے نے ویٹر کو کافی لانے کا آرڈر دیا اور تھوڑی دیر بعد معذرت کر کے اٹھ گیا۔ وہ تینوں مجھے اور میں انھیں آنکھوں ہی آنکھوں میں تول رہے تھے۔ معمولی کپڑے کی قمیص اور پتلونیں پہنے یہ تینوں اپنی نشست اور حلیے سے مجھے نہ تو بھارتی فوج کے افسران دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی ان کے چہروں پر اتنی بڑی رقم کے ڈاکومنٹس کے خریدار ہونے کی کوئی جھلک دکھائی دیتی تھی سول لباس میں ملبوس کسی مرد کی حیثیت اور شخصیت کو پرکھنے کے لیے میں ہمیشہ اس کے جوتوں کو دیکھتا ہوں۔ لباس چاہے کتنا ہی میلا یا معمولی ہو، ایک صاحب ذوق وحیثیت کے جوتے ہمیشہ صاف اور اعلیٰ کوالٹی کے ہوتے ہیں۔ ان سب کے جوتوں پر مٹی کی خاصی بڑی تہہ چڑھی تھی اور جوتے بھی ادنیٰ کوالٹی کے تھے۔ صرف ایک نے سیکو ۵

گھڑی پہنی ہوئی تھی جب کہ دوسرے دو نے اس سے بھی معمولی گھڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ میں ان کی ایک ایک بات نوٹ کررہا تھا تاکہ انھیں Assess (پرکھ) سکوں۔ ایک کی قمیص سے اس کی میلی بنیان جھانک رہی تھی۔ انھوں نے سگریٹوں کے ۵۵۵ کے ڈبے تھام رکھے تھے لیکن لائٹر وہ تھے جو آج کل پاکستان میں دس روپے کا ملتا ہے۔ کافی آئی تو ان میں سے ایک نے میرے اور اپنے پیالوں میں کافی انڈیلی۔ کافی اور دودھ سے پیالے لبالب بھرنے اور چمچ سے چینی ملانے کے انداز سے بھی ان کی پست حیثیت کا مجھے بخوبی احساس ہوگیا۔ کافی پیتے ہوئے بالآخر میں نے ہی انھیں مخاطب کیا اور نپی تلی انگریزی میں ان سے پوچھا ''کیا مسٹر وجے نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میرے پاس کس قدر اہمیت کے ڈاکومنٹس ہیں اور میں نے ان کی کیا قیمت طلب کی ہے؟'' میرے سوال کے جواب میں وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے میرے سوال کا جواب دینے کے لیے دوسرے کو کہہ رہے ہوں۔ چند لمحوں تک جب مجھے اپنے سوال کا جواب نہ ملا تو میں نے مزید ثقیل انگریزی میں اپنا سوال دہرایا شاید وہ میرے سوال کو سمجھ نہ سکے تھے۔ ان میں سے ایک نے بالکل ٹوٹی پھوٹی اور خالص بھارتی لہجے میں انگریزی میں جواب دیا ''ہم آپ کی قیمت دینے کو تیار ہیں لیکن ہمیں پہلے کاغذات دیکھنے ہیں'' میں ان کی اصلیت سمجھ چکا تھا اس لیے مسکراتے ہوئے میں نے کہا ''کیا آپ میں سے کوئی نیوکلیئر انرجی کا سائنس دان بھی ہے جو یورینیم ۲۳۸ کو Enrich (افروزہ) کرنے کے پیچیدہ فارمولے کو سمجھ سکے۔ اگر آپ صرف میری زبانی کہنے کو ہی کافی سمجھتے ہیں تو مجھے یہ بتایئے کہ آپ رقم کی ادائیگی کن بینکوں کے ذریعے کریں گے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آپ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی ریاض بینک یا بینک الاہلی کے ذریعے تو نہیں کریں گے'' اب وہ فی الحقیقت گھبرا گئے۔ بڑی مشکل سے اسی آدمی نے جواب دیا ''ہم جلدی میں چلے آئے تھے اس لیے ادائیگی کے ذریعے کا فیصلہ نہ کرسکے۔ وجے کے ذریعے ہم ایک آدھ دن میں آپ سے دوبارہ رابطہ کریں گے'' یہ جواب اس نے بجائے اپنی گھٹیا انگریزی کے ہندی میں دیا۔ وہ اتنے گھبرائے ہوئے تھے کہ کافی ختم کیے بغیر ہی گھبرا کر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی شخص نے مجھ سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا ''جب ہمارا آپس میں تعارف ہی نہیں ہے تو ہاتھ ملانے کا کیا فائدہ اور ہاں آئندہ جب بھی کسی سے بڑا سودا کرنا ہو تو کم از کم صاف بنیان پہن لیا کریں اور امریکن سگریٹوں کے ساتھ ایک ریال والا لائٹر بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ تینوں اتنے نروس ہورہے تھے کہ میری بات سنی ان سنی کر کے کافی شاپ سے چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے ہی ہوٹل سے باہر نکلا وہ تینوں ایک کھڑکھڑا ٹیوٹا کرولا میں جس کی اس حالت میں زیادہ سے زیادہ قیمت ۲۰ ہزار ریال ہوگی، بیٹھ کر چلے گئے۔ میں کافی شاپ میں واپس آیا تو وجے جو لابی میں کھڑا انھیں دیکھ رہا تھا، میری ٹیبل پر آیا اور مجھے پوچھنے لگا کہ کیا بات ہوئی ''سودا طے ہوگیا ہے اور وہ ۱۵ کروڑ ڈالر ایک گھنٹے کے اندر لانے کے لیے چلے گئے ہیں'' میں نے ہنستے ہوئے

جواب دیا۔ وجے جھینپتے ہوئے میری طرف دیکھے جا رہا تھا میں نے اس کی اس حالت سے لطف اٹھانے کے لیے ”مسٹر وجے ۱۵ کروڑ ڈالر کی خریداری کرنے والوں کو کم از کم لائٹر تو اچھی کوالٹی کے لے کر دینے تھے اور یہ بھی کہنا تھا کہ اپنے جوتوں پر پالش تو کرلیں۔ انھیں نیوکلیئر سائنس کی الف ب بھی نہیں آتی اور خریدنے چلے آئے نیوکلیئر انرجی کا فارمولا اس حیثیت کے لوگوں کو تو کسی اچھے اسٹور میں بھی گھسنے نہیں دیا جاتا اور تم نے انھیں بلالیا ۴ اسٹار فندق سلیمان میں۔ انھیں تو مہذبانہ طور پر کافی پینی بھی نہیں آتی۔ کافی شاپ ایئرکنڈیشنڈ ہونے کے باوجود وجے کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی میں اسے ایسی حالت میں چھوڑ کر باہر آیا تو مزمل اکیلا لان میں ٹہل رہا تھا اس نے بتایا کہ انھوں نے مجھے کافی شاپ میں ان تینوں کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ جب وہ واپس جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھے تو عمران اور قیصر اپنی گاڑی میں ان کے پیچھے چلے گئے۔ میں اور مزمل پھر کافی شاپ میں آ کر بیٹھ گئے اور میں نے وجے کے خریداروں کے متعلق بتایا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد قیصر اور عمران واپس آگئے اور انھوں نے بتایا کہ وہ تینوں ان کے تعاقب سے بے خبر جامع مسجد کے پاس منڈی میں ایک نائیلون کے فرنیچر اور رسیوں کی دکان کے سامنے اپنی گاڑی کھڑی کر کے اس دکان اور ساتھ کی دو دکانوں میں چلے گئے۔ ہم تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد نائیلون کی دکان پر گئے تو ان میں سے ایک آدمی نے جو غالباً دکان کا سیلز مین تھا، ہم سے پوچھا کہ کیا چاہیے۔ ہمیں اس نے مختلف قسم کی رسیاں دکھائیں اور ہم نے مجبوراً ۵۰ میٹر رسی خرید لی۔ ہم وجے کی اس بچکانہ حرکت پر خاصی دیر تک ہنستے رہے کہ سودے کے لیے اس نے کن لوگوں کا انتخاب کیا تھا۔ میں ساتھیوں کے ساتھ ہنسی میں تو شریک تھا لیکن میرے دماغ سے یہ بات نہیں نکلتی تھی کہ وجے نے ہمارے کمروں میں FM مائیکروفون کیوں چھپائے تھے۔ میرا دل بار بار یہ کہتا کہ وجے کا بھارتی ایجنسیوں سے یقینی واسطہ تھا ورنہ FM مائیکروفون جن کا سعودی عرب میں لانا سخت ممنوع تھا، وجے کے پاس کہاں سے آئے۔ ان دنوں ایسے چھوٹے مائیکروفون جو ٹرانسمیٹر کا کام بھی دیتے تھے کم از کم ۵ سو درہم میں دبئی سے ملتے ہوں گے۔ رات کو ۱۲ بجے کے قریب جب میں شب خوابی کا لباس پہن چکا تھا، وجے کا فون آیا، وہ مجھ سے فوری طور پر ملنا چاہتا تھا۔ میں نے پہلے تو اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن اس کا اصرار بڑھتا گیا۔ میں نے بالآخر اسے اپنے کمرے میں بلوالیا۔ وجے نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا کہ جو کچھ آج شام ہوا، اس کے لیے وہ بے حد شرمندہ ہے۔ دراصل بھارتی ایجنسی کا سعودی عرب کا انچارج جدہ میں رہتا ہے۔ میں نے جب فون پر اسے آپ کے متعلق بتایا تو اسے یقین نہیں آیا اور اس نے مجھے کہا کہ میں پہلے یہ تسلی کرلوں کہ آپ کے پاس واقعی یہ ڈاکومنٹس ہیں بھی یا نہیں۔ مجھے اور کچھ نہیں سوجھا تو میں یہاں پر رہنے والے تین بھارتیوں کو گاہک بنا کر آپ سے ملانے لے آیا۔ وہ تینوں معمولی Calibre (قابلیت) کے یہاں کی دکانوں پر سیلز مین ہیں۔ ان کے بالکل ناکام واپس جانے پر میں نے جدہ کے انچارج ایجنٹ کو ساری صورتِ حال فون پر بتائی۔

جانباز۔ ۲

اب کل بعد دوپہر کی فلائٹ پر وہ آپ سے ملنے خود آرہا ہے۔ جو کچھ ہوا، میں اس کی معافی چاہتا ہوں لیکن کل جب آپ اس سے ملیں گے تو آپ کو یقین آجائے گا کہ میں نے ساری بات ہی غلط نہیں بتائی تھی۔ اگر آپ چاہیں تو کل بعد دوپہر کی فلائٹ سے اس کی آمد کی تصدیق کے لیے خود ایئرپورٹ پر جاسکتے ہیں“ میں نے وجے کی ساری بات سن کر کہا ”یہ تمھارے لیے آخری موقع ہے کہ ہمارا سودا کروا دو اور کمیشن کی رقم سے اپنا مستقبل بنالو“ وجے نے کہا کہ کل بعد دوپہر کی ڈھائی بجے کی فلائٹ پر ایجنٹ کو بے وہ ایئرپورٹ پر جائے گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اپنے دوستوں کے ہمراہ ایئرپورٹ پر پہنچ جاؤں گا اور خود دیکھوں گا کہ تمھاری بات میں کتنی سچائی ہے۔ اگلے روز بعد دوپہر دو بجے میں اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ القصیم ایئرپورٹ پر جو بریدہ شہر سے ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، پہنچ گیا۔ ایئرپورٹ پر کئی پاکستانی دل افکو کے اور اپنے مختلف کاموں میں مصروف تھے میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ایئرپورٹ کا سائٹ منیجر اور تقریباً اسی فی صد اسٹاف پاکستانی ہے، وہیں پر مجھے بھٹی نام کا اے سی انجینئر بھی ملا جس نے بریدہ میں ہمارے مشن میں ہماری خاصی معاونت کی۔ فلائٹ آنے پر وجے نے ارائیول لاؤنج (Arrival Lounge) کے باہر ایک سوٹ پہنے اور سیاہ عینک لگائے شخص کا استقبال کیا۔ وجے نے اس سے کوئی بات کی تو اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ میں اس سے کافی فاصلے پر کھڑا تھا۔ اپنا سوٹ کیس لے کر وہ وجے کے ہمراہ کار پارکنگ میں آیا اور وجے کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وجے گاڑی لے کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوا اور تھوڑی دیر بعد ہم بھی اپنی گاڑیوں میں ہوٹل کی طرف ہوئے۔ اس شخص کی صورت اور چال ڈھال سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ یہ جو کوئی بھی ہے اس میں کمال درجے کی خود اعتمادی ہے۔ ہوٹل میں شام چھ بجے وجے نے مجھے فون کر کے کہا باس (Boss) نے صرف آپ کو آج رات ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانے کی دعوت دی ہے ”تمھارے باس کا نام کیا ہے؟“ میرے پوچھنے پر وجے نے کہا ”نام باس سے ہی پوچھ لیجیے گا باس وقت کے بہت پابند ہیں۔ اس لیے آپ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ڈائننگ ہال میں پہنچ جائیں“ وجے کو یہ ہدایات یقیناً اس کے باس نے دی ہوں گی۔ وہ مجھے ان باتوں سے متاثر کرنا چاہتا تھا۔ میں بھی... کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ بجائے ساڑھے آٹھ بجے میں ۸ بج کر ۵۰ منٹ میں ہال میں پہنچا وجے اس دوران مجھے دو مرتبہ فون کر کے وقت کی پابندی کے متعلق یاد دہانی کروا چکا تھا۔ میں آٹھ پچاس پر ٹہلتا ہوا ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ وجے جو دروازے میں کھڑا بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا، مجھے لے کر اس ٹیبل کی طرف بڑھا جہاں اس کا باس بیٹھا تھا۔ میں ٹیبل کے قریب پہنچا تو باس نے گھڑی دیکھ کر وجے کو ڈانٹتے ہوئے کہا ”میں نے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے کھانے کا وقت بتایا تھا جانتے ہو اب کیا وقت ہے“ وجے کے بجائے میں نے جواب دیا کیوں کہ بالواسطہ مجھے ہی مخاطب کیا گیا تھا میں نے بھی وجے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”میں اپنی مرضی کے وقت کے مطابق کھانا کھاتا یا کسی سے ملتا ہوں اگر میرے ٹائمنگ پر کسی کو

اعتراض ہے تو واپس جاتا ہوں‘‘ یہ کہہ کر میں واپس جانے کے لیے پلٹا تو مجھے آواز سنائی دی ’’مسٹر آصف! آجائیے۔ ہم یہاں لڑنے نہیں بلکہ ایک سودا کرنے آئے ہیں میں حیران تھا کہ اس شخص کو میرے کھٹمنڈو میں قیام کے دوران میرے کور نام (Cover Name) کا کیوں کر پتا چلا۔ سعودی عرب میں بھی میں ایک مختلف نام سے آیا تھا اور یہی نام میرے پاسپورٹ پر بھی درج تھا میں میز کی طرف بڑھا تو باس نے کھڑے ہوکر میرا خیرمقدم کیا اور اپنے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

☆☆

میں اس ایجنٹ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس کی شکل ہرگز جانی پہچانی معلوم نہیں ہورہی تھی۔ میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جارہا تھا۔ میری اس کیفیت کو بھانپتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے اپنی گہری نیلے شیشوں والی عینک اتاری اور بولا ’’مسٹر آصف! بے شک اپنے ذہن پر پورا بوجھ ڈال دیں لیکن آپ مجھے پہچان نہیں سکیں گے کیوں کہ آپ مجھے آج سے پہلے کبھی نہیں ملے۔ لیکن میں آپ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب آپ کو DMI نے حراست میں لیا تھا۔ اس کے بعد آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی مجھے خبر ہے۔ کھٹمنڈو میں جو کچھ آپ نے کیا اور پھر پاکستان جاکر کچھ عرصے بعد تھائی لینڈ، برما اور بھارت میں آسام اور بنگلہ دیش میں کھلنا اور پھر بھارت میں بمبئی، کلکتہ اور شانتی پور میں آپ کی تمام کارروائیوں کی تفصیل میرے پاس ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ نے بھارت کو کیا نقصان پہنچایا اور کتنے افراد کو ہلاک کیا۔ جن کی یہ ذمہ داری تھی کہ آپ پر وہاں ہاتھ ڈالتے جب وہ ہی اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکام ہوگئے تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ آپ کے ماضی کو ٹٹولوں۔ میں تو بالکل صاف ذہن کے ساتھ آپ سے اس لیے ملنے آیا ہوں کہ جو کچھ آپ فروخت کرنا چاہتے ہیں اس کی ویلیو لگاؤں اور یہ دیکھوں آیا ہمیں اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ جیسے آصف آپ کا اصلی نام نہیں ہے ویسے ہی آپ ترپاٹھی کہہ کر مجھے مخاطب کرسکتے ہیں‘‘ میں نے ترپاٹھی کو جواب میں کہا ’’جب آپ میرے متعلق اتنا کچھ جانتے ہیں تو آپ کو یہ بھی علم ہوگا کہ میں صرف اپنی شرائط پر کام کرتا ہوں۔ میں نے وجے کو بھی بتا دیا تھا کہ میں زبانی تو بتا سکتا ہوں کہ میرے پاس کتنی اہمیت کے ڈاکومنٹس ہیں اور ان کی سمری بھی دے سکتا ہوں لیکن سودے سے پہلے اصلی کاغذات کسی صورت میں بھی خریدار کے حوالے نہیں کروں گا‘‘ ’’آپ کی بات بہت معقول ہے‘‘ ترپاٹھی نے جواب دیتے ہوئے کہا ’’لیکن آپ کو میرے چند معمولی سوالوں کے جواب دینے ہوں گے۔ آپ اتنے محبّ وطن ہیں کہ اگر آپ جیسے لوگ ہمارے ملک میں ہوتے تو لوگ ان کے بت بنا کر ان کی پوجا کرتے اور انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ آپ کا یکایک اپنے ملکی مفاد کا سودا کرنے کا فیصلہ سمجھ میں نہیں آتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اتنی اہم نوعیت کے کاغذات نیوکلیئر اِن رچمنٹ کا فارمولا آپ کے ہاتھ کیسے لگا اور آخری سوال یہ ہے کہ آپ اس سودے کے بعد پاکستان جا کر تو رہ نہیں سکیں گے اس لیے آپ نے مستقبل کہاں

گزارنے کا سوچا ہے۔‘‘ ’’مسٹر ترپاٹھی! میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں محبّ وطن نہیں ہوں۔ یہ ڈاکومنٹس جن کے پاس تھے وہ انھیں فروخت کرنا چاہتے تھے۔ میں نے تو صرف یہ کیا ہے کہ انھیں ختم کرکے یہ ڈاکومنٹس خود حاصل کرلیے۔ اب میرے پاس انھیں فروخت کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ میری اس بات پر کون یقین کرے گا کہ ڈاکٹر قدیر خان کے فارمولے جو انتہائی سیکورٹی میں رکھے ہوئے تھے، چوری ہوچکے ہیں اور چور انھیں فروخت کرنا چاہتے تھے آپ کے تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے یہ یقین ہے کہ ان ڈاکومنٹس کے خریدار اس سودے کو خفیہ رکھیں گے کیوں کہ یہی ان کے مفاد میں ہے۔ اس لیے میرا پاکستان جانا خطرناک نہیں ہوگا۔ لیکن میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ اتنی دولت کو محض بینکوں کی زینت نہیں بناؤں گا بلکہ اس سے اپنی تمام دنیاوی خواہشات پوری کروں گا۔ پاکستان میں میری مالی حالت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں اس لیے وہاں میں اس دولت کا پورا لطف نہ اٹھا سکوں گا اس لیے میں کسی مغربی ملک میں قیام کرنا بہتر سمجھوں گا‘‘ میں نے ترپاٹھی کے سوالوں کے جواب میں کہا۔ ترپاٹھی میرے بولے ہوئے ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا تھا جیسے ان کی سچائی کو پرکھ رہا ہو۔ ادھر میں نے بغیر کسی تیاری کے ایٹمی فارمولے کی سمری دینے کا کہہ کر خود کو مشکل میں گرفتار کرلیا تھا کیوں کہ میرے پاس ایسے کوئی کاغذات نہ تھے۔ میں تو پاکستان کے خلاف جاسوسی کرنے والوں اور پاکستانی مفاد کو نقصان پہنچانے والوں سے دو دو ہاتھ کرنے آیا تھا اور صرف ان تک پہنچنے کے لیے پاکستانی ایٹمی فارمولے کا چارہ ڈالا تھا۔ ترپاٹھی کو دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی تو نہ تھا سوائے گولیوں کے۔ میری مشکل کو ترپاٹھی نے خود حل کردیا وہ کہنے لگا ’’مسٹر آصف! ہم بھارتی نیوکلیئر سائنس میں پاکستان سے بہت آگے ہیں اور سن ۷۴ء میں ایٹمی دھماکا بھی کرچکے ہیں۔ ہمیں اپنے لیے تو اس فارمولے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ہمارے دوست ملک اسرائیل کو ہے کیوں کہ وہ تو ایٹم بم بھی بناچکے ہیں۔ اس فارمولے میں ہماری دلچسپی محض اس حد تک ہے کہ ہم جان سکیں کہ پاکستان جوہری طاقت بننے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اگر آپ ہمیں فارمولا دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی سودا کرلیں کہ کہوٹہ کے زیرتعمیر پلانٹ کو تباہ بھی کردیں گے تو ہم آپ کے مطالبے سے دگنی رقم بھی آپ کو دینے کے لیے تیار ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے لیے یہ کام مشکل نہیں۔ آپ نے ہماری ٹاپ سیکورٹی والا گورکھ پور کا ہوائی اڈہ بھی تو تباہ کیا تھا‘‘ جس طرح کی باتیں ترپاٹھی میرے ساتھ کررہا تھا۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ ٹیبل پر پڑے چاقو سے ہی اس کی کھال اس کے جسم سے علیحدہ کردوں لیکن پاکستان دشمن اس پورے گروہ کا قلع قمع کرنے کی خواہش میں خود پر ضبط کیے بیٹھا رہا۔ ترپاٹھی نے کہا ’’مسٹر آصف! میں جدہ سے اپنے تین معاونوں کو ابھی فون کرکے بلواتا ہوں۔ وہ کل بعد دوپہر تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ یہاں قریب ہی ایک قصبے میں ایک مصرف رہتا ہے جو نیوکلیئر انرجی کے متعلق خاصی جانکاری رکھتا ہے اس کے اسرائیل کی موساد سے بھی گہرے رابطے ہیں اور وہی اسرائیل کے چیف ایجنٹ کو اس سودے

کے متعلق اپنی رائے دے گا۔ اگر یہ سودا ہماری حکومتوں کو منظور ہوا تو آپ کو ادائیگی دبئی میں کی جائے گی۔ اس کے لیے بھی ہمیں وقت چاہیے۔ میرے خیال میں ایک ہفتے میں یہ تمام معاملات طے ہوسکیں گے۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ کہوٹہ پلانٹ کو تباہ کرنے کے لیُے کیا آپ تیار ہیں۔ اگر آپ کو یہ منظور ہوا تو تمام ضروری دھماکا خیز مادہ آپ کو ہمارا اسلام آباد کا ہائی کمیشن مہیا کرے گا اور اس کام کی نصف ادائیگی پیشگی اور نصف کام کے بعد کی جائے گی‘‘ ’’کام کے بعد کون ادائیگی کرتا ہے‘‘ میں نے زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو ترپاٹھی بولا ’’نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ کام کرکے تو دیکھیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ آپ کے کتنے ہم وطن سیاست دان، بیورو کریٹس اور صنعت کار ہمارے لیے کام کررہے ہیں اور ہماری اور اسرائیل کی ایجنسیاں، انھیں کتنا زیادہ معاوضہ دے رہی ہیں ہم تو آپ جیسے نڈر اور حوصلہ مند افراد کی جو اپنے ملک سے مایوس ہوچکے ہیں، بے حد قدر کرتے ہیں‘‘ ادھر میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ کیا میں اپنے وطن سے مایوس ہوچکا ہوں تو دل سے آواز آئی ’’ہرگز نہیں۔ بے شک ہمارے وطن میں غداروں کی کمی نہیں لیکن ایسے بھی بے شمار پاکستانی ابھی الحمدللہ زندہ ہیں جو اپنے خون کے دریا اور جسموں کے پہاڑ بنا کر دشمن کے ارادوں کو خاک میں ملا دینے کو تیار ہیں۔ سچے دل سے ایک بار پکار کر دیکھو تو سہی۔ جاں بازوں اور جاں فروشوں کی اتنی بڑی تعداد سامنے آجائے گی جنھیں شمار کرنا بھی ناممکن ہوگا‘‘ ترپاٹھی کے ساتھ کھانا کھا کر اور اگلی رات ۹ بجے یہیں ملنے کا کہہ کر میں اس سے رخصت ہوا۔ مجھے سب سے زیادہ اس مشکل نے آن گھیرا تھا کہ نیوکلیئر انرجی کے فارمولے کی سمری کہاں سے لاؤں۔ ترپاٹھی کے پاس سے اٹھ کر میں سیدھا قیصر کے کمرے میں گیا اور اسے کہا کہ مزمل اور عمران کو لے کر لان میں آجائے۔ وجے نے اگرچہ خفیہ مائیکروفون ہاؤس کیپنگ والوں کے ساتھ آکر ہمارے کمروں سے نکال لیے تھے لیکن بھارتی ہندوؤں کا کیا بھروسا۔ وہ ہمیشہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ لان میں ٹہلتے ہوئے میں نے انھیں ترپاٹھی سے ہونے والی گفتگو اور اپنا مسئلہ بتایا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔ ہمارا ان بھارتی اور موساد کے ایجنٹوں سے ملنے کا مقصد نہ تو ان سے کوئی سودا کرنا تھا اور نہ ہی پیسے لینا۔ ہم تو ان کے نیٹ ورک کو توڑنا اور انھیں جہنم واصل کرنا چاہتے تھے۔ سوچتے سوچتے مجھے ایک خیال آیا۔ نیوکلیئر انرجی اور یورینیم کی اِن رچمنٹ کا فارمولا یقیناً عام تحریر کی طرح تو لکھا نہیں ہونا چاہیے تاکہ جس کے بھی ہاتھ لگے وہ سارا فارمولا جان لے۔ اسے لازماً کوڈ الفاظ اور ہندسوں میں الجبرے کی طرح لکھا ہونا چاہیے۔ میں نے ساتھیوں سے یہ بات کہی تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ مزمل کہنے لگا ’’اگر واقعی ہمارے پاس کوئی ایسا فارمولا ہوتا اور ہم اسے کسی کو فروخت کرنا چاہتے تو سیدھے سادے طریقے سے لکھا فارمولا کسی کو بھی قابل قبول نہ ہوتا۔ سب اسے جعلی سمجھتے۔ میری تجویز کو سب نے سراہا اور رات کو جب میں اپنے کمرے میں گیا تو اپنے ساتھیوں کی مدد سے انگریزی کے اوٹ پٹانگ لفظوں سے دو صفحات کی ایک تحریر اور دو

صفحوں پر الجبرے کی طرز پر مختلف ہندسوں اور جمع، تفریق، ضرب اور چھوٹی بڑی بریکٹوں پر مشتمل ’’نیوکلیئر اِن رچمنٹ‘‘ کا فارمولا میرے ہاتھوں میں تھا۔ اگلی صبح میں نے ہوٹل انتظامیہ کے دفتر سے ان چاروں کاغذوں کی دو دو فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنوالیں اور پھر میں شہر میں ریاض بینک میں گیا اور ۵ ہزار ڈالر کے ٹریولر چیک کیش کروائے۔ میرے تینوں ساتھی دوسری گاڑی میں بینک کے باہر میرے انتظار میں اور میری نگرانی کے لیے کسی آنے والے سے مجھے آگاہ کرنے کے لیے موجود تھے۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر بینک سے فارغ ہوکر میں باہر آگیا۔ بینک کے باہر ایک گاڑی میں دو غیر سعودی افراد بیٹھے تھے۔ عمران نے بتایا کہ وہ ہمارے پیچھے ہی یہاں آئے تھے اور اب تک گاڑی میں ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ ہم اکٹھے ہی دونوں گاڑیوں میں چلتے ہیں۔ راستے میں، میں ہوٹل کی سڑک پر چلا جاؤں گا۔ یہ پیچھا کرنے والے یقیناً میرے پیچھے ہی آئیں گے اس لیے وہ گھر کی طرف چلے جائیں اور گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کرکے گھر میں جائیں اور گروپ کے باقی افراد سے ملیں اور JCO اور ماہا کو کہیں کہ وہ اسٹینڈ بائی رہیں۔ شاید آج یا کل ان کی ضرورت پڑ جائے۔ میں اپنی گاڑی لے کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ میرے پیچھے ساتھیوں کی گاڑی اور ان کے پیچھے ہماری نگرانی اور جاسوسی کرنے والوں کی گاڑی تھی۔ کراسنگ کے بعد میں نے اپنی گاڑی پہلے ہوٹل والی سڑک پر ڈالی اور پھر دو کلومیٹر کے سفر کے بعد یوٹرن لے کر شہر کی طرف ہولیا۔ میرے ساتھی کراسنگ سے ہی گھر کی طرف چلے گئے تھے۔ میرے یوٹرن کرنے پر نگرانی کرنے والوں کو بڑی مشکل آن پڑی۔ اگر وہ بھی یوٹرن لیتے تو اپنی سمجھ کے مطابق وہ میری نظروں میں آجاتے لہٰذا وہ آگے ہی بڑھتے رہے۔ وہ ہماری دونوں گاڑیوں کو Lose (گم) کرچکے تھے۔ میں دو گھنٹے شہر میں یوں ہی گھومنے کے بعد ہوٹل واپس پہنچا تو عمران، مزمل اور قیصر واپس آچکے تھے۔ ہمارے تمام ساتھی بخیریت تھے اور عمران نے میرا Stand By رہنے کا پیغام ماہا اور JCO کو دے دیا تھا۔ آج رات کی میٹنگ میرے لیے بڑی اہم تھی۔ جدہ سے آنے والے ترپاٹھی کے معاون تھے یا سینئر اور الرس کا مصری انجینئر کیا واقعی مصری تھا یا اسرائیلی ان سب باتوں کا علم مجھے میٹنگ میں ہونا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہم پاکستان کے خلاف کام کرنے والے اصل خفیہ ہاتھوں تک پہنچنے کے لیے مزید انتظار کرتے یا آج رات ہی ہمیں بریدہ کے سلیمان ہوٹل میں جمع ہونے والوں کو ٹھکانے لگانا پڑتا۔ ان باتوں کا فیصلہ آج رات ہی ہونا تھا۔ میں نے مزمل، عمران اور قیصر کو کہا کہ اگر ہمیں ان لوگوں کو ختم کرنا ہوا تو بارودی اسلحے کو ہم کوئی اور چارہ نہ دیکھتے ہوئے آخر میں استعمال کریں گے، ورنہ پہلے اپنے بازوؤں کی طاقت، آہنی مکے کی ضرب اور رام پوری چاقو کی تیز دھار سے ہی کام نکالنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆

ہم نے آج رات کی میٹنگ اور اس کے بعد کے متوقع حالات سے نپٹنے کی مکمل تیاری کرلی

تھی، ماما اور JCO کو پہلے ہی Stand By رہنے کی ہدایت مل چکی تھی۔ میں نے بعد دوپہر دونوں بنگلہ دیشی سپاہیوں اور تھائی نمبر ٹو کو بھی عمران کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ گھر پر کھڑی دونوں گاڑیوں میں وہ ماما اور JCO کے ہمراہ رات کو ۸ بجے فندق سلیمان کے پارکنگ ایریا میں آجائیں۔ مزمل نے کہا کہ گھر میں صرف سپنا اور رضی رہ جائیں گے۔ ممکن ہے دشمن کو گھر میں ہمارے ساتھیوں کی موجودگی کا بھی علم ہو چکا ہو اس لیے بہتر رہے گا کہ رضی اور سپنا کو گھر میں چھوڑنے کے بجائے باقی ساتھی انھیں بھی ہمراہ لے آئیں۔ تجویز معقول تھی لہٰذا میں نے گھر میں موجود سبھی کو دونوں گاڑیوں میں آنے کی ہدایت کردی اور گھر والے تمام ساتھی رات کا کھانا کھا کر ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچ گئے۔ ادھر مزمل، عمران، قیصر اور میں نے بھی اپنے کمروں میں کھانا منگوا کر کھایا اور ٹھیک پونے ۹ بجے یہ تینوں میری ہدایت کے مطابق لابی میں جا کر رسائل کی ورق گردانی کرنے لگے۔ میں ٹھیک ۹ بجے ایک بڑے لفافے میں فارمولے اور سمری کی فوٹو کاپیاں لے کر کافی شاپ میں آگیا، ترپاٹھی کے ساتھ پانچ اجنبی بیٹھے تھے جن میں سے شکل وصورت کے لحاظ سے دو مصری یا اسرائیلی اور تین بھارتی معلوم ہوتے تھے، ترپاٹھی مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا اور اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا اس ٹیبل کی ساتویں کرسی خالی تھی۔ ترپاٹھی نے مجھے اس پر بیٹھنے کو کہا اور اپنے ساتھیوں کا مجھ سے صرف یہی تعارف کروایا کہ یہ سب میرے ساتھی ہیں، ہلکی مسکراہٹوں کے تبادلے کے بعد ان میں سے ایک نے عربوں کے لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مطلوبہ کاغذات لے آیا ہوں۔ میں نے اس کے جواب میں ترپاٹھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”کیا تمھارے خیال میں میرے لیے یہ مناسب ہوگا کہ جب تک ان صاحبان کی Identity (شناخت) دیکھ کر میں یہ اطمینان نہ کرلوں کہ یہ واقعی اصلی خریدار ہیں یا ان کے بھیس میں میری ملکی جاسوسی ایجنسیوں کے کارکن ہیں جنھوں نے شاید مجھے پھانسنے کے لیے یہ جال پھیلایا ہو، ایک لفظ تک نہ بولوں“ میں نے تیزی سے انگریزی بولتے ہوئے یہ بات کہی تھی جسے میرے اندازے کے مطابق مصری یا اسرائیلی، دو شخص سمجھ نہ سکے اور ترپاٹھی سے پوچھنے لگے کہ میں نے کیا کہا ہے۔ ترپاٹھی نے میری کہی ہوئی بات دہرائی تو ان میں سے ایک جو غالباً اسرائیلی تھا، مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”ہم یہاں اپنی شناخت کروانے نہیں بلکہ نیوکلیئر فارمولا خریدنے آئے ہیں۔“ ”اور میں بھی صحیح خریداروں کو فارمولا بیچنے آیا ہوں کسی Fake (غلط مصنوعی) شخص کے ہاتھوں بے وقوف بننے نہیں۔ کل بھی مجھے تین Stooges (احمقوں) سے یہ کہہ کر ملوایا گیا تھا کہ فارمولے کی خریداری کا حتمی فیصلہ کرنے کی اتھارٹی رکھتے ہیں جب کہ درحقیقت وہ مقامی مارکیٹ میں تین معمولی دکانوں کے سیلز مین تھے“ میرا جواب سن کر سب ترپاٹھی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ترپاٹھی نے ان سیلزمینوں کے متعلق بتایا تو ایک بھارتی نے ترپاٹھی کو ڈانٹتے ہوئے کہا ”میں حیران ہوں کہ تم جیسے نااہل شخص کو ایسی اہم ذمہ داری کی پوسٹ پر کیوں بھیجا گیا، کیا تمھارا کوئی بھائی یا داماد لوک سبھا کا ممبر ہے؟“ ترپاٹھی

آنکھیں جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ شخص جو یقیناً ترپاٹھی کا افسر اعلیٰ تھا، مجھ سے مخاطب ہوا، ”میں بھارتی فوج میں میجر جنرل ہوں اور یہ میری سروس بک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی سروس بک نکال کر مجھے دکھائی اور باقیوں کو اور ترپاٹھی کو بھی کہا کہ اپنی شناخت کروائیں۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں میں سے ایک بھارتی فوج میں لیفٹیننٹ کرنل اور دوسرا ٹاٹا کمپنی کا انجینئر تھا اور ترپاٹھی DMI میں ریسرچ اینڈ انیلیسز (Research and Analysis) کا ڈائریکٹر تھا (ٹاٹا کمپنی بھارت کی سب سے بڑی کمپنی ہے جس میں کامن پن سے لے کر جہاز تک بنتے ہیں اور اس کمپنی نے ٹاٹا نیوکلیئر ریسرچ کے نام سے ایک بہت بڑا ایٹمی ریسرچ کا شعبہ بنایا ہے۔ DMI (Diretorate Military Intellegence) میں ریسرچ اینڈ انیلیسز کا شعبہ بعد میں اتنا وسیع کردیا گیا کہ اسے بھارت کی سب سے بڑی اور متحرک جاسوسی ایجنسی را (RAW) یعنی (Research and Analysis Wing) کا نام دیا گیا۔) ان سب نے اپنے شناختی کارڈ اپنے ہاتھوں میں پکڑے مجھے دکھائے اور واپس جیبوں میں ڈال لیے۔ مصری نے کہا کہ میں الرس میں الیکٹریکل انجینئر اور پاور پلانٹ کا انچارج ہوں۔ چھٹے نے اپنی شناخت کروانے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں خریدار ہوں اور اپنی شناخت نہیں کرواؤں گا۔ وہ لب و لہجے سے اسرائیلی لگ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ تمھاری شناخت کی ضرورت بھی نہیں ہے کیوں کہ مجھے علم ہے کہ تم موساد کے ایجنٹ ہو اور جدہ میں ایک مغربی کمپنی میں کام کررہے ہو۔ میرے یہ کہنے پر وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگا حالاں کہ میں نے یہ بات یوں ہی کہہ دی تھی۔ اب میری باری تھی... میں نے ترپاٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ترپاٹھی نے فارمولے اور بلیو پرنٹس کے لیے میری مانگی ہوئی رقم کے مساوی رقم مجھے کہوٹہ پلانٹ کو تباہ کرنے کے لیے آفر کی ہے۔ کیا آپ کو اس بات کا علم ہے اور آپ مجھے یہ رقم بھی دینے کو تیار ہیں۔“ میری بات سنتے ہی موساد کا ایجنٹ بولا ”مجھے منظور ہے۔“ اس کے یہ کہنے سے صاف ظاہر ہوگیا کہ وہ اسرائیلی اور موساد کا ایجنٹ ہے ورنہ بھارتی میجر جنرل میرے سوال کا جواب دیتا۔ میں نے کاغذات کا لفافہ قمیص اور بنیان کے درمیان پینٹ میں اڑوس رکھا تھا۔ لفافہ نکالتے ہوئے میں نے پوچھا What will be the mode of payment? (رقم کی ادائیگی کا کیا طریق کار ہوگا) میجر جنرل نے تقریباً جھپٹتے ہوئے مجھ سے لفافہ لیا اور اس میں سے کاغذات نکال کر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور جب کچھ پلے نہ پڑا تو ٹاٹا کے انجینئر کو کاغذات دیے۔ موٹے عدسوں کی عینک پہنے ٹاٹا کے انجینئر نے کاغذات کا عمیق نظروں سے جائزہ لیا اور بولا ”مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں کیا لکھا ہے“ ”آپ درست کہتے ہیں جب تک اس فارمولے اور سمری کو De-Code (ڈی کوڈ) نہ کیا جائے، کچھ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ پاکستانی سائنس دان اتنے بیوقوف نہیں کہ اتنے اہم فارمولے اور اس کی سمری کو سیدھی سادی انگریزی میں لکھ کر چھوڑ دیں“ میں نے یہ کہتے ہوئے کرسی کی پیٹھ سے ٹیک لگالی۔ ”اس کی ڈی کوڈ بک آپ کے پاس ہے؟“ میجر جنرل نے مجھ سے

پوچھا ”یقیناً ہے لیکن میں اسے فارمولے، بلیو پرنٹس اور سمری کے ساتھ اس وقت دوں گا جب مجھے رقم مل جائے گی۔ کیوں مسٹر ترپاٹھی، یہی بات طے ہوئی تھی نا؟“ میں نے ترپاٹھی سے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ترپاٹھی اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں کامیابی سے جال پھینک چکا تھا اور شکار اس میں پھنس چکے تھے۔ فارمولا اور سمری ان کے ہاتھ میں تھی اور ڈی کوڈ بک میرے پاس، ٹاٹا کا انجینئر فارمولے اور سمری کے اوٹ پٹانگ الفاظ کو دوبارہ دیکھ رہا تھا کہ شاید اسے ڈی کوڈ کرنے کا کوئی سرا اسے مل جائے اور میں سوچ رہا تھا کہ ہمارا آئندہ قدم کیا ہونا چاہیے۔ سارا گروپ میرے سامنے تھا اور میرا اصل مقصد یہ تھا کہ ان پاکستان دشمنوں کو واصل جہنم کیا جائے۔ میں نے ٹاٹا کے سائنس دان سے کاغذات واپس لے کر لفافے میں ڈالے اور یہ کہتے ہوئے اٹھنے لگا ”میرے خیال میں آپ سودا کرنا نہیں چاہتے اس لیے اب میرا آپ کے ساتھ بیٹھنا بے کار ہے۔“ میں اٹھ رہا تھا کہ موساد کے ایجنٹ نے دھیمے اور ترش لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”مسٹر، ذرا ٹیبل کے نیچے دیکھو، تم میرے پسٹل کی زد میں ہو۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو خاموشی سے ہمیں اپنے کمرے میں لے چلو۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔“ میں کھڑا ہو چکا تھا اس لیے ٹیبل کے نیچے دیکھنا میرے لیے مشکل تھا۔ موساد کے ایجنٹ نے اپنا پسٹل میز کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو دیکھ لیا کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف چلو۔“ سب کھڑے ہوگئے۔ ایجنٹ نے کاغذات مجھ سے لے کر اپنے پسٹل کو ان میں چھپا لیا اور میں ان کے نرغے میں کمرے کی طرف چلا۔ لابی میں مزمل، عمران اور قیصر اب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا ”میں جانتا ہوں کہ میرے کمرے میں لے جا کر آپ مجھے ہلاک کر دیں گے لیکن بے سود کیوں کہ ڈی کوڈ بک کمرے میں نہیں ہے۔“ میرے ساتھیوں نے جو ہمیں جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے، میری آواز سن لی تھی۔ کمرے کو جانے والی لابی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے دیکھا۔ وہ تینوں اپنی جگہ سے غائب تھے۔ ٹیبل سے اٹھتے وقت میں نے جان بوجھ کر کمرے کی چابی آہستہ سے فرش پر پھینک دی تھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے پینٹ کی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ کمرے کی چابی میں ٹیبل پر ہی بھول آیا ہوں یا وہیں میری جیب سے گر گئی ہوگی۔“ میجر جنرل نے میرے داہنے ہاتھ کو پکڑ کر مروڑتے ہوئے کہا ”کوئی چالاکی نہ کرنا ورنہ یہیں تمھاری لاش تڑپتی نظر آئے گی۔“ لیفٹیننٹ کرنل چابی لینے کافی شاپ میں گیا میں اتنا ہی وقفہ چاہتا تھا تاکہ میرے ساتھیوں کو مجھ تک پہنچنے کے لیے مناسب وقت مل جائے۔ لیفٹیننٹ کرنل کافی شاپ سے چابی لے کر واپس پلٹا اور کمرے کا دروازہ کھولنے لگا۔ سب کا دھیان کمرے کی طرف تھا اور انھیں اس وقت تک یہ علم نہ ہوسکا۔ جب تک کہ پانچ پستولوں اور ریوالوروں کی نالیاں ان کی گردنوں سے لگ نہ گئیں؟ اور مزمل کی یہ آواز نہ آئی ”ہینڈز اپ ورنہ گولیوں سے تمھیں بھون دیا جائے گا۔“ ان پانچوں،

نے تو گردنیں گھمانے کی بھی جرأت نہ کی اور ہاتھ اوپر اٹھائے۔ موساد کے ایجنٹ کے اٹھے ہوئے ہاتھ سے عمران نے پستول چھین لیا اور لیفٹیننٹ کرنل جو میرے کمرے کا دروازہ کھول چکا تھا، اس نے بھی ہاتھ اٹھالیے۔ میرے تینوں ساتھیوں کے ہمراہ اب JCO، تھائی نمبر۲ اور ماہا بھی تھی، میرے ساتھی ان سب کو دھکیلتے ہوئے میرے کمرے کے اندر لے گئے۔ میں نے بھی اپنا پسٹل نکال لیا تھا۔ ہم نے ان سب کو دیوار کی طرف منہ کرنے اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑے ہونے کا کہا۔ JCO اور تھائی نمبر۲ نے ان کی تلاشی لی اور ان کی جیبوں میں پڑی تمام اشیا نکال کر فرش پر ڈھیر کر دیں۔ عمران کا کمرہ ساتھ ہی تھا، وہ اپنے کمرے سے نائیلون کی وہ رسی اٹھا لایا جسے پرسوں ہی اس نے نقلی ایجنٹوں کا پیچھا کرتے ہوئے خریدا تھا۔ قیصر نے اپنے چاقو سے رسی کے ٹکڑے کیے اور ان چھ افراد کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیے۔ میں نے ہاؤس ٹیلی فون پر وجے کو کہا کہ وہ فوراً میرے کمرے میں آجائے۔ پانچ سات منٹ میں ہی وجے بھی دستک دے کر کمرے میں داخل ہوا تو عمران اور تھائی نمبر ٹو اس پر اس سے پہلے جھپٹ پڑے کہ وہ کمرے کے حالات کا جائزہ لے سکے۔ میرے ساتھی بجلی کی پھرتی سے کام کر رہے تھے۔ قیصر نے اپنے چاقو سے پلنگ کی چادر کو پھاڑ کر سات ٹکڑے بنائے جن سے ان سب کے منہ باندھ دیے گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر قیصر اور عمران نے ایسی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا کہ اب کیا کیا جائے اور مزمل نے مجھ سے کہا ”بہتر ہے انھیں ختم کر دیا جائے“ ہرگز نہیں یہ تو ہمارے مہمان ہیں اور ہمارے لیے Gateway of Information (معلومات کے حصول کا دروازہ) ہیں“ میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔ قیصر کو اشارہ کرتے ہوئے میں نے پہلے لیفٹیننٹ کرنل اور پھر وجے کے سینوں پر پاؤں دھرا، قیصر نے اپنا رام پوری پھر کھول لیا تھا اس نے نہایت صفائی سے ان دونوں کی گردنیں کاٹیں۔ ان کی گردنوں سے خون فوارے کی طرح بہنے لگا۔ میں نے باقی قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”ان دونوں کا یہ حشر محض تمھیں یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ اگر تم نے میرے سوالوں کے صحیح جواب نہ دیے تو تمھارا بھی یہیں پر ایسا ہی انجام ہوگا۔“ وہ پانچوں کرنل اور وجے کے بے جان جسموں سے بہتے خون کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ میں نے عمران کو کہا کہ قیدیوں کے بائیں جانب سے ایک ایک کا منہ کھولے اور اسے میرے پاس لائے۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ پہلا نمبر جنرل کا تھا۔ عمران نے اس کے چہرے پر چند ٹھڈے رسید کیے اور اس کے منہ سے کپڑا ہٹا کر اسے میرے سامنے لا کھڑا کیا۔

☆☆

جنرل سول کپڑے پہنے، میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں تھرتھر کانپ رہی تھیں۔ میں نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے کہا ”دیکھو جنرل! اس وقت نہ تو تم بھارت میں ہو اور نہ ہی تم نے یونی فارم پہنی ہوئی ہے کہ میں بین الاقوامی اصولوں کے مطابق تمھارے ساتھ امتیازی سلوک کروں۔ اپنے

کرنل اور وجے کا حشر تم دیکھ چکے ہو اس لیے تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا تو ممکن ہے میں تمھیں زندہ چھوڑ دوں ورنہ تمھیں آسان اور باعزت موت کی گارنٹی دیتا ہوں‘‘ فوج میں سینے پر گولی لگنے سے مرنے کو باعزت موت کہتے ہیں۔ دورانِ جنگ کسی فوجی کی بہادری سے باعزت موت پر اسے میدانِ جنگ میں دفنا کر اور اس کی رائفل کو قبر کے سرھانے گاڑ کر مرنے والے فوجی کی ہلمٹ کو رائفل پر رکھ دیتے ہیں۔ پھر بگل سے مخصوص دھن Last Post (آخری مورچہ) بجا کر اسے تعظیم دی جاتی ہے۔ کسی فوجی کو پھانسی دے کر یا کسی اور طریقے سے مارنے کو ذلت کی موت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ رسم ان فوجیوں کے لیے ہی اہمیت رکھتی ہے جو بہادر ہوں۔ بھارتی فوجیوں کے لیے نہیں کہ جب کبھی بھی وہ گھیرے میں آگئے یا موت ان کو سامنے دکھائی دینے لگی تو وہ ہاتھ پاؤں جوڑ کر اور اپنے بال بچوں پر رحم کرنے کا کہہ کر رو رو کر جان بخشی کی بھیک مانگتے ہیں۔ جنرل اس وقت تمام فوجی اصول وقواعد بھول چکا تھا اور بار بار التجائیں کر رہا تھا کہ اسے زندہ چھوڑ دیا جائے۔ میں نے اس سے جو بھی سوال پوچھے اس نے ہر سوال کا جواب دیتے ہوئے ہر بار تان اس پر توڑی کہ اسے زندہ چھوڑ دیا جائے۔ میں اپنے سوال اور جنرل کے دیے ہوئے جواب یہاں اس لیے تحریر نہیں کر رہا کیوں کہ اس کے جوابوں کی روشنی میں ہم نے آئندہ مشنوں کو ترتیب دیا اس لیے انھیں یہاں بیان کرنے سے ان مشنوں کی دلچسپی ختم ہوجائے گی۔ جنرل کے متعلق یہاں صرف یہی عرض کروں گا کہ اس نے اپنی جان کے خوف سے ہمیں وہ کچھ بھی بتا دیا جس کی مدد سے ہمیں اپنے آئندہ ٹارگٹس کے حصول میں بڑی مدد ملی۔ جب جنرل سے میں نے تمام سوال پوچھ لیے تو میرے اشارے پر عمران نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر اپنے ریوالور کے دستے کی چوٹ لگا کر اسے بے ہوش کردیا۔ قارئین! اس وقت میں اور میرے ساتھی بے حد ذہنی تناؤ کا شکار تھے۔ سعودی عرب میں ہم نے پہلی بار دو افراد یعنی کرنل اور وجے کو ہلاک کیا تھا اور جو زندہ قیدی ہمارے پاس تھے اگر ہم انھیں زندہ چھوڑ دیتے تو بہت تھوڑے وقت میں سعودی پولیس ہمیں گرفتار کرلیتی اور ہم سب کا انجام جامع مسجد کے سامنے ہمارے سر قلم کرنے سے ہوتا۔ میں اور میرے ساتھی موت سے تو ڈرتے نہ تھے کیوں کہ ہم تو شروع سے ہی سر ہتھیلی پر لیے پھر رہے تھے۔ ہمیں صرف یہ خوف تھا کہ کہیں اپنے مشنوں کی تشنگی سے قبل ہی ہم گرفتار نہ کرلیے جائیں اور ہماری روحیں بھی نامکمل مشنوں کی تشنگی میں بھٹکتی نہ رہیں۔ میں نے مزمل کے کان میں کچھ کہا اور وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اب ترپاٹھی کی باری تھی۔ اسے میرے سامنے لایا گیا تو اس کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ ہم نے اس پر ابھی تک کوئی سختی نہیں کی تھی لیکن صرف خوف اور دو خون اگلتی بے سر کی لاشیں دیکھ کر ہی اس کی پتلون اور فرش کا وہ حصہ جہاں وہ پڑا تھا، گندہ ہوچکا تھا۔ ’’ترپاٹھی‘‘ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ’’تم نے دیکھ لیا ہے کہ زندگی اور موت کے درمیان کس قدر باریک لکیر کھنچی ہوئی ہے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ تمھاری موت اس

لکیر کو کراس کر جائے، مجھے ان اسرائیلی، بھارتی اور پاکستانی ایجنٹوں کے نام اور پتے بتا دو جو سعودی عرب میں پاکستان کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ تمھارے جنرل نے ہمیں اچھی خاصی انفارمیشن دے دی ہے۔ اس لیے ہم نے اسے ہلاک نہیں کیا۔ تم بھی سب کچھ بتا کر اپنی جان بچا سکتے ہو۔ ترپاٹھی DMI کا پرانا گھاگ تھا۔ لاشوں کو دیکھ کر اپنی جان کے خوف سے اس نے اپنی پتلون تو گندی کردی تھی لیکن جب اسے میرے سامنے کھڑا کیا گیا تو وہ خاصا سنبھل چکا تھا وہ پاکستان دشمن ایجنٹوں کے نام پتے بتانے کی بجائے لگا ادھر ادھر کی ہانکنے۔ اس نے بالکل وہی انداز اختیار کیا جو میں نے اپنی DMI کی حراست کے دوران تفتیشی ٹیموں کو بھارتی افواج کے متعلق وہ اطلاعات دے کر جو خاصی پرانی تھیں اور تفتیشی ٹیموں کو ان کی اپنی افواج کے متعلق ’’راز افشا‘‘ کر کے الجھا دیا تھا۔ ترپاٹھی نے بھی مجھے پاکستان کے اندرونی سیاسی حالات اور مارشل لا لگنے کے بعد سیاسی لوگوں کے ردعمل کا بتا کر مجھے بحث میں الجھانا چاہا۔ مجھے DMI کی حراست کے دوران ان کے تشدد سے لگنے والے زخم پھر سے رسنے لگے اور ان میں وہی درد اٹھنے لگا جو تشدد سہتے ہوئے مجھے ہوتا تھا۔ میں نے ترپاٹھی کو کہا کہ تم یوں نہیں مانو گے۔ تمھیں جب تک اس تشدد کا تھوڑا سا ذائقہ چکھا نہ دیا جائے جو تم لوگوں نے مجھ پر کیا تھا تمھاری زبان سے سچائی نہیں نکلے گی۔‘‘ میں نے عمران کو کہا کہ اس کا منھ اچھی طرح سے باندھ دے تاکہ آواز نہ نکل سکے۔ ادھر قیصر کو کہا کہ ٹیبل لیمپ میں سے بجلی کی تاروں کو نکال کر نیگیٹو اور پازیٹو تاروں کو تھوڑا تھوڑا ننگا کر لے۔ ابھی قیصر نے دونوں تاریں نکالی بھی نہیں تھیں کہ ترپاٹھی کی قوتِ مدافعت جواب دے گئی اور وہ منھ بندھنے سے پہلے ہی چیخ اٹھا۔ ’’میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔ مجھے صرف ایک موقعہ دو‘‘ اس وقت میری حیوانیت اور DMI کے مجھ پر کیے گئے تشدد کا بدلہ لینے کی خواہش عروج پر تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے وحشیانہ جذبات پر قابو پایا۔ اور ترپاٹھی کو کہا کہ فوراً بولنا شروع کردے۔ ترپاٹھی چوں کہ DMI میں رائج تشدد کے وحشیانہ طریقے خود دیکھ چکا تھا لہٰذا اس نے بولنا شروع کیا اور ان اسرائیلی ایجنٹوں جو امریکن پاسپورٹ پر سعودی عرب میں پاکستان کے خلاف کام کر رہے تھے، کے نام اور پتے بتانا شروع کیے۔ امریکی پاسپورٹ پر مذہب نہیں لکھا ہوتا لہٰذا یہ یہودی جنھیں اس وقت امریکی سیکریٹری آف اسٹیٹ (وزیر خارجہ) ہنری کیسنجر جو خود بھی ایک متعصب یہودی تھا، کی ایما اور مدد سے امریکی پاسپورٹوں پر امریکن بن کر سعودی عرب میں دندناتے پھرتے تھے۔ سعودی حکومت ان دنوں نامعلوم امریکیوں سے اس قدر متاثر یا خائف تھی کہ سبھی بڑی کمپنیوں اور خود حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز امریکیوں کو خصوصی رعایت اور سہولتیں دی جاتی تھیں۔ سعودی عرب میں ان دنوں کام کرنے والے غیر ملکیوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ۱۔امریکن نیشنل ۲۔یورپین نیشنل اور ۳۔تھرڈ کنٹری نیشنل۔ ایک جیسے عہدوں پر فائز امریکیوں کی تنخواہ تھرڈ نیشنل سے چار گنا زیادہ ہوتی تھی۔ گیارہ ماہ کام کرنے کے بعد ایک ماہ کی تنخواہ اور واپسی ٹکٹ سمیت چھٹی کے علاوہ ۲۰ روز کی RR

چھٹی (Rest and Relaxsation Leave) اور یورپ میں کسی بھی مقام کے لیے ریٹرن ٹکٹ کے علاوہ سالانہ تن خواہ کے ۲۰ فی صد کے برابر بونس بھی دیا جاتا تھا۔

یورپین شہریوں کو بونس کے سوا باقی تمام یہی سہولتیں دی جاتی تھی اور تھرڈ نیشنل جن میں مصری، سوڈانی، پاکستانی، تھائی، فلپائنی، بھارتی اور مشرق کی باقی ساری قومیں تھیں، افسران کو ۱۱ ماہ بعد ایک مہینے کی چھٹی اور ادنیٰ ملازمین کو ۲۳ ماہ بعد ایک ماہ کی چھٹی ملتی تھی اور بس۔ ترپاٹھی نے مجھے ان یہودیوں کے نام اور پتے دیے جو امریکن پاسپورٹس پر سعودی عرب میں کام کررہے تھے اور دراصل موساد کے ایجنٹ تھے۔ ان کے علاوہ ان بھارتیوں کے نام بھی دیے جو وہاں ملازمت یا کاروبار کررہے تھے اور دراصل بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے پے رول پر تھے۔ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ (اول) سعودی عوام اور حکومت کو پاکستان سے متنفر کریں (دوم) پاکستان سے درآمد شدہ اعلیٰ کوالٹی کی اشیا مثلاً چاول، کپڑے اور فروٹ کو بھارتی کم تر درجے کی اپنی اشیا سے بدل کر پاکستانی درآمدی اشیا کو کم تر اور خراب اور بھارتی اشیا کو اعلیٰ ثابت کریں اور پاکستانی کام کرنے والوں کے خلاف جھوٹی شکایات کر کے انھیں گرفتار کروائیں اور سزا بھگتنے کے بعد انھیں واپس پاکستان ڈی پورٹ کروائیں۔ اس کام میں غدار پاکستانی بھی بھارتی ایجنسیوں کے پے رول پر تھے۔ مجھے ترپاٹھی کی باتوں پر یقین نہیں آیا تو وہ کہنے لگا۔

”ان سب کے تو نہیں لیکن کچھ کے نام پتے میری ڈائری میں درج ہیں جو آپ نے میری جیب سے نکالی ہے اور ایک بڑی ڈائری میرے اس سوٹ کیس میں ہے جو میرے کمرے میں ہے۔ میری باتوں کی یہ دونوں ڈائریاں تصدیق کردیں گی۔“ ہم آج رات سے اتنے مصروف اور ذہنی تناؤ کا شکار تھے کہ ہمیں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ ترپاٹھی، جنرل، لیفٹیننٹ کرنل اور ٹاٹا کا انجینئر اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ان کے سامان سے بھی ہمیں خاصا کچھ ہاتھ لگ سکتا تھا۔ ان سب کے کمروں کی چابیاں ریسپشن پر تھیں۔ ریسپشن پر جا کر تو ان کی چابیاں لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میں نے ہاؤس فون پر ریسپشن والوں کو کہا کہ وجے کمار کہہ رہا ہے کہ کام ہوگیا ہے لہٰذا (ان چاروں کے نام لے کر) ان کی چابیاں ویٹر کے ہاتھ میرے کمرے میں بھیج دی جائیں۔ ریسپشن والوں نے کچھ پوچھنا چاہا تو میں نے کہا کہ اگر ۵ منٹ کے اندر چابیاں میرے کمرے میں نہ پہنچیں تو جنرل صاحب تم سے نپٹ لیں گے۔ ہوٹل کا سارا اسٹاف ہندو تھا اور بھارتی جنرل کے اس ہوٹل میں ٹھہرنے سے واقف تھا۔ چند منٹ میں ہی چابیاں لیے ویٹر نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ قیصر نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور ویٹر سے چابیاں لے لیں۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ان کمروں میں کیسے جائیں کہ مزمل ماہا، سپنا اور رضی کو لے کر کمرے میں آگیا۔ اس نے بتایا کہ ریسپشن پر صرف ایک نائٹ شفٹ کا آدمی اونگھ رہا ہے اور کار پارکنگ کے قریب ہوٹل کے مین گیٹ پر بھی کوئی نہیں ہے۔ میں نے مزمل کو کہا تو وہ رضی اور JCO کو ہمراہ لے کر ان چاروں کمروں کی تلاشی لے کر اور سب کے سوٹ کیس اٹھا کر میرے

کمرے میں لے آئے۔ ہم نے جلدی جلدی ان کے سوٹ کیس کھولے اور تمام کاغذات، ڈائریاں اور ان کی جیبوں سے برآمد ہونے والی تمام اشیا کو انھی کے ایک سوٹ کیس میں ڈال دیا۔ میں نے ماہا کو بتایا کہ ایک اسرائیلی ایجنٹ بھی موجود ہے تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ بولی ”اس سے تو میں سب کچھ اگلوالوں گی“ میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ ہمیں ابھی ان گرفتار ایجنٹوں کو ٹھکانے لگانا تھا اور اپنی جانیں بچانے کے لیے ہوٹل اور بریدہ سے بھی نکلنا تھا۔ میں نے عمران کے آہنی مکے اور اپنے ہاتھوں سے گردن کی مخصوص نسیں دبا کر جنرل، ترپاٹھی، مصری اور ٹاٹا کے انجینئر کو ختم کیا۔ ماہا کے کہنے پر ہم نے صرف اسرائیلی ایجنٹ کو ریوالور کے دستے کی چوٹ سے بے ہوش کردیا تھا۔ عمران، مزمل، قیصر اور میں نے اپنا سامان سمیٹا۔ یہاں میں نے ایک فیصلہ کیا۔ ہم سب کی زندگیوں سے وہ اطلاعات اہم تھیں جو ہمیں مل چکی تھیں۔ میں نے کاغذات سے بھرا سوٹ کیس مزمل کے حوالے کیا اور اسے کہا کہ وہ فوری طور پر عمران کے ساتھ جدہ کے لیے روانہ ہوجائے اور وہاں اشرافیہ میں اشرفیہ ہوٹل میں ٹھہرے اور اگر تین روز تک ہم ان تک نہ پہنچ سکے تو وہ کاغذات پاکستانی سفارت خانے میں فسٹ ملٹری اتاچی کے سپرد کردے۔ مزمل اور عمران نے میری بات ماننے سے صاف انکار کردیا اور کہا کہ میں کاغذات لے کر نکل جاؤں جب کہ وہ بریدہ کے حالات کو سنبھال لیں گے۔

میں نے ان کے انکار کو سن کر کہا ”تم اپنے لیڈر کی بات کو نہ مان کر ڈسپلن کی خلاف ورزی کررہے ہو۔ جس کی تمھیں سخت سزا مل سکتی ہے۔ یہ ملکی مفاد کا معاملہ ہے اور اس پر میں تمھاری یا اپنی زندگی کو ہرگز ترجیح نہ دوں گا۔ وقت بہت کم ہے۔ میرے حکم کی فوری تعمیل کرو۔“ مزمل اور عمران نے مجبور ہوکر کاغذات والا اور اپنے سوٹ کیس اٹھائے۔ ہم نے صرف زبانی ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ ان کے کمرے سے جانے کے ۱۰ منٹ بعد میں نے قیصر اور رضی کو کہا کہ بے ہوش اسرائیلی جاسوس کو دونوں بازوؤں سے تھام کر پارکنگ میں لے جائیں۔ ان کے پیچھے ہی ہم سب بھی دروازہ لاک کر کے گاڑیوں میں آ کر بیٹھ گئے۔ گھر پہنچتے ہی۔ ہم نے سارا سامان سمیٹا اور میں نے قیصر، ماہا اور اسرائیلی جاسوس کے علاوہ باقی ساتھیوں کو بھی جدہ اسی ہوٹل میں مزمل اور عمران کے پاس جانے کا کہا۔ سارے ساتھی بھی چلے گئے۔ اب قیصر ماہا بعد میں اسرائیلی جاسوس کے ہوش میں آنے کا انتظار کررہے تھے۔

چوتھا باب

آج دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ آج "جانباز" تحریر کرنے کے لیے کئی بار دل کڑا کیا، کئی بار کاغذ اور قلم سنبھالا لیکن ہاتھ لرز کر رہ گیا۔ میرے سامنے گزشتہ دو دنوں کے اخبار پڑے ہیں۔ کراچی، حیدرآباد، لاہور، سیالکوٹ اور کئی دوسرے شہروں میں پھر خون اور آگ کا کھیل شروع ہوگیا ہے اور بے گناہ پاکستانی مسلمانوں کا خون بہایا جارہا ہے۔ کہیں کلاشنکوف کی گولیاں ان کے سینوں میں پیوست ہورہی ہیں اور کہیں بم دھماکے ہورہے ہیں۔ ہر شخص سہما اور ڈرا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا دشمن کی قابض فوج اپنے فتح کیے ہوئے پاکستانی شہروں میں قتل عام کررہی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم اسے اپنے مقدر کا لکھا سمجھ کر صبر کرلیتے۔ آخر دہلی بھی تو سات بار لٹی ہے۔ نادر شاہ نے بھی وہاں پانچ روز تک قتل عام کا حکم صادر کردیا تھا لیکن جب پوری خبر پڑھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ قاتل بھارتی یا یہودی نہیں اور نہ ہی کسی دوسرے ملک سے آئے ہیں۔ یہ تو ہمارے ہی ہم وطن ہیں، مسلمان ہیں اور محض اس لیے یہ خون بہارہے ہیں کیوں کہ مقتولین کا مسلک دوسرا ہے۔ میں یہ خبریں پڑھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے غازی اور جانباز کے مشنوں میں پاکستان کے ازلی دشمن بھارت کے خلاف اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جو بھی کارروائیاں کی ہیں۔ میرے اپنے ساتھیوں نے جن میں بنگلہ دیشی، تھائی حتیٰ کہ اسرائیلی جاسوسہ جو تائب ہوکر پاکستانی دشمنوں کے خلاف ہمارا ساتھ دے رہی تھی اور جس نے ہمارے جذبۂ جہاد کو دیکھ کر اسلام قبول کرلیا تھا ان سب کی شہادتیں بالکل ضائع گئیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی لکھی ہوئی تمام تحریروں کو پھاڑ دوں اور اس بات پر یقین کر بیٹھوں کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے ملک و ملت کے لیے جو بھی قربانیاں دیں تھیں وہ سب رائیگاں گئیں اور ہم نے صرف جھک ماری تھیں۔ ہم پاکستان دشمن ممالک میں دشمنوں کا خاتمہ کرنے میں مصروف رہے اور خود

ہمارے ملک میں ملکی غداروں اور جاسوسوں نے مختلف لبادے اوڑھ کر ڈیرہ جمالیا۔ DMI کی حراست کے دوران ان کے تشدد کے نتیجے میں میرے سر کی ٹوٹی ہوئی ہڈی، گھٹنے کی شکستہ Stepnie، آنکھوں پر لگی ہوئی چوٹیں اور پیٹ پر پڑی لاٹھیوں کی ضربات نے مجھے آج تک نارمل نہ ہونے دیا۔ میں نے یہ سارے دکھ اس لیے جھیلے کہ اپنے ساتھیوں کو بچاؤں اور میرے ساتھیوں نے اپنی جانوں کی مسکراتے ہوئے قربانیاں کیا اس لیے دیں کہ ہمارے ملک میں غدار آگ اور خون کی ہولی کھیلیں۔ میں آج آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ نے قیصر، عارف، نذیر، بشیر گیرج والا، حاجی مستان، یوسف پٹیل، محسن، مزمل، عمران، JCO منصف، سپاہی دین محمد، سپاہی اکرم، رضی، تھائی ۲ عبداللہ اور مجھے حب الوطنی، وطن اور قومیت پرست، غازی اور مجاہد ہونے کے اپنے خطوط میں جو سرٹیفکیٹ دیے ہیں اور ہماری ملکی خدمات کو سراہا ہے، تعریفوں کے جو پل باندھ دیے ہیں تو کیا میں نے کبھی اپنا اور اپنے ساتھیوں کے مسلک کا ایک بار بھی ذکر کیا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں ہمارا کوئی مسلک نہیں۔ نہیں یہ بات نہیں۔ ہم سب کے اپنے اپنے مسلک تھے لیکن ہمیں اسلام کے اولین، بنیادی اور مکمل ترین ضابطے یعنی اللہ پاک کی وحدانیت، رسول پاک ﷺ کی رسالت اور ختم نبوت اور قرآنِ پاک کی سچائی اور حقانیت پر یقین کامل تھا اور ہے اسی یقین کامل نے ہمیں مختلف مسالک کا ہونے کے باوجود ایک گھونسے کی شکل دے دی تھی جس سے ہم نے ہمیشہ اپنے وطن دشمنوں کو ناک آؤٹ کیا۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ آج علماؤں کے بہکاوے میں آکر پاکستانی مسلمان مسالک کے اختلاف پر ایک دوسرے کا خون بہارہے ہیں۔ میرے عزیز قارئین! ذرا سوچیے کہ اگر یہ علما ہم مسلمانوں کو یہ تبلیغ کریں کہ تمام مسلمان مختلف مسالک کے ہونے کے باوجود بھائی بھائی اور ایک ہیں کیوں کہ سب اللہ پاک کی وحدانیت، رسولِ پاکؐ کی رسالت اور ختم نبوت اور قرآنِ پاک کی حقانیت پر ایک جیسا یقین رکھتے ہیں تو پھر ان علماؤں کے حلوے مانڈے کا انتظام کیوں کر ہوگا۔ مجھے چاہے کوئی قتل بھی کردے لیکن آج میں سچائی لکھ کر ہی رہوں گا۔ یہ علما جنھیں اگر مولوی کہہ دیا جائے تو یہ اس کے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتے ہیں کہ انھیں مولانا کیوں نہیں کہا گیا، مجھے صرف یہ بتادیں کہ مولانا کی ڈگری دنیا بھر میں کون سے دینی مدارس اور یونی ورسٹیوں میں ملتی ہے۔ بھارت میں دیوبند کی دینی درس گاہ میں منشی فاضل اور مولوی فاضل کی ڈگری ملتی تھی چناں چہ آپ یاد کریں کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، مشرقی پاکستان اسمبلی کے مولوی تمیز الدین خان اور بہت سے ایسے عالم تھے جو فخریہ اپنے نام کے ساتھ مولوی لکھتے تھے اب یکایک یہ مولانا کہاں سے اگ آئے۔ اگر انھیں مولوی کہا جائے تو ان کی جبیں پر شکنیں پڑ جاتیں ہیں حالاں کہ قرآنِ حکیم فرقانِ حمید میں سورۂ بقر کی وہ دعا پڑھ کر دیکھیں جس میں اللہ پاک سے دعا میں "ورحمنا انت مولانا" میں مولانا اللہ پاک کی بڑائی بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔ اب یہ سیکڑوں ہزاروں دنیاوی اللہ (مولانا) نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑے ہیں۔ یقین جانیے یہی اس گھناؤنی سازش کی کٹھ پتلیاں ہیں جنھیں ہنود و یہود نے پاکستانی

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے گھڑا ہے۔ یہ سب موساد اور را کے Pay Roll (پے رول) پر ہیں۔ موساد کے پاکستانی ڈسک کے انچارج جس نے پاکستان پر اپنے مقالے پر ڈاکٹر کی ڈگری لی ہے، نے اپنے مقالے میں یہی لکھا ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں اتنی نفرت پھیلا دینی چاہیے کہ وہ آپس میں لڑ لڑ کر ہی ختم ہوجائیں۔ آپ ایران، شام، عراق، کویت، ترکی، سعودی عرب، امارات، ملائیشیا، برونائی، لیبیا، الجزائر، سوڈان، مراکش کہیں بھی جائیں آپ کو علامہ اور مولانا قسم کی کوئی مخلوق نظر نہیں آئے گی۔ پاکستان میں ان کا واحد مقصد اپنی موٹی موٹی گردنوں سے لاؤڈ اسپیکر سے چلا چلا کر مختلف مسالک کے خلاف جھوٹی، من گھڑت اور اختلافی باتیں کرنا، اور سیدھے سادے عوام کو بھڑکا کر قتل وخون پر آمادہ کرنا ہے۔ میری عمر اگرچہ عملی جہاد کے قابل نہیں لیکن میں ان علما، مولاناؤں اور ان کے پیروکاروں کو (جو مساجد اور امام بارگاہوں میں، سڑکوں اور گھروں پر مسالک کے اختلاف پر خون بہاتے ہیں) دعوت دیتا ہوں کہ اگر ان کے خون میں اتنی ہی گرمی ہے تو میرے ساتھ آئیں۔ پڑوسی دشمن ملک سے ہماری سرحدیں خاصی طویل ہیں اور مجھے بارڈر کراس کرنے کے محفوظ راستے بھی معلوم ہیں۔ میں ان کے آگے چلتا ہوں۔ پاکستان میں تو یہ خدا، رسولؐ اور قرآن کی سچائی کو ماننے والوں کو ہلاک کررہے ہیں۔ اس دشمن ملک میں جہاں بھارتی ہندو خدا کو ''خود۔آ'' کہہ کر ہمارا تمسخر اڑاتے ہیں کہ ہمارے بھگوان نے تو ہم میں ہی جنم لیا تھا اور تم مسلمان اپنے بھگوان کو ابھی تک ''خود۔آ، خود۔آ'' کہہ کر بلانے کی دعوت دے رہے ہو۔ جہاں توبہ نعوذ باللہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو شاتم رسول رنگیلا رسول کہنے والے کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جہاں قرآنِ پاک کو خاکم بہ دہن ایک جنونی اور مجذوب کی لکھی ہوئی تاریخ کہا جاتا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر دشمن ملک میں ہمارے مذہب اور ملک کے دشمنوں کا صفایا کریں۔ یقین جانیے کہ دشمن کی پہلی گولی میں ہی اپنے سینے پر کھاؤں گا کیوں کہ وہاں صرف میں ہی موجود ہوں گا اور یہ سب بھاگ کھڑے ہوں گے کیوں کہ ان میں نہ تو جرأت ہے اور نہ ہی ایمان کی پختگی۔ یہ صرف اپنے مسلمان پاکستانی نہتے مردوں، عورتوں اور بچوں پر گولیاں چلا کر ہی خود کو تیس مار خان سمجھتے ہیں۔ آپ میں اگر پاکستان اور اسلام سے محبت ہوتی تو نہ تو شاتم رسول سلمان رشدی اب تک زندہ ہوتا اور نہ ہی عاصمہ جیلانی جو دشمن اسلام و پاکستان ہے۔ آج ۴ مئی کے اخبارات میں شائع ہوئی واہگہ بارڈر پر بھارتی فوجیوں کو مٹھائی تقسیم کرتے اور دہلی میں ہندو عورتوں کے ساتھ ناچتے ہوئے تصویریں شائع ہونے پر آپ کا خون کیوں نہیں کھول اٹھتا اور آپ اس عورت کی ریشہ دوانیوں کو ختم کرتے خدارا ہوش کے ناخن لیجیے اور سیدھے سادے پاکستانی مسلمانوں کو صحیح راہ دکھائیں اور بھٹکنے سے روکیں۔

☆☆

صبح کی روشنی پھیلنے لگی تو قیصر نے مجھے کہا کہ پولیس کو یہ خبر ملنے کے بعد کہ فندق سلیمان

کے ایک کمرے میں اتنے خون ہوچکے ہیں، ہمارا بریدہ جیسے چھوٹے شہر سے نکلنا ناممکن ہوجائے گا اس لیے بہتر ہے کہ ہم سڑکوں کی ناکہ بندی سے پہلے ہی شہر سے نکل جائیں۔ اجنبی ملک، شہروں اور سڑکوں سے ناواقفیت، ہم واقعی خاصی بڑی مشکل میں گرفتار ہوچکے تھے۔ میں نے بے دلی سے قیصر کو کہا ''قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا لیکن ہمیں اب واقعی اس شہر سے نکل جانا چاہیے۔ قیصر اور ماہا نے چند منٹوں میں اپنا سامان گاڑی میں رکھا۔ بے ہوش اسرائیلی جاسوس کے ساتھ قیصر پچھلی سیٹ پر اور میں ماہا کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم بریدہ سے ریاض جانے والی سڑک پر ہو لیے لیکن جلد ہی ہمیں احساس ہوگیا کہ اس بڑی شاہراہ پر چیکنگ زیادہ ہوگی۔ میں نے گاڑی واپس گھمائی اور مدینہ جانے والی سڑک پکڑ لی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ رحمت اللعالمین کی رحمتوں سے بھرپور اس شہر میں ہمیں ضرور پناہ مل جائے گی۔ میں نے ماحول کی خاموشی کو توڑتے ہوئے ماہا کو کہا ''ہم مدینہ جارہے ہیں جس میں کسی غیر مسلم کا داخلہ ممنوع ہے۔ تم یہودی ہو۔ تمھارا وہاں جانا مناسب نہیں'' ماہا نے نظریں نیچے کیے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ لوگوں کے حسن سلوک اور عورت کی عزت کے مقام کو سمجھنے اور تھوڑا بہت اسلامی لٹریچر پڑھ کر مجھے خاصے عرصے سے یہ احساس ہورہا تھا کہ میں اسلام قبول کرلوں۔ اب ہم اس شہر کی طرف جارہے ہیں جہاں اللہ کے سچے اور آخری نبی محو استراحت ہیں۔ اس سے اچھا اور کون سا موقع ہوگا جب میں اسلام قبول کروں۔ میں نے ماہا کی یہ بات سن کر گاڑی سڑک کے ایک جانب کھڑی کردی اور ماہا کو جس نے پہلے ہی حجاب اوڑھ رکھا تھا، کلمہ پڑھوایا۔ کلمہ پڑھنے کے بعد ماہا نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ''اے رب الاالعالمین! میں سچے دل سے تیرے آگے اقرار کرتی ہوں کہ میں نے یہودیت کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہے۔ تو دلوں کے بھید جاننے والا ہے۔ اپنے آخری نبی کے صدقے میں میرے گزشتہ گناہوں اور گم راہی کے کاموں کو معاف کر۔'' پھر رسول اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''اے محسن انسانیت! میں تیرے شہر میں اس یقین کے ساتھ داخل ہورہی ہوں کہ تیری رحمتیں نہ صرف میرے ماضی کے گناہوں سے مجھے پاک کردیں گی بلکہ میری آئندہ زندگی میں بھی جسے میں نے تیرے دین کی پناہ میں آکر تیرے دین کی خدمت کے لیے وقف کردیا ہے، میری رہبری کریں گی اور مجھے اپنے سابقہ گناہوں اور گم راہی کی زندگی کا کفارہ ادا کرنے میں میرے شامل حال رہیں گی۔'' ماہا نے اپنے اسلام قبول کرنے کا اقرار اور دعائیں عربی زبان میں مانگی تھیں۔ بدقسمتی سے میں اور قیصر عربی زبان سے نابلد تھے لہٰذا ماہا نے انگریزی میں ان کا ترجمہ سنایا جسے میں نے اردو میں قیصر کو بیان کیا۔ ہم حیران تھے کہ ماہا جیسی خود سر عورت نے یکایک اسلام قبول کرنے کا فیصلہ اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دعائیں اور اپنے گناہوں کی معافی کے لیے ایسی پر اثر دعائیں کیسے مانگیں۔ ماہا نے اپنے چرس اور ہیروئن کے اسٹاک کو اپنے سوٹ کیس سے نکال کر سڑک سے ذرا پرے ہٹ کر اس پتھریلے علاقے میں سپردِ آتش کردیا۔ قیصر اور میں اس کی ایک ایک حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"میں نے ان گندی نشہ آور منشیات کو اب سے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے" ماہا نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اسرائیلی ایجنٹ کے جسم میں حرکت کے آثار دیکھ کر ماہا نے کہا "مجھے اس کے ساتھ بیٹھنے دو۔ مجھے کسی بے ہوش کو ہوش میں لانے کے لیے مخصوص نسوں کو دبانے کی تربیت دی گئی تھی۔ آپ لوگ بالکل خاموش رہیں۔ میں اسے ہوش میں لاؤں گی اور اس سے تمام راز حاصل کروں گی۔" قیصر میرے ساتھ اگلی نشست پر آبیٹھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مین روڈ پر چند کلومیٹر آگے جا کر ایک چھوٹی اور تنگ سڑک پر جو مین روڈ کو نزدیکی دیہاتوں سے ملاتی تھی، ۲ کلومیٹر اندر جا کر پہاڑوں میں ایک محفوظ جگہ دیکھ کر گاڑی روک دی۔ ماہا اب تک اسرائیلی ایجنٹ کو ہوش میں لا چکی تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں بھی کھول دیے تھے اور اسے پانی پلا رہی تھی۔ اسرائیلی ایجنٹ ہم سب کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ ماہا ملی جلی عبرانی اور عربی میں اس سے بات کر رہی تھی جسے وہ بڑی حیرانی سے سن رہا تھا۔ میرے اور قیصر کے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ بعد میں ماہا نے ہمیں اس سے ہونے والی ساری گفتگو بتائی جو کچھ یوں تھی۔ ماہا نے اس اسرائیلی ایجنٹ کو کہا "تم ایک بہت بڑے جال میں پھنس گئے تھے۔ وہ تو میں جو تمھاری نگرانی پر معمور تھی، عین وقت پر آگئی اور تمھاری جان بچ گئی ورنہ بھارتی جنرل اور اس کے ساتھیوں کے علاوہ مصری انجینئر کو جس بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا، تمھارا بھی ان ہی کے ساتھ وہی حشر ہونا تھا۔ پاکستانی جاسوس ایجنسی کے پے رول پر ہر قوم اور مذہب کے لوگ ہیں۔ بھارتی جنرل اور اس کے ساتھی اور مصری بھی حقیقت میں انھی کے ایجنٹ تھے۔ یہ سارا ڈراما اسرائیل سے اتنی بڑی رقم اینٹھنے کے لیے رچایا گیا تھا۔" میرے اور قیصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماہا نے کہا "جب ہمارے ہیڈ کوارٹر کو اس سازش کی اطلاع ملی تو ان دونوں نے جو ہماری ایجنسی کے پے رول پر ہیں، اس جعلی کاغذات بیچنے والے پاکستانی کو ہلاک کر کے خود اس کی جگہ سنبھال لی۔ چوں کہ سلیمان ہوٹل میں جمع ہونے والے بھارتی اور تم نے اس جعلی شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے آپ سب اس کو ہی اصلی کاغذات فروخت کرنے والا سمجھ بیٹھے۔ میں ہوٹل کے باہر نہیں بلکہ ساتھ کے اس کمرے میں تھی جہاں سودا طے پا رہا تھا۔ جب کاغذات کا راز کھلنے لگا تو بھارتیوں اور ان دونوں میں خونی جھڑپ ہوئی۔ تم چوں کہ اپنے آدمی تھے لہٰذا انھوں نے تمھیں بے ہوش کر دیا اور سارے بھارتیوں اور مصری کو ہلاک کر کے اور تمھیں زندہ سلامت لے کر ہوٹل سے نکل بھاگے" ماہا کی باتوں پر اسرائیلی ایجنٹ کو اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ ماہا نے اپنا موساد کا کارڈ اسے دکھایا اور بولی "اگرچہ یہ ہماری ایجنسی کے اصولوں کے خلاف ہے کہ کسی کو بھی اپنی شناخت کروائی جائے لیکن تمھاری تسلی کے لیے میں تمھیں اپنی شناخت کروا رہی ہوں۔ میں موساد کی ایک کہنہ مشق ایجنٹ ہوں اور بھارت، کھٹمنڈو، عراق اور ابوظہبی کے علاوہ تھائی لینڈ اور ملائیشیا میں بھی اپنی Assignments (تفویض شدہ کاموں) پر کامیابی سے کام کر چکی ہوں" ماہا نے اسے مزید یقین دلانے کے لیے سینئر افسران اور اسرائیل کے اندر اور بیرونِ ممالک ٹریننگ سینٹروں کے

متعلق ایسے انداز سے بتایا کہ اسرائیلی ایجنٹ اس کے دام میں آگیا اور اس نے ماہا اور پھر مجھ سے اور قیصر سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی جان بچانے پر ہمارا شکریہ ادا کیا۔ وہ پوری طرح سے ماہا کے دام میں پھنس چکا تھا۔ ماہا نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "ہم ابھی تک بری طرح سے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ سلیمان ہوٹل میں پڑی لاشوں تک پولیس صبح ہی پہنچ چکی ہوگی اور اب ہر طرف قاتلوں کی تلاش جاری ہوگی۔ کیا تم کسی محفوظ جگہ تک ہمیں لے جا سکتے ہو" اسرائیلی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا "ہم اس وقت کہاں ہیں؟" "مدینہ کے قریب" ماہا نے جواب دیا "اگر ہم جدہ پہنچ سکیں تو کنگ عبدالعزیز انٹرنیشنل ایئر پورٹ کو تعمیر کرنے والی جرمن کمپنی حاختف میں ہمارے کئی آدمی کام کر رہے ہیں بلکہ جدہ میں اس کمپنی کے رہائشی علاقے میں ہی ہمارا ریجنل ہیڈ کوارٹر ہے۔ دمام میں آئل کمپنی آرامکو میں بھی ہمارے لیے کام کرنے والے کئی امریکن ہیں لیکن دمام یہاں سے بہت دور ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم مدینہ سے ینبع جانے والی سڑک ہو لیں اور راستے میں ہی جدہ والی سڑک پر مڑ جائیں۔ میں نے ماہا کو کہا کہ اسے کہے کہ ہم پہلے مدینہ چلتے ہیں اور وہاں ایک آدھ گھنٹا گزار کر جدہ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔"

اسرائیلی نے مجھے انگریزی میں مخاطب کرتے ہوئے کہا "اب جب کہ تمام باتیں صاف ہو چکی ہیں تو تم مجھ سے ڈائریکٹ گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ میں اچھی خاصی انگلش بول سکتا ہوں" "مدینے میں داخلے کے وقت تمھیں خود کو پولیس چیک پوسٹ پر مسلمان ظاہر کرنا اور اپنی شناخت کروانی ہوگی" میں نے اسے یہ بات کہی تو وہ ہنس پڑا اور بولا "سعودی عرب میں ہم سب مسلمان بن کر ہی آتے ہیں۔ میرے پاس مصری پاسپورٹ ہے جس پر میرا مذہب اسلام درج ہے" یہ کہہ کر وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا تو میں نے اسے کہا "تمھاری جیبوں میں موجود ہر شے ہم نے سوٹ کیس میں محفوظ کر کے رکھ دی تھی، لیکن وہ سوٹ کیس لے کر میرے ساتھی پہلے ہی جدہ جا چکے ہیں۔ تم یوں کرنا کہ چیک پوسٹ پر پہنچنے پر خود کو مریض ظاہر کرنا اور درد کی وجہ سے کراہنا اور پولیس والوں سے ایک دو فقرے عربی میں بول کر انھیں مطمئن کر دینا۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح ہم چیک پوسٹ سے با آسانی گزر جائیں گے" مدینے سے ۱۴ کلومیٹر کے فاصلے پر ہر داخلی سڑک پر چیک پوسٹیں ہیں جہاں گاڑیوں کو آہستہ کر لیا جاتا ہے۔ پولیس والے اگر کسی گاڑی کو روکیں تو وہ رک جاتی ہے ورنہ اکثر کو وہ روکے بغیر ہی آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیتے ہیں۔ ہماری گاڑی کو بھی بغیر روکے آگے بڑھنے دیا گیا (مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مکہ میں خانہ کعبہ اور مدینے میں روضۂ رسول ﷺ کی توسیع کے لیے جو غیر ملکی کمپنیاں کام کر رہی تھیں ان میں یہودی اور عیسائی بھی شامل تھے جو اسلامی ناموں سے ان غیر مسلموں کے لیے ممنوعہ دونوں شہروں میں مدتوں کام کرتے رہے ہیں) مدینے میں جنت البقیع کے قریب ہم نے پارکنگ میں اپنی گاڑی لگائی اور پہلے قیصر اور ماہا روضۂ رسول ﷺ کی زیارت کے لیے گئے اور میں اسرائیلی کے ساتھ بیٹھا رہا وہ

واپس لوٹے تو میں گیا۔ دل کی عجیب کیفیت تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں جسم اتنا ہلکا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہوا میں اڑ رہا ہوں۔ رحمت الاالعالمین، سرورِ کائناتِ، سرورِ دو عالم، محبوبِ خدا اور قیامت تک کے لیے ہمارے رہبر کے دربار میں مجھ جیسے گناہ گار کی حاضری؟ یقین جانیے میرا دل خوف، خوشی اور بے یقینی کی مشترکہ کیفیتوں سے دوچار تھا۔ میں جو زندگی میں بڑے سے بڑے خطرناک کاموں میں بے دھڑک کود جاتا تھا یہاں اتنا ڈرا ہوا تھا کہ میرے آقا، میرے مولا، میری اس حاضری کو قبول بھی فرماتے ہیں یا نہیں۔ اسی کیفیت سے دوچار میں حضور پاک کی ذری کے قریب گیا اور بے اختیار ہو کر ذری کی جالیوں کو چومنے اور آنکھوں سے لگانے لگا میری آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرے منہ سے صرف یہ جملہ ہی بار بار نکل رہا تھا ''میرے آقا، میری حاضری کو قبول فرمائیں اور مجھ پر رحم کریں میری پیٹھ پر مطوے (روضۂ رسول کے خادم اور مولوی) مسلسل چھڑیاں برسا رہے تھے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے پھول مارے جا رہے ہیں (سعودی قانون کے مطابق روضۂ رسول کو بوسہ دینے اور ذری کی جالی سے آنکھیں مس کرنے کی اجازت نہیں) میں نے اپنے وطن کے لیے DMI کی حراست میں انتہائی درجے کا تشدد برداشت کیا تھا ان چھڑیوں کی ضربات کو بھلا کیا خاطر میں لاتا۔ میں نے پوری تسلی اور اطمینان سے اپنی دلی آرزو کو پورا کیا۔ دونوں مطوے بھی مجھے چھڑیاں مارتے مارتے یا تو تھک گئے تھے اور یا انھیں یہ احساس ہو گیا ہوگا کہ اس جنونی کو اس کے ارادے سے باز رکھنا ان کے لیے ممکن نہیں، وہ اب دوسرے زائرین کی طرف متوجہ تھے۔ میں نے جی بھر کر اپنی ندامت کے آنسو حضور پاک کی خدمت میں پیش کیے اور اپنی کوئی حاجت بیان کرنے کے بجائے صرف یہی دعا مانگتا رہا کہ حضور پاک ﷺ میری حاضری کو قبول فرمائیں۔ میری سوچ کے مطابق اگر رسول پاک ﷺ کسی کی حاضری کو قبول فرمالیں تو دنیاوی اور آخرت کی تمام حاجات خود بخود پوری ہو جاتی ہیں۔ ذری سے ہٹ کر میں نے دو رکعت نفل ادا کیے اور تھوڑی دیر تلاوتِ قرآنِ پاک کر کے واپس پارکنگ کی طرف لوٹا۔ پارکنگ کے قریب ہی ایک ریسٹورنٹ سے ہم نے پلاؤ اور روسٹ مرغ لیے۔ ٹھنڈے پانی کی بوتلیں لیں اور مدینے شہر سے ینبع جانے والی سڑک پر ہو لیے۔ اس سڑک پر کئی پٹرول پمپ تھے۔ ہم نے پٹرول ڈلوایا۔ ابھی تک ہمیں کسی پولیس کی گاڑی نے نہیں روکا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض روضۂ رسول پر حاضری دینے کی وجہ تھی کہ ہم بیسیوں پولیس پٹرولنگ گاڑیوں اور چیک پوسٹوں سے گزرتے ہوئے بلا روک ٹوک رات ۹ بجے کے قریب جدہ میں اشرافیہ پہنچے۔ مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ نامعلوم میرے ساتھی بخیریت جدہ پہنچ بھی سکے یا راستے میں ہی کہیں دھر لیے گئے ہیں۔ اشرافیہ ہوٹل کی پارکنگ میں میں نے اپنے ساتھیوں کی دونوں کریسڈا گاڑیاں دیکھیں تو دل کو اطمینان ہوا کہ وہ بخیریت پہنچ چکے ہیں۔ میں نے اسرائیل کو کہا کہ بریدہ کے حالات کی وجہ سے رات کو جدہ میں حاتف کمپنی جانا محفوظ نہیں اس لیے رات وہ ہمارے ساتھ ہی بسر کرے اور اگلی صبح اپنے ساتھیوں کے پاس جائے ہوٹل میں کمرے لے کر

میں نے پہلے اپنے ساتھیوں کے متعلق معلوم کیا اور ان کے کمروں کے نمبر لے کر مزمل کے کمرے میں گیا۔ ہم بھینچ بھینچ کر گلے ملے۔ مزمل نے تمام ساتھیوں کو اپنے کمرے میں بلوالیا۔ ہم سب گلے مل اور ایک دوسرے کو بخیریت جدہ پہنچنے پر مبارک باد دی۔ اسرائیلی اور میں ایک ہی کمرے میں ٹھہرے تھے اور میں نے قیصر کو کہہ دیا تھا کہ ہم دونوں میں سے ایک غیر محسوس طور پر اُس کے ساتھ کمرے میں رہے۔ قیصر نے ساتھیوں کو ماہا کے اسلام قبول کرنے کا بتایا تو سب نے اسے مبارک باد دی۔

☆☆

اگلی صبح جب میں ساتھیوں سے ملا تو ہم سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ گزشتہ رات باوجود بے حد تھکے ہونے کے کوئی بھی سو نہ سکا تھا۔ کہا تو کسی نے کچھ نہیں لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ سب گرفتاری کے خوف سے سہمے ہوئے ہیں۔ میں نے ہوٹل کے ویٹر کے ذریعے انگریزی اخبار سعودی گزٹ منگوایا۔ خیال تھا کہ پہلے صفحے پر ہی بریدہ کے سلیمان ہوٹل میں اتنے افراد کے ہلاک ہونے اور قاتلوں کی تلاش میں پولیس کی کارروائی کی خبریں شائع ہوئی ہوں گی۔ ہم نے سارا اخبار کھنگال ڈالا لیکن اتنے بڑے واقعے کے متعلق ذرا سی بھی کوئی بات نہ ملی۔ میں نے ویٹر کے ذریعے عربی زبان کے تین اخبار منگوائے لیکن ان میں بھی کچھ نہ تھا۔ ہم حیران تھے کہ آخر بات کیا ہے جو اتنے بڑے سانحے کی کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ ساتھیوں نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ بریدہ سے جدہ کے سفر کے دوران پٹرولنگ والی درجنوں پولیس کی گاڑیاں دکھائی دیں لیکن کسی نے بھی انھیں نہیں روکا۔ خود ہماری گاڑی بریدہ سے مدینے اور مدینے سے جدہ آئی تھی لیکن ہمیں بھی راستے میں کہیں نہیں روکا گیا۔ پولیس کی طرف سے مکمل خاموشی کی وجہ سے ہماری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے ریاض میں عمر کے نمائندے عبدالخالق کو فون کیا۔ عبدالخالق چوں کہ عمر کی وجہ سے ہمارے ارادوں سے واقف تھا اور اسی نے ہمیں اسلحہ اور دستی بم دیے تھے لہٰذا میں نے اسے کہا کہ بریدہ میں اورنگ زیب سے پوچھ کر مجھے جدہ کے اشرافیہ ہوٹل میں بتائے کہ کیا بریدہ کے سلیمان ہوٹل میں معمول کے خلاف کوئی بات ہوئی ہے اور کیا پولیس والے اس ہوٹل میں آ جا رہے ہیں یا نہیں۔ تین گھنٹے بعد عبدالخالق کا فون آیا کہ اورنگ زیب نے خود سلیمان ہوٹل جا کر دیکھا ہے وہاں ہر بات معمول کے مطابق ہے اور کوئی غیر معمولی سرگرمی یا پولیس کی آمد و رفت نہیں ہے۔ عبدالخالق نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے تو میں نے اسے ٹال دیا اور کہا کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت جدہ آ گیا ہوں اور ہمارا اب بریدہ جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اس لیے وہ اورنگ زیب کو کہہ دے کہ مکان کی ہمیں اب مزید ضرورت نہیں اور اگر کوئی اورنگ زیب سے یا تم سے ہمارے متعلق پوچھے تو اسے ہرگز نہ بتایا جائے کہ ہم جدہ میں ہیں۔ عبدالخالق سے بات کرنے کے بعد میں نے مزمل کے کمرے میں تمام ساتھیوں کو بلا کر اس سارے واقعے کے بلیک آؤٹ ہونے کے متعلق ان کی رائے پوچھی لیکن کسی کی بھی سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آ رہی تھی خود میں بھی حیران تھا۔

آخر دو روز بعد یہ عقدہ اس وقت کھلا جب القصیم ایئرپورٹ (بریدہ کے ہوائی اڈے) پر دلہ انکو کے اے سی فورمین بھٹی (جس سے اپنی ملاقات کا ذکر میں کسی گزشتہ قسط میں کرچکا ہوں) کو میں نے فون کیا اور اس سے باتوں باتوں میں سلیمان ہوٹل کا ذکر کیا تو اس نے بتایا کہ وہاں ایئرپورٹ کے پاکستانی سائٹ منیجر اعجاز محمود کے سلیمان ہوٹل والوں سے خصوصی دوستانہ تعلقات ہیں۔ دو رات پیش تر اعجاز محمود نے ایئرپورٹ کا Incinerator Plant (بجلی سے چلنے والی بھٹی جس میں تمام کوڑا کرکٹ لکڑی اور لوہا وغیرہ جل کر راکھ ہوجاتا ہے یہ پلانٹ سعودی عرب کے ہر ایئرپورٹ پر لگے ہوئے ہیں) رات کو خود چلایا اور سلیمان ہوٹل کی ایک گاڑی جس میں بوریوں میں بند کچرا تھا اسے پلانٹ میں جلا کر راکھ کردیا گیا بھٹی کے کہنے کے مطابق یہ پلانٹ ہر روز صرف بعد دوپہر ایک گھنٹے کے لیے چلایا جاتا ہے لیکن اس رات خلافِ معمول اسے تین گھنٹے سے زیادہ چلایا گیا اور اعجاز محمود نے تین گھنٹے وہیں کھڑے گزارے۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آگئی تھی لیکن عقدہ پھر بھی حل نہیں ہوا تھا۔ یہ تو کئی روز بعد عبدالخالق نے فون پر بتایا کہ اورنگ زیب نے اپنے طور پر تحقیق کی تو اسے معلوم ہوا کہ ہوٹل کے ایک کمرے میں چند افراد ہلاک ہوگئے تھے اور ہوٹل کی انتظامیہ نے ان کی ہلاکتوں کو چھپانے کے لیے لاشوں کو غائب کردیا۔ ہلاکتوں کو چھپانے کی وجہ بعد میں جدہ میں بھارتی سی بی آئی کے ایک ایجنٹ کی زبانی معلوم ہوئی۔ جیسا کہ پہلے میں تحریر کرچکا ہوں کہ سلیمان ہوٹل کا انتظام ایک مشہور بھارتی ہوٹلوں کی چین کے مالک اوبرائے کے پاس تھا جس کے تقسیم ہند سے پہلے لاہور، راولپنڈی، مری اور پشاور میں اے کلاس ہوٹل تھے۔ اوبرائے بے حد متعصب ہندو تھا۔ بریدہ کے سلیمان ہوٹل کو اس نے سعودی عرب میں مقیم بھارتی اور اسرائیلی ایجنٹوں کی سرگرمیوں کا خفیہ مرکز بنا رکھا تھا۔ جہاں انھیں ہر قسم کی سہولتیں اور تحفظ میسر تھا۔ بھارتی سی بی آئی کے ایجنٹ نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ سچ اگل دیا تھا کہ بھارتی جنرل اور اس کے ساتھیوں کو نہ صرف سلیمان ہوٹل میں میرے اور میرے ساتھیوں کے ٹھہرنے کا علم تھا بلکہ انھیں یہ پتہ تھا کہ بریدہ کے ایک گھر میں میرے دوسرے ساتھی بھی ٹھہرے ہوئے ہیں اور ان کا پروگرام تھا کہ مجھ سے ایٹمی فارمولا لے کر ہمیں وجے کے ذریعے چائے میں زہر دے کر ہلاک کردیا جائے گا اور بریدہ کے گھر پر اچانک دھاوا بول کر میرے باقی ساتھیوں کو بھی ختم کردیا جاتا۔ سی بی آئی کے اس ایجنٹ کے بقول جو کھیل آپ نے کھیلا اگر اس میں دو گھنٹے کی تاخیر ہوجاتی تو وہی کھیل آپ کے ساتھ کھیلا جاتا اور ایئرپورٹ کے Incinerator Plant میں بجائے ان کی لاشوں کے آپ سب کے مردہ جسم کو بھسم کردیا جاتا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے کمرے میں لاشوں کا علم ہوتے ہی بھارت میں اوبرائے سے ہدایات لیں اور پولیس کو اطلاع دینے کے بجائے لاشوں کا وجود ہی مٹا دیا گیا کیوں کہ اگر پولیس اپنی تحقیقات شروع کرتی تو سلیمان ہوٹل میں سعودی عرب کے علاوہ پاکستان اور کئی دوسرے اسلامی ممالک کے خلاف بھارتی اور اسرائیلی ایجنسیوں کی بہت سی ایسی کارروائیاں بھی طشت ازبام ہوجاتیں جن پر

اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ قصہ کوتاہ بریدہ میں اس رات ہونے والے واقعات کی سعودی پولیس کو کبھی اطلاع نہ دی گئی اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ پولیس چاہے جہاں کی بھی ہو، خود کوئی قدم نہیں اٹھاتی جب تک کہ کسی واقعے کی رپورٹ نہ کی جائے۔ اب پھر اشرافیہ ہوٹل میں چلتے ہیں۔ اسرائیلی جاسوس کو ماہا نے کچھ اس طرح ذہنی طور پر گھیر لیا تھا کہ شام ڈھلے تک وہ ہمارے ساتھ رہا۔ وہ بار بار اپنی حاتخف میں جانے کا کہتا اور ماہا ہر بار کوئی نہ کوئی عذر کر کے اسے روک لیتی جب شام ڈھل گئی تو ماہا نے مجھے کہا کہ اب اس موساد کے ایجنٹ کو روکنا اس کے بس کی بات نہیں۔ ہمارے متعلق تو ماہا اسے پہلے ہی یقین دلا چکی تھی کہ ہم موساد اور بھارتی ایجنسیوں کے لیے کام کرتے ہیں اس لیے جب ہم نے اسے حاتخف کمپنی کے رہائشی علاقے میں لے جانے کا کہا تو وہ ہمارے ساتھ جانے پر فوری راضی ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اسرائیلی جاسوس کے ہمراہ ہونے کی وجہ سے اسے ہم سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر میں اور میرے ساتھ عمران بیٹھا اور پچھلی سیٹ پر قیصر اور ماہا کے درمیان اسے بٹھایا گیا۔ چلنے سے پہلے ہی ہم نے طے کرلیا تھا کہ اس اسرائیلی جاسوس سے کیا سلوک کرنا ہے۔ جدہ میں کنگ عبدالعزیز ایئرپورٹ کے قریب ہی سیمنٹ فیکٹری کے عقب میں حاتخف کمپنی کے مغربی ملازمین کا رہائشی علاقہ تھا اس اسرائیلی نے ہمیں راستہ بتایا۔ ماہا نے اسے باتوں میں لگا لیا تھا اور میں رہائشی علاقے کے تقریباً ساتھ ہی جدہ کے سمندر بحرۂ احمر کے ویران ساحل پر پہنچ گیا۔ اسرائیلی نے بتایا کہ اس جگہ وہ اور دوسرے مغربی ملازمین سمندر میں تیرتے اور Scuba Diving (بغیر گیس سلنڈروں کے غوطہ خوری) کرتے ہیں۔ میں نے وہیں گاڑی روک لی اور یہ کہتے ہوئے گاڑی سے باہر نکل آیا کہ چند منٹ ہم بھی سمندر کی ہوا کھالیں۔ میرے ساتھی اور اسرائیلی بھی گاڑی سے باہر آگئے تھے۔ رات کا گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا اور یہ جگہ بالکل سنسان اور اندھیری تھی۔ میں نے قیصر اور عمران کے ہاتھوں کو چھو کر اٹیک کرنے کا کہا اور اسرائیلی کو اس وقت ہمارے ارادوں کا علم ہوا جب ہم تینوں نے اسے زمین پر گرالیا تھا اور عمران اس کے سینے پر بیٹھا اس کا گلہ گھونٹ رہا تھا۔ میں نے عمران کو کہا کہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے چیخ مارنے سے روکے اور خود اس کی ان نسوں کو بڑی مشکل سے تلاش کر کے دبایا جس سے موت واقع ہوجاتی ہے۔ اسرائیلی بھی سارے داؤ پیچ جانتا تھا اس نے فوری طور پر اپنی سانس روک لی اور اپنی پوری Concentration (دھیان) اور اپنی ساری طاقت کو اپنی گردن پر مرتکز کردیا تاکہ اس کی حساس نسیں میری گرفت میں نہ آسکیں اس کی اس کوشش کی وجہ سے یہ نسیں بار بار میری انگلیوں کی گرفت سے نکل رہی تھیں۔ جب اس کی سانس روکنے کی حد ختم ہوئی تو اس نے اپنی ناک سے زور دار سانس لیا (اس کا منہ تو عمران نے پہلے ہی اپنے ہاتھوں سے بند کر رکھا تھا۔ سانس لینے سے اس کی نسیں یک دم ابھریں اور پوری طرح میری انگلیوں کے شکنجے میں آگئیں جنھیں میں نے اس وقت چھوڑا جب وہ بالکل ختم ہوگیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہوگئے اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کا شناختی کارڈ اور

دوسرے کاغذات جو صبح ہی میں نے اسے لوٹا دیے تھے، قیصر نے اس کی جیبوں سے نکال لیے اور عمران اور قیصر نے اس کے بے جان جسم کو سمندر میں پھینک دیا اس جگہ پر سمندر کراچی کے ہاکس بے اور مینڈیٹ کی طرح نہیں تھا جہاں سمندر کی لہریں دور سے آ کر ریت میں ختم ہوجاتی ہیں بلکہ بغیر بیاں سمندر نہروں کے بغیر ساکن اور کنارے سے ہی گہرا تھا اس کی لاش کو سمندر میں پھینک کر میں نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور ساتھیوں کو لے کر اشرافیہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ اسرائیلی جاسوس ہمارے لیے بے کار اور بے حد خطرناک تھا کیوں کہ بریدہ کی ساری واردات کا صرف یہی چشم دید گواہ تھا۔ ہمیں اس سے مزید کچھ معلوم تو ہو نہیں سکتا تھا لیکن یہ ہم سب کو گرفتار کروا سکتا تھا اس لیے اسے ہلاک کرنا ہی ہمارے بہترین مفاد میں تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے تمام ساتھیوں کو ایک کمرے میں بلا کر کہا کہ ابھی تک تو ہم بریدہ کی واردات میں پولیس کی گرفت سے بچے ہوئے ہیں (عبدالخالق نے ریاض سے مجھے سلیمان ہوٹل والوں کے لاشوں کو تلف کرنے اور رپورٹ نہ کرنے کا بعد میں بتایا تھا) لیکن ہم کسی وقت بھی پکڑے جاسکتے ہیں اس لیے آئندہ چند روز کے لیے ہم اپنی سرگرمیاں بالکل معطل رکھیں گے اور ترپاٹھی اور بھارتی جنرل کے کاغذات سے جن سے بھارتی اور اسرائیلی جاسوسوں کا انکشاف ہوا ہے ان سے مکمل پلاننگ کرانے کے بعد دو دو ہاتھ کریں گے۔ فی الحال چند روز ہم مکمل ریسٹ کریں گے اور تازہ دم ہوں گے۔ میرے ساتھیوں نے میری تائید کرتے ہوئے کہا کہ دو روز بعد جمعہ ہے لہٰذا ہم جمعے کو مکہ معظّمہ جا کر عمرے کی سعادت حاصل کرلیں اگلے روز ہم نے احرام خریدے اور عمرہ کرنے کی رہنمائی اور دعاؤں کی کتابیں خریدیں۔ ہم نے بیت اللہ جانا تھا جو دونوں جہانوں کے خالق اور مالک کا گھر ہے۔ یقین جانیے ہم بہت ڈر رہے تھے کہ کہیں کوئی بے ادبی نہ ہونے پائے کوئی چوک نہ ہوجائے ماہا بھی نہ صرف خود اپنی تیاری کررہی تھی بلکہ عربی زبان میں لکھی دعاؤں کا ہمیں انگریزی میں ترجمہ بھی سنا رہی تھی۔ عمران نے اسے کہا کہ اردو ترجمہ ساتھ ہی لکھا ہوا ہے تو اس نے تھائی نمبر ٹو عبداللہ کو سمجھانا شروع کردیا۔ سپنا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس سے ضبط نہ ہوسکا، اور وہ روتے ہوئے کہنے لگی ''ایک میں ہی ایسی بدنصیب ہوں جو یہاں آ کے بھی تہی دامن ہی لوٹ جاؤں گی، میں بھی مسلمان ہونا چاہتی ہوں، سچے دل سے آپ کو کہہ رہی ہوں کہ مجھے مسلمان کرلیں تاکہ عمرے کی سعادت میں بھی حاصل کرسکوں۔'' سپنا کو مسلمان کرنے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہی آن پڑی۔ اس نے غسل کیا، نئے کپڑے پہنے اور میں نے اسے کلمہ پڑھوایا۔ اس کے اسلام قبول کرنے کی خوشی میں ہم نے مٹھائی منگوا کر سب میں تقسیم کی، اپنے گھروں سے ہزاروں میل دور اور اپنی زندگی کی بازی لگائے ہوئے ہم سب ایک گھرانے کی طرح تھے۔ ہماری خوشیاں بھی سانجھی تھیں اور غموں اور دکھوں میں بھی ہم برابر کے شریک تھے۔

☆☆

جمعے کے روز ہم سب پورے اہتمام اور تیاری سے لبیک اللھم کہتے ہوئے مکہ معظّمہ کی جانب روانہ ہوئے جو جدہ سے صرف ۴۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم نے عمرہ کیا اور نہایت خشوع و خضوع سے دعائیں مانگیں۔ میں نے مکہ معظّمہ اور مدینہ میں ایک واضح فرق یہ دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور جاتے وقت ہم جوں ہی مدینے کی حدود میں داخل ہوئے مجھے اپنا جسم بڑا ہلکا اور ہوا میں تیرتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ احساس ہوتا تھا کہ چاروں طرف پھیلے نور نے مجھے اپنے اندر چھپالیا ہے۔ دل کو سکون اور دماغ میں عجیب طرح کی غنودگی محسوس ہورہی تھی۔ اس کے برعکس ربِ ذوالجلال والاکرام کے حضور بیت اللہ میں داخل ہوتے ہوئے خوف اور ڈر سے دل سہما جاتا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتا لیکن میری جو کیفیت تھی میں نے بیان کردی۔ مکہ اور مدینہ کے باسیوں میں بھی بڑا واضح فرق ہے۔ مدینے میں جو بھی ہمارے سامنے آیا۔ اس نے مسکرا کر ہمیں خوش آمدید کہا۔ دکان دار بے حد متحمل مزاج اور گاہک کے کہنے پر ساری دکان کا مال اس کے سامنے ڈھیر کردیتے ہیں جب کہ مکہ کے باسیوں کی تیوریاں ہمیشہ چڑھی رہتی ہیں راستہ پوچھنے پر وہ جھڑک کر جواب دیتے ہیں اور دکان دار کو اگر کپڑے کے دو تین مختلف تھان دکھانے کا کہا جائے تو وہ ''برا'' کہہ کر گاہک کو بھگا دیتا ہے۔ ہم شام تک بیت اللہ میں ٹھہرنے اور مغرب اور عشا کی نمازیں پڑھنے کے بعد جدہ واپس لوٹے۔ مجھے عمرے کے بعد مقامِ ابراہیم جس کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، پر نماز ادا کرنے کا موقع بھی ملا۔ اگلے روز صبح ہی ریاض سے عبدالخالق کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ سلیمان ہوٹل کی لاشوں کو تلف کردیا گیا ہے اور پولیس کو اس واردات کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی گئی یہ سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں جو ذہنی طور پر جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید تھا اب آزاد ہوگیا ہوں یقیناً یہی کیفیت میرے ساتھیوں کی بھی ہوئی ہوگی جب میں نے انھیں یہ خبر سنائی۔ اب ہم بے خوف ہو کر اپنے مشنوں کی تکمیل کے لیے آگے بڑھ سکتے تھے۔ اشرافیہ ہوٹل کا منیجر بھی پاکستانی تھا اس سے دو چار بار ملاقات ہوئی وہ خاصا بے تکلف ہوگیا۔ وہ سعودی عرب میں گزشتہ نو سال سے مختلف کام کررہا تھا اور اب اس ہوٹل کا منیجر تھا۔ اس نے سعودیوں کی سادگی اور تیل کی دولت کی ریل پیل ہونے سے غیر ملکیوں کے ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھانے کے کئی واقعات سنائے جو قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کررہا ہوں۔ جب یہاں موٹر کاریں آئیں تو سعودی بجائے ماڈل دیکھنے کے گاڑی کی لمبائی ماپ کر سب سے بڑی گاڑی خریدتے تھے اور بعض سعودیوں نے اپنی نئی گاڑی کا پٹرول ختم ہونے پر ''خلاص'' یعنی مرگئی ہے کہہ کر گاڑی کو وہیں چھوڑ دیا۔ ایک امریکن دھوکے باز نے یہاں آ کر حکومت کو آفر دی کہ وہ گرین لینڈ سے آئس برگ (برف کے پہاڑ) کو سمندری جہازوں کے ذریعے کھینچ کر جدہ کے ساحل تک پہنچا سکتا ہے جس سے نہ صرف پینے کے لیے وافر مقدار میں میٹھا پانی میسر ہوگا بلکہ گرم ہوائیں اور لو اس سے ٹکرا کر اور یخ بستہ ہو کر واپس پلٹیں گی جس سے اس علاقے کا گرم موسم ٹھنڈا ہوجائے گا اس امریکی کی اس بڑ کو حقیقت

سمجھتے ہوئے سعودی حکومت نے اسے یہ پروجیکٹ شروع کرنے کی اجازت دے دی اور کام کا آغاز کرنے کے لیے پیشگی بیس ملین ڈالر بھی دے دیے موسم کی تبدیلی اور میٹھے پانی کی فراہمی کی اس امریکی کی تجویز پہلے سعودی عرب کے اخبارات اور پھر News Week اور Time یعنی بین الاقوامی انگریزی رسائل میں جب شائع ہوئی تو ایک شور مچ گیا اول تو جہازوں کے ذریعے کسی آئس برگ کو کھینچ کر سعودی عرب تک لانا ہی ناممکن العمل تھا اور اگر وہ درجنوں سمندری جہازوں کے ذریعے کسی آئس برگ کو کھینچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو اگر آئس برگ مثال کے طور پر ایک ہزار فٹ سمندری پانی سے باہر ہوتا تو برف کی خاصیت کے مطابق سات ہزار فٹ پانی کے اندر ہوتا۔ آئس برگ کی لمبائی اور چوڑائی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ آئس برگ راستے کے جن ممالک کے قریب سے گزرتا ان میں سمندری پانی طوفان کی طرح داخل ہو کر ان ممالک کی ہر شے کو تہِ آب کر دیتا۔ دنیا بھر میں ایک شور مچ گیا۔ سعودی عرب کے حکام نے برف کے سات حصے پانی کے اندر ایک حصہ باہر ہونے کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا لہٰذا اس پروجیکٹ کو جس کا ابھی کاغذی کام بھی شروع نہیں ہوا تھا، فوری طور پر منسوخ کر دیا گیا اور امریکی بیس ملین یعنی دو کروڑ ڈالر لے کر اپنی چالاکی اور سعودیوں کی سادہ لوحی کا یہ واقعہ پیچھے چھوڑ کر امریکا چلا گیا۔

ہوٹل کے منیجر کی وساطت سے ہم نے شاہراہ فلسطین پر ایک دو منزلہ عمارت کرائے پر لی جس کی دونوں منزلوں پر آٹھ آٹھ کمروں کا ایک ایک اپارٹمنٹ بنا ہوا تھا۔ ہم نے دونوں اپارٹمنٹس کو ضروری فرنیچر اور سامان سے آراستہ کیا اور وہاں شفٹ کر گئے ایک دن میں ہی دونوں اپارٹمنٹس میں دو ٹیلی فون بھی لگ گئے اور ہم نے انٹر کام کے ذریعے دونوں منزلوں پر رابطہ بھی بنالیا۔ ان دنوں دارالحکومت اگرچہ ریاض تھا لیکن دنیا بھر کے سفارت خانے جدہ میں تھے۔ بندرگاہ ہونے کے باعث بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے لوگوں کا سعودی عرب میں داخلہ بھی یہاں پر نسبتاً آسان تھا۔ بنی مالک کا علاقہ پاکستانیوں کا گڑھ تھا اور وہاں جا کر محسوس ہوتا تھا کہ ہم سعودی عرب میں نہیں بلکہ لاہور کے کسی خالص پاکستانی وضع کے حصے میں آگئے ہیں یہاں درجنوں ریسٹورنٹ مثلاً لاہور ہوٹل، مغل محل ہوٹل، پشاوری ہوٹل، پانوں اور سگریٹوں کے کھوکھے، آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کی دکانیں اور ان کیسٹوں کے میوزک کا شور، مالشیے حتیٰ کہ ہیجڑے تک موجود تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ بنی مالک میں پاکستانی اور بھارتی مسلمانوں نے مل کر ایک مکان میں جعلی پاسپورٹوں اور ویزوں کا کام بڑے زور و شور سے شروع کر رکھا ہے اور ان کے پاس ایسی مشینیں اور کیمیکلز ہیں کہ وہ دنیا کے کسی بھی ملک کے پاسپورٹ اور ویزے کی ہو بہو ایسی نقل تیار کر سکتے ہیں جسے کوئی بھی جعلی ثابت نہیں کر سکتا۔ اگرچہ یہ کام غیر قانونی تھا لیکن ہمیں اپنے مشنوں کی تکمیل کے لیے ایسے ہی لوگوں کی ضرورت تھی۔ میں نے عمران اور قیصر کو یہ کام تفویض کیا کہ وہ ان جعلی پاسپورٹ اور ویزے بنانے والوں کو تلاش کریں اور ان سے رابطہ قائم کریں کیوں کہ ہمیں کسی وقت بھی ان کے پاسپورٹوں اور ویزوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے میں ایسے کاموں میں مزمل کو ہمیشہ پیچھے رکھتا تھا کیوں کہ

اپنی شکل وصورت، گھنی مونچھوں اور فوجی ہیئر کٹ کے علاوہ گفتگو کے انداز سے بھی وہ فوجی لگتا تھا جب کہ عمران اور قیصر اپنی شکل وصورت اور بول چال کے لحاظ سے عام شہریوں کی طرح تھے۔

اسرائیلی جاسوس کی سعودی گزٹ اور عربی اخبارات میں مختصر سی خبر شائع ہوئی کہ حاتف کمپنی کا ایک ملازم سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہوگیا۔ وہاں کے اخبارات ایسی خبروں کو شہ سرخیوں کے ساتھ نہیں بلکہ سنگل کالم میں غیر نمایاں جگہ پر شائع کرتے تھے ایسا شاید حکومت کی ایما پر کیا جاتا تھا کیوں کہ حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ غیر ملکی ملازمین ہراساں ہو کر کام چھوڑ کر واپس چلے جائیں۔ میں نے اپارٹمنٹس میں شفٹ ہونے کے بعد ساتھیوں کی مدد سے بریدہ کے مقتولین اور اسرائیلی جاسوس کی جیبوں اور سامان سے ملنے والے کاغذات کا یکے بعد دیگرے تفصیلی مطالعہ شروع کیا۔ کچھ میں تو سیدھی سادی انگریزی اور ہندی میں اس کے سعودی عرب، ایران، کویت اور ابوظہبی میں کانٹیکٹس کے متعلق لکھا ہوا تھا۔ ہندی تحریروں کا قیصر نے اردو میں ترجمہ کیا۔ ایک ڈائری ایسی تھی جس میں بے ربط الفاظ اور عجیب وغریب Spelling (ہجے) میں انگریزی لکھی ہوئی تھی۔ یہ ساری ڈائری کوڈ میں لکھی گئی تھی اور ہمیں اسے ڈی کوڈ کرنا تھا۔ قیصر نے اس ڈائری کی فوٹو کاپیاں بنوا کر عمران، مزمل، ماہا اور مجھے دیں اور ہم اپنے اپنے طور پر اسے ڈی کوڈ کرنے میں لگ گئے۔ میرے ساتھیوں میں ڈی کوڈ کرنے کی ماہر ماہا تھی تین دن خاصی مغز ماری کے باوجود ہم میں سے کوئی بھی اس کی عبارت کو ڈی کوڈ نہ کر سکا۔ اس ڈائری میں یقیناً کچھ اتنی ہی اہم باتیں تھیں جنھیں خفیہ الفاظ میں لکھا گیا تھا۔ ہم اس ڈائری کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ڈائری ترپاٹھی کی تھی۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ دنیا کے ہر ملک کا اپنا وضع کردہ کوڈ اور ڈی کوڈ رائج ہے۔ بھارتی سفارت خانے کا ٹرانسمیٹر آپریٹر یقیناً اسے ڈی کوڈ کر سکتا ہوگا۔ ہمارے ماضی اور حال کے حالات ایسے تھے کہ ہم بھارتی سفارت خانے میں داخل ہونے سے بھی ڈرتے تھے چہ جائے کہ ہم ان کے ٹرانسمیٹر آپریٹر سے یہ کہتے کہ اس ڈائری کو ڈی کوڈ کر دے۔ میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ قیصر بھارتی سفارت خانے میں چھٹی کے وقت جائے اور چوکیدار اور گارڈز سے آپریٹر کا پوچھے اور جب وہ چھٹی کر کے سفارت خانے سے نکلے تو قیصر اس کا پیچھا کر کے اس کی رہائش گاہ دیکھے اس کے بعد جو کچھ کرنا ہے اس کا ہم نے حتمی فیصلہ ابھی نہیں کیا تھا۔ قیصر نے پہلے ہی دن اس کی رہائش گاہ کا پتا چلا لیا۔ رندھیر نامی یہ آپریٹر ہماری رہائش گاہ کے قریب ہی شاہراہ مقرونہ پر فلیٹس کے ایک بلاک میں رہتا تھا جسے سفارت خانے نے اپنے سنگل رہائش والے ملازمین کے لیے کرائے پر لیا ہوا تھا۔ ہمارے لیے رندھیر کی رہائش گاہ تک پہنچنا اور اسے اغوا کرنا قدرے مشکل نہ تھا۔ دشواری صرف یہ تھی کہ کوڈ اور ڈی کوڈ کرنے والی کتابیں استعمال کے بعد ٹرانسمیٹر روم میں ہی سیف میں رکھ دی جاتی تھیں اور انھیں کمرے سے باہر لانے کی اجازت نہ تھی (یہ بات مجھے کھٹمنڈو میں پاکستانی سفارت خانے کے وائرلیس آپریٹر نے بتائی تھی جو میرے محکمے کا آدمی تھا) رندھیر رہتا بھی اکیلا تھا ورنہ، اس کی

بیوی بچوں کی جان کے عوض ہم اسے مجبور کر سکتے تھے کہ جیسے بھی بن پڑے دونوں کتابیں سفارت خانے سے باہر لے آئے۔ بہت سوچ بچار کے بعد جب کوئی حل دکھائی نہ دیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ رندھیر کو سفارت خانے سے واپسی پر راستے میں ہی اغوا کرلیا جائے اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے اپنے اپارٹمنٹس میں لایا جائے۔ میں نے سوچا تھا کہ رندھیر کو دن رات ٹرانسمیٹر کے ذریعے آنے اور جانے والے خفیہ خطوط کو کوڈ اور ڈی کوڈ کرنا پڑتا ہوگا اور اسے یقیناً ڈی کوڈ کرنے کا فارمولا زبانی یاد ہو چکا ہوگا ہم اس کو ڈائری کا صرف ایک صفحہ دے کر اسے کہیں گے کہ اسے ڈی کوڈ کرے اور ہمیں ڈی کوڈ کرنے کا فارمولا بتائے۔ ہم اس فارمولے کے ذریعے خود کوئی دوسرا صفحہ ڈی کوڈ کریں گے۔ اگر فارمولا ٹھیک ثابت ہوا تو رندھیر کو بلائنڈ فولڈ (آنکھوں پر پٹی باندھ کر) کر کے اس کے سفارت خانے کے قریب ہی چھوڑ دیں گے ورنہ پھر مجبوراً ہمیں اس سے دوسرے طریقے سے پوچھنا پڑے گا جس میں اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ یہ فیصلہ کر کے میں نے عمران، قیصر، تھائی نمبر۲ اور رضی کی ڈیوٹی لگائی کہ کل شام رندھیر کو بلائنڈ فولڈ کر کے اپارٹمنٹ لے آئیں میں نے ماہا اور سیما (سپنا) کو کہا کہ نچلے فلور کے ڈرائنگ روم کا سارا فرنیچر دونوں بنگلہ دیشی سپاہیوں کی مدد سے اوپر والے ڈرائنگ روم سے تبدیل کر دیں۔ میں نے یہ حفاظتی اقدام اس لیے اٹھایا تھا کہ رندھیر اگر ہمارے اپارٹمنٹس کو تلاش بھی کرنا چاہے تو مختلف فرنیچر ہونے کے باعث پہچان نہ سکے۔ سب تیاریاں مکمل تھیں اگلے روز میرے ساتھی رندھیر کو اغوا کرنے کے لیے بعد دوپہر تین بجے بھارتی سفارت خانے کے باہر پہنچ گئے۔

☆☆

کرنل مزمل نے میجر عمران، قیصر، تھائی نمبر۲ اور رضی کے ساتھ خود جانے پر اصرار کیا لیکن میں اسے اتنے معمولی کام کے لیے بھیجنے پر رضامند نہ ہوا۔ میں نے اسے کہا کہ ہم دونوں اپنے ساتھیوں کو کور دینے کے لیے ان کے قریب ہی موجود ہوں گے۔ مزمل کو میں جان بوجھ کر مشنوں میں پیچھے رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے اس کی بیوی سے کیا ہوا وعدہ کہ ”مزمل آپ کے ساتھ جا رہا ہے لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ اس کی بیوی اور بچے اس کی غیر موجودگی میں ہر دم اس کی واپسی کے انتظار میں رہیں گے اور میں آپ سے مزمل کو زندہ سلامت واپس لوں گی“ ہمیشہ یاد رہتا تھا۔ مجھے اپنے تمام ساتھیوں کی سلامتی کا ایک جیسا احساس تھا لیکن مزمل کو دیکھتے ہی اس کی بیوی اور بچوں کے چہرے میرے سامنے آجاتے تھے۔ عمران کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی اور رضی کی بیوی کراچی میں تھی اور اس کے بچے بھی نہیں تھے JCO اور دونوں سپاہی شادی شدہ تھے۔ تھائی نمبر۲ کے بھی بیوی بچے تھے لیکن کسی نے بھی مجھے اپنے شوہر یا باپ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی نہیں تھی۔ میرا اپنا حال یہ تھا کہ سوائے اپنی ضعیف ماں کے کسی کو بھی میرے زندہ رہنے سے زیادہ میری لاش اور پیسوں کی زیادہ طلب تھی۔ تین بجے بعد دوپہر میرا ہراول دستہ بھارتی سفارت خانے کے تقریباً سامنے رندھیر کے انتظار میں تھا اور ان سے تقریباً

پچاس میٹر کے فاصلے پر مزمل اور میں دوسری گاڑی میں انھیں کور (Cover) دے رہے تھے۔ تقریباً ساڑھے چار بجے رندھیر سفارت خانے سے باہر نکلا اور کسی کے انتظار میں ٹہلنے لگ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی سفارت خانے سے ایک پرائیویٹ گاڑی نکلی جس میں ڈرائیور کے علاوہ دو اور شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ رندھیر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ان کی گاڑی شاہ عبدالعزیز روڈ پر کوئینز بلڈنگ (Queens Building) کے قریب ساحل سمندر پر پارکنگ لاٹ میں جا کر کھڑی ہوگئی۔ یہ تمام علاقہ الیکٹرونکس، کپڑوں، منی چینجرز اور دوسری مصنوعات کی فروختگی کا مرکز تھا۔ ان کا پیچھا کرتے ہوئے ہم نے بھی پارکنگ میں اپنی گاڑیاں کھڑی کیں اور رضی اور تھائی نمبر۲ کو ان کے پیچھے بھیج کر ہم پارکنگ ایریا کے ساتھ ہی ایک اوپن ریسٹورنٹ میں جا کر مشروبات پینے لگ گئے۔ دو گھنٹے کے جان لیوا انتظار اور ریسٹورنٹ میں بیٹھے رہنے کے لیے چار بار مشروبات منگوانے کے بعد رندھیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اور ان کے پیچھے رضی اور تھائی نمبر۲ دکھائی دیے۔ کنگ عبدالعزیز روڈ سے ان کی گاڑی شاہراہ مقرونہ پر اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئی۔ ہماری گاڑیاں ان کے پیچھے تھیں اور آج کے دن کی ساری تگ و دو ضائع ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ ان کی گاڑی رہائش گاہ کی پارکنگ میں جا کر رک گئی تو رندھیر اور اس کے ساتھی دونوں ہاتھوں میں خریدے ہوئے سامان کے شاپرز تھامے گاڑی سے نکلے اور بلڈنگ میں داخل ہونے لگے تو قیصر اچانک اپنی گاڑی سے اترا اور زور سے ”رندھیر بھیا“ کہتے ہوئے اس کی طرف لپکا۔ رندھیر وہیں رک گیا اور اس کے ہمراہی بلڈنگ میں چلے گئے۔ ہم قدرے فاصلے سے یہ سارا ڈراما دیکھ رہے تھے۔ قیصر نے دو تین منٹ رندھیر سے کچھ باتیں کیں اور ہم نے دیکھا کہ قیصر رندھیر کو ہمراہ لیے اپنی گاڑی کی طرف جا رہا ہے۔ ان کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تھائی نمبر۲ اور رضی بیٹھے ہوئے تھے۔ رندھیر اور قیصر گاڑی کے بالکل قریب پہنچے تو گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا۔ رندھیر کو قیصر نے اندر دھکا دیا اور ساتھ ہی خود بیٹھ گیا اور ان کی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ گاڑی کا دروازہ کھلنے، رندھیر کو اندر دھکیلنے، قیصر کے ساتھ بیٹھنے اور گاڑی اسٹارٹ ہونے میں بمشکل چھ سات سیکنڈ لگے ہوں گے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ سارا کام اتنی تیزی سے اور غیر متوقع طور پر ہوا تھا کہ سڑک پر آنے جانے والی گاڑیوں اور چند پیدل چلنے والوں نے بھی کوئی نوٹس نہ لیا۔ میں نے چند منٹ وہیں رک کر اس کارروائی کو اگر کسی نے دیکھا ہو تو اس کا ردعمل دیکھنے کے لیے انتظار کیا۔ جب کچھ بھی نہ ہوا تو میں نے مسکراتے ہوئے مزمل کو کامیابی کی مبارک دی اور گاڑی تیزی سے اپنے اپارٹمنٹس کی طرف بڑھا دی۔

گراؤنڈ فلور کے ڈرائنگ روم میں رندھیر صوفے پر بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ منہ کھلا ہونے کے باوجود خوف کے مارے وہ بالکل خاموش تھا۔ میں نے قیصر اور رضی سے علیحدگی میں پوچھا تو قیصر نے بتایا کہ اس کے علاوہ رندھیر کو صرف چند لمحوں کے لیے ہی رضی کا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ گاڑی میں داخل ہوتے ہی رضی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی

تھی اور عمران اور تھائی نمبر ٹو کے فرنٹ سیٹ پر ہونے کی وجہ سے وہ ان کی صرف پشت ہی دیکھ سکا ہوگا۔ میں نے اس اپارٹمنٹ کے ایک پچھلے کمرے میں جہاں ساتھیوں کا سامان پڑا ہوا تھا، ایک میز اور چند کرسیاں رکھوا کر قیصر اور رضی کو کہا کہ رندھیر کو اس کمرے میں لے جائیں۔ رندھیر کو وہاں شفٹ کرنے کے بعد میں، مزمل، عمران اور قیصر کے ہمراہ اس کمرے میں گیا اور رضی کو کہا کہ اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دے۔ پٹی ہٹنے کے بعد رندھیر چند منٹ اپنے بندھے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ملتا رہا اور جب ٹھیک طرح سے ہمیں دیکھنے کے قابل ہوا تو ڈری اور سہمی ہوئی آواز میں بولا ''آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔ میں نے کیا قصور کیا ہے۔ آپ لوگ کون ہیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے اور بوڑھے ماں باپ ہیں۔ مجھ سے واقعی بڑی غلطی ہوئی تھی جو میں نے پرسوں شراب کے نشے میں سڑک پر غل غپاڑہ کیا تھا۔ میں نے بھگوان کی سوگند ان عورتوں کو تو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ان کو یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ میں نے ان سے بدتمیزی کی۔ بہرحال میں اپنے رویے کی معافی مانگتا ہوں۔ پاکستانی عورتیں ہوں یا کوئی اور، میں سب کو اپنی ماں بہنیں سمجھتا ہوں'' رندھیر کے ان بے ربط فقروں سے مجھے ساری بات سمجھ میں آگئی۔ پرسوں رندھیر اپنی بلڈنگ میں پینے کے بعد سڑک پر نشے میں اودھم مچا رہا ہوگا (سعودی عرب میں شراب لانے اور پینے کی سخت ممانعت ہے لیکن مختلف ممالک کے سفارت خانے اور مغربی اور امریکن بڑی کمپنیاں سفارتی سامان اور کمپنیوں کے کنٹینرز میں شراب منگواتی ہیں جسے وہ اپنے گھروں اور کمپنیوں کی باؤنڈری کے اندر استعمال کرتے ہیں۔ آرامکو کے وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں مغربی عورتیں موٹریں چلاتی اور سوئمنگ پول میں مردوں کے ساتھ نہاتی ہیں۔ حکومت اور پولیس بھی ان کے اس جرم سے چشم پوشی کرتی ہے۔) اور ہمسایوں کی پاکستانی خواتین کو چھیڑا ہوگا۔ اس کے خیال کے مطابق ہم یعنی ان خواتین کے گھر والوں نے اب رندھیر کو پرسش کے لیے اغوا کیا تھا۔ رندھیر بے ربط فقروں میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے اور معافی مانگنے میں لگا ہوا تھا۔ اور ہم اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا ''مسٹر رندھیر! تم نے پرسوں جو بدتمیزی کی ہے۔ اس کی سزا کے طور پر تو ہم نے تمھیں ہلاک کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لیکن اب تم نے بتایا ہے کہ تم نشے کی حالت میں تھے اور ہماری خواتین کو تم نے چھیڑا نہیں تھا تو تمھاری بات مانتے ہوئے صرف اس شرط پر تم کو معاف کردیں گے اگر تم ہمارا تھوڑا سا کام کردو'' یہ کہہ کر میں نے عمران کو اشارہ کیا اور اس نے ڈائری کا ایک ورق اور چند خالی کاغذ اور قلم ٹیبل پر اس کے سامنے رکھ دیے۔ ''مسٹر رندھیر! اس کاغذ پر کوڈ میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اسے ڈی کوڈ کرو اور ہمیں ڈی کوڈ کا طریقہ لکھ کر دو'' رندھیر نے کاغذ اٹھانا چاہا تو بندھے ہاتھ رکاوٹ بن گئے۔ قیصر نے اس کے ہاتھ کھولے۔ رندھیر نے کوڈ کی ہوئی عبارت پڑھنے کے بعد کہا ''سفارتی کوڈ نہیں بلکہ CBI کا کوڈ ہے۔'' ''جس کا بھی ہے تم اسے ڈی کوڈ کرو'' رندھیر اتنا سہما ہوا تھا کہ لرزتے ہاتھوں سے سادہ کاغذوں پر اس عبارت کو ڈی کوڈ کرنے لگا ''سر! یہ تو بہت ہی

معمولی کوڈنگ ہے۔ ہمیں ٹریننگ کے دوران پہلی عملی تربیت اسی کی دی گئی تھی۔ یہ سیدھا سادا طریقہ ہے۔ کوڈ کیے ہوئے ہر لفظ کے حرف کو الفابٹ میں پیچھے کی طرف ایک لفظ چھوڑ کر اس سے پہلے والا لکھ دیں اس سے عبارت ڈی کوڈ ہوجائے گی اور کوڈ کرتے وقت آئندہ کا ایک حرف چھوڑ کر اگلا لکھیں تو وہ سادہ عبارت کوڈڈ ہوجائے گی۔ اس نے ہمیں سمجھاتے ہوئے کاغذ پر لفظ Watch لکھا اور بولا ''اس کو کوڈ میں لکھنے کے لیے Ycvej لکھا جائے گا اور ڈی کوڈ کرتے ہوئے اس کے ہر الفابٹ سے پہلے کا ایک حرف چھوڑ کر دوسرا لکھیں تو Watch بن جائے گا لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں اور بھارتی CBI کے کوڈ کو ڈی کوڈ کرنے کی آپ کو کیا ضرورت آن پڑی ہے؟'' رندھیر نے فارمولا بتاتے ہوئے پوچھا ''رندھیر! ہم سوالوں کے جواب دیتے نہیں بلکہ صرف پوچھتے ہیں۔ اب اچھے بچوں کی طرح بھارت کے سفارتی کوڈ اور ڈی کوڈ کا فارمولا بھی بتادو'' میرے اس سوال پر رندھیر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا ''آپ لوگ کون ہیں'' ''پھر سوال کیا'' میں نے رندھیر کو ایک زوردار تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ میری پیروی کرتے ہوئے مزمل نے اپنا ریوالور اور قیصر نے اپنا رام پوری چاقو نکال لیا۔ رندھیر کے تو ریوالور اور چاقو دیکھتے ہی ہوش اڑ گئے۔ ''لیکن مجھے سفارتی کوڈ اور ڈی کوڈنگ زبانی یاد نہیں'' رندھیر نے ہکلاتے ہوئے کہا ''اتنے عرصے سے دن رات یہی کام کررہے ہو۔ اتنے وقت میں تو گدھوں کو بھی اپنے گھر کا راستہ یاد ہوجاتا ہے اور تمھیں فارمولا یاد نہیں'' میں نے یہ کہا تو قیصر نے اپنا چاقو اس کی گردن کے قریب لاتے ہوئے کہا ''اسے واقعی فارمولا یاد نہیں۔ اس لیے یہ ہمارے لیے بے کار ہے۔ میں اسے ختم کردیتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے قیصر نے چاقو اس کی گردن پر رکھ دیا۔ ''میں بتاتا ہوں۔ مجھے فارمولا یاد ہے۔ بھگوان کے لیے مجھے ایک موقع دیں اور مجھے مت ماریں'' رندھیر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''ٹھیک ہے۔ تمھیں ایک موقع دیتے ہیں لیکن یاد رکھنا کہ اگر غلط اور جھوٹ لکھا تو پھر تمھاری خیر نہیں'' یہ کہتے ہوئے میں نے قیصر کو اشارہ کیا اور اس نے چاقو اس کی گردن سے ہٹا دیا۔

رندھیر نے سفارتی فارمولا جو دنیا بھر کے بھارتی سفارت خانوں اور بھارتی وزارت خارجہ میں خفیہ رابطے کے لیے رائج تھا، کاغذ پر لکھنا شروع کیا اور بولا ''آج ہی دہلی سے ملا ہوا ایک کوڈڈ پیغام اور اسے ڈی کوڈ کی ہوئی تحریر میری جیب میں ہے جسے میں نے صبح ٹائپ کر کے فسٹ سیکریٹری کو دینا ہے۔ آپ اس سے ملا کر دیکھ لیجیے گا کہ میں نے غلط فارمولا نہیں لکھا ہے۔'' ڈیڑھ گھنٹے میں رندھیر نے یہ پیچیدہ فارمولا لکھ کر اپنی جیب سے کوڈڈ پیغام اور اس کی ڈی کوڈ کی ہوئی عبارت نکالی۔ مزمل اور میں اس کی دونوں جانب بیٹھ گئے اور فارمولا سمجھنے اور اس کا ڈی کوڈڈ تحریر سے موازنہ کرنے لگے۔ دہلی سے آنے والے کوڈڈ اور ڈی کوڈڈ پیغام کے مطابق رندھیر نے فارمولا بالکل صحیح لکھا تھا۔ ''اگر آپ کی تسلی ہوگئی ہو تو مجھے جانے کی اجازت دیں'' رندھیر نے التجائی لہجے میں کہا ''دیکھو رندھیر! ہمارے ساتھ تعاون کا ہم تمھیں معاوضہ دیں گے۔ تمھیں سعودی عرب میں بھیج کر تمھاری وزارت خارجہ نے تمھارے ساتھ زیادتی

کی ہے۔ یہاں نہ تو کوئی مندر ہے اور نہ ہی تمھیں کھلے بندوں پوجا کرنے کی اجازت ہے۔ تم نے بھی یہاں آنا اسی لیے قبول کیا ہوگا کہ تمھیں اوورسیز الاؤنس ملے۔ اگر تم ہمارے لیے کام کرو گے تو تمھیں مالی تشنگی نہیں رہے گی۔ آج کے کام کا معاوضہ ایک ہزار ریال تمھیں دیا جائے گا۔ آج کی ساری باتوں کو راز رکھنا تمھارے ہی مفاد میں ہے۔ تمھاری رہائش گاہ کا ہمیں علم ہے اور جلد ہی ہم تم سے رابطہ کریں گے۔ تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ ہمیں کس قسم کی انفارمیشن کی ضرورت ہے۔'' میں نے رندھیر کو لائن پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اگر یہ راز افشا ہوگیا تو تمھارا سفارت خانہ تمھیں اس لیے کوئی سزا نہیں دے سکے گا کیوں کہ اس سے پہلے ہی ہم تمھیں ہلاک کردیں گے'' مزمل نے اپنے انداز میں اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے رندھیر کو ایک ہزار ریال دیے اور قیصر، رضی، عمران اور تھائی نمبر ٹو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے شاہراہ مقرونہ کے قریب چھوڑ آئے۔ ادھر میں اور مزمل ترپاٹھی کی ڈائری کو ڈی کوڈ کرنے میں لگ گئے تھے۔

☆☆

ہم جیسے جیسے ترپاٹھی کی ڈائری کے صفحات کو ڈی کوڈ کرتے جارہے تھے، ویسے ویسے ہماری حیرانگی میں اضافہ اور ترپاٹھی کے اب تک کیے ہوئے کام اور بھارتی اور اسرائیلی جاسوسوں کے جو امریکن پاسپورٹ پر سعودی عرب میں کام کررہے تھے، نیٹ ورک میں ایک دوسرے سے رابطے کے نئے طریقے اور غیر مروّجہ طریق کار کا جان کر ترپاٹھی کے تجربے اور اپنے کام سے اس کی لگن کی عظمت کو دیکھ کر اسے سلوٹ کرنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ واقعی جاسوسی کے کاموں کا ماہر تھا۔ عمدہ کارکردگی دکھانے والا چاہے دشمن ہی کیوں نہ ہو اسے خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیے۔ ترپاٹھی کا جسم تو Incinerator کی آگ میں راکھ بن چکا تھا لیکن اس کی چالوں اور نیٹ ورک سے کام کرنے کے طریقے کو نہ سراہنا زیادتی ہوگی۔ رندھیر کو واپس چھوڑ کر ساتھی واپس آئے تو عمران اور قیصر بھی ہمارے ساتھ ڈائری کو ڈی کوڈ کرنے میں شامل ہوگئے۔ ہمارا دوسرا سارا دن بھی اسی میں صرف ہوا اور شام گئے ہم اس کام سے فارغ ہوئے۔ اب ہمارے پاس نہ صرف بھارتی CBI کے سعودی عرب، ایران اور ابوظہبی میں تعینات CBI اور ملٹری انٹیلی جنس کے سبھی کارندوں کے نام پتے اور ٹیلی فون نمبرز تھے بلکہ ان پاکستانیوں کے متعلق بھی مفصل معلومات تھیں جو ان ممالک میں بھارتی مفادات کے لیے کام کرتے اور ان کے سپے رول پر تھے۔ یہ سارے بھارتی اور پاکستانی سانپ تھے جن کے بلوں اور کمین گاہوں کا ہمیں علم ہوچکا تھا۔ عمران اور قیصر کہنے لگے کہ زیادہ چھان بین کی ضرورت نہیں۔ نام اور ایڈریس ہمارے پاس ہیں اور ہمیں ان سب کو کیفر کردار تک پہنچا دینا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے ان میں سے ہر ایک کو کریدنا شروع کردیا تو عین ممکن ہے کہ کام کے آغاز میں ہی ہم گرفت میں آجائیں اور ہمیں جان سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ ''ہمیں اپنی زندگیوں کی تو پرواہ نہیں، لیکن یہ ضرور چاہتے ہیں کہ بے شک ہم کو اپنی جانوں کا نذرانہ دینا

پڑے لیکن ہم جس مشن پر نکلے ہوئے ہیں، اسے ادھورا نہیں رہنا چاہیے۔'' قیصر نے یہ کہا تو عمران اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''ہماری نفری بہت تھوڑی اور دشمن تعداد میں ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں بھی سپاہی دین محمد، سپاہی اکرم، JCO منصف اور تھائی ساتھی عبداللہ صرف ہمارے حکم کی پابندی کرنے تک کے ہی اہل ہیں۔ رضی اور سیما (سپنا) بھی بس خانہ پری کے لیے ہیں۔ ماہا کو اس مشن پر اکیلا بھیجنے کا ہم رسک اس لیے نہیں لے سکتے کیوں کہ اس نے اسلام قبول کرنے سے قبل منشیات کے استعمال سے توبہ کرلی تھی۔ قوتِ ارادی سے وہ اب تک اپنے عہد کو نبھا رہی ہے لیکن ان منشیات کو یک لخت چھوڑنے سے اس کے ذہن پر بہت برا اثر پڑا ہے اور ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہے اور جب بھی وہ کوئی بات کرتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں قوتِ فیصلہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں نے کئی بار نوٹ کیا ہے کہ مختلف کھانوں کے مینو کارڈ میں سے اپنی پسند کا کھانا چننے میں اسے کافی وقت لگ جاتا ہے اور بعض اوقات تو وہ ویٹر کو ہی کہہ دیتی ہے کہ اپنی پسند کا کھانا لے آئے۔ باقی ہم چاروں یعنی آپ کرنل مزمل، قیصر اور مجھ سے صرف آپ ہی نے اب تک اپنی پلاننگ سے ان پاکستان دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ ہم نے تو اب تک صرف آپ کے ہاتھوں اور بازوؤں کا کام ہی کیا ہے۔ میں نے آپ کے کسی مشن کے طریق کار سے اگر دل میں اختلاف کیا تو مشن کی تکمیل کے بعد یہ احساس بھی ہوا کہ آپ کی پلاننگ میری سوچ سے بدرجہا بہتر تھی۔ میرے خیال میں یہی حال کرنل مزمل اور قیصر کا ہوگا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار یا جھجک نہیں کہ جس عمدہ پلاننگ کے بعد آپ خود سب سے پہلے دشمنوں میں کود پڑتے ہیں اس سے آپ کے شہید ہوجانے کا بہت احتمال ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو آپ تو یہ عظیم درجہ حاصل کرلیں گے اور ہم یوں ہی بھٹکتے رہ جائیں گے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ ایک تو آپ ہمیشہ سامنے مت آئیں اور یہ کام ہمیں کرنے دیں اور دوسری بات یہ کہ جب دشمن کی ڈائریوں اور دیگر کاغذات کا ہمیں علم ہوچکا ہے تو پھر چھان بین اور ان سے معلومات اکٹھی کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے بلکہ ہمیں ان دشمنانِ پاکستان کو ایک کے بعد ایک کرکے ختم کردینا چاہیے۔''

عمران نے جو کچھ کہا تھا کافی حد تک صحیح تھا۔ میں نے اس کے اس جذبے کی تعریف کرتے ہوئے جواب دیا کہ آئندہ ہم صرف ہر نیٹ ورک اور اس کے لیے کام کرنے والوں کو ختم کرنے تک ہی اپنے مشن کو محدود رکھیں گے۔ جہاں تک میرے پیچھے رہنے اور ساتھیوں کو آگے بھیجنے کا سوال ہے تو میں اس سے قطعاً متفق نہیں ہوں اور نہ ہی ایسا کروں گا۔ میں نے ہی آپ سب ساتھیوں کو اس مشن میں میرا ساتھ دینے کی پیش کش کی تھی اور میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ اپنی جان بچانے کے لیے آپ کو آگے کردوں۔ جہاں تک شہادت کا سوال ہے تو یہ سعادت خود حاصل نہیں کی جاتی بلکہ ربِ ذوالجلال والاکرام جس کو نوازنا چاہے، اسے ہی نصیب ہوتی ہے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا ''اس وقت فوری مسئلہ یہ

ہے کہ رندھیر سے ہمیں سفارتی کوڈ بھی ملا ہے ہمارا یہاں کا سفارت خانہ اور دنیا بھر میں ہمارے سفارت خانوں کے علاوہ اسلام آباد میں وزارت خارجہ بھی بھارتی سفارت خانوں کے پیغامات کیچ کرتے ہوں گے۔ بھارتی کوڈ اگر انھیں مل جائے تو وہ ساری دنیا میں بھارتی پیغامات کو ڈی کوڈ کر سکتے ہیں۔'' میں نے عمران اور مزمل کو یہ بھی کہا کہ اگر وہ چاہیں تو بنگلہ دیش کے سفارت خانے کو بھی یہ کوڈ دے دیں لیکن دونوں نے ایسا کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ جب ہم بنگلہ دیش کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتے تو پھر اس کے مفاد کے لیے کام کیوں کریں ''بنگلہ دیشی حکومت سے تو یہ بھی دور نہیں کہ وہ بھارتی حکومت کو یہ بتادیں کہ ان کا کوڈ اب راز نہیں رہا اور ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔'' مزمل نے یہ بات کہہ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ مزمل، عمران اور میں نے کئی گھنٹوں کی سردردی کے بعد رندھیر کے لکھے ہوئے سفارتی کوڈ کو صاف انگلش میں سہل طریقے سے لکھا اور اس کی چار فوٹو کاپیاں بنوالیں اگلے روز صبح دس بجے میں پاکستانی سفارت خانے گیا۔ سفارت خانے کے باہر پاکستانیوں، سعودیوں اور غیر ملکیوں کا ہجوم کھڑا تھا جو اپنے پاسپورٹوں کی تجدید اور پاکستانی ویزے کے حصول کے لیے کھڑے تھے۔ سفارت خانے کا دروازہ بند تھا اور دروازے پر کھڑا پہرے دار بڑی منت سماجت کے بعد اور مٹھی گرم ہونے پر کسی کا پیغام اندر جانے والے سے چپڑاسیوں کو دیتا تھا۔ میں نے پہرے دار کو بیس ریال دیے تو اس نے مجھ پر مہربانی کرتے ہوئے مجھے گیٹ کے اندر کیا۔ وہاں چپڑاسیوں کی حکومت شروع ہوتی تھی۔ پہلے تو مجھے چپڑاسی کو اپنا بائیو ڈیٹا بتانا پڑا۔ جب وہ اس سے مطمئن نہ ہوا تو بیس ریال اس کی نذر کیے اور اس نے اندر والے چپڑاسی کو بھی بیس ریال دینے کا کہہ کر دروازہ کھلوا کر مجھے اندر دھکیل دیا اس طرز سلوک سے میرا مارے غصے کے برا حال ہورہا تھا۔ اندر والے چپڑاسی نے بھی میرا مکمل بائیو ڈیٹا پوچھا اور جب میں نے اس سے کہا کہ میں فرسٹ ملٹری اتاشی سے ملنا چاہتا ہوں تو اس نے جواب دیا کہ وہ اوپری منزل پر بیٹھتا ہے۔ بڑی ڈھٹائی سے اس نے کہا کہ مجھے بیس ریال دو تو میں تمھیں اوپر بھیج دیتا ہوں۔ پھر اوپر والا چپڑاسی جانے اور تم جانو۔ یہ ساری گفتگو ایک تنگ سے کوریڈور میں ہورہی تھی۔ یہیں پر ایک دروازہ تھا۔ میرے پوچھنے پر چپڑاسی نے کہا کہ اس میں فرسٹ سیکریٹری نذیر صاحب کا کمرہ ہے اور اگر ان کا چپڑاسی اجازت دے تو پہلے اس کمرے میں جا کر چپڑاسی کو ''راضی'' کیا جاتا ہے اور پھر وہ چٹ لے کر فرسٹ سیکریٹری کے کمرے میں جاتا ہے۔ اسی اثنا میں فرسٹ سیکریٹری کے دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر نکلا۔ اس سے پہلے کہ اندر والا چپڑاسی دروازہ بند کرتا میں نے دروازے میں پاؤں پھنسا کر اسے دھکا دیا۔ چپڑاسی کو مجھ سے اس گستاخی کی توقع نہیں تھی وہ پیچھے جا پڑا اور میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ چپڑاسی غصے سے لال پیلا ہو کر کچھ بکنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے گھونسوں اور ٹھڈوں پر رکھ لیا۔ اس کے لیے یہ بالکل انہونی بات تھی۔ کہنے لگا۔ ''سیکریٹری صاحب کے کمرے کا دروازہ سامنے ہے اور وہ میٹنگ میں مصروف ہیں۔

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی ٹیبل کی دوسری جانب سیکریٹری اور میری طرف پشت کیے تین مرد اور دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور یہ سب چائے اور بسکٹوں سے شغل فرما رہے تھے۔ سیکریٹری نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس کا چپڑاسی جو میرے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا، کہنے لگا۔ ''سر! اس نے مجھے تھپڑوں اور ٹھڈوں سے مارا ہے اور زبردستی اندر گھس آیا ہے۔'' میں نے پلٹ کر چپڑاسی کو گریبان سے پکڑا اور تھپڑوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے کہا ''یہ تھپڑ تجھے اس لیے مار رہا ہوں کہ تمھیں تمیز سے بولنا آجائے۔'' سیکریٹری نے بھانپ لیا تھا کہ چپڑاسی کے بعد اس کی باری ہے۔ اس لیے بڑی ملائم آواز میں بولا ''اس کم بخت کو ذرا بھی احساس نہیں کہ شرفا اور افسروں سے کیوں کر بات کی جاتی ہے۔ اسے معاف کریں میں دراصل میٹنگ میں مصروف تھا اس لیے...'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''مسٹر نذیر! چائے اور بسکٹوں کے ساتھ تم کن کے ساتھ میٹنگ کررہے ہو۔ مجھے ذرا ان کے نام اور عہدے بتاؤ۔'' نذیر ایک دم گھبرا گیا ان دنوں جنرل ضیا الحق کا نیا نیا مارشل لا لگا تھا اور فوجی افسران اکثر نوکر شاہی کے ایسے افسران پر چھاپے مارتے تھے جو دفتری اوقات میں بھی سارا وقت عیاشیوں میں گزارتے تھے۔ نذیر نے اشارے سے بیٹھے ہوئے افراد کو کچھ کہا اور دونوں عورتیں اپنے لاؤڈ میک اپ زدہ چہرے اور انگ انگ دکھاتے کپڑوں کو سائیڈ ٹیبل پر پڑے برقعوں میں چھپاتی اور تینوں مرد اچنبھے سے مجھے گھورتے کمرے سے باہر چلے گئے۔ نذیر نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مجھے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی اور چپڑاسی کو بلا کر پہلے ٹھنڈا اور پھر چائے لانے کا کہا جسے میں نے فوراً منع کرتے ہوئے نذیر کو کہا ''باہر سیکڑوں پاکستانی، سعودی اور غیر ملکی اپنے کاموں کی وجہ سے کھڑے ہیں اور تم فاحشہ عورتوں اور ان کے دلالوں کے ساتھ میٹنگ کررہے ہو۔ دو چپڑاسیوں کو ۴۰ ریال اور تمھارے چپڑاسی کو تھپڑوں کی رشوت دے کر میں تم تک پہنچا ہوں۔ پاکستان کا نام تم لوگ خوب روشن کررہے ہو۔'' ''میں ابھی ان چپڑاسیوں کے خلاف ایکشن لوں گا۔'' وزیارت خارجہ کے مروّجہ سیاسی انداز میں نذیر نے مجھے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''کیا آپ اپنا تعارف کرانا پسند کریں گے؟'' ''میں نے جب اپنا تعارف کروایا تو تم اس کرسی پر نہیں سفارت خانے کے باہر ہوگے۔ مجھے فرسٹ ملٹری سیکریٹری سے فوری ملنا ہے۔'' میں نے دھمکی آمیز لہجے میں نذیر کو کہا۔ ''میں ابھی اسے بلاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے نذیر نے انٹر کام پر فرسٹ ملٹری سیکریٹری کو اپنے دفتر میں بلایا۔ پانچ سات منٹ میں ہی فرسٹ ملٹری سیکریٹری میجر جنرل کی وردی پہنے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میں کرسی سے اٹھا اور معانقہ کرنے کے بہانے اس سے قریب ہو کر سرگوشی میں اسے کہا ''بغیر سوال جواب کیے مجھے اپنے دفتر میں لے چلیں۔ ملکی مفاد کی ایک بہت اہم بات کرنی ہے۔'' جنرل کو شاید ایسی سچویشن سے پہلے بھی رابطہ پڑ چکا ہوگا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور پہلی منزل پر اپنے کمرے میں لے گیا۔

☆☆

میں جنرل کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنے وسیع دفتر میں سائیڈ پر پڑے صوفے پر مجھے بٹھاتے ہوئے میرا اصلی نام لیتے ہوئے پوچھا ''تم یہاں کہاں؟'' میں نے جنرل کو پہچاننے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ میری پریشانی کو بھانپتے ہوئے جنرل ہنس پڑا اور میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا ''اپنے ذہن کو خوانخواہ مت الجھاؤ۔ تم نے مجھے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن میں ایک بار تمھیں قریب سے بہت اچھی طرح سے دیکھ چکا ہوں'' ''جنرل صاحب! ایک طرف تو آپ مجھے یہ تلقین کر رہے ہیں کہ میں اپنے ذہن کو نہ الجھاؤں اور دوسری طرف مجھے الجھن پر الجھن میں ڈالے جا رہے ہیں'' میں نے واقعی پریشان ہو کر جنرل کو جواب دیا۔ جنرل میری پریشانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو چائے اور بسکٹ لانے کا کہا اور سگار کا ڈبہ اٹھا کر پہلے مجھے سگار آفر کیا اور پھر خود ایک سگار سلگا کر کش لینے لگا۔ شاید وہ میرے ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔ میں نے بھی صوفے سے ٹیک لگا لی اور اپنے سگار کا دھواں کمرے میں پھیلانے لگا۔ جنرل نے جب محسوس کیا کہ میں دوبارہ اپنے متعلق اس سے نہیں پوچھوں گا تو وہ کہنے لگا ''یاد کرو لاہور میں اپنی ٹریننگ کا زمانہ۔ ایک دن تمھارے انسٹرکٹر ایک میجر نے تمھیں ایک شام اچانک پلازہ سینما میں فلم دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ فلم ختم ہونے کے بعد جب وہ میجر اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا تو وہ اسٹارٹ نہیں ہوتی تھی۔ میجر نے تمھیں دھکا لگانے کا کہا اور تم دھکا لگانے لگے۔ یہ سب ڈراما تھا۔ میں اس وقت ساتھ کی گاڑی میں بیٹھا تھا اور تمھاری تربیت کے دوران تمھاری کارکردگی کی غیر معمولی رپورٹوں کی وجہ سے تمھیں دیکھنا چاہتا تھا ان دنوں میں اسی محکمے میں بریگیڈیئر تھا۔ میں نے تمھیں دیکھ کر اور تمھاری رپورٹیں پڑھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ تم ہمارے محکمے کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو گے۔ میری رپورٹ پر ہی تمھیں گروپ لیڈر بنایا گیا تھا'' مجھے یہ سارا واقعہ یاد آ گیا۔ بالکل ایسے ہی ہوا تھا جیسا جنرل نے بیان کیا تھا۔ ایک تو وہ فلم ایسی بور تھی کہ میں نے میجر کو کسی دوسرے سینما میں چلنے کا کہا لیکن اس نے اسی سینما میں جانے پر اصرار کیا اور میرے مسلسل نہ کہنے پر کیوں کہ میں دن بھر کی ٹریننگ سے تھکا ہوا تھا اور شام کو اس بچگانہ فلم کو دیکھنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ میجر نے مجھے کہا تھا This is My Order (یہ میرا حکم ہے) اور مجھے اس کے آرڈر کی تعمیل میں مجبوراً ڈھائی گھنٹے یہ بور فلم دیکھنی پڑی۔ ہمارے محکمے کا ایک دفتر بالکل قریب لارنس روڈ پر تھا اور چوں کہ یہ پروگرام پہلے سے طے تھا اس لیے ہمیں اسی سینما میں جانا پڑا اور مجھے ٹھیک ٹھاک گاڑی کو دھکے لگانے پڑے۔ ''جنرل صاحب مجھے سب یاد ہے کیوں کہ اتنی بور فلم کو مجبوراً دیکھنے اور جیپ کو دھکا لگانے کو میں کیسے بھول سکتا ہوں'' اتنی دیر میں چائے آ گئی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے جنرل کو کہا ''میں یہاں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ غیر سرکاری مشن پر آیا ہوں۔ ہمارا مشن پاکستان کے دشمن بھارتی اور اسرائیلی ایجنٹوں کے نیٹ ورک کو توڑنا اور انھیں ختم کرنا ہے۔ بریدہ میں اسی مشن کے پہلے Chapter (باب) کی تکمیل کے دوران CBI کے ایک

ڈائریکٹر ترپاٹھی کی ڈائری اور ایک بھارتی جنرل کے کاغذات کے علاوہ ایک اسرائیلی جاسوس اور ٹاٹا اٹامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ایک انجینئر کی ڈائریاں اور کاغذات ہمارے ہاتھ لگے۔ ترپاٹھی کی ڈائری CBI کے کوڈ میں لکھی تھی جسے ڈی کوڈ کروانے کے لیے ہم نے بھارتی سفارت خانے کے ٹرانسمیٹر آپریٹر کو اغوا کیا اور CBI کے کوڈ کے علاوہ بھارتی سفارتی کوڈ بھی اس سے حاصل کر لیا۔ کاغذات اور ڈائریاں چوں کہ بہت اہم ہیں اور ان میں نہ صرف بیرونِ ملک بلکہ پاکستان کے اندر دشمن کے مفادات میں کام کرنے والوں کے نام بھی ہیں اس لیے میں نے سوچا کہ انھیں جلد از جلد کسی Competent Authority (ذمہ دار شخصیت) کے حوالے کر دوں اس لیے سفارت خانے میں آپ کے پاس چلا آیا'' جنرل جو آنکھیں پھاڑے میری باتیں سن رہا تھا یک لخت بولا ''کیا یہ سب تمھارے پاس موجود ہے'' ''جی ہاں'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا لیکن میں اپنے ہمراہ اس لیے نہیں لایا کیوں کہ سفارت خانے کے اندر لانے کے بعد مجھ سے کوئی غیر متعلقہ شخص ان کاغذات کو چھین نہ لے'' جنرل فوراً بولا ''بہت اچھا کیا۔ یہاں کے سول ملازمین اور خصوصاً فسٹ سیکریٹری نذیر بھٹو کی سفارش پر یہاں تعینات کیا گیا تھا۔ اس کی حکومت ختم ہو گئی اور وہ گرفتار ہو گیا لیکن اس کے چمچے ابھی تک اسی کے راگ الاپ رہے ہیں۔ CBI کے ڈائریکٹر کا اصلی نام جگدیش ہے اور یہاں پر اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہاں ہماری مختصر سی انٹیلی جنس فورس کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ بھارتی Special Task Force (خصوصی اہداف کی فوج) کا ایک جنرل یہاں آیا ہوا ہے۔ CBI کا جگدیش اور جنرل چند دنوں سے دکھائی نہیں دے رہے یقیناً وہ کسی خصوصی مشن پر گئے ہوں گے'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''جنرل صاحب! بھارتی جنرل، جگدیش ٹاٹا کا انجینئر، اسرائیلی، جاسوس اور اس کا مصری انجینئر اور بریدہ میں ان کا میزبان وجے جو سلیمان ہوٹل میں AC انجینئر تھا ایک ایسے مشن پر چلے گئے ہیں جہاں سے ان کی واپسی ناممکن ہے'' ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' جنرل نے بے چینی سے پوچھا ''صرف یہ کہ ان سب کے Expose (کھل جانے) کے بعد انھیں زندہ رکھنا حماقت تھی اس لیے ہم نے انھیں پرلوک بھیج دیا اور قصیم ایئرپورٹ کے سائٹ منیجر اعجاز محمود نے جو پاکستانی ہے لیکن بھارتی مفاد کے لیے کام کرتا ہے، ان سب کے بے جان جسموں کو ایئرپورٹ کے Incinerator Plant میں جلا کر راکھ کر دیا کیوں کہ بھارتی حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ سعودی پولیس ان کی ہلاکتوں کا کھوج لگاتے لگاتے ان کے سعودی عربیہ اور پاکستان کے خلاف زیرِ زمین کیے ہوئے کاموں اور اسرائیلی رابطوں تک پہنچ سکے۔ اسی لیے سلیمان ہوٹل میں پانچ اور جدہ میں اسرائیل جاسوس کی ہلاکتوں کی تاحال پولیس میں کوئی رپورٹ نہیں کی گئی'' میری بات سن کر جنرل خوشی میں آپے سے باہر ہو کر بے اختیاری طور پر اپنے مادری لب و لہجے میں بولا ''اوئے ظالم کا بچہ۔ تو نے تو کمال کر دیا۔ ان حرام خوروں نے تو ہماری زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور تو نے اس سب کا خاتمہ کر دیا۔ ڈیر خلے کار کرے دہ'' جنرل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دیر تک خوشی کے اظہار

میں دباتا رہا۔ مجھ سے ہمارا ایڈریس لے کر اس نے شام سات بجے ہمارے ہاں آنے کا وعدہ کیا اور جب میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ دو بنگلہ دیشی فوج کے افسر، ایک JCO اور دو سپاہیوں کے علاوہ ایک بنگلہ دیشی شہری، ایک بھارتی مسلمان ایک تھائی مسلمان کے علاوہ دو نو مسلم بھارتی اور اسرائیلی عورتیں بھی ہیں اور اسرائیلی عورت موساد کی کہنہ مشق جاسوسہ رہ چکی ہے اور ہمارے حسن سلوک سے تائب ہو کر اب ہمارے لیے کام کر رہی ہے اور ہمارے سارے گروپ کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ پاکستان کے خلاف کام کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے، تو جنرل نے کہا کہ وہ میرے تمام ساتھیوں سے مل کر فخر محسوس کرے گا ''میرے جذبات اور میرے ہاتھ تو اس یونیفارم نے جکڑ رکھے ہیں ورنہ جی تو بہت چاہتا ہے کہ دشمنانِ پاکستان کو کچا چبا جاؤں'' ساتھ ہی آہستہ ہنستے ہوئے بولا ''But I Am Not a Cannibal (لیکن میں آدم خور نہیں ہوں)'' غرض یہ کہ بار بار مجھے کامیابی کی مبارک باد دیتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹے بعد جنرل مجھے رخصت کرنے سفارت خانے کے دروازے تک آیا۔

شام ٹھیک سات بجے جنرل ہمارے اپارٹمنٹس پر آ گیا۔ میں نے کرنل مزمل، میجر عمران، قیصر اور باقی سارے ساتھیوں سے اسے ملوایا۔ جنرل نے سب کو ان کی ہمت و شجاعت اور پاکستان کے لیے خدمات سر انجام دینے پر مبارک باد دی اور حوصلہ افزائی کی، جنرل میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگا یہ تو پاکستانی ہے اور جو کچھ بھی کر رہا ہے فرض سمجھ کر اپنے وطن کی خاطر کر رہا ہے۔ اس سے بہت زیادہ مبارک کے آپ مستحق ہیں کیوں کہ چاہے آپ کے دل میں پاکستان کی کتنی بھی محبت ہو لیکن ظاہری طور پر آپ غیر ملکی ہیں پاکستان سے آپ کی وابستگی اور اس کے مفاد میں اپنی جانوں کو داؤ پر لگانے سے آپ کا درجہ اس پاکستانی سے بہت بلند ہے جو آپ کا گروپ لیڈر ہے'' میں نے جنرل کو سارے کاغذات، ڈائریاں دیں (ان سب کی فوٹو کاپیاں ہمارے پاس محفوظ تھیں) رات کا کھانا بھی جنرل نے ہمارے ساتھ کھایا اور جاتے وقت میرے ساتھیوں کے جذبے کو پھر سراہا۔ جنرل کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ ایک میرے ساتھی ہیں جو غیر ملکی ہونے کے باوجود پاکستان کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کو ہمہ وقت تیار ہیں اور ایک وہ پاکستانی ہیں جو پاکستان میں رہتے، پاکستان کا کھاتے، پاکستان کا پانی پیتے، پاکستانی فضاؤں میں سانس لیتے اور پاکستان کے وسائل سے فیض یاب ہو رہے ہیں لیکن گن گاتے ہیں بھارت کے اور یہ کوئی ایک بار نہیں بلکہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی ان کی پاکستان دشمنی کا آغاز ہو گیا تھا اور ان کی غلیظ سوچوں کا اظہار کبھی پختونستان، کبھی عظیم بلوچستان، کبھی پنجاب کی تقسیم اور کبھی سندھو دیش کی صورت میں ہوتا رہا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے بھی انھوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا بلکہ سقوطِ ڈھاکا کے بعد ان کو اپنی بدخوابی کی تعبیریں دکھائی دینے لگی۔ ان کے ان ناپاک مقاصد کو محبّ وطن پاکستان کبھی بھی پورا ہونے نہیں دیں گے اور ان شاء اللہ پاکستان کی سرحدیں سمٹیں گی نہیں بلکہ آگے بڑھیں گی ان دشمنانِ پاکستان پاکستانیوں کے متعلق مجھے فارسی کی ایک مثال یاد آئی ہے ''یک

خطا، دو خطا، سہ خطا، مادر بہ خطا'' یعنی پہلی غلطی اور پھر ویسی ہی دوسری غلطی اور پھر تیسری غلطی کا مطلب ہے کہ غلطی کرنے والے کی ماں سے کوئی ''غلطی'' ہوئی ہے۔ اور یہ تو سن ۴۷ء سے اب تک مسلسل غلطیاں ہی کرتے چلے آرہے ہیں۔ نامعلوم ان دشمنانِ پاکستان کی مائیں زندہ بھی ہیں یا نہیں ورنہ ان سے ہی پوچھ لیتے کہ ان کی اولاد کی مسلسل پاکستان دشمنی کا راز کیا ہے اور نہیں تو کم از کم یہ تو ضرور پتا چل جاتا کہ ان کے پڑوس میں کوئی ہندو تو نہیں رہتا۔

ہم نے جنرل کو اپنے ہاتھ لگے سارے کاغذات اور ڈائریاں تو دے دی تھیں لیکن اس کی یہ بات میں اپنے دماغ سے نہ نکال سکا کہ وردی ہونے کی وجہ سے میرے جذبات اور ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ ان ڈائریوں اور کاغذات کے حوالے سے پاکستان کے خلاف جاسوسی کرنے والوں اور اس کے مفاد کو نقصان پہنچانے والوں سے ہمیں ہی دو دو ہاتھ کرنے ہوں گے۔ میں نے مزمل، عمران، قیصر اور ماہا کے ساتھ مل کر فوٹو کاپیوں کی مدد سے ان جاسوسوں اور دشمنانِ پاکستان کی ایک فہرست بنائی جس میں ان کے نام، پتے اور رابطے کے ذرائع لکھے تھے اس طویل فہرست میں سے ہم نے ان ناموں کو ہائی لائٹ Hi-Lite کیا جو نمایاں طور پر یہ کام کر رہے تھے اور یہ فیصلہ کیا کہ پہلے ان پر ہاتھ ڈالنا چاہیے اور ان کے بعد دوسروں سے نپٹا جائے۔ فہرست میں ایک نام بار بار کھٹکتا تھا... راجیش۔ یہ نام ترپاٹھی (جگدیش) اور بھارتی جنرل دونوں کی ڈائریوں میں لکھا ہوا تھا۔ جدہ میں ریڈک انٹرنیشنل کمپنی میں یہ شخص کسی ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ تھا، ریڈک انٹرنیشنل کا مرکزی دفتر جدہ میں تھا اور اس کے مالک کا نام فرعون تھا۔ راجیش کی رہائش پاکستانی سفارت خانے کے قریب ایک کوٹھی میں تھی جس کے آدھے حصے میں کوئی تجارتی دفتر بنا ہوا تھا اور آدھا راجیش کے پاس تھا۔ یہ دفتر کسی بھارتی کمپنی کا تھا۔

دو روز کی نگرانی (Surveillance) کے بعد عمران اور قیصر نے مجھے یہ رپورٹ دی تھی اور یہ بھی بتایا کہ بھارتی کمپنی کا دفتر اگرچہ شام ۵ بجے بند ہو جاتا ہے لیکن رات کو ۱۱ بجے کے بعد دفتر کے اندرونی حصے میں روشنیاں جل اٹھتی ہیں اور راجیش بھی ایک رات ۱۲ بجے کے بعد کوٹھی کے دفتر والے حصے سے باہر آیا اور اپنی گاڑی پر کہیں چلا گیا۔ ایک عجیب بات عمران نے نوٹ کی کہ رات کو دفتر کے حصے والی چھت پر سے تین ایریل نکل کر خاصی بلندی پر چلے جاتے ہیں۔ عمران کے مطابق یہ خفیہ ایریل وائرلیس پیغامات وصول کرنے اور بھیجنے کے لیے تھے۔ ہم نے اس رپورٹ کی روشنی میں پہلے راجیش کو کھنگالنے کا فیصلہ کیا۔

پانچواں باب

میں سب سے پہلے راجیش کو دیکھنا چاہتا تھا چناں چہ مزمل کو ہمراہ لے کر میں ریڈک انٹرنیشنل کے ہیڈ آفس میں گیا جہاں راجیش کسی ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ تھا۔ گزشتہ قسط میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کمپنی کے مالک کا نام فرعون تھا۔ مجھے یوں ہی خیال آیا کہ کمپنی کے مالک سے ملا جائے۔ آٹھ منزلہ بلڈنگ ریڈک انٹرنیشنل کی تھی جس کی آٹھویں منزل پر مالک کا دفتر تھا۔ ہم آٹھویں فلور پر پہنچے تو پہلے مالک کی آٹھ نو سیکریٹریوں سے پالا پڑا جو سب مصری اور مغربی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ مالک سے ملنے کے لیے آٹھ دس روز پیش تر وقت لینا پڑتا ہے اور ملنے کی وجہ بھی لکھنی پڑتی ہے۔ ہمارے ملنے کی وجہ تو کوئی تھی نہیں میں نے مزاحاً ایک چٹ پر ''موسیٰ'' لکھ کر اسے فولڈ کر کے اسٹیپل کیا اور ایک سیکریٹری کو یہ چٹ دیتے ہوئے کہا کہ اسے مسٹر فرعون تک لے جائے وہ فوراً بلوالیں گے۔ سیکریٹری حیرت زدہ سی اپنی کمپنی کے قواعد وضوابط کو توڑتے ہوئے چٹ مالک کے پاس لے گئی اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سیکریٹری نے کمرے سے باہر آ کر کہا کہ مالک بلا رہا ہے۔ میں اور مزمل اس کے عالی شان دفتر میں داخل ہوئے تو ایک بڑی آبنوسی میز کے دوسری جانب ایک شخص بیٹھا ہوا حیرانگی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم میز کے قریب گئے تو اس نے انگریزی میں پوچھا کہ آپ دونوں میں سے موسیٰ کون ہے میں نے جواب دیا کہ کوئی نہیں تو اس نے میری چٹ سامنے کر دی ''موسیٰ تو میں نے اس لیے لکھا تھا کہ آپ کی سیکریٹریوں کی فوج نے ہمیں بتایا تھا کہ آپ سے ملاقات کے لیے آٹھ دس روز پہلے وقت لینا پڑتا ہے اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا لہٰذا میں نے موسیٰ لکھ دیا کہ آپ کو احساس ہو جائے کہ مدتوں پہلے بھی آپ موسیٰ سے نہ ملے اور اس کی بات نہ ماننے کے نتیجے میں غرقاب ہوئے تھے اس لیے شاید اس بار یہ کوتاہی نہ کریں۔'' میرے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی اور

مزمل ہونقوں کی طرح مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا مذاق سمجھ کر فرعون قہقہے لگاتے ہوئے بولا ''نہیں اس بار کوتاہی نہیں ہوگی آپ دونوں تشریف رکھیں'' یہ کہہ کر اس نے اپنی پی اے کو بلا کر کافی لانے کا کہا اور دیر تک میرے اس مذاق پر ہنستا رہا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہمیں اس سے کام تو کوئی نہیں، صرف اس کا نام سن کر یہ عملی مذاق کرنے کو جی چاہا تو وہ کہنے لگا کہ مدتوں کے بعد اسے بھرپور قہقہے لگانے کا موقع ملا ہے اور وہ ہم سے گاہے بگاہے ملنے میں خوشی محسوس کرے گا اور اگر ہمیں ملازمت کی ضرورت ہے تو وہ ہمیں معقول ملازمت بھی دے سکتا ہے (کسی پاکستانی یا بھارتی کو دیکھتے ہی سعودی عرب میں کمپنیوں کے مالکان اور افسران ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ملازمت کے حصول کے لیے آئے ہیں) تقریباً آدھ گھنٹے کی خوش گپیوں کے بعد ہم فرعون کے دفتر سے باہر نکلے تو اس کی سیکریٹریوں نے مسکراتے ہوئے ہمارا خیر مقدم کیا وہ شاید ہمیں کوئی بہت بڑی بزنس پارٹی سمجھ رہی تھیں۔ میں نے ایک سیکریٹری سے کہا کہ ہمیں ان کے دفتر میں ایک بھارتی راجیش سے ملنا ہے تو اس نے جواب دیا کہ راجیش تھرڈ فلور پر الیکٹرونکس ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ ہے اور وہیں بیٹھتا ہے۔ ہم تھرڈ فلور پر آئے تو دفتر کے شروع میں ہی ایک ملازم سے راجیش کا پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ ابھی ابھی گراؤنڈ فلور پر کینٹین میں گیا ہے۔ ہم گراؤنڈ فلور پر آئے تو افسران کے لیے کینٹین کے مخصوص حصے میں صرف ایک ٹیبل پر تین افراد بیٹھے تھے۔ میں نے مزمل کو اشارہ کیا تو اس نے ان کے پاس جا کر راجیش کا پوچھا۔ بڑے اسمارٹ سے اور ٹائی لگائے ہوئے ایک شخص نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا اتنی دیر میں میں بھی مزمل کے پاس پہنچ چکا تھا۔ مزمل نے مجھے دیکھ کر مصافحہ کرنے والے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''مسٹر راجیش! ہمیں غلط فہمی ہو گئی تھی ہم جس راجیش کو تلاش کرنے آئے تھے وہ آپ نہیں ہیں اس لیے معذرت آپ کو ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر مزمل واپس پلٹا اور میں بھی اس کے ساتھ بلڈنگ سے باہر آ گیا۔ ہم دونوں نے راجیش کو دیکھ لیا تھا اور جس طرح نام کے مغالطے کا اسے کہا گیا تھا اس سے راجیش کے دل میں خدشہ ضرور پیدا ہو گیا ہوگا کیوں کہ مزمل کے مخصوص فوجی چہرے اور لب و لہجے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ سویلین نہیں ہے۔ ہم کار پارکنگ میں گئے اور مزمل نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ٹھیک اسی لمحے پارکنگ سے ایک اور گاڑی نکلی۔ سعودی عرب میں بڑی امریکن گاڑیاں مثلاً کیڈلک، بیوک، اولڈزموبیل اور جرمنی کی مرسیڈیز کے مختلف ماڈل میری کمزوری تھیں۔ میں ہر گاڑی کو توجہ سے دیکھتا۔ یہ سفید رنگ کی شیور لیٹ کیپری کلاسک تھی۔ مزمل تو گھر جانے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن میں نے اسے کہا کہ ہم پہلے شاہراہ مدارس پر ریڈسی اپارٹمنٹس میں جائیں گے جہاں ہمارے فسٹ ملٹری اتاچی کے کہنے کے مطابق ایک امریکی پاسپورٹ ہولڈر پاکستانی پائلٹ کیپٹن رضا رہتا تھا جس سے ہمیں بڑی مفید معلومات مل سکتی تھیں شاہراہ مدارس ایک ایسی سڑک ہے جہاں ٹریفک بہت معمولی ہوتی ہے۔ ایک موڑ پر گھومتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ریڈک انٹرنیشنل والی سفید گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ میری

چھٹی حس نے فوراً کام کرنا شروع کردیا ”ہمارا پیچھا کیا جارہا ہے لہٰذا اس وقت کیپٹن رضا سے ملنا موقوف اور اب ہمیں اس پیچھا کرنے والی گاڑی کو چکر دینا اور جھٹکنا ہے کیوں کہ اس گاڑی والوں کو (اس گاڑی میں دو افراد سوار تھے) کسی صورت بھی ہماری رہائش گاہ کا علم نہیں ہونا چاہیے“ میری یہ بات سن کر مزمل نے ایک دو اور ٹرن لیے اور ایک جگہ سڑک کے کنارے اپنی گاڑی کھڑی کر کے باہر نکلا اور بونٹ اٹھالیا۔ پیچھا کرنے والی گاڑی ہمارے اتنے قریب تھی کہ اس کے رکنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ آہستہ رفتار سے وہ ہمارے پاس سے گزر گئی۔ میں نے نوٹ کیا کہ ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے اپنے چہرے دوسری طرف کرلیے تھے تاکہ پہچانے نہ جاسکیں۔ مزمل نے پانچ چھ منٹ انجن کو ٹٹولنے کے بعد بونٹ بند کردیا۔ اب ہمارا رخ ایئرپورٹ کی جانب تھا میں نے اپنی طرف کے گاڑی کے باہر لگے عقب میں دیکھنے والے آئینے کا رخ اس طرح سیٹ کیا کہ پیچھے آنے والی گاڑیوں کو دیکھ سکوں۔ اب وہی سفید گاڑی خاصا فاصلہ رکھ کر ہمارا پیچھا کررہی تھی۔

☆☆

میں نے مزمل کو کہا کہ ایئرپورٹ پہنچ کر پارکنگ میں گاڑی لگا کر پیچھا کرنے والی گاڑی کا انتظار کرتے ہیں۔ ہمیں گاڑی پارک کیے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہی سفید گاڑی آگئی اور ہم سے کچھ فاصلے پر پارکنگ میں کھڑی ہوگئی۔ پیچھا کرنا اب کنفرم ہوگیا تھا۔ میں نے مزمل کو کہا کہ گاڑی اسٹارٹ کرے اور تیزی سے واپس لے چلے۔ ہم پارکنگ ایریا سے باہر نکل رہے تھے تو وہ گاڑی بھی اپنی جگہ سے ہلی اور ہمارے پیچھے ہولی۔ میں نے مزمل کو کہا کہ اب حد ہوگئی ہے اور ہمیں ان پیچھا کرنے والوں سے دو دو ہاتھ کرنے ہی ہوں گے۔ مزمل فوراً تیار ہوگیا۔ میں نے اسے کہا کہ اب وہ پھر شاہراہ مدارس پر چلے کیوں کہ وہاں کم ٹریفک ہوتی ہے۔ سفید گاڑی بدستور ہمارے پیچھے تھی جب ہم شاہراہ مدارس پر پہنچے ریڈ سی اپارٹمنٹس کے آگے کوئی عمارت نہیں تھی۔ میں نے مزمل سے کہا کہ اپارٹمنٹس کے ختم ہوتے ہی دائیں جانب اپارٹمنٹس کی باؤنڈری وال کی طرف گھومے اور تیس میٹر آگے جا کر گاڑی روکے اور گاڑی سے فوراً باہر آ کر میرے ساتھ پیچھے کی طرف چلے تاکہ ہم سفید گاڑی کو روک سکیں۔ گاڑی رکتے ساتھ ہی ہم نے اپنے ریوالور ہاتھوں میں تھامے اور پیچھے کی طرف تیز قدموں سے چلے۔ سفید گاڑی ابھی باؤنڈری وال کے ساتھ ہماری طرف گھومی ہی تھی کہ ہم اس کے قریب پہنچ گئے۔ ہم اس گاڑی کے بالکل سامنے تھے گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور اس کے دونوں جانب فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں افراد پر ہم نے ریوالور تان لیے۔ اگرچہ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اے سی چل رہا تھا لیکن ہمارے اس بالکل غیر متوقع ایکشن سے گاڑی میں بیٹھے ہوئے دونوں افراد اس درجہ بوکھلا گئے کہ انھوں نے اندر بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ اٹھالیے۔ اپنی شکل و شباہت اور پختہ رنگ

سے یہ دونوں بھارتی لگتے تھے۔ ہم نے بہ یک وقت دونوں اطراف کے دروازے کھولے اور ان دونوں کے سروں پر اپنے ریوالوروں کے دستوں سے زور دار چوٹیں لگائیں جن سے وہ بے ہوش ہوگئے۔ اگرچہ یہ جگہ سنسان تھی لیکن کسی وقت بھی چوکیدار یا کوئی اور اس طرف آسکتا تھا ہم نے تیزی سے ان کی قمیصوں اور پتلونوں کی تلاشی لی اور شناختی کارڈ اور اقامے (سعودی عرب میں رہائش کے اجازت نامے) نکال لیے۔ میں نے گاڑی کا اے سی بند کردیا اور گاڑی کی چابی نکال لی تاکہ انھیں ہوش میں آنے کے بعد بھی گاڑی چلانے میں خاصا وقت لگ جائے۔ دو منٹ کے اندر یہ سارا کام کر کے ہم اپنی گاڑی کی طرف لپکے اور اسے تیزی سے موڑ کر واپسی کی سڑک پر ہوئے اور اپنے اپارٹمنٹس پر پہنچ گئے۔ اقاموں اور شناختی کارڈوں سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں بھارتی ہندو تھے لیکن ان کے شناختی کارڈ ریڈک انٹرنیشنل کے نہیں تھے بلکہ دونوں ایک چھوٹی کنسٹرکشن کمپنی موستہ کے ملازم تھے اس سے دو نتیجے اخذ کیے جاسکتے تھے کہ یا تو وہ ہمارا پیچھا ہمارے ریڈک انٹرنیشنل میں پہنچنے سے پہلے ہی سے کررہے تھے اور یا وہ ریڈک انٹرنیشنل کی ہی کسی اور کمپنی کے ملازم تھے۔ دوسری صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ انھیں ہمارا پیچھا کرنے پر کس نے مامور کیا تھا۔ فرعون کے پاس تو ہم آدھا گھنٹے بیٹھے تھے لیکن راجیش سے زیادہ سے زیادہ آدھ منٹ ہماری بات ہوئی تھی اور اس کے بعد فوری طور پر ہم اپنی گاڑی لے کر چل پڑے تھے، راجیش کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ کسی کو ہمارا پیچھا کرنے کا کہے۔ اب صرف فرعون یا کوئی دوسرا ہی ہوسکتا تھا، میں نے یہ مسئلہ دوسرے ساتھیوں کو بتایا تو قیصر بولا ”جب آپ کو یقین ہے کہ آپ کا پیچھا کیا جارہا تھا اور ان کو ہوش میں آنے میں اور گاڑی کی ڈپلیکیٹ چابی لینے میں بھی خاصا وقت لگے گا تو میرے خیال میں، میں اور میجر عمران دوسری گاڑی لے کر جاتے ہیں اور ان کے ہوش میں آنے اور ان کے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کا انتظار کرتے ہیں، اب ہم ان کا پیچھا کریں گے اور اصل راز معلوم کر کے رہیں گے۔“ رضی، JCO اور عبداللہ تھائی بھی ان کے ساتھ جانے پر اصرار کرنے لگے۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ تینوں گاڑیاں لے کر ان ساتھیوں کو مزمل وہاں تک لے جائے اور خود واپس آجائے۔ دونوں گاڑیوں میں باقی ساتھی ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں اور ان کا پیچھا کریں۔ عمران بہت جوش میں تھا، کہنے لگا ”سر! اس مشن کا ہیڈ مجھے مقرر کردیں، ان شاء اللہ آپ کو مکمل کامیابی کی خبر سناؤں گا۔“ میں نے اسے کہا کہ ہیڈ کوئی بھی نہیں ہوگا۔ سبھی ساتھی تمھارے اور قیصر کے کہنے پر عمل کریں گے۔ میں اپنے ساتھیوں کے جذبات سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ جان تو دے سکتے تھے لیکن ان میں جذبات سے دور رہ کر اور حالات کو دیکھ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے میں مطمئن نہیں تھا۔ یہ بھارت تو تھا نہیں کہ میں ساتھیوں کو ”بزن“ یا حملہ کرو کہتا اور وہ مخالفین کو ڈھیر کردیتے، سعودی عرب میں ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا کیوں کہ سعودی عرب سے پاکستان کی دوستی اس قدر گہری اور مضبوط تھی کہ دوسرے ممالک اس پر رشک کرتے تھے، ہماری ذرا سی بے احتیاطی یا بھارت

کے آگے ہماری وجہ سے سعودی حکومت کی جواب دہی ہمارے ملکی تعلقات پر اثر انداز ہوسکتی تھی۔ میں نے عمران اور قیصر کو مزید ہدایات دیں اور کہا کہ کسی بھی صورت میں اسلحے کا استعمال نہ کیا جائے اور نہ ہی کسی کو ہلاک کیا جائے ''آپ کا یہ مشن صرف Surveillance (نگرانی) تک محدود ہے۔ آپ نے صرف انفارمیشن حاصل کرنی ہے اور اس سے آگے ہرگز ایک قدم بھی نہیں اٹھانا۔'' میں نے ساتھیوں کو رخصت کیا اور خود آج کے واقعات کے پیش نظر یہ سوچنے لگا کہ آخر ان پیچھا کرنے والوں کی ڈوریاں کن کے ہاتھ میں ہیں۔ میں رات کے دو بجے تک اپنے ساتھیوں کے انتظار میں جاگتا رہا۔ مزمل تو ایک گھنٹے میں ہی ریڈ سی اپارٹمنٹس کے پیچھے باقی ساتھیوں کو کیپری کلاسک گاڑی دکھا کر واپس لوٹ آیا تھا۔ مزمل نے بتایا کہ وہ دونوں اس وقت بھی بے ہوش تھے۔ جب ساتھیوں کا انتظار کرتے کرتے دو بج گئے تو میں نے مزمل کو جگایا اور کہا کہ نگرانی کرنے والے ہمارے آدمی ابھی تک نہیں پہنچے لہٰذا میں دونوں سپاہیوں کو لے کر ان کی تلاش میں جا رہا ہوں اور تم بھی ہمارے ساتھ چلو، ہم چاروں ریوالوروں اور دستی بموں سے لیس تھے۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ ہمارے ساتھی کسی مشکل میں گرفتار نہ ہوگئے ہوں۔ میں نے مزمل سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگا۔ اگر ایسی بات ہوئی تو جدہ میں جتنے بھی بھارتی ہندو ہیں چاہے وہ سویلین ہوں یا فوجی ہم ان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم چاروں گاڑی میں بیٹھنے ہی والے تھے کہ ہمارے ساتھیوں سے بھری دونوں گاڑیاں کمپاؤنڈ میں داخل ہوئیں۔ جب سب صحیح سلامت گاڑیوں سے باہر نکلے تو میں نے چین کا سانس لیا۔ مزمل نے عمران کا فوج میں سینئر ہونے کے ناتے اس سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو عمران بولا ''سر! میں صرف گروپ لیڈر کو جواب دہ ہوں'' مزمل یہ جواب سن کر خاموش ہوگیا۔ سب ساتھی نچلے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے تو بجائے عمران کے قیصر نے بولنا شروع کیا۔ ''ہم وہاں اس گاڑی کی مسلسل نگرانی کرتے رہے۔ رات گیارہ بجے کے قریب وہ دونوں ہوش میں آئے۔ ہم اپنی اپنی جگہوں پر ان کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے ان میں سے پہلے ایک گاڑی میں سے باہر نکلا۔ دماغی چوٹ کی وجہ سے اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں دوسرا بھی باہر آ گیا۔ گاڑی کی چابی بھی نہیں تھی اور ان کی جیبیں بھی خالی تھیں انھیں یقیناً احساس ہوچکا تھا کہ ان کے ساتھ ہاتھ ہوگیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حملہ آور نزدیک ہی موجود ہوں۔ دونوں نے اپنے سروں کو سہلایا اور ایک دوسرے کے پیچھے سر پٹ دوڑتے ہوئے مین روڈ پر آگئے۔ ہم اپنی گاڑیوں کی بتیاں بجھا کر ان کے پیچھے ہی مین روڈ پر آگئے کافی دیر انتظار کرنے کے بعد ان کو ایک ٹیکسی ملی جس میں سوار ہو کر وہ ہمارے اپارٹمنٹس کے قریب ہی ایک سڑک پر گئے اور ایک بڑی بلڈنگ کے ایک اپارٹمنٹ کے انٹرکام پر کسی کو بلایا۔ ایک شخص نیچے آیا اور انھیں کچھ پیسے دیے جن سے انھوں نے ٹیکسی کو فارغ کیا اور اس آدمی کے ساتھ ہی اس کے گھر میں چلے گئے'' قیصر یہ بتا کر خاموش ہوگیا تو میں نے پوچھا ''گھر کے اندر سے آنے والے آدمی کا حلیہ بتا

سکتے ہو؟'' ''ہلکی روشنی میں فاصلے سے ہم حلیہ تو ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکے لیکن ان کے گھر کے اندر جانے کے بعد گھر پر لگی ہوئی نیم پلیٹ ضرور پڑھ لی اور نام سن کر شاید آپ چونک پڑیں'' قیصر نے اپنے بیان کو پرلطف بناتے ہوئے جواب دیا۔ رات کے دو بجے کے بعد یہ لوگ واپس آئے تھے ہم ان کے لیے پریشان ہو رہے تھے اور اب قیصر بات ادھوری چھوڑ کر سسپنس پیدا کر رہا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر کہا ''میں صرف آپ لوگوں کی سلامتی کے لیے متفکر تھا۔ آپ بخیریت واپس آگئے ہیں، یہی کافی ہے۔ آپ کھانا وغیرہ کھائیں اور آرام کریں۔'' میں کرسی سے اٹھنے لگا تو قیصر نے میری جھنجھلاہٹ بھانپتے ہوئے سنجیدگی اختیار کی اور بولا ''جناب... نیم پلیٹ پر لکھا ہے، محمد نذیر، فسٹ سیکریٹری سفارت خانہ اسلامی جمہوریہ پاکستان'' یہ سن کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ عمران نے بھی قیصر کی بات کی تائید کی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان کی وزارت خارجہ کا ایک ذمہ دار افسر اس حد تک گر سکتا ہے کہ بھارتی ہندوؤں کے ذریعے میری Surveillance (نگرانی) کروائے۔ یہ حضرت بھی کھٹمنڈو میں پاکستانی سفیر کی طرح پنجاب کے ہی رہنے والے تھے۔ میں حیران تھا کہ ان غداروں کی موجودگی کے باوجود پاکستان اب تک کیسے قائم ہے۔ کیا ہمارے سفارتی اور وزارت خارجہ کے راز اب بھی محفوظ ہیں؟ کیا ان کالی بھیڑوں سے ہمارا ملک کبھی پاک بھی ہوسکے گا؟ کیا سقوط ڈھاکا جیسے المیے بار بار دہرائے جائیں گے؟ کیا ہم اس قابل بھی نہیں کہ اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکیں۔ کیا گاندھی اور نہرو کی یہ پیش گوئی درست تھی کہ پاکستان صرف چالیس پینتالیس سال میں ہی اکھنڈ بھارت کا ایک حصہ بن جائے گا کیا سقوط ڈھاکم کے بعد اندرا گاندھی کی تقریر جس میں اس نے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کر کے ہم نے دو قومی نظریے کو بحیرہ عرب میں غرق کردیا ہے، درست تھی۔ کیا ہمیں انگریزوں کی صد سالہ غلامی کے بعد اب ہندوؤں کی غلامی میں رہنا پڑے گا؟ دشمن کو تو ہم پر وار کرنے کا حق ہے۔ دکھ تو اس وقت ہوتا ہے جب اپنے لوگ ہی زخم دینے لگیں۔ غصے، شرم اور ندامت سے میرے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا جسے سب ساتھیوں نے محسوس کیا۔ مزمل، عمران اور قیصر میرے قریب آئے اور میری پشت سہلاتے ہوئے مزمل بولا ''آپ کو جو دکھ ہوا ہے مجھے اس کا بخوبی اندازہ ہے لیکن آپ کو حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ چند یا بہت سے غداروں کے ساتھ ساتھ آپ کو ایسے محب وطن پاکستانی بھی لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں مل جائیں گے جو اپنے وطن کی آبرو اور سالمیت کے لیے کٹ مرنے کو ہمہ وقت تیار ہیں۔ پاکستان کے وجود میں آتے ہی بلکہ اپریل سن ۴۷ء سے مسلمانوں نے اس وطن کے لیے جانوں کی قربانی دینی شروع کی تھی۔ کچھ کو آزادی ورثے میں ملتی ہے اور کچھ آزادی چھین کر حاصل کرتے ہیں۔ ہم نے بھی آزادی چھین کر حاصل کی تھی اور اسے برقرار رکھنے کے لیے اپنے خون سے جب بھی سینچنا پڑا تو جانوں کے نذرانے پیش کرنے والوں کی کمی نہیں ہوگی۔ آپ ہرگز آزردہ نہ ہوں اور دل میں یہ یقین رکھیں کہ پاکستان ان

شاء اللہ قیامت تک قائم و دائم رہے گا" ساتھیوں کی کہی ہوئی تمام باتیں لکھوں تو کئی صفحات بھر جائیں گے۔ غرض یہ کہ ساتھیوں کے دلاسے اور حوصلے سے مجھے بڑی تقویت ملی اور ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے فرسٹ سیکریٹری اور راجیش سے نپٹا جائے۔

☆☆

اگلے روز ۱۱ بجے میں اکیلا پاکستانی سفارت خانے گیا۔ دونوں بھارتیوں کے شناختی کارڈ اور اقامے میرے پاس تھے۔ سفارت خانے کے باہر پاکستانیوں اور غیر ملکیوں کا پہلے کی طرح ہی ہجوم تھا۔ مجھے دیکھتے ہی گارڈ نے سلام کیا اور دروازہ کھول کر مجھے اندر آنے دیا۔ اندر والے چپڑاسی نے بھی بڑے با آدب ہو کر اندرونی دروازہ کھلوایا۔ میں نے اسے کہا کہ میں فرسٹ سیکریٹری سے ملنے آیا ہوں۔ اس نے سیکریٹری کے دفتر کے چپڑاسی کو دروازہ کھٹکھٹا کر بلایا جس نے مجھے دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا اور بہت ہی با آدب ہو کر کہنے لگا "کیا آپ چٹ لکھنا پسند کریں گے یا سیدھے صاحب کے پاس جائیں گے۔ یہ سارا امتیازی سلوک میرے تھپڑوں اور فرسٹ ملٹری اتاچی کے مجھے باہر تک چھوڑ کر آنے کی وجہ سے تھا۔ میں نے چٹ پر نام لکھ کر چپڑاسی کو دیا اور سیکریٹری نے مجھے فوراً ہی اپنے دفتر میں بلالیا۔ بڑے تپاک سے ملنے اور بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کرتے ہوئے وہ بولا "آج تو آپ کو چائے پیے بغیر میں جانے نہیں دوں گا" وہ تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور ادھر میرا جی چاہتا تھا کہ اس کا وہ حشر کروں جسے اس کی سات پشتیں بھی بھول نہ سکیں۔ سیکریٹری کے پاس پہلے سے دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے جو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ میں نے فرسٹ سیکریٹری کو کہا کہ مجھے اس سے علیحدگی میں بات کرنی ہے۔ وہ دونوں میری بات سنتے ہی اٹھ کر چلے گئے۔ یہ ان جی حضوریوں کی قسم کے تھے جو کسی اعلیٰ افسر کے پاس بلاوجہ جا کر چاپلوسی اور خوشامد کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے جاتے ہی میں نے خاموشی سے دونوں اقامے اور شناختی کارڈ نکال کر میز پر اس کے سامنے رکھ دیے۔ میں چاہتا تھا کہ انھیں دیکھ کر اس کا ردعمل دیکھوں۔ نذیر نے انھیں الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا "بھارتی ہندوؤں کے ہیں" "جی ہاں یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ ان کا آپ سے کیا واسطہ ہے" میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ میں مسلسل نذیر کی آنکھوں اور چہرے کو دیکھ رہا تھا لیکن ان میں کوئی پریشانی دکھائی نہ دی۔ "نہ تو میں نے ان لوگوں کو کبھی دیکھا ہے اور نہ ہی ان کو جانتا ہوں" نذیر نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے اسی انداز میں کہا "یہ دونوں کل رات آپ کے گھر گئے اور آپ انھیں اپنے گھر کے اندر لے گئے اور اب کہہ رہے ہیں کہ آپ انھیں جانتے ہی نہیں" "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں اپنی بات پر قائم ہوں" نذیر نے اسی ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا جو وزارت خارجہ کے ملازمین کا امتیاز ہے "نذیر صاحب! اگر آپ برا نہ منائیں تو کیا آپ مجھے بتا سکیں گے کہ آپ کی رہائش کہاں ہے" میرے اس

سوال پر نذیر نے جواب دیا "کیوں نہیں۔ آپ نے ایئرپورٹ جاتے ہوئے ایک چوک کے درمیان ایک بہت بڑا سائیکل دیکھا ہو گا جسے نمائش کے لیے لگایا گیا ہے۔ اس چوک کے بائیں ہاتھ والی سڑک پر تین گھر چھوڑ کر چوتھا میرا گھر ہے جسے میں سیکنڈ سیکریٹری کے ساتھ شیئر (Share) کر رہا ہوں" جس گھر پر گزشتہ رات قیصر اور عمران نے فسٹ سیکریٹری کی نیم پلیٹ دیکھی تھی وہ نذیر کے بتائے ہوئے گھر سے تقریباً ۱۶ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ نذیر بولا "آخر بات کیا ہے۔ مجھے بتائیں تا کہ آپ کی اور میری الجھن دور ہو سکے" میں نے نذیر کو کہا کہ آدھے گھنٹے کے لیے کیا وہ میرے ہمراہ باہر چلنے کو تیار ہے" نذیر نے ہاں کہا تو میں نے اس کے فون پر عمران اور قیصر کو کہا کہ وہ دونوں جلد از جلد پاکستانی سفارت خانے پہنچ جائیں اور گارڈ کو اپنے نام بتائیں۔ فون کرنے کے بعد میں نے نذیر کو کہا کہ میرے دو ساتھی قیصر اور عمران نامی یہاں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے لہٰذا گارڈ کو کہلا دیں کہ ان کی آمد کی ہمیں فوراً اطلاع دے۔ قصہ کوتاہ عمران اور قیصر کے آنے کے بعد میں نذیر کو اپنی گاڑی میں لے کر پہلے اس کے گھر گئے جس میں وہ سیکنڈ سیکریٹری کے ساتھ رہ رہا تھا۔ نذیر ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں اس کی بیٹی ہم چاروں کے لیے ٹھنڈے مشروب لے کر آئی۔ اس کے گھر سے اٹھ کر ہم باہر نکلے تو عمران اور قیصر کی گاڑی اب آگے تھی اور ہماری پیچھے۔ وہ دونوں ہمیں اس گھر کے سامنے لے گئے جس پر نذیر کے نام اور عہدے کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اگر صرف نام ہوتا تو مغالطے کی گنجائش تھی لیکن عہدے سفارت خانے اور ملک کے نام نے مغالطے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ نذیر اپنے نام اور عہدے کی نیم پلیٹ کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر اسی حالت میں رہنے کے بعد نذیر نے میرا بازو پکڑا اور سہمے ہوئے لہجے میں کہنے لگا "یہ ہمارے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہو رہا ہے" میں نذیر کو یہ کہتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف لے گیا "ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہیے ورنہ یہ لوگ چوکنے ہو جائیں گے" میں نے عمران اور قیصر کو کہا "میں نذیر صاحب کو سفارت خانے چھوڑنے جاتا ہوں۔ یہاں قیصر اس مکان کی نگرانی کرے اور عمران دونوں فوجی سپاہیوں اور JCO کو لے کر یہاں آجائے اور تین تین گھنٹے کی اس وقت تک مستقل نگرانی کی جائے جب تک کہ ہم اپنے آئندہ لائحہ عمل کی تیاری نہ کر لیں۔ یہاں ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھی جائے اور ان کی آمدورفت کو نوٹ کیا جائے" یہ ہدایات دے کر میں نذیر کو سفارت خانے چھوڑ کر گھر چلا گیا۔ نذیر نے راستے میں مجھ سے کئی مرتبہ ہمارے متعلق پوچھا مگر میں نے اسے ٹال دیا۔ فسٹ ملٹری اتاچی نے جب اسے میرے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا تو مجھے اپنا صحیح تعارف کروانے کی کیا ضرورت تھی۔ نذیر اپنا گھر دکھانے کے باوجود میرے ذہن میں کلیئر نہیں ہوا تھا۔ اس کے پاکستان کے خلاف باتیں کرنے کا فسٹ ملٹری اتاچی نے مجھے جو کچھ بتایا تھا اس کے پیش نظر نذیر سے یہ بھی ممکن تھا کہ اپنی پاکستان دشمن سرگرمیوں کے لیے اس نے یہ علیحدہ مکان لے رکھا ہو لیکن وہ اپنی نیم پلیٹ ہرگز نہ

لگاتا۔ ہمیں نہ صرف اس عقدے کا حل تلاش کرنا تھا بلکہ جو بھی اس گھناؤنے کھیل میں شامل تھے ان سب کو ٹھکانے بھی لگانا تھا۔ میں نے حالات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا تھا کہ صرف Rapid Action (تیزی سے عمل کرتے ہوئے) سے ہی ہم اس سازش کو بے نقاب کرنے اور اس کے کرداروں کو کیفرکردار تک پہنچانے میں کامیاب ہوسکیں گے ورنہ دشمن اپنی نشان دہی ہونے پر اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر غائب ہوسکتے ہیں۔

رات کے ۹ بجے ہوں گے جب میرے نگرانی کرنے والے ساتھیوں میں سے ایک نے گھر آ کر بتایا کہ اس گھر کے اندر سے ایک شخص باہر آیا اور اس نے نذیر کی نیم پلیٹ اتار کر بنگلہ دیش کے فرسٹ سیکریٹری محبّ اللہ کی نیم پلیٹ لگادی ہے۔ یہ نئی بات سن کر میں نے مزمل، عمران اور قیصر سے فوری میٹنگ کی اور یہ فیصلہ ہوا کہ یہ گورکھ دھندا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر اس گتھی کو سلجھانے میں ہم نے وقت ضائع کیا تو عین ممکن ہے کہ ہمیں تو کچھ سمجھ نہ آئے لیکن یہ لوگ غائب ہوجائیں لہٰذا آج رات ہی اس گھر اور پاکستانی سفارت خانے کے قریب والے اس گھر پر جہاں راجیش رہتا ہے، دھاوا بولا جائے ''بارودی اسلحہ ہمراہ ضرور ہو لیکن اسے استعمال کرنے سے آخر وقت تک اجتناب کیا جائے۔ دونوں گھروں میں پہلے ماہا اور سپنا داخل ہوں گی کیوں کہ صنفِ نازک ہونے کے باعث ان کے لیے بند دروازے کھلوانا نسبتاً آسان ہوگا۔ قیصر کا رام پوری چاقو بھی صرف اسی وقت استعمال کیا جائے جب آہنی مکے اور ہاتھوں سے دشمنوں کو ہلاک کرنا ممکن نہ رہے'' غرضے کہ مکمل تیاری کے ساتھ ہم سب ساتھی ۱۱ بجے رات تینوں گاڑیوں میں نیم پلیٹ والے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ماہا اور سپنا نے برقعے اوڑھ رکھے تھے۔ ہم نے تینوں گاڑیاں سڑک کے کنارے ساتھ ساتھ کھڑی کردیں اور ماہا اور سپنا کو ہمراہ لے کر قیصر، مزمل، عمران اور میں اس گھر کے دروازے پر پہنچے، رضی، تھائی نمبر دو اور دونوں سپاہی ہماری سیکنڈ ڈیفنس لائن کے طور پر ہم سے چند قدم پر تیار حالت میں کھڑے ہوگئے اور JCO کو ہم نے گاڑیوں کی نگرانی اور باہر کے حالات پر نظر رکھنے کے لیے گاڑیوں کے پاس ہی چھوڑ دیا ماہا نے چار مرتبہ بیل بجائی تو کسی نے گھر کا دروازہ کھولا۔ ماہا نے عربی زبان میں اسے کہا کہ ہم دونوں ڈرائیور کے ہمراہ گھر جارہی تھیں کہ راستے میں خیال آیا کہ میں اپنا بیگ اس گھر میں ہی بھول آئی ہوں جہاں ہم رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ اب اپنے میزبانوں کو فون پر کہنا ہے کہ میرا بیگ اپنے ڈرائیور کے ہاتھ ہمارے گھر بھیج دے۔ گھر والا عربی زبان سے ناواقف تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح منھ پھاڑے ماہا اور سپنا کو دیکھے جارہا تھا۔ ماہا نے اس کی مشکل سمجھتے ہوئے ٹیلی فون اور ایمرجنسی کہا تو اس نے دروازے کی سیفٹی چین کھول کر انھیں اندر آنے کا کہا۔ ہم چار ساتھیوں کا گروپ جو اندھیرے میں کھڑا تھا، ماہا اور سپنا کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سپنا جو دونوں کے پیچھے تھی، کو دھکیلتا اندر داخل ہوا۔ قیصر نے سیٹی بجا کر سیکنڈ ڈیفنس لائن والوں کو سگنل دیا اور وہ بھی پلک جھپکنے میں ہمارے پیچھے ہی

مکان میں گھس آئے۔ جس نے دروازہ کھولا تھا اس نے جو اتنے اجنبیوں کی یلغار دیکھی تو وہ چلاتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ قیصر اور عمران بھی اس کے پیچھے ہی اس کمرے میں گئے۔ اتنی دیر میں ماہا نے اپنا برقعہ اتار دیا تھا۔ مزمل اور میں ماہا کے ساتھ دوسرے کمروں کی طرف لپکے، کمروں کے دروازے بند تھے لیکن لاک نہ تھے۔ ہم پہلے جس کمرے میں داخل ہوئے اس میں ۲ افراد دو بیڈوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اچھل کر فرش پر کھڑے ہوگئے اور کراٹے کے پینترے لینے لگے۔ ماہا نے یکے بعد دیگرے ان دونوں کو گھوم گھوم کر ککس (Kicks) ماریں۔ وہ ان سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ مزمل اور میں ان پر جھپٹے۔ مزمل کو تو کراٹے کی الف ب بھی نہیں آتی تھی اور میں بھی ٹریننگ کے دوران چند ابتدائی اسباق ہی لے سکا تھا۔ لیکن ہمارے ڈیل ڈول کے آگے ان کی کچھ نہ چل سکی۔ ان کی ٹانگیں ہوا میں ہی چلتی رہ گئیں اور ہم نے ان کو ان کی نازک پتلی کمروں سے دبوچا اور فرش پر یوں پٹخ دیا جیسے وہ تربوز ہوں۔ سر اور پشت پر چوٹیں لگنے سے وہ کراہنے لگے۔ میں نے ماہا اور سپنا کو کہا کہ وہ عمران اور قیصر کے کمرے میں جائیں، ممکن ہے انھیں تمھاری ضرورت ہو اور دونوں سپاہیوں کو کہیں کہ رسیاں لے کر اس کمرے میں آجائیں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں ہم پوری تیاری کے ساتھ نکلے تھے اور رسیوں کے علاوہ ہمارے پاس بڑی بوریاں بھی تھیں جن میں لاشیں رکھ کر سمندر کے حوالے کیا جاسکتا تھا۔ سپاہیوں نے ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھے اور منھ کپڑے سے بند کردیے۔ سپاہیوں کی نگرانی میں چھوڑ کر ہم دوسرے کمرے مین گئے وہاں عمران اور قیصر نے دو آدمیوں کو اپنے آہنی شکنجوں میں جکڑ رکھا تھا اور ان کے چہروں پر گھونسوں کی چاند ماری کررہے تھے میں نے مزمل کو کہا کہ وہ دوسرے کمرے سے سپاہیوں کو یہاں بھیج کر خود وہیں ٹھہرے۔ سپاہیوں نے اس کمرے میں آ کر ان دونوں کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ میں نے سپاہیوں کو کہا کہ پہلے والے دونوں کو اسی کمرے میں اٹھا لائیں۔ اس ہاتھا پائی اور مقابلے کے بعد میں نے دیکھا کہ مزمل کا اور میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ ہم دونوں عمر کے اس حصے میں تھے جہاں انسان کی صحت ٹھہر جاتی ہے اور پھر بتدریج مائل بہ زوال ہوتی جاتی ہے۔ میں تو DMI کی حراست کے دوران ان کے تشدد کی وجہ سے پہلے ہی اپنی صحت گنوا بیٹھا تھا لیکن مزمل بھی فوجی ہونے کے باوجود خاصا نڈھال لگتا تھا۔ بہرحال چند منٹ میں ہم نے اپنے سانس بحال ہونے پر ان چاروں کی انٹروگیشن شروع کی اور ماہا اور سپنا دوسرے کمروں میں کاغذات اور ہمارے مطلب کی دوسری اشیا تلاش کرنے چلی گئیں۔ ان چاروں سے میں نے ان کے نام پوچھے تو انھوں نے جو نام بتائے، صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے دو تین اور سوال پوچھے تو ان کے بھی انھوں نے ایسے جواب دیے جو صریحاً غلط تھے۔ میں انھیں ہلاک کر کے صرف لاشیں ہی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مجھے انفارمیشن چاہیے تھی جو وہ دے نہیں رہے تھے۔ میں نے سپاہیوں کو کہا کہ دونوں کمروں کی کھڑکیوں پر پردے لٹکانے والے لوہے کے راڈ اتار لائیں باریک راڈ شاید

انھیں بلوا سکیں۔ چناں چہ راڈ آنے پر میں نے دونوں سپاہیوں، قیصر اور عمران کو کہا کہ ان کو لٹا کر اور ان کی گردنوں پر راڈ رکھ کر انھیں ہاتھوں سے دبائیں۔ ابھی یہ کام شروع نہیں ہوا تھا کہ سپنا ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر اور ماہا پلنگ کی چادریں ڈھیر سارے کاغذات اور ایک سوٹ کیس لے کر آگئیں۔ ماہا نے بتایا کہ ٹرانسمیٹر تو ایک پلنگ کے نیچے سے ملا ہے اور سوٹ کیس میں کاغذات اور فائلیں ہیں۔ میز پر پڑے ہوئے سارے کاغذات چادروں میں ہیں۔ ٹرانسمیٹر کو دیکھتے ہی ان چاروں کے رنگ فق ہو گئے۔

ادھر میرے ساتھیوں نے راڈ کو دبانا شروع کیا۔ جب ان کے سانس رکنے لگے تو وہ غوں غوں کرنے لگے۔ میں نے ایک کے منھ سے کپڑا ہٹانے کا کہا۔ کپڑا ہٹتے ہی وہ بولا ''یہ تینوں کچھ بتائیں یا نہ بتائیں میں آپ کو یہ بات سولہ آنے درست بتاؤں گا بس مجھے ماریں نہ۔''

☆☆

میں نے اس بھارتی کی آفر کہ ''میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں، مجھے نہ ماریں''، سنی ان سنی کرتے ہوئے ساتھیوں کو ان کے گلے راڈ سے دباتے رہنے کا کہا۔ مجھے اس کے احکامات پر عمل نہیں کرنا تھا۔ میں ایک بنیادی بات جانتا تھا کہ ہندو کے خمیر میں ہی یہ بات نہیں ہے کہ تشدد سہے اور زبان نہ کھولے۔ مجھے یقین تھا کہ باقی تینوں بھی بہت جلد ہی بریکنگ پوائنٹ پر پہنچ کر ایسی ہی پیش کش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور ہوا بھی عین میرے خیال کے مطابق۔ باقی تینوں نے بھی یکے بعد دیگرے غوں غوں کر کے اپنے بند منھ کھلوائے اور انتہائی التجائی لہجے میں ہمیں اپنے متعلق سب کچھ بتانے کی آفر دی۔ میں نے سپاہیوں اور رضی کی مدد سے پہلے بھارتی کو دوسرے کمرے میں شفٹ کروایا اور باقی تینوں کے متعلق رضی کو کہا کہ اپنا ریوالور ہاتھ میں لے کر بیٹھ جائے اور ان تینوں میں سے کسی نے اگر ذرا بھی ہلنے یا بولنے کی کوشش کی تو اس کے سر میں گولی مار کر اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔ رضی کو میں نے یہ آرڈر اتنی اونچی آواز میں دیا کہ تینوں بھارتی اچھی طرح سے سن لیں۔ میں قیصر کو بھی ان کی نگرانی پر چھوڑ کر مزمل اور عمران کے ساتھ دوسرے کمرے میں گیا جہاں پہلے بھارتی کو لے جایا گیا تھا۔ میں نے سپاہیوں کو کہا کہ پہلے اس کے سر پر بیس جوتے ماریں تاکہ اسے اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے کہ ہم کسی قسم کا بھی جھوٹ سننے کو تیار نہیں ہیں۔ اسی ہندو کی ہوائی چپلوں سے سپاہیوں نے اس کے سر پر مساج کیا۔ جب وہ فارغ ہوئے تو میں نے اسے کہا کہ اب بولے اور اگر ذرا بھی غلط بیانی کی تو ہر غلط بات پر اس کے سر پر پچاس جوتے مارے جائیں گے۔ سر پر جوتے لگنے اور میری وارننگ سے اس کی قوتِ مدافعت اگر تھوڑی بہت باقی تھی تو وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ جو کچھ اس نے بتایا میں تقریباً اسی کے الفاظ میں تحریر کر رہا ہوں ''سر! میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ بس میری جان بخشی کر دیں۔ ہم چاروں دہلی میں DMI کے External Wing (بیرون ملک کے شعبے میں) میں ملازم ہیں۔ ہمیں دو ماہ قبل مختلف بھارتی کمپنیوں میں جن کے دفاتر جدہ میں ہیں، ملازمت

کے ویزے دلوا کر یہاں بھیجا گیا۔ میرا نام وِکرم ہے اور میں وائرلیس آپریٹر ہوں۔ میرے ساتھیوں کے نام ہری چند، اوم پرکاش اور لکشمی کانت ہیں۔ ہمیں اس مکان میں ان ہدایات کے ساتھ رکھا گیا ہے کہ ہم کم سے کم لوگوں سے ملیں۔ فوج کے ایک جنرل حکم لال جی ہمیں یہاں سیٹ کرنے اور Task (کام) دینے کے لیے آج سے پندرہ بیس روز پہلے یہاں آئے تھے انھوں نے ہمیں CBI کے ایک افسر سے یہ کہہ کر ملوایا کہ جب تک ہم Independant (کسی کی مدد کے بغیر) کام کرنے کے قابل نہ ہو جائیں اس وقت تک ہمیں CBI کے اس افسر کے احکامات پر کام کرنا ہوگا۔ جنرل صاحب اور CBI کے افسر جگدیش (ترپاٹھی) ایک روز چھوڑ کر ہمیں ملنے آتے تھے اور انھوں نے ہمیں بتایا تھا کہ اس مکان میں عنقریب ہی ہم سے زیادہ تجربہ کار اور مڈل ایسٹ کے ماہر آدمی ہمارے ساتھ رہیں گے۔ جگدیش صاحب نے ہمیں یہ بھی کہا تھا کہ ہم یہاں پاکستان اور بنگلہ دیش کے سفارت خانوں کے کارکنوں کے بھیس میں کام کریں گے۔ ہری چند اور لکشمی کانت بنگالی زبان پر عبور رکھتے ہیں۔ میری ہندی پاکستانی اردو کی طرح صاف ہے اور اوم پرکاش مجھ سے بھی صاف اردو بولتا ہے اور اسے تھوڑی بہت پنجابی بھی آتی ہے۔ جنرل صاحب اور جگدیش آٹھ دس روز سے زیادہ ہو گئے ہیں، یہاں نہیں آئے۔ یہاں پر پریکٹس کے لیے ہر رات ایک بجے ٹرانسمیٹر پر مجھے ایک فریکوانسی پر رابطہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس فریکوانسی پر میں ہر رات رابطہ کرتا اور اپنی اور باقی ساتھیوں کی خیریت بتاتا ہوں۔ ہم پریکٹس کے لیے ہر دو روز کے بعد پاکستانی اور بنگلہ دیشی فسٹ سیکریٹریوں کی نیم پلیٹیں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں یہ آرڈر اس لیے دیا گیا ہے کہ سعودی عرب میں جاسوسی کی غرض سے آنے کی وجہ سے ہم کو جو Tension (ذہنی دباؤ) ہے وہ کم ہو سکے اور ہم ان دونوں ملکوں کے Cover (کورم) میں کام کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔' وِکرم نے جو کچھ بتایا تھا، مجھے اس کی تصدیق اس کے ساتھیوں سے کرنی تھی۔ چار کمروں کے اس فلیٹ کے تیسرے کمرے میں سپاہی اسے کھینچ کر لے گئے تو میں نے دوسرے بھارتی کو اس کمرے میں لانے کا کہا۔ اس کی بھی پہلے جوتوں سے مرمت کی گئی۔ اس نے بھی وہی باتیں دہرائیں جو وِکرم پہلے بتا چکا تھا۔ تیسرے اور چوتھے کا بیان بھی پہلے دونوں سے مختلف نہ تھا۔ ان چاروں نے میرے پوچھنے پر یہی بتایا کہ دو شخص ایک ٹیکسی میں یہاں کل رات آئے تھے اور انھوں نے بتایا کہ انھیں بے ہوش کر کے لوٹ لیا گیا ہے اور ان کی گاڑی کی چابی بھی غائب کر دی گئی ہے۔ انھیں ٹیکسی کے کرائے کی ادائیگی کے لیے کچھ رقم درکار تھی۔ ہم بھلا اجنبیوں کو پیسے کیوں دیتے لیکن جب انھوں نے جنرل صاحب اور جگدیش صاحب کا نام لیا اور ہمارے ٹرانسمیٹر سے ہر رات ٹرانسمٹ کرنے کی فریکوانسی بھی بتا دی تو ہم انھیں گھر کے اندر لے آئے اور انھیں ٹھنڈا وغیرہ پلا کر پیسے دیے۔ ان کی حالت بڑی خراب ہو رہی تھی تقریباً ایک گھنٹا ہمارے پاس ٹھہرنے کے بعد وہ چلے گئے۔ ان چاروں سے ہمیں جو کچھ بھی معلوم ہو سکتا تھا اسے جان کر اب ہمارے لیے

بڑا مسئلہ وہ خود بن گئے تھے۔ DMI کے بیرون ملک کے شعبے کا مجھے پہلی بار علم ہوا تھا۔ بعد میں بھارتی انٹیلی جنس کور کے تعاون سے اسی شعبے نے RAW (را) کا نام اپنایا اور اس کا جال پھیلتے پھیلتے ایشیا سے نکل کر یورپ تک جا پہنچا لیکن اپنے نااہل افسران اور کم ہمت کارکنوں کے باعث اس کا عملی دائرۂ کار صرف پاکستان اور افغانستان تک ہی محدود ہے اور ان ممالک میں بھی را نے صرف بے غیرت اور بے ضمیر پاکستانی وطن فروشوں کو خریدنے اور ان کے ذریعے مخالفانہ پروپیگنڈے اور بم دھماکوں کے ذریعے عوام کو ہراساں کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں اب تک را کے صرف چند بھارتی ایجنٹ ہی پاکستان میں پکڑے گئے ہیں کیوں کہ بعض بے ضمیر اور بے غیرت غدار پاکستانی را کے ایجنٹ بن کر ان کا مشن پورا کر رہے ہیں۔ بھارت نے پاکستان سے اپنے طویل بارڈر کے نزدیک ہی اپنے علاقے میں درجنوں ٹریننگ کیمپ کھول رکھے ہیں جہاں ان بے غیرت پاکستانیوں کو اسلحہ چلانے اور بم بنانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے جن کی برین واشنگ ان کی سیاسی دہشت گرد جماعت کرتی ہے۔ ناپختہ ذہن کے نوجوانوں کو پاکستان اور ان کے اپنے مستقبل سے مایوس کر کے انھیں بالکل مجیب الرحمٰن کے بنگلہ دیش کی طرح جناح پور کے سنہری خواب دکھائے جاتے ہیں اور ان نوجوانوں کے جذبات سے کھیل کر انھیں دہشت گردی، قتل و غارت اور بھتا وصولی کے کام سونپے جاتے ہیں۔ ان کا لیڈر جسے جنرل ضیا الحق نے امریکا سے بلوا کر جہاں وہ پٹرول پمپ پر کام کرتا تھا، جماعت اسلامی اور پی پی پی کے زور کو کچلنے کے لیے ایک سیاسی جماعت بنانے کا کہا۔ اس شخص نے اپنی لچھے دار تقریروں سے یہاں کے عوام کو ایسے سنہری باغ دکھائے کہ ہمارے بھولے بھالے کچھ عوام اس کو اپنا رہبر، نجات دہندہ پیر اور نہ جانے کیا سمجھ کر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلنے لگے۔ جب دہشت گردوں کی سرپرستی کرتے ہوئے اس کا یہاں رہنا محال ہوگیا تو یہ لندن جا کر بیٹھ گیا اور وہاں سے اپنے پارٹی لیڈروں کو ہدایات اور پارٹی کے جذباتی کارکنوں سے ٹیلی فونک خطاب کرنے لگ گیا۔ اس کے دماغ میں سری لنکا کے تامل ٹائیگرز کی طرح اپنی پارٹی کے نوجوان کارکنوں کو ملک اور حکومت کے خلاف لڑائی کے لیے تیار کرنے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ لیکن کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ تامل ٹائیگرز اپنی گردنوں میں ہمیشہ سائنائڈ کے کیپسول باندھے رکھتے ہیں سری لنکا کی آرمی کے ہاتھ آج تک کوئی زندہ تامل ٹائیگر نہیں آیا لیکن یہاں ان پیر صاحب کے ٹائیگر جن کے نام دنبہ، مادہ، کن کٹا ان کی اوقات ظاہر کرتے ہیں، جب پکڑے جاتے ہیں تو تھانے کے ڈرائنگ روم کی سیر کے شروع میں ہی سب کچھ پٹر پٹر بول دیتے ہیں۔ ان کے ظلم کرنے اور بزدلی دونوں کی کوئی حد نہیں۔ حال ہی میں کراچی میں دہشت گردوں کا سرغنہ اجمل پہاڑی نے جس طرح اپنے ساتھیوں کو پکڑوانے اور ماضی میں تشدد سے اس کے ہاتھوں ہلاک کیے جانے والے بے گناہ لوگوں کے ڈھانچے برآمد کروائے اسی سے اس کی اور اس جیسے دوسرے دہشت گردوں کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آج کے اخبارات میں ان پیر صاحب کی وزیراعظم بننے

کے امکانات کے متعلق لکھا ہوا ہے۔ مجھے تو یہ کسی چرسی کی بانگی ہوئی بڑ معلوم ہوتی ہے لیکن پاکستان کے ۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے پہلے کے حالات و واقعات کو سامنے رکھیے تو یہ بھی کوئی بالکل ہی ناممکن بات نہیں۔ جیسے خواجہ معین کے مشہور ٹی وی ڈرامے تعلیم بالغاں کے ایک سین میں استاد طلبہ کو بتاتا ہے کہ کسی زیرتعلیم کو جب ووٹ کا ''و'' مل جاتا ہے تو وہ زیرتعلیم وزیرتعلیم بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر پاکستان کے ماضی پر نگاہ ڈالیں تو غدار اعظم بھی دو بار وزیراعظم بن گیا تھا کیوں کہ جعلی ووٹوں کا مینڈیٹ اسے مل گیا تھا۔ اب اگر یہ پیر صاحب بھی ایسا ہی سوچتے ہیں تو انھیں سوچنے دیں۔ جیسے کسی میراثی کے بیٹے کے بار بار پوچھنے پر کہ اگر گاؤں کا نمبردار اور اس کے سارے رشتہ دار مر جائیں تو پھر نمبردار کون بنے گا، باپ نے جواب دیا تھا کہ چاہے سارا گاؤں مر جائے پھر بھی تو نمبردار نہیں بن سکتا۔ اسی طرح مجھے یقین ہے کہ اگر پاکستان کے سارے سیاسی لیڈر مر جائیں (یہ میری دلی خواہش ہے) پھر بھی یہ جعلی پیر صاحب وزیراعظم نہیں بن سکتے۔ ان کو کروڑوں روپے کا بھتا ان کی پارٹی کے پاکستانی کارندے بھیجتے ہیں اور ان کی عیاشی کے لیے بھارتی حکومت اور را ہر وقت چشم براہ رہتی ہے تو کیا کسی پاگل کتے نے انھیں کاٹا ہے کہ پاکستان آئیں اور اپنے خلاف قتل کی متعدد ایف آئی آروں کے جواب میں عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کریں۔ میرے وطن عزیز کے سیدھے سادے لوگو! بھٹو، بے نظیر بھٹو، زرداری، نواز شریف اور اس کے حواریوں کی طرح یہ پیر صاحب بھی تمھیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ اب ان کا زور ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے اور ان کی پوجا کرنے والوں کے دلوں میں بھی اب یہ سوال پیدا ہو چکا ہے کہ وہ آخر کب تک ان کی شہ خرچیوں کے لیے اپنے پیٹ کاٹ کاٹ کر اور ان کے دہشت گردوں کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہو کر ان کے سامنے دولت کے انبار لگاتے رہیں گے۔ پاکستان کے مختلف صوبوں میں تو ان کے صوبائی سیکریٹریٹ اور دفاتر موجود نہیں لیکن لندن میں ان کا انٹرنیشنل سیکریٹریٹ ہر روز پاکستان کے خلاف زہر اگل رہا ہے۔ پیر صاحب! بہت ہو چکی اب بس کیجیے قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ اور بھولے بھالے عوام کو مزید بے وقوف بنانا۔ ورنہ میں آپ کی عیاشیوں اور فحاشی کی وہ تمام داستان تحریر کردوں گا جو آپ کے لندن کے دست راست ایم ایچ خان کے ذریعے مجھے معلوم ہوئی ہے۔

ان چاروں بھارتی DMI کے کارکنوں سے جتنا بھی ممکن تھا، معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے عمران، مزمل اور قیصر کو کہا کہ ان کو زندہ چھوڑنے کا مطلب اپنے لیے مصیبت مول لینا ہے ان تینوں نے کہا کہ آپ ماہا، سپنا اور ان سے ملنے والے ٹرانسمیٹر اور کاغذات کو لے کر گھر جائیں۔ ہم ان چاروں کو ٹھکانے لگا کر جلد ہی گھر آجائیں گے اور پھر ہم آج رات ہی راجیش کی رہائش گاہ اور ملحقہ دفتر پر دھاوا بولیں گے۔

☆☆

میں تو ماہا، سپنا اور اس گھر سے ملنے والے ٹرانسمیٹر اور کاغذات کو لے کر گھر آ گیا، ماہا اور سپنا تو ہماری ضرورت کی انفارمیشن کے کاغذات کی چھانٹی میں مصروف ہوگئیں اور میں ساتھیوں کے انتظار میں کبھی گھر کے اندر اور کبھی باہر نکل کر ان کی راہ دیکھنے لگا۔ بحیثیت گروپ لیڈر کے ان کی سلامتی اور مشن کی کامیابی کی ذمہ داری مجھ پر تھی، خدا خدا کر کے کافی دیر بعد میرے ساتھی اپنی گاڑیوں میں واپس لوٹے۔ سب کا بھوک، پیاس اور تھکاوٹ سے برا حال ہورہا تھا۔ مزمل نے ڈرائنگ روم میں جہاں ہم سب بیٹھے تھے، اپنے کام کی رپورٹ دیتے ہوئے کہا ''آپ کے جانے کے بعد انھی لوہے کے راڈوں کے ساتھ ہم نے ان چاروں کو ختم کردیا، قیصر نے ایک عقل مندی کی کہ انھیں ہلاک کرنے سے پہلے Last Minute Info (آخری منٹ کی انفارمیشن) لینے کی غرض سے ان سے پوچھا کہ وہ یہاں کون سی گاڑی استعمال کررہے ہیں، ایک نے بتایا کہ ٹیوٹا کرولا سبز رنگ کی گاڑی پارکنگ میں کھڑی ہے جسے وہ بازار سے سودا سلف لانے اور دوسرے نجی کاموں کے لیے کبھی کبھار استعمال کرتے ہیں کیوں کہ انھیں زیادہ سے زیادہ وقت گھر میں ہی رہنے کی ہدایت کی گئی ہے، قیصر نے ان سے گاڑی کی چابی بھی لے لی، ابھی تک وہ چاروں اسی غلط فہمی میں تھے کہ ہم ان کو مار پیٹ کر چھوڑ دیں گے اس لیے وہ اپنی جانیں بچانے کے لیے ہم سے پورا تعاون کررہے تھے۔ قیصر اور عمران نے آپس میں مشورہ کر کے انھیں کہا کہ انھیں اب ہمارے افسر اعلیٰ کے پاس لے جایا جائے گا اور اگر انھوں نے وہاں بھی سچ بولا تو وہ انھیں رہا کرنے کا حکم بھی دے سکتا ہے، قیصر نے پارکنگ میں جا کر ان کی گاڑی اسٹارٹ کی اور پارکنگ کے ایک خالی حصے میں لے جا کر کھڑی کردی، اس دوران ہم نے ان چاروں کی لاشوں کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے آزاد کیے اور ان کے منہ پر بندھے کپڑے ہٹائے، دونوں سپاہی، رضی اور عبداللہ تھائی ایک ایک کر کے ان کی لاشوں کو بازوؤں سے تھام کر ان کی گاڑی تک لے گئے۔ جہاں قیصر اور عمران ان کے بے جان جسموں کو سیٹ پر یوں بٹھاتے جیسے زندہ ہوں، جب ان سب کو ان کی ہی گاڑی میں ''بٹھا'' دیا گیا تو قیصر نے ان کی گاڑی اسٹارٹ کی، پیچھے ہماری دونوں گاڑیاں تھیں، شاہراہ فلسطین سے گزرتے ہوئے قیصر نے ایک پٹرول پمپ سے موبل آئل کے دو ڈبے خریدے اور تھوڑی دور آگے جا کر دونوں ڈبوں سے موبل آئل زمین پر الٹ کر انھیں خالی کرلیا اور ایک دوسرے پٹرول پمپ سے گاڑی میں اور ان دونوں خالی ڈبوں میں پٹرول بھروایا اور گاڑی سیدھی آگے لے جا کر اس اوور ہیڈ برج پر جا پہنچا جہاں سے ایک سڑک مکہ معظمہ کو اور دو سڑکیں جدہ شہر کو جاتی ہیں (اوور ہیڈ برج کو عربی زبان میں کبری کہتے ہیں) قیصر نے راستے سے ہی ایک وزنی پتھر بھی اٹھالیا تھا، اس نے برج سے شہر کو جانے والی سڑک پر جو بلندی سے نیچے آتی تھی، گاڑی کھڑی کی اور پٹرول بھرے دونوں ڈبے چاروں لاشوں پر خالی کردیے، پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایکسیلیٹر پر پتھر رکھ کر اسے پورا دبا دیا اور لاشوں کو دیا سلائی دکھا کر گاڑی کو گیئر میں ڈال کر خود باہر آ گیا، جلتی ہوئی

لاشوں کے ساتھ گاڑی تیزی سے ڈھلوانی سڑک پر بھاگتی ہوئی اور ایک جانب کی ریلنگ کو توڑتی ہوئی تقریباً چالیس فٹ نیچے لڑکنیاں کھاتی جاگری، انجن اور پٹرول ٹینک نے جو لبالب بھرا ہوا تھا، بھی آگ پکڑلی تھی۔ گاڑی نیچے گری تو ایک دھماکے کے ساتھ بلند شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی، اب ہمارا وہاں مزید ٹھہرنا بے سود اور خطرناک تھا۔ لہٰذا ہم قیصر کو لے کر سیدھے گھر واپس آ گئے۔'' ہمارے مشن کا آدھا حصہ تو مکمل ہوچکا تھا، باقی آدھے کے لیے جانے سے پہلے ہم نے کھانا کھایا اور چائے پی کر تازہ دم ہوئے۔ رات کے ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم نے راجیش کے گھر کا رخ کیا۔ ہمارے سارے ساتھی تینوں گاڑیوں میں پاکستانی سفارت خانے کے قریب اس کوٹھی کے قریب پہنچے۔ چوں کہ اس علاقے میں کئی سفارت خانے تھے اس لیے پولیس کی پٹرولنگ پارٹیاں بھی یہاں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ ہم نے اپنی گاڑیاں اس گھر سے قدرے فاصلے پر دوسری کوٹھیوں کے باہر اس طرح کھڑی کیں جیسے یہ گاڑیاں ان کوٹھیوں والوں کی ہوں۔ گاڑیوں سے نکل کر ہم نے راجیش کی رہائش گاہ کی چار دیواری کو پھلانگا۔ اس کوٹھی کے آدھے حصے میں اس وقت بھی لائٹ جل رہی تھی اور چھت پر تین 30,30 فٹ بلند ایریل دکھائی دے رہے تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت بھی وائرلیس ٹرانسمیٹر سے پیغامات کی آمدورفت جاری تھی، کوٹھی میں داخل ہونے کے لیے دروازے کی گھنٹی بجانی ضروری تھی، رات کے اس وقت گھر والوں کو یقیناً کسی کی آمد کی توقع نہیں تھی اسی لیے انھوں نے خفیہ ٹرانسمیٹر چالو کیا ہوا تھا، ہم نے کوٹھی کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ عمران نے مجھے سرگوشی میں کہا ''سر ہم یہاں کسی سے ملنے نہیں آئے جو سیدھے راستے سے گھر میں داخل ہوں۔ ہمیں تو ان کو رنگے ہاتھوں پکڑنا اور ان کو اگلے جہاں کی راہ دکھانی ہے، اس لیے ہم اس کمرے کی کھڑکی کو توڑ ڈالتے ہیں جس کمرے میں لائٹ جل رہی ہے۔ پردے لگے ہونے کی وجہ سے اندر کا حال تو ہمیں باہر سے معلوم نہیں ہوسکتا لیکن ایک تو تیز روشنی اور دوسرے دفتر والا حصہ ہونے کی وجہ سے یقیناً اس کمرے میں ہی ٹرانسمیٹر ہوگا اور کھڑکی سے کان لگا کر سنا جائے تو اندر سے کئی آدمیوں کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔ مجھے بھی اس سے بہتر کوئی تدبیر سجھائی نہیں دی۔ مجھ سے اجازت لے کر عمران نے دونوں سپاہیوں کو بنگلہ زبان میں سمجھایا کہ انھیں کیا کرنا ہے، رضی اور عبداللہ تھائی نے کوٹھی کے کمپاؤنڈ سے ہی وہ پختہ اینٹیں اٹھا کر بہ یک وقت کھڑکی پر دے ماریں۔ کھڑکی کے شیشے ٹوٹتے ہی قیصر نے کھڑکی کی اندرونی چٹخنیاں کھولیں۔ JCO اور رضی نے پردوں کو کھینچا اور دونوں سپاہی پہلے اور ان کے پیچھے JCO کود کر کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوئے اور ریوالور نکال کر کمرے میں موجود لوگوں پر تان لیے۔ اب قیصر اور عمران بھی کھڑکی کے راستے سے ہی اندر گئے اور اندر داخلے کا دروازہ کھولا اور میں مزمل، ماہا اور سپنا کے ساتھ کوٹھی کے سامنے کی طرف بنے دروازے سے اس کمرے کے اندر گیا۔ اندر کا منظر بڑا دلچسپ تھا۔ ایک شخص ایک بڑے ٹرانسمیٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے کانوں پر ہیڈ فون چڑھے ہوئے

تھے اور اس نے ہاتھ اوپر اٹھا رکھے تھے، راجیش اور دو اور شخص ایک ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے اور ان کے سامنے میز پر پڑے کاغذات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کاغذات موصول ہونے والے پیغامات اور بھیجے گئے اور بھیجے جانے والے M.ess: ges (پیغامات) تھے۔ ان تینوں نے بھی ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ میرے سب ساتھیوں کے ریوالوروں کے رخ ان سب کی جانب تھے اور یہ دہشت زدہ چہروں سے میرے ساتھیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے دروازے سے داخل ہونے کے بعد اب ان کی نگاہیں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹرانسمیٹر والے آدمی کے کانوں سے ہیڈ فون اتارنا چاہا تو عمران بولا ''سر میں نے اندر آتے ساتھ ہی ٹرانسمیٹر کو آف کردیا تھا۔ میں نے عمران کو کہا کہ ہیڈ فون اتارے، عمران نے ہیڈ فون اتارتے ہی ایک ایسی زور دار کک اس شخص کو ماری اور وہ کرسی سمیت پٹخنیاں کھاتے ہوئے دور جا پڑا۔ اس نے گرنے کے باعث لگنے والی چوٹ کو سہلانے کے لیے اپنے ہاتھ سر کے قریب کیے تو JCO اسے ایک اور کک مارتے ہوئے بولا ''ہاتھ اوپر، ہاتھ اوپر شالا'' اور اس نے اسی حالت میں پڑے ہوئے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ عمران اور قیصر راجیش اور اس کے دونوں ساتھیوں کے قریب گئے، عمران نے راجیش کو گریبان سے پکڑتے ہوئے اس کے چہرے پر تین چار زور دار گھونسے مارے اور بولا ''ہمارے افسر کھڑے ہیں اور تم حرام زادو ابھی تک کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہو'' راجیش کے کرسی چھوڑنے سے پہلے ہی دوسرے دونوں کھڑے ہوگئے، عمران نے اپنے ریوالور کی نال سے انھیں اشارہ کرتے ہوئے کہا sit on the floor you swines and keep your hands on your heads (سور کے بچو! فرش پر بیٹھو اور اپنے ہاتھ اپنے سروں پر رکھ لو) وہ تینوں اتنے خوف زدہ ہو رہے تھے کہ انھوں نے بلاچوں چراں عمران کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر اپنے سروں پر ہاتھ رکھ لیے، ٹرانسمیٹر کو عمران نے بند کیا تھا ورنہ پیغامات آ جا رہے تھے، میں نے ٹرانسمیٹر کو آن کیا۔ قیصر نے اپنا چاقو ٹرانسمیٹر آپریٹر کی گردن پر رکھتے ہوئے اسے کھڑا کیا اس ٹرانسمیٹر کی دوسری طرف کے ٹرانسمیٹر سے فریکوانسی پہلے ہی ملی ہوئی تھی۔ میں نے ہیڈ فون کا بایاں حصہ الٹا کر اپنے کان کے ساتھ لگایا اور آپریٹر کو کہا کہ دوسری طرف والوں کو کہے کہ بجلی فیل ہونے کی وجہ سے ٹرانسمیٹر عارضی طور پر بند ہوگیا تھا اس لیے سارا پیغام دوبارہ لکھوایا جائے (ٹرانسمیٹر والے میز پر لیٹر پیڈ پر ادھوری عبارت لکھی ہوئی تھی جس سے مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ اس وقت دوسری طرف سے پیغام لکھوایا جا رہا تھا جب میرے ساتھی کمرے میں داخل ہوئے اور عمران نے ٹرانسمیٹر بند کردیا تھا) آپریٹر نے رابطہ بحال ہونے پر پیغام دوبارہ لکھوانے کا کہا۔ پیڈ پر لکھی ہوئی عبارت دوبارہ دہرائی گئی اور جب پیغام مکمل ہوگیا تو دوسری طرف سے Over and Out کہہ کر رابطہ ختم کردیا گیا۔ عمران اور قیصر نے آج کے سارے بھیجے ہوئے اور وصول شدہ پیغام اکٹھے کیے۔ راجیش کے ساتھ فرش پر بیٹھے دونوں آدمی بغیر گردن ہلائے ہماری ایک ایک حرکت دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ان کی

آنکھوں کی سرخی دیکھ کر مجھے شک سا گزرا اور میں نے دونوں سپاہیوں اور JCO کو کہا کہ ان کی تلاشی لیں۔ ان دونوں کی پتلونوں کی خاص طور پر بنی اندرونی جیبوں سے دو لوڈڈ پسٹل نکلے اور پشتی جیبوں سے ان کے کارڈ اور سروس بکس ملیں۔ یہ دونوں بھارتی آرمی کے انٹیلی جنس ونگ میں میجر تھے۔ میں نے طنزیہ طور پر ہنستے ہوئے کہا ''تو آپ دونوں بھارتی آرمی میں میجر ہیں، میں چاہوں تو آپ کے ہم رتبہ بلکہ آپ سے سینئر افسروں کو آپ سے حسن سلوک کا کہہ سکتا ہوں لیکن آپ کے ملک اور فوج کا اخلاق اس قدر گھٹیا ہے کہ میں اپنے فوجی سپاہیوں سے یہ کام لوں گا'' یہ کہہ کر میں نے JCO کو کہا کہ ان کو بیس بیس چانٹے رسید کریں۔'' یہ کہہ کر میں نے راجیش کی طرف دیکھا۔ جسے اپنے فوجی افسروں کا حشر دیکھ کر اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا ''دیکھو۔ اچھے بچوں کی طرح سعودی عرب میں اپنے خفیہ کاموں کی ساری تفصیل خود ہی بتا کر خود کو اس تشدد سے بچالو جو ہم نہ بولنے والوں سے کرتے ہیں۔'' راجیش نے دونوں میجروں کی چانٹوں سے تواضع ہوتے دیکھنے کے باوجود خالص کاروباری انداز میں جواب دیا۔ ''پہلے مجھے یہ یقین دلا دیں کہ مجھ پر نہ تو تشدد کیا جائے گا اور نہ ہی میری جان لی جائے گی'' راجیش کی یہ بات سنتے ہی میں نے اس کے چہرے پر اتنی زور سے ٹھڈا مارا کہ وہ پٹخنیاں کھاتے ہوئے دور جا پڑا۔ بقول میرے ساتھیوں کے میرا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مرغا بن جائے وہ مرغا بنا تو میں نے پیچھے سے اسے زور دار کک لگائی۔ وہ لڑکھنیاں کھاتے ہوئے دو میٹر دور جا پڑا۔ میں نے کوئی ۱۵ بار اسے مرغا بنوا کر ککس ماریں، وہ بے حال ہو چکا تھا ادھر DMI میں اپنے اوپر ہونے والے تشدد کی یاد آنے پر میں بھی طیش میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ آخری کک لگنے کے بعد وہ اٹھ کر خود ہی مرغا بن گیا اور ہانپتے ہوئے بولا ''آپ جو کچھ بھی پوچھیں گے میں اس کا صحیح جواب دوں گا۔ اب بس کریں۔'' ادھر میں بھی غصے سے ہانپ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا ''اب تمھیں یقین آ گیا یا مزید یقین دلانے کی ضرورت ہے۔''

''آ گیا سر۔ بالکل یقین آ گیا'' راجیش نے مرغا بنے ہوئے ہی جواب دیا ''میں بعد میں پوچھوں گا۔ پہلے تم تفصیل سے اپنے اور اپنے خفیہ کاموں کے متعلق بتاؤ۔'' میں نے مرغا بنے راجیش کی گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں طیش میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا اور اب وہی کچھ کرنا چاہتا تھا جو DMI کی حراست کے دوران میرے ساتھ کیا گیا تھا۔ میرے تمام ساتھی خاموش کھڑے میرے اس وحشی پن کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆

راجیش نے بولنا شروع کیا تو اسرار کے پردے ہٹنا شروع ہوئے۔ ''سر! میں نے الیکٹرونکس میں کئی ملکی اور غیر ملکی ڈگریاں حاصل کی ہیں جو میرے رہائشی کمرے میں موجود ہیں، آج سے تقریباً چار سال پہلے جب میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس میں کام کرتا تھا تو میری اعلیٰ

کارکردگی کی رپورٹس پہلے CBI اور پھر بھارتی فوج کے انٹیلی جنس کور کے نوٹس میں آئیں۔ سویلین لباس میں فوجی افسران اور CBI والے کئی مرتبہ مجھے ملنے کے لیے اچانک اور بغیر اطلاع کے میرے دفتر اور پھر میرے گھر میں آنے لگ گئے، پہلے تو انھوں نے Between the Lines (بین السطور) اور پھر کھلے الفاظ میں مجھے اپنے محکموں میں کام کرنے کی آفر دی۔ میری شادی کو چند سال ہی ہوئے تھے اور میں اپنی بیوی، دو بچوں اور ماتا پتا کے ساتھ پرسکون اور خوش گوار زندگی گزار رہا تھا۔ میں اپنی ملازمت سے بہت مطمئن تھا لہٰذا میں نے انکار کردیا۔ میرا انکار سن کر وہ آخری بار خاموشی سے چلے گئے، اس کے چند دنوں کے بعد میرے ایک بچے کو جو فلیٹ کے باہر کھیل رہا تھا، اغوا کرلیا گیا اور اسی روز جب میں اور میرے پتا بچے کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، میرے پتا کو فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے چند لوگوں نے بلاوجہ بے دردی سے پیٹا۔ پولیس نے بچے کے اغوا کی رپورٹ تو درج کرلی لیکن کوئی کارروائی نہ کی۔ دوسری صبح میرے لڑکے کو ایک بند گاڑی فلیٹ کے سامنے چھوڑ کر چلی گئی، اغوا کرنے والوں نے نہ تو کوئی مالی مطالبہ کیا تھا اور نہ ہی بچے کو کوئی گزند پہنچایا تھا۔ ہم سب گھر والے حیران تھے کہ ایسا کس نے اور کیوں کیا۔ اسی شام وہی فوجی افسر اور CBI والے میرے گھر آگئے اور کہنے لگے کہ تمھارے بچے کے اغوا اور تمھارے پتا کو پیٹنے والے پاکستانی جاسوسی ایجنسی کے افراد تھے اور یہ سلسلہ آئندہ بھی نہ صرف جاری رہے گا بلکہ ایک ایک کر کے تمھارے سارے گھر والوں کی جانیں بھی چلی جائیں گی۔ میں یہ سن کر بے حد پریشان ہوگیا تو ایک فوجی افسر نے مجھے کہا کہ تمھارے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے خاندان کی حفاظت اور جانوں کی سلامتی کے لیے ہمارے ساتھ کام کرو۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ سب انھی کی پلاننگ تھی۔ میں نے مجبوراً ان کے ساتھ کام کرنے کی حامی بھرلی اور اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ انٹیلی جنس کور اور CBI کی مشترکہ ٹیم نے مجھے ایک برس جاسوسی کی ٹریننگ دی اور پھر جدہ میں ریڈک انٹرنیشنل میں ملازمت دلادی اور یہاں ملازمت کے آغاز میں ہی مجھے الیکٹرونک ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بنا دیا گیا، میں یہاں بالکل رسمی سا ہیڈ ہوں اور ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کا اصل کام ایک مصری کرتا ہے۔ سعودی عرب میں مرسیڈیز بینز کے سارے ٹرک، ٹرالے اور بسیں بھارت میں ٹاٹا کے کارخانے سے بن کر آتے ہیں اور ریڈک انٹرنیشنل نے ان کی سیلز ایجنسی لے رکھی ہے۔ چوں کہ الیکٹرونکس میں ٹیلی کمیونیکیشن میرا خاص شعبہ تھا لہٰذا پہلے مجھے یہ کام سونپا گیا کہ دمام، ریاض، جدہ، طائف اور خمیس مشیط میں وائرلیس ٹرانسمیٹر نصب کروں اور ان سب کا رابطہ Mother Transmitter (مین ٹرانسمیٹر) جدہ سے ہو۔ میں نے پہلے جدہ میں اس کوٹھی میں بڑا ٹرانسمیٹر نصب کیا اور پھر ان مختلف شہروں میں چھوٹے ٹرانسمیٹر لگائے۔ ان سے فارغ ہوا تو مجھے تل ابیب (اسرائیل) جانے کا حکم ملا۔ میں پہلے ترکی اور وہاں سے اسرائیل گیا۔ وہاں جانے کے لیے مجھے ایک دوسرے نام سے دوسرا پاسپورٹ دیا گیا تھا۔ تل ابیب میں بہت سے بھارتی سائنس دان، ان کے

ایٹمی ری ایکٹر پر کام کرتے ہیں۔ بھارتی اور اسرائیلی سائنس دانوں کو امریکی اساتذہ نیوکلیئر انرجی کی ایڈوانس ٹریننگ دیتے ہیں۔ میں ۶ ماہ تل ابیب میں رہا اور وہاں کے موساد کے مین ٹرانسمیٹر سے جدہ والے ٹرانسمیٹر کا رابطہ قائم کیا۔ یہاں واپس آ کر مجھے بھارتی انٹیلی جنس نے ایک اور کام سونپا، یہ کام مائیکرو ٹرانسمیٹرز کو جو بھارتی سفارتی ڈاک میں بغیر کسی چیکنگ کے بھارتی سفارت خانے میں پہنچ جاتے تھے، انھیں چیک کر کے Operational کرنا تھا۔ یہ ٹرانسمیٹر بورڈ پن کے سائز کے ہیں اور ان کے ایک جانب پن ہوتی ہے اور اس میں مرکری بیٹری استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی رینج ۱۰۰ میٹر کے دائرے تک ہوتی ہے۔ ہمارے بھارتی سفارتی عملے اور کاروباری لوگوں نے ایسے سیکڑوں ٹرانسمیٹر سعودی عرب کے مختلف حساس محکموں، ایئرپورٹس، بندرگاہوں اور سعودی فوج کے اعلیٰ افسران کے دفتروں تک میں چھپا کر لگادیے ہیں۔ انھی کی تعداد کے برابر ہمارے چھوٹے پورٹیبل ٹرانسمیٹر ان علاقوں پر کام کررہے ہیں اور تمام اطلاعات اس شہر کے بڑے ٹرانسمیٹر کو دی جاتی ہیں۔ بڑے ٹرانسمیٹر ان سب اطلاعات کو چھان پھٹک کر ہمارے جدہ کے مین ٹرانسمیٹر کو بھیجتے ہیں اور ہم یہ اطلاعات اس کوٹھی میں لگے ٹرانسمیٹر سے بہ یک وقت دہلی اور تل ابیب کو بھیجتے ہیں۔'' راجیش دم لینے کو رکا۔ میں اور میرے ساتھی آنکھیں پھاڑے اور منھ کھولے راجیش کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو سن رہے تھے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھارت اور اسرائیل نے سعودی عرب میں جاسوسی کا اس قدر وسیع جال پھیلا رکھا ہوگا۔ راجیش نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''سر! فرش پر بیٹھے بیٹھے میرے گھٹنوں میں درد ہورہا ہے۔'' میں نے عمران کو اشارہ کیا اور اس نے ٹرانسمیٹر آپریٹر کی کرسی اس کے قریب رکھ دی اور راجیش اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے نرم لہجے میں راجیش کو کہا کہ اپنا بیان جاری رکھے۔

''سر! CBI کے ایک اعلیٰ افسر مسٹر جگدیش اور ایک بھارتی فوج کے جنرل حکم چند تقریباً دو ہفتے پہلے مجھ سے ملے تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ بہت جلد ہمارے ہاتھ ایک انمول نیوکلیئر فارمولا آجائے گا جسے تم دیکھو گے کہ کس حد تک درست ہے۔ اس ملاقات کے بعد یہ دونوں پھر کبھی نہیں آئے۔ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ کے ایک ڈائریکٹر بھی ان کے ساتھ تھے وہ بھی پھر پلٹ کر نہیں آئے۔'' میں نے راجیش سے پوچھا کہ کیا اس کے پاکستانی سفارتی عملے سے بھی تعلقات ہیں ''سر میں کبھی بھی پاکستانی سفارت خانے میں نہیں گیا لیکن نچلے سفارتی عملے کے ذریعے میں نے سفیر سے لے کر تھرڈ سیکریٹری اور سارے ملٹری اتاچیز کے کمروں میں مائیکرو ٹرانسمیٹر خفیہ جگہوں پر رکھوا دیے ہیں اور پاکستانی سفارت خانے میں ہونے والی ایک ایک بات ہم تک پہنچ رہی ہے۔ اس وقت سفارت خانہ بند ہے ورنہ میں آپ کو ہر کمرے میں ہونے والی گفتگو سنوا دیتا۔'' میں نے راجیش کو کہا کہ مجھے سارے سعودی عرب میں تمھارے مائیکرو ٹرانسمیٹرز اور بڑے ٹرانسمیٹرز کی تفصیل چاہیے۔ راجیش نے بتایا کہ ایک بریف کیس میں جو اس کے رہائشی حصے میں پڑا ہے، ان سب کی تفصیل موجود ہے۔ میں نے عمران کو کہا کہ راجیش

کو اس کے رہائشی حصے میں لے جائے اور وہ بریف کیس لے آئے۔ راجیش کے پاؤں سے رسی کھول دی گئی، اور بندھے ہاتھوں کے ساتھ وہ عمران کے ہمراہ جا کر ایک خاصا بڑا بریف کیس لے آیا۔ راجیش کے ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے بریف کیس عمران نے اٹھا رکھا تھا۔ راجیش نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس بریف کیس کا لاک پیچیدہ نمبروں والا ہے اگر میرے ہاتھ کھول دیے جائیں تو میں اس کا لاک کھول دوں۔'' اس ساری گفتگو کے دوران ماہا اور سپنا بھی اسی کمرے میں آچکی تھیں۔ میرے کہنے پر عمران نے راجیش کے ہاتھ بھی کھول دیے۔ عمران نے راجیش کے ہاتھ کھولنے کے لیے بریف کیس فرش پر رکھ دیا تھا۔ ماہا قریب ہی کھڑی تھی، میں نے اسے کہا کہ بریف کیس راجیش کو دے۔ راجیش نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کردیا۔ اس کے صرف لب ہل رہے تھے، مجھے صرف بھگوان کا لفظ ہی سنائی دیا۔ ماہا نے بریف کیس اٹھایا اور راجیش کو دینے کے لیے اس کی طرف بڑھی۔ یکایک وہ ٹھٹھکی اور راجیش سے پوچھا۔ ''اس بریف کیس میں کیا ہے؟'' ''صرف کاغذات اور ڈائریاں'' راجیش نے جواب دیا تو ماہا نے بریف کیس ہم سے دور لے جا کر رکھ دیا اور راجیش کے پاس آ کر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کی آنکھوں میں چبھوتے ہوئے بولی ''صرف کاغذات اور ڈائریاں یا ۱۰ کلوگرام Explosive (دھماکہ خیز مادہ) جو بریف کیس کھلتے ہی پھٹ جاتا اور اس ساری کوٹھی کے علاوہ اردگرد کی عمارتوں کو بھی ملبے کا ڈھیر بنا دیتا۔'' ماہا کی یہ بات سنتے ہی راجیش بجلی کی تیزی سے اٹھا اور بریف کیس کی طرف بھاگا۔ ماہا اس کے اس ردعمل کے لیے بالکل تیار تھی۔ اس نے اپنی ٹانگ راجیش کی ٹانگوں میں پھنسا کر اسے فرش پر چت کردیا۔ یہ سب کچھ چند سیکنڈ میں ہوا۔ ہم ابھی معاملے کی تہ تک پہنچے بھی نہ تھے کہ ماہا مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی ''ذرا اس بریف کیس کا وزن دیکھیے، یہ کم از کم ۱۳ کلو ہے۔ اس طرح کے بریف کیس موساد والے اکثر استعمال کرتے ہیں لیکن ان میں ٹائم بم ہوتے ہیں اس قسم کے بریف کیس صرف Suicide Mission (خودکش مہم) پر جانے والوں کو دیے جاتے ہیں۔'' راجیش نے جو اپنا راز فاش ہوتے دیکھا تو ہسٹریائی لہجے میں چیخ چیخ کر کہنے لگا ''میں تم پاکستانیوں سے انتہائی نفرت کرتا ہوں۔ تم لوگوں نے ہمارے مہان بھارت کے ٹکڑے کردیے، ہم نے تمھارا مشرقی حصہ تم سے علیحدہ کردیا لیکن وہاں بھی مسلمانوں کی حکومتیں ہی بنیں، تم لوگ ملیچھ ہو، جس طرح اسرائیلی عظیم اسرائیل بنانے میں دن رات کوشاں ہیں ویسے ہی ہم ایک روز مہا بھارت بنالیں گے۔ میں تم لوگوں کے ہاتھوں زندہ رہنا تو دور کی بات ہے، مرنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ یہ عورت اگر چند منٹ نہ بولتی تو یہاں میرے ساتھ تم سب کے جلے ہوئے جسموں کے ٹکڑے بکھرے ہوتے۔'' راجیش نے جو چاروں شانے چت پڑا چلا رہا تھا، اچانک ہی اپنی گردن میں پڑی ڈوری میں بندھے کیپسول کو نکال کر چبالیا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھ سکیں، اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگی اور اس کا جسم تڑپنے لگا۔ مزمل اور میں نے اس کے بازو پکڑے

اور عمران اور قیصر نے اس کی ٹانگوں کو دبایا تاکہ اس کا جسم مزید نہ پھڑکے، زیادہ سے زیادہ دو منٹ میں ہی راجیش کی گردن ڈھلک گئی اور جسم ساکت ہوگیا۔ ہم سب کی آنکھیں راجیش کی بہادری سے جان دینے پر نم ہوگئی تھیں چاہے دشمن ہی کیوں نہ ہو اس کی دلیری کو خراج تحسین پیش نہ کرنا کم ظرفی ہے، بوجھل دلوں کے ساتھ ہم نے راجیش کے رہائشی حصے کی تلاشی لی اور تمام کاغذات اور ڈائریاں نکال کر اس کے ایک سوٹ کیس میں ڈالیں، ٹرانسمیٹر آپریٹر کے علاوہ دونوں بھارتی ہمارے لیے اب بے کار تھے لیکن ہم انھیں زندہ بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ میں نے عمران اور مزمل کی مدد سے ان کی نسیں دبا کر انھیں بھی قید زندگی سے آزاد کیا۔ ٹرانسمیٹر کو سپاہیوں نے اینٹیں اور پتھر مار مار کر تباہ کردیا ہم سب کوٹھی سے باہر نکلے تو صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔ اس روشنی میں دو اور گاڑیوں کے علاوہ ہمیں سفید کیپری کلاسک بھی دکھائی دی۔ ہمیں یہ کبھی بھی معلوم نہ ہوسکا کہ یہ گاڑی کس کی تھی۔ ہم نے دشمن کے جاسوسی کے ایک بڑے نیٹ ورک کو توڑ دیا تھا اور ہمارے پاس سعودی عرب کے مختلف شہروں میں بھارتی ٹرانسمیٹرز کے متعلق پور، معلومات تھیں، ہم گھر واپس پہنچے تو دن کی روشنی اچھی خاصی پھیل چکی تھی، ماہا اور سپنا نے سب کے لیے چائے بنائی۔ بارود سے بھرا ہوا بریف کیس بھی ہم ہمراہ لے آئے تھے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ آج کا دن ہم ریسٹ کرتے ہیں اور کل سے پاکستانی سفارت خانے میں پوشیدہ مائیکرو ٹرانسمیٹروں کی تلاش سے اس مشن کے بقیہ حصے کا آغاز کریں گے۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ راجیش نے جس بہادری سے اپنی جان دی اگر وہ ایسی بہادری سے ہمارے تشدد کو بھی سہ لیتا اور اپنے راز ہمیں نہ بتاتا تو بہادری، جرات اور وطن پرستی کی ایک روشن داستان رقم کر جاتا جس پر بھارت مدتوں فخر کرتا۔

چھٹا باب

دوسرے روز گیارہ بجے صبح میں اکیلا پاکستانی سفارت خانے گیا۔ جس کوٹھی میں راجیش رہتا تھا وہ سفارت خانے والی سڑک پر تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر واقع تھی۔ کوٹھی کے سامنے پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں اور پولیس کے سپاہیوں نے اس کوٹھی کو Condon (گھیرا ڈالنا) کیا ہوا تھا۔ اس سڑک پر کئی ممالک کے سفارت خانے بھی تھے اس لیے بہت سارے لوگ اس کوٹھی کے دونوں جانب کھڑے طرح طرح کی چہ مگوئیاں کررہے تھے۔ میں بھی اپنی گاڑی اپنے سفارت خانے کے قریب کھڑے کر کے ان لوگوں میں جا ملا۔ مجھے وہاں پہنچے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک بھارتی سفارتی گاڑی اس کوٹھی کے سامنے رکی اور اس میں بیٹھے تین افراد کوٹھی کے اندر داخل ہوگئے۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس کو یہ علم ہوچکا تھا کہ اس کوٹھی کے مقتولین بھارتی تھے۔ اس کوٹھی میں ایک ٹوٹے ہوئے ٹرانسمیٹر کی موجودگی پولیس کی تحقیقات کو نئی راہ دکھا سکتی تھی۔ سعودی عرب میں پرائیویٹ ٹرانسمیٹر رکھنا تو بڑی بات ہے معمولی کھلونا قسم کے واکی ٹاکی رکھنا بھی سخت جرم سمجھا جاتا ہے۔ وہاں پر جمع لوگ مختلف قسم کی باتیں کررہے تھے لیکن اصل واقعات کا کسی کو علم نہ تھا۔ میں پندرہ بیس منٹ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر اپنے سفارت خانے میں فسٹ ملٹری اتاچی کے دفتر میں چلا گیا۔ وہاں سیکنڈ اور تھرڈ ملٹری اتاچی بھی موجود تھے اور گفتگو کا موضوع راجیش کی کوٹھی ہی تھا۔ جنرل نے مختصراً مجھے اس واردات کے متعلق بتاتے ہوئے کہا کہ اس کے دونوں نائب اتاچی یہ خبر بھی لائے ہیں کہ چار ایمبولینس چار لاشیں لے کر جاچکی ہیں۔ میرے دفتر میں جانے کے چند منٹوں بعد ہی دونوں نائب دفتر سے چلے گئے اب میں اور جنرل اکیلے تھے۔ میرے چہرے سے رت جگا اور تھکاوٹ عیاں تھی۔ جنرل گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی شاید ہم دونوں یہی چاہتے تھے کہ اس سکوت کو

دوسرا توڑے۔ جنرل نے چپراسی کو بلا کر کافی اور بسکٹ لانے کو کہا اور کہنے لگا ''شاید تم رات بھر جاگتے رہے ہو یا تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے جواب دیا ''جنرل صاحب! ایک رات کی تو بات ہی کیا ہے نامعلوم اب کتنی راتیں جاگنا پڑے گا میں آپ سے چند انتہائی ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن یہاں نہیں بلکہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے'' جنرل کو میری بات سمجھ میں نہ آئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے سامنے میز پر پڑے لیٹر پیڈ پر یہ الفاظ لکھ دیے ''ہمارے سفارت خانے کے ہر کمرے میں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ دشمن کے ٹرانسمیٹر پر سنا جارہا ہے۔'' اور پیڈ جنرل کے سامنے رکھ دیا۔ یہ پڑھ کر تو فی الحقیقت جنرل کا رنگ فق ہوگیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اسی پیڈ پر لکھا کہ وہ اس وقت یونی فارم میں ہونے کی وجہ سے میرے ہمراہ نہیں جاسکتا ہے۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد وہ نووا پارک ہوٹل کی لابی میں مجھے ملے گا۔ اتنی دیر میں کافی آگئی اور میں جنرل سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کافی پی کر گھر چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد میں نووا پارک ہوٹل کی لابی میں گیا تو سویلین ڈریس میں جنرل میرا منتظر تھا اور سیکنڈ ملٹری اتاچی بھی شہری لباس میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جنرل نے اس سے میرے اصلی نام سے تعارف کرواتے ہوئے مجھے کہا کہ یہ میجر میرا دست راست ہے اور تم کھلے دل سے اس کی موجودگی میں سب باتیں کرسکتے ہو۔ میں اسے خصوصی طور پر اسی لیے ہمراہ لایا ہوں کہ جو کچھ تم نے پیڈ پر لکھا تھا اس قسم کی بات یہ پہلے بھی میرے ساتھ کرچکا ہے۔ میں ان دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر اس ۵ اسٹار ہوٹل کی کافی شاپ میں چلا گیا اور ایک الگ تھلگ ٹیبل کا انتخاب کیا اور اسنیکس کا آرڈر دیا۔ میں نے جنرل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''سر میں اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے سفارت خانے کے قریب کوٹھی پر گزشتہ رات میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دھاوا بولا تھا اور وہاں پر موجود چار افراد میں سے ایک نے خودکشی کرلی جب کہ باقی تینوں کو ہم نے ہلاک کیا۔ اس کوٹھی میں ایک بہت طاقت ور شارٹ ویو ٹرانسمیٹر بھی تھا جس کی رینج دہلی اور تل ابیب تک تھی۔ اس ٹرانسمیٹر کو تو ہم نے بالکل ناکارہ کردیا راجیش نے جو اس ٹرانسمیٹر کے علاوہ سعودی عرب کے کئی شہروں میں ٹرانسمیٹر نصب کرچکا تھا، مجھے یہ بتایا کہ جدہ اور ریاض میں سرکاری محکموں کے علاوہ یہاں کے پاکستانی سفارت خانے میں اس کے Planted آدمی دفتر کے کمرے میں مائیکرو ٹرانسمیٹر مختلف جگہوں پر خفیہ طور پر لگا چکے ہیں۔ ان مائیکرو ٹرانسمیٹر کی رینج ایک سو میٹر ہے اور بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے آدمی ہمارے سفارت خانے میں ہونے والی گفتگو کے ایک ایک لفظ کو مانیٹر کررہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے اپنے اندرونِ خانہ یعنی اپنے سفارت خانے سے اس کام کا آغاز کرنا چاہیے اور اس کے بعد سفارت خانے کے ذریعے سعودی حکومت کو اطلاع دینی چاہیے کہ وہ اپنے دفاتر کی خبر لے۔'' میجر ترمذی نے میری بات ختم ہوتے ہی

جنرل کو کہا ''سر میں نہ کہتا تھا کہ ہماری بند کمروں میں ہونے والی گفتگو کا باہر والوں کو کیوں کر پتا چل جاتا ہے اب ان کے کہنے سے میری بات کی تصدیق ہوگئی سر مجھے یقین ہے کہ مائیکروٹرانسمیٹر سفارت خانے کے کمروں میں لگانے والے ہمارے دونوں سوپر ہیں جن کی دفتر کے ہر کمرے تک رسائی ہے''
جنرل نے ہم دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ہمیں اس بات کا فی الحال کسی سے بھی ہرگز ذکر نہیں کرنا چاہیے پرسوں جمعہ ہے اور سفارت، خانہ بند ہوگا میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو یہ زحمت دوں گا کہ اس روز ہم سفارت خانے کے ہر کمرے میں یہ خفیہ ٹرانسمیٹر تلاش کریں اور میجر ترمذی اور کیپٹن عاشق اس تلاش میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ یہ کسی طور مناسب نہیں کہ اس بات کا کسی سے بھی تذکرہ کر کے Panic (خوف و ہراس) پیدا کیا جائے'' یہ فیصلہ ہونے کے بعد میں نے جنرل اور میجر ترمذی کو راجیش کی کوٹھی میں پیش آئے واقعات کی تفصیل بتائی اور کہا کہ ڈائریاں اور کاغذات اور ایک پورٹیبل ٹرانسمیٹر ہم اپنے ساتھ لے گئے ہیں ان کاغذات اور ڈائریوں میں سے آپ کے مطلب کی جو بھی Infoہوں گی وہ آپ تک دو تین روز میں پہنچا دوں گا اور باقی سے ہم خود نپٹیں گے'' جنرل صاحب یونی فارم اور حساس پوسٹ پر ہونے کی وجہ سے آپ کی دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کی Limitation (حدود) ہیں جن کے اندر رہ کر آپ کو کام کرنا پڑتا ہے میں اور میرے ساتھی اس یونی فارم کے بغیر آزاد ہیں اور ہم کسی بھی انتہا تک جاسکتے ہیں۔ میرا ایک مشورہ ہے کہ آپ سفیر صاحب کی اجازت سے سعودی عرب کے مختلف شہروں میں دشمن کے نصب کردہ خفیہ ٹرانسمیٹروں کی اطلاع بجائے اپنی وزارت خارجہ کے ڈائریکٹ یہاں کے کمانڈر انچیف اور سول ایوی ایشن کے سربراہ کو دیں۔ میری اطلاعات کے مطابق ان عہدوں پر فائز شہزادہ پاکستان کا بہت حامی ہے اور اس کو یہ اطلاع دینے سے افواجِ پاکستان کی نیک نامی اور سعودی عرب میں ان کی خصوصی دلچسپی میں اضافہ ہوگا۔ اس وقت پاکستانی آرمی کی خاصی بڑی تعداد تبوک، خمیس، مشیط اور شرورہ میں تعینات ہے اور ریاض کے قریب ملٹری سٹی کی تعمیر میں بھی ان کی خاصی Contribution ہے۔'' جنرل نے میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے جمعے کے روز مجھے اور میرے ساتھیوں کو صبح نو بجے سفارت خانے پہنچنے کی تاکید کی۔ کچھ دیر مزید وہاں ٹھہرنے اور پاکستان دشمن کی سازشوں پر گفتگو کرنے اور چائے اور اسنیکس سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

سعودی پولیس نے راجیش کی کوٹھی سے برآمد ہونے والے ٹرانسمیٹر کو مرکز تفتیش بناتے ہوئے یہ کیس سعودی انٹیلی جنس کے حوالے کیا جس نے کیا کچھ دریافت کیا ہمیں اس کے متعلق کچھ علم نہ ہوسکا۔ ہمارے فسٹ ملٹری اٹاچی نے سعودی افواج کے کمانڈر انچیف کو مختلف شہروں کے سرکاری دفاتر میں خفیہ مائیکروٹرانسمیٹر نصب ہونے کی اطلاع تحریری طور پر ملاقات کر کے دی۔ جس کے نتیجے میں سعودی انٹیلی جنس نے پاکستانی فوجی ڈویژن کی FIU (Field Intelligence Unit) کی مدد

سے ان شہروں کے سرکاری دفاتر سے نہ صرف خفیہ ٹرانسمیٹر برآمد کیے بلکہ ان ٹرانسمیٹر کی مانیٹرنگ کرنے والے ان علاقوں کے بالکل نزدیک پورٹیبل ٹرانسمیٹر بھی پکڑے اور ان کو آپریٹ کرنے والوں کو بھی سعودی قانون کے مطابق سزائے موت دی گئی۔ پاکستانی سفارت خانے سے ہم نے جمعے کے روز ۹ خفیہ ٹرانسمیٹر مختلف کمروں سے ڈھونڈ نکالے۔ پورٹیبل ٹرانسمیٹر تو پہلے ہی ہم راجیش کے گھر لے گئے تھے ہمارے سفارت خانے کے ٹرانسمیٹر آپریٹر نے پورٹیبل ٹرانسمیٹر سے ان کی جانچ کی تو سب بالکل ٹھیک چالو حالت میں تھے۔ سفارت خانے کے عملے نے ان خاکروبوں سے جنھیں خصوصی طور پر پاکستان سے لایا گیا تھا سختی سے باز پرس کی تو انھوں نے مان لیا کہ انھوں نے ہی ریالوں کے لالچ میں یہ کام کیا تھا۔ انھیں فوری طور پر واپس پاکستان بھیجا گیا جہاں ایئرپورٹ پر ان کے استقبال کے لیے پولیس اور فوج کے نوجوان منتظر تھے۔ اس طرح دشمن پاکستان بھارت اور اسرائیل کے مشترکہ نیٹ ورک کے ایک حصے کا جو سعودی عرب کے خلاف بھی جاسوسی میں مصروف تھا اس حصہ کا خاتمہ کردیا گیا۔ میں نے ساتھیوں کے مشورے سے صرف پاکستانی سفارت خانے سے متعلقہ دشمن کی کارروائیوں کے ڈوکومنٹری ثبوت اپنے سفارت خانے کے فرسٹ ملٹری اٹاچی کو دیے تھے لیکن ان کی بہت بڑی اور خطرناک سازشوں کے متعلق جو کاغذات ہمیں ملے تھے وہ اپنے پاس ہی رکھے۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ ان بری اور خطرناک سازشوں کو ہمارا سفارت خانہ یا حکومت پاکستان ختم کرنے کی جو منصوبہ بندی کرے گی تب تک وہ سازشیں ناکامیاب ہو کر ہمارے وطن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکی ہوں گی ان سازشوں کو بروقت ناکام بنانے کے لیے میری اور میرے ساتھیوں کی جانیں صاف تھیں اور ہمارا فیصلہ تھا کہ ہم خود ان سازشوں اور ان کے کرتا دھرتا دشمنانِ پاکستان سے دو دو ہاتھ کریں گے۔

☆☆

میں نے گزشتہ صفحات میں عرض کیا تھا کہ راجیش اور اس کے سعودی عرب کے مختلف شہروں میں سرکاری دفاتر میں لگائے ہوئے مائیکروٹرانسمیٹروں کی تلاش اور پورٹیبل ٹرانسمیٹروں کو پکڑنے اور اس نیٹ ورک کو ختم کرنے کے لیے سعودی پولیس اور انٹیلی جنس نے سعودی عربیہ میں متعین پاکستانی افواج کے انٹیلی جنس یونٹوں کی مدد سے پندرہ سے بیس دنوں میں یہ کام مکمل کیا۔ ہم نے پاکستانی سفارت خانے سے پوشیدہ مائیکروٹرانسمیٹر نکال کر آئندہ ۲۰ روز بالکل خاموشی میں گزارے اور راجیش کی کوٹھی کی واردات پر سعودی پولیس اور انٹیلی جنس کی تحقیقات کے متعلق اپنے سفارت خانے اور دوسرے ذرائع سے جائزہ لیتے رہے۔ ایک کہاوت ہے کہ بڑا جرم چھوٹے جرم کو چھپالیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی ہوا۔ راجیش کی کوٹھی سے بڑے ٹرانسمیٹر اور ملک کے دوسرے شہروں اور جدہ میں سرکاری دفاتر سے خفیہ ٹرانسمیٹروں کی برآمدگی نے چار بھارتیوں کے قتل ہونے کے واقعے کو پس منظر میں ڈال دیا۔ ہم نے بھی اس موقعے کو غنیمت جانا اور ترپاٹھی اور جنرل حکم چند سے ملنے [illegible] لے کاغذ... ڈائریوں اور

راجیش کی ڈائریوں اور کاغذات کو دوبارہ تفصیل سے پڑھ کر ان کے وہ حصے جو ہمارے آئندہ کے مشنوں کے لیے کارآمد تھے، انھیں علیحدہ کاغذات پر منتقل کیا۔ میں نے ان کاغذات کی ۵ فوٹو کاپیاں بنوا کر عمران، مزمل، قیصر اور ماہا کو دیں اور ایک خود رکھ لی، میں نے ان ساتھیوں کو کہا کہ ان کاغذات کو غور سے پڑھ کر ہر کوئی علیحدہ علیحدہ تحریر کرے کہ ہمیں اپنے آئندہ مشن کا کہاں سے آغاز کرنا چاہیے اور یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ اگرچہ وقتی طور پر راجیش کی رہائش گاہ پر ہونے والی واردات پر پردہ پڑ گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس رات کے واقعے کو بالکل ہی داخل دفتر کردیا گیا ہو۔ سعودی پولیس اور خفیہ والے اس بات کا کھوج لگانے میں یقیناً دلچسپی رکھتے ہوں گے کہ ان کے ملک اور حکومت کے دشمنوں کو آخر کس نے ٹھکانے لگایا اور وہ جلد یا بدیر اس بات کی تہ تک پہنچنے میں یقیناً کامیاب ہوجائیں گے۔ میں نے ساتھیوں کے سپرد جو کام کیا تھا انھوں نے بڑی خوشی سے اسے کرنے کی حامی بھری۔ ۵ روز بعد سب سے پہلے عمران اور مزید ایک ہفتے کے اندر باقی ساتھیوں نے بھی اپنی رپورٹس مجھے دے دیں۔ ہم نے دو ٹی وی اور دو وی سی آر خریدے تھے اور دن اور شام کا بیش تر وقت انگلش اور بھارتی فلمیں دیکھنے میں گزارتے۔ اسی فلم بینی کے دوران ہمیں بھارتی ایکٹر اور پروڈیوسر آئی ایس جوہر کی پاکستان دشمنی سے بھری ہوئی فلم ''مکتی باہنی'' اور بی بی سی ڈاکومنٹری فلم Princess Murdered for Love (محبت کے لیے شہزادی کا قتل) دیکھنے کا موقع ملا۔ پاکستان سے بھارت کی دشمنی تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی اس لیے مکتی باہنی فلم میں پاکستان اور پاکستانی افواج پر اس بھارتی پروڈیوسر نے جو کیچڑ اچھالا ہمیں اس پر کوئی تعجب نہ ہوا لیکن بی بی سی کی ڈاکومنٹری فلم دیکھ کر ہم اچنبھے میں رہ گئے۔ اس فلم کو بی بی سی ٹیلی وژن پر ایک بار دکھانے پر سعودی حکومت نے برطانیہ سے سخت احتجاج کرتے ہوئے برطانیہ سے اپنے سفارتی تعلقات ختم کردیے تھے۔ برطانوی حکومت نے سعودی حکومت سے باضابطہ معافی بھی مانگی اور اس کے مسلسل اصرار پر کئی مہینوں پر سفارتی تعلقات بحال ہوئے۔ برطانیہ نے مسلم اور سعودی دشمنی میں اس ڈاکومنٹری کی ویڈیو کیسٹس بنوا کر سارے سعودی عرب میں پھیلا دیں اور بی بی سی ٹیلی وژن پر صبح کے چار بجے دکھائی جانے والی فلم جو صرف برطانیہ میں ہی دکھائی دے سکتی تھی (ان دنوں سیٹلائٹ وغیرہ کا نام و نشان بھی نہ تھا اور بی بی سی ٹیلی وژن کی رینج صرف برطانیہ تک ہی محدود تھی) ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے نہ صرف ہر سعودی گھر میں پہنچ گئی بلکہ بشمول پاکستان دنیا کے ہر ملک میں مہیا کی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلم دشمنی میں مغربی دنیا میں سرفہرست برطانیہ اور امریکا ہیں۔ برطانیہ نے تقسیم ہند پر مجبور ہو کر ریڈ کلف ایوارڈ کو بھارت اور پاکستان کی حد بندی کا کام سونپا۔ اس کمیشن کا سربراہ ریڈ کلف تھا۔ اس نے دونوں ممالک کی حد بندی کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف ایسی ڈنڈی ماری کہ سارے برصغیر کی تقسیم تو صوبوں اور ضلعوں تک کی گئی لیکن بھارت کو کشمیر کا راستہ دینے کے لیے ایک تحصیل کے بھی دو ٹکڑے کر کے آدھا بھارت کو دے دیا گیا۔

بدقسمتی سے ریڈ کلف ایوارڈ میں پاکستان کی نمائندگی سر ظفر اللہ خان کر رہا تھا جو اعلانیہ قادیانی مذہب کا پیروکار تھا۔ اس نے بھی اس تحصیل کی تقسیم پر چپ سادھے رکھی اور یوں برطانیہ دونوں نوزائیدہ ممالک کے درمیان نفرت کے ایسے بیج بو گیا جس کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان اب تک تین جنگیں ہوچکی ہیں اور نامعلوم ان کا اختتام کب ہو۔ ظفر اللہ خان اتنا متعصب قادیانی تھا کہ اس نے پاکستان کا وزیر خارجہ ہوتے ہوئے بھی قائداعظم کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کردیا تھا۔ سر ظفر اللہ کے ساتھ ہی قائداعظم کے کئی دست راست جن میں اس وقت کے وزیراعظم لیاقت علی خان بھی تھے، نے قائداعظم کی بیماری کی وجہ سے زیارت کوئٹہ میں قیام کے دوران ان کے احکامات ماننے سے بھی انکار کردیا تھا۔ اسی لیے قائداعظم نے اپنی رحلت سے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ میری جیب میں صرف کھوٹے سکے ہیں۔ وہ اپنے ان ساتھیوں کی بری نیت اور خصلت کو پہچان گئے تھے لیکن اس وقت بہت دیر ہوچکی تھی۔ قائداعظم کے صرف ایک ساتھی سردار عبدالرب نشتر کی پاکستان سے بے لوث محبت اور قائداعظم سے وفاداری کی قسم اٹھائی جاسکتی ہے۔ باقی سب تو بس ''ایویں ہی'' کے ساتھی اور رفیق تھے۔

راجیش اور اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کو شاید پچیس یا چھبیس روز گزرے تھے کہ ایک صبح سعودی فوجی افسروں سے بھری ایک جیپ ہماری رہائش گاہ پر آئی۔ ان میں سب سے سینئر افسر کرنل رینک کا اور باقی تین میں سے دو میجر اور ایک کیپٹن تھا۔ کرنل اچھی خاصی انگریزی بول رہا تھا۔ میں اور میرے ساتھی ان کی یکایک آمد پر بے حد پریشان تھے۔ ان فوجیوں نے بڑی متانت اور شرافت سے JCO سے جو کال بیل کے جواب میں باہر نکلا تھا، کہا کہ وہ گھر کے اندر بیٹھ کر ان کے سربراہ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ JCO کے پاس انھیں اندر آنے نہ دینے کی کوئی وجہ تھی اور نہ ہی اپنے سے اتنے اونچے افسروں کو انکار کرنے کی جرأت۔ انھیں گراؤنڈ فلور کے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس نے فسٹ فلور پر آ کر مجھے ان کی آمد کا بتایا۔ میں جلد جلد کپڑے پہن کر نیچے آیا۔ عمران اور مزمل بھی قیصر کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ میں نے ان میں سب سے سینئر کرنل سے پہلے اور بعد میں دوسرے افسروں سے مصافحہ کر کے پوچھا ''آپ شاید مجھے ملنا چاہتے ہیں'' کرنل نے جسے شاید میرے متعلق پہلے ہی بریف کیا جا چکا تھا، جواب دیا ''ہم آپ سے ہی ملنے آئے ہیں اور بغیر اطلاع آنے کی معذرت چاہتے ہیں'' میں نے قیصر کو کہا کہ سب کے لیے کافی اور بسکٹ لائے اور کرنل کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا، ''فرمائیے'' کرنل نے عمران اور مزمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''ہمیں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے'' میں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا ''یہاں رہنے والے سب میرے ساتھی ہیں اور اگر ان کی غیر موجودگی میں بھی کوئی بات ہوگی تو میں لازماً انھیں بتاؤں گا'' کرنل مسکراتے ہوئے بولا ''جو کچھ آپ کے متعلق سنا تھا آپ بالکل ویسے ہی ہیں۔ ضدی اور اپنی بات منوانے والے۔ بہرحال ہم آپ کو اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔ لیکن اس سے آپ یہ مطلب ہرگز

نہ لیجیے گا کہ ہم آپ کو گرفتار کر رہے ہیں یا آپ کی مرضی کے خلاف آپ کو اپنے ہمراہ لے جائیں گے۔ دراصل ہمارے کمانڈر انچیف نے آپ سے آج گیارہ بجے ملاقات کا وقت طے کیا ہے اور ہمیں یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ آپ کو عزت و احترام سے اپنے ہمراہ لے جائیں'' پاکستانی سفارت خانے کے فسٹ ملٹری اتاچی سے میرا یہی طے ہوا تھا کہ وہ بجائے وزارت خارجہ کی نہ سمجھ آنے والی رپورٹوں کے ذریعے سعودی حکومت کے خلاف بچھائے گئے جاسوسی کے جال کے متعلق بتانے کے سیدھا کمانڈر انچیف کے پاس جائے اور ساری حقیقت حال واضح کردے۔ اس کے بعد وہ جانے اور اس کا کام۔ اب اس طے شدہ بات کی روشنی میں مجھے ان فوجیوں کے آنے اور کمانڈر انچیف کے طلب کرنے پر زیادہ حیرانی اور اچنبھا نہیں ہوا۔ میں نے ان سے پندرہ منٹ کی مہلت طلب کی کہ اس ملاقات کے لیے مناسب لباس پہن سکوں۔ میں نے ان سے دوسری بات یہ کی کہ اگر انھیں اعتراض نہ ہو تو میں اپنی گاڑی پر اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ ان کی دونوں جیپوں کے پیچھے آؤں گا، کرنل نے میری بات سن کر کہا ''آپ اور آپ کے ساتھیوں کو ہم خوش آمدید کہیں گے۔ آپ بے شک اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئیں لیکن کمانڈر انچیف سے ملاقات کے دوران آپ اور وہ بالکل تنہا ہوں گے۔''

قیصر، مزمل اور عمران کو میں نے فوری تیار ہونے کو کہا۔ کرنل اور اس کے ہم راہ آنے والے دوسرے افسر جتنی دیر میں کافی اور بسکٹوں سے فارغ ہوئے، ہم تینوں تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں ان کے پاس آگئے اور کمانڈر انچیف سے ملنے ان سعودی افسران کی جیپوں کے پیچھے اپنی گاڑی میں روانہ ہوگئے۔ جدہ کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے قریب ہی شاہی خاندان کے محلات کی ایک قطار ہے۔ انھی محلات میں سے ایک میں ہمیں لے جایا گیا۔ اس محل کے اندرونی باغات کے حسن کے متعلق اگر لکھنے لگوں تو کئی صفحات بھی کم پڑیں گے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ جنت کے حسن کا جو تصور کم از کم میرے ذہن میں تھا وہی کچھ ان باغات میں تھا سوائے دودھ اور شہد کی نہروں اور حوروں کے۔ ہمیں ایک بہت وسیع وعریض ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا گیا جہاں خدام ہر پانچ منٹ بعد شاہی خاندان کے لیے مخصوص قہوہ چھوٹے چھوٹے پیالوں میں ہمیں پیش کرتے رہے۔ محل میں داخلے کے وقت ہی محل کے گیٹ پر بنے سیکورٹی اور دوسرے اسٹاف کے دفتر سے ہماری آمد کی اطلاع اندر بھیج دی گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں صرف کرنل ہمارے ساتھ گیا تھا اور دوسرے فوجی گیٹ والے دفاتر میں چلے گئے تھے۔ تقریباً آدھا گھنٹا انتظار کے بعد ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے سے آ کر ایک خادم نے کرنل کو کچھ کہا اور کرنل مجھے لے کر خادم کے پیچھے اس دروازے کے اندر چلا گیا۔ دروازے کے دوسری جانب ایک غلام گردش تھی۔ اسی غلام گردش کے ایک دروازے سے پہلے خادم اندر گیا اور چند منٹ بعد باہر آ کر مجھے اور کرنل کو اندر جانے کا کہا۔ یہ ایک نسبتاً چھوٹا اور ذاتی ڈرائنگ روم تھا جس میں آرام و آسائش کی دنیا بھر کی بیش قیمت چیزیں موجود تھیں۔ ایک بڑے صوفے پر جس کے سامنے ایک بیش

قیمت آبنوسی میز پر تین گل دانوں میں تازہ پھول سجے ہوئے تھے، کمانڈر انچیف شہزادہ بیٹھا تھا۔ اس نے یونی فارم کے اوپر ایک لبادہ پہن رکھا تھا۔ مجھے کرنل نے بتایا کہ اگر کمانڈر انچیف نے ہمارے سلام کے جواب میں ہاتھ ملایا تو یہاں کے مرواج کے مطابق سر کو ہرگز نہ جھکانا اور ہاتھ ملاتے وقت اس کے دائیں بازو پر شانے سے نیچے لبادے کو بوسہ دینا۔ کرنل نے کمانڈر انچیف کو سیلوٹ کیا اور اٹینشن کھڑے ہوئے میرا نام بتایا۔

☆☆

میں نے السلام علیکم کہا تو شہزادے نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے اس کے بازو پر بوسہ دیا، کمانڈر انچیف شہزادے نے مجھے اپنے ساتھ کے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور کرنل کو ڈس مس کیا۔ کرنل سیلوٹ کر کے ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ اب میں اور شہزادہ کمرے میں اکیلے تھے۔ خادمِ خاص نے قہوے سے بھری پیالیاں ہمارے سامنے رکھیں (یہ شاہی قہوہ عام قہوے سے بالکل مختلف تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ شاہی قہوے میں کھجور کی چھال کے علاوہ بہت سی مقویٰ دوائیوں اور جڑی بوٹیوں کا ست بھی ملایا جاتا ہے اور وہاں کے رواج کے مطابق پیالہ خالی ہوتے ہی خادم دوبارہ پیالہ بھر دیتا ہے۔ شاہی خاندان کے لوگ تو دن میں ایسے پچاس پیالے پی جاتے ہیں لیکن میرے جیسے نئے لوگ اس قہوے کے دو کپ پی کر ہی قابو سے باہر ہونے لگتے ہیں۔ تزک بابری میں شہنشاہ بابر نے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے کہ اس کی فوج کے ایک اعلیٰ عہدے دار جوان کو بہادری دکھانے پر بابر نے اسے خلعت اور انعامات سے نوازنے کے علاوہ اپنی محفل خاص میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس محفل خاص میں بابر نے اسے چٹکی بھر اپنی معجونِ خاص بھی عنایت کی جو بابر خود ہر روز پاؤ بھر کھاتا تھا۔ اس رات کے بعد وہ جوان عہدے دار جب دس بارہ روز دربار میں حاضر نہ ہوا تو بابر نے اسے بلوایا۔ بابر کے بقول اس کی بری حالت تھی اس عہدے دار کی تین بیویاں تھیں دو بیویاں ان دس دنوں میں مر گئی تھیں اور تیسری کی حالت بھی خراب تھی، یہ سب اس چٹکی بھر معجونِ خاص کی وجہ سے ہوا تھا) جب خادم نے تیسری بار میرا پیالہ بھرا تو میں نے اسے پینے کے بجائے میز پر ہی رہنے دیا۔ شہزادے کمانڈر انچیف نے مجھے جو کچھ انگریزی میں کہا اس کا لب لباب اور ترجمہ پیش خدمت ہے ''تم نے جدہ اور دوسرے شہروں میں ہماری مملکت کے خلاف جاسوسی کے اتنے بڑے نیٹ ورک کی نشان دہی کی اور اسے توڑا جس کی ہم توقع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں یہ بخوبی علم ہے کہ کون ہمارے دشمن ہیں اور کون دوست، دوستوں سے تو ہم بڑی گرم جوشی سے ملتے ہیں جس کی مثال پاکستان کے ساتھ ہماری دوستی ہے۔ مغربی ممالک کی سخت مخالفت کے باوجود ہم نے پاکستانی فوج کے تین ڈویژن اپنے ملک میں رکھے ہوئے ہیں اور ہم نے پاکستان کی ہر ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھ کر پورا کیا ہے۔ اپنے دشمن ممالک کے خلاف ہم چاہتے ہوئے بھی نرم رویہ رکھنے پر مجبور ہیں۔ لیکن ہم ان سے یہ توقع ہرگز نہیں

کرتے تھے کہ وہ ہمارے نرم رویے کے باعث اس حد تک آگے بڑھ جائیں گے کہ ہمارے شہروں میں ہمارے خلاف جاسوسی کے نیٹ ورکس بنالیں گے۔ ہماری اسلامی قوانین کے تحت سزائیں اگر ہمارے شہریوں کو مل سکتی ہیں تو غیر ملکی بھی اس سے بری نہیں۔ ہمارے قوانین کے مطابق ہمارے خلاف جاسوسی کرنے کی سزا موت ہے۔ وہ سزا ہم دیں یا ہمارا کوئی دوست، مقصد پورا ہوجاتا ہے، میں نے جدہ میں چار بھارتیوں کی ہلاکت کی تفتیش اسی وقت رکوادی جب تمھارے سفارت خانے کا فرسٹ ملٹری اتاچی مجھ سے ملا اور ہمارے خلاف ہونے والی جاسوسی کے ثبوت دیے۔ اس وقت ہماری انٹیلی جنس والے اپنی تحقیقات میں تمھارے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ان تمام نیٹ ورکس جن کی تم نے اطلاع دی ہے، کے علاوہ بھارت، اسرائیل، امریکا اور برطانیہ کے مزید نیٹ ورکس یہاں کام کررہے ہوں گے۔ میں تمھیں یہ اجازت نامہ دیتا ہوں کہ تم سعودی عرب کے جس شہر میں بھی جا کر جاسوسی کے نیٹ تک جا پہنچو تو وہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس تمھارا بھرپور ساتھ دے۔ تم صرف دمام اور ینبع میں آرامکو (سعودی عرب میں تیل نکالنے کی اجارہ داری اس امریکی ادارے کے پاس ہے) کی حدود میں کام نہیں کرو گے کیوں کہ ہمارا ان کے ساتھ یہی معاہدہ ہے کہ ہم کسی صورت میں بھی اس کی حدود میں مداخلت نہ کریں۔ اپنے اور اپنے ساتھیوں کو تاکید سے کہنا کہ ہماری اس ملاقات کو راز ہی رکھیں۔" یہ کہتے ہوئے کمانڈر انچیف شہزادے نے مجھے جنرل اتھارٹی لیٹر اور ایک پیکٹ دیا اور کہنے لگا "اس پیکٹ میں جو کچھ ہے وہ سعودی عرب کے لیے تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی خدمات کے مقابلے میں شاید بہت کم ہو لیکن اسے ہمارا ہدیہ سمجھ کر قبول کرلو۔ آئندہ بھی جتنا عرصہ تم سعودی عرب میں قیام کرو، جب بھی اور جتنی رقم کی ضرورت پڑے اسے اپنے نام اور ایڈریس کے ساتھ لکھ کر اسی محل کے سیکورٹی چیف کو دے دینا۔ اگلے دن تم کو وہ رقم مل جائے گی۔" یہ کہہ کر شہزادہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ملاقات ختم کرنے کا اشارہ تھا، میں فوراً کھڑا ہوگیا اور شہزادے کا شکریہ ادا کر کے اس سے ہاتھ ملایا۔ خادم مجھے بڑے ڈرائنگ روم میں چھوڑ گیا جہاں کرنل، اس کے ہمراہ افسر، مزمل اور عمران اور قیصر میرے منتظر تھے۔ میرے ساتھیوں کے چہرے تمتمارہے تھے اور شاید یہی حال میرا بھی تھا۔ میرے پوچھنے پر مزمل نے قہوے کی پیالیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے چند کپ پی کر ہم تو سمجھے تھے کہ صرف ہم ہی مارے گئے ہیں لیکن تمھیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمھارا حال بھی ٹھیک نہیں ہے۔" کرنل ہمیں چھوڑنے کے لیے محل کے گیٹ تک آیا۔ سیکورٹی کے دفتر میں ہمارے منتظر دوسرے فوجیوں اور کرنل سے سعودی رواج کے مطابق معانقہ مصافحہ کرتے ہوئے میں اور میرے ساتھی وہاں سے رخصت ہوئے۔ گھر پہنچ کر میں نے تمام ساتھیوں کو یک جا کر کے آج کی ملاقات کی تفصیل بتائی تو گھر میں رہنے والے میرے ساتھیوں کی جو میرے اس طرح فوجیوں کے ساتھ جانے پر متفکر تھے، کی پریشانی ختم ہوئی، میں نے سب کے سامنے پیکٹ کھولا تو اس میں ۳۳ لاکھ ریال تھے۔ ہم کل

گیارہ تھے یعنی سعودی انٹیلی جنس نے جس کے متعلق کمانڈر انچیف نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے بالکل قریب پہنچ چکی تھی، اسے ہماری تعداد بھی بتادی تھی اسی لیے ہر ایک کے لیے تین لاکھ ریال بطور ہدیہ (تحفہ) دیے گئے تھے۔ میرے کہنے پر اگلے روز میرے ساتھیوں نے ان ریالوں کو امریکی ڈالروں میں تبدیل کروالیا کیوں کہ دنیا بھر میں امریکن ڈالر ہی بغیر کسی دشواری کے کسی بھی ملک میں تبدیل کیے جاسکتے ہیں۔

کراچی میں راجہ تری دیو رائے کو اس کے جواہر کا خزانہ دے کر جب سے میں بینکاک آیا تھا یا پھر یوں کہہ لیجیے کہ جب سے میں راجہ کو اس کا خزانہ اور بیوی اور چھوٹے لڑکے کو لانے کا وعدہ کر کے پاکستان سے باہر نکلا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ دلی سکون اور کسی قسم کی پریشانی اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی پلاننگ کرنے کے بغیر مجھے اور بعد میں میرے ساتھیوں کو ذہنی تفکرات کے بغیر آرام کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہم سب کے پاس پاکستانی پاسپورٹ تھے اس لیے ہمیں یورپ یا امریکا کے ویزے ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا سعودی عرب میں بھی ہمارا مشن ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اس لیے ہم نے سوچا کہ اسی ملک کے دو مشہور پہاڑی مقامات کی سیر پر جائیں یہ ابہا اور الباہا تھے۔ ان کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ تقریباً آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر یہ دو چھوٹے شہر اس صحرائی ملک میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ ان دونوں شہروں میں ہوائی اڈے بھی تھے چناں چہ سڑک کے ذریعے لمبا سفر کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب ایک بار پروگرام طے ہوگیا تو ہم نے وہاں کی سردی سے بچنے کے لیے سوئٹرز وغیرہ لیے اور دو روز کے بعد بذریعہ جہاز ابہا کے لیے روانہ ہوگئے۔ ان پرفضا پہاڑی مقامات پر جانے اور وہاں کے دلچسپ واقعات بیان کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کرنل نبیل جو مجھے ہزرائل ہائی نس کمانڈر انچیف کے پاس لے گیا تھا دو مرتبہ مجھے ملنے ہمارے گھر پر آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ کمانڈر انچیف نے یہ کہا ہے کہ ہم سعودی عرب میں جہاں کہیں بھی جائیں، جانے سے پہلے اس کی اطلاع اس کے محل کے سیکورٹی چیف کو ضرور دیں۔ کرنل نے ہی مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ ہماری ملاقات جس محل میں ہوئی تھی وہ جدہ میں ہزرائل ہائی نس کی رہائش گاہ تھی اور اس نے مصلحتاً ہمیں اپنے جدہ کے ہیڈ کوارٹرز میں نہیں بلایا تھا۔ جب میں نے سیکورٹی چیف کو یہ بتایا کہ ہم ابہا اور پھر الباہا محض سیر و تفریح اور تازہ دم ہونے کے لیے جارہے ہیں تو اس کے دوسرے روز کرنل نبیل نے گھر آکر مجھے بتایا کہ ابہا میں ابھی تک قرینے کا کوئی ہوٹل وغیرہ نہیں ہے اس لیے ہم گورنمنٹ کے ریسٹ ہاؤس میں قیام کریں جس کا اجازت نامہ وہ ساتھ لایا تھا ابہا کے رن وے پر ہمارا بوئنگ ۷۳۷ لینڈ کرنے کے بعد Ramp پر آ کے رکا اور ہم جہاز کی سیڑھیاں اترے تو ہمارے استقبال کے لیے وہاں کا پولیس چیف پہلے سے ہی موجود تھا۔ اسے میرے ساتھیوں کی تعداد بھی بتادی گئی تھی چناں چہ وہ اپنی جیپ کے علاوہ چار کاریں بھی ہمراہ لے آیا تھا۔ یہ استقبال اور انتظام شاہی خاندان کے فرد اور پھر

کمانڈر انچیف کے سیکورٹی چیف کے صرف فون پر ہماری ابہا جانے کی اطلاع کے باعث ہوا تھا۔ پولیس چیف ہمیں لے کر سیدھا سرکاری ریسٹ ہاؤس پہنچا وہاں آٹھ کمرے اور چاروں کاریں ہمارے لیے پہلے ہی مخصوص کردی گئی تھیں۔ میں نے ایشیا کے بیش تر پہاڑی مقامات دیکھے ہیں۔ اپنے ملک میں ہی مری، ایبٹ آباد، نتھیا گلی اور کوئٹہ کبھی واقعی پرافزا تھے لیکن اب تو درخت کاٹے جانے اور بے شمار عمارات کی تعمیر نے ان کے قدرتی حسن کو ختم کردیا ہے اور بے تکی تعمیرات اور درخت کاٹے جانے کے باعث ان میں اور میدانی شہروں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ابہا میں یہ بات نہ تھی ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر ایک منزلہ چھوٹے چھوٹے گھر تھے سرسبز درخت ہوا چلنے سے جھومتے اور ان کی سرسراہٹ ماحول کو مسحور کردیتی۔ بادل سڑکوں پر بچھے جاتے اور ہم دوڑتے ہوئے ان بادلوں میں گھس جاتے اور لمبے لمبے سانس لے کر اپنے پھیپھڑوں سے شہروں کی کثافت کو نکالتے۔ ہم نے گاڑیوں کا بہت کم استعمال کیا اور زیادہ وقت پیدل گھومنے میں ہی صرف کیا ہمیں صرف کھانے کی یکسانیت کی تکلیف تھی دونوں وقت کشمش والا پلاؤ اور روسٹ مرغ اور سلاد وغیرہ کھانے میں ملتے تھے۔ پانچ روز یہاں اچھی طرح سے گھوم پھر کے ہم الباہا گئے۔ یہ ذرا کم بلندی پر (شاید سات ہزار فٹ) پر واقع ہے یہ دونوں پہاڑی پرافزا شہر سعودی عرب کے انتہائی جنوب میں واقع ہیں یہاں بھی ہم نے خوب سیر کی اور اطراف کے پہاڑی سلسلوں میں خاصی دور تک جا کر قدرت کے حسین رنگ دیکھے۔ الباہا میں بھی ہمارے لیے سرکاری ریسٹ ہاؤس اور دیگر تمام سہولتیں مہیا کی گئی تھیں الباہا میں ہمارا کم از کم ایک ہفتہ ٹھہرنے کا ارادہ تھا لیکن تیسرے ہی روز ریسٹ ہاؤس کے فون پر کرنل نبیل نے مجھ سے رابطہ ہونے پر کہا کہ ہم پہلی فلائٹ پر جدہ آجائیں۔ کمانڈر انچیف نے ہمیں فوری طلب کیا ہے۔ یہاں جدہ سے ہفتے میں صرف دو روز جہاز آتا تھا اس فون کے بعد جو پہلی فلائٹ ایک روز چھوڑ کر آئی اس پر ہمارے لیے گیارہ نشستیں پہلے سے ہی محفوظ تھیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہمیں اس طرح یکایک کیوں طلب کیا گیا ہے۔ ہم جدہ پہنچے تو ایئرپورٹ پر کرنل نبیل متفکر چہرے کے ساتھ موجود تھا۔ میرے ساتھی تو ٹیکسیوں میں بیٹھ کر گھر چلے گئے اور کرنل نبیل نے مجھے کہا کہ کام کی نوعیت کے پیش نظر مجھے اس کے ساتھ ہی ڈپٹی کمانڈر انچیف کے پاس جانا پڑے گا کیوں کہ وہ خصوصی طور پر مجھے ملنے کے لیے اس وقت جدہ میں موجود ہے۔

☆☆

ہم تقریباً آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد سعودی فوج کے اس رجمنٹل سینٹر میں پہنچ گئے جہاں ڈپٹی کمانڈر انچیف بقول کرنل میرا انتظار کررہا تھا۔ رجمنٹل سینٹر میں پہنچ کر پتا چلا کہ اب ہمیں ڈپٹی کمانڈر انچیف کا انتظار کرنا پڑے گا کیوں کہ موصوف رات کو دیر تک مصروف رہنے کے بعد استراحت فرما رہے ہیں۔ میرے لیے سعودی فوج کے کسی کمانڈ سینٹر کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ میں صرف اتنا ہی

تحریر کرسکتا ہوں کہ ڈسپلن، یونی فارم کی فٹنس اور جوتوں کی چمک کے ساتھ ساتھ پریڈ اور چلنے کے انداز میں پاکستان کی کوئی بھی پولیس لائن اس سے بدرجہا بہتر ہوگی ''بحرظلمات میں گھوڑے دوڑانے والے'' اب صرف تاریخ میں ہی موجود تھے۔ اب فوج کے ہر سپاہی کے پاس ایئرکنڈیشنڈ گاڑی اور تنخواہ کا آغاز ۲۰ ہزار ریال ماہوار سے ہوتا ہے۔ میں نے پریڈ بھی دیکھی تو یوں محسوس ہوا گویا چہل قدمی کررہے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کی فوج کے کئی ڈویژن سعودی عرب کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے وہاں موجود تھے۔ یمن نے سعودی عرب کے تیل کے کنوؤں پر اپنا دعویٰ کر رکھا تھا ادھر سوڈان کی حکومت کہتی تھی کہ تیل کی دولت حاصل ہونے سے پہلے سعودی حکومت نے جدے کا بیش تر حصہ سوڈان کو فروخت کردیا تھا۔ سوڈانی چھاپا مار سوڈانی ساحل سے بحیرۂ احمر کو عبور کر کے ینبع اور دوسرے ساحلی شہروں پر حملہ کرتے اور سرکاری و غیر سرکاری املاک کو نقصان پہنچا کر واپس بھاگ جاتے۔ ادھر سعودی فوج عیش و آرام کی اتنی عادی ہوچکی تھی کہ فرلانگ بھر بھی جانا ہو تو گاڑی پر ہی جاتے اور بغیر اے سی کے ایک منٹ گزارنا بھی انہیں محال ہوتا۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ سعودی عرب اور تیل کی دولت سے مالا مال دوسری عرب ریاستوں کے جو جوان پاکستان کی ملٹری اکیڈمیز میں ٹریننگ کے لیے آتے ہیں، ان کی حکومتوں کی خواہش کے مطابق انھیں پاکستانی کیڈٹوں والی نہ تو سخت تربیت دی جاتی ہے اور نہ ہی ان پر ڈسپلن کی وہ پابندی عائد کی جاتی ہے جو پاکستانی کیڈٹوں کے لیے مخصوص ہے۔ بس انھیں کمیشن دے کر واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ ڈپٹی کمانڈر انچیف صاحب سے ڈھائی گھنٹے کے انتظار کے بعد ملاقات ہوئی۔ یہ حضرت بدو تھے اور ان کے نہایت شستہ اور دھیمے لہجے میں بولنے پر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی پاکستانی NOC پریڈ کو کاشن دے رہا ہے۔ ڈپٹی صاحب نے بڑے رازدارانہ اور کھسر پھسر کے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا کہ شہزادہ کمانڈر انچیف کے احکامات کے تحت مجھے یہاں بلوایا گیا ہے۔ ینبع البحر کے علاقے میں رہنے والی آبادی حکومت کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے اور اس مخصوص آبادی کو Fence لگا کر ایک طرح سے باقی ملک سے کاٹ دیا گیا ہے۔ ایسے ہی کچھ باغیوں کی سرکوبی کے لیے سعودی فوج کی ایک رجمنٹ کو بھیجا گیا تھا۔ جس میں کچھ عناصر باغیانہ خیالات رکھتے تھے۔ انھوں نے پوری رجمنٹ کو اپنا ہم خیال بنا کر حکومت کے خلاف بغاوت کرنے اور ینبع البحر اور ینبع النخل پر قبضہ کر کے آزاد حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا جسے عین وقت پر اس رجمنٹ کے ایک کپتان نے حکومت کو اطلاع دے کر ناکام بنا دیا۔ سوڈانیوں نے جو اس منصوبے کا دماغ تھے، ینبع کی بندرگاہ پر قبضہ کرنے کے لیے رجمنٹ کے اپنے اسلحے کے علاوہ بہت سارا اسلحہ اور طیارہ شکن توپیں بھی بحیرۂ احمر کے سعودی ساحل پر بھیج دی تھیں۔ حکومت نے فوری کارروائی کرتے ہوئے سعودی عرب کے نیشنل گارڈز (بدوؤں کی اندرونی امن قائم کرنے والی فوج جس کے سربراہ پرنس عبداللہ ہیں اور نیشنل گارڈز کے علاوہ سارے سعودی عرب میں بے حد مقبول ہیں) کے ذریعے بغیر ایک گولی چلائے

ساری رجمنٹ کو گھیر کر نہتا کر دیا۔ چوں کہ اس مخصوص علاقے کے لوگ جو تیل کی دولت ملنے سے پہلے بحری قزاقی میں مشہور تھے، اب بھی باوجود حکومت سے بے شمار سہولتیں اور فوائد حاصل کرنے کے حکومت کے خلاف تھے اس لیے انھوں نے راتوں رات سوڈان سے آنے والا اسلحہ اور طیارہ شکن توپیں غائب کر دیں۔ باوجود تلاشِ بسیار کے ابھی تک ان کا کوئی پتا نہیں چلا اور باغیوں کے اسلحے کی یہ تلوار ابھی تک حکومت کے سر پر لٹک رہی ہے کسی سعودی یا عربی بولنے والوں کو تو ینبع کے باسی کچھ بتاتے نہیں لہٰذا کمانڈر انچیف کی نظرِ انتخاب ہم پر پڑی کہ ہم شاید اس گم شدہ اسلحے کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں۔ میں نے ڈپٹی کو کہا کہ زبان نافہمی کے باعث اگرچہ مجھے کامیابی کی بہت کم امید ہے لیکن میں اس مشن کو اپنے لیے چیلنج سمجھ کر قبول کرتا ہوں۔ مجھے ینبع میں چار پرائیویٹ کاریں، میرے اور میرے ساتھیوں کے رہائش کا معقول بندوبست اور چار ٹیلی اسکوپ والی آٹو میٹک رائفلیں اور ۱۲ عدد پسٹل یا ریوالور اور وافر مقدار میں گولیاں درکار ہوں گی۔ ڈپٹی کمانڈر نے پہلے دونوں مطالبات تو فوراً مان لیے لیکن اسلحے کا سن کر وہ چونکا اور کہنے لگا۔ ''پورے سعودی عرب میں کسی سویلین یا غیر ملکی کو بارودی اسلحہ تو درکنار، غلیل تک رکھنے کی اجازت نہیں۔ آپ کو اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسلحہ کیوں کر دیا جا سکتا ہے'' ''جناب۔ آپ یہاں کی سویلین آبادی اور غیر ملکیوں سے ایسا کام بھی نہیں لیتے جیسا ہمیں سونپا جا رہا ہے۔ میں اور میرے ساتھی باغیوں کے چھپائے ہوئے اسلحے کی تلاش میں مسلح باغیوں کی گولیاں کھانے کو تیار ہیں لیکن صرف اسی وقت جب ہم بھی ان پر فائر کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ ہم خالی ہاتھوں بغیر مقابلہ کیے آپ کے دشمنوں کی گولیوں کا شکار ہونے کو تیار نہیں'' میرا یہ جواب سن کر ڈپٹی کمانڈر سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کرنل نبیل کو بھی اپنے دفتر میں بلا لیا تھا اور میرا اسلحے کا یہ مطالبہ اسے بھی بتایا۔ کرنل نبیل جو پاکستان میں کاکول اکیڈمی سے ٹریننگ لے چکا تھا، ڈپٹی کمانڈر سے انگریزی میں مخاطب ہوا ''سر! جب ہم، ہماری آرمی، پولیس اور نیشنل گارڈز اسلحے سمیت باغیوں کے اسلحے کا سراغ نہ لگا سکے بلکہ ہمارے تین نیشنل گارڈز Encounter (مقابلے) میں مارے گئے تو یہ غیر ملکی کیوں کر بغیر اپنے حفاظتی اسلحے کے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی حامی بھریں گے'' ''لیکن سویلین غیر ملکیوں کو ہم کیوں کر اسلحہ دے سکتے ہیں؟'' ڈپٹی کمانڈر نے اپنی سوچ کی حد بتا دی۔ کرنل نے ڈپٹی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سر! ہم نے پاکستانی فوج کی خاصی بڑی تعداد کو اپنی سرحدوں کی حفاظت اور اندرونی حالات کو پُرامن رکھنے کے لیے اپنے ملک میں رکھا ہوا ہے۔ جس قانون کے تحت وہ اپنا اسلحہ اپنے پاس رکھتے ہیں اس قانون کے تحت ان کو بھی اسلحہ رکھنے کی اجازت دی جا سکتی ہے'' ڈپٹی کمانڈر کے پاس اس دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بولا ''چوں کہ اس مشن کے لیے ہز رائل ہائی نس نے حکم دیا ہے اس لیے میں ان کے اسلحے کے مطالبے کو بھی پورا کرتا ہوں'' ڈپٹی صاحب کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس نے ینبع کے لیے میری طلب کردہ مراعات کی منظوری لکھ کر

کرنل کو دی اور ہمیں کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ میں نے اور کرنل نبیل نے معذرت کی اور ڈپٹی چیف سے اجازت لے کر اس کے دفتر سے باہر آ گئے۔ اب ہماری تمام ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری کرنل نبیل پر تھی۔ جیپ میں مجھے گھر چھوڑنے کے لیے جاتے ہوئے نبیل نے کہا ''ہم نے یہ بہت اچھا کیا کہ بجائے اپنا اسلحہ استعمال کرنے کے سرکاری اسلحہ استعمال کرنے کی اجازت لے لی۔ پرسوں شام تک تمھاری تمام ضروریات کا انتظام ہو جائے گا اور اس سے اگلے دن بعد دوپہر تم ینبع کے لیے پرواز کر سکو گے۔ سویلین لباس میں میرے دونوں میجر ینبع تمھارے ساتھ جائیں گے۔ ایک بات اور، تم اور تمھارے سارے ساتھی اپنا اسلحہ اپنے ہمراہ ہرگز نہ لے جانا یہاں کے قانون کے مطابق پرائیویٹ اسلحہ رکھنا اور استعمال کرنا بہت بڑا جرم ہے لیکن سرکاری اسلحے کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں'' کرنل نے مجھے موقع ہی نہیں دیا کہ میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے پاس اسلحے کی موجودگی کی تردید یا تائید کر سکوں۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ گھر پہنچ کر وہ مجھے چھوڑ کر اور کل شام ۶ بجے آنے کا کہہ کر رخصت ہوا۔

کرنل کے جانے کے بعد میں نے سب ساتھیوں کو ڈرائنگ روم میں بلوایا اور ڈپٹی کمانڈر سے ہونے والی گفتگو اور اپنے فیصلے کے متعلق بتایا۔ میرے سارے ساتھی ابہا اور الباہا میں سیر و تفریح اور آرام کے بعد تازہ دم ہو چکے تھے۔ سب نے دل سے میرے فیصلے کی تائید کی۔ میں نے جب اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ ہمارے لیے اس اسلحے کی تلاش میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمیں عربی زبان کا نہ آنا ہو گی تو ماہا بولی ''میرے ہوتے ہوئے آپ کو کم از کم یہ پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ وہاں پر آپ سب سے بہتر کارکردگی میں دکھا سکتی ہوں۔ جن جگہوں پر آپ مردوں کا جانا اور معلومات حاصل کرنا مشکل ہو گا وہاں میں بڑی آسانی سے اپنے نسوانی حسن اور جوانی کی وجہ سے نہ صرف جا سکوں گی بلکہ ان سے وہ راز بھی اگلوا لوں گی جو شاید آپ کو کبھی بھی معلوم نہ ہو سکیں۔ آپ نے آج تک مجھے کوئی مشن بھی آزادانہ کرنے کا موقع نہیں دیا ورنہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ مڈل ایسٹ کے ان دولت مند مسلمانوں سے ایک عورت کتنی جلد اور آسانی سے راز اگلوا سکتی ہے'' میں اسے ماہا کی لاف زنی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اسرائیلی موساد کی ایک ٹرینڈ جاسوسہ رہ چکی تھی اور اس کی اہلیت کے پیشِ نظر ہی موساد نے اسے کھٹمنڈو میں بھیجا تھا۔ میں نے اسے ابھی تک محض اس لیے کوئی مشن نہیں دیا تھا کیوں کہ میرے اصول کے مطابق جہاں تک ممکن ہو مردوں کے ہوتے ہوئے کسی عورت کو مشن پر اکیلے بھیجنے سے مردوں کی سبکی ہوتی تھی۔

بہرحال اگلے روز ہم نے ینبع جانے کے لیے اپنی تیاری مکمل کی۔ میں نے احتیاطاً سعودی عرب میں اب تک ہمیں ملنے والے کاغذات اور ڈائریاں بھی ہمراہ رکھ لیں کیوں کہ ہماری زندگیوں کے اس دور میں یہی ہمارا بیش قیمت سرمایہ تھیں اور انھی کی رہنمائی سے ہم اپنے آئندہ کے مشنوں کو جاری

رکھ سکتے تھے۔ مقررہ دن پر ینبع کی فلائٹ سے دو گھنٹے قبل دونوں سعودی میجر سویلین ڈریس میں ہمارے گھر آ گئے اور ہم نے ٹیکسیوں میں ایئرپورٹ کی راہ لی، صرف آدھے گھنٹے میں ہمارے جہاز نے ینبع کے ایئرپورٹ پر لینڈنگ کی۔ یہاں بھی ٹیکسیاں نہیں تھیں لیکن کرنل نبیل نے چار پرائیویٹ Rent-A-Car کاروں کا انتظام کیا ہوا تھا۔ ہم ان چاروں گاڑیوں میں ایئرپورٹ سے شہر کو جانے والی راہ پر ہوئے، شہر کے شروع میں ہی امارہ (گورنر ہاؤس) کے قریب ہی دو منزلہ ریسٹ ہاؤس میں ہمارے لیے ۱۰ کمرے ریزرو کیے گئے تھے۔ میرے کہنے پر ایک سعودی میجر نے گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو رخصت کر دیا انھوں نے ریسٹ ہاؤس کے منتظم کے پاس آج ہی صبح بذریعہ سڑک آئے ہوئے دو سوٹ ہمارے حوالے کیے جن میں ہمارا مطلوبہ اسلحہ، فالتو میگزین اور سیکڑوں کی تعداد میں گولیاں تھیں۔ رات کی فلائٹ سے دونوں میجر واپس چلے گئے۔ ہمارے لیے ایک ہی دن میں ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں دو ٹیلی فون لگوا دیے گئے تھے۔ میں نے وہ کمرہ خود لے لیا اور باقی کمروں پر میرے ساتھیوں نے قبضہ جما لیا۔ ماہا اور سپنا ایک کمرے میں اور دونوں سپاہی بھی ایک ہی کمرے میں ٹھہرے۔ اس طرح ہمارے پاس دو کمرے فالتو بچ گئے جنھیں ہم نے منتظم کو کہہ کر دو ڈرائنگ روموں میں بدلوا لیا یعنی ان کے بیڈ وغیرہ اٹھا کر وہاں صوفے اور کرسیاں رکھ دی گئیں۔ اگلے روز ہم سارے ساتھی ینبع دیکھنے کے لیے گاڑیوں میں نکل کھڑے ہوئے ہم نے اپنے اس مشن کا آغاز کر دیا تھا۔ شہر کے علاوہ ہم زیر تعمیر بندرگاہ اور آئل ٹرمینل دیکھنے کے بعد ریڈ سی (بحیرۂ احمر) کے ساتھ ساتھ کئی کلو میٹر تک ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک پر اپنی گاڑیاں لے گئے۔ وہاں پر کوسٹ گارڈ والوں کا دفتر اور گن بوٹس کھڑی تھیں یہاں پر صرف دو تین کلو میٹر لمبی ایک خلیج سی بنی ہوئی تھی اور کھلے سمندر سے خلیج میں داخلے کے دہانے پر کوسٹ گارڈ کا دفتر تھا۔

☆☆

ینبع میں پہلے تین روز ہم نے شہر اور زیر تعمیر انڈسٹریل ایریا میں گھوم پھر کر گزارے۔ شہر کے اکثر نجی اداروں اور دکانوں میں پاکستانی کام کرتے دکھائی دیے۔ ریاض بینک اور بینک الاہلی جو پاکستان کے نیشنل بینک کا سعودی عرب کے چھوٹے شہروں میں ایجنٹ کا کام بھی کرتا تھا، میں بھی کئی پاکستانی ملازم تھے۔ کئی ٹریول ایجنسیوں کے منیجر اور دوسرا اسٹاف بھی پاکستانی تھا۔ زمیندار ہوٹل اور دو دوسرے ہوٹلوں میں (یہ رہائشی ہوٹل نہیں تھے) پاکستانی کھانے ملتے تھے۔ میں نے ایسی تقریباً سبھی جگہوں پر جہاں بھی موقع ملا، فوجی بغاوت کی بات کرنی چاہی تو سب نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس بارے میں علم سب کو ہے لیکن وہ بات کرنے سے کترا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے لیے چوں کہ بالکل نیا تھا اس لیے وہ غالباً کسی اجنبی سے اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تیسرے روز شام کو میں اور مزمل انڈسٹریل ایریا سے واپس شہر آتے ہوئے موم بتی والے چوک کے

قریب پٹرول پمپ سے پٹرول لینے کے لیے رکے تو عین اسی وقت ایک پرانی ٹویوٹا کرولا گاڑی بھی پٹرول ڈلوانے کے لیے وہاں پہنچی۔ کرولا والا غالباً جلدی میں تھا۔ اس لیے اس نے میرے دروازے کے قریب آ کر کہا کہ وہ اپنی نائٹ شفٹ کی ڈیوٹی پر پہنچنے میں پہلے ہی خاصا لیٹ ہو چکا ہے لہٰذا اگر اسے پہلے پٹرول لینے دیا جائے تو وہ مشکور ہوگا۔ اس کا لب و لہجہ بنگالی تھا۔ میں نے گاڑی پیچھے کی اور اسے پٹرول ڈلوانے کا کہا مزمل گاڑی سے اتر کر اس کی گاڑی کے پاس گیا اور بنگالی میں اس سے کچھ پوچھا۔ دونوں میں چند منٹ بات ہوئی۔ اس کی گاڑی میں پٹرول ڈالا جا چکا تھا۔ اس نے گاڑی سائیڈ پر لگائی اور گاڑی سے باہر آ کر مزمل سے بڑی گرم جوشی سے خاصی دیر تک گلے ملتا رہا۔ دونوں میں کچھ دیر اور بات ہوئی اور مزمل اسے ہمراہ لے کر میری طرف آیا۔ اسی دوران میری گاڑی میں بھی پٹرول بھرا جا چکا تھا اور میں نے بھی اپنی گاڑی سائیڈ پر لگالی تھی میں بھی گاڑی سے باہر نکل آیا۔ مزمل نے میرا اس سے تعارف کرواتے ہوئے کہا ”یہ مبشر ہے اور میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب میں کیپٹن تھا۔ ۲۵ مارچ سن ۷۱ء سے پہلے کے چھ ماہ میں مکتی باہنی اور غدار بنگالیوں کے خلاف دو پرائیویٹ تنظیمیں البدر اور الشمس بہت متحرک تھیں۔ پاکستانی فوج کے شانہ بشانہ یہ دونوں مکتی باہنی اور سول لباس میں بھارتی فوجیوں کے خلاف کامیاب کارروائیاں کرتی تھیں۔ پاکستانی فوج نے ان کو اسلحہ بھی فراہم کیا تھا۔ مبشر پاکستان کا حد درجہ حامی اور وفادار تھا اور اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر خطرات میں کود جاتا اور پاکستان کے دشمنوں کو ٹھکانے لگاتا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد یہ روپوش ہو گیا اور اس کے خلاف مجیب گروپ کے آٹھ حامیوں کے قتل میں ایف آئی آر کاٹی گئی اور وارنٹ ایشو کیے گئے۔ میں ان باتوں کو اس لیے جانتا ہوں کہ روپوش مبشر ایک رات چھپتا چھپاتا میرے پاس آیا۔ میں نے اسے کہا کہ بہاری مہاجروں کی طرح بھارت سے ہوتا ہوا کھٹمنڈو چلا جائے اور پھر وہاں سے پاکستان لیکن اس نے کہا کہ پاکستان جا کر لاکھوں دوسرے بہاری مہاجرین کی طرح اسے بھی بے روزگاری کے علاوہ پاکستانیوں کی نفرت کا شکار ہونا پڑے گا کیوں کہ مغربی پاکستانی سانحہ سقوط ڈھاکا کا ذمہ دار ہر بنگالی بولنے والے بنگالی اور بہاری مہاجروں کو ٹھہراتے ہیں حالاں کہ مشرقی پاکستان میں رہائش پذیر مغربی پاکستانیوں اور بہاری مہاجروں کے ساتھ ساتھ بنگلہ بولنے والے مشرقی پاکستانیوں کی خاصی بڑی تعداد نے بھی پاکستان کے حامی ہونے کے باعث نہ صرف افواج پاکستان کے دوش بدوش پاکستان کے مخالف پروپیگنڈے میں حصہ لیا بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مکتی باہنی کے روپ میں آئے ہوئے بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے، مبشر نے مجھے کہا کہ اس نے بھلے وقتوں میں پاکستانی پاسپورٹ حاصل کر لیا تھا اور وہ میرے پاس اس لیے آیا ہے کہ میں اسے کسی کارگو شپ میں مڈل ایسٹ کے کسی مسلم ملک میں بھجوا دوں مبشر کی پاکستان کے لیے قربانیاں کچھ کم نہ تھیں۔ میں نے ڈھاکا سے بڑی مشکل سے ایک کارگو شپ میں کپتان کو پیسے دے دلا کر مبشر کو دمام (سعودی عرب) بھجوا دیا اور سن ۷۲ء کے

بعد یہ آج مجھے اچانک ملا ہے۔ مبشر اپنے ہم وطن محسن، مزمل اور ہم خیال پاکستانی یعنی مجھے مل کر اتنا خوش ہوا کہ اس نے کہا کہ اگر ہم شہر میں تھوڑی دیر کے لیے اس کے ہمراہ چلیں تو وہ آج رات کی ڈیوٹی سے چھٹی لے لے گا۔ اس کی خوشی اور جذبے کو دیکھتے ہوئے ہم نے حامی بھرلی اور مبشر اپنے ٹیلی فون آفس سے جہاں وہ سب انجینئر کا کام کرتا تھا، چھٹی لے کر ہمارے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں آگیا۔ وہاں ہمارے سارے ساتھیوں خصوصاً میجر عمران، ICO منصف، سپاہی اکرم اور سپاہی دین محمد سے مل کر بہت خوش ہوا اور یہ سارے خاصی دیر تک بنگلہ بھاشا میں باتیں کرتے رہے۔ مبشر نے رات کے کھانے کے دوران بتایا کہ سعودی عرب میں اس نے پہلے تو دو تین ڈیلی ویجز پر ملازمتیں کیں اور جب کچھ کچھ عربی سیکھ لی اور کچھ پیسے بھی جمع ہوگئے تو بہتر ملازمت کی تلاش میں ینبع چلا آیا جہاں سعودی عرب کی سب سے بڑی انڈسٹریل اسٹیٹ بن رہی ہے۔ یہاں اسے اس کے سابقہ تجربے اور ڈگری کی وجہ سے سب انجینئر کی ملازمت مل گئی گزشتہ کئی مہینوں سے وہ رات کی شفٹ میں ڈیوٹی سرانجام دیتا اور دن کو اپنی گاڑی میں معاوضہ لے کر مدینۃ الرسول میں لوگوں کو زیارت کے لیے لے جاتا اور اپنی ڈیوٹی ختم ہونے سے پہلے انھیں واپس لے آتا ہے۔ اس نے اس قدر محنت کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ اس کے والدین کے ساتھ اس کا صرف ڈاک اور ٹیلی فون سے رابطہ ہے۔ وہ بنگلہ دیش تو کبھی بھی نہیں جاسکتا اس لیے اس کے والدین نے اس کی بچپن کی منگیتر کے ساتھ ٹیلی فون پر اس کا نکاح کا انتظام کیا ہے ادھر اس کے محکمے کے افسر اعلیٰ نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ نکاح ہوتے ہی وہ مبشر کو فیملی ویزہ دلوا دے گا تاکہ اس کی دلہن سعودی عرب میں اس کے پاس آجائے۔ مبشر نے بتایا کہ آج سے ۹ روز بعد اس کا نکاح ہے اور اس کے پندرہ روز کے اندر اس کی دلہن جدہ پہنچ جائے گی جہاں سے وہ اسے اپنے ہمراہ ینبع لے آئے گا اس لیے وہ اضافی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے فالتو وقت میں ٹیکسی چلا رہا ہے۔ مبشر اگلے روز گیارہ بجے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا تو میں نے اپنے سارے ساتھیوں کو کہا کہ مبشر نے پاکستان کا حامی ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ تکالیف اٹھائی ہیں۔ اپنے والدین، عزیز و اقارب اور وطن اسے پاکستان سے محبت کے صلے میں ہمیشہ کے لیے چھوڑنے پڑے ہیں۔ اس کی زندگی میں غالباً پہلا خوشی کا موقع آرہا ہے ہمیں چاہیے کہ اس کو مالی امداد اور شادی کے ایڈوانس تحفے دے کر اس کی خوشیوں میں شریک ہوں۔ ہم سب نے دس دس ہزار ریال دیے تو ایک لاکھ دس ہزار ریال اکٹھے ہوگئے۔ کرنل نے بتایا کہ مبشر بڑا باغیرت جوان ہے۔ اور وہ اس امدادی رقم کو لینے سے انکار کردے گا۔ میں چوں کہ اس کا پرانا جاننے والا ہوں اور میں نے ہی اسے اور اس کے ساتھیوں کو پاک فوج کا اسلحہ فراہم کیا تھا اس لیے ممکن ہے وہ مجھے انکار نہ کرسکے۔ مبشر کی شادی کا سن کر میں بہت جذباتی ہورہا تھا۔ پاکستان سے محبت کی ''سزا'' اس نے بھگتی تھی اور اب اس کی زندگی میں خوشیاں اور بہاریں آرہی تھیں۔ پاکستان کی محبت میں ہی میں نے بھی بڑے دکھ درد اور مصیبتیں

جھیلی تھیں اور میری گھریلو زندگی کی تلخیاں اس نہج پر پہنچ چکی تھیں کہ جہاں ان میں بہتری کی کوئی امید دور دور تک نظر نہ آتی تھی۔ اپنے دل کو سکون دینے کے لیے میں اب دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہو کر اپنے بے قرار دل کو کچھ سکون دے لیتا تھا۔ میں نے مبشر کے لیے جمع کیے ہوئے ایک لاکھ دس ہزار ریال میں اپنی طرف سے مزید چالیس ہزار ریال شامل کر کے ڈیڑھ لاکھ ریال کرنل مزمل کو دیے۔ دوسرے روز جب مبشر آیا تو کرنل نے بڑی مشکل سے اسے پہلے آرام سے یہ رقم دینی چاہی لیکن مبشر کے مسلسل انکار پر جب کرنل مزمل نے اسے کہا کہ تم میرے ماتحت کام کر چکے ہو اور بحیثیت سینئر افسر کے تمھیں حکم دیتا ہوں کہ یہ رقم تم لے لو ورنہ میں تمھیں اپنے احکام نہ ماننے کی وجہ سے تم سے آئندہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرلوں گا تو مبشر کو یہ رقم لیتے ہی بنی۔ مبشر نے کہا کہ اس رقم سے وہ ایک مناسب گھر کرائے پر لے گا اور اسے فرنیچر سے آراستہ کرے گا اور پرانی گاڑی بیچ کر نسبتاً بہتر اور نئے ماڈل کی گاڑی بھی خریدے گا۔ کرنل نے بعد میں باتوں باتوں میں مبشر سے ینبع میں ہونے والی ناکام فوجی بغاوت اور سوڈان کے بھیجے ہوئے اسلحے کی گم شدگی کے متعلق پوچھا تو مبشر نے کہا کہ مجھ سے زیادہ صرف وہ جانتے ہوں گے جنھوں نے اسلحہ چھپایا ہے۔ فوجی بغاوت کے ناکام ہونے کے بعد گرفتار فوجیوں میں سے صرف سرغنوں کو گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر شفٹ کردیا گیا اور باقی رجمنٹ کے ایک ہزار سے زائد باغی جوانوں اور افسران کو موقع پر ہی گولیاں مار کر ہلاک کردیا گیا تاکہ ینبع کے وہ شہری جو موجودہ حکومت کے خلاف تھے وہ ڈر کر دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ پہلے یہ کام پاک فوج کو سونپا گیا کہ ان کے جے او سی نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ ہماری فوج آپ کے بیرونی دشمنوں کو آپ کی سرحدوں سے دور رکھنے کے لیے یہاں بلوائی گئی ہے۔ اندرونی دشمنوں اور فوجی بغاوتوں سے آپ خود نپٹیں۔ ہم یہاں آپ کے بیرونی دشمنوں کو کچلنے کے لیے آئے ہیں آپ کے شہریوں کو مارنے کے لیے نہیں۔ ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ میں ہونے کی وجہ سے تمام سرکاری کارروائیوں کے علاوہ باغیوں کے آپس میں رابطے کو بھی میں مانیٹر کرتا رہا ہوں۔ گم شدہ اسلحے کے متعلق میں آپ کو آٹھ کلومیٹر کے اس دائرے کی نشان دہی تو کرسکتا ہوں جہاں اسلحہ چھپایا گیا ہے لیکن اس کی بالکل صحیح نشان دہی نہیں کرسکتا۔ مبشر نے ہمیں اپنی عملی خدمات پیش کیں تو ایک تو اس کے سرکاری ملازم ہونے اور دوسرے بہت جلد ہی اس کی شادی ہونے کی وجہ سے ہم نے بالکل انکار کردیا اور کہا کہ اگر وہ چھپائے گئے اسلحے کے متعلق ایک نقشہ بنا کر اور اس پر دائرہ لگادے جہاں اس کے خیال میں اسلحہ چھپایا گیا ہے تو ہم اسے اپنے مشن میں اس کی بھرپور شمولیت سمجھیں گے اگلے روز مبشر ایک نقشہ لے کر آیا جس میں تفصیل کے ساتھ ینبع کے ان مختلف مقامات کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں باغی رجمنٹ نے بغاوت کی کامیابی کی صورت میں سرکاری اداروں اور امارہ پر قبضہ کرنا تھا اور جہاں پر سعودی فوج اور نیشنل گارڈز نے ان کے گرد گھیرا ڈال کر انھیں ہتھیار پھینکنے اور سرنڈر کرنے کی پیش کش کی تھی لیکن

رجمنٹ کی نفری نے ان پر فائر کھول دیا تھا اور گھیرے میں ہونے کی وجہ سے فوج اور نیشنل گارڈز کی فائرنگ سے تقریباً سب ہی نفری ہلاک اور زخمی ہوگئی تھی ینبع کے جن لوگوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں جو اب تک بچے ہوئے تھے، ان کے نام اور پتے نقشے کے ساتھ تھے، گمشدہ اسلحے کے متعلق اس نے جو دائرہ لگایا تھا وہ ینبع سے کئی سو کلو میٹر دور الوجیہہ شہر (جو ریڈ سی (بحیرۂ احمر) کے کنارے پر واقع تھا) کے سمندر کے اس ساحلی حصے کا تھا جہاں پانی ساکن ہوتا ہے اور مغربی ملازمین وہاں Scuba Diving (بغیر گیس سلنڈر کے غوطہ خوری) کرتے تھے۔ مبشر کے بقول اس سارے اسلحے کو باغیوں کے ساتھ شامل کوسٹ گارڈ کی دو کشتیاں وہاں سمندر میں پھینک آئی تھیں۔ یہ معلومات ہمارے لیے بیش قیمت تھیں۔ ہم ینبع میں ہی اسلحہ تلاش کرتے اور اپنا سر پھوڑتے رہتے۔ ہم نے الوجیہہ جانے کی ٹھانی لیکن ہمیں اسکوبا ڈائیونگ کے لیے ماہر اور پانی میں اترنے کے لیے واٹر پروف عینکیں اور فراگ شوز کے علاوہ سانس لینے کے لیے پانی کی نلکیوں کے علاوہ ماہر غوطہ خوروں کی بھی ضرورت تھی۔ میں تو چوں کہ سمندر اور اس کے لیے ضروری لوازمات سے بالکل بے خبر تھا اس لیے مجھے مزمل اور عمران جو دریاؤں کی سرزمین کے باسی تھے، سے گائیڈنس لینی پڑی۔ انھوں نے کہا کہ Scuba Diving تو ایک شوق اور کھیل ہے۔ اگر غوطہ خوروں کو ہم گیس سلنڈروں کے ساتھ پانی میں اتاریں تو وہ خاصی دیر تک پانی کے اندر رہ کر اسلحے کو تلاش کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کی بات مانتے ہوئے چار غوطہ خوروں کے لیے مخصوص لباس گیس سلنڈر، واٹر پروف لمٹس، فراگ شوز ینبع سے خریدے۔ خلابنی غوطہ خوروں کا انتظام بھی مبشر نے کردیا جو انڈسٹریل اسٹیٹ میں کام کرتے تھے معقول معاوضے کے لالچ میں انھوں نے ایک ایک ہفتے کی چھٹی لے لی۔ میرے پوچھنے پر مبشر نے بتایا کہ کوسٹ گارڈ کا ایک ملازم اس کا یارِ غار ہے۔ اس مرتبہ گفتگو کے دوران اس کے منھ سے نکل گیا کہ سعودی حکومت ینبع میں جس اسلحے کو تلاش کر رہی ہے وہ قیامت تک انھیں وہاں سے نہیں مل سکتا کیوں کہ وہ تو ابوجیہہ میں ہے۔ مبشر کے مزید کریدنے پر اس نے بتایا کہ ابوجیہہ میں چالیس فٹ کی گہرائی میں اس اسلحے کو سمندر میں ڈمپ کیا گیا ہے جو بالکل ساکن ہے۔ اس علاقے کی نشانی بتاتے ہوئے کوسٹ گارڈ والے دوست نے اسے بتایا کہ چھوٹی سفید مسجد سے سمندر کی طرف دیکھیں تو وہ جگہ دکھائی دے گی جہاں اسلحہ ڈمپ کیا گیا ہے۔

☆☆

ہم نے الوجیہہ جانے کی ساری تیاری مکمل کرلی تھی اور غوطہ خوری کا تمام سامان بھی خرید لیا تھا میں نے فون پر جدہ میں کرنل نبیل کے علاوہ کمانڈر انچیف کے چیف سیکورٹی آفیسر کو بھی بتا دیا تھا کہ ہم نے الوجیہہ جانا ہے ہماری رہائش کا اگر کوئی معقول انتظام ہوسکے تو ہمیں بہت سہولت ہوگی کیوں کہ الوجیہہ میں بھی کوئی رہائشی ہوٹل وغیرہ نہیں تھا۔ کرنل نبیل نے کہا کہ وہ الوجیہہ کے پولیس چیف کو فون پر ابھی رابطہ کر کے وہاں کے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ہماری رہائش کا انتظام کرنے کا کہہ دے گا اور

وہاں کا پولیس چیف ہمیں فون پر بتادے گا کہ ہم کب ینبع سے روانہ ہوں۔ کرنل نبیل نے مجھے یہ بھی کہا کہ میں وہاں کے پولیس چیف یا کسی سے بھی اپنے اصل مشن کے متعلق بات نہ کروں اور میں اور میرے ساتھی اپنی آمد کا مقصد صرف یہی بیان کریں کہ ہم الوجیہہ اور اس کے گردونواح میں میٹھے پانی کی تلاش میں آئے ہیں ’’آپ لوگ اپنا راز کسی کو نہ بتائیں کیوں کہ بحرۂ احمر کے اس کنارے پر آبادی ہم سے زیادہ ہمارے مخالفین کی حامی ہے‘‘ کرنل نبیل نے مجھے وہاں کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے ینبع میں پاکستانیوں سے ملنے اور ان سے معلومات حاصل کرنے کی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ دراصل مجھے مبشر کی بتائی ہوئی اطلاع پر پورا یقین نہیں تھا۔ مبشر اب ہر روز خاصا وقت ہمارے ساتھ گزارتا تھا۔ میرے دماغ میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ سعودی حکومت نے اس سوڈانی اسلحے کی تلاش میں کس قدر پاپڑ بیلے ہیں لیکن اسے اب تک ناکامی ہوئی۔ مبشر سمیت ان سب لوگوں کو یقیناً یہ بھی علم ہوگا کہ اس اسلحے کے متعلق صحیح اطلاع دینے والے کو حکومت انعام سے مالا مال کردیتی۔ بقول کرنل مزمل، مبشر کوئی ڈرپوک یا سیدھا سادا شخص نہیں تھا۔ وہ جس طرح بنگلہ دیشی حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہاں سے فرار ہوا تھا وہ کسی معمولی دماغ کے آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ مبشر نے اس اسلحے کے متعلق سب کچھ جانتے ہوئے بھی اب تک کیوں خاموشی اختیار کی رکھی۔ اس نے تو ہمیں ان سعودیوں کے نام اور ایڈریس بھی دے دیے تھے جو حکومت کے خلاف باغیوں کی امداد کررہے تھے اور اب تک حکومت کے عتاب سے بھی بچے ہوئے تھے۔ مبشر نے سوڈانی اسلحے کو الوجیہہ کے ساحل کے قریب ڈمپ کرنے کا اس یقین کے ساتھ ہمیں بتایا تھا گویا ساری کارروائی اس کی آنکھوں کے سامنے ہوئی ہو۔ وہاں کوسٹ گارڈ کے عملے میں صرف ایک ہی ملازم نہیں تھا بلکہ ان کی تعداد یقیناً ایک سو سے زیادہ ہوگی۔ کوسٹ گارڈ کی گشتی کشتیاں اور گن بوٹس بھی ۱۲ سے زیادہ تھیں۔ ان سب کی موجودگی میں کوسٹ گارڈ کے عملے کے کسی فرد نے اس کارروائی کو نہیں دیکھا۔ اسلحہ لے کر یہ بوٹ الوجیہہ گئی اور سمندر کے ساکن حصے میں اسے ڈمپ کر کے واپس آگئی۔ طیارہ شکن توپ کو ہاتھوں سے اٹھانے کے لیے میرے خیال میں کم از کم ۲۰ مضبوط جسم افراد کی ضرورت ہوگی۔ کیا اس بوٹ پر جانے والے اتنے افراد اور اسلحے کو عملے کے کسی دوسرے فرد نے نہیں دیکھا یا سارا عملہ ہی اس بغاوت کا حامی تھا کیا الوجیہہ کے کوسٹ گارڈ کے عملے نے بھی ساحل کے بالکل قریب اتنے بڑے حجم کی طیارہ شکن توپوں اور ڈھیر سارے اسلحے کو سمندر میں ڈمپ ہوتے نہیں دیکھا۔ مبشر جو اپنی ڈیوٹی کے بعد ٹیکسی چلا کر اپنی شادی کے لیے پیسے جمع کر رہا تھا اتنا کچھ جانتے ہوئے بھی کیوں خاموش رہا اور اب ہمارے سرسری پوچھنے پر ہی اس نے بلا جھجک اور کسی خوف کے بغیر ہمیں سب کچھ بتا دیا۔ یہ سب باتیں میرے ذہن میں مسلسل کھٹک رہی تھیں۔ کرنل مزمل بہت جذباتی انسان تھا اس نے تو مبشر کی بتائی ہوئی اطلاعات کی صداقت پر پورا یقین کرلیا تھا اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ جب تک میرے پاس کوئی

ایسا ٹھوس ثبوت نہ ہو، میں مزمل کے مبشر پر اس درجہ یقین کو جھٹلاؤں۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ مبشر کی دی ہوئی اطلاعات صحیح ہوں۔ اس مخمصے میں پھنسے ہوئے جب مجھے کرنل نبیل نے کہا کہ دو روز کے اندر الوجیہہ کا پولیس چیف مجھے الوجیہہ میں انتظامات ہونے کی اطلاع دے گا تو میں نے اس موقعے کو غنیمت جانتے ہوئے ینبع میں اس واقعے کے متعلق جاننے والے کسی اور شخص کی تلاش کے علاوہ مبشر کے ٹیلی فون کے دفتر سے اس کے متعلق جان کاری حاصل کرنے کے لیے اسی روز جب مبشر میرے بنگلہ دیشی ساتھیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھا، شہر کی دکانوں کے پاکستانی ملازمین سے پوچھ کر ٹلی فون کے دفتر جا پہنچا۔ اس دفتر میں ایک سینئر انجینئر سے جو بھارتی مسلمان تھا، میں نے مبشر نام کے انجینئر کے متعلق پوچھا تو اس نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرے یہ کہنے پر کہ شاید مبشر نے اپنا صحیح عہدہ نہ بتایا ہو یا یہاں کسی اور نام سے کام کررہا ہو، سینئر انجینئر نے اپنے دو ماتحتوں کو بلایا اور انھوں نے بھی اپنے سینئر کی بات کی تائید کرتے وہی کہا کہ مبشر نام کے کسی انجینئر یا عملے کی بات تو درکنار ہمارے سارے اسٹاف میں کوئی بھی بنگالی کام نہیں کرتا۔ ان کے اتنے وثوق سے یہ بات بتانے پر میرے شک کو اور تقویت ملی اور میں نے اس رات قیصر اور عبداللہ تھائی کے ہمراہ مبشر کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس بات پر بھی حیران تھا کہ ساری رات ڈیوٹی دینے کے بعد مبشر بالکل ترو تازہ ہمارے پاس آجاتا ہے اور اس کے چہرے پر رات بھر کی ڈیوٹی دینے اور جاگنے کے کوئی آثار نہیں ہوتے تھے۔

اس مشن کا انتہائی دلچسپ حصہ اب شروع ہورہا ہے جو اس قسط کے بقیہ حصے میں ختم نہیں ہوسکتا اس لیے بقیہ آئندہ قسط میں پڑھیے گا اور اب ذرا ان کا ذکر کرلوں جو ایک انتہائی مضبوط اور منظم مافیا کی صورت میں گزشتہ کم از کم تیس برسوں سے پاکستان کی جڑوں کو کاٹنے اور اپنی تجوریاں بھرنے میں لگے ہوئے ہیں اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے فوجی انقلاب کو ناکام بنانے کی کوششوں میں مسلسل مصروف ہیں کیوں کہ اب ان کو نہ صرف اپنے محاسبے کا خطرہ ہے بلکہ لوٹی ہوئی ملکی دولت کو اگلنے کے علاوہ اپنی ”حق و حلال“ کی آمدنی کے ختم ہونے کا ڈر بھی ہے۔ یہ ہے ہمارے پبلک سرونٹس کا مافیا۔ آپ نے دیکھا ہوگا سنا ہوگا اور محسوس بھی کیا ہوگا کہ پاکستان کے یہ پبلک سرونٹ (عوام کے خادم) عوام سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ انگریز تو نصف صدی سے زیادہ مدت ہوئی اس ملک کو اپنے وجود سے پاک کر گئے لیکن وڈیروں، جاگیرداروں، نوابوں، سرداروں اور قوانین کے ساتھ ساتھ پبلک سرونٹس کی لعنت اپنے پیچھے چھوڑ گئے انگریزوں کی برصغیر پر صد سالہ حکمرانی کے دوران (یہ بالکل حقیقت ہے) انگریز سول سرونٹس کی تعداد کبھی بھی ۲۵۰۰ سے زیادہ نہیں رہی۔ ضلعے کا ڈپٹی کمشنر اور ایس پی انگریز ہوتے تھے اور ان کے ماتحت اے سی، مجسٹریٹ اور ڈی ایس پی اور تھانیدار وغیرہ سب ہندوستانی۔ قیامِ پاکستان کے بعد قوم سے تمسخر کرتے ہوئے ان سول سرونٹس کو پبلک سرونٹس کا نام دیا گیا۔ بھارت نے بھی بھنگی اور چماروں کو ہریجن کا نام دیا لیکن انھیں کام وہی کرنا پڑا جو تقسیم ہند سے پہلے کرتے تھے۔ بھارت

کے دیہاتوں میں ہریجن گاؤں والوں کے ساتھ نہ رہ سکتے ہر گاؤں سے ملحقہ ان کی علیحدہ بستی ہوتی ہے جس پر نشانی کے لیے سرخ جھنڈا لگا ہوتا ہے ان کو ہندوؤں کے مندروں میں جانے اور کنوؤں سے پانی لینے کی اجازت نہیں۔ پاکستان سے انگریز تو چلے گئے ان عہدوں پر پاکستانی افسران کا تقرر ہوا جو انگریزوں کے لیے مخصوص تھے قیامِ پاکستان کے بعد کے چند سال چھوڑ کر ان عہدے داروں کی فرعونیت انگریزوں سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ یہ صرف اپنے مخصوص طبقے میں ہی اٹھتے بیٹھتے ہیں جس طرح انگریزوں نے برصغیر کو لوٹا، ان سے بڑھ کر یہ پاکستان کو لوٹ رہے ہیں۔ پاکستان میں سب سے اونچا عہدہ ۲۲ گریڈ کا ہے جس کی تنخواہ ۲۰ ہزار سے زیادہ نہیں اب ان پبلک سرونٹس کی بودو باش اور طرزِ رہائش کو دیکھیں ان کی اولاد یا تو امریکا اور برطانیہ میں زیرِ تعلیم ہوتی ہے یا پاکستان میں تعلیم کے سب سے مہنگے اداروں چیف کالج لاہور، لارنس کالج گھوڑا گلی اور پرائیویٹ اسکولوں میں جہاں کنڈرگارٹن جیسی ابتدائی کلاسوں میں بھی آٹھ نو ہزار روپیہ ماہوار فی طالب علم فیس لی جاتی ہے۔ ملک قرضوں میں ڈوبا ہوا ہے اور ان ”پبلک سرونٹس“ کی حفاظت کے لیے چھ چھ مسلح سپاہی سرکاری پیجارو اور مرسیڈیز گاڑیاں دفاتر کے عالی شان ایئرکنڈیشنڈ کمرے، مصروفیت اتنی کہ سائل کو چند منٹ کی ملاقات کے لیے دنوں بلکہ ہفتوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور کارکردگی اتنی اعلیٰ کہ چوری ڈاکے، قتل اور گاڑیاں چھیننے کی وارداتوں میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے جب بھی ملنے جاؤ تو پی اے یا چپڑاسی یہ مژدہ سنا دیتا ہے کہ صاحب میٹنگ میں ہیں اور اس وقت اندر کیا ہوتا ہے اس کا میں چشم دید گواہ ہوں کہ دوستوں کے ساتھ گپ بازی، چائے نوشی اور کسی ہم عصر افسر کی بیوی کی یورپ اور سنگاپور میں شاپنگ کے قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ کام ہے جو یہ پبلک سرونٹ کرتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی ان کے ماتحتوں کے مزاج بھی عرشِ معلیٰ پر جا پہنچے ہیں۔ اور دفتر کا چپڑاسی ہو یا سیکریٹری بڑے صاحب ہوں یا چھوٹے بابو بوا سبھی فرعون بنے ہوئے ہیں۔ بڑے صاحبوں کے بینک بیلنس، پلاٹوں اور دوسری جائیداد کا حساب ہی نہیں اور ذرا ان کی خاندانی اصلیت کو دیکھیں تو ”منجی پیڑھی ٹھکوالو“ والے ہوتے ہیں فوج میں ڈھائی سال کی اکیڈمی ٹریننگ اور ایم بی بی ایس کے ۵ سالہ کورس میں ملکی خزانے سے چھ لاکھ روپے سے زیادہ ہر کیڈٹ اور ڈاکٹر بنانے پر خرچ ہوتے ہیں اور چوں کہ فوج میں سرکاری خزانے میں نقب لگانے کا موقع نہیں ملتا اور ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کامیاب ڈاکٹر کے لیے اہلیت ضروری ہوتی ہے اس لیے کچھ کم ظرف اپنی پہلی ملازمتیں چھوڑ کر CSS (سینٹرل سپیریئر سروسز) یعنی ”عوام کی خدمت“ کے محکموں کی طرف دوڑتے ہیں۔ اس لیے آپ کو پولیس اور سول سروس میں ایسے افسران کثرت سے ملیں گے جن کے نام کے ساتھ ڈاکٹر یا کیپٹن اور میجر لکھا ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی عملی زندگی کے آغاز میں ہی ملکی خزانے کو اس طرح نقصان پہنچانے والوں کو پھر سرکاری ملازمتیں کیوں دی جاتی ہیں۔ سیاسی حکومتوں میں تو CBR اور وزارتِ خزانہ والوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔

''خود بھی کھاؤ ہمیں بھی کھلاؤ'' کے اصول کے پیش نظر سیاسی حکمرانوں کو ان کا حصہ گھر میں (وزیراعظم ہاؤس) میں پہنچ جاتا تھا اور باقی سب کچھ ان محکموں کے کرتا دھرتا ڈکار جاتے تھے۔ اب فوجی حکومت ہے تو ان محکموں کے کرتا دھرتا اس حکومت کو ناکام بنانے میں دن رات کوشاں ہیں بقول بیگم کلثوم نواز ''فوجی گولی تو چلا سکتے ہیں حکومت نہیں کر سکتے'' بیگم کلثوم نواز اپنے بیان میں ایک بات بھول گئیں کہ فوجی جب حکومت سنبھالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو ان کے بھرپور مینڈیٹ والے شوہر کی طرح ہیرا پھیریاں نہیں کرتے بلکہ ان کی حکمرانی ایسی سیدھی ہوتی ہے جیسے رائفل سے نکلی گولی۔ وزارتِ خزانہ کے کرتا دھرتا نے جو ۵۷ فی صد تنخواہوں میں اضافے کی خوش خبری سنائی ہے اس کا فارمولا ایک ایسا گورکھ دھندا ہے جو نہ تو جنرل پرویز مشرف صاحب کو سمجھ آیا ہوگا اور نہ ہی سیدھے سادے ملازمین کو۔ مجھے ایک صاحب فن حساب و شماریات نے بتایا کہ اس فارمولے سے ۵۷ فی صد تو دور کی بات ہے عملی طور پر ۱۰ فی صد اضافہ بھی نہ ہوگا۔ یہ ہی اور ایسی ہی بہت سے ڈھکی چھپی تدبیریں ہیں ان بیورو کریٹس کی جو فوجی حکومت کو فیل کرنے میں دن رات کوشاں ہیں جن کی آٹھ آٹھ گھنٹے کی ۲۴ گھنٹوں میں تین شفٹوں کی تنخواہوں کا حساب کریں تو ۴۰ ہزار ماہوار سے زیادہ ان کے حفاظتی گارڈ پر بھی سرکاری خزانہ صرف ہوتا ہے۔ ان کو مار کر کسی نے بلاوجہ گولی ضائع کرنی ہے ان کی رعونت کا عالم یہ ہے کہ صاحب بہادر کے گھر کے اندر سے آدھا گھنٹا پہلے یہ سرکاری ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کر کے ایک جگہ کھڑی کرتا ہے کہ صاحب بہادر کو ایک قدم بھی چلنا نہ پڑے ان کا بس چلے تو سرکاری گاڑی کو اپنے بیڈ روم میں بھی لے جائیں۔

✻

ساتواں باب

مبشر حسب معمول دوپہر ایک بجے ہمارے گیسٹ ہاؤس میں آیا اور کرنل مزمل، عمران اور میرے ساتھ تھوڑا وقت بیٹھ کر الوجیہہ جانے کے لیے ہماری تیاریوں کا پوچھا۔ مزمل نے کہا کہ ہم بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ یہ سن کر مبشر کہنے لگا کہ غوطہ خور فلپائنی لڑکے بھی روانگی کا پوچھ رہے تھے اور انھوں نے تو ایک ہفتے کی بغیر تنخواہ کے چھٹی بھی لے لی ہے۔ اب آپ روانگی میں تاخیر کیوں کر رہے ہیں مزمل کے جواب دینے سے پہلے ہی میں نے کہا کہ ہمیں ابھی روانگی کا گرین سگنل نہیں ملا۔ جوں ہی جدہ سے حکم ملے گا ہم روانہ ہو جائیں گے۔ میں نے مبشر کو ٹٹولنے کی غرض سے کہا ''مبشر مجھے ایک مزید ٹیلی فون کی فوری ضرورت ہے۔ تم تو اسی محکمے میں کام کرتے ہو کیا تم ایک آدھ دن میں ایک اور ٹیلی فون لگوا سکتے ہو۔ دراصل ہماری چھوٹی موٹی ضروریات کے لیے ہر بار یہاں کے پولیس چیف اور گیسٹ ہاؤس کے انچارج کو کہتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگتا'' مبشر میری بات سن کر کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا ''اگر کسی پرائیویٹ جگہ پر فون لگوانا ہو تو میں چند گھنٹوں میں یہ کام کر سکتا ہوں لیکن چوں کہ یہ گیسٹ ہاؤس سرکاری ہے لہٰذا یہاں پر فون لگوانے کے لیے گیسٹ ہاؤس کے انچارج کی طرف سے درخواست ضروری ہے'' مبشر کا یہ عذر بالکل صحیح تھا چناں چہ بات یہیں پر ختم ہوگئی۔ مبشر ہم سے رخصت ہو کر JCO منصف اور دونوں سپاہیوں کے پاس چلا گیا۔ جب سے اس نے گیسٹ ہاؤس میں آنا شروع کیا تھا، وہ بہت تھوڑا وقت ہمارے ساتھ اور پھر رات کو اپنی ڈیوٹی شروع ہونے تک منصف اور سپاہیوں کے ساتھ ہی رہتا۔ دو بار وہ ان تینوں کو اپنے ہمراہ شہر بھی لے گیا تھا۔ قیصر اور عبداللہ تھائی کو میں نے پہلے ہی آج شام مبشر کا پیچھا کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا اور گسٹ ہاؤس کے انچارج کے ذریعے رینٹ اے کار والوں سے ڈرائیور کے ساتھ ایک بڑی کار کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ شام کے سات بجے مبشر

JCO اور سپاہیوں سے رخصت ہوا تو اس کی گاڑی کے ایک پہیے کی ہوا نکلی ہوئی تھی۔ یہ کام میری ہدایت پر عبداللہ نے کیا تھا کیوں کہ مبشر کی گیسٹ ہاؤس سے روانگی کے وقت ہمیں اپنی پلاننگ کے مطابق پیچھا کرنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ مبشر اپنی گاڑی کا پہیہ تبدیل کرنے میں مصروف ہوگیا اور میں، قیصر اور عبداللہ ایک ایک کر کے گیسٹ ہاؤس سے باہر نکلنے اور گیسٹ ہاؤس سے ذرا فاصلے پر اوٹ میں کھڑی رینٹ اے کار کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس کا ڈرائیور تھائی تھا۔ عبداللہ نے اپنی زبان میں اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ ہم جس گاڑی کا بتائیں۔ اس کا بغیر ظاہر ہوئے پیچھا کرنا ہے۔ ہم تینوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے کیوں کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے کو پہچاننا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہی مبشر اپنی گاڑی میں نکلا اور تقریباً سو میٹر کا فاصلہ دے کر ہم نے اس کا تعاقب شروع کیا۔ مبشر کی گاڑی کا رخ شہر کے اس علاقے کی طرف تھا جہاں زیادہ تر غیر ملکی رہتے ہیں۔ بڑی سڑک سے اتر کر مبشر ایک لین (چھوٹی سڑک) میں داخل ہوا اور ایک درمیانہ درجے کے گھر کے سامنے اپنی گاڑی روک کر اس گھر میں داخل ہوگیا۔ اس کے اس گھر میں جانے کے تھوڑی دیر بعد ہم اپنی گاڑی اسی لین میں لے گئے اور گھر کی شناخت کے بعد گاڑی بڑی سڑک پر لا کر ایسی جگہ پر کھڑی کی جہاں سے مبشر کی گاڑی کو بڑی سڑک پر آتے ہوئے بخوبی دیکھا جاسکے۔ گرمی اور حبس کے باعث ہم نے اپنی گاڑی کے شیشے بند کر کے اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ رکھ کر AC چلوا رکھا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مبشر کی گاڑی بڑی سڑک پر آ کر ہمارے قریب سے ہی گزری۔ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر ایک اور پچھلی سیٹ پر دو سوڈانی بیٹھے تھے (ان کے چہروں کی سیاہ رنگت اور سوڈانی بڑی پگڑیوں سے ہم نے انھیں بطور سوڈانی پہچانا) مبشر کی گاڑی اب شہر کے باہر ایئرپورٹ کی طرف جارہی تھی اور ہم فاصلہ دیے اس کے تعاقب میں تھے۔ ایئرپورٹ اس سڑک کے دائیں جانب تھا۔ ینبع کی جیل کے سامنے سے گزر کر ایئرپورٹ سے ذرا پہلے مبشر نے اپنی گاڑی سڑک کے بائیں جانب موڑی۔ یہ سڑک سمندر کے ساکن حصے کو جاتی تھی جہاں لوگ پکنک اور سیر کے لیے آتے تھے اور رات گئے تک اس سڑک پر پرائیویٹ گاڑیوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ اس سڑک کے بالکل آخر پر ینبع کوسٹ گارڈ کے دفاتر اور گن بوٹس تھیں اور یہیں سے کھلا سمندر شروع ہوتا تھا۔ کوسٹ گارڈ کی حدود میں داخل ہونے کے لیے سیکورٹی چیک پوسٹ اور بیریر تھا۔ چیک پوسٹ اور بیریر کے باہر ہی ایک گاڑی اور دو آدمی (یقیناً سعودی) کھڑے تھے۔ انھوں نے سعودی عرب کا مخصوص لباس توپ پہنی ہوئی تھی۔ مبشر کی گاڑی لمحہ بھر کو وہاں رکی اور اسے موڑ کر وہ واپس اسی سڑک پر ہولیا۔ اب اس کے پیچھے دونوں سعودیوں کی گاڑی تھی جو مبشر کی گاڑی کو اوورٹیک کر کے اس سے آگے ہولی۔ اب ہماری گاڑی ان دونوں کے پیچھے تھی۔ پکنک والی جگہ سے یہ دونوں گاڑیاں ایک کچے اور پتھریلے راستے سے نیچے اتریں اور پکنک اسپاٹ جہاں بیسیوں گاڑیاں کھڑی تھیں، سے گزرتی ہوئیں ساکن سمندر کے ساتھ ایک ایسے مقام پر رکیں جہاں اردگرد کوئی

انسان نہ تھا۔ میں نے اپنی گاڑی پکنک والی جگہ پر دوسری گاڑیوں کے ساتھ رکوادی اور عبداللہ اور قیصر کے ساتھ مبشر کی گاڑی کی طرف پیدل چل پڑا۔ ان کی گاڑیاں ہم سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھیں اور ان کی ہیڈ لائٹس سمندر کے ساکن حصے کو روشن کررہی تھیں۔ ہم چھپتے چھپاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی گاڑیوں کی لائٹس میں ہم نے دیکھا کہ مبشر نے اپنے کپڑے اتارے اور صرف انڈرویئر پہنے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ یہاں میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ کھلے سمندر میں لہریں کناروں سے ٹکراتی ہیں جیسے ہاکس بے اور سینڈسپٹ پر آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہاں ساحل پر پانی بہت ہی کم ہوتا ہے اور جوں جوں سمندر کے اندر بڑھتے جائیں پانی گہرا ہوتا جاتا ہے سوائے ان جگہوں کے جہاں ساحل کے پہاڑ اور چٹانیں کھلے سمندر کے کافی اندر تک گئی ہوں۔ کھلے سمندر کا پانی ساحل پر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ساکن یا ٹھہرے ہوئے سمندر کا پانی کنارے پر ہی خاصا گہرا ہوتا ہے جیسے کراچی میں سی پورٹ کی مختلف جیٹیوں پر بڑے بڑے جہاز کنارے پر آلگتے ہیں۔ ینبع کے اس حصے کے سمندر کی بھی یہی حالت تھی۔ مبشر نے دو تین بار پانی سے سر نکال کر سانس لیا اور پھر غوطہ لگالیا۔ اتنی دیر میں ہم گھونگھوں کے بنائے دس بارہ فٹ اونچے ٹیلوں کی اوٹ میں ان گاڑیوں کے خاصے قریب پہنچ چکے تھے اور اس سب کارروائی کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ مبشر نے ایک بار اور پانی سے سر نکالا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک سوڈانی نے نائیلون کی ایک رسی گاڑی سے پہلے ہی نکال رکھی تھی جس کے ایک سر پر چھوٹا سا جال بنا ہوا تھا۔ اس نے جال والا سرا مبشر کی طرف پھینکا۔ مبشر اس جال والی رسی کو لے کر پھر پانی کے اندر چلا گیا۔ اس بار جب اس نے پانی سے سر نکالا تو اس کے اشارے پر دونوں سوڈانیوں نے رسی کو کھینچنا شروع کیا۔ مبشر اب تیرتا ہوا ساحل کی طرف آرہا تھا وہ ساحل کے بالکل قریب پہنچا تو دونوں سوڈانیوں نے آگے بڑھ کر رسی کو کھینچا، ادھر مبشر نے بھی پانی میں ہی ان کا ہاتھ بٹایا اور رسی کے جال میں لپٹی ہوئی لکڑی کی ایک بڑی پیٹی پانی سے باہر نکالی۔ اس پیٹی پر واٹر پروف کینوس چڑھا ہوا تھا۔ مبشر بھی پانی سے باہر آگیا۔ دونوں سوڈانیوں نے بڑے چاقوؤں سے کینوس کو کاٹ کر ہتھوڑی جیسے ایک اوزار سے پیٹی کے تختے علیحدہ کیے اور پولی تھین میں لپٹی ہوئی رائفلوں کے حصے نکالے۔ ہر پولی تھین میں ایک مکمل آٹومیٹک رائفل کے حصے موجود تھے اور ایسی ۱۲ رائفلیں پیٹی میں سے نکلیں۔ ان کے ساتھ ہی اسی طرح واٹر پروف میٹریل میں بند ان رائفلوں کی گولیوں کے ۶ پیکٹ بھی نکلے اور ان سب کو مبشر کی گاڑی کی ڈگی میں رکھ دیا گیا۔ لکڑی کی پیٹی کا بقیہ حصہ اور ٹکڑے سعودیوں نے اپنی گاڑی میں رکھ لیے اور یہ دونوں گاڑیاں واپس روانہ ہوئیں۔ ہم ان گاڑیوں کے اس قدر قریب پہنچ چکے تھے کہ قیصر نے دونوں گاڑیوں کے نمبر بھی اپنی ڈائری میں لکھ دیے۔ دونوں گاڑیاں ہمارے قریب سے گزر گئیں۔ ہمارے مشن کا پہلا حصہ مکمل ہوچکا تھا۔ لہٰذا اب ہمیں ان کے تعاقب کی ضرورت نہ تھی۔ گاڑیوں کے اوجھل ہونے کے بعد ہم اپنی گاڑی تک پہنچے اور واپس گیسٹ ہاؤس جا کر رینٹ

اسے کار کی گاڑی چھوڑ دی۔ واپسی کے سفر کے دوران ہم بالکل خاموش رہے لیکن ہمارے ذہن پوری طرح سے آج رات کی کارروائی میں الجھے ہوئے تھے۔ میں نے قیصر اور عبداللہ کو تاکیداً کہا کہ آج رات کے واقعے کا کسی سے بھی ذکر نہ کیا جائے۔ میں مزمل اور عمران کو بھی سرپرائز دے کر یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ ہم وطن، ہم زبان اور پرانی جان پہچان والے بھی وفاداریاں تبدیل کر لیتے ہیں اس لیے میں نے ان سے بھی اس سارے واقعے کے متعلق ایک حرف تک نہ کہا۔ گیسٹ ہاؤس میں اپنے کمرے سے ہی میں نے کرنل نبیل سے جدہ میں رابطہ کیا اور اسے یہ کہا کہ اگر وہ کل صبح پہلی فلائٹ سے ینبع پہنچ جائے تو مجھے خاصا یقین ہے کہ مجھے سونپے گئے مشن کی کامیابی کی رپورٹ اسے دے سکوں گا۔ نبیل نے اگلی صبح آنے کا وعدہ کیا۔ قارئین بھی اب تک سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم کس حد تک کامیابی سے ہم کنار ہو چکے تھے۔ صرف ایک بات میرے دماغ میں اٹکی ہوئی تھی کہ صرف ۱۲ رائفلوں کے ساتھ باغی حکومت کا مقابلہ کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتے پھر ان رائفلوں کو سمندر سے نکالنے کا مقصد کیا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک ہی میرے دماغ میں کوندا سا لپکا اور ساری بات واضح ہوگئی۔ مبشر نے ہمیں باغیوں کا سارا اسلحہ الوجیہہ کے سمندر میں ڈمپ کرنے کا اس طرح سے یقین دلایا تھا کہ ہم وہاں جانے کے لیے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں الوجیہہ میں کچھ نہ ملتا اور ہم ناکام واپس لوٹتے، باغیوں کا مقصد نہ صرف اسلحے کو چھپائے رکھنا تھا بلکہ اس کی تلاش میں آنے والوں کو ختم کرنا بھی تھا۔ مبشر کو یہ علم تھا کہ مزمل بڑا ہٹ دھرم اور ضدی ہے اور جس بات کا قصد کر لے اسے جب تک پورا نہ کر لے چین سے نہیں بیٹھتا۔ مبشر کو کرنل مزمل نے ''اپنا'' جانتے ہوئے یہ بھی یقیناً بتایا ہوگا کہ ہماری ٹیم کا سربراہ میں ہوں اور اس سے میرے ماضی کی کامیابیوں کا ذکر بھی یقیناً ہوا ہوگا JCO منصف اور دونوں سپاہیوں سے بھی اسے ہمارے متعلق خاصی معلومات ملی ہوں گی۔ مبشر سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس نے اسلحے کے ڈمپ کیے جانے کے واقعے کو اس طرح بیان کیا تھا کہ الوجیہہ سے اسلحہ نہ ملنے کی صورت میں بھی اس کی جان نہیں چھوٹتی تھی۔ ہمارے ہمراہ الوجیہہ جانے کی اگرچہ اس نے پیش کش بھی کی تھی لیکن یہ محض اس سارے ڈرامے میں اپنے کردار کو مضبوط کرنے کے لیے تھی۔ ناکامی کی صورت میں بھی ہم نے اس کا پیچھا چھوڑنا نہیں تھا۔ اگر وہ شروع میں ہمارے پوچھنے پر ہی اپنی لاعلمی ظاہر کرتا تو بات آئی گئی ہو جاتی۔ اپنی پہلی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے ہمیں الوجیہہ جانے کی ایسی ترغیب دی کہ ہم اس کے جھانسے میں آ گئے۔ باغی ساتھیوں سے مشورے کے بعد یہ بارہ رائفلیں حکومت کے خلاف استعمال کے لیے نہیں بلکہ ہمیں ینبع اور الوجیہہ کے سفر کے دوران ہلاک کرنے کے لیے پانی سے نکالی گئی تھیں۔ میرے پاس ان باتوں کا کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا لیکن واقعات کی کڑیاں ملانے سے یہی نتیجہ نکلتا تھا جو میں نے بیان کیا ہے۔ ینبع کے گیسٹ ہاؤس کی سیکورٹی اتنی زیادہ تھی کہ اوّل تو وہاں ہم پر حملہ کرنا بے حد مشکل تھا اور اگر حملہ کرنے کی جرأت کر بھی لی جاتی تو ہم سب کو مختلف کمروں میں ختم

کرنا ناممکن تھا۔ ویران سڑک پر چار گاڑیوں کے قافلے کو روکنا اور ہم سب کو رائفلوں سے ہلاک کرنا اتنا ہی آسان تھا جیسے بیٹھی ہوئی بطخوں کو نشانہ بنانا۔ مبشر کا غوطہ خوری کے لیے ہمارے سامان خریدنے میں بھرپور دلچسپی، فلپائنی غوطہ خوروں کا انتظام اور ہمیں بار بار الوجیہہ جانے پر اصرار کرنا بھی میرے خیال کی تائید کرتے تھے۔ ہم تو ضمیر اور جذبات کے قیدی تھے ہی دونوں فلپائنی بھی بلاوجہ مارے گئے۔

دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب پہلے مبشر حسب معمول ہمارے پاس آیا اور اس کے آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی کرنل نبیل کا فون آیا کہ وہ گیسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ نبیل کو میں نے کہا کہ اس ڈرامے کا کلائمکس بالکل قریب ہے۔ ہمیں فوری طور پر ایک سو کے لگ بھگ مسلح فوجی، غوطہ خور اور دو بڑی کرینیں چاہییں۔ تاکہ باغیوں کو گرفتار کیا جا سکے اور سمندر میں ڈمپ اسلحے کو نکالا جا سکے۔ کرنل نبیل کو یقین دلانے پر کہ سب کام یقینی طور پر ایسے ہی ہوگا جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، وہ ان انتظامات کے لیے چھاؤنی چلا گیا اور میں عمران کے کمرے میں آ گیا جہاں مبشر بیٹھا ہوا تھا۔

☆☆

کرنل نبیل نے مجھے بتایا تھا کہ تمام انتظامات میں تقریباً چار گھنٹے صرف ہوں گے اور اگر ضرورت پڑی تو وہ چھاؤنی سے مجھے فون کرے گا۔ بصورتِ دیگر تمام انتظامات مکمل کرنے کے بعد وہ گیسٹ ہاؤس میں آ کر مجھے ملے گا۔ میں نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور پہلے قیصر، عبداللہ تھائی اور رضی کو کہا کہ مسلح ہو جائیں اور مبشر کو کسی صورت میں بھی گیسٹ ہاؤس سے باہر نہ جانے دیں۔ انھیں یہ ہدایات دے کر میں عمران کے کمرے میں چلا آیا جہاں مزمل، عمران اور مبشر بیٹھے ہوئے تھے۔ مبشر مجھ سے بہت تپاک سے ملا۔ میں نے عمران کو کہا کہ مبشر کو چائے وغیرہ پلوائیں کیوں کہ اس سے ہاتھ ملاتے وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے سردی سے بخار اور زکام ہو رہا ہے۔ عمران بولا کہ چائے کا تو وہ پہلے ہی آرڈر دے چکا ہے۔ میں چوں کہ مبشر کی اصلیت سے واقف ہو چکا تھا اس لیے میں نے بڑے نرم پیرائے میں اس سے چبھتے ہوئے سوال پوچھنے شروع کیے ''مبشر میں حیران ہوں کہ تم کس مٹی کے بنے ہوئے ہو۔ رات بھر ڈیوٹی دینے کے بعد بھی تم بالکل تازہ دم دکھائی دیتے ہو۔'' میرے یہ پوچھنے کے جواب میں وہ ہنستے ہوئے بولا ''میں مسلسل محنت اور جدوجہد کرتے کرتے اس بات کا عادی ہو چکا ہوں'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے اس کی تائید میں سر ہلایا اور پوچھا ''کل شام میں نے تمھاری گاڑی میں تین سوڈانیوں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ کیا وہ بھی تمھارے ساتھ ہی کام کرتے ہیں؟'' میرے اس سوال پر مبشر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ کر چند سیکنڈ سوچنے کے بعد بولا۔ ''وہ تینوں سوڈانی دراصل میرے پرانے گاہک تھے جنھیں میں کئی بار مدینے لے گیا تھا۔ کل انھوں نے بہت مجبور کیا تو میں ان کو اپنی گاڑی میں مدینے لے گیا اور علی الصبح ہی ہم واپس پہنچے ہیں'' ''لیکن تم نے

تو ان سوڈانیوں کو ان کے گھر سے اٹھایا تھا اور پھر تمھاری گاڑی مدینے جانے والی سڑک کے بجائے الوجیہہ جانے والی سڑک پر کوسٹ گارڈ کے دفاتر کی طرف مڑ گئی تھی'' میرے اس انکشاف پر مبشر بالکل ہراساں ہوگیا اس کے منھ سے بات تک نہیں نکلی اور وہ خاموشی سے کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ عمران اور مزمل بھی حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی مبشر کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے چوں کہ مبشر کا بھید کھولنا تھا اس لیے پوری تیاری سے آیا تھا۔ میں نے ایکا ایکی ریوالور نکال کر اس کا رخ مبشر کی طرف کردیا اور عمران کو کہا فوری طور پر قیصر، عبداللہ تھائی اور رضی کو بلالائے۔ عمران ابھی تک کچھ نہ سمجھتے ہوئے غیر حاضر دماغ کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے سخت لہجے میں اسے کہا۔ Imran! Did you hear my Order (عمران! کیا تم نے میرا حکم سنا ہے) عمران فوراً ہی بے دھیانی کی کیفیت سے باہر آیا اور یس سر کہہ کر ساتھیوں کو بلانے چلا گیا۔ مبشر نے مجھے عمران سے مصروف دیکھ کر اپنی قمیص کے اندر ہاتھ ڈالنا چاہا تو میں فوراً بولا ''مبشر اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو گولیاں تمھارے سینے میں اتار دوں گا'' مبشر کا ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اپنے ریوالور کی نال کے اشارے سے میں نے اسے اپنے ہاتھ سر پر رکھنے کا کہا۔ چند لمحوں، میں ہی عمران تینوں ساتھیوں کو لے کر کمرے میں آگیا۔ میں نے قیصر اور رضی کو کہا کہ مبشر کے دونوں ہاتھ پکڑ لیں اور عبداللہ کو کہا کہ اس کے لمبے بالوں کو کھینچ کر اس کے سر کو پیچھے کریں۔ جب مبشر پوری طرح سے میرے ساتھیوں کی گرفت میں آگیا تو میں نے عمران کو اس کی تلاشی لینے کا کہا۔ اس کی قمیص کے اندر پینٹ کی پیٹی میں اڑسا ہوا ۲۵ بور کا ایک چھوٹا پسٹل نکلا۔ عمران اور مزمل ابھی تک واقعے کی تہہ تک نہیں پہنچے تھے۔ رضی نے میرے کہنے پر الوجیہہ ساتھ لے جانے والے سامان سے ایک رسی نکالی اور مبشر کو کرسی کے ساتھ اس طرح جکڑ دیا کہ وہ ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکے۔ اب میں نے مبشر کو مخاطب کرتے ہوئے اور سب کو سنانے کے لیے کل شام کی اپنی کارروائی بیان کرنی چاہی تو قیصر نے مجھے کہا ''سر میں اپنے تمام ساتھیوں کو یہاں بلالیتا ہوں تاکہ وہ بھی سارے واقعات سن لیں۔ خصوصی طور پر منصف JCO اکرم اور دین محمد بھی جن کے پاس یہ ہر روز بہت سا وقت بیٹھا رہتا تھا'' میں نے قیصر کو کہا کہ سب کے لیے یہ کمرہ چھوٹا پڑ جائے گا اس لیے ہم سب ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں اور مبشر کو بھی وہیں لے آئیں۔ قیصر اور عبداللہ تھائی نے رضی کی مدد سے مبشر کو اسی طرح بندھے ہوئے کرسی سمیت اٹھایا اور ڈرائنگ روم کے درمیان میں اس کی کرسی رکھ دی۔ اب قیصر اور رضی باقی سب ساتھیوں کو بلانے چلے گئے اور پانچ منٹ میں ہی ماہا اور سپنا کے ساتھ تمام ساتھی ڈرائنگ روم میں جمع ہوگئے۔ میں نے داستان کے شروع کے واقعات تمام ساتھیوں کو سنا کر مبشر سے سوالوں کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع کیا جو عمران کے کمرے میں ادھورا رہ گیا تھا۔ ''کوسٹ گارڈ کے دفاتر کی بیرونی دیوار کے ساتھ کھڑی ایک اور گاڑی میں دو توپ پہنے ہوئے آدمی بھی تمھارے ساتھ ہو لیے تھے اور دونوں گاڑیوں میں تم لوگ ساکن سمندر کے ایک مخصوص حصے کے پاس جا کر رکے اور تم نے سمندر میں کئی بار غوطہ لگانے

کے بعد سوڈانیوں کی پھینکی ہوئی ایک رسی کے ذریعے سمندر کی تہہ سے ایک پیٹی نکالی اس پیٹی کو وہیں کھولا گیا اور اس میں سے ۱۲ آٹومیٹک رائفلیں اور گولیاں نکلیں جنھیں تمھاری گاڑی کی ڈگی میں رکھا گیا اور رات کے اندھیرے میں دونوں گاڑیاں شہر کی طرف آگئیں'' مبشر کے چہرے کا رنگ خوف کے مارے سفید ہورہا تھا۔ اس نے میرے بیان کردہ واقعے کو نہ تو جھٹلایا اور نہ ہی اپنی صفائی میں ایک لفظ تک کہا۔ ایک مجرم کی طرح جو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو، گردن جھکائے وہ بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ عمران اور مزمل کا غصے اور شرمندگی کے مارے برا حال ہورہا تھا۔ انھیں شرمندگی اس بات کی تھی کہ ان کے ایک ہم وطن نے پردیس میں ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ مزمل اس کو برسوں پہلے سے جانتا تھا اور اسی سے اس کی پاکستان سے وفاداری کے واقعات سن کر ہی ہم سب نے نہ صرف اس کو بڑھ کر گلے لگایا تھا بلکہ اس کی دردناک کہانی اور شادی کا سن کر اس کی بھرپور مالی امداد بھی کی تھی۔ مزمل خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں گیا اور چند لمحوں بعد جب واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا ''میں اس غدار اور نمک حرام کو اس کی نمک حرامی کا ابھی مزہ چکھاتا ہوں۔'' میں نے اور عمران نے بڑی مشکل سے اسے روکا اور میں نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ سپاہی اس کے لیے ٹھنڈا پانی لے کر آئے اور جب چند منٹوں بعد اس کا غصہ ذرا دھیما ہوا تو میں نے مزمل اور دوسرے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''مجھے اپنی اپنی سوچ کے مطابق ذرا یہ بتایئے کہ ۱۲ رائفلوں کے ساتھ یہ باغی کیا سعودی حکومت کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ مزمل بھائی کیا تمھارے پاس کھلنا میں اپنے ہم خیال ۱۲ افراد بھی نہیں تھے جو رائفلوں کے ساتھ بنگلہ دیشی فوج اور حکومت کو زیر کرسکتے؟ کیا اسی ینبع میں سعودی نیشنل گارڈز نے ایک پوری باغی رجمنٹ کو بھون کر نہیں رکھ دیا تھا اور کیا مبشر اور اس کے ساتھی اس واقعے سے لاعلم تھے۔ نہیں۔ ایسی ہرگز کوئی بات نہ تھی جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں اور واقعات کی کڑیوں کو ملا کر جو نتیجہ سامنے آیا ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے کہ باغیوں کا سارا اسلحہ ینبع کے ساکن سمندر میں ہی ڈمپ کیا گیا ہے۔ مبشر باغیوں کا ساتھی ہے اور جب اسے ہمارے ارادوں کا علم ہوا تو اس نے ہمیں Mis guide (غلط راستے پر ڈالتے ہوئے) اسلحے کا الوجیہہ میں ڈمپ کیے جانے کا اتنے یقین کے ساتھ بتایا کہ ہم سب اس کی باتوں میں آگئے اور ہم نے اس پر پورا یقین کرتے ہوئے ان باتوں کو بالکل نظر انداز کردیا جن کے متعلق ذرا سا غور کرنے پر مبشر کی بتائی ہوئی تمام باتوں کی نفی ہوجاتی۔ ینبع میں باغیوں کے اسلحے کو دوبارہ کوسٹ گارڈ کی گن بوٹس یا کسی دوسری بوٹ پر لوڈ کرنے کے لیے درجنوں افراد کی ضرورت ہوتی۔ کوسٹ گارڈ کا سارا عملہ ہی باغیوں کے ساتھ ملا ہوا نہیں تھا کہ ساکن سمندر کے دہانے پر کوسٹ گارڈ کی درجن بھر گن بوٹس اور عملے کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسلحے سے بھری بوٹ الوجیہہ لے جا کر اسلحہ ڈمپ کردیتی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ بس اسی بات نے مبشر کو مشکوک بنا دیا۔ الوجیہہ جانے کے لیے ہماری تیاریوں میں اس نے بھرپور حصہ لیا۔ ٹیلی فون کے دفتر میں اس کی ملازمت کرنے کی

کہانی بھی محض جھوٹ ہے اور میں اس کی تصدیق کرچکا ہوں۔ مبشر نے کرنل مزمل، میجر عمران JCO منصف اور اکرم اور دین محمد سے اپنی ہم وطنی اور ہم زبانی کی وجہ سے ہمارے ماضی کے مشنوں کے متعلق خاصی جان کاری حاصل کی ہوگی اور اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب باغیوں کو ہماری ہٹ دھرمی کا بتایا ہوگا تو ہم سے نجات پانے کے لیے صرف یہی صورت ان کی سمجھ میں آئی کہ ہمیں الوجیہہ جاتے ہوئے راستے میں ہی ختم کردیا جائے۔ یہ بارہ رائفلیں اسی مقصد کے لیے سمندر سے نکالی گئی تھیں'

میری یہ باتیں سن کر مزمل پر پھر غصے کا دورہ پڑا۔ اس کا ریوالور تو میں پہلے ہی لے چکا تھا۔ اس نے کرسی سے بندھے ہوئے مبشر کو چانٹوں اور ٹھڈوں سے پیٹنا شروع کیا۔ میرے ساتھیوں نے اسے بڑی مشکل سے قابو کیا۔ میں نے مزمل کو سمجھاتے ہوئے کہا ''مزمل! اس میں تمھارا قصور نہیں۔ اس نے ہم سب ہی کو بے وقوف بنایا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہی یہاں کی چھاؤنی کے فوجی حرکت میں آجائیں گے اور آج ہی نہ صرف باغیوں کو گرفتار کریں گے بلکہ ڈمپ ہوا اسلحہ بھی نکال لیں گے۔ ہمارے ذمے جو کام تھا اسے ہم نے پورا کردیا ہے۔ باغیوں کے متعلق مبشر خود فوجیوں کی رہنمائی کرے گا اور سعودی قانون کے مطابق سب کو سزائیں دی جائیں گی۔ اس لیے ہم مبشر کو کوئی جسمانی ایذا نہیں پہنچائیں گے۔ اگر اس میں ضمیر نام کی کوئی شے ہے تو وہ اسے جسمانی موت سے پہلے ہزاروں بار مارے گی۔ ہماری طرف سے یہی اس کی سزا ہے۔'' میرے کہنے پر مبشر کو پانی پلایا گیا۔

بعد دوپہر دو بجے کرنل مزمل اپنے ہمراہ چند فوجی افسروں اور ایک ٹرک پر فوجی جوان کے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں آیا۔ میں نے اسے کل سے آج تک کے واقعات کی تفصیل بتائی اور کہا کہ مبشر نے تین سوڈانیوں اور دو توپ پہنے ہوئے غالباً سعودیوں کے ساتھ کل رات سمندر کے جس حصے سے بارہ رائفلیں نکالی تھیں، مجھے پختہ یقین ہے کہ باغیوں کا سارا اسلحہ وہیں ڈمپ کیا گیا ہے۔ کرنل نبیل نے کہا ''اب یہ ہم پر چھوڑ دو۔ مبشر اور اس کے ساتھی سارے باغیوں کے متعلق اتنی تفصیل سے ہمیں سب کچھ بتائیں گے جیسے انھوں نے اس کے سوا کچھ اور بولنا سیکھا ہی نہیں۔'' کرنل نے چار فوجی جوانوں کو بلا کر مبشر کو ان کے حوالے کرنے سے پہلے اس سے پوچھا ''کیا تم باغیوں کے نام، ایڈریس اور وہ سب کچھ جو تمھیں معلوم ہے، ہمیں خود ہی آرام سے بتا دو گے یا تمھیں سچ بولنے پر آمادہ کرنے کے لیے ہمیں اپنے مخصوص طریقے استعمال کرنے پڑیں گے جن کا آغاز تمھارے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے ناخن جڑ سے نکالنے سے ہوگا'' مبشر نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ بری طرح پھنس چکا ہے اور کوئی راہِ فرار باقی نہیں، کرنل نبیل کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ نبیل نے بھی اسے کہا کہ تم باغی نہیں بلکہ باغیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ تمھارے تعاون کی صورت میں تم سے رعایت برتی جائے گی۔ کرنل نبیل کے ہمراہ دوسرے فوجی چھاؤنی سے کرینیں اور غوطہ خور لے کر سمندر کے اس حصے کی طرف چلے گئے جہاں میرے خیال کے مطابق اسلحہ ڈمپ کیا گیا تھا۔ کرنل نبیل کی خصوصی اجازت سے

میں اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ اس مقام پر پہنچا ورنہ اس پورے علاقے کو فوج نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ غوطہ خوروں نے اسلحے کی چند پیٹیوں کے بعد جب پہلی طیارہ شکن توپ نکالی تو اپنے اس مشن کی کامیابی پر ہم ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے واپس گیسٹ ہاؤس آگئے۔

☆☆

نبیل ۶ روز ینبع میں رہا اور اس دوران مجھ سے اس کی روزانہ ہی ملاقات ہوتی رہی۔ نبیل نے بتایا کہ مبشر نے حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے فوج کا بھرپور ساتھ دیا۔ سوڈانی باغیوں کا دو سو سے بڑا گروہ پکڑنے کے علاوہ ۸ فلسطینی اور ساٹھ سے زائد سعودی بھی ابھی تک گرفتار کیے جاچکے ہیں۔ ڈمپ کیا ہوا تمام اسلحہ نکال لیا گیا ہے اور گرفتاریوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ میرے پوچھنے پر کہ مبشر کا کیا حشر ہوگا، نبیل کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ''یہ تو عدالت کا کام ہے۔ تمام باغیوں اور ان کے ہم دردوں کو سعودی قانون کے مطابق سزا دی جائے گی اور ہم عدالتی فیصلوں میں کبھی مخل نہیں ہوتے۔''

ینبع میں ہمارا کام ختم ہوچکا تھا اور ہم واپس جدہ جانا چاہتے تھے لیکن کرنل نبیل جو ہمارے کام سے بہت متاثر ہوا تھا اور میری، کرنل مزمل، عمران اور قیصر اور میرے دوسرے تمام ساتھیوں کی بہت عزت کرتا تھا اور میرے ساتھ تو خاصا بے تکلف بھی ہوچکا تھا، نے مجھے کہا کہ ہم مزید دو تین روز یہاں ٹھہریں۔ یہاں کا کام مکمل کر کے وہ ہمارے ساتھ ہی جدہ جائے گا۔ اس کی باتوں سے مجھے یہ محسوس ہورہا تھا کہ میں جدہ میں جب ہزرائل ہائی نس کمانڈر انچیف سے ملوں تو کرنل نبیل کی اہلیت اور اچھی کارکردگی کے متعلق بھی چند تعریفی کلمات اسے کہوں۔ ذاتی طور پر تو ان ماتحت افسران کی کمانڈر انچیف کے سامنے پیش ہوتے وقت ایسی حالت ہوتی تھی کہ ان کی ٹانگیں کانپتی تھیں۔ اگرچہ کرنل نبیل نے کھلے الفاظ میں اپنی اس خواہش کا مجھ سے اظہار نہیں کیا تھا لیکن میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگا کر خود ہی اسے کہا کہ میں اس کی پھرتی اور اہلیت سے بہت متاثر ہوا ہوں اور ہزرائل ہائی نس سے اگر ملاقات ہوئی تو اس کی کارکردگی اور قابلیت کے متعلق ضرور تعریفی کلمات کہوں گا۔ یہ سن کر تو کرنل نبیل کی باچھیں کھل گئیں اور وہ بولا ''میں یہاں پر دو تین روز میں باغیوں کی گرفتاری مکمل کرلوں گا۔ اس دوران شاید آپ کی مدد کی بھی ضرورت پڑے۔ اسی لیے میں نے ڈپٹی کمانڈر انچیف کو وائرلیس پر آپ کی کامیابی کی اطلاع دے دی ہے اور ان سے آپ کے یہاں چند روز مزید ٹھہرنے کی اجازت بھی لے لی ہے'

میرے پوچھنے پر اس نے مبشر کے متعلق بتایا کہ اسے فی الحال کسی قسم کا ٹارچر نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ وہ پوری طرح سے ہمارے ساتھ تعاون کررہا ہے۔ ابھی تو ہم اس کی دی ہوئی معلومات پر باغیوں کو گرفتار کررہے ہیں۔ یہاں کی کوسٹ گارڈ کے دو افسر اور کئی جوان بھی حکومت کے خلاف اس سازش میں شریک تھے اور انھی کے ذریعے اسلحے کو ینبع میں ڈمپ کیا گیا تھا۔ اگرچہ انتہائی خفیہ اور Unclassified Formation ہے لیکن جس طرح آپ نے حکومت کے خلاف سازش کو Upraute (بے نقاب) کیا

ہے اس لیے آپ کو بتا رہا ہوں۔ سوڈانی چھاپا ماروں اور باغیوں کو یہ اسلحہ اور بہت بڑی مقدار میں ڈالر ایک امریکی آئل ٹینکر نے ہماری سمندری حدود کے باہر کھلے سمندر میں دیا تھا ورنہ سوڈانی اتنی بڑی کارروائی کی اپنے طور پر جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری باغی رجمنٹ کو بھی انھی کی سپورٹ حاصل تھی۔ بہرحال یہ معاملہ بہت اونچے لیول کا ہے ہماری حکومت نے باغی رجمنٹ سے نبٹنے کے بعد مصلحت کے پیش نظر امریکا سے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا'' کرنل نبیل نے انتہائی بھروسا کرتے ہوئے مجھے جو راز کی بات بتائی، اس کی Out Lines میں پہلے ہی جانتا تھا۔ تیل سے مالا مال مڈل ایسٹ کے ان مسلم ممالک پر امریکا اپنا اثر و رسوخ بڑھاتے چلا جارہا تھا اور ان ممالک میں سے کسی کی بھی جرأت نہ تھی کہ اپنے ملکی معاملات اور غیر ممالک سے اپنے تعلقات قائم کرنے میں اپنی مرضی سے کام لے سکے۔ چند برس پہلے جب میں سعودی عرب گیا تھا تو ینبع بھی اپنے دوستوں سے ملنے گیا (ہزرائل ہائی نس نے میری کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ینبع جیسے حساس علاقے میں مجھے ایئرپورٹ ایڈمنسٹریٹر مقرر کردیا تھا اور میں ینبع کے علاوہ سعودی عرب کے ایک دو اور ایئرپورٹس پر اسی عہدے پر تعینات رہا اور ینبع ایئرپورٹ کی سیکورٹی کی اضافی ذمہ داری بھی مجھے سونپی گئی تھی) تو ینبع کی سی پورٹ (Sea Port) کی تعمیر کرنے والے پاکستانی چیف انجینئر نے مجھے بتایا کہ ہم نے درجنوں بار یہ بات دوربینوں سے دیکھی ہے کہ اسرائیلی آئل ٹینکر ہماری سمندری حدود میں داخل ہونے سے پہلے اسرائیلی جھنڈے اتار کر امریکی جھنڈا لگاتے ہیں اور ہمارے آئل ٹرمینل سے تیل لے کر واپس جاتے ہوئے پھر اسرائیلی جھنڈے ان آئل ٹینکرز پر لہرانے لگتے ہیں۔ اس نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ اسرائیل میں تو تیل نہیں نکلتا پھر وہ اپنی ضروریات کس ملک کے تیل سے پوری کرتے ہیں۔ میرے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ہم مزید پانچ روز ینبع میں رہے اور اس بندرگاہ کے شہر سے تقریباً پچاس کلو میٹر دور ینبع النخل بھی گئے یہ ایک چھوٹا سا دیہات تھا جس میں کھجور کے سیکڑوں درخت لگے ہوئے تھے۔ اسی لیے اس نخلستان کو ینبع النخل کہا جاتا ہے۔ تیل کی دولت ملنے سے پہلے اس نخلستانی گاؤں کو علاقے کی مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہاں کے کنوؤں اور چشموں سے ینبع کے بندرگاہی شہر کو میٹھے پانی کی سپلائی ایک چھوٹی سی نہر کے ذریعے کی جاتی تھی زمانہ قدیم میں اس بستی کی اتنی اہمیت تھی کہ یہاں پتھروں کا بنا ہوا ایک قلعہ بھی تھا جسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فتح کیا تھا۔ اس قلعے کی دیواریں اور اندر کی تعمیرات کے آثار اب بھی موجود تھے۔

ینبع میں قیام کے دوران کرنل نبیل ایک روز ہمارے گیسٹ ہاؤس میں آیا اور کرنل مزمل، عمران، JCO منصف اور اکرم اور دین محمد کے ساتھ مجھے بھی چھاؤنی میں لے گیا۔ اس نے کہا کہ مبشر نے باغی تو سب پکڑوا دیے ہیں لیکن اپنے حال اور ماضی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ ہم نے جب اسے زبان کھلوانے کے لیے ٹارچر کی دھمکی دی تو اس نے کہا کہ وہ اپنے متعلق سب کچھ بتا دے گا اگر آپ

سب کو بلوالیا جائے۔ چھاؤنی کے چھوٹے اسٹاف کے کمرے میں مبشر کو رکھا گیا تھا۔ کمرے میں ایک پنکھا اور بیڈ بھی تھا۔ سوائے اس کی داڑھی بڑھی ہونے کے اس کے چہرے اور جسم پر تشدد کے کوئی آثار نہ تھے اور نہ ہی مبشر نے تفتیشی افسروں کی کوئی شکایت کی۔ ایک انڈین بنگالی ہندو کو تفتیشی افسروں نے مبشر کے مترجم کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ جب ہم اس کے کمرے میں پہنچے تو مبشر نے نظریں نیچی کیے ہوئے ہمیں سلام کیا۔ ہم سب سویلین لباس میں تھے۔ بنگالی ہندو نے جو مبشر سے باغیوں کے متعلق جان کاری حاصل کر کے خود کو بڑا پھنے خان سمجھ رہا تھا، کرنل نبیل کو کہا ''میں اس سے سب کچھ اگلوانے والا ہی تھا کہ آپ لوگ آگئے'' میں نے اس کا نام پوچھا تو بڑی بے رخی سے جواب دیتے ہوئے وہ بولا ''میں ٹیگور فیملی سے ہوں اور میرا نام بسواس ٹیگور ہے'' اس بنگالی ہندو کو دیکھتے ساتھ ہی مجھے اس سے اور اس کی طرز گفتگو سے گھن آنے لگی۔ کرنل نبیل کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کہا ''مسٹر بسواس، تمھارا کام ختم ہوا۔ اب پلٹ کر بھی یہاں نہ آنا And now get out (باہر چلے جاؤ)'' بسواس کو میرا اس طرح اسے فوراً چلے جانے کا کہنا عجیب محسوس ہوا اور وہ کرنل نبیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا ''سر کیا میں واقعی چلا جاؤں'' کرنل نبیل نے یہ جانتے ہوئے کہ اسلحے کی برآمدگی، باغیوں کی گرفتاری وغیرہ سب ہماری وجہ سے ہوئی ہے اور مزید برآں اس مشن پر ہزرائل ہائی نس نے خصوصی طور پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھیجا ہے، بسواس کو کہا ''تم نے سنا نہیں کہ تمھیں کیا حکم دیا گیا ہے'' بسواس جانے لگا تو مبشر نے بڑے التجائی لہجے میں کہا ''اسے ابھی نہ بھیجیے مجھے باغیوں سے ملوانے والا یہی ہے اور اب میں جو کچھ بھی اسے بتاتا ہوں یہ اپنی مرضی اور دلچسپی کے مطابق میری باتوں کو توڑ موڑ کر تفتیشی افسران کو بتاتا ہے اور اس نے کئی بے گناہوں کو پکڑوا دیا ہے جب کہ اصل باغی ابھی تک بچے ہوئے ہیں'' بدقسمتی سے مبشر کی انگریزی بے حد کم زور تھی اور عربی زبان پر بھی اسے عبور نہ تھا۔ یہ بات سن کر میں نے بسواس کو جو کمرے سے باہر نکل رہا تھا واپس بلوایا اور کرنل نبیل کو یہ بتا کر مبشر کے کہنے کے مطابق بسواس بھی نہ صرف باغیوں سے ملا ہوا ہے بلکہ اس نے بے گناہوں کو پکڑوا دیا ہے اور سرکردہ باغی ابھی تک بچے ہوئے ہیں اس سے بسواس کی تفتیش کی اجازت لی اور بسواس کو اسٹول پر بیٹھنے کو کہا جہاں پہلے مبشر بیٹھا ہوا تھا۔ کرنل نبیل نے دروازے پر کھڑے پہرے داروں کو ہمارے لیے کرسیاں اور قہوہ لانے کا کہا۔ کرسیاں آگئیں تو نبیل ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ میں نے بسواس سے تفتیش کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا ''اپنا نام اور اپنے آبائی علاقے کا نام بتاؤ'' بسواس نے جواب دیا ''اپنا نام تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں اور میرے آبائی'' وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ میرے اشارے پر JCO منصف نے ایک زناٹے دار تھپڑ اسے رسید کیا اور بنگالی میں بولا ''تم کو سر سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ یہ تمیز میں تمھیں سکھاؤں گا'' منصف کے تھپڑ سے بسواس مع اسٹول لڑکھڑاتا ہوا فرش پر جا پڑا تھا اور حیرانی سے ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ JCO نے اسے مرغا بننے کو کہا اور خود اس کی پیٹھ پر سوار ہوگیا اور

سپاہیوں کو کہا کہ اپنے جوتوں سے اس کی ٹھکائی کریں۔ مرغا بنا ہوا بسواس JCO کے وزن سے بیٹھا جاتا تھا اور سپاہیوں کے جوتے اسے جسم کا پچھلا حصہ اونچا رکھنے پر مجبور کر رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ۵ منٹ اسی کیفیت میں رہنے کے بعد بسواس کی قوت برداشت ختم ہوگئی اور وہ چاروں شانے چت فرش پر اوندھے منہ پڑا ڈکرانے لگا۔ JCO منصف نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو میں نے اسے کہا ''Continue (جاری رکھو)'' اب JCO نے دونوں سپاہیوں اور رضی کی مدد سے مبشر کے بیڈ کے پائے اس کے دونوں ہاتھوں پر رکھے اور بیڈ کی اسی جانب چاروں بیٹھ گئے۔ فوجی بیڈ اکثر لوہے کے اور ان کے پائے لوہے کی ٹرائی اینگل کے بنے ہوتے ہیں ان چاروں کے وزن سے پائے بسواس کی ہتھیلیوں میں گھسنے لگے اور درد کی شدت ناقابل برداشت ہونے کی وجہ سے بسواس چیختے چلاتے کہنے لگا۔ بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دیں۔ میں سب کچھ سچ بتادوں گا۔ ابھی بسواس کا Bearing Point (قوتِ مدافعت کے خاتمے کا لمحہ) نہیں آیا تھا چناں چہ میں نے اس کے شور وغل کی پرواہ کیے بغیر ساتھیوں کو اپنا کام جاری رکھنے کا کہا۔

☆☆

اور ویسا ہی ہوا جیسا کہ میں چاہتا تھا کہ بسواس کو ہمارے دیے گئے تشدد سے سنبھلنے اور کوئی کہانی گھڑنے کا موقع نہ مل سکے۔ آئندہ ۵ منٹ کے اندر جب لوہے کے ٹرائی اینگل پائے اس کی ہتھیلیوں کو پھاڑتے ہوئے جلد کے اندر گھس گئے تو بسواس کی قوتِ مدافعت جواب دے گئی۔ اسی حالت میں پڑے ہوئے وہ بولنا شروع ہوا۔ ''شاب۔ ہم نے مبشر کو سوڈانی باغیوں سے ملایا تھا۔ ملانے سے پہلے ہم نے اس کے گھر اور گھر کے تمام لوگوں کے نام اور پتے لکھ لیے اور سوڈانی باغیوں سے ملانے کے بعد ہم نے اس کو بولا تھا کہ اگر اب اس نے Back Out (قدم واپس اٹھائے) کیا تو ہم نہ صرف اس کو بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی مروا ڈالے گا۔ میرا اس چھاؤنی کے ایک سارجنٹ سے ملنا جلنا ہے جو خود بھی باغیوں کا ساتھی ہے، جب مبشر پکڑا گیا تو مترجم کے طور پر سارجنٹ نے مجھے بلوالیا، مبشر نے جن باغیوں کے نام مجھے بتائے۔ میں نے ان کے نام اور پتے لکھوائے اور تفتیشی افسران کو ان کے صحیح نام اور پتے بتانے کے بجائے ان لوگوں کے نام لکھوائے جن کا باغیوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا ہم سے بڑا بھول ہوگیا شاب، ہم کو معاف کردو۔'' لوہے کے پائے اپنا کام دکھا رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کلکتے کے قریب جمشید پور کا رہنے والا ہے لیکن سعودی عرب میں بنگلہ دیش کے پاسپورٹ پر آیا ہے اور یہاں کی ایک چھوٹے سائز کی کنسٹرکشن کمپنی میں کام کر رہا ہے۔ بھارتی ہندوؤں اور خاص طور پر انڈین بنگال کے ہندوؤں کے لیے بنگلہ دیشی پاسپورٹ بنوانا چنداں مشکل نہ تھا۔ میرے ذہن میں ایک اور سوال تھا لیکن اس کا درست جواب لینے کے لیے مجھے بسواس پر تشدد میں کچھ اضافہ کرنا پڑا۔ میں نے JCO کو کہا کہ اب اسے الٹا لٹادو اور بیڈ کے پائے اس کی ہتھیلیوں کی پشت پر رکھ

کر دباؤ ڈالا جائے۔ بسواس سے پوچھا ''کیا تم انڈین آرمی اور پھر مکتی باہنی کے بھیس میں مشرقی پاکستان میں آئے تھے'' ''جی شاب ہم نمبر۴ بنگلا رجمنٹ میں سپاہی تھا اور ہم کو سول لباس میں مشرقی پاکستان میں بھیجا گیا تھا۔'' ''مکتی باہنی اور بھارتی ہندوؤں کی کتنی تعداد یہاں پر موجود ہے جو بنگلہ دیش کے پاسپورٹ پر آئے ہیں ان کے نام اور پتے بتاؤ۔'' عمران نے وہی کاغذ اور قلم سنبھال لیے جن پر بسواس مبشر کا بیان لکھتا تھا، کراہتے ہوئے بسواس نے ۹ ایسے لوگوں کے نام اور پتے لکھوائے۔ میرا آخری سوال تھا کہ تمھارا لیڈر کون ہے، بسواس کو بغیر بتائے اپنی جان چھوٹتی نظر نہیں آتی تھی ''شاب اس کا نام مراری لال ہے اور وہ یہاں کی ایک ٹریول ایجنسی میں اسسٹنٹ منیجر ہے۔'' عمران نے اس کا نام اور پتا بھی لکھ دیا۔ میرے سوال ختم ہوچکے تھے، میں نے مزمل، عمران اور JCO سے کہا کہ وہ اگر کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہوں تو پوچھ لیں، تینوں نے نفی میں سر ہلا دیئے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ اسے زمین پر بٹھا دیں لیکن پہلے تلاشی لیں۔ ہماری تلاشی سے چند بے فائدہ کاغذات، بٹوا جس میں سو سو ریال کے کئی نوٹ تھے اور اقامہ (سکونی اجازت نامہ) اور شناختی کارڈ کے سوا کچھ برآمد نہ ہوا۔ میرے سارے ساتھی، مبشر اور بسواس وہیں بیٹھے رہے اور عمران کے ہمراہ میں کرنل نبیل کے ساتھ اس کے ہم عہدہ کے دفتر میں چلے گئے۔ عمران نے کرنل نبیل کو نوٹ کی ہوئی تمام انفارمیشن دی۔ نبیل اس انفارمیشن کو پڑھتا گیا اور حیرانگی سے اس کا منہ کھلتا گیا، اس نے مختصراً مجھے بتایا کہ ان اطلاعات میں جن لوگوں کے نام ہیں ہم نے ان میں آدھے سے بھی کم کو ابھی تک گرفتار کیا ہے۔ نبیل نے اپنے ہم عہدہ کرنل سے ہمیں متعارف کروایا، اور وہ اس نئی لسٹ کے مطابق باقی لوگوں کو گرفتار کرنے کی پلاننگ کرنے لگے۔ میں نے ان کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا کام ختم ہوا لہٰذا ہمیں واپس گیسٹ ہاؤس جانے کی اجازت دی جائے اور بسواس کے زخمی ہاتھوں کی مرہم پٹی بھی کروا دی جائے، مبشر کے متعلق میں نے نبیل کو کہا کہ شروع میں غلطی کرنے کے بعد اسے اس قدر بلیک میل کیا گیا کہ وہ باغیوں کا ساتھ دینے پر بلیک میلنگ کی وجہ سے مجبور ہوا، لہٰذا اس کے ساتھ خصوصی طور پر نرم سلوک کیا جائے۔

کرنل نبیل سے رخصت ہو کر میں اپنے سارے ساتھیوں کے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں واپس آ گیا۔ میں بسواس کے بتائے ہوئے ان کے گروپ لیڈر میں زیادہ Interested تھا۔ اس کے بقول مراری لال ایک مقامی ٹریول ایجنسی میں ملازم تھا، سعودی عرب میں تقریباً تمام ٹریول ایجنسیاں بعد دوپہر سے رات گئے تک کام کرتی ہیں۔ میں مزمل، عمران اور قیصر، اس شام اس ٹریول ایجنسی پر جا پہنچے، مراری لال دفتر میں ہی موجود تھا ہم چاروں Clients (گاہک) بن کر مراری لال سے ملے اور اس سے لندن کے ریٹرن ٹکٹ کی بات کی، اس نے کلکولیٹر پر حساب کر کے ہمیں فی ریٹرن ٹکٹ جو رقم بتائی میں نے یہ کہہ کر اسے رد کردیا کہ یہ رقم بہت زیادہ ہے ہمیں تو بسواس نے کہا تھا کہ میرا نام لو گے تو مراری لال ہم سے اور ایجنسیوں کے مقابلے میں بہت کم قیمت پر ٹکٹ دے گا، مراری لال بڑا ہوشیار

اور پرانا گھاگ تھا۔ بسواس کا نام سنتے ہی وہ چونک پڑا اور پوچھنے لگا کہ ہم بسواس کو کیسے جانتے ہیں میں نے سرگوشی میں جواب دیتے ہوئے کہا ”مسٹر مراری لال، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور باغیوں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہورہی ہیں، بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔“ مراری لال نے بے یقینی اور یقین کی کیفیت میں سوال کیا۔ آپ لوگ کن کمپنیوں میں کام کرتے ہیں۔ میں نے بھی دھیمے لہجے میں جواب دیا ”مسٹر مراری لال آپ نے تو ہماری ایسے انکوائری شروع کردی جیسے ہم ملازمت ڈھونڈنے آپ کے پاس آئے ہیں۔ اگر بسواس کا نام لینے سے آپ کی تسلی نہیں ہوئی تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ بسواس نے چھاؤنی جانے سے پہلے ہمیں بتایا تھا کہ رات کو ساڑھے آٹھ بجے وہ ہم سے زمیندار ہوٹل کے ساتھ پان کی دکان پر ملے گا آپ اس سے وہیں ہمارے متعلق پوچھ لیجیے گا۔“ یہ کہہ کر میں اٹھنے لگا کہ مراری بولا ”آپ تو ناراض ہوگئے۔ آپ ٹھنڈا وغیرہ لیجیے۔ سوا آٹھ بجنے میں وقت ہی کتنا باقی رہا ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہی بسواس سے ملنے جاؤں گا۔ آج میں نے کئی بار اس سے ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔“ ہم پھر وہیں بیٹھ گئے اور ٹھنڈا وغیرہ پی کر جب اٹھے تو مراری لال بھی ہمارے ساتھ ہی دفتر سے باہر آیا اور اپنی گاڑی میں ہمارے پیچھے زمیندار ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔ مراری لال سے کچھ اگلوانے کے لیے کم از کم میرے دو ساتھیوں کا اس کی گاڑی میں بیٹھنا ضروری تھا تاکہ اسے اغوا کیا جاسکے۔ زمیندار ہوٹل اور پان کی دکان پر اس وقت برصغیر کے لوگوں کا اچھا خاصا رش ہوتا تھا۔ زمیندار ہوٹل بالکل قریب آ پہنچا تھا اور ہمیں کوئی ایسی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی جس سے مراری کی گاڑی میں بیٹھا جائے۔ زمیندار ہوٹل جس لین (گلی) میں واقع تھا اس کی مین سڑک پر تقریباً پچاس میٹر پہلے میں نے اپنی گاڑی روکی۔ مراری کی گاڑی بھی ہماری گاڑی کے پیچھے رک گئی۔ میں نے مراری کی گاڑی جس کے دروازے اندر سے لاک تھے اور اے سی چل رہا تھا، کے پاس جا کر ڈرائیونگ سیٹ کے دوسری جانب کے دروازے کی کھڑکی پر Knock کیا مراری نے شیشہ نیچے کیا تو میں نے کہا ”اس پکڑ دھکڑ کی وجہ سے یہاں کی انٹیلی جنس والے ہر جگہ پھرتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک ساتھی کو بسواس کو لانے کے لیے بھیجا ہے۔ تب تک میں تمھارے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ مراری نے خاموشی سے اس دروازے کا لاک کھول دیا اور میں اس کے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ قریب دس منٹ کے بعد ہماری پلاننگ کے مطابق عمران اور قیصر تیز تیز قدموں سے مراری کی گاڑی کی طرف آئے۔ عمران نے ہانپنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے میری طرف کا شیشہ کھٹکھٹایا میں نے شیشہ نیچے کیا تو عمران نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ وہاں تو اقاموں کی چیکنگ ہورہی ہے۔ بسواس تو ہمیں یہ کہہ کر اندرونی گلیوں میں غائب ہوگیا کہ وہ ایک گھنٹے کے بعد ہماری رہائش گاہ پر ہمیں ملے گا“ اتنی دیر میں کرنل مزمل نے تیزی سے اپنی گاڑی گیسٹ ہاؤس کی طرف بڑھائی میں نے ہاتھ پیچھے کر کے اپنی طرف کے دروازے کے لاک کو کھولا اور اس سے پہلے کہ مراری

کچھ سمجھ سکے، قیصر اور عمران پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ”مراری صاحب جلدی چلیے کہیں اقاموں کی چیکنگ کرنے والے ہم تک ہی نہ پہنچ جائیں۔“ مراری نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا ”آپ کہاں رہتے ہیں۔“ امارے کے قریب ہی ایک بلڈنگ کے فلیٹ میں ہماری رہائش ہے اور ہمارا انتہائی حساس ٹرانسمیٹر اور دوسرے آلات امارے میں ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ ریکارڈ کرسکتا ہے۔“ میرا جواب سن کر مراری خاموشی سے گاڑی امارے والی سڑک پر لے گیا لیکن شہری آبادی اور لوگوں کی آمدورفت کے ختم ہوتے ہی اس نے گاڑی روک لی اور کہنے لگا ”مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسی جاسوسی کرنے والوں کو میں نے آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے حالاں کہ ینبع میں جاسوسی کا کام کرنے والے تینوں نیٹ ورکس کے کارکنوں کو میں بخوبی جانتا ہوں۔“ عمران نے پیچھے بیٹھے ہوئے جواب دیا ”آپ کو ابھی یقین بھی دلاتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ریوالور کی نال اس کی گردن سے لگادی۔ قیصر اور میں نے بھی اپنے ریوالور نکال لیے تھے۔ قیصر نے گاڑی سے باہر آکر مراری کو کہا ”تم اب پیچھے آجاؤ۔“ مراری نے پیچھے آنے میں تذبذب کیا تو قیصر نے اس کی گاڑی کی چابی نکال لی اور عمران نے اس کی گردن پر ریوالور کی نال کا دباؤ بڑھا دیا۔ مراری نے دیکھا کہ وہ تین ریوالوروں کی زد میں ہے تو پیچھے آنے کے لیے دروازہ کھولنے لگا۔ میں نے کہا ”مراری باہر سے نہیں بلکہ گاڑی کے اندر ہی سے پچھلی سیٹ پر جاؤ۔“ مراری خاموشی سے میرے حکم یا ہمارے ریوالوروں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گاڑی کے اندر سے ہی پچھلی سیٹ پر آگیا قیصر اس کے ساتھ بیٹھ گیا یعنی مراری قیصر اور عمران کے درمیان سینڈوچ بن گیا۔ میں نے قیصر سے گاڑی کی چابی لی اور گاڑی گیسٹ ہاؤس کی طرف لے جا کر اندرونی گیٹ پر کھڑی کردی۔ مزمل ہمارے پیچھے ہی آرہا تھا میں نے مراری کو کہا ”اب تک تم سمجھ گئے ہوگے کہ ہم کون ہیں۔ اگر تم خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو گے اور ہمارے سوالوں کا جواب دو گے تو ہم تمھارے ساتھ عزت سے پیش آئیں گے ورنہ...“ قیصر نے اپنے ریوالور کی نال لہراتے ہوئے میرا فقرہ مکمل کیا ”ورنہ ان ریوالوروں کی گولیاں ہم تمھارے ہاتھوں اور پاؤں پر مار کر تمھیں ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا دیں گے بلکہ پہلی گولی لگتے ہی تم درد کی شدت سے خود بخود بولنے لگ جاؤ گے۔“

مراری بچنے کا کوئی راستہ نہ دیکھتے ہوئے خاموشی سے گاڑی سے نکلا۔ گیسٹ ہاؤس کے بیشتر کمرے تو ہمارے پاس تھے لہٰذا پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہمیں کوئی بھی نہ ملا ہم اسے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ قیصر نے رضی اور تینوں فوجی ساتھیوں کو بھی بلا لیا مراری کو فوجیوں نے کرسی کے ساتھ باندھ کر اس کے منہ کو بھی کپڑے سے بند کردیا اتنی دیر میں ماہا، سپنا اور رضی بھی نئے شکار کے پھنسنے کی خبر سن کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ بسواس کے مطابق اس کے نیٹ ورکس کا لیڈر مراری تھا اور مراری نے کہا تھا کہ ینبع میں کام کرنے والے تینوں نیٹ ورکس کے کارندوں کو وہ جانتا ہے۔ میں نے عمران، مزمل اور ماہا کی مدد سے ایک سوال نامہ تیار کیا اور مراری کے پاس آگئے اور سوالوں کا سلسلہ

شروع کرنے لگے۔ اکرم اور دین محمد نے مراری کے منہ سے کپڑا ہٹایا اور اسے ٹھنڈا پانی پلایا۔ ماہا نے کہا کہ اس سوال نامے سے پہلے میں ایک سوال اس شخص سے پوچھنا چاہتی ہوں۔

☆☆

ماہا نے جس طرح ہمارا سوال نامہ تیار ہونے کے بعد مراری سے ہماری تفتیش سے پہلے خود سوال کرنے کا کہا تھا، اس سے مجھے اچنبھا تو ضرور ہوا لیکن میں نے اسے اجازت دے دی۔ تفتیشی کمرے میں جو گیسٹ ہاؤس میں ہمارا ڈرائنگ روم تھا، میں اور میرے تمام ساتھی بیٹھے ہوئے تھے، ماہا نے مراری سے پوچھا ''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تمھارا صحیح نام مراری نہیں بلکہ بھگوان داس ہے۔ میرا کوڈ نمبر M540 ہے۔ اگر تم اپنا کوڈ نمبر اور اصلی نام بتا دو تو بڑی خوش گوار حیرت ہوگی۔'' مراری جو لمحہ بہ لمحہ بدلتے حالات سے بہت پریشان اور Confused دکھائی دے رہا تھا ماہا کی اس بات پر چونک پڑا اور بولا ''اگر مجھے میری ڈائری جو میری پینٹ کی جیب میں ہے، دیکھنے کی اجازت دی جائے تو میں آپ کے کوڈ کو چیک کر کے ہی کچھ بتا سکوں گا۔'' ماہا نے مراری کے منہ سے کپڑا پہلے ہی ہٹوا دیا تھا۔ اس نے اب JCO کو اشارہ کیا تو اس نے مراری کی پینٹ کی جیب سے ڈائری نکال لی۔ مراری کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ماہا نے ہی اس کے ہاتھ بھی کھلوا دیے اور مراری ڈائری کے چند مختلف صفحات الٹتے ہوئے ایک صفحے پر انگلی رکھتے ہوئے بڑبڑایا ''M540 تو آپ جینی ہیں۔ آپ تو مجھ سے بہت سینئر ہیں۔ میرا کوڈ ۱۰۶۲ ہے اور میرا نام بھگوان ہے۔ ماہا نے ہم میں سے کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر کہا ''ان کے پاؤں فوراً کھول دیے جائیں۔'' قارئین! یہ تمام گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ ہاتھ کھلتے ساتھ ہی ماہا نے مراری سے ہاتھ ملایا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہاتھ ملاتے وقت دونوں نے ایک دوسرے کی ہتھیلیوں پر انگلیوں سے مخصوص لکیریں کھینچیں۔ مراری کا سارا خوف ختم ہو چکا تھا۔ ہماری طرف دیکھتے ہوئے اس نے ماہا سے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''یہ سب ہماری ایجنسی کے آدمی ہیں اور میں ان کی لیڈر ہوں۔ بسواس پر فوجی افسروں (گالی نکالتے ہوئے) کو شک پڑ گیا تھا۔ میں اپنے نیٹ کے ہمراہ چند روز پہلے ہی یہاں پہنچی ہوں اور میں نے کرنل نبیل کو اس طرح گھیرا ہے کہ وہ میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ بسواس کے متعلق جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بولنے ہی والا ہے تو میں نے اسے ختم کروا دیا۔ کرنل نبیل کی وجہ سے ہم اس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور میرے پلان کے مطابق میرے ساتھی تمھیں میرے پاس یہاں لائے ہیں۔ اس طرح تمھیں جو پریشانی ہوئی اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ تم سے فوری طور پر رابطہ کرنے کا اور کوئی ذریعہ بھی نہ تھا۔ یہاں میں حجاب اوڑھتی ہوں اس لیے تمھاری ٹریول ایجنسی میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں بسواس نے ہمارے تینوں نیٹس کے متعلق کچھ بتا نہ دیا ہو، میں نے تم سے رابطہ ضروری سمجھا۔ بحیثیت سینئر کے میں تمھیں حکم دیتی ہوں کہ مجھے تینوں نیٹس کے متعلق پوری معلومات ان کے لیڈروں اور ان کے رابطے کے

ذریعے بتاؤ۔ ہم یہاں ایک انتہائی ضروری اور اہم مشن پر آئے ہیں اور اس مشن کو پورا کرنے میں مجھے تینوں گروپوں کی معاونت درکار ہوگی جس کے لیے چیف نے مجھے خصوصی لیٹر دیا ہے۔''

میں اور میرے تمام ساتھی خاموشی سے ماہا کے مراری سے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو سن رہے تھے۔ ہم نے جو ایک دوسرے کے قریب قریب کھڑے تھے، ایک دوسرے کے ہاتھ دبا کر ماہا کے پلان کی تائید کی اور جب ماہا نے کہا کہ کاغذات اور قلم لایا جائے تو مزمل نے ''یس میڈم'' کہا اور اپنے کمرے سے کاغذ اور قلم لے آیا۔ اس دوران ہم نے ماہا کے لیے ایک کرسی مراری کے قریب ہی رکھ دی۔ ماہا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم لوگوں نے بھگوان کو یہاں لانے کے دوران کوئی سختی کی ہے تو اس کے لیے معافی مانگو اور تمھارے سوا باقی سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاؤ۔'' میں نے بھرپور ایکٹنگ کرتے ہوئے مراری (بھگوان) سے اپنے اور باقی ساتھیوں کے رویے کی معافی مانگی جسے مراری نے بڑی رعونت سے بلاتے ہوئے "I Pardon You But Be Careful Next Time" (میں معاف کرتا ہوں لیکن آئندہ احتیاط رکھنا) کہا اور میرے سب ساتھی ڈرائنگ روم سے چلے گئے۔ چند منٹوں میں ہی تین کولڈ ڈرنکس لے کر JCO منصف کمرے میں آیا اور ہمیں کولڈ ڈرنکس دیتے ہوئے پوچھا کہ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بھجوا دی جائے۔ ماہا نے مجھے کہا۔ ''اسے کہو کہ جب تک کسی کو بلایا نہ جائے کوئی بھی اس کمرے میں نہ آئے اور سب ساتھی روانگی کے لیے تیار رہیں۔ ہمیں اپنے گروپس کو بچانے کے لیے آج ہی کارروائی کرنی ہے۔'' میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی JCO نے یس میڈم کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ ماہا نے مجھے افسرانہ دبدبے کے انداز میں کہا۔ ''تم ہم سے کچھ ہٹ کر بیٹھ جاؤ اور ہماری گفتگو کے دوران کوئی مداخلت نہ کرنا'' میں نے بھی یس میڈم کہا اور ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ ماہا دراصل ہم سب پر رعب جتا کر مراری پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ نہ صرف موساد کی بہت سینئر ایجنٹ ہے بلکہ تھائی، بنگلہ دیش اور بھارت کے جونیئر ایجنٹوں (مجھے بھی ماہا نے بھارتی ہی کہا) کے ساتھ کسی بہت بڑے مشن کی سربراہ ہے۔ میرے متعلق اس نے مراری کو بتایا ''یہ بمبئی کا پٹھان ہے اور اس کی بیوی یہودی ہے یہ کافی عرصے سے موساد کے لیے نہایت کارآمد خدمات سرانجام دے رہا ہے اور اسی وجہ سے اس مشن کے لیے اسے میرا نمبر ٹو مقرر کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے تینوں گروپوں کو بروقت اطلاع دے کر بچانا ہے کیوں کہ ابھی تک اس بات کی تصدیق نہیں ہوسکی ہے کہ بسواس نے مرنے سے پہلے کہیں ان گروپوں کی نشان دہی تو نہیں کر دی تھی'' ماہا نے اس خوبی سے مراری کو متاثر اور مرعوب کیا تھا کہ اس نے ان تینوں گروپس کے لیڈروں کے نام، رابطے کے ذریعے اور سارے کارکنوں کے نام اور پتے ان کاغذات پر تحریر کر دیے۔ اس دوران میں بالکل خاموشی سے بیٹھا رہا۔ ماہا یہ کاغذات لے کر مجھے دیتے ہوئے بولی۔ "You Fool Try TO Learn From Me" (بے وقوف مجھ سے سیکھنے کی کوشش کرو) کاغذات لے کر میں سر جھکا کر

خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ماہا نے مراری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''چوں کہ ہم ینبع سے اچھی طرح سے واقف نہیں ہیں اس لیے ان تینوں گروپ کے لیڈروں سے رابطہ اور ان کے ٹھکانوں تک پہنچنے میں تم ہماری راہبری کرو گے اور یہ میرا بحیثیت سینئر کے حکم ہے۔'' ''جیسا آپ کہیں'' مراری نے جواب میں کہا اور ماہا نے مجھے حکم دیتے ہوئے کہا ''خان۔ تمام ساتھیوں کو کہہ دو کہ پانچ منٹ کے اندر مکمل تیاری کے ساتھ گاڑیوں میں بیٹھ جائیں۔ مسٹر بھگوان کی گاڑی میں تم اور میں جائیں گے۔'' میرے ساتھی تو پہلے ہی سے پوری طرح مسلح اور تیار تھے۔ میں نے ساتھ کے کمرے میں جا کر عمران، مزمل اور قیصر کو ماہا کا یہ حکم سنایا اور ٹھیک سات منٹ بعد جب ماہا اور میں مراری کے ساتھ اس کی گاڑی تک پہنچے تو تمام ساتھی چاروں گاڑیوں میں پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ مراری نے گاڑی ٹیلی گراف آفس کی سڑک پر موڑی تو میں نے اَن جان بنتے ہوئے پوچھا ''مسٹر مراری یہ سڑک کس طرف جاتی ہے؟'' اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ماہا نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا ''بے وقوف۔ یہ گروپ لیڈر ہیں۔ انھیں سر کہہ کر مخاطب کرو'' ماہا کے ہمارے ساتھ طرزِ عمل سے اگر مراری کے دل میں کچھ شک تھا تو وہ بھی بالکل ختم ہوگیا۔ میں پچھلی سیٹ پر تھا اور ماہا مراری کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مراری نے کہا۔ ''ہم سب سے پہلے یہاں کے سب سے مضبوط نیٹ کی طرف جارہے ہیں۔ اس نیٹ میں دو اسرائیلی، تین بھارتی اور ایک مصری ہے۔ دونوں اسرائیلی فلسطینی بن کر یہاں خشک فروٹ کی اور دوسرا کراکری کی دکان کا مالک ہے۔ دونوں دکانیں ملحقہ ہیں اور تینوں بھارتی اور مصری ان دکانوں میں کام کرتے ہیں۔ دوسرے نیٹ کے لیے ہم کو انڈسٹریل ایریے میں جانا ہوگا۔ وہاں پر پٹرومین کمپنی کے لیبر کیمپ میں تھائی، فلپائنی، بھارتی اور پاکستانی مزدوروں اور ان کی کیمپ کمانڈنٹس کی خوراک اور لباس وغیرہ دھونے کا ٹھیکا دوسرے نیٹ کے سربراہ کے پاس ہے جو بھارتی ہے اور اس نیٹ کے دوسرے کارکن سربراہ کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کررہے ہیں۔ تیسرا نیٹ صرف چار افراد پر مشتمل ہے لیکن اسے سب سے زیادہ حساس کام سونپا گیا ہے۔ یہ چاروں بھارتی انجینئر ہیں اور ینبع کے Desalination (سمندر کے نمکین پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کرنے کے) پلانٹ پر کام کرتے ہیں۔ اس پلانٹ میں ایسی گیسیں استعمال کی جاتی ہیں جن سے یہ انجینئر پیچھے سے حکم ملنے پر ان گیسوں سے ایسا دھماکا کرسکتے ہیں کہ نہ صرف یہ پلانٹ بھک سے اڑ جائے اور ینبع کو میٹھے پانی کی سپلائی بند ہوجائے بلکہ سارا انڈسٹریل ایریا مع رائل نوو اسپتال اور رہائشی علاقے کو تباہ کردے اور چوتھا نیٹ میرا ہے۔ میرے ساتھ پانچ کارکن ہیں جن میں سے ایک بسواس تھا۔ یہاں کی انڈسٹریل اسٹیٹ چوں کہ سعودی عرب کا سب سے بڑا صنعتی مرکز بن رہا ہے لہٰذا یہاں غیر ملکیوں کی غیر معمولی طور پر آمدورفت رہتی ہے۔ ہمیں جوں ہی اطلاع ملی ہے کہ اس انڈسٹریل ایریا میں کوئی نئی صنعت لگ رہی ہے یا کوئی معقول جگہ خالی ہے تو ہم فوری طور پر اس کام کے اہل کسی بھارتی ہندو کو بھیج کر ملازمت دلوا دیتے ہیں اور ہمارا آدمی جب ایک بار کسی معقول جگہ پر ملازم ہوجاتا ہے تو

پھر وہ وہاں پر صرف بھارتی ہندوؤں کو ہی ملازم رکھتا ہے اور اگر کوئی پاکستانی وہاں پہلے سے ملازم ہو تو اسے وہاں سے نکلوا کر ہی دم لیتا ہے۔

مراری نے ہمیں دونوں یہودیوں کی دکانیں دکھائیں جو بند ہوچکی تھیں۔ دکانوں سے نزدیک ہی وہ دونوں دو ملحقہ اپارٹمنٹس میں رہتے تھے۔ ماہا ان دونوں فلسطینیوں کے بھیس میں چھپے اسرائیلیوں سے ملنے سے اس لیے کترا رہی تھی کہ مبادا انھیں ماہا کے موساد سے علیحدہ ہونے کی اطلاع مل چکی ہو اور یہ حسن اتفاق تھا کہ دونوں اپنے گھروں پر موجود نہ تھے۔ دوسرے نیٹ کے سربراہ کو ملنے پر ہم پٹرومین کے لیبر کیمپ میں گئے۔ معلوم ہوا کہ سربراہ ابھی ابھی شہر گیا ہے۔ تیسرا نیٹ Desalination پلانٹ پر کام کرتا تھا۔ ماہا نے مراری کو کہا کہ ان انجینئروں کے ٹیلی فونوں پر وہ ان سے رابطہ کرے گی۔ دراصل ہم فوری طور پر ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس وقت تو ہمیں صرف ان کے نام اور تعداد کے علاوہ رابطے کے ذریعے چاہیے تھے اب صرف مراری کے نیٹ کے چار کارکنوں کا پتا کرنا تھا۔ مراری بہت ہی چالاک صفت شخص تھا۔ ہمیں سب کچھ بتانے کے باوجود اسے ہم پر پورا یقین نہیں تھا چناں چہ جب ماہا نے اس کے ساتھیوں کے نام پوچھے تو اس نے کہا ''میڈم! میں اپنے گروہ کا لیڈر ہوں۔ آپ نے مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے جو بھی کام لینا ہے وہ مجھے بتائیں۔ میرے ساتھیوں سے آپ کا کیا واسطہ؟''

☆☆

مراری کے یہ کہنے پر کہ میرے نیٹ کے ممبروں کے ناموں سے آپ کا کیا واسطہ، ہمارے متعلق کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں، ماہا نے سخت لہجے میں جواب دیا ''مسٹر مراری! میں نے سینئر ہوتے ہوئے بھی نہ صرف اپنی شناخت کروائی بلکہ اپنے گروپ کے تمام ساتھیوں کو آپ کے سامنے کردیا اور آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ موساد کے لیے کام کررہے ہیں اور اس کا نہایت معقول معاوضہ بھی لے رہے ہیں اور آپ کے بیان کے مطابق آپ بھارتی انٹیلی جنس کے لیے بھی کام کررہے ہیں مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ آپ موساد کی دی ہوئی سہولتوں اور روپے سے موساد کے مفادات سے زیادہ اپنی ملکی ایجنسی کے لیے کام کرتے ہیں۔ آپ کو اچھی طرح سے علم ہے کہ میں کتنے اہم عہدے پر فائز ہوں اور آپ جیسے جونیئر کا مجھ سے اس طرح کا اندازِ تخاطب کسی طور بھی جائز نہیں۔ میں چاہوں تو ایک وائرلیس پیغام پر موساد سے نہ صرف آپ کی ملازمت ختم کرواسکتی ہوں بلکہ سعودی عرب سے بھی آپ کو نکلواسکتی ہوں'' ماہا نے اپنی بات اتنے ٹھوس لہجے میں کہی کہ مراری کا سارا دم خم ختم ہوگیا۔ ''میڈم میں اپنی گستاخی کی آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل آپ کے بسواس کو ختم کروانے سے میں گھبرا گیا تھا'' مراری نے معذرت خواہانہ جواب دیا۔ ''اگر بازو کے زخم کا زہر سارے جسم میں پھیل جانے کا خطرہ ہو تو اس بازو کو علیحدہ کر کے باقی جسم کو زہر سے بچایا جاسکتا ہے۔ بسواس کو ختم کروا کے میں نے

تینوں نیٹ ورکس کے علاوہ تمھارے نیٹ ورک کو بھی گرفتار سے بچا دیا ہے۔ میں نے تمھارے کارکنوں کے نام صرف اس لیے پوچھے تھے کہ کہیں بسواس نے مرنے سے پہلے ان کے نام تفتیشی افسران کو بتا نہ دیے ہوں'' ''آپ بالکل صحیح فرماتی ہیں میڈم۔ مجھے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے نام اور پتے بتانے میں اب کوئی تامل نہیں'' مراری نے موساد میں اپنی ملازمت بچانے کے لیے ہتھیار ڈال دیے ''سب سے پہلے گیسٹ ہاؤس چل کر Desalination پلانٹ پر کام کرنے والے بھارتی انجینئروں سے رابطہ کرو اور انھیں بتاؤ کہ میں آج کل یہاں پر ہوں'' ماہا یہ کہہ کر چپ ہوگئی۔ گیسٹ ہاؤس پہنچ کر میں نے مراری کو کہا کہ اپنی گاڑی پارکنگ میں لگادے۔ ہمارے ساتھیوں نے بھی پارکنگ میں گاڑیاں لگادیں اور ہم سب دوسری منزل کے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ مراری بڑی گہری نظروں سے ہم سب کا جائزہ لے رہا تھا۔ ماہا نے مجھے حکم دیا ''تم مسٹر مراری سے انجینئروں کو فون کرواؤ اور اس کے ساتھیوں کے علاوہ اس کا ایڈریس اور گھریلو ٹیلی فون نمبر بھی لکھو۔ میں وائرلیس پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرنے جارہی ہوں He is Now Your Guest (یہ اب تمھارا مہمان ہے)۔ یہ کہہ کر ماہا ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔ میں نے قیصر کو کہا کہ لیٹر پیڈ پر قلم لے آئے تاکہ شری مراری اپنا اور اپنے ساتھیوں کے نام اور ایڈریس لکھ دیں۔ مراری نے جب سب کچھ لکھ دیا تو کہنے لگا ''مجھے ٹیلی فون دیں تاکہ پلانٹ پر کام کرنے والے بھارتی انجینئروں کو فون پر میڈم جینی کے متعلق بتا سکوں'' ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون نہیں تھا لہٰذا میں نے اسے کہا کہ ریسپشن والے فون کو اس کام کے لیے استعمال کرنا مناسب نہیں ہے اور ایک فون میڈم کے کمرے میں ہے اور جب تک وہ خود اجازت نہ دیں، ہم از خود انھیں نہیں کہہ سکتے لہٰذا اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب تک میڈم وائرلیس پر پیغام بھیج کر واپس نہیں آجاتیں'' یہ کہہ کر میں مراری کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا اور میرے سارے ساتھی بھی جہاں جگہ ملی، وہیں بیٹھ گئے۔ میں نے مراری سے پوچھا کہ میڈم کو تو اس نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میرے دو تین سوال ابھی تشنہ جواب ہیں اس لیے اگر وہ ان کے جواب دے تو بڑی کرپا ہوگی۔ ''کون سے سوال''؟ مراری نے پوچھا ''میرا پہلا سوال ہے کہ آپ کا گروپ اور دوسرے تینوں گروپ پاکستان کے خلاف اب تک کن مشنوں میں کامیابی حاصل کرچکے ہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ کے جدہ کے ایک گروپ لیڈر جگدیش (ترپاٹھی) کی ہلاکت کے بعد کیا اس گروپ کو دوبارہ Re-Organise (دوبارہ منظم) کردیا گیا ہے اور اگر ایسا ہے تو اب گروپ لیڈر کون ہے'' مراری بڑے غور سے میرے سوالات سن رہا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا ''تمھارا یہ سوال کرنے کا مطلب کیا ہے۔ جب میڈم جینی نے مجھ سے یہ سوال نہیں پوچھے تو تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ میں گروپ لیڈر ہوں اور تمھارے سوالات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں'' میرے ضبط کی بھی انتہا ہوچکی تھی اور میرے ساتھی بے چینی سے کرسیوں پر پہلو بدل رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر ضبط کر کے مراری کو کہا ''میڈم تو شاید آج رات آپ سے

دوبارہ ملاقات نہ کرسکیں لہٰذا آپس واپس جاسکتے ہیں'' مراری یہ سنتے ہی کرسی سے اٹھا اور نیچے اپنی گاڑی کی طرف چلا۔ گاڑی کی چابی میرے پاس تھی۔ قیصر، عمران اور عبداللہ تھائی بھی میرے اشارے پر میرے ساتھ ہی اس کے پیچھے لپکے۔ مراری اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اسے گاڑی کی چابی میرے پاس ہونے کا خیال اس وقت آیا جب وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں ہم بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ ہم نے مراری کی گاڑی لاک نہیں کی تھی۔ مراری نے مجھ سے چابی مانگی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ساتھیوں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اسے پچھلی سیٹ پر اندر دھکیلا اور اس کے دونوں طرف قیصر اور عبداللہ تھائی بیٹھ گئے جب کہ عمران نے فرنٹ سیٹ سنبھالی اور میں نے گاڑی اسٹارٹ کرلی۔ مجھے یکایک کچھ خیال آیا اور میں نے عمران کے کان میں کچھ کہا عمران گاڑی سے اترا اور تیزی سے گیسٹ ہاؤس میں جا کر ۵ منٹ میں واپس لوٹ آیا۔ مراری کے لیے میڈم جینی کے تحت کام کرنے والوں کا یہ غیر شریفانہ اور جاسوسی کے اصولوں کے خلاف یہ رویہ یقیناً ناقابل فہم تھا اور وہ اس پر ضرور احتجاج کرتا یا شور مچاتا لیکن قیصر کے رام پوری اور عبداللہ تھائی کے خنجر کی دوطرفہ چبھن نے اس کی آواز کو منھ سے باہر نکلنے سے روک رکھا تھا۔ میں نے گاڑی فلسطینیوں کے بھیس میں چھپے موساد کے دونوں ایجنٹوں کی رہائش گاہ کو جانے والی سڑک پر موڑی اور ایک سنسان جگہ پر گاڑی روک دی۔ بیک ویو مرر سے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ گاڑی گیسٹ ہاؤس سے ہی ہمارے پیچھے آرہی تھی اور ہمارے رکتے ہی وہ ہم سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر رک گئی اور اس کی روشنیاں مدھم ہوگئیں یہ گاڑی عمران کے کہنے پر JCO منصف لایا تھا۔ میں نے مراری کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا ''مراری تم نے تو میرے سوالوں کے جواب دینے سے انکار کردیا لیکن میں تمھاری آتما کو بھٹکنے سے بچانے کے لیے کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ گروپ لیڈر جینی نہیں بلکہ میں ہوں اور ہم سب کا صرف ایک مشن ہے کہ موساد اور بھارتی جاسوسی کے اداروں کو اس حد تک مفلوج کر دیں کہ انھیں ری گروپنگ میں برسوں لگ جائیں۔ تمھارے جنرل حکم چند CBI کے جگدیش اور بریدہ میں وجے کو ختم کر کے ہم نے تمھارا وہاں کا نیٹ توڑا۔ جدہ میں راجیش اور اس کے ساتھیوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے تمھارے مین ٹرانسمیٹر کو بھی تباہ کیا اور اب ینبع میں بھی بھارتی اور موساد کے جاسوسی کے پھیلائے ہوئے نیٹ ورکس ختم کریں گے جس کی ابتدا تم سے ہوگی۔ تمھارے دھرم میں آواگون (مرنے کے بعد بار، بار جسمانی حالت میں پیدا ہونا) کو مانا جاتا ہے اسی لیے تمھیں کہہ رہا ہوں کہ جب تمھاری آتما (روح) دوسری آتماؤں سے ملے اور وہ بھی دوبارہ جنم لیں تو ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ اندرونی طور پر ہم پاکستانی چاہے کتنے ہی کم زور یا آپس میں اختلاف رکھتے ہوں لیکن جب بھی بیرونی دشمنوں یعنی بھارتیوں، یہودیوں اور نصرانیوں کے آمنے سامنے ہونے کا وقت آیا تو ان شاء اللہ ہر پاکستانی جبرالٹر (جبل الطارق) کی طرح مضبوط اور نہ ٹوٹنے والا ثابت ہوگا اور جب تک ایک پاکستانی بھی زندہ رہے

گا، وہ اپنے جھنڈے کو سرنگوں نہ ہونے دے گا'' گاڑی کی اندرونی مدھم روشنی میں مراری کی پھٹی ہوئی آنکھیں مجھے صاف دکھائی دے رہی تھیں میں نے قیصر اور عبداللہ تھائی کو کہا ''اب یہ تمھارا شکار ہے'' بہ یک وقت دونوں کے چاقو اور خنجر مراری کے دونوں پہلوؤں مین گھسے اور تب واپس نکالے گئے جب تک مراری کی جان نہ نکل گئی۔ عمران نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھ مراری کے منہ پر رکھ کر اس کے سر کو نشست کی پشت سے لگا رکھا تھا۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اے سی پوری رفتار سے چل رہا تھا میں نے مراری کی گاڑی دونوں یہودیوں کی رہائش گاہ کے بالکل نیچے کھڑی کی اور ہم چاروں ساتھی اس کی گاڑی سے اتر کر اپنی گاڑی میں جسے JCO منصف ہمارے پیچھے پیچھے لا رہا تھا۔ بیٹھ گئے۔ گیسٹ ہاؤس پہنچ کر قیصر اور عبداللہ نے اپنے لباس جن پر مراری کے خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے، آتش دان میں جلا دیے۔

اگلی صبح ماہا میرے کمرے میں آئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی اور یہ محسوس ہوتا تھا جیسے رات بھر وہ سو نہ سکی ہو۔ میں نے اسے مراری کے متعلق بتایا تو اس نے کہا کہ عمران پہلے ہی اسے سب کچھ بتا چکا ہے ماہا نے کہا کہ کل رات جب ہم فلسطینیوں کے بھیس میں چھپے یہودیوں اور موساد کے ایجنٹوں کی دکانوں پر مراری کے ساتھ گئے تو دکانیں تو اگرچہ بند تھیں لیکن میرے ساتھ کھڑی گاڑی میں موساد کا ایک سینئر ایجنٹ ہیفل بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا غالباً اس نے مجھے پہچان بھی لیا تھا کیوں کہ اس نے موساد کے ایجنٹوں کی خصوصی نشانی وہ انگوٹھی میرے سامنے کردی جس پر FM (فری میسن کا مخفف) لکھا ہوتا ہے. یہ چوکور انگوٹھی ہمیشہ الٹی پہنی جاتی ہے اور صرف پہچان کروانے کے لیے اسے سیدھے رخ پر لایا جاتا ہے۔ ہیفل نے میرے ساتھ موساد کی ٹریننگ لی تھی اور موساد سے میرے قطع تعلق کو بھی وہ بخوبی جانتا ہے۔ بینکاک میں اسی نے مجھے وارننگ دی تھی کہ اگر میں نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو مجھے یا تو زبردستی اسرائیل پہنچایا جائے گا اور یا پھر جہاں بھی موقع ملا، موساد کے ایجنٹ مجھے ہلاک کردیں گے ماہا کی بات سن کر میں بھی پریشان ہوگیا اور میں نے اسے کہا کہ اوّل تو ایسی نوبت ہی نہیں آئے گی کہ موساد والے تم تک پہنچ سکیں لیکن حفظ ماتقدم کے لیے آج سے دونوں فوجی سپاہی ہر وقت اس کی حفاظت کریں گے اور وہ کم از کم سعودی عربیہ میں اپنی رہائش گاہ سے باہر نہ نکلے میں نے ماہا کو بھرپور یقین دلایا کہ اس کی زندگی کی ذمہ داری بحیثیت گروپ لیڈر مجھ پر ہے اور میں اور میرے دوسرے تمام ساتھی اس کی سلامتی کے لیے اپنی جانوں کی بازی لگادیں گے ماہا کہنے لگی ''مجھے موت کا ہرگز خوف نہیں۔ جب موساد اور اس کے گھناؤنے عزائم کے لیے میں نے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی تو اب حق و صداقت کا ساتھ دیتے ہوئے موت سے کیوں ڈروں لیکن ایک بات ضرور کہوں گی کہ موساد کی جڑیں اتنی گہری اور وسائل اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ چاہیں تو مجھے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔

☆☆

میں ماہا کو لے کر ڈرائنگ روم میں آگیا اور تمام ساتھیوں کے ساتھ ایک جنرل میٹنگ کی اور انھیں ماہا کے بقول یہودی ایجنٹ ہیفل کے اسے پہچاننے کے متعلق بتایا۔ میرے تمام ساتھیوں کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم ماہا کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں نچھاور کردیں گے۔ عمران اور قیصر کہنے لگے کہ ہم آج ہی ان یہودی ایجنٹوں کے دکانوں اور فلیٹوں پر دھاوا بولیں اور ان دونوں کو ہلاک کردیں۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ ہمیں جوش کے ساتھ ہوش سے بھی کام لینا ہوگا۔ یہاں کی حکومت جب خود امریکا اور برطانیہ کے آگے اتنی بے بس ہے تو ہمارے دن دہاڑے ان ایجنٹوں کو سب کے سامنے ہلاک کرنے کے عمل کو کبھی بھی Defend (دفاع) نہیں کرے گی۔ خصوصی طور پر جب ہم نہ تو اس ملک کے شہری ہیں اور نہ ہی قانونی ویزے پر یہاں آئے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں ابھی تک صرف ینبع میں باغیوں کے اسلحے کی برآمدگی کا کہا گیا ہے اور وہ بھی زبانی طور پر، وہ کام ہم نے کردیا ہے۔ اس سے زیادہ ہم جو کچھ بھی کریں گے اسے حکومت اور فوج کی پشت پناہی حاصل نہ ہوگی۔ میں نے ساتھیوں کو بتایا کہ یہودی جاسوس نے ماہا کو پہچان کر اپنی انگوٹھی شناخت کے لیے آگے کر دی تھی جس پر Free Mason کا مخفف FM لکھا ہوا تھا۔ بہت سے قارئین کو فری میسن کے متعلق شاید علم نہ ہو اس لیے، مختصر الفاظ میں اس کی تشریح کرتا ہوں۔ رسولِ پاک ﷺ ہے کی حیاتِ مبارک میں ہی یہودیوں کو اپنا وطن نہ ہونے اور دربدر خاک بسر ہونے کا علم ہوگیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اسرائیل کے قیام تک یہودیوں کا کوئی وطن نہ تھا، کوئی ملک اور جھنڈا نہ تھا۔ یہ دنیا بھر کے ممالک میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہودیوں نے دنیا بھر کے ممالک میں پھیلے یہودیوں سے رابطے اور دوسری اقوام کے لوگوں کو اپنے دام میں پھانسنے اور بلیک میل کرنے کے لیے ایک دینی تنظیم بنائی جس کا نام فری میسن رکھا۔ اس تنظیم کے ممبروں کو جن میں یہودی، عیسائی، مسلمان، ہندو اور سب ہی قومیتوں کے لوگ شامل تھے، اپنی شناخت کے لیے ایک خصوصی انگوٹھی جس پر کونوں والے ستارے کے اندر FM لکھا ہوتا تھا، دی جاتی تھی اور مزید شناخت کے لیے ایک مخصوص انداز میں ہاتھ ملایا جاتا تھا۔ اس تنظیم نے اپنے ممبروں کے لیے دنیا بھر میں پرشکوہ عمارات تعمیر کی تھیں۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد غالباً ۸ فری میسن ہال، دہلی، بمبئی، کلکتہ، شملہ، مدراس وغیرہ میں تھے۔ لاہور میں اسمبلی ہال کے بالکل سامنے مال روڈ اور کوئینز روڈ کے چوراہے پر فری میسن ہال کی عالی شان عمارت اب بھی موجود ہے۔ اس تنظیم کی ممبر شپ حاصل کرنا آسان نہ تھا اور جو ایک بار ممبر بن جاتا اسے قطعاً اجازت نہ تھی کہ غیر ممبروں کو یہ بتائے کہ اس ہال کے اندر کیا ہوتا ہے۔ اعلیٰ سرکاری افسران، اونچے طبقے کے کاروباری لوگ اور یہودیوں کے ہمدردوں کو بڑی چھان بین کے بعد فری میسن کا ممبر بنایا جاتا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ تنظیم پوری آن بان شان سے لاہور کے فری میسن ہال میں اپنی خفیہ میٹنگز کرتی رہی۔ بھٹو صاحب کا عوامی دور شروع ہوا تو مصطفیٰ کو نے جو گورنر اور پنجاب کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے، اس تنظیم کی ممبر شپ نہ ملنے پر پولیس فورس کے ذریعے فری میسن ہال کے دروازے

کھلوائے۔ اندر سے کیا کچھ ملا، آج تک اس کا پتا نہ چل سکا۔ برطانیہ اور امریکا نے ایک ''آزاد'' تنظیم کے ہال پر قبضہ کرنے پر پاکستان سے باقاعدہ احتجاج کیا اور بھٹو صاحب کو امریکا کے سیکریٹری آف اسٹیٹ (وزیر خارجہ) ہنری کیسنجر نے خاصی ڈانٹ پلائی اور تبھی سے وہ بھٹو کا ذاتی مخالف بھی بن گیا۔ ہنری کیسنجر یہودی ہے اور کھلے بندوں اپنے یہودی ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ جب موساد نے زور پکڑا تو اسی تنظیم کے ممبروں (میں پاکستان کی بات کر رہا ہوں) کو اپنے اندر سمولیا اور یہ سابقہ فری میسن پاکستانی اعلانیہ اور چھپ کر پاکستان کے مفاد کے خلاف اب تک کام کر رہے ہیں۔ پاکستان میں اس کے سابقہ ممبروں میں قادیانیوں کی تعداد خاصی ہے۔

ہماری میٹنگ ابھی جاری تھی کہ کرنل نبیل آ گیا۔ اس نے بتایا کہ باغیوں کی سرکوبی کی ذمہ داری یہاں کے کمانڈنگ آفیسر کو سونپی گئی ہے اور ایک فلسطینی کے گھر کے بالکل سامنے ایک بھارتی کی لاش اس کی گاڑی سے ملی ہے۔ میں نبیل کے دل کی بات سمجھ چکا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اب ینبع میں ہمارا قیام بے سود ہے لہٰذا ہمیں واپس جدہ جانے کی اجازت دی جائے۔ نبیل نے کہا کہ کل صبح کی فلائٹ سے جدہ کے لیے آپ کی سیٹیں بک کروادی جائیں گی اور جدہ میں ہی ہز رائل ہائی نس آپ سے عنقریب ملیں گے۔ نبیل نے یہ بھی کہا ''ہمیں علم ہے کہ ہمارے تمام شہروں میں ہمارے دشمنوں کے جاسوس مختلف لبادے اوڑھے اپنی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ ہم انھیں ختم بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن مغربی ممالک ہماری راہ میں حائل ہیں۔ ہم ہر قسم کے اسلحے کے لیے ان کے محتاج ہیں۔ ہماری تیل کی دولت کی حفاظت کے لیے ہمارے دلوں میں مصنوعی خوف پیدا کر کے یہ ممالک ہمیں مسلسل بلیک میل کر رہے ہیں۔ اسرائیلی، عراقی اور ایرانی فوجی کارروائی کا مصنوعی خوف ہمارے اوپر طاری کر کے یہ ممالک مارکیٹ ریٹ سے دگنی قیمت پر اپنا فرسودہ اسلحہ ہمیں فروخت کرتے ہیں اور مارکیٹ ریٹ سے کم داموں پر ہمارا تیل خریدنے کے علاوہ ہمارے اندرونی معاملات میں بھی بھرپور دخل اندازی کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف اسرائیل کو بالکل مفت اور عراق و ایران کو ہم سے بہت بہتر اسلحہ بہت کم داموں پر مہیا کر کے ہمارے سروں پر ہر وقت موت کا ''ہوا'' کھڑا رکھتے ہیں۔ آپ نے جس جاں فشانی اور خلوص سے باغیوں کا اسلحہ برآمد کرا دیا ہے اس کے بدلے میں ذاتی طور پر اور سعودی عرب کی افواج اور عوام کی طرف سے آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔'' میں نے کرنل نبیل سے پوچھا کہ مبشر اور بسواس کی کیا پوزیشن ہے۔ ''مبشر کے ہمارے ساتھ تعاون کرنے اور مخصوص حالات میں گھیر کر مجبوراً باغیوں کا ساتھ دینے کے متعلق ہم پر زور سفارش اور رحم کی اپیل کے ساتھ عدالت میں اُس کا کیس بھیجیں گے اور بسواس اب وہیں جا چکا ہے جہاں آپ نے اس کے گروپ لیڈر کو بھیجا ہے۔'' اب مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ نبیل کے رخصت ہونے کے بعد میں نے ساتھیوں کو کہا کہ کل صبح جدہ جانے کے لیے تیار رہیں اور جدہ پہنچ کر ہم مکہ معظمہ میں الوداعی عمرہ بھی کریں گے۔ میرے ساتھی سمجھ گئے کہ جدہ جا کر

ہمیں بہت جلد سعودی عرب بھی جانا ہوگا۔ سب بہت خوش تھے کیوں کہ یہاں کے گھٹے ہوئے ماحول نے ہمیں خاصا بور کر دیا تھا۔

☆☆

اگلی صبح ساڑھے آٹھ بجے ہم ینبع ایئرپورٹ پہنچے۔ کرنل نبیل نے مجھے کہا تھا کہ چاروں گاڑیاں ہم ایئرپورٹ پارکنگ میں ہی مع چابیوں کے چھوڑ دیں جنھیں بعد میں رینٹ اے کار والے لے جائیں گے۔ اپنا سارا اسلحہ ہم نے کرنل نبیل کی ہدایت پر گیسٹ ہاؤس میں انھی سوٹ کیسوں میں رکھ دیا تھا، جن میں اسلحہ ہمیں دیا گیا تھا۔ پارکنگ ایریا میں ہم گاڑیوں سے اتر رہے تھے کہ ماہا نے مجھے ایک سرخ BMW گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ موساد کا یہودی ایجنٹ ہیفل گاڑی کے اسٹیئرنگ پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے علاوہ گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر ایک اور پچھلی سیٹوں پر دو اجنبی بیٹھے ہوئے ہیں۔ کرنل نبیل ہمارے ٹکٹ لینے کے لیے ایئرپورٹ بلڈنگ کے اندر گیا ہوا تھا۔ مزمل نے یہ بات چند سیکنڈوں میں باقی ساتھیوں تک پہنچا دی۔ ہمارے پاس اسلحہ نہیں تھا لیکن قیصر اور عمران اپنے چاقو اور آہنی مکے کے ساتھ اس گاڑی کی طرف بھاگے۔ عمران نے آہنی مکے سے ڈرائیونگ سیٹ کا شیشہ توڑا۔ ہیفل بھی گرگ باراں دیدہ تھا۔ وہ ان حملہ آوروں کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ اس نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور پارکنگ ایریا سے نکلنے کے لیے تیزی سے ریورس کی۔ قیصر نے چلتی گاڑی میں ہیفل پر چاقو کا وار کیا جو اوچھا پڑا اور صرف ہیفل کے بازو کے آر پار ہو سکا۔ ہیفل نے جس کے بائیں بازو سے خون کے فوارے بہہ رہے تھے، قیصر کو اپنی گاڑی تلے کچلنے کے لیے ایک دم فارورڈ گیئر لگایا۔ قیصر جمپ لگا کر گاڑی تلے کچلے جانے سے بال بال بچا اور ہیفل کی گاڑی اگلی لائن میں کھڑی کسی کی گاڑی سے جا ٹکرائی۔ چند سیکنڈ میں ہی یہ سب کچھ ہو چکا تھا اور ابھی کسی نے بھی ہمارے حملے اور گاڑیوں کے ٹکرانے کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ ہیفل نے بھاگ جانے میں ہی اپنی عافیت دیکھی اور تیز رفتاری سے گاڑی چلا کر ایئرپورٹ سے نکل بھاگا، شیشے کی ٹوٹی ہوئی کرچیں اور خون کے دھبوں کے سوا اب وہاں کچھ نہ تھا۔ عمران اور قیصر بھی صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور ایئرپورٹ بلڈنگ کے اندر داخل ہو گئے۔ نبیل ہمارے بورڈنگ کارڈ لیے ہمارا منتظر تھا۔ میں نے بھی اسے یہ واقعہ نہیں بتایا کیوں کہ اس سے اب کسی امداد کی توقع نہیں تھی۔ نبیل ہمیں الوداع کہتے ہوئے بولا ''آپ کے جدہ ایئرپورٹ پہنچنے پر میرے دو میجر جو پہلے بھی آپ سے مل چکے ہیں، آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔ ڈپٹی کمانڈر انچیف کے ذریعے آج ہی ہز رائل ہائی نس کو آپ کے جدہ پہنچنے کی اطلاع مل جائے گی، میں بھی دو ایک روز میں جدہ آ جاؤں گا اگر میرے آنے سے پہلے ہز رائل ہائی نس نے آپ کو طلب کیا تو میری کارکردگی کے متعلق انھیں ضرور بتائیے گا'' پینتیس منٹ کی فلائٹ کے بعد ہمارے جہاز نے جدہ ایئرپورٹ پر لینڈ کیا۔ دونوں میجر ہمیں لینے کے لیے وہاں موجود

تھے۔ ٹیکسیوں میں ہمارے اپارٹمنٹس میں پہنچا کر وہ ہم سے رخصت ہوئے۔ شام تک دونوں خواتین نے گھر اور اکرم اور دین محمد سپاہی نے گاڑیوں کی صفائی کی۔ اسی شام کو ہم بنی مالک گئے اور لاہور ہوٹل کے منیجر کی وساطت سے جعلی ویزے اور پاسپورٹ بنانے والوں سے ملے اور ان سے اپنے پاسپورٹوں پر ایران کے ویزے لگوانے کی بات کی۔ ان کے کرتا دھرتا نے کہا کہ وہ دو ہزار ریال فی ویزہ کے حساب سے ویزے لگا دیں گے لیکن ہمیں پہلے پاکستان میں کراچی جانا ہوگا اور وہاں سے ایران ایئر کے جہاز پر مہر آباد تہران جا سکیں گے کیوں کہ سعودی عرب یا امارات سے ماسوا دوبئ کوئی فلائٹ تہران نہیں جاتی۔ ویزوں کے متعلق اس نے یقین دلایا کہ اصل اور نقل میں پہچان ناممکن ہوگی۔ ان سے معاملہ طے کر کے اگلے روز میں نے ۱۱ پاسپورٹ اور بائیس ہزار ریال ویزہ لگانے والوں کے حوالے کیے اور تیسرے روز ہمیں ایران کے ویزے لگے پاسپورٹ مل گئے۔

جدہ پہنچنے کے اگلے روز میں پاکستانی سفارت خانے میں فرسٹ ملٹری اتاچی سے ملنے گیا۔ جنرل صاحب بڑی آؤ بھگت سے مجھے اپنے دفتر میں لے گئے اور مجھے بتایا کہ سعودی حکومت نے ایک خط سفیر کو اور ایک مجھے بھارتی جاسوسوں کی ''نشان دہی'' کرنے پر ہمارا شکریہ ادا کرنے اور ہماری معاونت کو سراہنے کے اظہار کے لیے بھیجے ہیں۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ظاہری نام و نمود کی خواہش تو تھی نہیں بلکہ ان خطوط میں ہمارا ذکر نہ ہونے پر فی الحقیقت ہمیں خوشی ہوئی کیوں کہ اس طرح خاموشی سے اپنے آئندہ مشنز کو پورا کرنے میں ہمیں آسانی نظر آئی۔ جنرل صاحب نے مجھے بتایا کہ انھوں نے اس خط کی ایک کاپی کے ساتھ ایک مفصل رپورٹ میرے سابقہ محکمے کو بھیج دی ہے جس میں واضح طور پر ہماری کارکردگی سے پاکستان دشمن بھارتی ایجنٹوں کے قلع قمع کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ جنرل صاحب نے سعودی حکومت کے خط اور اپنی رپورٹ کی ایک ایک فوٹو کاپی مجھے دی تاکہ اگر کبھی ضرورت پیش آئے تو اسے محکمے کے افسران کو دکھا سکوں۔ میں نے جنرل کو ینبع میں باغیوں کے چھپائے ہوئے اسلحے کی برآمدگی اور باغیوں کی گرفتاری کے ساتھ ساتھ بھارتی اور اسرائیلی جاسوسوں کے متعلق تفصیلاً بتایا۔ جنرل صاحب نے بھی یہ کہا کہ یہاں کی حکومت مغربی طاقتوں کی وجہ سے اتنی بے دست و پا ہو چکی ہے کہ اپنے ملکی مفاد کے خلاف کام کرنے والوں کی بیخ کنی کے لیے بھی اسے مغربی طاقتوں سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ دو روز بعد کرنل نبیل بھی جدہ آ کر مجھ سے ملا اور کہنے لگا کہ ہز رائل ہائی نس بہت جلد آپ سے ملاقات کریں گے سعودی عرب میں اب ظاہری طور پر ہمیں دو کام کرنے تھے۔ ہز رائل ہائی نس سے ملاقات اور الوداعی عمرہ۔ ہم نے عمرے کی ادائیگی کو اس لیے آخر میں رکھا تھا کہ اس متبرک فرض کی ادائیگی کے فوری بعد ہم سعودی عرب سے جانا چاہتے تھے اور ہماری یہ خواہش تھی کہ عمرے کی ادائیگی کے بعد کم از کم سعودی عرب میں ہم سے مزید قتل و غارت نہ ہو اب چند سطور ملکی حالاتِ حاضرہ پر۔

میں کئی روز سے اسی سوچ میں غلطاں ہوں اور دنیا کے نقشے میں کسی ایسے ملک کی تلاش میں ہوں جہاں

کے تاجر اور کاروباری حضرات اس لیے مسلسل کئی روز سے ہڑتال پر ہوں کہ وہ حکومت کو سیلز ٹیکس ادا نہیں کریں گے حالاں کہ یہ سیلز ٹیکس بالآخر خریدار کو ہی ادا کرنا پڑے گا اور تاجروں کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا جس ملک کے تاجر یہ کہیں کہ ہماری دکانیں اور گودام غیر ملکی اسمگلنگ کے سامان سے بھرے پڑے ہیں لہٰذا ہم اپنا سامان بھی چیک نہیں کرنے دیں گے کیوں کہ ہم نے یہ سامان باقاعدہ درآمد کر کے ڈیوٹی ادا نہیں کی بلکہ کھیپیوں اور دوسرے غیر قانونی ذرائع سے یہ سامان منگوایا ہے اور منگواتے رہیں گے۔ جس ملک میں اسمگل شدہ سامان پہلے صرف ایک سرحدی علاقے میں ملتا تھا لیکن اب ہر شہر میں باڑہ مارکیٹیں بن گئی ہوں بلکہ بلڈرز نے ملک کے سب سے بڑے شہر میں باڑہ پلازہ کے نام سے ایک مارکیٹ تعمیر کی ہو جہاں کی جیولر مارکیٹیں اس لیے بند رکھی جائیں کہ چیکنگ پر ان کا ۹۰ فی صد سونا غیر قانونی ذرائع سے دوبئ کی رزاق اینڈ کمپنی کے ذریعے آیا ہو۔ جہاں وڈیو کیسٹ والے کہیں کہ اب تک ہم غیر قانونی طور پر کاپی رائٹ کے بغیر وڈیو فلمیں فروخت کر رہے ہیں اور جب تک یہ اسٹاک ختم نہ ہو جائے ہم سے کاپی رائٹ کی بات نہ کریں۔ جہاں دھواں چھوڑتی لوکل بسیں سڑکوں پر آگے پیچھے نہیں بلکہ ایک ساتھ ریس لگاتی اور پیدل چلنے والے عوام کو ہر روز کچلتی رہیں جو بغیر اسٹاپ کے جہاں ڈرائیور اور کنڈیکٹر چاہے سواری اتارنے اور چڑھانے کے لیے روک دے۔ جہاں کے رکشا ڈرائیور سائیلنسر کی جالی اتار کر ٹینک چلنے کی آواز پیدا کرتے ہوئے سڑکوں پر دوڑیں اور ٹریفک پولیس بسوں اور رکشا ڈرائیور کی ان دھاندلیوں کو دیکھتے ہوئے بھی خاموش رہے کیوں کہ انھیں پبلک سیفٹی کی نہیں بلکہ ''منتھلی'' (Monthly) کی ضرورت ہے۔ جہاں کی پولیس کی نگاہ میں ہر شخص مجرم ہو جب تک وہ اپنی بے گناہی ثابت نہ کر دے، جہاں ٹیکسیوں کے میٹر اتنا زیادہ کرایہ بڑھا کر دکھائیں جس میں چھوٹا ہوائی جہاز چارٹر ہو سکے۔ جہاں کی نوکر شاہی اپنی فرعونیت کی وجہ سے خود کو عوام کا خادم سمجھنے کے بجائے آقا سمجھے اور حکومت اور عوام کے درمیان جان بوجھ کر اتنا فاصلہ پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ عوام حکومت کی ہر اچھی اور صحیح کوشش کو بھی ان نوکر شاہی کے فرعونوں کی وجہ سے سراہنے کے بجائے الٹا اثر لیں۔ جہاں لاکھ دو لاکھ کا فراڈ کرنے کے الزام میں تو پولیس ملزم کو الٹا لٹکا دے لیکن گورنمنٹ سے پونے تین ارب کا فراڈ کرنے والے صدر الدین گھانچی کا ایف آئی اے کا افسر اعلیٰ کھڑے ہو کر استقبال کرے اور چائے اور بسکٹوں سے اس کی تواضع کرے۔ جہاں کے کثیر الاشاعت اخبار معزول، گرفتار اور سزا یافتہ سابقہ وزیر اعظم سے کروڑوں روپے لے کر اسے بے گناہ اور فرشتہ ثابت کرنے کے لیے اپنے اخبار کے صفحات وقف کر دیں جہاں جمہوریت کا جنازہ نکالنے والے سیاست دان جو ماضی میں کبھی بھی اکٹھے مل کر نہ بیٹھے ہوں اور نہ ہی کبھی ملک کی اصلاح کے لیے کوئی کام کیا ہو وہ ملکی محبت سے سرشار اور ملک میں پھیلی گندگی اور غلاظت کو دور کرنے کے لیے ایک شخص اور ملک کی سالمیت کے لیے جان دینے والے ادارے کی مخالفت میں صرف اس لیے سر جوڑ کر بیٹھ جائیں کہ اس شخص اور ملک کے اس انتہائی

منظّم ادارے نے وردی پہن رکھی ہے۔ ساری دنیا کے نقشے کو بار بار دیکھنے اور ایسا ملک تلاش کرنے پر میری انگلی صرف اور صرف پاکستان پر ٹھہرتی ہے۔ جس طرح امریکا کے دریافت ہونے پر دنیا بھر کی قومیں اس ملک پر چڑھ دوڑی تھیں تاکہ اس کی دولت اور وسائل پر قبضہ کرسکیں۔ اسی طرح پاکستان میں سیاست ایک اتنا منافع دینے والا کاروبار بن چکا ہے کہ صوبائی اسمبلی کے الیکشن پر لاکھوں اور قومی اسمبلی کی سیٹ کے لیے کروڑوں روپے لٹا دیے جاتے ہیں اور ان اخراجات کی جب تک آٹھ گنا زیادہ وصولی نہ ہوجائے تب تک ان ممبران کی باچھوں سے رال بہتی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں جمہوریت کا آغاز ہی لوٹ مار سے ہوا ہے احمد شاہ بخاری (پطرس بخاری) نے برسوں پہلے ایک محفل میں یہ بات کہی تھی جو آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔ مرحوم نے کہا تھا کہ بابائے جمہوریت ابراہیم لنکن نے جمہوریت کی تشریح یوں کی تھی Government by the People for the People and of the People (عوام کی حکومت، عوام کے لیے حکومت اور عوام سے حکومت) مرحوم بخاری نے کہا کہ پاکستان میں جس قسم کی جمہوریت ہے اس کا تلفظ (انگریزی میں) تو وہی ہے لیکن Spelling (ہجے) مختلف ہیں۔ یہاں کی جمہوریت Buy the People far the People end of the People ہے (عوام کو خریدتی ہے، عوام کو دور کرتی ہے اور عوام کو ختم (ہلاک کرتی ہے) پطرس مرحوم کی اس طنز کا صحیح لطف صرف انگریزی جاننے والے ہی اٹھا سکتے ہیں میں نے کوشش کی ہے کہ اردو جاننے والے قارئین بھی اس طنز کو سمجھ سکیں۔ پطرس بخاری کوئی معمولی فہم کے آدمی نہیں تھے وہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے تھے اور سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی میں ان کی تقریریں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ قارئین! خدارا اپنے ضمیر اور دل کو جج بنائیں اور خود فیصلہ کریں کہ پاکستان میں جمہوریت کے دور نے پاکستانیوں کو کیا دیا۔ اب ایک الوالعزم جنرل نے ملکی حالات کو ٹھیک کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے تو ہم اسے کھلے دل اور اپنے تعاون سے کم از کم وہ مدت تو پوری کرنے کا موقع دیں جو سپریم کورٹ نے انھیں دی ہے۔ اگر ہم اس بار بھی ان خارش زدہ سیاست دانوں کے فریب میں آگئے تو ہماری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں۔

آٹھواں باب

اگلے روز بعد دوپہر سپاہی اکرم اور دین محمد نے مجھے بتایا کہ دو سفید کرونا گاڑیاں صبح سے ہمارے اپارٹمنٹس کے سامنے اور اردگرد منڈلا رہی ہیں۔ انھوں نے ان گاڑیوں کے نمبر بھی نوٹ کر لیے تھے۔ میں نے انھیں کہا کہ بعض لوگ یوں ہی بے مقصد گھومتے رہتے ہیں، ممکن ہے یہ گاڑیاں بھی ایسے ہی لوگوں کی ہوں، بہرحال وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور گاڑیوں میں بیٹھے افراد کی شکلیں ذہن نشین کرلیں، میں خود بھی ان گاڑی والوں کو دیکھنے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ کی گیلری میں آ کر بیٹھ گیا، مجھے وہاں بیٹھے زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹا گزرا ہوگا کہ سپاہی دین محمد نے جو ہمارے اپارٹمنٹس کے سامنے سڑک کی دوسری طرف بیٹھا تھا، سیٹی بجا کر مجھے متوجہ کیا۔ دو سفید کرونا گاڑیاں ایک دوسرے سے پچاس میٹر کے فاصلے پر آہستہ رفتار سے ہمارے اپارٹمنٹس کے سامنے سے گزریں، ہمارے اپارٹمنٹس شاہراہ فلسطین سے دائیں جانب نکلنے والی ایک لین میں تھے جو آگے جا کر خم کھاتی ہوئی شاہراہ فلسطین سے دوبارہ جا ملتی تھی اس لین میں دس بارہ بنگلے اور چار ایسی بلڈنگز تھیں جن میں اپارٹمنٹس بنے ہوئے تھے۔ دونوں گاڑیاں خم کھاتی ہوئی لین پر آگے جا کر نظروں سے اوجھل ہوگئیں، ان گاڑیوں میں چار چار افراد بیٹھے تھے، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور یوں بلاوجہ ان کا اس لین میں بار بار آنے کا مقصد کیا تھا۔ جو اسرائیلی ایجنٹ ینبع میں ماہا کے پیچھے لگے تھے، وہ ینبع ایئرپورٹ پر بھی پہنچ گیا تھا حالاں کہ ہماری روانگی کے پروگرام کا سوائے میرے ساتھیوں کے صرف نبیل کو علم تھا۔ اب جدہ میں بھی ہماری نگرانی شروع ہوگئی تھی۔ ان دونوں گاڑیوں کا بار بار اس لین میں آنے کا ضرور کوئی مقصد تھا۔ اگر ہماری نگرانی کرنے والوں کو ہماری رہائش گاہ کا علم ہوتا تو وہ بلاوجہ اس لین میں گاڑیاں نہ بھگاتے، میں

نے ینبع سے یہاں جدہ تک میں پیش آئے واقعات کی کڑیاں ملائیں تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی ہماری نقل وحرکت کے متعلق جاننا چاہتا ہے لیکن ہماری صحیح لوکیشن اسے نہیں مل رہی، ایسا کون ہوسکتا ہے۔ میں اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اچانک مجھے پاکستانی سفارت خانے اور سعودی حکومت کے مختلف شہروں کے دفاتر میں نصب کیے گئے مائیکروٹرانسمیٹر ز کا خیال آیا۔ اگر کسی نے مائیکروٹرانسمیٹر ز ہمارے سامان میں نصب کردیا ہو تو محدود حدود کے اندر اس ٹرانسمیٹر سے ہماری لوکیشن معلوم کی جاسکتی ہے۔ اس معمے کا حل ڈھونڈتے ہوئے میرے دماغ نے یہ جواب دیا، میں نے ایک مفروضے سے واقعات کی کڑیاں ملاتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنے سامان کو دیکھا، اس سے کچھ نہ نکلا تو قیصر اور عمران کے ساتھ تمام ساتھیوں کے سامان کی جانچ پڑتال شروع کی تو رضی کے سوٹ کیس کے پہلو کی جانب ایک چپٹے منھ والی پن دکھائی دی اگر وہ پن سوٹ کیس کا حصہ ہوتی تو دوسرے پہلو پر بھی یقیناً ویسی ہی پن ہونی چاہیے تھی اور پھر سوٹ کیس کے پہلوؤں پر پن کا کیا کام، میں نے اس پن کو کھینچ کر سوٹ کیس سے علیحدہ کیا یہ مائیکروٹرانسمیٹر تھا اور ینبع کے گیسٹ ہاؤس سے ہماری روانگی کے وقت گیسٹ ہاؤس کے کسی اسٹاف نے اسے رضی کے سوٹ کیس میں چھوکر فٹ کردیا تھا۔ میں نے اس مائیکروٹرانسمیٹر کو اپنے باتھ روم میں جوتوں سے کچل کر توڑ دیا اور فوری طور پر باقی ساتھیوں کی میٹنگ بلا کر انھیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے ساتھیوں کو بتایا کہ یہاں جدہ میں جو لوگ دونوں گاڑیوں میں گھوم رہے تھے وہ ابھی تک ہمارے اپارٹمنٹس کو Locate (ڈھونڈ) نہیں سکے ہیں، اسی لیے وہ بار بار اس لین میں چکر کاٹ رہے ہیں کیوں کہ ان کی گاڑیوں میں لگے ٹرانسمیٹر ریسیور سے انھیں کم زور سگنل ہی مل سکے ہوں گے، ہمارے چہروں سے وہ شناسا نہیں ہیں لہٰذا اپنی ناکامی کا جب وہ ہیفل کو بتائیں گے تو ہیفل خود یہاں آئے گا۔ بشرطے کہ اس کے بازو کا زخم ٹھیک ہوگیا ہو۔ ہیفل کے یہاں آنے پر ہم حالات کے مطابق اس سے نبٹنے کی تدبیر سوچیں گے۔ عمران اور قیصر میٹنگ ختم ہوتے ہی اپنے کمروں میں چلے گئے، دونوں سفید گاڑیاں ابھی بھی ہماری لین کے چکر کاٹ رہی تھیں، ہماری میٹنگ ختم ہوئے قریب آدھا گھنٹا گزرا ہوگا کہ پے در پے کئی دھماکوں سے ہمارے اپارٹمنٹس کے در و دیوار لرز گئے، میں نچلے فلور پر آیا تو سبھی ساتھی وہاں جمع تھے اور کچھ دیر بعد عمران اور قیصر بھی ہم میں آکر شامل ہوگئے ہم ابھی ان دھماکوں کے متعلق رائے زنی ہی کررہے تھے کہ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں ہوٹر بجاتی ہماری لین میں داخل ہوئیں اور خاصی آگے جا کر لین کے تقریباً دوسرے سرے پر پہنچ گئیں، میں نے رضی کو کہا کہ جا کر دیکھو کہ کیا معاملہ ہے، قیصر اور عمران نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات کی اور قیصر بولا۔ ''رضی کو بھیجنے کا کیا فائدہ جب میں آپ کو ساری بات بتا دیتا ہوں۔'' ہم سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تو قیصر نے نیچی آنکھیں کیے بولنا شروع کیا ''سب سے پہلے تو میں آپ سے اس بات کی اپنے لیے اور عمران بھائی کے لیے معافی چاہتا ہوں کہ ہم نے ڈسپلن کو توڑا

اور آپ سے اجازت لیے بغیر یہ کام کر ڈالا'' میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی میں نے قیصر کو کہا کہ تمہید نہ باندھے اور جو کچھ بھی دونوں نے کیا ہے مجھے فوراً بتایا جائے ''بات یہ ہے'' قیصر نے نیچی نظریں کیے ہوئے ہی کہا ''آپ نے جب مائیکروٹرانسمیٹر ملنے کے بعد ان گاڑی والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تو میں نے اور عمران بھائی نے آپ کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا، ہمارے خیال میں ان گاڑیوں والوں کو یہ تو معلوم ہوچکا تھا کہ ان کے مطلوبہ افراد یعنی ہم اسی لین میں ہیں تو وہ، ینبع فون کرکے ہیفل سے ہمارے حلیے پوچھ کر آج ہی ہماری رہائش گاہ کو پن پوائنٹ کرلیتے، اگر انھیں صرف ہماری تلاش ہی مقصود ہوتی تو، ایک گاڑی اور ایک یا دو بندے ہی کافی تھے دو گاڑیوں اور آٹھ افراد کے یہاں کے بار بار چکر لگانے کا مقصد ہمیں صرف تلاش کرنا ہی نہیں بلکہ ہمارے خلاف کارروائی کرنا بھی تھا، آپ سے بحث کرکے آپ کو قائل کرنا تو ناممکن تھا اور اس میں خاصا وقت بھی صرف ہوجاتا لہٰذا میں نے اور عمران بھائی نے اپنے اسلحے کے علاوہ دو دو ہینڈ گرینیڈ بھی ساتھ لیے، عمران بھائی گاڑی لے کر لین کے دوسرے سرے پر جا کر کھڑے ہوگئے جب کہ میں اپنی طرف والے داخلے کے رخ پر، ہمیں ان پوزیشنوں پر کھڑے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ دونوں سفید گاڑیاں لین میں داخل ہوئیں، عمران بھائی نے دور سے ان گاڑیوں کو آتے دیکھ کر اپنی گاڑی لین میں اس طرح کھڑی کردی کہ کوئی اور گاڑی نہ گزر سکے، لین میں دونوں گاڑیوں کے داخل ہونے کے بعد میں نے اپنی گاڑی ان کے پیچھے لگالی، آگے والی گاڑی جب عمران بھائی والی گاڑی کے قریب جا کر رک گئی تو میں نے مسلسل ہارن بجا بجا کر پچھلی سفید گاڑی کو اگلی سفید گاڑی کے بالکل قریب جانے پر مجبور کردیا۔ جب دونوں سفید گاڑیاں ایک دوسرے کے قریب رک گئیں تو میں اور عمران بھائی تقریباً اکٹھے ہی اپنی اپنی گاڑیوں سے باہر نکلے، عمران بھائی نے اگلی گاڑی اور میں نے پچھلی گاڑی کے شیشے کھٹکھٹا کر ان کے شیشے اتروائے اور اپنے پلان کے مطابق ہم نے ایک ایک دستی بم جن کی پنیں ہم نے پہلے ہی نکال رکھی تھیں، ان گاڑیوں کے اندر پھینکے اور اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگے ہم اپنی گاڑیوں میں بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ دونوں گاڑیوں میں پھینکے گئے دونوں دستی بم پھٹے، ان گاڑیوں میں بھی یقیناً بم تھے جو انھوں نے ہماری رہائش گاہ کا پتا چلنے پر ہمارے خلاف استعمال کرنے تھے، ہمارے دستی بموں کے دھماکوں سے دونوں گاڑیوں میں رکھے بم پھٹے اور پھر ان کے پٹرول ٹینکس نے آگ پکڑلی۔ دونوں گاڑیاں بموں کے دھماکوں سے کئی بار سڑک سے کئی کئی فٹ اچھلیں اور ان میں سوار کوئی شخص بھی نہ تو زندہ بچا اور نہ ہی اس کا مردہ جسم ثابت رہا ہوگا۔ ہم تو دھماکے ہوتے ہی اپنی اپنی گاڑیاں لے کر واپس چلے آئے تھے میں نے ریورس میں گاڑی چلائی جب کہ عمران بھائی شاہراہ فلسطین سے ہوتے ہوئے اپنی لین میں پہنچے، فائر بریگیڈ والوں کو وہاں خاکستر گاڑیوں کے ڈھانچوں اور آٹھ جلی ہوئی لاشوں کے ٹکڑوں کے سوا کچھ بھی نہ ملا ہوگا'' میرے پوچھنے پر قیصر نے کہا عمران تو دھماکا ہوتے ہی اپنی گاڑی شاہراہ فلسطین پر لے گیا تھا

لہٰذا ان کا تو کسی نے نوٹس نہیں لیا ہوگا۔ میں نے ساری لین میں گاڑی ریورس میں چلائی ہے لہٰذا مجھے یقیناً اس لین میں رہنے والوں نے دیکھا ہوگا، میرے پاس اس بات کا ایک معقول عذر ہے کہ میں لین سے گزر رہا تھا کہ آگے کھڑی گاڑیوں میں دھماکے ہوئے اور شعلے بلند ہوئے جن سے میں اتنا خوف زدہ ہوا کہ تنگ لین میں گاڑی موڑنے کے بجائے ریورس میں ہی چلاتے ہوئے اپنے گھر پہنچ گیا۔'' قیصر کے بولنے کے دوران سب ساتھی خاموش رہے اور اس کے بات ختم کرنے کے بعد بھی ان کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ سب میرے فیصلے کے انتظار میں تھے، قیصر اور عمران نے ڈسپلن کو ضرور توڑا تھا لیکن ان کا یہ فیصلہ قطعی درست تھا، اگر سانپ دکھائی دینے پر وہ ڈسپلن کی پابندی کرتے ہوئے پہلے مجھ سے اسے مارنے کی اجازت لیتے تو اجازت ملنے تک سانپ غائب ہوجاتا۔ ہم سب ایک ہی مقصد کے تحت یہاں آئے تھے کہ ہمیں پاکستان کے دشمنوں کو ختم کرنا ہے اور یا ان کی کمر توڑ کر انھیں اس قدر معذور بنا دینا ہے کہ وہ ہمارے وطن کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنے کے قابل نہ رہیں۔ عمران اور قیصر نے بھی ان سانپوں کو مارا تھا جو ہم سے بدلہ لینے کے لیے ہماری لین میں پہنچ گئے تھے اگر عمران اور قیصر مجھ سے اجازت لیتے تو میں ہرگز انکار نہ کرتا میں نے دونوں کو کہا کہ ساتھ ساتھ کھڑے ہوجائیں، وہ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوئے تو میں نے اپنا ریوالور نکال لیا، تمام ساتھی دم سادھے کھڑے تھے، مزمل نے کچھ بولنا چاہا تو میں نے اسے کہا کہ چپ رہے، ریوالور میرے ہاتھ میں تھا، میں نے اسے لہراتے ہوئے عمران اور قیصر کو کہا۔ ''تم دونوں گدھے ہو لیکن عقل مند گدھے'' اور ریوالور اپنی جیب میں ڈال لیا۔ سب ساتھی کھلکھلا کر ہنسنے لگے، پہلے میں نے اور پھر تمام ساتھیوں نے دونوں کو مشن کی کامیابی پر مبارک باد دی، ماہا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے اور وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آئے گا جب میری زندگی کی کسی کو اتنی پرواہ ہوگی، سب سے پہلے کھٹمنڈو میں آپ نے میری جان بچائی۔ آپ کے اس عمل سے میں اتنی متاثر ہوئی کہ میں نے پہلے موساد سے قطع تعلق کیا اور پھر آپ کے گروپ میں شامل ہوگئی۔ آپ سب کے مخلصانہ رویے سے میں نے اس قدر اثر لیا کہ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوگئی۔ میرے کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مسلمان اس قدر غیرت مند ہوتے ہیں کہ کسی اَن جان عورت کی حرمت کے لیے کٹ مرنے سے بھی گریز نہیں کرتے، ینبع ایئرپورٹ پر قیصر نے جس طرح ہیفل کو اپنے چاقو سے زخمی کیا اور آج جس طرح عمران اور قیصر نے میرے دشمنوں کو ہلاک کیا اس سے مجھے فخر ہے کہ میں نے ایسے مذہب کو اختیار کیا جس میں مرد اتنے غیرت مند ہوتے ہیں۔''

☆☆

جدہ جیسے بڑے شہر میں دن دہاڑے دو کاروں کا دھماکوں سے تباہ ہونا اور ان میں بیٹھے ہوئے آٹھ افراد کے جھلسے ہوئے جسموں کے ٹکڑے ملنا کوئی معمولی بات نہ تھی جسے خاموشی سے نگل لیا

جاتا۔ شام تک سارے شہر میں اس واردات کا چرچا اور لوگوں کی زبانوں پر طرح طرح کی باتیں تھیں۔ سعودی قانون کے مطابق کوئی اخبار بھی صرف اپنے رپورٹروں کی دی ہوئی کرائمز کے متعلق خبریں شائع نہیں کرتے جب تک کہ پولیس کی جاری کردہ پریس ریلیز اور اس جرم کے متعلق ایف آئی آر کی کاپی نہ مل جائے۔ اخبارات نے دو روز بعد اس واقعے کی خبر شائع کرتے ہوئے لکھا کہ دو گاڑیوں کے ٹکرانے سے ان میں آگ لگ گئی اور ان دونوں گاڑیوں میں بیٹھے افراد جھلس کر ہلاک ہوگئے۔ خبر میں بم کے دھماکوں اور لاشوں کے ٹکڑے ہونے کا کوئی ذکر نہ تھا (ویسے بھی مرنے والے کا بے جان جسم ثابت و سالم ہو یا ٹکڑوں میں بکھرا ہوا، مرنے والے کو کیا فرق پڑتا ہے) پولیس کئی روز تک اس لین میں رہنے والوں سے اس حادثے کے متعلق تحقیقات کرتی رہی لیکن کوئی چشم دید گواہ نہ مل سکا۔ ہمارے اپارٹمنٹس پر بھی پولیس کے دو افسر آئے اور اس واقعے کے متعلق پوچھ کر واپس چلے گئے۔ جب حادثے کی جگہ کے بالکل قریب رہنے والے پولیس کو کچھ نہ بتا سکے تو ہم سے جو جائے حادثہ سے قریباً ایک کلومیٹر دور تھے، پولیس والے کیا توقع رکھ سکتے تھے انھوں نے بھی انکوائری کے لیے کاغذات کا پیٹ تو بھرنا تھا اس لیے وہ ہمارے پاس بھی آگئے۔

اس واقعے کے دوسرے دن کرنل نبیل آیا۔ وہ یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ ہزرائل ہائی نس نے آج سے چھٹے روز یعنی جمعے کے دن شام ۵ بجے ملاقات کا وقت دیا ہے اور یہ ملاقات پہلے کی طرح اس کے ذاتی محل میں ہی ہوگی۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ کرنل نبیل نے زبان سے تو کچھ نہ کہا کہ اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ اس حادثے کے پیچھے ہمارا ہاتھ ہونے کا اسے پورا یقین ہے۔ ہم سے رخصت ہونے سے کچھ قبل نبیل نے اس حادثے کے متعلق بین السطور (Between The Lines) کہا کہ سعودی عرب میں قانون سے بالا کوئی نہیں اور کسی بھی شخص کا کوئی کتنا ہی جانی یا ملکی دشمن کیوں نہ ہو، اسے قانون کو ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا ''کرنل نبیل، ہم سعودی قانون کا بے حد احترام کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی اور ملکی دشمنوں سے جو سعودی قانون کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہمیں زک پہنچانے کیلئے کوئی کارروائی کرتے ہیں تو ہم آپ کے ملکی قانون کے حرکت میں آنے سے پہلے (جو ہمیشہ واردات کے بعد ہی حرکت میں آتا ہے) اس دشمن سے خود نمٹ لیتے ہیں۔ نبیل کے جانے کے بعد میں نے کرنل مزمل، عمران، قیصر اور ماہا کو بلایا اور نبیل سے ہونے والی گفتگو کا بتایا۔ میں نے ان ساتھیوں کو اپنی سوچ بتاتے ہوئے کہا کہ ہیفل نے خود ینبع ایئرپورٹ تک ہمارا پیچھا کیا اور اپنے ذرائع سے ہمارے سامان میں مائیکرو ٹرانسمیٹر لگوا کر ہماری نقل و حرکت کو معلوم کرنا چاہا۔ ینبع سے پرواز سے قبل قیصر نے اسے زخمی کردیا تھا اگر وہ کسی کم زور حیثیت کا مالک ہوتا تو ہمارے جدہ پہنچنے کے بعد ہمارا پیچھا نہ کرتا۔ اسے یہ بھی بخوبی علم ہوگا کہ ہم سعودی آرمی کی پشت پناہی میں ینبع میں کام کررہے تھے لیکن اس نے جدہ میں

ہمیں ختم کرنے کے لیے اپنی ایجنسی کے آٹھ آدمیوں کو ہماری رہائش گاہ کا پتا چلانے اور ہمیں ہلاک کرنے کے لیے بھیجا۔ ان آٹھوں کو بھی ہم نے ختم کردیا۔ اس سے ہیفل کی انتقامی آگ مزید بھڑک اٹھی ہوگی۔ وسائل کی اس کے پاس کمی نہیں ہمیں ہلاک کرنے کی اس کی پہلی کوشش میں ناکامی کے باعث وہ خاموش نہیں بیٹھے گا بلکہ کسی نئی فول پروف پلاننگ کے ساتھ ہم پر حملہ کروائے گا۔ زخمی ہونے کے باعث وہ خود اس مشن میں شریک نہیں ہوسکتا لیکن اس کی ایجنسی کے افراد جلد یا بدیر ہم تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ اس کے ماہا کو پہچاننے کے بعد ہمارے یک لخت ینبع کو چھوڑنے کا اس نے یہی مطلب لیا ہوگا کہ ہم اس سے ڈر کر جدہ بھاگ آئے ہیں۔ اب ہمارے پاس دو ہی راستے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہم نے جدہ یا سعودی عرب میں جتنے روز بھی مزید قیام کرنا ہے، وہ تمام وقت ان اپارٹمنٹس میں چھپ کر خوف وہراس کی فضا میں گزاریں اور اس صورت میں بھی یہ بات یقینی نہیں ہے کہ ہم محفوظ رہیں گے۔ اس پوری بلڈنگ کو دھماکا خیز مادے سے بھی اڑایا جاسکتا ہے۔ ہمارے پاس دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم ینبع جاکر ہیفل اور اس کے ساتھی کو ہلاک کردیں۔ ہیفل کے وہم وگمان میں بھی یہ نہیں ہوگا کہ ہم جو اس کی سوچ کے مطابق اس سے ڈر کر ینبع سے بھاگے ہیں، واپس ینبع جاکر اس پر حملہ کرسکتے ہیں۔ ماہا نے ہمیں ینبع جانے سے منع کیا کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ اسی کے باعث ہم اس خطرے میں گھر گئے ہیں اور ینبع میں ہمیں مزید خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مزمل، عمران اور قیصر نے میری تجویز کی بھرپور حمایت کی اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ اگر صبح چار بجے ہم دو گاڑیاں لے کر ینبع کے لیے روانہ ہوں تو ساڑھے سات بجے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے اور سیدھے ہیفل کی رہائش گاہ پر جاکر پہلے اسے اور بعد میں اس کے دوسرے ساتھی کو جو ساتھ کے فلیٹ میں رہتا ہے، ختم کرکے جدہ واپس روانہ ہو جائیں گے، اس پلاننگ کے مطابق اگر سب کام خوش اسلوبی سے طے پاگئے تو دن کے بارہ بجے تک ہم آسانی سے جدہ پہنچ جائیں گے۔ ہم نے یہ بھی طے کیا کہ چوں کہ ہمارا یہ مشن ہمارے تمام ساتھیوں کی زندگیوں کے لیے ایک ضرورت بن چکا تھا اس لیے ہم نے ہر حالت میں اسے پایۂ تکمیل تک پہچانا تھا۔ ہیفل پر حملہ کرنے کے بعد اس کے بچ جانے کی صورت میں ہم سب کی موت یقینی تھی۔

ایسی صورت میں وہ اپنے پورے وسائل کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہوتا اس لیے ہم نے اپنے ساتھ ریوالور اور رائفلوں کے علاوہ بارہ دستی بم بھی لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے لیے ہیفل پر یہ حملہ زندگی اور موت کی جنگ تھی اس لیے ہم نے بھی اپنے سارے مہیا وسائل سے کام لینا تھا۔ یہ فیصلہ ہوگیا تو JCO اور رضی کو میں نے دو گاڑیوں کے پٹرول ٹینکس فل کرانے اور انجنوں کی چیکنگ کرنے کا کہا۔ ہم رات کو جلد ہی سو گئے۔ ساڑھے تین بجے صبح ماہا اور سپنا نے ہمارے لیے ''ناشتا'' تیار کیا اور ٹھیک چار بجے ہم سب کو الوداع کہتے ہوئے ینبع کے لیے روانہ ہوگئے۔ میرے ساتھ قیصر اور مزمل کے ساتھ عمران تھا۔ ہم نے آپس میں یہ بھی طے کیا تھا کہ سفر کے دوران یا ینبع پہنچ کر کسی بھی وجہ سے اگر ہم چاروں میں سے

صرف ایک ساتھی ہی ہیفل کو ختم کرنے کے قابل رہ جائے تو وہ باقی ساتھیوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر ہیفل کو ختم کرنے کی کوشش ضرور کرے۔ قارئین میری اس بات کا مقصد ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ اگر ہم میں سے تین زخمی یا ہلاک بھی ہوجائیں تو چوتھا ساتھی مشن سے بیک آؤٹ نہ کرے۔ تازہ دم رہنے کے لیے ہم ایک سو کلومیٹر سفر کے بعد ڈرائیونگ سیٹ دوسرے ساتھی کے حوالے کرتے۔ ٹھیک پونے آٹھ بجے ہماری گاڑیاں ینبع شہر کی اس سڑک پر پہنچ گئیں جس کی ایک لین میں ہیفل اور اس کا ساتھی رہتا تھا۔ سعودی عرب میں معمول کی زندگی دن کے گیارہ بجے شروع ہوتی ہے۔ صبح کے آٹھ بجے اس سڑک پر ہو کا عالم تھا اور ہیفل کے رہائشی فلیٹ کی لین میں بھی صرف مکینوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن کوئی انسان دکھائی نہ دیا۔ ہم نے اپنی گاڑیاں مین روڈ پر ہی لین کے قریب ہی پارک کیں اور اپنی قمیص پتلونوں سے باہر نکال کر پتلونوں کی بیلٹس میں ریوالور پھنسائے اور تین تین دستی بم پتلونوں کی اور قمیصوں کی جیبوں میں رکھے اور ہیفل کے فلیٹ کی طرف چل پڑے۔ یہ دونوں فلیٹ فسٹ فلور پر تھے اور ان کی سیڑھیوں پر جانے کے لیے دروازہ اندر سے بند تھا اور دروازے کے ساتھ انٹرکام لگا ہوا تھا یہ بند دروازہ اور اس کے آگے نامعلوم کتنے بند دروازے ہوں گے جن میں سے گزر کر ہم ہیفل اور پھر اس کے ساتھی تک پہنچ سکتے تھے۔ مزمل نے کہا کہ ہم بہ یک وقت ریوالوروں کے فائر کر کے یہ بند دروازہ کھول سکتے ہیں لیکن میں نے فوراً ہی اس تجویز کو رد کردیا کیوں کہ فائروں کی آواز سے نہ صرف اردگرد کے مکین چونک پڑتے بلکہ ہیفل اور اس کا ساتھی بھی اپنے تحفظ اور مقابلے کے لیے تیار ہوجاتے۔ سامنے سے پہلے فلور تک جانے کا کوئی رستہ نہ پا کر ہم چند گھر چھوڑ کر ایک تنگ گلی سے گزر کر اس بلڈنگ کی پشت پر آگئے۔ وہاں دیواروں پر ہر فلیٹ کے لیے پانی کے حصول اور اخراج کے پائپ لگے ہوئے تھے اور ہیفل کے فلیٹ کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ قیصر تو پھرتیلا اور تیز تھا اور عمران فوج میں ایس ایس جی کی سخت ٹریننگ میں ہر قسم کی رکاوٹیں عبور کرنے پر حاوی تھا، یہ دونوں بندروں کی طرح کھڑکی کے قریب والے پائپ پر تیزی سے چڑھے۔ پہلے قیصر کھڑکی کے اندر کودا اور پھر عمران، میں اور مزمل نیچے کھڑے بے چینی سے ان کا انتظار کررہے تھے۔ میں نے مزمل کو فلیٹ کے سامنے والی لین میں بھیجا کہ شاید ادھر سے وہ دروازہ کھول کر ہمارا سیڑھیوں سے چڑھنا ممکن بنا سکیں دس بارہ منٹ انتظار کے بعد جب میں مزمل کی طرف جانے اور ریوالوروں سے دروازہ کھولنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوگیا تو قیصر نے کھڑکی سے اشارہ کر کے مجھے کہا کہ فلیٹ کے سامنے کی طرف آجاؤں میں بھاگتے ہوئے وہاں پہنچا تو قیصر نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور میں اور مزمل سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قیصر کی رہنمائی میں ایک کمرے میں پہنچے، یہ بیڈروم تھا اور ہیفل اپنے پلنگ پر سر پر ایک ہاتھ رکھے نیم دراز تھا اور اس کے دوسرے بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہیفل کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اسے اپنا انجام سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بخوبی سمجھ چکا تھا کہ ہم اس سے مذاکرات کرنے نہیں آئے

ہیں۔ عمران اس کے سرھانے کھڑا تھا اور اس کے ریوالور کی نال اس کے سر کو چھو رہی تھی۔ میں نے ہیفل کو کہا ''تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ ہم یہاں کس لیے آئے ہیں۔ تمھارا ہمارے ہاتھوں مرنا تو ایک مسلمہ امر ہے لیکن یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اپنی موت کو آسان بنالو یا انتہائی تکلیف دہ۔ آسان موت کے لیے تمھیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ اپنے ساتھی کو جو تم سے جڑواں فلیٹ میں رہتا ہے، یہاں بلوا لو یا ہمیں اس دروازے کا پتا دو جو دونوں فلیٹوں کے درمیان ہے۔ ہم خود یہ دروازہ بڑی آسانی سے تلاش کرسکتے ہیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ ہوش و حواس میں اپنے جسم کی کھال اترتے دیکھو' میرے اشارے پر قیصر نے اپنا رام پوری نکالا اور ہیفل کی طرف بڑھا ''نہیں نہیں۔ ایسا نہ کرنا مجھے گولی مار کر ہلاک کردو۔ میں موساد کا جاسوس ہوں اور جب میں نے موساد میں شمولیت اختیار کی تھی اس وقت سے مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میری موت طبعی نہیں ہوگی' میرا اصل نام لیتے ہوئے ہیفل نے اپنی بات جاری رکھی ''مجھے تمھارے متعلق ایک ایک بات کا علم ہے۔ جینی بھی ہمیں چھوڑ کر تمھارے ساتھ شامل ہوگئی ہے لیکن اس کی اور تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی زندگی بھی ختم ہونے والی ہے۔ میں نے ہیڈ کوارٹرز کو کل ہی ہمارے آٹھ ایجنٹوں کی جدہ میں تمھارے ہاتھوں ہلاکت کا بتا دیا ہے میں تم سے زندگی کی بھیک نہیں مانگتا لیکن بحیثیت انسان کے اور تمھارے ہم پیشہ ہونے کے ناتے تم سے صرف یہ التجا کرتا ہوں کہ مجھے آسان موت دو۔ مرتے وقت میں اپنے وطن اور اپنی قوم سے غداری نہیں کرسکتا اس لیے یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم میرے ساتھی ایجنٹ تک یقیناً پہنچ جاؤ گے میں تمھیں درمیانی دروازے کا نہیں بتاؤں گا'' یہ کہہ کر ہیفل نے آنکھیں بند کرلیں اور آہستہ آواز میں اپنے مذہبی دعائیہ کلمات پڑھنے لگا، ہیفل کو ہم نے زندہ تو ہرگز نہیں چھوڑنا تھا لیکن میں اس کی وطن پرستی اور اپنی قوم سے وفاداری سے بڑا متاثر ہوا کاش میرے ہم وطن اور ہم قوموں میں ہیفل جیسی وطن اور قوم پرستی ہی ہوتی تو ہم آج دنیا کے سامنے یوں شرمسار نہ بیٹھے ہوتے۔

☆☆

ہیفل سے اب مزید کچھ اگلوانے کی توقع رکھنا بے کار تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم اسے چند لمحوں میں ہلاک کردیں گے، اس نے اپنے وطن اور قوم کے لیے جس جذبے کا اظہار کیا تھا اس سے ہم سب خاصے متاثر ہوئے تھے ہیفل منہ ہی منہ میں دعائیہ کلمات دہرا رہا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ ہمارے پاس اسے ختم کرنے کے لیے ریوالور اور قیصر کا رام پوری چاقو تھا۔ ریوالور چلنے کی آواز سے نہ صرف اڑوس پڑوس والے چونک پڑتے بلکہ اس کا ساتھی بھی ہوشیار ہوجاتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ قیصر کو ہی اسے ختم کرنے کا کہوں۔ یکایک ہیفل نے آنکھیں کھولیں اور بولا ''میں مرنے سے پہلے اپنی آخرت کی بھلائی کے لیے تسبیح پڑھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم لوگ مجھے اس کی اجازت دو گے'' ہیفل بیڈ پر نیم دراز تھا اس کا بایاں بازو زخمی تھا میں نے اسے تسبیح پڑھنے کی اجازت دے دی اس

نے تسبیح اٹھانے کے لیے دایاں بازو سر سے اٹھا کر بائیں جانب بیڈ کے ساتھ جڑے سائیڈ ٹیبل پر رکھی تسبیح اٹھانے کے بجائے اپنا ہاتھ تکیے کی طرف بڑھایا۔ میں جو اس کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا، اس کی چالاکی کو فوراً سمجھ گیا اور عقاب کی طرح جھپٹ کر اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ تکیے کے نیچے جائے، اسے دوسری جانب دھکیل کر تکیے کے نیچے سے پسٹل اٹھالیا۔ یہ وبیلے اینڈ اسکاٹ کا ۳۲ بور کا پسٹل تھا اور اس کی نال کے ساتھ سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ میرے ساتھی ابھی سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ میں نے ہیفل کے سینے پر اسی کے پسٹل کی دو گولیاں داغ دیں۔ گولیاں یقیناً اس کے دل پر لگی تھیں۔ اس کا جسم صرف ایک بار بیڈ پر اچھلا اور وہ ختم ہوگیا۔ ہیفل نے ہماری مشکل خود ہی آسان کردی تھی۔ اس نے تو آخری وقت بھی اپنی چالاکی سے آخری عبادت کرنے کا جھانسا دے کر ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اللہ نے ہماری مدد کی اور ہم اس کے وار سے بچ گئے۔ سائیلنسر لگے پسٹل سے گولیاں چلنے سے ٹھس ٹھس کی بہت ہلکی آواز نکلی۔ یہ یقین کرنے کے بعد کہ وہ ختم ہوچکا ہے، مزمل نے اس کے بے جان جسم پر چادر ڈال دی لیکن اس سے پہلے اس کی مخصوص انگوٹھی اتار لی۔ بیڈ روم اور دوسرے کمروں کی تلاشی لینے پر ہمیں کئی ڈائریاں موساد کا کارڈ تین عدد ہینڈ گرینڈز، ۶ آٹومیٹک رائفلیں، ۸ پسٹل اور سیکڑوں کی تعداد میں گولیاں ملیں۔ ٹرانسمیٹر ہمیں کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ ٹرانسمیٹر یقیناً اسی فلیٹ میں کہیں چھپا کر رکھا گیا ہے ہم اسے بعد میں تلاش کریں گے پہلے ساتھ والے فلیٹ میں ہیفل کے ساتھی سے نمٹ لیں اس فلیٹ کے چاروں کمروں میں کوئی ایسا دروازہ نہ تھا جو دوسرے فلیٹ کے لیے ہو۔ سارے کمروں کو اچھی طرح دیکھ کر ہم دوبارہ ہیفل کے بیڈ روم میں آگئے۔ اس بیڈ روم کے اٹیچ باتھ روم کی ایک دیوار دوسری دیواروں سے کچھ مختلف محسوس ہوئی۔ وہ دیوار جہاں دوسری دیوار سے ملتی تھی وہاں صابن وغیرہ رکھنے کے لیے دیوار کے اندر ایک طاقچہ تھا جس میں شیمپو وغیرہ پڑے تھے۔ میں نے اس طاقچے کو خالی کیا تو دیوار سے جڑا ہوا ایک کنڈا دکھائی دیا۔ میں نے کنڈے کو اندر کی طرف دبایا تو ٹائیل لگی دیوار سلائیڈنگ دروازے کی طرح اس دیوار کے بقیہ حصے کے اندر چلی گئی اور چھوٹے دروازے جتنا خلا بن گیا۔ ہم ایک ایک کر کے اس خلا میں سے گزرتے ہوئے دوسرے فلیٹ میں داخل ہوئے اور دبے پاؤں چلتے ہوئے دو کمروں کو چھوڑ کر جب تیسرے کمرے میں داخل ہونے لگے تو عمران جو سب سے آگے تھا، دائیں جانب بنے کچن میں بھاگ کر داخل ہوا۔ وہاں ایک تقریباً برہنہ جوان تھائی یا فلپائنی لڑکی ناشتا بنارہی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس لڑکی کی چیخ نکلے، عمران نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسی طرح اسے اٹھائے ہوئے کچن سے باہر ہمارے پاس لے آیا۔ عمران نے ایک ہاتھ سے لڑکی کو اٹھا رکھا تھا اور اس کا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر اسے چیخنے سے روکے ہوئے تھا۔ لڑکی خود کو چھڑوانے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی قیصر نے اپنا چاقو نکال کر اس کی گردن پر رکھا اور اشارے سے اسے کہا کہ اگر اس نے اب

ذرا بھی حرکت کی یا منھ سے آواز نکالی تو چاقو سے اس کا گلا کاٹ دیا جائے گا۔ گردن پر چاقو کی تیز دھار محسوس ہوئی تو لڑکی نے سر ہلاتے ہوئے ہاں کہا اور عمران نے اسے فرش پر کھڑا کردیا اب قیصر اس کے منھ پر ہاتھ اور گردن پر چاقو رکھے اسے دھکیلتے ہوئے بیڈ روم کی طرف چل پڑا۔ عمران اور مزمل نے اپنے ریوالور اور میں نے ہیفل کا پسٹل ہاتھ میں پکڑے بیڈ روم کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ وہاں بیڈ پر ایک آدمی کروٹ کے بل سویا ہوا تھا۔ میں نے اس کی کمر پر ہاتھ سے ٹھوکا دیا تو اس نے آنکھیں بند کیے ہوئے کہا ''ڈارلنگ میں کچھ دیر اور نیند لوں گا۔ تم ناشتا بناؤ'' میں نے سن کر پسٹل کی نال اس کے گال پر رکھی اور کہا ''ناشتا بعد میں کرلینا، پہلے ہماری بات سنو' مردانہ آواز سنتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس نے کوئی شے بھی پہن نہ رکھی تھی اور چادر سے جسم ڈھانپا ہوا تھا۔ ہم تینوں اپنے اسلحے سے اسے کور کیے ہوئے تھے اور لڑکی کی گردن سے قیصر کا چاقو لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ بالکل خاموش رہے اور اپنے ہاتھ سر پر رکھ لے۔ اس نے فوراً ہی اپنے ہاتھ اوپر کیے ہمارے پاس پوچھ تاچھ کا وقت تو تھا نہیں لہٰذا اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہی میں نے پسٹل کی دو گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔ گولیاں لگتے ہی اس نے چیخ ماری اور بستر پر گر گیا۔ ہم اس لڑکی کو بھی زندہ چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ میں نے قیصر کو کہا کہ اسے دھکا دے کر بستر پر گرادے۔ لڑکی کو اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا، بستر پر گرتے ہوئے وہ بولی ''مجھے مت مارنا، میں تو اسپتال میں کام کرتی ہوں'' یہ الفاظ ابھی وہ پوری طرح سے ادا بھی نہ کرسکی تھی کہ میں نے اسے بھی دو گولیاں مار کر ٹھنڈا کردیا، اس شخص کے تکیے کے نیچے سے بھی ایک سائیلنسر والا پسٹل نکالا اور جب ہم نے اس کے فلیٹ کی تلاشی لی تو ایک کپڑوں کی الماری کھولنے پر اس کے اندر فٹ کیا ہوا بڑا ٹرانسمیٹر ملا۔ اس ٹرانسمیٹر کو ہم نے کچن میں پڑے دو رولرز کے ساتھ توڑ کر ناکارہ کردیا، اس کے سامان میں بھی ڈھیر سارے کاغذات، خفیہ تحریر لکھنے کے کیمیکلز، تین رائفلیں، ۵ ریوالور اور ڈھیروں گولیاں ملیں۔ ساتھیوں کی مدد سے میں نے تین سوٹ کیسوں میں دونوں فلیٹوں سے ملنے والا اسلحہ اور چوتھے سوٹ کیس میں ان دونوں کے فلیٹوں سے ملنے والے کاغذات، ڈائریاں اور ان کے امریکن پاسپورٹ اور اقامے اور ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ رکھے۔ ہمارا کام پورا ہو چکا تھا۔ ایک ایک سوٹ کیس اٹھائے ہم سیڑھیوں کے راستے نیچے لین میں آئے، لین میں اس وقت اکا دکا لوگ دکھائی دیے جو اپنی گاڑیاں صاف کررہے تھے، اپنے چہروں کو ہر ممکن حد تک چھپاتے ہوئے ہم مین روڈ پر اپنی گاڑیوں تک پہنچے اور چاروں سوٹ کیس دونوں گاڑیوں کی ڈگیوں میں رکھ کر جدہ کے لیے روانہ ہوگئے۔

زیر تعمیر انڈسٹریل ایریا سے گزرنے کے بعد ایک پولیس چیک پوسٹ آئی، وہاں گاڑیوں کی رفتار کم کر کے اور ایمرجنسی لائٹس جلا کر گزرنا پڑتا ہے۔ وہیں پر ایک چھوٹی کینٹین بھی ہے، ہم نے دور سے دیکھا کہ اس چیک پوسٹ پر معمول کے خلاف پولیس والے ہر گاڑی کو روک کر کاغذات وغیرہ دیکھ رہے ہیں میں اگلی گاڑی ڈرائیو کررہا تھا، بجائے چیک پوسٹ پر جانے کے میں نے اپنی گاڑی چیک

پوسٹ سے ملحقہ کینٹین پر روکی اور قیصر اور میں گاڑی سے باہر نکل کر کینٹین کی طرف بڑھے، عمران اور مزمل بھی اپنی گاڑی ہماری گاڑی کے پیچھے روک کر کینٹین میں آگئے، وہاں پر ہم نے کولڈ ڈرنکس اور ڈبل روٹی اور مکھن سے ناشتا کیا۔ یہ سب میں نے چیک پوسٹ پر کھڑے پولیس والوں پر نفسیاتی اثر ڈالنے کے لیے کیا تھا۔ پولیس والے ہمیں دیکھ رہے تھے، آدھ گھنٹے بعد ہم کینٹین سے باہر نکلے اور گاڑیاں اسٹارٹ کر کے چیک پوسٹ کے بیریر پر بجائے گاڑیاں دھیمی کرنے کے رک گئے، کینٹین پر سگریٹ نہیں تھے، میں نے گاڑی سے باہر نکل کر ان میں سے سینئر پولیس والے سے کہا ''دخان (سگریٹ) کینٹین میں بھی نہیں ہیں اور مجھے بہت طلب ہورہی ہے۔ کیا وہ ایک سگریٹ مجھے دے سکتا ہے'' میں نے یہ ساری بات انگریزی میں عربی کے دو تین الفاظ شامل کر کے کہی تھی۔ اس پولیس والے نے اپنے سگریٹ کی ڈبیا میں سے دو سگریٹ مجھے دیتے ہوئے کہا کہ کہاں جارہے ہو۔ میں نے کہا جدہ تو وہ کہنے لگا یہاں سے تقریباً ۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر دو تین دکانیں ہیں جو تمھارے وہاں پہنچنے تک کھل جائیں گی وہاں سے تمھیں سگریٹ مل سکتے ہیں۔ میں نے انھیں شکریہ کہا اور پولیس والے سے ہاتھ ملایا اور گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا اس پولیس والے نے ہاتھ کے اشارے سے بیریر پر کھڑے پولیس والے کو کہا کہ ہمیں جانے دے اور ہم بغیر چیکنگ اور کاغذات دکھانے کے چیک پوسٹ سے گزر آئے۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہم جدہ پہنچ گئے، ہمارے ساتھی بڑی بے چینی سے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے انھیں آج کی ساری کارروائی بتائی۔ ماہا ہمارے لیے سب سے زیادہ پریشان تھی یہ سن کر کہ ہیفل اور اس کے ساتھی کو ہم نے جہنم واصل کردیا ہے، خوشی اور اطمینان سے اس کے چہرے پر چھائی مردنی ختم ہوگئی اور وہ تازہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔ میں نے سائیلنسر والا ایک پستول اسے دیا، میں نے جان بوجھ کر اسے یہ نہیں بتایا کہ ہیفل نے مرنے سے پہلے ہمیں کہا تھا کہ موساد کے ہیڈ کوارٹرز میں اس نے وائرلیس پر پیغام بھیج دیا تھا کہ آٹھ اسرائیلی ایجنٹوں کو ہم نے جدہ میں ہلاک کردیا ہے ماہا موساد کے لمبے ہاتھوں سے بخوبی واقف تھی اور یہ بات جاننے کے بعد اس کا خوف اور بے چینی مزید بڑھ جاتی۔ اپنے طور پر میں نے ساتھیوں کو کہا کہ اب ہمیں بے حد محتاط رہنا ہوگا۔ ہر ساتھی اپنے پاس ہر وقت لوڈڈ اسلحہ رکھے اور کوئی ساتھی بھی باہر اکیلا ہرگز نہ جائے، اب جدہ میں ہم ہزرائل ہائی نس سے ملاقات کے انتظار میں تھے، پروگرام کے مطابق اس ملاقات کے بعد ہمیں ایران جانے کے لیے پہلے کراچی اور پھر وہاں سے ایران ایئر کے جہاز پر تہران جانا تھا۔ ہیفل سے بہت مختصر گفتگو کے دوران مجھے اسرائیلیوں کی حب الوطنی، اپنے مشن سے مکمل لگاؤ کے علاوہ ان کی چالاکی دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک کہاوت ہے کہ ایک یہودی نے اپنے چار سالہ بیٹے کو ایک اونچی دیوار پر بیٹھا کر اسے کہا کہ وہ نیچے کودے اور وہ اسے اپنے بازوؤں سے تھام لے گا۔ بیٹا دیوار سے کودنے میں جھجکتا رہا لیکن باپ کے بے حد یقین دلانے کے بعد کہ وہ اسے تھام لے گا اور اسے کوئی چوٹ نہیں پہنچے گی، بیٹا بالآخر دل کڑا

کر کے دیوار سے کود پڑا۔ باپ نے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ پیچھے کر لیے اور زمین پر گرنے سے بیٹے کو خاصی چوٹیں آئیں۔ روتے ہوئے بیٹے نے پوچھا کہ اس نے وعدہ کرنے اور اتنا یقین دلانے کے باوجود ہاتھ پیچھے کیوں کر لیے اور اسے تھاما کیوں نہیں تو باپ نے جواب دیا کہ صرف یہ سمجھانے کے لیے کہ اگر یہودی باپ بھی کوئی وعدہ کرے اور کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائے، اس کی بات پر ہرگز یقین نہ کرنا۔ ہیفل نے بھی آخری دعا کے بہانے ہم سے مہلت لی اور ہماری نرمی اور اس کی بات ماننے کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا، اگر ہم سے چند سیکنڈ کی بھی چوک ہو جاتی تو اس کے بجائے ہماری لاشیں وہاں ہوتیں، آج ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے یہودی اور یہودی نواز کارندے جس طرح سے ہمیں قرض دے کر بہلا رہے ہیں، مجھے اس کا انجام انتہائی بھیانک دکھائی دے رہا ہے۔ شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے Merchant of Venice (وینس کا سوداگر) میں یہودی ساہوکار شائی لاک انٹونیو کو روپیہ قرض دیتے وقت یہ شرط لکھواتا ہے کہ بروقت قرض کی رقم ادا نہ کرنے پر وہ انٹونیو کے جسم سے جہاں سے چاہے گا، ایک پاؤنڈ گوشت کاٹ لے گا، اب پاکستان کے پاس قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ بے نظیر اور نواز شریف کا ایک ایک پاؤنڈ گوشت ان دونوں یہودی اداروں کی نذر کر سکے۔

☆☆

ینبع سے جدہ واپس پہنچ کر ہم نے دن کا بقیہ حصہ اور رات کو آرام کرنے میں گزاری اور دوسرے روز صبح ہیفل اور اس کے ساتھی کے فلیٹوں سے ملنے والے کاغذات اور ڈائریاں دیکھنی شروع کیں۔ مزمل، عمران اور ماہا میرے ساتھ اس کام میں شریک تھے۔ ماہا ایک ڈائری کو جس میں الٹے سیدھے لفظ اور ہندسے لکھے ہوئے تھے، دیکھتے کے ساتھ ہی بولی "یہ ڈائری تو ایک خزانے سے کم نہیں۔ اس میں موساد کا رائج اور ایک اسٹینڈ بائی کوڈ اور ڈی کوڈنگ درج ہیں۔ لیکن یہ صرف مڈل ایسٹ کے لیے ہے۔ پاکستان اور اس کے مشرقی ممالک میں ایک دوسرا کوڈ استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے جو کوڈ اور ڈی کوڈنگ کی کتاب آپ کو دی تھی وہ پاکستان اور دوسرے مشرقی ممالک کے لیے ہے۔ جب تک موساد کو یہ علم نہ ہو جائے کہ ہیفل کی ہلاکت کے ساتھ یہ ڈائری بھی غائب ہو چکی ہے وہ اسی کوڈ کو استعمال کرتے رہیں گے۔ اس ڈائری میں اسٹینڈ بائی کوڈ بھی درج ہے اس لیے جب موساد کے ہیڈکوارٹرز کو اس کے گم ہونے کی اطلاع ملے گی تو موساد کے تمام ایجنٹوں کو جو مڈل ایسٹ کے ممالک میں کام کرتے ہیں، نئی کوڈ اور ڈی کوڈ کی کتاب پہنچانے میں کم از کم ایک مہینہ تو ضرور لگ جائے گا۔ اور اس وقت تک تمام ایجنٹوں کا ہیڈکوارٹرز سے مواصلاتی رابطہ منقطع ہونے کی وجہ سے انھیں نہ تو نئی اطلاعات مل سکیں گی اور نہ ہی ہیڈ کوارٹر اپنے ایجنٹوں کو نئی ہدایات دے سکے گا" سیدھی سادی انگلش میں لکھے کاغذات مزمل، میں اور عمران پڑھ رہے تھے اور عربی زبان اور کوڈ میں لکھے کاغذات کو ماہا دیکھ رہی تھی ایسے ہی ایک کوڈ کاغذ کو ڈی کوڈ کر کے ماہا نے جب پڑھا تو اس کے منہ سے "اوہو" نکلا۔ میرے

پوچھنے پر ماہا نے اس کاغذ کو چھپاتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں" میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی ایسی بات ہے جسے ماہا ہم سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔ میں نے ماہا کو سمجھاتے ہوئے کہا "دیکھو ماہا، تم ہماری ٹیم کی ایک سینئر ممبر ہو اور ہم سب کو تم پر اتنا ہی بھروسا اور اعتماد ہے جتنا خود اپنے پر۔ مجھے یقین ہے کہ تم جو کچھ چھپا رہی ہو اپنے خیال میں ہمارے بھلے کے لیے ہی کر رہی ہو لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم سے اس بات کو پوشیدہ رکھ کر تم خود کو اور ہم سب کو آنے والے کسی ممکن خطرے سے بے خبر رکھ کر غیر دانستہ طور پر ہمارے اور اپنے لیے ان دیکھی مشکلات کھڑی کر دو۔ اس لیے تم جو کچھ بھی چھپا رہی ہو وہ ہمیں بتا کر خود کو اور ہمیں الجھن سے نکال دو"۔ ماہا نے میری بات سن کر ایک کاغذ مجھے دیا جسے اس نے ڈی کوڈ کیا تھا۔ یہ موساد کے ہیڈ کوارٹر سے ہیفل کے لیے آیا ہوا پیغام تھا مختصر اور صرف دو فقروں میں۔ "جینی اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کر دو۔ جینی یہاں سے کسی صورت زندہ بچ کر نہ جانے پائے" میں نے دو تین بار انگریزی میں لکھے یہ فقرے پڑھے اور کاغذ مزمل کو تھما دیا۔ مزمل سے یہ کاغذ عمران نے لے کر پڑھا اور خاموشی سے مجھے واپس کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ساتھی حوصلہ چھوڑ رہے ہیں۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑا اور عمران کو کہا کہ تمام ساتھیوں کو یہاں بلا لائے۔ چند منٹوں میں ہی سارے ساتھی اس ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے تو میں نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کل ہم ینبع میں ہیفل اور اس کے ساتھی کو ہلاک کر کے اور اس کے ٹرانسمیٹر کو تباہ کر کے ان کی ساری ڈائریاں، کاغذات اور ڈھیر سارا اسلحہ لے کر بخیریت پہنچ گئے ہیں۔ ان میں سے اس کاغذ پر موساد کے ہیڈ کوارٹر کے لیے پیغام ہے کہ ہم سب کو یہاں پر ہلاک کر دیا جائے اور جینی کسی صورت زندہ بچ کر واپس نہ جا سکے۔ میں آپ سب سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا یہ پہلی بار ہوا ہے کہ ہمیں ہلاک کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ کیا آج سے پہلے درجنوں بار ایسے مواقع نہیں آئے جب ہمارے دشمنوں نے ہمیں ختم کرنے کی کوشش کی۔ کیا ہم نے آج تک ایک بار بھی دشمن سے پیٹھ موڑ کر اور بھاگ کر اپنی جانیں بچائی ہیں یا ہمیشہ ہم نے خود خطروں میں کود کر دشمنوں کا صفایا کیا ہے۔ کیا یہ کاغذ کا چیتھڑا زیادہ اہم ہے یا اللہ پاک کا کلام جس میں صاف کہا گیا ہے کہ زندگی اور موت اللہ پاک کی رضا اور مقررہ وقت پر ہی ہوتی ہے۔ کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول ہم نہیں جانتے کہ موت تمھاری زندگی کی محافظ ہے۔ یعنی موت کا جو وقت مقرر ہے اس سے قبل کوئی شخص اگر ایسے حالات میں گھر جائے کہ اسے موت دکھائی دینے لگے تو موت خود اس کی زندگی بچاتی ہے کیوں کہ ابھی اس شخص کی موت کا حقیقی وقت آیا نہیں ہوتا۔ موساد اور اس کے کرتا دھرتا کیا جن ہیں یا صرف ہمارے جیسے انسان۔ آپ خود جانتے ہیں کہ صرف سعودی عرب میں ہم نے موساد کے کتنے ایجنٹوں کو ہلاک کیا ہے اور وہ ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکی۔ ان تمام حقائق کے باوجود اگر آپ میں سے کوئی یا سبھی واپس جانا چاہتے ہیں تو شوق سے جا سکتے ہیں۔ میں نے آپ کی مدد اور ایما پر جن مشنوں کا آغاز کیا ہے۔ میری نگاہ میں وہ جہاد ہے اور جہاد کے لیے کسی سے زبردستی نہیں

کی جاسکتی۔ آپ شوق سے واپس چلے جائیں۔ میں اکیلا ان دشمنوں سے نمٹوں گا اور آپ دیکھیں گے کہ میں کامیاب وکامران واپس لوٹوں گا''۔ میری یہ جذباتی مختصر سی تقریر سارے ساتھیوں نے سنی۔ سب سے پہلے ماہا، پھر قیصر، مزمل، عمران، عبداللہ تھائی، سپنا، JCO منصف، رضی، اکرم اور دین محمد غرضے کہ سارے ساتھیوں نے ایک ایک کرکے مجھے یقین دلایا کہ وہ ہرگز ہرگز اس مشن سے دست بردار نہیں ہوں گے۔ قیصر نے بڑی اچھی بات کہی کہ زندہ رہے تو غازی کہلائیں گے اور مر گئے تو شہید جن کے اعلیٰ درجے اور ابدی زندگی کی اللہ پاک نے ضمانت دی ہے۔

بات تو ایک ہی ہے جسے بار بار مختلف زاویوں سے دیکھتا ہوں اور جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اسے قارئین تک پہنچانے کی اس لیے کوشش کرتا ہوں کہ شاید تیرے دل میں اتر جائے میری بات۔ مجھے ذاتی طور پر نہ تو کبھی بے نظیر بھٹو، الطاف حسین اور نواز شریف سے کوئی نقصان پہنچا ہے اور نہ ہی میری آنکھیں ان ''معتبر اور فرشتہ سیرت شریف ہستیوں'' کو دیکھنے کی کبھی گنہگار ہوئی ہیں۔ میں اپنے ایک گناہ کا اقرار کرتا ہوں اور اس گناہ پر مجھے شرمندگی نہیں بلکہ فخر ہے میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں ''پاکستان سے محبت کرنے والوں سے مجھے پیار ہے اور اس کے دشمنوں کے لیے میں قہر، عذاب اور موت کا پیغام ہوں۔ میں کوئی فلمی ڈائیلاگ نہیں لکھ رہا بلکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ میرے خون کی ایک ایک بوند میں پاکستان کی محبت اور اس کی سوندھی مٹی کی خوش بو رچی بسی ہے اور اس خوش بو میں کسی قسم کی بدبو اور غلاظت کو میں برداشت نہیں کرسکتا۔ ایک اور بات جس پر مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے وہ اپنے ہم قوموں کی سادگی اور اس سادگی سے فائدہ اٹھانے والے یہ لومڑی کی خصلت والے لیڈر ہیں۔ شاید میرے ہم وطنوں کی یادداشت بھی بہت کم زور ہے اور وہ سقوط ڈھاکا کی ذلت، ذوالفقار علی بھٹو کا بھارت سے ہزار سال تک جنگ کرنے کا عہد اور روٹی، کپڑا اور مکان دینے کا وعدہ بھی بھول چکے ہیں۔ بے نظیر بھٹو کی لن ترانیاں اور راجیو گاندھی کے اسلام آباد آنے پر راولپنڈی اور اسلام آباد میں کشمیر نام کے ہر بورڈ، نشان حتیٰ کہ شاہراہ کشمیر کے روڈ سائن کو کپڑوں اور بوریوں سے ڈھانپ دینے اور سکھ حریت پسندوں کی لسٹ راجیو گاندھی کو تحفتاً دینے کے واقعے کو بھی بھول چکے ہیں۔ آصف زرداری کے مسٹر ٹین پرسنٹ سے ہنڈرڈ پرسنٹ بننے اور سرے محل اور اربوں کی جائیداد اور غیر ملکی کرنسی سے سوئیٹزرلینڈ کے بینکوں کو بھرنے کا واقعہ بھی فراموش کرچکے ہیں۔ نواز شریف کی قرض اتارو اور ملک سنوارو (یعنی مجھے سنوارو) اور غیر ملکی امداد لینے والے کشکول توڑنے کی بات بھی ان کے ذہنوں سے محو ہوچکی ہے۔ رائے ونڈ کے محلات اور مغربی ممالک میں جائیدادیں خریدنے اور چارٹرڈ جہازوں سے ڈالر اور پاؤنڈ بیرون ملک بینکوں میں اپنے اکاؤنٹس میں جمع کروانے کی باتیں بھی انھیں یاد نہیں رہیں۔ یقیناً یہی وجہ ہے کہ نواز شریف قید کی سزا بھگتنے والا مجرم ہونے کے باوجود دوسرے مقدمات میں عدالت میں پیش ہونے کے دوران اخباری نمائندوں کے ذریعے پاکستانیوں کو پیغام دیتا ہے کہ تاجر حضرات حکومت کو ٹیکس ادا نہ

کریں کیوں کہ یہ حکومت ٹیکس لینے کی مجاز نہیں۔ کیوں کہ نواز شریف بخوبی جانتا ہے کہ اس بھولی بھالی قوم کو بے وقوف بنانا کوئی مشکل نہیں۔ میں اخباری نمائندوں سے بھی ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ ہر سزا یافتہ مجرم اور قید بھگتنے والے کے بیان اور انٹرویو لیتے اور اپنے اخبارات میں شائع کرواتے ہیں۔ جب پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے اس وقت بدقسمتی سے نواز شریف وزیراعظم تھا۔ جس نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور دوسرے سائنس دانوں کی دن رات کی برسوں کی محنت اور لگن سے ایٹمی دھماکوں کی کامیابی کا سہرا بھی اپنے سر باندھ کر ان سائنس دانوں کو پس پردہ کردیا۔ اس وقت تو بیگم کلثوم نواز نے جو ملک کی خاتونِ اول تھی، چاغی کی طرف ایک قدم بھی نہ رکھا اور اب جب ان کے شوہر نامدار جیل میں اپنے کرتوتوں کی سزا بھگت رہے ہیں تو پاکستان کا جھنڈا چاغی کے پہاڑوں (یا ان کے ماڈلوں) کے سامنے لہرا کر اور اخباروں میں فوٹو شائع کروا کر شاید یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ پاکستان کی بقا صرف ان کے شوہر کی رہائی میں ہے۔ ادھر بے نظیر صاحبہ کا یہ بیان بار بار شائع ہو رہا ہے کہ میں جنرل پرویز مشرف کے ٹیلی فون کے انتظار میں ہوں۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر وہ واپس پاکستان نہ آئیں تو خدانخواستہ پاکستان ختم ہوجائے گا اور یا شاید ۱۴ کروڑ پاکستانیوں میں ان جیسا قابل اور کوئی نہیں جو ملک کو سنبھال سکے۔ الطاف حسین لندن میں اپنی بانسری بجارہا ہے اور بزعمِ خود یہ سمجھتا اور پاکستانیوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کررہا ہے کہ پاکستان سے علیحدگی اور جناح پور نام کی آزاد ریاست بننے میں ہی اس ریجن کے لوگوں کی بقا ہے انھی لیڈروں کی شہ اور لیڈروں کے ہاتھوں بکے ہوئے اخبارات کی بدولت تاجر حضرات بلاوجہ ہڑتال کو طول دے رہے ہیں۔ یقین جانیے پاکستان کی حکومت فوجی ہو یا سیاسی، جنرل سیلز ٹیکس (GST) لازمی دینا پڑے گا۔ یہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے لیے ہوئے قرضوں کی وجہ ہے کہ پاکستان کو ان دونوں یہودی اداروں کی خواہش کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑ رہے ہیں۔ میں آپ سب سے صرف ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کیا ان اداروں سے یہ قرضے جنرل پرویز مشرف نے لیے تھے یا بے نظیر اور نواز شریف کی دو دو بار حکومتوں کے دوران لیے گئے۔ ان دونوں کی ملکی خزانے کی لوٹ کھسوٹ اور قرضوں کی رقم اپنے ذاتی اکاؤنٹس میں جمع کروانے کی وجہ سے ہی آج ہماری یہ حالت ہے کہ ہمارے بجٹ کا ۵۰ فی صد سے زائد صرف ان قرضوں کی سود کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے۔ ان قرضوں سے ترقی اگر ہوئی ہے تو صرف بے نظیر اور نواز شریف کی فیملی کی ہوئی ہے۔ باقی قوم تو پہلے بھی مہنگائی کی چکی میں پس رہی تھی اور اب بھی پس رہی ہے۔ پاکستانی عوام تو مہنگائی کے اس طوفان کو برداشت کرجائیں گے۔ نیندیں تو ان لیڈروں اوران کے حواریوں اور بیوروکریسی کی اڑی ہوئی ہیں جس کے حلوے مانڈے کھانے کے دن ختم ہوچکے ہیں اور انھیں مال بنانے کے ذرائع نظر نہیں آتے۔ یہی لوگ ہڑتالوں پر تاجر حضرات کو اکساتے ہیں لیکن یقین جانیے ان ہڑتالوں سے عوام کی مشکلات ضرور بڑھ جائیں گی لیکن وہ مر نہیں جائیں گے۔ موت تو ان تاجروں کی ہوگی جن پر عوام اعتبار کرتے ہیں اور

اس ہڑتال سے اب سب کو پتا چل گیا ہے کہ پاکستان کے وسائل اور دولت کو لوٹنے میں وہ بھی برابر کے شریک تھے اور ہیں۔

☆☆

اپنے طور پر میں نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے تمام احتیاطی تدبیریں کرلیں۔ JCO منصف، اکرم اور دین سپاہیوں اور رضی کی میں نے چھ چھ گھنٹے کی ڈیوٹی لگائی کہ اپارٹمنٹس کے باہر گشت کریں اور اگر کسی بھی مشکوک شخص یا گاڑی کو دیکھیں تو فوری طور پر اس کا میک، نمبر اور رنگ نوٹ کریں اور مجھے بتائیں۔ کوئی مشکوک شخص اگر اپارٹمنٹس کے قریب دکھائی دے تو اسے سختی سے وہاں سے بھگادیں اس کے علاوہ میں نے کرنل نبیل سے فون پر رابطہ کرکے کہا کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موساد کے ایجنٹ ہمارے پیچھے پڑگئے ہیں اس لیے وہ پولیس چیف یا ڈپٹی کمانڈر انچیف کے ذریعے چار باوردی جوانوں کی گارڈ ہمارے اپارٹمنٹس کے لیے مقرر کروادے۔ میں نے نبیل کو کہا کہ ہم اپنی حفاظت خود بھی کرسکتے ہیں لیکن اگر ہمارے ہاتھوں موساد کے کچھ ایجنٹ مارے گئے تو پھر وہ ہمیں سعودی قانون کی بالادستی کا حوالہ نہ دے۔ نبیل نے میری بات کے جواب میں کہا کہ آج شام کو وہ خود ہم سے ملنے آئے گا اور باقی باتیں زبانی ہوں گی۔ شام کو نبیل کے آنے پر جب رسمی علیک سلیک اور گفتگو کے بعد چائے پینے کے دوران میں نے نبیل کو پھر حفاظتی گارڈ مہیا کرنے کا کہا تو نبیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "آپ لوگوں کو حفاظتی گارڈ کی کیا ضرورت ہے آپ تو خود آگے بڑھ کر ان لوگوں کو ختم کررہے ہیں جن سے آپ کو خطرہ محسوس ہوتا ہے"۔ "کرنل نبیل، ہم اپنے ذاتی دشمنوں کو ختم نہیں کرتے بلکہ صرف ان سے دو دو ہاتھ کرتے ہیں جو سعودی عرب میں جاسوسی کے رنگ (RING) بنا کر پاکستان اور سعودی عرب کے مفادات کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں" میرا جواب سن کر نبیل بولا "بالکل ٹھیک کہا آپ نے اور ینبع میں دو فلسطینیوں اور ایک فلپائنی لڑکی کو ہلاک کرنے کی وجہ بھی شاید یہی تھی"۔ "ہر جاسوس کا آخر کار یہی انجام ہوتا ہے ہم تو اس غلاظت کو صاف کررہے ہیں جو موساد کے ایجنٹوں نے سعودی عرب میں پھیلا رکھی ہے اور جس کی بدبو آپ تک نہیں پہنچتی۔ ینبع کے دو فلیٹوں میں جن دو فلسطینی لبادہ اوڑھے اسرائیلی اور ایک غیر ملکی لڑکی کا جو انجام ہوا ہے اس سے تو آپ باخبر ہیں لیکن جو ٹرانسمیٹر بے کار کردیا گیا تھا اس کا آپ نے کوئی ذکر نہیں کیا" نبیل نے لاجواب ہو کر کہا "آپ کے لیے ایئرفورس کی گارڈ کا انتظام کردیا گیا ہے اور آج شام سے ۲۴ گھنٹے ایئرفورس پولیس کے چار نوجوانوں کی گارڈ یہاں تعینات رہے گی اور میں آپ سے یہ امید بھی رکھتا ہوں کہ آپ بھی جتنا وقت سعودی عرب میں ہیں آرام اور سکون سے گزاریں گے اور ہزرائل ہائی نس سے ملاقات کے بعد جلد از جلد سعودی عربیہ سے چلے جائیں گے۔ اس گارڈ کو آپ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے لہٰذا آپ اور آپ کے ساتھی اپنے اپارٹمنٹس سے جب بھی باہر جائیں گے اس گارڈ کے جوان اپنی گاڑیوں میں آپ کی حفاظت

کے لیے آپ کے پیچھے جائیں گے"۔ نبیل کی یہ بات سن کر میں نے کرخت لہجے میں کہا "کرنل نبیل! ہماری حفاظت کا عذر رکھ کر آپ ہماری نقل و حرکت کو نوٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس طرح کی حفاظت گارڈ کی ہرگز ضرورت نہیں ہمارے علم میں یا لاعلمی میں اگر اس طرح کا کوئی انتظام کیا گیا تو میں ہزرائل ہائی نس سے اس کے خلاف نہ صرف احتجاج کروں گا بلکہ انھیں آپ کی ملکی دشمنوں کی ان کارروائیوں کے متعلق بھی ضرور بتاؤں گا جن کا بخوبی علم ہونے کے باوجود آپ ان سے چشم پوشی کررہے ہیں"۔ میری یہ بات سن کر نبیل فوراً جھاگ کی طرح بیٹھ گیا "یہ تو ہم نے اپنے نقطہ نگاہ سے آپ کی حفاظت کے لیے انتظام کیا تھا اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو میں گارڈ کمانڈر کو کہہ دوں گا کہ وہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرے اور جس طرح آپ چاہیں ان سے کام لیں"۔ غرض یہ کہ کرنل نبیل دو گھنٹے ہمارے ساتھ گزار کر واپس چلا گیا۔ رات آٹھ بجے گارڈ کمانڈر نے آکر مجھے رپورٹ دی اور کہا کہ آپ کس طرح جوانوں کو ڈپلائے کرنا چاہتے ہیں آپ جو آرڈر بھی دیں گے میں اسے اگلی شفٹ والوں کے پاس کردوں گا"۔ میں نے گارڈ کمانڈر کو کہا کہ ہمارے اپارٹمنٹس کے اردگرد کوئی مشکوک شخص یا گاڑی دکھائی دے تو اسے چیک کریں ہر گارڈ کی ڈیوٹی کے دوران میرا ایک آدمی ان کی مدد کرے گا کیوں کہ وہ اس لین میں رہنے والوں اور غیر متعلقہ افراد میں تمیز کرسکتے ہیں۔

کرنل نبیل نے دو دن بعد صبح سویرے فون کرکے مژدہ سنایا کہ پرسوں صبح ہزرائل ہائی نس نے ۱۱ بجے ملاقات کا وقت مقرر کیا ہے۔ نبیل نے یہ بھی کہا کہ میں ہزرائل ہائی نس سے اس کی تعریف میں چند فقرے کہنے اور اس کی کارکردگی سراہنے کو بھول نہ جاؤں۔ دو روز بعد میں مزمل، عمران اور قیصر تیار ہو کر ساڑھے دس بجے ہزرائل ہائی نس کے محل میں پہنچ گئے سیکورٹی کے دفتر میں کرنل نبیل پہلے سے ہی بیٹھا ہوا ہمارا انتظار کررہا تھا۔ گیارہ بجے مجھے اندرونی انتظار گاہ میں پہنچادیا گیا جہاں ایک امریکی اور ایک سوئس باشندہ پہلے سے ہی بیٹھے ہوئے ہزرائل ہائی نس سے ملاقات کے منتظر تھے ان سے ہیلو کرنے اور تعارفی بات چیت سے معلوم ہوا کہ امریکی ایک اسلحہ ساز کمپنی کا ڈائریکٹر اور سوئس، سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک کا نمائندہ تھا۔ تھوڑی دیر کے اندر ہی پہلے امریکی اور اس کے جانے کے چند منٹوں کے بعد سوئس بینکار کو اندر بلالیا گیا۔ قریب بیس منٹ بعد دونوں مسکراتے ہوئے واپس لوٹے اور اس انتظار گاہ سے گزر کر باہر چلے گئے۔ ان کی مسکراہٹ سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ دونوں اپنے مقاصد میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے ہیں۔ ان کے جانے کے چند لمحوں بعد ہی مجھے ملاقاتی کمرے میں لے جایا گیا۔ ہزرائل ہائی نس مجھ سے پہلے جانے والے ملاقاتیوں سے کامیاب گفتگو اور فیصلے سے خود بھی بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ صاف محسوس ہورہا تھا کہ امریکی اپنا فرسودہ اسلحہ بیچنے اور سوئس بینکار ہزرائل ہائی نس سے اس اسلحے کی خریداری کے باعث اپنے بینک کے لیے ایک موٹی رقم ہتھیانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اس سودے کے باعث ہزرائل ہائی نس کے بینک اکاؤنٹس میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

ہزرائل ہائی نس سے میری ملاقات تقریباً ۱۵ منٹ رہی۔ ہزرائل ہائی نس نے میرے اور میرے ساتھیوں کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ اگر مجھے یا میرے ساتھیوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤں۔ میں نے کہا کہ ''ہمیں کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں، میرے تین سینئر ساتھی میرے ہمراہ آئے ہیں اور سیکورٹی آفس میں بیٹھے ہیں اگر یور رائل ہائی نس انھیں چند لمحوں کے لیے مل لیں تو ان کی عزت افزائی ہوگی'' شہزادہ اچھے موڈ میں تھا اس نے اپنے خادمِ خاص کو کہا کہ وہ میرے ساتھیوں کو یہاں لے آئے۔ ساتھیوں کے وہاں آنے تک میں نے کرنل نبیل کی اعلیٰ کارکردگی کی تعریف کی اور کہا کہ کرنل نبیل کے تعاون کی وجہ سے ہمیں اپنا مشن پورا کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی اور وہ بھی اس وقت سیکورٹی آفس میں بیٹھا ہوا ہے۔ ہزرائل ہائی نس نے مسکراتے ہوئے کہا ''میں جس فوج کا کمانڈر انچیف ہوں اس کی کارکردگی کو بخوبی جانتا ہوں'' یہ کہہ کر ہزرائل ہائی نس نے اپنے دوسرے خادم کو کرنل نبیل کو بلانے کے لیے بھیجا۔ میرے ساتھیوں کے آنے اور تعارف کے چند لمحوں بعد ہی جب ہم شاہی قہوہ پی رہے تھے، کرنل نبیل ملاقاتی کمرے میں آیا اس نے سلیوٹ تو خوب ایڑیاں بجا کر کیا لیکن فی الحقیقت اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ ہزرائل ہائی نس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''کرنل نبیل تمھاری کارکردگی کی اتنی تعریف کی گئی ہے کہ میں تمھیں فوری بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی دیتا ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ تم اس عہدے کے ساتھ اپنی کارکردگی کو بڑھاؤ گے اور ملک کے دشمنوں کا سراغ لگانے اور انھیں ختم کرنے کے لیے ہمیں آئندہ دوستوں کا سہارا نہیں لینا پڑے گا تمھاری ترقی کے آرڈر میرا سیکورٹی چیف تمھیں ابھی دے دے گا ''ڈس مس''۔ کرنل نبیل کی خوشی سے اب باچھیں کھلی جا رہی تھیں اس نے کمانڈر انچیف کو زوردار سلیوٹ مارا اور واپس چلا گیا۔ میں نے ہزرائل ہائی نس کو بتایا کہ مزمل اور عمران بنگلہ دیشی فوج میں فل کرنل اور میجر کے عہدوں پر حاضر سروس ہیں اور قیصر ایک بھارتی سرفروش مسلمان ہے اور یہ موساد اور بھارتی انٹیلی جنس کی پاکستان دشمن کارروائیوں کے خلاف ان کے جاسوسی نیٹ ورکس کو ختم کرنے کے لیے اور بغیر کسی ذاتی لالچ کے جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہوئے ہیں اور میرے باقی ساتھی بھی اسی جذبے کے ساتھ میرے ہمراہ ہیں تو ہزرائل ہائی نس بہت خوش ہوئے ہمیں رخصت کرنے سے پہلے انھوں نے ہاتھ اٹھا کر اللہ پاک سے ہماری کامیابی کی دعا مانگی اور مجھے کہا کہ آپ لوگوں کے لیے ہماری طرف سے بطور ہدیہ ایک پیکٹ سیکورٹی آفس میں پڑا ہے اسے جاتے وقت لے لیں۔ سیکورٹی آفس میں کرنل نبیل اپنی ترقی کے آرڈر ملنے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں نے ذرا بلند آواز میں کہا ''بریگیڈیئر نبیل آپ کو ترقی بہت بہت مبارک ہو'' نبیل نے الغیثکرا کہتے ہوئے مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے معانقہ کیا۔ سیکورٹی چیف نے ہدیے کا بھاری بھرکم پیکٹ میرے حوالے کیا نبیل نے کہا کل شام انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں رات کا کھانا ہم اس کے ساتھ کھائیں اس دعوت میں اس کے کئی فوجی ہم عصر بھی شامل ہوں گے۔ نبیل اور سیکورٹی چیف سے رخصت ہو کر ہم اپنے اپارٹمنٹس

میں واپس آئے اس بار ہدیے میں پہلے کے ہدیئے سے دگنی رقم یعنی ۶۶ لاکھ ریال تھے جسے میں نے تمام ساتھیوں میں برابر حصے سے تقسیم کر دیا۔ اسی وقت ہم نے ایک اور فیصلہ کیا کہ اگر ہم میں سے کوئی شہید ہو جائے تو اس کے جسد خاکی کو بجائے وطن جانے کے وہیں دفن کر دیا جائے اور اس کے حصے کی رقم اس کے ورثا کو دے دی جائے سب نے اپنے اپنے ایڈریس اور ورثا کے نام لکھ کر مجھے دیے۔ میں نے بھی اپنی والدہ کو اپنا وارث ٹھہراتے ہوئے اپنا ایڈریس وغیرہ لکھ دیا۔ ان سب کی ہم نے بائیس کاپیاں بنوائیں اور گیارہ کاپیوں کے سیٹ ہر ایک ساتھی کو دیے اور گیارہ سیٹ بحیثیت گروپ لیڈر میں نے اپنے پاس رکھے میں نے یہ کام اس لیے کیا کہ کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ ہم سے کون اور کتنے کب شہید ہو جائیں۔ میرے مشورے میں میں نے اور میرے ساتھیوں نے اگلے روز تمام ریال امریکی ڈالروں میں تبدیل کروائے اور میرے سپنا اور ماہا کے سوا سب ساتھیوں نے اپنے پاس صرف پانچ پانچ ہزار ڈالر رکھے اور باقی رقم کے ڈرافٹ بنوا کر اپنے اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کروا دیے۔ ماہا اور سپنا کے چوں کہ کوئی ورثا نہیں تھے اس لیے انھوں نے اپنی رقم جدہ میں ہی اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دی اگلی رات ہم بریگیڈیئر نبیل کے پرتکلف ڈنر میں شریک ہوئے اور اس کے دو روز بعد ہم سب الوداعی عمرہ کرنے کے لیے مکہ معظّمہ گئے۔ ہم سب نے دل کی گہرائیوں سے دعائیں مانگیں اور اپنی حاجات کے لیے گڑگڑا کر رب جلیل کے حضور استدعائیں کیں۔ ہمیں یقین کامل تھا کہ ہماری حاجات ضروری پوری ہوں گی کیوں کہ اس در سے کوئی خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔

☆☆

اب سعودی عرب میں ہمیں کوئی کام نہ تھا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں اب کراچی جا کر ایران ایئر کے جہاز سے تہران جانا تھا۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران تقریباً ہر ہفتے میں بمبئی میں حاجی مستان اور یوسف پٹیل اور سنائی گولک تھائی لینڈ میں عمر خان سے ٹیلی فون پر رابطہ کرتا رہا۔ خن سا سے بھی تین چار بار میری بات ہوئی تھی۔ میں بینکاک میں خن سا کے نمائندے کو فون کرتا اور وہ مجھے وہ وقت اور دن بتا دیتا جب خن سا مجھے میرے نمبر پر فون کرے گا۔ ایک دو گھنٹے کے فرق سے خن سا کا فون مجھے ملتا اور میری اور میرے ساتھیوں کی خیر و عافیت پوچھنے کے بعد ہر بار اس کی تان اس بات پر ٹوٹتی کہ میں اور میرے ساتھی اپنے مشنوں سے فارغ ہو کر اس کے پاس کام کریں۔ اب میں نے خن سا کو کہا کہ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایران جا رہا ہوں۔ یہاں ہمارے پاس خاصا اسلحہ ہے لیکن ہم بذریعہ جہاز پہلے کراچی اور پھر تہران جائیں گے۔ اس لیے یہ تمام اسلحہ ہمیں سعودی عرب میں ہی چھوڑنا پڑے گا اس لیے اگر وہ تہران میں ہمیں اسلحہ مہیا کر دے تو ہماری بہت بڑی پریشانی ختم ہو جائے گی۔ خن سا نے کہا کہ وہ ابھی عمر خان سے رابطہ کرتا ہے اور وہی تہران میں بھی اسلحے کا انتظام کر دے گا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ہی عمر خان کا فون آ گیا اور وہ مجھ سے ناراضگی سے بولا ''خن سا کو کہنے کی کیا ضرورت

تھی، میں جب سعودی عرب میں تمھیں اسلحہ دلواسکتا ہوں تو تہران میں کیوں نہیں، میں ابھی ریاض میں اپنے نمائندے عبدالخالق کو فون کرتا ہوں وہ بذریعہ جہاز تمھارے پاس جدہ پہنچ جائے گا اور تم سے سارا اسلحہ لے کر بذریعہ سڑک دمام بھجوائے گا جہاں سے اسلحہ تہران بھیجا جائے گا۔ وہ خود تمھیں بتا دے گا کہ تہران میں کب، کس جگہ اور کون ہمیں ہمارا اسلحہ دے گا''۔ جہاں دوستی ہوتی ہے وہاں ایسی چھوٹی موٹی رنجشیں بھی پیدا ہوجاتی ہیں عمر خان کو یہ گلہ تھا کہ جب اس نے ہمیں ہر مطلوبہ ملک میں اسلحہ مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے تو پھر میں نے خن سا سے کیوں کہا۔

اسی روز شام کو عبدالخالق نے جدہ ایئرپورٹ سے مجھے فون کیا میں نے عمران اور قیصر کو اسے لانے کے لیے ایئرپورٹ بھیجا، عبدالخالق نے ہمارے اپارٹمنٹس میں آکر دو تین لوکل فون کیے اور تقریباً تین گھنٹے بعد ایک لینڈ اوور ہمارے اپارٹمنٹس پر آگئی۔ اس دوران ہم نے اپنا تمام اسلحہ مع یبنج میں ہیفل اور اس کے ساتھ کے فلیٹوں سے ملنے والے اسلحے کے چار سوٹ کیسوں میں پیک کیا، لینڈ اوور پر ہلٹن ہوٹل کا نام اور مونو گرام بنا ہوا تھا اور اس میں کچھ سامان پہلے سے موجود تھا۔ ہمارے اسلحے سے بھرے چاروں سوٹ کیسوں پر بھی ہلٹن ہوٹل کے اسٹیکر لگا دیے گئے اور لینڈ اوور کے دونوں ڈرائیور دمام کے لیے روانہ ہو گئے۔ عبدالخالق نے مجھے کہا کہ آج سے ٹھیک آٹھ روز بعد میں تہران میں ہلٹن ہوٹل کے جنرل منیجر البرٹ سے ملوں اور اس کا خط البرٹ کو دوں۔ وہ چاروں سوٹ کیس میرے حوالے کردے گا۔ عبدالخالق نے مجھے کہا کہ میں البرٹ سے اپنے مشن کے متعلق ہرگز کوئی بات نہ کروں اور نہ ہی اسے یہ بتاؤں کہ ان سوٹ کیسوں میں کیا ہے ''وہ امریکی ہے اور سانپ پر تو اعتبار کیا جاسکتا ہے لیکن امریکیوں پر نہیں''۔ عبدالخالق نے مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا اسی رات عبدالخالق ریاض کے لیے پرواز کر گیا آئندہ دو روز میں ہم نے اپنی گاڑیاں ہراج (گاڑیوں کی نیلامی کی جگہ) میں لے جا کر فروخت کیں اس سے اگلے روز پی آئی اے کے ذریعے کراچی کے لیے ہماری سیٹیں بک تھیں شام کے چار بجے ہم ٹیکسیوں میں اپنا سامان لاد کر ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوگئے۔ دونوں اپارٹمنٹس کی چابیاں ہم نے مالکان کو لوٹا دی تھیں اور ہم نے جو فرنیچر اور ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ خریدے تھے وہ بھی مالکان کو دے دیے۔ ہماری روانگی سے پہلے بریگیڈیئر نبیل ہم سے ملنے آیا اسے میں نے صرف کراچی جانے کا بتایا تھا وہ ہم سے بڑی گرم جوشی سے مل کر رخصت ہوا ہم نے اپنے اکاؤنٹس جدہ کے بینک میں ہی رہنے دیے اور ہر ساتھی نے دس دس ہزار ڈالر اور میں نے پچاس ہزار ڈالر اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے نکلوائے۔ سعودی عرب میں ہماری رقوم محفوظ تھیں اور ہم جب اور جہاں سے بھی چاہتے اپنی تمام جمع پونجی نکلوا سکتے یا ٹرانسفر کروا سکتے تھے۔

پی آئی اے کے ۷۴۷ جمبو جٹ نے تقریباً ساڑھے چار گھنٹے میں ہمیں کراچی پہنچایا ایئرپورٹ سے ہم سیدھے میٹروپول ہوٹل آئے اور دس کمرے بک کرلیے کیوں کہ سپاہی اکرم اور دین محمد

نے ایک ہی کمرے میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا میں پاکستان میں تھا اور ہر انسان کی طرح مجھے بھی اپنے گھر، اپنی والدہ اور اپنے بیٹے کی یاد بری طرح ستانے لگی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے جہاز کے سفر اور پھر ۶ گھنٹے میں لاہور سے ٹیکسی میں اپنے گھر پہنچ کر میں اپنی انتظار کرتی ماں اور معصوم بچے شجاع سے مل سکتا تھا جو باپ کی زندگی میں ہی یتیم بن کر رہ گیا تھا لیکن جوں ہی مجھے اپنی ستم زدہ ماں اور اس پر ظلم کرنے والی اپنی بیوی کا خیال آتا تو میں ڈر جاتا۔ قارئین! گرامی آپ میری ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اپنے وطن کے دشمنوں کو جو بھی میرے وطن کو نقصان پہنچانے کے پروگرام ہی بنا رہے تھے میں نے اور میرے ساتھیوں نے ایسے ہلاک کیا جیسے بھیگے چوہوں کو مارا جاتا ہے میں یہ کھیل برسوں سے کھیل رہا تھا ریوالور، پسٹل اور سٹین گن ہاتھ میں پکڑے رہنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ سوتے ہوئے بھی میرا دایاں ہاتھ ایسی پوزیشن میں رہتا جیسے اسلحہ پکڑا ہو۔

کسی انسانی زندگی کو ختم کرنے کا احساس مجھے صرف اتنی ہی دیر رہتا جتنی دیر میں ایک سگریٹ پیا جاتا ہے۔ نہتے ہاتھوں بھی میں مخصوص نسیں دبا کر کسی بھی تن درست اور صحت مند شخص کو ہلاک کرسکتا تھا۔ مجھے صرف یہی خوف گھر جانے سے باز رکھ رہا تھا کہ اگر میرے گھریلو حالات مجھے ناقابل برداشت محسوس ہوئے تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکوں گا اور کہیں میرے ہاتھ سے اس حرافہ اور اس کے حامیوں کی لاشیں نہ گر جائیں۔ ایسی صورت میں مجھ جیسا بے منزل مسافر گھر کی ان راحتوں کو جو محض خواب اور آرزو بن کر رہ گئی تھیں انھیں حقیقت بنے دیکھتا تو گھر سے واپس لوٹنا دشوار ہوتا جب کہ میرے ساتھی کراچی میں میرا انتظار کر رہے ہوتے انھی سوچوں میں دو دن گزر گئے اور میں نے بالآخر اپنی خیریت کا ایک خط اپنی والدہ کو لکھا اور ڈیڑھ لاکھ روپے کا ڈرافٹ بنوا کر انھیں رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج دیا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ میری والدہ زندہ بھی ہیں یا نہیں میں نے اپنے گاؤں کے نزدیک قصبے میں ایک بینک میں ملازم اپنے ایک رشتہ دار کو فون کیا اس کی آواز سنتے ہی میں نے کہا ''صرف یہ بتادو کہ میری والدہ زندہ ہیں یا نہیں'' اس نے کہا ''زندہ ہیں لیکن'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے فون بند کردیا۔ میرے لیے یہی بات کافی تھی کہ میری والدہ بقید حیات تھیں۔ اس رشتہ دار کے کہے ہوئے لفظ لیکن کے آگے سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔

کراچی میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میں سونیا اور اس کی والدہ کو ملنے گیا یہاں میں یہ عرض کرتا ہوں کہ رضی کراچی میں لینڈ کرنے کے دوسرے روز صبح سویرے اپنی بیوی کو ملنے چلا گیا اور بعد دوپہر وہ اپنی بیوی کو اپنے ہمراہ ہوٹل لے آیا۔ کراچی میں ہمارے قیام کے بقیہ دن وہ ہوٹل میں رہی۔ سونیا اپنی والدہ کے ساتھ بہت خوش و خرم تھی۔ سونیا کے لیے ہم نے زیب النسا اسٹریٹ سے تحائف لیے اس کا کون تھا جو اس کے لیے تحفے لاتا سونیا کے لیے تحفے لیتے وقت مجھے پھر اپنے گھر کا خیال آیا میرا بیٹا شجاع بھی اس آس میں دن کاٹ رہا ہوگا کہ ابو آئیں گے تو ڈھیر ساری چیزیں لائیں گے ایک

خاردار دیوار میرے اور میرے بیٹے اور میری ماں کے درمیان حائل تھی جس نے ہم تینوں کی زندگی کی اصل خوشیوں سے محروم کررکھا تھا۔

کراچی میں پانچ دن قیام کے بعد ہم تہران کے لیے روانہ ہوگئے۔ دو گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت میں ہمارے جہاز نے مہر آباد (تہران) کے ہوائی اڈے پر لینڈ کیا اس وقت کے اور آج کے ایران میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ شاہ رضا شاہ پہلوی کا دور تھا۔ تہران کو مشرق کا پیرس کہتے تھے بادشاہ نے بھی ایران کو کم ازکم ثقافتی طور پر مغرب کا ہم پلہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ چودہ سال سے چالیس سال تک کی عمر کی خواتین کے لیے اسکرٹ پہننا لازمی تھا۔ تمام بڑے ہوٹلوں میں زن و مرد اکٹھے ناچتے گاتے اور ہر قسم کی بے ہودگی کرتے دکھائی دیتے تھے۔ سرعام بوس وکنار کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تمام بڑے ریسٹورانٹس اور ہوٹلوں میں سور کا گوشت کھلے بندوں ملتا اور کھایا جاتا تھا۔ دنیا کی بہترین شرابوں سے دکانیں بھری ہوئی تھیں۔ مسلمان عورتوں کے شرم وحجاب کی باتیں محض داستانوں میں تھیں۔ یہ تو امرا اور اپر مڈل کلاس کا حال تھا عوام کی اکثریت بھوک، غربت اور بے سروسامانی کا شکار تھی ایران کا تیل (LIGHT CRUDE OIL) دنیا بھر میں بہترین سمجھا جاتا تھا امریکی، برطانوی اور اٹلی کی مہنگی ترین کاریں تہران کی سڑکوں پر دوڑتی پھرتی تھیں۔ شہر کے وسط میں امریکی سفارت خانہ بذات خود ایک چھوٹا شہر دکھائی دیتا تھا دنیا بھر کی خرافات اس شہر میں یک جا ہوچکی تھیں۔ تہران میں شمران کے علاقے میں شاہی محلات اور روسا وامرا کی ایسی عالی شان رہائش گاہیں تھیں کہ ان پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ یقین جانیے روسا کے محلات میں پچاس ساٹھ کمرے ہونا معمولی بات تھی۔ اتنی وسیع عمارات کے کمپاؤنڈ میں ایکڑوں میں پھیلے ہوئے باغات، صاف پانی کی نہریں، پھولوں کے تختے اور رات کو ان باغوں میں جلتے رنگ برنگے قمقمے عجب سماں باندھ دیتے تھے۔ امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہورہا تھا اور یہ علامت تھی ایک خونی انقلاب کے آنے کی تہران میں ہم نے شیرٹن ہوٹل میں قیام کیا۔ یہ خاصا مہنگا فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ تین روز کے بعد ہم نے ایک بڑا گھر کرائے پر لے لیا۔ کرائے کے گھر لینے کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔

☆☆

آج لکھنے بیٹھا تو ایک اخبار کی خبر مسلسل میرے ذہن میں گھومتی رہی اور بے اختیار جی چاہا کہ اس خبر کے متعلق کچھ لکھوں۔ خبر یہ ہے کہ ناروے کا ۲۶ سالہ ولی عہد ہاکون ایک سال کے لیے ۱۴ اگست سے سیاسی تربیت حاصل کرے گا، ۱۴ اگست پاکستان ڈے بھی ہے یعنی ایک نئی مملکت کے آغاز کا دن۔ میرے خیال میں ولی عہد ہاکون کو سیاسی تربیت کے حصول کے لیے پاکستان سے رجوع کرنا چاہیے کیوں کہ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں بہترین اور مختلف اقسام کی سیاسی تربیت دینے والے نہ صرف موجود ہیں بلکہ گزشتہ ۵۲ سال سے ان کی سیاست سے اس مملکت خداداد کو جو چار چاند لگے ہیں

ساری دنیا ان کی گواہ ہے۔ پاکستان سیاست کا ایک ایسا گڑھ ہے جہاں چائے سگریٹ کے کھوکھوں سے لے کر ایرانی ریسٹورانوں اور چھوٹے بڑے ہوٹلوں سے لے کر اسلام آباد کے صدارتی محل اور وزیراعظم ہاؤس حتیٰ کہ جیلوں کی رونق بڑھانے والے سابق حکمرانوں اور سابقہ صاحب اقتدار لوگوں نے جیل کو بھی سیاست کا اکھاڑا بنا رکھا ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک میں تو سیاست حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے درمیان ہی رہتی ہے لیکن پاکستان میں سیاست کی درجنوں اقسام پائی جاتی ہیں۔ ذرا شروع ہوجائیں صوبہ سرحد سے، قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک نیشنل عوامی پارٹی کا ایک سطری یہ منشور رہا ہے کہ ہر ایسی بات کی مخالفت کرو جس میں پاکستان کا بھلا ہو۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک صوبہ سرحد کا نام پختونستان رکھنے کے مطالبے پر یہ پارٹی پاکستان کی اس حد تک مخالفت کرتی رہی ہے کہ ولی خان کے والد عبدالغفار نے مرنے کے بعد پاکستان میں دفن ہونا پسند نہ کیا اور جلال آباد (افغانستان) میں دفن ہو کر ۶ فٹ زمین کا نام پختونستان رکھ دیا۔ اب تو ولی خان کو کالا باغ ڈیم بننے سے نوشہرہ تک کا علاقہ ڈیم کی جھیل میں ڈوب جانے کا عذر لنگ بھی ہاتھ آگیا اور اسی ایشو پر وہ، ان کی بیگم اور اولاد مزید چالیس سال اپنی سیاست جاری رکھیں گے۔ اب آگے آیے پنجاب میں۔ ٹوانے، نون محمدوٹ، حیات اور دولتانہ فیملی نے تو انگریزوں کے دورِ حکومت اور آغازِ پاکستان میں اتنے فوائد اٹھائے اور زمینیں اور جاگیریں لیں کہ ان کے معدوں میں مزید کچھ بھرنے کی گنجائش نہیں اور وہ POLITIC (سیاست) سے ریٹائر ہوکر STATESMEN (رہبر سیاست) بن گئے۔ ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا اسے پر کرنے کے لیے ایک نئی کھیپ تیار ہوئی جس کو نوابزادہ نصر اللہ خان نے حزب اختلاف کے داؤ پیچوں اور احتجاج کی تربیت دی اس نئی کھیپ میں دو گوہر لاثانی ذوالفقار علی بھٹو اور مجیب الرحمان تھے۔ ان دونوں نے پاکستان کی سیاست میں جو کارہائے نمایاں دکھائے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایک نے ”ہمار دیش، تمھار دیش، سنار دیش“ کا نعرہ لگا کر مشرقی پاکستانیوں کو ورغلایا اور دوسرے نے ہزار سال تک جنگ لڑنے کی ڈینگ مار کر پاکستانی افواج سے ڈھاکا میں ہتھیار ڈلوائے اور ملک دولخت ہوگیا۔ جنرل یحییٰ خان کے دورِ حکومت تک حکمران اپنے مخالفوں کے ساتھ ملانے کے لیے صرف سرکاری اور سیاسی عہدوں کی بندر بانٹ کرتے تھے لیکن سقوط ڈھاکا کے بعد ملک کے تمام سیاست دانوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ سیاست میں جان بھی جاسکتی ہے۔ لہٰذا اب انھوں نے عہدوں کے ساتھ ساتھ زر کا مطالبہ بھی شروع کردیا اور بریف کیس کی سیاست شروع ہوئی اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعے سے غیر ممالک میں جائیدادیں خریدی جانے لگیں اور سوئٹزرلینڈ کے محفوظ بینکوں میں ان سیاست دانوں کی بھاری رقوم جمع ہونے لگیں صرف ایک بچارے مصطفیٰ کھر صاحب ایسے محبّ وطن ثابت ہوئے کہ انھوں نے صرف پاکستانی زن (زنوں) زر اور زمین پر ہی اکتفا کیا کیوں کہ یہ تینوں انھیں پاکستان میں ہی بافراط مل گئیں۔ بھٹو صاحب کے دورِ حکومت میں پاکستان میں مغرب نوازی اس حد تک بڑھ گئی کہ کراچی کے

KEY CLUB کی داستانیں سن کر یورپ والوں نے بھی دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔ ہیرا منڈی لاہور کی طوائفوں کی ایک فون کال پر برسوں سے انتظار میں بیٹھے لوگوں کے فون چوبیس گھنٹوں میں لگ جاتے۔ بھارتی مارکیٹ لاہور میں گوگو ریسٹورنٹ پر مصطفیٰ کھر صاحب جو گورنر اور سب مارشل لا ایڈ منسٹریٹر پنجاب تھے لپکتے، لڑکیوں پر جھپٹتے اور جھپٹ کر واپس گورنر ہاؤس پلٹتے کہ یہ لہو کو گرم رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔ بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹا گیا جنرل ضیا الحق نے اقتدار سنبھال کر تین ماہ میں الیکشن کرانے اور اسلامی نظام رائج کرنے کا وعدہ کیا۔ پر تین ماہ بعد وہ کوئی نہ کوئی مجبوری ظاہر کر کے ایک آیت پڑھتے اور الیکشن آئندہ تین ماہ کے لیے ملتوی ہوجاتے۔ پاکستانی عوام قرآنی آیات سن کر احتراماً خاموشی سے آئندہ تین ماہ گزرنے کا انتظار کرتے اور یوں جنرل صاحب نے گیارہ سال گزار دیے لیکن جب عزرائیل نے انا للہ وانا الیہ راجعون کہا تو جنرل صاحب کے جسد خاکی کا صرف جبڑا اور خاک اس فانی دنیا میں باقی رہی۔ جنرل صاحب نے پاکستان کو اپنے دور اقتدار میں جو تحفے دیے وہ ہیروئن، کلاشنکوف اور ۳۵ لاکھ افغانی مہاجر تھے جو روس کے افغانستان سے نکل جانے کے باوجود اب تک سارے پاکستان میں کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے پاکستانی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوار کھے ہیں اور انھی پاکستانی پاسپورٹوں پر وہ سعودی عرب میں ہیروئن لے جاتے اور اکثر اپنے سر قلم کرواتے ہیں۔ جنرل ضیا الحق کے یہ تو عام تحفے تھے لیکن دو خصوصی تحفے انھوں نے پاکستانیوں کو دیے۔ جنرل جیلانی جو پنجاب کے گورنر تھے ان کی لاہور میں کوٹھی کی تعمیر میں بھرپور تعاون کے انعام کے طور پر نواز شریف کو پنجاب کی حکومت میں شامل کرلیا گیا اور کراچی میں جماعت اسلامی کا توڑ کرنے کے لیے الطاف حسین کو امریکا سے بلوا کر ایم کیوایم کی بنیاد ڈالی۔ الطاف حسین کو جو امریکا میں کسی پٹرول پمپ پر کام کر کے حق حلال کی روزی کما رہے تھے یقیناً کسی پاکستانی ایجنسی نے ہی ان کے گن دیکھ کر انھیں پاکستان بلوایا اور بنیادی تربیت دی تھی لہٰذا وہ آج بھی لندن میں بیٹھے ہوئے ہیں انھیں پاکستان میں کسی بھی اچھے یا برے کام میں کسی ایجنسی کا ہاتھ ہی دکھائی دیتا ہے حالاں کہ اس ایک غلطی پر ساری ایجنسیاں اب تک پچھتا رہی ہیں۔ چوں کہ وہ خود بھی کسی ایجنسی کی پیداوار ہیں۔ اب ذرا پھر پیچھے کی طرف چلیں اور بیورو کریسی کا ذکر ہوجائے۔ ملک غلام محمد جو بیورو کریٹ تھے خود بخود پاکستان کے گورنر جنرل بن گئے اور یہ گورنری جنرلی انھیں ایسی بھائی کہ مفلوج ہونے کے باوجود وہ یہ کرسی چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ اس مفلوج گورنر جنرل سے اس کی ایک با اعتماد سیکریٹری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جس کاغذ پر دستخط کرائے وہ اس کا استعفیٰ تھا۔ اس کے بعد تو بیورو کریٹ حکمرانوں کی لائن لگ گئی۔ چودھری محمد علی، محمد علی بوگرہ، معین قریشی اور نا معلوم کتنے بیورو کریٹس سامنے اور کتنے پس پردہ پاکستان پر حکمرانی کرتے رہے۔ نواز شریف نے جو ضیا الحق کو اپنا روحانی باپ کہتا ہے (میرے خیال میں روحانی کا لفظ فالتو ہے) دوبار ملک کا اقتدار سنبھالا۔ کبھی جاگ پنجابی جاگ کا نعرہ لگایا اور کبھی قرض اتارو ملک سنوارو کا سلوگن دے کر

دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹا۔ پاکستان بلکہ برصغیر میں سن ۴۷ء کے بعد سیاست دانوں کے بیٹوں، بیٹیوں اور بیواؤں نے بھی بھرپور کردار ادا کیا اور کر رہی ہیں۔ بنگلہ دیش میں مجیب کی بیٹی حسینہ واجد، جنرل ضیا الرحمٰن کی بیوہ بیگم خالدہ ضیا، بھارت میں نہرو کے بعد اس کی بیٹی اندرا گاندھی اور پھر اس کے بعد راجیو گاندھی اور اب اس کی بیوہ سونیا گاندھی جو اٹالین ہے، نے نہرو کی لاش پر بھرپور سیاست اور حکمرانی کی اور سونیا بھی بھارتی وزیراعظم بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ پاکستان میں ایوب خان کے بعد ان کا بیٹا گوہر ایوب اور داماد نے خوب پیر جمائے۔ بھٹو کے بعد بے نظیر نے باپ کی اجرک سنبھالی اور شادی کے بعد آدھی جگہ آصف زرداری کو اوڑھا دی اور ان دونوں نے دوبار ملک کی باگ ڈور سنبھالنے پر ملکی خزانے اور وسائل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ اس لوٹ کھسوٹ میں شامل ہونے اور بھٹو کی لاش پر سیاست کرنے کے لیے مرتضیٰ بھٹو اور اس کی اہلیہ غنویٰ بھٹو بھی آگئے ہیں۔ اقتدار میں بھلا کون کسی کو شریک کرتا ہے اس لیے مرتضیٰ بھٹو قتل ہوئے اور اس کی بیوہ سیاست میں قدم جمانے کے لیے ابھی ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ نواز شریف بھی اس لوٹ کھسوٹ میں پیچھے کیوں رہتا۔ اس نے باقاعدہ پلاننگ سے پہلے پارلیمنٹ کو مفلوج کیا پھر عدلیہ پر ہاتھ ڈالا اور آخر میں افواج پاکستان کو اپنے ذاتی خدمت گار بنانا چاہا۔ دوبار یعنی جنرل آصف جنجوعہ اور جنرل جہانگیر کرامت پر تو اس کا وار کامیاب رہا لیکن تیسری بار جنرل پرویز مشرف نے اس کا وار سہ کر افواج پاکستان کی مزید تذلیل برداشت نہ کی اور ملک کو جو تباہی کے کنارے پر پہنچ چکا تھا، بچانے کے لیے جنرل پرویز مشرف نے عارضی طور پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو میاں صاحب، بے نظیر بھٹو، الطاف حسین اور ولی خان سے یہ برداشت نہ ہوسکا کہ کسی مخلص اور محب وطن کی کوششوں سے یہ ملک قائم رہے لہٰذا نواز شریف نے جو خالص کاروباری ذہن کا مالک ہے، چند اخبارات کے مالکان کے ضمیروں کو خریدا۔ جو مسلسل موجودہ حکومت کی مخالفت میں مضامین شائع کر رہے ہیں۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ جب کوئی سیاست دان برسر اقتدار آجاتا ہے تو پھر اس کی بیوی، بیٹے اور بیٹیاں یہ دعائیں مانگتے ہیں کہ جلد از جلد اس کی غیر طبعی موت ہو اور وہ خود بھی اقتدار کا مزہ چکھیں۔ آج ایک زندہ سیاست دان سے زیادہ اس کی لاش زیادہ آسانی سے کیش ہوسکتی ہے۔ اس لیے بیگم کلثوم نواز نے بھی اپنے شوہر کی گرفتاری اور سزا کے بعد سیاست میں قدم رکھ دیا ہے کیا ہوا جو وہ تعلیم یافتہ نہیں اور نواز شریف کی گرفتاری سے پہلے صرف امریکا، برطانیہ اور دوسرے ترقی پذیر ممالک میں اپنے شوہر کے ہمراہ جاتی اور بھاری شاپنگ کرتی رہی ہیں۔ سیاست میں آنے کے لیے صرف پیسے کی ضرورت ہے۔ بے شک اس کا سر اس کے کندھوں پر ڈیکوریشن پیس ہی ہو وہ ضرور کامیاب ہوجائے گا۔ الطاف حسین لندن کی فضاؤں میں الہڑ جوانیوں سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف ہر روز ایک آدھ بیان داغ دیتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں سے اب ان کا جادو بھی ختم ہو رہا ہے پٹرول پمپ کے ملازم سے وہ سیاست دان بنے اور سیاست دان سے پیر، پیر کو تو کسی گدی یا

مزار پر ہونا چاہیے۔ یہ کیسے پیر ہیں جو برسوں سے لندن میں بیٹھے پاکستان سے بھتوں کی وصولی کرتے اور عیاشی کررہے ہیں ان کے حامیوں نے بھی اب انھیں پیر تسمہ پا کہنا شروع کردیا ہے۔ یہ تو تھے پاکستان کی سیاست کے بڑے ستون۔ باقی جو ہیں وہ محض اکھڑی ہوئی اینٹیں ہیں۔ ان میں فاروق لغاری، اعجاز شفیع، جہانگیر بدر، مصطفیٰ کھر اور عبدالقادر مگسی وغیرہ ہیں ان کا ذکر کرنا بھی وقت کو برباد کرنا ہے۔ چھوٹے تاجروں کے نمائندے عمر سیلیا نے جس کا ایمپریس مارکیٹ والا ریسٹورنٹ موجودہ ہڑتال کے درمیان بھی کھلا ہوا ہے، تاجر برادری کے مفاد میں اپنی جان دینے کی ''آفر'' کی ہے۔ سیلیا صاحب جان دینے والے اعلان کر کے جان نہیں دیتے وہ نسل ہی اور ہوتی ہے جو اصولوں کے لیے جان کی پرواہ نہیں کرتی۔ آپ کا نہ تو کوئی اصول ہے اور نہ ضمیر اور نہ ہی آپ کو اپنے ملک سے اپنے وطن سے محبت ہے۔ بہت دیکھے ہیں ہم نے ایسے جھوٹے دعوے کرنے والے ڈراموں کے کردار۔

ذکر شروع ہوا تھا ناروے کے ولی عہد کی سیاسی تربیت کا۔ اگر ناروے والوں کو علم نہیں تو حکومت پاکستان کو چاہیے کہ ولی عہد کو پاکستان آنے کی دعوت دے اور یہاں کے موجودہ سیاست دانوں میں اسے کھلا چھوڑ دیا جائے گا۔ ایک سال تو بڑی بات ہے چھ ماہ بعد ہی وہ اتنا پختہ اور بھرپور سیاست دان بن جائے گا کہ ناروے میں کوئی بھی اس کے مقابل نہ ٹھہر سکے گا۔ آزمائش شرط ہے۔

❁

نواں باب

تہران میں دو روز شیرٹن ہوٹل میں قیام کے بعد ہم ایک مکان میں شفٹ کر گئے ہمارے مکان لینے کی دو تین وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو شیرٹن ہوٹل کا ہوش ربا کرایہ اور بہت مہنگے کھانے تھے۔ کھانے بھی یا تو مغربی تھے اور یا صرف ایرانی بغیر مرچ مصالحوں کے۔ سب سے مشہور ایرانی کھانا ''چلو کباب'' تھا۔ سیخ میں پروئی ہوئیں بے نمک مرچ گوشت کی تین بوٹیاں اور پیاز اور ٹماٹر کے چھوٹے ٹکڑے اور ابلے ہوئے چاول، جسے ہم نے دوبار کھانے کے بعد چلو کباب یعنی واپس یا آ گے چلو کباب کہنا شروع کردیا پاکستانی کھانوں کے پورے شہر میں دو تین ریسٹورنٹ تھے لیکن ہمارے ہوٹل سے خاصے فاصلے پر۔ دوسری وجہ ہم گیارہ غیر ملکیوں کا ہوٹل میں طویل عرصے تک کسی ظاہری وجہ کے بغیر قیام ہوٹل کی انتظامیہ کے علاوہ پولیس اور ایرانی جاسوسی ایجنسی کو بھی شک میں ڈال سکتا تھا۔ شیرٹن ہوٹل یورپی اور امریکی شہریوں سے بھرا پڑا تھا ہم گیارہ ایشیائی غریب ملکوں کے شہریوں کو ہوٹل والے بھی گھاس نہیں ڈالتے تھے۔ ایران کی اندرونی حالت ایسی تھی کہ حکومت کے خلاف اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ شہنشاہ ایران نے خاصی کوشش کی کہ ملک کے حالات سنبھل جائیں اور غریب عوام کو کم ازکم زندگی کی بنیادی سہولتیں میسر آجائیں لیکن وہاں کی بیوروکریسی اور امرا کے طبقے نے شہنشاہ اور عوام کے درمیان اتنی وسیع خلیج حائل کردی تھی جسے پاٹنا ناممکن ہوچکا تھا۔ سابق وزیراعظم ڈاکٹر مصدق جو عوام کی حالت سدھارنے کے لیے شاہی اخراجات کو کم کرنے اور امرا پر اتنا ٹیکس لگانا چاہتا تھا کہ ان کی فضول خرچیوں اور شاہانہ اخراجات میں نمایاں کمی ہو اور ان کی دولت کے کچھ حصے سے عوام کی محرومیاں ختم ہوں، خود تو زندہ نہ رہا لیکن ایرانی عوام میں ایسی روح پھونک گیا جس نے بالآخر انقلاب ایران کی صورت میں ملکی وسائل سے اپنا حصہ اپنا خون بہا کر اور بزور بازو حاصل کیا۔ اس دور کے

ایران میں یہودیوں کو رہنے کی آزادی تھی اور انھیں پورے شہری حقوق حاصل تھے۔ اسلامی مملکت ہو، دولت مند ہواور یہودی رہتے ہوں اور ترنہ پھیلے، یہ ناممکن ہے۔ شہنشاہ کا جھکاؤ مغرب کی طرف اور اس کی سجدہ گاہ امریکا تھا تیل کی دولت سے زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کے لیے برطانیہ اور امریکا کا ایران میں ٹکراؤ تھا اور یہ دونوں ملک اپنے ملکی جاسوسوں کے علاوہ ایرانی یہودیوں سے بہت کام لے رہے تھے۔ شہنشاہ کو اپنے دباؤ میں رکھنے، اپنا اسلحہ بہت مہنگے داموں ایران کو فروخت کرنے کے علاوہ شہنشاہیت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے تعاون کے عوض یہ رضا شاہ پہلوی سے بھاری قیمت وصول کررہے تھے۔ میں نے ایران کے سیاسی اور معاشی حالات اس لیے بیان کیے ہیں کہ ایسے حالات میں ہم گیارہ افراد کی ٹیم کو اپنا کام کرنے کی راہ میں کس قدر دشواریاں حائل تھیں۔ ہم مکان کی تلاش میں سرگرداں تھے اور ہر کسی سے کرائے کے مکان کا پوچھتے تھے۔ ہوٹل کے ہاؤس کیپنگ کے ایک کارکن نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھے بتایا کہ ایک بیوہ خاتون کے پاس بہت بڑا مکان ہے جس میں وہ خود بھی رہتی ہے اور مکان کے کمرے پے اِنگ گیسٹ کو کرائے پر دیتی ہے یہ مکان شیرٹن ہوٹل کے قریب ہی تھا۔ میں اسی روز کارکن کے ساتھ مکان کی مالکہ سے ملنے گیا یہ ادھیڑ عمر کی خاتون اسکرٹ پہنے اور میک اپ سے جوان دکھائی دینے کی ناکام کوشش کرتے ملی، اس کے پاس نو خالی کمرے تھے یعنی اس وقت کوئی پے اِنگ گیسٹ نہ تھا اس نے یہ سن کر کہ یہاں پاکستانی رہیں گے پہلے تو ناک بھوں چڑھائی لیکن جب میں نے ان کمروں کے کرائے اور گیارہ افراد کے کھانے کے ۱۵ ہزار ڈالر ماہوار منظور کرکے ایک مہینے کا ایڈوانس اس کے سامنے رکھا تو وہ رضامند ہوگئی۔ میرے کہنے پر کہ ہمیں پاکستانی کھانا چاہیے اس نے مزید تین ہزار ڈالر کا مطالبہ کیا میں نے یہ تین ہزار ڈالر بھی اسے دیے تو وہ بولی کہ کل سے ہم اس مکان میں شفٹ ہوسکتے ہیں۔ پاکستانی کھانا پکانے کے لیے وہ ایک بھارتی مسلمان باورچی بھی کل سے رکھ لے گی کمروں میں ہلکا پھلکا فرنیچر اور بستر بھی وہ مہیا کرے گی۔ اگلے روز ہم اس مکان میں شفٹ کر گئے۔ سپاہی دین محمد اور اکرم ایک کمرے میں اور ماہا اور سپنا دوسرے کمرے میں اکٹھے رہنے لگیں۔ میں نے رضی اور JCO منصف کو بھی اکٹھے ایک کمرے میں شفٹ کیا۔ باقی کمروں میں سے ہم نے ایک ایک سنبھالا اور ایک کمرے کو ڈائننگ، روم بنالیا۔ اگلے روز میں نے ایک بڑا فریج خریدا کیوں کہ اتنے افراد کے لیے مکان مالکہ کا فریج چھوٹا پڑتا۔ میں نے ساتھیوں کو سختی سے ہدایت کی کہ وہ اس گھر کو بھی اپنے لیے اتنا ہی غیر محفوظ سمجھیں جتنا کہ ہوٹل اور بھول کر بھی مکان کی مالکہ، باورچی یا مالکہ کو ملنے والے کسی بھی شخص سے ایسی کوئی بات ہرگز نہ کریں جس سے انھیں ہمارے آنے کے مقصد کی بھنک بھی پڑسکے۔ ایران کے لیے ہم سب کے تین ماہ کے بزنس ویزے لگے ہوئے تھے۔ دو روز شہر میں گھومنے کے بعد میں مقررہ دن ہلٹن ہوٹل کے جنرل منیجر البرٹ سے ملنے گیا اس نے چاروں سوٹ کیس خاموشی سے میرے حوالے کیے۔ میں سوٹ کیس لیے

گھر آیا اور سارے ساتھیوں کو ایک ایک ریوالور دیا اور اپنے اور عزل کے لیے سائیلنسر والے پسٹل نکال لیے باقی اسلحہ ہم نے سوٹ کیسوں میں ہی رہنے دیا کیوں کہ ابھی تو ہم نے مشن کا آغاز بھی نہیں کیا تھا جس کے لیے ہمیں بڑے اسلحے اور دستی بموں کی ضرورت پڑتی۔

میرے سابقہ محکمے کے افسر اعلیٰ نے ایران میں جن پاکستان دشمن لوگوں کی نشان دہی کی تھی ان میں بھارتی جاسوس ایجنسی کے پے رول پر بھارتی ہندو کاروباری لوگوں کے علاوہ امریکی، برٹش اور اسرائیلی بھی تھے جو امریکی اور برٹش پاسپورٹوں پر ایران میں اپنی کارروائیوں میں مشغول تھے۔ یہ امریکی سی آئی اے، برٹش M-5 اور موساد کے ایجنٹ تھے، سن ۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ایران نے کھلے بندوں پاکستان کی مدد کی تھی۔ اسلامی ممالک کی یک جہتی کی سن ۶۵ء کی جنگ میں ایک نئی مثال قائم ہوئی تھی۔ پاکستان ایئرفورس کے پاس اس وقت سٹار جٹ F-104 جہاز تھے جو نیٹو معاہدے کے تحت امریکا نے پاکستان کو اس لیے دیے تھے کہ کمیونزم کے خلاف استعمال کیے جاسکیں۔ امریکا نے یہ جہاز دیتے وقت یہ چالاکی کی تھی کہ ان کے راکٹ لانچر ایران کو اور راکٹ ترکی کو دیے تاکہ ان تینوں ممالک میں سے کوئی ملک بھی تنہا انھیں استعمال نہ کرسکے اس وقت بھارت کی ہوائی طاقت پاکستان سے پانچ گنا زیادہ تھی، اس کے پاس روسی مگ ۱۹ اور ۲۱ کے علاوہ نیٹ، فرانسیسی، میراج اور برطانوی لڑاکا اور بم بار طیاروں کے بیسیوں اسکواڈرن تھے اور پاکستان کے پاس F-86، کینبرا اور F-104 تھے پاکستانی جنگی جہاز بھارت پر حملوں کے بعد ایرانی ہوائی اڈوں پر اترتے اور وہیں سے تیل لے کر اور چیک کروانے کے بعد پرواز کرتے اور بھارتی ہوائی اڈوں اور دیگر جنگی تنصیبات پر حملہ کرتے۔ پاکستان نے اپنے ہوائی اڈوں پر لکڑی کے بنے ڈمی جہاز پین (PANS) میں کھڑے کیے ہوئے تھے۔ بھارتی ہوا باز پاکستان سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ان ڈمی جہازوں کو بھی اپنا نشانہ نہ بنا سکے بھارت کے سرگودھا کے ہوائی اڈے پر حملہ کرنے کے دوران اس وقت اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم نے اکیلے اپنے F-86 سے چھ بھارتی جہازوں کو سرگودھا کی فضا میں بھسم کردیا جنگ کے دوران کا ٹوٹلی سکویرا بھارتی جہاز تھے۔ جنگ شروع ہوتے ہی ترکی نے F-104 کے راکٹ اور ایران نے راکٹ لانچر پاکستان بھیجنے شروع کیے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ سن ۶۵ء کی جنگ کے آغاز سے ہی کراچی میں رات کو بلیک آؤٹ ہوتا تھا۔ اس بلیک آؤٹ کی راتوں کے دوران ایران اور ترکی کے C-130 جہازوں پر یہ راکٹ اور راکٹ لانچر پہنچائے جاتے تھے F-104 انٹرسپٹ جہاز تھا ان جہازوں نے فلی لوڈڈ (Fully Loaded) ہونے کے بعد جب پروازیں شروع کیں تو بھارتی ایئرفورس بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی اور پاکستان اور بھارت کی فضاؤں پر پاکستانی جہازوں کی حکمرانی تھی۔ انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو نے اپنی تمام بحریہ جس میں بیس سے زیادہ آبدوزیں تھیں، پاکستان کے حوالے کردی تھیں جنھوں نے مشرقی پاکستان کو بحری حدود میں بھارتی جہازوں کی آمد کو روکے رکھا۔

ادھر چین نے جو پاکستان کا مثالی دوست تھا، بھارت کو ۲۴ گھنٹوں کا الٹی میٹم دیا تھا کہ اس کی دو ہزار وہی بھیڑیں چین کو واپس دی جائیں جنھیں چین بھارت سرحد سے بھارت نے اغوا کیا ہے ورنہ چین بھارت کے خلاف جنگ شروع کردے گا بعض قارئین کو شاید علم نہ ہو کہ سابقہ مشرقی پاکستان کی سرحد پر ایک جگہ ایسی ہے جسے چینی بارڈر سے بھارت کی صرف ۱۸ میل چوڑی پٹی جدا کرتی ہے جنگ کی صورت میں چین بہت آسانی سے اس ۱۸ میل کی پٹی کو عبور کر کے سابقہ مشرقی پاکستان میں داخل ہوسکتا تھا۔ اس جنگ میں پاکستان کی بھارت پر بالادستی بالکل عیاں تھی اسی لیے بھارت نے غیراعلانیہ جنگ شروع کرنے اور ۶ ستمبر کی سہ پہر کو بھارتی کمانڈر انچیف جنرل چودھری کی ڈینگ مارنے کہ شام کو شراب کا پیک وہ لاہور جیم خانے میں پیے گا، جب جنگ کا بدلا ہوا پانسہ دیکھا اور پاکستان کے جوابی حملے میں کھیم کرن کا اہم قصبہ پاکستان کے قبضے میں چلا گیا تو بھارت نے خوف زدہ ہو کر اپنا دارالحکومت دہلی سے عارضی طور پر الہ آباد شفٹ کردیا اور سلامتی کونسل میں بھارتی نمائندہ چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ ہم ابھی اور اسی وقت جنگ بندی کے لیے تیار ہیں۔ یہ واقعات تو بہت دلچسپ اور طویل ہیں۔ یہاں پر میں نے ان کا ذکر محض اس لیے کیا ہے کہ امریکی CIA، برٹش M-5 اور بھارتی انٹیلی جنس کور اور موساد نے جب پاکستان کی مدد کے لیے آگے بڑھنے والے ان ممالک کو دیکھا تو انھوں نے پاکستان کے ان ہمدرد ممالک کو پاکستان سے بدظن کرنے کی کوششیں شروع کردیں اور وہ اپنی کوششوں میں اس قدر کامیاب رہے کہ سن ۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں بھارتی چالاکیوں اور اپنوں کی غداری سے پاکستان دولخت ہوگیا لیکن پاکستان کے ان سابقہ ہمدرد ملکوں نے بھول کر بھی نہ پوچھا کہ بھیا کس حال میں ہو۔ ایران میں ہمارا مشن یہ تھا کہ ان پاکستان دشمن ایجنسیوں کے نمایاں ایجنٹوں کو ہلاک کر کے گر ختم نہ کرسکیں تو کم ازکم اس حد تک مفلوج کردیں کہ یہ مدتوں تک اپنی پاکستان دشمن کارروائیوں سے باز رہیں۔ ہمیں ان ایجنسیوں کے ایجنٹوں کا کھوج لگانا اور انھیں ختم کرنا تھا۔ مجھے جو معلومات دی گئی تھیں ان کے مطابق ایرانی مسلمانوں کی اکثریت پاکستان کی حامی تھی۔ مجھے چند ایسے ایرانیوں کے نام اور ایڈریس بھی دیے گئے تھے جو پاکستان کے مفاد کے لیے بڑے سے بڑا رسک بھی لے سکتے تھے۔ جانباز کے اس حصے میں ان ایرانیوں کے صحیح نام تحریر نہیں کروں گا کیوں کہ اگرچہ انقلاب ایران کے بعد وہاں موساد، سی آئی اے اور ایم ۵ کی سرگرمیاں بہت محدود ہوچکی ہیں لیکن ان پاکستان کے ہمدردوں اور ان کے لواحقین کو اب بھی ان دشمن ایجنسیوں کے ایجنٹوں سے جان ومال کا خطرہ ہوسکتا ہے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں اپنے کام کا آغاز رام سر سے کرنا تھا۔ اس شہر میں شہنشاہ کا سرمائی محل تھا اور یہ کیسپین سی کے کنارے واقع ہے۔ اس دور کے USSR کی سرحدیں یہاں سے قریب ہی کیسپین سی کے دوسری جانب تھیں یہاں ہمیں پاکستان کے ایک ہمدرد سے ملنا اور بعض معلومات حاصل کرنی تھیں۔ اسی شہر میں امریکی CIA کا ایک چھوٹا اڈہ بھی تھا جہاں سے وہ روس

کے جہازوں کو مانیٹر کرتے تھے اور اسی اڈے میں دو امریکی جاسوس تھے جنھیں خصوصی طور پر پاکستان کے خلاف کام کرنے کی ہدایات دی گئی تھیں۔

☆☆

میں نے ساتھیوں سے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہم اپنے مشن کا آغاز رام سر سے کریں گے۔ ہمیں سب سے بڑی رکاوٹ یا خوف یہ تھا کہ اگرچہ ہمارے کمروں کی چابیاں مکان مالکہ نے ہمیں دے دی تھیں لیکن اس کے پاس بھی ڈپلیکیٹ چابیاں ضرور ہونی چاہییے تھیں۔ پے انگ گیسٹ ہاؤس چلانے والی کمروں کی فالتو چابیاں اپنے پاس ضرور رکھتے ہیں۔ ہماری غیرموجودگی میں مکان مالکہ اگر ہمارے کمرے کھولتی تو اسے یقیناً رائفلوں اور بموں سے بھرے سوٹ کیس اور وہ تمام ڈائریاں اور انتہائی اہم کاغذات بھی ہاتھ لگ سکتے تھے جو ہمیں سعودی عرب سے را اور موساد کے ایجنٹوں کو ہلاک کرنے کے بعد ان کے گھروں اور جیبوں سے ملے تھے۔ میں نے اس پریشانی کا یہ حل تجویز کیا کہ رضی، سپنا اور دونوں سپاہیوں کو گھر پر ہی رہنے دیا جائے اور اور مزمل، عمران، قیصر، ماہا اور JCO منصف کو ہمراہ لے جاؤں۔ اس طرح گھر کا اہم سامان بھی محفوظ رہے گا اور رام سر جیسے چھوٹے شہر میں ہمیں رہائش کے لیے بھی زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔ میں نے اپنے ہمراہ جانے والے ساتھیوں کو دو روز بعد رام سر روانگی کا بتایا تاکہ وہ مکمل تیاری کے ساتھ چل سکیں۔ میں نے اپنے ہمراہ ۱۲ دستی بم بھی لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ریوالور اور پسٹل تو پہلے ہی ہمارے پاس موجود تھے اسی شام جب میری ملاقات مکان مالکہ سے ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ رام سر میں کسی معقول ہوٹل کا بتاسکتی ہے کیوں کہ تفریح اور سیر کی غرض سے میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ایک ہفتے کے لیے رام سر جارہا ہوں۔ ”وہاں تو کوئی رہائشی ہوٹل نہیں البتہ دو تین ریسٹورنٹس ہیں اگر آپ پسند کریں تو میں اپنے ایک جاننے والے کے لیے خط دے سکتی ہوں جو وہاں آپ کی رہائش اور خوراک کا انتظام کردے گا۔ آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔ اس گرمی کے موسم میں رام سر سیروتفریح کے لیے کوئی نہیں جاتا وہاں تو سیروتفریح کے دلدادہ سردیوں میں جاتے ہیں۔ کیا وہاں آپ محض تفریح کے لیے جارہے ہیں یا کوئی اور کام بھی ہے۔“ میں نے مکان مالکہ کے اس ذاتی سوال کا برا مناتے ہوئے جواب دیا ”مسز زہرا زہدی، ہم آپ کے کرایہ دار ہیں اور میں نے آپ سے صرف رام سر میں کسی رہائشی ہوٹل کا پوچھنا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ ہم سیروتفریح کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ آپ کا اس طرح کے سوال پوچھنا مناسب نہیں“ مسز زہرا زہدی مسکراتے ہوئے بولی ”اگر آپ کو میری بات بری لگی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ لیکن میں نے یہ سوال محض اپنی معلومات کے لیے نہیں پوچھا تھا۔ آپ کے ایران پہنچنے کے ساتھ مجھے آپ کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی شیرٹن ہوٹل کے ہاؤس کیپنگ والا کارکن ہمارا ہی آدمی ہے اور وہ میرے کہنے پر ہی آپ کو اس گھر میں لایا تھا۔ میں کون ہوں اور میرا رابطہ کن

سے ہے، اس کے متعلق آپ پاکستانی سفارت خانے کے سیکنڈ ملٹری اتاچی میجر ظفر سے پوچھ لیں۔ وہ بھی آپ ہی کے سابقہ محکمے کا آدمی ہے اور اسی کی ہدایت پر میں نے آپ کو اپنے گھر میں رکھا ہے۔"
مسز زاہدی کی یہ بات سن کر تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہم نے تو ایران آنے اور اپنے مشن کو خفیہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن ہمارے یہاں پہنچنے کے ساتھ ہی ہمارے چرچے بھی یہاں پہنچ چکے تھے۔ مجھے فی الحقیقت اپنے سابقہ محکمے والوں کی ہماری ہر حرکت پر نگاہ رکھنے والی بات اچھی نہیں لگی۔ وہ یہ کام چاہے ہماری بھلائی کے لیے ہی کر رہے ہوں لیکن جب ہم نے ان سے کوئی مدد نہیں مانگی تو انھیں بھی ہمہ وقت ہماری نگرانی کرنے کی کیا ضرورت تھی، آخر اور بھی لاکھوں پاکستانی غیر ممالک میں آتے جاتے رہتے تھے۔ کیا وہ ان سب کی نگرانی (Survillance Lance) کرتے تھے؟ میں نے مسز زاہدی کو کہا کہ میں پہلے پاکستانی سیکنڈ ملٹری اتاچی سے مل لوں اس کے بعد اس موضوع پر اس سے بات کروں گا۔ اگلی صبح میں پاکستانی سفارت خانے گیا اور میجر ظفر سے ملنے کے لیے ریسپشن والوں کو کہا۔ جلد ہی مجھے میجر ظفر کے کمرے میں پہنچادیا گیا۔ میجر ظفر نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور چپڑاسی کو چائے لانے کا کہتے ہوئے بولا "یہاں آپ کو پاکستانی چائے پلواتا ہوں جو سارے ایران میں نہیں ملتی"۔ چائے پیتے ہوئے میں نے میجر ظفر کو کہا "میں اور میرے ساتھی ایران میں سیروتفریح کے ساتھ ساتھ ایک دو چھوٹے موٹے کام کے لیے آئے ہیں۔ ہم لوگ جس مکان میں ٹھہرے ہیں بلکہ ٹھہرائے گئے ہیں اس کی مالکہ مسز زاہدی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کی ہدایات پر اس نے یہ انتظام کیا تھا کہ میں اور میرے ساتھی ہوٹل سے آپ کے پلان کے مطابق اس کے گھر میں ٹھہریں۔ کیا آپ نے اسے یہ ہدایات دی تھیں اور وہ اور آپ میرے اور میرے ساتھیوں کے متعلق کیا کچھ جانتے ہیں"۔ میجر ظفر خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ میں نے بات ختم کی تو وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا "میں نے اپنی طرف سے مسز زاہدی کو کچھ نہیں کہا مجھے جو ہدایات اسلام آباد سے دی گئیں میں نے ان کے مطابق عمل کیا۔ ویسے تو آپ کی تسلی کے لیے میں اسلام آباد سے موصول ہونے والا وائرلیس پیغام آپ کو دکھا سکتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی آپ کو یہ بھی بتادینا چاہتا ہوں کہ میں بھی آپ کے سابقہ محکمے سے یہاں بھیجا گیا ہوں"۔ میجر ظفر نے اپنے کمرے میں پڑی آہنی الماری سے ایک فائل نکالی جس کے کور پر سرخ حروف میں CLASSIFIED (خفیہ) لکھا ہوا تھا۔ اس فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر مجھے دیتے ہوئے میجر ظفر بولا "اسے پڑھ لیں" اس کاغذ پر ہمارے گروپ کے ایران آنے کا لکھا ہوا تھا اور میجر ظفر کو خصوصی ہدایات دی گئی تھیں کہ ہمیں کسی طور بھی مسز زاہدی کے ہاں ٹھہرنے پر رضامند کرے اور اگر ہم یہ بات نہ مانیں تو اس صورت میں ہماری ہر ممکن مدد کی جائے۔ میں نے حساب لگایا تو کراچی سے ہمارے ایران کے ٹکٹ خریدنے کی تاریخ سے اگلے دن یہ پیغام تہران بھیجا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کراچی میں بھی ہم جتنے روز رہے

میرے سابقہ محکمے والے ہماری نہ صرف نگرانی کرتے رہے بلکہ ہمارے متعلق ہر بات سے میرے سابقہ محکمے کے ہیڈ کوارٹر کو مطلع کرتے رہے۔ میجر ظفر نے مجھے اپنا شناختی کارڈ بھی دکھایا جو میرے سابقہ محکمے کا جاری کردہ تھا۔ "میجر ظفر! آپ کی تمام باتیں درست ہیں لیکن میں ایک بات واضح طور پر بتادینا چاہتا ہوں کہ میں اور میرے ساتھی آزادانہ طور پر اور محکمے کی دی ہوئی گائیڈ لائن کے بغیر کام کررہے ہیں۔ میرے سابقہ محکمے کی وفاداریاں ملکی حکومتوں کے بدلنے کے ساتھ ہی بدل جاتی ہیں جب کہ ہم صرف اور صرف پاکستان کی بھلائی اور پاکستان کے دشمنوں کو ختم کرنے کے لیے ہر طریقہ استعمال کرتے ہیں اگر ہمیں کبھی آپ کی مدد کی ضرورت پڑی تو آپ سے ضرور رجوع کریں گے ورنہ ہم اپنے اصولوں اور طور طریقوں سے آزادانہ طور پر کام کریں گے" میں نے میجر ظفر کو جب اتنا روکھا جواب دیا تو وہ کہنے لگا "آپ اپنا مشن انجام دینے میں پوری طرح آزاد ہیں میں صرف آپ کو ان لوگوں کی ایک لسٹ دوں گا جو پاکستان کے خلاف کام کرتے ہیں اور پاکستان ایران برادرانہ جذبات کو ختم کرنے میں دن رات کوشاں ہیں۔ اس لسٹ سے آپ کو ان کے اصل چہرے دکھائی دیں گے اگر آپ ان کی منافقانہ چالوں اور حربوں کو ختم کرسکے تو نہ صرف آپ کا سابقہ محکمہ جو آپ کی انتہائی قدر کرتا ہے، آپ کا مشکور ہوگا بلکہ سارا پاکستان آپ کا ممنون احسان ہوگا"۔ یہ کہتے ہوئے میجر ظفر نے دو صفحے کی ایک لسٹ مجھے دی اور کہا کہ میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں مسز زاہدی کے متعلق میجر ظفر نے کہا کہ وہ ہمارے محکمے کے پے رول پر ہے اور پاکستان ایران تعلقات کی بہتری کے لیے ہمہ وقت بڑے کام کرنے کو تیار رہتی ہے اور میں اس پر مکمل اعتماد اور بھروسا کرسکتا ہوں۔ میجر ظفر نے میرے سامنے ہی مسز زاہدی کو فون کر کے بتایا کہ میں اس کے پاس بیٹھا ہوں اور وہ مجھ سے ہر ممکن تعاون کرے۔ چونکہ ہمارے سفارت خانے کے ٹیلی فونز پر آبزرویشن لگی ہوئی تھی اس لیے ظفر نے صرف اتنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ میجر ظفر نے مجھے یہ بتادیا کہ پاکستانی سفارت خانے میں صرف وہی اس محکمے سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا اگر کبھی کوئی ضرورت پیش آئے تو میں صرف اسی سے بات کروں۔

میجر ظفر سے مل کر میں واپس گھر لوٹا۔ مسز زاہدی اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی مجھے دیکھتے کے ساتھ ہی کہنے لگی "کیا اب بھی تم مجھے رام سر میں اپنے مشن کے متعلق نہیں بتاؤ گے"۔ میں یک لخت کسی پر اعتبار نہیں کرتا لہٰذا میں نے مسز زاہدی کو کہا "میجر ظفر نے مجھے تمہارے متعلق سب کچھ بتادیا ہے، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ یہاں ہم اس کے گھر میں ٹھہرے ہیں جو پاکستان کی بے حد حامی ہے۔ رام سر ہم اس لیے جارہے ہیں کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہاں کچھ لوگ ایران اور پاکستان کے خلاف کام کررہے ہیں۔ ہمیں نہ تو ان کے نام معلوم ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی اتا پتا ہے۔ محض ایک انتہائی معمولی شناخت کے سوا ہمارے پاس فی الحال انھیں تلاش کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں

ہے۔ ہمارا اس دفعہ رام سر جانے کا مقصد انھیں تلاش کرنا اور اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو ان کے حفاظتی حصار کا جائزہ لینا ہے"۔ مسز زاہدی کہنے لگی "اگر آپ چاہیں تو آپ کو رام سر لے جانے اور واپس لانے کے لیے ٹیکسیوں کا بھی انتظام کردوں۔ ایک ٹیکسی کے ڈرائیور طفیل پر آپ پورا اعتماد کرسکتے ہیں۔ وہ رام سر سے بخوبی واقف ہے اور اس کے ذریعے آپ کو اپنی منزل تک پہنچنے میں آسانی رہے گی"۔ میں نے مسز زاہدی کو دو ٹیکسیوں کا انتظام کرنے کو کہا۔ ہمارے پلان کے مطابق ہم نے رام سر میں پوری کوشش کرنی تھی کہ پہلی بار ہی ہم اپنے مشن کو مکمل کرکے لوٹیں۔ میں اس مشن کے دوران گاڑی کی خرابی یا کسی ایسی رکاوٹ کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا اس لیے میں نے دو امریکی بڑی گاڑیوں شیورلیٹ اور بیوک جو ٹیکسی کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں، مسز زاہدی کے ذریعے بک کروائیں۔ مسز زاہدی نے رام سر میں اسد اللہ اکبر کے نام ایک خط دیا جس میں رام سر میں ہمارے قیام اور طعام کے علاوہ ہماری ہر ممکن مدد کرنے کا لکھا۔ مسز زاہدی نے مجھے خط دینے کے بعد اسد اللہ اکبر کو میرے سامنے ہی فون کر کے کہا کہ چھ انتہائی اہم اور "اپنے" پاکستانی لوگ کل بعد دوپہر رام سر پہنچیں گے۔ ان کے قیام اور طعام کا وہ فوری انتظام کرے اور ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرے۔

اگلے روز صبح ۹ بجے دو شیورلیٹ پرائیوٹ ٹیکسیاں گھر پر آگئیں اور میں، مزمل، قیصر، عمران، ماہا اور JCO منصف اپنے سوٹ کیسوں کے ساتھ دوسرے ساتھیوں اور مسز زاہدی سے رخصت ہو کر رام سر کے لیے روانہ ہوگئے۔ میں خلیل ڈرائیور کی ٹیکسی میں جو ذرا لنگڑا کر چلتا تھا۔ قیصر اور ماہا کے ساتھ بیٹھا اور دوسری گاڑی میں تینوں دوسرے ساتھی۔ خلیل نے بتایا کہ رام سر جانے کے لیے ہم کو دس ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر جانا اور پھر زمین کے لیول تک جانا ہے اور اس تمام سفر میں تقریباً آٹھ گھنٹے صرف ہوں گے۔ تہران شہر کی گہما گہمی ختم ہوگئی تو باغات اور خوش نما گھروں کے سلسلے شروع ہوگئے۔ خلیل نے گائیڈ کے فرائض انجام دینے بھی شروع کردیے ہر باغ اور گھر کے مالک کے متعلق وہ مختصراً ہمیں بتاتا جاتا۔ پہاڑ کی ۵ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچنے سے پہلے خلیل نے ہمیں دو باغوں کی سیر بھی کروائی۔ جہاں ہم نے درختوں پر لگے پھل اور نہر کا شیریں اور ٹھنڈا پانی پیا۔

☆☆

تہران سے رام سر کا سفر ہم نے راستے میں رکتے، باغوں کی سیر کرتے اور پہاڑ کی انتہائی بلندی پر مبنی ایک لمبی سرنگ جہاں پر فی الحقیقت سردی کی وجہ سے ہمارے دانت بجنے لگے تھے، کو عبور کرکے پھر ڈھلوانی پیچ وخم کھاتی سڑک پر سے ہوتے شام سات بجے کے قریب طے کیا۔ رام سر کیسپین سی کے کنارے آباد ہے۔ شہر کے مضافات میں ہی خلیل نے بائیں جانب ایک چھوٹی سڑک پر اپنی گاڑی موڑی اور ایک بڑے بنگلے کے سامنے گاڑی روک کر ہمیں بتایا کہ یہ اسد اللہ اکبر کا گھر ہے۔ بیل بجانے پر ایک ملازم باہر آیا۔ خلیل نے فارسی زبان میں اسے کہا کہ تہران سے مہمان آگئے ہیں۔

ملازم اندر گیا اور چند منٹوں میں ہی اسد اللہ اکبر نے باہر آکر ہم سب سے (ماہا کے سوا) معانقہ کیا اور پرانی رسم و رواج کے مطابق ہم نے ایک دوسرے کے گال چومے۔ اسد اللہ کے دو اور ملازم بھی آگئے اور ہمارا سامان اٹھا کر اندر لے گئے۔ خلیل اور دوسرے ڈرائیور نے بھی رام سر میں ہمارے قیام کے دوران وہیں ٹھہرنا تھا۔ اسد اللہ نے انھیں فرنٹ کوارٹرز کی طرف بھیجا اور ہمیں گھر کے اندر لے گیا اس کے وسیع ڈرائنگ روم میں ایک جانب مغربی انداز کے صوفے اور ٹیبل وغیرہ تھے اور دوسری طرف مشرقی انداز کی نشست گاہ تھی۔ ایک بڑے اور قیمتی قالین پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی اور دونوں دیواروں کے ساتھ مخملیں گاؤ تکیے پڑے تھے۔ اسد اللہ اکبر نے کہا کہ ہم پہلے غسل کرکے سفر کی تھکاوٹ دور کریں پھر ڈرائنگ روم میں نشست ہوگی، اس نے اپنے بنگلے کے چھ کمرے ہمارے لیے تیار کررکھے تھے۔ ہم نے غسل کیا۔ تازہ دم ہوئے اور آدھ گھنٹے کے اندر ڈرائنگ روم کی فرشی نشست گاہ میں بیٹھ گئے۔ اسد اللہ ہم سے اتنی بے تکلفی اور اپنائیت برت رہا تھا جیسے ہم برسوں سے اسے جانتے ہوں۔ اس کی انگریزی، اردو اور فارسی کی ملی جلی گفتگو کانوں کو بہت بھلی محسوس ہوتی تھی۔ فارسی کو دنیا بھر میں شیریں زبان کہا جاتا ہے میں تھوڑی بہت فارسی جانتا تھا لیکن اپنی اس کم مائیگی کو میں نے چھپائے رکھا اور ہم سب انگریزی اور اردو میں باتیں کرتے رہے۔ پہلے تازہ پھلوں کے کئی طشت ہمارے سامنے رکھے گئے پھر چائے اور خشک فروٹ۔ ایرانی میزبان ایک لمحے کو بھی اپنے مہمانوں کو کچھ کھاتے پیتے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ آپ نے ذرا سا ہاتھ بڑھایا اور میزبان نے آپ کے نہ نہ کرنے کے باوجود آپ کی پلیٹ بھردی۔ ہماری یہ نشست رات کے کھانے کے بعد تک جاری رہی۔ سارے دن کے سفر اور تھکاوٹ سے جب ہماری آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں تو اسد اللہ نے ہمیں شب بخیر کہا اور ہم اپنے کمروں میں لمبی تان کر جو سوئے تو دوسرے روز دن چڑھے آنکھ کھلی۔ میں نہا دھو کر تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ تھوڑی دیر میں ہی سارے ساتھی وہاں پہنچ گئے۔ ڈرائنگ روم کے بغل میں ڈائننگ روم تھا وہاں پر تکلف ناشتہ کرنے کے بعد میں نے ساتھیوں کو کہا کہ میں اسد اللہ سے یہاں کے حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ سارے ساتھی اپنے کمروں میں چلے گئے تو میں نے اسد اللہ کو مسز زاہدی کا خط دیا۔ مختصر سا تعارفی خط تھا۔ اسد اللہ نے خط پڑھ کر کہا کہ مسز زاہدی سے آج صبح بھی اس کی ٹیلی فون پر بات ہوئی ہے۔ خط جیب میں رکھتے ہوئے اسد اللہ نے کہا "فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں" میں اسے اپنے یہاں کے مشن کے متعلق کچھ بتانے سے کترا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ بات کا آغاز وہ کرے۔ یہاں کے حالات کیسے ہیں، مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے اس کے مطابق رام سر میں کچھ بدیسی لوگ پاکستان اور ایران کے تعلقات کو خراب کرنے میں مصروف ہیں اور وہ ایران کے متعلق بھی دوستانہ خیالات نہیں رکھتے" میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ اسد اللہ نے جو میری نہایت محتاط انداز میں گفتگو کے آغاز کو سن رہا تھا مسکراتے ہوئے بولا "آقا! اگر آپ مجھے

کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھتے تو میں ہی کھل کر بات کروں گا۔ یہاں پر امریکا نے روس کی پروازوں کو مانیٹر کرنے کے لیے سمندری جہاز کی شکل کا ایک اڈہ بنایا ہوا ہے۔ ظاہری طور پر یہ اڈہ کیپسین ہی میں اس مخصوص مچھلی کے غول کو تلاش کرنے کے لیے بنایا گیا ہے جس کے انڈے (CAVIARE) کھانے کے ضمن میں دنیا بھر میں سب سے قیمتی ہیں۔ ایرانی حصے کے کیپسین Sea (سمندر) میں اس نسل کی جو مچھلی پائی جاتی ہے اس کے انڈے دس ہزار ڈالر فی کلو کے حساب سے بکتے ہیں اور دنیا بھر کے امرا و رؤسا اپنی سال بھر کی ضرورت کے انڈوں کی قیمت ایڈوانس ہی جمع کروادیتے ہیں۔ ظاہری طور پر ان مچھلیوں کی تلاش کے پردے میں اس اڈے پر جو آلات نصب ہیں وہ روس کے اندر خاص گہرائی میں روسی ایئرفورس کے جہازوں کے علاوہ ان کے میزائل سسٹم کو بھی مانیٹر کرتے ہیں۔ یہاں تک ان کا جو کام ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن پاکستان اور ایران کے برادرانہ تعلقات کو ختم کرنے کی ان کی اب تک کی کوششوں پر ہمیں اعتراض ہے۔" میرے یہ پوچھنے پر کہ کیپسین سی کے کنارے اس الگ تھلگ شہر سے وہ پاکستان اور ایران کے تعلقات پر کیونکر اثرانداز ہوسکتے ہیں، اسد اللہ نے کہا "بہت آسانی سے، شاہ کا سرمائی محل یہاں ہے اور موسم سرما میں وہ اکثر اپنے دوست احباب کے ساتھ یہاں سیر وتفریح کے لیے آتا ہے ان کے مہمانوں میں کئی ملکوں کے سربراہ اور سیاست دانوں کے علاوہ دنیا بھر کے امیر ترین کاروباری اداروں کے مالک شامل ہوتے ہیں۔ یہاں تہران کے شاہی محل کے پروٹوکول سے ہٹ کر شاہ آزادی سے اپنے دوستوں کی مہمان نوازی کرتا ہے ساحل کے ایک مخصوص حصے پر شاہ اور اس کے مہمان بے تکلفی کے ماحول میں نہاتے اور آفتابی غسل کرتے ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق اس اڈے پر کام کرنے والے امریکیوں میں موساد کے دو ایجنٹ بھی ہیں جنھیں یہ کام سونپا گیا ہے کہ وہ ساحل سمندر پر شاہ اور اس کے مہمانوں کی موجودگی کے وقت غوطہ خوری کے لباس میں سمندر سے ساحل پر آئیں اور شاہ یا کم ازکم اس کے چند دوستوں کو ہلاک کرکے پھر سمندر کے اندر چلے جائیں۔ جب شاہ یہاں آتا ہے تو ساحل پر اس کے لیے مخصوص جگہ کے دونوں اطراف اور پیچھے پولیس اور فوج کے جوانوں کا کڑا پہرہ ہوتا ہے لہٰذا صرف سمندر کی جانب سے ہی وہاں تک پہنچا جاسکتا ہے۔ سمندر میں بھی ایک گن بوٹ خاصے فاصلے پر سمندر کی جانب سے آنے والوں کو روکنے کے لیے موجود رہتی ہے"۔ "لیکن اس سے راستے میں پاکستان کے تعلقات خراب ہونے کی بات کہیں فٹ نہیں ہوتی"۔ میرے ٹوکنے پر اسد اللہ بولا "میں اسی طرف آرہا ہوں دراصل ہم ایرانیوں کی ایک عادت ہے کہ جب تک کسی بات کی ایک ایک تفصیل بیان نہ کردیں ہمیں تسلی نہیں ہوتی۔ پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے جو شاہ رضا کے دوست بھی تھے، شاہ کی ذاتی حفاظت کے لیے چھ فوجی محافظ بھیجے تھے ہمارے ملک کے اندرونی خلفشار کی وجہ سے شاہ اپنوں سے زیادہ پاکستانیوں پر اعتبار کرتے ہیں۔ وہ چھ محافظ ہمیشہ شاہ کے قریب اور اردگرد رہتے

ہیں۔ یہاں ساحل سمندر پر شاہ کی آمد کے وقت بھی صرف وہ پاکستانی محافظ ہی شاہ کے قریب ہوتے ہیں جب کہ ایرانی فوجی اور کمانڈوز شاہ سے خاصے دور اپنی ڈیوٹی دیتے ہیں۔ ان اسرائیلی ایجنٹوں کا پلان یہ ہے کہ شاہ کی یہاں آمد کے ساتھ ہی دو پاکستانی محافظوں کو اغوا کرلیا جائے اور انھیں ہلاک کرکے غوطہ خوری کے لباس پہنا دیے جائیں۔ اسرائیلی جاسوس اسی قسم کی غوطہ خوری کے لباس میں شاہ اور اس کے دوستوں پر حملہ آور ہوں اور کامیاب آپریشن کے بعد سمندر میں کود جائیں۔ شاہ کے محافظ یقیناً ان پر گولیاں چلائیں گے جو ہلاک شدہ پاکستانی محافظوں کو لگیں گی ان کی لاشیں پانی کی سطح پر آجائیں گی اور اسرائیلی جاسوس پانی کے اندر ہی اندر اپنے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔ اس طرح ایران اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان جو تھوڑا بہت رشتہ باقی ہے، وہ بھی ختم ہوجائے گا" اسد اللہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا کہ وہ کس حد تک اس سازش کو ناکام بنانے میں ہمارے ساتھ جاسکتا ہے۔ اسد اللہ نے جواب دیا کہ وہ ہرممکن حد تک ہماری مدد کرے گا۔ میرے یہ پوچھنے پر کہ اس سازش کے متعلق اس نے حکومت کو اطلاع کیوں نہیں دی اسے تو مالا مال کردیا جاتا۔ اسد اللہ ہنس کر بولا "آپ مالا مال کی بات کررہے ہیں یہاں امریکی اور یہودی لابی اس قدر مضبوط ہے کہ اول تو کسی نے ہماری بات پر یقین نہیں کرنا تھا اور اگر حکومتی افسر ہماری اطلاع سے شاہ کو آگاہ کرنا چاہتا تو اس کے گرد کھنچے امریکی اور یہودی حصار کو پار کرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا۔ الٹا اس افسر کے خلاف کارروائی کی جاتی اور اسے اس سازش کا کردار بنا کر یا تو گولی مار دی جاتی اور یا زندگی بھر وہ زیرزمین قید خانے میں گزارتا۔ اسی لیے میں نے آپ کو جو ہرممکن مدد کا کہا ہے وہ صرف اخلاقی مدد ہوگی۔ ہم نے اس سازش کی اطلاع پاکستانی سفارت خانے کو دی تھی۔ مسز زاہدی کا شوہر بھی پاکستان میں ایران کا ملٹری اتاچی رہ چکا تھا۔ اسے بھی یہودی لابی نے تہران میں قتل کروادیا کیوں کہ اس نے پاکستان کے مفاد میں بہت زیادہ کام کیا تھا اور سن ۶۵ء میں اسی کی کوششوں سے پاکستانی ایئرفورس کے جہازوں کو ایران میں لینڈ کرنے اور پٹرول لینے کی اجازت دی گئی تھی۔ اسی "جرم" کی پاداش میں اسے قتل کروادیا گیا۔ یہاں بھی میرے ہم خیال بہت سے ایرانی ہیں لیکن خوف کی وجہ سے وہ کسی قسم کی عملی کارروائی میں حصہ نہیں لیں گے۔ اگر آپ اس مشن کو مکمل کرسکے تو پاکستان کے حامی ایرانیوں کے حوصلے بھی بلند ہوں گے اور وہ بھی اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے سازشوں کے جال کو توڑنے کی کوشش کریں گے" میں نے اسد اللہ کو کہا کہ آپ ہماری صرف یہ مدد کریں کہ ان یہودیوں کی ہمیں شناخت کروادیں اور اس اڈے تک اور ان کی رہائش گاہ تک ہماری رہنمائی کریں جہاں سے یہودی اور امریکی اپنی کارروائیاں کرتے ہیں اسد اللہ نے کہا "اڈے تک تو میں آپ کو پہنچاسکتا ہوں جہاں تک ان یہودیوں کی شناخت کا تعلق ہے تو اس کے لیے میں اس ایرانی کو بلواتا ہوں جو ان یہودیوں کے لیے بازار سے گوشت خریدتا ہے۔ امریکی تو بند ڈبوں کی خوراک کھاتے ہیں جو امریکا سے ان کے

لیے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ یہودی چونکہ حلال گوشت کھاتے ہیں لہٰذا ان کے لیے بازار سے خریداری کی جاتی ہے" اسد اللہ مجھ سے رخصت ہو کر شہر کی طرف گیا میں نے ڈرائنگ روم میں اپنے ساتھیوں کو بلوایا اور انھیں اسد اللہ سے ہو۔نے والی گفتگو کے متعلق بتایا۔ ماہا نے کہا "آپ لوگ پہلے اڈہ اور اس میں کام کرنے والوں کی تعداد اور اسرائیلیوں کو شناخت کرلیں اپنے ہم وطنوں سے کیونکر نمٹا جاتا ہے یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ مشن کے دوران مجھے صرف کور دیں باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں"۔ میں نے ماہا کو کہا کہ ابھی تو ہمیں ان اسرائیلیوں کو تلاش کرنا ہے اس کے بعد میں یہ فیصلہ کروں گا کہ مشن کو کس طرح اور کون انجام دیتا ہے۔ دراصل میں یہ نہیں چاہتا کہ ہم ہٹے کٹے مردوں کی موجودگی میں ماہا سے محض اس لیے کام لیا جائے کہ وہ ہماری ٹیم کی ممبر ہے اور موساد کے ایجنٹوں کو زیادہ بہتر طور پر TERATMENT (سلوک) دے سکتی ہے۔

☆☆

اسی روز شام ڈھلے اسد اللہ کے ملازم نے مجھے میرے کمرے میں آکر کہا کہ اسد اللہ اور ایک آدمی ڈرائنگ روم میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اسد اللہ نے اس ملاقاتی کا یہ کہہ کر تعارف کروایا کہ یہ امریکی اڈے پر کام کرنے والے یہودیوں کے لیے بازار سے سودا سلف لاتا ہے۔ اس شخص کے چہرے سے ہی عیاری جھلک رہی تھی میں تو یہ سمجھا تھا کہ اسد اللہ اس سے ان یہودیوں کی شناخت کے متعلق خود پوچھ کر مجھے بتائے گا لیکن وہ اس آدمی کو ہی لے آیا۔ رام سر جیسے چھوٹے اور کم آبادی والے شہر میں میں اپنے مشن کی وجہ سے اپنے اور اپنے ساتھیوں کی پہچان کو ہر ممکن حد تک چھپانا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے ساتھیوں کو تاکیداً کہہ دیا تھا کہ وہ گھر سے باہر نہ جائیں۔ یہودیوں کے لیے کام کرنے والے اس شخص نے اگر انھیں ہماری یہاں آمد اور ان کے متعلق پوچھ گچھ کی اور انھیں بتادیا تو وہ یقیناً بہت محتاط ہو جائیں گے۔ بہرحال تیر کمان سے نکل چکا تھا اسے واپس تو نہیں لایا جاسکتا تھا۔ ہمیں اب آگے کا سوچنا تھا۔ وہ شخص اچھی خاصی انگریزی بول سکتا تھا۔ میں نے اس سے پہلے ادھر ادھر کی چند باتیں کیں اور پھر اپنے مقصد پر آگیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دونوں یہودی پینتیس اور چالیس کی عمر کے ہوں گے۔ ان دونوں کے رنگ صاف، جسم گھٹے ہوئے ہیں دونوں کے قد پانچ فٹ ۹ انچ کے قریب ہوں گے یہ تو کوئی خاص بات نہ تھی جسے سامنے رکھ کر ان کی شناخت کی جاتی۔ میرے مزید کریدنے پر اس نے کہا کہ وہ عربی اور فارسی بھی روانی سے بولتے ہیں اور اکثر دن کے وقت سمندر میں نہاتے اور گیس سلنڈروں کے ساتھ غوطہ خوری کرتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر کہ وہ تو ان یہودیوں کے لیے صرف سودا اور گوشت وغیرہ لاتا ہے پھر اسے کیسے ان کے سمندر میں نہانے اور غوطہ خوری کا علم ہوا تو اس نے کہا بعض اوقات جب میں سودا خرید کر انھیں دینے جاتا ہوں تو وہ غوطہ خوری کے لیے گئے ہوتے ہیں ایسی صورت میں مجھے ان کی واپسی کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور بعض

اوقات ان دونوں میں سے کوئی غوطہ خوری کے لباس میں ہی مجھ سے سودا وغیرہ لے جاتا ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اس کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کام کا اتنا معاوضہ اور انعام وغیرہ دیتے ہیں کہ اسے کوئی اور کام کرنے کی ضرورت نہیں اور آج کا سودا ہمیشہ کی طرح وہ صبح دس بجے انھیں دے آیا ہے۔ میں نے اسد اللہ کو کہا کہ مجھے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اب صرف ایک کام اور کردے کہ ہمیں امریکیوں کا اڈہ دکھادے جس میں امریکی اور یہ یہودی کام کرتے ہیں اور اسی کے ایک حصے میں ان کی رہائش ہے میں نے دو سو ڈالر اس شخص کو دیتے ہوئے کہا کہ پندرہ منٹ انتظار کرے اور مجھے وہ اڈہ دکھادے۔ میں نے اسد اللہ کے ملازم کو کہا کہ خلیل کو کہے کہ دس منٹ میں گاڑی کمپاؤنڈ سے نکال کر باہر کھڑی کرے اور خود جاکر عمران اور قیصر کو کہا کہ فوری تیار ہو کر اور اسلحہ لے کر ڈرائنگ روم میں آجائیں۔ ہمیں روانہ ہوتے ہوئے بیس منٹ لگ گئے اور شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب ہم گھر سے روانہ ہوئے تو فرنٹ سیٹ پر خلیل کے ہمراہ میں بیٹھا اور پچھلی نشست پر درمیان میں وہ شخص اور اس کے دائیں بائیں عمران اور قیصر بیٹھ گئے اس شخص نے خلیل کو سمندر کے کنارے شہر کے بائیں جانب والی سڑک پر چلنے کو کہا۔ شہر سے تقریباً ۵ میل دور امریکیوں کا اڈہ تھا جس کا تقریباً نصف خشکی پر اور نصف سمندر کے اندر تھا یہ دور سے ایک بڑے آئل ٹینکر کی طرح دکھائی دیتا تھا ہم اس سڑک پر اڈے کے سامنے سے گزرے اور تقریباً دو کلو میٹر آگے جا کر گاڑی موڑی، اڈے پر داخلے کے دروازے پر دو امریکی میرین گارڈ روم کے باہر کھڑے تھے اور آٹھ نو امریکی گاڑیاں پارکنگ میں کھڑی تھیں۔ داخلے کی جگہ پر بیریر لگا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی گارڈ روم تھا۔ میں نے اس شخص سے جس کا نام نوری تھا، پوچھا کہ کیا وہ بتا سکتا ہے کہ اڈے میں کل کتنے لوگ رہتے ہیں تو اس نے کہا کہ وہ صحیح تو نہیں جانتا لیکن اس کے خیال میں پہرے داروں کو ملا کر کل بیس بائیس افراد وہاں رہتے ہوں گے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس اڈے پر سولہ سے زیادہ گاڑیاں ہوتی ہیں اور اس وقت اڈے کے کچھ امریکی سیر و تفریح کے لیے باہر گئے ہوں گے اسی لیے اس وقت پارکنگ میں کم گاڑیاں ہیں۔ میں نے خلیل کو گاڑی واپس گھمانے کو کہا۔ اس بار اڈے کے سامنے سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ خشکی پر بنے حصے میں کھڑکیوں سے اندر کی روشنی دکھائی دے رہی تھی جب کہ سمندری حصے میں صرف دو یا تین کمروں کی لائٹ جل رہی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ اس اڈے کے آلات اور آپریشن روم سمندر والے حصے میں تھے اور خشکی پر رہائشی کمرے اور اسٹور وغیرہ تھے۔ ہم گاڑی کو اسی سڑک پر مزید سات کلو میٹر آگے لے گئے وہاں پر ایرانی حکومت کا چھوٹا سا شپ یارڈ تھا جس میں کیپسین سی میں مچھلی پکڑنے والے ایرانی ٹرالروں اور موٹر لانچوں کی مرمت ہوتی تھی۔ اس شپ یارڈ اور امریکی اڈے کے درمیان وہ ساحل تھا جہاں شاہ اور اس کے دوست سمندر میں تیراکی اور آفتابی غسل کرتے تھے۔ وہاں پر دو کلو میٹر کے لگ بھگ ساحل پر بورڈ لگے ہوئے تھے کہ یہاں ساحل

پر اترنے اور سمندر میں نہانے کی ممانعت ہے۔ ان دونوں بورڈوں کے پاس ہی پولیس گارڈ کی دو خالی چوکیاں تھیں۔ خلیل نے بتایا کہ جب شاہی پارٹی یہاں آتی ہے تو اس سڑک کو امریکی اڈے کے ختم ہوتے ہی بند کردیا جاتا ہے اور شپ یارڈ والی چوکی سے بھی گاڑیوں کو آگے آنے کی ممانعت ہوتی ہے۔ ہماری گاڑی شپ یارڈ سے بھی خاصی آگے آچکی تھی اب خاصا اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے خلیل کو کہا کہ گاڑی کو روک لے۔ گاڑی روک کر ہم سب گاڑی سے باہر آگئے میں نے نوری کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور سڑک کی دوسری جانب لے جاتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس کوئی گاڑی ہے۔ نوری نے جواب میں نہیں کہا تو میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ ہر روز دس گیارہ کلو میٹر کا سفر اڈے والے یہودیوں کو سودا دینے اور واپس آنے کے لیے کس طرح طے کرتا ہے ''سائیکل تو تمھارے پاس ہے نہیں یہ مجھے اسد اللہ نے بتایا ہے اس لیے تم یقیناً پیدل ہی یہاں تک آتے جاتے ہوگے''۔ ''جی ہاں اسی لیے تو مجھے زیادہ معاوضہ دیتے ہیں'' ''لیکن مجھے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ تمھیں اڈے کی مارکیٹ میں لے جانے والی گاڑی تمھارے گھر سے تمھیں اٹھاتی ہے اور سودا خریدنے اور اڈے پر پہنچانے کے بعد واپس گھر چھوڑ جاتی ہے''۔ یہ سن کر نوری گھبرا گیا اور کہنے لگا ''جیسے بھی ہوتا ہو، میری ڈیوٹی صرف ان کے لیے سودا لانے کی ہے''۔ ''نوری گھبراؤ نہیں صرف میرے سوالوں کا صحیح جواب دے دو، تم ان یہودیوں کے متعلق اور کیا کچھ جانتے ہو اور کتنے عرصے سے ان کے لیے کام کر رہے ہو''۔ میں نے نوری کو دبی ہوئی وارننگ کے لہجے میں کہا ''میں چار سال سے ان کے ساتھ کام کر رہا ہوں اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا جو آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں''۔ نوری نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا ''نہیں نوری۔ تم نے ہم سے کئی اہم باتیں چھپائی ہیں تم نے یہ نہیں بتایا کہ ان یہودیوں نے تمھیں انعام میں ایک گاڑی بھی دی ہے اور تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ تمھارے بش کوٹ کی جیب میں ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ ہماری تمام گفتگو ریکارڈ کر رہا ہے اور تمھارے جسم کے ساتھ ایک لوڈ پسٹل بھی بندھا ہوا ہے'' نوری کو انعام میں دی جانے والی گاڑی کا اسد اللہ نے مجھے بتایا تھا اور میری اور میرے ساتھیوں کی ایکس رے کرنے والی نگاہوں نے جان لیا تھا کہ اس نے اپنے جسم کے ساتھ ایک پسٹل باندھ رکھا ہے اور بش کوٹ کی بیرونی جیب میں ایک ٹیپ ریکارڈ ہے جسے چلانے اور بند کرنے کے لیے نوری نے اپنی جیب میں کئی بار خالی ہاتھ ڈالا اور کچھ ڈالے اور نکالے بغیر ہاتھ جیب سے باہر نکالا۔ یہ سن کر نوری کی سٹی گم ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پسٹل نکالتا یا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا میں نے اپنا بازو جسے میں اس کے کندھے پر رکھا ہوا تھا اس کی گردن کے گرد گھما کر اسے دبوچ لیا عمران اور قیصر نے فوری طور پر اس کے بازو پکڑ لیے میرے بتانے کے عین مطابق اس کے بش کوٹ کی جیب سے چھوٹا ٹیپ ریکارڈ اور بش کوٹ کے نیچے سے پسٹل نکال لیا۔ اندھیرا خاصا پھیل چکا تھا اس لیے نوری کے چہرے کے تاثرات تو ہم نہ دیکھ سکے لیکن اس کی التجائی آواز میں اسے معاف

کرنے اور کوئی سزا نہ دینے سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس کے چہرے پر یقیناً دہشت اور خوف کے سائے منڈلا رہے ہوں گے۔ اس کی تلاشی لینے پر اس کی جیب سے گاڑی کی چابی اور ایک شناختی کارڈ اور بٹوا وغیرہ ملے۔ کارڈ امریکی اڈے کا تھا جس پر اس کا عہدہ گارڈ کا درج تھا۔ عمران اور قیصر نے اسے وہیں تھامے رکھا اور میں نے گاڑی کی روشنی میں کارڈ پر درج عبارت پڑھی اور بٹوے کے خانے ٹٹولے۔ مقامی کرنسی کے علاوہ اس میں ایک کاغذ پر میرے اور میرے ساتھیوں کی تعداد، حلیے اور جینی (ماہا) کا نام لکھا ہوا تھا ہمارے رام سر پہنچنے سے پہلے ہی اڈے پر ہماری آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی اور نوری کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ ہمیں رام سر میں تلاش کرے۔ اسے یہ زحمت اٹھانے کی نوبت ہی نہ آئی اور اسد اللہ نے اسے بلا کر ہمیں خود اس کے جال میں پھینک دیا تھا کیا اسد اللہ کی یہ حرکت دانستہ تھی یا نادانستہ ہمیں اس کا کھوج لگانا تھا۔ نوری ابھی اس غلط فہمی میں تھا کہ ہم اسے پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیں گے اس لیے اس نے یہ کہا کہ ہمارے حلیوں والا کاغذ اسے اسرائیلیوں نے دیا تھا لیکن اسے یہ علم نہیں تھا کہ ہماری تلاش سے ان کا کیا مقصد ہے۔ نوری نے کہا ''آپ اپنے دو سو ڈالر واپس لے لیں اور مجھے جانے دیں امریکیوں کے پاس ملازمت کرنا کوئی جرم تو نہیں میرے آقا بہت اثر و رسوخ والے ہیں اگر مجھے کوئی گزند بھی پہنچا تو وہ آپ لوگوں کو نہیں چھوڑیں گے'' میں نے عمران اور قیصر کو کہا کہ نوری کو چھوڑ دیں اور میرے پاس آجائیں دونوں ساتھی میرے پاس آگئے نوری ابھی وہیں کھڑا اپنے حواس کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے سائیلنسر لگے پسٹل سے دو گولیاں نکلیں اور نوری کے سینے میں پیوست ہوگئیں، ایک چیخ مار کر نوری وہیں گر پڑا۔ میں نے تیسری گولی اس کے سر میں ماری۔ نوری تو دونوں پہلی گولیوں سے ہی ہلاک ہو چکا تھا یہ تیسری گولی اس کی موت کو یقینی بنانے کے لیے تھی۔ ہم اس کی لاش کو وہیں چھوڑ کر اپنی گاڑی میں آبیٹھے اور خلیل کو واپس چلنے کو کہا۔ میرے ذہن میں ایک فوری پلان آیا اگر ہم نوری کی گاڑی لے کر آج رات ہی اڈے پر دھاوا بولیں تو اس کی گاڑی کی وجہ سے ہم با آسانی پارکنگ تک پہنچ سکتے تھے میرے پلان کے خدوخال ابھی واضح نہیں تھے میں نے خلیل کو جس نے آتے وقت نوری سے اس کے گھر کا ایڈریس پوچھ لیا تھا، اس کے گھر چلنے کو کہا۔ فلیٹوں کی ایک قطار میں اس کے گھر کے سامنے اس کی اسٹوڈی بیکر گاڑی کھڑی تھی میں نے قیصر کو گاڑی کی چابی دی اور دو تین منٹ میں ہی ہم اور قیصر اس کی گاڑی میں ہمارے پیچھے پیچھے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆☆

گھر پہنچتے ساتھ ہی میں نے عمران، مزمل اور قیصر کو کہا کہ وہ اٹیک کے لیے تیار ہوجائیں اس لیے کہ نوری کی گاڑی لے کر اڈے میں داخل ہونے کا جو موقع آج ہمیں ملا ہے وہ پھر ہمیں کبھی نہیں مل سکے گا۔ ہم نے اپنے اسلحے کے ساتھ فالتو گولیوں کے علاوہ دو دستی بم بھی لے لیے اور اسد

اللہ سے ملے بغیر جلد تیار ہو کر نوری اور خلیل کی گاڑیوں میں اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیسا کہ میں گزشتہ قسطوں میں تحریر کر چکا ہوں کہ اس حملے کی مکمل پلاننگ میں نہیں کر سکا تھا محض اس کے خدوخال میرے ذہن میں تھے۔ ساتھیوں کو اس کے سوا کچھ علم نہ تھا کہ ہم اڈے پر حملہ کرنے جا رہے ہیں میں نوری کی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور میرے ساتھ عمران اور مزمل تھے۔ سائیلنسر والا پسٹل صرف میرے اور مزمل کے پاس تھا۔ ہم اڈے کے قریب پہنچے تو میں نے گاڑی روک کر ساتھیوں کو کہا کہ ہمیں اتنا وقت شاید ہی مل سکے کہ ہم بیس بائیس افراد میں سے دو یہودیوں کو تلاش کر سکیں اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جو بھی ہمارے سامنے آیا اسے جہنم واصل کریں گے اور اگر ممکن ہوا تو سارے اڈے کو ورنہ اس کے سمندر والے حصے کو جہاں مانیٹرنگ کے آلات نصب ہیں، تباہ کر دیں گے۔ ہم سے چاہے ایک شخص مرے یا سارے مارے جائیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے اپنی زندگیاں بچانے اور اڈے والوں کے مقابلے کی مہلت دینے سے ہم بہت نقصان میں رہیں گے جو بندہ بھی سامنے آئے اسے ختم کرتے جائیں اور اس مشن کو کم سے کم وقت میں ختم ہونا چاہیے۔ یہ ہدایات دے کر میں نے قیصر کو خلیل کی گاڑی میں جانے کا کہا اور خود اکیلا نوری کی گاڑی میں اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ باقی ساتھی خلیل کی گاڑی میں مجھ سے بیس میٹر سے بھی کم فاصلے پر آ رہے تھے۔ اڈے کے گارڈ روم کے سامنے پہنچ کر میں نے گاڑی روک دی۔ خلیل کی گاڑی مجھ سے تھوڑے فاصلے پر لائٹیں بجھا کر کھڑی ہو گئی۔ گارڈ نے ٹارچ کے ساتھ نوری کی گاڑی کا نمبر دیکھا اور نوری کو پہچاننے کے لیے اسٹیرنگ والے دروازے کے قریب آیا۔ بہ یک وقت دو باتیں ہوئیں۔ گارڈ نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پھینکی اور میرے سائلنسر والے پسٹل نے شعلہ اگلا۔ گولی گارڈ کے ماتھے پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور پارکنگ میں لے جا کر کھڑی کر دی۔ اتنی دیر میں میرے ساتھیوں نے گارڈ کی لاش کو اٹھا کر چھوٹے سے گارڈ روم میں رکھا اور خلیل نے اس دوران اپنی گاڑی بھی پارکنگ میں لگا دی۔ خلیل گاڑی میں بیٹھا رہا اور میرے تینوں ساتھی میرے ہمراہ اڈے کی عمارت کے مین دروازے میں داخل ہوئے۔ ایک کشادہ لابی کے دونوں اطراف کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے کچھ کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ دروازوں کے کمروں میں ایک ایک امریکی اپنے بیڈ پر لیٹا یا کرسی پر بیٹھا کچھ کر رہا تھا۔ لابی کی ایک جانب مزمل نے سنبھال لی تھی اور دوسری میں نے۔ مزمل کے ساتھ عمران تھا اور میرے ساتھ قیصر۔ کھلے دروازوں میں کھڑے ہو کر میں اور مزمل ہیلو کہتے۔ امریکی ہماری طرف دیکھتا اور اسی وقت میرے اور مزمل کے سائیلنسروں والے پستولوں کی گولیاں ٹھس کرتیں اور اپنے اپنے شکار کو گرا لیتیں۔ ہم نے دو بار اپنے پستولوں کے میگزین تبدیل کیے اور کھلے دروازوں والے دونوں جانب کے کمروں میں اپنے شکار کو ہلاک کرتے ہم نے بند دروازوں کو آہستہ آہستہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ ہمارے کھٹکھٹانے پر کمروں کے دروازے کھلے۔ شب خوابی کا لباس پہنے امریکی دروازہ کھولتے اور فوراً

ہماری گولیاں ان کے سینوں میں پیوست ہو جاتیں۔ ہمارے نشانے اتنے پختہ ہو چکے تھے کہ ایک گولی سے ہی دشمن کی بے جان لاش بغیر آواز نکالے گر جاتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی انسان جب کسی دوسرے انسان کو مارتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں رہتی۔ جھجک اور احساس صرف پہلی گولی چلانے تک ہی ہوتا ہے پھر تو ایک ایسی جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ بیسیوں کیا، سیکڑوں انسانوں کو بھی ہلاک کر دیا جائے تو سیری نہیں ہوتی۔ میں اور میرے ساتھی اس کیفیت سے کئی بار گزر چکے تھے اور اب بھی ہماری یہی حالت تھی۔ دورانِ جنگ جب دشمن سامنے ہو تو پھر کون گنتی کرتا ہے کہ اس کے ہاتھوں کتنے دشمن مارے گئے۔ اس وقت صرف یہی خیال ہوتا ہے کہ کوئی گولی بھی ضائع نہ جائے۔ ہم نے جب اس گیلری کے تمام کمروں میں جتنے بھی لوگ تھے انھیں ختم کر دیا تو ہم سمندر والے حصے کی طرف آگے جانے ہی لگے تھے کہ ہمیں پیچھے سے ہینڈز اپ کی آواز آئی ہم نے پلٹ کر دیکھا تو ایک امریکی میرین گارڈ وردی پہنے اور ہم پر اپنا پسٹل تانے کھڑا تھا۔ یہ غالباً گارڈ روم کا دوسرا گارڈ تھا جو حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے اپنے کمرے کے باتھ روم میں اس وقت گیا ہوگا جب ہم نے وہاں کھڑے گارڈ کو ہلاک کیا تھا۔ میں نے اور عمران نے ہاتھ اٹھا لیے ہم چونکہ ہینڈز اپ کی آواز پر پیچھے کی جانب پلٹ گئے تھے اس لیے کرنل مزمل جو پہلے مجھ سے آگے قیصر کے ہمراہ سمندری حصے کی جانب جا رہا تھا اب ہمارے پیچھے تھا گارڈ ہم چار اجنبیوں کو عمارت کے اندر دیکھ کر اس قدر ہراساں ہو چکا تھا کہ اس نے جس ہاتھ سے پسٹل تھام رکھا وہ کانپ رہا تھا میں نے اپنے سامنے کھڑے گارڈ سے اوپر دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا (Bashir, beaware) ''بشیر ہوشیار رہنا'' گارڈ نے فوری ہی اپنی گردن پیچھے گھما کر دیکھا اس سے یہ عمل قدرتی طور پر اور بے ساختگی سے ہوا اس کے گردن گھمانے کی دیر تھی کہ مزمل اور میرے پستولوں سے بہ یک وقت گولیاں نکلیں اور ہم دونوں نے اس وقت تک ٹرائیگرز سے ہاتھ نہیں ہٹایا جب تک کہ دونوں کے میگزین خالی نہیں ہو گئے غالباً آٹھ یا نو بے آواز گولیاں اس گارڈ کو لگیں۔ اپنا پسٹل چلانے کی آرزو دل میں ہی لیے وہ لہراتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اور مزمل نے نئے میگزین اپنے پستولوں میں ڈالے عمران اور قیصر نے بھی اپنے ریوالور لوڈ کیے اور ہم ایک بڑا دروازہ جو اس اڈے کے آپریشنل اور رہائشی حصوں کو جدا کرتا تھا، کھول کر آپریشنل حصے میں داخل ہوئے۔ رہائشی حصے کی طرح وہاں بھی دیواروں پر آگ بجھانے والے آلات لگے ہوئے تھے۔ ہم دبے قدموں ایک کمرے کے سامنے پہنچے جس کے دروازے کھلے ہوئے تھے اس کمرے میں سامنے اور سائیڈوں کی دو دیواروں کے ساتھ ایسے برقی آلات لگے ہوئے تھے جیسے بہت بڑے ٹرانسمیٹر ہوں۔ ایک جانب سپول والے دو دیوار گیر ٹیپ ریکارڈ تھے۔ یہ تمام آلات ہمارے لیے انجانے تھے۔ ایک آلے پر جس پر کنٹرول کے لیے بیسیوں سوئچ لگے ہوئے تھے سرخ، سبز اور سفید چھوٹی لائٹیں مسلسل جل بجھ رہی تھیں۔ ایک سفید فام کرسی سے ٹیک لگائے ان آلات کی طرف منہ کیے

کوئی انگریزی دھن گنگنا رہا تھا۔ وہ خود میں اتنا محو تھا کہ میں نے جب اس کے قریب جا کر اپنے پسٹل کی نال اس کی گردن پر رکھی تو بھی اس کے وہم گمان میں یہ نہ آیا کہ کوئی باہر والے اندر آ چکے ہیں اس نے مجھے اپنا کوئی ساتھی سمجھتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے اور بولا Mac! Please don't do Practical Jokes (میک، مہربانی کر کے عملی مذاق مت کرو) it's not a joke its real (یہ مذاق نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے) میری آواز سنتے ہی اس نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی میں ذرا ہٹ کر کھڑا ہوگیا ''اب اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ'' میرے یہ کہتے ہی اس نے ہاتھ اوپر اٹھادیے۔ ''دونوں یہودی کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا تو وہ ہکلاتا ہوا بولا ''ساتھ والے اگلے کمرے میں'' مزمل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے کہا کہ سارے بلاوجہ مارے گئے۔ میں دشمن سے ہمدردی کا احساس اس کے دل سے ختم کرنا چاہتا تھا اس لیے سامنے سے ہٹ گیا اور مزمل کو کہا Muzzamil Your Prey! (مزمل یہ تمھارا شکار ہے) میری بات سنتے ہی مزمل کے چہرے سے ہمدردی کا تاثر ختم ہوگیا اور اس نے تابڑ توڑ اپنے پسٹل سے تین گولیاں اس امریکی کے سینے پر اتار دیں۔ وہ بھی وہیں ٹھنڈا ہوگیا اب ہم اگلے ساتھ والے کمرے میں گئے۔ اس امریکی نے غلط نہیں کہا تھا دونوں یہودی اپنی مخصوص مذہبی ٹوپیاں پہنے اس کمرے میں بڑے ٹرانسمیشن سیٹ کے سامنے بیٹھے کوئی پیغام بھیج رہے تھے یہ پیغام ٹیلی کوڈ میں بھیجا جا رہا تھا ہمیں دیکھتے ساتھ ہی انھیں احساس ہوگیا کہ ہم وہی ہیں جن کی تلاش کا کام انھوں نے نوری کو سونپا تھا اور ہم ان تک اس اڈے کی تمام رکاوٹیں پھلانگ کر پہنچے ہیں انھوں نے ہمیں دیکھتے ساتھ ہی اپنے ہاتھ اوپر کر لیے۔ ان کا بھیجا جانے والا پیغام ادھورا ہی رہ گیا۔ ہمارے پاس بھی ان سے پوچھ گچھ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ جو امریکن اڈے سے باہر گئے ہوئے تھے وہ کسی وقت بھی واپس آسکتے تھے میں نے مزمل کو اشارے سے اپنے قریب بلایا دونوں یہودی جاسوس ہم دونوں کے بالکل سامنے بیٹھے تھے میں نے مزمل کو کہا Joint Venture (مشترکہ کارروائی) اس سے پہلے کہ یہ یہودی زندگی کی بھیک مانگتے یا آہ وبکا کرتے ہمارے پستولوں سے نکلی ہوئی چار خاموش گولیاں ان کے جسموں میں داخل ہوئیں وہ دونوں اپنی کرسیوں سے آدھے آدھے اٹھے اور پھر یوں گرے کہ چند سیکنڈ تک ان کے جسم کانپے اور وہ ختم ہوگئے۔ میں نے ان کے بھیجے جانے والے پیغام کے کاغذ اور کوڈ بک اٹھائی اور کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے ان کے ٹرانسمیشن سیٹ پر میگزین کی باقی گولیاں چلا کر اسے ناکارہ کردیا۔ آگے کے دو کمروں میں غوطہ خوری کا مکمل سامان، گیس سلنڈر اور پانی کے اندر سے چلنے والی دو بندوقیں پڑی ہوئی تھیں جن سے گولیوں کے بجائے بارودی تیر چلتے ہیں اس کے علاوہ ان کمروں میں چھوٹے وائرلیس سیٹ اور کئی درجن رائفلیں اور ریوالور وغیرہ پڑے تھے اب قیصر نے اپنا کام دکھانا شروع کیا اس نے اسلحے کے بالکل قریب ایک دستی بم رکھ کر اس کی پن کے ساتھ ایک مضبوط دھاگا باندھ کر اسے کھلے دروازے کے ساتھ باندھ دیا ویسے ہی دو اور دستی بم

یہودیوں کے ٹرانسمیٹر اور امریکیوں کے بڑے برقی آلات اور ٹرانسمیٹرز کے ساتھ رکھ کر کھلے دروازوں سے باندھ دیے۔ اسی طرح لابی کے درمیان کے دو کمروں اور ایک داخلے کے ساتھ والے کمرے میں تین دستی بم فٹ کردیے گئے۔ قیصر نے ہمیں کہا کہ آپ خلیل والی گاڑی لے کر سڑک پر چلے جائیں مزمل اور عمران خلیل کے ساتھ گاڑی لے کر سڑک پر چلے گئے میں لابی میں کھڑا رہا۔ قیصر نے پہلے باندھے گئے تین بموں والے کمروں کے دروازے بجلی کی سی تیزی سے بند کیے اور بھاگتے ہوئے لابی میں آکر تینوں رہائشی کمروں میں جن میں بم فٹ کیے گئے تھے، ان میں سے پہلے کا دروازہ بند کرہی رہا تھا کہ پہلے بم کا دھماکا ہوا پھر یکے بعد دیگرے تینوں بم پھٹے۔ اتنی دیر میں ہم تینوں رہائشی کمروں کے دروازے بند کرکے بھاگتے ہوئے سڑک کی جانب دوڑے۔ داخلے کے گیٹ پر ایک گاڑی دیوار سے ٹکرا کر کھڑی ہوئی تھی اور مزمل اپنی گاڑی میں باہر کھڑا تھا اب تک چھ کے چھ بم پھٹ چکے تھے اور اسلحے والے کمرے کے دستی بم سے وہاں پڑی گولیوں نے بھی آگ پکڑ لی تھی اور ان کے دھماکے ہو رہے تھے مزمل نے بتایا کہ ایک امریکی اپنی گاڑی میں سے باہر آیا تھا وہ گارڈ کی لاش کے پاس جو گارڈ روم سے صاف دکھائی دیتی تھی، رکا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال کو سمجھ سکتا مزمل نے اپنے پسٹل سے اسے گولی مار دی۔ چونکہ گاڑی ابھی گیئر میں تھی اس لیے دیوار سے جا ٹکرائی۔ قیصر نے آج کے مشن کو آخری ٹچ دیتے ہوئے ایک دستی بم اس گاڑی کے اندر پھینکا اور ہم خلیل کی گاڑی میں تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ خلیل نے یہ ساری کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ بولا ''یسیار خوب کام کردین'' (آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے)۔

☆☆

جب ہم امریکی اڈے سے واپس لوٹ رہے تھے تو ہمارے دستی بم کے دھماکوں کے علاوہ اڈے کے اسلحہ خانے میں بھی ایمونیشن نے آگ پکڑ لی تھی جن کے چھوٹے چھوٹے دھماکے ہمیں سنائی دیے۔ پھر ایک بڑا دھماکا ہوا جس کی شدت سے ہماری گاڑی بھی لرز گئی۔ یہ دھماکا یقیناً یا تو اسلحہ خانے میں پڑے بڑے ایمونیشن کے آگ پکڑنے سے ہوا تھا جسے ہم جلدی میں دیکھ نہ سکے تھے اور یا پھر اڈے میں پٹرول کے ذخیرے میں آگ لگنے سے دھماکا ہوا ہوگا۔ ہم اس وقت اس اڈے سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھے جب ہم نے بڑے دھماکے کی آواز سنی۔ پورا اڈہ آگ کے بلند شعلوں میں لپٹا ہوا تھا آگ کے شعلے اتنے زیادہ اور بلند تھے جن سے اڈے کی ہر شے یقیناً راکھ بن گئی ہوگی خلیل کو صورت حال کی سنگینی کا علم تھا اس لیے اس نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ وہ جلد از جلد اس چوراہے پر پہنچنا چاہتا تھا جہاں سے تین اور سڑکیں مختلف اطراف کو جاتی تھیں اور یہ چوراہا شہر کے تقریباً وسط میں واقع تھا۔ اس امریکی اڈے میں دھماکے کی آواز شہر میں بھی صاف سنائی دی ہوگی اور اڈے سے اٹھتے بلند شعلے بھی لوگوں نے دیکھے ہوں گے۔ اس لیے شہریوں کی ایک بڑی تعداد سڑکوں پر

جمع تھی سڑکوں پر لگی تیز لائیٹس میں ہم نے دیکھا کہ اڈے کے تباہ ہونے سے لوگوں کے چہروں پر ایک ان جانی خوشی دکھائی دے رہی تھی یہ ردعمل تھا ایرانی عوام کی محرومیوں کا جس کا لاوا مدتوں سے ان کے دلوں میں پک رہا تھا۔ جو قارئین انقلاب ایران کے بعد وہاں جا چکے ہیں انھوں نے امریکا کے خلاف ایرانیوں کی نفرت کے اظہار کو دیواروں پر لکھی عبارتوں سے بخوبی دیکھا ہوگا ''شیطان بزرگ امریکا'' (امریکا بڑا شیطان) اور اسی قسم کی دوسری عبارتیں اور امریکیوں کے خلاف بنے کارٹونوں سے عوام کی امریکا سے بیزاری اور نفرت کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔

ہم گھر پہنچے تو اسد اللہ ہمارے انتظار میں گھر کے لان میں ٹہل رہا تھا ہمیں ساتھ لے جا کر وہ سیدھا ڈرائنگ روم میں گیا وہاں ماہا اور JCO منصف بے چینی سے ہمارے منتظر تھے ماہا نے جب ہم چاروں کو صحیح سلامت دیکھا تو اس کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے ہم چاروں کو دیکھتے ساتھ ہی کہا ''آپ چاروں بخیریت واپس آگئے ہم اسی لیے پریشان تھے اپنی کارروائی کی کامیابی کا ابھی کچھ نہ بتائیے گا اس کا ہم نے اپنی آنکھوں سے بلند ہوتے شعلہ دیکھ کر اور کانوں سے دھماکے کی آواز سن کر بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ اپنے مشن میں کامیاب ہوگئے ہیں''۔ JCO منصف نے بھی بغیر کچھ پوچھے ہمیں کامیابی کی مبارک باد دی۔ اسد اللہ بڑی بے تابی سے میرے ساتھیوں کے خاموش ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی قومی عادت کے مطابق وہ مشن کی تکمیل کے دوران پیش آئے واقعات کی ہر طرح تفصیل جاننے کو بے تاب تھا۔ میں نے اسد اللہ کو کہا ''آپ پہلے کھانا لگوائیں کیونکہ بھوک سے ہمارا برا حال ہو رہا ہے کھانے کے بعد قہوے کے دور چلیں گے جس کے دوران میں تمام واقعات آپ کے گوش گزار کروں گا'' تھوڑی دیر میں ہی کھانا چن دیا گیا۔ کھانے کے بعد قہوے کی کیتلیاں آگئیں اور ہم ڈرائنگ روم کی فرشی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنی طرف سے مختصراً سارا واقعہ بیان کیا لیکن اسد اللہ کے سوالات کا جواب دیتے دیتے ایک گھنٹے سے زائد وقت گزر گیا۔ میں نے اسے نوری کے متعلق بتایا کہ وہ امریکیوں کا وفادار اور پالتو تھا اور جیبی ٹیپ ریکارڈ سے ہماری ساری گفتگو ریکارڈ کر رہا تھا اور اس کے پاس ایک لوڈڈ پسٹل بھی تھا سو ہم نے پہلے اسے جہنم واصل کیا تاکہ وہاں اپنے آقاؤں کا خیر مقدم کر سکے۔ اسد اللہ تو ابھی اور بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے کہا کہ ہم بہت تھک چکے ہیں اور صبح ہمیں تہران بھی جانا ہے لہٰذا اب ہمیں اجازت دی جائے اسے شب بخیر کہتے ہوئے ہم اپنے کمروں میں چلے گئے میں نے خلیل کو کہلا بھیجا کہ صبح ۹ بجے دونوں گاڑیاں تہران جانے کے لیے تیار ملیں۔

اگلی صبح ساڑھے نو بجے ہم اسد اللہ اکبر کی میزبانی کا شکریہ ادا کر کے تہران کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہمیں رخصت کرتے ہوئے اسد اللہ نے ہم سے بار بار ایسے معانقہ کیا گویا ہم سے اس کی برسوں سے دوستی ہو۔ یہ ایرانی کلچر کا حصہ ہے۔ ہم بھی بڑی گرم جوشی سے اس سے وداع ہوئے۔

واپسی کا سفر ہم نے بڑی تیز رفتاری سے طے کیا اور راستے میں صرف ایک بار پندرہ منٹ کے لیے رکے۔ راستے میں دوبار ایرانی پولیس اور ملٹری پولیس والوں نے ہماری گاڑیاں روکیں۔ چونکہ وہ سب صرف فارسی بولتے تھے لہٰذا خلیل نے ہمارے مترجم کے فرائض ادا کیے اور ان کے سوالات کے جو جواب ہم نے دیے ان میں خلیل نے اپنی طرف سے خاصا اضافہ کر کے پولیس اور ملٹری پولیس والوں کو مطمئن کیا۔ شام کو سات بجے کے بعد ہم تہران میں اپنے گھر پہنچے۔ وہاں ہمارے ساتھی اور مسز زاہدی یکساں بے چینی سے ہماری راہ دیکھ رہے تھے مسز زاہدی نے بتایا کہ اس نے کل اور آج چار بار ٹیلی فون پر اسد اللہ سے ہماری خیریت دریافت کی ہے۔ آج پہلے فون پر اسد اللہ نے ہماری تہران واپسی کی اطلاع دی اور دوسرے فون پر بتایا کہ رام سر شہر کو صبح ۱۱ بجے سے فوج اور پولیس نے گھیرے میں لے لیا ہے اور رام سر سے باہر جانے والوں کی سختی سے جانچ پڑتال کی جا رہی ہے۔ مسز زاہدی نے یہ بھی بتایا کہ اس کے مرحوم شوہر کا ایک گہرا دوست ایرانی فوج میں میجر جنرل ہے آج صبح ہی اس نے میجر جنرل کو ہماری دونوں گاڑیوں کے نمبر دیے اور کہا اس کے مرحوم شوہر کے دوست پاکستان سے آئے ہوئے ہیں اور آج رام سر سے واپس آ رہے ہیں کسی وجہ سے فوج رام سر سے آنے والوں کی چیکنگ کر رہی ہے اس لیے وہ ایسا انتظام کر دیں کہ ان کی گاڑیوں کو سہولت سے گزرنے دیا جائے۔ بقول مسز زاہدی کے میجر جنرل نے اسے کہا کہ وہ ابھی وائرلیس پر متعلقہ فوجی یونٹ کے افسر کو کہہ دے گا کہ ان نمبروں والی دونوں گاڑیوں کو بلا روک ٹوک گزرنے دیا جائے۔ مسز زاہدی نے یہ بھی کہا کہ وہ جنرل آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے گا کیونکہ وہ آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہے۔ اس نے فون پر صرف اتنا کہا تھا کہ تمھارے مہمان ہمارے ملک کے مہمان ہیں اور مجھے ان کی پاکستان سے آمد کے دوسرے روز ہی بریف کیا گیا تھا۔ مسز زاہدی نے میجر جنرل والی بات کھول کر نہیں کی تھی۔ ملک کے مہمان اور آمد کے دوسرے روز بریف کیے جانے کے دو مطلب نکلتے تھے۔ ایک یہ کہ ہماری سعودی عرب میں سرگرمیوں کی اطلاع انھیں مل چکی تھی اور وہ ہمیں ایران میں ملک کے مہمان یعنی سرکاری مہمان بنانا چاہتے تھے اور دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ شہنشاہیت کے خلاف عوام میں جو نفرت پھیلی ہوئی تھی اور جو لوگ اس حکومت کے خلاف تھے ان میں یہ جنرل بھی شامل تھا۔ دوسرا مطلب زیادہ قرین قیاس تھا کیونکہ اگر یہ جنرل ہمارے خلاف ہوتا تو ہمیں پکڑنے اور امریکی اڈے کو تباہ کرنے کا الزام عائد کرنے کا سنہری موقع ہمیں رام سر سے تہران کے سفر کے دوران گرفتار کرنے کا تھا۔ بہرحال گومگو کی کیفیت میں ہی ہم نے یہ تھوڑا سا وقت نہا دھو کر تازہ دم ہونے میں گزارا۔ ہم سب تیار ہو کر مسز زاہدی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی جنرل وردی پہنے اور تمغے لگائے آ گیا۔ مسز زاہدی نے ہمارا تعارف کروایا۔ وہ ہمیں بڑے پرتپاک سے ملا اور وردی میں ہونے کے باوجود ہم سب مردوں سے گرم جوشی سے معانقہ کیا۔ مسز زاہدی نے خصوصی طور پر اس کے لیے

ایرانی کھانے پکوائے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے اور قہوے کے دور شروع ہوئے۔ جنرل کاؤسی بڑے صوفے پر میرے ساتھ بیٹھا اس نے دھیرے سے میرے کان میں کہا ''رام سر میں اتنے بڑے مشن کو کامیابی سے پورا کرنے پر میری دلی مبارک قبول کریں''۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا کہ یہ محض اللہ پاک کا کام ہے کہ ہمیں کامیابی ہوئی ورنہ ہم تو بغیر تیاری کے تھے۔ قارئین! خاصی دیر تک ہم دونوں رام سر میں کیے گئے مشن کے متعلق گفتگو کرتے رہے لیکن نہ تو جنرل کاؤسی نے کھلے الفاظ میں اڈے کا ذکر کیا اور نہ ہی میں نے اس کی تباہی کا۔ ہماری تمام گفتگو between the lines (بین السطور) ہورہی تھی۔ میرے ساتھی بھی اس پراسرار خاموشی اور ہماری کسی تیسرے کو نہ سنائی دینے والی گفتگو سے بور ہورہے تھے میں نے بالآخر اکتا کر جنرل کاؤسی کو کہا کہ ہمارے معاشرے میں کسی محفل میں صرف دو افراد کا دھیمے لہجے میں گفتگو کرنا اور باقی شرکائے محفل کا خاموشی سے بیٹھے رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جنرل کاؤسی نے فوراً ہی ''مجھے بہت افسوس ہے میں شرمندہ ہوں'' کہتے ہوئے پوری آواز میں باتیں کرنا شروع کردیں۔ اس نے کہا ''میں آپ سب کا ایران میں خیر مقدم کرتا ہوں آپ کے ٹیم ورک اور کامیابیوں کی اطلاع مجھے آپ کی ایران آمد کے دوسرے روز ہی مل گئی تھی۔ کل آپ نے ہمیں ایک بہت بڑی سردردی سے نجات دلائی ہے جس کے لیے میں آپ سب کا بہت مشکور ہوں''۔ سب اس کی گفتگو کے اس انداز سے چڑتے ہوئے صرف زیرلب مسکرا کر رہ گئے۔ ویسے بھی اصولاً گروپ لیڈر کی موجودگی میں ٹیم کے کسی ممبر کا گفتگو میں ڈائریکٹ حصہ لینا مناسب نہیں تھا اب میں نے جنرل سے سوال کرنے شروع کیے ''جنرل کاؤسی! رام سر میں کل کے حادثے کو حکومت اور فوج نے کس حد تک اہمیت دی ہے آپ کے خیال میں کیا اس واقعے کو ایک عام حادثہ سمجھ کر دبادیا جائے گا یا امریکی حکومت اسے تخریب کاری سمجھتے ہوئے سرکاری طور پر اس کی تحقیقات کروانے پر زور دے گی''۔ اب جنرل کاؤسی کو بولنا ہی پڑا ''ابھی تو مقامی پولیس ہی حادثے کی تحقیقات کررہی ہے حادثے کے وقت جو امریکن اڈے سے باہر گئے ہوئے تھے آج ان کے بیانات لیے گئے ہیں امریکی سفیر کے احتجاج اور مشورے پر ہم نے رام سر کو Seal (بند) کردیا ہے میری اطلاع کے مطابق ترکی سے ایک امریکی ٹیم بھی حادثے کی تحقیقات کے لیے پہنچنے والی ہے۔ اس کے جانے کے بعد ہی اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے گا'' کاؤسی نے پھر اپنا منھ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے کہا ''اڈے کے اندر موجود سب لوگوں کی لاشیں جل کر ناقابل شناخت ہوچکی ہیں گارڈ روم کے اندر ایک گارڈ کی لاش ملی ہے اور ایک امریکن کی لاش پارکنگ کے قریب اس کی گاڑی سے ٹکڑوں کی صورت میں دستیاب ہوئی ہے اور ایک ایرانی کی لاش اسی سڑک پر اڈے کے نزدیک ہی ملی ہے ان تینوں کو پستول سے گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا ہے''۔ میں جنرل کے اس انداز گفتگو سے حقیقتاً تنگ آچکا تھا میں نے اس سے پیچھا چھڑوانے کے لیے آخری سوال پوچھا

''جنرل کیا ہمیں اس حادثے میں ملوث سمجھا جارہا ہے کیونکہ اس رات ہم بھی تو رام سر میں تھے''۔ ''ہرگز نہیں ہم نے اس واقعے کو ایک دوسرا رنگ دیا ہے۔ نوری کا اڈے پر رہنے والوں سے کوئی جھگڑا ہوگیا تھا اس کو چونکہ اڈے کے اندر جانے کی اجازت تھی اس لیے اس نے اندر جاکر ہاتھا پائی کی اور اڈے والوں نے اسے گولی مار کر ہلاک کردیا اس کی ہلاکت کے بعد اڈے میں رہنے والے امریکیوں کی دو پارٹیاں بن گئیں جو آپس میں لڑپڑیں۔ نتیجتاً کچھ لوگ تو آپس میں گولیوں کے تبادلے میں مارے گئے جو باقی بچے انھوں نے اپنی جان بچانے کے لیے گارڈ اور باہر سے آنے والے امریکن کو بھی گولیاں مار کر ہلاک کردیا کیوں کہ اس طرح معاملہ رفع دفع نہیں ہوسکتا تھا اس لیے اتنی ہلاکتوں کو چھپانے کے لیے زندہ رہ جانے والوں نے خود ہی اپنے اسلحہ خانے سے دستی بم نکال کر پٹرول کے ذخیرے اور اسلحہ خانے کو آگ لگادی اور خود اپنی گاڑیوں میں شہر جاکر کافی دیر کے بعد واپس آئے۔ کہیے کیسی ہے یہ کہانی''۔ جنرل کاؤسی نے داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ''بالکل ناقص اور فوری ہی رد کردینے والی گھڑی ہوئی کہانی معلوم ہوتی ہے اس وقت تو میں اور میرے ساتھی تھکے ہوئے ہیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو کل شام تک آپ کو ایک فول پروف واقعہ دے سکوں گا''۔ جنرل نے یہ کہانی وہیں بیٹھے بیٹھے گھڑی تھی کہنے لگا ''میں کل شام بے تابی سے آپ کا انتظار کروں گا اور شام چھ بجے آپ سے یہیں ملوں گا'' یہ کہہ کر جنرل ہم سے رخصت ہوا اور ہم اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جس فوج کے جنرل دن رات شاہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں مصروف ہوں ان کے دماغ ہی اس قسم کی واہیات اور بچکانہ کہانیاں سوچ سکتے ہیں۔

☆☆

اگلی صبح میں پاکستانی سفارت خانے سیکنڈ ملٹری اتاچی میجر ظفر سے ملنے گیا۔ میں نے اسے رام سر میں پیش آئے واقعات تفصیل سے بتائے۔ میجر ظفر نے خاموشی سے میری ساری بات سنی، اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رام سر میں اتنی ہلاکتوں اور وہ بھی امریکیوں کی جو ایران میں بے حد اثرورسوخ رکھتے تھے، کا سن کر کچھ گھبرا گیا۔ اس کا خوف بھی بے جا نہیں تھا پاکستانی سفارت خانہ پاکستان ایران تعلقات کو استوار کرنے میں مصروف تھا۔ شہنشاہ ایران نے مغربی طاقتوں کے دباؤ اور اپنے دوست ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد پاکستان کے ساتھ گہرے برادارانہ تعلقات کو اب خاصا رسمی بنادیا تھا اگر اسے رام سر میں امریکی اڈے کی تباہی میں پاکستان کا ہاتھ ہونے کا علم ہوتا تو وہ امریکی دباؤ کے پیش نظر پاکستان سے مزید دور ہوجاتا۔ میجر ظفر نے کہا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رام سر میں ہم اتنا زیادہ خون خرابہ کریں گے وہ کہنے لگا ''میں سمجھتا ہوں کہ اب مجھے فسٹ ملٹری اتاچی اور سفیر کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتادینا چاہیے، میں اکیلا اتنے بڑے واقعے کو سنبھال نہیں سکتا'' ''یہ تمھاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ اگر فرسٹ ملٹری اتاچی اور سفیر

نے تمھیں ہی موردِ الزام ٹھہرایا تو پھر کیا ہوگا۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ پاکستانی سفارت خانے کی اعانت کے بغیر کیا ہے ہم لوگ نہ تو آپ کے بلاوے پر یہاں آئے ہیں اور نہ ہی آپ لوگوں نے ہمیں کوئی مشن سونپا ہے۔ مملکت پاکستان کے دشمن کون ہیں، انھیں ہر بالغ النظر پاکستانی جانتا ہے یہ سراسر ہمارا ذاتی فیصلہ اوراپنے ملک کے دشمنوں کے خلاف کارروائی تھی۔ تمھارے سینئرز نے اگر تم سے تعاون نہ کیا تو پھر یہ معاملہ دو مملکتوں کے درمیان بے جا اندرونی مداخلت کی صورت اختیار کرجائے گا۔ تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم اس معاملے سے خود کو بالکل بے تعلق رکھو Keep your eyes and ears shut (اپنی آنکھیں اور کان بند رکھو) اور اس معاملے میں اپنا ذرا سا بھی تعلق ظاہر نہ کرو اسی میں تمھاری بہتری اور بھلائی ہے ہم جب سے اپنے مشنوں پر نکلے ہیں ہم نے کبھی بھی حکومت پاکستان کی یا اپنے سفارت خانوں کی مدد حاصل نہیں کی ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ ہم حکومت پاکستان کے نہیں بلکہ مملکت پاکستان کے وفادار ہیں'' میں نے میجر ظفر سے کھلی بات کی تو اسے احساس ہوا کہ اس کی سوچ کس قدر غلط تھی اور اگر وہ یہ حماقت کر بیٹھتا تو اس کا بڑا بھیانک نتیجہ بھی نکل سکتا تھا۔ میجر ظفر سے رخصت ہو کر میں گھر واپس آیا غیروں کے دیس میں جہاں اپنے بھی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اپنے وطن پر جان نثار کرنے والوں کی کاوشوں پر پانی پھیر سکتے تھے، ہمارا اللہ اور اس کے رسول اور پنج تن مبارک کے علاوہ کوئی آسرا، سہارا اور مددگار نہ تھا۔ شام کو جنرل کاوُسی نے بھی آنا تھا۔ مجھے اس پر بھی پورا اعتماد نہ تھا شاہ کی فوج کی وردی پہن کر وہ کسی وقت بھی شاہ سے اپنی وفاداری نبھانے اور انعام وترقی کے لالچ میں ہمارا راز افشا کرسکتا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو اپنے ڈرائنگ روم میں جمع کرکے ساری صورت حال بتائی اور کہا کہ ہمیں ایران میں اگر مزید کچھ کرنا ہے تو اپنے رسک پر کرنا ہوگا۔ پاکستانی سفارت خانے یا کسی مقامی باشندے سے کسی قسم کی امداد یا خیر خواہی کی توقع رکھنا عبث ہوگا۔ ہم نے آج تک بھارت سمیت جن ممالک میں بھی اپنے مشن پورے کیے ہیں محض اللہ پاک کی مدد اور اپنے زورِ بازو سے کیے ہیں۔ بھارت، تھائی لینڈ، بنگلہ دیش اور سعودی عرب میں ہمیں اپنے چند حامیوں اور خیر خواہوں کی مدد ضرور ملی ہے لیکن کسی بھی مشن میں ہمارے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کوئی بھی شریک نہیں ہوا یہاں پر ہمیں آئندہ شاید ایسے خیر خواہ بھی نہ مل سکیں اس لیے آپ کو اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم جو مقصد لے کر یہاں آئے ہیں اسے ادھورا چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں یا بغیر کسی انسانی مدد کی توقع کے اسے پورا کرنے کی کوشش کریں''۔ میں خاموش ہوا تو قیصر جسے میں نے اپنا نمبر ٹو بنایا ہوا تھا، نے جواب دیا ''بھائی جان! میرے خیال میں آپ تمام ساتھیوں سے فرداً فرداً ان کا فیصلہ پوچھیں میں اپنے اور سپنا کے متعلق آپ کو اپنا فیصلہ بتاتا ہوں کہ ہم دونوں آخری سانس تک آپ کے ساتھ مشنوں کی تکمیل میں آپ کا بھرپور ساتھ دیں گے'' سپنا کا فیصلہ قیصر کی زبانی! میرے لیے یہ نئی بات تھی، میں نے قیصر سے اس بارے میں پوچھا تو قیصر بولا '' بھائی

جان سپنا کو مسلمان ہونے کی میں نے ہی ترغیب دی تھی۔ یہ میرا مشورہ تھا جسے اس نے قبول کرلیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اس کی بڑی وجہ بھی سپنا کا میرے ساتھ دہلی جانا تھا میرے بچے میری والدہ کے ساتھ ہیں سپنا کے اسلام قبول کرنے کے بعد ہم نے باہمی رضامندی سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی مناسب موقعے پر ہم نکاح کرلیں گے ہم دونوں کی ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے ہی میں نے اپنے فیصلے میں اس کی رضامندی بھی شامل کرلی ہے''۔ سپنا اور قیصر دونوں نے مسکراتے ہوئے آنکھیں جھکالیں۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ میں نے قیصر کو بمبئی سے سپنا کے ہمراہ دہلی بھیجا تھا اور قیصر نے دہلی میں اپنی بیوی کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے اسے طلاق دے دی تھی اور سپنا کے ساتھ بمبئی لوٹ آیا تھا۔ آپ کے ذہن میں ہوگا کہ سپنا کے رویے سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ میری زندگی کی ساتھی بننا چاہتی ہے اس بات کا اس نے بین السطور کئی بار اظہار بھی کیا تھا۔ مجھے اس بات سے قطعی انکار نہیں کہ اپنی گھریلو زندگی کی تلخیوں کی وجہ سے یہ بات میرے دل میں ایک دو بار آئی مگر ہوا کے جھونکے کی طرح چلی گئی کیوں کہ میرے خوابوں اورخیالوں میں صرف وہ چہرہ بسا ہوا تھا جسے برما میں جادوگرنی نے مجھے پانی کے طشت میں دکھایا تھا۔ سپنا کے ساتھ ممبئی لوٹنے پر میں نے جب قیصر سے پوچھا کہ کیا وہ سپنا سے شادی کرنا چاہتا ہے تو قیصر نے کہا تھا کہ ایک تو سپنا ہندو ہے اور دوسری بات یہ کہ میں نے اسے بہن کہا ہے اس پر میں نے قیصر کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ بہن تو چچا زاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد اور خالہ زاد بھی ہوتی ہیں۔ پھر جب ان سے نکاح جائز ہے تو صرف منہ سے کسی کو بہن کہنے سے وہ حقیقی بہن نہیں بن جاتی اس پر قیصر نے کہا تھا کہ وہ دیکھے گا کہ اگر سپنا نے بغیر کسی دباؤ کے اسلام قبول کرلیا تو پھر وہ اسے اپنے ساتھ شادی کا کہے گا اس کے بعد جب سپنا مسلمان ہوئی تو دونوں نے ہم میں سے کسی کے علم میں لائے بغیر شادی کے عہدوپیاں کرلیے۔ قیصر نے سپنا کے مسلمان ہونے سے کافی مدت پہلے ہی مجھے یہ ضرور کہا تھا، سپنا اناڑی مگر جذباتی ہے اس لیے اسے کسی مہم میں ہمراہ نہ رکھا جائے۔ قیصر کے دل کا چور میں نے اسی وقت پکڑ لیا تھا اور اب ان دونوں نے کھلے بندوں اپنے فیصلے کا اظہار کردیا تھا۔ میں نے ان کو اس فیصلے پر مبارک دیتے ہوئے کہا ''تم دونوں پرلے درجے کے احمق ہو جو ابھی تک نکاح نہیں کیا بھلا اس سے بہتر موقع اور کون سا ہوگا میں آج ہی تمھارے نکاح کا انتظام کرتا ہوں میرے سارے ساتھیوں نے فرداً فرداً آئندہ مشنوں میں میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ میٹنگ ختم کرکے ہم سب مسز زاہدی سے ملنے اس کے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ میں نے مسز زاہدی کو کہا کہ آج قیصر اور سپنا کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنا ہے لہٰذا وہ سپنا اور ماہا کو ہمراہ لے کر بازار جائے اور شادی کا پاکستانی طرز کا جوڑا اور زیور خریدے اور نکاح خواں اور مٹھائی کا انتظام بھی کرے۔ مسز زاہدی نے جس کی کوئی اولاد نہیں تھی وہ سپنا کو اپنی بیٹی بنا کر وداع

کرنے کے لیے سپنا اور ماہا کو لے کر شادی کی شاپنگ کے لیے بازار چلی گئی۔ ادھر عمران اور مزمل نے قیصر کو ساتھ لیا اور بازار جاکر اسے دولھا بنانے کی خریداری کے لیے چلے گئے۔ شادی کے تمام اخراجات جب میں نے برداشت کرنے کا کہا تو عمران اور مزمل مچل گئے کہ وہ بھی اخراجات میں شرکت کریں گے لیکن میں نے انھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ میرے سگے بھائی یا بہن تو کوئی ہیں نہیں جن کی ذمہ داری مجھ پر ہو قیصر کو میں نے سگے بھائیوں سے بڑھ کر پایا ہے لہٰذا یہ خوشی مجھے پوری کرنے دیں۔ میں نے ماہا کو دس ہزار ڈالر دیے تھے کہ ان سے زیور اور شادی کا جوڑا خریدے۔ میں اپنے کمرے میں گیا تو باقی سارے ساتھی بھی مجھے بتائے بغیر غائب ہوگئے اور جب واپس لوٹے تو ہر ایک نے سپنا کے لیے زیورات کے ڈبے اٹھائے ہوئے تھے۔ مسز زاہدی بعد دوپہر سپنا اور ماہا کے ساتھ واپس آئی اس نے فوری طور پر سپنا کے لیے شادی کا جوڑا سلوایا تھا اور جوتے اور لیڈیز بیگ کے ساتھ دوسرے لوازمات کے علاوہ ڈھیر سارے زیور بھی خریدے تھے۔ آج تو دس ہزار ڈالر کوئی وقعت نہیں رکھتے لیکن اس دور میں سونا ۱۶۰ روپے تولہ تھا اور ایران میں تو اس سے بھی سستا تھا۔ مٹھائی وغیرہ اور سہرا اور پھول بھی آگئے تھے۔ پانچ بجے نکاح خواں بھی آگیا تقریباً اسی وقت جنرل کاؤسی بھی وردی پہنے آن پہنچا۔ جب اسے شادی کا علم ہوا تو اس نے دو روز بعد اتوار کو انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں ولیمے کی ذمہ داری بے حد اصرار کرکے خود لے لی۔ ساڑھے پانچ بجے قیصر اور سپنا کا نکاح پڑھا گیا اور دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے مسز زاہدی نے بھی اپنے زیورات میں سے ایک سیٹ سپنا کو دیا، غرضے کہ پردیس میں ہم نے دل کھول کر بھرپور انداز میں شادی کی رسومات کو نبھایا، میری پوری زندگی میں یہ پہلی خوشی تھی جسے میں نے دل کھول کر منایا۔ مسز زاہدی نے اپنے ٹیپ ریکارڈر پر ایرانی گانے لگائے اور ہمسائے سے آئی ہوئی چند خواتین، مسز زاہدی اور ماہا نے ان گانوں پر ناچنا شروع کیا ان کے بعد میں نے مزمل اور عمران کے ساتھ ''لٹھے دی چادر'' گاتے ہوئے لڈی ڈالی۔ رضی منصف اور دین محمد نے بنگالی گانے گائے۔ جنرل کاؤسی نے بھی لڈی میں ہمارا ساتھ دیا (لڈی اور لٹھے دی چادر افواج پاکستان اور بنگلہ دیشی فوج میں یکساں مقبول ہے) مسز زاہدی نے رات کے لیے انواع واقسام کے کھانے پکوائے تھے ہماری یہ خوشی کی محفل رات گیارہ بجے ختم ہوئی ماہا دلہن کو قیصر کے کمرے میں لے گئی تھی کچھ دیر بعد ہم نے دولھا سے گیارہ بیٹھکیں نکلوا کر اسے جانے کی اجازت دی۔ جنرل کاؤسی نے یہ دیکھ کر کہ محفل ختم ہوگئی ہے، مجھے کہا کہ آپ نے کل مجھے رام سر کے واقعے کے متعلق ایک فول پروف کہانی بتانے کا کہا تھا'' میں نے جنرل کو کہا ''آج اس خوشی کے موقعے پر خون خرابے کی داستان چھیڑنا مناسب دکھائی نہیں دیتا اگر آپ کل شام تشریف لے آئیں تو تفصیل سے آپ کو بتا سکوں گا'' جنرل خود بھی شاید یہی چاہتا تھا اس نے اگلے روز شام پانچ بجے آنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہوگیا میرے ساتھی بھی اس ہلے گلے میں خاصے تھک گئے تھے۔ وہ بھی رخصت ہوئے تو میں نے مسز زاہدی

کا اس کے تعاون اور انتظامات کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سپنا کی قیصر سے شادی ہونے سے میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ سپنا ہمارے ساتھ ساتھ ہر شہر اور ملک میں جارہی تھی اور مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا کیا کروں۔ ہم سب اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھے مشن انجام دے رہے تھے جب بھی ہم کسی مشن پر جاتے یہی سمجھ کر جاتے کہ شاید ہم واپس نہ آسکیں گے اگر خدانخواستہ ایسی بات ہوجاتی تو سپنا کا کیا ہوتا۔ میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ آئندہ مشنوں میں قیصر کو سب سے پیچھے رکھوں گا اب یہ ایک زندگی کا نہیں بلکہ دو زندگیوں کا سوال تھا جنھوں نے ایک ہوکر پھر سے زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونا تھا میرا کیا تھا ایک سوکھے پتے کی طرح ہوا کے دوش پر میں ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔

دسواں باب

قیصر اور سپنا کی شادی کا اگلا دن بھی ساتھیوں کے شور شرابے میں گزر گیا۔ میرے اور میرے ساتھیوں کی زندگی میں مسلسل خون خرابے اور مشنوں کی پلاننگ کی وجہ سے جو (Tension) (ٹینشن) ہم پر طاری تھی پردیس میں اس خوشی کے موقعے پر ہم نے اسے جھٹک کر اور اپنے دلوں کے بوجھ کو یکسر ہٹا کر حقیقی خوشی اور قہقہوں میں یہ دو دن گزارے۔ شام کے چھ بجے جنرل کاوسی سویلین لباس میں ہمیں ملنے آیا۔ ''حال شما خوب است'' کہہ کر اس نے ہم سب کی خیریت دریافت کی دنیا کی ہر زبان میں کسی سے ملنے پر ایک ہی طرح کی بات پوچھی جاتی ہے اردو میں آپ کے مزاج کیسے ہیں، انگریزی میں How do you do? فرانسیسی میں Comment allez vous? اور بنگالی میں کیمون آچھون عربی میں ''کیف حالک'' پشتو میں سنگا خیرے، پنجابی میں ''کی حال اے'' غرضے کہ ہر زبان میں سوالیہ لہجے میں مزاج پوچھے جاتے ہیں۔ صرف فارسی میں سوالیہ لہجے کے بجائے کہا جاتا ہے ''حال شما خوب است'' (آپ کی طبیعت مزاج اور حال بہت اچھے ہیں) ہم سب مسز زاہدی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے جب کاوسی آیا فرداً فرداً سب سے ملتے ہوئے جب اس نے سہاگ رات کے اگلے دن نئی نویلی دلہن سپنا سے کہا حال شما خوب است تو ہم سب بے ساختہ ہنس پڑے اور سپنا شرم سے دہری ہوگئی۔ جب سے ہم ایران آئے تھے فارسی زبان کے عام کلمات ہم سب نے سیکھ لیے تھے سپنا نے گردن جھکائے ہوئی بڑی آہستہ آواز میں جواب دیا ''چتوری'' ہم سب نے سن لیا اور پھر ایک فرمائشی قہقہے سے سارا ہال گونجنے لگا سپنا کے چہرے پر رات بھر جاگنے اور قیصر کی خرمستیوں کے واضح نشان دکھائی دے رہے تھے۔ اس پر ''چتوری'' (شکریہ بالکل ٹھیک ہوں) کا جواب سن کر یہ فرمائشی قہقہہ لگا تھا۔

میری بات کا یقین نہیں تو میری تلاشی لے لیں' میرے اس جواب پر دونوں ایجنٹ خاموش ہوگئے ہم گاڑی سے باہر نکلے تو مدھم نیلی روشنیوں میں جو باغ میں جل رہی تھیں، میں نے دیکھا کہ اونچی چار دیواری میں گھری ہوئی ایک بڑی کوٹھی ہے ایجنٹ میرے ساتھ کوٹھی کی غلام گردش میں بنے ایک کمرے میں داخل ہوئے وہاں تین افراد بیٹھے ہوئے تھے جو ان ایجنٹوں کو دیکھتے کے ساتھ ہی کھڑے ہوگئے اور ایڑیاں بجا کر انھیں سیلوٹ کیا ایک ایجنٹ نے سر ہلایا اور پہلے سے وہاں موجود ایک آدمی اندرونی دروازے سے اندر چلا گیا۔ ہم وہیں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے ان سب کے چہرے اتنے سپاٹ تھے کہ ان سے کسی بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا مجھے اس واقعے سے خاصی گھبراہٹ ہو رہی تھی میں نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور لمبے لمبے کش لیے تا کہ خود کو نارمل رکھ سکوں بھارت میں DMI کی قید اور تشدد کے واقعات ایک ایک کرکے میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے اور ذہن میں خیال آیا کہ اب نا معلوم مجھے کن صعوبتوں سے گزرنا پڑے گا اور یہ لوگ نہ جانے میرا کیا حشر کریں گے۔ میں نے اب تک جتنے دشمنوں کو ٹھکانے لگایا تھا اس کے بعد میں نے خود کو ہر قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا ہر مشن پر جاتے وقت کم ازکم میں یہی سوچ کر جاتا تھا کہ یہ میرا آخری مشن بھی ہوسکتا ہے اور جس طرح میں دشمنوں پر بے دریغ فائر کرتا تھا اسی طرح کسی کی گولی کا میں بھی شکار ہوسکتا ہوں۔ انھی سوچوں میں میرا سگریٹ ختم ہوگیا لیکن طلب ختم نہ ہوئی۔ اسی سگریٹ سے میں دوسرا سگریٹ جلانے ہی لگا تھا کہ اندر گیا شخص واپس آیا اور ایجنٹوں کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ سینئر ایجنٹ نے مجھے کہا کہ افسرِ اعلیٰ کے پاس جانا ہے۔ میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں رکھا اور ہم اندرونی دروازے سے گزر کر کوٹھی کے اندر بنی ساری گیلری طے کرکے دوسری جانب کی غلام گردش میں پہنچے وہاں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ ہم پچھلی جانب سے اس وسیع کوٹھی کے اندر داخل ہوئے تھے کیونکہ اس طرف کے باغ میں تیز روشنیاں جل رہی تھیں اور کئی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ غلام گردش میں ایک کمرے میں جو غالباً لائبریری کے طور پر استعمال ہوتا تھا، ایجنٹ مجھے ساتھ لیے داخل ہوا۔ ایک میز کی دوسری جانب ایک پچاس سال کے لگ بھگ عمر کا سفید بالوں اور کلین شیو والا آدمی ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا منہ میں پائپ لیے کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ایجنٹ نے ایڑیاں بجا کر اسے سیلوٹ کیا اس شخص نے پڑھنے کی عینک لگائی ہوئی تھی سر اٹھا کر مجھے اور ایجنٹ کو دیکھا اور سر کو ہلایا۔ ایجنٹ فوراً ہی واپس چلا گیا۔

اس شخص نے کتاب میز پر رکھی اور عینک اتارتے ہوئے بولا ''میں تمھارے صرف ایک نام سے ہی نہیں بلکہ کئی ناموں سے واقف ہوں اور اپنا نام اور عہدہ بتانا نہیں چاہتا اس لیے ان رسمی تکلفات کے بجائے ہم سیدھے مطلب کی بات کرتے ہیں تم سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاؤ اور سگریٹ بھی پی سکتے ہو''۔ یقین جانیے میں زندگی میں پہلی بار کسی شخص کے رویے اور گفتگو سے متاثر ہوا یا

گھبرایا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا اس کی نگاہیں بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں شاید ہم دونوں ایک دوسرے کو نگاہوں سے تولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر تو ں ہی ایک دوسرے کو تکتے رہنے کے بعد اس نے سکوت کو توڑا ''میں فضول اور لمبی باتیں نہیں کرتا اور مجھے امید ہے کہ تم بھی مجھ سے ٹو دی پوائنٹ بات کرو گے'' وہ بڑی صاف ستھری انگریزی میں بات کر رہا تھا میں نے بھی مختصر جواب دیا ''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا'' اس نے میری بات سن کر میز پر پڑا ہوا ہوانا کے اعلیٰ سگاروں کا ڈبہ کھول کر مجھے سگار پیش کیا۔ میں نے سگار سلگایا تو اس نے بڑے دھیمے لہجے میں مجھے مخاطب کیا ''بھارت کی وزارت خارجہ نے اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی رپورٹس پر مبنی ایک بڑی فائل ہمیں بھیجی ہے تم نے اور تمھارے ساتھیوں نے بھارتی ایجنٹوں اور پاکستان کے دشمن بھارتیوں کے خلاف جو کچھ بھارت، بنگلہ دیش، تھائی لینڈ اور سعودی عرب میں کیا ہے وہ سب کچھ اس فائل میں موجود ہے یہاں تک کہ انھوں نے ہمیں یہ بتایا کہ تم اب ایران میں ہو اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایران میں تشدد بھری کارروائیاں کرو گے یہاں پر بھارتی سفارت خانے نے ہم سے ان کے سفارتی عملے اور سفارت خانے کی حفاظت کے لیے خصوصی طور پر حفاظتی گارڈ مہیا کرنے کی درخواست کی ہے۔ تم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ رام سر گئے تھے اور وہاں تمھارے دو روزہ قیام کے دوران ہی امریکن اڈے کو مع اس میں کام کرنے والے بیش تر امریکیوں کو ختم کر دیا گیا بادی النظر میں یہ تمھاری ٹیم کا کام دکھائی دیتا ہے حالاں کہ تمھیں اس واقعے میں ملوث کرنے کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں جیسے تمھارے ملک میں آئی ایس آئی حکومت کی وفادار ہونے کے بجائے مملکت کی وفادار ہے اور اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ کون سی پارٹی یا شخص حکمراں ہے بالکل ویسے ہی ساوک بھی مملکت ایران کی وفادار ہے، شہنشاہ کی نظروں میں اپنا مقام بنائے رکھنے کے لیے ہم کبھی کبھار شاہ کے مخالفین کو پکڑ لیتے ہیں اور شاہ اور اس کے حواریوں کو یہ کہہ کر کہ ہم نے ان مخالفین کو ہلاک کر دیا ہے، ایران سے باہر بھجوا دیتے ہیں۔ اتنی اہم اور انتہائی راز کی باتیں میں تمھیں محض اس لیے بتا رہا ہوں کہ بھارت کی ہمیں بھیجی ہوئی فائل کو ان کے نقطہ نظر سے پڑھنے کے بعد جب میں نے اس فائل کو دوبارہ اپنے نقطہ نظر سے پڑھا تو مجھے صاف دکھائی دیا کہ تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی ہر کارروائی کے پیچھے صرف اپنے وطن اور مملکت سے محبت چھپی ہوئی ہے خفیہ ایجنسیاں اور فوج بھی مملکت کے تحفظ کے لیے ہوتی ہیں حکمرانوں کے تحفظ کے لیے نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں بادشاہت ہے اور میری ایجنسی کے بیش تر کارکن اپنی وفاداریاں شاہ کو بیچ چکے ہیں ایک مرد مومن امام خمینی جسے عرصہ دراز سے جلا وطن کر دیا گیا ہے، فرانس سے ایرانی عوام کو بیدار کرنے کے لیے اپنی تقاریر کی کیسٹیں بھجوا رہا ہے۔ اس کی تقاریر نے ایرانی عوام میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور شہنشاہیت کے خلاف ابلتا ہوا لاوا کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ میں ایسے نازک حالات میں مملکت ایران کے دشمنوں کے خلاف کوئی کارروائی محض اس

لیے نہیں کر سکتا کہ فوج کے جنرل اور دوسری سرکاری ایجنسیوں کے لوگ شاہ کے نمک خوار اور حامی ہیں وہ آدمی جو تمھیں یہاں لائے ہیں وہ میرے اور مملکت کے انتہائی وفادار اور قابل اعتماد ہیں مجھے تہران میں یہودیوں کی ایک بہت بڑی سازش کا پتا چلا ہے میں اس کے قطعی ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس کے لیے مجھے قابل اعتماد ایسے لوگ نہیں مل رہے جو اس سازش کو کامیاب ہونے سے پہلے ہی روک سکیں میری اطلاعات کے مطابق اگر یہ سازش کامیاب ہوگئی تو ایران کی تین چوتھائی آبادی کا اس سے ہلاک ہونے کا خدشہ ہے۔ اگر تم لوگ اس سازش کو ناکام بنانے میں ہمارے ساتھ تعاون کرو تو مجھے یقین ہے کہ ایران ایک بہت بڑی تباہی سے بچ جائے گا'' وہ شخص خاموش ہوا تو میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا چند لمحے تو میں اس قابل نہ ہی تھا کہ کچھ بول سکوں آخر اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے میں نے اسے کہا ''بھارت اور اسرائیل صرف پاکستان کے ہی نہیں بلکہ ساری دنیائے اسلام کے دشمن ہیں ہم اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لیے ان سے نبرد آزما ہیں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مملکت ایران کے دشمنوں کو ہم اپنے دشمن سمجھتے ہیں اور ان کی سازشوں کو ناکام بنانے میں ہم اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کو تیار ہیں۔

☆☆

میں نے ساوک کے سربراہ کو اپنے تعاون کی جو یقین دہانی کروائی تھی اور اس بارے میں جو الفاظ کہے تھے وہ دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے۔ ساوک کا سربراہ کوئی بچہ یا ناتجربہ کار نہ تھا کہ وہ سچ اور جھوٹ میں تمیز نہ کر سکتا۔ بھارتی حکام کی بھیجی ہوئی فائل بھی اس نے پڑھی تھی جس میں ہمارے گزشتہ مشنوں کے بارے میں تفصیلاً ہر بات درج تھی۔ اس فائل سے بھی اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ میں اور میرے ساتھی اب تک جو کچھ بھی کرتے رہے ہیں اس میں ہماری ذرہ برابر بھی ذاتی اغراض شامل نہ تھیں بلکہ اپنے وطن کی محبت میں ہم نے اپنے وطن دشمنوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔ فائل میں سعودی عرب میں ہماری کارروائیوں کا مقصد بھی پاکستان اور ملت اسلامیہ کے دشمنوں کی پوشیدہ اور ظاہری سرگرمیوں کا خاتمہ کرنا تھا جسے ساوک کا سربراہ بخوبی سمجھ چکا تھا۔ اس کی بہترین مثال کشمیر ہے جہاں بھارتی ہٹ دھرمی اور جبریہ قبضے کے خلاف لڑنے والوں کو ہم مجاہد کہتے ہیں اور بھارتی حکومت انھیں شرپسند، لٹیرے، درانداز اور نہ جانے کن کن ناموں سے پکارتی ہے۔ ساوک کے سربراہ نے کرسی سے اٹھ کر اور میرے قریب آ کر میرا ہاتھ پکڑا۔ میں بھی کھڑا ہوگیا اس نے مجھے گلے لگایا اور دفتر میں پڑے صوفوں پر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ اردلی چائے اور بسکٹ لے آیا جن کے لیے اس نے شاید اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہی گھنٹی بجا کر اردلی کو آرڈر دیا تھا۔ اردلی کے جانے کے بعد چائے پیتے ہوئے ساوک کے سربراہ نے کہا ''اب جب کہ شک وشبہات کے سب پردے اٹھ چکے ہیں میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرا نام علی کوشش ہے اور میں لیفٹیننٹ جنرل ہوں اور میرے دونوں

نائبین جن پر مجھے اتنا ہی اعتماد ہے جتنا کہ خود اپنی ذات پر، کرنل محمود شیرازی اور میجر اسفند ہیں یہ دونوں ہمارے درمیان رابطے کا کام دیں گے ۔ یہ تم سے ہمیشہ سویلین لباس اور مختلف بھیس بدل کر ملیں گے۔ یہاں پر حالات اس قدر سنگینی اختیار کرچکے ہیں کہ ہمارے محکمے کی بھی نگرانی کی جاتی ہے اور ہمارے تمام ٹیلی فون پر آبزرویشن لگی ہوئی ہے۔ ہماری نگرانی کرنے والے خود شاہ کے مخالف ایرانیوں کو مار کر ان کے قتل ہمارے ذمے ڈال دیتے ہیں جس کے باعث عوام میں ساوک کی دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔ میں بہت جلد ہی آپ سے رابطہ کروں گا آپ کو ایک مشن دیا جائے گا جس میں ہماری پوری اعانت ہوگی۔ اس مشن میں آپ کی کامیابی ایرانیوں کی بہت بڑی بے گناہ آبادی کو موت کے منھ سے بچاسکے گی۔ اس مشن میں خدانخواستہ اگر آپ Expose (پہچانے گئے) ہوگئے تو آپ کو ہمارے محکمے کا ہوائی جہاز یا سپیڈ بوٹ جو مشن کے دوران ہر وقت تیاری کی حالت میں ہوں گے، خلیج کے دوسری طرف متحدہ عرب امارات کی کسی بھی ریاست میں پہنچادیں گے۔ سپیڈ بوٹ کا میں نے اس لیے کہا ہے کہ اس مشن کا بیش تر حصہ بندر عباس میں ہوگا۔ راس الخیمہ بندر عباس بہت قریب ہے اس مشن کے لیے آپ کو جن جن ہتھیاروں اور دھماکا خیز سامان کی ضرورت پڑے گی وہ ہم آپ کو مہیا کریں گے'' مجھے اپنے ساتھیوں سے الگ ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ انھیں جو کچھ بتا کر میں ان سے علیحدہ ہوا تھا اس سے ان کی تشویش اور پریشانی کا مجھے بخوبی احساس تھا۔ میں نے جنرل علی کوشش کو کہا کہ اس طرح چلے آنے سے میرے ساتھی بے حد پریشان ہوں گے۔ جنرل ہنسا اور میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولا ''میں تمھارے ساتھیوں کی پریشانی کو تم سے زیادہ جانتا ہوں تمھارے تین ساتھیوں نے کانٹی نینٹل ہوٹل سے ہی ہماری اس گاڑی کا پیچھا کرنا شروع کیا جس میں تم تھے۔ ہمارے ڈرائیور نے انھیں ڈاج دینے اور ان کے پیچھا کرنے سے جان چھڑوانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ہماری گاڑی اس چار دیواری میں داخل ہوئی تو وہ گیٹ کے بالکل سامنے کھڑے ہوگئے۔ چونکہ میرا مقصد تم سے ملنا اور یہ باتیں کرنی تھیں اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ تمھارے ساتھی زیادہ دیر باہر انتظار نہیں کریں گے اور زبردستی اندر گھس کر کہیں خون خرابہ نہ کریں اس لیے میری ہدایت پر انھیں عزت وتکریم سے بیرونی ڈرائنگ روم میں بٹھا کر انھیں یقین دلایا گیا ہے کہ آپ بخیریت ہیں اور جلد ہی ان کے پاس آجائیں گے اب تو ان کی چائے وغیرہ سے خاطر تواضع کی جارہی ہے'' یقین جانیے یہ بات سن کر فخر اور خوشی سے میرا سینہ پھول گیا جنرل علی کوشش نے میجر اسفند کو بلوایا اور مجھے رخصت کرتے ہوئے بولا ''آپ کا جو اصل مشن ہے اور جتنے وفادار آپ کے ساتھی ہیں مجھے یقین ہے کہ کامیابیاں ہمیشہ آپ کے قدم چومیں گی'' جنرل سے رخصت ہو کر میں میجر اسفند کے ساتھ بیرونی ڈرائنگ روم میں آیا وہاں کرنل مزمل میجر عمران اور قیصر بیٹھے ہوئے تھے چائے اور بسکٹ ان کے سامنے پڑے تھے لیکن انھوں نے کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا ان کے چہروں سے بے چینی اور

چائے کے دور کے بعد جنرل نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا ''میں رام سر کے واقعے کے متعلق آپ کی کور اسٹوری سننے کے لیے بے تاب ہوں'' سب میری طرف دیکھنے لگے میں سنبھل کر بیٹھا۔ جنرل کاؤسی میرے ساتھ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا میں نے جنرل کو کہا ''جنرل کاؤسی! آپ میرے چند سوالوں کے جواب دیں کور اسٹوری آپ کو خود بخود سمجھ میں آجائے گی میرا پہلا سوال یہ ہے کہ کیپسین سی کے ایران کے علاوہ کن دوسرے ممالک میں ساحل ہیں'' ''رشیا یعنی USSR'' کاؤسی نے میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا ''کس ملک کی خواہش ہوگی کہ یہ اڈہ جس کے آلات اس کی حدود کے بہت اندر تک جھانک سکتے ہیں، ختم کردیا جائے'' ''...USSR'' کاؤسی نے ابھی بھی پوری طرح سے میرا مقصد نہیں سمجھا تھا۔ ''جنرل کاؤسی! ایک چھوٹی سی روسی آبدوز رات کے اندھیرے میں اڈے کے قریب پانی سے باہر آئی اس میں سے چھ غوطہ خور باہر نکلے اور خاموشی سے اڈے میں داخل ہوئے اور بموں اور دستی اسلحے سے اڈے پر موجود تمام افراد کو ہلاک کردیا جب وہ اپنی کارروائی میں مصروف تھے تو ان میں ایک غوطہ خور کو جو پارکنگ ایریا کے قریب اڈے پر آنے والوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا، ایک گاڑی اڈے میں داخل ہوتے ہوئی دکھائی دی۔ اس غوطہ خور نے اس گاڑی کو چلانے والے اور ایک امریکی گارڈ کو جو پہرے پر موجود تھا، ہلاک کردیا اپنی کارروائی سے فارغ ہو کر ان غوطہ خوروں نے دستی بموں سے آنے والی گاڑی اور اڈے کے اندرونی کمروں کو تباہ کردیا اور تمام آلات ناکارہ کردیے اور ان کاموں سے فارغ ہو کر اپنی آبدوز میں واپس چلے گئے۔'' ''کہاں چلے گئے؟'' کاؤسی جو بڑے غور سے میری بات سن رہا تھا بولا USSR میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''جہاں تک نوری کے قتل ہونے کی بات ہے اسے آپ امریکی اڈے سے نہ ملائیں نوری کے مقامی ایرانی بھی دشمن ہوسکتے ہیں جنھوں نے اسے موقع پا کر قتل کردیا آپ کو ایک ہی دن میں ہونے والے دونوں واقعات کی آپس میں کڑیاں ملانے کی کیا ضرورت ہے'' کاؤسی نے ایک لمبا سانس لیا جیسے اس کے دل کا سارا بوجھ باہر نکل گیا ہو اور کہنے لگا ''واقعی اس سے بہتر تفتیش اور کوئی نہیں ہوسکتی، دراصل رام سر کا واقعہ اتنا بڑا ہے کہ ہم رام سر کے دائرے میں ہی گھومتے رہے ہیں کیپسین سی کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں گیا آپ اب یہ مہربانی کیجیے گا کہ اس بارے میں بالکل خاموش رہیں میں تفتیش کا یہ نیا رخ اپنے نام سے وزارت خارجہ اور اگر ممکن ہوا تو شاہ تک پہنچاؤں گا، مجھے یقین ہے کہ اس پر اسرار واقعے کو اس خوبی سے حل کرنے پر مجھے کم از کم ایک میڈل تو ضرور ملے گا'' تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بیٹھنے اور اگلی رات یعنی اتوار کی رات شام آٹھ بجے کانٹی نینٹل ہوٹل میں ولیمہ ڈنر کی دعوت کی یاد دہانی کروا کے کاؤسی نے ہم سب سے گرم جوشی سے ہاتھ ملائے اور رخصت ہوا۔

ایرانی شادی کی رسومات کے مطابق شادی کے دوسرے روز بھی خواتین خوب ناچتی اور گاتی ہیں۔ آج شام بھی مسز زاہدی کی سہیلیوں اور ہمسایوں نے خوب ڈھول ڈھمکا کیا جو رات گئے

تک جاری رہا۔ مسز زاہدی نے اپنی مہمان خواتین کے لیے شراب بھی منگوائی تھی دور شہنشاہیت میں مردوں کی بات تو کیا کرنا خواتین کا شراب پینا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شراب کے نشے میں یہ خواتین ناچ گانے اور تفریح کی حدوں کو پار کر گئیں۔ چونکہ یہ صرف خواتین کی محفل تھی اس لیے ہم مرد اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ خواتین پر جب شراب کا سرور زیادہ چھا گیا تو انھیں مردوں کی کمی محسوس ہوئی ہمیں اچھی خاصی زبردستی سے کمروں سے نکالا گیا اور ہم مجبوراً اس اودھم بازی میں شریک ہوئے لیکن ترغیب اور ماحول کی رنگینی کے باوجود ہم اخلاقی حدود کے اندر ہی رہے رات دو بجے یہ محفل ختم ہوئی تو ہم سب بیزار اور ضبط جذبات کی کوشش سے بے حال اپنے کمروں میں سوئے۔

اگلے روز ہم دن چڑھے تک سوتے رہے اور شام کو ولیمے کی دعوت کے لیے تیار ہو کر شام پونے آٹھ بجے کانٹی نینٹل پہنچے۔ کانٹی نینٹل ہوٹل کے ایک ہال میں کاؤسی نے ولیمہ ڈنر کا انتظام کیا تھا سپنا عروسی جوڑے میں زیورات سے لدی ہوئی تھی ایک عجیب بات کو جو ہمارے معاشرے کا خصوصی حصہ ہے، میں نے نوٹ کی۔ سپنا کئی ماہ سے ہمارے گروپ میں شامل تھی شادی سے پہلے قیصر اور سپنا نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے اور نام لے کر ایک دوسرے کو پکارتے تھے اب قیصر کو سپنا سنیے کہہ کر مخاطب کرتی اور قیصر بھی ہمارے سامنے سپنا سے بات کرتے ہوئے جھجکتا تھا کاؤسی نے ہمارے اور مسز زاہدی کے علاوہ اپنے کئی ہم منصب فوجیوں اور دوستوں کو ان کی بیگمات کے ساتھ مدعو کیا تھا ایران میں اپنی قومی زبان کے علاوہ فرانسیسی زبان، انگلش سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ مغربی رواج کے مطابق سوائے دولھا اور دلہن کے باقی تمام مہمانوں کی نشستیں اس طرح ترتیب دی گئی تھیں کہ ہر ایک خاتون کے دونوں جانب دو مرد بیٹھے جن میں ان کا شوہر نہیں ہوتا تھا یہ مکس ڈنر تھا دونوں جانب خواتین اور ان کے ساتھ دو مرد بیٹھے تھے۔ دو امریکی بھی مہمانوں میں شامل تھے جن کا تعارف کرواتے ہوئے کاؤسی نے بتایا تھا کہ یہ ایران آئل کی بائی پروڈکٹس (موبائل آئل ڈیزل آئل اور موم بتیاں وغیرہ) کے دو کارخانوں کے انجینئر ہیں۔ وہ ہم سب سے بڑی گرم جوشی سے ملے وہ ماہا کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے ماہا نے یہاں بھی حجاب اوڑھا ہوا تھا اور میک اپ سے اس نے بڑی حد تک اپنے چہرے کے نقوش کو بدل لیا تھا اور حجاب سے وہ چہرے کو خاصی حد تک ڈھانپے ہوئے تھی۔ کھانے کے بعد ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر ہم ہال میں رکھے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ماہا نے ٹیبل سے اٹھنے کے بعد میرے قریب آ کر کہا کہ دونوں امریکن بڑے غور سے مجھے دیکھ رہے تھے اور ایک لمحے کو بھی ان کی نگاہیں میرے چہرے سے نہیں ہٹیں۔ غالباً وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے میں نے ماہا کو تسلی دی اور کہا کہ اب میں ان امریکیوں کے پاس بیٹھوں گا اور ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کرنے کی کوشش کروں گا۔ صوفوں پر میں ان امریکیوں کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور ان سے ان کے بزنس کے متعلق پوچھنے لگا میں نے بڑی جلدی محسوس کر لیا کہ ان میں ایک تو خالص امریکی لہجے میں

بات کر رہا تھا لیکن دوسرے کی انگلش سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ مڈل ایسٹ کے کسی ملک سے تعلق رکھتا ہے امریکی لہجے میں ''ڈ'' اور ''ٹ'' کے حروف صحیح تلفظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں لیکن فرنچ، ایرانی، سعودی، مصری اور مڈل ایسٹ کے دوسرے ممالک میں ''ڈ'' کو ''د'' اور ''ٹ'' کو ''ت'' بولا جاتا ہے میں نے محسوس کیا کہ دونوں امریکی گفتگو تو مجھ سے کر رہے تھے لیکن ان کا دھیان ماہا کی طرف تھا آخر امریکی لہجے میں بولنے والے سے ضبط نہ ہوسکا اور اس نے مجھ سے ماہا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا (Who is that Lady) (وہ خاتون کون ہے) My Wife and Alsomy First Cousin we have Three Children (وہ میری بیوی اور میری چچا زاد ہے اور ہمارے تین بچے بھی ہیں) میں نے ان کا دھیان ماہا کی اصلیت جاننے کی طرف سے ہٹاتے ہوئے کہا But that Lady (لیکن وہ خاتون...) اس امریکی نے کچھ کہنا چاہا اور میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا Listen mr we dont like to discuss about our wives with strangers (ہم اجنبیوں کے ساتھ اپنی بیویوں کے متعلق باتیں کرنا پسند نہیں کرتے) میرے لہجے کی کرختگی کو محسوس کرتے ہوئے وہ امریکی خاموش ہوگیا۔ جنرل کاؤسی نے وہیں پر سپنا کو زیور کا ایک سیٹ تحفے میں دیا اور تھوڑی دیر بعد میں نے کاؤسی سے اس ولیمہ ڈنر کا شکریہ ادا کیا اور ساتھیوں سمیت ہوٹل سے باہر آ گیا۔ ابھی ہم ہوٹل کی پارکنگ کی طرف جا رہے تھے کہ دو سویلین لباس میں ملبوس ایرانیوں نے مجھے روکا اور مجھ سے ایران آنے کی وجہ پوچھنے لگے۔ میں نے سختی سے انھیں کہا کہ وہ کون ہیں جو متعارف ہوئے بغیر مجھ سے یہ سوال پوچھ رہے ہیں ان میں سے ایک نے جو سینئر دکھائی دیتا تھا، ایک کارڈ نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا ''ہم ساوک (ایرانی جاسوس ایجنسی) (سازمانِ امنیت و اطلاعاتِ کشور) سے ہیں اور ہمارے فرائض میں یہ شامل ہے کہ ہم اجنبی اور غیر ملکیوں سے ان کے ایران آنے کی وجہ پوچھیں'' مزمل اور عمران بھی میرے قریب آ گئے تھے میں نے انھیں کہا آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اگر جنرل کاؤسی کو جن کے ہم مہمان ہیں، یہاں بلالیں تاکہ وہ آپ کو ہماری شناخت کروا سکیں'' مجھے صرف ایک ہی خوف تھا کہ میں اور میرے ساتھی اس ہوٹل میں مسلح ہو کر آئے تھے اور مجھے خدشہ تھا کہ اگر بات بڑھ گئی اور تلاشی کی نوبت آئی تو ہم ناجائز اسلحہ رکھنے کی کوئی وجہ بیان نہ کر سکیں گے۔

☆☆

ساوک کے دونوں ایجنٹوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا گویا کچھ فیصلہ کر رہے ہوں پھر ان کے سینئر نے آہستگی سے کہا ''ہم کو کسی فوجی سے نہ تو بات کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ہمارا ان سے کوئی واسطہ ہے۔ آپ کے متعلق ہمارے افسرِ اعلیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ آپ سے چند معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ آج رات آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ اکیلے چلنا پڑے گا۔ ہم آپ کو گرفتار نہیں کر رہے ہیں اس لیے آپ کے لیے بھی یہ مناسب ہوگا کہ آپ

خاموشی سے ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں پر آپ اکیلے نہیں بلکہ آپ کے ساتھی بھی موجود ہیں ہمیں اگر آپ کو گرفتار کرنا ہوتا تو ہم بھی اپنے ہمراہ اپنے بہت سے آدمیوں کو لے کر آتے آپ خواہ مخواہ معمولی سی بات کو پیچیدہ نہ بنائیں ورنہ ہمیں مجبوراً اپنے آدمیوں کو بلوانا پڑے گا" ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے ہر صورت میں اپنے ہمراہ لے جائیں گے۔ میں نے صورتِ حال کا اندازہ لگاتے ہوئے انھیں کہا کہ میں چند منٹ کی مہلت چاہتا ہوں تاکہ اپنے ساتھیوں کو بتاسکوں کہ میں کسی ضروری کام سے جارہا ہوں ورنہ وہ میرے اچانک غائب ہونے سے بہت پریشان ہوں گے۔ کیونکہ ہم یہاں اپنے ایک ساتھی کی دعوتِ ولیمہ میں آئے ہوئے تھے" ساوک کے دونوں کارکنوں نے جو اچھی خاصی انگریزی بول رہے تھے اور انداز گفتگو سے بھی خاصے اہم افسر دکھائی دیتے تھے، مجھے ساتھیوں سے ملنے کے لیے پانچ منٹ کی مہلت دی۔ میں مزمل اور عمران کی طرف گیا جو مجھے دو اجنبیوں سے باتیں کرتا دیکھ کر مجھ سے قدرے فاصلے پر رک گئے تھے میں نے انھیں بتایا کہ ساوک کے دو ایجنٹ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر مصر ہیں لہٰذا وہ خاموشی سے گھر چلے جائیں اور جنرل کاوسی سے مسلسل رابطے میں رہیں اور اپنا تمام اسلحہ سوٹ کیسوں میں رکھ کر مسز زاہدی کے حوالے کردیں۔ یہ کہتے ہوئے میں پہلے عمران سے بغل گیر ہوا اور پھر مزمل سے گلے ملتے ہوئے میں نے اپنا پسٹل اس کی جیب میں ڈال دیا۔ میں نے عمران اور مزمل سے کہا کہ میری غیر موجودگی میں تمام ساتھیوں کی ذمہ داری میں انھیں سونپتا ہوں۔ قیصر کو بھی وہ میرے متعلق نہایت مختصر الفاظ میں بتائیں اور اگر میں کسی وجہ سے بھی تین روز تک واپس نہ آسکا تو وہ سب ساتھیوں کے ساتھ کراچی جاکر میٹروپول ہوٹل میں ٹھہریں اور اگر وہاں بھی میں ایک ہفتے تک نہ پہنچ سکا تو میری طرف سے مشن کا خاتمہ سمجھ کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ عمران اور مزمل کو ہدایات دے کر میں ان ایجنٹوں کے پاس آیا اور انھیں کہا کہ میں چلنے کو تیار ہوں۔ دونوں ایجنٹ میری دونوں جانب چلتے ہوئے بجائے ہوٹل کی پارکنگ کے مین روڈ پر آگئے جہاں ایک طرف ایک بڑی سیاہ شیشوں والی سیاہ رنگ کی ہی گاڑی کھڑی تھی۔ شوفر نے پچھلا دروازہ کھولا اور مجھے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی پر نمبر پلیٹ کی جگہ مخصوص نشان کی پلیٹ لگی ہوئی تھی ۔ دونوں ایجنٹ میرے دونوں طرف بیٹھ گئے۔ اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان بھی ایک سیاہ شیشہ لگا ہوا تھا۔ یعنی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مجھے باہر کی تیز روشنیوں کے بہت ہی مدھم سے نشان دکھائی دے رہے تھے اور آگے سے بھی کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہمارے بیٹھنے کے ساتھ ہی ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھائی اور تقریباً پینتالیس منٹ کی ڈرائیونگ اور کئی جانب مڑنے اور گھومنے کے بعد ایک جگہ گاڑی روک دی۔ گاڑی سے باہر نکلنے سے پہلے ایک ایجنٹ نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے" "میں ولیمے کی دعوت میں شرکت کے لیے آیا تھا کسی سے لڑنے بھڑنے نہیں اور پھر ہم غیر ملکیوں کو ایران میں ہتھیار لانے کی کیا ضرورت ہے اگر آپ کو

شروع سے مشہور ہے کہ اگر انھیں ملک کا سربراہ بنادیا جائے تو چند روز بعد وہ اپنی ہی حکومت کے خلاف احتجاجی جلوس نکال دیں گے۔ کچھ لوگوں کی سرشت میں ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ جوڑ توڑ کرکے اور کسی بھی حکومت کی مخالفت کرکے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے فوری بعد صوبۂ سرحد سے عبدالغفار خان مملکت پاکستان کی دشمنی اور مخالفت میں اور نواب زادہ نصراللہ حکومت پاکستان کی مخالفت میں جت گئے۔ عبدالغفار خان کو تو مملکت پاکستان کی مخالفت کی وجہ سے پاکستان کی پاک مٹی نے بھی قبول نہ کیا اور قدرت نے بھی ۔ ملک سے دشمنی کی بنا پر اس کے یہاں دفن ہونے کے بجائے جلال آباد میں دفن ہوکر پاکستان کی زمین کو اس کے ناپاک وجود کے بوجھ سے بچا دیا۔ اب یہ نصراللہ صاحب (جن کو... زادہ) کہہ کر طبیعت کو سیری ہوتی ہے نا معلوم آئندہ کب تک اپنی خسیس فطرت کی وجہ سے سازشوں کے جال بنتے رہیں گے۔ مستقبل کا مورخ ان کے حقے اور ترکی ٹوپی کے ساتھ ان کی خصلت کا ذکر ضرور کرے گا ویسے ان کے متعلق عوام میں جو یہ خوش فہمی تھی کہ یہ دوسرے سیاست دانوں کی طرح لٹیرے نہیں وہ ان کے صاحب زادے منصور نے پنجاب حکومت میں شامل ہوکر دور کردی۔ اوروں نے تو وقت اور موقع دیکھ کر قومی خزانے اور ملکی وسائل پر ایسے جم جما کر ہاتھ مارے کہ جنرل پرویز مشرف کی حکومت اب تک ان لٹیرے سیاست دانوں کے کرتوتوں کے متعلق سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان کی کرپشن کا وہ سرا ڈھونڈ رہی ہے جس سے ان کی مکمل گرفت ہوسکے یہ اس حکومت کے شریفانہ انداز ہیں ورنہ اگر ان کرپٹ سیاست دانوں کی ایک بار چھتر پریڈ ہوجائے تو یہ سب کچھ خودبخود اگل دیں گے۔ آزمائش شرط ہے۔ منصور نے تو حکومت میں آنے کے ساتھ ہی اتنے لمبے لمبے ہاتھ مارے کہ عوام چیخ اٹھے اور نصراللہ صاحب کا مسٹر کلین ہونے کا دعویٰ بھی دھرے کا دھرا رہ گیا۔ جب منصور حکومت میں شامل تھا تو اس کے والد محترم چین کی بانسری بجا رہے تھے اس وقت وہ اس حکومت کے خلاف ایک لفظ تک نہ بولے کیوں کہ منہ میں ہڈی تھی۔ سیاست دانوں کے ٹولے نے وطن عزیز کو ٹینس کورٹ کی بال بنا رکھا ہے جو چاہتا ہے اپنے انداز سے ریکٹ سے اس گیند کو اچھالتا ہے ہمارے سادہ لوح عوام بھی کبھی روٹی کپڑا مکان اور کبھی قرض اتارو ملک سنوارو اور کبھی جمہوریت کے پرفریب نعروں سے ان سیاست دانوں کے کالے کرتوتوں کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ہر کسی کے دل میں لیڈر بننے کا شوق محض اس لیے ہے کہ جتنی کمائی ہمارے ملک میں سیاسی لیڈر بن کر ہوتی ہے اتنی کسی ہیروئن کے بین الاقوامی اسمگلر کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتی۔ اب تاجروں کے نام نہاد لیڈر عمر سیلیا کو لیجیے۔ یہ اسمگل شدہ مال رکھنے والوں اور ٹیکس چوروں کے لیڈر بن کر اپنی پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں کرنے کی سوچ میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ تاجروں کی بیس روزہ ہڑتال کرواکے بھی ان کو چین نہیں آیا۔ یہ شخص صرف اسمگلروں اور ٹیکس نہ دینے والوں کے آگے لگ کر اپنی مٹھی گرم کرنے کے چکر میں ہے اسے ان لوگوں کا ذرہ برابر خیال نہیں جو ان تاجروں کی بڑی بڑی

دکانوں میں بطور سیلز مین کام کرتے ہیں اور نہ ہی اس نے کبھی ان روزانہ دہاڑی پر ان تاجروں کے کام کرنے والوں کا سوچا ہے جن کا چولھا ہر روز کی اجرت ملنے پر ہی جلتا ہے جن کے معصوم بچوں کے منہ میں روٹی کا نوالہ جبھی جاتا ہے جب باپ دن بھر کی مشقت کے بعد روزانہ اجرت کے روپوں سے سودا سلف خرید کر گھر لوٹتا ہے جن کے بچے اسکولوں کی فیس نہ دینے کے بہانے... گئے ہیں جن کی بیویاں ہمسایوں سے قرض مانگ مانگ کر کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں ہیں جن کے چندوں پر عید میلاد النبی کی خوشیاں اور شہر بھر میں چراغاں کی روشنیاں بھی ذراسی مسکراہٹ نہ لاسکیں کیونکہ وہ خود بھوکے پیٹ تھے ان کے بچے بھوکے پیٹ تھے اور یہ روشنیاں اور سبز جھنڈے ان کے پیٹ کی آگ کو بجھا نہیں سکتے تھے کلثوم نواز صاحبہ بہت ہوچکی، قوم نے مشرقی معاشرے کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اور آپ کو گھریلو خاتون کا درجہ دیتے ہوئے بہت سن لیں آپ کی لن ترانیاں۔ اب آپ سیاست دان بننے پر تلی ہوئی ہیں تو پھر قوم بھی آزاد ہے کہ آپ کے ساتھ مردوں والا رویہ اپنائے آپ کے مجرم شوہر اور دوبار عمر قید اور ساری املاک کی ضبطی کی سزا پانے والے نے کارگل ایشو پر زبان کھول کر اپنے سابقہ عہدے کے حلف کی پاس داری نہیں کی اور وہ پہلی سزاؤں کے بعد اب پاکستان کے سارے عوام، قوم اور مملکت کا مجرم بن چکا ہے اسے سزائے موت عدالت دے یا عوام لیکن اس سنگین جرم کی سزا جو صرف موت ہے، اس کا مقدر بن چکی ہے۔ آپ بے شک اپنی پوشیدہ تجوریوں کے منہ کھول دیں غاصب سیاسی لیڈروں کو یک جا کرلیں جلسے جلوس کریں یا ہڑتالیں کروائیں آپ کے شوہر کی رہائی ناممکن ہے آپ کی دولت ان غداروں اور بے حمیت لوگوں کو تو خرید سکتی ہے جنھیں اپنے وطن سے زیادہ سکوں کی جھنکار سے محبت ہے جو تاریخ کے مشہور غداروں میر صادق اور جعفر کے روپ میں اپنے وطن اور اپنی آزادی کا سودا کرنے میں ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔ بات تو تب ہے کہ آپ جنرل پرویز مشرف، جنرل عثمانی، جنرل عزیز اور جنرل محمود کو خرید کر دکھائیں۔ آپ کے شوہر نے جنرل آصف نواز کو مروایا کیونکہ اس نے آپ کے شوہر کے اباجی کو رشوت میں پیش کی ہوئی BMW کار لینے سے انکار کردیا تھا اور جنرل کرامت کو ذلیل کرکے چیف آف اسٹاف کے عہدے سے محض اس لیے ہٹادیا کہ انھوں نے نواز شریف کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کی تھی۔ شہباز شریف اور ISI کے سابقہ سربراہ جنرل ضیاء کو امریکا کی آشیر باد ملنے پر جنرل پرویز مشرف کی سری لنکا سے واپسی کی پرواز کو فضا میں ہی بھسم کرنے یا بھارت میں جہاز اتارنے کا اس لیے حکم جاری کیا تھا کہ بھارتی حکومت جنرل پرویز مشرف کو گرفتار کرلے۔ اسی لیے ۱۲ اکتوبر کو PTV ہیڈکوارٹرز سے دوبار جنرل ضیا الدین کو چیف آف اسٹاف بنانے کے خصوصی خبر نامے نشر کیے گئے۔ بیگم کلثوم نواز! تمھارے شوہر کے سیاہ کرداروں کی طویل فہرست میں کارگل ایشو پر بات کرنے کے جرم کو قوم کبھی بھول نہیں سکتی نواز شریف نے اپنی بزدلی اور کم ہمتی سے ہماری فتح کو شکست سے بدل دیا اور ہم اس کا بدلہ ضرور لیں

گے۔ ان شاء اللہ۔

☆☆

جنرل کاؤسی نے مجھے ان دو امریکیوں کے متعلق بتادیا تھا کہ وہ ہلٹن ہوٹل میں مقیم ہیں اور ان کے نام بھی بتادیے تھے۔ میں نے ساتھیوں کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ آج رات ہی ان سے ملا جائے۔ قارئین جو جانباز کا مسلسل مطالعہ کررہے ہیں اب تک بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے اور میرے ساتھیوں کے کسی کو ملنے سے کیا مراد ہوتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ساوک کے سربراہ نے ہم سے جو کام لینا تھا اس سے پہلے ہی ان امریکیوں کے معاملے کو ختم کردیں تاکہ ماہا جس کو یہاں بھی شناخت کرلیا گیا تھا، کسی حد تک محفوظ ہوسکے۔ ہم نے اس بار ان امریکیوں سے جو یقیناً موساد کے ایجنٹ تھے، ان کی چال پر دہری چال چلنے کا فیصلہ کیا۔ تہران کے ۵ اسٹار ہوٹل میں ان امریکیوں کو ہلاک کرنا تو خود ایرانی پولیس کے دام میں پھنسنے کے مترادف تھا۔ اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ان امریکیوں کو رات کو ہوٹل سے باہر لاکر ان سے نمٹا جائے اس لیے اس مشن میں ہمیں ماہا کو بھی شریک کرنا پڑا۔ رات کو آٹھ بجے ماہا کو لے کر میں عمران، مزمل اور قیصر ہلٹن ہوٹل گئے اور وہاں کافی شاپ میں بیٹھ گئے ماہا نے ہوٹل کے ہی لیٹر پیڈ پر عبرانی زبان میں ان دونوں ایجنٹوں کو نیچے کافی شاپ میں آنے کا لکھا تاکہ ان سے کوئی ضروری بات کی جاسکے میں نے ہوٹل کے بیل بوائے کو وہ چٹ دے کر ان امریکیوں کے کمرے میں بھیجا ادھر ماہا نے ہوٹل کے ہاؤس ٹیلی فون پر ان میں سے ایک سے کنٹیکٹ کیا اور اسے کہا کہ وہ جینی بول رہی ہے اور اس نے بیل بوائے کے ہاتھ میں ایک سلپ بھی ان کو بھیجی ہے۔ اگر وہ چاہیں تو کافی شاپ میں اس سے مل سکتے ہیں وہ مزید دس منٹ ان کا انتظار کرے گی۔ ماہا یہ فون کرکے واپس آئی تو میں نے مزمل کے ساتھ اسے گھر واپس بھجوادیا اور مزمل کو کہا کہ وہ ماہا کو گھر چھوڑ کر اور JCO منصف کو لے کر یہاں آجائے۔ میں عمران اور قیصر کے ساتھ کافی شاپ میں ہی بیٹھا رہا۔ ہم سب پوری طرح سے مسلح تھے اور خلیل کی ٹیکسی پارکنگ لاٹ میں ہمارا انتظار کررہی تھی کیونکہ وہ اب ایک طرح سے ہمارا راز دار اور شریک کار بن چکا تھا۔

دس منٹ کے اندر ہی دونوں امریکی کافی شاپ میں آکر ماہا کو تلاش کرنے لگے تو میں نے انھیں اشارے سے اپنی ٹیبل پر بلایا وہ ماہا کے بجائے ہمیں دیکھ کر چونکے تو ضرور لیکن آپس میں کچھ بات کرکے ہمارے پاس چلے آئے۔ میں نے انھیں اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی جسے انھوں نے بادل نخواستہ قبول تو کرلیا لیکن ان کی نگاہیں ہال میں چاروں طرف جینی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ عمران نے ان کے لیے کافی کا آرڈر دیا کافی پیتے ہوئے میں نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا ”مجھے آپ کے ناموں کا تو علم نہیں لیکن کل رات کانٹی نینٹل میں ڈنر پر آپ سے ملاقات ہوئی تھی اور چند لمحے ہم نے باتیں بھی کی تھیں۔ ایک عجیب اتفاق ہے جس پر میں حیران ہوں۔ کل رات آپ میری بیوی کے متعلق

پوچھ رہے تھے اور آج میں حیران ہو رہا ہوں کہ چند لمحے قبل ایک خاتون جو میری بیوی کی اتنی ہم شکل تھی جیسے وہ جڑواں بہنیں ہوں، ایک اجنبی کے ساتھ یہاں بیٹھی تھی۔ میں نے اسے اپنی بیوی سمجھتے ہوئے دوبار آواز بھی دی اور پھر اس کے قریب چلا گیا۔ قریب جا کر مجھے احساس ہوا کہ وہ میری بیوی کی حیران کن حد تک ہم شکل تھی سوائے ایک فرق کے کہ اس خاتون کے دائیں گال پر ایک نمایاں تل تھا جب کہ میری بیوی کے چہرے پر کوئی تل نہیں (ماہا کے چہرے پر تل تھا جسے وہ سعودی عرب اور ایران میں حجاب پہن کر چھپائے رکھتی تھی) اسی اثنا میں تین آدمی کافی شاپ میں آئے اور اس خاتون کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا وہ خاتون ان کے ہمراہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن کسی مجبوری یا خوف کی وجہ سے ان کے ساتھ جانے پر مجبور ہوگئی'' "She Was Janey" وہ جینی تھی۔ مڈل ایسٹ والوں کے لب و لہجے میں بولنے والا امریکی بے ساختہ بول اٹھا ''کتنی دیر ہوئی ہے اسے باہر گئے ہوئے'' دوسرے امریکی نے پوچھا ''یوں سمجھو کہ ایک دروازے سے تم کافی شاپ کے اندر داخل ہوئے اور دوسرے دروازے سے وہ لوگ باہر گئے ممکن ہے ابھی وہ پارکنگ ایریا میں ہی ہوں کیونکہ وہ خاتون ان لوگوں کے ہمراہ جانے پر راضی نہیں تھی'' میں نے یہ بات کہی تو دونوں امریکی ہوٹل کے بیرونی دروازے کی طرف لپکے میں نے کافی کے بل سے زیادہ رقم ٹیبل پر رکھی اور ہم بھی ان کے پیچھے ہی باہر نکل آئے۔ دونوں امریکی دیوانہ وار پارکنگ ایریا میں ماہا کو تلاش کر رہے تھے ان کی نظریں دوسری طرف ہوئیں تو عمران چلا کر بولا ''وہ غالباً اس گاڑی میں جا رہے ہیں'' عمران نے ایک گاڑی جو پارکنگ ایریا کے ایک کونے سے باہر نکلی تھی، کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں امریکی فوراً اپنی گاڑی کی طرف بھاگے تاکہ جینی کو ساتھ لے جانے والوں کا پیچھا کر سکیں مجھے جس بات کی تصدیق کی ضرورت تھی وہ ہو چکی تھی ہم پارکنگ ایریا میں ہی کھڑے رہے تھوڑی دیر میں ہی مزمل ماہا کو گھر چھوڑ کر JCO منصف کے ہمراہ آ گیا ہم نے امریکیوں کی گاڑیوں کے نمبر نوٹ کر لیے تھے لہٰذا اب وہاں مزید ٹھہرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم سب خلیل کی گاڑی میں بیٹھے اور گھر لوٹ آئے۔

ہر مشن کئی حصوں پر مشتمل ہوتا ہے ہمارا یہ مشن تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا حصہ کہ کیا واقعی یہ امریکی ماہا کی تلاش میں تھے، کامیابی سے پورا ہو چکا تھا دوسرا حصہ ان کو ہوٹل یا دفتر کے راستے سے کسی سنسان جگہ پر لے جانا اور تیسرا حصہ تھا انھیں ختم کرنا۔ میں نے عمران اور JCO منصف کی ڈیوٹی لگائی کہ کل علی الصبح وہ خلیل کی گاڑی میں ہوٹل جائیں اور ان امریکیوں کے علم میں لائے بغیر ان کے دفتر تک ان کا پیچھا کریں اور یہ بھی نوٹ کریں کہ کیا ہوٹل سے دفتر تک کے راستے میں کوئی ایسی مناسب جگہ آتی ہے جہاں سے ان کو گزرنے والوں کی نظروں میں آئے بغیر اغوا کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ خلیل کو ہمراہ لے کر کوئی ایسی سنسان جگہ تلاش کریں جہاں ان امریکیوں سے مطلوبہ معلومات لے کر انھیں جہنم واصل کیا جا سکے۔ عمران اور منصف صبح کے گئے گہری شام کو واپس لوٹے انھوں نے بتایا

بے یقینی کی کیفیت بالکل عیاں تھی۔ مجھے دیکھ کر تینوں کھڑے ہوگئے۔ میں نے میجر اسفند سے ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا ''میرے ان ساتھیوں نے کیا آپ کو زیادہ پریشان تو نہیں کیا'' اسفند کہنے لگا۔ آپ پریشانی کی بات کرتے ہیں انھوں نے ہمارے دس منٹ کے سفر کو ۴۵ منٹ کا بنادیا اور پھر بھی ہمارا پیچھا کرنے سے باز نہ آئے ہم نے کئی چھوٹی سڑکوں پر یک دم گاڑی گھمائی کئی بار ہم نے گاڑی کی رفتار دو سو کلو میٹر تک بڑھادی لیکن یہ ہمارے پیچھے چپکے ہی رہے یہاں پہنچ کر اگر ہمیں انھیں اندر بلانے میں پانچ منٹ کی بھی دیر ہوجاتی تو یہ دیواریں پھلانگ کر اندر آ جاتے'' میں نے مزمل سے پوچھا ''ٹیکسی ڈرائیور نے کیا مخصوص نشان کی گاڑی کا پیچھا کرنے میں حیل وحجت تو نہیں کی'' ڈرائیور کو تو ہم نے ہوٹل کی پارکنگ میں ہی زبردستی پیچھے بٹھادیا تھا سارا وقت قیصر نے ہی گاڑی چلائی'' میں ساتھیوں کو لیے ہوئے سڑک پر آیا تو ٹیکسی ڈرائیور کی خوف اور سراسیمگی سے جو حالت ہو چکی تھی اسے دیکھ کر ہی مجھے ہنسی آ گئی۔ گاڑی کی چابی قیصر اپنے ساتھ اندر لے گیا تھا ورنہ ٹیکسی ڈرائیور کبھی کا رفوچکر ہوگیا ہوتا۔ مجھے دیکھ کر وہ کہنے لگا ''آقا مجھے گاڑی کی اتنی زیادہ فکر نہیں تھی جتنی اپنی زندگی کی تھی۔ انھوں نے گاڑی اتنی تیز چلائی اور ایسے خطرناک موڑ کاٹے کہ ہر بار مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ اب گاڑی الٹی اور ہم سب جان سے گئے''۔ ایرانی ڈرائیور نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بہت کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اسے کہا کہ اب ہمیں گھر لے چلے میں نے راستے میں ساتھیوں سے کوئی بات نہیں کی صرف یہ کہا کہ اس کوٹھی کے راستے کو ذہن میں رکھیں۔ گھر پہنچ کر میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی توقع سے زیادہ کرایہ اور انعام دیا اور ساتھیوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہوا۔ مسز زاہدی سمیت میرے سارے ساتھی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے انھیں ہنستے ہوئے کہا ''ایک پرانا واقف کار مل گیا تھا جس نے زبردستی اپنے گھر لے جانے کے لیے مجھے اغوا کرنے کا ڈراما کھیلنا چاہا لیکن مزمل، قیصر اور عمران نے اس کے ڈرامے کو ادھورا ہی رہنے دیا اور پیچھا کرتے ہوئے اس کے گھر پہنچ گئے اور میں کچھ دیر اس دیرینہ دوست کے گھر رہ کر ان کے ہمراہ واپس آ گیا'' سب سمجھ رہے تھے کہ میں مصلحتاً جھوٹ بول رہا ہوں لیکن کسی نے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے ساتھیوں کو کہا کہ صبح ناشتے کے بعد ۱۰ بجے ہماری ڈرائنگ روم میں میٹنگ ہوگی اب جا کر آرام کریں۔ مسز زاہدی کہنے لگی جنرل کاؤسی آپ کے لیے بہت فکرمند تھا جب میں نے اسے بتایا کہ ایک مخصوص نشان والی بغیر نمبر پلیٹ کی گاڑی میں آپ کو لے جایا گیا ہے تو وہ سر پیٹ کر رہ گیا اور کہنے لگا کہ وہ اس بارے میں سوائے اطلاعات حاصل کرنے کے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہمارے یہاں پہنچنے کے ہر پندرہ منٹ بعد اس کا فون آ رہا ہے وہ کچھ بتاتا تو نہیں صرف یہ کہتا ہے کہ اگر آپ لوٹ آئیں تو میں اسے فوری طور پر فون کروں'' ابھی مسز زاہدی کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ کاؤسی کا فون آیا مسز زاہدی نے اسے بتایا کہ میں بخیریت اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ لوٹ آیا ہوں۔ کاؤسی نے

مجھ سے بات کرنی چاہی تو میں نے اسے کہا کہ میں بخیریت ہوں کوئی خاص بات نہیں تھی بہرحال اگر وہ کل دن کو مجھے مل لے تو بہتر رہے گا یہ بات کر کے میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ راستے میں ماہا نے مجھ سے پوچھا ”کیا میرے متعلق کوئی بات تھی“۔ ”نہیں ماہا تمھارے متعلق نہیں بلکہ ہم سب کے متعلق تھی اور اب ہم پہلے سے زیادہ محفوظ ہیں باقی بات صبح بتاؤں گا“ کہ میں نے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں دو امریکیوں کا ذکر کیا تھا جو ماہا کی طرف ہی متوجہ تھے اور اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے ماہا اسی وجہ سے زیادہ پریشان تھی۔

اگلے روز ناشتے کے بعد میں ساتھیوں کے ہمراہ اپنے ڈرائنگ روم میں آ گیا اور انھیں گزشتہ رات کا واقعہ اور ساوک کے سربراہ سے ہونے والی گفتگو بتائی۔ قیصر نے میرے نمبر ٹو کی حیثیت سے میری تمام روائیداد سننے کے بعد کہا ”بھائی جان! ساوک والے جس انداز سے آپ کو اپنے ہمراہ لے گئے وہ بہت ہی نامناسب اور غلط طریقہ تھا اگر سربراہ کو آپ سے ملنا اور آپ کا تعاون درکار تھا تو بہتر اور مہذب طریقے سے بھی آپ کو بلایا جاسکتا تھا آپ نے ان کے ساتھ جانے سے پہلے جو ہدایات مزمل بھائی اور عمران بھائی کو دی تھیں اور جس طرح وہ آپ کو اپنے ہمراہ لے گئے اس سے ہم سب کی تو جان ہی نکل گئی۔ عمران بھائی نے مجھے آپ کے متعلق جلدی میں بتایا اور میں نے ماہا کو کہا کہ آپ گھر جا کر فوری طور پر اپنا سارا اسلحہ لے کر تیار رہیں ہم بھائی جان کے پیچھے جاتے ہیں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہم بھائی جان کا ٹھکانا دیکھ کر فوری واپس آئیں گے اور پھر سب مل کر اس جگہ جا کر حملہ کریں گے اور بھائی جان کو چھڑوانے کے لیے اگر ہم سب کی جانیں بھی گئیں تو آخری سانس اور آخری گولی تک ہم ان سے مقابلہ کریں گے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس کوٹھی کے اندر سے آپ کو ساتھ لے جانے والے جلد ہی باہر آگئے ورنہ مزمل بھائی کو گھر سے سب کو لانے کے لیے بھیج کر میں نے اور عمران بھائی نے دیوار پھلانگ کر اندر چلے جانا تھا پھر جو ہوتا سو ہوتا“ میں نے قیصر کو تسلی دیتے ہوئے کہا ”یہ واقعی ان کی غلطی تھی کہ مجھے اس طرح ہوٹل کے باہر سے لے جایا گیا لیکن ان دونوں کو بھی مجھے بلانے کی حقیقت کا علم نہیں تھا۔ پاکستان اور بھارت میں بھی اگر خفیہ ایجنسی کا سربراہ کسی شخص کو لانے کے لیے اپنے جونیئرز کو کہے تو وہ تو اس سے بھی برا سلوک کر کے اسے ساتھ لے جاتے ہیں چاہے سربراہ کا مقصد اس شخص سے جو اس کا دوست بھی ہو، محض ملنا ہی ہو۔ بہرحال جو کچھ ہوا اس سے ساوک کے سربراہ کو میرے سامنے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ میرے ساتھی ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے سے ہرگز دریغ نہیں کرتے۔ ابھی جنرل کاؤسی بھی آنے والا ہے اسے بھی یہ علم ہو چکا ہے کہ ساوک والے مجھے لے گئے تھے جنرل کاؤسی بے شک ہمارا ہمدرد ہے لیکن شاہ کا وفادار بھی ہے جب کہ ساوک والے صرف مملکت کی بہتری اور بھلائی کا سوچتے ہیں اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں پہلے جنرل کاؤسی سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ میرے ہوٹل سے جانے

کے بعد کے واقعات کے متعلق کس حد تک جانتا ہے مجھے یقین ہے کہ اصل وجہ اسے بھی معلوم نہیں ہوگی ہم بھی اسے کچھ نہیں بتائیں گے میں یہی کہوں گا کہ وہ کسی دوسرے غیرملکی کے معاملے میں مجھے لے گئے تھے جس کی شکل وصورت اور قد کاٹھ مجھ سے ملتا تھا راستے میں جب انھیں حقیقت معلوم ہوئی تو بہت معذرت کرتے ہوئے انھوں نے مجھے ایک ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب اتارا اور چلے گئے۔ میں تو کاؤسی کو یہ بھی بتانا نہیں چاہتا کہ مجھے یا آپ سب کو یہ معلوم ہے کہ مجھے ساوک والوں نے اٹھایا ہے“ ابھی ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ مسز زاہدی نے آ کر بتایا کہ جنرل کاؤسی ڈرائنگ روم میں میرا انتظار کر رہا ہے۔

☆☆

مسز زاہدی نے جب ہمارے ڈرائنگ روم میں آ کر جنرل کاؤسی کی آمد کی اطلاع دی اس وقت میں اپنے ساتھیوں کو گزشتہ رات ساوک کے سربراہ سے ہونے والی گفتگو کے متعلق سب کچھ بتا چکا تھا۔ میرے ساتھیوں نے یک زبان ہو کر مجھے یقین دلایا کہ میں نے ساوک کے سربراہ سے اپنے تعاون کا جو وعدہ کیا ہے اس میں ان کا بھرپور تعاون شامل ہوگا اور وہ میرے کندھے سے کندھا ملا کر میرے ہر مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ میں جنرل کاؤسی سے ملنے مسز زاہدی کے ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں آپ میں سے جو بھی چاہیں ہماری گفتگو میں شریک ہو سکتے ہیں۔ قیصر، عمران، مزمل اور ماہا میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور باقی ساتھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ جنرل کاؤسی نے مجھے دیکھا تو مجھ سے یوں لپٹ لپٹ کر ملا جیسے برسوں کے بچھڑے دوست ملتے ہیں کہنے لگا ”اللہ کا شکر ہے کہ تم بخیر وعافیت واپس آ گئے ورنہ ساوک والے جس کو ایک بار اٹھا لیں پھر اس کا کبھی پتا نہیں چلتا کہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ تمھیں اتنی جلدی ان سے رہائی کیسے مل گئی؟“ ”اس لیے جنرل کاؤسی کہ مجھے حراست میں لیا ہی نہیں گیا تھا میرے کسی ہم شکل کے شبہے میں وہ مجھے اپنی گاڑی میں تھوڑی دور لے کر گئے میں نے جب انھیں اپنا پاسپورٹ دکھایا تو انھوں نے معافی مانگتے ہوئے کہا کہ وہ مجھے کسی اور کے مغالطے میں ساتھ لے جا رہے تھے انھوں نے بار بار معذرت کے بعد مجھے ہوٹل کے قریب ہی ایک ٹیکسی اسٹینڈ پر اتارا اور چلے گئے“ میں نے مختصر الفاظ میں سارے واقعے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو تمھاری قسمت اچھی ہے ورنہ ساوک والوں کو جب تک یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ کسی غیرمطلوبہ شخص کو غلطی سے لے آئے ہیں اس وقت تک اس شخص کی ایسی بری حالت ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ نہ تو زندوں میں شمار ہوتا ہے اور نہ ہی مردوں میں“۔ کاؤسی نے موساد کے متعلق اپنے خیالات بیان کرتے ہوئے کہا۔ چلیے چھوڑیے اس واقعے کو میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ گزشتہ رات آپ نے جن دو آئل کی بائی پروڈکٹس بنانے والے امریکیوں کو اپنی دعوت میں بلایا تھا ان کا حدود اربعہ کیا ہے آپ کب سے انھیں جانتے ہیں اور اس کام کے علاوہ ان

کی اور کیا مصروفیات ہیں'' میں نے کاؤسی سے پوچھا تو اس نے کہا ''دراصل ان کے متعلق میں خود اس سے زیادہ نہیں جانتا جیسا آپ نے بتایا ہے میرے ایک دوست نے جس کے پاس ان کی پروڈکٹس کی ایجنسی ہے، میری اجازت سے انھیں اپنے مہمانوں کی صورت میں بالواسطہ بلایا تھا میرے دوست نے مجھے یہ کہہ کر ان کو بھی دعوت میں شرکت کی اجازت لی تھی کہ وہ اپنے ان کاروباری دوستوں کو اس دعوت میں اعلیٰ فوجی افسران سے ملا کر اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے لیکن آپ ان کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' اس لیے کہ انھوں نے دعوت کے دوران خصوصی طور پر اپنی توجہ ماہا پر مبذول رکھی کھانے کے بعد جب ہم کافی پینے صوفوں پر بیٹھے تو ماہا کے یہ بات بتانے پر میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا مجھ سے بھی انھوں نے ماہا کے متعلق سوال کیے تو میں نے انھیں یہ کہا کہ ماہا میری بیوی ہے پھر بھی ان کا تجسس کم نہ ہوا، میں نے ایک بات اور نوٹ کی تھی کہ ان میں سے ایک تو اسرائیلی لب و لہجے میں انگلش بول رہا تھا لیکن دوسرا جو ماہا کی طرف زیادہ متوجہ تھا اس کی انگریزی کا تلفظ بالکل مڈل ایسٹ اور فرانسیسیوں کی طرح تھا۔ میں یہ چاہوں گا کہ آپ اپنے دوست کے ذریعے ان دونوں امریکیوں کے مکمل کوائف اور تہران میں رہائشی ایڈریس کل شام تک مجھے دیں'' میں نے کاؤسی سے یہ کہا تو وہ بولا ''یہ کیا مشکل ہے میں اپنے دوست کو ابھی فون کر کے ان کے نام اور کارخانوں اور رہائشی ایڈریس لے لیتا ہوں مجھے ان کے متعلق صرف یہ پتا ہے کہ جب میرے دوست نے انھیں ہمراہ لانے کی اجازت طلب کی تو میں نے اسے کہا کہ وہ اپنی فیملیوں کو بھی ہمراہ لے آئیں تو میرے دوست نے جواب دیا کہ وہ فی الحال یہاں کسی ہوٹل میں رہتے ہیں اور ان کی فیملیز ان کے ساتھ نہیں ہیں''۔ یہ کہہ کر کاؤسی نے مسز زاہدی سے اجازت لے کر اس کے فون پر اپنے دوست سے رابطہ کیا۔ ٹیلی فون جس میز پر پڑا تھا اس پر پیڈ اور قلم بھی تھا۔ کاؤسی ریسیور اپنے کان سے لگائے کچھ لکھتا بھی جاتا۔ بات ختم ہونے پر اس نے وہ کاغذ میرے حوالے کیا وہ دونوں امریکی ہلٹن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ان کے نام والکر (Walkler) اور اسمتھ (Smith) تھے۔ جنرل کاؤسی نے مجھے بتایا کہ اس نے رام سر میں ہونے والے حادثات کی میرے کہنے کے عین مطابق رپورٹ بنا کر پولیس کے چیف کو بھجوادی ہے اور اسے یقین ہے کہ پولیس چیف اس کی رپورٹ کے فریم ورک میں ہی اپنی تفتیش دکھائے گا۔ تھوڑی دیر بعد کاؤسی ہم سے رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ماہا، قیصر، عمران اور مزمل سے مشورہ کر کے ان امریکیوں سے آج رات ہی ملنے کا پروگرام بنایا اور اس کی تفصیل طے کر کے ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

اب ذرا اپنے ملکی حالات پر ایک نظر۔ بیس اور اکیس جون کے سبھی اخبارات میں نواب زادہ نصر اللہ کی کراچی آمد اور فنکشنل مسلم لیگ کے پیر پگارا، جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور صاحب کے علاوہ دیگر [illegible] پارٹیوں کے لیڈروں سے ملاقات کا ذکر ہے۔ نواب زادہ کے متعلق ایک بات

کہ قم شہر کو جانے والی سڑک پر ان کا دفتر ہے اور دفتر جاتے اور واپسی کے وقت اس سڑک پر اتنی ٹریفک ہوتی ہے کہ وہاں سے ان کو اغوا کرنا تقریباً ناممکن ہے اپنے دیر سے واپس لوٹنے کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ وہ ان کے ہوٹل لوٹنے کے بعد کافی شاپ میں مشروبات پی رہے تھے کہ یہ دونوں ہوٹل سے باہر نکلے۔ دونوں نے ان امریکیوں کا پیچھا کیا وہ اپنی گاڑیوں میں شمران کے علاقے میں امپریل کلب میں چلے گئے اور یہ دونوں ہمیں بتانے کے لیے فوراً گھر چلے آئے ہیں یہ دو امریکی دو مختلف گاڑیوں میں کلب گئے اور ان کے نمبر، میک اور رنگ وغیرہ انھوں نے نوٹ کر لیے ہیں عمران اور منصف کو کلب سے گھر پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ ۲۵ منٹ صرف ہوئے تھے اور اغلب خیال یہی تھا کہ اگر ہم فوراً ہی کلب کی طرف جائیں تو یہ وہیں موجود ہوں گے۔

☆☆

عمران اور منصف کے یہ بتانے پر کہ وہ دونوں امریکی امپریل کلب میں گئے ہیں اور ابھی بھی شاید وہیں ہوں، میں نے قیصر اور مزمل کو تیار ہونے کا کہا اور پندرہ منٹ کے اندر میں، مزمل، عمران اور قیصر خلیل کی گاڑی میں امپریل کلب کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو گیٹ پر ہی گارڈز نے ہمیں اندر جانے سے روک دیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس کلب میں صرف ممبر ہی جا سکتے ہیں اور اگر ان کے ساتھ کسی مہمان نے جانا ہو تو اس کے لیے تین چار دن پیش تر اجازت نامہ لینا پڑتا ہے۔ باہر سے ہی اس کلب کی شان و شوکت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کلب امرا کے بھی چوٹی کے طبقے کے لیے مخصوص ہے۔ خلیل نے گارڈ سے فارسی بول کر یہ بھی معلوم کر لیا کہ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی بھی مہینے میں دو ایک بار اس کلب میں آتا ہے۔ میں حیران تھا کہ اتنے اہم اور اونچے طبقے کے لیے مخصوص کلب کا امریکی پاسپورٹ رکھنے والا کوئی بھی شخص چاہے وہ ملک دشمن کسی بیرونی ایجنسی کا ایجنٹ ہی کیوں نہ ہو۔ ممبر بن سکتا ہے پاکستان میں جیم خانہ اور سندھ کلب کی ممبر شپ کے لیے بھی سرمایہ دار اپنی مالی حیثیت کے تحریری ثبوت کے باوجود چھ چھ ماہ کوششوں کے باوجود ممبر نہیں بن پاتے کیونکہ جب تک بورڈ آف ڈائریکٹر کی میٹنگ میں تین ممبر نئے امیدوار کی سفارش اور ذمہ داری نہ اٹھائیں اسے ممبر شپ نہیں مل سکتی۔ امپریل کے بارسوخ ممبران میں یقیناً کچھ ایسے لوگ ضرور ہوں گے جنھوں نے ان امریکیوں کے لیے ممبر شپ کی شرائط کو بہت سہل بنا دیا ہوگا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ہمیں کلب کے سیکریٹری تک جانے کی اجازت مل جائے لیکن گارڈز نے انکار کر دیا ڈالروں کی رشوت کی بھی پیش کش کی لیکن یہ حربہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اسمتھ اور واکر نامی امریکیوں کے متعلق جب میں نے پوچھا تو گارڈز نے کہا کہ انھیں ممبروں کے متعلق کچھ بھی بتانے کی اجازت نہیں۔ میں زیادہ دیر کلب کے گیٹ پر ٹھہرنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ پولیس کی پیٹرولنگ کرتی گاڑیاں پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے یہاں سے گزر رہی تھیں۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ یہاں مزید ٹھہرنے کا کوئی فائدہ

نہیں اس لیے واپس چلتے ہیں اور ان امریکیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا کوئی اور راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ میں نے خلیل کو کہا کہ گاڑی سیدھی آگے لے جائے اور کسی چوراہے سے واپس موڑ کر گھر کی طرف چلے میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ان امریکیوں کو ہمارے متعلق شک پڑ گیا ہے کیونکہ جینی کا جس کی موت کے آرڈر موساد کے ہیڈکوارٹرز سے جاری ہونے کا ہمیں سعودی عرب میں علم ہوگیا تھا ،خود موساد کے ان ایجنٹوں کو ہلٹن ہوٹل ملنے آنا نا قابل یقین بات تھی کیونکہ جینی (ماہا) کو موساد کو چھوڑے سال بھر سے زیادہ وقت گزر چکا تھا جینی کو بھی یہ علم کیسے ہوا کہ موساد کے ایجنٹ ہلٹن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں ان ایجنٹوں کے سامنے جب میں نے جینی کا حلیہ اور چہرے کے تل کا ذکر کیا تھا تو بے ساختگی میں ایک ایجنٹ کے منہ سے جینی نکلا۔ بعد میں اگر انھوں نے انٹرکانٹی نینٹل میں دعوت کے بعد اگلے روز ہی سے پیش آنے والے واقعات کی کڑیاں ملائی ہوں تو یقیناً وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ سب محض اتفاق نہیں تھا بلکہ انھیں جال میں پھانسا جا رہا تھا اگر ان کی جگہ پر میں خود ہوتا تو ان واقعات کی تہ تک پہنچ جاتا۔ موساد کے ایجنٹ بھی کوئی سیدھے سادے لوگ نہیں تھے بڑی کڑی آزمائشوں اور سخت ٹریننگ کے بعد انھیں دوسرے ممالک میں بھیجا جاتا ہے۔ ہم اگلے چوراہے سے گاڑی موڑ کر گھر کی طرف جا رہے تھے کہ پولیس کی ایک پٹرولنگ کار نے ہمارا راستہ روک کر ہم سے پوچھ گچھ کرنا شروع کی۔ پولیس کی گاڑی دیکھتے ہی خلیل نے ہمیں کہا کہ آپ سب بالکل خاموش بیٹھے رہیں اور فارسی اور انگلش میں کوئی بات نہ کریں میں پولیس والوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ خلیل گاڑی سے اتر کر پولیس سے باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد خلیل کی آواز اونچی ہوگئی اور ہاتھ ہلا کر باتیں کرتے ہوئے اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے ایک کارڈ نکال کر انھیں دکھایا۔ خلیل نے خود ہی بولنا شروع کیا ”میں چاہتا تھا کہ خود کو آپ کے سامنے ظاہر نہ کروں لیکن اب مجبوری تھی اور کوئی چارہ نہ رہا میں یہاں کی خفیہ پولیس میں سارجنٹ ہوں“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا کارڈ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا“۔ ” میرا آپ سے اپنا اصلی عہدہ چھپانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کہیں آپ مجھ پر بھی شک نہ کریں مسز زاہدی نے مجھے خصوصی طور پر آپ کی بحیثیت ٹیکسی ڈرائیور ڈیوٹی دینے کو کہا تھا۔ میں ویسے بھی ٹیکسی ہی چلاتا ہوں اور مسافروں کی گفتگو اور ان کی آمدورفت کی جگہوں کی رپورٹ دینا میرے فرائض میں شامل ہے۔ میں خود اسی گروپ میں ہوں جس میں مسز زاہدی اور جنرل کاؤسی ہیں یعنی مملکت کے دشمنوں کی بیخ کنی کرنے والا گروپ۔ آپ جنرل کاؤسی اور مسز زاہدی سے میرے متعلق پوچھ سکتے ہیں میں حکومت کا نہیں بلکہ مملکت کا وفادار ہوں“ خلیل کو مجبوراً اپنی اصلیت ظاہر کرنی پڑی تھی میں نے خلیل کو کہا ”تم اب تک یہ تو بخوبی جان گئے ہو گے کہ ایران میں ہماری آمد کا مقصد کیا ہے رام سر میں ہونے والے سارے واقعات تمھاری نظروں کے سامنے پیش آئے ہمیں خود تمھارے سرکاری عہدے کا تو اب تک علم نہیں تھا لیکن پہلے روز سے ہی ہمیں یہ یقین ضرور تھا کہ تم

بھی ایران کے اصل دشمنوں کا خاتمہ چاہتے ہو۔ اب جب کہ ہر بات کھل گئی ہے تو ہمیں یہ بتاؤ کہ ہلٹن ہوٹل میں رہنے والے ان موساد کے ایجنٹوں تک کس طرح پہنچا جائے۔ میرا مطلب ہے کہ کس طرح انھیں اپنی گرفت میں لیا جائے“ خلیل نے جواب دیا ”جناب، میں تو اپنے محکمے کا ایک ادنیٰ کارکن ہوں اور نہ ہی اتنا ہوشیار اور نڈر ہوں کہ اتنے اہم کاموں کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کرسکوں یا ان پر عمل درآمد کروں میری ناچیز رائے میں ان دونوں کو ختم کرنے کے لیے ہلٹن ہوٹل میں ان کے کمرے ہی بہترین رہیں گے۔ ہمارا ایک کارکن اور میرا دوست اس ہوٹل میں کام کرتا ہے اس کے ذریعے میں اس ہوٹل کے مونوگرام والے دو تین اوورآل لے سکتا ہوں جنھیں پہن کر آپ سروس لفٹ سے ان کے کمروں تک جاسکتے ہیں اور بجلی اور اے سی کی چیکنگ کا عذر کرکے ان کے کمروں میں داخل ہوسکتے ہیں۔ آپ لوگ اگر ایک بار بلا روک ٹوک ان کے کمروں میں ان کی موجودگی میں داخل ہو جائیں تو پھر آگے جو کرنا ہے وہ آپ کے لیے بہت سہل ہوجائے گا“ کئی بار بڑے بڑے دماغ والے اس نکتے تک نہیں پہنچ پاتے جہاں ایک عام شخص فوراً پہنچ جاتا ہے۔ خلیل نے جو بات کی تھی وہ ہم سب کے ذہن میں آئی ہی نہیں تھی۔ میں نے خلیل کو کہا کہ اس نے ہمیں بہترین راستہ دکھایا ہے اگر وہ ایک رات کے لیے تین اوورآل اور ایک الیکٹریشن کے سروس بکس کا انتظام کردے تو ہم یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے۔ خلیل نے دو روز کے اندر ہمارے سائز کے اوورآل اور سروس بکس مہیا کرنے کا وعدہ کیا اور ہمیں گھر چھوڑ کر رخصت ہوگیا۔

اگلے روز میں نے سب ساتھیوں کو اپنے ڈرائنگ روم میں بلوایا اور انھیں گزشتہ دن اور رات کے واقعات بتائے اور کہا کہ جو پلاننگ خلیل نے ہمیں بتائی ہے ہم اسی پر عمل کریں گے، اس کام کے لیے میں نے مزمل، عمران اور خود کو رکھا لیکن قیصر نے بضد ہو کر مزمل کے بجائے خود اسے اپنے ساتھ لے جانے پر مجھے مجبور کردیا۔ ابھی ہم یہ باتیں کررہے تھے کہ مسز زاہدی نے آکر بتایا کہ ویزا سیکشن کا کوئی افسر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ ابھی ہمارے ویزوں میں بہت وقت باقی تھا۔ میں مسز زاہدی کے ڈرائنگ روم میں آیا تو میجر اسفند بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا میجر اسفند نے کہا کہ وہ یہ کہنے آیا ہے کہ ایرانی قانون کے مطابق ہم تہران کے علاوہ ملک کے کسی بھی شہر میں جائیں تو ویزے آفس سے راہداری بنوا کر جائیں۔ انھیں اطلاع ملی ہے کہ ہم بغیر راہداری کے رام سر گئے تھے اس بار تو ہمیں صرف وارننگ دی جاتی ہے لیکن آئندہ اگر ایسے ہوا تو ہمیں فوری طور پر ایران سے بے دخل کردیا جائے گا۔ چائے لانے کے لیے مسز زاہدی کچن میں گئی تو میجر اسفند نے کہا ”چیف آج رات آٹھ بجے آپ سے ملنا چاہتا ہے، ایک گاڑی اس گھر کے دائیں جانب سڑک پر کھڑی ہوگی وہ آپ کو چیف تک پہنچادے گی“۔ یہ کہتے ہوئے اس نے گاڑی کا نمبر لکھی ہوئی ایک چٹ مجھے دی اور چائے پینے کے بعد مجھے آئندہ قانون کی پابندی کرنے کی تلقین کرتے ہوئے رخصت

ہوا۔ میں ساتھیوں کو میجر اسفند کی آمد کا اصل مقصد بتا کر رات ٹھیک ساڑھے سات بجے اکیلا سڑک پر نکل آیا۔ اس نمبر والی گاڑی اچانک پیچھے سے آئی اور مجھ سے ذرا آگے رک گئی سیاہ شیشوں والی اس گاڑی نے بیس منٹ سے بھی کم وقت میں مجھے اسی کوٹھی میں پہنچادیا جہاں پہلی بار جنرل علی کوشش مجھے ملا تھا۔ دوسرے اہل کاروں کے علاوہ آج صرف میجر اسفند ہی وہاں موجود تھا اس نے ٹھیک آٹھ بجے مجھے جنرل علی کوشش کے دفتر میں پہنچایا۔ جنرل اپنی کرسی پر سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھا تھا فکر اور پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ پھیکی مسکراہٹ سے میرا حال احوال پوچھنے کے بعد وہ دفتر کے صوفوں پر میرے ساتھ بیٹھ گیا اور کہنے لگا ''ایران کی تباہی کا وقت آن پہنچا ہے ایک آئل ٹینکر آج سے چار روز بعد بندر عباس کی بندرگاہ پر پہنچ جائے گا جس میں تیار پام آئل بھرا ہوا ہے اس پام آئل کو امپورٹ کرنے والی پارٹی بہت اثرورسوخ والی اور شاہ سے قرابت داری رکھتی ہے اس تیل کو بندر عباس میں ہی ڈبوں میں بند کرکے سارے ملک کے غریبوں میں مفت تقسیم کیاجائے گا شاہ کے خصوصی احکام کے تحت یہ تیل ایک مخصوص دن شاہ کی طرف سے غریب عوام کو دیا جائے گا کسی بھی سرکاری ادارے کو اس تیل کی جانچ پڑتال کرنے کی اجازت نہیں۔ ہمیں جو اطلاعات اپنے ذرائع سے ملی ہیں ان کے مطابق اس تیل میں ایک ایسا مخصوص کیمیکل ڈبوں میں منتقلی کے وقت شامل کیاجائے گا جس سے اسے استعمال کرنے والے ہمیشہ کے لیے مفلوج ہوجائیں گے''۔ ''جنرل علی! دو باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ پہلی یہ کہ ایرانی عوام کو مفلوج کرنے سے تیل امپورٹ کرنے والی پارٹی کو کیا فائدہ ہوگا اور دوسری بات یہ کہ آپ کی ایجنسی ان ڈبوں کی تقسیم سے پہلے ہی اس تیل سے بھرے کچھ ڈبے لے کر پریس کے سامنے پیش کیوں نہیں کرتی'' میرے ان سوالوں کا جواب جنرل علی کوشش نے دیتے ہوئے کہا کہ ''ایک وقت میں ایک ہی شاہ ہوسکتا ہے شاہ کی بہن شہزادی اشرف پہلوی اور شاہ کا چھوٹا بھائی یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ شاہ بغیر اولاد نرینہ کے ہی مر جائے گا یا اسے محلاتی سازشوں سے ہلاک کردیاجائے گا جو شہزادی اشرف پہلوی کا چہیتا ہے لیکن ملکہ فرح دیبا کے بطن سے شاہ کے دو لڑکے پیدا ہونے کے بعد ان کی یہ آس ٹوٹ گئی اور اب وہ ملک میں شاہ کی طرف سے غربا میں کھانے کا تیل مفت تقسیم کرکے شاہ کے خلاف بغاوت کروانا چاہتے ہیں۔ آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایران میں کسی اخبار میں یہ جرأت نہیں ہے کہ وہ اتنی بڑی سازش کے متعلق ایک حرف بھی لکھ سکے۔ جن اخبارات نے اس سے بہت کم درجے کی غلطیاں کی تھیں ان کے مالکان اور ایڈیٹروں کا آج تک پتا نہ چل سکا اپنی صفائی میں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاہ کے ان مخالفین کے غائب کرنے میں ہماری ایجنسی کا کوئی ہاتھ نہیں''۔

☆☆

''جنرل علی کوشش! صرف دو سوال اور'' میں نے بندر عباس میں آئندہ چند روز میں پام

آئل لانے والے جہاز کے متعلق جنرل کی وضاحتیں سن کر کہا ''آپ ہم سے یہ کام کیوں لینا چاہتے ہیں میری معلومات کے مطابق ساوک کے لیے کام کرنے والوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ ہے اور آپ کے وسائل بھی بے پناہ ہیں۔ پھر اتنا اہم اور حساس کام آپ ہم ہی سے کیوں کروانا چاہتے ہیں؟ اسلحہ بارود اور دوسری اشیا آپ نے مہیا کرنے کا پہلے ہی وعدہ کیا ہے لیکن بندر عباس ہمارے لیے بالکل اجنبی شہر ہے وہاں ہماری معاونت کے لیے آپ کتنے افراد مہیا کریں گے اور وہاں ہماری رہائش کا کیا انتظام ہوگا؟''۔ جنرل علی بڑے غور سے سوال سن رہا تھا اس نے جواب دیا ''آپ سے یہ کام ہمیں مجبوراً لینا پڑ رہا ہے میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میری ایجنسی میں بہت ہی کم ایسے لوگ ہیں جن پر میں بھروسا کرسکتا ہوں ورنہ دوسرے سب کے سب کہنے کو تو میرے ماتحت ہیں لیکن اگر میں یہ کام انھیں تفویض کروں یا ان کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑجائے تو وہ فوراً ہی پام آئل کے امپورٹر کو جس کی شاہ سے بڑی نزدیکی قرابت داری ہے، جاکر سب کچھ بتادیں گے انھیں تو تھوڑا بہت انعام مل جائے گا لیکن میری ایجنسی اور میں شاہ کے زیر عتاب آجائیں گے۔ امپورٹر نے چالاکی یہ کی ہے کہ مفلوج کرتے والا کیمیکل بندر عباس میں اپنے پلانٹ میں پام آئل کے ڈبوں میں ڈالے جانے کے وقت شامل کیاجائے گا اور اس پلانٹ میں ہمارے کسی بھی اہلکار کا داخلہ ممنوع ہے اور ملک بھر میں مفت بانٹے جانے والے ان ڈبوں کو اگر ہم کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کرکے اس میں ملائے جانے والے کیمیکل کی تشہیر بھی کردیں تو غریبوں کی امداد میں شاہ کی طرف سے مفت بانٹے جانے والے تیل کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے کے جرم میں ہمیں یا تو ہلاک کردیا جائے گا اور یا لمبی قید کی سزا ملے گی۔ اس حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے آپ سے ہماری مدد کرنے کی استدعا کی ہے میرا انتہائی معتمد کرنل شیرازی پہلے ہی بندر عباس جاچکا ہے اور وہاں کے شیرٹن ہوٹل میں آپ سب کے لیے کمرے بھی بک کروائے گئے ہیں اس کے ساتھ ہمارے چار اور اہلکار ہیں۔ اسلحہ Explosive Sticks (دھماکا خیز بارودی اسٹکس) بارودی سرنگیں اور تمام ضروری سامان اور غوطہ خوری کے مکمل لباس اور گیس سلنڈر وغیرہ ہم نے پہلے ہی بندر عباس میں آپ کے لیے ذخیرہ کرلیے ہیں۔ میجر اسفند آپ کے ہمراہ آپ سے ان جان بن کر جائے گا۔ آپ کے بندر عباس کے شیرٹن ہوٹل میں قیام کے دوران آپ سے کرنل شیرازی اور میجر اسفند مسلسل رابطے میں رہیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تیل لانے والے جہاز کو Outer Ancher (بندرگاہ میں داخلے سے پہلے کھلے سمندر میں لنگرانداز ہونا) پر ہی تباہ کردیاجائے۔ رات کے اندھیرے میں آپ کو تکمیل مشن کے لیے جہاز تک لے جانے اور واپس لانے کے لیے دو اسپیڈ بوٹس کا انتظام بھی کردیا گیا ہے مشن میں خدانخواستہ ناکامی کی صورت میں آپ کو راس الخیمہ تک لے جانے کے لیے ایک بائی پلین (پانی میں تیرنے والا ہوائی جہاز) اور دو تیز رفتار لانچوں کو بھی اسٹینڈ بائی پوزیشن میں رکھا جائے گا۔ ایک بات اور اس میں

کامیابی کی صورت میں آپ کو پچاس لاکھ ڈالر کا تحفہ بھی دیا جائے گا"۔ ایک تو لاکھوں انسانی زندگیوں کا سوال تھا اور دوسرے علی کوشش کو اگر میں اس مشن میں شمولیت سے معذرت کرتا تو وہ ہمیں رام سر میں ہونے والے واقعات میں بڑی آسانی سے ملوث کرسکتا تھا۔ ۵۰ لاکھ ڈالر کی پرکشش آفر بھی تھی لہٰذا میں نے ان سب باتوں کے پیش نظر جنرل علی کوشش کو اپنے بھرپور تعاون کا دوبارہ گرین سگنل دیا اور اس زبانی معاہدے کی ہم نے گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر تصدیق کی مہر لگادی اور تھوڑی دیر بعد ہی وہی گاڑی مجھے مسز زاہدی کے گھر کے قریب چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے اسی رات عمران، مزمل، قیصر اور ماہا سے اس مشن کے متعلق تفصیلاً گفتگو کی اور سب کے باہم مشورے سے یہ فیصلہ ہوا کہ Outer Ancher پر کھڑے جہاز تک میں، مزمل، عمران، قیصر اور سپاہی اکرم جائیں گے۔ بنگلہ دیش میں دریاؤں کی بہتات کی وجہ سے وہاں کے کمانڈر گروپ کی ٹریننگ میں طبی غوطہ خوری بھی شامل ہے اور پھر عمران اور سپاہی دین محمد نے غوطہ خوری کی باقاعدہ ٹریننگ لی ہے لہٰذا وہ غوطہ خوری کے لباس اور گیس سلنڈر کے ساتھ سمندر میں اتریں گے اور جہاز کے پانی کے اندر کے حصے میں ۶ سرنگیں چسپاں کرکے واپس آجائیں گے چونکہ ایسی بارودی سرنگوں کے پھٹنے کا وقت سیٹ کیا جاسکتا ہے اس لیے انھیں جہاز سے چسپاں کرتے وقت آدھے گھنٹے بعد کا وقت سیٹ کیا جائے گا اور اس وقفے میں ہم بخوبی بندر عباس کے ساحل تک واپس پہنچ جائیں گے یہ بنیادی باتیں طے کرنے کرکے ہم نے جزئیات کے متعلق فیصلے بندر عباس جاکر حالات کے مطابق کرنے تھے ہم سب خاصی دیر تک ہلٹن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے موساد کے دونوں ایجنٹوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ ہمیں پہلے ہی سے سروس لفٹ کے متعلق اور ہوٹل کے دوسرے اسٹاف سے مڈبھیڑ ہوجانے پر اپنے متعلق وضاحت کرنے کا فیصلہ کرلینا چاہیے۔ میں نے کہا کہ کل صبح جب خلیل آئے گا تو میں اسے کہوں گا کہ ہمیں سروس لفٹ اور دونوں کمروں کی صحیح لوکیشن کے متعلق ہوٹل میں کام کرنے والے اپنے ساتھی سے نقشہ بنوا کر دے اور اگر وہ ہوٹل میں ہماری آمد کے وقت ہوٹل کے عقبی دروازے پر ملے اور ہمیں ان کمروں تک پہنچادے تو ہمارا کام خاصا آسان ہوجائے گا۔

اگلی صبح جب خلیل آیا تو میں نے اسے ان باتوں کے متعلق کہا خلیل نے وعدہ کیا کہ وہ کل تین اوور آل اور بجلی کا سروس بکس لائے گا اور نقشے کے علاوہ اس کا آدمی ہماری رہبری کے لیے ہوٹل کے عقبی دروازے پر ہمارا انتظار کرے گا۔ خلیل ہمیں اپنی گاڑی میں چھوڑنے ہوٹل جائے گا اور وہیں ہماری واپسی کا انتظار کرے گا اور اپنے آدمی سے ہمیں ملوائے گا۔ میں نے خلیل کو یہ بھی کہا کہ اپنے آدمی کو کہے کہ ہم شام کے ۵ بجے ہوٹل پہنچ جائیں گے اور خلیل کی گاڑی میں ہی بیٹھے رہیں گے جب وہ دونوں ایجنٹ اپنے کمروں میں چلے جائیں گے تو وہ خلیل کو آکر بتائے اور ہمیں اپنے ساتھ ہوٹل کے اندر لے جائے۔ میں نے خلیل کو یہ کہا کہ ہم اس مشن کو کل پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

اگلے روز دس بجے خلیل ہمارا تمام مطلوبہ سامان لے کر آگیا۔ قیصر، عمران اور میں نے اوور آل اور ٹوپیاں پہن کر دیکھیں اور سروس بکس میں سے ٹولز نکال کر اپنے پسٹل اور ریوالور بکس میں رکھے۔ ہم نے احتیاطاً باریک نائیلون کی رسیاں اور منہ پر لگانے والی ٹیپ بھی منگوالی۔ خلیل شام پانچ بجے ہمیں لے کر ہلٹن ہوٹل کے لیے روانہ ہوا اور ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں عقبی دروازے کے قریب اپنی گاڑی پارک کردی۔ خلیل تو اپنے آدمی کے انتظار میں گاڑی کے باہر کھڑا ہوگیا ہم گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ چند منٹوں بعد خلیل عقبی دروازے سے باہر آنے والے ایک شخص سے ملا اور اس سے چند باتیں کرکے ہمارے پاس آیا اس نے ہاتھ میں ہوٹل کے تین بیج پکڑے ہوئے تھے جنھیں ہم نے اپنے اوور آلز کے اوپر لگالیا۔ ابھی وہ دونوں ایجنٹ دفتر سے ہوٹل واپس نہیں آئے تھے ساڑھے چھ کے لگ بھگ خلیل کے آدمی نے ان کی آمد کی اطلاع دی۔ انھیں کمرے میں پہنچنے کا موقع دینے کے لیے ہم ان کی آمد کی اطلاع ملنے کے بیس منٹ بعد گاڑی سے اترے اور عقبی درازے سے اندر داخل ہوکر سیدھے سروس لفٹ کی طرف گئے۔ خلیل کا آدمی ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ لفٹ سے وہ ہمیں چھٹے فلور پر لے گیا اور دو کمرے دکھائے جن کے نمبر۶۰۹ اور ۶۰۷ تھے۔ یہ دونوں کمرے گیلری میں آمنے سامنے بنے ہوئے تھے قیصر نے ۶۰۷ نمبر کمرے کے دروازے پر دستک دی ۔ قیصر نے دروازے کے سامنے اور عمران اور میں اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے دروازہ کھلا۔ قیصر نے اسپورٹس کیپ اتنی جھکی ہوئی پہنی تھی اور سر بھی بادب ہونے کے انداز میں جھکایا ہوا تھا کہ موساد کا ایجنٹ اسے پہچان نہ سکا اور قیصر کے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں یہ کہنے پر کہ ساتھ والے کمرے کی بجلی کی وائرنگ میں کچھ نقص ہے جسے آپ کے کمرے کے وائر باکس سے ٹھیک کرنا ہے۔ ایجنٹ نے اسے کمرے کے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ قیصر کے اندر گھستے ساتھ ہی میں اور عمران بھی کمرے میں داخل ہوگئے۔ ایجنٹ کی ابھی ہماری طرف پیٹھ ہی تھی کہ ہم تینوں نے اسے دبوچ کر فرش پر گرادیا۔ قیصر نے سروس بکس میں سے بڑا پسٹل اور عمران کا ریوالور نکال لیا۔ عمران نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور میں اس کے پیٹ پر بیٹھا اس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ یہ مڈل ایسٹ والوں کے تلفظ میں انگریزی بولنے والا ایجنٹ تھا۔ اب میں نے اس کے پیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے پاؤں اس کے بازوؤں پر رکھ کر اپنے ہاتھوں سے اس کی ٹانگیں پکڑ کر اوپر کیں اور قیصر کو کہا کہ میرے سائلنسر والے پسٹل کی نالی اس کے خفیہ اعضا پر رکھ کر دو گولیاں داغے۔ پسٹل چلنے کی آواز اس قدر ہلکی تھی کہ مجھے سنائی نہ دی میرے نیچے پڑے ایجنٹ کا جسم دوبار تھوڑا تھوڑا اچھلتا ہوا محسوس ہوا اور اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ یقیناً دونوں گولیوں نے اس کے جگر، معدے اور تلی کو چھلنی کردیا ہوگا کیونکہ یہ خاص قسم کی گولیاں جسم کے اندر جاکر پھٹتی تھیں۔ عمران نے اس کے منہ سے ہاتھ اٹھایا تو ایک دوبار خوخو کی آوازیں آئیں اور وہ بالکل ٹھنڈا ہوگیا اسے اسی حالت میں چھوڑ کر ہم نے چند سیکنڈوں میں اپنا حلیہ

درست کیا اور کمرے کو اندر سے لاک کر کے گیلری میں آ گئے۔ قیصر نے دوسرے ایجنٹ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر سے پوچھنے پر وہی بجلی ٹھیک کرنے کا بتا کر دروازہ کھلوایا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس ایجنٹ کو شاید کچھ شک پڑ گیا تھا کیوں کہ جب میں اور عمران کمرے میں داخل ہوئے تو وہ کرسی پر بیٹھا قیصر سے پوچھ رہا تھا کہ ریسپشن والوں کے مجھ سے اجازت لیے بغیر تم کیسے آ گئے۔ قیصر کو کوئی جواب نہ سوجھا تو اس نے کہا ''مائی سپر وائزر'' اب ایجنٹ نے مجھے اور عمران کو دیکھا تو ہمیں فوراً پہچان گیا اور اپنے بیڈ کے ساتھ جڑے ٹیبل کی دراز کھول کر اپنا اسلحہ نکالنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کے چہرے، سر اور دل کا نشانہ لے کر اس پر تین گولیاں چلائیں۔ اس کے دل کا کیا حشر ہوا۔ یہ تو معلوم نہ ہوسکا لیکن سر پر چلائی گولی عین اس کے ماتھے کے درمیان لگی اور چہرے پر لگی گولی اس کی ناک اڑاتی ہوئی اندر گھس گئی۔ اس ایجنٹ کے چہرے پر تحیر خوف اور دہشت کے آثار چند لمحوں کے لیے چھائے اور اس کا جسم کرسی سے لڑھک کر فرش پر جا گرا۔ ہمارے پاس ان دونوں کے کمروں کی تلاشی لینے کا وقت نہیں تھا۔ کسی بھی لمحے روم سروس والا ان کے دیے ہوئے آرڈر لے کر آ سکتا تھا یا ٹیلی فون کی گھنٹیاں بج سکتی تھیں۔ اس ایجنٹ کو بھی اسی حالت میں چھوڑ کر ہم نے اپنے ریوالور اور پسٹل سروس بکس میں رکھے اور ٹوپیاں آگے کو جھکائے ہوئے سروس لفٹ کی طرف آئے۔ بٹن دبانے پر سروس لفٹ ایک ڈیڑھ منٹ پر اس فلور پر آ کر رکی۔ لفٹ میں ہوٹل اسٹاف کے تین افراد پہلے سے موجود تھے ہم ان کے لیے اجنبی تھے لیکن ہوٹل کے اوور آل پہنے ہونے کی وجہ سے ان میں سے ایک نے فارسی میں پوچھا'' کیا آپ لوگ نئے بھرتی ہوئے ہیں'' میں نے جواب میں کہا ''بلے امروز'' اتنی دیر میں لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئی لفٹ سے نکل کر ہم عقبی دروازے پر پہنچے تو دربان نے ہمارا راستہ روک لیا اور کہنے لگا کہ سروس بکس لے کر ہم باہر نہیں جاسکتے۔ ہمارے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں نے ''صدر دروازہ خراب شد'' (داخلے کے بڑے دروازے کی بجلی خراب ہے) کہا دربان میری اس عجیب فارسی کو سن کر حیران تو ضرور ہوا لیکن اس نے ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے گاڑی کے قریب سے گزرتے ہوئے خلیل کو کہا کہ گاڑی ہمارے پیچھے لے آئے۔ ہوٹل کے بیرونی دروازے سے نکل کر ہم سڑک پر پہنچے۔ خلیل بھی گاڑی لے کر وہاں پہنچ گیا جس میں ہم گھر کو روانہ ہو گئے۔ ہمارے آج تک کے مشنوں میں یہ سب سے آسان مشن ثابت ہوا جس کا کریڈٹ خلیل کو جاتا تھا۔ کیونکہ ہماری لمبی چوڑی پلاننگز کے برعکس اس نے اپنے مشورے سے ہمارے لیے اس مشن کو بے حد آسان بنا دیا تھا۔

☆☆

ہم جب گھر پہنچے تو ہمارے تمام ساتھی بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ مسز زاہدی کو اگرچہ ہم نے اس مشن پر جانے کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی لیکن میرے ساتھیوں سمیت وہ اپنے

ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہمارے انتظار میں بے چین تھی۔ ہمیں ہلٹن ہوٹل کے اوور آل پہنے دیکھ کر اسے غالباً احساس ہو چکا تھا کہ ہم محض گھومنے پھرنے کے لیے باہر نہیں گئے تھے۔ سپنا اور ماہا کی حالت بھی دیدنی تھی۔ قیصر کو دیکھتے ہی سپنا اس سے تقریباً لپٹ گئی اور جب اسے یہ احساس ہوا کہ اتنے لوگوں کے بیچ بے ساختگی میں اس سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے تو وہ شرمائی شرمائی سی اس سے الگ کھڑی ہو گئی۔ ماہا کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر تشکر کے گہرے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔ اب مسز زاہدی سے کچھ چھپانا بے سود تھا میں نے مختصراً سب کو یہی کہا کہ ہم موساد کے دونوں ایجنٹوں کو جہنم واصل کر کے بخیریت آ گئے ہیں تو ڈرائنگ روم میں موجود سب نے چین کا سانس لیا۔ ماہا اٹھ کر میرے پاس آئی اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی ''صرف میری وجہ سے آپ نے یہ خطرہ مول لیا تھا میں جانتی ہوں کہ آپ کے دل میں میرے لیے بڑا احساس ہے جس کا آپ نے کبھی بھی اظہار نہیں کیا لیکن آپ کے میرے لیے ہر عمل اور فعل سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ کھٹمنڈو میں آپ نے جب میری جان بچائی تھی مجھے تو اسی وقت احساس ہو گیا تھا کہ کوئی کسی کے لیے بلاوجہ اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالتا''۔ میں ماہا کے دل میں چھپی بات کو جان گیا تھا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''ماہا میں تمھارے جذبات سے بخوبی آگاہ ہوں، کھٹمنڈو میں تمھاری جان بچانے کی وجہ یہ تھی کہ جرمن غنڈے تمھیں ہلاک کرنا چاہتے تھے اور تم تن تنہا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ تمھیں غنڈوں سے بچا کر میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ یہ میرا فرض تھا جسے میں نے ادا کیا۔ اس کے بعد جب سے تم ہماری ٹیم میں شامل ہو، تمھاری اور اپنے تمام ساتھیوں کی ہر طرح کی پوری ذمہ داری مجھ پر ہے جسے ادا کرنے میں میری طرف سے ہرگز کوئی کوتاہی نہیں ہوگی''۔ یہ کہہ کر میں نے تمام ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''آج کا مشن تو بغیر کسی دشواری کے پورا ہو گیا ہے اب ایک بڑی مہم درپیش ہے جس کے لیے آپ خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیں ہمیں شاید بہت جلد ہی اس مہم کو سر کرنے کے لیے جانا پڑے۔ دوسری بات یہ کہ ان اوور آلز میں ہمارے جسم پھنک رہے ہیں لہٰذا آج کی مجلس برخاست کرتے ہوئے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں تاکہ اپنے کمرے میں جا کر اوور آل سے پیچھا چھڑوا سکوں'' یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا میرے ساتھی بھی میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے ہوئے میں نے قیصر اور عمران کو کہا کہ سروس باکس اور اوور آل اور ہلٹن ہوٹل کے بیج کل صبح خلیل واپس لے جائے گا اس لیے انھیں حفاظت سے رکھا جائے۔

اگلے روز دس بجے کے قریب خلیل آیا اور میں نے اسے تینوں اوور آل، تین بیج اور سروس باکس لوٹاتے ہوئے کہا کہ آج سارا دن ہم باہر نہیں جائیں گے لہٰذا وہ ہلٹن ہوٹل اور پولیس وغیرہ سے کل رات ہوٹل کے دو مہمانوں کے ہلاک کیے جانے کی خبر لیتا رہے اور شام کو سات بجے مجھے آ کر رپورٹ دے۔ ابھی خلیل کو واپس لوٹے آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ مسز زاہدی نے جنرل کاوسی

کے آنے کی اطلاع دی۔ میں حیران تھا کہ جنرل کاؤسی کو ہم سے ملنے کے سوا کیا کوئی اور کام نہیں کہ وہ تقریباً ہر روز ورنہ ایک دن کے ناغے سے یہاں چلا آتا ہے میری یہ عادت ہے کہ اگر اکثر ملنے والا کوئی شخص یک دم کنارہ کشی کرے یا کوئی عام روٹین سے ہٹ کر زیادہ ملنے لگے تو مجھے اس کے رویے پر شک ہونے لگتا ہے۔ جنرل کاؤسی نے ملتے ساتھ ہی کہا "ہلٹن ہوٹل میں تو کہرام بپا ہے ایرانی پولیس اور خفیہ والوں کے علاوہ امریکی سفارت خانے میں مستقل تعینات ایف بی آئی کی ٹیم بھی اپنے اپنے زاویے سے تفتیش کررہی ہیں۔ دو امریکی بزنس مینوں کا ہلٹن ہوٹل میں قتل ایسی بات نہیں ہے جسے خاموشی سے لگا جاسکے۔ میری معلومات کے مطابق ان امریکیوں کے قتل ہونے کا آج صبح روم سروس والوں کے ذریعے ہوٹل انتظامیہ کو علم ہوا۔ ابھی تو تفتیش ابتدائی مرحلوں پر ہے اور عام خیال یہ ہے کہ ان امریکیوں کو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے کسی اور مہمان یا مہمانوں نے قتل کیا ہے کیونکہ انتظامیہ کے علم میں لائے بغیر باہر کا کوئی شخص رہائشی کمروں کی طرف نہیں جاسکتا۔ ہوٹل اسٹاف کے ممبروں پر بھی شک ہوسکتا ہے لیکن ان کے ان امریکیوں کو قتل کرنے کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔ کمروں میں ان کے پاس موجود کرنسی اور دوسری قیمتی اشیا بھی پڑی ہیں اور قاتلوں نے انھیں ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں آج رات آپ کے پاس پھر آؤں گا اور آپ کو بتاؤں گا کہ تفتیش کس قدر آگے بڑھی ہے اور مختلف تفتیشی ٹیموں کی تفتیش کا رخ کس طرف ہے"۔ جنرل کاؤسی ان ہلاکتوں کے متعلق کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گیا تھا۔ ہمیں تفتیش کے متعلق بتانے سے اس کا مقصد صاف ظاہر تھا کہ وہ ان ہلاکتوں کا ذمہ دار ہمیں ٹھہرا رہا ہے لیکن چونکہ ہم نے اسے اس مشن کے متعلق کچھ نہیں بتایا لہٰذا وہ بھی کھلے طور پر اس کا اظہار نہیں کررہا تھا۔ میں نے جنرل کاؤسی کو اعتماد میں لیتے ہوئے بے تکلفی سے کہا "جنرل تم بھی بڑے کائیاں ہو سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس طرح سے باتیں کررہے ہو جیسے تمھیں کچھ علم ہی نہیں کہ ان امریکیوں کو ہلاک کرنے والے کون ہیں حالانکہ میں نے چند روز پیش تر ہی ان کے ناموں اور رہائشی ٹھکانوں کا پوچھا تھا۔ دراصل تمھیں پہلے بتانے کا موقع ہی نہیں ملا اور آج یہاں آتے ہی تم نے بغیر رکے بولنا شروع کردیا دراصل ان امریکیوں کو..." میں اسے حقیقت بتانے والا ہی تھا لیکن اس نے مجھے بیچ میں ہی ٹوکتے ہوئے کہا "نہ، نہ، نہ اپنے منھ سے اس بارے میں کوئی لفظ نہ نکالنا، مجھ میں ہزاروں عیب ہوں گے لیکن اگر مجھے قسم اٹھا کر بولنے کو کہا جائے تو پھر میں غلط بیانی نہیں کرتا۔ میں تفتیش کے متعلق تمھیں مکمل اطلاع دیتا رہوں گا لیکن تم اور تمھارے ساتھی اس واقعے کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کرو گے اور چپ چاپ میری باتیں سنتے جاؤ گے"۔ جنرل کاؤسی نے موضوع بدلا اور کہنے لگا "غیر محسوس طور پر ایرانی عوام کی حکومت اور شہنشاہ کے خلاف نفرت بڑھتی جارہی ہے۔ اب مخالفت کے اس غبارے میں بغاوت کی ہوا اس قدر بھر چکی ہے کہ غبارہ اب پھٹنے کے قریب ہے۔ عوام ایرانی افواج کو شہنشاہ کی پروردہ اور ذاتی فوج سمجھتے ہیں اگر بغاوت ہوگئی اور

انقلاب آگیا تو نہ جانے ہم ہائی رینک افسروں کا کیا انجام ہوگا۔ میں تو سوچتا ہوں کہ استعفے دے دوں لیکن مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ میرے استعفے کو حکومت سے مخالفت کی وجہ سمجھ کر مجھ پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا جائے گا"۔ اس قسم کی اپنے متعلق مایوس کن باتیں کرنے کے بعد جنرل کاؤسی رخصت ہوا۔ مسز زاہدی بھی اس کی ان باتوں سے خاصی پریشان ہوگئی تھی اور اسی حالت میں اس نے بے خیالی میں وہ بات کہہ دی جسے اب تک ہم سے چھپایا گیا تھا۔ ایرانی حکومت کے متعلق باتیں کرتے ہوئے اس کے منھ سے اچانک نکلا "اگر کاؤسی کو کچھ ہوگیا تو میں دوبارہ بیوہ ہوجاؤں گی"۔ وہ بے خیالی میں یہ بات کہہ گئی تھی جب میں نے اس کی وضاحت مانگی تو پہلے تو اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی لیکن میرے اصرار پر اسے حقیقت بتانی پڑی۔ "کاؤسی میرے مرحوم شوہر کا دوست تھا۔ اور ہمارے ساتھ اس کے گہرے روابط تھے میرے شوہر کے انتقال کے بعد کاؤسی نے میری دل جوئی میں دن رات ایک کردیا جس کا انجام یہ ہوا کہ ہم نے گزشتہ سال نکاح کرلیا۔ کاؤسی کی ایک بیوی اور تین بچے ہیں ابھی تک ہم نے اس نکاح کو خفیہ رکھا ہوا ہے لیکن میرے زور دینے پر کاؤسی نے اس خفیہ نکاح کا اعلان کرنے پر اب آمادگی ظاہر کردی ہے۔ آپ لوگوں سے مجھے اور کاؤسی کو جذباتی لگاؤ اور محبت ہے لہٰذا آپ کو جو کچھ میں نے بتایا ہے اس کا فی الحال کسی سے ذکر نہ کریں ہم بہت جلد ہی اس نکاح کا اعلان کرنے والے ہیں اگر آپ لوگ اس وقت یہاں ہوئے تو بھرپور طریقے سے ہمارے جشن میں شریک ہوں گے۔ کاؤسی نے ذہنی طور پر اپنی پہلی بیوی اور بچوں کو یہ خبر سنانے کے لیے تیار کرلیا ہے" مسز زاہدی کے نکاح کرنے یا نہ کرنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن میں سوچنے لگا کہ عورت چاہے مشرقی ہو یا مغربی، کسی پیشے سے وابستہ ہو یا گھریلو خاتون ہو، آزاد خیال ہو یا قدامت پسند اور عمر کے کسی حصے میں بھی ہو بغیر شوہر کے ہمیشہ خود کو ادھوری محسوس کرتی ہے۔

شام کو خلیل نے اور پھر رات کو جنرل کاؤسی نے آنا تھا تاکہ ہمیں تفتیش کے متعلق بتاسکیں۔ میں اب جلد از جلد ساوک کے جنرل علی کوشش سے ملنا چاہتا تھا کیونکہ میری اور میرے تمام ساتھیوں کی خواہش تھی کہ جب ہم ایران میں ہیں تو ہمیں مشہد میں امام علی رضا اور قم میں بی بی معصومہ کے روضوں پر ضرور حاضری دینی چاہیے۔ مجھے جنرل علی کوشش سے خود رابطہ کرنے کے لیے نہ تو کوئی نمبر دیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی اور ذریعہ بتایا گیا تھا، میں نے مزمل سے اس بارے میں بات کی تو اس کا منھ پھولا ہوا تھا۔ میرے کئی بار پوچھنے پر اس نے کہا "میں محسوس کررہا ہوں کہ آپ اپنے مشنوں میں مجھے اکثر پیچھے رکھتے ہیں اگر میں فٹ نہیں ہوں تو صاف بتادیں تاکہ میں واپس چلا جاؤں، میں جو مقصد لے کر آپ کے ساتھ شامل ہوا تھا اس میں میری اتنی تھوڑی شرکت سے میں بہت اپ سیٹ ہوگیا ہوں" میں نے مزمل کو گلے لگایا اور کہا "تمھارے اس جذبے پر فرشتے بھی عش عش کر اٹھے ہوں گے۔ عام طور پر تو لوگ خطرناک کاموں میں کودنے سے بچنا چاہتے ہیں اور تم مجھ سے اس

سے شاکی ہو کہ میں نے دو تین مشنوں میں تمھیں شامل نہیں کیا۔ بہرحال غصہ تھوک دو اور اپنے دل میں یہ خیال ہرگز نہ لانا کہ میں جان بوجھ کے تمھاری کسی خامی کی وجہ سے تمھیں ہمراہ نہیں لے جاتا۔ اگر حقیقت جاننا چاہتے ہو تو سنو، کھلنا سے روانگی کے وقت تمھاری بیوی اور میری بھابی نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں تمھیں صحیح سلامت اور زندہ اس کے پاس واپس لاؤں گا۔ کسی بھی خطرناک مشن پر جاتے ہوئے یہی وعدہ تمھیں اپنے ہمراہ لے جانے میں حائل ہوتا ہے" کرنل مزمل نے فوری جواب دیا "تمھیں میری بیوی سے کیا ہوا وعدہ تو یاد ہے لیکن خدائے ذوالجلال والاکرام کا وہ وعدہ یاد نہیں کہ شہیدوں کو مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور ہم انھیں رزق دیتے ہیں شہید کا رتبہ سب سے بلند ہے اور میرے تمھارے ساتھ شریک ہونے کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ پاک مجھے شہادت کے رتبے پر فائز ہونے کی توفیق دے اور تم میرے اور اللہ کے درمیان اس رتبے کو پانے میں اس لیے حائل ہو کہ تمھارے نزدیک میری بیوی سے کیے ہوئے اپنے وعدے کا پاس زیادہ اہم ہے۔ یا تو مجھے اپنے مشنوں میں بھرپور شرکت کی اجازت دو اور یا واپس جانے دو۔ تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ اگر تمھارا میری بیوی سے کیا ہوا وعدہ آئندہ بھی میری مشنوں میں شرکت میں حائل ہوگا تو میں اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہوں تاکہ تمھارے اس سے کیے ہوئے وعدے کی حیثیت ختم ہوجائے اور تم میرے فرض اور اللہ کے حکم کے درمیان حائل ہو کر مجھے وہ عظیم مقام حاصل نہ کرنے دو جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ شہدا کو جب اس عظیم مقام پر بھیجا جائے گا تو وہ اللہ پاک کے حضور دعائیں کریں گے کہ انھیں بار بار زندگی عطا کی جائے تاکہ ہر بار وہ شہید ہو کر اس عظیم مقام کی فضلیت میں اپنے لیے اضافہ حاصل کرسکیں" میں نے مزمل کو پھر خود سے لپٹا لیا اور کہا کہ اب بس کرے آئندہ میں اسے ہر مشن میں شامل کروں گا میں سوچنے لگا کہ محض اللہ پاک کا کرم ہے کہ میرے ساتھی اس قدر بے لوث، ملک وملت سے محبت کرنے والے اور دشمن کے خلاف لڑنے کو اپنا دینی فرض سمجھتے ہیں اور انھیں شہادت پانے کی کس قدر آرزو ہے۔ میں نے مزمل سے کہا کہ میں جنرل علی کوشش سے فوری ملنا چاہتا ہوں تو مزمل نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ مجھے یہ بتانا بھول گیا تھا کہ میجر اسفند نے اسے اپنے دو ٹیلی فون دیتے ہوئے کہا تھا کہ بوقت ان نمبروں پر ہم اس سے رابطہ کرسکتے ہیں کیونکہ ان پر آبزرویشن نہیں لگی ہوئی۔ یہ کہہ کر مزمل نے اپنی ڈائری میں لکھے نمبر مجھے ایک کاغذ پر لکھ کردیے۔

❁

گیارھواں باب

کرنل مزمل نے مجھے جو نمبر لکھ کر دیا تھا اس کے ساتھ ایک کوڈ ورڈ بھی تھا۔ مزمل نے کہا کہ میجر اسفند نے مجھے یہ نمبر اور کوڈ ورڈ دیتے ہوئے کہا تھا کہ جنرل کی ہدایت پر وہ یہ نمبر دے رہا ہے "فون اٹھانے والے کو آپ کوڈ ورڈ "شب تیرہ" کہیں اگر جواب میں دوسری طرف۔ سے "یقین طلوع آفتاب" کہا جائے تو اپنا نمبر بتا کر اسے کہیں کہ میجر اسفند سے بات کرنی ہے پندرہ منٹ کے اندر ہی میں آپ سے رابطہ کرلوں گا میں نے مزمل کو کہا "ایران کی سب سے بڑی خفیہ ایجنسی کی جس کے متعلق سیکڑوں دہشت ناک کہانیاں سن رکھی ہیں، اندرونی حالت اس قدر دگرگوں کردی گئی ہے کہ اس کے اپنے بیسیوں ٹیلی فونوں پر آبزرویشن لگی ہوئی ہے اور اس سے رابطے کے لیے اس طرح کے انتظام کیے گئے ہیں جیسے وہ حکومتی ایجنسی نہ ہو بلکہ ملک دشمن باغیوں کا کوئی خفیہ ادارہ ہو۔"

قارئین! آج اسی موضوع پر آپ سے چند باتیں کرلوں پاکستان عوام کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ماضی اور حال کے شاطر لیڈروں نے مملکت اور حکومت کے بالکل علیحدہ علیحدہ تصور کو یک جا کردیا ہے انگریزوں کے سو سالہ دورِ حکومت میں ہندوستان کے لیڈروں نے بلاامتیاز مذہب ایک پلیٹ فارم سے ایک زبان ہو کر برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کی۔ قائداعظم کو جو اس جدوجہد میں ہندو رہنماؤں کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کررہے تھے، جب یہ محسوس ہوا کہ ہندوؤں کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا مطلب صرف ہندوؤں کی آزادی ہے اور مسلمان آزادی ملنے کے بعد بھی ہندوؤں کے غلام ہی رہیں گے تو انھوں نے مسلم لیگ میں شامل ہو کر برصغیر کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا مطالبہ کیا۔ ہندو لیڈروں کے لیے یہ مطالبہ قطعی قابل قبول نہ تھا وہ تو پورے برصغیر پر نظریں جمائے بیٹھے تھے انھوں نے قائداعظم کو مختلف ترغیبات دے کر اس مطالبے سے

دست بردار ہونے کی کوششیں کیں کبھی یہ آفر دی گئی کہ آپ کو تاحیات متحدہ ہندوستان کا گورنر جنرل اور صدر بنا دیا جائے گا کبھی آزادی ملنے کے بعد مسلمانوں کے لیے خصوصی رعایت اور اسمبلی میں نشستیں مخصوص کرنے کا لالچ دیا گیا لیکن قائداعظم نے جو ہندوؤں کی سرشت کو سمجھ چکے تھے، ان کی تمام ترغیبات کو ٹھکرا دیا اور اپنے مطالبے پر قائم رہے۔ قائداعظم نے اپنے ٹی بی جیسے موذی مرض کو چھپائے رکھا کیونکہ انھیں یقین تھا کہ ہندو لیڈروں کو اگر ان کی بیماری کا علم ہوگیا تو وہ نئی چالیں چلیں گے اور ہوا بھی قائداعظم کی سوچ کے عین مطابق۔ جواہر لال نہرو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے قائداعظم کی رحلت (۱۱رستمبر ۴۸ء) کے بعد اعلانیہ کہا کہ اگر انھیں معلوم ہوجاتا کہ قائداعظم کو ٹی بی ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کردیتے جب تک جناح زندہ رہتے قائداعظم کی نہ جھکنے اور نہ بکنے والی فطرت کی وجہ سے پاکستان تو بن گیا لیکن انھیں قیام پاکستان کے فوری بعد ہی یہ احساس ہوگیا کہ ان کے ساتھ پاکستان سے زیادہ اپنی جیبوں کے بھرنے اوراقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں اسی لیے قائداعظم نے قیام پاکستان کے بعد کہا تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکوں کے سوا کچھ نہیں۔ قائداعظم کی رحلت کے بعد تو وہ نفسانفسی کا عالم پیدا ہوا کہ توبہ ہی بھلی۔ ہر سیاسی لیڈر چاہے وہ اقتدار میں تھا یا حزب اختلاف میں صرف اپنی ذات کی بھلائی تک ہی محدود ہوگیا حکومتیں مہینوں بلکہ ہفتوں کے لیے بنتیں اور ٹوٹ جاتیں اقتدار کبھی ایک پلڑے میں اور کبھی دوسرے پلڑے میں ہوتا اور کسی کو بھی یہ احساس نہ ہوا کہ اپنی ذاتی خواہشات اور ہوسِ اقتدار کے حصول کے لیے وہ مملکت کو کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں اس دور کو پھلانگ کر جب ہم ۱۹۶۸ء میں آتے ہیں تو ایوب خان کا قوم پر آخری احسان یحیٰی خان کی صورت میں دکھائی دیتا ہے یحیٰی خان کے صدر مملکت بنتے ہی جنرل رانی بلیک کوئین اور ایک فاحشہ ایکٹریس ترانہ کے علاوہ اسی قماش کی درجنوں عورتیں صدارتی محل کی کرتا دھرتا بن گئیں اور صدارتی محل ملک کی عزت و وقار کے نشان سے زیادہ ایک شراب خانے اور فحاشی کے اڈے کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ الیکشن ہوئے تو عوامی لیگ کے صدر مجیب الرحمٰن اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں علی الترتیب نمایاں کامیابی حاصل کی۔ مجیب کی پارٹی عوامی لیگ نے ملک بھر میں قومی اسمبلی کی ۱۲۱ سیٹیں حاصل کرلیں یحیٰی خان کو اصولی طور پر چاہیے تھا کہ عوامی لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دے لیکن بھٹو نے اپنی تاریخ ساز غداری کا ثبوت دیتے ہوئے یحیٰی خان کو مجبور کردیا کہ وہ حکومت کی تشکیل کو ملتوی کرتا رہے۔ یحیٰی خان خود بھی نئی حکومت میں صدر رہنے پر بضد تھا ادھر بھٹو نے ایسی چال چلی کہ مجیب کو یقین ہوگیا کہ اس کی حکومت کبھی نہیں بننے دی جائے گی۔ مشرقی پاکستان میں مجیب کو موقع مل گیا کہ وہ سول نافرمانی اور آزاد مملکت کے لیے عوام کو بھڑکا سکے۔ بھٹو نے مجیب کو ایک نیا فارمولا دیا کہ ملک میں دو وزیراعظم ہوں جسے مجیب نے یکسر مسترد کردیا۔ مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی شروع ہوگئی بھارت تو پہلے ہی ایسے نادر موقعے کی تلاش میں تھا چنانچہ

مکتی باہنی کے روپ میں اس نے سول لباس میں اپنے فوجی مشرقی پاکستان میں داخل کیے جنھوں نے مشرقی پاکستانیوں کی مرکز سے نالاں اکثریت کے ساتھ مل کر مغربی پاکستانیوں اور مشرقی پاکستان میں رہنے والے بہاری مہاجروں کا قتل عام کر کے ظلم و بربریت کی وہ داستان رقم کی جس سے انسانیت قیامت تک لرزہ براندام رہے گی۔ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان لایا گیا ادھر بھارت نے اپنی باقاعدہ فوج مشرقی پاکستان میں داخل کر دی اور پاکستان کی چار ڈویژن فوج کو بھارتی نیوی اور ایئرفورس نے اپنے حملو سے اور باغی مشرقی پاکستانیوں اور مکتی باہنی کے گوریلا وارفیئر نے بالکل مفلوج کردیا فوج نے سپلائی لائن نہ ہونے اور ایمونیشن کی کمی اور اپنی ایئرفورس اور نیوی کی مدد حاصل نہ ہونے کے باوجود جرأت بہادری اور وطن پرستی کی ایسی مثالیں قائم کیں جنھیں دنیا بھر کے فوجی مبصروں کے علاوہ بھارتی جرنیلوں نے بھی سراہا۔ بھٹو پانسہ اپنے حق میں جھکتا دیکھ کر بہت خوش اور مطمئن تھا کہ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو سلامتی کونسل میں پولینڈ نے ایک قرارداد پیش کی جس میں بھارت اور پاکستان کو اپنی افواج واپس اپنے ممالک میں بھیجنے، فوری جنگ بندی اور مشرقی پاکستان کے سیاسی حل کا کہا گیا تھا۔ اس قرار داد کو امریکا اور روس کی حمایت بھی حاصل تھی اگر اس قرارداد کو منظور کرلیا جاتا تو بھارتی افواج کو مشرقی پاکستان سے اور مغربی پاکستان کے مفتوحہ علاقوں سے نکلنا پڑتا جب کہ پاکستانی افواج مشرقی پاکستان میں ہی رہتیں۔ اس قرارداد پر اگر عمل کیا جاتا تو پاکستان ذلت آمیز شکست، ۹۰ ہزار پاکستانی فوجیوں کے بھارتی فوج کے ہاتھوں قیدی بننے کی رسوائی اور مشرقی پاکستان کو کھو دینے سے بچ جاتا لیکن بھٹو کو اقتدار ملنے کے بجائے حزب اختلاف میں بیٹھنا پڑتا جو اسے منظور نہ تھا۔ لہٰذا پہلے دو روز تو بھٹو کو اس کے تاریخی زکام نے نیویارک کے ہوٹل سے سلامتی کونسل میں جانے سے روکے رکھا اور تیسرے روز جب کوئی اور بہانہ نہ مل سکا تو سلامتی کونسل میں جاکر پولینڈ کی قرارداد کو پھاڑ کر وہ یہ کہہ کر سلامتی کونسل کے اجلاس سے اٹھ آیا کہ ہم ہزار سال تک لڑتے رہیں گے (یحیٰی خان نے بھٹو کو ڈپٹی وزیراعظم اور وزیر خارجہ بنا دیا تھا) ۱۶ دسمبر کو پاکستان کے جنرل نیازی نے ڈھاکا میں بھارتی جنرل اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈالے اور پاکستان دولخت ہوگیا اور ہماری افواج کو جنگی قیدی بنا کر بھارت کے مختلف کیمپوں میں رکھا گیا۔ مجیب ابھی تک مغربی پاکستان میں قید تھا بھٹو نے اقتدار سنبھالا اور مجیب کو جو مشرقی پاکستانیوں کا مسیحا بن چکا تھا، بھٹو نے اس کی رہائی کو پاکستانی افواج کی واپسی سے مشروط کرنے کے بجائے اسے ویسے ہی رہا کردیا کیونکہ مغربی پاکستان میں اس کی حکومت کے تسلیم کیے جانے کے لیے مجیب کی رہائی ضروری تھی۔

قارئین گرامی! میں نے قائداعظم کی رحلت کے بعد سے سقوط ڈھاکا تک کے واقعات اس لیے دہرائے ہیں کہ اس تمام عرصے میں آپ کو کہیں بھی ان سیاسی لیڈروں کی مملکت پاکستان، اپنے وطن جو ہماری شناخت ہے۔ سے ذرہ بھر بھی خیر خواہی یا محبت کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ سن ۴۷ء میں وجود میں

آنے والی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے حصے بخرے کرنے کی شروع ہی سے کوششیں شروع ہوگئیں تھیں۔ ولی خان ولد عبدالغفار خان نے قیام پاکستان کے ساتھ ہی پختونستان کا شوشہ چھوڑا۔ بلوچستان میں خان قلات نے بغاوت کر کے بلوچستان کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جسے اب تک اس کے چیلے چانٹوں اور ہم نواؤں نے جاری رکھا ہوا ہے۔ پنجاب کے ٹکڑے کرنے کے لیے سرائیکی صوبہ بنانے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ سندھ میں جی ایم سید اور اب اس کے حواری سندھو دیش بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ادھر الطاف حسن نے آزاد جناح پور کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ اسی لیے ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ مملکت سے کسی کو بھی محبت نہیں۔ صوبائی اور ضلعی سطح کے یہ لیڈر اپنی اپنی بانسری محض اس لیے بجا رہے ہیں کہ پاکستان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے وہاں اپنی اپنی حکومت قائم کرسکیں۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ بھارتی لیڈر تو بھارت کو وسعت دے کر اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھ رہے ہیں اور انھوں نے حیدرآباد دکن، جوناگڑھ اور کشمیر پر زبردستی قبضہ کر کے اور پرتگیزی مقبوضات گوا، دمن، دیو پر فوج کشی کر کے انھیں بھارت میں شامل کرلیا ہے اور ادھر ہمارے لیڈر ہیں کہ اس بچے کھچے پاکستان کو تقسیم در تقسیم کرنے کے درپے ہیں۔ بھٹو نے اپنی گرفتاری کے دوران کہا تھا کہ میری موت پر ہمالیہ بھی روئے گا۔ اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں، پیغمبروں اور رسولوں کے وصال پر تو ہمالیہ نہ رویا لیکن بھٹو کی موت پر روئے گا کتنی غلط فہمی تھی بھٹو کو اپنے متعلق۔ نواز شریف نے جاگ پنجابی جاگ کا نعرہ لگا کر پاکستان کے دوسرے صوبوں اور پنجاب کے درمیان نفرت کی خلیج حائل کردی۔ اب گرفتاری کے بعد کارگل کے متعلق اوٹ پٹانگ بیان دے کے اس سابق وزیراعظم کی مملکت کے ساتھ جھوٹی محبت کے دعوے کا پول بھی کھل گیا ہے۔ نواز شریف کو وزارت عظمٰی اور ''بھاری مینڈیٹ'' مملکت سے زیادہ عزیز ہے۔ نواز شریف مملکت پاکستان کے بہت سے ایسے رازوں سے بھی واقف ہے جن کا یوں سرعام ذکر کرنا مملکت پاکستان کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وزیراعظم کے عہدے کے حلف میں مملکت کے ان رازوں کی پاس داری کا حلف بھی شامل ہے۔ میاں صاحب اگر آپ کی طرح سب ہی پاکستانی اپنے اٹھائے ہوئے حلفوں کی پاس داری چھوڑ دیں جیسے آپ نے VIP قیدی ہونے کے باوجود اپنا حلف توڑ دیا تو آپ افواج پاکستان کے افسران اور جوانوں کے متعلق کیا کہیں گے جو مملکت سے پاس داری کے عہد کو نبھاتے ہوئے بھارت سے کشمیر اور دوسری سرحدوں پر ہر روز نبرد آزما ہوتے ہیں۔ روز زخمی ہوتے ہیں اور روز مرتے ہیں اور جنگ کے دوران دشمن کی لاکھوں گولیوں اور ہزاروں گولوں کا سامنا کرتے ہیں۔ بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کے نیچے لیٹ جاتے ہیں۔ جو پکڑے جانے پر انتہائی اذیت ناک موت کو تو گلے لگاتے ہیں لیکن دشمن کو اپنی افواج کے متعلق ایک لفظ تک نہیں بتاتے۔ اس لیے کہ ہماری افواج کو مملکت پاکستان سے محبت ہے اور آپ کو اپنی سابقہ کرسی اور حکومت سے۔ یہ تو اللہ کا بڑا کرم ہوا کہ آپ نے فوج میں شمولیت نہیں کی ورنہ اپنی زندگی بچانے کے لیے آپ بزدلی اور غداری کی ایسی مثال قائم

کرتے اور اپنے وطن کو ایسا نقصان پہنچاتے جس کا صدیوں تک ازالہ نہ ہوسکتا۔ شرم کرو اور اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ تم پاکستانی تو کیا مرد بھی کہلانے کے لائق نہیں ہو۔

☆☆

میں نے مزمل کے دیے ہوئے نمبر پر فون کیا۔ ایک نہایت شیریں نسوانی آواز نے ہیلو کہا۔ میں نے کوڈ ورڈ دہرایا ''شب تیرہ'' جواب آیا ''یقین طلوع آفتاب'' میں نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا کہ میجر اسفند کو کہیں کہ مجھ سے جلد از جلد رابطہ کرے۔ مزمل میرے ساتھ ہی ٹیلی فون کے قریب بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی میجر اسفند لائن پر تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے چیف سے ایک ضروری بات کرنی ہے لہٰذا آج ہی اگر ملاقات ہوجائے تو بہت بہتر ہے میجر اسفند بولا کہ وہ جلد از جلد چیف سے بات کر کے مجھے کال بیک کرے گا۔ مزید بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ میجر اسفند نے کہا کہ آدھے گھنٹے کے اندر وہی کار جو مجھے پہلے بھی دفتر میں لے گئی تھی ہمارے گھر کے سامنے سڑک پر مجھے ملے گی، غرضے کہ ایک گھنٹے کے اندر میں جنرل علی کوشش کے دفتر میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے جنرل کوشش کو کہا کہ میرے ساتھی ایران سے جانے سے قبل مشہد اور قم میں زیارت پر جانا چاہتے ہیں بندر عباس والے مشن پر جانے کے بعد نامعلوم کیا صورتِ حال ہو اور ہم واپس آ بھی سکیں یا نہیں اس لیے میں اور میرے ساتھی چاہتے ہیں کہ بندر عباس جانے سے پہلے ان زیارت سے فیض یاب ہوجائیں جنرل نے کہا ''قم تو آپ صبح جا کر شام کو واپس لوٹ سکتے ہیں، مشہد جانے کے لیے آپ کو جہاز سے جانا ہوگا آپ کل قم چلے جائیں اور پرسوں صبح مشہد کے لیے پہلی فلائٹ پر آپ اور آپ کے ساتھیوں کی روانگی اور اگلے روز بعد دوپہر کی فلائٹ پر تہران واپسی کے لیے سیٹیں بک کروا کر مع ٹکٹوں کے آپ کو آج ہی بھجوا دیتا ہوں۔ ہمارا ایک اہلکار یہ ٹکٹیں لے کر آپ کے پاس آئے گا'' جنرل سے رخصت ہو کر میں گھر واپس آیا اور ساتھیوں کو کہا کہ کل صبح ہم قم کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ مسز زاہدی کو میں نے خلیل کے علاوہ دو اور ٹیکسیوں کے انتظام کا کہا۔ اگلی صبح آٹھ بجے ہم قم کے لیے روانہ ہوگئے قم میں بی بی معصومہ کا روضہ ہے بی بی معصومہ امام علی رضا کی ہمشیرہ تھیں اور مدینے سے اپنے بھائی کو ملنے آ رہی تھیں قم میں آپ کے پڑاؤ کے دوران آپ کو امام علی رضا کی شہادت کی خبر ملی یہ خبر سن کر وہیں پر آپ کا بھی وصال ہوگیا اور آپ کو وہیں دفن کیا گیا۔ ایرانیوں نے آپ کی قبر پر ایک نہایت عالی شان روضہ تعمیر کیا ہے آپ کے روضے کی زیارت کرنے والوں کا ایک جم غفیر وہاں چوبیس گھنٹے لگا رہتا ہے۔ قم میں ہی وہ مذہبی درس گاہ بھی ہے جہاں نائب امام آیت اللہ خمینی نے مذہبی تعلیم حاصل کی تھی بی بی معصومہ کے روضے کی زیارت کے علاوہ ہم نے وہاں کئی اور زیارتوں پر حاضری دی اور شام کو واپس تہران لوٹ آئے۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے فلائٹ پر ہم تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد مشہد پہنچے اور بازار رضا کے قریب ہی ایک ہوٹل میں ہمارے آٹھ کمرے پہلے ہی سے بک کروائے گئے تھے

ہم وضو کر کے امام علی رضا کے روضے پر گئے۔ روضے کی عمارت ایرانی طرزِ تعمیر کا بہترین شاہکار ہے روضہ اور اس سے ملحقہ لائبریری اور عجائب گھر میں قدیم قلمی قرآن پاک کے نسخے اور بہت سے تبرکات رکھے ہوئے ہیں۔ امام کے روضے کے لنگر سے باہر سے آنے والے ہر زائر کو کھانے کے ٹوکن ملتے ہیں اور بہترین اور انواع و اقسام کے کھانے زائرین کو پیش کیے جاتے ہیں۔ روضے کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھ کے ہم ٹیکسیاں لے کر طوس گئے یہاں وہ زندان خانہ ہے جہاں خلیفہ مامون رشید نے امام کو قید کر رکھا تھا اور وہیں آپ کی شہادت ہوئی۔ حسن اتفاق سے ہمیں صوبہ خراساں کے گورنر کے ہمراہ اس زندان کے تہہ خانے میں جانے کا موقع بھی مل گیا جسے عموماً بند رکھا جاتا ہے اس قید خانے میں لوہے کے وزنی سنگل بیڑیاں گلے کا طوق دیکھا جسے امام علی رضا کے جسم سے ان کی شہادت کے بعد اتارا گیا پتھر کی بنی ہوئی وہ لمبی نال بھی دیکھی جس میں سے امام علی رضا منھ لگا کر پانی پیتے تھے کیونکہ آپ کے بازوؤں کے سنگل اس قدر بھاری تھے کہ امام ہاتھوں سے پیالہ اٹھا سکتے نہیں تھے۔ یہ زمانے کے رنگ اور حقیقت کی سچائی ہے کہ غریب الوطن اور بے یار و مددگار امام علی رضا کو مشہد کے قبرستان میں دفن کیا گیا اور خلیفۂ وقت مامون الرشید بھی اسی قبرستان میں دفن ہوا اس وقت تو اس کی قبر پر عالی شان مقبرہ تعمیر نہیں ہوا تھا لیکن آج اس غریب الوطن سید کا روضہ اتنی شان سے بنا ہوا ہے کہ جہاز ابھی مشہد سے سو کلومیٹر دور ہی ہوگا کہ روضے کے سنہری گنبد اور مینار دکھائی دیتے ہیں پورا صوبہ خراساں امام علی رضا کے نام پر وقف ہے ہر وقت ان کا لنگر جاری رہتا ہے اور مامون الرشید جس کی حکومت اور خلافت برصغیر سے لے کر اسپین تک تھی اس کی قبر پر پڑی سیمنٹ کی ایک تختی جس پر اس کا نام کندہ ہے امام علی رضا کے روضے کے داخلی راستے میں ایسی جگہ پر واقع ہے کہ جب تک زائر کے پاؤں اس تختی پر نہ پڑیں وہ اندر داخل نہیں ہوسکتا یہ وہ حقائق ہیں جن سے سرمو انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ طوس میں زندان کے بالکل ساتھ ہی وہ جگہ بھی دیکھی جہاں خواجہ غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے چالیس روز چلہ کشی کی تھی۔

اگلے روز صبح ہم پھر امام علی رضا کے روضے پر گئے اور بعد دوپہر کی فلائٹ سے تہران واپس آگئے ساوک کے چیف کو اگرچہ اپنے ماتحتوں پر اعتبار نہیں تھا لیکن اس کی جاسوسی کا نظام اتنا عمدہ تھا کہ ہمیں گھر پہنچے بمشکل ایک گھنٹا گزرا ہوگا کہ میجر اسفند کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ مشہد کے گورنر علی رضا سفری سے ہماری ملاقات کہاں ہوئی اور ہم کس ہوٹل میں ٹھہرے۔ اس نے ان ٹیکسیوں کے نمبر تک بتادیے جن پر ہم مشہد سے طوس گئے تھے۔ اس نے کہا کہ آج رات آٹھ بجے وہی گاڑی مجھے چیف کے پاس لے جانے کے لیے گھر کے باہر ملے گی۔ عصر کی چائے کے دوران جنرل کاؤسی بھی آگیا۔

جنرل کاؤسی نے مجھ سے ملتے ہی کہا ''ہلٹن ہوٹل میں تفتیشی ٹیمیں اپنی ساری قابلیت اور تجربے کے باوجود سر پٹخ پٹخ کر تھک ہار کر گئی ہیں اور انھیں واردات کا کوئی سرا اب تک ہاتھ نہیں لگا ہے

ان دونوں امریکیوں کے کمروں کو واردات کا علم ہوتے ہی سیل کردیا گیا تھا اور ایرانی پولیس خفیہ پولیس، ساوک اور امریکی ایف بی آئی ٹیموں کو کمروں سے کوئی بھی چیز اٹھانے کی ساوک والوں نے ممانعت کردی تھی۔ ایف بی آئی والوں نے کمروں میں پڑی اشیا کی درجنوں تصویریں بھی اتاریں۔ میری معلومات کے مطابق ایف بی آئی والوں نے بہت سے کاغذات اور ڈائریوں کی بھی تصاویر بنائیں ان کے جانے کے بعد ساوک والے تمام کاغذات اور ڈائریاں اپنی خصوصی حیثیت کو استعمال کرتے ہوئے ساتھ لے گئے۔'' جنرل کاؤسی اپنے وعدے کے مطابق ہمیں تفتیشی ٹیموں کی کارکردگی سے پوری طرح آگاہ کر رہا تھا۔ میں نے کاؤسی سے پوچھا کہ ساوک والے ان کاغذات اور ڈائریوں کو کہاں لے گئے ہوں گے تو اس نے کہا کہ اتنی بڑی واردات کے متعلق یقیناً ساوک کے سربراہ کو آگاہی ہوگی لہٰذا تفتیشی ٹیم ان کاغذات کو ساوک کے ہیڈ کوارٹرز میں ہی لے گئی ہوگی'' جنرل کاؤسی نے مجھے ساوک کی پہنچ اور لامحدود ذرائع وسائل سے آگاہ کرتے ہوئے مجھے اور میرے ساتھیوں کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور ہمارے ساتھ مزید چند منٹ رہنے کے بعد مسز زاہدی کے ساتھ اس کے رہائشی حصے میں چلا گیا۔ مسز زاہدی نے اسے یقیناً بتادیا ہوگا کہ اس نے ان کی شادی کی خبر ہمیں دے دی ہے لہٰذا آج سے پہلے جنرل کاؤسی جو ہم سے چھپ کر مسز زاہدی سے ملتا تھا، آج دندناتا ہوا اس کے ساتھ رہائشی حصے میں چلا گیا۔

میں رات آٹھ بجے جنرل علی کوشش کے پاس گیا۔ وہ پہلے کی طرح آج بھی سر تھامے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ساتھ ہی وہ کہنے لگا۔ ''ان دو امریکیوں کی ہلاکت کی تفتیش کے دوران میرے ماتحت میرے حکم پر ان کے کمروں سے ملنے والے تمام کاغذات اور ڈائریاں اٹھا لائے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ دونوں موساد کے ایجنٹ تھے اور تمھارے ساتھیوں کے بارے میں انھیں پورا علم تھا کہ تم تہران میں ہو اور رام سر کے امریکی اڈے کی تباہی میں بھی تمھارا ہاتھ تھا۔ وہ تمھارے گروپ میں شامل کسی خاتون کو موساد کی ساتھی جینی نامی ایجنٹ سمجھ رہے تھے جسے ہلاک کرنے کے احکام انھیں مل چکے تھے اور وہ اب اس خاتون کو ہلاک کرنے کے لیے کسی مناسب موقعے کی تلاش میں تھے۔ اس کے علاوہ دو اور اہم باتیں ہمیں معلوم ہوئی ہیں پہلی تو یہ کہ بندر عباس میں پام آئل ڈپو میں منتقل کرتے وقت اس میں ملایا جانے والا کیمیکل بھی انھی ایجنٹوں نے امپورٹ کرنے والی پارٹی کو مہیا کیا ہے اور دوسری بات یہ کہ ان ایجنٹوں نے تہران میں اپنے دفتر میں جو وائرلیس سیٹ بظاہر جزائر مجنوں کے قریب اپنے کارخانوں سے رابطہ کرنے کے لیے لگایا ہوا ہے وہ ٹرانسمیٹر دراصل موساد کے ہیڈ کوارٹرز سے ان کے رابطے کا ذریعہ ہے۔ وائرلیس پر تہران سے کوڈ پیغام پہلے ان کے کارخانے میں بھیجا جاتا ہے اور پھر وہاں کے ٹرانسمیٹر سے وہ پیغام موساد کے ہیڈ کوارٹر کو اور اسی طرح ہیڈ کوارٹر کے پیغامات ان تک پہنچتے تھے۔'' میں نے جنرل کوشش سے پوچھا کہ ان دونوں امریکیوں کی ہلاکت سے ہمارے لیے خطرہ تو نی

الحال ٹل گیا ہوگا تو اس نے کہا ”کیا تمھارے خیال میں سارے ایران یا تہران میں موساد کے صرف یہی دو ایجنٹ تھے۔ میرے بھائی! تہران تو موساد کے ایجنٹوں اور سب ایجنٹوں سے بھرا پڑا ہے ان دو کے ہلاک ہونے سے موساد کے درخت کی صرف ایک ٹہنی ٹوٹی ہے۔ بے شمار ٹہنیاں تنے درخت اور جڑیں ابھی اپنی جگہ موجود ہیں۔ میں نے ان ایجنٹوں کی اصلیت جاننے کے بعد تمھارے گھر کے اردگرد اپنے چھ چھ اہل کاروں کی ڈیوٹی لگادی ہے تاکہ کوئی بے خبری میں تم پر حملہ آور نہ ہوسکے۔ پام آئل والا ٹینکر پرسوں آوٹرا اینکر پر پہنچے گا اور میں چاہتا ہوں کہ پرسوں صبح کی فلائٹ سے آپ لوگ بھی بندرعباس پہنچ جائیں۔ اگر تم میری بات سے متفق ہو تو پرسوں کی فلائٹ پر آپ کے لیے سیٹیں بک کروادی جائیں گی اور بندرعباس کے شیرٹن ہوٹل میں کمرے بھی بک کروادیے جائیں گے“ حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرچکے تھے کہ ہمارے آگے بھی گڑھا تھا اور پیچھے بھی۔ تہران میں ہمارا مزید قیام ہمارے لیے پریشانیاں لا سکتا تھا اور بندرعباس کے مشن میں بھی بہت خطرہ تھا وہاں ہمیں موساد کے چیف کا کور حاصل ہونا تھا اور یہاں رہنے اور بندرعباس کے مشن سے معذرت کرنے پر موساد کی ہمارے ساتھ معاونت کے بجائے ہمیں اس کی مخالفت سہنی پڑتی۔ رام سر میں امریکی اڈے اور تہران کے ہلٹن ہوٹل کی وارداتوں میں ہمارا ہاتھ ہونے پر ابھی ہمارے خلاف کوئی کارروائی محض اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ ہمیں موساد اور جنرل کاؤسی کا تعاون حاصل تھا اگر یہ ہمارے خلاف ہوجاتے تو ہمیں ان وارداتوں میں فٹ کرنے میں انھیں چنداں دشواری نہ ہوتی۔ میں نے جنرل کوشش کو کہا کہ ہم پرسوں صبح جانے کے لیے تیار ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم اس مشن کو بھی انشاء اللہ کامیابی کے ساتھ پورا کریں گے۔ جنرل کوشش میری بات سن کر بڑا خوش ہوا اور کہنے لگا۔ ”مجھے پہلے ہی آپ پر پورا یقین تھا کہ آپ اپنے وعدے سے سرمو انحراف نہیں کریں گے۔ میں آپ کے لیے یہ کرتا ہوں کہ ان ڈائریوں اور کاغذات کو اپنے سامنے نذرِآتش کرواتا ہوں تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ موساد کے نئے ایجنٹوں کو یہ تمام معلومات حاصل کرنے میں خاصا وقت لگے گا اور تب تک آپ بندرعباس کا مشن مکمل کرکے لوٹ بھی آئیں گے۔

☆☆

جنرل علی کوشش سے بندرعباس جانے کے پروگرام کو فائنل کرکے میں گھر لوٹ آیا اور ساتھیوں کو بتایا کہ پرسوں ساڑھے آٹھ کی فلائٹ پر ہم بندرعباس جارہے ہیں۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ سب اپنے اپنے سائیڈ آرمز اور خاصی مقدار میں گولیاں روانگی سے پہلے ایک سوٹ کیس میں رکھ لیں اور اپنے کپڑے اور زیور وغیرہ بھی اپنے ہمراہ بندرعباس لے جائیں۔ اسلحے والا سوٹ کیس ہم ایئرپورٹ پر میجر اسفند کے حوالے کردیں گے جو اپنی ایجنسی کا کارڈ دکھا کر جہاز میں اسے اپنے ہمراہ لے جائے گا۔ باقی سامان ہم راہ لے جانے کا میں نے ساتھیوں کو اس لیے کہا تھا کہ یہ بھی عین ممکن تھا کہ ہم کو

بندرعباس سے راس الخیمہ یا کہیں اور جانا پڑتا اور ہم واپس تہران نہ آسکتے۔ اگلے روز میجر اسفند سے فون پر بات ہوئی تو اس نے کہا کہ وہ کل علی الصبح ہمارے گھر آکر جہاز کی ٹکٹیں اور بندرعباس کے شیرٹن ہوٹل میں کمروں کی ریزرویشن کی کنفرمیشن دے جائے گا اور اسلحے والا سوٹ کیس بھی وہیں سے لے جائے گا۔ اس نے کہا کہ جنرل علی کوشش نے اسے کہا ہے کہ تہران اور بندرعباس کے ایئرپورٹس اور جہاز میں سفر کے دوران وہ ہمارے لیے بالکل ان جان بنے رہے اور بندرعباس پہنچ کر شام کو ہوٹل میں ہم سے رابطہ کرے۔ یہ احتیاط محض اس لیے اختیار کی جارہی تھی کہ شاہ اور اس کے حواریوں نے دو اور ایجنسیاں ساوک کی نگرانی پر مامور کر رکھی تھیں۔ اگلی صبح ہم مسز زاہدی سے صرف یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ ہم چند روز کے لیے شیراز جارہے ہیں۔ جنرل کاؤسی سے بھی ہم نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

بندرعباس کے ایئرپورٹ سے ہم نے شیرٹن ہوٹل کے لیے تین ٹیکسیاں لیں اور ہوٹل پہنچ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ابھی ہمیں ہوٹل پہنچے دو گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ ہوٹل کی ریسیپشن سے فون آیا کہ تین پولیس والے ہمارے گروپ لیڈر سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں ریسیپشن پر گیا تو مقامی پولیس کے تین اہلکار وہاں موجود تھے میں لابی میں پڑے صوفوں پر انھیں لے گیا۔ انھوں نے میرے اور میرے ساتھیوں کے پاسپورٹ اور ویزے دیکھے اور چند معمولی نوعیت کے سوال پوچھ کر چلے گئے۔ میں نے ریسیپشن والوں سے پوچھا کہ کیا ہر نئے مہمان سے یہ پولیس والے اسی طرح پوچھ گچھ کرتے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ اتنے مہنگے ہوٹلوں میں صرف یوروپین اور امریکی ہی ٹھہرتے ہیں۔ بندرعباس میں مقیم پاکستانی اور بھارتی صرف معمولی نوعیت کی ملازمت کرتے ہیں اور نہ ہی اس فائیو اسٹار ہوٹل میں مدتوں سے کسی پاکستانی نے قیام کیا ہے۔ ریسیپشن کے کاؤنٹر پر ایک بھارتی مسلمان بھی کام کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ یہاں کے تقریباً سب ہی ٹیکسی ڈرائیور خفیہ ایجنسی میں کام کرتے ہیں اور وہی بندرعباس میں نئے اور خصوصاً تیسری دنیا کے باشندوں کی آمدورفت کی اطلاع اپنے دفتر میں دیتے ہیں۔

بندرعباس میں بلا کی گرمی تھی۔ ابلتے سمندر کی گرم اور ریت سے آلودہ تیز ہوا نے اس بندرگاہی شہر کو تپتے تنور کی طرح جلا رکھا تھا۔ شام گہری ہوئی تو ریسیپشن سے پھر فون آیا کہ چار پولیس والے ملنا چاہتے ہیں۔ میں انھیں لے کر پھر لابی کے صوفوں پر بیٹھ گیا۔ یہ پولیس والے انگریزی زبان سے اتنے ہی واقف تھے جتنا میں فارسی سے۔ وہ کچھ پوچھتے رہے اور میں کچھ اور جواب دیتا رہا۔ جب ان کے پلے کچھ نہ پڑا تو ان کا لہجہ درشت ہوگیا اور انھوں نے مجھے اپنے ساتھ تھانے چلنے کا کہا۔ میں نے انکار کرتے ہوئے ریسیپشن والوں کو کہا کہ کیا وہ اپنے ہوٹل کے مہمان سے بلاوجہ کا توہین آمیز رویہ دیکھ کر یوں ہی خاموش رہیں گے تو انھوں نے جواب دیا کہ اپنے جنرل منیجر کو انھوں نے پہلے ہی اطلاع

دے دی ہے اور تھوڑی دیر میں ہی وہ یہاں آجائے گا۔ انھوں نے پولیس والوں کو کہا کہ وہ تھوڑی دیر جنرل منیجر کے آنے کا انتظار کریں۔ پولیس والے بادل نخواستہ بڑبڑاتے ہوئے بیٹھ گئے۔ جنرل منیجر کی آمد سے پہلے ہی کرنل شیرازی، میجر اسفند اور ان کے ساتھی تین اہلکار، سبھی سویلین لباس میں ہمارا سوٹ کیس لیے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ میں خاموشی سے پولیس والوں کے ساتھ بیٹھا رہا۔ کرنل شیرازی نے ریسپشن والوں سے کچھ پوچھا تو انھوں نے میری طرف اشارہ کردیا۔ شیرازی اور اسفند میری طرف آئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہ پولیس والے مجھے اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جانے پر مصر ہیں۔ کرنل شیرازی نے پہلے آرام سے اور پھر کرختگی سے ان سے بات کی۔ پولیس والوں کا لہجہ بھی سخت ہوگیا تھا۔ اپنے افسران کو اونچی آواز میں بولتے دیکھ کر ساوک کے تینوں اہلکاروں نے لباس کے اندر پہنے ہوئے اپنے ہولسٹروں سے ریوالور نکال لیے۔ شیرازی نے انھیں اشارے سے روکتے ہوئے اپنا کارڈ نکال کر ان کے سامنے لہرایا اور انتہائی غصیلی آواز میں انھیں دفع ہوجانے کا کہا۔ کارڈ دیکھتے ساتھ پولیس والوں کی تو سٹی گم ہوگئی۔ فی الحقیقت ان کی ٹانگیں کانپنے لگیں، چہرے زرد ہوگئے اور خوف سے پسینے بہنے لگے۔ اب پولیس والے لگے معافیاں مانگنے۔ کرنل شیرازی اور میجر اسفند نے انھیں تھپڑوں اور ٹھڈوں پر رکھ لیا۔ یونی فارم میں ہونے کے باوجود پولیس والوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور مار کھا کر اور معافیاں مانگتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئے۔ کرنل شیرازی نے مجھ سے ان پولیس والوں کی بدتمیزی کی معافی مانگی اور مجھے کہا کہ میں انھیں اپنے کمرے میں لے چلوں۔ کرنل شیرازی اور میجر اسفند نے بیل بوائے کو سوٹ کیس کمرے میں لانے اور اپنے اہلکاروں کو لابی میں بیٹھنے کا کہا اور میرے ساتھ میرے کمرے میں آگئے۔ میں نے ان کے لیے ٹھنڈے مشروبات منگوائے اور میجر عمران کو جو میرے ساتھ کمرے میں ٹھہرا تھا، کہا کہ قیصر اور مزمل کو لے کر میرے کمرے میں آجائے۔ کرنل شیرازی نے بتایا کہ وہ گزشتہ ایک ہفتے سے بندر عباس میں مشن سے متعلقہ ضروری سامان اور اسپیڈ بوٹس اور بائی پلین کے انتظام کے لیے مقیم ہے اور اس نے اس دوران آئل ٹینکر کے متعلق مزید معلومات بھی اکٹھی کی ہیں۔ اس نے بتایا کہ تمام انتظامات ہوچکے ہیں اور وہ آئل ٹینکر کل کسی بھی وقت آؤٹر اینکر پر لنگر انداز ہوجائے گا۔ چونکہ بندرگاہ پر کل رات تک کوئی برتھ خالی نہیں ہوگی لہٰذا اس ٹینکر کو پرسوں تک آؤٹر اینکر پر ہی انتظار کرنا ہوگا۔ عام اندازے کے مطابق چھوٹے سائز کے ٹینکر پر عملے کے تیس سے پینتیس تک افراد ہوتے ہیں اور کسی ہنگامی صورتِ حال کے پیش آنے کی صورت میں عملے کے لیے چھ عدد لائف بوٹس ہوتی ہیں۔ چھ بارودی سرنگوں کے پھٹنے سے آل ٹینکر لامحالہ ڈوب جائے گا لیکن اس کے آگ پکڑنے کے چانسز ۶۰ فی صد اور عملے کی جانوں کے ضیاع کے چالیس فی صد ہیں۔ آؤٹر اینکر پر چونکہ کئی جہاز بندرگاہ کی برتھوں کے خالی ہونے کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں اس لیے یہ مشن رات کو کیا جائے گا۔ دو اسپیڈ بوٹس رات آٹھ بجے سے پوائنٹ زیرو پر تیار ملیں گی اور ہمیں رات ۱۱ بجے اس مشن پر روانہ ہونا ہے۔

پوائنٹ زیرو سے پوائنٹ ایکس کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ نصف کلومیٹر ہے۔ جہاں اسپیڈ لانچ اور بائی پلین موجود ہوں گے۔ پوائنٹ زیرو سے آؤٹر اینکر پر کھڑے کسی بھی جہاز تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ پچیس منٹ اور واپسی پر بیس منٹ صرف ہوں گے۔ کیونکہ جاتے وقت بلند موجوں کا سامنا ہوگا جب کہ واپسی پر یہی لہریں رفتار بڑھا دیں گی۔ دس بارودی سرنگیں ہمارے ہمراہ ہوں گی تاکہ اگر چھ مقناطیسی سرنگوں کو جہاز کے پانی کے اندر کے حصے میں لگاتے وقت کوئی سرنگ پانی میں گر جائے تو اس کا بدل موجود ہو کیونکہ اس مشن کو مکمل طور پر کامیاب کرنے کے لیے چھ سرنگوں کا لگائے جانا ضروری ہے۔ دوسری اسپیڈ بوٹ اسٹینڈ بائی کے طور پر پہلی بوٹ کے ساتھ ہی جہاز تک جائے گی تاکہ اگر ایک بوٹ خراب ہوجائے تو دوسری استعمال کی جاسکے۔ مشن کے کامیاب ہونے کی صورت میں اگلی صبح کی پہلی فلائٹ پر تہران کے لیے ہماری سیٹیں بک ہوں گی تاکہ جائے حادثہ سے جس قدر جلد ممکن ہو، تہران پہنچا جاسکے۔ اگر خدانخواستہ مشن ناکام ہوگیا اور ہماری جانوں کو خطرہ محسوس ہوا تو صاف موسم ہونے کی صورت میں بائی پلین سے ورنہ اسپیڈ لانچ سے ہمیں راس الخیمہ پہنچا دیا جائے گا جہاں سے ساوک کے اہلکار ہمارے لیے امارات کی کسی بھی ریاست میں جانے کا انتظام کردیں گے۔ میجر اسفند سارے مشن کے دوران اور اگر راس الخیمہ جانا پڑا تو ہمیں وہاں چھوڑ کر واپس آئے گا۔ دو گھنٹے سے زیادہ وقت انھی جزیات کے طے کرنے میں صرف ہوا۔ کرنل شیرازی ایک بریف کیس ہمراہ لایا تھا۔ اس نے بریف کیس مجھے دیتے ہوئے کہا کہ جنرل علی کوشش نے بیس لاکھ ڈالر بھیجے ہیں۔ ہر دونوں صورتوں میں یہ آپ سب کے لیے ہیں۔ مشن کامیابی سے مکمل ہونے کے بعد بقیہ رقم آپ کو تہران میں دی جائے گی اور مشن کی کامیابی کے بعد اگر آپ کو یہیں سے راس الخیمہ جانا پڑا تو بقیہ رقم میجر اسفند ہمیں دے گا۔ کرنل شیرازی نے رخصت ہوتے وقت کہا کہ میں آپ کا پوائنٹ زیرو پر رات ساڑھے دس بجے منتظر ہوں گا جہاں سے میجر اسفند ہمیں یہاں سے دس بجے لے جائے گا۔ پیراکی کے لباس اور غوطہ خوری کے آکسیجن سلنڈر پوائنٹ زیرو پر ہی پہنچ جائیں گے۔ ان دونوں کے رخصت ہونے کے بعد میں نے قیصر کو کہا کہ آج رات کا کھانا ہم سب ڈائننگ ہال میں ہی کھائیں گے۔ وہاں سب ساتھیوں کے ساتھ کھانے کے بعد میں نے ان کو بتایا کہ کل رات دس بجے ہمیں اس مشن پر روانہ ہونا ہے جس میں کامیابی اور ناکامی کے ففٹی ففٹی چانسز ہیں۔ خدانخواستہ دوسری صورت میں ہمیں کل رات ہی راس الخیمہ کے لیے روانہ ہونا پڑے گا۔ لہٰذا تمام ساتھی دس منٹ کے نوٹس پر جانے کے لیے تیار رہیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سارے ساتھیوں کے چہروں پر فکر و تردد کے آثار تھے جنھیں وہ اپنی مصنوعی مسکراہٹوں سے چھپانے کی بے سود کوشش کررہے تھے۔ خود میری اپنی حالت ان سے مختلف نہ تھی۔ مجھے مشن کی ناکامی کا خوف کم تھا لیکن ساوک کے متعلق جو داستانیں سن رکھی تھیں، ان کا سوچ کر دل سہم جاتا تھا۔ ان داستانوں کے مطابق ساوک والوں کا وتیرہ تھا کہ کسی اہم اور خفیہ مشن کی کامیابی کے بعد وہ چاہے ان

کے اپنے اہل کار ہوں چاہے انھوں نے باہر والوں کی خدمات لی ہوں، وہ ثبوت مٹانے کے لیے سب کو ہلاک کردیتے تھے۔ اگر ان کی یہی سوچ ہمارے لیے بھی تھی تو میجر اسفند اور اسپیڈ بوٹ چلانے والے دو آپریٹروں کی زندگی ان کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ میں اس مسئلے پر جتنا غور کرتا، میری بے چینی اتنی ہی بڑھتی جاتی۔ سوچ سوچ کر میں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ کرنل مزمل سے اپنے خدشات بیان کر کے اسے اپنا نمبر ٹو مقرر کروں۔ کھانے کے بعد اپنے کمروں میں واپس لوٹتے ہوئے میں کرنل مزمل کو اپنے کمرے میں لے گیا اور اسے تمام بات بتا کر کہا کہ کل میں مشن پر جانے سے پہلے تمام ساتھیوں کے سامنے تمھیں اپنا نمبر ٹو مقرر کرنے کا کہہ دوں گا۔ اور اگر ہم مشن پر جانے والوں کو کوئی حادثہ پیش آیا تو وہ بقیہ سارے ساتھیوں کو لے کر پاکستان چلا جائے اور تمام فیصلے اپنی صوابدید کے مطابق کرے۔ کرنل مزمل نے پہلے تو ہمارے مشن پر جانے کے لیے ضد کی اور پھر اتنی بڑی ذمہ داری سنبھال نہ سکنے کا عذر کیا لیکن جب میں نے اسے سمجھایا اور اس فیصلے کے سارے پہلو دکھائے تو وہ بالآخر راضی ہوگیا۔

☆☆

رات کے ٹھیک دس بجے اپنے تمام ساتھیوں سے مل کر میں، عمران، قیصر اور سپاہی اکرم ہوٹل سے باہر آئے۔ ہم نے احتیاطاً اپنے سائیڈ آرمز اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ ساتھیوں سے رخصت ہوتے وقت مایا نے جس کے چہرے سے پریشانی اور گھبراہٹ عیاں تھی، مجھے ایک جانب لے جا کر کہا کہ وہ میری بخیریت واپسی کی دعائیں مانگے گی۔ ''آپ کو علم نہیں کہ کسی کی زندگی کی تمام آرزوئیں اور رنگینیاں صرف آپ سے وابستہ ہیں'' مایا نے آنکھیں نیچی کیے ہوئے کہا۔ ''مایا تم صحرا میں جسے پانی سمجھ کر اس کی طرف بڑھ رہی ہو، وہ محض سراب ہے۔ اب بھی پلٹ جاؤ Nothing is end of the World (دنیا میں کچھ بھی حرفِ آخر نہیں ہے) میری زندگی میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں اور میں ایک جلتا ہوا کوئلہ ہوں۔ جو بھی میرے قریب آئے گا اسے کانٹوں کی چبھن اور جھلسا دینے والی تپش کے سوا کچھ نہ ملے گا'' میں نے مایا کو مجھ سے بے فائدہ امیدیں باندھنے سے روکنے کے لیے کہا۔ مایا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''کاش آپ مجھے موقع دیتے تو میں آپ کے کانٹوں کو پھولوں سے اور آگ کو بادِ نسیم میں بدل دیتی۔ چونکہ میں خود بھی ایسے ہی حالات سے گزر چکی ہوں بلکہ ابھی تک گزر رہی ہوں اس لیے آپ کے دکھ اور درد کو اچھی طرح سے محسوس کرسکتی ہوں۔ آپ ہی کی طرح میں بھی دنیا بھر میں کسی کی محبت سے ناآشنا ان جانے سفر میں نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہی ہوں'' مایا اپنے دلی جذبات کے اظہار پر قابو پا نہ سکنے کی وجہ سے آج کھل کر بول رہی تھی۔ میں نے اسے کہا ''دیکھو مایا، تم سے ضبط نہ ہوسکا اور تم نے اپنے دل کی بات کہہ دی اور میری حالت یہ ہے کہ ضبط کرتے کرتے دم پخت ہو چکا ہوں۔ اگر زندگی رہی تو اس مشن کے بعد تم سے اپنے دل کا حال کہوں گا۔ اب صرف یہ کہہ کر تم سے رخصت ہوتا ہوں کہ اگر لگن سچی ہو تو ہم جیسے خاکی اور فانی

انسانوں کی تو بات ہی کیا، انسان کو خدا بھی مل جاتا ہے۔'' مایا سے یہ باتیں کر کے میں عمران، قیصر اور سپاہی اکرم کے ساتھ ہوٹل سے باہر آیا۔ دو بند گاڑیاں لیے میجر اسفند ہمارا منتظر تھا۔ پندرہ بیس منٹ میں ہی ہم پوائنٹ زیرو پر پہنچ گئے جہاں دو اسپیڈ بوٹس اور ان کے آپریٹروں کے ساتھ کرنل شیرازی بے تابی سے ہمارا انتظار کررہا تھا۔ خلیج فارس میں سمندر کی تیز و تند لہروں کے شور میں ٹارچوں کی مدد سے عمران، قیصر، سپاہی اکرم اور میں نے غوطہ خوری کے لباس پہنے اور آکسیجن سلنڈر پشت پر باندھے۔ قیصر کو ہم اسٹینڈ بائی کے طور پر لے جارہے تھے۔ کرنل شیرازی نے ہمیں بارودی سرنگوں کا ٹائم فکس کرنے کا بتایا اور ہم تینوں کو نائیلون کے جال سے بنے تھیلوں میں تین تین بارودی سرنگیں رکھ کر دیں۔ ان مقناطیسی سرنگوں میں سے ہر ایک کا وزن پندرہ کلو کے لگ بھگ تھا یعنی ہم میں سے ہر ایک کو ۴۵ کلو وزن کے ساتھ غوطہ لگانا تھا۔ پانی میں ان کا وزن آدھے سے بھی کم ہوجانا تھا۔ میں نے آخر وقت میں یہ تبدیلی کی تھی کہ میں خود بھی غوطہ لگانے جارہا تھا اور قیصر کو اسٹینڈ بائی رکھا تھا۔ آخری تیاری اور چیک اپ کے بعد ہم ایک اسپیڈ بوٹ میں سوار ہوئے اور دونوں بوٹس تیزی سے آوٹر ایٹکر کی طرف روانہ ہوئیں۔ اس آئل ٹینکر کی مدھم روشنیاں ہماری رہنمائی کررہی تھیں۔ کرنل شیرازی نے ساحل سے ہمیں الوداع کہا اور میجر اسفند ہمارے ساتھ تھا۔ آئل ٹینکر کے قریب پہنچنے پر ہمیں واٹر پروف ہیلمٹس پہنا دی گئیں جن کے سامنے کے حصے پر آکسیجن گیس کے سلنڈر کا پائپ فٹ کیا گیا اور ہیلمٹس کے سامنے کے اوپری حصے پر طاقت ور بیٹری کی لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ یہ گیس سلنڈر آدھے گھنٹے تک ہمیں آکسیجن گیس مہیا کرسکتے تھے جب کہ ہمیں اپنے اپنے ٹارگٹس پر بارودی سرنگیں لگا کر پانی سے باہر آنے میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ درکار تھے۔ قارئین! میں نے غازی مشن کے دوران گیس سلنڈر کے ساتھ غوطہ خوری کی صرف دو تین بار سوئمنگ پول میں ٹریننگ لی تھی لیکن سمندر میں غوطہ لگانے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ عمران نے مجھے بتایا کہ سمندر میں غوطہ خوری کے وقت چھلانگ نہیں لگائی جاتی بلکہ کشتی کی سائیڈ پر اندر کی جانب بیٹھ کر الٹی قلا بازی لگائی جاتی ہے۔ چونکہ مجھے اس کی پریکٹس نہیں تھی اس لیے عمران اور اکرم نے سب سے پہلے مجھے اس طریقے سے اپنی مدد سے پھینکنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری اسپیڈ بوٹس کے انجن ٹینکر کے قریب پہنچتے ہی بند کردیے گئے اور چپوؤں کی مدد سے دونوں بوٹس کو ٹینکر کے ساتھ لگا دیا گیا۔ قیصر نے ہم تینوں کی ہیلمٹس کی لائٹیں آن کیں اور گیس کا والو کھول دیا۔ میں نے سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا اور عمران اور اکرم نے مجھے بڑے آرام سے سمندر میں اتار دیا۔ سمندر میں گرتے ساتھ ہی میں تقریباً پندرہ فٹ پانی کے اندر گیا لیکن ایک تو سمندر کے کھارے پانی اور دوسرے فراگ شوز کے باعث میں خود پر کنٹرول کرنے میں کامیاب ہوا۔ سطح پر بپھرا ہوا سمندر اندر سے بالکل ساکن تھا۔ میری ہیلمٹ کی روشنی دیکھ کر عمران اور اکرم بھی میرے قریب آگئے۔ ہماری کشتیاں ٹینکر کے تقریباً وسط میں رکی تھیں۔ مجھے غوطہ خوری میں اناڑی ہونے کے باعث سب سے آسان کام دیا گیا تھا۔ مجھے ٹینکر کے اپنی جانب

کے وسط اور پورٹ سائیڈ کی طرف دو سرنگیں پانی کے اندر دس سے پندرہ فٹ گہرائی میں ٹینکر سے چسپاں کرنی تھیں۔ جب کہ مزمل اور عمران کو تین سرنگیں ٹینکر کے دوسری جانب اور عمران کو تین سرنگیں ٹینکر کے دوسری جانب پورٹ سائیڈ، وسط اور اسٹار سائیڈ کی طرف لگانے کے علاوہ میری سائیڈ کے اسٹار سائیڈ پر بھی لگانی تھی۔ میں نے پہلی سرنگ پورٹ سائیڈ پر لگا کر اس کا بٹن دبا دیا جس سے فکس ٹائم کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہوگیا۔ میں نے ٹینکر کے وسط میں دوسری سرنگ لگائی، جہاز لوہے کا ہوتا ہے اور یہ سرنگیں مقناطیسی لوہے کی ہوتی ہیں۔ جہاز کے لوہے کے قریب جاتے ہی یہ سرنگیں بہت آسانی سے اس سے چپک جاتی ہیں۔ ٹائم پہلے سے ہی ہم نے سیٹ کیا ہوا تھا۔ لہٰذا انھیں چپکانے کے بعد صرف ایک سرخ بٹن کو دبانا تھا جس سے سرنگ ایکٹو ہوجاتی اور ٹائم کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہوجاتا۔ دوسری سرنگ لگانے کے بعد میں نے تیسری سرنگ بھی جہاز کے عقبی جانب چپکادی اور کشتی کی طرف پلٹا۔ کشتی کا پیندا دکھائی دیا تو میں پانی سے باہر ابھرا۔ قیصر اور میجر اسفند نے مجھے پانی سے کھینچ کر باہر نکالا۔ قیصر ابھی میری ہیلمٹ اتار ہی رہا تھا کہ عمران اور اکرم نے بھی اپنے سر پانی سے باہر نکالے۔ انھیں بھی کشتی میں بٹھایا گیا۔ دونوں اسپیڈ بوٹس کے انجن غرائے اور وہ تیزی سے واپسی کے لیے روانہ ہوگئیں۔ میری طرح عمران اور اکرم نے بھی اپنی اپنی تیسری سرنگیں بجائے واپس لانے کے جہاز کے مختلف حصوں میں لگادی تھیں۔ اکرم نے میری سائیڈ پر عقبی حصے میں اپنی تیسری سرنگ لگائی تھی۔ بعض اوقات فنی وجوہ یا کسی اور وجہ سے یہ سرنگیں ایکٹو ہونے کے باوجود نہیں پھٹتیں۔ ہم نے اس قسم کا کوئی خطرہ مول نہ لینے کی غرض سے چھ کے بجائے نو سرنگیں جہاز سے لگادی تھیں۔ ساحل تک واپسی کا سفر اسپیڈ بوٹس کے انجنوں کی طاقت کے علاوہ موجوں کے زور کی وجہ سے بیس منٹ سے بھی کم وقت میں طے ہوا۔ کشتیاں زیرو پوائنٹ پر پہنچیں تو ہم گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ہی اتر گئے۔

کرنل شیرازی نے بوٹ آپریٹرز کو وہیں رکنے کا کہا۔ ہم غوطہ خوری کا لباس تبدیل کر ہی رہے تھے کہ کرنل شیرازی کے تین اہل کاروں نے ان دونوں آپریٹروں پر اچانک اپنی اسٹین گنوں سے فائر کھول دیا۔ گولیوں سے چھلنی ان کے جسم بوٹس میں ہی گر گئے۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع ہوا تھا کہ ہم کچھ بھی نہ کرسکے۔ بالکل غیر ارادی طور پر قیصر نے اپنا ریوالور نکال لیا اور ہمارے کپڑوں میں سے جو ہمارے قریب ہی ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے، مجھے، عمران اور اکرم کو ہمارے سائیڈ آرمز نکال کر دیے۔ کرنل شیرازی، میجر اسفند اور ان کے اہل کار خاموشی سے قیصر کو ہمارا اسلحہ ہمیں دیتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

کرنل شیرازی جو بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا، فوری بول اٹھا۔ ”کسی غلط فہمی میں پڑ کر کوئی حماقت نہ کیجیے گا۔ یہ دونوں آپریٹر ہمارا راز جان گئے تھے اور ہمارے پاس انھیں ہلاک کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا“ ”ہم بھی تو آپ کا راز جانتے ہیں“ میں نے چیختے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں میرے

ساتھیوں نے ساوک کے تینوں اہل کاروں کو اپنے نشانے پر لے لیا تھا۔ کرنل شیرازی نے اپنے اہل کاروں کو کہا ”اپنے ہتھیار فوری زمین پر رکھ دو۔“ اہل کاروں نے اپنے ہتھیار نیچے رکھے اور کرنل شیرازی اور میجر اسفند نے اپنے ریوالور مجھے اور عمران کو الٹے کر کے پکڑا دیے۔ کرنل شیرازی نے فوری فیصلہ کر کے ایک بڑے خون خرابے کو روک دیا تھا ورنہ دوچار سیکنڈ میں ہی ہم ان اہل کاروں پر فائر کھول دیتے۔ ان کے پاس بھی اسٹین گنیں تھیں۔ جس طرف سے بھی گولیاں پہلے چلتیں وہی بچ سکتے تھے۔ کرنل شیرازی میرے قریب آیا اور کہنے لگا۔ ”ہم لوگوں نے اپنے ہتھیار آپ کو دے کر یہ تو ثابت کردیا ہے کہ ہم آپ کو کوئی گزند پہنچانا نہیں چاہتے۔ جہاں تک ان آپریٹروں کا معاملہ ہے انھیں ہم نے ہلاک کیا ہے اور اس کی پوری ذمہ داری ہم پر ہے۔“ ابھی یہ الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ آؤٹر اینکر پر کھڑے اسٹیمر میں سے روشنی کے کئی گولے یکے بعد دیگرے بلند ہوئے۔ کرنل شیرازی دوربین سے اس طرف دیکھنے لگا۔ چھوٹے روشنی کے کئی گولوں کے بعد اسٹیمر سے ایک بہت بڑا شعلہ بلند ہوا۔ ہلکے دھماکوں کی آواز بھی ہم تک پہنچی تھی۔ پھر بڑے دھماکے کی آواز آئی۔ کرنل شیرازی نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا ”اسٹیمر ڈوب رہا ہے“ اور دوربین میری طرف بڑھا دی۔ دوربین سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ پورا اسٹیمر آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا اور ایک جانب جھکا ہوا ڈوب رہا تھا۔ بارودی سرنگوں نے تو اس کے Hull (باڈی) میں بڑے بڑے سوراخ کردیے ہوں گے اور کسی بارودی سرنگ سے اس کے انجنوں کے تیل کے ذخیرے نے بھی آگ پکڑ لی تھی۔ کرنل شیرازی کے اہل کاروں نے دونوں اسپیڈ بوٹس پر پہلے سے وہیں پر رکھے جیری کینوں سے پٹرول ڈالا۔ ہم نے اپنے اپنے پیراکی کے لباس گاڑیوں میں رکھے۔ آکسیجن سلنڈروں کو آگ لگا کر دونوں اسپیڈ بوٹس میں پھینکا۔ دونوں بوٹس دھڑا دھڑ جلنے لگیں۔ گاڑیاں تقریباً نصف گھنٹے میں ہمارے ہوٹل پہنچیں۔ کرنل شیرازی اور میجر اسفند نے ہمیں مشن کی کامیابی پر مبارک دی لیکن ہمارے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہ آسکی۔ میں نے کرنل شیرازی کو اور عمران نے میجر اسفند کو ان کے ریوالور لوٹائے۔ کرنل شیرازی کہنے لگا ”کل صبح سات بجے گاڑیاں آپ کو لینے ہوٹل آجائیں گی اور صبح ساڑھے آٹھ کی فلائٹ پر آپ تہران کے لیے روانہ ہوں گے۔ آپ کے ہوٹل کا بل علی الصبح ادا کردیا جائے گا اور جو کچھ آپ نے دیکھا ہے، اسے اپنے ذہن سے محو کرنے کی کوشش کریں۔ ہم نے بصد مجبوری ان آپریٹروں کو ہلاک کیا ہے جن کی ہمارے ساتھ کوئی مخالفت نہ تھی۔ یہ بالکل اسی طرح ہوا جیسے اسٹیمر کی آگ سے ہوتا ہے کہ آدھے سے زیادہ کریو جل کر بھسم ہوگیا ہوگا اور ان کو ہلاک کرنے کی آپ کو کوئی خواہش نہ تھی۔“ یہ کہہ کر کرنل شیرازی اور میجر اسفند اپنے اہل کاروں کے ساتھ چلے گئے اور ہم خاموش اور سپاٹ چہروں کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوئے۔

☆☆

کرنل مزمل ہوٹل کی لابی میں بے چینی سے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ ہمیں زندہ سلامت دیکھتے

ہی اس کی جان میں جان آئی۔ وہ بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے اسے اپنی بے تابی چھپانے کے لیے کہا کیونکہ صرف چند گھنٹے پہلے ہی تو ہم ہوٹل سے باہر گئے تھے اور آدھی رات کے بعد واپس لوٹے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل والوں کو ہم پر کسی طرح کا بھی شک ہو۔ مزمل کو ساتھ لیے ہوئے میں نے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بتایا کہ مشن اللہ پاک کے فضل سے سو فی صد کامیاب رہا ہے اور وہ تمام ساتھیوں کو بتا دے کہ صبح سات بجے تہران جانے کے لیے بالکل تیار رہیں۔ اس مشن کے متعلق ساتھیوں کے ساتھ تفصیلی گفتگو تہران پہنچ کر ہوگی۔

اگلی صبح میجر اسفند ہماری تہران جانے کے لیے ٹکٹیں لے کر آگیا۔ اس نے ہی ہوٹل کا بل ادا کیا میں نے اسے اپنے اور ساتھیوں کے اسلحے والا سوٹ کیس دیا اسفند نے کہا کہ تہران میں چیف کو مشن میں کامیابی کا مژدہ کرنل شیرازی نے رات کو ہی سنا دیا تھا اور آج اسی فلائٹ پر کرنل شیرازی بھی تہران جارہا ہے اور چیف سے ملنے کے بعد وہ حسب سابق ہم سے رابطہ کرے گا میجر اسفند کے جانے کے بعد ہم ٹیکسیوں میں ایئرپورٹ گئے اور دوپہر بارہ بجے سے پہلے ہم تہران میں اپنے گھر پہنچ گئے کرنل شیرازی اور میجر اسفند بھی اسی فلائٹ پر جارہے تھے لیکن ہم نے ایک دوسرے کو نظر انداز کیا تہران ایئرپورٹ کے باہر میجر اسفند نے ہمارے اسلحے والا سوٹ کیس ہمارے سامان کے ساتھ ہی رکھ دیا مسز زاہدی کو تو ہم یہ بتا کر چلے تھے کہ ہم شیراز جارہے ہیں وہ حیران تھی کہ ہم اتنی جلد کیوں لوٹ آئے یہاں پر ہم نے سپنا کا سہارا لیا اور مسز زاہدی کو کہا کہ سپنا کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی لہٰذا ہم شیراز ایئرپورٹ سے ہی واپسی کی سیٹیں لے کر ہوٹل میں گئے اور آج صبح کی فلائٹ سے ہی لوٹ آئے ہمارے اس بے بنیاد عذر میں کوئی دم نہ تھا لیکن مسز زاہدی نے ہم سے اس بارے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ سرشام ہی جنرل کاؤسی بھی آن پہنچا وہ رسمی خیر و عافیت پوچھنے کے بعد بجائے ہم سے شیراز سے اس قدر جلد واپس لوٹنے کی وجہ دریافت کرنے کے کہنے لگا ''آپ کی ایک رات کی غیر موجودگی میں بندر عباس میں ایک بڑا حادثہ ہوگیا ہے ایک آئل ٹینکر میں جو ایران کے لیے پام آئل لاتے ہوئے آؤٹر اینکر پر لنگر انداز تھا، یکایک دھماکے ہوئے اور اس میں آگ بھڑک اٹھی اور کریو کے سترہ افراد کے ساتھ ٹینکر ڈوب گیا بروقت لائف بوٹس میں سوار ہونے والے کریو کے افراد ہی زندہ بچ سکے۔ بندر عباس کے ساحل پر ہی دو جلی ہوئی اسپیڈ بوٹس میں سے دو ایسی لاشیں بھی ملیں ہیں جو جل کر ایسی کوئلہ ہوچکی تھیں کہ ان کی شناخت بھی ناممکن تھی۔ جنرل کاؤسی نے جس وقت یہ بات کی کرنل مزمل، قیصر اور عمران بھی وہیں موجود تھے ہم نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا میں نے صرف یہ کہا ''جنرل اتنا بڑا ملک ہے حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ کاؤسی کا مقصد بھی ہمیں حالات سے باخبر رکھنا [illegible] اس نے بھی ہمیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

رات آٹھ بجے جب ہم کھانے کے لیے تیار ہو رہے تھے میجر اسفند کا فون آیا اور اس نے

کہا کہ ٹھیک نو بجے ان کی گاڑی مجھے لینے کے لیے گھر کے سامنے موجود ہوگی رات ساڑھے نو بجے میں جنرل علی کوشش کے دفتر میں تھا۔ میجر اسفند نے جو ویٹنگ روم میں بیٹھا تھا مجھے بتایا کہ کرنل شیرازی بھی جنرل کے ساتھ بیٹھا میں جنرل کے کمرے میں داخل ہوا تو پہلے جنرل علی کوشش نے اور پھر کرنل شیرازی نے مجھ سے ایرانی معانقہ کرتے ہوئے میرے گال چومے دونوں میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئے اور جنرل نے مجھے کامیابی سے یہ مشن انجام دینے کی مبارک دی اور کہنے لگا کہ کرنل شیرازی نے اسے ہماری دلیری اور بے خوفی کے متعلق بتاتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ واپسی پر ساحل پر پہنچنے کے بعد جب ہمارے آدمیوں نے اسپیڈ بوٹس کے آپریٹروں کو گولیاں ماریں تو آپ اور آپ کے ساتھیوں نے ان سب پر اپنے اسلحے تان لیے میں نے اس کے جواب میں کہا ''جنرل ان بوٹ آپریٹروں کو گولیاں مارنے سے پہلے ان کے ساتھ بھی آپ کے آدمی ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے پھر یکایک ان کی مشین گنوں نے ان آپریٹروں پر گولیاں اگلنی شروع کردیں ان کا یہ انجام دیکھ کر لازماً ہمارے دلوں میں بھی یہ شک پیدا ہوگیا تھا کہیں ہمارا بھی ان جیسا ہی حال نہ ہو اس لیے ہم نے سیلف ڈیفنس میں اپنا اسلحہ نکالا''

''آپ بالکل درست کہتے ہیں آپ کی جگہ وہاں کوئی بھی ہوتا تو اس کی سوچ بھی بالکل آپ جیسی ہوتی۔ کرنل شیرازی کو چاہیے تھا کہ آپ کو وہاں سے رخصت کر کے یہ کارروائی کرتا ان آپریٹروں کو ہلاک کرنا ہماری راز داری کے لیے بے حد ضروری تھا۔ بہرحال جو ہوگیا سو ہوگیا آپ اپنے دل کو ہماری طرف سے بالکل صاف رکھیں میں نے اپنے چند قابل اعتماد ماتحتوں کو پام آئل امپورٹ کرنے والی پارٹی کے کارخانے کو جو بندر عباس کے صنعتی علاقے میں ہے، مکمل طور پر تباہ کرنے اور نذر آتش کرنے کا پلان دیا ہے آئندہ دو روز میں یہ کام بھی ہوجائے گا آپ کی بقیہ انعامی رقم آپ کو کل گھر میں بھیج دی جائے گی آپ اور آپ کے ساتھیوں نے لاکھوں ایرانی عوام کی زندگی بچا کر جو احسان کیا ہے اس کے لیے میں اپنی پوری قوم کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں'' جنرل اگرچہ انگریزی بول رہا تھا لیکن اس کے لب و لہجے سے ایرانی زبان اور طرز ادائیگی کی مٹھاس ٹپک رہی تھی۔ مجھے ایران کی زبان کی مٹھاس اور چاشنی کے متعلق ایک کہاوت یاد آگئی ایران میں جب کسی مجرم کو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے لایا جاتا ہے تو اسکواڈ کمانڈر اس کے پاس جا کر اس سے گلے ملتا ہے اور اس کے گال چومتے ہوئے ایرانی طرز میں اس کی خیریت دریافت کرتے ہوئے کہتا ہے ''حال شما خوب است'' (تمھاری حالت اور مزاج بہت اچھے ہیں) اور پیچھے ہٹتے ساتھ ہی رومال سے اسکواڈ کو فائرنگ کا اشارہ دیتا ہے جنرل کوشش سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے ایک گھنٹا بیت گیا تو میں نے اس سے اجازت چاہی پھر وہی گلے ملنے اور گال چومنے کا مرحلہ طے ہوا اور ان کی گاڑی مجھے گھر چھوڑ گئی۔ مشن پر جانے والے میرے ساتھیوں نے باقی ساتھیوں کو تفصیلاً ہر بات پہلے ہی بتادی تھی لہٰذا مجھے یہ سارا واقعہ دہرانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

اگلے روز میجر اسفند نے فون پر کہا کہ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ دفتر کی گاڑی میں ہمارے

گھر کے قریب بقیہ رقم دینے کے لیے میرا انتظار کرے گا۔ اسفند سے تیس لاکھ ڈالر لے کر میں گھر واپس آیا اور اپنے سمیت تمام ساتھیوں میں ایڈوانس کے بیس لاکھ ملا کر کل پچاس لاکھ ڈالر برابر تقسیم کر دیے۔ ہمراہ نہ جانے والے ساتھیوں نے کئی بار کہا کہ یہ رقم صرف ان میں تقسیم کی جائے جو مشن پر گئے تھے لیکن میں نے کہا کہ یہ سب ہمارا ٹیم ورک ہے اس لیے سب ساتھیوں کو برابر کا حصہ ملے گا ایران میں اب ہمارا مزید ٹھہرنا بے کار اور خطرناک تھا رام سر، تہران کے ہلٹن ہوٹل اور بندر عباس کی وارداتیں معمولی نوعیت کی نہیں تھیں اور مجھے خدشہ تھا کہ امریکی ایف بی آئی یا ایرانی تحقیقاتی ٹیموں کی تفتیش کا رخ کہیں ہماری جانب نہ پھر جائے۔ میں نے ساتھیوں سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ہم کو اب جلد از جلد پاکستان جانا چاہیے جہاں چند روز خوف اور ڈر کے بغیر آرام کر کے پھر اپنے آئندہ مشن کا آغاز کریں گے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے ساتھیوں پر ایران کے مشنوں کے باعث اچھی خاصی Tension تھی۔ وہ ہر وقت خوف و ہراس کی حالت میں رہتے تھے۔ خود میری حالت بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ مجھ پر تو اپنی ساری ٹیم کی ذمہ داری تھی۔ میں نے پاکستان جانے کی بات شروع ہی کی تھی کہ سارے ساتھیوں نے اس کی فوراً تائید کر دی میں نے اسی شام میجر اسفند سے رابطہ کیا اور اسے کہا کہ میں جنرل علی کوشش سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی رات جنرل کوشش سے ملاقات کے دوران میں نے اسے ہمارے پاکستان جانے کے متعلق کہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ بات تو پہلے سے ہی اس کے لبوں پر تھی۔ وہ کہنے لگا ”یہ آپ کا بہت ہی دانش مندانہ اور صحیح فیصلہ ہے، میں یہ بات آپ سے کہتے ہوئے اس لیے جھجکتا تھا کہ اپنا مقصد حل کروانے کے بعد میں آپ کو واپس جانے کا کیسے کہوں۔ یہاں کے حالات اور ساوک میں دوسری ایجنسیوں کی در اندازی کا آپ کو یقیناً احساس ہوگا، اگر آپ اور آپ کے ساتھیوں کے متعلق دوسری ایجنسیوں کو شک پڑ گیا تو میں اس پوزیشن میں ہرگز نہیں ہوں کہ آپ کی کھلے بندوں مدد کر سکوں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ جلد از جلد ایران سے چلے جائیں، پرسوں ایران ایئر کی فلائٹ کراچی جا رہی ہے اگر آپ چاہیں تو اس فلائٹ پر آپ سب کی ٹکٹیں لے کر سیٹیں بک کروا دی جائیں، اس جہاز کی روانگی تک میں آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی پوری ذمہ داری لینے کو تیار ہوں۔ میں نے اس فلائٹ سے جانے کی حامی بھر لی تو جنرل کوشش نے مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے کہا۔ ”زندگی میں ان شاء اللہ ایسے کئی مواقع آئیں گے جب ہماری ملاقات ہوگی لیکن اب میں آپ کو خدا حافظ کہتا ہوں۔ میجر اسفند آپ کی روانگی کا انتظام کر کے آپ کو پرسوں ایئرپورٹ پر الوداع کہے گا“ ”ایک بات اور جنرل صاحب، ہمارے پاس جو اسلحہ ہے اسے ہم اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ کیا اس کا کوئی انتظام ہو سکتا ہے۔“ میری بات سن کر جنرل علی کوشش سوچ میں پڑ گیا اور کچھ دیر بعد بولا ”صرف ایک صورت ہے، آپ اسلحے والا سوٹ کیس میجر اسفند کو کل شام دے دیں، وہ اسے ایرانی وزارت خارجہ میں ساوک کے ڈیسک کے ذریعے فوری طور پر کراچی میں ایرانی قونصلیٹ میں

ساوک کے ایجنٹ کے پاس بھجوا دے گا، اپنے ایجنٹ کے نام میرا خط بھی میجر اسفند آپ کو ٹکٹوں کے ساتھ دے دے گا، کراچی پہنچ کر آپ اگلے روز ایرانی قونصلیٹ میں جائیں، میرا خط دیکھ کر ایجنٹ سوٹ کیس آپ کے حوالے کر دے گا“ جنرل سے رخصت ہو کر میں گھر آیا اور سارے ساتھیوں کو اسی وقت بتایا کہ پرسوں صبح کی فلائٹ پر ہم کراچی جا رہے ہیں۔ یہ بات سن کر سب کے چہرے کھل اٹھے۔ دوسرے روز میں نے مسز زاہدی کو کہا کہ ہم کل کراچی جا رہے ہیں اور نامعلوم پھر کب ایران آنا ممکن ہو اس لیے اس کی شادی کے جشن میں شرکت نہ کرنے کا احساس رہے گا، مسز زاہدی نے اسی وقت جنرل کاؤسی کو فون کر کے بلوایا۔ جنرل کو جب معلوم ہوا کہ اگلی صبح ہم ایران سے جا رہے ہیں تو اس نے بھی یہ کہا کہ حالات کے پیش نظر یہ ہمارا بہترین فیصلہ ہے، جنرل کاؤسی نے کہا کہ وہ اور مسز زاہدی (اب مسز کاؤسی) ہمیں ایئرپورٹ پر الوداع کہنے آئیں گی۔ اگلے روز شام کو میجر اسفند نے ہمیں جہاز کی اوکے ہوئیں ٹکٹیں لا کر دیں اور اسلحے والا سوٹ کیس اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے مجھے جنرل کوشش کا کراچی میں اپنے ایجنٹ کے نام خط بھی دیا۔ جسے دکھا کر میں نے سوٹ کیس لینا تھا۔ ہم اگلی صبح آٹھ بجے مہر آباد ایئرپورٹ پر پہنچ گئے۔ جنرل کاؤسی اور مسز زاہدی اپنی گاڑی میں ہمیں الوداع کہنے ایئرپورٹ پر آئے اور بڑی گرم جوشی سے ہمیں رخصت کیا۔ امیگریشن اور کسٹم وغیرہ سے فارغ ہو کر جب ہم ڈیپارچر لاؤنج میں آئے تو ہمارے پیچھے ہی، میجر اسفند بھی اپنے خصوصی کارڈ کی وجہ سے آ گیا، میرے تمام مرد ساتھیوں سے گلے ملنے کے بعد جب مجھ سے گلے ملنے لگا تو میرے کان میں کہنے لگا۔ ”پیچھے مڑ کر آخری لائن میں دیکھو، جنرل علی کوشش بھی آپ کو الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے ہیں، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سیاہ شیشوں کی عینک لگائے جنرل کوشش نے ہاتھ ہلا کر مجھے Wish کیا۔ اس وقت ایئر ہوسٹس نے جہاز پر سوار ہونے کی اناؤنسمنٹ کی اور ہم ایران کی تلخ و شیریں یادیں لیے جہاز میں سوار ہو گئے...!

☆☆

مہر آباد ایئرپورٹ سے کراچی کی پرواز کے دوران قم میں میرے ساتھ پیش آیا ایک واقعہ مجھے بار بار یاد آ رہا تھا۔ بی بی معصومہ کے روضے کی زیارت کے بعد ہم روضے کے قریب ہی بازار سے ایران کا مشہور حلوہ سوہن خریدنے کے لیے گئے تو میں ایک دکان سے عقیق کے دانوں کی تسبیح خریدنے لگا تو میرے ذہن میں یہ تھا کہ عقیق کی چند انگوٹھیاں اور تسبیحاں اپنی والدہ اور گھر کے دیگر افراد کے علاوہ چند قریبی عزیزوں کے لیے بھی خرید لوں۔ میں نے دکان دار کو یہ چیزیں دکھانے کے لیے کہا تو ایک مجذوب سا ایرانی میرے قریب آ کر کہنے لگا ”مجھے حلوہ لے دو“ میں مصنوعی مجذوبوں اور پیشہ ور بھکاریوں سے ہمیشہ دور بھاگتا ہوں اس لیے میں نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ یہ مجذوب جس نے پہلے فارسی میں مجھ سے حلوہ دلوانے کی فرمائش کی تھی جب دوبارہ اپنی بات دہرائی تو میں نے ہاتھ

کے اشارے سے اسے انکار کر دیا۔ اب اس مجذوب نے میرا کندھا پکڑتے ہوئے سلیس اردو میں مجھے کہا۔ ''تو جن کے لیے یہ انگوٹھیاں وغیرہ خرید رہا ہے ان کے پاس تو برسوں تک نہیں جاسکے گا۔ جب تک تو اپنے ہاتھ میں پہنی سونے کی انگوٹھی اتار نہیں دیتا تیرے دل کی مراد کبھی بھی پوری نہیں ہوگی۔'' مجذوب کی یہ بات سن کر میں ہنس پڑا کہ اب یہ انٹرنیشنل پیشہ ور فقیر جو یہاں آنے والے زائرین کو مختلف زبانیں بول کر مرعوب کرتا ہے، مجھ سے میری سونے کی انگوٹھی لینا چاہتا ہے۔ ہنستے دیکھ کر مجذوب کی آنکھیں سرخ ہوگئیں جنھیں دیکھنے سے میری آنکھوں میں جلن پیدا ہوگئی تھی۔ ''میری بات کا یقین نہیں کرتا اور اس جادوگرنی کے شعبدے پر یقین کر بیٹھا جس نے تیری زندگی کے مختلف ادوار تجھے دکھائے تھے۔ اللہ والوں کی بات نہیں مانتا اور شیطان کی چیلی کی باتوں میں آگیا۔'' میرے ذہن میں برما کے صوبے اراکان میں پیش آیا واقعہ تیز رفتار فلم کی طرح سے گھوم گیا کوئی اور ہوتا تو فوراً اس مجذوب کے پاؤں پکڑ لیتا لیکن میں خوش گوار زندگی کی آرزوؤں کو پیچھے چھوڑتا ہوا مایوسیوں کی حدوں کو بھی پار کر چکا تھا اس لیے میں نے مجذوب کی بات پر چونکنے کے بجائے اسے کہا ''جادوگرنی نے تو مجھے میرے ماضی اور مستقبل میں پیش آنے والے جو واقعات پانی کے تسلے میں دکھائے تھے، وہ بالکل ویسے ہی پیش آئے۔ اللہ والوں نے مجھے کیا دیا۔ صرف دعائیں جو عرش تک تو کہاں پہنچتی تھیں ان کمروں سے باہر بھی نہ جاسکیں، جن میں وہ بیٹھے تھے۔'' مجذوب بولا ''وہ اللہ والے نہیں بلکہ دھوکے باز تھے تو جن کے پاس جاتا رہا۔ آ میرے ساتھ۔ تجھے دکھاؤں کے اللہ والوں کے غلاموں کا غلام بھی کس قدر طاقت رکھتا ہے۔'' یہ کہہ کر مجذوب آگے چل پڑا اور میں کسی نہ دکھائی دینے والی طاقت کے زیر اثر اس کے پیچھے ہولیا۔ یقین جانیے میرا دماغ اس وقت بالکل ماؤف ہوچکا تھا۔ ہم زیادہ سے زیادہ آدھا کلو میٹر چلے ہوں گے کہ شہر کی مین سیوریج لائن کے لیے سیمنٹ کے بنے نئے بڑے بڑے پائپ دکھائی دیے۔ مجذوب ایک پائپ کے اندر چلا گیا اور اس کے پیچھے میں بھی اندر داخل ہوگیا۔ مجذوب پائپ کے درمیان میں بیٹھ گیا اور ایک گدڑی کو جسے اس نے کندھے سے لٹکا رکھا تھا، کھولا۔ قارئین! یقین جانیے، اس گدڑی کے کھلتے ساتھ ہی ایسی خوش بو کے جھونکے آئے جسے بیان کرنا کم از کم میرے لیے ناممکن ہے۔ میں سیکڑوں قسم کے پرفیوم استعمال کر چکا ہوں لیکن ان سب کی خوش بو اس گدڑی سے اٹھنے والی لپٹوں کے سامنے ہیچ تھیں۔ میں ابھی آنکھیں بند کیے اس خوش بو میں ہی کھویا ہوا تھا کہ مجذوب بولا ''تو آج آقاؤں کے غلاموں کے غلام کا مہمان ہے۔ لے سیر ہو کر کھا'' میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے ایک چمک دار طشت میں انگور، سیب اور آم سجے ہوئے تھے۔ میں حیران تھا کہ آس پاس کوئی دوسرا موجود نہیں پھر یہ طشت اور فروٹ کہاں سے آگیا۔ میں نے انگور کا ایک دانہ منہ میں رکھا تو ایسے محسوس ہوا جیسے شہد سے بھرا ہو۔ سیب اور آم بھی انتہائی لذیذ تھے۔ ان پھلوں جیسے لذیذ پھل مجھے آج تک دوبارہ نصیب نہ ہوئے۔ میں نے خوب سیر ہو کر یہ پھل کھائے۔ مجذوب کہنے لگا ''اس جادوگرنی

نے تجھے جو کچھ دکھایا تھا وہ درست تھا لیکن اس کا ذریعہ شیطانی قوتیں تھیں۔ لیکن میں تجھے اللہ اور اس کے پیاروں کے غلام کی قوت دکھاؤں گا۔'' مجذوب نے یہ کہہ کر گدڑی میں ہاتھ ڈالا اور ایک سبز رنگ کا چوکور کپڑا نکال کر اپنے سامنے بچھالیا اور تسبیح پڑھنے لگا۔ تسبیح ختم ہوئی تو اس نے مجھے کہا۔ ''اس کپڑے پر نظریں جمالے۔'' میں نے کپڑے پر نظریں گاڑ دیں۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میں اس پائپ میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہوں۔ میری والدہ کی میت برآمدے میں پڑی ہے اور تمام عزیز و اقارب جمع ہیں۔ پھر محسوس ہوا کہ میں کسی پاکستانی ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا ہوں اور دو نوجوان میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ پھر منظر بدلا۔ میں کسی مسجد میں احباب کے ساتھ بیٹھا ہوں اور میرا نکاح پڑھوایا جارہا ہے۔ میں چلا اٹھا۔ ''بابا اب اس کا چہرہ بھی دکھا دو جس کے انتظار میں میری زندگی پر خزاں چھا گئی ہے۔'' ''بہت بے صبرا ہے تو۔ خاموش رہتا تو تجھے تیری آئندہ زندگی کا ایک ایک لمحہ دکھا دیتا پر اب صرف تیری فرمائش ہی پوری کرسکوں گا۔'' یہ کہہ کر مجذوب نے گدڑی میں سے ایک مٹی کی بنی ہوئی پلیٹ نکالی اور میرے سامنے کردی۔ مٹی کی اس پلیٹ میں ایک نسوانی چہرہ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ''یہ ہے وہ جسے تجھے جادوگرنی نے دکھایا تھا۔ یہ تجھے ضرور ملے گی لیکن اکیس سال کے بعد۔ تمھاری زندگی کا یہ فیصلہ آسمانوں پر ہوچکا ہے۔ یہ تجھے ضرور ملے گی لیکن اس وقت جب مایوسیوں نے تجھے ہر طرف سے گھیر رکھا ہوگا۔ جب زندگی کے کٹھن سفر سے تیرے تلوے چھلنی ہوچکے ہوں گے۔ جب بھری دنیا میں تیرا ہم درد اور خیر خواہ کوئی نہ ہوگا اور یہ تجھے اپنے وطن میں ہی ملے گی۔ غور سے دیکھ اور اس چہرے کو یاد رکھ'' میں پلیٹ کو پکڑے اس چہرے کے خدوخال کو اپنے ذہن میں جذب کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجذوب بولا۔ ''مایوس نہ ہو۔ یہ سارا کٹھن وقت بہت جلد گزر جائے گا۔ تیرے گناہ بے حد و شمار ہیں لیکن تیری چند نیکیاں ان سب پر بھاری پڑ گئی ہیں۔ جا اور اب وقت کا انتظار کر۔'' مجذوب خاموش ہوا۔ لمحے بھر کو میری نظریں اس پلیٹ پر سے ہٹ گئی تھیں۔ دوبارہ دیکھا تو اس پلیٹ میں کچھ نظر نہ آیا۔ مجذوب کو مخاطب کیا تو وہ سر جھکائے مراقبے میں جاچکا تھا اور اس کے منہ سے علی علی کی مدھم آواز آرہی تھی۔ میں الٹے قدموں پائپ سے باہر آگیا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ سونے کی انگوٹھی اتار کر وہیں سے چاندی کی انگوٹھی خرید کر پہن لی اور ساتھیوں کے ساتھ آن ملا۔

قارئین! جانباز دوم اب اختتام کے بالکل قریب ہے اس لیے میں جانباز کے بہت سارے قارئین کے میری ذاتی زندگی کے اس پہلو کے متعلق پوچھے گئے سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ سن ۱۹۹۸ء میں جب زندگی کی دوپہر ڈھل رہی تھی اور میں اپنے حالات سے مایوس ہو کر زندگی کے سفر کو ڈیلی ویجز کی طرح بسر کر رہا تھا کہ اچانک اور انتہائی غیر متوقع طور پر مجھے نہ صرف وہ چہرہ بلکہ ایک مکمل خاتون دکھائی دی جس کی تلاش میں میں مدتوں سے بھٹک رہا تھا۔ مجذوب کے کہنے کے مطابق کہ وہ ہستی اکیس سال بعد مجھے میرے وطن میں ملے گی، میں نے راولپنڈی، جہلم، سرگودھا، لاہور اور ملتان

میں دو برس سے زیادہ اس کی تلاش میں ناکام ہو کر سن ۹۶ء سے کراچی میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اسی دوران غازی کے عنوان سے میری آپ بیتی روزنامہ امت میں شائع ہوئی۔ غازی کی بے انتہا مقبولیت کے باعث ہزار ہا قارئین کی طرح اس ہستی نے بھی میری اس داستان کو سراہا۔ ایک ان جانی طاقت نے مجھے اس سے ملنے کے لیے اکسایا اور جب میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سرتاپا یہ وہی تھی، وہی تھی، وہی تھی جسے میں نے جادوگرنی کے پانی کے تسلے میں دیکھا اور پھر قم میں مجذوب نے مجھے مٹی کی پلیٹ میں اس کا چہرہ دکھایا اور اس عکس کو زندگی سے بھرپور دیکھنے کے انتظار میں میں نے ۲۱ برس گزار دیے تھے اور اسی لیے مشنوں کے دوران متعدد عورتوں سے میرا واسطہ پڑا لیکن میں کسی سے بھی متاثر نہ ہوسکا۔ چونکہ ہمارے ملاپ کا وقت آچکا تھا اس لیے تمام دشواریاں اور رکاوٹیں خود بخود دور ہوگئیں اور ۲۵ مارچ ۹۸ء میرے خوابوں کی ملکہ جس کے انتظار میں دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ میں نے تڑپ تڑپ کر گزارا تھا، میری زوجیت میں آگئی۔ میری رفیقۂ حیات نے جسے میں بیوی سے کہیں زیادہ اپنی محبوبہ اور گم شدہ جنت کا حقیقی روپ میں مل جانا سمجھتا ہوں، میری زندگی میں مسرتیں اور خوشبوئیں بکھیر دی ہیں۔ ہم دونوں کی یہ حالت ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے۔ کسی بات پر اگر کچھ اختلاف ہو بھی جائے تو ہم دونوں کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ جلد از جلد اس اختلاف کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ چند گھنٹوں میں ہی اختلاف کو پرے پھینک کر ہم پھر شیر وشکر ہوجاتے ہیں۔ صرف لفظی طور پر ہی نہیں بلکہ شادی کے بعد میری دو شدید علالتوں کے دوران میری محبوبہ بیوی نے جس طرح دن رات ایک کر کے مجھے پھر سے صحت یاب کیا ہے اور اس کا ایثار اور محبت جس طرح کھل کر سامنے آیا ہے اسے میں ہی جانتا ہوں۔ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن مجھے زندہ رہنے کی خواہش مجھے میری بیوی سے ہی ملی ہے اگر وہ نہ ملتی تو شاید میں جانباز لکھنے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔ وہ انتہائی مہذب اور پڑھے لکھے خاندان سے ہے۔ دنیا کے لیے وہ ایک سینئر سرجن ہے لیکن میرے لیے میرے دل کی مسیحا ہے۔ میری بھی یہ حالت ہے کہ میں اسے دیوانہ وار چاہتا ہوں۔ جاننے والے ہمیں Love Birds کہتے ہیں۔ اسے مجھ سے صرف ایک شکایت ہے کہ میں سگریٹ پینا چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔ میں نے سگریٹ بہت کم کردیے ہیں لیکن انھیں یکسر چھوڑنا میرے بس میں نہیں۔ جو زندگی بھر سلگتا رہا ہو وہ اس آگ کا عادی ہوجاتا ہے اور اس سے یک دم کنارہ کشی کو وہ برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ قسط لکھنے کے دوران بھی وہ کئی بار مجھے سگریٹ پینے سے مختلف طریقوں سے روکے جارہی ہے۔ ادھر میں نے سگریٹ نکالا، ادھر اس نے میرے منہ میں کوئی شے ڈال دی، کبھی لائٹر غائب کردیا اور کبھی سگریٹ کی ڈبیا۔ یہ سب کچھ وہ میری صحت کے لیے کررہی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں چھپ چھپا کر دو چار کش لے لیتا ہوں۔ ہماری ایک ہی بڑی خواہش اور آرزو ہے کہ اللہ پاک ہمیں اولاد سے نوازے۔ قارئین! آپ بھی ہمارے لیے دعا کریں۔

کراچی پہنچ کر ہم نے حسب سابق ہوٹل میٹروپول میں کمرے لیے۔ اگلے روز میں ایرانی قونصلیٹ میں گیا اور ساوک کے ایجنٹ کو ملا جو سفارتی عہدے کے کور میں کام کررہا تھا۔ جنرل علی کوشش کا خط پڑھ کر اس نے سوٹ کیس تو مجھے دے دیا لیکن مجھ سے مختلف قسم کے سوال کرنے لگا۔ میرے ساتھ قیصر اور عمران بھی تھے۔ میں نے قیصر کو کہا کہ وہ سوٹ کیس لے کر ہوٹل جائے، میں اور عمران بھی تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔ ساوک کے ایجنٹ نے سوٹ کیس ہمیں قونصلیٹ کے باہر دیا تھا اور قیصر کے جانے کے بعد ہم قونصلیٹ کی بیرونی انتظار گاہ میں ایجنٹ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جب میں نے اس کے سوالات کے جواب میں ادھر ادھر کی ہانکنی شروع کی تو اس کا لہجہ کرخت ہوگیا اور اس نے کہا کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم قونصلیٹ یعنی ایرانی سرزمین میں بیٹھے ہیں۔ عمران سے اس کی یہ دھمکی برداشت نہ ہوسکی۔ اس نے اٹھتے ہوئے اسے کہا کہ ہم جارہے ہیں اور تمھارے فضول سوالات کا جواب نہیں دیں گے۔ ایجنٹ نے اسے روکنے کی کوشش کی تو میں نے ایجنٹ کو ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ''ہم تمھاری سرزمین پر جو کچھ کر کے آئے ہیں اس کے متعلق اپنے محکمے سے پوچھنا اور اگر تم نے ہمیں یہاں روکنے کی کوشش کی تو تمھارا قونصلیٹ کی عمارت سے باہر نکلنے پر وہ حشر کریں گے کہ رام سر کے امریکی اڈے کی یاد تازہ ہوجائے گی۔ میری یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ ایجنٹ کرسی پر بیٹھا اپنے گال سہلاتا رہا اور ہم قونصلیٹ سے باہر چلے آئے۔

☆☆

برسوں سے مسلسل کشت وخون اور خوف و ہراس کی زندگی بسر کرتے ہوئے کم از کم میں اکتا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ ایک طویل بریک کیا جائے۔ میرے ساتھیوں کی حالت مجھ سے مختلف نہ تھی۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم جتنا عرصہ پاکستان میں رہیں گے وہ سارا وقت سیر وتفریح اور ذہنی سکون میں گزاریں گے۔ پاکستان کے دشمن اور مخالف تو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے ہم کہاں تک ان کا صفایا کرتے اور اب تو ہماری ذہنی کیفیت ایسی ہوچکی تھی کہ ہم میں گزشتہ حالات کی وجہ سے ذرا سا بھی ضبط اور تحمل نہیں رہا تھا۔ ہمیں خود کو نارمل حالت میں لانے کے لیے بھی دماغی سکون اور تفریح کی بے حد ضرورت تھی۔ میں نے حسب سابق اپنے گاؤں کے تحصیل ہیڈکوارٹر بھلوال کے نیشنل بینک میں ملازم اپنے ایک رشتہ دار کو فون کر کے اپنی والدہ، بیٹے اور بیوی کی خیریت دریافت کی اور اسے کہا کہ دو لاکھ کا بینک ڈرافٹ اپنی والدہ کے نام بھیج رہا ہوں۔ وہ گھر والوں کو میری خیریت اور کراچی آمد کا بتادے۔ اگلے روز میں اسی وقت اسے دوبارہ فون کروں گا تاکہ اگر کوئی ضروری بات ہو تو وہ مجھے بتا سکے۔ میرے گھر کے حالات حسب سابق ہی تھے اور میں ان کے جاننے سے اتنا خوف زدہ تھا جیسے صحرائی شتر مرغ آندھی سے اپنے بچاؤ کے لیے صرف اپنے سر کو ریت میں دبا کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے آندھی سے خود کو محفوظ کرلیا ہے یا کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتا ہے کہ اس کو بلی سے اب کوئی خطرہ نہیں۔

ساتھیوں کے ساتھ میں نے تحائف خریدے اور سونیا کو ملنے گئے۔ سونیا اپنی رانی ماں کے ساتھ بہت خوش و خرم تھی۔ رضی کی بیوی اور مسز ڈیوڈ بھی ان ماں بیٹی سے ایسی گھل مل گئی تھیں کہ سب ایک ہی خاندان کا فرد معلوم ہوتی تھیں۔ رضی تو کراچی پہنچتے ساتھ ہی اپنی بیوی کو ہوٹل میں لے آیا تھا اور اس نے کراچی میں ہی رہنا پسند کیا لیکن سترہ روز تک میں اور سارے ساتھی اسلام آباد، مری، نتھیا گلی، سوات، کالام اور بشام تک خوب گھومے پھرے اور مشہور جھیل سیف الملوک بھی دیکھنے گئے۔ اس سیر و تفریح کے دوران سپنا کی طبیعت فی الحقیقت خراب ہوگئی۔ قیصر نے مجھے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ واپسی پر ہم اسلام آباد میں دو روز ٹھہرے جہاں میں نے اپنے سابقہ محکمے کے افسران سے رابطہ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ ان سب کے تبادلے ہوچکے ہیں اور ان کی جگہ نئے افسران نے سنبھال لی ہے۔ ان نئے افسران سے نہ ہی میں نے ملنے کی کوشش کی اور نہ ہی انھوں نے ماضی کے ریفرنس سے مجھے کوئی اہمیت دی۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ جب ہم تمام مشن اپنے طور پر انجام دے رہے ہیں تو محکمے والے کیوں ہماری کامیابیوں کا سہرا اپنے سر باندھیں۔

پروگرام کے مطابق ہمیں اب ابوظہبی جانا تھا جہاں Sub Tech (سب ٹیک) نامی کمپنی میں اسرائیلی اور موساد کے ایجنٹ امریکی پاسپورٹوں پر کام کررہے تھے اور اندرونِ خانہ ابوظہبی کے امیر شیخ سلطان بن ال نہیان کو جو پاکستان کے بہت حامی تھے اور ہیں، پاکستان کے خلاف بہکانے میں دن رات ایک کررہے تھے۔ اس کمپنی کے متعلق مجھے پاکستان سے سعودی عرب روانگی سے میرے سابقہ محکمے کے ایک افسرِ اعلیٰ نے بریف کیا تھا۔ میں نے اس مشن پر صرف مردوں کو ہمراہ لے جانا چاہا۔ سپنا تو ویسے بھی اس قابل نہیں تھی کہ ہمارے ساتھ جا سکے۔ لیکن مایا نے ضد کی کہ وہ ضرور ہمارے ساتھ جائے گی۔ ہم سب نے اسے سمجھایا لیکن اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔ مجھے مجبوراً اسے ہمراہ لے جانے کی حامی بھرنا پڑی۔ میں نے سونیا کی ماں سے سپنا کو ہماری واپسی تک اپنے ساتھ رکھنے کا کہا تو اس نے دلی خوشی سے سپنا کو اپنے ساتھ رکھنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ سعودی عرب کے وزیر دفاع کے دیے ہوئے خط کی وجہ سے سعودی قونصلر نے ہم سب کے ابوظہبی کے ویزے لگوا کر دیے اور ہم پاکستان میں چھبیس روز سیر و تفریح کے بعد تازہ دم ہو کر ابوظہبی کے لیے پرواز کر گئے۔

❁

اختتامیہ

جانباز میری نظر میں

''جانباز'' آپ کے ہاتھ میں ہے لیکن صد افسوس !! اس کا خالق، یعنی اصل جانباز اپنی جان کی بازی ہار چکا ہے...!!

سیّد سلیم عباس (غازی) ۲۰ر فروری ۲۰۰۲ (۷ ذالحج) کی المناک شام اپنے ہزاروں پرستاروں اور چاہنے والوں کو تنہا سوگوار چھوڑ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ پاکستان کے ایک قابلِ فخر جانباز مجاہد تھے۔ ان کی پہلی محبت و ترجیح پاکستان تھی، اور اس مملکت خداداد کے لئے شہید ہونا انکی سب سے بڑی آرزو........!

ملکی محاذ کی طرح وہ قلم کے میدان کے بھی ایک دلیر و بے خوف مجاہد تھے۔ آخری وقت بھی وہ اپنی خواہش کے مطابق اپنے قدموں پر چلتے ہوئے، اپنی مخصوص بہادری و اعتماد کے ساتھ مسکراتے ہوئے موت سے نبرد آزما ہوئے۔ زندگی سے بھرپور اس دلیر جانباز غازی کو مرحوم کہتے دل نہیں مانتا۔ مجھے تو لگتا ہے وہ آج بھی زندہ ہیں اور زندہ و جاوید رہیں گے۔ شاید اس لیے کہ انھوں نے اپنی ہر دعاء میں صدقِ دل سے شہادت کی دعا مانگی اور آخری وقت تک شہادت ان کا مطلوب و مقصود تھی۔ حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو شہادت کا رتبہ عطا کر دیتے ہیں۔

جاسوسی کے محکمے کے تحت دشمن ملک میں اپنی مہمات کے دوران اُنھوں نے کئی نام بدلے۔ کبھی ونود چوپڑا، تو کبھی آصف علی۔ اسپیشل سروس سے منسلک ہونے کے باعث انھوں نے زیادہ تر ابوشجاع ابووقار کے قلمی نام سے لکھا۔ اپنے قلمی نام کی طرح وہ شجاعت و وقار کا پیکر تھے۔ انکی تحریروں کی قدر مشترک پاکستان سے محبت اور اس کے دشمنوں کو بے نقاب کرنا ہے۔ بحیثیت ادیب ان کی شہرت کو عروج ان کی آپ بیتی 'غازی' کی اشاعت سے ملی۔ یہ آپ بیتی ۱۹۷۱ء جنگ کی ذلت آمیز شکست کا بدلہ لینے

کے لیے، اُن کے بحیثیت جاسوس دشمن ملک میں انجام دیئے گئے حیرتناک کارناموں پر مبنی ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت سے "غازی" ان کے نام کا جز بن گیا۔ سیدھے سادھے دل کی گہرائیوں سے نکلے الفاظ، اور سچے جذبات سے لکھی اس دلچسپ آپ بیتی نے اس کے پڑھنے والوں کو ان کا شیدائی بنا دیا اور لوگوں کے دل سسپنس سے بھرپور پے درپے مہم جوئی کے واقعات کے ساتھ دھڑکنے لگے۔ ملک کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں ان کو تعریفی خطوط موصول ہوئے اور لوگ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے مشتاق ہوئے۔ ان کے ہزارہا کارناموں میں سے ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اپنی تحریر 'غازی' کے ذریعے انھوں نے پاکستان کے مستقبل سے مایوس جوانوں اور بزرگوں میں امید کی ایک نئی روح پھونک دی۔ ایسے کئی نوجوانوں نے ان سے مل کر یا ان کی کتاب پڑھ کر اپنے مستقبل پاکستان کے لیے کام کرنے پر بدل دیے۔ اور ان کے ساتھ مل کر پاکستان کے لیے عملی جہاد کرنے کے متمنی ہوئے۔ ایک محفل میں ان سے کسی نے پوچھا آپ غازی ہیں تو غازی کا رتبہ زیادہ بلند ہوتا ہے یا شہید کا؟ ان کا جواب تھا، "غازی اس وقت تک غازی نہیں بن سکتا جب تک وہ شہید ہونے کا آرزومند نہ ہو......"

ان کے پرستاروں کو اُن کی دوسری کتاب 'جانباز' کا شدت سے انتظار تھا۔ انھوں نے اپنا وعدہ ایفا کیا۔ کتاب 'جانباز' آپ کے ہاتھ میں ہے مگر زندگی نے ان سے وفا نہ کی..! اور یہ جانباز اس کتاب کی اشاعت کے آخری مراحل میں اپنی جان کی بازی ہار گیا.... !! انکی زندگی میں جانباز اول طباعت کے مرحلے میں داخل ہونے کو تھی، جانباز دوئم وہ اگلے مرحلے میں شائع کروانے کے لئے مکمل کر چکے تھے، اور جانباز سوئم کا تحریری خاکہ انکے ذہن میں تھا۔ انکے اچانک یکلخت اس دار فانی سے رخصت ہونے کے باعث اس کتاب کو آخری مرحلے سے گزارنے کی ذمہ داری بلکہ سعادت میرے حصے میں آئی۔ اس مشکل کام نے مجھے انکی اس تخلیق کے ذریعے، انکی ذات میں محو ہو کر، اس قیامت انگیز دکھ میں وقت گزارنے کا حوصلہ دیا۔ انکے بغیر اپنی زندگی سے بھی مایوسی کے باعث، میں نے فیصلہ کیا کہ جانباز اول و دوئم کو ایک ہی جلد میں شائع کروا دیا جائے۔ اس وجہ سے، اور اس کام سے ناواقفیت کے باعث اِس کتاب کی اشاعت میں قدرے تاخیر ہوئی۔ اس تاخیر کے لئے اور کتاب کے ضخیم ہو جانے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

انکی ہمہ صفت، غیر معمولی، "legendary" شخصیت کو پوری طرح تحریری طور پر اجاگر کرنا ممکن نہیں، یہ اختتامیہ، وطن کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر قابلِ فخر کارنامے انجام دینے والے اس جانباز کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کرنے کی میری چھوٹی سی کوشش ہے۔۔ 'جانباز' میں وہ اپنی ذاتی زندگی اور شخصیت کے پہلوؤں سے گاہے بگاہے پردہ سرکاتے رہے ہیں مگر انکی 'بلٹ پروف' شخصیت کے کچھ نرم و روشن پہلو شاید اب بھی بہت سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوں۔ انھیں محض دور سے جاننے والے ان کو ایک سخت، کھردرے انسان کے طور پر جانتے ہوں گے، مگر اس عزم و ہمت

و بہادری کے پیکر، چٹان کی طرح سخت، نڈر انسان کے اندر ایک بہت گداز، محبت سے لبریز دل بھی تھا۔ جو لوگ ان کے قریب تھے وہ ان کے اعلیٰ اخلاق، شائستگی، خوش مزاجی اور زندہ دلی کے معترف تھے۔ زندگی کے بیشتر سال محبت، خوشیوں اور راحت سے محروم رہنے کے باوجود شگفتہ مزاجی اور پرامید رہنا اُن کی فطرت میں شامل تھا۔ وہ امید کو زندگی سمجھتے۔ خود بھی ہمیشہ پرامید رہتے اور دوسروں کو بھی مایوس نہ ہونے دیتے۔ ان کی کتاب غازی کا آخری فقرہ بھی ظہیر کاشمیری کے اس شعر پر ختم ہوتا ہے:

ہمیں یقین ہے کہ ہم ہیں چراغ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں، اُجالا ہے

میں ان کی جیون ساتھی تھی اور ان کے والدین سمیت چند خوش نصیبوں میں سے جنھیں انھوں نے ٹوٹ کر چاہا۔ ان کی شخصیت کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو میں انھیں 'غیر معمولی' انسان کہوں گی۔ اُن کا اسٹائل اور اندازِ زندگی جداگانہ و منفرد تھا۔

ان کا والہانہ انداز محبت، ہر دم تر و تازہ، زندگی سے بھرپور انداز، بڑے بڑے خطرات و مسائل کا ہنس کر مقابلہ کرنا اس طرح کہ دوسرے کو ان کی پریشانی یا تکلیف کا احساس تک نہ ہو، کسی کی مصیبت کو حل کرنے کے لیے سب سے پہلے پہنچنا اور میرے تمام مسائل کو ایک سائبان بن کر اپنا لینا، مجھے ہمیشہ ہر کام و فکر سے آزاد کر کے ہنسانے کی کوشش کرنا اور ایسی بے شمار باتیں یاد کر کے آنسوؤں و آہوں کے طوفان کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے اس دنیا سے جانے کا صدمہ جاں گسل بیان سے باہر ہے اور میری تمام خوشیوں و امنگوں کا خاتمہ ہے۔ بدقسمتی سے میرا اور ان کا ساتھ مختصر رہا مگر یہ چند قیمتی سال ہی میری زندگی کا حاصل ہیں... !!

سید سلیم عباس نے علی پور سیداں (بھیرہ) ضلع سرگودھا کے ایک بہت معزز سید گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد کی دورانِ ملازمت ٹرانسفر کی وجہ سے ان کی پیدائش دینہ ضلع جہلم میں ہوئی۔ اکلوتا ہونے کے باعث، 'چھیمو' (سلیم) بہت ناز و نعم میں پلے، مگر اس وجہ سے تنہائی شروع سے ہی اُن کی ساتھی بنی۔ ان کے والد، سید عباس علی شاہ (کنگ عباس)، سرگودھا کے مشہور، دلیر، بارعب اعلیٰ پولیس افسر تھے۔ بہادری و شجاعت شاہینوں کی اس سرزمین، اور خصوصاً اس گھرانے کا ٹریڈ مارک تھی۔ انھوں نے گورڈن کالج راولپنڈی سے گریجویشن کی، اُن کی کالج لائف دوستوں کے گروپ کے ساتھ شوخیوں اور شرارتوں پر مبنی مہم جوئی کے واقعات سے پر تھی۔ یہ دن وہ ہمیشہ اپنے یادگار دنوں کے طور پہ یاد کرتے جبکہ وہ ہر فکر سے آزاد تھے۔ انکے اندر کا یہ شوخ و زندہ دل 'سلیم' جسے وطن کی محبت و گھریلو حالات نے جنگ و جدل کی راہ پر ڈال دیا تھا ہمیشہ زندہ رہا۔ میں جب بھی پنڈی جاتی تو دیکھتی کہ یہ سب دوست آپس میں مل بیٹھتے اور بالکل کالج کے لڑکوں کی طرح وہ ہلا گلا کرتے کے سماں برپا ہو جاتا، مگر شائستگی کے حدود کے اندر۔ میں انھیں اسطرح لڑکپن کے دنوں میں جاتا دیکھ کر بڑی حیران ہوتی۔

خدا نے انھیں انتہائی وجیہہ، اسمارٹ اور سحر انگیز شخصیت سے نوازا تھا۔ دراز قد و قامت، چہرے سے پھوٹتی سرخی، زندہ دلی و خوش مزاجی، اوپر سے باذوق لباس، مہذب و بے اختیار مسکراہٹ بکھیر دینے والی گفتگو۔ یہ خوبیاں ہر کسی کو ان کی طرف کھینچ لیتیں۔ اسی لیے وہ پارٹیز کی جان اور One Man Show کہلاتے مگر ساتھ ہی ان کے ذہن میں یہ بات بھی شروع سے ہی نقش تھی کہ:

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

ابھی وہ بیس سال کی عمر میں نوجوانی اور بے فکری کے دن گزار رہے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت ان کے آخری الفاظ یہ تھے، ''مجھے مرنے کا غم نہیں مگر دکھ اس بات کا ہے کہ میں اپنے بیٹے کے سہرے نہ دیکھ سکا.....!'' ان الفاظ کا ان کی ضدی اور حساس طبیعت نے بڑا اثر لیا اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ جب والد کی حسرت ہی پوری نہ ہوسکی تو وہ اب شادی نہیں کریں گے۔ مگر والدہ کی تنہائی اور بے حد اصرار کے پیشِ نظر، آخر ایک دن والدہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اس افسوسناک خانہ بربادی کا احوال اور بالآخر اختتام، سلیم صاحب جانباز میں بیان کر چکے ہیں۔

خانگی زندگی کے اس اُلٹ پھیر نے اس انسان کی زندگی، جسے خدا نے ہر چیز سے نوازا تھا، تلخیوں اور دکھوں سے بھر دی۔ اس کے اثرات درخت کی جڑوں کی طرح ان کی ساری زندگی میں پھیلتے چلے گئے۔ ایک تلخ خانگی زندگی کے آغاز اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کی شکست سے سلگتے ہوئے کسی کربناک وقت، جب ایک انگریز افسر نے دورانِ ملازمت ان سے طنزیہ کہا، "If your soldiers had only spitted on the faces of your enemy, the defeat would not have been so disgracing" (تم پاکستانی ۱۹۷۱ کی جنگ میں ہتھیار ڈالتے ہوئے اتنا بھی نہ کر سکے دشمن کے منہ پر تھوک ہی پھینک دیتے۔'') تو اس جوشیلے جوان سے یہ توہین برداشت نہ ہوئی۔ انھوں نے اس افسر کو تو منہ توڑ جواب دیا ہی، ساتھ ہی ملازمت سے فوری استعفیٰ دے کر سیدھے آرمی کے ایک حساس ادارے کے دفتر پہنچے۔ وہاں انھوں نے دشمن ملک جا کر اس کے دانت کھٹے کرنے اور تضحیک کا بدلہ لینے کے لیے اپنے آپ کو والنٹیئر کیا۔ بہت جلد فوجی ٹریننگ مکمل کر کے، ساری کشتیاں جلا کر باڈر کراس کر گئے۔ وہاں انھوں نے اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کر، پانچ مجاہدین کی مختصر 'فوج' کے ساتھ دشمن ملک کو بھاری نقصان پہنچایا اور اس کی جاسوسی ایجنسیوں کو تگنی کا ناچ نچا دیا۔ اور وہ وہ کارنامے انجام دیے کہ عقل دنگ رہ جائے اور بے اختیار انھیں سیلوٹ کرنے کو دل چاہے۔ اس مہم کے دوران کئی کٹھن مراحل آئے، موت کئی بار چھو کر گزری مگر وطن کی محبت سے سرشار اس مجاہد نے ہر قدم پر خدا کی مدد پر بھروسے اور اپنی ہمت و ذہانت سے کامیابی حاصل کی۔ اپنے مشن کے دوران وہ اپنے ایک مخبر ساتھی کی وجہ سے گرفتار ہوئے، اور دشمن ملٹری ہیڈ کوارٹر میں زیرِ حراست بدترین ٹارچرز کا شکار ہوئے۔ ملکی رازوں کے دفاع کی خاطر بجلی کے شاک، برف کی سلیں، پسے ہوئے شیشوں کی خوراک اور جانے کیا کچھ برداشت

کیا مگر زبان نہ کھولی۔ حوصلہ ہارنا یا شکست کھانا انھوں نے سیکھا نہ تھا۔ خدا سے دعائیں مانگ کر، اس کی ذات پہ بھروسہ کر کے ایک سنگین خطرہ مول لیا اور دو گارڈز کو بجلی کی سی تیزی سے ہلاک کر کے وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ جو ایک ریکارڈ ہے کہ ''یہ پہلا شخص ہے جو ملٹری ہیڈ کوارٹر کے اندر سخت پہرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔'' ٹارچر اور فرار کی وجہ سے وہ شدید زخمی ہوئے۔ روپوشی کے باعث صحیح علاج بھی ممکن نہ تھا لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے مشن جاری رکھے۔ وہ پہلے سے بڑی کامیابیاں حاصل کرتے گئے۔ ملکی محاذ پر تو وہ پے در پے کامیابیاں حاصل کرتے جا رہے تھے مگر گھریلو محاذ پر بری طرح ناکامیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ اپنے سینے پر کامیابیوں کے ساتھ ہزاروں زخموں و قربانیوں کے تمغے سجائے جب وہ غازی بن کر اپنے وطن لوٹے تو کچھ افسرانِ بالا کی غلط فہمیوں اور گھریلو زندگی کے بکھرتے شیرازے نے ان کی روح پر بھی کئی زخم لگا دیئے۔ مگر وہ اپنوں و غیروں کے ستم نظر انداز کر کے، ہر درد و تکلیف کا مسکراتے ہوئے بہادری سے مقابلہ کرتے رہے۔ مجھے یاد ہے اُنھوں نے بتایا کہ جب وہ واپس آئے اور اپنے ادارے میں رپورٹ کی تو ایک جنرل نے کہا 'اب تم دشمن ملک کے بارے میں اتنا جان گئے ہو کہ اب وہاں کام کرنے کے لیے تم سے بہتر کوئی اور نہیں۔ تمھیں ایک بار پھر وہاں جانا ہوگا۔'

انھوں نے کہا، ''سر! مگر وہاں پر میرے "Wanted Alive or Dead" (زندہ یا مردہ درکار ہے) کے پوسٹرز لگے ہوئے ہیں۔ میں تو وہاں جاتے ہی دھر لیا جاؤں گا، پھر میں وہاں کیا کر سکوں گا؟

جنرل صاحب نے کہا " You will have to go, this is my order! (تمہیں وہاں جانا ہوگا یہ میرا حکم ہے)۔

سلیم صاحب کبھی وطن سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے زچ ہو کر بے خوفی سے جواب دیا: "Right orders, but once I cross the border, then I will decide for which country, I Sir !, I obey going to work." am (''سر! میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا، مگر ایک دفعہ سرحد کے پار جانے کے بعد، پھر میں فیصلہ کروں گا کہ مجھے کس ملک کے لیے کام کرنا ہے۔'')

یہ جواب سن کر جنرل صاحب ششدر رہ گئے، اُنہوں نے غصے و حیرت سے میز پر ایسے ہاتھ مارے کے کوئی بٹن دب گیا اور خطرے کے الارم بجنے لگے۔ اس پہ جنرل صاحب مزید حواس باختہ ہوئے اور میز پر رکھی چائے کی پیالی بھی اُن پر الٹ گئی۔ جنرل صاحب کو اپنی وردی کے داغ دھونے پڑے اور سلیم صاحب کو وقتی طور پر اپنی ملازمت سے ہاتھ۔ انہیں میڈیکل گراونڈز پر رخصت لینی پڑی۔

کچھ عرصہ بعد وہ اپنے دوست کی خاطر پرخطر و دلچسپ مہم پر روانہ ہوئے جس کا ذکر 'جانباز'

اول میں ہے۔ وہ ہمیشہ سے دوست نواز تھے، دیکھئے کہ دوستی کے لازوال رشتے کی خاطر اُنہوں نے کن خطرات سے گزر کر کامیابی حاصل کی، وہ بھی بغیر کسی صلے و تمنا کے۔

معاشی ضروریات انھیں سنگا پور اور سعودی عرب لے گئیں جہاں وہ سترہ سال رہے۔ خانگی زندگی کی خوشیوں سے محروم وہ زندگی کا بیشتر وقت تنہا ہوٹلوں میں گزارنے پر مجبور رہے۔ سلیم منزل جو کبھی والدین کی محبتوں سے ایک جنت تھی، اب نفرتوں کے آسیب سے کھنڈرات میں بدل رہی تھی۔ ان کی والدہ جو ان سے بے لوث محبت کرنے والی واحد ہستی تھیں، ۱۹۹۴ میں وہ بھی علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ بیماری کے دوران انھوں نے والدہ کی دن رات خدمت کی اور ان کی بے شمار دعائیں لیں۔ وہ پھر تنہا ہو گئے۔ کئی گھنی زلفوں اور پری چہروں نے انہیں اپنا اسیر کرنا چاہا، مگر ایک بار ڈسے جانے کے بعد کوئی چہرہ یا شخصیت انھیں متاثر نہ کر سکی۔ انہیں اپنے تصور میں بسے اس نسوانی ہیولے کی تلاش تھی، جسکا عکس وہ مستقبل کے طلسمی آئینے میں بھی دیکھ چکے تھے۔۔! اسے پانے تک تنہا ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔

بیرونِ ملک بھی وہ پاکستان کے لیے اپنے فرائض سے غافل نہ ہوئے۔ اور وطن دشمنوں کے خلاف لڑتے رہے، جنکا ذکر جانباز دوئم میں ہے۔ پاکستان واپس آ کر وہ اینٹی نارکوٹک فورس سے منسلک ہو گئے۔ بڑے بڑے ڈرگ اسمگلروں کو قانون و قلم کے ذریعے بے نقاب کرتے رہے۔ جس سے باز رکھنے کے لیے انھیں پر کشش پیشکشیں بھی ہوئیں اور ان کی سیکیورٹی کو خطرات بھی لاحق ہوئے مگر ملکی سلامتی کے لیے انھیں مرنا قبول تھا کوئی سودہ بازی منظور نہیں۔

زندگی کے آخری برسوں میں انھوں نے پاکستان کے لیے اپنے مشن کے بارے میں لکھنے کا فیصلہ کیا تا کہ نئی نسل کو کچھ حوصلہ ملے۔ اس آپ بیتی ''غازی'' کو لکھتے ہوئے ان کے وہ تمام زخم ہرے ہو گئے جو وہ اب تک اپنے جسم و جان پہ خاموشی سے سہتے چلے جا رہے تھے۔ وہ تنہائی اور احساسِ محرومی کی آگ میں سلگنے لگے۔ ایک بار پھر انھوں نے کمزور پڑ کر یونہی بے بسی کی زندگی گزارنے کے بجائے ایک نئے عزم سے ملک کے لیے جان دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ ملکی بقاء کی خاطر ایک خودکش مہم کے لیے کمر بستہ ہو گئے ....! لیکن خدا کو اس خوبصورت، باہمت و صابر انسان کو دنیا سے یوں ہی تشنہ کام بلانا منظور نہ تھا۔ اس وقت جبکہ وہ اپنے طور پر زندگی کی تمام خوشیوں سے منہ موڑ کر اپنا سامانِ زیست لپیٹ چکے تھے، اور میں بحیثیت سرجن اپنے پروفیشن میں اس قدر محو ہو چکی تھی کہ گھر بسانے کا خیال ہی دل سے نکل چکا تھا، قدرت نے ہمیں ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا.....!! بقول ان کے وہ مجھے دیکھتے ہی ٹھٹھک گئے کہ یہی تو وہ چہرہ، وہ ہیولا ہے جس کی تلاش میں وہ بھٹک کر مایوس ہو چکے تھے..!! چنانچہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر انھوں نے میرے والدین کو رضامند کیا۔ میری روح کو بھی شاید انہی کی تلاش تھی جو میں بھی اتنا عرصہ شادی سے گریزاں رہی۔ بس چند دنوں میں جیسے ایک غیر مرئی طاقت نے ہمیں

ایک دوسرے کے سامنے لاکر باعزت طریقے سے شادی کے بندھن میں باندھ دیا...! ہماری شادی میں ان کے پرستاروں کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ اپنے محبوب غازی کو نئی زندگی ملتے دیکھ کر بہت مسرور تھے۔ حالانکہ خوش نصیبی تو میری تھی کہ ایک غیر معمولی عظیم انسان نے بھری دنیا میں مجھے ہی اپنے خوابوں کی تعبیر جانا اور مجھے اتنا سراہا، جس کے شاید میں قابل بھی نہیں۔ مجھے آج بھی فخر ہے کہ مجھے اس قابلِ فخر مجاہد اور منفرد انسان کی شریکِ حیات بنی۔ درحقیقت یہ دو روحوں کا ملاپ تھا....!! جسے مادی و خاکی دنیا کے مسائل، کھوٹ کھپٹ راس نہ آیا۔! میری دعاء ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہماری روحوں کا ابدی ساتھ اگلے جہان میں ضرور ہو گا۔ انشاء اللہ !۔

'غازی' پڑھنے کی وجہ سے شادی کے وقت میں ان کی حد درجہ بے خوفی، "quick-at-trigger" ہونے، وغیرہ سے خائف تھی مگر شادی کے بعد ان کا اصل Soft اور Jolly روپ دیکھ کر حیران بھی ہوتی اور بہت خوش بھی۔ بظاہر چٹان کی طرح سخت، اور فولادی اعصاب کے مالک اس شخص کے اندر سے ایک بہت ہی نازک، حساس، محبت سے لبریز دل تھا، جو ذرا سی محبت و خلوص سے موم کی طرح پگھل جاتا اور اپنا سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار ہو جاتا۔ انہوں نے بتایا کہ بڑی سے بڑی مصیبت میں ان کی آنکھوں سے کبھی آنسو نہیں بہے اور وہ اب فراز کے شعر والی کیفیت پہ پہنچ گئے تھے کہ:

ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

شادی کے کئی دنوں بعد تک ان کی حالت ایسی تھی جیسے زندگی کی امنگوں و جذبات سے بھرے دل پر مدتوں سے رکھا کوئی بند ٹوٹ گیا ہو۔ برسوں سے دل کے گوشے میں چھپے بچپن کے واقعات، کالج کے دنوں کی شوخیاں، چھوٹے چھوٹے واقعات و لطائف سنا سنا کر خوش ہوتے۔ کئی دفعہ کوئی بات سناتے ہوئے دوسروں کے دکھ محسوس کر کے آبدیدہ ہو جاتے۔ خاص طور پر پاکستان اور اس کے شہیدوں کے ذکر سے۔ پہلی بار آبدیدہ ہوتے ہوئے میں نے انھیں ایک بھارتی کرنل کا راز سناتے ہوئے دیکھا، جو وہ اب تک دل میں چھپائے بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ ایک بھارتی کرنل (جس کا ذکر 'غازی' میں ہے) کو لاہور کی ایک لڑکی 'شیلا' سے عشق تھا، ہند و پاک کی تقسیم کے نتیجے میں حائل سرحد نے اُنہیں ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ کرنل شنکر شیلا کو نہ بھلا سکا اور ساری عمر شادی نہ کی۔ اس غم کو وہ شراب کے ذریعہ بھلانے کی کوشش کرتا۔ سلیم صاحب اس سے بحیثیت جاسوس پنجاب کے ایک ہندو ''ونود'' کے نام سے ملے تھے۔ ان کی دلکش شخصیت، لاہور کی نسبت اور اُن کی جاسوسی کی آڑ میں ہمدردی کی وجہ سے کرنل سلیم کو بے حد پسند کرنے لگا، شراب کے نشے میں اکثر وہ ان کے سامنے اپنے راز دل کھول دیتا۔ ایک دن اُس نے غم میں ڈوب کر آنسوؤں کے ساتھ بتایا کہ ۱۹۶۵ء جنگ میں اُسے لاہور پر

بمباری کرنے کا حکم ملا، مگر اُس نے کسی طریقے سے اس حکم بجا آوری سے گریز کرلیا۔ کرنل نے کہا،

"جانتے ہو میں نے ایسا کیوں کیا؟ جس دھرتی پہ شیلا کے پاؤں پڑتے ہوں، میں وہاں بمباری نہیں کرسکتا تھا.....!!"

کرنل کو آخر میں احساس ہوگیا تھا کہ 'ونود' شاید ایک پاکستانی جاسوس ہے، مگر سلیم صاحب سے اُنیست اور شیلا کا ہمراز ہوجانے کی وجہ سے اُس نے ونود (سلیم) کو چپکے سے نکل جانے دیا۔

میں ان کا اصل Happy-Go-Lucky روپ دیکھ کے حیران ہوتی اور کہتی کہ مجھے یقین نہیں آتا، آپ جیسا موم دل، رومانٹک سا انسان گولی کیسے چلا لیتا ہے؟ وہ مجھ سے بھی زیادہ حیران ہوکر کہتے کہ انھیں یقین نہیں آتا کہ ایک نازک سی ڈرپوک لڑکی چیڑ پھاڑ (آپریشن) کیسے کرلیتی ہے ؟

موت سے کئی بار آنکھ مچولی کے بعد وہ زندگی کے ہر لمحہ کے قدر دان تھے، چھوٹی چھوٹی خوشیاں تلاش کر کے خوش رہتے اور مجھے بھی ایسے ہی کرنے کو کہتے۔ ان کو کبھی کسی نے پژمردہ یا منہ لٹکائے بیٹھا نہیں دیکھا۔ انہوں نے میرے ساتھ نئی رنگ وخوشبو کی دنیا سے لطف اندوز کے لئے کبھی اپنے آرام وسکون کی پرواہ نہ کی۔ اُنکی اسپرٹ اور دل بالکل نوجوانوں کا سا تھا۔ ہمیشہ چاق و چوبند نظر آتے۔ گھر میں ملازم ہونے کے باوجود وہ اپنے کچھ ذاتی کام خود ہی کرتے۔ اپنے جوتے آخری دن بھی خود ہی پالش کیے۔ مجھ سے بھی خدمت نہ لیتے۔ کبھی مجھے کوئی معمولی سا کام کرنے کا اگر مجھے موقعہ مل بھی جاتا تو کئی بار تھینک یو مائی ڈیئر ، "God bless you" کہتے رہتے۔ آخری وقت تک وہ ایسے ہی active رہے۔

خطروں میں کودنا اور جان جوکھوں میں ڈالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل اور مشغلہ تھا۔ کئی بار موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نکل جانے سے ان میں موت کا خوف ختم ہوچکا تھا۔ کہتے ہیں سب موت کا خوف دل سے نکل جائے تو پھر کسی چیز کا خوف نہیں رہتا، سوائے خوفِ خدا کے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خوف یا ناممکن جیسے الفاظ سے نا آشنا تھے، اور بظاہر ناممکن صورت حال میں بھی پر امید رہتے اور ذرا ہراساں نہ ہوتے۔ انکا عزم اتنا نا قابل تسخیر ہوتا کہ جیسے :

اے جذبہء دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے۔۔۔!

اُن کے مشنوں کے دوران ان کے بڑے بڑے ناممکن ٹارگٹ حاصل کرنے کے عزم و امید کو دیکھ کر انھیں ان کے افسران "A man with indestructible optimism" (نا قابلِ تسخیر حد تک پرامید انسان) کہتے۔ یہ رجائیت، دلیری، اور زندہ دلی ان کے چہرے کی سرخی، اعتماد اور لہجے سے پھوٹتی تھی اور ان سے ملنے والے ایک ڈرپوک انسان میں بھی حوصلہ و امید پیدا کر دیتیں۔ ان کی موجودگی زندگی کا پتہ دیتی۔ اپنی زندگی پہ چھائی لمبی خزاں کے باوجود جس محفل میں سلیم آتے ، بہار آجاتی..! اب یہ بہاریں انکو ڈھونڈتی ہیں......!!

میرے لیے وہ نہ صرف ایک انتہائی محبت کرنے والے شوہر تھے بلکہ ایک مخلص، دانا دوست محافظ و رہنما بھی۔ ان کے ساتھ چلتے ہوئے میں آنکھ بند کر کے بھی چلتی تو فکر نہ ہوتی۔ کئی دفعہ دروازے پہ کال بیل بجنے پر میں پوچھتی کون ہے؟ تو وہ ہنس کر جواب دیتے 'گورکھا! (گارڈ)۔ میرے گھر اور باہر کے تمام مسائل کو وہ اپنے اوپر اوڑھ لیتے۔ مجھے ذرا سے نقصان پہچانے والے سے بڑے جارحانہ انداز میں نمٹتے۔ مجھے لگتا اُن کے بغیر میں اب یک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ اب اُن کے بغیر یہ زندگی کیسے کٹ سکے گی؟ لیکن مجھے لگتا ہے اُنکے وعدے کے مطابق ان کا سایہ اب بھی میرے ساتھ ساتھ ہے......!!

انکے تجربے اور عملی اقدامات سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ میں اپنے پیشے کے خول میں بند تھی اور سرجن ہونے کے باوجود دنیاوی معاملات میں کافی نا بلد اور بزدل۔ اُنہوں نے مجھے بہادر بنایا، زندگی کی رعنائیوں و رنگینیوں سے روشناس کروایا، جن سے میں قریباً ناواقف تھی اور وہ اُن کو فراموش کرچکے تھے۔ انکے ساتھ بیتے سال زندگی کو جاننے ، بھرپور طریقے پر گزارنے اور خوشگوار یادوں سے پر، سنہری سال ہیں۔ زندگی کے ہر خوشگوار لمحے کو وہ کیمرے میں محفوظ کرنا نہ بھولتے۔ یہ یادگار لمحے درجنوں البمز (Albums) کی صورت میں میرے پاس محفوظ ہیں، مگر مجھ میں اب انھیں دیکھنے کی تاب نہیں۔ دیکھتے ہی ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں....!!

میرے تمام رشتہ داروں کے ساتھ ان کا رویہ بہت مہذب ، شائستہ اور رکھ رکھاؤ والا تھا. جس سے بھی ملتے اس کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھیرے بغیر نہ جاتے۔ اگر کسی مسئلے کی انھیں بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ فوراً اس میں کود پڑتے اور منٹوں میں پرابلم کا قلع قمع کر کے مسکراتے ہوئے آجاتے۔ اپنی خوش مزاجی و خوش خلقی سے انھوں نے ہم سب کے دل موہ لیے، اور بہت جلد ہماری فیملی کے ایک اہم، ہردل عزیز ممبر بن گئے۔ کوئی بھی چاہے، وہ ایک بار ہی ان سے ملا ہو، ان کی تعریف کئے بغیر نہ رہ پاتا۔ جب ہم لوگ ان کی محبت و اخلاق کی تعریف کرتے تو وہ کہتے "خدا نے مجھ پر کتنا کرم کیا کہ اب مجھے نہ صرف اچھی بیوی دے دی بلکہ پوری ایک فیملی عطا کردی جس کے لیے میں کب سے ترستا رہا تھا۔" آج ان کی محبت، خلوص اخلاق اور منفرد شخصیت کو یاد کر کے میں تو انتہائی رنجیدہ وشکستہ ہوں ہی، اس کے ساتھ ہمارے گھر کے ہر فرد کی آنکھ ان کو یاد کر کے نم ہوجاتی ہے۔ خاندان کے ایک اہم، ہنس مکھ، زندہ دل ،دلیر انسان کے چلے جانے سے ایسا خلاء پیدا ہوگیا ہے جو کبھی پُر نہیں ہوسکتا.....!!

ہو حلقہ یاراں تو ابریشم کی طرح نرم

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

سلیم صاحب کی زندگی میں نظم وضبط، سلیقہ وقرینہ بلا کا تھا۔ ان کی سوچ بڑی واضح ہوتی۔ کسی چیز کے بارے میں ابہام یا کنفیوژن نہ رکھتے ۔ زندگی کے بیشتر معمولات مثلاً دوست، دشمن، گھر،

پیشہ وغیرہ کو انھوں نے ملکی سرحدوں کی طرح واضح لکیروں سے دو، اِدھر یا اُدھر کے حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ان کا ہینڈ بیگ جو وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے، وہ بھی دو الگ خانوں میں تقسیم تھا۔ دشمنوں کی 'تواضع' کا سامان ایک خانے میں اور دوستوں کی تفریح طبع کا سامان دوسرے خانے میں۔۔! آپ حیران ہوں گے کہ دوستوں کے خانے میں علاوہ اور چیزوں کے چند پٹاخے اور جادوئی کمالات کی چیزیں بھی شامل تھیں .... !! انکی شخصیت گویا گلاب و بارود کا انوکھا امتزاج تھی ، اور اس میں ایک mesmerizing رعب و دبدبہ تھا۔ دشمنوں کے ساتھ سخت، درشت، بیباک و بے لحاظ ہوتے۔ اپنوں اور دوستوں کے ساتھ ان کا رویہ بیحد نرم، شائستہ، مہذب، شفیق اور درگزر کرنے والا ہوتا۔ دشمن کی راہ میں کانٹے بچھادیتے اور دوستوں کی راہ سے کانٹے چن لیتے۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ، صاف دکھری بات تو منہ پر کہہ جاتے مگر دل دکھانے والے طنزیہ نشتر نہ لگاتے۔ میں نے آج تک ان کو کسی کا دل توڑنے والے یا مایوس کرنے والے الفاظ کہتے نہیں سنا۔ اپنے پیشے میں وہ ایک جفاکش سپاہی ہوتے۔ عقابی نظریں رکھنا، دشمن کی بو پاتے ہی چوکس ہو کر اسلحہ پر گرفت مضبوط کر لینا اور دشمن پر شاہین کی طرح لپک کر جھپٹنا اور آخری کمین گاہ تک اسکا پیچھا کرنا اور اپنا ہدف پورا کرنا ان کا مخصوص اسٹائل تھا۔ پسٹل نکالنے، اسے کاک کرنے اور فائر کرنے تک وہ صرف دو منٹ لیتے۔ !!

مجھے ان کے کسی انداز سے پتہ نہ چل پاتا کہ وہ کسی خطرناک مہم پہ جا رہے ہیں۔ ہمیشہ بعد میں، اگر وہ بتاتے، تو مجھے پتہ چلتا کس خطرے سے نکل آئے ہیں۔ اس وقت ، مجھے بالکل جیمز بانڈ کی طرح لگتے جو بڑی سے بڑی خطرناک مہم کے بعد ہنستے ہوئے ریوالور کی نال پھونک مار کر صاف کرتے ہوئے آ جاتا ہے۔ وہ کسی کام کو ناممکن نہیں سمجھتے، اپنے دوستوں میں وہ "A man who can do impossible" (ناممکن کام کرسکنے والا) مشہور تھے ۔ وہ کسی آنے والے کو مایوس نہ کرتے اور مصیبت زدہ کی مدد کرنے ہمہ وقت تیار رہتے۔

ان کی زندگی کا ایک اور چھپا ہوا پہلو ان کا فنونِ لطیفہ کا اعلیٰ ذوق اور اس کو محسوس کرنے والا حساس دل تھا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کے انھوں نے خود ڈوکومینٹری فلمز بھی بنائیں اور دو فلموں میں کام بھی کیا۔ اچھی موسیقی، فلم، شعر وادب کے دلدادہ تھے۔ان کے پاس بہترین کلاسک فلمز اور گانوں کا وسیع کلیکشن تھا جن میں سے بیشتر ان کی خود ریکارڈ کی ہوئی تھیں۔ انکے مشاہدے کا حیران کن اندازہ مجھے ان کے ساتھ ایسی یادگار فلمیں دیکھتے ہوئے بھی ہوتا۔ سیکنڈوں میں گزرنی والی گاڑی کا ، وردی کا نمبر وغیرہ نوٹ کر لیتے۔ نیم کلاسیکی موسیقی اور آرکیسٹرا کی باریکیوں کو سمجھتے اور بہت محظوظ ہوتے۔ انیل بسواس، نوشاد وغیرہ کی شاندار موسیقی اور طلعت محمود کی غزلوں سے مجھے روشناس انھوں نے ہی کروایا۔ میں ان سے مذاق میں کہا کرتی، ' اگر آپکا ساتھ مجھے نہ ملتا تو دو بڑے نقصان ہوتے

ایک تو میرے کان 1940-1960ء کی اتنی اعلیٰ موسیقی، ایسے مدھر گانے سننے سے محروم رہ جاتے، اور دوسرا مجھے پستول کا صحیح وزن نہ پتہ چلتا۔!(پہلی مرتبہ جب انکا پستول میں نے کھلونا سمجھ کر اٹھایا تو اس کے غیر متوقع وزن سے میں دھڑام نیچے آ رہی..!)۔ انکے پاس انتہائی مدھر اور رسیلی موسیقی و گانوں کا عمدہ کلیکشن تھا، جو اب میرے لئے اشکبار کر دینے والی انکی باتوں و یادوں کا خزینہ ہیں...!! خوشبویات ان کی کمزوری تھی۔ مختلف قسم کی نفیس خوشبیات استعمال کئے بغیر وہ اپنے آپ کو مکمل نہ سمجھتے۔ آج بھی ان کی مخصوص خوشبو انکی چیزوں میں بسی ہے اور انکی موجودگی کا احساس دلاتی ہے ....!!!

ان کی مذہبی معلومات بھی کافی متاثر کن تھیں۔ خدا کی ذات پہ، اس کی رحمت پہ غیر متزلزل، کامل یقین رکھتے۔ ہر حال میں صبر وشکر کا دامن تھامے رہتے ۔''مایوسی کفر ہے'' پر اتنی سختی سے کاربند ہوتے میں نے انہی کو دیکھا۔ وہ روز آنہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہو کر، اس خشوع و خضوع، عاجزی سے عبادت کرتے ، اور گڑگڑا کر خدا سے عربی اور اپنی سادہ منظوم زبان میں دعائیں مانگتے کہ سُننے والے پر بھی رقت طاری ہو جاتی۔ اکثر وہ آدھی رات کو بھی اٹھ کر بڑے اہتمام سے کھلے آسمان تلے نفلیں پڑھتے اور دعائیں مانگتے۔ حضرت علیؓ کی دلیری سے بہت متاثر تھے اور ایسی ہی دلیری ان کی زندگی کا نصب العین تھی۔

وہ اپنی دعاؤں میں منافقوں سے محفوظ رہنے کی دعا بھی مانگتے۔ خود بھی (سوائے بحیثیت جاسوس اپنے پیشے کے دوران) منافقت سے کبھی کام نہ لیتے بڑے سے بڑے وزیر یا سفیر کے سامنے صاف گوئی سے حق بات کہتے نہ ڈرتے۔ سلیم صاحب موجودہ (پرویز مشرف) حکومت کے حامی تھے اور پرویز مشرف صاحب کو وطن محبت اور نڈر فیصلوں میں بالکل اپنا ہم خیال سمجھتے تھے مگر کچھ معاملات پر انکی گرفت کو اور مظبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ حال ہی میں جب وہ اسلام آباد گئے تو اُنہوں نے بتایا کہ ایک اعلیٰ فوجی افسر جو اُن کے خیالات سے واقف تھا اور توقع کرتا تھا کہ وہ حکومت کی تعریف میں ضرور کچھ کہیں گے، اُس نے پوچھا، ''آپ کا موجودہ حکومت کے بارے میں کیا comment (تبصرہ) ہے؟''

سلیم صاحب نے حسب معمول بلا جھجک کہہ دیا:

"Sir ! It is an Impotent Martial Law."

فوجی افسر اس غیر متوقع جواب سے چونکا، مگر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

انھیں دنیا کی نظروں میں پارسا نظر آنے کا کوئی شوق نہ تھا، ہر کام اپنے ضمیر کے مطابق کرتے۔ پیشہ ور گداگروں ، دھوکہ بازوں سے سختی سے نمٹتے، مگر کوئی مستحق ضرورت مند آ جاتا تو اپنے بٹوے میں موجود آخری نوٹ بھی دے دیتے۔ ایک دفعہ میں اُن کے ساتھ زیب النساء اسٹریٹ پر جا رہی تھی کہ ایک باریش بزرگ اُن سے بے اختیار لپٹ کر رونے لگے اور اُن کے ہاتھ چومنے لگے۔ سلیم صاحب کو پہچاننے میں مشکل ہوئی تو اُسی نے بتایا ''صاب آپ کو یاد نہیں کہ کھٹمنڈو میں ہم اپنی بیوی

اور بچیوں کے ساتھ بمشکل دشمنوں سے آبرو بچائے تنگدستی کے ساتھ محصور تھے۔ ہمارے ساتھ ہزارہا ایسے لوگ تھے۔ آپ نے میری اور مجھ جیسے ہزاروں لوگوں کی مالی مدد بھی کی اور ہمیں فیملی کے ساتھ باعزت طور پر پاکستان پہنچانے کا انتظام بھی کیا۔ آپ کا ہم سب پر بڑا احسان ہے۔ وہ روتا جاتا اور دعائیں دیتا جاتا۔ انکو ایسے دعائیں دیتا دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ رائیگاں نہیں جائیں گی۔

ان کی تعریفیں و خوبیاں بیان کرتے تو شاید الفاظ کم پڑ جائیں مگر بہر حال کوئی انسان کامل نہیں۔ شاید کچھ لوگوں کو ان کے سخت و بیباک رویہ سے یا کسی اور وجہ سے ان سے کوئی شکایت ہو۔ کاش وہ لوگ اس انسان کے باطن میں جھانک سکتے...! آخری ایام میں کئی اداروں و افراد کی جانب سے ان کی حق تلفیاں ہوئیں۔ ان کے جائز حقوق دینے کے لیے بھی لوگ وعدہ فردا و تسلیوں سے کام لیتے رہے۔ اس وجہ سے ان کے معاملات الجھتے رہے اور وہ ذہنی دباؤ معاشی مشکلات کا بھی شکار ہونے لگے۔ مجھے ذاتی طور پر بہت رنج انکی کتاب غازی کے ساتھ ہونے والے سلوک کا تھا، جو انہوں نے خون دل صرف کر کے لکھی۔ اسے اسی 'امت' کے ایک انکے رفیق نے راتوں رات تمام ثمرات سمیٹتے ہوئے، غلطیوں اور تبدیلیوں کے ساتھ شائع کر دی۔ اسے بعد میں انہیں نقصان سہہ کر اصل مجلد شکل میں چھپوانی پڑی۔ خودداری کی وجہ سے وہ ہر حال میں اپنے پاؤں پہ کھڑا رہنا چاہتے تھے۔ اپنے اسٹینڈرڈ سے گرنا انھیں گوارہ نہ تھا۔ بیکار بیٹھنا، کسی کو خوشیاں نہ دے پانا ان کے لیے شکست تھی اور شکست ان کے لیے موت۔ لہذا وہ مجبوراً اپنی صحت و سکون کی پروا نہ کرتے ہوئے کئی رسکی (Risky) اور پیچیدہ کاموں میں ہاتھ ڈال بیٹھے کیونکہ وہ کسی کام کو ناممکن نہ سمجھتے اور کبھی مایوس نہ ہوتے۔ ان پیچیدہ دشوار کاموں میں دوسروں کی کوتاہیوں کی ذمہ داری اپنے اوپر لے بیٹھے بقول شاعر:

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے

میں تو ان کے بہت قریب تھی میری نظر میں وہ ایک فرشتہ صفت انسان تھے جو اپنا درد چھپا کر دوسروں کو خوش کرنا عبادت سمجھتے۔ اپنی تکلیف تھکاوٹ، صحت، و جان کی پرواہ کئے بغیر وہ کسی نہ کسی کٹھن کام کا بیڑہ اٹھائے رکھتے۔ میں اُن سے پوچھتی آخر یہ سب آپ کی حق تلفی کیوں کر رہے ہیں، کوئی آپ کی داد رسی کیوں نہیں کرتا؟ تو وہ اپنا ایک پسندیدہ شعر دہرا دیتے:

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو درد تھے لادوا نہ تھے

موت سے کئی بار آنکھیں چار کرنے کی وجہ سے موت کے بارے میں ان کا یقین تھا کہ جب، جہاں اور جیسے آنی ہے آ کر رہے گی۔ معمولی بیماریوں، زخموں کو خاطر میں نہ لاتے۔ زیادہ بیماری

میں صرف فرسٹ ایڈ کی حد تک علاج کر لیتے، اس کے بعد بیماری کو بھول جاتے۔ پرہیز اور صحت کے اصولوں کو کو مردانگی کے خلاف سمجھتے۔ ان کا ایک دوست ان کے بارے میں کہا کرتا کہ "یہ اپنی زندگی کے ساتھ غنڈہ گردی کرتا ہے۔" وہ بڑی سے بڑی تکلیف کا اظہار نہ کرتے، نہ معمولات میں کوئی فرق آنے دیتے۔ ایک دو گولیاں کھا کر اسی دن بستر سے اٹھ بھاگتے اور بالکل فِٹ فاٹ نظر آنے لگتے۔ میری پریشانی کو ہنس ہنسا کر چٹکیوں میں اڑا دیتے۔ بالآخر میں نے ان کی Will Power (قوت ارادی) کی بالا دستی کی قائل ہو گئی اور سمجھ لیا کہ وہ ان Rare Cases میں سے ہیں جن کے آگے میڈیکل نالج فیل ہو جاتی ہے، اور ہم انہیں "miracles" (معجزات) کہہ سکتے ہیں۔

میری ان کی صحت سے لاپروائی کے بارے میں تشویش سے وہ کبھی برا مناتے، hurt سے ہو جاتے اور کبھی سخت جھاڑ بھی پڑ جاتی۔ کبھی مذاق بناتے کہ "لیڈی ڈاکٹر سے شادی کرنے کا یہ بڑا نقصان ہے کہ وہ شوہر کو زیادہ ہی غور سے دیکھتی ہے۔ اِدھر شوہر بیچارہ انتہائی رومانٹک موڈ میں کوئی بات شروع کرتا ہے، اُدھر وہ کہہ دیتی ہیں ٹھہریئے..!، آپ کی آنکھیں کچھ پیلی لگ رہی ہیں کہیں آپ کو Jaundice (یرقان) تو نہیں ہو گیا؟ لیجئے جناب سارے رومانس کا بیڑہ غرق۔" وہ ہر حال میں اپنے کو فٹ رکھنا اور سمجھنا چاہتے تھے۔ ان کی خوشی بھی اسی میں تھی کہ انھیں کبھی بیمار سمجھا یا کہا نہ جائے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے

"My dear! if you love me never say I do not look well, always tell me that I am O.K" ۔ بستر پہ پڑ جانا وہ بالکل پسند نہ کرتے اور کہتے 'میں اپنے آپ کو آخری وقت تک فِٹ رکھنا اور سمجھنا چاہتا ہوں، بستر پہ پڑنا میری شکست ہے اور شکست میرے لیے موت۔ "I want to die with my boots on." (میں اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے مرنا چاہتا ہوں)۔ انکی محبت سے مغلوب ہو کر میرا دل چاہتا کہ انہیں انکے پر خطر انداز زندگی میں خوش رہنے دوں، کوئی روک ٹوک نہ کروں، مگر پھر میرا فرض غالب آ جاتا۔ فرض و محبت کی اس کشمکش میں، میں ہاری....! میں نے راہ فرار ڈھونڈ لی اپنے دل کو انکی پر اعتماد تسلیوں سے بہلانے میں کہ سب ٹھیک ہے..... !! پہلی جنوری ۲۰۰۲ کو انہوں نے خود ہی سگریٹ نوشی ترک کرنے کا اعلان کرتے ہوئے مجھے نئے سال کا تحفہ دیا۔ میں خوشی سے پھولے نہ سمائی کہ اب طبی نکتہ نظر سے انکی زندگی کے دس سال بڑھ گئے.... مگر تقدیر کا لکھا کون ٹال سکتا ہے؟ سو الٹی ہو گئیں سب تدبیریں......!!

آخری ایام میں ان کی باتوں کی کڑیاں ملاتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ انھیں اپنی موت کا پہلے سے علم ہو چکا تھا۔ دو ہفتے پہلے باتوں باتوں میں مجھے اپنا خواب سنایا، جس میں اپنے آخری سفر کا اشارہ تھا۔ میں یہ سن کر پریشان ہو گئی تو فوراً ہنس کر بات بدل دی۔ چھٹی حس خطرے کا الارم جیسے ہم

دونوں کے دل و دماغ میں بجا چکی تھی۔ ہمارے اعصاب جھنجھنا چکے تھے، کسی طور دل نہ ٹھہرتا تھا، میں اور وہ خود بھی محسوس کر رہے تھے کہ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، کھانے سے ہاتھ جلد کھینچ لیتے اور روٹین کے کام بھی جیسے جبر کرکے کر رہے ہوں۔ ایسا لگتا کہ وہ ذہنی تناؤ یا تھکاوٹ کا شکار ہیں مگر اُن کے کام اُنہیں ستانے کا موقع نہ دیتے، جب ذرا آرام کرنے کا سوچتے، فون کی گھنٹی بج جاتی، کہیں جانا پڑتا۔

شاید اسی چھٹی حس کے باعث آخری دنوں میں اپنے پرانے پسندیدہ کیسٹس دیکھنے شروع کر دیے، ان کو ترتیب سے رکھنے لگے، تمام دیرینہ دوستوں سے باتیں کیں ان کے چند دوستوں نے مجھے بعد میں بتایا کہ انھوں نے مجھے پریشان کرنے کے خوف سے بتایا نہ تھا مگر سلیم نے ان سے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا 'یار اچھی طرح گلے مل لو پھر پتہ نہیں ملاقات ہو نہ ہو۔' ان کے دوست نے کہا یار تو بھلا چنگا ہے، کیوں ایسی باتیں کرتا ہے۔ تو انھوں نے کہا 'بس یار میرے ابو جان بھی اسی عمر میں فوت ہوئے تھے وہ بھی اپنے آخری سفر پر اپنے قدموں پہ چل کر گئے تھے اور میں بھی انشاءاللہ ایسے ہی جاؤں گا'۔ پاک بھارت ممکنہ جنگ کے پیش نظر اور شہادت کی آرزو کی خاطر، انہوں نے اس وقت بھی اپنے آپ کو جنگ کے لئے والنٹیر کر دیا۔۔!!

میں نے اپنے کیریئر میں بہت پیچیدہ کیس بھی ٹھیک ہوتے دیکھے، خود ایمرجنسی آپریشن میکانکی انداز میں کئے، چاک سینے کے اندر انسانی دل حقیقتاً مٹھی میں لے کر دبایا اور اللہ کے حکم سے موت کے منہ سے واپس آتے دیکھا۔ لیکن سلیم کو کچھ ہونے کے خوف سے ہی میرا دل چوزے برابر ہو جاتا۔ انکی رپورٹس بھی خود پڑھنے کی ہمت نہ پاتی، پہلے کسی اور کو پڑھواتی۔ اب ان کی مضمحل سی طبیعت، بدلے ہوئے رختِ سفر باندھنے والے انداز سے سخت ہراساں ہو رہی تھی۔ میری تو کل کائنات ہی وہ تھے، ان سے بچھڑنے کا تصور ہی میرے لیے روح فرسا اور میری تمام خوشیوں کا خاتمہ تھا۔ اس لیے ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی انجانے خوف سے میرے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے اور ہوش و حواس گم۔ وہ اپنے روٹین کے سب کام کرتے رہے۔ میرے انجانے خوف سے گھبرانے پر ہنس کر تسلی دیتے کہ سب ٹھیک ہے، وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ بس اب یوں لگتا ہے جیسے کسی طاقت نے میری تمام صلاحیتیں سلب کر لی ہوں اور قدرت نے جیسے اپنے اٹل فیصلے کے آگے مجھے غافل، بے دست و پا کر دیا ہو۔۔!!

ایک رات پہلے وہ اپنی خواہش پر مجھے لانگ ڈرائیو پر لے گئے۔ میں بہت اداس اور خاموش تھی۔ گاڑی میں کیسٹ لگا ہوا تھا:

ہمارے بعد اس محفل میں افسانے بیاں ہوں گے
بہاریں ہم کو ڈھونڈیں گی نجانے ہم کہاں ہوں گے

میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ مجھے ہنسانے کی کوششیں کرنے لگے۔ پوچھا تم

اختتامیہ

چپ کیوں ہو؟ میں نے کہا میں آپکی طرف سے فکر مند ہوں، اسپتال چلتے ہیں ایسے ہی چیک اپ لے لئے۔ انھوں نے اپنی مخصوص، پراعتماد، دلیرانہ انداز میں کہا 'میں بالکل ٹھیک ہوں تم بلا وجہ پریشان ہو رہی ہو۔ کہو کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور ہنسو، رویا نہ کرو۔ روئیں تو میری تاریخ اگر لکھی گئی تو اس میں لکھا جائے گا کہ "ایک سپاہی جو کسی کی گولی سے نہیں مرا، وہ اپنی محبوبہ بیوی کے آنسوؤں کے خنجروں سے مر گیا۔۔" میں نے آنسو پوچھ لیے اور انکی مصنوعی ہنسی میں شامل ہوگئی۔۔۔۔۔

آخری دن جب میں اسپتال سے آئی تو حسبِ معمول مسکرا کر ہیلو کہا، میری ساری روداد سنی اور مشورے دیئے۔ پھر پہلی بار انھوں نے کہا کہ ذرا میری نبض تو دیکھیں۔ میں نے جو نبض پہ ہاتھ رکھا تو مجھے جیسے کرنٹ لگ گیا کیونکہ وہ بہت ہی تیز تھی، میں حیران ہوگئی کہ نبض کی اس رفتار کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بظاہر نارمل اور پرسکون کیسے رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے فوراً ان کو اسپتال چلنے کے لیے کہا۔ تھوڑی پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوش لباسی سے تیار ہوئے، فون پر کچھ اپائمنٹ کینسل کیں، حسب معمول جاتے وقت اپنا پسٹل چیک کیا، ملازم کو ہدایات دیں، اور اپنے قدموں پر چلتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے۔ میں ان کو آغا خان اسپتال لے گئی۔

آج بھی میری آنکھوں میں ان کا انتہائی بہادری، اعتماد سے مسکراتے، لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں موت کے بستر کی طرف جانے کا منظر گھوم جاتا ہے۔ میں ڈری ہوئی تو تھی مگر ایک لمحہ کو بھی سوچ نہ سکتی تھی کہ وہ کتنی جلد مجھ سے دُور جانے والے ہیں۔ ایمرجنسی بیڈ پر بھی وہ ہنستے ہوئے ڈاکٹر اور نرسز کو لطیفے سنا رہے تھے۔ ان کا چہرہ تب بھی پر عزم، زندگی سے بھرپور تھا، بلکہ پہلے سے زیادہ گل و گلنار اور کھلتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس سج دھج اور بہادری سے شاید ہی کوئی مریض ایمرجنسی وارڈ گیا ہو۔ ڈاکٹرز بھی ان کے شاداب گلابی چہرے، اعتماد اور بہادری سے شاید دھوکہ کھا گئے۔ اور نہ سمجھ سکے کہ اس مسکراتے، دلیر انسان کے اندر شاید ایک زخموں سے چور، رفو شدہ دل ہو۔ انھوں نے ان کا کیس شاید بہت Lightly لیا اور کہا کہ آپ کو ہارٹ اٹیک نہیں، صرف نبض تیز ہے، ایک انجکشن لگاتے ہیں آپ ٹھیک ہوجائیں گے۔ اس پر ان کو چہرہ خوشی سے اور بھی گلنار اور کھلا ہوا ہو گیا، میں بھی خوش، ہو گئی۔ انھوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا دیکھو رونا نہیں ورنہ میں مر جاؤں گا۔ میں نے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا، میں ایک دلیر مجاہد کی بیوی ہوں نہیں روؤں گی۔ میرے گھر والے بھی پہنچ گئے تھے، وہ بھی ان کو خوش باش باتیں کرتا دیکھ کر خوش و مطمئن ہو گئے۔ سلیم کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے، اس لیے سب کو بہ اصرار ویٹنگ روم میں آرام سے بیٹھنے کو کہا۔ ادھر ڈاکٹر نے ایک انجکشن لگایا ادھر پل بھر میں یہ مسکراتا چہرہ کملا گیا! میں بے بسی سے ہاتھ ملتی رہ گئی، پیروں تلے زمین نکل گئی ..! حواس جاتے رہے۔ ڈاکٹروں نے پردے تان دیئے۔! ایمرجنسی ٹرے و مشینوں کے گھسیٹنے، اور ڈاکٹروں کی آوازوں نے میری ساری ہمت ختم کردی۔ اپنا وعدہ بھول گئی اور رونے لگی۔

میں اپنے پیشے میں ان رسومات کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ مجھے ڈاکٹر ہوتے ہوئے اپنے حواس پر قابو رکھنا چاہیے تھا مگر میری تو دنیا لٹی جا رہی تھی ..!!ان کے اپنے لیے انمول، قیمتی ہونے، ان سے خود بھی بے پناہ محبت کرنے اور اپنی زندگی کا محور سمجھنے کی وجہ سے میری حالت ایک عام گھریلو عورت سے بھی ابتر ہوگئی۔ پریشانی میں کبھی اِدھر جاتی کبھی اُدھر۔ ڈاکٹروں کے ساتھ بات کرتے منہ سے الفاظ نہیں نکلتے تھے، میں کسی طور ان کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں ان کے قریب گئی تو وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اشارے سے کہنے لگے کہ میں بیٹھ جاؤں، انھیں اس تکلیف میں نہ دیکھوں، اور ڈاکٹرز کو یہ سب نہ کرنے دوں انھوں نے پوری قوت جمع کر کے کہا، "Tasneem, I am going to die........."۔

مجھے لگا یہ میرے کانوں کا دھوکہ ہے۔ میرا دل حلق میں آ گیا۔ میں نے روہانسی ہو کر انکا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا، اور روہانسی ہو کر بے بسی سے انکی آنکھوں میں دیکھا جن میں اس وقت بھی حوصلہ اور باطل سے لڑنے کا عزم تھا۔ میں نے انکے ماتھے پر بوسہ دیا اور بھاگ کر ڈاکٹرز کی طرف گئی کہ ان کو ہر قیمت پہ بچائیں۔ پلٹ کر سلیم کے پاس آئی تو وہ بہت دور جا چکے تھے....!!! زندگی سے بھرپور اس دلیر ہر دم پر امید زندہ دل انسان نے ڈرامائی انداز میں ہنستے ہوئے، بہادری کے ساتھ موت کو گلے لگا لیا۔۔۔!میں کچھ نہ کہہ پائی۔ ..! آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا............... !

پل بھر میں میری دنیا اجڑ گئی، سب کچھ چھن گیا۔..!کافی عرصہ مجھے یقین نہ آتا کہ سلیم اب واپس نہیں آئیں گے۔.! میرے ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی ان کا کیس mismanage ہوگیا، اپنی نظر میں اس کوتاہی کے لیے میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ کتنا بے بس ہے انسان!! پچھتاوے میرا پیچھا کرتے رہیں گے۔..!!

اتنا بڑا اسپتال، اتنی بڑی میڈیکل ٹیم، اتنی مشینیں اور ''مسیحا'' شریکِ سفر مگر پھر بھی آج تک یہ معمہ ہی رہا کہ اُن کی بیماری کیا تھی؟ وجہِ موت کیا بنی، ایک ہنستا بولتا انسان اچانک ایک انجکشن کے بعد بے سدھ کیوں ہوگیا؟ میری جگہ اگر سلیم ہوتے تو وہ اس غفلت یا غلطی کا جو بھی، جہاں بھی ذمہ دار ہوتا، اُسے جا دبوچتے، مگر کتنی پست ہمت ہوں میں! کہ سوچتی ہوں، کس کس کا گریبان پکڑوں، کس کس کے ہاتھ پر اُن کا لہو تلاش کروں؟ ویسے بھی وہ معاشرے کے لگائے زہر کے انجکشن سے شاید پہلے ہی گھائل تھے۔ اُن کے اردگرد بیشتر لوگوں نے جیسے خنجر تان رکھے ہوں، وہ اتنے دلیر و باہمت تھے کہ خنجروں کے سائے سے بھی نکل آتے مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ "You too Brutus!" والا آخری وار کہاں سے کب ہوا کہ اس غازی و جانباز نے اس صدمے سے دنیا سے منہ موڑ لینے کا فیصلہ ہی کرلیا۔!

کاش ہم ان کم یاب، جانباز، خاموش مجاہدوں کی قدر کرنا سیکھ لیں اور اُن کی خدمات و ضروریات کو کبھی فراموش نہ کیا کریں.....!!

جس کی موجودگی سے زندگی بولتی تھی، اس کے اچانک چلے جانے سے ہر شے خاموش لگتی ہے.!!۔ ایسے منفرد خوبصورت و قابلِ فخر انسان کا ساتھ اتنا مختصر ہوگا کبھی سوچا نہ تھا۔ اپنی کم مائیگی کا رہ رہ کر احساس ہوتا ہے۔.!! کاش قدرت مجھے ان کو مزید خوشیاں و راحت دینے، ان کے احسانوں، محبتوں کا بدلہ چکانے کی کچھ اور مہلت دے دیتی۔ کتنے قیمتی لمحوں کو ضائع کر دیتی ہیں غمِ دوراں و غمِ روزگار کی دلفریبیاں...!!

میری تو دنیا اجڑ ہی گئی مگر پاکستان بھی ایک سچے محبِ وطن اور دشمن کو للکارنے والے بہادر مجاہد سے محروم ہوگیا..! لیکن وہ حب الوطنی، شجاعت و بہادری کی ایسی داستانیں رقم کر گئے جو انکے قدر دانوں کے دلوں میں انکی یاد ہمیشہ تازہ رکھیں گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ موت ہر ذی روح کا لازمی انجام ہے، کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں، مگر صیادِ اجل جب ایک زندہ دل، ہنس مکھ انسان کو چپکے سے اچانک اُچک کر لے جاتا ہے تو یہ صدمۂ جانکاہ ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے۔ ایسے میں خدا سے شکوہ کرنا تو گناہ ہے مگر زبان پہ غالب کا مصرعہ آ ہی جاتا ہے کہ:

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اتنے دن گزرنے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ سلیم اب کبھی واپس نہیں آئیں گے، میرے لیے وہ ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گے (انشاء اللہ)۔ ان کے اتنی جلد ہم سب سے مانوس ہو جانے اور چلے جانے سے ایسے لگتا ہے جیسے وہ کوئی فرشتہ تھے جو اچانک ہماری زندگی میں آیا، سب کو ہنسا کر خوشیاں بانٹ کر چپکے سے چلا گیا، بقولِ ناصر کاظمی

گئے دنوں کا سراغ لے کر، کدھر سے آیا، کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

اُن کے جانے سے میرا گلستاں اجڑ چکا ہے، ہر شے پہ مکمل سکوت ہے، زیست پہ جمود۔ خوشی کتنی عارضی ہے اور غم کتنا دائمی...!! دنیاوی زندگی اب بے وقعت معلوم ہوتی ہے اور اس میں دل لگانا ناممکن لگتا ہے۔ ..! میرے لیے وہ نہ صرف ایک بے لوث، بے مثال محبت کرنے والے شوہر تھے بلکہ ایک پرخلوص دانا دوست، ایک محافظ و رہنما اور محسن بھی۔ میری خوشیوں کا مرکز بھی۔ یہ سب کچھ ایک ہی لمحے میں مجھ سے چھن گیا۔..!!

اب ان کی یادیں، ان کے ساتھ گزارا زندگی کا سفر ہی میرے لیے سرمایۂ حیات اور زادِ راہ ہیں۔ ان کی باتیں اور سکھائے اصول میرے لیے مشعلِ راہ۔ ایک عظیم جانباز مجاہد کی بیوہ ہونے کا فخر ہی اب میری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔

اس بات کا اطمینان ہے کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق اپنے پاؤں پہ چل کر گئے، بستر سے نہ لگے، کبھی کی محتاجی نہ ہوئی۔ وہ اپنی کٹھن زندگی میں اپنے شاندار انداز سے جئے اور اسی شان سے دنیا

سے رخصت ہوئے کہ:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں

آخری وقت ان کا چہرہ اتنا پرنور و پرسکون تھا جیسے طویل کٹھن راہ کا کوئی تھکا ہوا مسافر میٹھی نیند سوجائے۔ ایسا لگتا کہ وہ اپنے "چاہنے والوں" کو یہ کہہ گئے ہوں:

ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرت
خاموش پڑا سوئے گا درماندۂ الفت

ان کی تدفین ملیر کینٹ میں کارگل کے ایک نوجوان شہید کے پہلو میں ہوئی۔ آسمان بھی اس دن رو دیا۔ جمعرات ۸ ذالحج کے مبارک دن تدفین کے ساتھ ہی ابر چھا گیا، سارا دن ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی اور اسکے ساتھ ہی ہمارے آنسو بھی زمین میں جذب ہوتے رہے.........!

انا للہ و انا الیہ راجعون

خدا مجھے ان کے ساتھ کی ہوئی کسی بھی کوتاہی کو معاف کرے۔ مجھے ان کی خواہشات کے مطابق صبر و بہادری سے زندگی کے باقی دن گزارنے کی ہمت عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ سید سلیم عباس صاحب کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔
ثم آمین...!!

آخر میں اس جانباز مجاہد کو *last post کا سیلوٹ!!

تسنیم سلیم

✿

---

*last post (لاسٹ پوسٹ، آخری مورچہ) = سپاہی کی تدفین کے موقع پر بگل پر بجائی جانے والی الیہ دھن۔

TRIBUTE TO A SILENT SOLDIER

خاموش سپاہی کو سلام!

یہ نظم سلیم عباس صاحب کے ایک پرستار، فاروق بروہی صاحب نے ان کے لیے ان کی زندگی میں لکھی۔ یہ خوبصورت نظم ان کی شخصیت کی مکمل، حقیقی عکاسی کرتی ہے۔

When I first saw him
I whispered to myself
Ghazi Dada... Ghazi Dada?
Have you heard Ghazi Dada?
There are fictitious Dadas and
movie Dadas
and of course gangster Dadas But
Ghazi ?
This Ghazi is different,
that No depth charger can sink
His eyes and strong chin
Emit clear message
To his enemy that-
Your brain is floundering to
Stay out my reach, but deep
in your soul you know,
I 'll stick like a leech
Thoughts like smoke twine
Through your brain

No I won't stop till you're
Dead or insane
Weep no more
the race is run
You lost the battle ,
and I 've won

Sink in the water and in fear
Call for help
but no one 's near
The game is over
The players are dead
I can play any part
Coming out of my head
You see, Ghazi is different
Different?
yes different from other men
To me Ghazi is like a blue rose
A blue rose?

Yes a blue rose, every
gardener would love to raise
People would come from far away
to see it
It would be rare
Different and beautiful
Ghazi is different and beautiful too
He is like a blue rose
Fresh and rare
And so in a way
Sometimes Ghazi's eyes
twinkle or sadden
For no apparent reason
At least, for none
that we could see
and so we come
to understand that
A little different
Unknown to us
In some ways
We began to think that
He was in a world in
which we might not feel
completely at home
To go there might in a way
be like going to another planet-
Ghazi is like a blue rose
And because there are
So few blue roses
We don't know much about them-
We only know
That they have to be tended more
carefully
And loved more

(❀❀❀❀)